پروین بیگم کا جی آج صبح سے کہیں نہ لگ رہا تھا۔
بلکہ یہ کیفیت تو کل رات سے تھی۔
اور کوئی کام ہو نہ ہو اتنا دل جمعی سے نہیں کرتی تھیں جتنا دل لگا کے سویا کرتیں۔
ایسی گہری اور طویل نیند ہوا کرتی ان کی کہ لوگ رشک کیا کرتے' بلکہ وہ سب بے چارے جو نیند کی کمی کا شکار رہتے' وہ تو باقاعدہ حسد کرنے پہ مجبور ہو جاتے۔ ان کی گہری اور میٹھی نیند کو ان کے بچے بھی متاثر نہ کر سکے۔ اب تو چھوٹا والا حسان بھی تین سال کا ہو چلا تھا ورنہ بچے جب چھوٹے تھے تب رات کو کئی کئی بار جاگتے۔ گلا پھاڑ پھاڑ کے روتے رہتے اوپر کے پورشن میں رہنے والے ان کے جیٹھ کے سارے بچے بھی ان کے ساتھ شامل ہو جاتے مگر ان سب کے پہلو میں بے سدھ لیٹی ان کی ماں پروین بیگم تب تک نہ اٹھتیں جب تک ان کے شوہر سراج دین انہیں جھنجوڑنے پہ مجبور نہ ہو جاتے۔
لیکن پتہ نہیں کیا بات تھی کہ رات وہ معمول کے مطابق بستر پہ لیٹیں تو ہمیشہ کی طرح تکیے پہ سر رکھتے ہی دنیا سے بے خبر ہونے کے بجائے دیر تک کروٹیں بدلتی رہیں۔
رات چونکہ آنکھ دیر سے لگی تھی' اس لیے صبح بیدار ہونے پہ عجیب سی کسلمندی اور جھنجلاہٹ کا غلبہ تھا۔ وہ باورچی خانے کی ملکہ کہلائی جاتی تھیں۔ دن میں تینوں وقت کا کھانا بڑے اہتمام اور ذوق و شوق سے بناتیں لیکن آج ناشتہ تیار کرتے ہوئے نہ وہ ذوق و شوق نظر آ رہا تھا نہ جوش و خروش۔ جیسے تیسے احسن کو ناشتہ کرایا۔ لنچ باکس بھرنے کے بجائے ایک نوٹ پکڑا دیا حالانکہ وہ اس کے کینٹین سے کھانے پینے کو خود بھی پسند نہیں کرتی تھیں اور ان کے شوہر بھی اس کے خلاف تھے۔
حسان کو دلیہ کھلانے کے بجائے فیڈر منہ سے لگا دیا۔ ان کی ساس شوکت جہاں ناشتے میں ابلا ہوا انڈا لینے کی عادی تھیں لیکن آج انہیں یہ آسان ترین ناشتہ بنانا بھی دوبھر لگ رہا تھا۔ کچی کی زردی والا ڈھیلا ڈھالا انڈا۔ جس پہ سے چھلکا بھی صفائی سے نہ اترا تھا' لا کے شوکت جہاں کے سامنے رکھا تو وہ چشمے کے پرے اپنی آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھنے لگیں' پھر اس پیالی کو پرے سرکا کے خالی چائے کا کپ اپنے لبوں سے لگا لیا۔ ایک تو صبح صبح بحث و تکرار کرنے کا موڈ نہیں تھا' دوسرا اس وجہ سے بھی پروین بیگم کو رعایت مل گئی کہ ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا ورنہ وہ اپنا کام ذمہ داری اور خوش اسلوبی سے انجام دینے کی عادی تھیں اور یہ تو صرف ایک ابلا انڈا تھا۔

"ہو جاتا ہے کبھی کبھی۔ شاید طبیعت ٹھیک نہ ہو۔" انہوں نے نظرانداز کرنا چاہا مگر کر نہ سکیں۔ احسن کو اسکول بھیجنے کے بعد پروین بیگم کا معمول تھا دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنا کیونکہ سراج دین دس بجے کے قریب فیکٹری کے لیے نکلتے تو دوپہر کا کھانا ساتھ لے کر جاتے۔ جوانی میں ہی السر کا مرض لگ چکا تھا جسے پرہیز کے باعث قابو میں کر رکھا تھا۔ پروین بیگم بڑی احتیاط اور اہتمام کے ساتھ ان کے لیے کم تیل میں ٹھنڈی تاثیر کی سبزیاں اور مرغی کا گوشت کم نمک مرچ کے ساتھ پکایا کرتیں کیونکہ گائے یا بکرے کا گوشت بھی انہیں منع تھا اور گرم مسالا جات بھی۔

لیکن شوکت جہاں نے بڑے اچنبھے کے ساتھ دیکھا وہ ڈھیلے ڈھالے انداز میں برآمدے میں رکھی ڈائننگ ٹیبل کی چیئر پر بیٹھی۔ یوں کسی الجھن کا شکار نظر آ رہی تھیں۔ فجر کی نماز کے بعد وہ لمبے وظائف پڑھنے اور دیر تک تلاوت کرنے کی عادی تھیں اس لیے سو نے اس کی الجھن بعد میں دریافت کرنے کا سوچتے ہوئے وہ پھر سے عبادت میں مگن ہو گئیں۔

"کیوں؟ کھانا کیوں نہیں تیار ہوا؟"

سراج دین کی تیز آواز پہ وہ چونکیں اور گھڑی کی جانب نظر اٹھا کر دیکھا۔ پونے دس بج رہے تھے۔

"ایک دن بازار کا کھا لیں گے تو کیا فرق پڑ جائے گا۔" یہ دوسری جھنجھلائی ہوئی آواز ان کی بہو پروین کی تھی۔

شوکت جہاں تخت سے اتریں اور اپنے سلیپر پہنتے ہوئے باہر نکلیں۔

"فرق تو پڑے گا۔ ہاں مگر تمہاری صحت پہ نہیں' اس لیے تمہیں کوئی پروا نہیں ہے۔" ان کا چھوٹا بیٹا سراج دین جو بچپن سے غصے کا تیز اور تنک مزاج تھا' بیوی پہ برس رہا تھا۔

"کیوں شور مچا رکھا ہے صبح صبح؟" انہوں نے ناگواری سے ٹوکا۔

"اماں! دیکھیں' اس نے آج پھر کھانا وقت پہ تیار نہیں کیا۔"

"بھئی۔ پھر سے کیا مطلب ہے آپ کا؟" پروین بیگم کے آگ ہی تو لگ گئی اس الزام پر۔ "بات تو یوں کر رہے ہیں جیسا یہ میرا روز کا معمول ہے۔ کبھی مہینوں بعد ایسا اتفاق ہوتا ہو گا' وہ بھی کسی نہ کسی وجہ سے اور آج تو عرصے بعد ایسا ہوا ہے ورنہ سردی ہو یا گرمی' طبیعت خراب ہو یا ٹھیک' میں نے کبھی اس معمول میں سستی نہیں دکھائی۔"

"دکھانا بھی نہیں چاہیے۔ سارا دن گدھوں کی طرح کام کرتا ہوں۔ کیا یہ میرا حق نہیں کہ مجھے کھانا تو میری مرضی کا ملنا چاہیے اور یہ بھی کوئی میرا نخرہ نہیں ہے بلکہ مجبوری ہے۔ بازار کا کھانا کھا کر میری طبیعت بگڑ جاتی ہے۔"

"جانتی ہے وہ' اسی لیے خاص پرہیزی کھانا تمہارے لیے الگ بنتا ہے۔" شوکت جہاں نے بھرپور مداخلت کی۔

"کوئی احسان نہیں کرتی۔ فرض ہے یہ اس کا۔ میں بھی اس بیماری کے ساتھ سارا دن محنت مشقت کرتا ہوں۔ کس کے لیے؟ بیوی اور بچوں کے لیے ہی نا!"

"تم بھی کوئی احسان نہیں کرتے۔ یہ فرض ہے تمہارا۔"

"اماں! ایک تو آپ۔۔۔" سراج دین زچ ہو گئے۔ "میں اپنی بیوی سے بات کر رہا ہوں۔ آپ آرام کیجیے جا کر۔" اس بار وہ بڑے مہذب لہجے میں بدتمیزی کرتے ہوئے بولے۔

شوکت جہاں کو غصہ آ گیا۔ "پہلی بات تو یہ کہ تم اپنی بیوی سے بات نہیں کر رہے تھے بلکہ اس پہ چلا رہے تھے' دوسری بات یہ کہ یہ بیوی کو تم کہیں سے بھگا کے یا اٹھا کے نہیں لائے تھے' میں بیاہ کے لائی تھی اسے تمہارے لیے' یہ میری ذمہ داری ہے کہ میں اسے غلط دیکھوں گی تو ٹوکوں گی بھی۔۔۔ اور کہیں اس کے ساتھ غلط ہوتا دیکھوں گی تو روکوں گی بھی۔۔۔ اور تیسری بات یہ کہ تم کون ہوتے ہو مجھے آرام کا مشورہ دینے والے۔ کیا تم مجھے میرے کمرے تک محدود کر کے اس گھر سے لاتعلق قرار دینا چاہتے ہو؟"

"ہمیشہ۔۔۔" سراج دین نے ہتھیلی پہ مکا مارتے ہوئے کہا۔ "ہمیشہ ایسا ہوتا ہے۔ جب میں کوئی بات کرتا ہوں' آپ اسی طرح دخل دیتی آ جاتی ہیں' بات کا رخ اپنی جانب موڑ کے اسے ختم کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ اب انسان اپنے گھر میں اپنی بیوی سے کوئی بات تک نہیں کر سکتا۔"

وہ تلملاتے ہوئے اپنی گھڑی اور دوسری لازمی چیزیں اٹھائے ان کے پاس آئے۔ اسی ناراض ناراض سے انداز میں سر ان کے سامنے جھکایا۔

"پھونکیں' ذرا جلدی پھونکیں' پہلے ہی دیر ہو گئی ہے۔"

"جیتے رہو۔" شوکت جہاں جو گھڑی کلائی پہ باندھتے' پرس جیب میں ڈالتے اور چشمہ آنکھوں پہ لگانے کے دوران ہی آیات قرآنی کا ورد زیر لب کرنے لگی تھیں' اپنی مسکراہٹ دبا کے بیٹے کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پھونک مارنے لگیں۔

"ہاں' اب بتاؤ کیا بات ہے؟" بیٹے کے جانے کے بعد وہ پروین بیگم سے مخاطب ہوئیں۔

"کچھ نہیں اماں جی! کچھ بھی نہیں۔" ان کے لہجے میں وہی کسلمندی جھلک رہی تھی جو صبح سے ان کی ہر ہر حرکت سے واضح تھی۔

"جب تم جانتی ہو کہ بازاری کھانے اسے موافق نہیں تو کیوں غفلت برتی ہو؟ کیوں نہیں کھانا تیار کیا؟ ایک بندے کا پرہیزی سادہ کھانا تیار ہونے میں وقت ہی کتنا لگتا ہے۔"

"یہ بات نہیں اماں جی! وقت تو تھا۔ بس۔۔۔"

"وہی تو میں پوچھ رہی ہوں کہ کیا وجہ تھی؟"

"آپ بھی عجیب ہیں اماں جی!" پروین بیگم کچھ سوچ کے مسکرا دیں۔ "میاں صاحب مجھ سے سوال جواب کریں تو آپ ڈھال بن جاتی ہیں لیکن بعد میں خود آڑے ہاتھوں لینا نہیں بھولتیں۔" واضح طور پہ انہوں نے اپنی ساس کا سوال ٹالتے ہوئے بات بدلنے کی کوشش کی تھی۔

"تم سے باز پرس کرنا میرا حق ہے۔ اپنے ہاتھوں بیاہ کر لائی ہوں۔ ہاں مگر مردوں کا اپنی بیویوں پہ اونچی آواز میں چلانا بھی مجھے پسند نہیں۔ ٹھیک ہے' کبھی کوئی شکایت بھی ہوتی ہے' غصہ بھی آ جاتا ہے۔ لیکن ایسے معاملات اپنے کمرے کے بند دروازے کے پیچھے نمٹا لینا ہی عقلمند میاں بیوی کا شیوہ ہے۔ یوں اونچی آوازوں کے ساتھ گھر بھر میں اپنے جھگڑے کا چرچا کرنا جہالت کی نشانی ہے اور میں اس کی نوبت نہیں آنے دینا چاہتی۔ اور پھر یہ بھی ہے پروین بیگم کہ سراج تو غصے کا تیز ہے ہی' تم میں بھی برداشت بس ایک حد تک ہی ہے۔ قسم کھا کے بتاؤ' اگر میں یوں درمیان میں آ کے بات ختم نہ کروایا کروں تو تم اور کتنی دیر چپ رہ سکتی ہو؟"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ تائیدی انداز میں سر ہلانے لگیں۔

"عورت کی زبان کھل جائے تو مرد کا ہاتھ اٹھ جاتا ہے۔ تمہاری زبان نہ کھل جائے اس لیے مجھے تمہاری حمایت میں اپنی زبان کھولنا پڑتی ہے۔ تمہارے اندر جو لاوا پک رہا ہوتا ہے' وہ میری ہمدردی پا کے خود بخود ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ اس گھر میں بری بن جاتی ہوں بیٹے کی نظروں میں بھی۔"

"اس کا مطلب ہے اماں جی! آپ صرف بات ختم کرنے کی نیت سے میری طرف داری کرتی ہیں' سچ میں میری ہمدرد نہیں ہیں آپ؟" پروین بیگم نے گلہ کیا۔

شوکت جہاں مسکرا دیں۔ "میں اس بات سے انکار نہیں کروں گی کہ ایسا میں صرف بات ختم کرنے کی نیت سے ہی کرتی ہوں۔ سراج جیسا بھی ہے' ماں کا اتنا لحاظ تو کرتا ہے۔ میری مداخلت بری لگے تب بھی غصے میں آ کر ادھر ادھر ہو جاتا ہے' میرے منہ نہیں لگتا لیکن اگر بات ختم کرنے کے لیے میں تمہارے بجائے اس کی طرف داری کروں گی تو یہ بات اتنی آگے نکلے گی کہ سنبھالے نہیں سنبھلے گی۔ پھر یہ میاں بیوی کے عام سے جھگڑے سے بڑھ کر ساس بہو کی روایتی چپقلش میں بدل جائے گی۔"

"نہیں اماں جی! ایسا نہیں ہو سکتا۔" پروین بیگم نے پورے وثوق سے کہا۔ "ایسا کبھی بھی نہیں ہوگا۔ آپ کو اتنے سالوں بعد تو اندازہ ہو جانا چاہیے۔ آخر ہمارا ساٹھ سالوں کا ساتھ ہے۔"

"تم میرے ساتھ اچھی ہو کیونکہ میں تمہارے ساتھ اچھی ہوں۔" شوکت جہاں نے سچائی کے ساتھ حقیقت بیان کی۔ "جس دن میں تمہاری غلطیاں ڈھونڈ ڈھونڈ کے معراج کے ہاتھ میں تھمانے لگوں گی اور اس کے غصے کو ہوا دینے لگوں گی تب دیکھیں گے تمہارا دعوا کہاں تک سچا ہے۔" شوکت جہاں اس بحث میں سچ مچ بھول گئیں کہ انھیں پروین بیگم سے کیا پوچھنا تھا۔

اسی لیے تو ان کی اپنی اس بہو سے زیادہ بنتی تھی کہ دونوں کے مزاج میل کھاتے تھے۔ تحمل، بات سے بات نکال کر گفتگو کرتے نہیں تھکتی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ انھوں نے پانچ سال پہلے دونوں بیٹوں کی گھر داری الگ کرنے کے بعد اپنی اس بہو کے ساتھ رہنا پسند کیا تھا ورنہ بڑی والی بھی بری نہ تھی۔ بلکہ کئی لحاظ سے پروین سے بہتر ہی تھی۔

زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ بہتر فیملی بیک گراؤنڈ رکھنے والی۔ عزت تو وہ بھی اس کی بے حد کرتی تھیں لیکن شوکت جہاں کو اس کا لیے دیے رہنے والا مزاج اور خصوصاً اس کا کم گوئی نہیں بھاتی تھی۔ انھیں چاہیے تھا کوئی ایسا جو ان کی ہر ضروری اور غیر ضروری بات توجہ سے سنے اور ان کی بڑی بہو 'معراج دین کی بیوی رخشندہ' کو ایسے میں اچانک کوئی نہ کوئی کام یاد آجاتا۔

جبکہ انھیں ہنسنے والے کے ساتھ ساتھ بولنے والا بھی چاہیے تھا جس کے ساتھ لمبی لمبی بحثیں کرنے کا مزہ بھی آئے اور رخشندہ عادی تھیں نپی تلی گفتگو کی۔

شوکت جہاں خاصی مجلسی خاتون تھیں۔ خاندان کی دور پرے کی عزیز خواتین سے بھی روابط تھے اور محلے میں تو اچھے تعلقات تھے ہی۔ کوئی نہ کوئی دن بھر میں ملنے آیا رہتا۔ کبھی کبھی تو باقاعدہ محفل سی جایا کرتی اور رخشندہ کو میل ملاپ محض خوشی غمی کے مواقع کی حد تک ہی گوارا تھا اور تو اور اپنے میکے سے بھی اس کے تعلقات رسمی اور سرسری سے تھے۔ شوکت جہاں کی مہمان نوازی اور خوش اخلاقی کا عالم تو یہ تھا کہ بہوؤں کے میکے والوں کی آمد بھی کھل جاتی۔ یہی عادت کچھ کچھ پروین بیگم میں بھی تھی۔ انھیں بھی گھر میں مہمانوں کی آمد و رفت اچھی لگتی تھی۔ وہ ساس کے معمولات سے اکتاتی نہیں تھیں۔

اور ایک وجہ اور بھی تھی۔

اور وہ وجہ تھی۔۔۔ وصی۔

ان کا ساڑھے تین سال کا نواسا 'وصی'۔

حالانکہ پانچ سال پہلے جب انھوں نے بڑے کے بجائے چھوٹے والے بیٹے کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کیا تھا تب اس وجہ کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ اپنی اکلوتی بیٹی زہرہ کی شادی کرنے کے فوراً بعد ہی انھوں نے دونوں بیٹوں کے پورشنز الگ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شادی کے دو سال بعد زہرہ ایک حادثے میں چھ ماہ کے وصی کو چھوڑ کے دار فانی سے کوچ کر گئی تھی۔ اس کے جانے کی نہ تو عمر تھی نہ وقت۔ کتنا ہی عرصہ شوکت جہاں کو سنبھلنے میں لگا۔ تھا وصی کبھی ددھیال تو کبھی ننھیال میں وقت گزارتا۔ ان کا داماد اپنے ماں باپ کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بوڑھے دادا، دادی اکیلے اس چھ ماہ کے بچے کو پالنے کے قابل ہوتے تو جی جان سے پالتے مگر دادا فالج کے مریض تو دادی جوڑوں کے درد کی بنا پر زیادہ نہ رکھ پائے۔

دوسری جانب شوکت جہاں بھی بیٹی کی جوان مرگی سے نڈھال تھیں۔ پروین بیگم خود پورے دنوں سے تھیں۔ رخشندہ کے ماتھے کے بل کسی سے چھپے نہ رہ سکے۔ انھیں اس معصوم بچے کا وجود اس گھر میں کھٹک رہا تھا اور اسے سنبھالنا دو بھر لگ رہا تھا۔ ان کے اپنے اوپر تلے کے چار بچے تھے ایسے میں ایک چھ ماہ کے بچے کی اضافی ذمہ داری اٹھانے پہ وہ تیار نہ تھیں۔

بچے اور ماہ گزرے تو وصی کے باپ نے دوسری شادی کرنے میں دیر نہ لگائی اور اس شادی کے چند دنوں بعد ہی وصی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ننھیال آگیا۔ تب تک پروین بیگم کے ہاں حسان کی پیدائش ہو چکی تھی بلکہ وہ تین ماہ کا ہو رہا تھا۔ انھوں نے وصی کی پرورش کا ذمہ لے لیا اور شوکت جہاں نے ایک بار پھر اپنے دور اندیش فیصلے کی داد دی۔ انھیں انسانوں کے پرکھنے میں کبھی دھوکا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

پچھلے ڈیڑھ دو سال سے وصی بھی احسن اور حسان کے ساتھ برابر پل بڑھ رہا تھا۔ کہنا تو غلط ہوگا کہ پروین بیگم نے اپنے بچوں سے بڑھ کے یا اپنی اولاد کے برابر اس کا خیال رکھا مگر ہاں مقدور بھر کوشش ضرور کی اور اس کی وجہ سے ان کی ساس ان کی گرویدہ تھیں یا شاید دل ہی دل میں ممنون اور احسان مند تھیں تب ہی اپنے بیٹے کے مقابلے میں وہ ہمیشہ بہو کا ساتھ دیتیں۔ جیسا کہ آج ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

"پروین! ذرا میرون رنگ کے دھاگے کی نلکی تو دینا۔"

وہ بڑی بے دلی سے سالن تیار کرنے کے لیے پیاز کاٹ رہی تھیں جب ان کی جیٹھانی رخشندہ نے نیچے آکر پوچھا۔

"میرون۔۔۔" وہ ہاتھ روک کے سوچنے لگیں۔ "ہاں شاید ہے۔۔۔ دیکھ لیجیے ناں بھابی! مجھے تو آج سامنے رکھی ہوئی چیز بھی نظر نہیں آرہی' خاک ڈھونڈ پاؤں گی میں میرون دھاگے کی نلکی۔ اماں جی کے کمرے میں رکھا ہے ڈبہ' خود ہی ڈھونڈ لیجیے۔"

"کیوں بھئی' ایسا کیوں؟"

"پتہ نہیں' بس یونہی کوئی کام کرنے کو جی نہیں چاہ رہا۔ دل بجھا بجھا سا ہے۔ صبح میاں صاحب سے بھی اسی لیے کھٹ پٹ ہو گئی کہ معمول کے مطابق کھانا کیوں نہیں تیار کیا۔ اب آپ ہی بتائیے' انسان ہوں' کبھی کبھار اکتا۔۔۔"

وہ پتہ نہیں کب تک بولتی رہتیں مگر رخشندہ جو کم بولنے کے ساتھ ساتھ کم سننے کی بھی عادی تھیں گھبرا کے یہ کہتے ہوئے نکل گئیں۔

"اچھا میں خود ہی دیکھ لیتی ہوں۔"

پروین ایک سرد آہ بھر کے رہ گئیں۔ بے زاری سے انھوں نے سامنے رکھی سبزی کی ٹوکری اور چولہے پہ دھری دیگچی میں سرخ ہوتی پیاز کو دیکھا۔ دل چاہ رہا تھا سب چھوڑ چھاڑ بس تکیے میں منہ دے کر لیٹ جائیں۔ چپ چاپ۔۔۔ بالکل اکیلے۔۔۔ مگر یہ گھر داری جان چھوڑے تب ناں۔

"تمہیں یہ دھاگے کی کیا ضرورت آن پڑی! خیر سے درزی سلامت تو ہیں شہر کے؟"

شوکت جہاں نے طنزیہ انداز میں رخشندہ کو دیکھا۔ رخشندہ پیسہ خرچنے کی شوقین تھیں۔ ان کے مطابق اگر ملازمہ سے ہر کام تنخواہ دے کر کروایا جا سکتا ہے۔۔۔ درزی کے بل بھر کے کپڑے سلوائے جا سکتے ہیں تو خود کو ہلکان کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ شاہ خرچیاں ان کی ساس کو پسند نہ تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ بچوں کے چھوٹے چھوٹے فراک اور نیکریں؟ اپنے روزمرہ کے پہننے والے کپڑے بھی بیبیاں خود ہی سیتی بھلی لگتی ہیں۔

"اور آپ ٹھیک ہیں نا؟"

ساس کا طنز اور سوال دونوں نظر انداز کر کے وہ ڈبے میں سے مطلوبہ رنگ تلاشتے ہوئے مصروف اور رسمی انداز میں کہنے لگیں۔ "قیمہ بھرے کریلے اور کڑھی پکائی ہے۔ بھجواتی ہوں آپ کے لیے۔"

یہ کہہ کے وہ نکلنے لگیں کہ شوکت جہاں کی آواز پہ رکنا پڑا۔

"بارہ بجے ہی بھجوا دینا' آج صرف چائے ہی پی ہے میں نے بھوک جلدی لگ جائے گی اور پروین بی بی تو خیر سے

لپ جھپ روانہ ہوئی تھیں کچن کی جانب۔ وہاں سے بھی کب سے صرف برتن بجنے کی آوازیں ہی آرہی ہیں۔ نجانے دھیان کدھر ہے آج اس کا۔ صبح سویرے تو اچھی طبیعت صاف کرنے والا تھا اس کی اگر جو میں بیچ میں نہ آتی۔"

انھوں نے فخریہ اپنی کارکردگی اور ذہانت جتائی کہ دیکھو میرا ساتھ اس بہو کے لیے کتنا فائدہ مند ہے لیکن رخشندہ بس یونہی رواداری میں مسکرادیں۔ انھیں بھلا اس افادیت سے کیا لینا دینا تھا۔ معراج دین صاحب کے منہ میں تو ویسے ہی زبان نہیں تھی اور بیگم کے سامنے تو وہ پلکوں کو جنبش دینا تک بھول جاتے تھے۔

"ذرا تم پتہ کرو میکے میں لڑ جھگڑ کر آئی ہے کیا؟ خیر وہاں ہے کون سوائے ڈیڑھ ماں اور بھائی کے اور بھائی بھی اللہ میاں کی گائے۔۔۔ آئے گئے نہیں وہ دونوں خیر تو ہیں؟"

اچانک انھیں نیا ہی خیال سوجھا۔

"کیسی خبر؟" نہ چاہتے ہوئے بھی رخشندہ کو دلچسپی ظاہر کرنا پڑی۔ سامنے شوکت جہاں تھیں ان کی ساس۔۔۔ کوئی دیورانی نہیں کسی جس کی بات ان سنی کرکے ادھوری چھوڑ کے وہ باہر نکل جاتیں اس لیے بڑی مجبوری کے عالم میں دروازے کے پاس کھڑی پوچھ رہی تھیں۔

"اے ہے۔ وہی ڈائن یہ یاد نہیں پہلے دونوں بچوں کی دفعہ بھی شروع شروع میں ایسے ہی ہر ایک کو کاٹ کھانے کو دوڑتی تھی۔ اٹوائی کھٹوائی لیے پڑی رہتی تھی۔ جبھی تو مجھے تو بہوؤں سے ایسی من کرن لینا پسند نہیں۔ لحاظ نہیں رہتا۔ ہاں تم ذرا پتہ کرو کتنے دن چڑھے۔۔۔؟ اس بار بیٹی ہو تو میرے سراج پہ اللہ کی رحمت بھی نازل ہوجائے گی۔"

"لو یہ کیا مصیبت۔ اب میں دائیوں کی طرح عورتوں سے ان کے دن چڑھنے کی رپورٹیں لیتی پھروں۔"

رخشندہ نے کوفت سے سوچا اور ٹالنے کے سے انداز میں ہامی بھرتے ہوئے نکلنے کو تھیں ———

کہ ٹیلی فون کی کرخت گھنٹی نے گھر کے پرسکون ماحول کو منتشر کردیا۔

گھر میں فون لگے چند مہینے ہی ہوئے تھے لیکن اب تک کوئی بھی عادی نہ ہوا تھا اس اچانک بجنے والی گھنٹیوں کا۔ ایک پل کے لیے تو رخشندہ بھی چونک گئیں۔

پروین بیگم چھری ہاتھ سے رکھ کے حسان کی فکر کرنے لگیں جسے ابھی ابھی سلا کے کام نمٹانے آئی تھیں۔

سب سے بری حالت ہوتی تھی شوکت جہاں کی۔ ان کو تو ٹیلی فون کی گھنٹی کی آواز زہر لگا کرتی۔ اب بھی ایک ہاتھ سینے پہ رکھے دوسرا کان پہ جمائے توبہ توبہ کررہی تھیں۔ تیسری بیل پہ پروین نے برآمدے میں رکھے سیاہ ٹیلی فون سیٹ کا ریسیور اٹھایا تھا لیکن ان کے حواس اب تک قابو میں نہ آئے تھے۔

"ایک گھونٹ پانی تو پلانا۔"

رخشندہ نے کولر سے ٹھنڈے پانی کا گلاس بھر کے انھیں پیش کیا۔

"توبہ۔۔۔ کیا صور اسرافیل کانوں میں پھونکنے کو لا رکھا ہے سراج نے۔ جب بجتا ہے دل ہل جاتا ہے۔ ہول اٹھتے ہیں مجھے کہ نجانے کیا خبر آئی ہے۔ ایسی منحوس گھنٹی ہے اس کی جیسے خطرے کا سائرن۔"

"اماں جی۔ اماں جی۔" پروین بیگم متوحش انداز میں بھاگتی آئیں۔

"الٰہی خیر۔" وہ مزید گھبرا گئیں۔

"صبح سے میرا دل یونہی نہیں گھبرا رہا تھا۔ میں نہ کہتی تھی کہ کوئی بات ہے ضرور۔ کچھ ہونے والا ہے۔"

وہ روتی دھوتی شوکت جہاں کے بستر پہ دھم سے بیٹھ گئیں۔ رخشندہ نے پانی کا گلاس تپائی سے اٹھا کے اب پروین کے ہاتھ میں تھما دیا۔

"ارے کچھ بول بھی۔۔۔ کیا ہوا؟" شوکت جہاں کی آواز لرز رہی تھی۔ "یا اللہ۔۔۔ میرے سراج معراج کی خیر رکھنا۔"

"میری اماں کا فون تھا۔" پروین نے دوپٹہ نما تولیہ سا اپنا کے منہ پہ رکھتے ہوئے اپنی ہچکیاں روکیں۔

"ساجدہ کو ہسپتال لے گئے ہیں۔ اس کی حالت بہت خراب ہے۔" ہچکیاں ایک بار پھر شروع ہوگئیں۔

"ساجدہ۔۔۔ تمہاری بھابھی؟"

پروین نے اثبات میں سر ہلایا۔ ساجدہ بے شک ان کے بڑے بھائی نوید مراد کی بیوی تھی مگر ان سے عمر میں کم تھی جس لیے وہ بھابھی کہنے کے بجائے نام لے کر ہی پکارتیں۔

"اس کے ہسپتال جانے میں ابھی خاصا وقت تھا۔" رخشندہ نے کہا۔ "تم نے تو ڈاکٹر کا دوسرا ہفتہ بتایا تھا اور ابھی تو۔۔۔ دن پورے ہونے میں کچھ ہفتے باقی ہیں۔ تو کیا وقت سے پہلے ہی۔۔۔؟"

"وہ سیڑھیوں سے گر گئی ہے۔"

"ہائے۔۔۔" شوکت جہاں نے دہل کر سینے پہ ہاتھ رکھا۔ دھان پان نازک سی لڑکی کہہ کر ساجدہ کی صورت آنکھوں میں پھر گئی جسے نوید مراد کی دلہن بنے ابھی سال بھر ہی ہوا تھا۔ رخشندہ بھی متفکر ہو گئیں۔

"مجھے ابھی وہاں جانا ہے اماں جی!"

"ہاں کیوں نہیں۔ میں بھی ساتھ چلتی ہوں بلکہ رخشندہ! تم بھی معراج اور سراج کو فون کرکے بتا دو اور ہمارے ساتھ ہی چلو۔"

"فون میں کردیتی ہوں اماں جی! اور ساتھ بھی ضرور جاتی لیکن بچے اسکول میں ہیں۔ گھر بند کرکے کیسے چل پڑیں۔"

"ہاں! احسن بھی اسکول میں ہے۔"

"آپ اماں جی کے ساتھ ابھی چلے جائیے۔ حسان کو سویا رہنے دیں اور بچیاں بھی کھیل رہی ہیں۔ رضا اور احسن اسکول سے آجائیں تو میں بچوں کو کھانا کھلا کے نکل آؤں گی۔ سب ہی بچے گھر پہ رہیں گے، ساتھ والوں کی آپا جی کو بٹھا جاؤں گی۔"

"وصی کو بھی اوپر ہی لے جاؤ، صحن میں بیٹھا ہوگا طوطے کے پنجرے کے پاس۔"

شوکت جہاں کے اس نئے آرڈر پہ وہ بغیر کسی تاثر کے سر ہلا کے رہ گئیں۔ اس ردعمل سے شوکت جہاں کی خاص تسلی نہ ہوئی۔

"کہیں بچے اکیلے نہ چھوڑ دینا بن ماں کے بچے کو۔ ننھی سی جان ہے ڈر کے مارے ہولتا رہے گا۔"

"ہاں ظاہر ہے۔" وہ بڑبڑائیں۔ روکھا پھیکا مزاج ہوتا ایک طرف۔ ایسی بے دردیا کٹھور تو ہرگز نہ تھیں، نہ ہی اس معصوم بچے سے کوئی دشمنی تھی جو موقع بے موقع نکالتیں۔

☼ ☼ ☼

ٹھیکیدار نوید مراد پھٹی پھٹی آنکھوں سے پکے فرش پہ خون میں لت پت پڑی ساجدہ کو دیکھ رہا تھا۔

ماربل کا فرش اس نے چند ماہ پہلے ہی بڑے شوق سے بنوایا تھا۔ سفید جھاگ سا صحن اور برآمدہ۔۔۔ چمکتی ہوئی سیڑھیاں کتنی اچھی لگتیں اور آج اسی خوش نما فرش پہ گاڑھا گاڑھا سرخ خون جھر جھر بہہ رہا تھا۔

"ارے کوئی اٹھاؤ اسے۔۔۔ نوید۔۔۔ پروین۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔ ارے میں مر گئی۔"

یہ پروین بیگم اور نوید مراد کی ماں تھیں جو سینہ پیٹتے ہوئے واویلا کررہی تھیں۔

"ارے نوید! کھڑا کیا تک رہا ہے۔ اٹھا اس بدنصیب کو۔۔۔ مرجائے گی۔۔۔ ہسپتال لے کر جا۔ ارے رسولن کی ثریا۔۔۔!"

وہ ہمسائیوں کے نام پکارتے ہوئے ننگے پیر باہر کی جانب بھاگیں۔

نوید مراد جیسے سکتے کے عالم میں کھڑا نیچے گرے بے ہوش وجود کو دیکھ رہا تھا۔

ساجدہ جسے اس کی زندگی میں شامل ہوئے ابھی کچھ ہی عرصہ ہوا تھا یا یوں کہیے کہ زندگی کو زندگی کی طرح محسوس کرنا اس نے ابھی ابھی سیکھا تھا۔ آنکھ کھولتے ہی اس نے خود کو یتیمی کے دور میں اور ماں کو بیوگی کی چادر

اوڑھے دیکھا۔ ہوش سنبھالتے ہی خود کو ذمہ داریوں میں جکڑا پایا۔ سارا لڑکپن "فرائض اور ذمہ داریوں کے بوجھ تلے گزرا اور نوجوانی کے ابتدائی کئی سال بھی۔
کڑی محنت اور مشقت کے وہ سال۔۔۔
جن میں خود اس کے اپنے لیے ایک پل نہ تھا سو سارے سال اس نے اپنے قدم جمانے "پختہ دیواروں کے سر پہ چھت قائم کرنے اور چھوٹی بہن کے لیے جہیز اکٹھا کرنے میں گزار دیے۔
اس کی اس جدوجہد کا کچھ انعام تو ملا ہی تھا۔ بڑی بہن بیگم کا رشتہ اچھے گھرانے میں ہو گیا۔ بہت عزت کے ساتھ بسنے والا کر اس نے بہن کو رخصت کیا تھا۔ ذاتی مکان۔۔۔ ٹھیکیداری کا منافع بخش کام۔۔۔ سب کچھ حاصل ہو گیا تب اس نے اپنے بارے میں سوچا۔
ماں اور بہن نجانے کہاں سے چھانٹ کے یہ ہیرا لائی تھیں اس کے لیے۔ اس نے پہلی بار ساجدہ کو دیکھا تھا تو مبہوت رہ گیا تھا۔ یہ تو اس نے سوچا تک نہ تھا کہ اب جب اس کی عمر اڑتیس سال سے اوپر ہو چلی ہے اور کڑی مشقت کے شب و روز نے اس کے ظاہر پہ اثر انداز ہو کے اسے عمر سے کہیں بڑا ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے "اسے اتنی حسین اور کم عمر بیوی مل سکتی ہے لیکن یہ بڑی بہن بیگم کا کارنامہ تھا۔ ایک غریب سے گھرانے کی انیس بیس سالہ خوبصورت اور سلیقہ شعار لڑکی بیوہ اپنے بھائی کے لیے ڈھونڈ کر لائی تھیں۔
ساجدہ عادت کی بھی اچھی تھی۔ نوید مراد کی ماں مزاج کی قدرے تیز تھیں لیکن ساجدہ نے ان کے ساتھ بھی ہنس کے نباہ کر لیا۔ شادی کے دو ماہ بعد ہی اس نے نوید مراد کو خوشخبری سنائی تھی اور تب سے اس کے پیر زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔ یہ احساس ہی کتنا خوش کن تھا کہ وہ جو عرصے سے بوجھ اٹھانے کا عادی ہے "کوئی اس کی بھی ذمہ داریاں بانٹنے والا آ رہا ہے۔ کوئی اس کا بھی سہارا بننے والا ہے۔
"لیکن شاید میری خوشیوں کی عمر اتنی ہی تھی۔"
نوید مراد نے بجھتی ہوئی آنکھوں سے ساجدہ کے نیم مردہ وجود کو دیکھا اور اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا بوجھ مزید سہارنے سے یکسر انکار کر دیا۔
جس وقت اس کی اماں شمشاد محلے کے لوگوں کو اکٹھا کر کے روتی چیختی اندر لا رہی تھیں وہ کھڑے قدموں نیچے گر رہا تھا۔ رسولن اور شہناز بھی ساجدہ کو سنبھالنے آگے بڑھیں اور شمشاد اپنے بیٹے کو۔
"میرے بچے کو خوشیاں راس نہیں آئیں۔ نجانے کس موئے کی بد نظر کھا گئی ہائے۔۔۔ لوگوں کے ہاں ڈھیر لگے ہیں پوتے پوتیوں کے۔ مجھ کملی نے تو کبھی جلاپا نہ کیا پھر میرے گھر کے پہلے پہلے "جی" آنے کی خبر پہ لوگوں کے سینے پہ سانپ کیوں لوٹ گئے۔ کس کے تعویز گنڈے کام دکھا گئے۔"
نوید مراد کو اس کا کوئی پڑوسی پانی کے چھینٹے مار کے ہوش میں لا رہا تھا۔ ایک اور پڑوسی جو اپنی گاڑی نکال لایا تھا اور اب وہ تین عورتوں کی مدد سے ساجدہ کو اٹھا کے گاڑی میں لٹانے کی کوشش کر رہا تھا اور ادھر شمشاد بی بی اپنے بین کرنے میں مصروف تھیں۔
"اٹھو نوید بابو۔ اسپتال جانا ہے۔"
حاجی نور محمد نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی۔
وہ خالی خالی نظروں سے اب تک فرش پہ گرے خون کو دیکھ رہا تھا۔ ساجدہ اب وہاں نہیں تھی مگر اس کی خون میں لت پت چپل ابھی وہیں پڑی تھی۔
"جلدی کرو شاباش۔۔۔ ورنہ دیر ہو جائے گی۔ خون بہت بہہ رہا ہے حالت ٹھیک نہیں بی بی کی۔"
"دیر تو ہو گئی حاجی صاحب!"
بہت وقت کے بعد وہ اتنا کہنے کے قابل ہوا۔ اس کی ویران آنکھوں میں امید کی ذرا سی بھی رمق نہیں تھی۔۔۔ وہ خود کو کسی خوش فہمی میں بھی نہیں رکھنا چاہتا تھا۔

"وہ نہیں بچے گی۔" آنسوؤں سے بھری آواز کے ساتھ وہ سر ہلا کے کہہ رہا تھا۔ "میں جانتا ہوں۔۔۔ وہ نہیں۔۔۔"
اس سے آگے الفاظ ہمت ہار گئے۔
"استغفراللہ۔" حاجی نور محمد نے سرزنش کی۔ "ایسی کفر بولتے ہو۔ اللہ کی ذات سے ناامیدی؟ اس کا کرم مانگو گڑگڑا کے اس کو مناؤ نا بجائے اس کے کہ اپنے طور پہ اپنے اندازے لگاتے رہو۔"
وہ زبردستی اسے کھینچتے ہوئے باہر تک لے گئے ورنہ وہ کسی بھی طرح وہاں سے اٹھنے پہ آمادہ نہ تھا۔ نجانے اس کی کون سی حس تھی جو اسے بار بار یہ اشارہ کر رہی تھی کہ وہ ساجدہ کو کھونے والا ہے۔
"سوہنا ڈارلنگ!"
"اونہوں، کتنی بار کہا ہے کہ مجھے ایسے مت پکارا کریں۔"
منزہ نے ناک چڑھا کے کہا۔ وہ اس وقت ڈریسنگ ٹیبل کے آگے بیٹھی اپنے لمبے گھنے بال سلجھا رہی تھی۔
"کیوں بھئی کیا برائی ہے سوہنا نام میں؟ منزہ کے بجائے مجھے تمہیں پیار سے سوہنا پکارنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"
مظہر نے بیڈ پر لیٹے لیٹے تکیے سے ذرا سا سر اٹھا کے کہا۔
"سوہنا نام میں برائی نہیں لیکن یہ جو آپ اس کے آگے ہر جملہ لگا دیتے ہیں وہ سخت زہر لگتا ہے۔"
"تو کیا کہوں 'جانِ من'۔۔۔ جانِ تمنا۔۔۔ سویٹ ہارٹ۔۔۔ کیا کہوں؟"
"سوہا کی ماں۔" منزہ نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔ "شادی کے تین سال بعد آپ مجھے اس نام سے پکارتے اچھے لگیں گے۔ سوہا کی ماں۔۔۔ ذرا بات سننا۔۔۔ کیوں کیسا ہے؟"
"ایکدم بکواس۔۔۔ بکواس۔۔۔ تم میرے لیے ڈارلنگ تھیں، ہو اور رہو گی۔ بھلے سوہا تو سوہا۔۔۔ ماہا، روحا اور نیہا تک کی ماں بن جاؤ۔"
مظہر نے اسے تکیہ کھینچ مارا تھا۔
"توبہ ہے۔ اماں جی نے سن لیا تو شامت آ جائے گی۔ چار چار لڑکیاں۔"
وہ بظاہر چیختے ہوئے کہہ رہی تھی مگر اس کی ہنسی میں کھنک کے بجائے جو تپش تھی وہ مظہر کو بھی بآسانی محسوس ہوئی۔
"کیا اماں جی نے اس دن کے بعد دوبارہ ایسی کوئی بات کی؟" اس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھا مگر منزہ ٹال گئی۔
"آپ نے تو قافیہ ملا کے نام تک سوچ لیے۔ ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے جناب کے۔"
"ارادے تو سو فیصد ہی ٹھیک ہیں۔ بیٹا ہو یا بیٹی دونوں اللہ کی رحمت ہیں اور مجھے جی جان سے قبول مگر ابھی نہیں۔ کم از کم مزید دو سال تک تو بالکل بھی نہیں۔"
"لیکن اماں جی۔۔۔ ان کی خواہش ہے مظہر!" منزہ نے دبے الفاظ میں کہنا چاہا۔ "انہوں نے تو سوہا کے تین چار ماہ کا ہوتے ہی کہنا شروع کر دیا تھا اور اب ماشاءاللہ وہ بھی دو سال کی ہونے والی ہے۔"
"اماں جی کی بات چھوڑو۔ تم یہ بتاؤ "اس بار سوہا کی برتھ ڈے کیسے منائی جائے۔ چھ دن ہی تو رہ گئے ہیں۔"
"گھر میں سب مل کے کیک کاٹ لیں گے اور کیا کرنا ہے۔"
اس نے رخ پھیرتے ہوئے دوبارہ آئینے کے سامنے توجہ کی اور بال آگے کی جانب لا کے ڈھیلی سی چوٹی کرنے لگی۔
"کیوں بھئی ہماری شہزادی کی سالگرہ ہے۔ ہم تو دھوم دھام سے منائیں گے۔ سارا گھر سجائیں گے۔ سارے شہر کو بلائیں گے۔"
"رہنے دیجیے پچھلے سال اپنے سارے شوق آپ نے پورے کیے تو تھے۔ اس بار سادگی سے ہی ہو جائے تو کتنا اچھا ہے۔"

"اس بار ایک سال بعد میں ہی سارے چاؤ پورے ہو گئے؟ میں ہر سال اپنی بیٹی کی برتھ ڈے اسی دھوم دھام سے مناؤں گی۔"

"چلیں، مظفر! سمجھا کریں۔ پچھلی بار بھی کہا تھا میں نے یہی باتیں تھیں۔ ماں جی کو کتنا برا لگا تھا۔ انہوں نے صاف صاف جتایا تھا کہ بیٹیوں کے ایسے چونچلے اٹھانا اس خاندان کی روایت نہیں۔ تب تو پہلی پہلی بار کی رعایت تھی۔ اب دوبارہ کریں گے تو زیادہ ناراض ہوں گی۔"

"مجھے ان کی ناراضی کی پروا نہیں۔ وہ وقتی غصہ ہوتا ہے۔"

"آپ کو نہیں لیکن مجھے ہے۔ میرے لیے ان کا غصہ وقتی نہیں ہوتا۔ مجھے سارا دن ان کے ساتھ گزارنا ہوتا ہے۔"

منزہ کی ہر ممکن کوشش ہوتی تھی کہ ساس کی جلی کٹی باتوں پہ پردہ ڈالے رکھے۔ مظفر اس کے بارے میں حد درجہ حساس تھا اور اسے گھر میں ہونے والی کسی بھی تلخی کے بارے میں بتانے کا مطلب تھا ایک نہ ختم ہونے والی محاذ آرائی شروع کرنا۔ منزہ کا دل اس شور شرابے اور گالم گلوچ سے بڑا گھبراتا تھا۔ وہ خود پہ ہونے والے کیچڑ بھی سہہ لیتی۔ نت نئے توہین آمیز خطاب بھی برداشت کر لیتی۔ حتیٰ کہ ایسے ایسے الزام بھی اپنے سر خوشی سے لے لیتی جو سراسر جاہلانہ ہوتے لیکن یہ اس کی برداشت سے باہر تھا کہ مظفر اس کی خاطر اپنی ماں سے تو تو میں میں کرے۔ اس کی بہن ماں کی حمایت میں میدان میں اترے اور منزہ کے خاندان کی پچھلی سات پشتیں کھنگالے۔ اس کی ساس سینہ کوبی کرتے ہوئے محلہ اکٹھا کر لے اور مظفر آخر کار واہیات گالم گلوچ پہ اتر آئے۔ بہرحال وہ اپنے خاندان کے کسی بھی فرد سے اس معاملے میں کم تو نہ تھا۔

یہی وجہ تھی وہ اپنے طور پہ اس کی نوبت آنے ہی نہ دیتی لیکن آج مظفر اپنی ضد پہ اڑا رہا تو اسے ڈھکے چھپے الفاظ میں کہنا ہی پڑا اور آخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ مظفر سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ گیا۔

"تم بھیگی بلی بنی کیوں سہتی رہتی ہو۔ منہ میں زبان نہیں ہے کیا؟"

اب اس سوال کا جواب وہ کیا دیتی۔ منہ میں زبان تو اس کے بھی تھی لیکن مظفر کے لیے یہ ماننا بہت مشکل تھا کہ اسے اس زبان کو سختی سے بند رکھنے کی کتنی کڑی تربیت دی گئی تھی۔ اس کے ہاں تو دو کے بدلے چار اور وہ بھی کراری سنانے کا رواج تھا۔ اس ریت کو نبھاتے ہوئے یہ تخصیص روا نہ رکھی جاتی کہ سامنے کوئی بڑا ہے یا چھوٹا۔ بس دل کی بھڑاس نکالنا ضروری ہے۔ تین سال ہو گئے تھے اسے اس گھر میں نباہ کرتے ہوئے لیکن اب تک وہ خود کو یہاں کے طور طریقوں میں ڈھال نہ سکی تھی۔ جنگل کا قانون چلتا تھا یہاں۔ جس کا جو جی چاہتا کرتا۔ بے مجال کسی کی جو روک سکے اور جو کوئی روک ٹوک کرنے کی جرات کرتا تو منہ کی کھاتا۔ مظفر ان لوگوں کی فکر کا تھا، اس لیے ساری کسر بے چاری منزہ کی ذات پہ نکالی جاتی۔

"اچھا اس بار میری بات مان لیں اور ویسے بھی خوشی منانے کا اس سے اچھا طریقہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ سارے اپنے ہماری اس خوشی میں دل سے شریک ہوں۔ کسی ایک کے دل میں بھی گلہ یا غبار ہو تو خوشی کے رنگ پھیکے لگنے لگتے ہیں۔"

"مجھے تو تمہارے سامنے ویسے بھی سارے رنگ پھیکے لگتے ہیں۔"

وہ ایک بار پھر پٹری سے اترا۔ منزہ کے لیے اس کی یہ دیوانگی تھی کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتی تھی اور یہی وجہ تھی گھر میں منزہ کے خلاف بڑھتی کدورت کی۔ بھلا جس خاندان میں بیوی کو جوتی کی نوک پہ رکھنے کی روایت ہو۔ وہاں ایک عام سی غریب سے گھر کی لڑکی کو سر پہ بٹھا لیا جائے یہ آسانی سے ہضم ہونے والی بات ہے؟

"اب چھوڑ دو آئینے کا خیال۔ میری آنکھوں میں دیکھو۔ خود کو سنوارنے کا مزا ہی آئے گا۔"

اسے کاجل لگاتے دیکھ کے اس نے کہا۔

"آپ کی آنکھوں میں دیکھنے بیٹھ گئی تو ہو گئی کام ہے۔" وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"شام کے چھ بج رہے ہیں۔ مجھے کچن کا کام بھی دیکھنا ہے۔ آٹھ بجے تک کھانا لگ جاتا ہے۔"

"آج باہر سے کھالیں گے۔"

مظفر نے قریب سے گزرتی منزہ کا ہاتھ پکڑ کے اسے اپنے برابر گرا لیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ سنبھل کے بیٹھ گئی۔ "ابھی چار دن پہلے باہر کھانا کھایا تھا۔ روز روز ہوٹلنگ کوئی اچھی عادت نہیں۔ ویسے بھی رات کا کھانا بنانا میری ڈیوٹی ہے۔ اگر مجھے باہر جانا بھی ہوا تو یہ ڈیوٹی ادا کر کے جاؤں گی۔ باقی گھر والوں کو تو کھانا کھانا ہے نا۔"

"تمہیں سب کی پروا ہے، سوائے میرے۔" مظفر نے روٹھے ہوئے انداز میں اپنا سر اس کے شانے سے ٹکا دیا۔

"آپ کی پروا ہے، بالکل ہے، اسی لیے باقی سب کی پروا بھی کرنی پڑتی ہے۔ اب اچھے بچوں کی طرح بستر کا پیچھا چھوڑیں۔ نہا کر وہ شلوار سوٹ پہن لیں جو باتھ روم میں ٹنگا ہے۔ آفس سے آتے ہی لیٹ جاتے ہیں گندے۔"

"کیا کروں وہاں جا کر؟ میں کیسے سات گھنٹے گزارتا ہوں تمہارے اور سویا کے بغیر۔ گھر آ کے اور کچھ کرنے کو جی ہی نہیں چاہتا، سوائے تم سے باتیں کرنے کے اور تم ہو کہ تمہیں میری شکل دیکھتے ہی سارے کام یاد آتے ہیں۔ کتنی بار کہا ہے تم دن کو کھانا بنا لیا کرو۔ رات کا ماں جی یا شمیم بنا لیا کریں گی۔"

"اچھا سوچوں گی۔" اس نے ایسے کہا جیسے یہ ڈیوٹی بدلنا اس کے اختیار میں ہو۔ نصرت اور شمیم نے ٹائمنگ خوب سوچ سمجھ کے سیٹ کی تھیں پھر وہ اسے بدلنے پہ کیوں آمادہ ہوتیں۔ ایک تو اس طرح ان کے لاڈلے مظفر کو بیوی کے چرنوں میں بیٹھنے کا موقع کم سے کم ملتا تھا، دوسرے ان کی بھی کام کی بچت تھی۔ زیادہ کام ہوتا ہی رات کو تھا۔ مظفر، اس کا بھائی اصغر اور ان کے ابا سب رات کے کھانے پر اکٹھے ہوتے تھے۔ لامحالہ کھانا زیادہ مقدار میں بھی پکتا اور اہتمام کے ساتھ بھی۔ دن کو تینوں مرد گھر میں نہیں ہوتے تھے۔ شمیم رات کا کوئی نہ کوئی بچا ہوا سالن گرم کر لیتی۔ کم ہوتا تو چٹنی یا رائتہ ساتھ بن جاتا۔ بازار سے چار پانچ روٹیاں آ جاتیں لیکن یہ سب باتیں وہ مظفر کو نہیں بتا سکتی تھی۔ اگر اس کے تھوڑے بہت کام سے گھر میں سکون قائم تھا تو یہی بہت تھا۔ مظفر تو لڑ جھگڑ کے بھول جاتا۔ اگلے دن معمول کے مطابق آفس چلا جاتا۔ پیچھے رہ جاتی وہ اور اس کی دو سالہ معصوم بچی سویا جن پہ شمیم اور نصرت عتاب کی طرح سارا دن برستی رہتیں۔

"ارے کیا سوچنے لگی ہو۔" مظفر نے چٹکی بجا کے اسے اپنی جانب متوجہ کیا۔

"یہی کہ آپ میرا کس قدر وقت ضائع کرتے ہیں۔ اب تک میں گوشت چڑھا کے چاول تک بھگو چکی ہوتی۔ بس باتوں میں لگا لیتے ہیں۔"

"باتوں میں نہ لگایا ہوتا تو یہاں تک لاتا کیسے؟"

اس نے شرارت سے آنکھ دبائی۔ منزہ جھینپ گئی۔

"خوش قسمتی تھی آپ کی جو میں آپ کی باتوں میں آ گئی۔"

"میں نے اس سے کب انکار کیا ہے۔" وہ مخمور نگاہوں سے اسے تک رہا تھا۔

منزہ کو اپنا آپ سخت بے بس محسوس ہوا۔ اب اس کا بھی اٹھنے کو جی نہ چاہ رہا تھا مگر ایک منٹ بھی مزید گزرتا تو باہر سے ماں جی کے پکارنے کی آواز اندر تک آ جاتی تھی۔

"کھانے کے بعد کچھ دیر سویا کو باہر گھما لائیں۔ قریب کے پارک میں ہی لے جائیں۔ سلائیڈ لے لے گی۔ آج موسم خاصا خوشگوار ہے۔" اس نے مظفر کو مصروف کرنا چاہا۔

"تمہیں کیسے پتا چلا کہ موسم خوشگوار ہے۔ تم بھی ساتھ چلو نا پھر شاید۔"

"اوفوہ۔" اس بار وہ سچ مچ زچ ہو گئی۔ "میں کیسے جا سکتی ہوں۔ اچھا کھانے کے بعد اکٹھے واک کے لیے

بنیں گے۔ ابھی تو سوہا کو نے جانا ہے۔"

وہ جلدی سے کوتی باہر نکلنے لگی مبادا وہ پھر نہ ہاتھ تھام لے۔

"بالوں کو کھول دیا کرو۔ کیسے کس کے باندھ لیے ہیں۔ تمہیں پتا ہے نا کتنے پسند ہیں مجھے تمہارے کھلے ہوئے بال۔"

اس نے پیچھے سے ایک اور فرمائش کر ڈالی۔

"ماں جی سے سخت جھاڑ پڑے گی اگر میں کچن میں کھلے بال لیے گھس گئی تو۔"

"ایک تو ماں جی تمہارے حواسوں پہ بری طرح سوار ہیں۔" اس نے جھنجھلا کر کہا اور حسن اتفاق اس وقت تک منزہ کمرے کا دروازہ کھول چکی تھی اور سامنے نصرت بی بی شاید دستک دے کر بلانے کی نیت سے ہی ہاتھ باندھے کھڑی تھیں۔

"یہ نہیں کرنا ماں جی ناراض ہوں گی۔ وہ نہیں کرنا ماں جی کو برا لگے گا۔ ارے یار! تم میری بیوی ہو یا [illegible] کی۔"

وہ اپنی ماں کی موجودگی سے بے خبر اپنی بھڑاس نکال رہا تھا۔

"دفع دور... تجھے مبارک یہ پھاپھا کٹنی... میں تیری جگہ ہوتی تو مر کے بھی ایسی گنوں کی پوری کو بیوی نہ بناتی۔ یہ تو تیری مت ماری گئی تھی۔ ادائیں دکھا دکھا کے الو بنا لیا تھا اس چلتر نے۔"

"ماں جی... وہ... مظہر تو مذاق..." منزہ نے گھبرا کے کہنا چاہا مگر وہ اسے ایک دھکے کے ساتھ پرے کرتی اندر گھس آئیں۔ وہ لڑکھڑا کے دروازے سے جا لگی۔

"کیوں... کیا کچھ مشہور کر رکھا ہے اس کٹنی نے میرے متعلق۔ کون سی بچی جھوٹی شکایتیں لگاتی ہے۔ میری تو زبان جل جائے جو سارا دن اس پھپھے منہ والی سے کلام بھی کیا ہو۔ اچھی طرح پتا ہے مجھے ان چار جماعتیں پڑھی لڑکیوں کا... مردوں کو انگلیوں پہ نچانا اچھی طرح جانتی ہیں۔ کالج میں جاتی کس لیے ہیں۔ یہی کرتوت سیکھنے اور لڑکے پھنسانے جیسے میرا بچہ پھنسا لیا۔"

"ماں! چپ ہو جاؤ۔ جس بات کا پتا نہیں اس کے بارے میں الٹا سیدھا بول کے کیوں اپنا اور میرا سر کھا رہی ہو۔"

مظہر بھی آپے سے باہر ہو گیا۔

"مجھے کچھ پتہ چلنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ کیا میری آنکھیں نہیں ہیں۔ سب نظر آتا ہے مجھے، کیسے اس کے ساتھ زیادتیاں ہوتی ہیں۔ وہ میری پسند سے اس گھر میں آئی ہے، اس بات کا بدلہ لیتی ہو تم اور شمیم۔ وہی تو فساد کی جڑ ہے، سارا دن لگائی بجھائی کر کے تمہارے کان بھرتی رہتی ہے۔"

"یہ کام تمہاری اس آوارہ بیوی کا ہے۔ میری شمیم کو کیا پڑی ہے۔ اس کے تو کام ہی نہیں ختم ہوتے۔ سارا دن گدھے کی طرح لگی رہتی ہے اس گھر کے کاموں میں۔ اسے کہاں فرصت ان حرکتوں کی۔"

"تو کیا میں نے کہا تھا اسے گھر کے کاموں میں جتا دو۔ بیاہ دیا ہوتا وقت پہ۔ اب بھی دیر نہیں ہوئی۔ ملباجی کتنے شوق سے مانگ رہے ہیں اپنے منظور کے لیے... ہاں کیوں نہیں کر دیتی ہو؟ کیا کرنا ہے اسے گھر بٹھا کے۔ بیس سال کا تو کر دیا ہے۔"

"ڈوب مر کیسے بہن کی عمر گنوا رہا ہے۔ اور دل نہیں کانپا منظور کے لیے ہاں کرنے کا کہتے ہوئے۔ وہ ہکلا بھی رہ گیا ہے۔ میری شمیم کے لیے۔ میری لڑکی مجھ پہ بھاری نہیں۔ ابھی اس کا باپ بھی زندہ ہے۔ اور ماں بھی۔ تیری اس چاند کو بیوی کی طرح یتیم نہیں ہوئی، بھائیوں کے آسرے پہ چھوڑ دی ہے جو آنکھ مٹکا کر کے اپنا بندوبست کرتی پھرے۔ جیسے اس بدچلن نے کیا تھا۔ بھائیوں کے چنگل سے نکلنے کے لیے۔"

"یا اللہ...!" منزہ نے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے اور ڈوبتے دل کے ساتھ وہیں دیوار کے ساتھ لگ کے بیٹھ گئی۔ مظہر اب دوبدو لڑ رہا تھا۔

یہ سب منزہ کے لیے اب نیا نہیں رہا تھا۔ تین سالوں سے دیکھتی آ رہی تھی لیکن ہر بار اسے نئے سرے سے تکلیف ہوتی تھی۔ خاص طور پہ مظہر کو یوں جاہلوں اور لڑاکا عورتوں کی طرح ماں اور بہن سے مقابلے بازی کرتے دیکھنا اس کی برداشت سے باہر ہوتا تھا۔

جان نچھاور کرنے والے، بے حد خیال رکھنے والے، پڑھے لکھے شوہر کا یہ روپ اسے اوپرا اوپرا لگتا۔ وہ ناگواری سے اسے دیکھتی تھی۔ لیکن اس وقت مظہر کو پروا ہی کہاں تھی۔ بعد میں نادم ہو کر وہ ہر بار منزہ سے وعدہ کرتا تھا کہ آئندہ بدکلامی نہیں کرے گا، لیکن لڑتے وقت اسے ہوش ہی کہاں رہتا تھا۔

منزہ نے گھڑی کی جانب دیکھا۔ سات بجنے والے تھے۔ اسے بہت سے کام تھے۔ ان لوگوں کی تو عادت تھی۔ لڑنے جھگڑنے کے بعد یوں نارمل ہو جاتے جیسے یہ بھی روز مرہ کے کاموں کا ایک حصہ ہو۔ ظاہر ہے سب کو کھانا وقت پہ چاہیے تھا اور وہ باہر جانے سے گھبرا رہی تھی۔ وجہ تھی شمیم۔ جو اسے ہرگز نہ بخشتی۔

اللہ اللہ کر کے نصرت بی بی کی بھڑاس نکلی۔ وہ اپنے نصیب کو کوستی منزہ کو بددعائیں دیتی کمرے سے نکلیں۔ منزہ نے ناراض نظروں سے مظہر کو دیکھا۔ وہ نظریں چراتا باہر نکل گیا۔

"میں ذرا سوہا کو گھما کے لاتا ہوں۔"

وہ اس خالی کمرے کو تکنے لگی۔ جہاں صرف ایک منٹ پہلے گھمسان کا رن پڑا تھا۔ اس وقت خالی کمرہ کتنا پرسکون لگ رہا تھا جیسے اس کے در و دیوار سوائے مظہر اور منزہ کی پیار بھری سرگوشیوں اور ننھی سوہا کی قلقاریوں کے اور کسی آواز سے آشنا ہی نہ ہوں۔

اس کے جہیز کے بیڈ پہ اس کے ماہر ہاتھوں سے کاڑھی صاف ستھری بیڈ شیٹ بچھی تھی۔ تکیے بے ترتیب تھے۔ ایک سائیڈ ٹیبل پہ لیمپ اور مظہر کا لائٹر اور سگریٹ کی ڈبیا رکھی تھی۔ دوسری پہ سوہا کی وہ تصویر جس میں وہ چند ماہ کی تھی۔

سامنے کی دیوار کے ساتھ دو کرسیاں اور ایک میز رکھی تھی۔ ان پہ بھی منزہ کے ہاتھ کے بنے کشن اور میٹ سجے تھے۔ بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ الماری تھی۔ اور دائیں جانب ڈریسنگ ٹیبل اور سوہا کا کاٹ رکھا تھا۔ ایک کونے میں ٹرالی پہ چودہ انچ کا کلر ٹی وی بھی تھا جسے دیکھنے کے لیے وہ رات کو پہیوں والی ٹرالی کھینچ کے بیڈ کے سامنے لے آتے کیونکہ اتنی چھوٹی اسکرین [illegible] دور سے کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔

بیڈ کے اوپر دیوار پہ دونوں کی شادی کی تصویر لگی تھی۔ دونوں کے چہرے خوشی سے جگمگا رہے تھے۔ آنکھوں میں کچھ خوابوں کو حقیقت کا روپ دینے کی فتح مندی اور سرشاری تھی اور کچھ نئے خوابوں کے رنگ بھی جھلملا رہے تھے۔ دونوں کی پسند کی شادی تھی۔ لو میرج۔ جو ہو تو گئی تھی مگر اتنی آسانی کے ساتھ بھی نہیں۔ زیادہ رکاوٹیں مظہر کے گھر والوں کی جانب سے تھیں۔ وہ کسی مال دار گھرانے کی لڑکی بہو بنانا چاہتے تھے۔ جو لمبا چوڑا جہیز لائے۔ حالانکہ خود وہ کوئی رئیس ابن رئیس نہ تھے۔ ہاں نیا نیا پیسہ ہاتھ لگا تھا۔ مظہر کے ابا کا کاروبار تو سالوں سے چل ہی رہا تھا۔ اچانک کچھ عرصے سے ابھرنا شروع ہو گیا۔

دوسری طرف حیرت انگیز طور پہ مظہر نے ایک بڑی ڈگری بھی لے لی ورنہ ان کے خاندان میں پڑھنے لکھنے کا خاص رجحان نہ تھا۔ اسے اچھی فرم میں معقول ملازمت کیا ملی نصرت اور اس کی بیٹی شمیم کے قدم گویا زمین پہ پڑنا بھول گئے۔ تو دولتیوں والے سارے رنگ ڈھنگ اپنا لیے گئے۔ کرائے کے مکان سے اٹھ کے ذاتی کوٹھی میں چلے آئے۔ گاڑی بھی خرید لی گئی۔ موٹر سائیکل بھی چھوٹے والے اصغر کو لے دی گئی۔ اوپر کے کاموں کے لیے ملازمہ بھی رکھ لی گئی اور گھر بھی تقریباً سب ہی اشیائے ضرورت و آسائش سے بھر دیا گیا۔ مگر اپنی خو نہ بدل سکے وہ لوگ۔

وہی گالم گلوچ اور ہاتھا پائی کا وہی عالم تھا۔ حتیٰ کہ اتنی اعلا تعلیم حاصل کرنے کے بعد مظہر بھی خود کو بدل نہ پایا تھا۔ گھر سے باہر وہ ایک مہذب سلجھا ہوا نوجوان تھا۔ مگر گھر کے اندر وہی بن جاتا جو گھر کے باقی مکین تھے۔

اس نے سرگوشی کی۔ دوبارہ اماں نے اپنی آواز کو دھیمے رکھنے کا کوئی تکلف نہ کیا۔

"وہاں کیا کروں آ کے بیٹھ جاؤں۔ ایک تو تو ہر جگہ نوٹ فاقتہ ساتھ لیے پھرتی ہے۔"

اس بات پر افسوس سے تلاوت کرتی شوکت جہاں کو بلی کر گیا۔

"اب تو تیری ساس مت کے لیے چھوڑ کیا کہیں نہیں جاتی۔ بلا کی طرح ساتھ چمٹی رہتی ہے۔ بھلا اس کو ساتھ لانے کی کیا ضرورت تھی؟ اس کے بغیر ادھر کے کون سے کام رک جانے تھے۔"

"مذاق کرتی ہو! اپنا بیاہ داری اور تعلق داری اپنی اپنی جگہ ہوتی ہے۔ جو میری ساس کو ہنوز اچھی طرح آتا ہے۔ اور میں جانتی ہوں وہ کسی وجہ سے نہ آئیں تب بھی تمہیں تو سب سے پہلے اعتراض ہوتا۔ ایک تو وہ سارے محبت اور خلوص کے ساتھ چلی آئیں۔ اس پہ بھی باتیں بنا رہی ہو۔"

"تیری زبان نہیں تھکتی ساس کے گن گاتے ہوئے۔ سارے زمانے سے وکھری لڑکی پیدا کی ہے میں نے۔ اوروں کی لڑکیاں میکے آ کے ٹسوے بہاتی ہیں دکھ کہتی ہیں۔ اپنی ساس کے رونے روتی ہیں۔ ایک یہ شہزادی ہے ساس کے پیچھے ماں سے لڑنے بیٹھ جاتی ہے۔"

"میں لڑ نہیں رہی، صرف اتنا کہہ رہی ہوں امی طرح راستے کے درمیان کھڑے ہو کر جھگڑا لگا کر نہیں لگانا اس موقع پہ اچھا نہیں لگ رہا۔ بے چاری ساجدہ کی کیا حالت ہے۔ اس بارے میں تو سوچو۔ میری ساس کے پاس نہیں بیٹھنا تو بے شک مت بیٹھو۔ جا کر بھائی جان نوید کو ہی تسلی دو۔ دیکھو کیسے رنگ اڑا ہوا ہے ان کا۔"

اس نے صرف آواز دبا کے کہنے پہ ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ ماں کو بازو سے تھام کر بھائی کے نزدیک لے بھی آئی۔

"میرا لعل۔۔۔ میرا بچہ۔۔۔ تجھے خوشیاں راس نہ آئیں۔"

اس نے نوید کا سر سینے سے لگا کر واویلا مچانا شروع کر دیا۔ تلاوت میں مشغول شوکت جہاں نے ذرا کی ذرا آنکھ اٹھا کے ایک ناپسندیدہ نگاہ اس جانب ڈالی اور پھر تاسف سے سر ہلا کے دوبارہ تلاوت کرنے لگیں۔

"ہائے ہائے ابھی تیرا گھر بسے وقت ہی کتنا ہوا تھا۔ حاسدوں سے برداشت نہ ہوا۔"

اس کی تان آ جا کے یہیں ٹوٹ جاتی۔

"بے چارہ میرا بیٹا کیسے برداشت کرے گا۔ اتنا سا تھا جب باپ کا سایہ اٹھا" گڈیاں اڑانے" کنچے کھیلنے کی عمر میں کام دھندا کرنے لگا۔ لڑکا سا تھا جب بہن کو شان سے بیاہا گھر بنایا۔ ساری ذمہ داریاں پوری کر کے جب اپنی گرہستی بسانے کا وقت آیا تو ہائے ہائے۔۔۔ قسمت دغا دے گئی۔"

پروین کا دل چاہا ایک جھٹکے سے ماں کو بھائی سے الگ کر دے۔ یا اس کے منہ پہ ہاتھ ہی رکھ دے۔

"توبہ دیکھے ہیں ڈرامے اس شمشاد کے۔" اس کی پکی سہیلی، نزدیکی ہمسائی رسولن نے ثریا کے کان میں پھونکا۔

"نری نحوست پھیلا رکھی ہے۔ کیسی کیسی باتیں کر رہی ہے۔ یہ نہیں کہ بیٹے کو تسلی دے۔ الٹا کچھ ہونے سے پہلے ہی اسے ڈرا رہی ہے۔ مجھے تو لگتا ہے جن تعویذ گنڈوں کا رونا یہ رو رہی ہے یہ نہ ہو اسی نے ساجدہ پہ ڈالے ہوں گے۔ ورنہ سوچنے والی بات ہے۔ شریک شمشاد کے اور وار اس کی بہو پہ کریں گے؟ ان کا بس چلتا تو شمشاد کی ہی نہ بچی مروڑتے، پر یہ ساری حیاتی بھلا کس کے قابو آئی ہے۔"

"ٹھیک کہتی ہے تو رسولن! بڑی ہی بھلی بچی ہے یہ ساجدہ۔ کبھی اس کی اونچی آواز نہیں سنی مگر اس سے بھی شمشاد کو سو شکایتیں تھیں۔ سب سے بڑی خار تو یہ تھی کہ نوید زنانی کا مرید بن گیا تھا۔ اسے بڑی تکلیف تھی کہ نوید آخر پورے سال میں ایک دفعہ بھی زنانی سے لڑا کیوں نہیں۔ اس کی گت کیوں نہیں بنائی۔ میں نے تو سنا بھی کہ اب کیوں روتی ہے۔ اتنی ہلکی عمری اور اتنی سوہنی، دو جی لانے کی ضرورت کیا تھی۔ اب بھگت۔ پر وہ شمشاد ہی کیا جو بھگت لے۔ وہ تو بھگتانے والوں میں سے ہے۔ جس بڑے پیر سرکار کا نام لے رہی ہے اسی کے تعویذ اس نے ساجدہ کا پتا صاف کرانے کے لیے خود اپنی کیاری میں دبائے ہوں گے۔"

[illegible] اپنے ماہرانہ تجربے بیان کر رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"مونا ڈارلنگ!"

منزہ کے کانوں کے قریب سرگوشی ابھری تو اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ آٹا گوندھ رہی تھی۔ آٹے میں ہاتھ لگا کر اس نے آٹے کو پیڑے سے ڈھانپا اور دو قدم آگے بڑھ کے سنک میں ہاتھ دھونے لگی۔ مظہر بھی اس کے پیچھے سائے کی طرح چلتا آگے بڑھ آیا۔

"مونا ڈارلنگ۔۔۔ سویٹ ہارٹ۔۔۔ ہنی بن۔" وہ مسلسل اس کے کانوں میں سرگوشیاں کر رہا تھا۔

منزہ نے بمشکل اپنی مسکراہٹ دبائی اور پیچھے مڑ کے اسے مصنوعی ناراضی سے دیکھنے لگی۔

"پھر وہی حرکت؟ آپ باز نہیں آئیں گے۔"

"پھر اتنی خوبصورت؟ تم باز نہیں آؤ گی۔"

"اف! کتنا مشکل ہے آپ کو سمجھانا۔"

"اف! کتنا مشکل ہے تم پہ سے نظر ہٹانا۔"

"اب آپ یہاں سے جائیں گے یا نہیں؟"

"اب تم میرے پاس آؤ گی یا نہیں؟"

"شام کے سات بجنے والے ہیں۔ مجھے کھانا تیار کرنا ہے۔ روٹیاں پکانی ہیں۔ امی کے لیے سویاں بنانی ہیں۔ انہوں نے کھانا کھانے سے منع کیا ہے۔ ابھی میں کیسے آ سکتی ہوں۔"

"شام کے سات بجنے والے ہیں۔ مجھے تمہیں حال دل بتانا ہے۔ کچھ تمہارے دل کا سننا ہے۔ تمہیں یہ بتانا ہے کہ اس گلابی سوٹ میں تم کس قدر خوبصورت لگ رہی ہو۔ ابھی میں اکیلا کیسے رہ سکتا ہوں؟"

وہ مسلسل اسے مسکراتی نظروں سے دیکھتا اسی کی باتیں اس پہ لوٹا رہا تھا اور وہ زچ ہو رہی تھی۔

"دو سال سے زیادہ ہو گئے ہیں یہ بات سمجھاتے ہوئے مگر مجال ہے جو آپ سمجھ جائیں۔"

تنگ آ کر اس نے اپنا منہ پھیر لیا اور سارا غصہ سبزی پہ نکالنے لگی۔ اسے بے دردی سے چھلکے کاٹتے ہوئے وہ بڑبڑا رہی تھی۔ مظہر سے لاکھ محبت رکھنے اور اس کی محبت پہ نازاں رہنے کے باوجود کبھی کبھار وہ اس کی دیوانگی بالفاظ دیگر ڈھٹائی سے عاجز آ جایا کرتی تھی۔

"کتنی بار کہا ہے کہ امی کو پسند نہیں آپ کا یوں سارے گھر میں میرے پیچھے پیچھے منڈلانا۔ وہ بغیر کسی لحاظ کے سب کے سامنے ہی شروع ہو جاتی ہیں۔ بے شرمی اور بے حیائی کا طعنہ سنتے ہوئے اس قدر شرم محسوس ہوتی ہے مگر آپ باز نہیں آتے۔ حالانکہ آپ کو اپنے گھر کا ماحول مجھ سے بہتر سمجھنا چاہیے۔"

وہ ساس کی شکایتیں کرنے میں حد درجہ محتاط رہا کرتی تھی مگر کبھی کبھار مظہر اسے برداشت کی حد تک توڑنے پہ مجبور کر دیتا تھا۔ اسے صورت حال کی سنگینی کا احساس کم ہوتا تھا۔ یوں بھی وہ صبح نو بجے گھر سے نکلتا تو شام چھ ساڑھے چھ بجے لوٹتا۔ جو بھگتنا ہوتا بے چاری منزہ کو ہی بھگتنا پڑتا۔ اگر وہ اس کی مکمل تفصیل بھی اسے بتا دیتی تب اسے احساس ہوتا۔ مگر اس احساس کے نتائج خاصے خوفناک نکلتے۔

وہ اپنی حرکتیں تو کیا چھوڑتا اور کیا خاک احتیاط کرتا۔ البتہ اسٹینلیس پلیٹ کے اماں اور بہن پہ ضرور چڑھ دوڑتا۔ اس کی چہیتی بیوی کی آنکھ میں آنسو آنے کے جرم میں اور ان سب سے اس کا بڑا ہی گہرا ناتا تھا۔ یوں تو دیکھنے میں وہ تین یار بھائی بھائی ہیں، باپ بیٹے ہیں، ماں بیٹے ہیں، میاں بیوی ہیں، بہن بھائی ہیں۔ تو تو میں میں ہوا ہی جایا کرتی تھی۔ چھوٹی موٹی لڑائیاں جو بچپن میں لڑتے تھے سارے خاندان کو خبط تھا مگر کسی تنازعے کی وجہ وہ بنے یہ اسے منظور نہ تھا۔ وہ جانتی تھی جب بھی اس کی لاکھ احتیاط کے باوجود ایسا ہو جاتا ہے تو اس کی ذات کس کس طرح گھسیٹی جاتی ہے۔ اس کے

[illegible] تو وہاں تھا۔

"تمہیں سارے زمانے کی پروا ہوتی ہے سوائے میرے۔ فلاں کو برا نہ لگ جائے، فلانہ ناراض نہ ہو جائے۔ کبھی میرے بارے میں سوچ کر ڈر نہیں لگا کہ کہیں تمہاری اس حرکت پر میں ناراض نہ ہو جاؤں۔ میں یعنی کہ تمہارا مجازی خدا، تمہارا سرتاج۔"

"نہیں، کیونکہ میں جانتی ہوں، آپ مجھ سے خفا ہو ہی نہیں سکتے۔"

اس کے لہجے میں عجب سی بے اختیار مسکراہٹ تھی اور اس کی آنکھوں میں مان ہی مان بھرا تھا۔ مظہر کی محبت کا مان۔

"اور اگر ہو گیا تو...؟ سوچ لو۔"

"میں نے کہا ناں، ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" اس نے چولہا جلایا اور دیگچی اوپر چڑھا دی۔

"ہو بھی سکتا ہے۔ اس دنیا میں کچھ بھی ناممکن نہیں۔"

"آپ مجھے دھمکا رہے ہیں۔"

"نہیں، ذہنی طور پر تیار کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کبھی میں تم سے اتنا ناراض ہو جاؤں کہ تمہارے ہزار منانے کے باوجود نہ مانوں، عمر بھر کے لیے تم سے منہ پھیر لوں۔"

پتہ نہیں وہ واقعی اپنی خفگی کی دھمکیاں دے رہا تھا یا پھر اسے ستانے کی کوشش کر رہا تھا، جو بھی تھا۔ منزہ کو ایک دم اپنا دل ڈوبتے ہوئے محسوس ہوا۔ وہ تڑپ کے پلٹی۔ ہاتھ میں پکڑا کفگیر دیگچی سے ٹکرایا اور وہ دیگچی جس میں اس نے گرم تیل میں پیاز سرخ ہونے کے لیے چھوڑ رکھی تھی، الٹ کے اس کے دائیں بازو پہ گری۔ شکر ہے کہ تیل اتنا گرم نہیں تھا کہ اس کے بازو کی نازک جلد جھلس کر رہ جاتی، پھر بھی مظہر نے جلدی سے اس کا ہاتھ تھام کے بازو ٹھنڈے پانی کے نل کے نیچے رکھا۔ وہاں ایک گہرا سرخ دھبہ نظر آ رہا تھا۔ اور منزہ کی نگاہوں میں بے پناہ درد۔

"دھیان سے کام کیا کرو یار! دیکھو جلا لیا ناں خود کو۔ بہت درد ہو رہا ہے۔"

مظہر اس کی نگاہوں سے چھلکتے گہرے درد کی حقیقت سے واقف تھا، اس کے باوجود دانستہ انجان بن کے پوچھا

"ہاں۔ بہت درد ہو رہا ہے مگر آپ کو کیا؟ درد دینے سے پہلے سوچنا تھا۔ شرم تو نہیں آتی ایسی باتیں کرتے ہوئے۔"

بہت ضبط کرتے ہوئے بھی اس کے آنسو چہرے پہ پھیل گئے۔

"یار! تم چاہتی کیا ہو؟ کیا میں ہر وقت شرماتا رہوں؟ جب دیکھو مجھے شرم نہ آنے کے طعنے دیتی رہتی ہو۔ تم سے پیار جتاتے ہوئے شرم کروں۔ اپنی وفا کا یقین دلاتا ہوں تو شرم کروں۔ تمہاری تعریف کرتا ہوں تو شرم کروں۔ آخر کتنی شرم کروں۔ میں شرمیلا بیگم بن جاؤں یا پھر لاج ونتی؟"

وہ اس کی توجہ اپنے الفاظ سے ہٹانے کے لیے ادھر ادھر کی ہانکنے لگا۔ اس کا نتیجہ حسب خواہش نکلا۔ باوجود اس سے ناراض ہونے کے وہ ہنس پڑی۔

"یہ ہوئی ناں بات۔ اب لگ رہی ہو میری موٹی ڈارلنگ! اس پیارے سے چہرے پہ شبنم کے قطرے بھلے لگتے ہیں جان، آنسو نہیں۔ اور خبردار جو کبھی میرے سامنے، میرے ہوتے ہوئے، میری زندگی میں کبھی تم نے آنسو بہائے تو... سمجھیں...؟"

وہ اس کے آنسو صاف کر رہا تھا جب شمیم نے اپنی اچانک قسم کی انٹری دی۔ ویسے وہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار بھی کچن میں نہیں جھانکتی تھی مگر اپنی بے چین فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر جب مظہر بیوی کے پیچھے پیچھے

یہاں تک چلا آیا تو اب اس کا جھانکنا ضروری ہو گیا تھا۔

"وہ... اے منزہ تو جب دیکھو چولہے چوکے سے چپکی رہتی ہے۔" اس نے سلطانہ کے پیچھے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا، جیسے کوئی بہت بڑی بات... مظہر کچھ کہتا، منزہ گھبرا کے پیچھے ہٹی۔ مظہر نے کچن پر امانت کے اس ٹکڑے کو جواب دیا۔

"امی! آدمی آکے دیکھ لو، کتنا دھواں ہے اور کتنا نہیں۔ میں تو نہیں جا سکتی اندر۔"

اس نے کچن کے دروازے پہ کھڑے کھڑے ماں کو آواز دی۔

"کیوں، اندر کرفیو لگا ہوا ہے جو تیرے جانے پہ پابندی ہے؟ کون پیدا ہوا ہے جو مجھ پہ پابندیاں لگانے والا۔ وقت بے وقت ہانڈی پکانے سے کوئی باورچی خانے کا نک نہیں بن جاتا۔"

نصرت حسب عادت اپنی مرضی کے مطلب نکالتے ہوئے زور زور سے بولتی اس طرف آئی۔ منزہ کو اچانک اپنی کلائی پہ جلن کا احساس شدت سے ہونے لگا۔ ملتجیانہ نظروں سے اس نے مظہر کو دیکھتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں یہاں سے جانے کی التجا کی جسے وہ نظر انداز کر گیا۔ اچھی طرح جانتا تھا، اس وقت یہاں سے کھسک لینے کا مطلب ہے۔ منزہ کو اپنی ماں اور بہن کے نرغے میں تنہا چھوڑ دینا۔

"کیا بات ہے؟ کس نے منع کیا ہے اندر جانے سے؟" نصرت نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔

"زبان سے تو منع نہیں کیا لیکن جس بے حیائی کے ساتھ یہ دونوں ہر وقت اور ہر جگہ رومانس لڑاتے پھرتے ہیں۔ اس کے بعد مجھ جیسی شریف لڑکی تو کمرے میں بند ہو کے ہی گزارا کر سکتی ہے۔ توبہ، نہ کوئی لحاظ، نہ شرم، نہ خوف خدا۔ گھر میں چھوٹے بڑے سب موجود ہیں اور یہ ہیں تو جب دیکھو طوطا مینا بنے رہتے ہیں۔ کسی شریف خدا ترس کی ہوتی تو اتنا سوچتی کہ گھر میں بوڑھا سسر، جوان دیور اور کنواری نند موجود ہے۔ کوئی بھی کسی وقت اندر آ سکتا ہے۔ کیا عزت رہ جائے گی میری ان سب کی نظروں میں؟ مگر اسے عزت کا احساس ہوتا تو رونا کس بات کا تھا۔"

"عزت کا احساس کرنے والی ہوتی تو آنکھ مٹکا کر کے لڑکے کیسے پھنساتی۔" نصرت نے نفرت سے اسے دیکھا۔

"بس...!" مظہر نے دخل دیا۔ "بہت ہو گیا۔ شمیم کو عادت ہے بات بڑھا چڑھا کے بیان کرنے کی۔ اور آپ ہمیشہ اس کی سائیڈ لیتی ہیں۔ پہلے جان تو لیں کہ اصل بات کیا ہے۔ بغیر کسی وجہ کے شور مچا دیا ہے۔"

"اس بدذات چھوٹے گھر کی لڑکی سے کیا گلہ، جب میرا اپنا بیٹا ہی بے دید ہو چکا ہے۔ اس بے شرم کی صحبت میں اس کے دیدے بھی ڈھل گئے ہیں۔ کیسے ماں کو لال لال ڈیلے نکال کے گھور رہا ہے۔"

"اور ابھی جب بیوی کو دیکھ رہا تھا تب پوچھتی، دیکھنے والے تھے۔ تک رہا تھا جیسے کھڑے کھڑے قربان ہو رہا ہو اس حسن بانو پہ۔ واری صدقے جا رہا تھا۔" شمیم حسد سے چور لہجے میں بولی۔

"مظہر ذرا دیکھئے، [illegible] کمرے میں آ گئی ہے۔"

منزہ نے اسے یہاں سے بھیجنا چاہا تاکہ بات آگے نہ بڑھے مگر اس کا بھی الٹا مطلب نکالا گیا۔

"اس بچی کو [illegible] لگا دو اس جوان مرد کو یہ پھر اپنے چونچلے اٹھوانے میں مصروف رکھو۔ کیسی جادوگرنی ہے، تم نے میرے اتنے کماؤ بیٹے کو گھر جمائی بنا کے رکھ دیا ہے۔ یا تو تمہارے ناز نخرے اٹھاتا رہتا ہے یا اس موئی کو [illegible] ہے۔ جسے تو نے تین سالوں میں پیدا کر کے بڑا معرکہ انجام دیا ہے اور [illegible] خدا ہی خیر کرے۔ ان کے اولادیں ہوتی ہیں، اسی لیے ان کے دماغ نہیں اٹھتے۔ بس ایک یہ ہی [illegible] جسے ترس ترس کے عورت ملی ہے اور وہ سوکھی سڑی، کمی کمین دو ٹکوں کی، جو متھا چاٹتا رہتا ہے۔"

نصرت کی زبان برداشت سے باہر ہو گئی تو مظہر نے بھی لحاظ کا دامن چھوڑ دیا۔

"شرم کریں آپ۔ آپ کو اپنی عمر کا لحاظ نہیں رہا۔ چلو منزہ تو غیر ہے۔ بہو ہے اس لیے نظروں میں کھٹکتی ہے۔ اب اپنی ہی پوتی کو بھی برا بھلا کہنا شروع کر دیا ہے۔ میں اپنی اولاد کے خلاف ایک لفظ نہیں سن سکتا۔"

"ہائے ہائے بڑی اولاد پیدا کی ہے۔ تیری اس مہارانی نے بچوں کے ڈھیر نہیں لگا رکھے جو منہ بھر بھر کے اولاد

کہہ رہا ہے۔ تین سالوں میں ہاتھ بھر کی چھوکری پیدا کی ہے۔ وہ بھی غلطی سے ہو گئی ہو گی ورنہ ایسی عورتوں کو گھر بنانے یا خاندان بڑھانے سے کیا مطلب۔ یہ تو عیش کرنے دنیا میں آئی ہیں۔ ایک مرد چاہیے ہوتا ہے انہیں ہر وقت موج مزے کے لیے۔"

نصرت کے طعنوں کا رخ آج کل ہمیشہ اسی جانب مڑ جاتا تھا کہ تین سال کے عرصے میں وہ کوئی بیٹا کیوں نہیں پیدا کر سکی۔

"حد ہوتی ہے بدزبانی کی بھی۔"

"ماں کو بدزبان کہہ رہا ہے۔ بے غیرت۔"

"عشق میں اندھا ہو چکا ہے امی۔ اسے اب غیرت سے کیا مطلب؟" شمیم نے بڑھاوا دیا۔

"تم اپنی بکواس بند کرو۔ یہ تم ہو آگ لگانے والی۔ ایسا کون سا غضب ہو گیا تھا جو امی کو [illegible] بڑا لیا۔ فسادن۔"

وہ بہن کو جاہل عورتوں کی طرح ہاتھ ہلا ہلا کر طعنے دینے لگا۔ منزہ کو اس پل منظر سے گھن محسوس ہوئی۔ اس نے اپنا رخ تبدیل کر لیا اور اس سارے جھگڑے سے لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتے ہوئے دوبارہ سے پیاز کاٹ کر ہنڈیا چڑھانے لگی۔

"میں فسادن ہوں؟ آگ لگاتی ہوں؟ آگ تو تمہاری اس معشوقہ کو لگی ہوئی ہے۔ دکھاوا کر رہا ہے کیا کیا غضب ہو گیا ہے۔ اس کے لیے تو یہ کوئی بات ہی نہیں اور مجھ سے پوچھو کیسے پیروں تلے زمین کھسک گئی تھی۔ انہیں اس حالت میں دیکھ کر۔"

منزہ کو اپنا آپ پستی کی گہرائیوں میں گرتا محسوس ہوا۔ اس نے اس سختی سے لب دانتوں تلے دبائے کہ وہاں سے خون رسنے لگا۔

"اور کیا میری معصوم حیادار بچی۔۔۔۔ تم لوگوں کو یہ عاشقی معشوقی والے کھیل کھیلنے ہوتے ہیں تو اپنے کمرے میں جا کے کھیلا کرو اپنی بچی کے سامنے۔ اس کو برباد کرو۔ میری بچی کا دماغ کیوں خراب کرتے ہو منظر تجھے اتنا خیال نہیں آتا کہ کنواری جوان بہن کے سامنے توبہ توبہ۔۔۔ اس شرموں والی کا کیا حال ہوا ہو گا۔"

منزہ کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر ماں اور بھائی کو اس "شرموں والی" کنواری کے کرتوت بتائے۔ سارا دن بند کمرے میں وہ سی ڈی پلیئر پہ کیا کچھ دیکھتی ہے۔ لیٹ نائٹ پیکجز میں ٹیلی فون پہ کون سی دوستیاں نبھاتی ہے۔ سب کچھ بتائے مگر وہ ایسا کر سکتی تھی نہ کرنے کی ہمت پائی تھی۔

"بات کا بتنگڑ بنانا کوئی اس شمیم سے سیکھے۔ یہی کرتوت تو اس کا گھر نہیں بسنے دے رہے۔ پتہ نہیں کب جان چھوٹے گی اس بلا سے۔"

منظر اسے خونخوار نظروں سے گھورتا کچن سے نکل گیا اور وہ سینے پہ دو ہتڑ مارتی اونچی آواز میں روتے ہوئے ماں سے لپٹ گئی۔

"دیکھا امی۔۔۔! کیا کچھ کہا منظر نے۔ یہ میرا چھوٹا بھائی ہے۔ جسے میں نے گود میں کھلایا ہے لاڈ اٹھائے ہیں۔"

جذبات میں بہہ کر نامناسب کہہ گئی ورنہ اول تو وہ کسی کے سامنے آسانی سے تسلیم نہ کرتی تھی کہ وہ منظر سے عمر میں بڑی ہے اور جو لوگ جانتے تھے انہیں بڑے آرام سے جھٹلا دیا کرتی کہ کوئی خاص فرق نہیں اوپر تلے کے ہیں ہم دونوں۔"

"آج یہ مجھے طعنے دے رہا ہے۔ گھر نہ بسنے کی بددعائیں دے رہا ہے۔ مجھ سے چھٹکارا پانا چاہتا ہے۔"

"تو کیوں دل پہ لیتی ہے وہ تو اندھا ہو چکا ہے اس۔۔۔ کے عشق میں۔" نصرت نے بلا تکلف موٹی سی گالی دی۔

منزہ سلیب پہ گرا تیل صابن لگے کپڑے سے صاف کرتی رہی۔ اس نے بے حسی کا فن نیا نیا سیکھا تھا اور آج کل وہ اسی کی کڑی پریکٹس کرتی رہتی تھی۔

"بہن کو شادی شدہ ہونے کا طعنہ تو دے دیا بے غیرت نے مگر یہ نہ سوچا کہ یہ اس کی شرافت ہے اگر وہ بھی تیری بیوی کی طرح [illegible] کالجوں میں پڑھنے کے بہانے [illegible] کر کے دل پشوری کر لیتی تو آج چہرے سے کچھ اس کا پتا لگ رہا ہوتا۔ مگر میں نے اپنی بچی کو یہ تربیت نہیں دی۔ اپنی شریف بن بیٹی گھر بیٹھی ہے۔ یہ سب تو ایسی ہوتی ہیں جنہوں نے زمانے میں گھر گھر چکر رکھی ہوئی ہے! اپنے کرتوتوں سے اور جن کے گھر والے بدنامی کے خوف سے انہیں چار کپڑوں میں رخصت کروا دیتے ہیں۔"

ایک ہی سانس میں اس نے منزہ کو کالج میں پڑھنے، منظر سے پسند کی شادی کرنے اور جہیز نہ لانے کے طعنے دے ڈالے اور پھر بیٹی پچھلی ہو کر شمیم کے ساتھ کچن سے نکل گئی۔ منزہ نے ایک گہری سانس بھر کے خود کو پرسکون کرنا چاہا۔ مگر ناکام رہی۔ ایک پھانس سی سینے میں اٹک رہی تھی۔ اس نے پورا دھیان لگا کے کھانا پکانا شروع کر دیا۔ عموماً وہ کھانا پکانے کے دوران تین چار بار کمرے کے چکر لگایا کرتی تھی کہ ایسا کرنے کی منظر کی خاص تاکید ہوتی تھی۔ لیکن آج اس نے پوری طرح کچن میں مصروف رہنے کی کوشش کی۔ یہ ایک طرح سے منظر سے اظہار ناراضی تھا۔ وہ کتنی بار اس سے کہہ چکی تھی کہ اسے نند کی تنقید اور ساس کے طعنے اتنے برے نہیں لگتے جتنا منظر کا اس کی خاطر ان لوگوں سے جھگڑا کرنا اس کا دل دکھانے کا باعث بنتا ہے اور وہ ہر بار ایسا نہ کرنے کا وعدہ کرنے کے بعد پھر بھی کچھ کر گزرتا تھا۔

مصروف رہنے کے لیے اس نے نصرت کے لیے سویاں بنانے کے بعد میٹھے میں کسٹرڈ بھی بنا ڈالا۔ سلاد بھی دیر تک محنت سے سجائی اور دو طرح کی چٹنی تیار کی۔

پورے سوا آٹھ بجے وہ تھک کے چور پسینے میں شرابور کچن سے نکلی۔ کمرے کا دروازہ کھلتے ہی تیز پرفیوم کی مہک نے اس کا استقبال کیا۔ بیڈ پہ سوہا بے بی وائٹ اور پنک فراک میں ملبوس ہم رنگ جرابیں اور سفید شوز پہنے گالوں پہ کلپ لگا کے پونی ٹیلز بنائے بیٹھی تھی۔ یقیناً اسے منظر نے تیار کیا تھا۔ منزہ نے اس کی تلاش میں نظر دوڑائی۔ وہ بھی ٹپ ٹاپ سے درست آئرن اسٹینڈ کے نزدیک کھڑا تھا۔ آفس سے آنے کے بعد وہ عموماً آرام دہ شلوار قمیص پہن لیا کرتا تھا۔ علاوہ اس دن کے جب ان کا آؤٹنگ کا پروگرام ہوتا۔ اس وقت وہ تازہ تازہ شیو کے ساتھ کریم پینٹ اور کریم لائننگ والی وائٹ شرٹ میں تیار کھڑا اس کا سوٹ پریس کر رہا تھا۔

"اسپیشل کون سا پروگرام ہے؟"

"ہم ڈنر کے لیے باہر جا رہے ہیں۔"

"شوق سے جائیے۔" وہ بھنا کے بیڈ پہ گر گئی اور تکیہ درست کر کے لیٹنے کی تیاری کی۔

"شوق سے ہی جا رہے ہیں۔" وہ آگے بڑھ کے اسے اٹھانے لگا۔

"جلدی کرو۔ تمہارا بلیک اور کریم سوٹ نکال کر پریس کر دیا ہے۔ کیا ہے یار۔۔۔ اتنا ڈھنگ کا کوئی وائٹ اور کریم سوٹ ہی نہیں ملا تمہارا ورنہ دونوں میچنگ ڈریسز پہنتے۔ چلو جلدی اب۔ بارہ بج رہے ہیں تمہاری شکل پہ، صرف منہ ہاتھ دھونے سے کام نہیں بنے گا۔ شاور لے لو۔ فریش ہو جاؤ گی۔"

اس کے قطعی انداز سے لگ رہا تھا کہ اس کے سامنے منزہ کا کوئی بہانا نہیں چلے گا۔ اس لیے نہ چاہتے ہوئے وہ اٹھ کے بیٹھ گئی البتہ چہرے سے موڈ کی خرابی اب تک ظاہر ہو رہی تھی۔

"ڈنر کا موڈ تھا تو کم از کم مجھے بتا تو دیتے۔ میں اتنا اہتمام نہ کرتی۔ جو امی نے کہا تھا بس اتنا کرتی۔"

"ہاں سوچا تھا مگر۔۔۔" وہ کان کھجانے لگا۔ "تم سے ڈر لگتا ہے یار۔"

"ہاں۔ بڑی خونخوار ہوں ناں میں۔ سب کو مارتی ہوں۔" وہ ڈرنے کی اس ایکٹنگ پہ چڑ گئی۔ یہی طعنے تو سارا دن سنتی تھی کہ شوہر اس سے دبتا ہے۔ یہ حقیقت تو صرف وہی جانتی تھی کہ منظر اس کی محبت میں لاکھ دیوانہ سہی مگر کرتا اپنے دل کی تھا۔ سو لاکھ کچھ سمجھائے وہ اپنی بات پہ اڑا رہتا۔

"آپ کیوں کرتے ہیں ایسا؟"

احترام کرنا سیکھو فیصل۔"

"خواتین کا؟ بہت کرتا ہوں مگر جو احترام کے قابل ہوں۔ یہ بازاری عورتیں اپنا احترام کروانے 'باجی یا بھابھی' کہلوانے نہیں باہر نکلتیں۔ کیا ہو گیا ہے تمہاری عقل کو؟"

"میری عقل ٹھکانے پہ ہے اور حواس بھی۔ فکر مت کرو۔ ایسا کچھ نہیں ہے جیسا تم سوچ رہے ہو۔ کوئی عشق وشق کا چکر نہیں ہے۔"

"پھر یہ روز روز کا ملنا' ساتھ ڈنر کرنا۔ یقیناً" تحفے تحائف اور رقمیں بھی بٹور رہی ہوگی۔ مفت میں تو وہ اپنا ایک سیکنڈ نہ ضائع کرے۔"

"ریما ایسی لڑکی نہیں ہے۔"

"پہلی بات تو یہ کہ میں اسے لڑکی نہیں مانتا۔ یہ جو ہیں نہ خواتین کی صف میں شمار ہونے والی [illegible] جیسا سمجھو۔ پتہ نہیں کس چکر میں پھنس گئے ہو۔ یار یہ سب دل بہلانے کی چیزیں ہیں۔ یہاں عیش کرو۔ ڈانس دیکھو۔ زیادہ پسند آجائے تو چند گھنٹے خرید ڈالو۔ مگر قیمت ادا کرنے کے بعد دوبارہ مڑ کے پیچھے مت دیکھو۔ یہ جونک ایک بار چمٹ جائے تو مشکل سے چھوڑتی ہے۔"

"میں نے کہا ناں' وہ اوروں سے مختلف ہے۔"

"تم کیسے کہہ سکتے ہو' اس سے قبل کتنی کال گرلز سے واقفیت رہ چکی ہے تمہاری جو تم تقابل کرنے پہ اتر آئے ہو۔"

"کال گرل؟ ریش۔ وہ صرف آرٹسٹ ہے... وہ ایک ڈانسر ہے اور بس۔" اس نے جھٹلانا چاہا۔

"تم اتنے وثوق سے اس لیے کہہ رہے ہو کہ ابھی تک تم نے صرف ڈانس ہی دیکھا ہے اس کا۔ وہ ایک ڈانسر نہیں' ایک طوائف ہے اور طوائف کا سب کچھ برائے فروخت ہوتا ہے۔ اس کی ادائیں' اس کا وقت' اس کی ہنسی' اس کی محبت' اس کی آواز اور اس کا جسم بھی۔ کبھی قیمت لگا کے دیکھو تب اندازہ ہوگا کہ تم کتنے غلط ہو اور میں کتنا صحیح۔"

"وہ جو بھی ہے' مجھے اس کی حقیقت جاننے کے لیے ایسا کچھ بھی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اپنی اصل زندگی میں وہ جو بھی ہے جیسی بھی ہے' اس سے مجھے کیا لینا دینا۔ فی الحال وہ میری ایک اچھی دوست ہے۔ اچھے دوستوں کی طرح ہم کچھ وقت اچھا گزار لیتے ہیں اور بس۔"

"ارے یار! ہم سب مر گئے ہیں کیا؟ دوستی کرنے کے لیے تجھے وہی ملی؟"

"اس میں ایک عجیب سی کشش ہے اور سچ بتاؤں' مرد اور عورت کی دوستی محض ایک ڈھکوسلہ ہے۔ یہ صرف کشش ہی تو ہے۔ سو یہی کشش جو اس کے اور میرے درمیان ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہاں ذہانت اور خوبصورتی کی کمی نہیں۔ بہت سی لڑکیاں ہیں خود میری اپنی فیملی میں' مگر جس ماحول سے ہے وہاں یہ وصف کم دیکھنے میں آتا ہے۔ اسی بات نے مجھے اٹریکٹ کیا ہے۔ اس میں ہے بلا کی' خود اعتمادی' ذہانت' برجستگی' ادائیں سب ہی کچھ"

"مجھے تو ڈر لگ رہا ہے' کہیں تم لٹو نہ ہو جاؤ۔"

"اتنا کمزور نہیں ہوں میں' ویسے بھی میں نے آج تک جو کیا ہے' انجام کو مد نظر رکھ کر کیا ہے۔ اس دوستی کے آغاز سے پہلے ہی میں نے یہ طے کر رکھا ہے کہ اس کا انجام کیا ہوگا اور وہ انجام یہ ہے کہ دو ماہ بعد جب واپس اسلام آباد چلا جاؤں گا۔ اور پھر وہ کہاں' ہم کہاں' زندگی کے ایک مختلف تجربے کے طور پہ یاد رہے گی یہ دوستی۔ اس کے علاوہ کچھ نہیں۔"

"خدا کرے ایسا ہی ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا!"

"[illegible] یہاں سے؟"

[illegible] سے آتے ہی رخشندہ سے پوچھا تھا۔ [illegible]

[illegible] بیٹھ گئے۔

"بیٹی نے فون کیا تھا۔ [illegible] طبیعت ٹھیک ہے۔ شاید آ رہی ہو۔"

"اماں سے بات ہوئی [illegible] طبیعت تو خراب نہیں ہو گئی؟"

[illegible] رخشندہ کو پسند نہیں آیا۔ کون سا ان کی [illegible] تھیں۔ چند گھنٹے [illegible] نے ہمیشہ کی طرح [illegible] ظاہر کیے بنا۔

"میں نے ہسپتال میں فون کیا تھا۔ اماں جی سے بات کیسے ہوتی۔ ہاں پروین سے ان کا پوچھا تھا ٹھیک ہیں وہ۔"

اتنا سا جواب دیتے ہوئے رخشندہ کے چہرے کے زاویے بگڑے تھے مگر سراج دین کی تسلی کرانے کے لیے ضروری تھا ورنہ سوال در سوال کا ایک رابطہ شروع ہو جاتا۔

کھانے کی میز پہ انھوں نے پھر سے ذکر چھیڑا۔ پروین کے گھر نہ ہونے کی وجہ سے رخشندہ نے ان کے کہنے پہ کھانا پہلے ہی لگوا دیا تھا کہ سراج دین کو دقت نہ ہو۔

"مہرن! تم دوبارہ ہسپتال گئے؟"

"نہیں۔"

"جانا چاہیے تھا۔"

"ایسا ضروری بھی نہیں' میرا بار بار حاضری لگوانا۔ وہ بیٹھی ہے ناں صبح سے دھرنا مار کے۔"

"پھر بھی ناں' تعلق داری بھی کوئی چیز ہے' تمہارا رشتہ ہے ان لوگوں سے۔"

"رشتہ نہیں ہے بھائی صاحب' صرف واسطہ ہے۔ رشتے خون کے ہوتے ہیں۔" سراج دین نے ہڈی بھنبھوڑتے ہوئے اپنا فلسفہ بیان کیا۔

"یہ کیا بات ہوئی' اس طرح تو میاں بیوی کا رشتہ بھی کوئی رشتہ نہ ہوا۔ خون کا تعلق جو نہیں ہوتا۔"

"نہیں جی۔ اس رشتے کو تو میں مانتا ہوں' مگر لازم نہیں ہے کہ بیوی کے ساتھ ساتھ اس کے ورثن پھر رشتے داروں کو بھی ہم اپنی زندگی کا حصہ بنائیں۔ اور پھر رشتے دار کسی کام کے بھی تو ہوں۔ میرے وہاں جانے سے کترانے کی اہم وجہ میری ساس محترمہ ہیں۔" انھوں نے ایسا برا منہ بنایا جیسے منہ میں کنکر آ گیا ہو۔ "اس عورت کا سامنا کرنے سے بہتر ہے۔"

"بہرحال وہ تمہاری ساس ہے۔ اور کچھ نہیں تو الفاظ استعمال کرنے میں ہی محتاط رہو۔ دل کا تو میں علاج نہیں کر سکتی۔"

"میں جانتا ہوں' یہ عورت ایک نہ ایک دن پروین کا دماغ خراب کرکے رہے گی۔ وہ میری ساس نہیں' میری خوشحال ازدواجی زندگی پہ ہر وقت لٹکتی ایک خطرے کی تلوار ہے۔ پھر میں کیسے خود کو اس کی عزت کرنے پہ مجبور کروں۔ اماں کا حوصلہ ہے جو صبح سے اسے جھیل رہی ہیں۔ اپنی بہو کی محبت میں۔"

"واقعی اماں کو اتنا وقت وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ وہ خود بیمار رہتی ہیں' ہسپتال کا ماحول۔ بہتر ہوتا کہ پروین کو تم ساتھ لے جاتے۔ اماں بعد میں ہمارے ساتھ چکر لگا لیتیں۔ رخشندہ! کھانے کے بعد چکر لگا لیتے ہیں ہم بھی ہسپتال کا۔"

"ہمم۔" وہ متذبذب نظر آئی۔ "میں کیسے جا سکتی ہوں۔ پروین تو سب بچوں کو میرے حوالے کر گئی ہے۔ کس کے حوالے کرکے جاؤں۔"

اسے بروقت بہانہ سوجھا تھا اور وہ بھی ایسا جس پہ کوئی اعتراض نہ کر سکے۔

"ہاں' یہ تو ہے۔"

سامنے ہو گی۔"

پروین نے اپنے آنسو پونچھے۔ اسے نرس کے انداز سے گھبراہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ بے ساختہ در آنے والے اندیشوں کو شدومد سے جھٹلا رہی تھی۔

"لڑکی ہوئی ہے؟" شمشاد بھی قریب آ گئی۔ وہ اپنی کسی رشتہ دار خاتون کے ساتھ الگ سر جوڑے بیٹھی تھی۔

"ساجدہ کا کیا بتایا ہے نرس نے؟"

"ابھی تک تو کچھ نہیں بتایا اماں۔" نوید مراد نے مایوسی سے جواب دیا۔ اس کا دل لمحہ بہ لمحہ ڈوبتا جا رہا تھا۔ بیٹی کی پیدائش نے بھی اس کے اندر خوشی کا کوئی احساس پیدا نہیں کیا تھا' وہ صرف ایک بار 'بس ایک بار یہ سننا چاہتا تھا کہ ساجدہ اب خیریت سے ہے۔

"چلو اللہ بہتر کرے گا۔" شمشاد نے بڑی بے دلی سے جمائی لے کر کہا۔ اسے نیند پہ قابو پانا مشکل لگ رہا تھا۔

"ٹھیک ہی ہوئی۔ آخر لڑکی بھی تو اللہ کے فضل سے ٹھیک ٹھاک ہی پیدا کی ہے۔"

اس کے بعد وہ شوکت جہاں کے نزدیک بیٹھ کر سنانے لگی۔

"ویسے تو ہمارے ہاں پہلوٹی کے لڑکے پیدا ہونے کا رواج ہے۔ پھر بھی۔ چلو جو اللہ کی مرضی' میرا بھی پہلا لڑکا ہوا اور خیر سے میری پروین کے دونوں ہی لڑکے۔"

"اللہ کی قدرت کسی رواج کو نہیں مانتی بہن۔" انھوں نے متانت سے جواب دیا۔ "لڑکا ہو یا لڑکی 'سب اللہ کی دین ہے۔ کوئی رحمت تو کوئی برکت کا باعث بنتا ہے۔ بس دعا کیجئے۔ زندگی والی قسمت والی ہو' وہ اپنی ماں کی صحت کا وسیلہ بنے۔ اللہ اس ننھی سی جان کے صدقے اس کی ماں کو زندگی دے دے۔"

"آمین۔" پروین نے صدق دل سے کہا تھا۔ اسے اپنی بھاوج ساجدہ ویسے بھی بہت پسند تھی۔ اس کی ماں کے ساتھ گزارا کرنا بڑے دل گردے کا کام تھا۔ مگر وہ ہمہ وقت مسکراتی ملتی اور نوید اور اس کا سنجیدہ فطرت بھائی 'اس کے لبوں پہ بھی اب مسکراہٹ رہنے لگی تھی۔

"ساجدہ بی بی کے ساتھ کون ہے؟" ڈاکٹر اپنا اوور آل بازو پہ ڈالے پژمردہ چہرے کے ساتھ آپریشن تھیٹر سے نکلی۔

"جی میں۔ میں شوہر ہوں اس کا۔"

نوید مراد دھڑکتے دل کے ساتھ آگے بڑھا۔

"ہمیں افسوس ہے۔ ہم آپ کی بیوی کو نہیں بچا سکے۔ وہ بہت کمزور تھیں اور چوٹیں شدید نوعیت کی تھیں۔ خون کی کمی ان کا جسم برداشت نہیں کر سکا۔ ہم نے کوشش تو بہت کی مگر وہ بچ بھی جاتیں تو ان کا دماغ متاثر ہو چکا تھا۔ شاید ایک طویل عرصے کے لیے کومے میں چلی جاتیں۔"

وہ پوری وضاحت کے ساتھ بتا رہی تھی مگر نوید مراد تو ڈاکٹر کے پہلے ہی فقرے پہ چکرا کے رہ گیا تھا۔

● ● ●

فضا میں اگربتیوں اور مرجھائے ہوئے پھولوں کی باسی مہک پھیلی ہوئی تھی۔

پھر اس خوشبو پہ دیگ میں پکے پکوانوں کی خوشبو حاوی ہونے لگی۔

"پروین! تو اپنا اور باجی جی کا کھانا ادھر کمرے میں ہی لگوا لے۔ دیگ کھل گئی ہے۔ میں باہر صحن اور برآمدے میں برادری اور محلے کی عورتوں کو دیکھتی ہوں۔" شمشاد نے اندر آ کر کہا۔

"نہیں پروین بیٹا! میرے لیے تکلیف نہ کرنا۔" شوکت جہاں نے نرمی سے منع کرنا چاہا۔ انہیں مرگ والے گھر میں کھانا کھانا ہمیشہ بھاری لگتا تھا اور یہ تو موت بھی جوان جہان ساجدہ کی تھی جو چند منٹ کی بچی کو اکیلا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ابھی اس نے دنیا میں دیکھا ہی کیا تھا۔

غریب گھر کی یتیم' صابر بچی۔ جس نے شادی کے بعد ابھی تو خوشیوں کا ذائقہ چکھا تھا۔ ابھی تو اس کا دل

خوش ہونے سے آشنا ہوا تھا اور اتنی جلدی اس کی زندگی نے ساتھ چھوڑ دیا۔

ابھی تو اس نے اپنی ننھی سی بچی کے نرم گرم وجود کو چھوا تک نہ تھا' اس کے گلابی گالوں پہ اپنے لب تک نہ رکھے تھے۔

اسے لوری نہ سنائی تھی۔

اسے پالنے میں جھولے نہیں دیے تھے۔

ابھی تو اسے اس کی قلقاریاں سننی تھیں۔

اس کی ننھی انگلی تھام کے اسے پاؤں پاؤں چلنا سکھانا تھا۔

اس کے ننھے ننھے پھولے ہوئے فراک سینے تھے اور اس کے ریشمی سنہری بالوں کی چوٹیاں بنانی تھیں مگر۔۔۔

مگر وہ تو یہ تک نہ جانتی تھی کہ اس کی گڑیا کے بال بالکل سورج کی کرنوں جیسے سنہری ہیں۔

اور۔۔۔ اور وہ تو اس بات سے بے خبر تھی کہ درد اور تکلیف کے جس سفر سے گزر کر وہ اس دوسرے جہان میں پہنچی ہے' اس سفر میں وہ ایک ننھی بچی کو پیچھے چھوڑ آئی ہے۔

یہ درد صرف شوکت جہاں ہی کی نہیں' بلکہ یہاں موجود بہت سے لوگوں کی آنکھیں بھگو رہا تھا۔

کچھ ایسے بھی تھے جن کی آنکھیں غم کی شدت سے بنجر ہوئی تھیں جیسے نوید مراد۔

ساجدہ کی موت کی خبر سننے سے لے کر اب تک یعنی اس کی تجہیز و تکفین سے لوٹ کر آنے کے بعد۔۔۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو بھی نہیں بہا تھا لیکن ہاں۔۔۔ اس کا دل تھا جو قطرہ قطرہ خون بن کر پگھل رہا تھا۔ ختم ہو رہا تھا۔ اس نے ابھی تک اپنی بیٹی کا چہرہ تک نہ دیکھا تھا۔ اسے اتنا ہوش ہی نہیں تھا۔ قبرستان سے آنے کے بعد وہ سیدھا اپنے کمرے میں چلا گیا اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

اور کچھ ایسے بھی تھے جو رسم دنیا سمجھ کے رونے بھی 'چلائے بھی' اور اب سکون سے بیٹھے ادھر ادھر کی باتیں بگھار رہے تھے۔ ان میں سے ایک نوید مراد کی ماں 'ساجدہ کی ساس شمشاد تھی۔

"یوں تو پہلی رونق میکے سے آتی ہے' رواج یہی ہے' مگر میری پوتی بیچاری کے "میکے" ذرا ماڑے (کمزور) ہیں۔ میں نے نوید سے کہا' نہ اتنا خرچا ڈال غریب بندوں پہ۔ ہم خود دیگیں منگوا لیتے ہیں۔ اللہ کے فضل سے ہمیں کوئی کمی ہے؟"

وہ پلاؤ' قورمہ اور نان دسترخوان پہ ملازمہ سے رکھواتے ہوئے باآواز بلند سنا رہی تھی اور نان کا پہلا نوالہ توڑتی ساجدہ کی بڑی بھاوج کا ہاتھ وہیں رک گیا۔ اس نے کن انکھیوں سے اپنی خالہ ساس کو دیکھا۔ وہ بھی برے برے منہ بنا رہی تھی۔

"اور دیکھنا بھر جائی جی!" اب شمشاد اپنی کسی دور کی بھابھی کے پاس بیٹھے ہوئے قدرے کم آواز میں کہہ رہی تھی مگر یہ آواز اتنی بہرحال ضرور تھی کہ وہاں چند دور لوگوں تک آسانی سے پہنچ جائے۔

"وہ ایک آدھ دیگ بھجوا بھی دیتے تو کیا ہوتا؟ الٹا برادری میں ہماری ناک کٹتی۔ ہمارے سارے رشتے دار دوسرے شہروں' پنڈوں سے آنے والے۔۔۔ اس کے علاوہ بھی ہم لوگ اپنے گھر آئے' کسی بندے کو بغیر روٹی کھلائے واپس نہیں جانے دیتے۔ اتنے بندوں کی روٹی پہ کیا بھیجتے۔۔۔ بھیجتے بھی تو کوئی شوربے والا سالن یا چنوں والے چاول۔۔۔ میری جوان نوں مری ہے' میں لوگوں کو چنوں والے چاول کھلاؤں گی؟ کوئی عزت ہے اس میں۔۔۔؟ دیکھو یہ دو دیگیں مرغی کے قورمے کی۔۔۔ ایک دیگ بکرے کے گوشت کے پلاؤ کی۔۔۔ یہ ڈیڑھ دو سو روغنی نان۔۔۔ یہ اپنا لوگوں کو وارے کھاتا تھا۔۔۔؟ مگر نان جی۔۔۔ کوئی احسان نہیں مانتا۔ ان چھوٹے لوگوں کی اکڑ بڑی ہوتی ہے۔ دیکھو ذرا! ایک نوالہ نہیں توڑا اب تک۔ اتنا ہی نخرہ تھا تو پلیٹیں بھر کے اپنے سامنے رکھنے کی لوڑ کیا تھی۔ ایسے بوتھے سوجا کر بیٹھے ہیں جیسے ان کی لڑکی کو میں نے مارا ہو۔ خود ہی بتا بے گرا کر آ گے اسے جھڑیوں کی مٹھ بنا رکھا تھا۔ ذرا جان سا تو نہیں تھا اس میں کہ بچہ جن کر بچ سکتی۔ یہ تو ذرا سو ہرے آگر کوئی ماس بوٹی چڑھا تھا' ورنہ میکے میں کیا جڑتا تھا

اسے ... ایک ... جو شخص بغیر کسی دال ڈال کے سارا غبار نکال (نواسے) کا گئے والا ...

وہ یوں ... تھے منہ میں رکھتی جس رفتار سے قورمے کا صفایا کر رہی تھی اگر یہی رفتار رہے تو دل دکھانے والی باتیں بھی جاری رہتی ہیں جیسے اس کا بیان طویل ہوتا جا رہا تھا اس کی آواز بلند سے بلند تر ہوتی جا رہی تھی۔

پہلے وہ بس ہے ... تھیں ... پھر یہاں عورتوں تک ہی نہ تھے ان طعنوں پہ دل برداشت ہو کر ساجدہ کی خالہ نے اپنا برقعہ سنبھالا اور اپنے ساتھ آئی ہوئی سہیلیوں کو اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ سب ہی شمشاد کی تیز زبان کی زہریلی دھار سے اچھی طرح واقف تھیں مگر نظر انداز کرتی رہیں۔ اب اس کی بدزبانی برداشت کرنے کو کوئی جواز باقی نہ رہا تھا۔ ساجدہ تو نہ رہی تھی جس کے لحاظ میں وہ اس کی کڑوی کسیلی پی جایا کرتے تھے اور آج ... آج تو حد ہو گئی وہ پہلے سے کئی گنا بڑھ کے ذلت آمیز سلوک کر رہی تھی اور وہ بھی اس موقع پہ ... اتنے لوگوں کے سامنے۔

شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ پہلے ساجدہ کی بھابھیاں ... خالہ، چچی اور ممانی اب شمشاد کو برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھیں، کیا طرح جواب ساجدہ کی وفات کے بعد شمشاد نے بھی اپنا رہا سہا لحاظ اور مروت ایک طرف رکھ دیا تھا۔ وہ ان لوگوں سے کوئی تعلق واسطہ نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

انہیں بغیر کھانا کھائے باہر نکلتے دیکھ کے شمشاد کو ذرا ٹھنڈ پڑی۔

"دیکھا ... کیسی بے غیرت ہیں یہ عورتیں ... لڑکی کیا مری ... باقی سارے رشتے ختم ... چھوڑ گئے نہ پوچھیں ... نہ بات کریں ... میں کون سا ترسی بیٹھی ہوں۔ میری جوتی کو پروا نہیں ان منحوسوں کی مگر وہ جو اندر بیٹھا ہے بد نصیب ... میرا بیٹا ..."

ایک بڑی سی ڈکار لینے کے بعد اس نے دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ لیا اور بال بال کر سسکنے لگی۔

"وہاں کا بھی کچھ لگتا ہے اس کو ہی دو بول تسلی کے بول جاتیں ... وہ ذرا سی بچی ... ان کی لڑکی کی ہی اولاد ہے۔ جاتے جاتے اس بچی کا نہیں پوچھا۔ چلو اچھا ہوا۔"

اس نے سکنڈ ل اعتدال پہ لاتے ہوئے دوپٹہ آنکھوں سے ہٹایا اور سامنے رکھا ایک اور نان اٹھا لیا۔

"منع ور لیسے نانکہ (ننھیال والے) تم سارے گواہ ہو ... یہ خود رشتہ توڑ کے نکلے ہیں اس گھر سے ... اب ترسیں گے بچی کی شکل دیکھنے کو۔ میں تو اب ان لوگوں کے پاس نہ جانے دوں گی ... یہ بھی یاد رکھیں گے۔" شمشاد سے "ہونہہ" نکالا ہے۔

وہ یک طرفہ محو کھول رہی تھی۔ حالانکہ دوسری جانب بچی کے لیے ترسنے یا تڑپنے کا ایسا کوئی امکان کہیں بھی نہ تھا۔ نہ تو اس کے سگے نانا نانی زندہ رہے تھے نہ کوئی ماسی ... یعنی ماں کی بہن جن کو نواسی یا بھانجی کی کشش یہاں واپس کھینچ لاتی ایک بار پھر ذلیل ہونے۔

☼ ☼ ☼

"اچھا ہوا اماں جی! آپ گھر آ گئیں ... مجھے تو ڈر تھا کہ پروین اپنے ساتھ آپ کو بھی وہیں نہ چپکا لے۔"

سراج دین کے کہنے پہ شوکت جہاں نے گھوری نظروں سے اسے دیکھا۔

"میری بچھو ڈاٹ میں نے گھر واپس آ کر اچھا کیا یا نہیں مگر تمہیں آج کی رات وہاں رکنا چاہیے تھا۔"

"وہ کس خوشی میں ..." اس نامعقول قسم کے سوال پہ انہیں غصہ ہی تو آ گیا۔

"خوشی ...؟ یا وہاں خوشیاں منائی جا رہی ہیں۔ بے وقوف انسان! مرگ ہوئی ہے وہاں ... تمہاری بیوی کی بھابھی کی۔ تمہارا بڑا سالا ہے وہ انسان جس کی زندگی کو اتنا بڑا دھچکا لگا ہے ... خوشی میں تم کیسے رکتے ... غم میں ایسی باتوں کو دھیان رکھنا پڑتا ہے اسی دنیا کے رہنے والے ہیں ہم بھی ... تم بھی ... اور وہ لوگ بھی جو ایسی کوتاہیوں پہ سو سو باتیں بناتے ہیں۔ آپ کو پروین کے رشتے داروں کے الفاظ میں اسے یہ بات محسوس نہیں کروا رہے ہوں گے۔"

"ویسے الفاظ ہیں کیوں؟" سراج دین نے طنزیہ کہا۔ "ایسے مہذب نہیں ہیں وہ ... منہ پھاڑ پھاڑ کے جتا رہے ہوں گے ... اللہ موقع دے ان لوگوں کو زبان کے زنگ اتارنے کا۔"

"جب یہ بات جانتے ہو تو پھر رک جاتا تھا ایک رات ... آخر تم اس گھرانے کے داماد ہو۔ تمہاری بھی کوئی عزت ہے ... وہ ... نہ کرو تو کہیں ہی کوئی اس بے چارے کے سنے ناڈی ... وہ تمہارا اس گھر کا اکلوتا مرد ... تم ہوتے تو کل ہونے والے ختم قرآن شریف ... انتظام ہی کچھ کر لیتے۔"

"اور وہ جو وہیں سے میرا ساس کا حق ہے۔" سراج دین کے لہجے میں تنفر تھا۔ "ان کا شوہر زیادہ معقول دکھتا ہے ... معافی ہے بگڑی ہے۔" "اماں جی! آپ جو ایک ہی بات میرے بارے میں زبردستی کیوں ٹھونسنے کی کوشش کرتی ہیں۔ میں اس بات ہوں مشغلہ سے زیادہ نہیں گزار سکتا ... وہ عورت کسی بھی طور پر شریف اور بھلے انسان کی وجہ سے گزارا کرتا ہوں ورنہ پروین کی ماں جیسی عورتیں چند سیکنڈ بھی برداشت کرنے کے قابل نہیں ہیں۔"

"شرم کرو سراج دین! تمہارا انداز بھی برا ہے لہجہ بھی اور الفاظ بھی ... میں نے تمہیں یہ تربیت نہیں دی۔"

شوکت جہاں نے ڈپٹنے کا ذرا واضح لہجہ ہوئے۔

"یہ آپ کی تربیت ہی تو ہے کہ میرے دل میں جو بھی ہے میں اس عورت کے منہ پہ اس کا اظہار کرنے سے گریز کرتا ہوں۔"

"تمہیں دل بھی صاف رکھنا چاہیے ... ایسا نہ ہو کہ یہ چیز تمہارے اور پروین کے تعلقات پہ اثر انداز ہو۔"

"اثر انداز تو ہوتی ہے۔" انہوں نے اعتراف کیا۔

"پروین سے یہ سچ برداشت نہیں ہوتا اور اپنی ماں کے بارے میں تو بالکل بھی نہیں۔ حالانکہ اس سے زیادہ کون جانتا ہوگا ان کے بارے میں ... اس کے باوجود بحث پہ اتر آتی ہے۔"

"اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اس بے چاری کے سامنے بھی اپنے برے خیالات کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے ... جیسے کیا گزرتی ہوگی اس پہ ... کیسے سنتی ہوگی وہ ...؟ کوئی بیٹی اپنی ماں کے بارے میں یہ سب نہیں سن سکتی۔ کتنے بے حس انسان ہو تم ... تمہیں ضرورت کیا ہے پروین کے سامنے اس کی ماں کی خامیاں نکالنے کی۔ تمہیں پروین سے مطلب ہونا چاہیے ... اس کی ماں کیسی ہے اچھی یا بری ...؟ اس پہ کڑھ کڑھ کے اپنا گھر کیوں خراب کرتے ہو۔ پروین ایک اچھی لڑکی ہے، سلیقہ شعار ہے، معصوم ہے ... تمہارا گھر بار، تمہارے بچے سب کچھ ذمہ داری سے سنبھال کر رکھتی ہے، تمہاری ماں کی عزت کرتی ہے اور تمہیں کیا چاہیے۔"

"بالکل یہی تو میں کہنا چاہ رہا ہوں ... مجھے بھی نہیں اور کچھ بھی نہیں چاہیے ... نہ مجھے کوئی لمبی چوڑی رشتہ داریاں اور تعلق داریاں نہیں نبھانا مجھے۔ ابھی آپ نے خود کہا ہے کہ مجھے صرف پروین سے مطلب ہونا چاہیے تو ... میرا صرف اس سے واسطہ ہے۔ اس کے پورے خاندان سے تعلقات خوشگوار رکھنے کا میں نے ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔"

"واہ ... کیسی بات پکڑی ہے ... تم تو میرے منہ میں ہاتھ ڈالے بیٹھے ہو کہ ادھر میری زبان پھسلے اُدھر تم پکڑو۔"

شوکت جہاں نے ناراض انداز میں داد دی۔

"تم کبھی نہیں سدھر سکتے۔" وہ گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کے اٹھنے لگیں۔

"میرا ہی دماغ خراب ہے جو تم پہ سر کھپاتی ہوں۔"

"تو میں نے منع تھوڑا ہی کیا ہے اماں جی! آپ مجھ پہ نا سہی شوق سے سر کھپائیں۔"

سراج دین کے چہرے پہ مسکراہٹ پھیل گئی۔ وہ دونوں شانوں سے تھام کے ماں کو واپس اپنے بیڈ پہ بٹھانے کی کوشش کرنے لگے۔

"میں سدھروں یا نہ سدھروں یہ ایک الگ مسئلہ ہے۔ آپ اپنی کوشش جاری رکھیے یہ آپ کا حق ہے اور فرض بھی۔"

"ہاں ... نہ حق ادا ہوتا ہے نہ ہی فرض پورا کر پائی ہوں۔" وہ بیٹھ گئیں مگر بدستور خفا خفا سی تھیں۔ سراج کی

مسکراہٹ بھی انہیں موم نہیں کر رہی تھی۔

"بچپن سے تو ایسا ہے' ایسا ہی بحث کرنے والا۔ اپنی من مانی کرنے والا۔ ضدی اور گستاخ۔ اب تیرے بال بچوں والا ہو گیا ہے' اپنا تو شرم کر۔ اب بھی یونہی ماں سے بحث کرتا رہتا ہے۔ کل کو تیرے بچے کیا خاک عزت کریں گے میری۔"

ان کا طرز تخاطب یہ ظاہر کر رہا تھا کہ اوپر سے وہ کتنے خفا نظر آ رہی ہوں مگر اندر سے بیٹے کا غصہ پا تے ہی پگھل گئی تھیں۔ یہ ان کے پیار کا انداز ہی تھا کہ وہ سراج دین کو "تم" کی بجائے "تو" کہہ کر پکار رہی تھیں۔

"کیوں نہیں کریں گے' ٹانگیں نہ توڑ کے رکھ دوں گا میں نالائقوں کی۔"

"جب باپ کو میرے ساتھ چونچیں لڑاتا دیکھیں گے تو خود بھی یہی کریں گے اور بڑا آیا ٹانگیں توڑنے والا میرے پوتوں کی۔ ٹانگیں تڑوا کے کیا کوئی عزت کرنے لگتا ہے؟"

"جب آپ سب جانتی ہیں تو سمجھتی کیوں نہیں ہیں۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ ٹانگیں تڑوا لینے کے بعد واقعی کوئی عزت کرنے نہیں لگ جاتا' یہ واحد جذبہ ہے جو زبردستی پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ آپ مجھے پروین کی ماں کی عزت کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتیں' اس لیے ایسی کوشش کیا بھی نہ کریں۔"

شوکت جہاں نے مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کبھی کبھی انہیں اپنا بیٹے کا موقف درست لگتا تھا۔ شمشاد جس مزاج اور فطرت کی عورت تھی' اس کا اندازہ انہیں بخوبی تھا اور آج اس کا ایک افسوس ناک مظاہرہ وہ دیکھ بھی چکی تھیں۔ انہیں بھی کوئی شوق نہیں تھا سراج دین کے دل میں شمشاد کے لیے عزت و احترام اور پیار و محبت کے جذبات جگانے کا۔ ہاں مگر وہ دل سے پروین کو پسند ضرور کرتی تھیں اور اس کی خوشی کے لیے چاہتی تھیں کہ سراج اپنی سوچ کچھ تبدیل کر لے۔ اگر وہ یہ نہیں کر سکتا تو کم از کم اس کا بے دھڑک اظہار کرنے میں ہی محتاط رہے۔ دنیا داری کے لیے ہی کچھ لحاظ سے کام لے مگر وہ اس پہ بھی تیار نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"بڑی خاموشی ہے آج تو گھر میں۔"

اتوار کا دن تھا' پونے ایک بجے اصغر جاگا اور انگڑائیاں لیتا کمرے سے نکلا۔

"بتی گئی ہوئی ہے۔" شمیم نے برا سا منہ بنا کے اطلاع دی۔

"تو کیا اس گھر کے بندے بھی بتی سے چلنے لگے ہیں کہ لائٹ گئی تو سارے ٹھس۔"

وہ بڑی سی جمائی لے کر صوفے پہ ڈھیر ہو گیا۔ جاتی سردیوں کے دن تھے' اب ہیٹر' سویٹر اور شال وغیرہ کی ضرورت تو محسوس نہیں ہوتی تھی مگر پنکھے کے بغیر بھی با آسانی گزارا ہو جاتا تھا' اسی لیے صبح سے لائٹ نہ ہونے کے باوجود اصغر کی نیند میں کوئی خلل نہ پڑا تھا۔

روشنی کے لیے لاؤنج کے پردے ہٹا دیے گئے تھے۔ کھڑکی کے ساتھ رکھے بڑے سے تخت پہ نصرت سبزیوں کا ڈھیر پھیلائے بیٹھی تھی اور شمیم بیزار سی شکل بنائے سنڈے میگزین میں سے اپنی دلچسپی کی کوئی چیز تلاش کر رہی تھی۔

"بتی آ رہی ہو تو ذرا رونق رہتی ہے اور کچھ نہیں تو شمیم کا ڈیک ہی بجتا رہتا ہے۔ ٹی وی پہ بھی شور شرابا ہوتا رہتا ہے' فریج کی آواز' ڈیپ فریزر کی آواز' سب سویرے سے آ تو ل رہے ہیں۔"

نصرت نے شمیم کے بیان کی وضاحت کی۔

"آج تو اوپر بھی بڑی خاموشی ہے۔"

اصغر نے بڑے بھائی بھابھی کے کمرے کی جانب اشارہ کیا۔

"دونوں میاں بیوی سویرے سویرے ہی سیر سپاٹے کرنے نکل گئے ہیں۔" شمیم نے پہلے سے بھی زیادہ برا منہ بنا کر کہا۔

"واہ قسمت ہو تو ایسی ہو بھئی۔ ایک ہم ہیں' پھکنکیں ہوئی ہے پکنک منانے کی۔ تیار شیار ہو کے گیا ہو گا پکن کے اسمبال کر کے' باٹ پاٹ میں کباب اور تلی مچھلی بھرتے ہوئے تھیک چلو نے ایک بار بھی ساس نند کو ساتھ لے جانے کی صلاح نہیں دی۔ ہم ارمان نہیں' جہاز اڑانی نہیں کرتا' بار بار جا کے گھومتے پھرنے کو' ناں نے تو اباکے ہم پہ عیش کر لیے۔ میرے بیٹے نے بیٹیا کی بابت بھی نہیں سوچا۔ ابھی میری عمر ہی کیا ہے' کون سا میرے سارے ارمان پورے ہو گئے ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے باہر جانے کو مگر میری قسمت میں اب چپنی چیں بیٹھ کے ٹی وی دیکھنا اور گانے سننا رہ گیا ہے اور آپ وہ دراصل سے کیسے عیش کر رہی ہے یہاں آ کر' ٹھاٹ دیکھو ذرا۔ ایک سے ایک نیا کپڑا۔ سیر سپاٹے۔ کھانا پینا۔"

"اس کو کیا الزام دینا' جب اپنا سکہ ہی کھوٹا ہے۔" نصرت نے آہ بھری۔

اگرچہ وہ منہ پہ دل کی بھڑاس باقاعدگی سے نکالتی رہتی تھی مگر دل سے یہ بھی جانتی تھی کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس نے مظفر کو کوئی خاص پٹی نہیں پڑھا رکھی بلکہ اس کے حسن اور عشق نے ضرور اس کے بیٹے کی آنکھوں پہ پٹی باندھ رکھی ہے۔ دل ہی دل میں وہ پکا ارادہ کیے بیٹھی تھی کہ اصغر کی دفعہ وہ ایسی غلطی نہیں کرے گی۔ ایسی حسین بہو کو ہرگز بہو بنا کے لائے گی کہ اس کے آگے اصغر کو ماں بہن نظر آنا ہی بند ہو جائے۔ ویسے بھی ان کے اللے تللے اصغر کی بدولت ہی چلتے تھے۔ مظفر کو باپ کی دکانداری نما کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ تھا اور ایک اچھی ملٹی نیشنل کمپنی میں اچھے عہدے پہ تھا۔ وہ ہر ماہ ماں کو اخراجات کے لیے معقول رقم ضرور دیتا تھا مگر اس کی تنخواہ اتنی بھی نہیں تھی کہ بیوی اور بیٹی کے اخراجات کے بعد ان کی فرمائشیں پوری کرتا۔ یہ بھی اس کی اچھائی تھی کہ اپنی جاب پہ لگ جانے کے بعد اس نے کبھی پلٹ کے چھوٹے بھائی سے سوال نہ کیا تھا' نہ ہی باپ کے کاروبار سے ہونے والی آمدنی میں سے اپنا حصہ طلب کیا تھا مگر اس کی اس اچھائی کا کبھی ذکر نہیں کیا گیا تھا۔ یہ لوگ اچھائیاں تسلیم کرنے والے نہیں بلکہ کمزوریاں اچھالنے والے تھے۔

"بھابھی کا گلہ کر رہی ہے' یہ بتا کہ بھائی نے تجھے جھوٹے منہ بھی پوچھا؟ وہ پوچھ لیتا تو بھابھی کیا کر لیتی مگر اسی کی تو شہ ہے اس چھوکری کو۔ جانتی ہے کہ میاں مٹھی میں ہے۔"

"غلطی تو ساری میرے اپنے بیٹے کی ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ ایسا جورو کا غلام نکلے گا۔"

وہ چبا چبا کے کہتی اس بے دردی سے شلجم کاٹنے لگی' جیسے چھری کی زد میں سبزی نہیں' مظفر کی گردن ہو۔

"جن کے دل میں ماں اور بہنوں کی قدر ہوتی ہے' آسمان سے اتری حوریں بھی ان کو نہیں بدل سکتیں۔ اب مجھے ہی دیکھ' تیرا باپ کیا بچھا ہے میرے آگے۔ تری شکل و صورت ہی نہیں' خاندان بھی تگڑا تھا میرا۔ تیرے دادکے (ددھیال) تو "تیلی" تھے پیچھے سے اور ہم زمیندار لوگ۔ بس مقدر میں لکھا تھا تیلیوں کے گھر بسنا' بس گئی۔ تیرا باپ تو میرے پیر بھی دھو دھو کے پیتا تو کم تھا مگر اس کے کلیجے میں رو رہ کے اپنے ماں پیو کی پیڑ (درد) جاگتی رہتی تھی۔ میں نے تو نہ فائدہ اٹھایا اپنی خوبصورتی کا۔ صبر کے ساتھ گزارا کیا۔ اس آس پہ کہ چلو میری اولاد بھی اپنے باپ پہ جائے گی۔ میری اولاد بھی بیوی کے بجائے ماں کی سنا کرے گی مگر۔"

وہ دل کے افسوس میں جھومنے لگی۔ یہ اس کا افسوس کرنے کا منفرد اور مخصوص انداز تھا۔

"جوانی ساس کے ساتھ صبر کرتے گزار دی اور اب بڑھاپا بہو کو برداشت کرنے میں خوار ہو رہا ہے۔"

اس کے بیان کی تصدیق شمیم اور اصغر اس لیے نہ کر سکے کہ اپنے ہوش میں انہوں نے اپنے ددھیال والوں کو زیادہ دیکھا ہی نہ تھا۔ آنا جانا' ملنا ملانا نہ ہونے کے برابر تھا۔ نصرت نے بہت جلدی ان لوگوں سے چھٹکارا پا لیا تھا اور تردید کرنے کا حوصلہ ان میں اس لیے نہ تھا کہ اس صورت میں ماں کا اگلا پچھلا سارا غصہ ان دونوں پہ نکل سکتا تھا۔ "یہ تو مجھے بددعا لگی ہے کسی کی جو ایسے بیٹے پیدا ہوئے ہیں۔"

اگر رانی بچپن میں ذرا سی بھی خوبصورت ہوتی تو ضرور شیخ کا دل للچا جاتا' وہ اس بڈھے بدصورت شوہر پہ لعنت بھیج کر طلاق لے کر دوسرے ہی دن اسی کو سونپتے۔ آج تک مگر لڑکی بالکل اپنے باپ پہ گئی تھی۔

رانی چھ سات سال کی تھی جب اس کے باپ کی وفات ہوئی' پینتیس سالہ شیخ جیسے تیسے گزارا کرنے لگی اور ساتھ ہی ساتھ رانی کے جوان ہونے کا انتظار۔ اس نے اچھا بھلا مکان چھوڑ کے پچھلے محلے جانا گوارا کیا۔ ویسے بھی اب یہاں کے لوگ عام رہائشی علاقوں میں دھڑلے سے آباد ہو چکے تھے۔ البتہ اس کے مراسم وہاں والوں سے پھر استوار ہو گئے۔ گھر کا ماحول قریباً قریباً وہی تھا۔ رانی اسی ماحول کے اثرات لیے کر بڑی ہوئی۔ اب وہ اپنی بچپن کی ان سہیلیوں کے ساتھ محفلیں سجانے لگی جو اس کی ماں کی سہیلیوں کی بیٹیاں تھیں۔

ایسی ہی کسی محفل میں اصغر سے ملی اور وہ بھی جان سے اس پہ فدا ہو گیا۔ حالانکہ وہاں موجود بہت سی لڑکیاں اس سے زیادہ خوبصورت تھیں مگر دل کا کیا کیجیے' اصغر کا دل اسی پہ آ گیا۔

وہ گاہے بگاہے یہاں جانے لگا' تحائف کے ہمراہ۔ عیاش فطرت نہ تھا بلکہ واقعی عاشق ہو بیٹھا تھا اس پہ' اس لیے شادی کا ذکر بھی کر بیٹھا۔

شیخ شاید اس کی توقع نہ کر رہی تھی' اس لیے حیران ہوئی۔

"شادی..... ؟ تم جانتے ہو لڑکے! کیا کہہ رہے ہو؟ رانی میری اکلوتی بیٹی ہے اور ابھی تو اس کا وقت شروع ہوا ہے۔ اس کی شادی کرنے کا مطلب پتہ ہے؟ میرا کباڑہ۔ ایسا گھاٹے کا سودا..... ؟ ہاں کوئی منافع بخش بات کرو تو سوچا بھی جائے۔"

اصغر گڑبڑا کے رہ گیا۔ شیخ سے اس کی لڑکی کا ہاتھ مانگتے ہوئے یہ تو بھول ہی گیا تھا کہ وہ کس طرح کی صورت سے اس کی بیٹی کا رشتہ مانگ رہا ہے۔ طوائفیں بھی بیٹیاں دیتی ہیں مگر ان شرائط پہ نہیں جن پہ شریف زادیاں بیاہی جاتی ہیں۔

"جو آپ چاہیں' دینا ہی ہوگا آنٹی جی! آپ کو تو پتہ ہے کتنا بڑا کاروبار ہے میرا۔ ذاتی گھر' گاڑی....."

"بس بس رہنے دو' تم اپنی چند لاکھ کی جائیداد کا رعب کیا ڈال رہے ہو۔ پچیس تیس لاکھ تو میری رانی ویسے بھی اگلے دو تین سالوں میں مجھے کما کر دے دے گی۔" "میں اسے بہت خوش رکھوں گا۔"

"تو ادھر کون سا کیڑے کاٹ رہے ہیں اسے اور تم کیا جانو ہم جیسوں کو خوش کیسے رکھا جاتا ہے۔"

"آپ ایک بار رینا سے پوچھ تو لیں۔"

اصغر کو آس تھی' وہ رینا کی خریدی ہوئی مسکراہٹ اور توجہ کو محبت سمجھ رہا تھا۔

اس کی اس بات پہ شیخ کو ہنسی آئی جس کو اس نے کمال مہارت سے چھپا لیا۔

اصغر کے بارے میں اپنی بیٹی کے اصل خیالات سے وہ بخوبی واقف تھی۔ پھر بھی اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے' بات کروں گی۔ یہ بات کان کھول کے سن لو' وہ راضی بھی ہوئی تب بھی میں سارا نفع نقصان ذہن میں رکھ کے ہاں کروں گی۔ اور ہاں..... تم اپنی طرف سے رانی سے ایسی کوئی بات نہ کرنا ورنہ سارا معاملہ بگاڑنا مجھے اچھی طرح آتا ہے۔"

اس نے دھمکی دی۔ دراصل اسے ڈر تھا کہ اصغر سے شادی کی پیش کش کا سن کر رانی بدک نہ جائے' وہ پہلے ہی اس احمق عاشق سے خار کھاتی تھی۔ ماں کے رعب میں برداشت کر لیتی تھی۔ لیکن اصغر کو واقعی امید بندھ گئی۔

"جو بھی ہے' شادی تو رینا سے ہی ہوگی۔ چاہے اس کے لیے کچھ بھی کرنا پڑے۔ کیا ہے یہ کاروبار..... یہ دکانیں' یہ پیسہ' یہ گھر..... سب اس کے نام کر دوں گا اگر وہ زندگی میرے نام کر دے۔ ویسے بھی شادی جس سے ہو گی میرا سب کچھ اس کا ہی ہو جائے گا تو رینا کیوں نہیں۔"

جیسے جیسے اس کا پیٹ بھرتا جا رہا تھا' وہ اپنے ارادے کو مزید پختہ کرتا جا رہا تھا۔

رینا اس وقت جعفر محمود کے ہمراہ ایک چائنیز ریسٹورنٹ میں بیٹھی تھی۔ نیوی بلیو ساڑھی اس نے بڑے اہتمام سے زیب تن کی تھی جو اس کے بے حد تیکھے نقوش والے کتابی چہرے پہ بہت جچ رہی تھی۔ یہ رنگ بھی اس کی دودھیا رنگت کو نکھار رہا تھا۔

کانوں میں اس نے نیلم کے وہ ٹاپس پہن رکھے تھے جو کچھ دیر پہلے جعفر محمود نے اسے دلائے تھے' یہ ساڑھی بھی پچھلی ملاقات کا تحفہ تھی۔ دوسرے لفظوں میں سر سے پیر تک تحائف کی طرح۔

"آپ مجھے اپنے گھر کیوں نہیں لے کر جاتے۔"

رینا نے جعفر کو پڑھی لکھی ذہنی آفر کی۔ ریسٹورنٹ اور شاپنگ سینٹر پہ ہونے والی گفتگو ڈیڑھ گھنٹے کی ملاقاتوں سے اس کی تسلی نہ ہوتی تھی۔

"ڈارلنگ..... ؟ وہ کس لیے بھئی؟ کیا ضرورت ہے۔ مل تو لیتے ہیں ہم۔" وہ ذرا سا گھبرا گیا' پھر سگریٹ ایش ٹرے میں مسلتا ہوا کچھ سنبھل کے کہنے لگا۔

"اوہ' انکار کرتے کیوں ہیں آپ' آپ تو یہاں اکیلے رہتے ہیں نا' آپ کی فیملی تو اسلام آباد ہوتی ہے۔"

"ہاں میں اکیلا رہتا ہوں اسی لیے تمہیں اپنے گھر لے جانا نہیں چاہتا۔ یہ مناسب نہیں لگتا۔"

اس کی بات رینا کو ہواؤں میں اڑانے لگی۔ وہ کوئی ایسی بھولی بھالی بیمار سی بھی نہ تھی۔ اس کے ساتھ اکیلے گھر جانے کی فرمائش اس نے کچھ سوچ سمجھ کے ہی کی تھی۔ وہ اپنے اور جعفر کے دوستانہ تعلقات کو اب کوئی نیا موڑ دینا چاہتی تھی۔ کوئی بہت ہی جذباتی موڑ۔

مگر اس کی توقع کے برعکس جعفر نے اسے اپنے گھر لے جانے سے معذرت کر لی۔ اسے برا لگا۔ مگر اس کی وجہ جان کر اس کا سارا گلہ جاتا رہا۔ اسے لگا آج جعفر محمود جیسے نفیس' عزت دار اور پڑھے لکھے انسان نے اسے ایک بازاری عورت سمجھنے کی بجائے جو ایک باعزت عورت والا احترام دیا ہے۔ اس کے بعد وہ یقیناً اپنی منزل کو پالے گی۔

"وہ پہلے صرف پسندیدگی کا اظہار ہوا تھا۔ اب وہ میری عزت بھی کرتا ہے۔ میری' بنتی رینا کی' جسے پتہ ہی نہیں عزت کیسے کی جاتی ہے۔ جب وہ مجھ جیسی لڑکی کو عزت دے سکتا ہے تو محبت کیوں نہیں۔ وہ دن دور نہیں جب یہ شخص مجھ سے محبت کا اظہار کر رہا ہوگا۔ میرا ساتھ طلب کر رہا ہوگا۔ اسی دن کا تو انتظار ہے مجھے۔"

وہ مسرور ہو کے سوچنے لگی۔

جعفر محمود سے اس کے بڑھتے تعلقات' باقاعدگی سے ملنا ملانا یہ سب اس کی شعوری کوششوں کا نتیجہ تھا' وہ جان گئی تھی جعفر کے مزاج میں کتنی نفاست' شائستگی اور وقار ہے۔ وہ اس کے سامنے شائستگی کے ساتھ آتی تھی۔ رفتہ رفتہ وہ اس عام سی شکل و صورت' مگر پر کشش سراپا اور مکمل ذہانت رکھنے والی لڑکی کا اسیر ہونے لگا تھا۔

بے شک یہ سب رینا بہت سوچ سمجھ کے کر رہی تھی۔ مگر یہ بھی سچ تھا کہ جعفر محمود صرف ایک خواب تھا۔ ایک ایسا خواب' جو ہر طوائف عمر کے ایک حصے میں ضرور دیکھتی ہے' یعنی ایک مالدار' صاحب حیثیت' صاحب جائیداد اور عزت دار شخص کے نام کا حوالہ پا کر معتبر ہونے کا خواب۔

جعفر..... بس اب اس خواب سے بڑھ کے بہت کچھ ہو چکا تھا۔ وہ شدت سے اسے چاہنے لگی تھی۔ ہر نیا دن اس شدت میں اضافہ کر جاتا۔ ہر ملاقات اس محبت کو دو آتشہ کر جاتی۔

جتنی یہ محبت زور پکڑتی جا رہی تھی۔ جعفر کو پانے کی طلب بھی اتنی ہی منہ زور ہوتی جا رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" جعفر نے ایک اور سگریٹ سلگاتے ہوئے اسے دیکھا۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا دی۔

"جو میں سوچ رہی ہوں' وہ کیسے کہہ دوں؟" اس نے آہستہ مگر شوخ آواز میں کہا تو جعفر کا دل دھڑک اٹھا۔ اسے رینا کی یہی محتاط سی بے باکی..... یا ادب سی شوخی تو پسند تھی۔

"کہہ دو نا' کیا؟" رینا نے سرگوشی کی۔

"ہاں بولو۔" وہ آہستہ کو جھکا اور اس کی جذب انداز آنکھوں میں جھانکا۔

"کچھ باتیں ان کہی رہنے دو۔ اچھا لگتا ہے۔"

ہر بار وہ اس کی کسی نہ کسی انداز میں کی ہوئی پیش قدمی پہ یونہی بند باندھ دیا کرتا تھا اور ریتا ہمیشہ جھینپ کر چپ ہو جاتی۔ یہ جھجک بھی جعفر کی بارعب شخصیت کو سامنے پاتے اس کے اندر عود کر آتی' ورنہ وہ ایسی کہاں تھی۔

"وہ مرد ہو کے اتنے محتاط' اتنے باادب ہیں۔ اپنی عورت کو اتنا کھلا ہوا دیکھنا پسند نہیں کریں گے۔ مجھے تو ان کی پہل کا انتظار صبر کے ساتھ کرنا ہو گا ورنہ مجھے لیلیٰ نسوانی اور بے حیا کی صف میں کھڑا کرتے میں وہ ایک پل کی دیر نہیں لگائیں گے۔"

یہی سوچ کر وہ دل کی بات ہونٹوں تک لاتے لاتے رہ جاتی۔

دوسری جانب جعفر نے بھی شاید یہ طے کر رکھا تھا کہ وہ ریتا کو اس خاص حد سے بڑھنے نہیں دے گا۔ یہ حد جو اس نے دوستی کے نام پہ خود عائد کر رکھی تھی۔

جعفر مڈل کلاس سے تعلق رکھتا تھا اور اب اپنی اعلا سرکاری ملازمت کی وجہ سے اپر کلاس کا کہلاتا تھا۔ اس کے خاندان کا ماحول تعلیم یافتہ مگر روایتی تھا۔ بعض کے ہاں اب تک پردے کی پابندی ہوتی تھی۔ وہ کو ایجوکیشن میں بھی نہ پڑھا تھا اس لیے صنف نازک سے دوستی کا ارمان ضرور رہا مگر پورا نہ کر سکا۔ اب کلاس امپروو کر جانے کے بعد اس کا حلقہ احباب بھی تبدیل ہوا مگر اسلام آباد میں اپنی فیملی کے درمیان رہتے ہوئے وہ ایسی دوستیاں کھلے عام افورڈ نہ کر سکتا تھا۔ لاہور میں اکیلے رہنے کا موقع ملا۔ چند بے تکلف دوستوں کی بدولت ریتا سے بھی ملاقات ہوئی تو برسوں پرانی خواہش انگڑائی لے کر بیدار ہوئی۔

کسی حسینہ سے فلرٹیشن کا تجربہ حاصل کرنے کی خواہش جو شاید ہر مرد کے اندر کہیں نہ کہیں' کسی نہ کسی مقدار میں ہوتی ہے۔

کہیں بڑھ کے ہوس اور عیاشی تک جا پہنچتی ہے۔

اور کہیں جعفر کی طرح صرف وقت گزاری کی بے ضرر سی تمنا۔

زیادہ بازاری ناز و ادا اور کھلا پن اس کی نفیس فطرت اور ذوق پہ گراں گزرتا تھا۔ دوسری جانب اپنی فیملی اور دوسرے ملنے ملانے والوں میں پائی جانے والی گھریلو' سادہ اور جھجکی شرمائی خواتین میں بھی وہ کوئی کشش محسوس نہیں کرتا تھا۔

ریتا کی صورت میں اس کی وقتی تسکین ہو رہی تھی۔ وہ شوخ اور بے باک ضرور تھی مگر چھچھوری اور بھونڈی حرکتیں کرنے والی کوئی عام بازاری لڑکی نہیں لگتی تھی۔

اب جعفر کی شامیں خوشگوار گزرنے لگیں۔ کبھی کسی ریسٹورنٹ میں' کبھی کسی پارک میں' کبھی لانگ ڈرائیو کرتے ہوئے تو کبھی شاپنگ کرتے ہوئے۔ اس شہر میں اس کے جاننے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اسی لیے اسے کوئی خوف بھی نہ تھا۔ آج کل وہ بتیس سال کی عمر میں' بائیس سال کی عمر والی تازگی محسوس کر رہا تھا۔

مگر کچھ دنوں سے ریتا کے انداز اسے چونکانے لگے تھے۔ شاید وہ اس دوستی' اس ہلکے پھلکے فلرٹ کو کسی اور رشتے یا کسی اور تعلق میں بدلنا چاہتی تھی۔ یہ وہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ نوبت یہاں تک نہ پہنچے کہ اسے ریتا سے صاف الفاظ میں بات کرنی پڑے۔ جب تک معاملہ چل رہا ہے' چلنا چاہیے۔ دوستی کی صورت میں وہ کبھی بھی اپنی راہیں الگ کر سکتا ہے' واپس اپنے شہر لوٹتے ہوئے آرام سے بائے بائے کر سکتا ہے مگر محبت وحبت... اگر ریتا نے یہ راگ الاپنا شروع کر دیا تو مصیبت ہو سکتی تھی۔

"پرسوں میں تم سے نہیں مل سکوں گا۔"

اس بار اس نے ویک اینڈ ساتھ گزارنے سے معذرت کر لی۔

"وہ کیوں بھلا؟ اپنے گھر جا رہے ہیں کیا؟"

"نہیں' کچھ دوستوں نے مل کر شنگریلا جانے کا پروگرام بنایا ہے۔ ساتھ تو دینا پڑے گا۔ آخر دوستی کا معاملہ ہے۔"

"اور یہاں معاملہ کون سا ہے؟" ریتا نے بڑی آس سے پوچھا۔ شاید جواب ملے۔ "دل کا۔"

مگر وہ صاف کترا گیا۔

"یہاں معاملہ مزاج آشنائی کا ہے' یعنی انڈر اسٹینڈنگ کا۔ تم تو میری بات سمجھ سکتی ہو۔ ضد نہیں کرو گی نہ ہی ناراض ہو گی مگر ان دوستوں کو سمجھانا مشکل ہے۔"

ریتا کا موڈ ہو رہا تھا ناراض ہونے کا۔ مگر جعفر کے مان بھرے انداز پہ وہ چپ کر گئی۔ اس کا "مزاج آشنائی" اور "انڈر اسٹینڈنگ" کا دعوا خود کیسے جھٹلا دیتی۔

❀ ❀ ❀ ❀

"بس۔ یہ خالی ٹاپس۔"

شمع نے ہاتھ پہ رکھے نیلم جڑے ٹاپس اچھالے جیسے ان کا وزن کر رہی ہو اور ناک چڑھائی۔

"مشکل سے ڈیڑھ دو تولے کے ہوں گے۔ ساتھ میں کوئی ہار' انگوٹھی کچھ بھی تو نہیں ہے۔ لینا تھا تو پورا سیٹ لیتیں۔"

"اس کی قیمت اس کے دو تولے سونے میں نہیں' اس میں لگے ان ذرا ذرا سے پتھروں میں ہے مگر تم یہ سب کیا جانو۔"

اس نے ماں کے ہاتھ سے جھپٹ کر دوبارہ کانوں میں پہن لیے۔

"سب جانتی ہوں میں۔ یا تو وہ تھوڑا تجھے الو بنا رہا ہے یا پھر تو مجھے الو بنا رہی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"یا تو وہ تجھے بے وقوف بنا رہا ہے یا پھر تو مجھے وہ سب دکھانا نہیں چاہتی جو اس سے بٹورا ہے۔ اپنے پاس دبا کے رکھنا چاہتی ہے۔ کیا بات ہے نا؟"

اس نے ٹٹولتی نظروں سے بیٹی کے کھلے کھلے چہرے کو دیکھا' جہاں آج کل ایک انوکھی سی چمک تھی اور شمع کے محدود تجربے اور علم کے مطابق چہرے پہ چمک صرف "مال" سے ہی آتی ہے۔

"اری کے کہنے پہ تو محفلیں سجانا چھوڑے بیٹھی ہے۔ ایک فون آتا ہے اور بھاگ جاتی ہے اس کے پاس۔ کئی کئی گھنٹے گزار کے آتی ہے۔ ایسے ہی تو کوئی اپنا وقت ضائع نہیں کرتا۔ خوب نواز رہا ہو گا تجھے۔ مگر تو کمینی یہ ماڑی موٹی چیزیں مجھے دکھا دیتی ہے۔ اصل مال کی ہوا نہیں لگنے دیتی۔"

"ایسی کوئی بات نہیں۔"

"میں نہیں مانتی۔"

"تو مت مانو۔ میرا کیا جاتا ہے۔" اس نے خاص پروا نہ کی اور ساڑھی کا پلو سمیٹتی اٹھ گئی۔ اس کے ہر انداز سے سرشاری اور بے نیازی جھلک رہی تھی۔

"اگر تیری بات مان بھی لوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خبیث انسان تجھے الو بنا رہا ہے۔"

"یہ آج تو کیوں سوار ہیں تمہارے ذہن پہ۔" وہ بار بار کی تکرار سے اکتا گئی۔

"جو نظر آ رہا ہے وہ کہوں گی۔ یہ تیرے کمانے کے دن ہیں' زندگی کے مزے لوٹنا ہمارا مقصد نہیں' بلکہ زندگی کے مزے لوٹنے والوں کو لوٹنا ہمارا پیشہ ہے۔ سمجھیں' اب وہی یہ تفریح' یہ مزے' یہ سیر سپاٹے' یہ عاشقی معشوقی ان سب کو لگام دے اور سیدھی طرح کام پہ دھیان دے۔"

"کتنی بار کہا ہے' میرے سامنے یہ الفاظ مت استعمال کیا کرو۔" وہ چلا اٹھی۔

"نہیں' برابر والوں کی ماسی روزانہ آکر صفائی وغیرہ کر دیتی ہے۔ البتہ کپڑوں کی دھلائی سے اس نے معذرت کر لی تھی اور رہے برتن وغیرہ تو وہ مل جل کر دھو لیتے ہیں مل جل کر۔"

"اچھی طرح جانتا ہوں کتنے مل جل کر دھوتے ہیں۔" مظہر نے ذرا یقین نہ کیا۔

"اور اس ڈھیر میں مجھے اپنے تمہارے اور سوہا کے کپڑوں کے علاوہ امی اور شمیم کے بھی کئی ایک کپڑے نظر آرہے ہیں۔ یہ پینٹ اصغر کی ہے۔ اور یہ شرٹیں بھی۔ یہ دونوں شلوار سوٹ ابا جی کے ہیں۔ اور یہ پردے' یہ بھی میرے خیال میں۔"

"میرے ساتھ کر یہ سارا حساب کتاب' محلے والوں کو کیوں سنا رہا ہے۔"

شمیم نے مظہر کو بچوں کی جانب جاتے دیکھ کر نصرت کو خبر دینے میں دیر نہ لگائی تھی اور نصرت نے بھی عین موقع پہ چھاپہ مارنے میں توقف نہ کیا۔

"اگر دھلائی سارے گھر کے کپڑوں کی ہو رہی ہے تو شمیم کو بھی ساتھ لگنا چاہیے تھا' یا اکیلی کیوں دھوبی گھاٹ کھول کر بیٹھے۔ یا پھر ملازمہ کے آنے کا انتظار کر لینا چاہیے تھا۔"

"انتظار ہی کر رہے ہیں ایک ہفتے سے میں نے تمہیں کہا تھا تو ابا جی نے زادی کو کہہ مشین لگا لے۔ اس نے اپنی مرضی سے لگائی ہے۔ بغیر مجھ سے پوچھے۔"

"ہاں اور اپنی مرضی سے ہی یہ سب کے کمروں سے میلے کپڑے بھی اکٹھے کر کے لائی ہے۔ بغیر آپ سے پوچھے۔" مظہر منزہ کے اشاروں کو بتا طریقے بتلاتے ہوئے ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔

"اس نے اپنی ضرورت کے تحت مشین لگائی ہوگی اور شمیم نے لا کر ڈھیر کر دیے۔ یہ پردے تک اتار کے پھینک دیے۔"

وہ منزہ کی عادت سے واقف تھا اس لیے بالکل درست اندازہ لگایا۔

"پرے کرو یہ سب۔" اس نے منزہ کو تڑخ کر کہا۔

"چار دن اور ملازمہ نہ آئی تب بھی گزارا ہو سکتا ہے۔ کپڑوں کی کمی نہیں ہے ان کے پاس۔"

"کیا ہو گیا ہے' مظہر؟" اسے واقعی یہ بات پسند نہ آئی۔ بعض اوقات مظہر بہت ہی بے بنیاد باتوں پہ بھڑک اٹھتا تھا۔

"اپنے گھر کا کام ہی کر رہی ہوں۔ ان سب کے کپڑے دھونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔ آخر میں ان کی بیٹی بھی ہوں۔"

"اور جو حقیقی بیٹی ہے اس کو تو بڑا فرق پڑتا ہے مل کے پانی پینے سے بھی۔"

"تمہیں میری بڑی تکلیف ہے۔ گھڑی گھڑی مجھے کوسنے تک جاتے ہو اپنی اس نگی کے کاپنے میں ٹھنڈ ڈالنے کے لیے۔"

شمیم اب تک اندر کھڑی سن گن لے رہی تھی۔ تڑپ کے سامنے آئی۔

"جس نے ماں کو منٹ میں پرایا کر دیا۔ وہ بہن کو کیا سمجھے گا۔"

اس ایکٹنگ نے غالباً مظہر کو بھی کچھ کچھ متاثر کر دیا۔ اس کا غصہ دھیما ہوا۔

"تم امی کے کپڑے دھو لو' وہ ماں ہیں' ان کی خدمت کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں مگر شمیم کے اپنے ہاتھ پیر سلامت ہیں۔ اس کا ڈھیر اسے واپس کرو۔ چاہے دھوئے یا پھینکے۔ یا ابا کے کپڑے' یہ پردے یہ سب کچھ لانڈری بھجوا دو۔ اتنے بھاری کپڑے تم کیسے دھوؤ گی۔"

"ہاں یہ بھی لگتا احسان کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ نخرے تو ایسے اٹھائے جا رہے ہیں۔ مہارانی کے جیسے دس نوکروں سے اٹھ کے آئی ہو۔ اپنے گھر چاہے مشین پہ دھونا بھی نصیب نہ ہوتا ہو۔ ڈنڈے سے کوٹ کوٹ کے اور برش سے رگڑ رگڑ کے دھوتی ہو گی۔"

نصرت بڑبڑ کرتی اندر پلٹ گئی۔

"تم نے اپنی انہی حرکتوں کی وجہ سے سب کی عادتیں خراب کی ہوئی ہیں۔"

اب اس کی ناراضی کا رخ منزہ کی طرف تھا۔ وہ چپ چاپ اپنا کام کرنے لگی۔

"اب آپ اصغر کی شادی بھی کر ہی دیں۔ اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے بھی کوئی ہونا چاہیے کب تک ماں اور بھائی کے سہارے عیش کرتا رہے گا۔"

اندر آکے اس نے ریموٹ اٹھاتے ہوئے ماں کو مشورہ دیا۔

"عیش کرا تا بھی تو ہے۔ تم تو چند ہزار روپوں کے خرچے کے لیے دیتے ہو۔ بجلی کے اتنے بڑے بڑے بل' نوکروں کی تنخواہیں' اوپر نیچے کے خرچے' یہ سب وہی پورے کرتا ہے۔"

"کون سا پلے سے کرتا ہے۔ ابا جی کا جما جمایا کاروبار ہے۔ مجھے ساری خبر ہے۔ مہینے میں ڈیڑھ لاکھ تک آمدنی ہوتی ہے' کبھی اس سے بھی زیادہ چالیس پچاس ہزار بھی اگر یہ ملازمت لگا دیتا ہے تو کیا کرے میں ہے۔"

"محنت بھی اسی کی ہے۔" نصرت کی ساری ہمدردیاں اصغر کے ساتھ تھیں۔

"اس سے مجھے انکار نہیں۔" مظہر نے فراخ دلی سے اعتراف کیا۔ "اور اسی لیے کبھی ایسا حساب نہیں کیا۔ مگر میں اس کی کمائی کے رعب میں آنے والا نہیں۔ اور ایسا برا کیا کہا ہے میں نے۔ اس کی شادی کرنے کا ہی کہا ہے۔ بڑے کے بعد اب چھوٹے کی شادی کا ذکر۔" شمیم پہلو بدلنے لگی۔

"میں کیوں اپنا بڑھاپا خوار کروں۔ میں کیوں کروں اس کی شادی۔ کرے گا وہ بھی خود ہی' تمہاری طرح۔ لے آئے گا کوئی حور پری میرے سر پہ بٹھانے کے لیے۔"

کچھ دیر پہلے اصغر کی حمایت میں بولنے والی نصرت کے لہجے میں اب شکوے تھے۔

"یعنی اس نے کوئی پسند کر لی ہے؟"

مظہر کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ اس کا خیال تھا کہ اصغر صرف دو کو چار بنانے میں ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ یہ نہ پتا تھا کہ اسے زندگی بنانے کا خیال بھی آگیا ہے۔ اس نے اصغر سے کھل کے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

اصغر نے اس کے کمرے میں بلا کر بات کرنے پہ حیران ہوتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں ہے تو خاص بات' سنا ہے تم بڑے چھپے رستم نکلے ہو۔"

مظہر کے نٹا نگانے پہ اصغر گھبرا گیا۔ اور نزدیک کھیلتی سوہا کو گود میں اٹھا کے گدگدانے لگا۔ مظہر اس کی اس حرکت سے سمجھ گیا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔

"سوہا! چاچو کے ساتھ جوائے لینڈ جائے گی۔ آئس کریم کھائے گی' پارا پارا فراک لے گی۔ چلو جی۔"

سوہا سے وہ واقعی پیار کرتا تھا مگر اس وقت صرف مظہر کے اگلے سوال سے بچنے کے لیے سوہا کے بہانے نکلنے کے چکر میں تھا۔

"جائے گی' ضرور جائے گی۔" مظہر نے اسے کھسکنے نہ دیا اور پکڑ کر دوبارہ اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"آئس کریم بھی کھائے گی' فراک بھی خریدے گی مگر پہلے چاچو کا پول کھولے گی۔"

"پول۔" اصغر کا رنگ اڑ گیا۔ جس پہ مظہر ٹھٹکا وہ کوئی سولہ سترہ سالہ نوخیز لڑکا نہ تھا جو کسی محلے میں شروع کیے کسی معاشقے کی خبر گھر تک پہنچنے پہ گھبرا رہا تھا۔

"تم تو ایسے ڈر رہے ہو جیسے کہیں ڈاکہ ڈالا ہو۔ جس کی مخبری میں کرنے والا ہوں' ابے۔ پیار کیا تو ڈرنا کیا۔ اپنے بڑے بھائی سے سبق حاصل کر۔" اس نے بے تکلفی کی فضا پیدا کرتے ہوئے اس کی جھجک ختم کرنا چاہی۔

اصغر کچھ شرماتا' کچھ کھسیاتا اسے دیکھنے لگا۔ مظہر کا صحت مند خوش باش چہرہ' کھلی کھلی مسکراہٹ' جگمگاتی

آنکھیں۔ سلیقے سے سجا گھر، جس کا کونا کونا مکینوں کی محبت کا گواہ تھا۔ بیٹی بھی کھلونوں سے کھیلتی ایک ننھی منی پیاری سی گڑیا۔ جانے کی ارے سے لے کر اندر تک ایک تعلیم یافتہ سلجھی ہوئی خوش شکل شریک حیات

سب کچھ کتنا مکمل تھا۔

اور قابل رشک بھی۔

اس کے دل میں بھی خوشگوار ازدواجی زندگی کا آغاز کرنے کی خواہش اور بھی قوی ہو گئی۔ وہ منزہ کے روپ میں ریتا کو اور مظہر کے روپ میں خود کو دیکھ رہا تھا۔

"کون ہے وہ؟" مظہر نے ٹٹولا۔

"وہ۔۔۔ ریتا ہے اس کا نام۔" کچھ جھجکتے ہوئے اصغر نے کہا۔ ساتھ ہی کن اکھیوں سے بھابی کی طرف دیکھا۔

"ہوں۔۔۔ نام تو خوبصورت ہے کیوں منزہ! اور خود کیسی ہے وہ؟"

"اچھی ہے۔"

"امی کیا کہتی ہیں؟"

"ابھی کچھ کہنے کی نوبت ہی نہیں آئی۔"

"تو بات کرو یار! کیا لڑکیوں کی طرح شرما رہے ہو۔ دیر کرتے رہے تو امی لے آئیں گی۔ خاندان کی کسی بانو یا ثریا کو جو ثمینہ سے بھی دو ہاتھ آگے ہوگی۔ گھر کیا تمہیں پانی پت کا میدان بن جائے گا۔ تمہیں تو پتا ہی ہوگا ہمارے خاندان میں کیسی کیسی رضیہ سلطانہ اور جھانسی کی رانیاں ہیں۔ یار ایک میری بیوی ہے بے چاری مسکین۔ اس کا کیا بنے گا۔ ایسی "خاندانی" بلا کو دیورانی تو اسے چٹکی میں مسل دے گی۔ ہمت کرو اور امی کو بتا دو۔"

"ڈر لگتا ہے۔"

"مرد بن یار! میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔" مظہر نے حوصلہ دیا۔ اصغر نے نظر اٹھا کے اسے دیکھا اور تصدیق چاہی۔

"وعدہ؟ اور اگر بعد میں پیچھے ہٹ گئے تو۔۔۔؟"

"میں تمہیں پیچھے ہٹنے والوں میں سے لگتا ہوں؟ ایسا ہوتا تو آج منزہ میرے ساتھ نہ ہوتی۔ اس کے لیے کیا امی اور ثمینہ نے کم پھڈا کیا تھا۔ سو سو اعتراض تھے ان کے۔"

"وہ اعتراض الگ تھے مگر ریتا۔۔۔ میں جانتا ہوں امی کبھی نہیں مانیں گی۔"

"ایسی کیا بات ہے۔ صاف صاف کیوں نہیں بتاتے۔" اب مظہر کو بھی کسی گڑبڑ کا احساس ہوا۔ اس کا اندازہ تھا شاید منزہ کے میکے والوں سے بھی گئے گزرے خاندان سے ہوگی۔ کیا پتا کوئی جاب وغیرہ کرتی ہو کیونکہ نصرت کے خیالات ملازمت کرنے والی لڑکیوں کے بارے میں بھی اچھے نہیں تھے۔

"وہ دراصل ریتا جو ہے ناں، نہیں وہ نہیں، اصل میں اس کی ماں۔۔۔" وہ پھر رک گیا۔

"ہاں کیا ہے اس کی ماں کو؟ دوسری شادی کر رکھی ہے یا مطلقہ ہے؟"

مظہر نے ایک اور اندازہ لگایا۔ دوسری شادی کرنے والیوں اور مطلقاؤں کے بارے میں بھی اس کی ماں نادر شاہی فرمودات نشر کرتی رہتی تھی۔

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ وہ کوٹھے والی ہے۔"

"کیا۔۔۔؟" مظہر کے لبوں تک آتا چائے کا کپ اچھل گیا۔

"کیا بکواس کر رہے ہو؟ تم نے کوٹھوں پہ آنا جانا شروع کر دیا؟ کوئی پوچھنے والا نہیں اس لیے جو دل چاہے کرتے پھرو گے۔"

ابھی تک دوستانہ انداز میں گپ شپ کرتا وہ یکدم بھڑک کر اس پہ آنکھیں نکالنے لگا۔ اصغر اگرچہ چھوٹا تھا عمر

میں گھر کا ماحول ایسا تھا کہ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ اور بڑوں کا چھوٹوں پہ رعب کم ہی نظر آتا تھا۔ وہ بھی ہرگز ایسے شدید تاؤ اور جواباً آنکھیں دکھا سکتا تھا۔

لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ وہ اکیلا کمزور پڑ رہا تھا۔ جانتا تھا ریتا کی خواہش کر کے اس نے کوئی قابل فخر یا لائق تحسین کارنامہ نہیں انجام دیا۔ اسے اب حمایتوں کی ضرورت تھی نہ کہ مخالفتوں کی۔ مصلحت کا تقاضا تھا کہ مظہر کی ڈانٹ ڈپٹ خاموشی سے سن لی جائے۔

اس کے برعکس منزہ شوہر کے غیظ و غضب پہ ڈر گئی۔ اسے خطرہ تھا کہ اب تک مسکرا مسکرا کے باتیں کرتے دونوں بھائی اچانک گتھم گتھا نہ ہو جائیں۔

"تم بازاری عورتوں کے چکر میں پڑے کیسے؟"

"ریتا ایسی نہیں ہے۔" وہ تڑپ کے اٹھ کھڑا ہوا۔

"اچھا۔۔۔؟ اس کی ماں کوٹھے والی ہے اور وہ خود کیا ٹیوشن پڑھاتی ہے؟ کسی مدرسے میں استانی لگی ہوئی ہے؟"

"وہ ایک پڑھی لکھی لڑکی ہے۔"

"آج کل طوائفوں میں بھی ڈگریاں لینے کا رواج ہے۔ کوئی نئی بات نہیں۔" وہ متاثر نہ ہوا۔

"وہ اپنی ماں سے مختلف ہے۔"

"ہاں ہاں ٹھمریاں گاتی تھی، یہ دری مکس گاتی ہوگی۔ ماں مجرے کرتی تھی یہ ڈسکو کرتی ہوگی۔"

مظہر نے اپنی کسیلی زبان کے جوہر دکھانے شروع کیے تو اصغر برداشت نہ کر سکا۔

"بس کریں بھیا! زیادہ بکواس نہیں سنوں گا۔"

"ابھی تو تم پتا نہیں کیا کچھ سنو گے امی سے۔ ابا جی سے، سارے خاندان سے، ہر ملنے ملانے والے سے، یہ بات ذرا منہ سے نکال کے تو دیکھو۔" اس نے چیلنج کیا۔

"تم نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ کہا تھا کہ میرا ساتھ دو گے۔" اصغر نے پھر التجائیہ انداز اختیار کیا۔

"ہاں کہا تھا۔۔۔ تمہاری شادی تمہاری پسند کی جگہ کرانے میں تمہاری مدد کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ یہ نہیں کہا تھا کہ گھر میں تم کسی بھی طوائف کی لڑکی کو لا کے بٹھا دو گے تو میں برداشت کر جاؤں گا۔ تمہیں کوئی محبت نہیں ہوئی گدھے۔۔۔ تم کسی غلط جگہ پھنس گئے ہو۔ ہو تو بے وقوف ہی۔"

"اب یہ بے وقوف سب کو بتائے گا کہ وہ اصل میں ہے کیا۔"

اصغر نے گلا پھاڑ کے اعلان کیا۔ سویا سمبہ کے رونے لگی تو منزہ نے فوراً اسے گود میں اٹھا لیا۔

"واقعی گدھا تھا میں جو اتنے سالوں سے سارے ٹبر کا بوجھ ڈھوتا رہا۔ میری خوشی کا وقت آیا تو کوئی ہاتھ آگے نہیں کر رہا۔ نہیں تو نہ سہی میں بھی اب گدھا پن سے اتنے لوگوں کا بوجھ نہیں اٹھاؤں گا۔ اپنی اپنی کریں سب اور میں اپنی کروں گا۔"

ریتا کا عشق اس کے سر چڑھ کے بول رہا تھا، اسی لیے وہ اس کی جانب سے شادی کا اقرار سننے سے پہلے ہی یک طرفہ جنگ لڑنے لگا۔

"پاگل ہو گیا ہے۔" اس کے نکلنے کے بعد مظہر نے منزہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ پیار سے سمجھاتے تو شاید۔۔۔"

"رہنے دو۔۔۔ یہ الٹی کھوپڑی ہے۔ آرام سے کچھ سمجھ میں نہیں آتا اسے۔ امی ایک جھٹکے میں ٹائٹ کر دیں گی۔"

"لیکن آپ نے سنا اس نے کیا دھمکی دی ہے۔ امی کا سارا رعب دبدبہ ایک طرف لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان کے بیشتر خرچے اصغر نے اٹھا رکھے ہیں۔ اگر اس نے واقعی ہاتھ کھینچ لیا تو آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ کیا

جب اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر پروین نوید مراد کو بلانے جا رہی تھی تب اس نے چپکے سے اپنے میاں سے کہا تھا۔

"بھائی جان کو طریقے سے سنبھال لیجئے گا۔ ان کے زخموں پہ ہمدردی کا پھاہا..."

تب بات کاٹتے ہوئے سراج الدین نے کھردرے لہجے میں اپنا ایک زریں قول سنایا تھا جس کے بعد وہ خاموشی سے منہ لٹکا کر چلی گئی اور ابھی تک دوبارہ اندر نہیں آئی تھی۔

سراج دین کوفت کے عالم میں ٹانگ پہ ٹانگ چڑھائے بے دلی سے ادھر ادھر نگاہیں دوڑا رہے تھے۔ گاہے گاہے ایک اچٹتی نظر سامنے بیٹھے نوید مراد پہ بھی ڈال لیتے۔ جو یہاں موجود ہوتے ہوئے بھی موجود نہ تھا۔ باہر سے بلند بولنے والی ملازمہ کی سنگلاخ گفتگو کانوں پہ پتھر کی طرح برس رہی تھی جس سے وہ نجانے کیسے فیضیاب ہو رہی تھی۔ شمشاد بیگم تو حسب عادت محلے کے سفارتی دورے پہ نکلی ہوئی تھیں۔ کبھی کبھی چند روز کی بچی کے رونے کی نحیف سی آواز بھی سنائی دیتی۔

"کہاں رہ گئی پروین۔" سراج دین نے رسٹ واچ پہ ٹائم دیکھا اور برا سا منہ بنا کے بڑبڑائے۔

"ایسا کون سا سازوسامان لے آئی تھی جو سمیٹنے میں اتنا وقت لگ گیا۔"

"میں دیکھتا ہوں۔" نوید مراد اپنے خیالوں سے چونکا اور یہ کہتے ہوئے اٹھا مگر اتنے میں پروین چائے کی ٹرالی گھسیٹتے ہوئے اندر آ گئی۔

"اس تکلف کی ضرورت کیا تھی۔" وہ کسمسائے اور ساتھ میں زیرلب وہی بڑبڑانے کی عادت...

"اب مزید آدھا گھنٹہ برباد۔"

پروین نے گھبرا کے اپنے بھائی کے چہرے کی جانب دیکھا۔ لیکن شاید وہ اپنی غائب دماغی کی وجہ سے اس بڑبڑاہٹ پہ غور نہ کر سکا۔

"آپ فیکٹری سے سیدھا یہیں آ رہے ہیں۔ چائے ابھی تک نہیں پی ہو گی اس لیے میں لے آئی۔"

وہ کپ آگے بڑھاتے ہوئے منت بھری نظروں سے شوہر کو دیکھ رہی تھی جیسے کہہ رہی ہوں نا

"خدارا کچھ دیر بڑبڑاہٹ پہ قابو رکھیں۔"

"ساجدہ ہوتی تو کبھی تمہیں کھانا کھائے بغیر لوٹنے نہ دیتا تھا اس نے۔" نوید مراد کی کھوئی کھوئی آواز نے ماحول میں افسردگی گھول دی۔

"اور آج تم میکے میں مہمان ہو مگر تمہاری میزبانی کرنے والی بھابھی نہیں ہے پروین.... تمہیں خود چائے بنا کے لانا پڑی ہے۔"

اس کی آواز کپکپا گئی تو پروین بھی دوپٹہ منہ پہ رکھ کے سسکنے لگی۔ سراج سے چائے کا گھونٹ حلق میں اتارنا مشکل ہو گیا۔

"اس میں رونے والی کیا بات ہے۔ پروین! ایسا ہی ہے تو تم چائے نہ بناتیں۔ ویسے گھر میں بھی بناتی رہتی ہو۔ دن میں کئی کئی بار' یہاں بنا لی تو رونے بیٹھ گئیں۔"

اپنی جانب سے شگفتگی کا مظاہرہ کر کے ماحول کو ہلکا پھلکا بنانا چاہا مگر واضح طور پر پروین کو یہ لن ترانی ایک آنکھ نہیں بھائی۔ وہ اپنی آنکھیں خشک کرتے ہوئے انہیں شکایت آمیز نگاہوں سے تکنے لگی۔ وہ کھسیا کے چائے میں بسکٹ ڈبو ڈبو کر کھانے میں مگن ہو گئے۔

"وشمہ کہاں ہے؟" نوید نے پوچھا۔

"وہ ابھی سلا کے آئی ہوں۔ روئے چلے جا رہی تھی۔ شاید پیٹ میں درد ہے۔"

"یہ کون ذات شریف ہیں۔۔؟" جھنجھلایا ہوا۔ آدھا بسکٹ کچھ زیادہ ہی نرم ہو کے چائے کے کپ میں غڑاپ ہو چکا تھا۔ اسے چمچ سے نکالنے کی کوشش کرتے ہوئے سراج نے سرسری سا پوچھا۔

"بھائی جان کی بیٹی ہے۔" پروین کی آواز اب تک رندھی رندھی سی تھی۔

"اوہ... ہاں... میں تو بھول ہی گیا۔"

"[illegible]"

"[illegible] سال۔"

[illegible] شاید سراپا بولنے والی کرخت نقوش کی ملازمہ نے پردہ اٹھا کے جھانکتے ہوئے اطلاع دی۔

"جانا ہے؟" پروین گھبرا گئی۔ "بس کرو تو آ لیتے ہو۔ یہ میرے شوہر آئے بیٹھے ہیں مجھے لے جانے کے لیے مجھے بھی اپنے گھر کے لیے نکلنا ہے۔"

"اچھا" اس چیچک کے رنگ والی ملازمہ نے جس کے چہرے کے نقوش اور مردانہ ہاتھ پیر بھی "ملا لیا" کی وضاحت کے ساتھ ہی دخل کر تیار ہوئے تھے۔ ترچ ترچ کرتے الفاظ سے بھرپور تقریر سنا ڈالی جس کا لب لباب یہ تھا۔

"ہاں سکتی آنے کا پتہ نہ جانے کا۔ وہ دگر رات تک واپس نہ آئی تو میں بیٹھی تو نہیں رہ سکتی۔ صبح کی کام پہ نکلی ہوں۔ بچے گھر پہ اکیلے رہتے ہیں۔ گھر جا کر ان کی بھی روٹی پانی کا بندوبست کرنا ہے۔ مرد بھی تیکھی مزاج اور جھگڑالو ہے۔ دیر سے گئی تو... وغیرہ وغیرہ"

"اسے تو چپ کراؤ..." اس کی تقریر ناقابل برداشت حد تک طویل ہو گئی تو سراج نے ناگواری سے اپنی بیوی کو اشارہ کیا۔

"رخصت کرو بھئی اسے۔ بٹھا کے کیا لینا ہے۔"

"اماں گھر نہیں ہیں' میں جا رہی ہوں۔ بچی گھر میں اکیلی ہے۔ ویسے تو سو رہی ہے لیکن جاگ گئی تو بھائی جان کیسے سنبھالیں گے۔ اس کے لیے فیڈر کیسے بنائیں گے۔" بات کرتے کرتے اس کے آنسو بہہ نکلے۔

"طبیعت بھی ٹھیک نہیں لگ رہی بچی کی۔"

سراج نے نہ ہاں کہا نہ ناں' بس لاتعلقی سے گھڑی دیکھتے رہے۔ یہ انداز بھانپ کر نوید نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"تم فکر مت کرو پروین... میں وشمہ کو سنبھال لوں گا اور اماں کون سا دور سے شہر گئی ہیں۔ آتی ہی ہوں گی۔ تم بے فکر ہو کے اپنے گھر جاؤ۔ تمہارے بچے بھی تمہارے انتظار میں ہوں گے۔"

ان کلمات کو سراج نے نکلنے کا عندیہ جانا۔ چابیاں میز سے اٹھائیں اور کھڑے ہو گئے۔

"چلیں...؟" پروین نے یوں سر ہلایا جیسے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہو۔ اندر سے اپنی چادر لانے گئی تو بستر پہ بے خبر سوئی وشمہ کو دیکھ کر اس کا دل بھر آیا۔ بے اختیار اسے پیار کرنے لگی... وہ ذرا سا کسمسائی تو ڈر کے پرے ہو گئی۔

"اے ہے' کہیں جاگ ہی نہ جائے' کیسی آفت مچا کے تو سوئی ہے۔ بچی نیند سے جاگ گئی تو پریشان کرے گی بھائی جان کو۔ یہ اماں بھی نا بس... حد ہوتی ہے غیر ذمہ داری کی بھی۔ اب انہیں گھر میں ٹکنے کی عادت ڈال لینا چاہیے۔ بھائی جان کو کام دھندے پہ بھی نکلنا ہو گا یا بچی کی ... ہی کرتے رہیں گے۔ کتنا سمجھایا تھا انہیں رات کو مگر سب بے سود۔ اب بھی تین گھنٹے ہو رہے ہیں پوچھا تک نہیں کہاں ہیں' کیوں ہیں اور کب تک ہیں۔"

وہ وشمہ کی ننھی گلابی مٹھیاں دھیرج سے سہلاتے ہوئے کڑھ رہی تھی۔

"چلو آ جاؤ بھئی۔"

کمرے کے باہر سے سراج دین پوری آواز کے ساتھ چلائے تھے۔ بچی نے نیند میں چونک کے ہلکا سا جھٹکا لیا تھا۔ پروین گھبرا کے اسے تھپکنے لگی۔

"ایک تو میاں صاحب... جب بلائیں گے حلق پھاڑ کے۔"

بچی کو کروٹ دے کر سلانے کے بعد اس نے ننھا سا ایک تکیہ اس کے بازو پہ رکھا تاکہ اسے دسراہٹ کا احساس ہو اور دبے پاؤں باہر نکل آئی۔ مبادا دوسری آواز نہ آ جائے۔

وہ جتنا چاہتی تھیں کہ وہ بلاناغہ صبح شام گھر پہ فون کر کے ان کی خیریت دریافت کرتی ہے۔ دوائی؟ کیا کھایا؟ آرام؟ دغیرہ۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات پوچھتی ہے اور ابھی سراج کے آنے سے دس بارہ منٹ پہلے ہی اس نے ان سے بات کر کے فون رکھا تھا۔ وہ ان کی خیریت سے لاعلم نہیں تھی جو دریافت کرتی۔ مگر وہ یہ سب ان کو بتا نہ سکی۔ اس کے ذہن میں ایک ہی بات گردش کر رہی تھی۔

"اتنی سی بات چبھ گئی کہ میں نے ان کی والدہ کی خیریت دریافت کیوں نہیں کی۔ یہ اعتراض تو میں بھی کر سکتی ہوں میاں صاحب بلکہ میرے پاس تو اعتراض کرنے کی توجیہہ زیادہ کھری ہے۔ میری اماں سامنے کھڑی تھیں اور آپ نے رواداری میں حال چال پوچھنا تو در کنار سلام بھی مارے باندھے منہ ہی منہ میں بدبدا کے کیا تھا۔ کیا مروت کے اصول و قواعد صرف مجھ جیسی ایک عورت پہ لاگو ہوتے ہیں؟ آپ یعنی مرد ان سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ چلیں۔ میرے پاس تو تربیت کی کمی ہے بقول آپ کے پھر بھی اپنے طور پر اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے کر گزارے لائق حسن سلوک کر رہی ہوں اپنے سسرالی عزیزوں سے مگر میاں صاحب آپ کے پاس تو تربیت دینے والی ہستی بھی ہے۔ پھر آپ کیوں نہ استفادہ حاصل کر سکے۔"

یہ سب باتیں وہ دل ہی دل کے ساتھ سوچتی ہی رہی۔ زبان پہ لانے کی ضرورت نہ سمجھی کہ سراج دین ان لوگوں میں سے نہ تھے جو آئینہ دیکھ کر سنبھل جایا کرتے ہیں۔ خود کو سنوار لیا کرتے ہیں۔ وہ آئینے میں حسب منشا عکس نظر نہ آنے پہ آئینہ ہی پتھر مار کے توڑ دینے والے لوگوں میں سے تھے۔

گھر پہنچ کر بچوں کو دیکھ کر وہ سب بھول بھال گئی۔

دیر تک انہیں سینے سے بھینچے رہی۔ جیسے مدتوں بعد مل رہی ہو حالانکہ ان پندرہ دنوں میں اماں جی کا کئی بار آنا ہوا تھا اور وہ صرف اس سے ملوانے کی خاطر بچوں کو بھی ساتھ لیتی آئی تھیں۔

"اور تم تو اچھی رہیں؟"

شوکت جہاں نے فوراً "سب کی خیریت دریافت کرنے کے بعد اس سے پوچھا۔ اس نے سرشاری سے ہلا دیا۔ میاں کی بے رخی کا ملال کچھ کم ہونے لگا تھا وہ محبت و عقیدت سے ساس کا کھانا دبانے لگی۔

اگرچہ فون پہ روزانہ ہی بات ہو جاتی اور سب حالات کا علم بھی ہوتا رہتا تھا اس کے باوجود انہوں نے میکے آئی بہو سے ہر شخص کی بابت پوچھا تھا۔ حتیٰ کہ ننھی سی وشمہ کے بارے میں بھی۔ جب کہ شمشاد بیگم نے رسماً بھی داماد سے چلتے وقت یہ نہیں کہا تھا کہ اپنی اماں کو میرا سلام کہنا۔

"بچے تمہارے بغیر تو خاصا اداس رہے۔ بہت مشکل ہو جاتی ہے۔ کبھی کبھی سنبھالنے میں خصوصاً حسان اور وصی کو...... دن بھر تو کھیلتے رہتے تھے خوب مزے میں۔ بے چاری بنا بہلائے رکھتی تھی۔ اچھی عادت کی بچی ہے۔ اس پہ نہیں پڑی۔"

بات کرتے کرتے انہوں نے آخری فقرہ ذرا آواز دبا کے کہا۔ پروین کے ہونٹوں پہ ہلکی سی مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ تائید میں سر ہلا کے ناگلیں دابتی رہی۔ شوکت جہاں پھر سے اصل موضوع پہ آ گئیں۔

"تکرار ہوتی نہیں کہ دونوں کا رونا بسورنا شروع۔ ایک کہے ممی دوجا پکارے مائی ام حسن کو پڑا ہے۔ رو کر یا چیخ کر اس نے تمہاری ضد نہیں کی مگر چپ چپ اداس سا رہا۔ جیسے تم سے ضد کر کے یا فرمائش کر کے اپنی منوا تا تھا۔ ویسے اس نے تائی سے ایک بار نہیں کہا کہ چپس بنا دیں شربت چاہیے وغیرہ۔ اور نہ اس پھلی پانس نے کبھی منہ سے کہا۔ چلو اللہ بھلا کرے اس کا۔ جیسے بھی سہی اتنے دن بچوں کو سنبھالا تو سہی ماں جیسی محبت اور توجہ نہ دی مگر خیال تو رکھا۔ کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ دل میں تنگ ہوئی بھی ہو تو زبان سے نہیں کہا۔"

یہ ان کی عادت تھی کسی سے گلہ دل میں نہ رکھتیں فٹ سے کہہ ڈالتیں اسی طرح کسی کی اچھی بات کی تعریف کرنے میں بھی بخل سے کام نہ لیتیں۔ یہ سب باتیں انہوں نے فون پہ بھی پروین سے نہیں کی تھیں کہ وہ بچوں کے بارے میں سن کر پریشان نہ ہو۔ اب ساری تفصیل سے آگاہ کر رہی تھیں۔

وقت پہ بچوں کو تیار کر کے ناشتہ کروا کے اسکول بھیجتی رہی۔ ان کے کپڑے لتے نہلانے دھونے کا انتظام کرتی رہی۔"

واپسی کے احسان ایک ایک کر کے گنوا رہی تھیں۔

"رسیلا ہے بھابھی کی۔ میں ان کا شکریہ ادا ضرور کروں گی۔" وہ دل سے ممنون ہوئی حالانکہ ایسی ڈیوٹیاں وہ مہینے میں دو تین بار پورے پورے دن کے لیے ضرور ادا کیا کرتی تھی جب رخشندہ کسی دوست کے ہمراہ تبلیغی درس یا شاپنگ وغیرہ کے لیے بچے گھر پہ چھوڑ کے جایا کرتی۔ البتہ پروین کا یہ پہلا موقعہ تھا۔

"ہاں یاد سے کرنا۔ ایسے تکلفات کو بہت اہمیت دیتی ہیں ہماری بہو صاحبہ۔۔۔ حالانکہ اپنوں میں کیسا احسان جتانا۔"

انہوں نے بات ٹھنڈی اور پھر حسب عادت دوسری پھیلا دی۔

"تم کیوں چپ چپ سی ہو۔ میں ایک گھنٹہ بھی کہیں گزار آؤں تو سنانے کے لیے دس باتیں ہوتی ہیں اس حساب سے تو پندرہ دنوں میں ہزاروں باتیں جمع ہو چکی ہوں گی۔"

"پندرہ دن کیسے گزرے ہیں اماں جی! آپ بھی جانتی ہیں۔" اس کی آواز سے ہی دکھ کا اظہار ہو رہا تھا۔

"صبر کرو بیٹی! جانے والے چلے گئے۔ اب آنسوؤں کو واپس نہیں لا سکتے۔ بس مغفرت کی دعا کرو۔"

"جانے والوں پہ تو صبر کیا جا سکتا ہے اماں جی! جو باقی رہ گئے ان کے حال پہ دل کیسے صبر کرے۔ وہ ذرا سی بچی بن ماں کی بچی۔۔۔ اس کی صورت آنکھوں میں پھرتی ہے تو صبر نہیں آتا۔ کیسے پلے گی وہ ننھی سی جان۔"

"اللہ مسبب الاسباب ہے۔ جس نے پیدا کیا ہے وہی ذات پاک پرورش کا وسیلہ بھی بنا دے گا۔"

"اماں سے اس عمر میں بچی کیا پالی پوسی جائے گی۔ بھائی جان سارا دن گھر پہ نہیں ہوں گے۔ دوسری کوئی عورت گھر پہ نہیں۔ مجھے تو سوچ سوچ کے ہول اٹھتے ہیں۔"

"ہاں وہی والا مسئلہ۔" انہیں زہرہ کے جانے کا وقت یاد آ گیا۔ وہ بھی چند دن کے وصی کو گود میں لے کر روتی آنکھوں آنسو روتی تھیں۔

"شمشاد بہن کو چاہیے تھا چند سالوں کے لیے بچی ننھیال میں رہنے دیتیں۔ بچی شروع کے دن مشکل ہیں۔ ذرا سیانی ہو تو واپس لے آئیں۔"

"ایسا ہو سکتا تو مشکل کیا تھا مگر ننھیال میں نانا نانی تو ہیں نہیں بھائی بھاوج ہیں۔ وہ بھی روکھے سے۔ ایک تو حالات اچھے نہیں ان لوگوں کے۔ دوسرا دل بھی تنگ ہیں۔ حالات کی تو خیر ہے اگر وہ وشمہ کو تین چار سال سنبھالنے کی ہامی بھرتے تو بھائی جان ہر ماہ معقول رقم اخراجات کے لیے دے دیا کرتے۔ لیکن ان کے دلوں میں خدا ترسی اور محبت تو بھری نہیں جا سکتی خون سفید ہو گیا ہے سگے رشتوں کا۔ ایک بار بھولے منہ سے نام نہیں لیا انہوں نے بچی کا۔ ایسے بھی ہوتے ہیں ماموں اور ایسی بھی ہوتی ہیں ممانیاں۔"

اٹھتے چھپے الفاظ میں اپنا احسان جتانا چاہا کہ کیسے نند کے بچے کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ آخر وہ بھی تو ممانی ہے۔

"ہاں سچ ہے۔ کون لیتا ہے کسی کی ذمہ داری۔" شوکت جہاں کے الفاظ پہ پروین کو دھچکا سا لگا۔ (کیا اس نے یہ ذمہ داری جی جان سے نہیں لی تھی)

اس کے ہاتھ ان کی ٹانگوں پہ سست سے پڑ گئے۔

☼ ☼ ☼

"گیارہ بج رہے ہیں اور ابھی تک سارا گھر الٹا پڑا ہوا ہے۔ نہ صفائی ہوئی ہے نہ پھیلاوا سمیٹا ہے۔ نہ ناشتے کے برتن دھلے ہیں اور تو اور ہانڈی تک نہیں چڑھائی جب کہ تمہارے سسر ناشتہ نہیں کرتے اور ٹھیک بارہ بجے لاٹ صاحب کو گرم گرم پھلکوں کے ساتھ تازہ سالن چاہیے ہوتا ہے۔ اب کیا میں اپنا کلیجہ توڑ کے (ٹکڑے) کر کے ان کے آگے رکھوں گی۔"

"دکھانے لوگ کے تماشے تو نہ کر۔ جلی ہوئی چیز مجھے کہاں ہضم ہوتی ہے۔"

سسر صاحب کہاں کم تھے۔ نصرت بی بی کی چیخ پکار زور پکڑ گئی تو کھانے کے لیے رکھنے کی پیش کش سن کر انہوں نے اپنے کمرے سے با آواز بلند یہ تبصرہ نشر کیا۔

"بس تم اندر بیٹھی ٹی وی دیکھتی رہو یا "چکریاں" (طنز) کرتے رہو۔ غضب خدا کا۔ تین تین نوکر لگے ہوئے ہیں گھر میں۔ پہلے کپڑے دھونے والی کچھ دن نہیں آئی تو بڑا احسان کر کے بیگم صاحبہ نے مشین لگائی اور ساتھ اپنے خصم سے ساس کو ڈبل بھی کروایا۔ اب وہ بدبخت صفائی والی ملازمہ چوٹ لگا کر گھر بیٹھ گئی ہے تو آتا نہیں در اس سے کہ وقت پہ صفائی ہی کرنے کون سا روز کا کام ہے۔ اپنے گھر بھی ملازم نصیب نہیں ہوا۔ ادھر آ کے ایسے پھیل گئی ہے جیسے کبھی ہل کے پانی نہ پیا ہو۔"

"میں کرنے ہی والی تھی ابی جی! بس آپ کے اٹھنے کا انتظار تھا۔" منزہ نے نصرت بی بی کے پل بھر کے لیے خاموش ہوتے ہی جلدی سے وضاحت پیش کرنا چاہی۔

"کیوں؟ کیا مجھے دکھا کے صفائی کرنی تھی یا ہانڈی روٹی کرنا تھی؟ میرے سر پہ کوئی احسان چڑھانا تھا؟ تمہارا گھر نہیں ہے یہ؟ میں بارہ بجے اٹھتی تو تم بارہ بجے تک ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھی رہتیں۔"

"ظاہر ہے جب سوہا کو کسی کے سپرد کر کے ہی میں کام کر سکتی ہوں۔" اس نے تحمل سے جواب دیا۔

"لو اور سنو' یہ اچھے نخرے ہیں۔ پہلے اسے بچی کے لیے آیا للوا کے "وہ تین چار ہزار روپے کی" پھر ان سے جھاڑو پونچھا کرواؤ۔"

"میرا یہ مطلب نہیں ہے۔ اسے کمرے میں اکیلا چھوڑ کے کچن میں کیسے جاتی۔ ساتھ بھی نہیں لے جا سکتی۔ اسے گرمی دانے نکلے ہوئے ہیں۔"

"توبہ' جیسی ماں نازک پری ویسی بیٹی نخریلی۔" شمیم بھی پھاڑ سا منہ کھولے جمائی لیتی اپنے کمرے سے برآمد ہوئی۔ ان دونوں ماں بیٹی کو رات دیر تک وی سی آر پہ فلمیں دیکھنے اور مل کر خاندان بھر کے بخیے ادھیڑنے کی لت تھی۔ سو دن چڑھے تک سو کر نیندیں پوری کی جاتیں۔ ایسے میں منزہ۔ کام کا آغاز کرتی تو کیسے کرتی۔ اسے خود بھی احساس تھا۔ کچن میں مظہر کے ناشتے کے جھوٹے برتن رکھے تھے تو وہاں کھڑا ہونا دوبھر لگ رہا تھا۔ رات کسی وقت شمیم نے چائے بنائی تھی اور ساتھ ہی شاید کچھ تلا بھی تھا۔ گھی کی چکناہٹ' چینی کے بکھرے دانے۔ چائے کے خشک ہوتے بھورے نشانات' ان سب پہ جمع چیونٹیاں اور منڈلاتی مکھیاں یہ سب دیکھنا اس کی صفائی پسند طبیعت کی برداشت سے باہر تھا' لیکن مظہر کو ناشتے کی ٹیبل پہ اکیلا چھوڑ کر یہاں کی صفائی کرنے کا مطلب تھا۔ سویرے سویرے اسے ناراض کرنا اور ایسا رسک وہ نہیں لے سکتی تھی۔

کل چھٹی کا دن تھا۔ مظہر گھر پہ ہی تھا۔ اس لیے سوہا کو اس کے پاس کھیلتا چھوڑ کے اس نے سب کے جاگنے سے قبل سارے کام نمٹا لیے تھے۔ ناشتے کی تیاری مکمل تھی۔ آٹا گندھا ہوا۔ آملیٹ کے لیے پیاز اور ہرا مسالہ کترا ہوا۔ انڈے پھینٹے ہوئے۔ کچن اور لاؤنج کی مکمل صفائی' باہر کا پورچ اور برآمدہ بھی دھو ڈالا تھا اور آج وہ خود اس قدر پھیلاوا دیکھ دیکھ کر گھبرا رہی تھی۔ سوہا کو گرمی دانے چبھ رہے تھے۔ مشکل سے اسے سنبھالتے ہوئے وقتاً اپنے کمرے کی صفائی کی تھی۔

"ہم نے تو چھوٹے چھوٹے بچوں کو کمر پہ لاد کے بھی صفائیاں کی ہیں۔ گود میں اٹھا کر بھی ہانڈی روٹی کی ہے۔ یہ آج کل کی لڑکیاں پتہ نہیں کیسی ہیں۔"

"اور اکیلے کمرے میں کیا سوہا کو جن بھوت کھا جاتے؟" شمیم جب بولتی ایسے ہی بنا سوچے سمجھے بولتی۔ منزہ کا دل کانپ گیا۔

"اللہ نہ کرے۔ مگر سو خطرے ہوتے ہیں' بچی ہے کسی کی چیز یا سوئچ میں ہاتھ دے ڈالے۔ خدانخواستہ باتھ روم میں پھسل جائے' کوئی غلط چیز منہ میں ڈال لے۔"

اس نے وہ خدشات گنوانا چاہے جن کے تحت وہ سوہا کو اکیلا نہیں چھوڑتی تھی۔ مگر نصرت نے بے زاری سے

"بچی نہ ہو گئی آفت ہو گئی۔ دو سال کی بچی اور سارے گھر کو مصروف رکھا ہوا ہے۔"

نصرت کی آواز میں تنفر اور بے زاری تھی۔

"دراصل یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔ کام نہ کرنے کے بہانے' ورنہ ابا جی اندر بیٹھے ہیں' اس کی نیت ہوتی تو بچی کو ان کے پاس بٹھا دیتی۔ وہ کیا منع کر دیتے۔"

منزہ نے شمیم کے منہ لگنا مناسب نہ جانا اور چپ چاپ سوہا کو واکر میں بٹھا کے جھاڑو اٹھا لیا۔

کچن میں برتن دھوتے ہوئے بھی اسے نصرت اور شمیم کی آوازیں بدستور آتی رہیں۔ حالانکہ پانی کا نل کھلا ہوا تھا' برتنوں کی اٹھا پٹخ بھی جاری تھی۔ یہ تیز تیز بول رہی تھیں۔ ریڈیو پہ کوئی گیت بج رہا تھا اور اس کی پوری شعوری کوشش یہ تھی کہ وہ یہ سب سن کے بھی نہ سنے لیکن واقعہ یہ تھا کہ نصرت بیگم اور شمیم دونوں ہی بولتی تھیں تو ایک دوسرے کو سنانے کے لیے نہیں کرتے تھے۔ مقصد اس کے کانوں میں ڈالنا ہی ہوتا تھا۔ شاید اس کی وجہ ان کے خیال میں یہ ہو کہ مظہر کی میٹھی بولی لبھانے والی پیار بھری باتوں کی نرماہٹ کا اثر زائل ہو جائے۔

"پتا نہیں کس گھرانے کی لڑکی ہو بھی پیار کے لائق یا نہیں لگتا ہے کہ ہم پچھتا رہے ہیں۔"

"آپ نے بھی تو من مانی کرنے کی چھوٹ دے رکھی ہے۔ اولاد کو۔ اب بھی وقت ہے اصغر کی لگامیں کس لیں ورنہ وہ بھی لے آئے گا کوئی روتی بسورتی چونکا ماری دانی۔ غریبوں کو یہاں کھانا کھانا اور پہننا اوڑھنا دیکھنے کے بجٹ پڑے گی۔" شمیم نے صلاح دی۔

"انہیں ہی لے آئے گا۔ میں نے ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ بیگم خوب۔ غریب نیت لڑکیوں کا۔ اللہ کی شان کوارٹروں میں رہنے والیاں کوٹھیوں میں آ کے راج کریں۔ سوکھی روٹی چٹنی کے ساتھ رگڑ کے کھانے والیاں ہوٹلوں میں دعوتیں اڑائیں۔ چھیتڑے پہننے والیاں ادھر آ کے چکن برگر اور گل احمد کی لان پہنیں کیوں بھئی؟"

یہ ٹھیک تھا کہ منزہ کے میکے والوں کے حالات اچھے نہ تھے اور لڑکپن میں ہی ماں باپ کی وفات ہو جانے کی وجہ سے وہ بھائی بھاوجوں کے آسرے پہ تھی۔ جنہوں نے مقدور بھر اس کا خیال ضرور رکھا لیکن وہ خود بھی ان پہ زیادہ بوجھ نہ ڈالتی تھی۔ ضرورت کی چیزوں کے لیے بھی اس نے دل کو مار رکھا تھا۔ مگر ایسے برے حالات بھی نہ تھے جن کا نقشہ اس کی ساس کھینچ رہی تھی۔ بس سفید پوش سلیقے اور رکھ رکھاؤ والے لوگ تھے۔ شاید یہ منزہ کے صبر کا ہی صلہ تھا کہ اسے مظہر جیسا چاہنے والا اور قدردان شوہر نصیب ہوا' جس نے بساط بھر سہولت اور آسائش اسے مہیا کر دی تھی۔ یہ صلہ اللہ تعالیٰ نے بخشا تھا مگر اس کا کریڈٹ بھی نصرت بی بی خود لینا چاہ رہی تھی اور یہ بھی گوارا نہ تھا اس جیسی کم ظرف عورت کو کہ کسی کو اس کے' اس کی اولاد یا اس کے گھر کے وسیلے سے ذرا سی خوشی اور آسانی بھی نصیب ہو جائے۔ منزہ کے چہرے پہ پھیلا سکون اور آسودگی اسے انگاروں پہ جلا دیتی تھی۔

"اب تو میں لاؤں گی کسی سیٹھ کی لڑکی' جانا کیسے۔ مظہر اصغر سے زیادہ پڑھا لکھا ہے۔ کپڑے بھی فیشنی پہنتا ہے۔ دفتر میں بابوؤں کے کام کرتا ہے۔ انگریزی میں گٹ پٹ کرتا ہے۔ سیٹھوں کی چھوکریاں ایسے ہی لڑکوں کو پسند کرتی ہیں۔ اس کا رشتہ ڈھونڈنے جاتی تو کسی کروڑ پتی کی لڑکی تو مل ہی جاتی' مگر برے نصیب' جانے کس کی بددعا لگی ہے کہ کنگلے چپڑاسی کی لڑکی اٹھا لایا۔ خیر اصغر اتنا سوہنا نہیں مگر مانتا تو اس سے ڈرتا ہے۔ کروڑ پتی نہ سہی لکھ پتی کے گھر تو رشتہ ہو جائے گا۔ کیسی شان سے بارات جائے گی۔ مظہر کی تو بارات لے جاتے ہوئے بھی ڈر لگ رہا تھا کہ سب ہی اگر ایک بند بھی ہو گیا تو لڑکی کے بھائیوں کو غش نہ پڑ جائے اور انتظام کیا گیا تھا ان فقیروں نے تمبو قناتوں سے بٹھا دیا تھا۔ ہونہہ" اصغر کی شادی تو میں ایسی جگہ کروں گی جہاں بارات کسی اونچے ہوٹل میں جائے۔ جو لڑکی کو کم از کم پچاس تولے اور لڑکے کی ماں بہن کو "وردتن" (پہناونی) میں دس دس تولے سونا دیں اور جو لڑکی کے نام زمین جائیداد' مکان' دکانیں لگا کر رخصت کریں۔ سمجھتا ہم؟"

سانپ کے ان ارادوں پہ اندر کام کرتی منزہ کو ہنسی آگئی۔ ذرا سے اصغر اور مظہر کے ملازم ہوتے والا [illegible] جیسے تپتانل ٹھونک کے اصغر نے اعلان کیا تھا۔

"شادی تو میں ربنا سے ہی کروں گا چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے۔ کوئی مائی کا لال مجھے اس سے نہیں روک سکتا۔ چاہے وہ کہیں کی بھی ہے۔ کسی میں ہمت ہے تو مجھے منع کر کے دکھائے۔ میں ربنا کو اس گھر میں لاؤں گا۔ جس کو اعتراض ہے وہ خود نکل جائے یہاں سے۔"

"کاش۔ ایسا ہی ہو جائے۔"

منزہ ہاتھ روک کر سوچنے لگی۔

"اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ میری بلا سے اصغر کوڑی کی لاڈلی سے شادی کرے یا کسی طوائف کی بیٹی سے۔ مگر [illegible] کے غرور کو تو ٹھیس لگنی چاہیے۔"

بہت متحمل مزاج سہی۔ بہت صابر سہی۔ مگر تھی تو بندہ بشر۔ جس کے صبر کی بہرحال ایک انتہا ضرور ہوتی ہے۔ اور نصرت کے کافی دیر سے جاری طعنے اسے اس انتہا تک لے آئے تھے کہ وہ صبر کھونے لگی تھی ان کے [illegible] بھڑاس نکالنے کا یارا نہ تھا۔ اور نہ فطرت میں یہ چیز موجود تھی۔ بس دل میں چپکے سے دعا مانگ بیٹھی۔

"انشاء اللہ اصغر کی سن لیتا۔ وہ اسی ربنا سے شادی کر کے لے آئے تو کیسی بات ہو ان کے اونچے ارادوں کو۔ امیر زادی کو میرے مقابل کھڑا کر کے دراصل یہ مجھے احساس کمتری میں مبتلا کرنے اور دن رات ذلیل کرنے کے لیے اور بہانے تلاشنے کی کوشش کرنا چاہتی ہیں۔ اللہ کرے وہی طوائف زادی ان کی بہو بن جائے۔ بڑی [illegible] ہوگی میری۔"

یہ دعا مانگتے ہوئے کہیں بھی اس کے دل میں یہ وسوسہ نہ تھا کہ یہ دعا اگر قبولیت پا گئی تو اس کے حق میں کتنا [illegible] ہوگا۔

☆ ☆ ☆ ☆

"میں نے یہ زندگانی۔ سنگ تیرے بتانی۔
تجھ میں بسی ہے میری جاں۔
ہائے جیا دھڑک دھڑک' جیا دھڑک دھڑک جائے۔

وہ آئینے کے سامنے کھڑی سنور رہی تھی۔ گنگنا رہی تھی۔

"یا اللہ خیر! آج تو سروں سے چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے۔"

شمع نے زیتون کا تیل پنڈلیوں پہ ملتے ہوئے کہا۔ حسب توقع ربنا کی گنگناہٹ تھم گئی اور اس کا ہاتھ بھی۔ اس نے آئینے میں نظر آتے اپنے عکس سے نظریں ہٹا کے اس سے ذرا پیچھے جھلکتے ماں کے عکس کو بغور دیکھا۔ اس باسی میدے کی پوری رنگت والے چہرے پہ اور سانپ کی جیسی آنکھوں میں کھوج ہی کھوج تھی۔

ربنا جانتی تھی کہ آج کل اس کی ماں کی ساری توجہ اس جانب ہے کہ اس کے جعفر محمود سے تعلقات کس نہج پہ جا رہے ہیں۔ چونکہ نہ وہ کبھی یہاں آیا تھا نہ ہی بلاوے کے بعد بھی آنے کا امکان تھا۔ اس لیے وہ متجسس تھی کہ کسی بہانے اندر کی بات کا پتہ چلے۔ کہیں لمبی اڑان بھرنے کی تیاری میں نہ ہو۔

ربنا نے ایک گہری سانس بھری۔ ہیئر برش دوبارہ اپنے بالوں میں چلنے لگا اور وہی مدھم گنگناہٹ۔

تجھے دیکھ دیکھ سونا
تجھے دیکھ دیکھ جاگنا

"ہاں وہ تو جیسے چوبیس گھنٹے تیرے کوٹھے سے لگا بیٹھا رہے گا۔ تو اسے دیکھ دیکھ جاگے گی اور دیکھ دیکھ سوئے گی۔"

اس کے ہاتھ تیزی سے تیل کے مساج میں مصروف تھے اور زبان اسے بولنے پہ اکسانے میں۔

"جب آپ کے پاس ایک الگ کمرہ موجود ہے تو اپنے حسن کے نکھار کے ٹوٹکے وہاں بیٹھ کر کیوں نہیں

آزماتیں۔" "اچھا۔" تنک کے جواب دینے کے بجائے وہ خاصے ٹھنڈے لہجے میں مخاطب ہوئی مگر اسی ٹھنڈے لہجے کی مار بھی شمع کو بری طرح تپا گئی۔

"کیوں یہاں میرا آنا منع ہے؟ کسی وزیر کو دربار کا کمرہ ہے یہ؟ اور حسن کے ٹوٹکے میں نے کیا آزمانے ہیں۔ یہ مصیبتیں ان کو مبارک جو پوری صورتیں لے کر پیدا ہوئی ہیں۔ ان کو ہی دو دو گھنٹے لگتے ہیں شیشے کے سامنے۔ بجلی کی طرح چمک جاتی ہیں۔ تمہارا میک اپ۔"

لڑکیوں بالیوں کی طرح ہی تو تجھے پتا چلتا ہے کہ اپنی ہی بیٹی سے الجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اس کی ہم عمر ہو۔

"یہ تیل تو میں بس اپنے پٹھوں اور جوڑوں کے درد کی وجہ سے لگا رہی ہوں۔"

"ان کا بہترین علاج یہ ہے کہ انہیں دن میں دو تین بار تکلیف دے لیا کریں۔ بیٹھ بیٹھ کر جوڑ جڑ جاتے ہیں۔ یہی حال رہا تو چلنے پھرنے سے بھی رہ جاؤ گی والدہ محترمہ۔"

ربنا نے خاصا چبا چبا کر کہا۔

"کوئی کم تکلیف نہیں دی ان ٹانگوں کو۔ ان ٹانگوں نے تھرک تھرک کے ساری ساری رات گھنگھرو چھنکا کے بھوؤں کے پیٹ بھرے ہیں۔ اسی لیے تو اب رہ گئی ہیں بے چاری۔ مگر آج کل کی اولاد کو کیا احساس ماں باپ کی ساری قربانیاں ایک منٹ میں بھول کر خود غرض بن کر اپنی دنیا آپ بسانے چل نکلتے ہیں۔"

اس نے بھولا سا منہ بنا کر جتانے کی کوشش کی۔

"اب کون چلا گیا اپنی دنیا آپ بسانے کے لیے؟"

وہ سب کچھ سمجھ رہی تھی مگر سمجھ کے بھی نظر انداز کرتے ہوئے اطمینان سے آئی لائنر لگا رہی تھی۔

"گیا تو نہیں مگر جانے کو پر کچھ ضرور پھیلا رہا ہے۔" شمع نے کن انکھیوں سے اس کی تیاری دیکھی۔

"بس اب کیا کہ گیا۔ پیچھے رہ جائے گا وہ مالی جو ساری عمر اس پودے کو اپنا خون پلاتا رہا مگر پھول توڑ کے لے گیا کوئی اور۔"

اچانک ربنا کو جو ہنسی کا دورہ پڑا تو شمع کو خود پہ طاری کیا خود ساختہ یاسیت اور مظلومیت کا نقاب اتارنا پڑا۔ اب وہ اسے خشمگیں نگاہوں سے گھور رہی تھی۔ جو ہنس ہنس کے دوہری ہوتی بیڈ پہ بیٹھ گئی تھی۔

"میں نے کیا کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

"لطیفہ نہیں کسی تھرڈ کلاس بلیک اینڈ وائٹ فلم کی ہیروئن والا ڈائیلاگ سنایا ہے۔ اور قسم سے یہ ڈائیلاگ آپ کے منہ سے سن کر ایسا ہی لگ رہا ہے جیسے وحید رحمان کے مقابلے ہیلن رٹ کے سنا رہی ہو۔"

"مر جا تو اور تیرا وحید رحمان۔" شمع نے جل کر کوسا۔

"اور ہیلن کے ساتھ اتنی رعایت کیوں؟ سگی ہے کیا؟" ربنا نے اور جلایا۔

"ہاں سگی ہے۔ تیری دادی لگتی ہے۔"

"واقعی؟ اس کا مطلب ہے ننھیال ہی نہیں' ددھیال بھی خاصا گنی ہے میرا۔"

اس نے استہزائیہ قہقہہ لگایا اور ربن نما دوپٹہ گلے میں ڈال کر ہاتھ میں اورنج کلر کا خوبصورت پرس تھاما۔

"جا رہی ہوں میں' دروازہ بند کر لینا۔"

"ادھر کون سے خزانے دفن ہیں۔ اللہ نے ایک سبب بنایا تھا رزق روٹی کا۔ اب وہ بھی ختم ہونے والا لگ رہا ہے۔ میں پوچھتی ہوں تیرے یہ سیر سپاٹے کبھی ختم ہوں گے یا نہیں؟"

شمع نے کھا جانے والی نظروں سے اس کی تیاری دیکھی۔ سیاہ فٹنگ والے اور خاصے کھلے گریبان والے لباس پہ جابجا نارنجی موتیوں کا ننھا سا کام تھا۔ اسی رنگ کا پرس' سینڈل اور جیولری۔ نارنجی شیڈ ہی کی چمکدار لپ اسٹک نے اس کے لب بھی بھرے بھرے بنائے ہوئے تھے۔ یوں تو شمع کو وہ ہمیشہ عام سی لگی مگر آج کل کچھ تھا جو اسے خاص بنا رہا تھا۔

"گھر پہ رکوں؟ کیا بیبیوں کی طرح کشیدہ کاری کروں؟ حلوے بھونوں یا زیادہ نمونے گنے میں؟ یا پھر آس پڑوس کے بچوں کو سپارے پڑھاؤں؟ کیا کروں گھر بیٹھ کر؟"

"میں نے کب گھر گھر بیٹھنے کو کہا۔ ضرور باہر نکل مگر کچھ کمانے نکل۔ عیش کرنے نہیں تو جس راہ پہ چل رہی ہے اس پہ کچھ نہیں رکھا۔"

"بکواس مت کرو۔ کچھ نہیں ہوتا مجھے اور جس راہ پہ اب تک آپ چلاتی رہی ہو مجھے اس میں بھی کچھ نہیں رکھا سوائے ذلت کے۔ کسی ایک آنکھ میں اب تک میں نے اپنے لیے خلوص نہیں دیکھا۔ عزت نہیں دیکھی۔ ہر جگہ دھتکار' بے عزتی اور ان سب کے بدلے میں کمایا بھی کیا ہے؟ چند ہزار' یہ گلا سڑا فلیٹ' یہ بوسیدہ فرنیچر' یہ جگہ جگہ سے ادھڑا ہوا بدبودار قالین' یہ سیل سے خریدے گئے سستے اور بھڑکیلے کپڑے۔ جھوٹے زیورات۔ کھانے کے لیے وہی دال روٹی۔ پارٹیوں میں گئے تو کھا لیے مرغ مسلم اور بریانیاں ورنہ... گرمی کے تین مہینے یہ پنکھا جو اسے ہی چلانا پڑے تو بجلی کا بل نکالنے کے لیے مجھے کتنی راتیں... چھی..."

اس نے فرش پہ تھوکا اور ہاتھ میں تھاما برش پرے پھینک کر پھر سے بیٹھ گئی۔

"پھر کچھ ملتا ہوتا انسان کچھ میں خوشی خوشی کرے بھی تو ترت نہیں تمہیں اس زندگی سے اتنی محبت کیوں ہے۔"

وہ آپ جناب سے بات کرتے کرتے پھر ایک بار "تو" اور "تم" پہ آ گئی۔ شمع کے سامنے وہ زیادہ دیر تک خود پہ شائستگی کا یہ خود ساختہ نقاب نہیں اوڑھ سکتی تھی۔

"اس سے تو اچھا ہوتا تم مجھے چار جماعتیں اور پڑھنے دیتیں۔ کسی دفتر میں سیکرٹری لگ جاتی تو اس سے زیادہ کما لیتی۔ بے شک اس نوکری کی آڑ میں وہی کچھ کرنا پڑتا جو اب کر رہی ہوں مگر میں کہلاتی تو ایک پڑھی لکھی ورکنگ وومن' اچھے لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا تو ہوتا' ناچنے والی' محفلیں سجانے والی۔ یہ تعارف تو نہ ہوتا میرا۔"

"اپنے پیشے سے کیسا شرمانا رانی' اور پھر دیکھ کیا مزے کا کام ہے۔ دن چڑھے تک سوتی ہے تو۔ اچھے اچھے کپڑے پہنتی ہے۔ جہاں جاتی ہے' لوگ سو سو تعریفیں کرتے ہیں۔ دفتر میں لگ کے تیری کون سی عزت ہو جانی تھی۔ ادھر دیکھتی ہوں میں بس اسٹاپ پہ کھڑی ہوتی ہیں دفتروں میں جانے والیاں۔ ہر شہدا لفنگا چھیڑ کر ہی گزرتا ہے۔ حق حلال کی کمانے والیوں کو یہ لوگ ماں بہن سمجھ کے عزت نہیں کرنے لگ جاتے۔"

"نہ کمائی میں حق حلال کی۔ میں نے کب کہا کہ دفتر میں بیٹھ کے میں نے کوئی نیک پروین بن جانا تھا۔ تب تو یہی زندگی گزارنا پڑتی۔ بلکہ اس سے بھی بری۔ مرد گھر سے باہر کسی شریف عورت کا وجود اسے گوارا نہیں۔ کم از کم یہ نہ ہوتی میں بس یہ نہ ہوتی۔"

وہ جھلی پہ مکا مارتے ہوئے بے بسی سے کہہ رہی تھی۔ آج سے پہلے اس نے اس طرح کھل کے اپنی اس حیثیت سے نفرت کا اظہار نہیں کیا تھا۔ شمع کو تشویش ہونے لگی۔

"بیاہ کر دوں تیرا؟"

"بیاہ...؟" ریتا کا قہقہہ بلند ہوا۔

"کیسا بیاہ؟ وہ جو تم نے کیا تھا؟ مگر اس قسم کا مایوس تجربہ کرنے کے لیے ابھی میری کافی عمر پڑی ہے۔ چالیس کے قریب پہنچ جاؤں گی۔ کام ملنا بند ہو جائے گا تو ڈھونڈ لوں گی میں بھی کوئی بڈھا کھوسٹ سیٹھ' بیوپاری یا دکاندار جو تین چار سال بعد مر کھپ جائے گا اور میں اس کے بچے پالنے کے لیے "ہاف ریٹ" پہ پھر سے کام تلاش کرنا شروع کر دوں گی یا نئے "نگ" پالش کرنے کا کام شروع کروں گی۔ یا پھر اس قسم کی شادی جو اس سے پہلے آنٹی زرقون اور میڈم جھمی کر چکی ہیں اپنی بھتیجیوں کی۔ وہی پیپر میرج' ایگری منٹ والی۔ ایک سال یا چھ مہینے کی شادی۔ جس میں جہیز دینے کی بجائے لینا پڑتا ہے۔ کیا میرا بھی کوئی ایسا رشتہ آیا ہوا ہے۔"

اس کی آنکھوں میں' آواز میں' الفاظ میں زہر ہی زہر بھرا ہوا تھا۔ جسے نظر انداز کر کے شمع نے جواب دیا۔

"ایسے رشتے تیرے لیے آتے تو رونا کس بات کا تھا۔ جھمی نے یونہی تو ڈیفنس میں بنگلہ نہیں لے لیا اور

زرقون نے گھر کے آگے بھی تین تین گاڑیاں ایسے ہی تو نہیں کھڑی کیں۔ اپنی لڑکیوں کے لیے زمیندار' وڈیرے اور بڑے بڑے سیاستدان داماد گھیرے تھے اس نے۔ کیا ہوا جو نکاح نامے پہ دستخط کرتے ہوئے ایک اور معاہدہ بھی طے پا گیا تھا کہ یہ خفیہ شادیاں سال بھر سے زیادہ نہیں چلیں گی۔ ایسا داماد مجھے بھی مل جاتا تو وارے نیارے ہو جاتے۔ پر اقبال تو بدھو کے تیرے لیے ایک ہی رشتہ آیا ہے۔ کوئی بہت تگڑی آسامی نہیں ہے۔ ہاں عاشق بڑا تگڑا ہے تیرا۔ اس نے جو کچھ ہے سب تجھ پہ وارنے کو ایک دم تیار ہے۔ جو یہ بڑے بڑے زمیندار اور وزیر سال بھر کی شادیوں کے بدلے دیتے ہیں۔ بس یہ ہے کہ تجھے ساری زندگی پھر اس کی بیوی بن کر چولہا چکی کرنا ہو گی۔"

"اونہہ... چولہا چکی...؟ پھر کیا کروں گی میں اس دولت کا جو وہ میرے نام کرے گا۔ اگر مجھے بعد میں چولہا چکی ہی کرنی ہے۔"

"بھلا چھوڑ یہ سب' وہ دیوانہ ہے کون؟"

"مجھے کوئی ضرورت نہیں۔ پہلے ہی بہت دیر ہو گئی ہے۔ اچھی بھلی نکل رہی تھی۔ خوامخواہ ٹوک کر راستہ کھوٹا کر دیا۔"

اس نے دوبارہ برش اٹھایا اور آئینے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اتنی محنت سے سجایا سنوارا چہرہ پژمردہ لگنے لگا تھا۔ جس پہ اب وہ بشاشت پیدا کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

"کبھی کبھی کہنا ہی کام آتا ہے میری شہزادی۔" شمع نے تکیے کے نیچے سے سگریٹ نکال کر سلگائی۔

"خوش رہ جتی ہے تو ایک چانس لے کر دیکھ لے۔"

"کیسا چانس؟" ریتا اس بے معنی گفتگو میں الجھنا نہیں چاہتی تھی لیکن شمع نے ایک بار پھر اسے ٹھٹھک کر رک جانے پہ مجبور کر دیا۔

"اپنا سکہ چلانے کا۔" اس نے لمبا کش لے کر دھواں چھوڑا۔

"وہ کرے گا تجھ سے شادی؟"

اس سوال پہ ریتا کے دل نے ایک بیٹ مس کی۔ اس کا ہاتھ بے اختیار اپنے سینے پہ ٹھہر گیا۔ وہ اپنے دل کی اس الہڑ' ان چھوئی ادا پہ حیران ہوئی۔

"کیا اس جیسی لڑکی کا دل بھی ایسے سوال پہ شرما کے گھبرا جاتا ہے؟" یہ سوال اس نے اپنے آپ سے کیا تھا۔

"جواب نہیں دیا تو نے؟" یہ سوال اس کی ماں نے کیا تھا۔ اس کے پاس ان دونوں سوالوں کا جواب نہیں تھا۔ اور وہ جواب ہی تلاش کرنا چاہتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"سنیے' مجھے اماں کے ہاں اتارتے جائیے گا۔"

پروین نے کھانا ٹفن میں پیک کر کے اپنے میاں کے سامنے رکھتے ہوئے جھجک کر کہا۔

سراج دین ناشتے کے بعد نیپکن سے ہاتھ پونچھ رہے تھے۔ ایک گہری نظر اس پہ ڈالی تو احساس ہوا کہ آج وہ سویرے سویرے ہی خاصے معقول حلیے میں تھی' ورنہ صبح بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرنا... ناشتہ کروانا' لنچ باکس بھرنا... اس کا ناشتہ... میاں کا الگ ناشتہ... دوپہر کے کھانے کی تیاری کہ سراج دین کھانا صبح ہی ساتھ لے جاتے تھے... ملازمہ سے صفائی کا آغاز بھی تو ساڑھے نو بجے کروانا ہوتا ہے۔ اس ساری افراتفری میں پروین کو کبھی منہ ہاتھ دھونا نصیب نہیں ہوا تھا۔ کہیں بارہ بجے کے قریب کام ختم ہوتے تو ہوش ٹھکانے آتے اور حلیہ سنوارا جاتا مگر آج صاف ستھرا' استری شدہ لباس پہنا ہوا تھا۔ بال بھی گوندھ کے بنائے گئے تھے۔ ہلکی سی لپ اسٹک بھی نظر آ رہی تھی۔ سراج دین پروین کو زیادہ غور سے دیکھنے کے خاص عادی نہ تھے' ورنہ یہ بات پہلے ہی نوٹ کر لیتے۔ اب احساس ہوا کہ آج سارے کام بھی معمول سے ذرا جلدی نمٹ گئے تھے۔

"کس خوشی میں؟"

معتبر خانہ نگاہوں سے یہ سارا جائزہ لینے کے بعد سوال کیا گیا۔

"کسی خوشی میں بھی نہیں..... مجبوری میں جانا پڑے گا اور آگے بھی جانا ہوا کرے گا۔" پروین نے پہلے ہی واضح کر دیا تاکہ وہ ذہنی طور پہ تیار رہیں۔

"اماں بیمار رہتی ہیں' بچی بہت چھوٹی ہے' کیسے چلے گا گھر؟ میں نے سوچا ہے' دوسرے تیسرے دن چکر لگا لیا کروں گی۔"

"اور یہ گھر..... یہ گھر کیسے چلے گا پروین بیگم؟"

"میں نے کہا تو ہے کہ دوسرے تیسرے دن جایا کروں گی اور وہ بھی صرف چند گھنٹوں کے لیے جیسے آج جا رہی ہوں' اپنے صبح کے معمول کے سب ہی کام نمٹا کر اور ان شاء اللہ بچوں کے اسکول سے اٹھنے سے پہلے پہلے آ جاؤں گی۔"

"یہ چلے گا کسی اور کو بتانا۔"

"کیا مطلب ہے آپ کا؟" اس لفظ پہ وہ بھڑک اٹھی۔ مزاج میں تیزی تو پروین کے بھی تھی۔ آخر شمشاد بی بی کی بیٹی تھی۔ ہاں بس خود کو سنبھال کے رکھنا آتا تھا اور کبھی کبھی سارا تحمل سراج دین کسی ایک تلخ فقرے یا نامناسب رویے سے ہو جاتا۔

"یہ دو سرائے مرا ہر روز میں بدل جایا کرے گا۔ کسی اور گھر کا انتظام چلانے کے لیے میں اپنے گھر کا بیڑہ غرق نہیں کر سکتا۔"

ناشتے کے بعد دیر تک اخبار پڑھتے بلکہ چاٹنے کی عادت تھی مگر اب بحث سمیٹتے ہوئے اخبار بھی تہہ کر کے ایک جانب رکھ دیا اور حتمی انداز میں اپنا فیصلہ سنا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔

"کس قدر بے حس انسان ہیں آپ۔" پروین کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"ایسے موقعوں پہ تو دشمن بھی رعایت کر جاتے ہیں' آپ کو میرے میکے والوں سے نجانے کیا کدورت ہے جو بجز اس شکل ہی نہیں یاری' اور ایسی کوئی پرخاش ہے بھی تو اس معصوم بچی کو تو بخش دیں' اسی پہ ترس کھائیں۔"

"واہ..... بہت اچھے..... کوئی سن لے تمہاری فریادیں تو پتہ نہیں میرے بارے میں کیا کیا سوچے کہ کیسا ظالم جابر' تشدد پسند قسم کا شوہر ہے۔ کوئی کسر رہ گئی ہے تو وہ بھی کہہ ڈالو۔"

"ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔"

"ہاں ابھی تو کچھ کہا نہیں..... رعایت کر دیں..... بچی کو بخش دیں..... ترس کھالیں..... ایسا لگ رہا ہے جیسے کوئی مظلوم کسی ظالم یا شیطان کے سامنے رحم کی بھیک مانگ رہا ہو۔ اچھی ڈرامے بازی ہے۔"

"یہ کیا تکرار شروع کر رکھی ہے صبح صبح؟"

شوکت جہاں اپنے کمرے سے نکل آئیں۔

"اماں جی! دیکھیے میاں صاحب کو' میں نے صرف کہا کہ مجھے چند گھنٹوں کے لیے میکے چھوڑ آئیں تو باتیں سنانے لگے۔"

پروین ساس کی ہمدردی حاصل کرنے لپک کے شکایت کرتی ان کے پاس آئی مگر انہوں نے کڑی نظروں سے گھورا۔ اپنے کمرے میں جائے پیتے پیتے جہاں انہوں نے سراج دین کی دھاڑ سنی تھی' وہاں پروین کا مسلسل زبان چلانا اور حجت کرنا بھی سنائی دے رہا تھا اور وہ بہوؤں کے معاملے میں لاکھ روشن خیال اور وسیع القلب ہوں' ان کا شوہر کے آگے تن کے کھڑے ہونا پسند نہیں کرتی تھیں' بلکہ صرف بہو ہی کیوں' انہیں بیٹی کے معاملے میں بھی یہ روش پسند نہ تھی' اسے بھی ہمیشہ یہی نصیحت کی۔

"مرد کو عورت اپنی خدمت' خاموشی اور حکمت عملی سے قابو میں کرتی ہے۔ دوبدو جواب دینے والی..... شوہر کو اپنی زبان کے ہاتھوں زچ کرنے والی عورت آخر میں ہمیشہ گھاٹے میں رہتی ہے۔"

اور آج پروین ان کی یہ نصیحت فراموش کر بیٹھی تھی' اس لیے انہوں نے حسب سابق اس کی حمایت کرنے سے گریز کیا۔

"آپ سامنے ہوں تو میں 'میاں صاحب' ہو جاتا ہوں اور ابھی آپ کے پیٹھ پیچھے مجھے کہہ دیا بے درد' سنگ دل اور بے حس کہا جا رہا تھا۔"

بیٹے نے بھی شکایت پیش کی۔

"اچھا چلو اب بس کرو' ہو گیا ختم' بس ہوا۔" ماں بولیں "ہو گئے تم لوگوں کے جھگڑے" پٹاتے ہوئے..... اب اتنا دم نہیں رہا۔ خود تو کچھ ہوش کرو' دنیا جہان کے مرد کمانے نکلتے ہیں گھر سے مگر کوئی بیوی بچوں پہ یوں سو سو احسان دھر کے نہیں نکلتا جیسے تم نکلتے ہو سراج..... جب تک حلق پھاڑ کے سارے گھر میں وحشت نہ پھیلا لو گھر سے باہر قدم نہیں دھرتے ہو اور تم پروین..... اچھی بھلی بیبیاں میاں کو جتنے مسکراتے دعاؤں میں گھر سے رخصت کرتی ہیں نہ کہ تمہاری طرح کوستے ہوئے۔"

"مگر اماں جی..... میں تو....." پروین نے منمنا کے اپنی صفائی پیش کرنا چاہی مگر شوکت جہاں نے ڈپٹ کے خاموش کرا دیا۔

"چپ رہو' شکر کرو بیٹوں کی ماں ہو..... بیٹی بھی ہوتی تو کیا اثر لیتی ان سب تماشوں سے..... کل کو بیاہ کے اگلے گھر جاتی اور خود بھی یہ سب کرتی۔"

ان کی اس بات پہ پروین کے دل کو دھچکا لگا۔

اسے آج سے پہلے کبھی ساس کا ڈانٹنا ڈپٹنا برا نہیں لگا تھا۔ وہ ساس بن کے نہیں' ہمیشہ ماں بن کے غلطیوں کا احساس دلایا کرتی تھیں۔ ابھی بھی وہ اس کے ساتھ ساتھ سراج دین کا بھی تنبیہہ کر رہی تھیں لیکن ان کا یہ فقرہ پروین کے دل میں بڑے درد کے ساتھ کھب گیا تھا۔

"یہ سب کرتی..... کیا کرتی ہے؟ یعنی ایسا کیا کرتی ہوں میں؟ ٹھیک ہے کبھی کبھی صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جاتا ہے لیکن میں صرف سچ ہی تو کہتی ہوں....."

اس کی نظر سے دیکھا جائے تو اس کے طرز عمل میں واقعی کوئی برائی نہیں تھی۔ پروین کے باپ کو گزرے عرصہ بیت چکا تھا مگر جو بھولی بسری یادیں اس کے ذہن میں زندہ تھیں' ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ وہ سر جھکائے ایک کونے میں رکا کھڑا ہوتا اور اس کی ماں شمشاد بی بی پوری طاقت کے ساتھ چلا چلا کر اس کی ماں' بہن ایک کر رہی ہوتی..... کوسنے اور بددعائیں دے رہی ہوتی۔ اسی کی بیٹی ہونے کے باوجود اس نے ہمیشہ یہ منظر یاد آنے پہ گھن محسوس کی تھی اور ایسا کچھ بھی نہ کرنے کا عہد بھی کیا تھا خود سے۔

خوش قسمتی سے سسرال کا ماحول ایسا ملا کہ اس کے اندر چھپی فطری اچھی عادات اور بھی نکھر کے سامنے آئیں۔ شوکت جہاں کے مشفق برتاؤ سے اس نے بہت کچھ سیکھا بھی اور گرہ سے باندھا بھی۔ انہی کی تربیت کے سہارے سراج دین جیسے اکھڑ مزاج' تند خو اور تلخ زبان شوہر کے ساتھ مقدور بھر صبر و برداشت والی زندگی بھی گزار لی اور آج ایک تلخی اور حق کی بات پہ شوہر کو آئینہ دکھانے کی کوشش کیا کی کہ اس کی ساری پچھلی اچھائیاں اور کارگزاریاں اندھے کنوئیں میں ڈال دی گئیں۔ وہ شاکی ہو کر ساس کو دیکھنے لگی۔

"چلو میاں تم تو اپنے کام پہ سدھارو' بھلے لوگ خوش خوش گھر سے نکلتے ہیں کہ دن کا آغاز اچھا ہو' ہر کام برکت والا ہو۔"

"ساری بات تو یہ ہے کہ اپنا سکون درہم برہم ہوا ہے۔" پروین اب سارے گلے شکوے دل ہی دل میں کر رہی تھی۔ "انہی طرح سمجھا دیں اسے' میرے منہ نہ لگا کرے اور اپنا دل گھر میں لگانے کی کوشش کرے۔"

وہ نکلتے نکلتے بھی کہنا نہ بھولے۔

"اتنے سالوں میں تمہیں تو سمجھا نہ سکی۔" وہ بڑبڑانے لگیں اور پھر بیٹے کے نکلنے کے بعد پروین کی جانب نظر

اٹھائی۔ اس کا چہرہ کستا ہوا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا رہی تھیں اور سر جھکائے لب کچل رہی تھی۔ ان کا دل موم ہو گیا۔ قریب آکر اس کے سر پہ ہاتھ رکھا۔

"چھوڑو جانے دو اب پتا تو ہے تمہیں اس کی عادت کا۔ کیوں دل پہ لیتی ہو۔"

پروین ابھی دل ہی دل میں گلے کر رہی تھی ان سے۔ اب اتنی سی ہمدردی پاتے ہی سب بھول بھال کر ساس کے گلے لگ گئی اور سسکنے لگی۔

"اماں جی! یہ ہمیں تانے طعنے دیتے رہتے ہیں کہ میرا دل گھر میں نہیں لگتا۔ کیا میں باہر گھومتی پھرتی ہوں۔ سیر سپاٹے کرتی رہتی ہوں۔ بسینیا، ل ہنا رہتی ہیں میں تے؟ اس گھر کے علاوہ اور میری زندگی میں ہے ہی کیا۔ پہلے پھر بھی میکے ہو آیا کرتی تھی ہفتے میں ایک آدھ رات رک بھی جاتی تھی لیکن بچوں کا اسکول شروع ہونے کے بعد تو گھنٹے بھر کا چکر بھی مہینے میں ایک دو بار ہی لگ پاتا ہے۔ اس کے باوجود یہ طعنے۔ میں کوئی شوق سے تو نہیں جاتی وہاں۔ مجبوری ہے۔ میری بھائی کی گھر ہستی اجڑی ہے۔ ان کی دلجوئی بھی ضروری ہے اور ان کی ننھی سی بچی کی دیکھ بھال بھی۔ کیا میں سب بھول کر اپنے گھر کی خوشیوں میں مگن رہوں۔"

"نہیں میری بچی! کسی بھی بیٹی یا بہن کے لیے آسان نہیں ہوتا میکے کے درد بھول کر اپنے گھر کی خوشیوں میں مگن رہنا۔"

شوکت جہاں نے شفقت سے اس کی پشت سہلائی۔

"میں یہ بات سمجھ سکتی ہوں کیونکہ میں بھی کسی کی بیٹی اور کسی کی بہن رہ چکی ہوں مگر ایک مرد یہ بات نہیں سمجھ سکتا۔ خاص طور پہ سراج جیسا مرد۔ اسے صرف اپنے گھر کے سکون اور خوشیوں سے مطلب ہے اور وہ ان میں کسی کی ساجھے داری برداشت نہیں کر سکتا۔ اسے ڈر ہے کہ تم ان لوگوں پہ توجہ دو گی تو اس کا گھر اور بچے ڈسٹرب ہوں گے۔"

"مگر وہ غلط سوچ رہے ہیں اور میں انہیں یہی بتا رہی تھی۔"

"ہر شخص میں اتنا ظرف نہیں ہوتا کہ وہ اپنی غلطی کو غلطی مان لے۔ اگر اسے یہ خدشات ہیں تو تم اس سے اور جھگڑ کے ان خدشات کو ہوا کیوں دے رہی ہو۔ اس کے دل میں یہ خیال پختہ ہو گا کہ جن کے ذکر سے ہی دونوں میاں بیوی میں تلخی اور بدمزگی پیدا ہو گئی اور تمہارے اپنے گھر کے لیے بہت برا ہو گا۔"

وہ بیٹے کو جانتی تھیں رگ رگ سے واقف تھیں اس لیے پروین کو آنے والے خطرے سے آگاہ کر کے سمجھا رہی تھیں۔

"لیکن اماں جی!"

"میں مانتی ہوں مشکل ہے مگر تمہیں کرنا تو ہو گا۔ فی الحال کچھ دنوں کے لیے میکے جانے کا ذکر مت کرنا۔ ابھی وہ ضد میں آیا ہوا ہے میں بعد میں اسے مناؤں گی اس کا موڈ اور موقع دیکھ کر۔"

"ضرورت تو اب ہے اور ابھی میں چپ چاپ پیچھے ہٹ جاؤں۔"

"یہ تو تمہارے ہاتھ میں ہے کہ تم کسے اولیت دیتی ہو اپنے گھر کو یا میکے کو۔ میں تمہیں غلط نہیں کہہ رہی نہ ہی تمہارا مطالبہ ناجائز ہے۔ یقیناً غلط میرا بیٹا ہے مگر مصلحت بھی کوئی چیز ہے بیٹی! اگر کوئی بات تمہارے گھر پہ اثر انداز ہوتی ہے تو وہ کتنی ہی درست کیوں نہ ہو اس سے احتراز کرو۔ شوہر اور گھر سب سے اہم ہے۔ اس کی ضد ختم ہو گی تو خود تمہیں اجازت دے دے گا۔"

"تب تک وہ بن ماں کی بچی وہ اجڑا گھر انتظار کرتا رہے گا۔" پروین بپھر گئی۔

"پالنے والی ذات اللہ تعالیٰ کی ہے پروین! یہ مت بھولو جس نے پیدا کیا ہے وہی پالے گا بھی۔ تم اس کی فکر مت کرو۔ باپ ہے دادی ہے کوئی غیر تو نہیں وہ۔ آخر ان کی بھی کوئی ذمہ داری ہے۔ میں چلوں اب۔"

وہ گھٹنوں پہ ہاتھ کا دباؤ ڈال کر اٹھ گئیں۔

"دیا بیٹی! ذرا ایک چائے کا کپ اور بنا نا۔ ذرا تازہ دم ہو جاؤں تو وظیفہ شروع کر لوں۔"

پروین نے دھیرے سے گردن ہلائی اور ان کے پیچھے پیچھے ہی کمرے سے نکل گئی۔

"بابی! او دیا!"

وصی کی آواز پہ سامنے کچن میں چائے کا پانی چڑھاتی پروین نے پلٹ کے دیکھا۔

"ابھی پوچھ دوں بیٹا! اس نے فوراً دوسرا چولہا جلایا اور دودھ گرم کرنے کے لیے مگر شوکت جہاں جو سست رفتاری سے چلتی اپنے کمرے کی جانب جا رہی تھیں ان کی تیز سماعتوں تک وصی کی یہ بات پہنچ گئی۔

"وہ چھوڑو بھلا۔ کیا وقت ہو گیا اور ننھے سے بچے کو ابھی تک دودھ نہیں ملا۔ یہ تیجہ ہوتا ہے بلا وجہ کی کل کل کا۔"

وہ تو تبصرہ کر کے اندر چلی گئیں مگر پروین جس کا آئینہ سا دل ہلکا سا دھندلا ہونے کے بعد ابھی ابھی صاف ہوا تھا پھر سے جگہ جگہ سے چٹخنے لگا۔

"وصی کے معاملے میں کسی نے یہ کیوں نہیں سوچا کہ اس کا باپ اور دادی زندہ ہیں اور ان کی بھی کچھ ذمہ داریاں ہیں۔ وہ اس کے ناز لیں گے اسے۔ تب اماں جی کا یہ توکل کہاں تھا کہ جس نے پیدا کیا ہے وہی پال لے گا مگر تب تو وصی کے لیے رو رو کے ہلکان ہوتی تھیں۔ آخر گھر لا کے ہی رہیں اور تب اسے میری گود میں ڈالتے ہوئے میاں صاحب کو یہ فکر کیوں نہیں ستائی کہ اس کی وجہ سے میرے اپنے بچے اور گھر متاثر ہوں گے۔ حسان بھی تو چند ماہ کا تھا۔ ایک ساتھ دو ننھے بچوں کی پرورش کر لی میں نے تب گھر کے حالات ڈسٹرب نہ ہوئے۔ اب جب کہ بچے بڑے ہو گئے ہیں مجھ پہ ذمہ داری بھی کم ہے اب ایک اور بن ماں کی بچی کو اگر میری ضرورت ہے تو سب کو نت نئی تاویلیں سوجھ رہی ہیں۔"

وہ کڑھ کڑھ کر سوچتی رہی۔ سوچ سوچ کر کڑھتی رہی اور چولہے پہ رکھا دودھ کڑھ کڑھ کے کم ہوتا گیا۔

☼ ☼ ☼

جعفر محمود بڑے مسرور و مگن انداز میں ڈرائیو کرتا ہوا اپنے گھر لوٹا تھا اور گاڑی سے نکلتے ہی ٹھٹک گیا تھا۔ مین ڈور کے سامنے ربتا بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔

"تم یہاں ہو؟" اس کے محاورتاً نہیں حقیقتاً ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ گھبراہٹ کے عالم میں وہ ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ یہ اپارٹمنٹ اسے گورنمنٹ کی جانب سے ملا تھا۔ آس پاس اسی کے گریڈ کے دوسرے افسران رہائش پذیر تھے اور وہ ان اکا دکا میں سے تھا جو فیملی کے بغیر رہ رہے تھے۔

"ہاں میں۔ کیسے ہیں آپ جعفر؟ کب آئے شکار سے؟"

بے تابی اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ ہر انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

"ابھی بس ابھی کل ہی واپس آیا ہوں۔" جعفر نے اپنی گھبراہٹ پہ قابو پاتے ہوئے کہا۔

"بس تمہیں فون کرنے ہی والا تھا۔"

"آپ کے منہ سے جھوٹ اچھا نہیں لگتا جعفر۔" ربتا عجیب انداز میں مسکرائی۔

"آپ کا ملازم کہہ رہا ہے کہ آپ کو شکار سے واپس آئے ایک ہفتہ ہو چکا ہے۔"

"ہاں مگر پھر اگلے ہی روز مجھے اسلام آباد واپس جانا پڑا۔ گھر میں کچھ مسئلہ تھا وہاں سے کل ہی لوٹا ہوں۔ اس جاہل بندے کو کیا پتہ؟"

جعفر نے ربتا کے عقب سے نمودار ہوتے اپنے ملازم کے حواس باختہ چہرے کو دیکھ کر دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ وہ بھی مالک کا نبض شناس تھا فوراً اس وضاحت میں اضافہ کیا۔

"وہ جی۔ بس یا ہو دران نے پوچھا ای شکار سے واپس آئے کا تو میں کی کروا؟"

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے اندر چلو تم۔" جعفر نے اسے چلتا کیا۔

"میں تو پریشان ہی ہو کے رہ گئی تھی جعفر! آپ کے گھر کا نمبر بھی خراب تھا۔" آفس کا نمبر آپ نے دیا ہی نہیں تھا۔ "تم آپ اسلام آباد جانے سے پہلے اطلاع ہی کر دیتے۔ اتنی دیر سے خیریت تو تھی وہاں؟"

"میں نے کہا نا کوئی گھریلو پرابلم تھا۔" جعفر نے پل بھر میں اسے ٹھیک حد یاد دلا دی۔ وہ کچھ خفیف سی ہو گئی۔

"تو کیا میں تمہیں ڈراپ کر دوں؟"

"کیا؟" وہ حیران رہ گئی۔ وہ ہمیشہ اسے اپنے گھر تک چھوڑنے یا بلانے سے پرہیز کیا کرتا تھا۔ یہ حقیقت اس پہ اچھی طرح روشن تھی لیکن یہ توقع نہ تھی کہ اگر وہ آہی جائے گی تو دروازے سے لوٹا دے گا۔

"کم آن۔" جعفر نے اس کے تاثرات کی پروا کیے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا اور خود ڈرائیونگ سیٹ کی جانب بڑھا۔

یہ وہی جعفر محمود تھا جو آگے بڑھ کے اس کے لیے فرنٹ ڈور کھولا کرتا تھا۔ اس کے بیٹھنے کے دوران اس کا آنچل تھام کر اس کی گود میں رکھنے کے بعد ڈرائیونگ سیٹ کا رخ کرتا تھا جو ہمیشہ ریسٹورنٹ میں اس کی سیٹ درست کر کے بٹھاتا تھا اور جس نے اسے پہلی بار عزت، احترام اور شائستگی جیسے رویوں سے روشناس کرایا تھا۔ یہ وہی جعفر محمود تھا جو آج اجنبی انداز میں اکھڑا اکھڑا نظر آ رہا تھا۔

ریتا کا دل بجھ گیا۔

"میں خود چلی جاؤں گی۔" یہ گویا ناراضی کا اظہار تھا۔

"اوکے، ایز یو وش۔" جعفر نے جیسے اللہ کا شکر ادا کیا تھا اور جھٹ گاڑی سے نکل آیا۔ اس نے مروتاً بھی دوبارہ اصرار نہیں کیا۔

ریتا کو اس قدر ہتک کا احساس اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔ سب سے پہلے احترام کے معنی سکھانے والا بھی وہی اور ذلت کے اس شرمناک احساس کو دلانے والا بھی وہی۔

"تم کہو تو میں اپنے ملازم سے کہہ کر ٹیکسی منگوا دوں؟" جعفر سے شاید اس سے زیادہ رکھائی کا مظاہرہ نہیں کیا گیا، اس لیے یہ پیشکش کی۔

"شکریہ۔" ریتا نے بھیگی آواز میں کہا اور اس کے قریب سے گزر کے جانے لگی۔ نجانے اس کے چہرے پہ کیسی شکستگی تھی کہ جعفر سے رہا نہ گیا اور ہزار خود کو سمجھانے کے باوجود پاس سے گزرتی ریتا کا بازو تھامنے سے خود کو روک نہ سکا۔

"سوری۔۔۔ دراصل میں کچھ پریشان ہوں، تھکا ہوا بھی ہوں، ورنہ۔۔۔"

"اٹس اوکے۔" وہ اتنے سے التفات پہ بھی موم ہو گئی۔

"لیکن آپ چاہیں تو اپنی پریشانی مجھ سے شیئر کر سکتے ہیں۔ دل ہلکا ہو جائے گا۔"

"کیوں نہیں لیکن اس وقت میں اکیلا رہنا چاہتا ہوں ریتا! تم تو میری مزاج آشنا ہو۔ آئی ہوپ کہ تم مائنڈ نہیں کرو گی۔"

اس نے ایک بار پھر ترپ کا پتا استعمال کیا۔ یعنی ریتا سے مزاج آشنائی اور دوستی کا دعوا۔ وہ مغرور سی ہو گئی۔

"ٹھیک ہے میں چلتی ہوں۔ آپ آرام کیجیے۔ میں کل فون کروں گی۔ بہت اداس ہو رہی ہوں۔ کل ملیں گے نا۔"

"ہاں کل نہیں تو پرسوں۔" جعفر نے ٹال مٹول سے کام لیا۔

"میں بالکل ہلکا پھلکا ہو کے، ہر فکر، ہر پریشانی سے آزاد ہو کر تم سے ملنا پسند کروں گا۔ میں خود تمہیں فون کر کے بلوا لوں گا۔"

اس نے آس دلائی اور ریتا نے آس کا یہ سہارا مضبوطی سے تھام لیا۔ اس کے باوجود وہاں سے نکلتے ہوئے اس کے قدم ڈگمگا رہے تھے۔

جعفر نے بعد میں اپنی بے مروتی اور رکھائی پہ پردہ ڈال دیا تھا، وہ بہل بھی گئی تھی لیکن اب کوئی چیز اس کو کھٹک

رابطہ کیا تھا۔ جیسے پہلا تھا۔ شہرت پانے سے قبل جب کوئی لڑکی تھا۔
جعفر محمود۔۔۔ اور تو اس کے انداز بھی بدلے ہوئے تھے اور تیور بھی۔
اور یہ سوچ کے گھر سے نکلی تھی۔ آج صبح سے ہونے والی گفتگو نے اسے ایک فیصلہ کن نتیجے تک پہنچنے میں مدد دی تھی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ ہر حال میں جعفر سے اپنے اور اس کے تعلقات کی بابت کوئی حتمی فیصلہ کر کے رہے گی۔ اس کے سامنے نہ صرف اپنی محبت تسلیم کرے گی بلکہ یہ اعتراف اس سے بھی کروا لے گی اور ہوا کیا؟

یہی جعفر بدل گیا ہے یا اس کا دل۔۔۔ یا پھر میرے دن بدل گئے ہیں؟ نہیں نہیں، ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ شخص کسی کا ہو گا نہیں، یہ ہو سکتا۔ کسی کو دل نہیں دکھا سکتا۔ پریشانیاں کس پہ نہیں آتیں۔ ذہنی طور پہ ڈسٹرب ہو گا اور بس۔ یہ کچھ ہی دن، کل خود فون کرے گا۔ اپنے رویے پہ معذرت پیش کرے گا اور پھر شام کو ملنے بھی آئے گا۔ میں بھی خوب نخرے دکھاؤں گی، جب قدر ہو گی میری اور میرا خیال ہے وہی درست موقع ہو گا یہ بات چھیڑنے کا۔ میں اس کے دل میں چھپی اپنی چاہت ابھار کے رہوں گی۔"

وہ اپنے خیالوں میں مگن، دل کو خوش فہمیوں سے بہلاتی چلتی جا رہی تھی۔ کئی خالی ٹیکسیاں اور رکشے اس کے نزدیک سے گزر کے چلے گئے مگر اس کا دھیان ان تک نہ گیا۔

وہ پیدل چلتی رہی۔

پھر ایک وائٹ بالینو کے ہارن پہ وہ بری طرح چونکی۔ ہڑبڑا کے ادھر ادھر دیکھا۔ راؤنڈ اباؤٹ کے بالکل سامنے کھڑی تھی وہ۔۔۔ ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھی طرحدار حسینہ نے جھنجلا کر۔۔۔ سر ہلایا اور ٹرن لے کر آگے بڑھ گئی۔ ریتا دوسری جانب ماؤف سی کیفیت سے نکل چکی تھی اور ہاتھ دے کر نزدیک سے گزرتی ٹیکسی کو روکا۔

پیلی ٹیکسی اسے بٹھائے اس جگہ سے دور لیے جا رہی تھی اور جن راستوں سے پیدل گزر کے وہ یہاں تک آئی تھی انہی جانے پہچانے راستوں پہ اب وہ وائٹ بالینو دوڑ رہی تھی۔

پھر وہ جعفر محمود کے اپارٹمنٹ کے سامنے رک گئی۔

"ہائے سویٹ ہارٹ میں کب سے تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔"

اس نے آگے بڑھ کے والہانہ اظہار کیا اور اس کی جانب کا دروازہ کھولا۔

وہ ایک ابھرتی ہوئی ماڈل تھی۔

کمرشلز میں نظر آنے والی نہیں بلکہ ریمپ پہ کیٹ واک کرنے والی اور مہنگے فیشن میگزینز کے لیے فوٹو شوٹ کروانے والی ماڈل۔

"ہائے جعفی۔۔۔!" اس نے نزاکت سے اپنا مہکتا ریشمیں گال جعفر محمود کے چہرے کے ساتھ مس کیا۔ وہ مسحور ہو گیا۔

"مجھے نہیں پتا تھا کہ تم میرا انتظار اتنی بے چینی سے کر رہے ہو گے۔"

اس نے جعفر کو گیٹ کے پاس کھڑے دیکھ کر کہا جبکہ وہ ریتا کو رخصت کرنے کے بعد تک یہاں اس لیے کھڑا رہا کہ کہیں وہ واپس نہ آ جائے۔

اس کے کانونٹ لب و لہجے پہ جعفر بالکل ہی ریشہ خطمی ہو گیا۔ ریتا سے پہلے بھی ایک آدھ لڑکی سے اس کی شناسائی جانا چکی تھی لیکن ریتا جیسی پیشہ ور "دوست" نے اس کی جھجک دور کر دی تھی۔ بستر سے بستر تک کی طمع پیدا ہو چکی تھی اس کے اندر، اس لیے سوفیہ جیسی الٹرا ماڈ اور ہائی سوسائٹی کی جان کہلائی جانے والی ماڈل سے راہ و رسم بڑھانے میں اسے خاص وقت نہ لگا اور اس کے ساتھ گزارے چند دن ہی اسے ریتا کے ساتھ گزارے دو مہینے بھلا گئے۔ اب ریتا سے دوستی اسے اپنی حماقت لگا کرتی۔

"پتا نہیں کیا سوچ کر میں نے اس عام سی شکل و صورت والی بازاری لڑکی کو سر پہ چڑھا لیا تھا جسے چار لوگوں میں اٹھنے بیٹھنے کا سلیقہ بھی نہ تھا اور جس کی نظر ہر دم میری جیب پہ ہوتی تھی۔"

اب اسے ریتا کی وہ باتیں بھی جاہلانہ اور سوقیانہ لگنے لگیں جن کو سننا اسے اچھا لگتا تھا۔ وہ بڑے انداز سے اچک کر اشعار پڑھنا۔ وہ دھم گنگنانا تھیں۔ وہ فدا ہو جانے والی مسکراہٹیں... سب کی سب طوائف کے نخرے نظر آنے لگے۔

اب سومیہ کی فراٹے بھرتی انگریزی، مغربی طور طریقے، بے باک ادائیں اور بے حجابانہ لباس بھانے لگا تھا اسے اور پھر ایک بات اور بھی تھی۔ ریتا ساتھ ہوتی تو وہ خود سے بھی شرمندہ رہتا۔ اس کے ساتھ بڑے بڑے شاپنگ مالز میں گھومتے ہوئے یا کسی مہنگے ریستوران میں بیٹھے ہوئے بھی وہ چور نظروں سے ادھر ادھر تکتا رہتا کہ کہیں کوئی شناسا نہ نکل آئے۔ کوئی ایسا شناسا جو نہ صرف اسے جانتا ہو بلکہ ریتا کی حقیقت سے بھی واقف ہو اور سومیہ کے ساتھ بانہوں میں بانہیں ڈال کر گھومتے ہوئے اسے یہ خدشہ نہیں ہوتا تھا۔ اس کا کوئی جاننے والا مل جاتا تب بھی وہ فخریہ سومیہ کا تعارف کراتا اور سومیہ کو تو سب ہی جانتے تھے، اس کے ساتھ چلتے ہوئے وہ لوگوں کی رشک آمیز نظریں اور حاسدانہ تبصرے پا کر خوامخواہ مغرور ہو جاتا تھا۔

"مجھے پرسوں سنگاپور جانا ہے ایک فوٹو شوٹ کے لیے... تم چلو گے جیفی؟"

جعفر کے سومیہ پہ لٹو ہو جانے کی تو ایک وجہ تھی اور وہ یہ کہ دیہاتی پس منظر رکھنے والا یہ اعلا سرکاری عہدیدار خوبصورت، ماڈرن اور بے باک حسیناؤں سے دوستی رکھ کے اصل میں اپنے اس احساس کمتری کو دبانے کی کوشش کرتا تھا جو اس اچانک مل جانے والی حیثیت سے اس میں عود کر آیا تھا۔ وہ کسی گئے گزرے خاندان سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ زمین دار لوگ تھے اور قدرے غیر تعلیم یافتہ... فطری طور پر وہ صنف نازک کی انہی خصوصیات سے متاثر ہوتا تھا جو اس کے ہاں کی خواتین میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن سومیہ کا اس پہ حد سے بڑھتا التفات خود جعفر کی سمجھ سے بھی بالاتر تھا۔ وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ سومیہ ان لڑکیوں میں سے تھی جو کسی نہ کسی شخص کو دم چھلا بنا کے رکھنے میں فخر اور تسکین محسوس کرتی ہیں۔ عرصے بعد اسے جعفر کی شکل میں ایک باادب جی حضور ٹائپ کا پرستار ملا تھا، اسی لیے وہ اس سے چند دن کی دوری بھی برداشت کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

"میں... میں وہاں کیا کروں گا؟"

"وہی... جو یہاں کرتے ہو۔" اس نے جعفر کے کالر سے کھیلتے ہوئے شریر نظروں سے اسے دیکھا۔

"دفتر، آفس..."

"میں ضروری ہوں یا آفس؟" سومیہ نے اس کی بات مکمل نہ ہونے دی تھی۔ وہ ہنس کر چپ ہو گیا۔ وہ ایسی چیز نہیں تھی جسے صاف جواب دے کر ناراض کرنے کا رسک لیا جا سکتا۔

"پھر تم چل رہے ہو نا میرے ساتھ؟"

"پرسوں جانا ہے تمہیں، اتنی جلدی میں کیسے..."

"ٹھیک ہے میں پرسوں کی فلائٹ سے جا رہی ہوں اور تم ترسوں کو میرے پاس ہو گے۔ او کے۔"

وہ انکار نہ کر سکا۔

وعدے کے مطابق اس نے ان پانچ دنوں میں ویزے اور ٹکٹ کے مسائل نمٹائے اور کچے دھاگے سے بندھا اس کے پیچھے پیچھے سنگاپور پہنچ گیا۔

آزاد فضاؤں میں ان کی آزاد دوستی اور بھی پروان چڑھنے لگی اور ایسے میں ان رنگین شب و روز کے دوران اسے ایک پل کے لیے بھی ریتا کا خیال نہ آیا، جسے وہ اگلی ملاقات کا لارا دے کر آیا تھا اور جو ہر روز اس کا سیل فون نمبر ملاتی اور ہر بار اسے نہ پا کے نئے وسوسوں کا شکار ہوتی۔ جعفر نے تو شاید ایک بار بھی نہ سوچا ہو گا کہ واپس جا کر اگر ریتا سے اس کا سامنا ہوا تو وہ اس سے اپنی غیر حاضری کا کیا بہانہ کرے گا مگر قدرت نے اس کی یہ مشکل آسان

کر دی۔ اب اسے ریتا سے کچھ بھی کہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔

اس کے پاکستان لوٹنے سے پہلے ہی اس کی اور سومیہ کی خبریں وہاں پہنچ چکی تھیں۔ ملکی صحافت کے نمایاں روزناموں، ہفت روزوں اور ماہناموں میں ان کے تعلقات کی سنسنی خیز خبریں بمعہ تصویروں کے جگمگا رہی تھیں۔

جن دنوں وہ سنگاپور میں اس کے ساتھ گلچھرے اڑا رہا تھا، ایک فلمی صحافی بھی اپنے ذاتی نوعیت کے کام کے سلسلے میں وہاں موجود تھا۔ اس نے ذاتی نوعیت کے کام کو تو پس پشت ڈالا اور پیشہ ورانہ تقاضے پورے کرتے ہوئے ان کے بارے میں چٹپٹی خبریں اور رنگین و سنگین تصویریں پاکستان پہنچا دیں۔ وہ بہت بڑا افسر سہی مگر عوام کے لیے اجنبی فرد تھا جبکہ سومیہ شوبز کی شخصیت تھی، جانی پہچانی۔ نوجوان نسل میں سے اکثریت کے خوابوں کی ملکہ... اس کے ساتھ دوستی نے یہ رنگ دکھایا کہ اب وہ بھی اس کے حوالے سے مشہور ہو چکا تھا۔

یہ خبر ریتا نے بھی پڑھی تھی۔

ایک بار نہیں، بار بار پڑھی تھی۔

اس کے باوجود اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جعفر تو مجھ سے... اور اگر وہ مجھ سے محبت نہیں بھی کرتے تب بھی وہ اس سومیہ نام کی چھپکلی کو کیسے چاہ سکتے ہیں؟ وہ کتنے نفیس طبع اور ستھری شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایسی اوچھی حرکتیں نہیں کر سکتے۔ یہ تصویریں ان کی ہو ہی نہیں سکتیں۔"

وہ آنکھوں دیکھی بات کو جھٹلا رہی تھی۔

ان تصاویر کو غلط قرار دے رہی تھی جس میں جعفر محمود کہیں جام ہاتھ میں لیے سومیہ کے لبوں سے لگا رہا تھا تو کہیں ڈانس فلور پہ اسے بانہوں میں لیے جھوم رہا تھا۔ یہ واقعی سچ تھا مگر وہ یقین نہ کر پا رہی تھی کیونکہ اس کے سامنے جعفر نے اب تک اپنا وقار نہیں کھویا تھا۔ خود وہ اپنے بارے میں حد درجہ محتاط رہتی تھی کہ کہیں اس کی معمولی سی لغزش، جعفر جیسے خاندانی اور معزز انسان کو اس سے متنفر نہ کر دے، اس لیے بہت سنبھل سنبھل کے رہا کرتی۔ یوں جعفر بھی سنبھلا ہی رہا۔

لیکن سومیہ کو اسی احساس کمتری کا سامنا نہ تھا جس سے ریتا دوچار تھی۔ وہ بڑے باپ کی بیٹی تھی۔ اس کا باپ... اس کا دادا... اس کا نانا... اس کے دادا کا دادا اور نانا کا نانا سب سرمایہ دار تھے۔ اس ملک کے اس طبقے سے تعلق رکھتے تھے جو تھا تو صرف دو فیصد مگر ملک کے اٹھانوے فیصد پہ حاوی تھا۔ یہ اپنی برائیاں بھی فخر سے پیش کرنے والے لوگ تھے۔ سومیہ میں کچھ تو اپنے طبقے کی خصوصیات تھیں، کچھ شوبز نے اسے اور نڈر اور بے باک کر دیا تھا۔ اس کے ساتھ نے جعفر کو بھی احتیاط اور روایت پسندی کا دامن چھوڑ دینے پہ مجبور کر دیا تھا۔

ریتا، جعفر کی سنگت میں خود کو سنوارنا، نکھارنا چاہتی تھی مگر اس کا یہ عمل کتنا سست رہا۔

اور جعفر، سومیہ کی سنگت میں کتنی جلدی بگاڑ کے عمل سے کامیاب ہو گزرا۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔" وہ بڑبڑائی اور اخبار کے دو ٹکڑے کر کے پرے پھینک ڈالے۔

آج تیسرا دن تھا، اخبارات کو چٹخارے دار بنانے کے لیے ان کا اسکینڈل چھپ رہا تھا۔ ہر روز نئی سے نئی خبر سامنے آ رہی تھی، اس کے باوجود وہ جعفر کی منتظر تھی۔ اس سے اصل بات جانے بغیر وہ اس خبر پہ یقین کر کے بھی نہ کر پا رہی تھی۔

"آ جائیے جعفر صاحب! خدا کا واسطہ ہے جلدی واپس آ جائیے اور آ کے ان سب افواہوں کی تردید کر دیں۔"

وہ روز تصورات کی دنیا بسا کے اس سے منت کرتی۔

بالکل اپنے میکے کے گھر کی طرح۔

"امی! آپ رات کے وقت چاول نہیں کھاتیں، کہیں تو دلیہ پکا دوں آپ کے لیے؟"

"جب پتا ہے کہ رات کو چاول مجھے تکلیف دیتے ہیں تو پھر پکانے کی ضرورت کیا تھی۔"

اسی قسم کے جواب سے بچنے کے لیے وہ عموماً ساس کو مخاطب کرنے سے پرہیز کیا کرتی تھی۔ آج ان کو خوش دیکھ کر پوچھ بیٹھی اور جلا ہوا جواب سن لیا۔

"پکانے والی کی اپنی پسند سب سے اوپر ہوتی ہے۔ امی! بھابھی کو چاول کتنے پسند ہیں، آپ کو نہیں پتہ۔"

شمیم کو کافی دیر سے اس موقع کی تلاش تھی مگر اس کا یہ وار اس کے باپ نے ضائع کر دیا۔

"تمہاری ماں کو چھوڑ کر چاول اس گھر میں سب کو پسند ہیں بلکہ میں غلط کہہ گیا۔ پسند تو اسے بھی بہت ہیں، سانس کی تکلیف کی وجہ سے پرہیز کرنا پڑتا ہے لیکن ہم سب کو تو دمہ نہیں ہے۔ ہم کیوں [illegible] سے محروم رہیں۔"

وہ چاولوں سے بھری پلیٹ پر رائتہ انڈیلتے ہوئے کہہ رہے تھے۔ نصرت نے خشمگیں نگاہوں سے اپنے شوہر کو گھورا۔

"دمہ ہو میرے دشمنوں کو، مجھے تو الرجی ہے الرجی۔" وہ اپنی سانس کی تکلیف کو زیادہ ظاہر نہیں کرتی تھیں صرف اور صرف پرہیز سے بچنے کے لیے ورنہ معمولی سر درد کو بھی بڑھا چڑھا کے بتانا ان پہ ختم تھا۔

"کھاؤ، ٹھونسو تم لوگ چاول مگر میرے لیے بھی تو کچھ پکنا چاہیے تھا۔ یہ ڈیڑھ دو کلو مرغی اس طاہری نے دو چار بوٹیاں سالن بھونتے ہوئے میرے لیے نکال لیتی۔ روٹی کیا میں رائتے میں ڈبو کے کھاؤں گی۔"

"وہ دوپہر کا سالن ہے۔" منزہ نے کہنا چاہا۔

"ہاں وہ جس میں گنتی کی تین مریل چانپیں پڑی ہیں۔ ویسے بھی دوپہر کا سالن مجھ سے نہیں کھایا جاتا۔"

وہ روٹھنے کا پروگرام بنا رہی تھیں اور منزہ کا دل بجھ رہا تھا۔ وہ سمجھ رہی تھی جیسے پچھلے دو ڈھائی گھنٹوں سے کے ایک جگہ پہ اکٹھے ہونے کے باوجود کوئی بدمزگی نہیں ہوئی۔ کھانے کے دوران بھی نہیں ہوگی۔

"اوہو ماں میری۔ ناراض کیوں ہوتی ہو۔"

اصغر نے کھانے سے سر اٹھا کے کہا۔

"کیا کھانے کو دل چاہ رہا ہے۔ مجھے بتاؤ، ابھی منگواتا ہوں۔"

"رہن دے رہن دے۔ سامراؤں کی کباب۔ روٹی رگڑ کے گلے میں پھنس رہا ہے سوکھا۔"

"او ہو کہہ تو رہا ہوں جو چاہیے بتاؤ، ابھی منگواتا ہوں۔ بازار کون سا دور ہے۔ مجید سائیکل دوڑاتا جائے گا دس منٹ میں واپس آ جائے گا۔"

اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر والٹ نکالا۔ مظہر نے چمچہ منہ میں ڈالتے ہوئے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔

"ایک چکن پیس منگوا دے۔ نانے کا دل ہے ورنہ سیخ کباب بھی منگوا لی۔"

"میرے لیے بھی ایک پیس۔" شمیم نے فوراً فرمائش کی۔ حالانکہ وہ ایک پلیٹ چاول ختم کر کے دوسری بھرے بیٹھی تھی۔

"ابا جی! آپ کھاؤ گے کچھ؟"

"میرے سگریٹ ختم ہو گئے ہیں، وہ منگوا دو اور پیسٹری وغیرہ۔" وہ میٹھے کے شوقین تھے اور بلا کے سگریٹ نوش بھی۔ "بھابھی آپ؟"

اگرچہ اس کے اس سوال پہ شمیم اور نصرت دونوں نے کڑے تیور سے اسے گھورا تھا کہ منزہ کو اس پیشکش کرنے کی ضرورت کیا تھی لیکن وہ ڈھیٹ بنا بھابھی کے پرتکلف انکار کے بعد بھی اصرار کر رہا تھا۔

"نہیں، آئس کریم ہی کھا لیں۔"

"نہیں، میرا گلا خراب ہے۔" وہ سادگی اور منہ کے زور سے جھجک رہی تھی۔

"چل چھوڑ بوی کا اصغر۔ اسے رہن دے۔ نخرے ہی نہیں ختم ہوتے ادھر تو۔" نصرت نے ناک بھوں چڑھائی۔

"چاچو! مجھے کھانوں کی آئس کریم۔" سوہا نے اپنے توتلے چھوٹے سے لہجے میں فرمائش کی۔

"او کیوں نہیں میری شہزادی، میری رانی۔" وہ سوہا سے واقعی بے حد لاڈ کرتا تھا۔ کوئی دکھاوے کی بات نہیں تھی۔ اس لیے اسے سوہا کو گود میں لے کر بھینچتے ہوئے دیکھ کر مظہر نے کچھ نہ کہا لیکن جب مجید کو پیسے پکڑانے کے بعد فوراً فوراً سب کی فرمائش نوٹ کرواتے ہوئے اس نے مظہر سے بھی پوچھا تو وہ رہ نہ سکا۔

"تم کھاؤ گے کچھ؟" اس دن کی تلخ کلامی کے بعد اصغر نے بڑے بھائی کو مخاطب نہ کیا تھا اس لیے قدرے جھجک کے پوچھا۔

"میرا جواب تم سن چکے ہو۔ میری طرف سے انکار ہے۔" اس نے خاصا چبا چبا کے کہا۔

"لے، ابھی تو پوچھا ہے اس نے، تو نے پہلے انکار کب کیا ہے؟"

نصرت نے ٹوکا تو اس نے ماں کی جانب رخ کیا۔

"میں کسی اور انکار کی بات کر رہا ہوں۔"

اب کے اصغر بھی ٹھٹکا۔ اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں مظہر سے یہ ذکر نہ چھیڑنے کی التجا کی۔ منزہ بھی شوہر کا موڈ بھانپ کر اس کے پیچھے آن کھڑی ہوئی۔

"اور اسی لیے کہہ رہا ہوں مجھے اب یہ فیاضی دکھانے کی ضرورت نہیں۔ یہ چاپلوسیاں ان کے ساتھ کرو جن کی تمہیں حمایتیں درکار ہیں۔ حالانکہ یہ کوششیں فضول ہی ہیں۔ کھا پی کے ڈکار سب مار لیں گے، تمہاری ضد کسی نے نہیں ماننی۔"

منزہ نے اس کے کاندھے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈال کے گویا خاموش رہنے کی درخواست کی تھی۔

شمیم کی تیز نظروں نے یہ حرکت بھانپ لی۔ پہلے اس نے ماں کو ٹہوکا دیا پھر کان میں کھسر پھسر کرنے لگی۔

مظہر سنسنی پھیلا کے اب آرام سے کھانا کھا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس کے ابو نے سوال اٹھایا۔

"کس قسم کی ضد؟ کوئی پھڈا تو نہیں ہو گیا؟ کوئی دکانوں کا مسئلہ۔ کوئی کاروبار کا پھڈا؟"

انہیں فوری طور پر اپنے اس کاروبار کی فکر لاحق ہوئی جس سے وہ عملی طور سے کئی سال پہلے دستبردار ہو چکے تھے۔ "یہ تیری زنانی کیا اشارے کر رہی ہے؟"

نصرت نے گھور کے گویا منزہ کی جان نکالی۔ وہ چپ چاپ چاولوں کی خالی ڈش اٹھا کے کچن میں چلی گئی جو ایسے حالات میں اس کی واحد پناہ گاہ تھی۔

بیٹھے بٹھائے سارا ماحول خراب ہو گیا تھا اور اس بار ذمہ دار یقیناً اس کا شوہر تھا۔ وہ وہیں دیوار سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی اور بجھے دل کے ساتھ باہر سے آتی آوازیں سننے لگی۔

"اس نے کیا کرنا ہے، کرنے والی تو اب آئے گی۔" مظہر اصغر کی بے چینی کا مزہ بھی لے رہا تھا اور گھر والوں کے تجسس کا بھی۔

"کون ہے آنے والی ہے؟"

نصرت نے بلا تکلف موٹی سی گالی دیتے ہوئے للکارا۔

"آپ کی چھوٹی بہو۔ جناب اصغر بھٹی کی بیگم!" اس نے شوشہ چھوڑا۔

"ہائے ہائے میں مر جاواں۔"

نصرت نے اپنا سینہ پیٹ ڈالا۔ شمیم بھی پوری بات جانے بغیر واویلا مچانے لگی۔

ان سب سے بے نیاز ان کے والد بھٹی صاحب یوں سر جھٹک کے دوبارہ کھانے میں مگن ہو گئے جیسے کھودا پہاڑ'

نکاح جو باوالا معاملہ ہو۔

"توبے اصغرے! تو نے شادی کر لی۔ کون ہے وہ منحوس ڈائن جس نے میرے بیٹے کو پھانس لیا۔ اس کو ڈھائی گھڑی کی آئے۔۔۔ کبھی نہ بسے ماں کا دل اجاڑنے والی۔۔۔ چپ چپاتے شریف لڑکوں سے شادیاں کرنے والی۔"

"کسی نے نہیں کی شادی۔" وہ چیخ اٹھا پھر مظہر کو شانے سے پکڑ کر بدتمیزی سے جھنجوڑا۔

"کیا بکواس لگا دی ہے ادھر۔ کیوں شوشے چھوڑ رہے ہو؟"

"آرام سے۔" مظہر نے سرد لہجے میں تنبیہہ کی اور اس کا ہاتھ جھٹکا۔

"اتنے بھڑک کیوں رہے ہو' غلط کیا کہا ہے میں نے۔ کیا تم شادی نہیں کرنا چاہتے؟ کیا تم اپنی مرضی سے نہیں چن بیٹھے؟ اور کیا اس سے شادی کرنے کے لیے حمایت مانگنے نہیں آ گئے تھے تم میرے پاس [illegible] کے۔"

"کوئی بھیک نہیں مانگی میں نے' خودمختار ہوں میں۔ مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے آگے منت کرنے' اجازت میں مانگنے کی۔ مجھے جب شادی کرنا ہو گی جس سے کرنا ہو گی' میں ڈنکے کی چوٹ پہ کروں گا۔"

اس کے واضح اعلان کے بعد کچھ دیر کے لیے سکوت چھا گیا۔

شمیم ماں کا چہرہ تکتے ہوئے اس کے تاثرات بھانپنے کی کوشش کر رہی تھی' جبکہ نصرت کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ اس نے اصغر کے الفاظ اور انداز دونوں پہ غور کیا۔

الفاظ اسے اٹل اور بے لچک لگ رہے تھے' جبکہ انداز باغیانہ۔

اس نے موقع کی نزاکت بھانپتے ہوئے فوراً پینترا بدلا۔

"ہاں ہاں' کیا ضرورت ہے تجھے چھپ کے کچھ کرنے کی۔ یہ کوئی ڈر پڑا ہوا ہے۔ دھج سے بیاہ کروں گی میں اپنے پتر کا' جس کو ساڑا (جلن) ہوتا ہے' ہو۔"

نصرت نے مظہر کو گھورا' جس کے اطمینان میں ذرا فرق نہ پڑا تھا اور جو جانتا تھا کہ پوری بات جاننے کے بعد اس کی ماں کا ردعمل کیا ہو گا۔ البتہ اصغر کو ماں کے اس رویے سے خاصی تقویت ہوئی۔

"مجھے پتہ تھا میرا ساتھ ضرور دیں گی۔ یہ مظہر تو۔۔۔ یہ تو بس ایسے ہی مجھے ڈرا دھمکا تا۔۔۔" وہ سوچ رہا تھا۔

"اگر میں غلط ہوں تو ثابت کرو۔" مظہر نے اس کی بات کاٹی۔

"موقع اچھا ہے' سب موجود ہیں' شاباش۔۔۔ بتاؤ انہیں سب کچھ' وہ سب کچھ جو مجھے بتایا ہے۔ اس کے بعد امی سے پوچھو کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گی یا نہیں۔" "بات کیا ہے اصغر؟" نصرت بھی اب ٹھٹکی۔

"وہ۔۔۔ بس ایسے ہی امی۔۔۔! رہنے دو۔۔۔ یہ تو ایسے ہی۔۔۔ مجھ سے ہی غلطی ہوئی جو بڑا بھائی جان کے اس سے مشورہ کرنے چلا گیا۔" وہ دانت کچکچا کے اسے دیکھنے لگا جو دل جلانے والی مسکراہٹ سجائے سامنے بیٹھا تھا۔

"چھوڑو ساری باتیں' سیدھا آنے والا ہو گا۔ آپ کھانا کھاؤ بس۔ اس کے بعد نکلتے ہیں سیر کرنے۔ فالودہ کھانے۔"

تب۔ اس نے ماں کا دھیان بٹانے کی کوشش کی جو اب ایک ہی جگہ اٹک گیا تھا۔

"فالودہ رہنے دے اور مجھے اصل بات بتا' کون سی حور پری پسند کر لی ہے تو نے؟"

"ملوا دوں گا میں کسی دن' اس وقت یہ بات ختم نہیں ہو سکتی؟" وہ جھنجلا گیا۔

"ہو سکتی ہے' بالکل ہو سکتی ہے۔"

مظہر اپنی کرسی پیچھے کی جانب دھکیلتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا کھانا بھی ختم ہو چکا تھا اور کام بھی۔

"اور یہ بات میں ختم کر دیتا ہوں۔ امی کو یہی جاننا ہے نا کہ وہ حور پری کون ہے' وہ حور ہے یا پری۔۔۔ یہ تو مجھے نہیں پتا' نام اصغر نے شاید یہ بتایا تھا کہ شہناز۔"

"زینا۔" اصغر بے اختیار کہہ اٹھا۔

"ہاں ہاں بیٹا۔۔۔ اور باپ کون ہے' یہ بھی نہیں پتہ۔ نہ مجھے' نہ اصغر کو' نہ خود بتانے والی کو۔"

اس نے نصرت کو سارا دھچکا دیا۔

"ہاں پتہ خاصی معروف ہے اور مشہور بھی۔ بہت بڑی گرامی طوائف رہ چکی ہے۔"

"وے ستیاناس۔" نصرت نے اپنے سینے پہ دو ہتڑ مارا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کافی دن نہیں ہو گئے تمہیں اپنی ماں کے ہاں گئے ہوئے؟"

رخشندہ نے ٹٹولتے ہوئے انداز میں پروین سے پوچھا۔

سلائی مشین پہ اس کا ہاتھ سست پڑ گیا۔

"نہیں' کوئی اتنے دن تو نہیں' ابھی ہفتے کو تو گئی تھی۔"

"اور آج بدھ ہے۔" رخشندہ نے گویا اطلاع دی۔

"پتا ہے۔" پروین کو جانے کیوں غصہ آ گیا۔ سلائی مشین پہلے سے دگنی رفتار سے چلنے لگی۔

(توبہ۔۔۔ اتنے سالوں بعد اب رخشندہ بھابھی کھلنے لگی ہے۔ سب سمجھ رہی ہوں میں۔۔۔ مجھے بولنے پہ اکسا رہی ہیں۔۔۔ مشغول رہتی ہیں۔ اس دن سن گن مل گئی ہو گی نا میاں صاحب سے میرے جھگڑے کی۔ اب تفصیل جاننے کے لیے تمہید باندھی جا رہی ہے' ورنہ کبھی رخشندہ بھابھی کہیں کہ کوئی جیے یا مرے' ان کی بلا سے۔ گھر میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں' انہیں کوئی سروکار نہیں ہوتا تھا۔ بس اپنے کام سے کام اور اپنے میاں اور بچوں سے تعلق واسطہ۔ اب کیسے موقع دیکھ کے اس وقت نیچے اتری ہیں' جب اماں جی سو رہی ہیں۔ چاہتی ہیں کہ ادھر میرے منہ سے کوئی گلہ نکلے' ادھر یہ بات پکڑیں اور مجھے جتائیں کہ دیورانی بی بی! اور کرو خدمتیں ساس کی۔۔۔ اور جی حضوری کرواپنے میاں کی۔۔۔ مجھے کیا پڑی ہے ایسے جھوٹے ہمدردوں کے سامنے اپنا آپ ہلکا کرتے یا اپنی کوئی کمزوری ان کے ہاتھ میں دینے کی۔)

وہ بظاہر پورے دھیان سے فراک کے گھیرے پہ لیس لگا رہی تھی اور دل ہی دل میں جٹھانی کی کسی بات کا تسلی بخش جواب نہ دینے کے ارادے باندھ رہی تھی۔

رخشندہ کو بھی اس کے کچے پن پہ تاؤ سا آ گیا۔

"میں کل اپنے میکے جا رہی ہوں۔"

ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ وہ اپنے کسی پروگرام سے یوں قبل از وقت کسی کو مطلع کر رہی تھی' ورنہ عین وقت پہ دھماکہ کیا جاتا۔

"بچوں کی چھٹیاں ہیں' ضد کر رہے تھے۔ سوچا ایک آدھ ہفتہ رہ آؤں۔"

"ایک آدھ ہفتہ۔۔۔" بالآخر پروین کا مصنوعی انہماک ٹوٹنے میں کامیاب ہو ہی گیا۔

اب پروین کو فکر لاحق ہوئی۔

وہ پچھلے چار روز سے اپنے میکے نہیں جا سکی تھی۔ مصلحتاً اس نے سراج دین سے جانے کا تقاضا بھی نہیں کیا تھا اور پچھلے چار روز سے وہ کوشش کر رہی تھی کہ گھر میں کسی قسم کی کوئی تلخی نہ ہونے پائے۔ نہ کسی بات پہ سراج دین سے الجھ رہی تھی' تاکہ اس کا موڈ خوشگوار رہے۔ ایسا کر کے وہ اپنی ساس کی ہدایت پہ ہی عمل کر رہی تھی۔

(چاہے یہ نصیحت اس وقت اسے کتنی گراں ہی کیوں نہ گزری تھی لیکن اس پہ عمل کرنے کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا۔)

جمعہ کو اس کا جانے کا ارادہ تھا۔ سوچا تھا' بچوں کی چھٹیوں کا کہہ کر انہیں بھی دو دن کے لیے ساتھ لے جائے گی لیکن رخشندہ نے اپنے جانے کا کہہ کر اسے پریشانی میں ڈال دیا تھا۔ وہ اماں جی کو اکیلے گھر میں چھوڑ کے خود میکے کیسے رہنے جا سکتی تھی۔ سراج دین کی اجازت ملتا یا نہ ملتا تو بہت بعد کی بات تھی' خود وہ بھی ایسا کرنے کی خود میں

ہمت نہیں پاتی تھی۔

"آپ کل ہی جا رہی ہیں بھابھی؟" اس نے مرے مرے انداز میں پوچھا۔

"ہاں ارادہ تو یہی ہے۔ تمہیں پتہ ہے میں کتنی موڈی ہوں۔ ہو سکتا ہے رات ساری پیکنگ کر کے رکھنے کے بعد صبح جانے کا ارادہ تبدیل ہو جائے لیکن شاید ایسا نہ ہو۔ بچے اداس ہو جائیں گے۔ اب تو جی چاہے نہ چاہے جانا ہی پڑے گا، بچوں کی خاطر۔"

وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں دراصل یہ جتا رہی تھی کہ وہ سارے معاملات میں کتنی خود مختار ہے۔ اس کی طرح وہ بھی پروگرام بنانے کے لیے شوہر اور ساس کی اجازت کی محتاج نہیں بلکہ صرف اور صرف اپنے موڈ کی تابع ہے۔

"اور ڈیڑھ ہفتہ ہی رہیں گی؟"

"ہو سکتا ہے دو تین دن پہلے آ جاؤں یا تین دن مزید لگ جائیں۔ کیوں تم ابھی سے اداس ہونے لگیں؟"

"جائیں شوق سے جائیں۔ میں بھلا کیوں اداس ہونے لگی۔"

اس نے روکھے انداز میں کہتے ہوئے دانتوں سے دھاگا توڑ کر فراک سمیٹا اور اٹھتے اٹھتے بڑبڑانے لگی۔

"میرے کون سے کام رک رہے ہیں آپ کے بغیر۔ بھئی اپنی مرضی کی مالک ہیں۔"

اب پچھلے دس منٹ سے وہ ٹیلی فون سیٹ کے قریب تذبذب کے عالم میں بیٹھی تھی۔ سوچ رہی تھی کہ میاں کو فون کر کے جانے کی اجازت لے یا نہیں۔

کچھ دن پہلے ہونے والی عزت افزائی کے بعد دل تو نہ چاہ رہا تھا یہ بات چھیڑنے کو۔ جواب وہ جانتی تھی کیا ہو گا۔ یہی کہ "ابھی وہاں سے آئے دن کتنے ہوئے ہیں جو دوبارہ میکے کی ہڑک جاگ اٹھی ہے۔" اس طعنے سے بچنے کے لیے وہ انتظار کر رہی تھی کہ کم از کم ایک ہفتہ گزر جائے تو ذکر کرے۔

دوسری جانب یہ احساس بھی تھا کہ رخشندہ کے کل چلے جانے کی صورت میں وہ اگلے دو ہفتے تک گھر سے بندھ کر رہ جائے گی اور ادھر اس کی ننھی سی بھتیجی، وہ معصوم بن ماں کی بچی.... وہ اجڑا ہوا، بکھرا ہوا گھر۔ اس کا غم زدہ بھائی۔ ان سب کا کیا ہو گا اتنے دن تک اگر وہ بھی پرسان حال نہ ہوئی۔

بہت ہمت کر کے بالآخر اس نے فیکٹری کا نمبر ملا ہی لیا۔ (یوں بھی بنا کسی بات کے ٹیلی فون تو ہوتی ہی رہتی ہوں آج کسی وجہ سے ہو جاتی ہوں۔)

"خیریت ہے؟ تم نے اس وقت فون کیسے کیا؟"

ایسا شاذ و نادر ہی ہوتا تھا اس لیے سراج دین کا چونکنا فطری تھا۔

"جی... جی سب خیریت ہے۔ بس یونہی فون کیا تھا۔" نمبر ملا تو بیٹھی تھی، اب دوسری جانب سے آتی کھردری لاتعلق سی آواز سن کر مدعا بیان کرنے کی ہمت کھو رہی تھی۔

"خیریت ہے تو کیا منڈی کے بھاؤ جاننے کے لیے یہاں کا نمبر ملایا ہے؟ اماں جی تو ٹھیک ہیں نا؟"

طنز کرتے کرتے اچانک ماں کا خیال ستایا۔

"جی وہ بالکل خیریت سے ہیں۔"

"پھر بچے.... بچے تو سب گھر پہ ہی ہیں نا؟"

اب بچوں کا وہم ستانے لگا۔

"جی اور کہاں ہوں گے اس گرمی میں، اندر کمرے میں کھیل رہے ہیں۔"

"تو فون کس لیے کیا ہے، جلدی پھوٹو، میں یہاں فارغ نہیں بیٹھا ہوں۔"

"وہ... آپ سے پوچھنا تھا..." ہچکچاتے ہوئے ابھی اتنا ہی کہا۔

"کیا؟" سخت بے زاری سے کہا گیا۔

"یہی کہ آپ کیسے ہیں؟" اس بے زاری اور اکتاہٹ میں ڈوبے لہجے نے پسپا کر دیا۔

"اصل بات بتاؤ پروین بیگم! صرف میرا حال پوچھنے کے لیے تم نے اتنے سالوں میں ایک بار بھی فون کرنے کی زحمت نہیں کی۔ تب بھی نہیں جب میری طبیعت خراب ہوئی تھی۔ اب اپنے ضروری کاموں سے وقت ضائع کر کیوں کرنے لگیں؟ مطلب کی بات کرو۔"

"مجھے.... مجھے اماں کی طرف جانا ہے۔"

اس نے یوں جلدی سے کہا جیسے اس ایک سیکنڈ میں نہ کہا تو دوبارہ کہنے کی مہلت نہ ملے گی۔

جواباً دوسری جانب ایک گہری خاموشی چند ثانیوں کے لیے چھا گئی۔

"یہ بات گھر میں نہیں ہو سکتی۔ شام کو آتا ہوں پھر دیکھتے ہیں۔"

خلاف توقع خاصے ٹھنڈے انداز میں کہا گیا ورنہ اسے تو سراج کے بھڑک اٹھنے کی پوری پوری امید تھی۔

"مجھے کل صبح نہیں، ابھی جانا ہے۔"

یہ نرمی پروین کی ہمت بندھا گئی۔

"کیوں ابھی کیوں۔ ایسی کیا افتاد آن پڑی؟"

"جانا تو مجھے دو چار روز بعد تھا لیکن رخشندہ بھابھی کل سویرے بچوں سمیت اپنے میکے جا رہی ہیں اور ان کا کوئی پندرہ روز تک رہنے کا پروگرام ہے۔ ایسے میں میں اتنے دن گھر سے نکل نہیں پاؤں گی۔ بھائی صاحب تو ساتھ جاتے نہیں بھابھی کے۔ ان کے کھانے پینے کا بھی خیال رکھنا ہو گا اور اماں جی کا۔"

"ٹھیک ہے ہو آؤ۔ مگر کیسے جاؤ گی؟"

اتنی جلدی اجازت.... اور وہ بھی اتنے غیر متوقع انداز میں۔ خوشی کے مارے پروین کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ تو ابھی مزید منتیں کرنے کے ارادے باندھ رہی تھی۔

"رکشے میں۔"

"بچے ساتھ ہوں گے؟"

"اگر آپ اجازت دیں تو؟"

"چلو لے جاؤ۔" وہ اور فیاض بنے۔

"مگر رکشے میں نہیں، میں گاڑی بھجوا دیتا ہوں۔"

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ فیکٹری شہر کی حدود سے باہر تھی۔ وہاں سے گاڑی آنے میں خاصا وقت لگتا اور دن کے بارہ بجنے والے تھے۔ ایسے میں رش بھی زیادہ ہوتا، معمول سے زیادہ ہی وقت لگتا گاڑی گھر تک پہنچنے میں اور وہ وقت ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی۔

"گاڑی آنے میں گھنٹہ لگ جائے گا، رکشہ موڑ سے مل جائے گا، ابھی ملازمہ کو بھیج کر منگوا لوں گی۔"

"ٹھیک ہے... اچھا خیال رکھنا، پہلی بار رکشے میں لے جا رہی ہو۔ ایک تو تمہارے بے وقت کے پروگرام۔"

مزید کچھ کہے بغیر سراج دین نے ریسیور رکھ دیا۔ وہ واپسی کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گئی کہ وہ لینے آئیں گے یا وہ خود ہی بھائی کے ساتھ چلی آئے۔

"چلو وہاں جا کے دوبارہ فون کر لوں گی۔"

اس نے جلدی جلدی چند کپڑے بیگ میں ٹھونسے، بچوں کے کپڑے تبدیل کروانے کا وقت نہیں تھا۔ سوچا وہاں جا کے نہا دھو لیں گے۔ ملازمہ کو رکشہ لانے کا کہہ کر بچوں کو کھیل چھوڑنے کو کہا، نانو کے گھر جانے کا بتایا اور خود اماں جی کے کمرے کا رخ کیا۔

چونکہ میاں سے اجازت مل چکی تھی اس لیے انہوں نے کیا تعرض کرنا تھا۔

ذہنی سرشاری سی، اتنی چلچلاتی دھوپ میں رکشے میں تین بچوں اور ایک بیگ کے ساتھ ٹھنسی ہوئی بیٹھی تھی۔

بیگ میں وہ چھوٹے چھوٹے خوبصورت فراک پڑے تھے جو اس نے ان چار دنوں میں وشمہ کے لیے سیئے تھے۔

☼ ☼ ☼

واپسی پہ دیر سے ہی سہی مگر سراج دین خود اسے لینے آئے۔ نوید مراد نے بہن کے کہنے پہ فون کر کے باقاعدہ اصرار کے ساتھ بلایا تھا۔ نہ بلایا ہوتا تب بھی سراج نے آنا ہی تھا۔ اپنی والدہ بیگم شوکت جہاں کی طرح وہ بچوں کے معاملے میں خاصے وہمی انسان تھے۔ پتہ نہیں کس موڈ میں آ کر انہیں رکشے میں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ بعد میں فکر مندی رہے اور ان کے گھر پہنچنے تک دو بار فون کر کے پوچھ چکے تھے اسی لیے رات گیارہ بجے خود لینے آ گئے۔

"آ گئی دیہینہ؟" پروین نے پوچھا کیونکہ وہ فیکٹری سے بہت لیٹ آتے تب بھی رات کے سات ساڑھے سات بج جاتے تھے۔

"فیکٹری سے نہیں گھر سے آ رہا ہوں۔"

وہ سمجھ گئی کہ سیدھا یہاں آنے کے بجائے وہ پہلے گھر گئے ہوں گے نہا دھو کے کھانا کھا کر لباس تبدیل کر کے یہاں آئے ہیں۔ اس کا دل بجھ گیا۔ نوید مراد نے خاص بہنوئی کے لیے پرتکلف کھانا تیار کروایا تھا۔

"آج رات کا کھانا آپ کی پسند کا بنا تھا۔ بھائی جان نے خود آپ کو کھانا ہم سب کے ساتھ کھانے کی دعوت دی تھی۔ ہم سب بلکہ بچے بھی آپ کے انتظار میں اب تک بھوکے بیٹھے ہیں۔"

اس نے شکوہ کیا۔

"تو چلو کھاتے ہیں۔" وہ خوش دلی سے کھانے کی ٹیبل کی جانب بڑھے۔ پروین کا دل خوشی سے اچھل کے رہ گیا۔

(یعنی گیارہ بجے تک بھی انہوں نے کھانا نہیں کھایا گھر جانے کے باوجود۔ صرف ہمارے ساتھ کھانے کے لیے۔)

آج سراج دین کا موڈ خاصا خوشگوار تھا۔ نوید مراد سے بھی کھانے کے دوران خاصی گپ شپ رہی۔ ساس سے حسب معمول خشک اور لیا دیا رویہ رہا لیکن غنیمت رہی کہ ان کی بے سروپا باتوں کو نظر انداز کر دیا۔ نہ برے برے منہ بنائے نہ طنز کیا نہ ہی جھنجلاہٹ کے مارے کھانا چھوڑ کے اٹھ کھڑے ہوئے۔

اور تو اور جاتے جاتے پروین کی گود میں سوئی ننھی سی وشمہ کے گال انگلی سے چھو کر اس کے بارے میں بھی دریافت کیا۔

"آج تو صاحب انسانیت کی جون میں ہیں۔" وہ سرشاری سے مسکرائی۔

واپسی پہ سارا راستہ یہ مسکراہٹ اس کے لبوں سے جدا نہ ہوئی۔

"اماں جی ٹھیک کہتی ہیں۔ صبر اور خاموشی وہ ہتھیار ہیں جن سے مرد کو زیر کیا جا سکتا ہے۔ میں میاں صاحب کو کبھی بھی زیر نہیں کرنا چاہتی۔ ہاں صرف اتنا چاہتی ہوں کہ وہ میری خوشی کا خیال رکھ لیا کریں۔ میری جائز خواہشات مان جایا کریں۔"

اس کی یہ ساری سرشاری یہ خوشی صبح ناشتے کے وقت بھک سے اڑ گئی جب رخشندہ میٹھی پوریاں لیے نیچے اتری۔

"یہ خاص اہتمام کس خوشی میں؟"

شوکت جہاں نے دبا دبا طنز کیا۔ بہوؤں پہ طنز کرنا ان کی عادت نہ تھی لیکن رخشندہ کے معاملے میں وہ کبھی کبھی ایسی ہو جایا کرتی تھیں۔ شاید اس لیے کہ اس کی بہت سی عادتیں ان کے نزدیک ناپسندیدہ تھیں۔ پروین ان کے اتنے قریب تھی کہ انہیں اسے ٹوکنے کے لیے ڈھکے چھپے الفاظ کی ضرورت نہ ہوتی تھی جبکہ رخشندہ کو وہ نہ ٹوک پاتیں

باتیں۔ جب غبار زیادہ بڑھ جاتا تو یونہی ہلکے پھلکے طنز و مذاق سے جتا دیتیں جیسے اب کر رہی تھیں۔

"ماشاءاللہ بھئی آج تو اتوار ہے نہ جیم جانا نہ کھٹن۔۔۔ وہ رو کھے توس کیا ہوئے؟ بہت ہوا تو کسی دن انڈے مل گئے۔ یہ آج اتنے اہتمام کے ساتھ میٹھی پوریاں۔۔۔ کوئی خاص بات ہے کیا؟"

رخشندہ اپنی عادت کے مطابق اس طنز کا جواب دینے کی بجائے ناشتے کی ٹیبل پہ پلیٹ خاموشی سے رکھنے لگی۔ البتہ سراج دین بے ساختہ کہہ اٹھے۔

"بھابی میکے جانے کی خوشی میں یہ ناشتہ کھلا رہی ہیں سب کو۔ اس بار پروگرام بھی تو لمبا ہے۔"

"واقعی بہو! میکے جا رہی ہو کب؟"

اس بار وہ خاموش رہی۔ شوکت جہاں کا دل برا ہونے لگا۔ سراج دین بھانپ گئے کہ ماں کو یہ اطلاع ابھی ابھی ملی ہے۔

"میرا خیال ہے آج ہی جا رہی ہیں دو ہفتوں کے لیے۔ آپ کو نہیں پتا؟"

"نہیں مجھے تو نہیں بتایا بہو بیگم نے۔" ان کی آواز میں ملال کے ساتھ ساتھ گلہ بھی شامل ہو گیا۔

"تو جاؤ بھلا" آج انہیں جانا ہے اور ہمیں خبر تک نہیں۔ بھئی اجازت مانگنے کا رواج تو گئے زمانوں کی بات تھی۔ اب کیا بڑے بزرگوں کو اپنے آنے جانے سے باخبر رکھنا بھی پرانے دور کی روایت کہلایا جانے لگا ہے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ اماں جی!" رخشندہ نے ان کے سامنے رکھی پلیٹ میں پوری رکھی اور نرم لہجے میں کہنے لگی۔

"اس سے پہلے کبھی ایسا ہوا ہے کہ میں آپ کو بغیر بتائے گئی ہوں یا وقت کے وقت گھر سے نکلتے ہوئے بتایا ہو۔ کئی دن پہلے ہی بتا دیا کرتی ہوں۔"

"تو آج یہ دن کدھر سے چڑھ آیا؟" وہ بدستور ناراض لگ رہی تھیں۔ ابھی تک ایک لقمہ نہ توڑا تھا۔ پروین یہ ساری گفتگو بے نیازی سے سنتے ہوئے ننھی وشمہ کو پراٹھا کھلانے میں مگن تھی۔

"وہ اس لیے کہ میں کہیں جا ہی نہیں رہی۔"

اس کی اس بات پہ پروین چونکے بغیر نہ رہ سکی۔

سراج دین کا ہاتھ چائے کی پیالی لبوں تک لے جاتے رہ گیا۔

"کیوں سراج؟" شوکت جہاں نے بیٹے کی جانب دیکھا۔

"مجھے پروین نے بتایا تھا۔" وہ ہڑبڑا کے سارا معاملہ اس پہ ڈال گئے۔

اب وہ بہو کو استفہامیہ انداز میں گھورنے لگیں۔

"میں تو۔ بھابھی نے۔۔۔ کیوں بھابھی! آپ نے خود ہی تو کہا تھا۔ کل آپ کہہ نہیں رہی تھیں کہ آپ صبح اپنے میکے جانے والی ہیں دو ہفتے رہیں گی۔۔۔ بچوں کی چھٹیاں ہیں وغیرہ وغیرہ۔۔۔"

"میں تو صرف یہ ذکر کر رہی تھی کہ بچوں کی چھٹیاں ہیں ان کا دل چاہ رہا ہے جانے کو۔ کوئی حتمی پروگرام تو نہیں بنایا تھا۔"

پروین اس غلط بیانی پہ تاؤ کھا کے رہ گئی۔ اسے زندگی میں پہلی بار رخشندہ کی صورت اس قدر مکروہ لگی۔

"آپ نے تو یہاں تک کہا کہ اگر موڈ بنا تو دو تین دن مزید بھی لگ سکتے ہیں اور۔۔۔"

"اور میں نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں بوں ہی موڈی۔ موڈ نہ ہوا تو نہیں جاؤں گی بھول گئیں۔ ہاں کل دل چاہ رہا تھا جانے کو۔ بس باتوں باتوں میں پروین سے تذکرہ کیا کہ شاید چلی جاؤں۔ یہ شاید بھی کہا اور بھی۔"

اب اس نے ساس کی جانب رخ کر کے وضاحت کی اور خالی پلیٹ ہاتھ میں لیے اوپر چلی گئی۔

"وہ اماں جی! بھابھی نے اتنے وثوق سے۔۔۔ وہ سچ میں یہ کہہ رہی تھیں کہ۔۔۔"

پروین بھی ہکلا کے اپنی پوزیشن صاف کرنے لگی مگر شوکت جہاں نے ہاتھ اٹھا کر اسے بولنے سے منع کر دیا۔

"چھوڑو اس بات کو، یہ بھی کوئی مسئلہ ہے بحث کرنے کا۔ صبح کا وقت ہے، بے کار کے مباحثے میں کیوں خراب کرنا۔ ہو جاتا ہے کبھی کبھار مغالطہ۔ کہنے والا کچھ اور کہتا ہے، سننے والا کچھ اور سمجھتا ہے اور رخشندہ تو یونہی بھی گول مول بات کرنے کی عادی ہے۔ جانے دو۔"

"نہیں اماں جی! آپ ہر بار اس کی غلطی کی پردہ پوشی کر کے بات ختم کرنے کی کوشش مت کیا کیجیے۔" سراج نے پیالی میز پہ پٹخی۔

"اس نے جان بوجھ کے بھابھی کی بات کو غلط معنی پہنائے اور جھوٹی افواہ پھیلائی۔"

"چپ کرو تم فضول کے الزامات۔ نجانے کیا فتور بھرا ہے تمہارے دماغ میں۔" انھوں نے جھڑکا۔

"میرا دماغ خراب ہے اور یہ فرشتہ ہے جو غلطی کر ہی نہیں سکتی، جھوٹ بول ہی نہیں سکتی۔" وہ تلملائے۔

"جھوٹ کون نہیں بولتا، سب بولتے ہیں۔ کبھی مصلحتاً، کبھی ضرورتاً، کبھی کسی مجبوری کے تحت۔۔۔ اور غلطی کس سے نہیں ہوتی، سب سے ہوتی ہے۔ کبھی غیر ارادی طور پہ، کبھی ارادتاً۔ مجھ سے، تم سے، سب سے غلطی ہوتی ہے۔ میں یہ نہیں کہہ رہی کہ پروین نے زندگی بھر کوئی جھوٹ نہ بولا ہوگا لیکن عقل سے کام لو۔ وہ کوئی فطرتاً تو جھوٹی نہیں، نہ لگائی بجھائی کرنے والی عادت ہے اس کی۔ اتنا تو ساس ہونے کے ناتے میں بھی جانتی ہوں اور شوہر ہونے کے ناتے تمہیں بھی پتا ہوگا۔ بھلا رخشندہ کے جانے کی جھوٹی اطلاع گھر میں پھیلانے سے اسے کیا فائدہ ہو سکتا ہے۔ بلاوجہ دروغ گوئی کیوں کرے گی وہ؟"

"بلاوجہ نہیں، اس کے پاس جواز تھا یہ سب کرنے کا۔" انھوں نے پروین کے رنگ اڑے چہرے کی جانب غصے سے دیکھا۔

"اسے فائدہ اٹھانا تھا اور وہ یہ کہ اس بہانے یہ ایمرجنسی میں اپنی ماں کے ہاں جانے کا پروگرام بنا سکے۔"

"میری بات تو سنیں۔" اس نے کہنے کی کوشش کی مگر بے سود۔

"تم اپنا اعتبار کھو چکی ہو اس لیے اب منہ کھولنے کی کوشش مت کرو۔"

"الٹا سیدھا مت بولو سراج! ذرا سی بات پہ تم اسے بے اعتبار قرار دے رہے ہو۔ شرم کرو، بیٹا شادیوں تک آنے لگا ہے اور تم ایسی عاقبت نااندیشی کی باتیں کر رہے ہو۔ ارے اپنے میکے ہی تو گئی تھی وہ، کہیں اور تو نہیں۔۔۔"

"ضرور جائے۔ سو بار جائے مگر اتنا بڑا ڈرامہ رچا کے ہرگز نہیں، اس لیے مجھے اس کے میکے کے نام پہ تکلیف ہوتی ہے۔ میری ان لوگوں سے کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے لیکن جن عورتوں کو میکے کا خبط سوار ہوتا ہے، وہ اسی طرح میکے کی خاطر دوسرے ہر رشتے کو دھوکا دیتی ہیں۔ میکے کی محبت اسے لے ڈوبے گی اماں!"

وہ وارننگ دیتے تیز تیز قدموں سے باہر نکل گئے۔

پروین پراٹھے کا نوالہ ہاتھ میں لیے بے آواز آنسو بہا رہی تھی اور وصی منتظر تھا کہ کب وہ نوالہ اس کے منہ میں ڈالے۔

"لاؤ میں کھلاتی ہوں۔" شوکت جہاں نے نوالہ اس کے ہاتھ سے لیا، وہ چپ چاپ بیٹھی رہی مگر وصی نے دادی کے ہاتھ سے کھانے سے انکار کر دیا۔

"ماما سے!" وہ ٹھنک کے بولا۔

پروین نے ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کیے اور ساس کے ہاتھ سے نوالہ لے کر وصی کے منہ میں ڈالا۔

"سراج کا دماغ خراب ہو چکا ہے، اس کی بات کا برا کیا ماننا بیٹی! بس کرو، رو رو کر اپنا اور میرا دل برا مت کرو۔"

وہ اس کے علاوہ اور کس انداز میں تسلی دیتیں۔

"ان کا دماغ خراب نہیں ہوا اماں جی! بس اونچے سنگھاسن پہ جا بیٹھا ہے۔ وہ صرف اسے سچ مانتے ہیں جو خود کہتے ہیں، صرف اسے درست جانتے ہیں جو خود سمجھتے ہیں۔ ان کی نظر میں باقی سب غلط ہیں۔ بار بار وہ یہی ایک بات دہراتے ہیں کہ میکے کی محبت مجھے برباد کر ڈالے گی۔ کیسے؟ آپ بتائیے کیسے؟ کیا محبت بھی برباد کر ڈالتی ہے؟

میکے کی محبت کیا ہوتی ہے؟ محبت تو محبت ہوتی ہے۔ رشتوں کی محبت، اپنوں کی محبت۔ جیسی محبت مجھے اپنے شوہر، بچوں اور گھر سے ہے، آپ سے ہے اور جیسی محبت مجھے اپنی ماں اور بھائی سے ہے۔ جب وہ محبت بری نہیں تو یہ محبت کیوں بری ہے؟ یہ مجھے کیوں لے ڈوبے گی؟"

"ان سوالوں میں مت الجھو پروین!"

ان کی بات واقعی چونکا دینے والی تھی کہ ان کا اپنا ذہن جھٹکے کھا گیا۔ انھیں پروین کے سوالوں سے تنفر اور بغاوت کی بو آنے لگی، اسی لیے اسے سمجھانے لگیں۔

"محبتیں واقعی کبھی بھی نقصان نہیں دیتیں لیکن ہر محبت کا خانہ الگ ہوتا ہے۔ زندگی کے مختلف ادوار میں مختلف خانوں کی نوعیت بدلتی رہتی ہے۔ کبھی کوئی اہم ہو جاتا ہے تو کبھی کوئی۔ اس وقت تمہارے نزدیک زیادہ اہم تمہارا شوہر اور بچے ہونے چاہئیں۔ تمہیں باقی سب کے مقابلے میں انھیں اولیت دینی چاہیے۔ میں تو بس اتنا جانتی ہوں اور یہی صلاح دوں گی تمہیں۔ آگے تم خود سمجھدار ہو۔ اپنا اچھا برا جانتی ہو۔"

اسے نصیحت کرنے کے ساتھ ساتھ انھوں نے یہ بھی جتا دیا کہ وہ کوئی اس کے ساتھ جبر نہیں کر رہیں نا کہ اس کا پہلے سے باغی ذہن مزید متنفر ہو جائے۔

"ماما۔۔۔" کمرے سے آتی حسان کی آواز نے پروین کو چونک کر خیالوں کی دنیا سے باہر آنے پہ مجبور کیا، ورنہ ساس کے اٹھ کے جانے کے بعد سے وہ یونہی بے دھیانی میں چھوٹے چھوٹے نوالے توڑ کے وصی کے منہ میں ڈال رہی تھی۔ احسن اور حسان کب کے ناشتے سے فارغ ہو کے اندر جا چکے تھے۔

"ماما! جلدی آئیں، یہ حسان مجھے تنگ کر رہا ہے۔ ہوم ورک نہیں کرنے دے رہا۔"

اب احسن نے بھی پکارا تو اسے اٹھنا پڑا۔

"ماما! ناچتہ (ناشتہ)۔" وصی نے اس کا آنچل پکڑا۔ وہ احسن کو "دو منٹ، ابھی آئی" کہتے کہتے رک گئی۔ وزدیدہ نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھا پھر درشت لہجے میں اس سے اپنا پلو چھڑاتے ہوئے کہا۔

"خود کھاؤ، مجھے اور بھی بہت سے کام ہیں۔"

اپنی اولاد کے مقابلے میں باقی سب کو پس پشت ڈالنے کا سبق اسے ابھی ابھی پڑھایا گیا تھا، جس پہ عمل کرنے کا وہ پورا پورا ارادہ رکھتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"تم یہاں کیا لینے آئی ہو؟"

ریتا کو دیکھ کے ہی جعفر کو آگ لگ گئی۔ موڈ پہلے ہی خاصا بگڑا ہوا تھا، اسے سامنے پا کے خطرناک ہو گیا۔

"اپنے ایک سوال کا جواب لینے آئی ہوں۔"

اس نے یہ تمام درشتی برداشت سے پیتے ہوئے کہا۔ حالانکہ آدھا جواب وہ اپنا بے گانگی اور خراب رویے سے دے ہی چکا تھا۔

"میں تمہارے کسی سوال کا جواب دینے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ منہ موڑ کے اپنے ملازم کو آواز دینے لگا۔

"فضل! کتنی بار کہا ہے کسی کو اندر بلانے سے پہلے مجھ سے پوچھ لیا کرو۔ ہر ایرا غیرا منہ اٹھا کے اندر گھس آتا ہے۔"

پچھلی بار بھی اس کے تیور بدلے ہوئے تھے کیونکہ اس کا دل بدل چکا تھا۔ اب وہ کسی اور کے حسن کا اسیر تھا لیکن اس کے باوجود اس نے اپنا رکھ رکھاؤ نہیں کھویا تھا اور اب اگر وہ ریتا کے ساتھ زیادہ ہی رکھائی اور بدتمیزی سے پیش آ رہا تھا تو اس لیے کہ سومیہ کے ساتھ گزارے وقت کا اسے جو خمیازہ بھگتنا پڑ رہا تھا، اس کے نتیجے میں وہ سب سے بے زار تھا۔ ریتا تو کیا سومیہ تک کی شکل دیکھنے کا روادار نہ تھا۔ فی الحال وہ اپنے صنف نازک والے شوق کو کستے ہوئے آئندہ کسی بھی قسم کے رنگین چکر میں نہ الجھنے کا عہد کر رہا تھا کہ ریتا کی آمد ہوئی اور وہ زیر عتاب آ گئی۔

"صاب۔ ! میں تو۔۔۔" وہ گڑبڑا گیا۔ اب کیا کہتا کہ ربتا نے منت ہی اس انداز میں کی تھی کہ وہ شست اندر لانے پہ مجبور ہو گیا۔

"دفع ہو جاؤ اب۔۔۔ شکل گم کرو اور تم۔۔۔ تم بھی۔"

اس نے حقارت سے چٹکی بجاتے ہوئے اسے بھی نکلنے کا اشارہ کیا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اس معزز، مہذب شخص کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھتی رہی جس کی شیریں بیانی اور رکھ رکھاؤ پہ ہی تو مرمٹی تھی وہ جس طرح وہ بات رکھتا تھا۔

جس طرح وہ اسے احترام سے مخاطب کرتا تھا۔ وہ سب انداز۔۔۔ وہ سب اطوار اسے ایک ایک کر کے یاد آنے لگے۔

"سنا نہیں تم نے، میری شکل کیا دیکھ رہی ہو؟"

"دیکھ رہی ہوں، انسان کتنی جلدی بدل جایا کرتے ہیں۔"

"میں اس وقت تمہاری بے کار کی باتیں سننے کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"اب ہماری باتیں بے کار ہو گئی ہیں صاحب۔۔۔!" وہ ذرا سا مسکرائی۔ اس کی یہ مسکراہٹ جعفر کو مزید تپا گئی۔

"تم یہاں سے جاتی ہو یا میں دھکے دے کے نکلواؤں۔"

اس قدر تذلیل۔۔۔ اتنی بے عزتی۔۔۔ اور وہ بھی اس ہستی کے ہاتھوں جس سے ہمیشہ پذیرائی کے ہی سپنے دیکھے ہوں۔

اس کے قدم لڑکھڑا سے گئے۔

"چلی جاؤں گی جعفر صاحب! چلی جاؤں گی۔ پہلے یہ تو جان لوں کہ آپ کی حقیقت کیا ہے؟ کیا وہ۔۔۔ جو میں نے جانی۔۔۔؟ یا پھر وہ۔۔۔ جو یہ اخبار دکھا رہے ہیں؟"

اس نے اخبار آگے کیا جس میں سومیہ کے ساتھ اس کے تعلق کی خبریں چٹ پٹے الفاظ میں تحریر تھیں۔

جعفر محمود نے اس کے ہاتھ سے اخبار جھپٹ کر دو ٹکڑے کر دیا۔

"بکواس ہے یہ سب۔۔۔ کچھ نہیں لگتی یہ سومیہ میری۔۔۔ نہ ہی میں اس سے کوئی شادی وادی کر رہا ہوں۔"

"سچ۔۔۔؟ میں پہلے ہی کہتی تھی، آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ آپ تو۔۔۔ آپ تو۔۔۔"

وہ احمق پھر سے خوش گمان ہونے لگی تھی کہ اس کی سرد نگاہوں سے جھلکتی نفرت نے اس کی زبان پہ گویا قفل ڈال دیے۔

"سومیہ کے چکر میں پھنسنا میری زندگی کی سب سے بڑی حماقت تھی اور تم سے شناسائی سب سے سنگین غلطی۔ میں دونوں پہ پچھتا رہا ہوں۔ ایک سے تعلق نے رسوائی دی تو تم سے تعلق رکھنے پہ میرا اپنا آپ مجھے شرمندہ کر رہا کہ آخر میں کیچڑ کے اس ڈھیر میں گرا کیسے؟"

اور ربتا کو کسی نے دونوں ہاتھوں سے بدبودار کیچڑ سے بھرے گڑھے میں اوندھے منہ دھکا دے کر گرا دیا۔

"کتنا سمجھایا مجھے میرے دوستوں نے کہ یہ تمہارا اسٹینڈرڈ نہیں۔ یہ دو ٹکے کی ناچنے والیاں۔۔۔ یہ محفلیں سجا کے اوباشوں کو خوش کرنے والیاں۔۔۔ یہ سستی قسم کی عیاشیاں تمہارے جیسے انسان کو زیب نہیں دیتیں۔ پتہ نہیں میرا وقت خراب تھا یا پھر میرا دماغ خراب تھا جو تمہیں سر پہ چڑھائے پھرتا رہا۔ بات سنو، تم میرے دل سے اسی وقت اتر گئی تھیں جب سومیہ نے مجھے گرین سگنل دیا تھا۔ اس دن سے لے کر آج تک میں نے ہزار بار خود کو کوسا ہے اتنے گندے ذوق پہ۔ اور اب جبکہ میں سومیہ کے قبیل کی حسیناؤں سے بھی دس گز کے فاصلے پہ رہنے کا عہد کر چکا ہوں تو تمہارے جیسی سڑک چھاپ لڑکی جس کے پاس نہ صورت ہے، نہ شکل۔ چار آنسو بہا کے مجھے پھر سے اس حماقت پہ مجبور نہیں کر سکتی۔ سنا تم نے۔"

اس کی اس طویل بات کے دوران دو بار کال بیل بج چکی تھی۔ فضل اس کے قریب سے بھاگتا ہوا پہنچا

دروازے تک گیا اور پھر الٹے قدموں واپس لوٹا۔

"بی صاحب! آپ کے گھر والے آئے ہیں۔"

"گھر والے۔۔۔ اسلام آباد سے۔۔۔؟" وہ گڑبڑا گیا۔ سارا رعب، جو ربتا پہ انڈیل رہا تھا جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"ہاں جی، وہ آپ کے ابا جی، وڈے بھرا، دراں جی اور آپ کی بیگم صاحبہ جی۔۔۔"

"بیگم صاحبہ؟" ربتا کے لیے یہ ایک اور انکشاف تھا۔

"دفع ہو جاؤ تم۔" اس کا بس نہ چل رہا تھا مغلظ گالیوں کے ساتھ ساتھ ٹھڈے مارتا ہوا اسے باہر سڑک پہ نکال پھینکے۔

"فضل! اسے پیچھے سے نکال دو۔ گیٹ میں کھولتا ہوں۔"

بیٹ روم سے پلٹ کر اس نے فضل کی جانب دھکیلا! جو اس گفتگو کو سن کر یہ اندازہ لگا ہی چکا تھا کہ یہ مہمان لڑکی کون ہے۔ اپنے بازوؤں میں اس گرتی سنبھلتی لڑکی کو سمیٹتے ہوئے اس کی بانچھیں چر گئیں۔ وہ مشکور انداز میں باہر کی جانب نکلتے صاحب کی پشت کو تکنے لگا پھر اچانک اسے وہ آرڈر یاد آیا۔

"چلو تم میرے ساتھ آؤ۔ میں تمہیں باہر کا رستہ دکھاتا ہوں۔"

اصلیت کھلنے پہ اس کا انداز تخاطب بھی بدل گیا۔ اب وہ بھی اسے مضبوطی سے جکڑے ہوئے تھا جیسے قسمت سے ہاتھ آنے والے اس خزانے سے محروم ہونے کا کوئی ارادہ نہ ہو۔

"چھوڑو مجھے۔" ربتا نے ایک جھٹکے سے اپنا آپ چھڑایا اور جعفر کے پیچھے لپکی۔

"اوئے۔۔۔" فضل بھی اس سے غافل نہیں تھا۔ اس نے دو قدم اچھل کر اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے اپنی طرف کھینچا اور اسی طرح گھسیٹتا ہوا کچن میں لے گیا۔ دروازہ زور سے بند کرنے کے بعد اس نے ربتا کو دیوار سے لگاتے ہوئے اس کے لبوں پہ اپنا مضبوط ہاتھ جما دیا۔

پہلی بار اسے شدید قسم کا خوف محسوس ہوا۔

وہ مجہول سا نظر آنے والا غریب ملازم اس وقت اس بند کمرے کی تنہائی میں کوئی غنڈہ بدمعاش نظر آ رہا تھا۔ اس کی خوف زدہ آنکھیں دہشت کے مارے پھیل گئیں۔

اس کا خوف بے جا نہیں تھا۔ اس وقت فضل کی آنکھوں میں جو کچھ تھا اس سے اس جیسی لڑکی انجان نہیں ہو سکتی تھی لیکن فضل بھی بے بس تھا۔ وہ اپنے مالک کے گھر میں تھا اور صرف مالک ہی نہیں، مالکوں کے مالک جتنی ان کے بزرگ بھی گھر میں موجود تھے۔ وہ اس حسن اور جوانی کی تپش سے صرف آنکھیں اور ہاتھ ہی سینک سکتا تھا۔

آہستہ آہستہ اس کا ہاتھ ربتا کے ہونٹوں سے نیچے سرک کر اس کی گردن تک آن پہنچا۔ باہر سے آتی ہلکی ہلکی آوازوں نے ربتا کو سراہٹ کا احساس دلایا۔ وہ بھانپ گئی کہ فضل کی نیت ڈانواں ڈول سہی لیکن اس وقت وہ بے بس اور لاچار ہے۔ اپنے مذموم ارادوں پہ عمل نہیں کر سکتا۔ یہ احساس اس کی ہمت بڑھا گیا۔ اپنے سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے التجا کی۔

"کیا میں ایک نظر باہر جھانک لوں؟"

"مروانا ہے مجھے، صاب کا پتہ نہیں سمجھے۔" وہ ہلکے سے غرایا۔

"بس ایک بار کھڑکی سے ذرا پردہ ہٹا کے۔" اچانک ہی اس کے اندر جعفر محمود کی بیوی کو دیکھنے کی خواہش جاگی تھی اور یہ خواہش اتنی طاقت ور تھی کہ وہ اسے دبا نہ پا رہی تھی۔

فضل نے کھڑکی پہ لگا پردہ سرکانے سے پہلے ٹیوب لائٹ آف کر دی۔

باہر سے آتی آوازیں واضح نہیں تھیں مگر منظر بے حد واضح تھا۔

جعفر محمود فق چہرے کے ساتھ گردن جھکائے کھڑا تھا۔ وہ کہیں سے بھی باوقار اور پراعتماد افسر نہیں لگ رہا تھا

جس کی قربت نے ربتا کو اس کی اوقات سے بڑھ کے خواب دیکھنے پہ مجبور کیا تھا۔ نہ ہی اس جعفر میں کچھ دیر پہلے والے جعفر کی جھلک تھی جو بڑے کروفر اور طنطنے کے ساتھ ربتا کو آئینہ دکھا رہا تھا۔

یہ جعفر تو اپنے سامنے بیٹھے ان تین نفوس کے سامنے نظر تک اٹھانے کے قابل نہ لگ رہا تھا۔

ان میں سے ایک عمر رسیدہ مگر بارعب شخص یقیناً جعفر کا باپ تھا جس کے چہرے پہ غصے کے ساتھ ساتھ ناز بھی تھا۔

دوسرا شخص جو اتنا عمر رسیدہ نہیں تھا مگر بارعب اس سے بڑھ کے لگ رہا تھا اور جس کی آتشیں نظریں مسلسل جعفر کے وجود کو چھید رہی تھیں۔

تیسرا وجود وہ نسوانی وجود تھا جو بہت عام سا تھا۔ اسے معمولی قرار دینے والے شخص کی نصف بہتر خود اتنی معمولی ہوگی یہ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا۔

بڑی سی سیاہ چادر میں لپٹی دراز قامت مگر قدرے بھاری جسامت والی وہ انتیس تیس سال کی عورت عام سے نقش والے گندمی چہرے پہ ایسے سپاٹ تاثرات لیے ہوئے تھی جیسے یہ معاملہ اس کے شوہر کا نہیں غیر کا ہو۔ وہ یہاں موجود تینوں مردوں سے لاتعلق نظر آئی۔ بےزاری سے نظریں گھما گھما کے ڈرائنگ روم کی آرائش کا جائزہ لے رہی تھی پھر اچانک اس کی نظریں کچن کے اس گلاس ونڈو پہ جا پڑیں جو یہاں سے متصل تھا۔

ربتا نے گڑبڑا کے پردہ گرا دیا۔

کچن میں خاصا اندھیرا تھا، شیشے بھی گہرے رنگ کے تھے۔ اس کے دیکھے جانے کا امکان صفر کے برابر تھا پھر بھی وہ بری طرح گھبرا گئی۔

اس کا خیال درست تھا، جعفر کی بیوی واقعی یہ اندازہ نہیں کر پائی تھی کہ شیشے کے اس پار کوئی انہیں دیکھ رہا ہے لیکن اس کا ڈر بھی بےوجہ نہ تھا، وہ پردہ گرا کے مڑی تو فضل کو دیکھ کر ٹھٹک گئی تھی۔

"چل نکل اب... بھاگ یہاں سے۔" فضل صاحب کی بیگم کو کچن تک آتے دیکھ کر ربتا کو بھگانے لگا۔ اس کا سارا ٹھرکی پن اڑن چھو ہو چکا تھا۔ اب صرف اپنی نوکری بچانے کی فکر تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ اسے پچھلے دروازے کا رستہ دکھاتا، بیگم صاحبہ کچن میں داخل ہو چکی تھیں۔

"کون ہو تم..... ؟ وہ اخبار والی..... ؟"

اس عام سی نظر آنے والی عورت کے لہجے میں ایسا کروفر تھا جو پکار پکار کر اعلان کر رہا تھا کہ اس کی حیثیت اور مقام معمولی نہیں۔

ربتا اس سے مرعوب ہو گئی۔

"وہ تو نہیں لگ رہی ہو، کون ہو؟"

"میں ربتا...." اس نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے کہا۔

"تم اکثر آتی ہو؟" وہ اتنے ٹھنڈے انداز میں پوچھ رہی تھی کہ ربتا کو حیرت ہو رہی تھی۔

"نہیں، پہلی بار آئی ہوں۔"

"وہ لائے ہیں تمہیں؟"

"خود آئی ہوں۔"

"کیا کرنے؟" پہلی بار اس کا لہجہ درشت ہوا۔

"وہی جو آپ کرنے آئی ہیں۔"

"کیا مطلب؟" اس کے ابرو تن گئے۔

"پوچھنے آئی ہوں کہ میری محبت اور وفا میں کون سی کمی رہ گئی تھی جو وہ اس عورت سے لینے گئے تھے۔"

ربتا کے اس جواب پہ مدیحہ نے اپنے منہ پہ ایسے ہاتھ رکھا جیسے اپنا بے ساختہ نکلتا قہقہہ روک رہی ہو۔

"تمہاری اس بات پہ دل کھول کے ہنسنے کو جی چاہتا ہے مگر ڈرتی ہوں یہ آواز سن کر باہر والوں کو تمہارے یہاں ہونے کا پتہ نہ لگ جائے۔"

"آپ کیوں ڈر رہی ہیں؟ پتا چلنے دیں۔"

"تم میرے بھائی اور سسر سے انجان ہو اس لیے ایسی بات کہہ سکتی ہو۔ میں ڈرتی ہوں کیونکہ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ جو اصل فساد کی جڑ ہے، وہ تو جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے۔ جب بھی ہاتھ آئی حشر اس کا بھی کم برا نہیں ہوگا لیکن اس وقت تم ہاتھ لگ گئیں تو ساری بھڑاس تم پہ نکل جائے گی اور میں تمہارے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دینا چاہتی۔"

"سوکن ہوں میں تمہاری پھر میرے ساتھ اتنی ہمدردی کیوں؟"

مدیحہ نے ایک بار پھر اپنی ہنسی روکی۔

"پہلے تمہاری یہ غلط فہمی دور کر دوں کہ تم میری سوکن ہو۔ اگرچہ خود کو میری سوکن بتاتے ہوئے تمہاری گردن بڑے فخر سے اکڑی ہوئی تھی مگر ایسا لمحے بھر کا فخر کس کام کا جو گردن ہی کٹوا دے اور یہ خوش فہمی بھی دور کر لو کہ مجھے تم سے ہمدردی ہے۔ میں تین بیٹیوں کی ماں ہوں۔ مجھے تمہارے انجام سے نہیں، بددعاؤں سے ڈر لگتا ہے۔"

کسی چودھرائن کی طرح دو ٹوک لہجے میں بات کرتے کرتے اچانک اس کی آواز بھیگ گئی۔

"میں تمہیں نہیں، اپنی بیٹیوں کا مستقبل بچانا چاہتی ہوں۔ بھاگ جاؤ یہاں سے ورنہ میرا بھائی تمہارا وہ حشر کرے گا کہ....."

اس کے ادھورے فقرے نے ہی ربتا کی ٹانگوں کو لرزا ڈالا۔ اس نے نظر کھڑکی کے پار ڈالی۔ مہین جالی کے پردے کے اس پار سب دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔

اس نے مدیحہ کو دیکھ کر اثبات میں سر ہلایا اور فضل کے پیچھے خاموشی سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کے بیٹھا وہ شخص مدیحہ کا بڑا بھائی، جعفر محمود کا سالا اور اس کا سگا تایا زاد ہی نہ تھا بلکہ اس کا سب سے بڑا بہنوئی بھی تھا۔

دونوں کی عمر میں کوئی سولہ سترہ سال کا فرق تھا۔ جب بڑی آپا کی شادی ہوئی تب جعفر کی عمر بارہ برس رہی ہوگی۔ اس کے والد پہلے سے اپنے بڑے بھائی کے رعب میں تھے۔ بیٹی دے کر اور دب گئے۔ یوں بہنوئی کو اس گھر کے سب سے محترم اور بزرگ فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی۔ بعد میں اسی کی چھوٹی بہن مدیحہ سے جعفر کی شادی ہوئی۔ رشتے برابر ہو جانے کے بعد بھی مکرم باجوہ کی حیثیت جعفر سے اوپر ہی رہی۔

اس وقت بھی وہ گرج رہے تھے اور وہ سر جھکائے سن رہا تھا۔ سالوں بیت گئے تھے یوں گردن جھکائے ان کی باتیں سنتے ہوئے اور یہ تب زیادہ گراں گزرتا جب مدیحہ سامنے ہوتی۔

اس معمولی عورت کے سامنے وہ یہ سبکی برداشت نہیں کر پاتا تھا جو ادل بدل کے رشتوں میں زبردستی اس کے سر منڈھ دی گئی تھی۔ وہ ایسے پل میں بظاہر لاتعلق نظر آنے کی کوشش کرتی مگر اسے یہی لگتا جیسے وہ اس کی بےبسی کا دل ہی دل میں مزہ لے رہی ہو۔

وہ اچانک کسی وجہ سے اٹھ کے کچن میں گئی تو اس نے خود کو ریلیکس محسوس کیا۔ اب وہ زیادہ شرمندہ ہوئے بغیر بہنوئی نما سالے... مکرم باجوہ سے جھاڑ سن سکتا تھا مگر جب اسے کچن میں گئے دو تین منٹ سے زیادہ ہو گئے تو اچانک اسے ربتا کا خیال آیا۔

وہ بیٹھے بیٹھے پہلو بدلنے لگا۔ اسے وہم لاحق ہو گیا کہ ربتا ابھی گئی نہیں، کچن میں ہی ہے اور ہو نہ ہو مدیحہ نے نہ صرف اسے پکڑ لیا ہے بلکہ ابھی اسے سب کے سامنے بھی لانے والی ہے۔ اسی ڈر نے اسے بولنے تک کی ہمت نہ

دی جب اس کے بہنوئی نے اپنا حتمی فیصلہ سنا دیا۔

"تم استعفیٰ دو اور ہمارے ساتھ چلو۔ بیوی بچوں گھر بار زمین جائیداد سب کے ہوتے ہوئے یوں دربدر کے دھکے کھانے کی نوکری کیا کرنی۔"

اتنی کہہ کر وہ اور اس کے اباجی آرام کرنے گیسٹ روم میں چلے گئے۔ وہ اٹھ کے کچن کی طرف لپکا مگر راستے میں مدیحہ وہاں سے نکل آئی۔

وہ وہیں بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا اور اس کے چہرے کے تاثرات سے کچھ اخذ کرنا چاہا۔

وہاں ہمیشہ کی طرح ایک سرد اور جامد خاموشی تھی' وہ بغیر کچھ کہے اس کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

"بھائی جی اندر چلے گئے؟"

"ہاں اور جاتے جاتے حکم سنا گئے ہیں کہ استعفیٰ دے دو جیسے میری زندگی میری اپنی نہ ہو۔ سب کام ان کے مشورے سے ہی کرنے ہوں گے۔"

وہ زہرخند لہجے میں کہتا جلے دل کے پھپھولے پھوڑنے لگا۔

"آپ اپنی زندگی بھی جی رہے ہیں اور بہت خوب جی رہے ہیں۔ میں ابھی ابھی نمونہ دیکھ کے آ رہی ہوں۔"

جعفر کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔

"گھبرایئے مت' بھگا دیا ہے آپ کی اس ناکام معشوقہ کو مگر میں ساری زندگی یہی کام کرنے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ مجھے اپنا گھر بار بھی دیکھنا ہے' بچیوں کو بھی سنبھالنا ہے' ان کی بھی تربیت کرنی ہے۔ کب تک بھاگ بھاگ کے آپ کے پھیلائے بکھیڑے سمیٹتی رہوں گی بس کیجیے اور بھائی جی کی بات مان لیں۔"

اس کے لہجے میں نرم سی دھمکی تھی جسے فی الوقت مانے بغیر اس کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا۔

"دوپہر اتنی گرمی میں لور لور کرتی آ رہی ہے' کہاں گئی تھی اتنی شکر دوپہر میں؟"

شمع نے اسے اندر داخل ہوتے دیکھ کر فکرمندی سے پوچھا۔ اس کی حالت ہی اتنی ابتر ہو رہی تھی بلکہ وہ تو پچھلے تین دنوں سے حال بے حال پھر رہی تھی۔ پہلے تو شمع طنزیہ جملے کس کس کے اسے بولتے پہ اکساتی رہی' پھر خود بھی تشویش میں مبتلا ہو گئی۔ جو بھی تھی' جیسی بھی تھی' بہرحال ماں تو تھی۔

بھری دوپہر میں اڑی ہوئی رنگت' پسینے پسینے ہوتے جسم اور پپڑی ہوتے ہونٹ لے کر وہ گھر میں داخل ہوئی تو شمع کے دل کو وسوسے ستانے لگے۔

"بیٹھ ادھر... لگتا ہے لو لگ گئی ہے۔ لے شربت پی۔" اس نے پنکھے کے نیچے بٹھاتے ہوئے اپنے دوپٹے سے اس کا پسینہ صاف کرتے ہوئے شربت کا گلاس تھمانا چاہا مگر اس کے ہاتھ نہ اٹھے۔

"امی! میرا..... میرے لیے کون سا رشتہ آیا ہے؟"

"ہیں..... ؟ رشتہ.....؟" اس غیر متوقع سوال پہ وہ حیران رہ گئی۔

"ہاں' اس دن خود تو کہہ رہی تھی کہ میرے لیے ایک رشتہ آیا ہوا ہے۔"

"ہاں وہ....." شمع کو اصغری کی پیشکش یاد آ گئی۔

"میری وہاں شادی کرا دو۔"

"کیا کہہ رہی ہو رانی؟"

"کل کرا دو... چاہے ابھی... اسی وقت۔"

"ہوش میں تو ہے تو؟" شمع نے اسے جھنجھوڑا۔

"ہاں اب تو آیا ہے ہوش۔ میں بہت ہلکی ہوں میری ماں! شہتیر کے ٹوٹے چھلکے کی طرح ہلکی..... مجھے بھاری کر دو' کسی ایک کا کر دو مجھے' ورنہ میں خود کو مار لوں گی۔"

"پاگل نہ بن رانی! ہاں ہاں کر دوں گی شادی' کر دوں گی۔ تو آرام کر' تیری طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے رانی کو سمجھانا چاہا۔

"میں مذاق نہیں کر رہی۔ میری شادی کر دو ورنہ..... ورنہ میں مار ڈالوں گی خود کو۔"

اس نے سامنے رکھا سیب کاٹنے والا چاقو اٹھا لیا۔

◇ ◇ ◇

اصغر گاڑی میں نہیں گویا ہوائی جہاز میں بیٹھ کے جا رہا تھا۔ تیس منٹ کا راستہ اس نے پندرہ منٹ میں طے کیا اور دوڑتا ہوا گلی' سیڑھیاں پھلانگتا ہوا اوپر تک پہنچا۔

کال بیل پہ رکھی اس کی انگلی باقاعدہ مرتعش تھی۔ وہ اپنے ہیجان کو کنٹرول نہیں کر پا رہا تھا۔

تیسری بیل پہ دروازہ کھلتے ہی شمع کا ستا ہوا چہرہ نظر آیا۔

"میں..... میں آ گیا۔" خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اس نے کہا تو سامنے کھڑی شمع کا چہرہ بجھتا ہوا محسوس ہوا۔

"مجھے دیر تو نہیں ہوئی؟"

مگر کوئی بھی جواب دینے کے بجائے وہ ذرا سا پرے ہٹ کر اسے راستہ دینے لگی۔

"بیٹھو' رانی کو بلاتی ہوں۔" وہ اسے ڈرائنگ روم میں بٹھا کے خود نکل گئی۔

اصغر بیٹھ تو گیا مگر جیسے انگاروں پہ..... اسے اک پل چین نہ تھا۔ بار بار پہلو بدلتے ہوئے' کانٹے اگے حلق کو تر کرتے ہوئے' بے چینی سے کبھی دروازے تو کبھی گھڑی پہ نظر ڈالتے ہوئے وہ بیک وقت اضطراب اور بے پناہ مسرت کا شکار لگ رہا تھا۔ اس کی یہ کیفیت تب سے تھی' جب سے اس نے شمع کو فون پہ یہ کہتے ہوئے سنا تھا۔

"رانی تم سے شادی کرنے پہ تیار ہے اور یہ شادی جلد سے جلد کرنا چاہتی ہے۔ تم انتظام کر لو اور..... اور یہاں آ جاؤ۔"

آخری الفاظ اس نے قدرے اٹک کر اور بجھے دل کے ساتھ کہے تھے جو اسے صاف محسوس تو ہوئے مگر وہ اس پہ غور کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ فی الحال تو اسے بلیوں اچھلتے دل کو قابو کرنا تھا' خود کو یہ یقین دلانا تھا کہ وہ واقعی اتنا خوش قسمت ہے۔ اس کے بعد اس نے یہاں پہنچنے میں دیر نہیں کی تھی۔

"کیوں..... یہ رانا پتہ نہیں کیوں اتنی دیر لگا رہی ہے۔" وہ اٹھ کے ٹہلنے لگا۔ بس نہ چل رہا تھا کہ یہاں سے نکل کر خود رانا کے کمرے میں پہنچ جائے اور اس کے چرنوں میں بیٹھ کے اس مہربانی کا شکریہ ادا کرے۔

"دروازہ کھول رانی..... وہ آ گیا ہے۔" شمع نے مری مری آواز کے ساتھ کہتے ہوئے مری مری سی دستک اس کے کمرے کے بند دروازے پہ دی۔

"اکیلا؟" صبح سے دی گئی ہر دستک اور پکار کے جواب میں پہلی بار اس کی آواز سنائی دی گئی جس پہ شمع کی جھنجھلاہٹ ایک بار پھر عود کر آئی۔

"نہیں تو کیا بنج لے کر آتا؟ تیرے جیسیوں کو دولہے مل جائیں' یہی نصیب کی بات ہے' بارات کہاں سے آ رہے..... چل آ اب باہر نکل' اندر بیٹھا ہے وہ۔"

"اکیلا کیوں آیا ہے؟ مولوی کہاں ہے نکاح پڑھانے والا؟ اس سے کہو واپس جائے' نکاح خواں اور گواہوں کے ساتھ واپس آئے۔"

"پاگل ہو گئی ہے۔" شمع کا دماغ پھر اسی طرح گھوما جیسے اس کے منہ سے پہلی بار شادی کی خواہش سن کر گھوما تھا۔

"گڈے گڑیا کا کھیل نہیں ہے شادی' جو بیٹھے بٹھائے تیرے تالی بجا دینے سے ہو جائے۔ پہلے باہر نکل' اس سے مل' بات چیت کر۔ جو طے کرنا ہے کر لے۔ بعد میں سر پکڑ کے رونا نہ پڑے۔"

"سودے بازی کا خیال دل سے نکال دو' ورنہ کہیں تمہیں سر پکڑ کے رونا نہ پڑے۔" رانی کی سرد آواز ابھری۔

"یہ تو دیکھ لیا ہوگا کہ مجھے موت سے اب ڈر نہیں لگتا۔ اگر یہ زندگی نہ ملی جس کی مجھے خواہش ہے تو [illegible] زہر پی لوں گی۔ یہ دھمکی یہ نہیں ہے کیونکہ میری شادی ہو یا موت' دونوں تمہارے لیے ایک برابر ہیں۔ دونوں صورتوں میں تمہارے ہاتھ سے گئی' اسی لیے مرنے مارنے کی دھمکی کو تم خاطر میں لانے والی نہیں۔ یہ میں جانتی ہوں۔ دھمکی یہ ہے کہ اگر میں مری تو اپنی موت تمہارے سر ڈال کے مروں گی۔ پڑی سڑتی رہنا جیل میں۔"

"مرن جوگی... اولاد... جیا دشمن۔" شمع کلس کے بولی۔ "کون سے جنم کا بدلہ لینے پہ تلی ہے۔"

"میرے جنم کا۔" ریحانے اسی زہر بھرے لہجے میں جواب دیا۔

"مجھے جنم دے کر تم نے ہی اس دشمنی کا آغاز کیا تھا۔ مجھے نہ اس سے ملنا ہے' نہ کچھ طے کرنا ہے۔ سوائے اس کے کہ چھپ کے نہیں رہوں گی' کسی بدرشتہ کی طرح۔ اپنے گھر میں' اپنے سگوں کے ساتھ رہ کے۔ جاؤ کہہ دو۔"

اس نے آخری الفاظ چبا کے کہے اور اس کے ساتھ ہی کوئی چیز اٹھا کے دروازے پہ ماری۔

ڈرائنگ روم میں بیٹھے اصغر نے بلند آواز میں کہے یہ آخری الفاظ "جاؤ کہہ دو" بھی سنے اور اس دھماکے کی آواز بھی سنی۔ وہ بے ساختہ اچھل گیا۔ بے یقینی کا شکار اس کا دل مختلف وسوسوں میں گھر گیا۔

"کہیں اس نے انکار تو نہیں کر دیا؟ مجھے جانے کا تو نہیں کہہ رہی؟"

اس کے یہ اندیشے مزید مستحکم ہوئے۔ جب اس نے اندر سے آتی شمع کی روئی روئی آنکھوں کو دیکھا۔

"تم ابھی جاؤ اور۔۔۔"

"مگر آپ نے ہی کہا تھا کہ میں فوراً پہنچوں۔ آپ اپنی بیٹی کی شادی مجھ سے کرنا چاہتی ہیں۔"

وہ بات کاٹ کے احتجاجاً بولا۔

"ہاں تو شادی کیا میں کرواؤں گی؟" شمع نے سارا غصہ اس پہ نکالنا چاہا۔ "کیسے احمق انسان ہو۔ نہ نکاح خواں نہ گواہ' نہ وکیل' نہ سہرا' نہ ہار پھول' نہ شادی کا جوڑا' نہ کوئی زیور۔۔۔ نکاح پڑھوانے آئے ہو یا میرے پیٹنے پڑھنے؟"

اس کا تمکنتا ہوا انداز بھی اصغر کو برا نہ لگا بلکہ اسے تو جیسے کسی نے حیات نو کی نوید سنا دی ہو۔

وہ پھر سے جی اٹھنے والوں جیسا ہو گیا۔

دل چاہا ابھی اس عورت کے آگے جھک جائے جو دنیا جہاں کا تنفر آنکھوں میں لیے اسے دیکھ رہی تھی اور کیا نہ دیکھتی' اس کی عمر بھر کا سہارا وہ پل میں سمیٹ کر چل دینے والا ہے۔

"میں ابھی گیا اور ابھی آیا۔"

"ایک منٹ۔" شمع نے اسے روکا۔ ریحانے کسی بھی قسم کی سودے بازی سے منع کیا تھا لیکن وہ اس کے سارے مطالبے اور شرطیں ماننے کی پابند نہیں تھی۔ ماں وہ تھی یا یہ؟

"رانی بھگائی ہوئی لڑکیوں کی طرح نہیں رہے گی۔ میں اسے شان سے رخصت کر رہی ہوں اور تم اسے شان کے ساتھ ہی اپنے گھر لے کر جاؤ گے۔"

یہ کڑی شرط سن کر ایک لمحے کے لیے اصغر کے قدم لڑکھڑا گئے۔

"کیوں' بس اتنا ہی حوصلہ ہے؟" شمع سے اس کی بد دلی کیفیت چھپ نہ سکی اور اس نے طنزاً کہا۔ "ٹھنڈا پڑ گیا عشق؟ منظور ہے تو جلدی بولو' ورنہ بہت سے کھڑے ہیں لائن میں جو دل والے بھی ہیں' پیسے والے بھی اور ہمت والے بھی' سمجھے۔"

"وہ میرے ساتھ میرے گھر میں رہے گی۔" اصغر نے فوراً یہ دعوا کیا۔

"جسے اعتراض ہوگا وہ خود گھر سے نکل جائے گا۔ یہ گھر میری وجہ سے چل رہا ہے' سارا کاروبار میرے ہاتھ میں ہے۔ کسی کی مجال نہیں جو میری یا میری بیوی کی جانب ٹیڑھی نظر سے بھی دیکھے۔"

"ہوں۔۔۔ اور حق مہر بھی میری مرضی کا۔" اس نے دوسرا پتہ پھینکا۔

"جتنا مرضی لکھوا لیں۔" اصغر نے سینہ پھلا کے کہا۔ اس وقت وہ کچھ بھی ماننے یا کرنے کو تیار تھا۔

دشمنوں کے حق میں رہتے ہو' ٹھہرائے جس کو چھوڑنے کا ارادہ ہو۔ میرا تو جو کچھ ہے سب ریحانہ کا ہے۔ چاہے جس کا نام بھی منتقل کروا لو۔"

تب وہ قدرے مطمئن ہو گئی۔

مکرم باجوہ اسے فتح کیے اپنے ساتھ لے جا رہا تھا۔

اس لشکر کا سپہ سالار وہ خود تھا جبکہ مطمئن چہرہ لیے اس کا بوڑھا باپ اور فاتحانہ چمک لیے ہوئے اس کی بیوی اس کے دائیں بائیں بیٹھے تھے جیسے کسی مفتوح کو نرغے میں لیے ہوں یا اسے یرغمال بنا کے لے جا رہے ہوں۔

جعفر محمود کے چہرے پہ سنگلاخ سنجیدگی تھی۔ وہ تقریباً سارے رستے خاموش رہا تھا۔ اس کے والد نے اور جبکہ مکرم مخدوم نے تو اسے مخاطب تک کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی' البتہ مدیحہ گاہے بگاہے اسے بولنے پہ اکساتی رہی تھی۔ کبھی کسی بچے کے متعلق بات کی' کبھی چائے پانی کے بارے میں پوچھ کے۔ جن کا رد عمل وہ رسمی اور سرسری سی دلچسپی کے ساتھ ظاہر کرتا رہا۔ علاوہ ہوں ہاں کے اس نے زیادہ بات کرنا گوارا نہ کیا۔ وہ تو یہ بھی نہ کرتا اگر مکرم باجوہ اگلی سیٹ پہ اور پچھلی سیٹ پہ' دائیں جانب کندھے سے کندھا جوڑے اس کا باپ نہ بیٹھا ہوتا۔

"میرا کیریئر۔۔۔ میری جاب سب ختم ہو گیا۔ اب عمر بھر ان لوگوں کے ہاتھوں کی کٹھ پتلی بن کے جینا ہوگا۔ آغاز تو ہو ہی چکا ہے' مجھ سے استعفیٰ پہ دستخط کروائے گئے۔ یہ شہر چھڑوایا گیا' اب وہاں لے جا کے نظربند کر دیں گے اور شاید زبردستی زمینداری بھی کروائی جائے۔ کیا میری غلطی اتنی بڑی تھی کہ مجھ سے اپنی زندگی خود جینے کا حق چھین لیا جائے۔ میری تعلیم' میری قابلیت سب رُل جائے گی۔ یہ تعلیم میں نے سرکاری عہدے' مجسٹریٹ والی گاڑی اور پوزیشن کے لیے ہی تو حاصل کی تھی۔"

اسے رہ رہ کے ریحا اور سومیہ کے چہرے یاد آ رہے تھے' بچھڑے چہرے آپس میں گڈمڈ ہونے لگے۔

اور دل نے ایک عشرت کا روپ دھار لیا۔

ایک ایسا [illegible] جرم جس نے اس کی شخصیت کے اعتبار' اپنوں کے اعتماد' بھرم' عزت اور ساکھ سب کو نگل لیا تھا۔

"بچیاں بہت خوش ہوں گی' جب انہیں یہ پتہ چلے گا کہ آپ اب ہمیشہ ان کے پاس رہیں گے۔"

مدیحہ نے ہلکی سی سرگوشی کے ساتھ کہا۔

"جب سے پیدا ہوئی ہیں' کسی مہمان کی طرح آپ کا انتظار کرتی رہی ہیں۔ مہینے میں ایک بار ہوا کی طرح آئے اور چلے گئے۔ اچھا ہوا' اب وہ بڑی اور سمجھدار ہو رہی ہیں۔ باپ کا سر پہ ہر وقت موجود ہونا بھی ضروری ہے۔"

اس کی سنجیدگی اور مدبرانہ انداز سے جعفر محمود کو جی بھر کے کوفت اور بےزاری محسوس ہوئی۔ اس کا جی چاہا' چلتی گاڑی سے چھلانگ مار دے اور عمر بھر' دن رات' حاوی رہنے والی اس بور اور خشک ترین عورت سے چھٹکارا مل جائے۔ اسے عورت کے اس بے رنگ روپ سے شدید چڑ تھی۔

اور اب اسے پتہ نہیں کب تک اسی بے رنگی کو سینے سے لگا کر جینا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ پلیٹ میں کیا ڈھک کے رکھا ہے؟"

نصرت کی تیز نگاہوں سے بھلا کیا چھپتا تھا اور منزہ کے جواب کا انتظار کیے بغیر اس نے ڈھکن اتار کے دیکھا۔

چھوٹی سی پلیٹ میں بھنے ہوئے گوشت کی دو بوٹیاں تھیں۔

"سوہا کے لیے ہے۔ وہ کریلے نہیں کھاتی نا!" اس سے پہلے کہ نصرت پلٹ کے اسے گھورتی وہ فوراً وضاحت دینے لگی۔

"تو کھلاؤ اتنے نخروں کا عادی کیوں بنا رہی ہو۔" ماں سے پہلے بیٹی نے جواب دیا۔

پتہ نہیں یہ ماں بیٹی ایک دوسرے کا سایہ کیوں بنی رہتی تھیں۔ جہاں شمیم ہوتی وہیں نصرت کھنچی چلی آتی اور نصرت کا دم چھلا بن کے شمیم ساتھ چپکی رہتی۔ ابھی بھی ماں کو کچن کا رخ کرتے دیکھ کے وہ بھی ٹی وی پہ دلچسپ پروگرام فوراً چھوڑ کے پیچھے چلی آئی۔

"ہانڈی بے برکتی ہو جاتی ہے۔ تمہاری ماں نے تمہیں اتنا بھی نہیں بتایا کہ پکتی ہانڈی میں سے کچھ نہیں نکالنا چاہیے۔ توبہ۔۔۔ ابھی سے بچوں کو سر چڑھا رکھا ہے۔"

شمیم پلیٹ اٹھا کے کڑاہی میں انڈیلنے لگی جس میں منزہ کریلے گوشت بھون رہی تھی۔ اس کی کیا مجال تھی کہ اس کا ہاتھ روک پاتی یا ٹوک دیتی۔ اسے اس کے سارے نخرے یاد دلاتی؟ البتہ نصرت نے بڑے آرام سے پلیٹ اس کے ہاتھ سے لے لی۔

"چل رہنے دے۔ خوامخواہ بچی بھوکی رہے گی۔ دو ڈھائی سال کی بچی ہے کہاں کھاتے جاتے ہیں کریلے۔"

منزہ کو حیرت ہوئی مگر زیادہ نہیں کیونکہ نصرت بہرحال سوہا کی دادی تھی۔ منزہ سے اسے بھلے ہی خدا واسطے کا بیر ہو اور وہ بے شک کبھی کبھی اسی کو کلسانے کے لیے سوہا کو بھی برا بھلا کہہ ڈالتی تھی مگر محبت تو تھی اسے اپنے خون سے جس کا بے ساختہ اظہار اکثر و بیشتر اس کی مختلف حرکتوں سے ہو جاتا تھا۔ سو سو احسان جتاتے ہوئے باتیں دھرتے ہوئے بھی وہ پوتی کو سنبھال لیتی تھی جب منزہ کے کاموں میں مصروف ہوتی۔

جو تھوڑی بہت حیرت منزہ کو ہوئی وہ اس بات پہ تھی کہ نصرت نے آخر تک چڑھی بیٹی کے سامنے یہ حمایت کیسے کر لی۔

"دنیا سے نرالی بچی نہیں ہے۔" نصرت کو واقعی ماں کا اپنی پوتی کے لیے ولار پسند نہ آیا۔ اس نے آج تک اپنے دل میں اس ننھی پیاری سی بچی کے لیے وہ محبت محسوس نہ کی تھی جو پھوپھیوں کے دل میں ہوا کرتی ہے۔ کبھی کبھی تو منزہ کو اس کے عورت ہونے پہ شبہ ہونے لگتا تھا۔ بھلا کوئی عورت اتنے پیارے معصوم سے بچے کو ایک نظر بھر کے بھی پیار سے نہ دیکھے تو حیرت ہی ہوگی۔

"اور کیا پتہ سوہا کے لیے نکال کے رکھی ہے یا اپنی زبان کا چسکہ پورا کرنے کے لیے۔ امی! آپ بھی ہر کسی کا ڈرامے بازی میں آجاتی ہیں۔"

اس بار اس کی شر انگیزی کام کر گئی۔

نصرت نے پلیٹ اٹھائی اور اسے جتایا۔

"سوہا کو میرے پاس بھیج میں کھلاتی ہوں اسے۔ ویسے اس کی شکل سے تو نہیں لگتا کہ اس نے کبھی گوشت یا پھل کھایا ہوگا۔ ڈھائی سال سے اوپر ہو رہی ہے مگر وہی ہاتھ بھر کی۔ جیسی ماں ویسی بیٹی' ورنہ میرے خاندان کی تو صحت اور حسن ہی دیکھنے لائق ہوتا ہے کیونکہ میں نے بچوں کو اپنے منہ کا نوالہ بھی کھلایا ہے لیکن جن بچوں کی ماؤں کا اپنا پیٹ نہ بھرتا ہو اور جو بچوں کا نام لے کر خود سب ہضم کر جائیں وہ کیا بڑھیں پھلیں گے۔"

وہ حسب عادت دل دکھانے والی باتیں کر کے پلیٹ اٹھا کے باہر چل دی۔

منزہ اتنے سالوں سے یہ سب سن سن کر بھی عادی نہ ہو پائی تھی۔ ہر بار اس کا دل نئے سرے سے دکھ جاتا مگر ہر بار اس کی آنکھیں اس بے عزتی سے چھلملا اٹھتیں۔ اس نے پورا دھیان ہنڈیا بھوننے کی جانب لگانے کی کوشش کی لیکن باہر سے آتی ماں بیٹی کی گفتگو بار بار دھیان ہٹا دیتی۔

"دیکھو تو بچی کی شکل کیا نکل آئی ہے؟ کچھ کھائی پیتی ہو تو لگے اور سگے تو نظر بھی آئے۔"

"چھوڑو بھی امی! یہاں پڑی ہے بے رونق غریب صورت سوکھی سڑی۔"

"ہاں کو تو قافے سکھاتے یہ تو ماشاء اللہ سے کھاتے پیتے لوگوں کا خون ہے۔ سیٹھ کی پوتی سیٹھ کی بھتیجی۔"

"مگر سیٹھ کی بیٹی تو نہیں ہے۔" نصرت کو سیٹھانی کہلوانے کا بڑا شوق تھا۔ فرمائش کر کے اس نے گھر کے باہر نیم پلیٹ پہ اپنے شوہر کے نام کے آگے لفظ "سیٹھ" کندہ کرایا تھا۔

"باپ تو اس کا غلام ہی ہے نا۔"

"غلام کیوں ہونے لگا؟ باؤ ہے باؤ۔۔۔ افسر لگا ہے میرا مظہر۔"

آج نصرت کے دل میں نجانے کہاں سے بیٹے کی بھولی بسری محبت نے جوش مارا' ورنہ منزہ سے شادی کے جرم میں وہ ہر وقت اس کے خلاف محاذ کھولے رہتی تھی۔ یہ سن کر شمیم تنک گئی۔

"افسر ہو یا کوئی اور غلام ہے اور وہ خود سرا سینہ تانا پھرتا ہے اسے دیکھا زن مریدی کے سارے ریکارڈ توڑے بیٹھا ہے اس طوائف زادی کے عشق میں آنکھیں ماتھے پہ رکھ لی ہیں۔"

"مجھے آنکھیں واپس لانی بھی آتی ہیں۔ تو فکر نہ کر۔"

"فکر کیسے نہ کروں۔ دیکھا نہیں کیسے اس دن تن کے اعلان کیا تھا اس نے کہ مجھے شادی کرنے کے لیے کسی کی اجازت کی ضرورت نہیں۔"

"اجازت تو کیا اسے شادی کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی۔"

"ان خیالوں میں نہ رہنا امی! اور بھلا رہے گا شادی کے بغیر؟ یہ بیٹیاں ہوتی ہیں جو ماں باپ کی عزت سمیٹے دہلیز پہ بیٹھی رہ جاتی ہیں۔ اسے کسی کا کیا ڈر یا خوف۔"

موقع ملتے ہی وہ اپنی شادی نہ ہونے کا گلہ ضرور کر دیتی تھی۔

"تو ابھی تک اپنی ماں سے واقف ہی نہیں ہے۔ میں اتنے آرام سے بیٹھنے والی نہیں۔ غضب خدا کا' ناچنے گانے والی ادھر کی ماں بن کے آ جائے کیا یہ میں ہونے دوں گی۔"

"تب تو اصغر کے سامنے فوراً دب گئی تھیں؟"

"تو کیا اینٹ اٹھا لیتی' وقت کی نزاکت بھی دیکھنی ہوتی ہے۔ وہ اس دو ٹکے کی چھوکری کے پیچھے پاگل ہو رہا ہے۔ دیکھا نہیں مظہر کی مخالفت کرنے پہ کیسا مرنے مارنے پہ تلا بیٹھا تھا۔ مجھے بیٹا ہاتھ سے نہیں گنوانا۔ اوپر سے میٹھی بن کے اس کے اندر کا عشق زہر کرنا ہے اور اس کے لیے بڑا اچھا توڑ سوچا ہے۔"

"وہ کیا؟" شمیم نے دلچسپی لی تو نہ چاہتے ہوئے بھی منزہ تک ہاتھ روک کے غور سے سننے لگی۔

"اسے شادی جی۔" نصرت نے آواز دبا کے کہا۔

"ایسے تکڑے اور ظالم تعویذ لاؤں گی' سارا عشق ہرن ہو جائے گا۔"

"شادی جی کے تعویذ ابھی تک مظہر کا عشق تو ہرن نہ کر سکے۔" شمیم کے انداز میں مایوسی تھی۔

"وہ تو تعویذ ہی ہلکے والے تھے۔ یہ غریبنی میرا لیتی ہی کیا ہے' پڑی رہے کونے میں۔ صرف اس کی زبان بندی کے تعویذ لیے تھے شادی جی سے اور دیکھ لو کتنا اثر ہے۔ کچھ بھی کہہ لو' اس کے منہ میں پڑی چھڑے کی زبان ہلتی تک نہیں۔ اس سے بھاری تعویذ میں خود ہی نہیں لیتی کہ اس کے لیے ترس آ جاتا ہے۔"

بڑی شان سے اپنی نرم دلی اور خدا ترسی کا مظاہرہ کیا گیا۔

"لیکن وہ بدمعاش عورت۔۔۔۔ وہ ناچنے گانے والی بے حیا۔۔۔۔ اس کے ساتھ تو جو کروں وہ کم ہے۔ تین دن کے اندر اندر گھل کے ختم نہ ہو گئی تو بے شک نام بدل دینا۔"

"تین دن؟"

"شادی جی تو دشمن کا نام و نشان تین گھنٹوں میں بھی مٹا دیں۔ اتنا علم ہے ان کا لیکن فیس بھی اتنی ہی ہوتی ہے' جتنا جلدی کا کام کراؤ۔"

"ہائے امی! چار پیسے زیادہ خرچ کرا لو مگر یہ قصہ جلدی ختم کرو۔ تین دنوں میں تو کچھ کا کچھ ہو جاتا ہے۔"

شمیم کو رینا کا وجود صفحہ ہستی سے مٹانے کی زیادہ ہی جلدی تھی' اس لیے بے تابی سے بولی۔

"وہ بدقماش عورت یہاں آ گئی تو ہمارا تو بچھو بوریا بستر گول۔۔۔ ایسی گھاٹ گھاٹ کا پانی پینے والی عورتیں ہم جیسی سیدھی سادی گھریلو عورتوں کو منٹ میں کونے لگا دیتی ہیں۔"

"وہ کیا کونے میں لگائے گی میں اسے قبر میں پہنچا دوں گی۔ تین دنوں کی تو بات ہے تو کیوں فکر کرتی ہے۔"

نصرت کو اپنے شاہ جی اور ان کے تین دنوں میں ہندہ ٹھکانے لگا دینے والے زوداثر تعویذ پہ حد سے زیادہ تھا لیکن یہ پتہ نہیں تھا کہ تین دن بعد وہ جس وجود کو قبر میں سلانے کے عزم کا اظہار کر رہی تھی وہ اس وقت اس کے گھر کی دہلیز پہ کھڑا تھا۔

"یہ تو اصغر کی گاڑی کا ہارن لگتا ہے۔"

شمیم پھلوں کے چھلکے سمیٹنے لگی۔ سارا دن کھاتے پیتے رہنے کے باوجود وہ سب پہ یہی ظاہر کرنا پسند کرتی تھی کہ اس کی خوراک چڑیا جتنی ہے۔ صوفے کے نیچے پھلوں والی ٹرے کھسکانے کے بعد وہ دروازے کی جانب بڑھی۔ اتنی دیر میں تین بار کال بیل بجائی جا چکی تھی۔

"خیر تو ہے..... ایک تو آج شام سے بھی پہلے گھر واپس آ گیا ہے اوپر سے بھی ہارن تو کبھی بیل ہے۔"

نصرت، سوہا کے منہ میں آخری نوالہ ڈالنے کے بعد گردن اونچی کر کے دیکھنے لگی۔

شمیم نے دروازہ کھولا تو سامنے اصغر کے بجائے ایک سجی سجائی دلہن کو پایا۔

وہ بڑی طرح ٹھٹک کے وہیں جم گئی۔

جبکہ دوسری جانب سے کمال کی بے نیازی کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ دلہن اسے کسی بے جان اور بے کار چیز کی طرح ایک طرف ہٹاتی آگے بڑھی۔ اب چونکنے اور ہڑبڑا کے اٹھنے کی باری نصرت کی تھی۔

وہ اپنے سنگھار، لباس اور زیورات کی وجہ سے ضرور دلہن لگ رہی تھی لیکن اس میں دلہنوں والی کوئی بات نہیں تھی۔

نہ اس کے چہرے پہ حیا کے رنگ تھے۔

نہ اس کے قدموں میں جھجک تھی۔

نہ اس کے روپ میں خوشی اور سرشاری جھلک رہی تھی۔

اس کے برعکس وہ اندر آتے ہی بڑے مالکانہ تاثر اور ناقدانہ انداز میں ان دونوں اور گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

"کون ہے تو؟" نصرت کا دل چیخ چیخ کر اس آنے والی آفت کا تعارف کرا رہا تھا مگر وہ جھٹلاتے ہوئے کڑک کر اس سے پوچھ رہی تھی۔

"تمہاری چھوٹی بہو ربنا!"

اصغر نے اندر داخل ہوتے ہوئے جواب دیا اور ربنا جو اپنی تمام تر بے خوفی کے باوجود اس کڑک دار لہجے سے خائف ہو چلی تھی، مسکرا کے اس کے بازو میں ہاتھ ڈال کے کھڑی ہو گئی۔ اس کے اس بے ساختہ عمل سے جہاں اصغر نے خود کو ہواؤں میں اڑتا محسوس کیا کہ سارے راستے وہ اس کی بے گانگی سے مایوس ہی ہوتا آ رہا تھا، وہیں خود ربنا کو بھی اپنی ذات کی مضبوطی کا احساس ہوا۔

"غارت ہو ایسی راہ چلتی بدمعاش بہو پہ۔" نصرت ہوش میں آئی اور آتے ہی سینہ کوبی شروع کر دی۔

"اندر آنے کی ہمت کیسے کی اس نے۔ یہ شریفوں کا گھر ہے، ایک قدم بھی اور بڑھایا اس نے تو وہ جوتے لگاؤں گی، وہ جوتے لگاؤں گی....."

"بس امی! بہت ہو گیا۔ یہ کون سا انداز ہے نئی دلہن کے استقبال کا؟" اصغر نے ناگواری سے کہا۔

"کیسی نئی دلہن، کون سی نئی دلہن۔" وہ ہاتھ نچا کر پوچھنے لگی۔

"تجھ سے پہلے نجانے کتنوں کی دلہن بن چکی ہوگی یہ۔"

"اونہہ..... وہ بھی..... دلہن ایک رات کی۔" شمیم نے خاصا چبا کے کہتے ہوئے اپنا فلمی اسٹائل گھسیڑا، جو اب تک خاموش کھڑی ربنا کو جھلسا کے رکھ گیا۔

زمانے بھر کا غبار تو اس کے اندر پہلے ہی بھرا تھا، ہو گئی شروع۔ اس نے وہ وہ زبان استعمال کی..... گٹر سے اپنی ماں کے نسبی قبیلا کی مختلف آنٹیوں، نانیوں سے منتقل ہوتی گالیاں اس تواتر سے استعمال کیں جو اس کے خاندان میں سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی چلی آ رہی تھیں۔ یہاں تک کہ نصرت جیسی اول درجے کی بدزبان عورت بھی انگلیاں دانتوں تلے دبانے پہ مجبور ہو گئی۔

اور اپنے کمرے میں دبک کے بیٹھی منزہ نے تو استغفار اور لاحول پڑھتے ہوئے بے ساختہ دونوں کانوں کو ہتھیلیوں سے ڈھانپ دیا۔

سوہا کو وہ پہلے ہی ٹی وی پہ کارٹون لگا کے دے چکی تھی تاکہ اس کا دھیان باہر کی جانب نہ جائے۔ اس کے باوجود بھی وہ ایک منٹ بعد باہر سے آتے ہنگامے پہ چونک چونک جاتی اور ماں کی جانب حیران سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگتی۔

"ہائے اللہ یہ دن دیکھنے سے پہلے میں مر کیوں نہ گئی ہائے۔"

شمیم نے ذرا جو ربنا کو تھم کے سانس لیتے دیکھا تو واویلا مچا دیا۔

"یہ بازاری عورت میرے بھائی کے سامنے مجھے واہیات گالیاں دے رہی ہے۔ میری عزت نجانے کس کس چوبارے پہ رول رہی ہے، کس کس بدذات کے ساتھ مجھے نتھی کر رہی ہے اور یہ بے غیرت ایسے ہوتے ہیں بھائی۔ جو بہن کی درگت بنتے چپ چاپ کھڑے دیکھ رہے ہیں۔"

"اس کی آنکھوں میں جادو کی سلائی پھیر دی ہے اس کتی نے، ورنہ یہ تو تھا دیکھ اس کا کوئی حسن پری بھی نہیں ہے۔ اس کا تو مجرا دیکھنے کے لیے آنے والے پیسہ نچھاور کرنے کے بجائے الٹا لیتے ہوں گے اس سے۔ ایک میرا ہی بیٹا الو کا پٹھا نکلا جو اس کو سر پہ بٹھا کے لے آیا۔"

اب واویلا کرنے کی باری ربنا کی تھی۔ اپنے وہ سارے قیمتی زیورات نوچ نوچ کے پھینک دیے، جو اصغر شمع کے شارٹ نوٹس پہ خرید کے لایا تھا۔ اس کی ذرا سی باری دیکھ کے وہاں بیٹی بھی دنگ رہ گئیں۔ پہلے کتنی ہی تیز طرار رہ چکی ہوں مگر ایک بازاری عورت کے پینترے اور رنگ ڈھنگ سے مقابلہ ان کے بس کی بات نہیں تھی۔

"اس لیے لائے تھے تم مجھے، یہ عزت کروانے کے لیے۔ تم تو کہتے تھے یہ گھر میرا ہے، اس کی ہر چیز پہ میرا اختیار ہوگا اور یہاں تو مجھے قدم آگے بڑھانے کی اجازت نہیں مل رہی۔ جھوٹے، چار سو بیس..... فراڈی!"

وہ اس طرح حلق پھاڑ رہی تھی کہ باوجود اس کے کہ اس علاقے میں بے کنالوں کے رقبے پہ پھیلے بنگلے ایک دوسرے سے خاصے فاصلے پہ تھے پھر بھی اس کی آواز کم از کم آس پاس کے چار چار گھروں تک تو ضرور پہنچی ہوگی۔

"اس کا دماغ کیوں خراب کر رہی ہے، مجھ سے بات کر۔"

"تم سے بات کرنا اپنی جوتی اپنے سر مارنا ہے۔"

"اری چل بے وقعات ہو..... یہاں میں نے تیرے لیے قبر نہیں کھود رکھی جو دندناتی ہوئی گھس آئی ہے۔"

"یا اللہ۔" منزہ کانوں پہ ہاتھ رکھے رکھے تھک گئی۔ یہ آوازیں تھیں کہ پردے پھاڑ کے اندر گھسی چلی آ رہی تھیں۔ نہ یہ نئی آنے والی دیورانی ہمت ہار رہی تھی، نہ شمیم تھک رہی تھی، نہ ہی اس کی ساس کا توپ خانہ اسلحے سے خالی ہو رہا تھا۔ اس نے وال کلاک کی جانب دیکھا۔

شام کے چھ بجنے والے تھے۔ عموماً اس وقت تک مظہر کی واپسی ہو جاتی تھی لیکن آج وہ صبح ہی بتا گیا تھا کہ کسی ضروری کام کی وجہ سے دیر سے لوٹے گا۔

"اور اگر عین اس جنگ کے موقع پہ مظہر کی انٹری ہو گئی تو....."

یہ خیال اسے لرزا گیا۔

فی الحال یہ جنگ عورتوں کے درمیان تھی اور اصغر خاموش تماشائی بنا دیکھ رہا تھا اس لیے محض زبانی کلامی حملے ہو رہے تھے لیکن اگر مظہر آ جائے اور ربنا کو دیکھ کر اس کی غلیظ زبان کے جوہر سن کر بپھر جائے..... پھر دونوں بھائی

گھتم گھتا ہو جائیں گے۔ منزہ یہ نوبت نہیں آنے دینا چاہتی تھی' اس لیے اس نے فوری طور پہ ایک فیصلہ کیا۔

اپنے، سوہا کے اور مظہر کے دو دو جوڑے بیگ میں ٹھونسے۔ بچی کی چند مزید ضروری چیزیں رکھیں اور کمرے سے نکل آئی۔ اس کا میکہ یہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ رکشے میں جانے پر زیادہ سے زیادہ دس منٹ لگتے اور راستہ بھی سنسان نہیں تھا' اس لیے اسے شام کے وقت اکیلے نکلتے میں جھجک محسوس نہیں ہوئی۔ مظہر نے اسے اتنی محبت اور اعتماد بخش رکھا تھا کہ اسے شوہر سے اجازت لینے جیسے تکلفات کی بھی خاص ضرورت نہ تھی' نہ ہی یہ خوف کہ وہ اس سے باز پرس کرے گا۔ اصل اور کڑا مرحلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ ریتا کی وجہ سے آیا جلال نصرت اس پہ بھی الٹ سکتی تھی لیکن وہ جو کر رہی تھی گھر کی بہتری کے لیے کر رہی تھی۔

اس وقت گھر کا ماحول ایسا ہرگز نہیں تھا کہ مظہر جیسا لوز نیچر شخص مداخلت کرتا۔ وہ معاملہ سلجھانے والوں میں سے نہیں بگاڑنے والوں میں سے تھا۔ ایک بیوی ہونے کے ناتے وہ اپنے شوہر کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سے واقف تھی۔ گھر میں دونوں بھائیوں کے درمیان مار پیٹ ہوتی یا نتیجے کے طور پہ بیوی کے عشق میں ڈوبا اصغر اپنا اختیار استعمال کرتے ہوئے انہیں گھر سے نکلنے کا حکم دے۔ اس سے کہیں بہتر تھا کہ وہ ساس کی چار باتیں سن لے مگر نہ صرف خود یہاں سے چلی جائے بلکہ مظہر کو ایک دو دن یہاں سے دور رکھے۔ معاملہ ٹھنڈا ہونے کے بعد وہ یہاں آ سکے۔

"لو ایک اور آ گئی۔ اندر اور کتنی دبا رکھی ہیں؟"

ریتا نے اسے کینہ توز نگاہوں سے تکتے ہوئے کہا۔ منزہ اندر ہی اندر سمٹ کے رہ گئی۔ اسے یہ نظریں اپنے آرپار گھستے ہوئے محسوس ہوئی تھیں جس کی وجہ جاننے سے وہ قاصر تھی۔ ایسا لگ رہا تھا یہ لڑکی یہاں کوئی پرانے بدلے چکانے آئی ہو۔ ساس اور نند سے اس کا معرکہ تو سمجھ میں آتا ہے کہ پہل ان کی جانب سے ہوئی تھی لیکن وہ بے ضرر سا اس نے تو کلام تک کرنے کی زحمت نہیں کی تھی پھر اس پہ حملے کا مطلب؟

"یہ میری بہو ہے' زبان سنبھال کے بات کرنا۔ شریفوں کی لڑکی ہے اور شریفوں کے گھر رہ رہی ہے۔ تیری طرح کوٹھے کی پیداوار نہیں ہے۔ ہم اپنی بہوؤں کی عزت کرنا بھی جانتے ہیں اور کروانا بھی۔ خبردار جو اس کے بارے میں کچھ الٹا سیدھا کہا تو۔"

منزہ ساس کے اس بیان پہ بے ہوش ہوتے ہوتے بچی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ایسا اس نے صرف ریتا کو بے وقعت کرنے کے لیے کہا ہے۔

"امی جان!" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہنے کی کوشش کی۔

"بڑی بھابھی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' گھر سے فون آیا ہے' کیا میں چلی جاؤں' رات وہیں رکوں گی۔"

اور کوئی موقع ہوتا تو نصرت ادھیڑ کے رکھ دیتی اسے' ابھی بھی زیر لب بڑبڑا اٹھی۔

"کم بخت میکے میں رپورٹ دینے جا رہی ہے۔ پیٹ ہے بھی تو اتنا سا۔ گھر کے ساتھ لگا ہو' کوئی بات اندر رکے تو کیسے۔"

لیکن فی الوقت اسے اپنا کلہ مضبوط کرنا تھا۔ اسے حمایتی درکار تھے۔ وہ اصغر اور اس کی اس بارود بھری بیوی کے خلاف اپنی ٹیم کی نفری زیادہ کرنا چاہتی تھی اور اس کے لیے مظہر ہی تھا جو اصغر پہ بھاری پڑ سکتا تھا۔ ابھی اس سے اور منزہ سے بنا کے رکھنے میں ہی بھلائی تھی' اس لیے فوراً اجازت دے دی۔

"جاؤ جاؤ۔ دیر نہ کرو' مجھے فون کروا دینا' تمہاری بھابھی کی خیریت دریافت کرنے کے لیے۔"

اس بات پہ منزہ زیادہ فکر مند نہیں ہوئی کہ ان کے فون کرنے سے بھابھی کی بیماری والا جھوٹ کھل نہ جائے' اس لیے کہ وہ جانتی تھی اس کی ساس ایسا فون کبھی نہیں کرے گی۔

اجازت ملتے ہی وہ خدا کا شکر ادا کرتی وہاں سے نکلی۔

☆ ☆ ☆

"دل لگا تمہیں فرصت؟"

شمشاد بیگم نے پروین کو آتے دیکھ کے پہلا طنزیہ وار کیا۔ پروین کے قدم سست پڑ گئے۔ اس نے ٹھہرا کے ماں کو اشاروں ہی اشاروں میں اپنے پیچھے آتے سراج دین کے بارے میں خبردار کرنا چاہا۔ مگر وہ کون سا انجان تھیں' ہاں بے نیاز ضرور تھیں' ہر مصلحت سے۔

"دے دی اجازت تمہاری ساس اور میاں نے کہ جا تو بی بی گھڑی بھر کو بیمار ماں کو بھی دیکھ آ۔ دکھی بھائی کا حال پوچھ آ۔" سراج دین کی پیشانی میں پڑی سلوٹوں میں یک بیک کئی گنا اضافہ ہو گیا۔

"آپ میری والدہ کا نام کیوں لے رہی ہیں؟ جو کہنا ہے مجھ سے کہیں۔ ہاں میری اجازت نہیں تھی اسے۔"

"کیوں نہیں تھی اجازت؟ میاں! تم بیٹی کے باپ نہیں ہو' اس لیے لگا سکتے ہو ایسی پابندیاں۔ کوئی میرے دل سے پوچھے' اکلوتی بیٹی مہینہ مہینہ شکل نہ دکھائے اور وہ بھی ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے تو کیا گزرتی ہے۔ کیا پتھر کا کلیجہ ہے تمہارا' ماں کو بیٹی سے الگ کر رکھا ہے۔"

"ایک مہینہ تک نہ ملنے سے ماں بیٹی کا رشتہ ختم ہو جاتا ہو تو کیا فائدہ ایسے رشتے کا۔" وہ بھی دوبدو بولے۔

"چھوڑیے نا' ختم کیجیے یہ بحث۔ اماں! آپ بھی بس۔۔۔ میاں صاحب کیوں پابندی لگائیں گے۔ گھر کے اور بچوں کے کاموں سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ کیسے نکلوں اور ایسی کوئی نئی بات بھی نہیں ہے۔ میں ہر ہفتے میکے آنے کی عادی بھی نہیں ہوں۔ اکثر ہی مہینہ مہینہ ہو جاتا ہے۔ یہ میری اپنی روٹین ہے' آپ اس کا الزام کسی اور کو کیوں دے رہی ہیں۔"

"کیوں نہ دوں' گھر کے کام تم نے خود تو سر پہ لادے نہیں ہوں گے۔ یہ دوسروں کے طریقے ہی تو ہیں تمہیں گھر پہ قید رکھنے کے' ورنہ دوسروں کی بھی بیٹیاں ہیں۔ گھربار والی' بال بچے والی' سسرال والی۔۔۔ ان کے گھر بھی بستے ہیں اور میکے کی رونق بھی بنی رہتی ہے۔ پھر پہلے کی بات اور تھی۔ ساجدہ زندہ تھی' اب ہمارا کون پوچھنے والا ہے؟ میں بڑھی جان' بھائی تمہارا پریشان اور وہ ہاتھ بھری بچی۔ ایسے میں تم شکل ہو کے بھی مہینہ مہینہ خبر نہ لو تو کیا میں شکایت تک نہ کروں۔"

"تم شام تک رک کے شکایتیں' گلے اور شکوے سنو' شوہر اور ساس کے خلاف دل میں غبار بھرو۔ میں جا رہا ہوں۔ ٹھیک شام سات بجے واپس آؤں گا' تیار رہنا۔"

سراج دین نے ساس کو یکسر نظرانداز کرتے ہوئے پروین سے کھردرے لہجے میں کہا اور واپسی کے لیے پلٹ گئے۔

شمشاد بیگم داماد کی پشت پہ بھی بڑبڑانے سے باز نہ آئی۔

"لو اور سنو' سات بجے کی واپسی کا آرڈر بھی دے دیا۔ لو یہ تو آ ہی آٹھ بجے تک ہے۔ اب اتنے دنوں بعد آئی ہو اور بھائی سے ملے بغیر واپس چلی جاؤ گی۔ توبہ ظلم ہے' ظلم۔"

"اماں! چپ بھی کرو۔" پروین نے ہاتھ جوڑے۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے اور پھر دور جانے کا یقین ہو جانے کے بعد اس نے قدرے اطمینان کی سانس لی۔

"اگر دو منٹ آپ خود پہ قابو رکھ لیں تو کیا بگڑ جائے گا آپ کا۔ پتہ بھی ہے کہ میاں صاحب مزاج کے تیز ہیں۔"

"بس کر۔۔۔ بس کر۔۔۔ میاں صاحب' میاں صاحب کر کر کے تو نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پہ پہنچا رکھا ہے اور میں ایسے ایسوں کے مزاج رکھتی ہوں اپنی جوتی کے نیچے۔"

"وہ آپ کے داماد ہیں۔" اس نے نزاکت کا احساس دلانا چاہا مگر بے سود۔

"تو کیا سر پہ بٹھا لوں' وہ باتیں سناتا جائے اور میں چپکی جاؤں۔ بہت لحاظ اور عزت کر لی میں نے۔ آج صبر نہیں ہوا۔ بہت دل دکھا ہوا تھا میرا' پورا ایک مہینہ۔"

"وشمہ! کیسی ہے؟" پروین نے موضوع بدلنا چاہا۔

"آفت ہے پوری۔ چھٹانک بھر کی لونڈیا اور قید کر کے رکھ دی ہے۔ مجھے نہ دن کو چین لینے دیتی ہے' نہ رات کو آرام سے سوتی ہے۔ کبھی الٹیاں ـــ کبھی پوٹیاں ـــ"

"ارے ' بیمار ہے وہ؟"

"نہیں ' بیمار کیسی؟ بخار وخار تو نہیں ہے۔ ویسے ہی دودھ ہضم نہیں ہوتا۔ یہ منحوس ڈبے کا دودھ کہیں پچتا ہے بچوں کو۔ یہ بھی پیتے ہی الٹ دیتی ہے۔ دن میں سترہ دفعہ کپڑے گندے کرتی ہے ' میں تو بڑی تنگ ہوں۔"

"سو رہی ہے کیا؟"

"توبہ کرو ' یہ سونے والی شکل ہے۔ ساتھ والوں کے ہاں بھیجا ہے۔ ان کے بچے خوش ہوتے ہیں کھیل کے۔ لے جاتے ہیں وہ دو گھنٹے کے لیے۔"

"میرے بچے بھی بہن سے ملنے کے شوق میں آئے ہیں۔ لے آئیں نا اماں! شام تک یہ بھی کھیل لیں بچی سے۔"

"لے آؤں گی ' ابھی رہنے دو وہیں۔ بڑا شور شرابا۔" وہ سخت بے زار لگ رہی تھی۔ بالآخر پروین کے بار بار کہنے پہ لے کر آئی۔

پروین بچی کا چہرہ دیکھ کے ہی دھک سے رہ گئی۔ بچی کی عمر چار ماہ ہو چکی تھی مگر چہرہ بالکل بلی کے ایک دن کے بچے کے برابر لگ رہا تھا۔ گال پچکے ہوئے ' رنگت پھیکی اور آنکھیں بے جان۔ نہ ہنستی ' نہ کھیلتی ' نہ ہی روتی۔ یہ نحیف سی لاغر بچی منہ سے کمزور اور مری مری سی آواز نکال رہی تھی جیسے کوئی زخمی چڑیا کراہ رہی ہو۔

"یہ ـــ یہ کیا حال ہو گیا وشمہ کا؟ اچھی بھلی صحت مند تھی۔" پروین کے آنسو ہی تو چھلک پڑے اسے ہاتھوں میں لیتے ہوئے۔

"بن ماں کی بچی کا اور کیا حال ہوگا۔" شمشاد بیگم نے بھی زبردستی کی رقت خود پہ طاری کی۔

"صحت بنے تو کیسے ' ایک تو دودھ نہیں ٹھہرتا اس کے پیٹ میں اور دوسرا یہ نہ سوتی ہے ' نہ چپ کرتی ہے۔ ساری ساری رات رونا۔ دیکھو ذرا رو رو کے گلا بھی بیٹھ چکا ہے۔ اب تو آواز بھی نہیں نکل رہی رونے کی۔ اچھا تو بتا کیا کھائے گی دوپہر کو اور بچے کیا کھائیں گے شوق سے۔"

"کمال کرتی ہیں اماں! بچی اتنی بیمار ہے اور آپ ـــ آپ اس قدر مطمئن اور لاپروا۔ کم از کم کسی ڈاکٹر کو تو دکھایا ہوتا؟" "لے ـــ نہ بخار ' نہ خسرہ ـــ ڈاکٹر کے پاس کیوں لے کر جاتی۔"

"صرف بخار ہونے سے ہی تو بچے بیمار نہیں ہوتے۔ اس کا وزن اس کی عمر کے لحاظ سے آدھا بھی نہیں رہا۔ جان بالکل ختم ہو چلی ہے۔ رنگ پیلا اور ـــ اور ـــ"

وہ اسے سینے سے لگا کر رو پڑی۔ ایک مہینے تک نہ آسکنے کا سب سے زیادہ ملال اب ہو رہا تھا۔ کوئی واضح پابندی تو نہ لگائی تھی سراج دین نے لیکن اس تلخی کے بعد وہ خود ہی اکڑ گئی اور ضد میں آکے کتنے ہی دن میکے جانے کا نام نہ لیا۔ دل ہی دل میں کڑھتی اور جلتی رہی لیکن انتظار تھا کہ کس دن میاں صاحب کو خود خیال آتا ہے اور وہ لے جاتے ہیں۔

"یہ بوتل لگا منہ سے ' شاید پی لے۔"

شمشاد بیگم نے وہی فیڈر اس کے منہ میں ٹھونسنا چاہا جو وہ ہمسایوں کے گھر سے واپس لائی تھی۔ فیڈر ڈھکن کے بغیر تھا اور اس میں موجود ڈھائی اونس دودھ جم کے پھٹ رہا تھا۔ پروین نے غصے میں آکے بوتل دیوار پہ دے ماری۔

"خراب دودھ دے رہی ہیں آپ اسے۔ یہ تو دیکھنے سے بھی صاف نظر آرہا ہے اور یہ فیڈر ـــ لگتا ہے جیسے کبھی ٹھیک سے دھلا ہی نہیں۔ پلاسٹک تک پیلی پڑ چکی ہے اس کی اور نپل ـــ تو بس ـــ بچی کی ایسی حالت نہ ہو تو اور کیا ہو۔"

اس کے بعد اس نے بچی کو لٹایا اور اس کے بدبودار کپڑے اتارنے لگی۔ سخت گرمی کے موسم میں اسے ریشمی فراک پہنایا گیا تھا جو پسینے سے بھیگ رہا تھا۔ اس کی نازک جلد سرخ ہو رہی تھی۔ گردن سے بندھا رومال میل سے اکڑا ہوا اور بدبو کے بھبکے اڑا رہا تھا۔ جمپر اتارا تو وہ بھی غلیظ۔ نیپی ریشز سے بچی کی جلد چھلی ہوئی تھی۔

"یہ کیا ظلم کیا اماں! بن ماں کی بچی کے ساتھ یہ لاپروائی۔ ارے اس سے تو اچھا تھا کسی یتیم خانے میں داخل کرا دیتے یا پھر کسی بے اولاد کو دے دیتے۔"

بچی کو واپس بستر پہ روتا چھوڑ کے خود سر ہاتھوں میں گرا کے سسکنے لگی۔

"ہو گئیں سنگ دل ـــ بھائی جان بھی بس بیوی کے عاشق بنے اسی کو رو رہے ہیں۔ اب چلی گئی جانے والی ' کب تک مرے کا سوگ منانا ہے۔ جو زندہ ہیں ' ان کی تو خبر لو۔"

"اب تو یوں ماں کی میت پہ بیٹھ گئی ہے۔" شمشاد بیگم کو اس کا رونا ذرا پسند نہ آیا۔ اس کا تو خیال تھا بیٹی اس سے ہمدردی جتائے گی کہ اس عمر میں نہ صرف گھر سنبھالا ہوا ہے بلکہ بچی کو بھی پالنا پڑ رہا ہے۔

"اتنا درد جاگ رہا ہے تو تو لے جا اسے اپنے ساتھ۔ میں کسی غیر کو کیوں دوں۔ تو اللہ رکھے اولاد والی ہے لیکن بچی کی ماں تو نہیں ـــ لے جا اسے اپنی بیٹی بنا کے اور پال لے جس طرح پالنا ہے۔ مجھ بڈھی سے تو یہ سیاپے نہیں دیکھے جاتے۔ کون سے چار چار نوکر رکھ کے دیے ہیں نوید نے۔"

اس بات پہ پروین خاموش ہی رہی اور چپ چاپ بچی کو نہلانے لے گئی۔

"ہاں ' اب کیوں بولے گی؟ ہاں ' کہ باتیں سنانا آسان ہے۔ خصم کو سر چڑھایا ہوا ہے اور ساس ـــ وہ تو ہتھیلی کا چھالا ہے۔ ان کو ناراض تو نہیں کر سکتی۔ ارے وہ نہیں رہ رہا تیری نند کا بیٹا۔ نند ـــ گھر کا تنکا ـــ اس گند کی نشانی کو کلیجے سے لگا کے پال سکتی ہے تو بھائی کی بچی کو کیوں نہیں۔"

"کوئی کلیجے سے لگا کے نہیں پال رہی۔" پروین نے باتھ روم کے کھلے دروازے سے چلا کے کہا۔

"ہاں پال ضرور رہی ہوں ' صرف خوف خدا کے نام پہ اور ضروری نہیں خدا کا خوف میرے گھر کے دوسرے لوگوں کے دل میں بھی ہو۔ لڑکی ذات ہے یہ ـــ کیسے پرائے گھر میں لے جا کے پال لوں۔ ایک میرے سوا وہاں سب غیر ہیں اس کے لیے اور وصی کی بات نہ کریں ' ایک میرے علاوہ باقی سب اپنے ہیں اس کے۔"

اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں جلتا ہوا گلہ اور شکوہ تازہ ہو گیا۔ جب اس نے یہاں آتے ہوئے وصی کو ساتھ لے جانا چاہا بلکہ وہ خود بھی ساتھ جانا چاہتا تھا۔ اب بڑا ہو گیا تھا اور پروین سے اٹیچ ہونے کی وجہ سے ہر وقت اس کے ساتھ ساتھ رہنا چاہتا تھا لیکن اس کی ساس اور شوہر دونوں نے اجازت نہیں دی۔

"پالنے پوسنے کے لیے مجھے ماں کا درجہ دے دیتے ہیں لیکن میرا کوئی حق بھی اس پہ رہنے نہیں دیتے۔" آتی بے اختیاری ـــ

شام تک کا وقت کیسے گزر گیا ' اسے پتہ ہی نہیں چلا۔ کلینک میں ہی کئی گھنٹے لگ گئے۔ وشمہ کو ڈائریا تھا اور ڈی ہائیڈریشن کی وجہ سے پانی کی بے حد کمی بھی ہو رہی تھی جسم میں۔ ڈرپ کے ساتھ دو تین انجکشن لگے تو جیسے منٹوں میں اس نے بچی کے اندر نئی جان آتے دیکھی۔ چائلڈ اسپیشلسٹ نے اس کے لیے ایک خاص فارمولے پہ بنا دودھ تجویز کیا۔ صفائی کا خاص خیال رکھنے کو کہا۔ اسے اماں سے توقع تو نہیں تھی ' اس کے باوجود انہیں تاکید ضرور کی ' پانی اور فیڈر ابال کے استعمال کرانے کی۔

بھائی سے بھی فون پہ طویل بات کر کے وشمہ کی ذمہ داری ڈھنگ سے نبھانے کی التجا کی۔

"ہو سکے تو کسی معقول خاتون کا انتظام کر دیجیے اس کی دیکھ بھال کے لیے۔ اماں کی ایک تو عمر ہو گئی ' دوسرے ان کا اپنا مزاج ہے۔ ڈاکٹری ہدایات اور حفظان صحت کے اصولوں کو وہ فضول کے چونچلے گردانتی ہیں۔ اگر کچھ پیسے زیادہ بھی خرچ کرنے پڑیں تو کوئی بات نہیں ـــ اولاد سے بڑھ کے قیمتی کیا ہوتا ہے۔"

فون رکھ کے اس نے ٹائم دیکھا۔ سات بجنے میں فقط دس منٹ تھے۔ اس کا تقریباً سارا دن ڈاکٹر کے پاس گزر

گیا تھا۔ بوا اماں نے کیا کھایا، کیا پیا! اسے کچھ خبر نہیں تھی۔

"اور اگر میں آج بھی اکڑ کے بیٹھی میاں صاحب کو نخرے دکھاتی رہتی تو....؟ اگر میں آج بے شرم بن کے خود یہاں آنے کی فرمائش نہ کرتی تو....؟ اگر میاں صاحب آج شرافت سے بات ماننے کی بجائے مجھے واپس لے جاتے تو....؟ تو دو شمع کا کیا ہوتا۔ ڈاکٹر تو پہلے ہی باتیں سنا رہا تھا کہ بچی کو لانے میں اتنی دیر کیوں کی لیکن ایسا ہونا ہی تھا۔ مجھے آنا ہی تھا۔ اللہ نے اس بن ماں کی بچی کے لیے کوئی وسیلہ تو بنانا تھا۔"

وہ گہری سانس لے کر اٹھی اور بچوں کو تیار رہنے کے لیے کہنے کو چل پڑی۔ سراج دین کسی بھی وقت یہاں پہنچ سکتے تھے۔

٭ ٭ ٭

وہ اندر آنے کے بعد کہیں نہیں رکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح اپنی ماں جی کو سلام کرنے بھی نہیں گیا تھا۔

اس نے سیدھا اپنے کمرے کا رخ کیا اور دروازہ دھڑ سے بند کر دیا۔ اے سی آن کرنے کے بعد اس نے کوٹ بیڈ پہ پھینکا اور خود بھی وہیں چت لیٹ گیا۔

سامنے کی دیوار پہ تین تصویریں لگی تھیں۔ ایک بڑی اور دو نسبتاً چھوٹی۔

سب سے بڑی تصویر اس کی شادی کی تھی جس میں وہ روایتی شیروانی اور کلاہ باندھے رعب سے اکڑا کھڑا رہا تھا اور اس کے ساتھ مدیحہ کھڑی تھی۔ گہرے سرخ بھڑکیلے عروسی لباس میں ملبوس، ڈھیروں سونا لادے۔ اس کے لبوں پہ بھی شرمگیں سی مسکراہٹ جعفر محمود کو سراسر فاتحانہ محسوس ہوئی۔ اس نے چڑ کے نظر ہٹائی۔

دوسری تصویر میں وہ تینوں بچیوں کے ساتھ یوں کھڑی تھی جیسے کوئی جاگیردار اپنی جاگیر کے ساتھ۔ اس مسکراہٹ میں اسے فاتحانہ چمک کے ساتھ ایک چیلنج سا بھی محسوس ہوا۔

تیسری تصویر میں وہ اپنی بڑی بیٹی کے ساتھ تھی۔ چند دن کی بچی کے ساتھ زرد چہرہ لیے ہوئے اور اس نقاہت کے عالم میں بھی وہی فاتحانہ سرور، وہی چیلنج دیتا انداز.... وہی غرور، وہی تفاخر......

وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اٹھ بیٹھا اور اپنا رخ تبدیل کر کے دوبارہ لیٹ گیا تا کہ نہ وہ تصویریں نظر کے سامنے آئیں، نہ ہی اس کا جی جلے۔ وہ جی جو پہلے ہی خاصا جل چکا تھا۔

"تو یہ ہے میری زندگی.... یہ سجا سجایا پنجرہ.... یہ زمین جائیداد جس کا میں اکلوتا وارث ہوں، نگران، شراکت دار؟ میرے ابا جی اور اماں جی نے عائد کر رکھی ہیں۔ میری بیوی.... میری بچیاں.... یہ میرے لیے کسی خوشگوار اور خوشحال زندگی کی علامت نہیں ہیں۔ انہیں مجھے کسی ذمہ داری کی طرح، کسی کڑے قول کی طرح ہر حال میں نبھانا ہے۔ یہ بات زبردستی مجھے سمجھائی گئی ہے۔ بھلا زبردستی بھی دل بستے ہیں۔ مدیحہ سے شادی کرتے وقت ہی ماں جی نے مجھے باور کرا دیا تھا کہ ہم تمہاری شادی نہیں کر رہے۔ تمہاری بڑی آپا کا مستقبل محفوظ کر رہے ہیں۔ مدیحہ کی خوشگوار زندگی تمہاری بہن کی خوشگوار زندگی کی ضمانت ہو گی۔"

اور اس کے نوخیز جذبے وہیں ٹھنڈے پڑ گئے تھے۔ مدیحہ کا چہرہ دیکھے بغیر، اسے جانچے پرکھے بغیر ہی وہ اس سے اکتا گیا۔ یہ کیسا زندگی کا ساتھی ملنے جا رہا تھا اسے جس کے ساتھ ساتھ نہیں چلنا تھا بلکہ سر پہ لادے پھرنا تھا۔ شاید وہ اپنے دل میں مدیحہ کے لیے گنجائش پیدا کر ہی لیتا۔ اگر یہ جبر و تحکم کی صورت اس پہ تھوپی نہ جاتی۔

اس کے ابا جی نے ساری عمر اماں جی سے ڈرتے ہوئے گزاری تھی پھر اپنے خوبرو اور لائق بیٹے کو عمر بھر کے لیے نند کی بڑھتی عمر کی قبول صورت اور کند ذہن بہن کا رشتہ لے کر انہوں نے چھوٹے بھائی کو بالکل ہی زیر بار کر لیا۔ اپنے باپ کی دیکھا دیکھی وہ بھی "ماما" اور پھر بہنوئی کے رعب میں آ گیا۔ اس کی بہن سے شادی کرنے کے بعد وہ اپنی "سالے" والی پوزیشن سے اوپر نہیں ابھر سکا تھا۔

اسی لیے کسی بے زبان مویشی کی ہنکا ہوا جب وہ اسے یہاں لایا تو وہ دم تک نہ مار سکا۔

"آپ سیدھے یہیں آ گئے؟"

جیسے بنا اس کی مرضی جانے وہ اس کی زندگی میں آئی تھی، اسی طرح بغیر اجازت کے کمرے میں بھی آ گئی۔

"ہاں جی، پوچھ رہی تھیں آپ کا۔"

وہ خاموش ہی رہا۔

مدیحہ اس کے شوز اتار کے ایک جانب رکھنے کے بعد کوٹ ہینگ کرنے لگی۔

"اس طرح آڑے ٹیڑھے کیوں لیٹے ہیں۔ سیدھی طرح آرام سے لیٹیے، تکیہ دوں۔"

اس کا بس تو بہت چاہا کہ چلا کے کہہ اٹھے۔

"اب کیا میں اپنی مرضی سے لیٹ بھی نہیں سکتا۔"

لیکن اس وقت ایک لفظ تک کہنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کی خاموشی کو محسوس کرنے کے باوجود مدیحہ نے پیش قدمی ترک نہیں کی۔ اپنے گھر اور اپنے لوگوں میں آنے کے بعد وہ اپنے قدم اور بھی مضبوط محسوس کر رہی تھی۔

"یہ لیجیے تکیہ۔" اس نے تکیہ آگے بڑھایا اور جعفر کی جانب سے کوئی ردعمل ظاہر نہ ہونے کے بعد خود اس کا سر دھیرے سے اٹھا کر تکیہ رکھنا چاہا۔

اس بار وہ خود پہ ضبط نہ کر سکا اور تکیہ اس کے ہاتھوں سے چھین کر دور پھینکا۔

"بابا...." اسی وقت آٹھ سالہ تحریم اندر داخل ہوئی۔ تکیہ اس پہ جا لگا۔

"تحریم.... کیا ہوا بیٹا....؟ آنکھ میں لگا ہے۔"

اگلی آواز مدیحہ کی تھی جو تحریم کو آنکھ پہ ہاتھ رکھتے دیکھ کر اس کی جانب لپکی تھی مگر اس سے پہلے جعفر زقند بھر کے اس تک پہنچ گیا۔

تحریم باپ کی طرح اونچے قد کاٹھ کی تھی مگر اس کے باوجود اس نے بچی کو گود میں اٹھا لیا۔

"سوری بیٹا! سوری میری جان.... زور سے تو نہیں لگا۔ پاپا نے تکیہ آپ کو نہیں مارا تھا جانو!"

وہ بار بار اس کی موٹی موٹی آنکھیں چوم رہا تھا۔

"تو کیا ماما کو مارا تھا پاپا؟"

اس کے سوال پہ وہ سن ہو گیا۔

"ہم کھیل رہے تھے بیٹا!" مدیحہ نے بات سنبھالی۔

"جیسے میں اور تقدیس، تطہیر کھیلتے ہیں تکیوں اور کشنز کے ساتھ۔"

"ہوں۔" جعفر نے اس کے ماتھے پہ آئے بال پیچھے کیے۔

"لیکن ماما! ہمیں تو آپ منع کرتی ہیں۔ اچھا تو آپ دونوں بھی ناٹی ہو گئے ہیں۔"

اس نے ہلکا سا کھنکتا ہوا قہقہہ لگایا۔ جعفر کے لبوں پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔

اور ایسے میں وہ یہ نہ دیکھ سکا کہ اس کے پیچھے کھڑی مدیحہ کے چہرے پہ وہی مسکراہٹ تھی۔ وہی فاتحانہ اور تفاخر و غرور سے بھرپور مسکراہٹ جس میں کسی کو زیر کر لینے کی آسودگی تھی۔

٭ ٭ ٭

"زہے نصیب، زہے نصیب۔"

منزہ کی آواز سنتے ہی مظہر کی ساری کلفت اور تھکان دور ہو گئی۔ اب وہ بشاشت بھرے لہجے میں اس سے بات کر رہا تھا۔

"آج میری جانم نے فون کرنے کی زحمت کیسے کر لی؟"

"آہستہ.... آپ آفس میں بیٹھے ہیں۔"

"سویٹ ہارٹ! یہ میرا کیبن ہے۔ میرا پرائیویٹ اور پرسنل کیبن۔ یہاں بیٹھ کے میں اپنی بیوی سے ہر طرح کی پرائیویٹ اور پرسنل بات کر سکتا ہوں۔ کسی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟"

"میں بھائی جان کے پاس سے فون کر رہی ہوں۔"
"جانتا ہوں۔"
"وہ کیسے؟" وہ حیران ہوئی کچھ پریشان بھی کہ شاید اس کے میکے آنے کی خبر اس سے پہلے ساس صاحبہ نے دی ہو اور اگر انہوں نے فون کیا ہوگا تو پھر اور بھی بہت کچھ بتایا ہوگا۔ اصغر کی اچانک شادی اور پریشانی کے متعلق بھی۔
"وہ ایسے کہ اول تو اپنے گھر سے تمہیں کبھی فون کرنے کی توفیق نہیں ہوئی یا یوں کہہ لو ہمت نہیں ہوئی۔ ضروری کام کے لیے کر بھی لیا تو ڈرے ڈرے انداز میں چار لفظ مجبوراً کہے اور ریسیور رکھا....."
"آپ بھی سسرال میں رہیں تو آپ کو پتہ چلے۔" وہ آہستگی سے اپنی مجبوری بیان کر گئی۔
"خیر... ہماری تو جناب بڑی عزت ہے اپنے سسرال میں۔ آپ ہی نکمی ٹھہریں جو اپنی قدر نہ کرا سکیں۔ ہم تو اپنی سسرال کی آنکھوں کا تارا ہیں، سر پہ بٹھاتے ہیں وہ اور خوب آؤ بھگت کرتے ہیں۔"
اس کے اترانے پہ منزہ کو ہنسی آ گئی۔
"تو آ رہے ہیں نا پھر آؤ بھگت کرانے۔"
"تم رات رک رہی ہو؟"
"جی... شاید کل کا دن اور رات بھی۔"
"خیریت؟ یہ اچانک پروگرام کیسے بنا؟ صبح تو تم نے ذکر نہیں کیا تھا۔"
"بس یونہی میرا دل چاہ رہا تھا۔ سوہا بھی ضد کر رہی تھی۔"
"سچ سچ بتاؤ گھر میں تو کوئی بات نہیں ہوئی؟ کسی کے کچھ کہنے پہ تو تم گھر سے نہیں نکلی ہو؟"
"نہیں بھئی! میں سچ کہہ رہی ہوں اور گھر میں پہلے بھی آئے دن کوئی نہ کوئی بات ہوتی رہتی ہے۔ کیا اس سے پہلے میں ناراض ہو کر گھر سے نکلی ہوں اور آج تو امی کا موڈ بھی بہت اچھا تھا' اسی لیے انہوں نے بغیر کسی سوال جواب کے جانے کی اجازت دے دی۔"
اس نے مختصراً "سب اچھا ہے" کی رپورٹ دی۔
"حیرت کی بات یہ نہیں کہ انہوں نے اجازت دے دی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ تم نے اجازت مانگ لی۔ کہاں سے لائیں اتنا حوصلہ؟"
وہ مذاق اڑانے کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔
"اچھا چھوڑیے یہ سب سیدھے یہیں آ جائیے گا۔ سوہا کے لیے وہ چاکلیٹس ضرور لائیے گا جو آپ اکثر لاتے ہیں۔ یہاں کی مارکیٹ سے نہیں ملی بھائی جان گئے تھے لینے۔"
"ہاں ڈھیر ساری لے آؤں گا ایک ہی دفعہ۔"
"ارے تو کیا کرنی ہیں گرمی میں پگھل جاتی ہیں۔ بس دو تین کافی ہیں۔"
"یہاں بھی تو بچے ہیں۔ ایک ایک ان کو دے دینا۔ باقی فریج میں رکھ لینا۔ کافی دور ہے وہ شاپ جہاں سے میں یہ چاکلیٹس لاتا ہوں۔ پتہ نہیں دوبارہ جانا ہو سکے یا نہیں۔ ایک ہی بار اسٹاک کر لینا۔"
"اچھا۔" وہ تابعداری سے سر ہلا گئی۔ یہ وضاحت کچھ اوپر سے گزر گئی تھی۔
"میں امی کو فون کر کے بتا دیتی ہوں کہ آپ آج گھر نہیں جائیں گے۔ اچھا اللہ حافظ۔"
"تمہیں بہت جلدی ہے مجھے اللہ حافظ کرنے کی۔" وہ جھنجلا کے بولا۔
"ابھی میرا دل کر رہا ہے تم سے بات کرنے کو۔ یہاں تو ساس یا نند کی صورت میں تمہارے سر پہ کوئی تھانیدار مسلط نہیں ہے پھر کیا جلدی ہے تمہیں۔"
"آپ کے کام کا حرج نہیں ہو رہا؟ آپ تو دیر تک آفس میں اسی لیے رکتے ہیں نا کہ آج کام زیادہ ہے۔"

"ہاں کام زیادہ ہے۔ اور وقت کم۔ میں اکتا گیا ہوں یار! مجھے [illegible] میں بے حد مکمل کھپ گیا۔" وہ تھکا تھکا سا بولا۔
"چلیں باقی کل کر لیجیے گا۔"
"منزہ بات کرو نا مجھ سے۔" اس کے لہجے میں عجب سی تڑپ اور بے تابی تھی۔
"فون بند کریں گے تو یہاں سے نکلیں گے اور نکلیں گے تو جلدی پہنچیں گے۔ باقی باتیں واپس آ کے کر لیجیے گا۔ نو بجنے بھی ہو گئے ہیں۔"
"دراصل اس وقت تم سے بات کر کے وہی لطف آ رہا ہے جو منگنی اور شادی کے درمیان میں فون پہ چوری چھپے بات کرنے میں آتا تھا۔ ایسا لگ رہا ہے گیا وقت لوٹ آیا ہو۔ مجھے تھوڑی سی دیر اور اس وقت میں جی لینے دو نا منزہ۔"
اس کے بوجھل لہجے اور گہری سانسوں کے آگے وہ بے بس ہو گئی اور خود بھی گئے وقت کی مہک میں کھو گئی۔
"میں تمہیں بہت چاہتا ہوں منزہ!"
"میں جانتی ہوں۔"
"شکر ہے کہ تم سچ جان سکو۔"
"آپ کچھ زیادہ ہی رومانٹک نہیں ہو رہے۔" اس نے ٹوکا۔
"ایک بار مجھے آئی لو یو کہو نا۔" وہ ان سنی کرتا ہوا یہ فرمائش کر رہا تھا جس پہ وہ بے ساختہ مسکرا اٹھی۔
"اوں ہوں۔ یہاں میں اکیلی نہیں۔"
"بہانے مت بناؤ۔ تم اکیلی ہو ورنہ اتنی دیر تک بات نہیں کرتی۔ بولو نا...."
"نہیں۔"
"کیوں؟"
"بہت عجیب لگ رہا ہے۔"
"پہلی بار تو نہیں کہہ رہی۔"
"ہاں مگر فون پہ۔"
"ہاں فون پہ کبھی نہیں کہا اور میں سننا چاہتا ہوں' ہر طرح سے سننا چاہتا ہوں۔ تمہیں سامنے بٹھا کے بہت بار سنا ہے۔ ایک بار فون پہ بھی کہہ دو پلیز... میری جان تمہیں ہو۔"
"اف... کبھی کبھی بہت تنگ کرتے ہیں آپ۔"
"اچھا اب نہیں کروں گا' بس تم میری یہ فرمائش پوری کر دو۔"
"نہ آپ کبھی تنگ کرنے سے باز آئیں گے' نہ فرمائش کرنے سے۔"
"پکا وعدہ... آج کے بعد تنگ کروں گا' نہ کوئی اور فرمائش کروں گا۔ بس یہ ایک... آخری بار...."
"آئی لو یو۔" اس نے فوراً کہہ دیا اور اس کے بعد پتہ نہیں کیا ہوا کہ کسی نئی نویلی دلہن کی طرح شرما کے ریسیور رکھ دیا۔
اس نے دونوں ہتھیلیوں سے اپنے رخسار چھوئے جو حدت سے تمتما رہے تھے۔ مظہر کی جانب سے ایسی [illegible] معمول کی بات تھی۔ وہ اپنی محبت کے اظہار کے معاملے میں بہت فراخ دل تھا لیکن آج... آج کچھ خاص ہی بات تھی... معمول سے ہٹ کر... آج وہ اس حد سے بڑھے التفات اور کھلم کھلا اظہار عشق سے چڑنے کی بجائے ایک عجب سا سرور محسوس کر رہی تھی۔ ایک ایسا سرور جو دل کو کیف و انبساط دینے کے ساتھ ساتھ ہلکا سا گداز اور سوز بھی بخش دیتا ہے۔
شاید یہ واقعی اس گئے وقت کی یادوں کا اعجاز تھا جب محبت کے اولین دنوں میں وہ دوشیزہ خود کو سراہے

جذبوں کی حکایتیں سن کر ایسے ہی شرم سے سرخ اور خوشی سے سرشار ہو جاتی تھی۔

وہ کمرے سے نکل کر کچن میں جانا چاہتی تھی تاکہ بھابھی کی مدد کرے جو ان کی اچانک آمد کی وجہ سے کھانا تیار کرنے میں مصروف ہو گئی تھیں لیکن اس کے نکلنے سے پہلے ہی فون کی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔

"ہیلو۔"

"مجھے اللہ حافظ کہے بغیر ہی فون رکھ دیا؟" دوسری جانب مظہر تھا۔

"حد کرتے ہیں آپ۔"

"نہ ہی مجھ سے اپنے پیار کا جواب سنا۔ بیگم صاحبہ! لگتا ہے آپ کا دل بھر چکا ہماری محبتوں سے۔"

"کیسی باتیں کرتے ہیں۔" وہ برا مان گئی۔

"آئی لو یو... آئی لو یو... آئی لو یو..."

"بس بس... بس کیجیے، مجھے یقین آگیا۔ کیا اب میں فون رکھ سکتی ہوں صاحب!"

"تم سے اللہ حافظ سنے بغیر تو میں نہیں جانے والا۔"

"اللہ حافظ... فی امان اللہ... اللہ کے سپرد۔"

اس کی تسلی کی خاطر وہ تین چار بار کہہ گئی۔

ریسیور رکھنے کے بعد بھی دیر تک ایک آسودہ اور سرشار سی مسکراہٹ ان کے لبوں پہ سجی رہی۔

"کیا بات ہے؟ لگتا ہے میاں جی نے پھلجھڑیاں چھوڑی ہیں۔"

اس کے گل رنگ چہرے اور مسکراتے لبوں کو دیکھ کے ثناء بھابھی نے چھیڑا۔

وہ خاصی بے تکلف تھی منزہ سے شاید عمر کے کم فرق کی وجہ سے۔ ورنہ صائمہ بھابھی سے تو احترام والا رشتہ تھا۔

وہ مسکرا کے سر جھٹک کے رہ گئی اور چپ چاپ ان کے آگے سے قیمہ اٹھا کے کوفتے بنانے لگی۔

"مظہر نے پوچھا نہیں کہ اچانک پروگرام بنانے کی کیا وجہ تھی؟"

"میں نے ٹال دیا۔ اب اصل بات کیسے بتاتی؟"

"بھلا یہ تمہارا میاں جو آسانی سے ٹل جاتا ہے۔" وہ ہنس پڑی۔

"ایک تمہارے بھائی صاحب ہیں جو بال کی کھال اتارنے کے ماہر ہیں۔"

"کم تو مظہر بھی نہیں البتہ میرے ساتھ ان کا رویہ مختلف ہوتا ہے۔ میں تو خود حیران ہوتی ہوں بھابھی! اوروں کے لیے شعلہ بنے رہنے والا شخص میرے لیے شبنم کیسے بن جاتا ہے۔ میری کسی بھی بات پہ انہیں غصہ نہیں آتا۔"

"ماشاء اللہ کہو ماشاء اللہ۔" ثناء نے فوراً ٹوکا۔

"خدا ان کی محبت کو نظر بد سے بچائے اور خاص طور پہ تمہاری ساس اور نند کی نظر بد سے کہ وہ تو [illegible] ہے۔"

دونوں پھر کھل کھل کر کے ہنس پڑیں۔

"ایک بات ہے منزہ! اگر مظہر تمہاری ہر بات اتنے ہی تحمل سے سن لیتا ہے تو تمہیں اصغر کے اس نئے کارنامے کے متعلق بتا دینا چاہیے تھا۔ تم تو اسے 'جائے وقوعہ' سے ہی کھینچ لائی۔"

"کیا کرتی بھابھی! آپ میری ساس کے مزاج سے واقف نہیں۔ وہ ہر مصلحت سے عاری ہیں۔ مظہر بھی غصے کے تیز ہیں، اصغر بھی کم بد لحاظ نہیں اور ان سے بجائے مصالحت کے اس جھگڑے کو اور اچھالنا تھا یہ سوچے بغیر اس کا نتیجہ خطرناک نکل سکتا ہے۔ مظہر سے ویسے تو ان کی کم بنتی ہے لیکن اس معاملے میں چونکہ دونوں کا ردعمل ایک سا ہوتا اس لیے اصغر کے خلاف ٹیم بن جاتی اور مظہر کو اپنے مقصد کے لیے انہوں نے اور بھی بھڑکانا تھا

جھگڑا بڑھانے کے لیے انہیں اشتعال دلا کے اپنی طرف سے استعمال کرنا تھا۔"

"وہ بھی امریکہ میں تمہاری ساس تو۔" ثناء نے جھرجھری لے کر کہا۔ اس کی یہ بات منزہ کو پھر سے ہنسنے پہ مجبور کر گئی۔

دونوں کی بکھرتی ہنسی کے درمیان کہیں فون کی گھنٹی بج رہی تھی۔

"تو آیا پھر سے فون... تمہارے عاشق کا ہوگا۔" ثناء نے ہنسی روکتے ہوئے کہا۔

"نہیں اب نہیں۔ وہ تو میرے اللہ حافظ کہنے کے انتظار میں تھے۔" منزہ نے بے تحاشا ہنسنے کی وجہ سے سرخ ہوتے چہرے پہ دونوں ہاتھ رگڑتے ہوئے کہا۔

اتنے میں گھنٹی جو کئی بار بجنے کے بعد بند ہو گئی۔ شاید کسی نے فون ریسیو کر لیا تھا۔

"توبہ... کتنی بدگمان ہیں بھابھی آپ۔"

اس سے پہلے کہ ثناء کچھ اور کہتی اس کے شوہر نے بلند آواز میں اسے پکارا۔

"ذرا یہ پیاز دیکھنا سرخ ہونے والے ہیں۔ اس میں یہ گوشت ڈال کے بھون لینا۔ میں بات سن آؤں۔"

"جی خیریت؟" وہ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی اندر آئی جہاں جمشید فون کے نزدیک رکھی کرسی پہ دونوں ہاتھوں میں سر گرائے بیٹھا تھا۔

"آپ نے آواز دی تھی۔" وہ نزدیک آ کے دھیرے سے بولی۔ پہلے تو اس قدر اونچی آواز میں چلا کے اسے آواز دینا ثناء کو چونکا گیا اور اب یہ نڈھال سا پژمردہ انداز۔

"ہاں وہ... منزہ کے سسرال سے فون آیا تھا۔" اس نے سر اٹھا کے دیکھا تو وہ اپنے شوہر کی بے تحاشا سرخ ہوتی آنکھیں دیکھ کے ڈر گئی۔

"اس کے دیور کا تھا۔ مظہر... مظہر کا ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" جمشید نے بہت دقت کے ساتھ غم سے ٹوٹے لہجے میں کہا لیکن شاید کوئی خاص اثر نہ ہوا۔ الٹا اسے غصہ سا آ گیا۔

"توبہ کس قدر جھوٹا اور بکواس شخص ہے یہ منزہ کا دیور۔ شرم بھی نہیں آتی اسے اس قسم کا بے ہودہ مذاق کرتے ہوئے اور وہ بھی اپنے ہی سگے بھائی کے متعلق۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی منزہ فون پہ مظہر سے بات کر رہی تھی۔"

"وہ مذاق نہیں کر رہا۔ فون کے بعد وہ یہیں آنے کے لیے نکلا ہوگا کہ..."

"لیکن ابھی تھوڑی دیر پہلے تو..." ثناء بات کرتے کرتے رک کے وال کلاک کی جانب دیکھنے لگی۔ تقریباً سوا گھنٹہ ہو چکا تھا منزہ کو فون پہ بات کرتے ہوئے اسے کچن میں مل جل کے کھانا پکاتے اور خوش گپیوں کے دوران وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا تھا اور اب جب احساس ہوا تو اس کی لرزتی ٹانگوں نے اس کا بوجھ اٹھانے سے صاف انکار کر دیا۔

وہ کانپتے ہوئے بیٹھ گئی۔

"سوا گھنٹہ، واقعی اب تک تو وہ پہنچ بھی چکا ہوتا۔"

"تم منزہ کو کسی بہانے وہاں لے جانے پہ تیار کرو۔ کہو کہ... کہو کہ... ہاں کہو اس کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

کہتے ہوئے اس نے ریسیور اٹھا لیا۔ شاید یہ اطلاع وہ کسی اور کو بھی دینا چاہتا تھا لیکن ثناء کا دل اس حکم پہ الجھ کے رہ گیا۔

"بہانے سے... بہانے سے کیوں؟ سچ سچ بتائیے کیا... کیا وہ... وہ زیادہ زخمی ہے؟"

کسی بد ترین اندیشے کو زبان پہ لانے کی ہمت نہ کر سکی۔

"بچوں کو ذرا برابر والوں کے ہاں بھیج دو میں بھائی صاحب کو بھی فون کر دوں۔ اکٹھے نکلتے ہیں۔"

جمشید نے اس کا سوال نظر انداز کیا اور وحشت زدہ چہرے کے ساتھ ایک نمبر ملانے لگا۔ اس کا بڑا بھائی بیوی کے ساتھ خاندان میں ہونے والی کسی تقریب میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ شاید اسی سے رابطہ کرنے کی کوشش ہو رہی تھی۔ ثناء نے کریڈل پہ ہاتھ مار کے لائن منقطع کی۔

"میں کیا پوچھ رہی ہوں' وہ کس ہاسپٹل میں ہے؟"

"کسی میں بھی نہیں۔ ہم منزہ کے گھر جا رہے ہیں۔ مظہر کو گھر لایا جا چکا ہے۔"

جمشید نے سر جھکا کے کہا اور آہستگی سے ثناء کا ہاتھ ہٹا کے دوبارہ نمبر ڈائل کرنا چاہا۔

"اوہ..... شکر ہے میرے اللہ۔" ثناء نے کھل کے سانس لی جو جمشید کے انداز کی وجہ سے سینے میں ہی کہیں اٹک گئی تھی۔

"یعنی خطرہ نہیں ہے۔ میں ایسا کرتی ہوں منزہ کو بتا دیتی ہوں۔ جھوٹ بولنے کی ضرورت کیا ہے آخر؟"

وہ بتانے کے لیے اٹھی مگر اس سے پہلے جمشید فون پہ سے پھینک کر اٹھا اور اس کا بازو سختی سے پکڑ کے واپس کھینچا۔

"اسے ابھی کچھ بتانے کی ضرورت نہیں۔"

"لیکن کیوں؟ آپ خود ہی تو کہہ رہے ہیں وہ ہاسپٹل سے واپس گھر آ گیا ہے۔ یعنی چوٹیں معمولی نوعیت کی ہوں گی جب ہی تو اتنی جلدی ہاسپٹل سے....."

"میں نے یہ نہیں کہا کہ وہ ہاسپٹل سے واپس آ چکا ہے۔" جمشید کی انگلیاں ثناء کو اپنے بازو میں اندر تک دھنستی محسوس ہوئیں۔

"میں نے..." اس کی آواز اچانک بھرا گئی۔

"میں نے کہا ہے کہ اسے ہاسپٹل سے گھر لایا جا چکا ہے۔"

وہ مزید ضبط نہ کر سکا اور ثناء کے شانے پہ سر رکھ کے پھوٹ پھوٹ کے رو دیا۔

◆ ◆ ◆
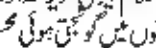
"ارے بھائی! آپ جو مرضی کہہ لیں..... جورو کا غلام' بیوی کا دیوانہ جو دل چاہے' میں برا نہیں مانوں گا۔" مظہر کی زندگی سے بھرپور آواز ثناء کو اپنے کانوں میں گونجتی ہوئی محسوس ہوئی اور پھر اس کا جان دار قہقہہ لگاتے ہوئے سامنے بیٹھی منزہ کو شرارت سے آنکھ مارنا اور منزہ کا سب کے سامنے اس حرکت پہ سرخ ہو کے آنکھیں دکھانا۔

ثناء جس خشک تولیے سے چہرہ ڈھانپے ہوئے تھی' وہ بھی گیلا ہونے لگا۔ بے بسی کے شدید احساس سے ہوتے ہوئے اس نے ایک بار پھر پانی کے چھینٹے منہ پہ مارنے شروع کیے۔ وہ ان روتی روتی آنکھوں کے ساتھ منزہ کے سامنے نہیں جانا چاہتی تھی اس لیے پچھلے سات آٹھ منٹ سے واش روم میں بند ان آنسوؤں کے نشان مٹانے کی کوشش کر رہی تھی مگر ہنوز ناکام تھی۔

اس نے ایک بار پھر آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہا۔ آنکھوں میں جو ہلکی سی سرخی اب تک تھی۔ سو تھی مگر چہرہ پہ دکھ اور الم کے یہ نشان.....

"منزہ بچی تو نہیں جو سمجھ نہ سکے۔ لیکن فی الحال اسے لاعلم رکھنا بھی ضروری ہے ورنہ اسے یہاں سے لے جانا محال ہو جائے گا۔ نجانے کیا کر گزرے۔"

اس نے یہ سوچ کے ہونٹوں پہ ہلکی پھلکی مسکراہٹ لانے کی کوشش کی کہ شاید اس سے چہرے پہ بشاشت کے تھوڑے اثرات نمودار ہو سکیں مگر اس کوشش میں اس کی آنکھوں کے گوشے پھر سے بھیگنے لگے۔

"ثناء! جلدی کرو۔" جمشید نے دروازہ کھٹکھٹاتے ہوئے بھاری آواز میں حکم دیا۔

وہ تولیے سے چہرہ خشک کرتی باہر نکلی۔

جمشید عجیب وحشت زدہ انداز میں سامنے کھڑا تھا۔

"جمیل بھائی جان کو خبر دے دی ہے۔ وہ بھابی کے ساتھ وہیں پہنچ رہے ہیں۔ تم منزہ کو لاؤ..... ہمیں بھی فوراً پہنچنا چاہیے۔"

"ایسا کریں' آپ جائیں۔ میں اور منزہ....."

"دیکھو ثناء اسے پتہ تو چلنا ہی ہے۔ زیادہ دیر کرنا مناسب نہیں ہے۔ تم اسے لے آؤ۔"

"لیکن ہم تینوں اکٹھے جائیں گے تو اس کے دل میں کھٹک پیدا ہو جائے گی۔ ویسے بھی وہ مظہر کے اب تک نہ پہنچنے کی وجہ سے تشویش میں مبتلا ہو چکی ہے۔ میں نے ابھی دیکھا ہے فون کے نزدیک بیٹھی مسلسل نمبر ملا رہی ہے۔ خدانخواستہ اسے ذرا سا بھی شک ہو گیا تو اسے سنبھالنا مشکل ہو جائے گا۔ بہتر ہے کہ وہاں جا کے خود ہی..... اسے یہ اطلاع دینا ہم میں سے کسی کے لیے بھی مشکل ہو گا۔"

اس کی آواز بھرا گئی۔ جمشید بھی اپنی آنکھیں مسلنے لگا۔

"زندگی میں اس نے بھلا کون سی خوشی دیکھی تھی اس ایک خوشی کے علاوہ۔ ہماری سب سے چھوٹی بہن۔ چھوٹی سی تھی جب ماں باپ کے سائے سے محروم ہوئی۔ سسرال ملا تو وہ بھی بے قدرا..... ایک مظہر ہی تو تھا اس کی زندگی میں اب وہ بھی۔"

"بس کیجیے..... آپ کی حالت دیکھ کے وہ ویسے بھی شک میں پڑ سکتی ہے۔ ایسا کریں آپ اس کا سامنا کیے بغیر نکل جائیں۔ میں آپ کے پیچھے اسے لے کر آتی ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ثناء نے اپنے شوہر کے شکستہ قدموں کو دکھ سے دیکھا اور ایک بار پھر بہت مشکل سے امڈ آنے والے آنسوؤں کو روکا۔

منزہ اس کے لیے ایک بے ضرر سی نند رہی تھی۔ جب وہ بیاہ کے آئی تو وہ کالج میں پڑھتی تھی مگر بڑی بھابی کلثوم نے اس کا بچپن بھی دیکھ رکھا تھا۔ وہ خود بتاتی تھیں کہ وہ بچپن سے ہی بڑی صابر و شاکر اور صلح جو رہی ہے اس لیے اکلوتی نند ہونے اور بھائیوں کی لاڈلی ہونے کے باوجود بھابیوں کے لیے کبھی مسئلہ نہیں بنی۔

شادی کے بعد کم کم آتی مگر جب آتی بھابیوں کا خلوص لے کر لوٹتی۔ لیکن اس وقت ثناء کو منزہ کے لیے اپنے دل میں ہمیشہ سے بڑھ کے پیار محسوس ہو رہا تھا۔ اس کا دل اس کے دکھ میں ویسے ہی دکھی تھا جیسے کسی سگے کے لیے ہوتا ہے۔

"کیا کر رہی ہو منزہ؟"

اس نے پردہ ہٹا کے اندر جھانکتے ہوئے کہا۔ وہ پریشان سی صورت لیے صوفے پہ بیٹھی تھی' ٹیلی فون سیٹ گود میں دھرا تھا۔

"مظہر اب تک نہیں پہنچے۔ آفس میں فون کیا تو پتہ چلا کہ کب کے نکل چکے ہیں۔"

"کہیں رک گیا ہو گا۔ مارکیٹ میں یا کسی دوست کے ہاں۔"

"نہیں' وہ سیدھے گھر آتے ہیں۔ اگر کہیں جانا بھی ہو تو کم از کم مجھے اطلاع دیے بغیر تو نہیں۔ پھر بھی ان کے جن دو دوستوں کے نمبر مجھے آتے تھے میں نے وہاں بھی فون کیا ہے۔"

"تو پھر؟" ثناء کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

"ایک تو ملے نہیں..... دوسرے کچھ عجیب گول مول سی باتیں کر رہے تھے۔"

"کیا مطلب؟" وہ خوفزدہ ہو گئی کہ کہیں کسی دوست نے.....

"پتہ نہیں کیا کہہ رہے تھے اسی کو دیکھنے جا رہا ہوں۔ آپ بھی آ جائیں' پتہ نہیں کیا کیا۔ مجھے تو نشے میں لگ رہے تھے۔ آواز بھی لڑکھڑا رہی تھی حالانکہ وہ ایسے ہیں تو نہیں خیر مظہر سے بات کروں گی کیسے شرابیوں سے دوستی کر رکھی ہے۔" "گھر کا نمبر مسلسل بزی مل رہا ہے۔"

"اچھا؟ تم نے وہاں بھی کیا؟" دل ہی دل میں ثنا نے شکر کیا منیرہ کی ملنے پہ.....
"ہاں..... حالانکہ وہ مجھے بتائے بغیر کہیں نہیں جاتے۔"
اس فکر کے عالم میں بھی اس کے لہجے سے فخر اور محبت بھرا مان جھلک رہا تھا۔ ثنا خوامخواہ ہی منہ پھیر کے سیٹ کرنے لگی۔

"کبھی کسی جگہ جانا اتنا ضروری ہوتا ہے کہ انسان چاہتے ہوئے بھی اطلاع نہیں دے پاتا منیرہ!"
"جی..... لیکن بھابی!"
"اچھا چھوڑو یہ سب۔ اٹھو ذرا میرے ساتھ آؤ۔ مارکیٹ تک جانا ہے۔"
وہ خود پہ قابو پاتے بولی۔ منیرہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھا۔
"میں کیسے جاؤں بھابی؟ مظہر اب تک نہیں پہنچے اور....."
"ارے پانچ منٹ کا کام ہے۔ یہ تمہارے بھائی جان..... بغیر بتائے نکل گئے۔ اب میں کس کے ساتھ جاؤں بلکہ ایسا کرتے ہیں' مارکیٹ کے اس طرف تو تمہارا گھر ہے۔ وہاں بھی نظر مار آتے ہیں شاید مظہر وہیں ہو۔"
"نہیں..... وہ وہاں کیوں جانے لگے' جب انہوں نے مجھ سے یہاں آنے کے لیے کہا ہے۔"
"ضروری نہیں منیرہ! کہ انسان جو کہے' وہ پورا بھی کر دکھائے۔ کبھی کبھی کوئی مجبوری ایسی ہو جاتی ہے کہ ارادے سب وعدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔" وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سنجیدہ ہو گئی۔
"ہو سکتا ہے تمہارے فون کے بعد تمہاری ساس نے فون کر دیا ہو اور تمہارے زیور والا سارا قصہ سنا کر مظہر سے رہا نہیں گیا ہو گا اور وہ وہاں پہنچ گیا ہو گا۔"
"ہاں..... یہ ہو سکتا ہے۔" وہ بے چینی سے کھڑی ہو گئی۔
"پھر تو ہمیں فوراً وہاں پہنچنا چاہیے۔ کہیں حالات قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ مجھے دیکھ کے مظہر پھر بھی رک جاتے ہیں۔"
وہ فوراً چادر اوڑھنے لگی۔ ثنا دکھ سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"یہ مان' یہ استحقاق اب کس پہ جتاؤ گی منیرہ؟ تمہاری ذات کو یہ غرور دینے والا اس بار تمہارے لیے رکنے..... لیکن پتہ نہیں' پتہ نہیں وہ کس دل سے گیا ہو گا تمہیں چھوڑ کر۔"
منیرہ کے کہنے کے باوجود اس نے سوہا کو اپنے بچوں کے ساتھ گھر پہ چھوڑ دیا۔ اپنے میکے فون کر کے وہ یہ خبر دے چکی تھی۔ سب کے سب منیرہ کے گھر روانہ ہو چکے تھے اور ثنا کی خالہ یہاں بچوں کے پاس رکنے آ رہی تھیں۔
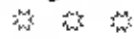
☆ ☆ ☆

"ہائے میرا مظہر' میرے کلیجے کا ٹکڑا' میرا گبھرو سوہنا۔"
نصرت کو غش پڑ رہے تھے اور وہ سینہ پیٹ پیٹ کر بین ڈال رہی تھی۔ اس کی چیخ و پکار سن کر اپنے تو اپنے غیروں کی بھی آنکھیں بھر آ رہی تھیں۔ وہ بار بار جھکتی اور دیوانہ وار مظہر کا چہرہ چومنے لگتی۔
"ہائے کوئی سہرا لاؤ..... میرے بیٹے کو سہرا باندھو۔ کوئی ہار لاؤ' لے ہار ڈالو پھولوں کے۔"
اسے بار بار اپنی وہ دعائیں یاد آ رہی تھیں جو وہ منیرہ کی ضد میں مظہر کے ساتھ کر گزرتی تھی۔ وہ ساری کی ساری جھڑ چکی اور وہ زور زور سے اپنا سر پیٹنے لگی۔
"مجھے پتہ ہوتا مظہر تو نے ماں سے اتنا سخت ناراض ہو جانا ہے' ہمیشہ کے لیے چلے جانا ہے تو میں کبھی تجھے کچھ نہ کہتی۔ ذرا ناراض نہ کرتی۔ ماں صدقے تو شہزادے' ماں کو معاف کر دے۔ میرے بچے کی قسم..... واپس آ جا۔ اب تجھے کچھ نہیں کہتی کچھ نہیں کہتی۔ اللہ پاک کی قسم! بس تو ایک بار واپس آ جا۔"
"امی..... امی ہوش کرو۔" شمیم نے بمشکل اس کے بازو قابو کر کے مزید سینہ کوبی سے باز رکھنے کی کوشش کی۔
"نصرت! اب تیرا بیٹا نہیں آنے والا۔ تیرا کوئی وعدہ' کوئی قسم اسے نہیں لا سکتی۔" ایک اور رشتے دار نے اسے باور کرایا۔

"اس طرح بین ڈال کے اسے تکلیف مت دو۔ اس کا آخری سفر آسان کرو۔ دعا کرو اس کی مغفرت کے لیے' اس کی بخشش کے لیے۔"
یہ ایک اور خاتون تھیں جو بار بار معقول مشورہ دے رہی تھیں مگر شمیم کو اس اندوہناک سانحے پہ اس معقولیت کا مظاہرہ زہر لگا۔ وہ اس خاتون کے پیچھے پڑ گئی۔
"اچھا..... اب ہمارا بھائی بڑا نیک تھا..... بخشا ہوا تھا۔ اس نے کون سے گناہ کیے تھے جو ہم بخشش کروانے بیٹھیں۔ اب ہم روئیں بھی نہ؟ جس کا دل پھٹا ہو وہی جانتا ہے کیسے آنسو روکنا مشکل ہوتا ہے۔ میری ماں نے اپنا سب سے پیارا' سب سے لائق' سب سے پیارا بیٹا کھویا ہے۔ وہ کیسے صبر کرے۔"
وہ زار زار روتے ہوئے چلا رہی تھی۔ ایک اور عورت نے پہلی خاتون کو ہاتھ دبا کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ وہ بدمزگی سے خاموش بیٹھ گئیں۔
"اس کی بیوی نہیں پہنچی اب تک؟" کسی نے پوچھا۔
"آ رہی ہو گی بدنصیب۔" نصرت نے ایک اور دہائی چیخ ماری۔ وہاں بیٹھی منیرہ کی بڑی بھابی کلثوم اپنی والدہ کی گود میں منہ چھپا کے بلک پڑی۔
"اسے کیا پتہ کہ اس کے سر کا سائیں' اس کا شہزادہ اس جوان عمر میں کیسا روگ لگا کے گیا ہے۔"
شمیم نے روتے روتے حیرت سے اپنی ماں کو دیکھا جو اس وقت ذرا سا بانکل نہیں کر رہی تھی اور زندگی میں پہلی بار وہ منیرہ کے لیے کوئی ہمدردانہ جملہ کہہ رہی تھی۔
"ہائے مظہر تو تو اس کی ساری باتیں مانتا تھا۔ وہ جو کہتی تھی کرتا تھا..... مجھے بڑا غصہ آتا تھا تیری اس حرکت پہ..... لیکن ماں صدقے تو اس کی خاطر رک جاتا۔ اس کی بات مان لیتا۔ تو نے تو اس کا خیال بھی نہ کیا۔ اپنی ذرا سی بچی کے لیے بھی نہ سوچا۔ کیا بنے گا ان دونوں کا۔"
"اللہ کی ذات صبر دینے والی ہے بہن!" انہی معقول خاتون سے ایک بار پھر رہا نہ گیا اور وہ بول پڑیں۔
"وہی سب کا پالنے والا ہے۔ بس دعا کرو' اللہ انہیں صبر دے۔" شمیم نے ایک بار پھر کڑی نظروں سے اسے دیکھا۔
"یہ کون ہے؟" کسی نے شمیم کو ٹہوکا دے کر پوچھا۔ نصرت نے بھی نظر اٹھائی۔
وہ ریتا تھی جو لہنگا اور دلہن کا لباس تبدیل کر کے' زیور اتار کے' میک اپ صاف کر کے اب اپنے کمرے سے برآمد ہوئی تھی۔ سادہ سے موتیا رنگ کے شلوار قمیص میں ڈھلے ہوئے چہرے کے ساتھ وہ بہت معمولی شکل و صورت کی لگ رہی تھی۔
"یہ..... یہ ہے وہ کچھل پیری' وہ منحوس ادھر اس نے اپنے سبز قدم میرے گھر میں رکھے اور ادھر میرے گھر میں ویرانیاں پھیل گئیں۔"
وہ جو نڈھال اور ادھ موئی سی بیٹے کے نزدیک بیٹھی تھی کسی بپھری ہوئی شیرنی کی طرح لپکی اور زمین پہ سوگوار انداز میں بیٹھی ریتا پہ جھپٹی۔
"اس کی نحوست کھا گئی میرے بیٹے کو۔ ایسی ٹکر ماری بس والے نے کہ اگلا سانس بھی نہ لے سکا بدنصیب' یہ کھا گئی ہے میرے گھر کی خوشیاں۔" وہ دونوں ہاتھوں سے اسے پیٹنے لگی۔
"اصغر....." ریتا نے دونوں ہاتھوں سے اپنا بچاؤ کرتے ہوئے اصغر کو مدد کے لیے بلایا۔
وہ ٹوٹے ہوئے انداز میں گھر کے باہر مختلف انتظامات میں مصروف تھا۔ دل تھا کہ بڑے بھائی کی اس اچانک اور افسوسناک موت پہ پھٹا جا رہا تھا مگر وہ ہمت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کام دیکھ رہا تھا کہ اس کا باپ تو مظہر کی ڈیڈ باڈی گھر آتے ہی غش کھا کے گر پڑا تھا اور اس وقت اس کے دوست انہیں ہاسپٹل لے کر گئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ایک دوسرے دوست کو قبرستان کے لیے ہدایات دے رہا تھا جب اندر سے عجیب سا شور اٹھا۔ اس

نے خاص دھیان نہ دیا کہ وقفے وقفے سے اس کی ماں کے بین بلند ہو رہے تھے لیکن رضا کی آواز اور پھر اصغر اصغر کی پکار نے اسے پلٹ کر اندر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

وہ بچاری عورتوں کے درمیان نصرت کے ہاتھوں بری طرح پٹ رہی تھی۔ کئی عورتیں نصرت کو روکنے کی کوشش کر رہی تھیں مگر وہ بری طرح بپھری ہوئی تھی اور تھپڑ اور دھکے پے در پے کر رہی تھی۔

"امی... امی کیا ہو گیا ہے؟" وہ تیزی سے آگے آیا اس کے ساتھ چمٹ گیا اور دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لیے۔

"وے اصغر! اسے کہاں سے لے آیا۔ اپنے بھائی کی موت کو۔"

"امی! بھائی کی اتنی ہی زندگی تھی۔ وہ اتنی ہی لکھوا کے لایا تھا۔"

وہ آنسو بھی بہا رہا تھا اور ساتھ ساتھ غم و غصے سے پاگل ہوتی ماں کو قابو بھی کیے ہوئے تھا۔ اس کے اشارے پر رضا نیا دوپٹہ زمین سے اٹھا کر جان بچا کے کمرے میں بھاگی۔

"کیوں؟... کیوں لایا تھا وہ اتنی زندگی۔" وہ تھک کے نیچے بیٹھی رونے لگی۔

اصغر بھی وہیں بیٹھ گیا۔ دونوں کچھ گھنٹوں پہلے ہونے والے جھگڑے کو یکسر فراموش کیے اپنے اس درد مشترک کا سوگ منا رہے تھے۔ انہیں اس شور میں باہر رکتے رکشے کی آواز نہیں آئی تھی مگر رکشے سے اترتی منزہ کو باہر تک نصرت کے بین سنائی دیے۔ اس کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔

وہ سہمی ہوئی نظروں سے کبھی نظریں چراتی ثنا کو تو کبھی سامنے اپنے بڑے سے گھر کے پورے کھلے لوہے کے گیٹ کو دیکھ رہی تھی۔

گیٹ کے باہر سے ہی اندر ہونے والی ساری ہلچل دکھائی دے رہی تھی۔ بڑے سے لان اور پورٹیکو میں قناتیں لگی تھیں۔ وہ ثنا سے ایک بھی لفظ پوچھے بغیر ڈوبتے لڑکھڑاتے قدموں سے اندر بڑھنے لگی۔

دریاں بچھی تھیں۔ بہت سے شناسا اور اجنبی مردوں کے چہرے نظر آئے۔ سب سوگوار انداز میں بیٹھے تھے۔ وہ گیٹ پہ کھڑی دور سے ہی اندر بیٹھی بے شمار عورتوں کو دیکھ رہی تھی۔ نصرت اور شمیم کی آہ و بکا سن رہی تھی۔ اس کے ایک اندازے کی تصدیق تو ہو چکی تھی مگر وہ مرنے والا...

"کون...؟" اس کے دل نے بڑے ڈرے ڈرے انداز میں سوال اٹھایا۔

اندر ایک کونے میں وہ پولیس والے مظہر کے خالہ زاد بھائی کے ساتھ باتیں کرتے نظر آئے۔

کہیں مظہر کا وہ غصہ تو رنگ نہیں لے آیا... جس سے میں ہمیشہ دہل دہل جاتی تھی۔

اسے خیال گزرا کہ دونوں بھائیوں میں جھگڑا کوئی افسوس ناک صورت تو اختیار نہیں کر گیا تھا۔ کہیں مظہر نے طیش میں آ کے اصغر کی اس نئی نویلی بیوی کو تو...

"بھئی صاحب کو ہسپتال سے لے آئے ہیں؟" گزرتے ہوئے ایک پڑوسی کی آواز کانوں میں پڑی۔ وہ مظہر کے اباجی کے بارے میں اصغر کے کسی دوست سے پوچھ رہا تھا۔

"اوہ... تو کیا اباجی..." اب اس کا دھیان سسر کی جانب گیا اور حیرت کی بات تھی کہ اگرچہ سسرال میں ان کا رویہ باقی سب کی نسبت غنیمت تھا اور وہ دل سے ان کا احترام کرتی تھی اس کے باوجود اس بات پہ اس نے اپنے دل میں دکھ کے ساتھ ساتھ اندر کہیں ایک سکون سا بھی اترتے محسوس کیا۔ کم از کم اس کے وہ بد ترین اندیشے تو غلط ثابت ہوئے کہ مظہر کے ہاتھوں اصغر کی بیوی نہ ماری گئی ہو۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے دل کو اس بے حسی اور خود غرضی کے مظاہرے پہ ڈانٹا۔ اپنے سسر کی صورت اس کی آنکھوں میں پھر گئی۔

"بھائی... یہ کیا ہو گیا؟ اباجی تو بھلے چنگے تھے۔" مرکزی دروازے تک پہنچتے پہنچتے اس نے پلٹ کر دکھ اور بے یقینی سے ثنا کو دیکھا۔ جو کب سے رو کے آنسو کھل کے بہا رہی تھی۔

منزہ کے آنسو بھی بے اختیار ہو گئے۔ اب اس کے قدموں میں تیزی آ گئی۔

اندر داخل ہوتے ہی اس نے لاؤنج میں عورتوں کے ہجوم کے درمیان لٹے پٹے انداز میں بیٹھی

"امی جی..."

نصرت کو دیکھا۔

اس وقت اس عورت کے چہرے پہ اتنے گہرے دکھ تھے کہ منزہ پل میں اس کی ساری زیادتیاں، سارے مظالم بھلا گئی۔ بے اختیار اس کا دل چاہا کہ بھاگ کے اس سے لپٹ جائے اور اسے تسلی دے... کوئی دلاسہ دے۔

شمیم بھی سوگوار انداز میں چارپائی کے نزدیک بیٹھی نظر آ رہی تھی جس پہ سفید چادر اور گلاب کی پتیوں سے ڈھکا وجود رکھا تھا۔ وہ بے ساختہ اپنا بازو چھڑاتے ہوئے آگے بڑھی۔

"امی جی یہ کیا ہو گیا؟"

"ہائے میری بچی ہم برباد ہو گئے۔" نصرت نے اسے دیکھ کے دونوں بازو پھیلا دیے۔ اصغر جو اب تک ماں کی گود میں سر رکھے آنسو بہا رہا تھا اٹھ کے بھابی کو دیکھنے لگا جو رو رہی تھی غم زدہ اور اداس بھی لگ رہی تھی۔ مگر وہ سب اسے نظر نہ آیا جس کی توقع تھی اور جس کا ڈر تھا۔

اس نے سوالیہ نظروں سے ذرا دور کھڑی ثنا کی جانب دیکھا۔ وہ لب کچلتے ہوئے نفی میں سر ہلانے لگی۔ اصغر ایک سرد آہ بھر کے ماں سے الگ ہو کے سوچنے لگا۔

"یہ کڑا مرحلہ ابھی باقی ہے۔"

دوسری جانب منزہ نصرت کے گلے لگتے ہی جھینپ سی گئی۔ وہ والہانہ اسے چوم رہی تھی اور اسے سینے سے لگا لگا کے دھاڑیں مار رہی تھی۔ منزہ کے لیے اس کا یہ روپ باعث حیرت تھا۔

"بس کرو نصرت! اپنی بہو کو ہی دیکھ لو کتنے صبر اور حوصلے سے کام لے رہی ہے۔" کسی خاتون نے ایک بار پھر کہا۔

"اور کیا... تمہارا دکھ بھی کم نہیں مگر اس کے آگے تو ساری زندگی پڑی ہے۔"

منزہ یہ تبصرے سن کے الجھ گئی اور متفکر سا سب کا منہ دیکھنے لگی۔ تب اس نے غور کیا کہ کلثوم بھابی جو خاندان کی کسی تقریب میں شرکت کرنے کی روادار نہیں تھیں وہ بھی نظر آ رہی تھیں۔ نہ صرف وہ بلکہ ان کے میکے سے بھی سب پہلے سے موجود تھے۔

ثنا بھابی کے میکے والے بھی موجود تھے۔ خود اس کی اپنی سگی خالہ اور چچی بھی بیٹھی تھیں۔ کلثوم بھابی اس کی نظروں کی تاب نہ لا کے منہ ڈھانپ کے رونے لگیں۔ منزہ جس نے کچھ دیر قبل وہاں کھڑے کھڑے ان گنت اندازے لگا لیے تھے اب بالکل گنگ تھی۔

اس کا ذہن جیسے بالکل ماؤف ہو چکا تھا... کچھ بھی سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت سے یکسر محروم۔

"مظہر وہ اب تک نہیں آئے؟" بہت دیر بعد وہ اٹک اٹک کے اصغر سے پوچھنے لگی۔

"انہیں تو اطلاع دے دی ہو گی؟" وہ سوال کر رہی تھی۔

کئی عورتوں نے تعجب سے اسے دیکھا۔ کئی کی نگاہوں میں ترحم اور ہمدردی تھی۔ سب کے چہروں کے عجیب و غریب تاثرات... بھٹکتی ہوئی اچانک اس کی نظریں دروازے کی جانب اٹھ گئیں۔

اصغر کے ایک دوست اور اس کے بھائی جمشید کا سہارا لے کر اندر آتے ہوئے وہ اس کے سسر تھے۔

اس کی آنکھیں پھٹنے کے قریب ہو گئیں۔ جمشید نے بہن کو دیکھ کے سر جھکا لیا تھا۔

منزہ نے پلٹ کے چارپائی پہ ابدی نیند سوئے وجود کو دیکھا۔ اصغر نے اسے پکڑنا چاہا مگر وہ اٹھ کے پل بھر میں یہ چھ سات قدموں کا فاصلہ طے کر چکی تھی۔ اس نے کپکپاتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا الٹا۔

"مظہر..."

اس کی دلدوز چیخ وہاں موجود سینکڑوں لوگوں کا سینہ چیر گئی۔

☆ ☆ ☆

اپنے کمرے میں موجود ربینہ دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے ٹہل رہی تھی۔ آج تیسرا دن تھا اس نے اصغر کی ہدایت پہ کمرے سے جھانک کے نہیں دیکھا تھا۔

اور کوئی حالات ہوتے تو وہ اصغر کے اس حکم کو رکھتی اپنے جوتے کی نوک پہ اور جان بوجھ کے نصرت اور شمیم کا کلیجہ جلانے کے لیے بار بار ان کے سامنے آتی لیکن یہ موقع ہی ایسا نازک تھا۔

اصغر اس بری طرح بکھرا ہوا تھا کہ اس موقع پہ وہ کسی بے وقوفی کا مظاہرہ کرکے بازی اپنے خلاف نہیں الٹ سکتی تھی۔ الٹا وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کی دلجوئی کرتے ہوئے یہ احساس دلا رہی تھی جیسے اس کے غم میں برابر شریک ہو۔

رات گئے جب اس کے کمرے میں لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ ان کے سیپارے پڑھنے میں مصروف ہو جاتی۔ اس سے دن بھر کمرے میں بند رہنے کا۔ نصرت اور شمیم کے اہانت آمیز رویے کا گھر آئے عزیزوں کے طرح طرح کے تبصروں کا اصغر کے تین دن سے ذرا سا بھی وقت نہ دینے کا غرض کسی بات کا گلہ اس نے اب تک نہ کیا تھا اور اصغر کے پہلے سے جیتے دل کو اور بھی مٹھی میں کر لیا تھا۔

تیسرے دن تک بھائی کی موت کا غم بھی قدرے ہلکا ہو گیا تھا۔ اب اسے ماں کا طرز عمل سنگدلانہ اور غیر حقیقی لگنے لگا تھا۔ اس نے اندر آتے ہی ربینہ کو دیکھا تو وہ ماتھے تک لپیٹے سیپارہ غلاف میں رکھ رہی تھی۔

"چلے گئے مہمان؟" قریب آتے ہوئے اس نے بڑی دلسوزی سے پوچھا۔

"ہاں۔" وہ تھکا تھکا سا بیٹھ گیا۔ یوں تو تین دن سے تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا لیکن جو رشتے دار پچھلے تین دنوں سے یہیں رہ رہے تھے وہ بھی ایک ایک کرکے جا چکے تھے۔

ہر وقت سسکیوں، آہوں کا سے لرزتی دیواروں والا یہ دو منزلہ گھر ایک دم سنسان مگر سوگوار سا سکوت لیے نظر آ رہا تھا۔

"امی کا غصہ کچھ کم ہوا؟" وہ چپ رہا۔

"میں جاؤں ان کے پاس؟"

"سر تڑوانے؟"

"ایسے کب تک چوروں کی طرح اندر چھپی رہوں۔ اب تو مجھے بھی لگنے لگا ہے جیسے بھائی جان کی موت میری وجہ سے ہوئی ہے۔"

وہ رقت آمیز لہجے میں کہہ رہی تھی۔ تین دن سے وہ اصغر کے آنسو پونچھ رہی تھی اب بہا رہی تھی تو اصغر بھلا کیسے برداشت کرتا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو ربینہ! اظہر کا جانا واقعی قیامت سے کم نہیں لیکن یہ تقدیر میں لکھا تھا۔ اس میں تمہارا کیا قصور؟"

"اگر تم مجھے یونہی چھپا چھپا کے رکھتے رہے تو مجھے ایسا ہی لگے گا بلکہ دوسروں کو بھی لگنے لگے گا۔ سب مجھے مجرم سمجھیں گے۔"

"ہاں مجھے اندازہ ہے لیکن اس وقت......"

"گھر کی بات ہے اصغر! اور امی کون سا غیر ہیں۔ بزرگ ہیں میری ماں کی جگہ اور پھر ایسے وقت میں ان کی ذہنی حالت بھی ٹھیک نہیں وہ کچھ کہہ لیں یا ماریں تب بھی میں برا نہیں مانوں گی۔"

وہ یقین دلا رہی تھی مگر اصغر بے یقین سا تھا۔ اسے اپنی ماں سے ربینہ کی پہلی ملاقات یاد آ رہی تھی جو نصرت کو خاصی بھاری پڑی تھی۔

"یاد نہیں اس دن ستر عورتوں کے سامنے انہوں نے مجھے ادھیڑ کے رکھ دیا تھا مگر میں نے اف تک نہیں کی تھی۔" ربینہ نے اس دن کا حوالہ دیا۔ اصغر کچھ کچھ یقین لے آیا۔

"واقعی تمہارا ظرف بڑا ہے بہت حوصلہ ہے تم میں۔"

"یہ ظرف اور حوصلے کی نہیں محبت کی بات ہے اصغر جی!" اس کے اندر کی لومڑی انگڑائی لے کے بیدار ہوئی اور اپنے مطلب کے لیے اس پہ نثار ہونے لگی۔

"مجھے ان کے پاس جانے دیجیے۔ اب تو مہمان بھی چلے گئے۔ وہ میرے ساتھ جو بھی کریں گی۔ میں سہہ لوں گی۔ سوچیے اگر آج گھر کی بات گھر میں ہی رہ جائے گی لیکن کم از کم ان کے دل کا سارا غبار تو نکل جائے گا۔"

"تم کتنی اچھی ہو ربینا!" وہ اس کے ہاتھ تھام کے عقیدت سے چومنے لگا۔

"یہ تو آپ ہیں اصغر جی! جو مجھے اس گھر کی عزت بنا کے لائے اور مجھے پیار کے ساتھ ساتھ عزت اور اعتبار بھی دیا۔ اس گھر کے سکون کی خاطر تو میں کچھ بھی کر گزروں گی۔"

وہ بلی کی طرح دبے پاؤں سر پہ اوڑھنی لیے کمرے سے نکلی۔ مگر نصرت کے کمرے تک پہنچتے پہنچتے اس کی چال میں طنطنہ آ چکا تھا۔ دوپٹے کا پلو ایک جھٹکے سے اس نے پیچھے پھینکا اور زور سے دروازہ کھولا۔

شمیم نصرت کو دوا کھلانے کے بعد سہارا دے کر بستر پہ لٹا رہی تھی۔ دونوں اس کی اس اچانک اور دھماکہ خیز آمد پہ حیران ہو کے اسے دیکھنے لگیں۔ شمیم نے گردن گھما کے وال کلاک کی سمت دیکھا۔ رات کے ڈیڑھ بج رہے تھے۔

"تو... تیری ہمت کیسے ہوئی میرے کمرے میں گھسنے کی؟ یہ تیرے کسی یار کا کمرہ نہیں ہے جہاں دندناتی ہوئی گھس آئی ہے۔"

تین دن سے رو رو کے نصرت کا گلا بیٹھ چکا تھا اس کے باوجود اس نے پھیپھڑوں کا پورا زور لگانا چاہا۔ ربینہ جانتی تھی کہ وہ اسے دیکھ کے یونہی مشتعل ہو جائے گی اس لیے جان بوجھ کے نہ صرف اپنے کمرے کا دروازہ کھلا چھوڑ آئی تھی بلکہ اس دروازے کو بھی کھلا رہنے دیا تھا۔

نصرت کی آواز بڑی آسانی سے گھر پہ چھائے ہوئے سناٹے کو چیرتے ہوئے اصغر کے کانوں تک پہنچتی تھی اور اسے اپنے کمرے سے نکل کر یہاں آنے میں بس ایک آدھ منٹ ہی لگنا تھا وقت کم تھا مگر وہ اس ایک آدھ منٹ کو ضائع نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے عین نصرت کے سر پہ پہنچ کر اس نے بڑے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں مگر قدرے کم آواز میں اس کے چہرے پہ نظریں گاڑ کے کہا۔

"رسی جل گئی بل نہیں گیا۔ کیوں ری بڈھی ڈائن... ایک بیٹے کو دفنا کے تیرا دم خم نہیں نکلا؟ ابھی تک وہی اکڑ؟... خیر بڑی دیکھی ہیں تیرے جیسی تیکھی ہوئی عورتیں۔ میں نے بھی اگلے ہی جھٹکے میں ساری اکڑ نہ ختم کی تو نام بدل دینا۔"

اس سے آگے اسے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ پڑی تھی۔ نصرت کسی زخمی شیرنی کی طرح اس پہ پل پڑی تھی۔ اسی وقت اصغر اندر داخل ہوا اور ربینا کو ماں سے چھڑانے لگا۔

"دماغ خراب ہو چکا ہے امی کا۔" وہ شمیم کو مدد کے لیے بلا رہا تھا مگر وہ الٹا اس پہ چڑھ دوڑی۔

"دماغ تمہاری اس آوارہ بیوی کا خراب ہوا ہے۔"

"میں جتنا لحاظ کر رہا ہوں اتنا ہی دونوں بڑھتی جا رہی ہو۔"

اس نے ایک جھٹکے سے ربینا کو نصرت سے الگ کیا اور دھکا دے کر ماں کو بستر پہ گرانے کے بعد سسکتی ہوئی ربینا کو بازوؤں میں بھر لیا۔ وہ بھی کسی زخمی چڑیا کی طرح اس کے سینے سے لگی ہچکیاں لے رہی تھی۔

بستر پہ گرنے کے انداز میں ڈھئی نصرت پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی یہ ڈرامے بازی دیکھ رہی تھی۔

منیبہ شور سن کے اپنے کمرے کے دروازے تک آئی مگر صورت حال کا اندازہ کرنے وہیں رک گئی..... اس کے پیچھے شانو تھی۔ وہ آج رات ان کے پاس رک رہی تھی۔ پچھلی دو راتیں کلثوم بھابی نے اس کے ساتھ گزاری تھیں۔

"تمہیں دنوں سے جینا عذاب کر رکھا ہے تم دونوں نے۔ ٹھیک ہے۔ مظہر جوانی موت مر گیا۔ مجھے بھی اکلوتے بھائی کا غم ہے۔ مگر میں یہ غم دوسروں پہ نہیں نکالتا پھر رہا۔ اس بے چاری کا کیا قصور ہے جو اسے منٹ منٹ پر بیتے والی ہو۔ کتنے دنوں سے کمرے میں چوروں کی طرح قید ہے۔ یہ سب دکھانے کے لیے میں اسے یہاں لایا تھا؟"

"نہیں تو اسے ماں کو ذلیل کروانے لایا تھا۔"

"ذلیل تو یہ بے چاری ہو رہی ہے۔ کتنے شوق سے آئی تھی یہ تمہارے پاس اور دیکھو کیا حال کر کے رکھ دیا ہے۔"

"شوق سے؟ یہ شوق سے آئی ضرور تھی مگر ایک دکھی ماں کے کلیجے میں سوئی چبھونے۔ تجھے نہیں پتا اس نے میرے ساتھ کیا کیا باتیں کی ہیں۔" وہ رونے لگی۔

"رہنے دو امی! رہنے دو۔ میں مظہر نہیں ہوں جس کے سامنے کچھ بھی بول دو گی۔ ایک منٹ پہلے تو نکلی ہے اپنے کمرے سے ایک منٹ میں اس نے کون سے تیر مار دیے ہیں۔"

"امی ٹھیک کہہ رہی ہیں اصغر۔ یہ ذلیل۔" شمیم نے گواہی دینا چاہی مگر اصغر نے اسے بری طرح ڈپٹ کے رکھ دیا۔

"تو تو منہ نہ ہی کھول تو اچھا ہے۔ یہ تو تمہی ہے ماں کو نئی نئی باتیں سکھانے والی۔ ورنہ امی تو مظہر کے غم میں بیٹھی تھیں۔ تیری پڑھائی پٹی میں آ کے ہی یہ نیا ڈرامہ کھیلا گیا ہے۔"

وہ اسی طرح ریتا کو چیختے ہوئے نگاہوں سے کمرے سے نکلا۔ اس نے بالکل سامنے کھلے دروازے پہ کھڑی منزہ اور اس کی بھابی کی جانب آنکھ اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا البتہ وہ دونوں دیکھ چکی تھیں۔

دیکھ چکی تھیں کہ کیسے نکلتے ہوئے ریتا نے پلٹ کے نصرت اور شمیم کو فاتحانہ مسکراہٹ سے نوازا تھا۔

ثنا نے تعجب سے کچھ جتاتے ہوئے منزہ کو دیکھا۔ وہ بے دلی سے ثنا نے اچکا کے رہ گئی اور ایک گہری تھکی ہوئی سانس لے کر دروازہ بند کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"یہ کس قسم کی عورت کو گھر لے آیا ہے تمہارا دیور؟" ثنا نے اس کے برابر بیڈ پہ بیٹھتے ہوئے اچنبھے سے پوچھا تھا۔

منزہ کوئی بھی جواب دیے بغیر بیڈ شیٹ کے بڑے بڑے نیلے پھولوں پہ انگلیاں پھیرتی رہی۔ غلطی سے شاید ہی اس کے ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا ہوا ہو۔ وہ سکتے کی کیفیت میں نہیں تھی مگر اس کی گویائی جیسے سانحے کی نذر ہو چکی تھی۔

کل سے وہ اسی گم صم کیفیت میں کسی معمول کی طرح چل پھر رہی تھی اور اس سے پہلے کا دن۔ یہ تو خود اسے بھی یاد نہیں تھا کہ کیسا گزرا تھا۔ اسے فقط اتنا یاد تھا کہ سفید چادر سے ہٹاتے ہی اسے مظہر کا پرسکون چہرہ نظر آیا تھا اور اور اس کے بعد۔ بس یہاں اس کی یادداشت ساتھ چھوڑ دیتی تھی۔

ہوش میں آنے کے بعد کا پہلا منظر جو اسے یاد آتا تھا شاید یہی وہ منظر تھا جو اسے ہوش کی دنیا میں واپس لایا تھا۔ اس کی بھابی نے بری طرح بلکتی سوہا کو اس کی گود میں ڈالا تھا اور کہا تھا۔

"منزہ! بس کرو۔ بس کرو منزہ!" وہ اسے بری طرح جھنجھوڑ رہی تھیں اور روتی ہوئی سوہا اپنے ننھے منے ہاتھ اس کے گالوں پہ مار مار کے اسے اپنی جانب متوجہ کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

"ادھر دیکھو منزہ! یہ تمہاری بچی ہے۔ یہ معصوم بچی اس نے بھی باپ کھویا ہے مگر اس بدنصیب کے آنسو پونچھنے والا کوئی نہیں۔ کوئی اپنے بیٹے کا غم منا رہا ہے کوئی بھائی کا۔ تم اپنے شوہر کا غم۔ اسے کون دیکھے گا؟ اس ڈھائی تین برس کی یتیم بچی کو کون دیکھے گا۔ جسے یہ بھی نہیں پتہ کہ اس کے ساتھ کیا گزری ہے۔ وہ تو صرف اسی بات پہ رو رو کے ہلکان ہو رہی ہے کہ اس کی ایک آواز پہ اپنے سارے کام چھوڑ کے اس کی جانب لپک کر آنے والے پاپا اس کے بار بار بلانے پہ بھی اٹھ کیوں نہیں رہے؟ اس کی ساری فرمائشیں پوری کرنے والے، ہر بات ماننے والے پاپا اس سے

اس کے بلانے پہ بھی جاگ کیوں نہیں رہے تھے اور اور کچھ لوگ اس کے پاپا کو ڈھک کے اس سے دور کیوں لے گئے

اٹھو منزہ! تم اور کچھ نہیں تو اسے دیکھو۔ مظہر مجبور تھا۔ اللہ نے اسے زندگی ہی اتنی دی تھی لیکن تم تم کیسے اس سے لاپرواہ ہو سکتی ہو؟ کیسے اپنے غموں میں اسے بھول سکتی ہو؟"

کچھ بھابی کی باتیں اسے سوہا کی جانب کھینچ رہی تھیں۔ وہ اپنی بیٹی کو سینے سے بھینچ کر ایسے روئی کہ حلق پھاڑتی۔ وہاں تک سب کے چپ ہو گئی۔

اس کے بعد اس نے ایک گہری چپ سادھ لی تھی۔ وہ یا تو مظہر کے ایصال ثواب کے لیے کچھ پڑھتی نظر آتی یا پھر معمول کی طرح چھوٹے موٹے کام نمٹاتی۔ اس خاموشی میں بھی اس کے چہرے پہ بڑا کی داستانیں ہوتیں۔ جو لبوں تک آنے سے پہلے بجھ جاتے اور آہ بھر کے رہ جاتے۔

ابھی بھی جب ثنا کے بار بار بلانے پہ بھی منزہ ایک خاموش نظر اس پہ ڈال کے رہ گئی تو ثنا کا دل یکدم دکھ سے بھر گیا۔ اس کا دل چاہا ہاتھ جوڑ کے اس سے التجا کرے کہ وہ کم از کم اسے تو اس نظر سے نہ دیکھا کرے۔ یہ نظر جو سوال کرتا ہوا ہی کرانے کا کام ہے۔

"کیا مظہر اس عورت سے مل چکا تھا؟" اس نے ایک اور کوشش کی اسے بولنے پہ آمادہ کرنے کی۔

وہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے پاس ہی سوئی ہوئی سوہا کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

"مل لیتا تو شاید تمہیں اور اپنی بیٹی کو اس عورت کے ساتھ اس چھت کے نیچے رکھنے پہ کبھی تیار نہ ہوتا۔"

وہ تب بھی چپ رہی۔

"اس نے تو تمہاری ساس اور نند جیسی عورتوں کو بھی مات دے دی۔ تمہارا کیا حشر کرے گی؟.... کبھی سوچا؟"

اس بار منزہ نے اسے یوں دیکھا جیسے ان سب باتوں کا مقصد پوچھ رہی ہو۔ ثنا اس کا سوال بھانپ کے ذرا سا کھنکھاری۔ جیسے کسی بات کا کسی بہت خاص بات کا آغاز کرنے والی ہو۔

"منزہ! میرا بلکہ تمہارے بھائیوں کا بھی، ہم سب کا خیال ہے کہ مظہر کے بعد اب تمہارا یہاں رہنا کسی بھی طرح مناسب نہیں ہے۔"

وہ تڑپ کے اٹھ بیٹھی اور گھائل نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔ ثنا اس کے ہاتھ پہ اپنے ہاتھ کا محبت بھرا دباؤ ڈالتے ہوئے گویا ہوئی۔

"گھبراؤ مت، ہم جانتے ہیں ابھی تمہارا جانا ذرا معیوب لگے گا..... ابھی ہم تمہیں نہیں لے جا رہے۔ کم از کم مظہر کے چہلم تک یا پھر اپنی عدت پوری کرنے تک تو تمہیں یہیں رہنا ہوگا۔"

منزہ نے اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیے۔ مظہر کے حوالے سے قل، تدفین، چہلم اور عدت جیسے الفاظ گزشتہ تین دنوں سے اسے مسلسل تکلیف دے رہے تھے۔

"پہلے سے اس لیے بتا رہی ہوں تاکہ تم ذہنی طور پہ تیار رہو۔ یہ تمہارا گھر نہیں ہے منزہ! سسرال وغیرہ کچھ نہیں ہوتا۔ ایک شوہر کا رشتہ ہوتا ہے جو سب سے باندھ کے رکھتا ہے۔ سارے سسرالی رشتے اسی سے وابستہ ہوتے ہیں اور جب وہی نہ رہے تو...

ہاں جہاں پیار، محبت، خلوص اور ہمدردی ہو وہاں بھی گزارا ہو جاتا ہے جبکہ اس گھر کے مکین ان اوصاف سے قطعاً عاری ہیں اور سب سے بڑھ کے یہ آوارہ عورت ہے تو تمہیں کھا جائے گی۔ منزہ! اس لیے اب خود کو یہاں سے جانے کے لیے آمادہ کرنا شروع کر دو۔ یہی تمہارے اور تمہاری بچی کے حق میں بہتر ہوگا۔"

منزہ پتھر کے بت کی مانند بیٹھی رہی۔ ثنا تو وہ تین کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی مگر اس کی نیندیں تو تین راتوں سے روٹھی ہوئی تھیں۔ اب اس کی باتوں سے اسے اپنی بچی کھچی زندگی بھی روٹھتی نظر آنے لگی۔

"میں اب بھی مظہر سے نہیں مل سکتی۔ کبھی اسے دیکھ نہیں پاؤں گی۔ ابھی تک میں اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں ہی کامیاب نہیں ہو سکی اور آپ مجھے ان دیواروں سے، اس گھر سے بھی دور کرنا چاہتی ہیں۔"

"کیا اب بھی یہ سب کبھی نہیں دیکھ پاؤں گی یہ سب تو مجھے مظہر کی یاد دلاتا ہے۔ مجھے یہ احساس دلاتا ہے مظہر نہیں ہے مگر اس کا سب کچھ تو اب بھی میرے پاس ہے میرے اردگرد ہے۔
یہ الماری جس میں اس کے کپڑے ٹنگے ہیں یہ آئینہ جس میں اس کا عکس رہ گیا ہے یہ کنگھا جو روزانہ اس کے بالوں کو سنوارتا تھا۔
یہ تولیہ جو اس کے بدن کی نمی جذب کرتا تھا۔ یہ رومال جو اس کے پسینے سے مہک رہے ہیں۔ یہ تکیہ یہ چادر کمبل یہ چشمہ یہ کرسی یہ سب... یہ سب... کبھی میں نہیں دیکھ سکوں گی؟"
آنسو ٹپ ٹپ اس کی گود میں گرنے لگے۔ اسے لگا آج مظہر کی وفات کے تیسرے دن بہت سی موتیں اکٹھی ہو گئی ہیں۔ وہ ان سب کا ماتم کر رہی تھی۔
"کیا آج کے بعد مجھے اجنبی چھت کے نیچے اجنبی دیواروں کے درمیان اجنبی چیزوں کے ساتھ جینا ہو گا؟ نہیں میں ایسا نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے ایک عزم کے ساتھ اپنے آنسو پونچھے۔
"مظہر کو روکنا میرے اختیار میں نہیں تھا لیکن اس کی یادوں کے ساتھ اس کی نشانیوں کے ساتھ جینا میرے اپنے اختیار میں ہے۔ میں اس سے کبھی محروم نہیں ہوں گی۔"

☆ ☆ ☆

کافی عرصے بعد پروین، سراج دین کے ساتھ شاپنگ کے لیے نکلی تھی ورنہ وہ اکیلی ہی جایا کرتی۔ یا جب ساجدہ زندہ تھی تب اس کے ساتھ بازار جانے میں بھی مزہ آیا کرتا تھا۔
رخشندہ کا مزاج ایسا تھا کہ وہ خود ہی الگ تھلگ رہنا پسند کرتی تھی۔ اسے اپنے ساتھ بازار جانے کی دعوت دیتے ہوئے پروین خود ہی جھجک جاتی۔ اتنے سالوں کے ساتھ نے بھی دونوں میں دیورانی جٹھانی والا دوستانہ رشتہ پیدا نہ ہونے دیا تھا۔
حالانکہ اس عرصے میں دونوں کے بیچ ہلکی سی تلخ کلامی کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔
آج جب بچوں کے اصرار پر وہ انہیں جوائے لینڈ لے کے آئے اور پروین کے ایک بار کہنے پر ہی صنعتی نمائش کا ایک چکر لگا لینے پر راضی ہو گئے تو پروین کی تو گویا مراد بر آئی۔
اس کے گھر سے صنعتی نمائش خاصی دور پڑتی تھی۔ اکیلے آنے کا حوصلہ نہ پڑتا تھا۔ جوائے لینڈ کا پروگرام بنتے ہی اس نے ٹھان لیا تھا کہ وہ اس کے بالکل ساتھ ہی لگی نمائش میں ضرور جائے گی۔
سراج دین کا موڈ بھی کبھی کبھار ہی اچھا ہوتا تھا۔ اتفاق سے آج بھی تھا۔ بچوں نے جوائے لینڈ میں جی بھر کے تھکایا بھی تھا اس کے باوجود اب تک بے زار نہ ہوئے تھے۔
معراج کے چاروں بچے بھی ہمراہ تھے اور وصی تو خیر ہر وقت ساتھ ہوتا ہی تھا۔
"یہ دیکھیں ان ٹراؤزرز کے ساتھ یہ شرٹس اچھی لگیں گی؟"
اس نے سراج سے رائے لینا چاہی۔ پہلے وہ بے رغبتی سے سرسری نظر ڈالتے ہوئے اثبات میں سر ہلا گئے پھر کچھ خیال آنے پر آہستہ سے کہنے لگے۔
"حسن، احسان کے لیے لے رہی ہو؟"
"نہیں وصی کے لیے بھی لے رہی ہوں۔ تینوں کے دو دو سوٹ لے لیتی ہوں۔"
"رضا اور **عمیر** بھی ساتھ ہیں۔ برا لگے گا اگر......"
"ٹھیک ہے میں پانچوں کا ایک ایک سوٹ لے لیتی ہوں۔" پروین نے ان کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا اور سیلز مین سے رضا اور **عمیر** کے سائز بھی نکلوانے لگی۔
"اور بچی ہمارے لیے......" شمو نے لاڈ سے کہا۔

"بچی! ادھر یہ بڑے پیارے سندھی اور بلوچی ڈریسز ہیں۔ وہ دکھاتی ہوں تمہارے اور حمد کے لیے۔" پروین نے مسکراتے ہوئے اس کے گال تھپتھپائے۔
پروین کو شمو سے خاص انس تھا۔ وہ تھی بھی تو پیار کے قابل۔ سب سے جلدی گھل مل جانے والی، سب کا خیال رکھنے والی رخشندہ سے بالکل مختلف مزاج کی۔
سیلز مین شمو کے لیے بلوچی فراک اور سندھی کڑھائی والے کرتے رکھتے ہوئے اسے گھیر دار سا شیشے کے کام سے سجا ایک ننھا منا نیلا فراک نظر آیا۔ وہ اشتیاق سے اسے اٹھا کے دیکھنے لگی۔
"اس سے چھوٹا سائز ہے؟"
"نہیں باجی! یہ سب سے چھوٹا سائز ہے۔ ایک سال تک کے بچے کا۔"
"مجھے اس سے چھوٹا چاہیے۔ تقریباً تین چار مہینے کی بچی کا۔"
"اس میں تو اور سائز نہیں ہے جی، یہ جامنی ویلوٹ والا ہے۔ یہ چھ مہینے کی بچی کا سائز ہے۔"
"بڑا لگ رہا ہے۔" وہ ہاتھ میں لے کر دیکھنے لگی۔ فراک تو یہ نیلا بھی بہت خوب صورت تھا۔
"باجی! یہ بھی تو ویلوٹ کا ہے۔ سردیاں آتے آتے پورا آ ہی جائے گا۔" تجربہ کار سیلز مین ہر حربہ آزما رہا تھا اسے بیچنے کے لیے۔
"آف سیزن ہونے کی وجہ سے سستا بھی مل رہا ہے۔"
"ٹھیک ہے آپ یہ رکھ دیں اس میں پنک یا ریڈ کلر ہے؟"
"یہ اتنا سا فراک کس کے لیے لے رہی ہو؟" اب تک خاموش کھڑے سراج دین نے سیلز مین کے پلٹتے ہی دھیمے لہجے میں پوچھا۔
"وشمہ کے لیے۔" وہ آہستہ سے بولی۔
"آپی ساجدہ کی بیٹی؟ وہ چھوٹی سی، پیاری سی؟ سچ کتنی اچھی لگے گی اس فراک میں۔" شمو سن کر خوشی سے بولی۔
"لے لوں؟" پروین نے آہستگی سے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔
"لے لو... بلکہ لے چکی ہو۔" شاہانہ بے پروائی سے اجازت دیتے ہوئے جتایا بھی گیا۔
"کیا فرق پڑتا ہے، جہاں سب کے لیے اتنا کچھ لیا ہے، ایک اس بیچاری کے لیے بھی۔ دو تین سو روپے کے لیے میں کیوں منع کرنے لگا۔" پروین کا دل اس انداز پر بجھ سا گیا۔
"یہ لیں باجی! آپ کی قسمت اچھی ہے اس ڈیزائن میں یہ سرخ رنگ کا آخری پیس بچا ہے، پیک کر دوں؟"
"نہیں رہنے دو۔" پروین نے آنسو اپنے اندر اتارتے ہوئے کہا۔ "یہ بہت بڑا ہے۔"
سراج نے بھی پوچھنے کی زحمت نہیں کی کہ اس نے لیتے لیتے وہ فراک کیوں چھوڑ دیا۔ وہ خاموشی سے باقی چیزوں کی پے منٹ کرنے لگے۔ پروین ہمیشہ کی طرح دل ہی دل میں گھٹ کر رہ گئی۔
"میں یہ فراک وشمہ کے لیے اپنی خوشی سے لے رہی تھی میاں صاحب، ترس کھا کے نہیں۔ یہ ایک تحفہ تھا جسے آپ نے عطیہ یا خیرات بنانا چاہا۔ ورنہ اس کے باپ نے اس کے لیے کسی چیز کی کمی تو نہیں رکھی ہوئی۔"
پھر اس کا دل شاپنگ میں نہ لگ سکا۔ صرف بچوں کی خوشی کی خاطر ان کی چیزیں خریدیں اور ان کی فرمائشیں پوری کیں۔ ضرورت کی وہ سب چھوٹی موٹی چیزیں جن کی لسٹ وہ راستے بھر ذہن میں ترتیب دیتی آئی تھی سب رہ گئیں۔
سراج کے ایک آدھ بار کے اصرار کے باوجود اپنی بھی کوئی چیز نہ خریدی۔ جو ان کا موڈ خراب کر گئی۔
واپسی پر وہ خاصے غصے میں نظر آ رہے تھے۔ یہ پھر اس پر گھر آ کے نکلا۔
"الٰہی خیر۔" شوکت جہاں افتاں و خیزاں اپنے کمرے سے باہر آئیں جہاں سراج دین چیزیں پٹختے ہوئے دھاڑ رہے تھے۔

"کیا ہوا ہے سراج! اچھے بھلے گئے تھے تم؟"

"مجھ سے کیا پوچھ رہی ہیں اماں جی! انہی سے پوچھ ڈالیں کیا تھا! اسے خیال ہونا چاہیے کہ ایک مرد اگر ہفتہ بھر دن جان توڑ محنت کرنے کے بعد چھٹی کا دن آرام اور سکون سے گزارنے کے بجائے اپنی فیملی کو تفریح کی غرض سے باہر لے جا کر خوار ہو رہا ہے تو اس بات کی قدر کرنی چاہیے' احسان مند ہونا چاہیے اس کا نہ کہ منہ پھلا کر بیٹھ جانا چاہیے۔"

"مگر ہوا کیا پروین! کیا ہوا ہے آخر؟"

مگر وہ کوئی جواب دینے کی بجائے ہاتھوں پہ سر گرا کے بیٹھ گئی۔ میاں کی بات پہ اس کا دل کس بری طرح ٹوٹا تھا لیکن پھر بھی وہ اس دکھ کو الفاظ کی شکل نہیں دے پا رہی تھی۔ اس نے کچھ جتایا نہیں تھا' صرف اتنا قصور تھا کہ خوب چڑھا کے اپنی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ ہنس بول نہیں سکی تھی اور اس بات کو وہ اتنا بڑھا گئے۔

اسے یہ تو محسوس ہو گیا تھا کہ وہ غصے میں ہیں لیکن گھر آتے ہی اس غصے کا مظاہرہ دیکھنے کو ملے گا اس کی توقع نہیں تھی۔ وہ ذہنی طور پہ ساس کی باز پرس کے لیے بھی تیار نہیں تھی اس لیے کوئی جواب نہ دے سکی۔

"پھر کیا بتائے گی اب۔۔۔؟ جو عورت ہر جگہ میکہ ساتھ ساتھ اٹھائے پھرنے کی عادی ہو اس کے اپنے گھر کے حالات کیسے سدھر سکتے ہیں۔"

"کیا بہن شمشاد کو بھی ساتھ لے گئے تھے تم لوگ؟"

سراج کی بات سے شوکت جہاں نے یہی نتیجہ اخذ کیا جسے سن کر وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔

"میرا دماغ خراب نہیں ہے۔"

پروین نے تڑپ کے شکایتی نظروں سے انہیں دیکھا۔

"میکہ سوار ہونے کے لیے کسی کا ساتھ ہونا ضروری نہیں ہے اماں جی! میکے اور میکے کی فکر اس کے سر پہ چوبیس گھنٹے تلوار کی طرح لٹکتی رہتی ہے۔"

"تم ہی سمجھنے کی کوشش کرو سراج! اس کے میکے کے حالات ہی ان دنوں ایسے ہیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی ان سے لاتعلق نہیں رہ سکتی' اور کیوں رہے۔ وہ اس گھر کی بہو بعد میں بنی' پہلے ان کی بیٹی ہے۔ اتنے سال تک تمہیں اس سے ایسا کوئی گلہ نہیں ہوا۔ اب اگر ہو رہا ہے تو اس کی وجہ سمجھنے کی کوشش کرو اور پروین تم! جب تمہیں پتہ ہے کہ اس کا احساس مر چکا ہے۔ اس پہ دوسروں کے جذبات اثر نہیں کرتے تو کیوں اس کے سامنے وہ ذکر کرتی ہو؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا اماں جی!" پروین نے اپنے لب کھولے۔ "میں نے صرف وشمہ کے لیے ایک تحفہ ساتھ لینا چاہا تھا۔"

شوکت جہاں کو یہ سن کر شدید صدمہ پہنچا۔ وہ کئی ثانیے تک خاموش کھڑی تاسف سے سراج دین کو دیکھتی رہیں جو بے زاری اور تنفر سے سر جھٹک رہے تھے۔

"سراج! مجھے تم سے اس چھوٹے پن کی امید نہیں تھی۔"

"چلو بات ہی ختم۔ اس عورت کو تو ٹسوے بہا کر ہمدردیاں سمیٹنا خوب آتی ہیں۔"

"وہ ذرا سی بچی۔۔۔ اس سے بھی ایسا سلوک۔ اسے اپنی سسرالی رشتے دار کی بجائے ایک عام بچی کی نظر سے دیکھو تمہارے دل میں اس کے لیے ضرور جگہ پیدا ہو گی مگر تم نے تو خوامخواہ کا بیر پال رکھا ہے پورے سسرال سے۔ کیا فرق پڑتا اگر یہ اس بچی کے لیے کچھ خرید لیتی۔ اس کا پورا حق ہے تمہاری کمائی پہ اور یہ حق بھی ہے کہ وہ اسے جیسے چاہے' جہاں چاہے خرچ کرے۔"

"پہلے اس سے پوری بات تو پوچھیں اماں جی! اس کے بعد مجھ پہ الزام عائد کریں۔ اس سے پوچھیں کیا میں نے ایک بار بھی منع کیا اس کے تحفے کو دینے سے۔۔۔۔ کسی قسم کا کوئی بھی اعتراض کیا؟ ناک بھوں چڑھا لینا تو نہیں ہے نا۔ میں نے تو اسی وقت جیب سے پیسے نکال لیے تھے مگر اسے بہانہ چاہیے اپنے میکے کی وجہ سے میرے ساتھ بدمزگی کرنے کا۔ خود ہی تو پسند کیا ہوا لباس پیک کرنے سے منع کر دیا اور منہ پھلا کے پھرنے لگی۔ منت کی کہ اللہ کی بندی اپنے ... لے لو مگر مزاج ہی نہ مل رہے تھے۔ پتہ نہیں یہ اس قسم کی حرکتیں کر کے کیا ثابت کرنا چاہتی ہے۔"

وہ بات ختم کر کے باہر نکل گئے۔ شوکت جہاں نے سوالیہ انداز میں پروین کو دیکھا۔

"کیا یہ سچ کہہ رہا ہے؟"

"اماں جی! یہ سچ ہے انہوں نے زبان سے منع نہیں کیا مگر۔۔۔ مگر آپ کبھی ان کا انداز دیکھتیں۔ جیسے کوئی جونک ... سے ہو۔"

"مگر کیا پروین!" انہوں نے شاید پوری بات نہیں سنی تھی۔

"کیا بات ہوئی کہ زبان سے منع نہیں کیا مگر انداز۔۔۔ بیٹی! اب تم مرد کا ہر انداز دیکھو گی اس کی ذرا ذرا سی بات پکڑو گی تو نباہ نہیں ہو گا تو کیا ہو گا؟ اور مرد بھی سراج دین جیسا تنگ مزاج۔"

"مگر اماں جان!"

"اور سچ پوچھو تو سراج میں مزاج کی کڑواہٹ کے علاوہ کوئی خاص قابل ذکر خامی ہے بھی نہیں۔ ایسی چھوٹی چھوٹی خامیوں سے سمجھوتہ کر لینے والی عورتوں کے گھر ہی ہنسی خوشی بسے رہتے ہیں۔ تم کیوں نہیں اس کے مزاج میں ڈھل جاتیں؟"

جواباً پروین ایک طویل آہ بھر کے رہ گئی جیسے اپنے سمجھوتوں اور مزاج کی بے بسی کی تفصیل بتانے سے قاصر ہو۔

"وہ دل کا برا نہیں ہے بس اپنی مرضی اور مزاج کے خلاف کچھ ہوتا نہیں دیکھ سکتا۔ احتیاط کیا کرو تمہارے ہی حق میں بہتر ہے۔"

"کتنی احتیاط کروں اماں جی! میں ان کے سامنے اپنے گھر والوں میں سے کسی کا ذکر تک بھی کروں' صرف ان کے ہونے کا احساس ہی میاں صاحب کا پارہ ہائی کر دیتا ہے۔"

"خیر ایسا ہمیشہ سے تو نہیں تھا۔ تمہارے بھائی نوید سے تو اس کا خاصا دوستانہ رہا ہے۔" شوکت جہاں نے اس کا یہ الزام قطعی بے بنیاد قرار دیتے ہوئے جھٹلایا۔

"اور اب انہی کی معصوم بے ضرر سی بچی سے خوامخواہ کا عناد پالے بیٹھے ہیں۔" وہ چڑ کے بولی تو شوکت جہاں نے بغور اس کا جھنجھلایا ہوا چہرہ دیکھا۔

وہ ان کا بہت لحاظ کرتی تھی اور اس سے پہلے اس نے کبھی اتنی حجت نہیں کی تھی۔ انہوں نے بھی اپنی عزت اپنے ہاتھ والے سنہرے اصول کو یاد کرتے ہوئے اس بلاوجہ کی بحث کو سمیٹنے کا ارادہ کیا۔

"برا مت ماننا بیٹی! اسے اس بچی سے دشمنی کیوں ہونے لگی' ہاں چڑ ضرور ہو سکتی ہے' وہ بھی شاید تمہارے رویے کی وجہ سے' ورنہ گھر میں اور بھی بچے ہیں اس کے اپنے سگے بچوں کے علاوہ۔ میں نے اسے کبھی کسی بچے کے ساتھ سختی سے پیش آتے نہیں دیکھا۔"

وہ اٹھتے ہوئے نہیں مبادا یہ بحث تلخی نہ اختیار کر جائے جس کا خدشہ انہیں محسوس ہو رہا تھا کہ پروین کے جواب پہ رک گئیں۔

"ان کا رویہ سب ہی کے ساتھ ایک جیسا ہوتا تو یہ گلہ میرے دل میں جگہ بناتا ہی کیوں؟ میں اسے ان کے مزاج کا حصہ جان کے تسلیم کر لیتی لیکن باقی سب کے ساتھ اتنا مشفقانہ رویہ اور وشمہ کا نام آتے ہی۔۔۔"

"بیٹا! بات کڑوی ضرور ہے مگر ہے سچ۔" نہ چاہتے ہوئے بھی وہ یہ آخری بات کرنے کو رک گئیں۔

"وہ اس کے اپنے سگے بہن بھائیوں کے بچے ہیں' اس کا اپنا خون۔ ان کے لیے جو محبت اس کے دل میں ہے وہ کسی اور کے لیے پیدا ہو ہی نہیں سکتی۔ اس قدرتی امر کو سنگدلی یا بے حسی کا نام دینا درست نہیں۔"

وہ چلی گئیں۔ اپنی دانست میں بحث ختم کر کے مگر پروین کے ذہن میں کلبلاتے سوال اب بھی اسی طرح موجود تھے۔

"اور یہی قدرتی احساس اگر میرے دل میں کسی بھی عورت کے دل میں ہو تا تب اسے کیا برا سمجھا جاتا۔ عورت کے لیے یہ ضروری کیوں سمجھا جاتا ہے کہ وہ سگے رشتوں کو خون کے رشتوں کو پس پشت ڈال کے ان رشتوں کو آنکھوں پہ بٹھائے جو کبھی اس کے نہیں ہو سکتے جیسے۔

جیسے امی جی..... جن کو میں نے ہمیشہ اپنی ماں سے بڑھ کے پایا لیکن آخر تو وہ اپنے بیٹے کی ہی ماں نکلیں۔"

☆ ☆ ☆

"منزہ نے یہ بے کار کی ضد کر کے اچھا نہیں کیا۔" جمشید نے گھر واپس پہنچ کر نڈھال انداز میں بیٹھتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"سچ پوچھیں تو مجھے بھی اس کا یہ فیصلہ پسند نہیں آیا۔"

ثنا نے تائید کی البتہ جمشید سے بڑے والے بھائی جمیل نے غیر جانب داری سے کہا۔

"وہ ہماری چھوٹی بہن ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ اب اتنی بھی چھوٹی نہیں رہی۔ بہت سمجھدار اور باشعور ہے ویسے بھی عمر سے زیادہ غم جھیلنے کے بعد انسان عمر سے زیادہ سمجھ بوجھ پالیتا ہے۔ اس نے بھی کچھ سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہو گا۔"

"وہ بے شک سمجھ بوجھ والی ہو گی بھائی جان!" ثنا نے کہا۔ "مگر یہ فیصلہ اس کی سمجھداری نہیں۔ میں صرف اس کی بھابی ہی نہیں دوست بھی ہوں۔ اچھی طرح جانتی ہوں کہ اس گھر میں سوائے مظہر کے اس کو کوئی بھی تحفظ دینے والا نہیں ہے۔ مظہر اس کی ڈھال تھا اور اس کی بے پناہ چاہت اس کے لیے سب سے بڑا سہارا۔ اب نہ ڈھال ہے نہ سہارا۔ وہ لوگ بھیڑیے ہیں بھیڑیے کھا جائیں گے اسے چیر پھاڑ کے۔"

"بہر حال ہم اسے مجبور تو نہیں کر سکتے۔" جمیل ہمیشہ سے ہر معاملے سے لاتعلق رہنے کا عادی تھا۔ ثنا کی اس منظر کشی نے بھی اس پہ خاص اثر نہیں کیا تھا۔ کلثوم البتہ خاصی متاثر نظر آ رہی تھیں۔

"اس کی ساس تو ویسے آج کل خاصی سدھری ہوئی ہے حالانکہ وہ دو دھاری تلوار ہے لیکن اس مہینے ڈیڑھ مہینے میں میں جتنی بار گئی ہوں اس کا الگ ہی رنگ ڈھنگ دیکھا ہے۔ شاید جوان بیٹے کی موت نے سارا دم خم نکال دیا ہے۔"

"بھابی! اس گمان میں مت رہیں۔ وہ کبھی بھی اپنے اصل میں لوٹ سکتی ہیں۔ میں نے منزہ کو بھی خبردار کیا کہ اس کی چاروں کی اپنائیت سے دھوکا مت کھائے اور وہ شمیم اور سب سے بڑھ کے وہ دیورانی وہ دونوں بھی ہیں۔" ثنا کے لہجے سے فکر مندی عیاں تھی۔

"میں نے تو بہت سمجھایا مگر وہ اپنی ضد پہ ڈٹی رہی۔" جمشید نے ثنا سے اچکا۔

"میں اسے اس کے حال پہ بھی تو نہیں چھوڑ سکتا۔ ٹھیک ہے اسے اپنا شوق پورا کر لینے دو جوبات ہم سب اسے نہ منوا سکیں شاید وہ فیصلہ وقت کروا دے۔ ابھی دن ہی کتنے گزرے ہیں۔ آج تو چہلم تھا مظہر کا۔"

☐ ☐ ☐ ☐
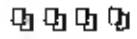
آج وہ اس کمرے میں بالکل اکیلی تھی

اپنی شادی کے تقریباً چار سالوں میں آج رات.....

اگرچہ مظہر کے بغیر جو رات اس نے گزاری تھی وہ آج سے چالیس دن پہلے گزر چکی تھی مگر پچھلے ایک ڈیڑھ مہینے میں اس کی تنہائی کا خیال کر کے کوئی نہ کوئی اس کے پاس ہوتا تھا۔

کبھی کلثوم بھابی رات کو رک جاتیں۔ کبھی ثنا دو چار دن گزار جاتی، کبھی خالہ تو کبھی اس کی ساس۔

وہ اکیلی ہوتے ہوئے بھی تنہا نہیں ہوتی تھی۔ سب کی کوشش ہوتی تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس کا دھیان بٹائے رکھیں۔

اور آج وہ بالکل اکیلی تھی۔

بالکل اکیلی۔

اتنی اکیلی کہ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔

ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے اس کا ساتھ دینے کے لیے مظہر کی کوئی یاد یا اس کی خوشبو بھی موجود نہ ہو۔

ہر طرف چنبیلی باسی پھولوں کی مہک اگر بتیوں کی تیز خوشبو اور دیگ پکوانوں کی مسالے دار خوشبو میں شاید مظہر کے جسم کی خوشبو ان میں کہیں دب گئی تھی۔

وہ خوشبو جو اتنے دنوں سے منزہ کو اس کے ہونے کا احساس دلا رہی تھی۔

وہ بے قرار روح کے انگاروں کی طرح کمرے میں ادھر ادھر پھرنے لگی۔ پھر روتی ہوئی سوہا کے نزدیک رک گئی۔ وہ بیڈ پہ دائیں سوئی ہوئی تھی جہاں سونے کی عادی تھی یعنی بالکل درمیان میں دائیں جانب مظہر سوتا تھا اور بائیں جانب منزہ۔

اس وقت دائیں جانب گاؤ تکیہ رکھا تھا اس نے تاکہ سوہا کروٹیں لیتی ہوئی بیڈ سے نیچے نہ جا گرے۔ منزہ نے الماری کھولی۔

مظہر کی الماری جس میں بہت سے استری شدہ کپڑے ہینگر میں لٹکے ہوئے تھے۔ کچھ تہ لگے ہوئے رکھے تھے اس نے وہ بلیک کوٹ نکالا جو مظہر نے وفات سے پہلے آخری بار اس کے ساتھ ڈنر پہ جاتے ہوئے پہنا تھا۔ یہ اب تک ڈرائی کلین ہونے نہ جا سکا تھا۔

منزہ نے وہ کوٹ ہینگر سے اتار کر گاؤ تکیے پہ پھیلایا اور دو قدم پیچھے رک کر غور سے دیکھا۔

پھر بیڈ کے نیچے سے اس کے وہ جوتے نکالے جو اس نے ایکسیڈنٹ کے وقت پہنے ہوئے تھے مظہر کی عادت کے عین مطابق اس نے جوتے کمرے میں ادھر ادھر پھینکے۔

موزے بھی یہاں وہاں گرا دیے۔ اس کے بعد وہ پھر سے کھڑی ہو کے کمرے کا جائزہ لینے لگی۔

ابھی بھی اس کے چہرے سے مکمل اطمینان نہ تھا۔ پھر وہ بھاگ کے واش روم گئی۔ تولیہ بھگو کے لائی اور بیڈ کے ایک سرے پہ گول مول کر کے پھینک دیا۔

مظہر کے واش روم کے سلیپر پانی سے بھرے ہوئے لا کے کارپٹ پہ رکھے۔ ڈریسنگ ٹیبل سے اس کا فیورٹ کلون اٹھا کے کمرے میں اسپرے کیا۔

اب وہ سائڈ دراز سے اس کے سگریٹ کی ڈبیا اور لائٹر نکال رہی تھی۔ سگریٹ سلگا کے اس نے ایش ٹرے میں رکھا۔ جیسے جیسے سگریٹ سلگتا جا رہا تھا دھواں پھیلتا جا رہا تھا اور کمرے کی فضا میں ایک مانوس سی مہک پھیل رہی تھی۔

منزہ نے منہ اوپر کر کے ایک گہرا سانس بھرا۔ اب وہ مطمئن نظر آ رہی تھی۔ ایک آسودہ سی مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ نظر آ رہی تھی اور یہ مسکراہٹ اتنے عرصے کے بعد اس کے چہرے پہ بہت اجنبی سی لگ رہی تھی۔

"کہاں جا رہی ہو امی؟"

شمیم پہلے تو ماں کو کپڑے بدلتے دیکھتی رہی پھر اٹھ کے چپل پہن کے باہر نکلتے دیکھا تو پوچھنے لگی۔

"منزہ کے کمرے میں۔"

"کیوں؟" وہ ٹھٹک کے بولی۔

"آج وہ اکیلی ہے بے چاری۔"

"اکیلی کہاں ہے سوہا بھی تو ہے۔"

"وہ تو ابھی بچی ہے..... اور سوہا بھی تو ہے۔ اکیلی تو میں ہو جاؤں گی۔"

"تو اس اکلاپے کا درد کیا جانے..... اور اللہ کرے نہ ہی جانے۔" نصرت کے لہجے میں درد تھا۔

"حجاب کے کمرے میں چلی جا اگر ڈر لگ رہا ہے تو۔"
وہ تسنیم کے مزاج کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے چلی گئی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے لیے ہاتھ اٹھایا مگر پھر دروازہ
خراب ہونے کے خیال سے رک گئی۔ ہاتھ کا دباؤ سا پایا تو دروازہ کھل گیا۔
اندر زیرو پاور کا بلب جل رہا تھا۔ باہر روشنی سے آنے کی وجہ سے اسے صاف نظر نہیں آیا مگر ہولے عجیب
احساس ہوا تھا اسے۔ بے چین کر گیا۔ اس نے جلدی سے آگے بڑھ کے لائٹ آن کی۔
اندر کا منظر دیکھ کے وہ بے ساختہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے رہ گئی۔
"ہائے میرے ربا....." وہ سینے پہ ہاتھ رکھ کے بے ساختہ کہہ اٹھی۔
پورے کمرے میں مظہر کے ہونے کا احساس سرا سر رہا تھا۔
اس مظہر کے ہونے کا احساس جس کے نہ ہونے کا یقین وہ کئی راتوں سے خود کو دلا رہی تھی اور بھی ...
یاور کراتے کراتے اٹھ کے یہاں تک آئی تھی۔
ہر جانب مظہر کی خوشبو پھیلی تھی۔
اس کے سگریٹ کے دھوئیں کی۔
اس کے استعمال میں رہنے والے باڈی ٹانک کی، کلون کی، آفٹر شیو لوشن کی.....
اس کے کپڑے ہر جگہ بکھرے تھے۔
بیڈ پہ کوٹ..... بیڈ کے نیچے شوز.....
کارپٹ پہ موزے.....
صوفے پہ ٹائی..... صوفے کے ساتھ باتھ روم سلیپر.....
وہ بھی لاپروائی سے بکھرے ہوئے۔
بالکل اسی طرح جیسے بکھرے ہوئے پھیلے پیچ و تاب کرتے پرے کمرے کے قالین پہ لانے کا عادی تھا۔
اور منزہ..... وہ بیڈ کے بائنتی پہ سر رکھے نیچے بیٹھی تھی۔ اس نے پلکیں موند رکھی تھیں مگر ان کی ہلکی
لرزش اور لبوں پہ بھی بد ظلم تو بھی کبھی گہری ہوتی، بیکھی سی مسکان ظاہر کر رہی تھی کہ وہ سو نہیں رہی۔
اس نے اپنے ہاتھوں میں مظہر کی شرٹ بھینچ رکھی تھی جس کا کالر اس کے لبوں سے مس ہو رہا تھا۔
ایک گہری سانس لے کر جیسے اس کالر سے اٹھنے والی مہک کو اپنے اندر سمو رہی تھی۔
نصرت بے قراری سے اندر لپکی اور اسے شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالا۔
"منزہ..... نی منزہ! ہوش کر۔"
دو تین بار بری طرح جھنجھوڑنے کے بعد اس کے ماتھے پہ ہلکی سی شکن نمودار ہوئی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ
غائب.....
اس نے کسمسا کر نصرت کے ہاتھ ہٹانے کے لیے اپنے شانے جھٹکے مگر نصرت نے اسے تقریباً ہلا ڈالا۔
"نی شودائن..... ہوش کر۔"
منزہ نے بمشکل آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ اس کی مخمور آنکھوں میں نجانے کیسا سحر تھا کہ نصرت
کو زبردست خوف نے گھیر لیا۔ اس کے پورے بدن نے ایک جھرجھری لی تھی۔ وہ خوف زدہ نگاہوں سے
آنکھوں کے مست مست سرور اور ہونٹوں کی پراسرار مسکراہٹ کو دیکھتے گئی۔
"منزہ..... منزہ! تیری طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟"
"ششش....." منزہ نے ہونٹوں پہ انگلی رکھ کے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "بڑی کچی نیند ہے ان کی۔"
اس کی نظروں کی طرح اس کے لہجے اور آواز میں بھی خمار جھلک رہا تھا۔ شاید وہ اس وقت اپنے ہوش میں
تھی۔ "نہیں جھلیے! اس دفعہ بڑی گوڑی نیند وے سویا ہے میرا پتر۔" نصرت دوپٹے سے آنکھیں خشک کرتے

بولی۔
"ابھی..... تھک گئے ہیں۔" وہ اس کی بات پہ دھیان دیے بغیر بیڈ پہ رکھے گاؤ تکیے پہ پھیلے کوٹ کو اپنی انگلیوں سے
سہلانے لگی۔
"میری چاکلیٹ لینے بہت دور چلے گئے تھے بہت دور۔ بہت ساری لائے ہیں۔ کہہ رہے تھے فریج میں رکھ
لینا پتہ نہیں پھر میں دوبارہ جا سکوں یا نہیں۔"
اسی بے ہوشی کے انداز میں بات کرتے کرتے اچانک وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔
شاید اپنی ہی کوئی بات اسے ہوش کی دنیا میں کھینچ لائی تھی۔ ہوش کی بے درد اور سفاک دنیا۔ جو اسے وہ سب یاد
دلا رہی تھی جو اس کے رکے ہوئے آنسوؤں کے بند توڑ رہی تھی۔
"امی! کیا انہیں پتا چل گیا تھا؟"
وہ..... رندھی آواز میں پوچھنے لگی۔
"کیا پتا....." نصرت جواب میں سرد آہ بھر کے رہ گئی۔
"پتا تھا نہیں..... سب پتا تھا۔" اس نے خود ہی اپنے سوال کا جواب دیا۔ "وہ جانتے تھے، اسی لیے اس دن فون
پہ ایسی باتیں کر رہے تھے۔" وہ نصرت سے ایسے اپنے دل کا حال کہہ رہی تھی جیسے وہ اس کی سگی سہیلی ہو ورنہ پہلے
معمول کی عام بات چیت بھی وہ اس کے ساتھ بہت محتاط ہو کے کیا کرتی تھی۔
"کاش! مجھے پتا ہوتا، پہلے سے پتا ہوتا تو میں....." نصرت نے اپنی حسرت بیان کی۔
"تو کیا آپ اسے روک لیتیں؟"
"ناں پتر! اللہ کا بلاوا آیا ہو تو کون روک سکتا ہے کسی کو۔ لیکن مجھے پتا ہوتا تب تو میں..... میں اس سے....."
نصرت کو ایک بار پھر ساری تلخیاں یاد آ گئیں۔ ہمیشہ خود کو مظلوم ثابت کرنے کی کوشش کرنے والی کو اس وقت
ہر معاملے میں زیادتی اپنی نظر آ رہی تھی۔
"تیرے سے تو وہ بڑا خوش گیا ہے، بڑا راضی۔ تجھے تو سکون ملنا چاہیے۔" وہ رشک سے اسے دیکھنے لگی۔
"وہی تو نہیں ملتا۔" منزہ کے لبوں نے نامحسوس سی سرگوشی کی۔
"تو پتر اولاد میں دل لگانے کی کوشش کر۔"
"اس میں بھی وہی نظر آتے ہیں۔" نصرت کے مشورے پہ اس نے بے چارگی سے کہا۔
"سویرے میں تجھے تیرے بھائی کے گھر چھوڑ آؤں گی۔"
اس دوسرے مشورے پہ وہ کرنٹ کھا کے اچھلی تھی۔
"کیوں..... آپ مجھے گھر سے نکال رہی ہیں؟ یہاں سے بھیج رہی ہیں؟ ہمیشہ کے لیے نکال رہی ہیں؟"
وہ چلانے لگی تو نصرت گھبرا کے وضاحتیں دینے لگی۔
"نہ نہ..... نہیں..... میرا یہ مطلب نہیں تھا..... میں تو....."
مگر وہ اس کی کوئی بھی وضاحت سننے کے بجائے کسی پارے کی طرح کمرے میں بکھر رہی تھی۔ آنسوؤں کی لڑیاں
اس کی آنکھوں سے اور بے ربط الفاظ اس کے لبوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر ادا ہو رہے تھے۔
"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی..... یہ گھر..... ہاں گھر میرا نہیں ہو گا نہ سہی..... گھر آپ کا ہے مگر یہ کمرہ میرا
ہے، میرے مظہر کا ہے..... وہ لائے تھے مجھے یہاں..... میں یہاں سے نہیں جاؤں گی۔"
"میری بات تو سن....."
نصرت اپنے تھل تھل کرتے وجود کے ساتھ اسے پکڑنے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی مگر وہ کہاں ہاتھ آنے
والی تھی۔ ایک وحشیانہ سے جنون کے ساتھ وہ کمرے میں یہاں سے وہاں ہو رہی تھی۔
"یہاں پہ وہ سوتے تھے۔" وہ بیڈ پہ سے تکیے اٹھا کے بھینچنے لگی۔
"ان تکیوں میں ان کے بالوں کی مہک ہے۔"

"اور یہاں... یہاں بیٹھتے تھے... ٹی وی دیکھتے تھے۔"
اب وہ صوفے پہ ایک سیکنڈ کے لیے بیٹھی تھی پھر اٹھ کے کھڑکی تک آئی... پردے ہٹائے۔
"اور یہاں کھڑے ہو کر..."
"یہ کیا شور مچا رکھا ہے آدھی رات کو۔"
کمرے کا دروازہ دھڑ سے کھول کر اچانک اصغر اندر داخل ہوا اور ناگواری سے پوچھنے لگا۔ اس کے عقب میں ربا کھڑی نظر آ رہی تھی۔ اپنے چہرے پہ وہی ازلی جی کسانے والی تلخ مسکراہٹ لیے۔ دونوں کی آنکھوں سے کہیں یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ وہ سو رہے تھے اور منزہ کے واویلے نے ان کی پرسکون نیند میں خلل ڈالا ہے۔ بھی آدھی آدھی رات تک جاگنے کی بیماری تھی ربا کو... اور اصغر کو اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ وہ اس وقت سنگھار کیے ہوئے تھی۔
"دیکھو اصغر... یہ امی... امی مجھے یہاں سے نکال رہی ہیں۔" منزہ فریاد کرتی اس کے نزدیک آئی۔
اس کی بات سن کر ربا واضح انداز میں چونکی تھی۔ اس کے ماتھے پہ ایک پرسوچ سی شکن پیدا ہوئی تھی۔
اصغر سوالیہ انداز میں ماں کو تکنے لگا جو بے چارگی سے نفی میں سر ہلا رہی تھی۔
"میں یہاں سے نہیں جاؤں گی... یہ مظہر کا گھر ہے... میں کیسے جا سکتی ہوں۔ وہ اکیلے ہو جائیں گے۔ کیسے چھوڑ جاؤں انہیں۔"
وہ بلک بلک کر روتی اصغر کا گریبان تھام کے کہہ رہی تھی۔ روتے روتے اس نے اپنا سر اصغر کے سینے سے ٹکا دیا۔ بالکل کسی معصوم یتیم بچے کی طرح جو ہمدردی پاتے ہی کسی سے لپٹ جاتا ہے۔ اصغر دل کا برا نہیں تھا... بھی منزہ کے لیے وہ ابتدا سے ہی باقی گھر والوں کی نسبت نرم گوشہ رکھتا تھا۔ اس کے آنسو دیکھ کے وہ پگھل گیا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ منزہ کے سر پہ ٹھہر گیا۔
"گھبراؤ نہیں! کوئی نہیں بھیج سکتا تمہیں یہاں سے... یہ صرف مظہر کا ہی نہیں، تمہارا اور سوہا کا گھر بھی ہے۔ میرے ہوتے ہوئے کون نکال سکتا ہے تمہیں۔"
ربا سر سے پیر تک سلگ گئی۔ اس کے بنے سنورے وجود سے چنگاریاں نکلنے لگیں۔ میک اپ سے لتھڑے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو کے بگڑ گئے۔
"یہی بات تو میں اس بدنصیب کو سمجھا رہی تھی۔" نصرت نے کہا مگر ربا تڑخ کر بولی۔
"سمجھانے والی بات تو کوئی سمجھاتا نہیں۔"
"کیا مطلب؟ کون سی بات؟"
"تمہی کا کیا نہیں ہے یہ تمہاری بدنصیب جو جانتی نہ ہو کہ یہ عدت سے ہے۔"
اس نے گم صم کھڑی منزہ کو زہریلی نظروں سے تکتے ہوئے کہا جو اصغر کا بازو زور سے بھینچے کھڑی تھی اور اس کی نگاہیں کارپٹ کے نقش و نگار کو گھور رہی تھیں۔ لب نیم وا تھے۔ آنسو چہرے پہ ٹھہر چکے تھے۔
"مجھے تو دن رات اصیل نہ ہونے کے طعنے دیتے نہیں تھکتے تم سارے کے سارے اور خود ان شریف زادی کے لچھن دیکھو۔ عدت میں بھی چین نہیں... نہ گلے میں دوپٹہ ہے نہ آنکھ میں شرم۔ کیسے چپک کے کھڑی ہے بدبخت!"
جس کے متعلق یہ ہرزہ سرائی کی گئی تھی وہ جیسے سن کے بھی نہ سن رہی تھی۔ اس کی حالت میں سر مو فرق نہ آیا تھا جبکہ اصغر اچھل کے رہ گیا تھا۔ بے ساختہ اس نے اپنا ہاتھ نہ صرف اس کے سر سے ہٹایا تھا بلکہ اپنا بازو ایک جھٹکے سے چھڑا لیا تھا۔
اور نصرت... وہ تو تھرا کے رہ گئی تھی۔
اس نے ان تینوں سالوں میں منزہ کو کون سا چرکہ نہیں لگایا تھا۔ کون سے بھلے نہیں چھوئے تھے

جلانے کے لیے کون سا حربہ نہیں آزمایا تھا مگر اس کے کردار پہ چھینٹے اڑانے کی اس کی ہمت نہ ہوئی تھی۔ بہت ہوا تو چھپ کے شادی کرنے کا طعنہ دے دیا۔
"خدا کا خوف کر بے حیا عورت!" وہ ربا کے لتے لینا چاہتی تھی مگر اس نے موقع نہ دیا۔
"کیوں کوئی غلط بات کی ہے میں نے؟ تمہارا کیا خیال ہے سارے اصول تم لوگوں کو پتا ہیں؟ میں بھی پیدائشی مسلمان ہوں۔ بچوں میں اذان ہمارے ہاں بھی دی جاتی ہے۔ سپارہ ہمارے ہاں بھی پڑھایا جاتا ہے۔ پتا ہے مجھے دین کی ساری باتوں کا۔ کیا یہ عدت میں نہیں ہے؟ کیا اس کا اصغر کے سامنے آنا، اس کے سینے سے لگ کر رونے کے ڈرامے کرنا یہ سب غلط نہیں ہے؟"
وہ کمر پہ ہاتھ رکھے پوچھ رہی تھی۔ اصغر اپنی جگہ چور سا بن گیا۔
"ہونہہ..." نصرت نے کہا۔ "ہاں یہ عدت میں ہے مگر عدت میں بیٹھی عورت پہ اتنے گندے الزام لگانے سے پہلے کچھ تو سوچو۔ وہ چالیس دن سے اپنے کمرے میں بند ہے۔ کمرے سے نکلتی ہے تو منہ سر لپیٹ کے۔ تپ چڑھا تو دوائی تک لینے ڈاکٹر کے پاس نہیں گئی تھی۔ یہ پاس کھڑا ہے تیرا بندہ، اس سے پوچھ، سامنے آئی تھی اس کے؟ آج یہ ہوش میں نہیں ہے، دماغ پھرا ہوا ہے اس کا... اس کی حالت تو دیکھ... اسے اپنا ہوش نہیں ہے۔ دین دنیا کا کیا ہوش ہوگا۔ اس حالت میں تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے۔ یہاں پر تیرے جیسے بندے نہیں کرتے۔"
"ہونہہ... ڈرامے... ہوش میں نہیں ہے۔" وہ منہ بگاڑ کے نصرت کی نقل کرنے لگی۔ "نشہ شروع کر دیا ہے غم میں؟"
"ربا...!" اصغر ضبط نہ کر سکا۔
خلاف توقع اس للکار پہ وہ شاک میں آ گئی۔ اس کا خیال تھا اس نے اصغر کو پوری طرح مٹھی میں کر لیا ہے۔ اب وہ اس کے آگے دم نہیں مارے گا۔ اس لیے پیر پٹختی ہوئی چلی گئی۔
اصغر میں بھی بس اتنا ہی حوصلہ تھا۔ اسے پلٹتے دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ابھی کچھ دیر پہلے تو منایا تھا۔ وہ بھی الٹے پاؤں اس کے پیچھے گیا۔
نصرت نے منزہ پہ توجہ دی۔
وہ اب بھی اسی حالت میں کھڑی تھی۔ بازو نیچے لٹک رہے تھے۔ ابرو اوپر چڑھے ہوئے تھے۔ خالی خالی نظریں نیچے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔
نصرت کو اس کے بارے میں تشویش ہونے لگی۔ اس سے پہلے کے دنوں میں اس کا رویہ ایسا نہ تھا۔ دکھ اور غم کے اثرات تو فطری تھے لیکن وہ یوں ہوش سے بیگانہ نہیں ہوتی تھی۔
وہ اس کا ہاتھ تھام کے بیڈ تک لائی۔
منزہ کسی معمول کی طرح چلتی اس کے پیچھے آئی۔ نصرت نے اسے پکڑ کے بیڈ پہ لٹایا، وہ لیٹ گئی۔
اس کا تکیہ درست کیا، چادر اوڑھائی۔ وہ اب بھی پوری آنکھیں کھولے دیکھ رہی تھی۔
کیا دیکھ رہی تھی؟ یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔
شاید وہ خود بھی نہیں۔
"میں نے ایسے ہی ایک بات کی تھی کہ سویرے تجھے تیرے بھائی کے گھر چھوڑ آتی ہوں۔ میرا خیال تھا وہ چار دن اپنوں میں رہے گی، تیرا دل بہلے گا، دھیان بٹے گا اور تو نے الٹا مطلب لے لیا لیکن... لیکن اب سوچ رہی ہوں، یہ الٹا مطلب ہی صحیح ہے۔ تجھے وہیں رہنا چاہیے۔ ادھر اب تیرا کون ہے۔"
وہ اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

* * * *

"بات مت کریں مجھ سے۔"
ربا نے نخوت سے اصغر کا ہاتھ جھٹکا۔

"دیکھو میری رانی! تمہیں بھابھی کو ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔"

اس نے احساس دلانا چاہا تو ربیتا نے پینترا بدلا اور ساری خفگی اور نخرے بالائے طاق رکھتے ہوئے اس کے شانے سے اپنا سر ٹکایا اور کچھ آنسو بہائے۔

"تم صحیح کہتے ہو' مجھے یہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔"

اتنی جلدی اسے پسپائی اختیار کرتے دیکھ کر اصغر کا سینہ فخر سے پھول گیا۔ اسے اپنی مردانگی پہ ناز ہونے لگا۔ اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب مرد سب سے زیادہ احمق پن کا ثبوت دیتا ہے۔ اپنی مردانگی کی دھاک بٹھانے کے زعم میں وہ دماغ کے سارے دروازے بند کر لیتا ہے۔ ان ہی بند دروازوں پہ قفل لگاتے ہوئے ربیتا نے اپنی [illegible] ظاہر کی۔

"مجھے منزہ سے ہمدردی ہے بلکہ ترس آتا ہے اس جوان جہان بیوہ پہ۔ لیکن اس وقت میں نے جو کچھ کہا تو میں نے کہا تھا' نہ منزہ کو سنایا تھا۔ وہ بات ایک چاہنے والی بیوی نے ایک دوسری عورت کے لیے کی تھی۔"

"بھابھی دوسری عورت نہیں ہے' وہ بیچاری بڑی مسکین اور شریف' بے زبان عورت ہے۔ اس کے بارے میں ایسا سوچنا بھی مت۔"

"میں سوچنا نہیں چاہتی لیکن تمہارے عشق نے میری مت ماردی ہے اصغر! ساری سمجھ' سوچ تو تم میں ڈوبی ہے۔ بس مجھ سے نہیں برداشت ہوا جب اس نے تمہیں چھوا۔"

اصغر کا سینہ اور چوڑا ہو گیا۔ اس کی مردانگی اب چاہے جانے کے تمغے سے بھی سج گئی تھی۔

"وہ میرے لیے امی اور تسنیم کے جیسی ہے۔"

"میں جانتی ہوں' اسی لیے میں نے تمہیں تو ایک لفظ بھی نہیں کہا۔ تم پہ پورا اعتبار ہے مجھے۔۔۔ ہاں مگر کسی پہ نہیں۔ میں کسی کو موقع نہیں دوں گی کہ وہ تمہیں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے۔"

اصغر نے یہ ڈائیلاگ کہے تو کئی بار تھے اور نجانے کتنوں سے کہے تھے مگر سنے پہلی بار تھے۔ وہ ہواؤں میں اڑنے لگا' اور اس پرواز کے دوران بھی اس نے ہلکی سی مزاحمت کرنے کی جرأت کی۔

"مگر بھابھی۔۔۔! تم اس کے بارے میں ایسا مت سوچو۔ میں تو تمہیں کہوں گا کہ اس سے بنا کے رکھو۔ پورے گھر میں ایک وہی تو ہے جو دل کی صاف اور نیت کی کھری ہے۔ ہمیشہ مشکل وقت میں تمہارے کام آئے گی۔"

ربیتا نے تسلی دیتی مسکراہٹ کے ساتھ اثبات میں سر ہلا دیا مگر دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

"مشکل وقت۔۔۔؟ مشکل وقت میں ساتھ دیتا ہے صرف اور صرف پیسہ۔۔۔ یا پھر طاقت اور حیثیت۔ ان تینوں میں سے کیا ہے جو تمہاری اس مسکین بیوہ بھابھی کے پاس ہو گا؟ میرا کیا دماغ خراب ہے جو میں فالتو لوگوں سے دوستیاں گانٹھنے اور بہناپے جوڑنے میں اپنی جوانی گنواؤں۔ میں تو الٹا ہر اس شخص کے قدم اکھاڑ دوں گی جو پیسہ' طاقت اور حیثیت حاصل کرنے کے میرے مقصد میں روڑے اٹکائے گا پھر چاہے وہ تمہاری بھابھی ہو' تمہاری ماں یا تمہاری بہن۔۔۔ یا پھر خود تم۔"

☆ ☆ ☆

"یہ کیا کہہ رہی ہو ثنا؟" جمشید بہن کا حال بیوی کی زبانی سننے کے بعد ششدر تھا۔

"میں بھی یقین نہیں کر رہی تھی۔ اور پھر اس کی ساس' اس پہ تو مجھے ویسے ہی اعتبار نہیں تھا اس لیے خود دیکھ آئی ہوں اور یقین کیجیے' منزہ کی حالت واقعی بہت تشویش ناک ہے۔"

"لیکن اسے یکایک ہو کیا گیا؟ اگر صدمے نے اس کے ذہن پر اثر ڈالا ہے تو یہ ڈیڑھ ماہ بعد ہی کیوں؟ ایسا ردعمل اسے مظفر کی وفات کی خبر سنتے ہی دکھانا چاہیے تھا۔"

"ہم سمجھ رہے تھے' اس نے خود کو سنبھال لیا ہے مگر در حقیقت خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ہی اس کا یہ حال ہوا ہے اور ڈیڑھ ماہ بعد کیوں ہوا ہے تو شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ مظفر کی کمی کا احساس گزرتے وقت کے ساتھ شدت اختیار کرتا جا رہا ہے۔ ہر آنے والا دن اسے تنہا ہونے کا احساس دلا رہا ہے۔"

"وہ تنہا نہیں ہے۔ یہ تنہائی اس نے خود منتخب کی تھی۔ اب میں اس کی ایک نہیں سنوں گا اور اسے یہاں سے لے جاؤں گا۔ پتا نہیں وہ بے رحم لوگ اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے ہوں گے جو وہ اس حال تک پہنچ گئی۔"

"کوئی کچھ نہیں کر رہا۔" ثنا نے گہری سانس لے کر بتایا۔ "جس جس نے جو جو کرنا تھا' مظفر کی زندگی میں کر لیا۔ اور مظفر کی محبت کے سہارے منزہ نے ہنسی خوشی سب کچھ جھیل بھی لیا۔ اب کسی میں دم خم نہیں رہا۔ اس کی ساس بیٹے کے غم میں ادھ موئی ہو گئی ہے۔ [illegible] یہ وہ عورت ہے جس نے منزہ کا جینا حرام کر رکھا تھا۔ اس کی منزہ کے لیے محبت اور فکر مندی میں بناوٹ نہیں ہے اور یہ بڑھاپے کی محبت جتا کر اسے ثابت بھی کیا کرتی ہے۔ وہ بدل چکی ہے لیکن پھر بھی میں یہ کہوں گی کہ منزہ کی ذہنی حالت اس گھر میں رہ کے کبھی بھی بہتر نہیں ہو سکے گی۔ بلکہ دن بدن خراب ہوتی جائے گی۔"

"میرا ایک دوست بہت اچھا سائیکاٹرسٹ ہے۔ میں اس سے بات کرتا ہوں۔ پھر ہم منزہ کو لے آتے ہیں۔ اس کا علاج کتنا بھی مہنگا ہو۔ ہم ضرور کرائیں گے۔ میں اس عمر میں اسے ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ وہ میری ایک ہی بہن ہے۔ میری سب سے چھوٹی بہن' میرے ماں باپ کی نشانی۔" جمشید کی آنکھیں بھر آئیں۔

ثنا نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے تسلی دی۔

"حوصلہ رکھیں۔ وہ جلد صحت یاب ہو جائے گی ان شاء اللہ۔ ہم اس کے علاج اور دیکھ بھال میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھیں گے۔ آپ دیکھیے گا۔ وہ دوبارہ زندگی کی جانب لوٹے گی' ہمارے لیے نہ سہی' اپنی بچی سوہا کے لیے۔"

اور اسی شام وہ دونوں منزہ کو لے آئے' وہ اس وقت اس کیفیت میں نہیں تھی کہ آنے سے انکار کرتی یا مزاحمت کرتی۔ نصرت ہی اس کا سامان اور سوہا کی چھوٹی موٹی ضرورت کی چیزیں پیک کرتی رہی۔

"یہ منزہ کا اپنا گھر ہے۔" جاتے ہوئے اس نے جمشید اور ثنا کو روک کے کہا۔ "اور سوہا کا بھی۔ وہ میرے بیٹے کی نشانی ہے' مجھے اس میں اپنا بیٹا نظر آتا ہے۔ اگر یہاں سے جانے میں منزہ کی بھلائی نہ ہوتی تو میں کبھی اسے نہ جانے دیتی۔ جب اس کا دل ٹھہرے گا' صبر آئے گا تو اسے بتانا' یہ گھر اب بھی اس کا ہے۔ مظفر کا کمرہ اب بھی اور ہمیشہ اس کے لیے خالی رہے گا۔"

ثنا نے خاموشی سے سر ہلا دیا۔

سیڑھیوں پہ کھڑی ربیتا نے انہیں نکلتے دیکھ کے اطمینان بھرا سانس لیا اور واپس اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔

منزہ صدمے کے زیر اثر تھی اور کئی راتوں کی بیداری اور مسلسل ڈپریشن نے اس کی دماغی حالت پہ اثر ڈالا تھا' قابل ڈاکٹروں کی توجہ' بہترین علاج' سکون آور دواؤں کے استعمال اور سب سے بڑھ کے ثنا اور جمشید کی بھرپور محبت نے اسے دنوں میں صحت یابی کی جانب لوٹنا شروع کر دیا۔

دوسرے تیسرے دن بڑے بھائی جان بھی کلثوم بھابھی کے ساتھ آ جاتے' کبھی مل جل کے تفریح کا پروگرام بن جاتا۔ بڑے بھائی جان کے پاس گاڑی تھی۔ وہ بچوں کو اور منزہ کو ساتھ بٹھا لیتے' جمشید اور ثنا اپنی موٹر سائیکل پہ پیچھے پیچھے چلتے۔ اس کا دل جانے کو نہ بھی چاہ رہا ہوتا تو اتنے پیار کرنے والے بھائیوں بھابیوں سے زیادہ دیر تک انکار نہ کر پاتی۔ سوہا یہاں آ کے خوش رہنے لگی تھی۔ اور اس کی خوشی دیکھ کر منزہ کو بھی اپنے غم بھولنے لگتے۔

اگرچہ رات کی تنہائیاں بڑی ظالم ہوتیں' سارے دن کا بہلایا ہوا دل باغی ہونے لگتا۔ مگر اس سے پہلے کہ وہ نئے سرے سے اپنے سارے زخم ادھیڑ کر خود کو پھر سے ڈپریشن میں مبتلا کرتی' مسکن ادویات اپنا اثر دکھاتیں اور نیند کی وادی میں اتر جاتی۔

وہ ایسی ہی ایک صبح تھی جب وہ خلاف معمول ذرا جلدی جاگ گئی ورنہ دوا کے زیر اثر آج کل وہ دیر تک سوئی رہتی تھی۔

بچے اسکول جا چکے تھے۔ سوہا کہیں نظر نہیں آرہی تھی۔ وہ سوہا کو ڈھونڈتے ہوئے جمشید کے کمرے تک آئی' اس کی آواز باہر کوریڈور تک آرہی تھی۔ شاید وہ آفس جانے کے لیے نکلنے ہی والا تھا۔

"تم اخراجات بڑھتے جا رہے ہیں' تنخواہ پوری نہیں پڑتی۔ اس پہ منزہ کے علاج کے لیے جو قرض اٹھایا' وہ بھی چکانا ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہ سب کیسے ہوگا؟"

اس کی تشویش میں ڈوبی آواز سن کر اس کے بڑھتے قدم تھم گئے۔

"میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ قرض مت لیں۔ میں کوئی زیور بیچ دیتی ہوں۔"

منزہ نے دانتوں میں لب دبا کے وہیں دیوار سے ٹیک لگالی۔ بڑے بھائی جان کی نسبت جمشید کے حالات ذرا نرم تھے مگر نوبت قرضے اور زیورات بیچنے تک آجائے گی' اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔ اس نے حساب لگانے کی کوشش کی کہ وہ اپنی چند ہزار کی تنخواہ میں بچوں کی فیس' مکان کا کرایہ' بجلی پانی کے بل اور کچن کے اخراجات پہ خرچ کرنے کے بعد کتنا بچا پاتے ہوں گے۔ وہیں کھڑے کھڑے اسے احساس ہوگیا کہ بچنا تو در کنار شاید یہ تنخواہ ان کے کچن کے اخراجات کے لیے بھی ناکافی رہتی ہوگی۔ اس پہ اس کا اور سوہا کا اضافی خرچہ' اس کا مہنگا علاج' دوا' پھل' سوہا کا دودھ' ڈائپرز' کھلونے' اور اس کا دل بہلائے رکھنے کے لیے اکثر ویشتر باہر کے تفریحی پروگرام' پتہ نہیں انہوں نے خود کو کتنا زیر بار کیا ہوگا۔

اسے اپنی بے حسی پہ غصہ آنے لگا۔ وہ ان کے حالات سے ناواقف نہیں تھی۔ مگر مظہر نے اسے کبھی کسی چیز کی تنگی نہ ہونے دی تھی۔ اس کی تنخواہ اچھی خاصی تھی' جس میں سے اسے گھر کے کسی خاص خرچے کے لیے کچھ نہ نکالنا ہوتا۔ سوائے کچن کے اخراجات کے لیے ایک مخصوص رقم ماں کو دینے کے علاوہ۔ باقی بل وغیرہ سب اصغری ادا کرتا۔ ہر چیز کی فراوانی تھی۔ خوشحالی تھی۔ وہ دونوں ہاتھوں سے پیسہ اس پہ اور سوہا پہ لٹاتا تھا۔ منزہ تو جیسے تنگ دستی کا مطلب ہی بھول گئی تھی۔ اس کا دھیان اس جانب گیا ہی نہیں کہ اس کے اضافی خرچے کی وجہ سے بھائی کو مشکلات کا سامنا بھی کرنا پڑ سکتا ہے۔

"آپ اس دوسری ملازمت کے بارے میں کیوں نہیں سوچتے۔ وہاں کی تنخواہ یہاں سے قدرے زیادہ ہی ہے۔"

ثنا کی آواز پہ اس نے دوبارہ کان کمرے کی طرف لگائے۔

"مگر اس ملازمت کا کوئی بھروسہ نہیں۔ مستقل بنیاد پہ نہیں دے رہے۔ میں صرف دو ہزار زائد کی خاطر اتنا بڑا رسک نہیں لے سکتا۔ خدانخواستہ یہ ملازمت بھی ہاتھ سے نہ نکل جائے۔ یہاں میں گیارہ سال سے کام کر رہا ہوں اور اپنی محنت اور ایمان داری سے میں نے اپنی ایک ساکھ بنائی ہے۔ اب تو ترقی کے چانسز بھی بہت زیادہ ہیں۔ اور جن ملازمین کو کمپنی کویت بھیجنے والی ہے۔ اس لسٹ میں سب سے اوپر میرا نام ہے۔"

"یہ تو میں پچھلے دو سال سے سن رہی ہوں۔"

"میں جلد بازی کر کے اتنا سنہری موقع نہیں گنوا سکتا۔ کچھ سختی ہے۔ اللہ نے چاہا تو ٹل جائے گی۔"

"ان شاء اللہ" ثنا نے پورے یقین سے کہا۔

وہ دبے پاؤں واپس اپنے کمرے میں لوٹ آئی اور بیڈ کے نیچے سے بیگ نکال کر اپنا اور سوہا کا سامان پیک کرنے لگی۔

اس نے یہاں سے جانے کا فیصلہ صرف بھائی بھابی کی باتیں سن کر نہیں کیا تھا' وہ یہ فیصلہ پہلے ہی کر چکی تھی کہ اسے اسی گھر میں لوٹنا ہے جہاں مظہر اسے اتنے ارمانوں سے لے کر گیا تھا۔ اور اب جب کہ اس کی ساس کا رویہ بھی اس کے ساتھ تبدیل ہو چکا ہے تو وہ اس عورت کو اپنی اکلوتی پوتی کی جدائی کا دکھ کیوں دے' جو عورت اس کے محبوب شوہر کی ماں ہے۔ اپنے سسرال لوٹنے کا فیصلہ کرنے کی ایک وجہ سوہا بھی تھی۔ وہ جانتی تھی سوہا ننھیال میں رہ کے بھی پل ہی جائے گی۔ بھائی بھابی اس میں اور اپنے بچوں میں کوئی فرق نہیں رکھتے۔ یہاں رہ کے اس کی تعلیم

و تربیت اور پرورش میں کوئی کمی نہیں رہے گی۔ محبت' توجہ' آسائش سب میسر ہوگا مگر اس گھر کے در و دیوار اسے باپ کا احساس نہیں دلا سکیں گے۔ وہ بھی یہاں آ کے اگرچہ رو بہ صحت ہو رہی تھی لیکن یہ بھی اندازہ کر چکی تھی کہ یہاں ہر شخص مظہر کے ذکر سے دانستہ گریز کرتا ہے۔ شاید اس کی وجہ منزہ کی صحت کا خیال رکھنا ہی کیوں نہ ہو مگر اسے یہ بات کبھی کبھی بری طرح چبھتی تھی' اور سوہا' وہ یہاں رہی تو اپنے اس باپ سے ہمیشہ کے لیے انجان رہ جائے گی۔ جسے اس نے ڈھائی سال کی عمر میں کھویا تھا۔ جب کہ اپنے ددھیال میں وہ باپ کے نہ ہوتے ہوئے بھی اسے پا لے گی۔ اپنی دادی میں' چچا میں' دادا میں' وہاں وہ بوڑھے ماں باپ ہوں گے جو زندگی کی آخری سانسوں تک اپنے سب سے پیارے بیٹے کو یاد کرتے رہیں گے' اس کی چھوٹی سے چھوٹی باتیں پوری تفصیل سے اسے بتاتے رہیں گے۔ اور یہی وہ چاہتی تھی۔

وہاں ہر دیوار پہ مظہر کی تصویر لگی ہوگی۔ اس کے استعمال میں رہنے والی چیزیں ہوں گی۔ جن کی مدد سے وہ سوہا کے لیے اس کے باپ کو اجنبی نہیں رہنے دے گی۔

وہ مظہر کی یاد کو اس کی اکلوتی اولاد کے دل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رکھنا چاہتی تھی اس لیے اس نے وہیں لوٹنے کا فیصلہ کئی دن پہلے کر لیا تھا۔ صرف اس پہ عمل کرنے کے لیے مناسب موقع کی تلاش میں تھی۔ پہلے وہ بھائی' بھابی کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ اب وہ سنبھل چکی ہے اور نارمل زندگی کی طرف لوٹ آئی ہے تاکہ وہ زیادہ اعتراض نہ کریں اس کے فیصلے پہ۔

مگر اب ان سب کا وقت نہ تھا۔ وہ اپنی وجہ سے اتنے پیار کرنے والے بھائی بھابی کو مشکل میں نہیں ڈال سکتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بسم اللہ!"

نصرت کو اس نے اپنے آنے کی اطلاع فون پہ دے دی تھی۔ وہ جوان دونوں کے آنے کی امید دوسرا مہینہ ختم ہونے کے بعد چھوڑ ہی چکی تھی' جیسے نئے سرے سے جی اٹھی۔ پوتی کو دیکھنے کی تڑپ میں بے قراری سے گیٹ کے آس پاس ٹہل رہی تھی۔ ان دونوں کو رکشے سے اترتے دیکھ کر والہانہ انداز میں یہ تیزی آگے بڑھی۔ اور منزہ کو اسے دیکھ کے دھچکا سا لگا۔

ان دو مہینوں نے اس عورت کو جیسے نچوڑ ڈالا تھا۔ ساری چربی ڈھل گئی تھی۔ چمکتی ہوئی گندمی رنگت جھائیوں بھری سنولاہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ مہینے میں دو بار بڑے اہتمام سے رنگے جانے والے بال' جو ہر وقت سرسوں اور چنبیلی کے تیل میں بھگو کر گوندھے جاتے تھے اب سوکھے' بے رونق' بکھرے ہوئے تھے۔ سفید بالوں نے سیاہی کو ڈھانپ لیا تھا۔ آنکھوں کے نیچے گہرے سیاہ حلقے کسی بیماری کی نشان دہی کر رہے تھے۔

"امی! آپ کو کیا ہوا؟ بیمار رہی ہیں کیا؟"

وہ تشویش سے پوچھنے لگی۔ جب کہ نصرت سوہا کو بازوؤں میں بھرے چٹاچٹ چومے جا رہی تھی۔

"بس ایویں ہی۔ بڑھاپا سو بیماریوں کی جڑ۔"

وہ ٹال گئی مگر منزہ اندر ہی اندر جی بھر کے شرمندہ ہوئی اور یاد کرنے لگی کہ ان دو ماہ میں اس نے بھلا کتنی بار انہیں فون کیا تھا۔

"چل آ اندر۔ بڑا اچھا کیا جو تو واپس آگئی۔"

"میں واپس آنے کے لیے ہی گئی تھی امی۔ یقین کیجیے۔"

وہ اس کے ساتھ ساتھ چلتی اندر بڑھنے لگی۔ ساتھ ساتھ وہ اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔ پورٹیکو میں اصغری گاڑی کے ساتھ ایک نئی ٹیوٹا کرولا کھڑی نظر آ رہی تھی۔ پورے بنگلے پہ نیا رنگ و روغن اور عام سے لان کی تو شکل

بدل گئی تھی۔ جابجا سنگی مورتیں اور قد آدم گملے عین درمیان میں نصب فوارہ۔ جھولا۔
وہ دو ماہ کے قلیل عرصے میں ہونے والی اس تبدیلی پہ حیران تھی۔ اندر رکھا قدم رکھتے ہی اسے احساس ہوا کہ
باہر نظر آنے والی تبدیلیاں بہت معمولی تھیں اور ان تبدیلیوں کے مقابلے پہ کچھ بھی نہیں جو اندر رونما ہو چکی
تھیں۔

لاؤنج جس میں ایک صوفہ سیٹ، نصرت کا تخت جس پہ بیٹھ کے وہ سبزی بنایا کرتی اور ٹی وی دیکھا کرتی تھی۔
ڈائننگ ٹیبل اور ٹی وی کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا تھا۔ وہ اب ایک پر تعیش لونگ روم میں تبدیل ہو چکا تھا۔ پورے
گھر میں وال ٹو وال کارپٹ بچھے نظر آ رہے تھے۔ دیواریں مہنگے آرائشی سامان سے سجی تھیں۔ جابجا بیش قیمت
کرسٹل، ڈیکوریشن پیسز رکھے تھے۔ اس نے یونہی سوہا کی انگلی مضبوطی سے تھام لی۔
"مجھے پتا تھا تو نے آنا ہی ہے۔۔۔ تو یہاں سے دور رہ ہی نہیں سکتی۔"
نصرت پورے وثوق سے کہتی اس کو لیے سیڑھیوں کا رخ کرنے لگی۔
منزہ رک گئی۔ "امی! آئیے آپ کے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ میں بعد میں اوپر چلی جاؤں گی۔ آپ کہاں
سیڑھیاں چڑھیں گی۔"
نصرت کو سانس کی تکلیف تھی۔ سیڑھیاں اترنے چڑھنے میں دقت ہوتی تھی اس کا خیال کرکے اس نے یہ
بات کہی۔
"میرا کمرہ۔۔۔ وہ بھی اوپر ہی ہے اب۔" نصرت نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا تو منزہ کو حیرت ہوئی۔
"اوپر کیوں؟"
جب اس کی شادی ہوئی تو مظہر نے خود اوپر والے پورشن میں جانا پسند کیا تھا، وہ منزہ کو اس چخ چخ سے الگ رکھنا
چاہتا تھا۔ لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ نچلے پورشن میں بنے کمرے زیادہ کشادہ اور آرام دہ تھے۔
"اس لیے کہ تمہارے اولڈ فیشن ساس سسر اور وہ گنوار نند میرے اس ویل ڈیکوریٹڈ گھر سے میچ نہیں کر رہے
تھے۔"
ماسٹر بیڈ روم جو کبھی نصرت کے استعمال میں تھا، اس کا دروازہ کھول کے ریشا باہر نکلی، اور بڑی نخوت سے یہ
جواب دیا۔
منزہ کو اس کا لہجہ اور انداز بہت کھلے مگر مصلحتاً ان کو نظر انداز کرتے ہوئے اس نے سلام میں پہل کی جس کا
جواب سر ہلا کے دیا گیا۔
"بڑی جلدی دل بھر گیا تمہاری بھابھی کا۔۔۔ لے کر تو بڑے نخرے سے گئی تھی۔ دو مہینے میں ہی دیوالیہ ہو گئے
کیا؟"
"میں وہاں کچھ دن رہنے ہی گئی تھی۔"
اس نے تحمل سے جواب دیا جسے سن کر ریشا نے واہیات سا قہقہہ لگایا۔
نصرت اس کا بازو پکڑ کے کھینچنے لگی۔
"چل شاوا۔۔۔ چل اوپر چل کے باتیں کرتے ہیں۔"
"ہاں ہاں جاؤ، مائی کو بڑی جلدی ہے باتیں سنانے کی۔ ایک تم ہی تو تھیں جو چپ چاپ سب سن لیتی تھیں۔ وہ
بیٹی سے یہ کسی کو کھری کھری سنا نہیں سکتی۔ اب لگا لے گی اگلی پچھلی کسریں۔"
"میرے منہ نہ لگ طوائف زادی۔"
نصرت نے اس کو خونخوار نظروں سے گھور کے کہا۔
"جاؤ تم جا کے اس غریب زادی کے منہ لگو جو بھائی بھابی کے دھتکارے جانے کے بعد پھر اسی دہلیز کو چاٹنے آگئی
ہے جس پہ بڑے طنطنے سے تھوک کر گئی تھی۔"

منزہ کے ہوش اڑ گئے۔ واپسی پہ اس قسم کی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا تصور بھی اس نے نہ کیا
تھا۔
نصرت اس کا ہاتھ تھام کر اوپر لے جانے لگی۔

☼ ☼ ☼

جمیل کو منزہ کے واپس سسرال لوٹنے کی خبر ملی تو کلثوم کے ساتھ فوراً جنید کے ہاں آ پہنچا۔ وہاں پہنچ کے ایک نئی
خبر سننے کو ملی اور کافی عرصے بعد یہ کوئی اچھی خبر سننے کو ملی تھی۔
جمشید کی کمپنی اسے فیملی سمیت کویت بھیج رہی تھی اور بہت اچھی تنخواہ اور مراعات کے ساتھ۔ خبر بے شک
خوشی کی تھی مگر منزہ کے اچانک ضد کرکے جانے کے عمل نے دونوں کو اتنا رنجیدہ کر رکھا تھا کہ وہ ڈھنگ سے
خوش بھی نہ ہو پا رہے تھے۔
"ارے بھئی تم شاء! منہ لٹکا کے ایسے بیٹھی ہو جیسے خدانخواستہ کیا ہو گیا ہے جبکہ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے۔
بیٹھے بٹھائے کیا سنہری موقع ہاتھ لگا ہے بچوں کا مستقبل سنوارنے کا۔"
کلثوم نے سمجھانا چاہا۔
"خوشی تو ہے بھابھی! وہ منزہ۔۔۔ پتا نہیں کیوں اس نے اچانک واپس جانے کا فیصلہ کر لیا۔ شاید ہماری محبت اور
خلوص میں کوئی کمی رہ گئی تھی۔ جمشید تو بجھ کے رہ گئے ہیں۔ اتنے مان سے وہ بہن کو لائے تھے مگر اس نے اپنی ضد
کے آگے ان کی ایک نہ سنی۔"
"کمی تمہاری محبت اور خلوص میں نہیں شاء! تمہارے حالات میں تھی۔"
"کیا مطلب بھابھی؟"
"مطلب یہ شاء بی بی! کہ منزہ اونچے گھر کی بہو تھی۔ مظہر اللہ بخشے اس کا دیوانہ تھا۔ ہر آسائش اس کے اور بچی
کے قدموں میں ڈھیر کر رکھی تھی اور سسر بھی صاحب جائیداد تھا۔ اتنی بڑی کوٹھی۔۔۔ اور خود منزہ کے اپنے کمرے
میں ہر سہولت اے سی، فریج۔۔۔ اتنی گرمی میں اس سے گزارا نہیں ہو رہا ہوگا تمہارے ایئر کولر سے اور پھر رکشوں
پہ سفر کرنے کی وہ عادی کہاں ہے۔ تم لوگ پیار محبت، خلوص تو دے سکتے ہو، وہ عیش و آرام تو نہیں دے سکتے جن کی
وہ عادی ہو چکی تھی۔"
"نہیں ایسی بات نہیں ہے بھابھی!"
شاء کے دل میں کھٹک پیدا ہوئی لیکن اس نے کمزور سی مزاحمت ضرور کی۔
"ہم نے کوئی کسر باقی نہیں رکھی تھی جس حد تک ممکن ہو سکا۔۔۔"
"ہاں بھئی۔ تم نے تو اپنی حد کے مطابق ہی کرنا تھا۔ جتنا ممکن ہوتا۔۔۔ مگر وہ اپنا اور سوہا کا فائدہ کیوں نہ دیکھتی پھر
مظہر کی تنخواہ بھی خاصی تھی اور باپ کی طرف بھی اس کا حصہ نکلتا ہے۔ خاصا جوڑ رکھا ہوگا اس نے۔ وہاں مزے
سے بینک سے نکلوا نکلوا کے خرچ کرے گی۔ تم بے کار میں فکرمند ہو رہی ہو۔"
کلثوم شاء سے یہ سب کہہ رہی تھی اور دوسرے کمرے میں جمیل الگ ہی شوشے چھوڑ رہا تھا۔
"تم تو بے وقوف ہو جمشید! جذبات میں آکر تم منزہ کے ساتھ بھلا نہیں بلکہ اس کا کباڑہ کر رہے تھے۔"
"کیا مطلب نہیں میں اس کا کباڑہ کر رہا تھا؟"
جمشید کو واقعی بہت برا لگا۔
"اور کیا؟ تم بہن کو لاڈ میں یہاں لے تو آئے مگر یہ نہیں سوچا کہ اس طرح تم اسے اور اس کی اولاد کو اس کے
جائز حق سے محروم کر رہے ہو۔ میں نے پہلے بھی ایک آدھ بار اس کا احساس دلانا چاہا مگر تمہاری بھابھی نے روک
لیا کہ نجانے اس سے تم لوگ کیا مطلب اخذ کرو کہ نہیں اس میں میرا کوئی ذاتی مفاد تو نہیں لیکن اچھا ہوا منزہ کو خود
عقل آگئی، اس نے بروقت فیصلہ کر لیا، ورنہ جتنا وقت گزرتا، اتنی مشکل ہوتی اسے اپنا حق لینے میں۔"

"حق؟"

"ہاں حق۔۔۔ مظہر کی جائیداد پہ اس کی بیوہ اور بیٹی کا جو حق بنتا ہے وہ حق۔ بنگلہ، فیکٹری، دکانیں۔۔۔ ان سب میں اصغر کے ساتھ ساتھ مظہر بھی برابر کا حصہ دار ہے۔ دو تو بھائی تھے وہ۔ اگر منزہ کو تم یہاں رکھ لیتے تو چھوٹے کے لیے تو میدان صاف ہو جاتا۔ ہر چیز پہ وہ اکیلا قابض ہو جاتا۔ منزہ کا یہ فیصلہ دانشمندانہ ہے۔"

"آپ کی بات غلط نہیں ہے، واقعی اس جانب میرا دھیان نہیں گیا لیکن ضروری تو نہیں منزہ نے یہی سوچ کر وہاں جانے کا فیصلہ کیا ہو۔ ہو سکتا ہے اس کا دھیان بھی نہ گیا ہو۔ وہ ان معاملات میں خاصی کوری ہے، بہت سیدھی ہے وہ۔"

"اولاد تو اچھے اچھوں کی سادگی چھڑوا دیتی ہے میاں! اپنی اولاد کا مفاد سامنے ہو تو انسان کو خود بخود عقل آجاتی ہے اور پھر یہ کون سا کوئی غلط کام ہے۔ اس کا جائز حق ہے۔ تم کیوں جذبات میں آ کے اس کا راستہ کھوٹا کرتے ہو۔ بچی کے آگے ساری زندگی پڑی ہے۔ اچھا ہے بچی کی پرورش سہولت سے ہو جائے گی۔ تم اطمینان سے اپنی روانگی کا انتظام کرو۔"

"اگر منزہ کو اس کا حق مل جائے تو میرے لیے اس سے زیادہ خوشی کی بات اور کیا ہو گی لیکن۔۔۔ پردیس میں یہی فکر رہے گی کہ شوہر کے بغیر سسرال میں کیا مقام رہتا ہے عورت کا۔"

"فکر کیسی؟ میں بڑا بھائی ہوں۔ تمہارا ہی نہیں، اس کا بھی۔ مجھے بھی اس کی فکر ہے۔ میں دانستہ اس سے ذرا الگ الگ اس لیے رہا کہ اسے ان سہاروں کی عادت نہ پڑ جائے۔ اس کی عمر کیا ہے ابھی۔۔۔ ایک پوری زندگی پڑی ہے اسے۔۔۔ اور یہ جینے کے لیے اسے حوصلہ چاہیے۔ اگر وہ تمہارے میرے سہارے پہ جیتی رہی تو کہاں کا حوصلہ۔ یہ قدم اس نے خاصا حوصلہ مندانہ اٹھایا ہے۔ میں تو بہت خوش ہوا ہوں اس کے اس فیصلے سے۔ اس میں ضرور اپنا ہاتھ اس کے لیے آگے بڑھاؤں گا۔ اب اسے اس کی ضرورت ہے۔ تم بے فکر رہو۔۔۔ میں تمہاری غیر موجودگی میں اس کا پورا پورا خیال رکھوں گا۔ برابر خبر گیری کرتا رہوں گا۔ تمہارے چلے جانے سے اس کا یہ حق ختم نہیں ہو گا۔"

"کیسی باتیں کر رہے ہیں بھائی جان! شرمندہ مت کیجیے۔ اس کے لیے ہی نہیں، میرے لیے بھی آپ باپ کی جگہ ہیں۔ مجھے آپ پہ پورا اعتماد ہے۔ اب میں ہر پریشانی سے آزاد ہو کے جا سکوں گا، ورنہ یہی بات ہے کہ اتنی اہم خوش خبری کے بعد بھی میں بجھا بجھا سا تھا۔ یہ کامیابی پانے کے بعد بھی وہ جوش و جذبہ محسوس نہیں کر رہا تھا جو کرنا چاہیے تھا۔"

"تو اب کرو۔۔۔ کھل کے کرو۔"

جمیل نے اس کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

☆ ☆ ☆

"جی بھائی جان۔ سوہا بھی بالکل ٹھیک ٹھاک ہے۔"

"جی۔۔۔ جاتی رہتی ہوں۔ ابھی پچھلے ہفتے رات بھی رہ کے آئی تھی بھائی جان کے ہاں۔"

"جی کیوں نہیں بہت خیال رکھتے ہیں بھائی جان! فون بھی کرتے رہتے ہیں۔"

"نہیں، کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہیں بالکل بھی نہیں۔"

"بس آپ دعاؤں میں یاد کرتے رہا کیجیے۔"

"بچوں کو میری طرف سے بہت پیار دیجیے گا۔"

"اللہ حافظ۔"

بات کر کے اس نے فون رکھا اور سامنے صوفے پہ بیٹھی ریتا پہ ایک نظر ڈالی جو دانتوں سے کتر کتر کر سیب کھا رہی تھی۔

جشید کو کویت گئے تین ماہ ہو چکے تھے۔ اس دوران گاہے بہ گاہے اس کے فون آجاتے تھے۔ کبھی بڑے بھائی جان کا بھی آجاتا جسے سننے کے لیے اسے نیچے آنا پڑتا۔ ریتا نے اوپر کے پورشن سے لائن کٹوا دی تھی۔ ان چند مہینوں میں بہت کچھ بدل چکا تھا۔ ریتا کا راج پوری طرح قائم ہو چکا تھا۔

"اپنے بھائی کو کہنا آئندہ اس وقت فون نہ کیا کرے۔"

اس نے آرڈر دیا اور جاتے جاتے پلٹی۔

"پہلے رات کے وقت فون کرنے پہ اعتراض تھا اب میں نے دن کا کہا ہے تو اس پہ بھی اعتراض۔"

"دوپہر کی چلچلاتی گرمی میں اسی وقت فون کیوں کیا جاتا ہے، جب میں آرام کر رہی ہوتی ہوں۔ ارے اس بچی کو تو پکڑو، یہ کیا الٹی سیدھی طرف بڑھ رہی ہے۔ کہیں اسکرین پہ نہ دے مارے۔"

منزہ نے سوہا کو گود میں اٹھا لیا اور جانے لگی۔

"رات کو کھانے پہ کچھ مہمان آ رہے ہیں۔ ذرا کچن کا چکر لگا لینا۔ کل بھی ایسا نکما ملا ہے کہ کوئی چیز ڈھنگ کی نہیں بنا تا۔ ذرا تم خود سر پہ کھڑے ہو کے پکوانا اور میٹھا اپنے ہاتھ سے بنانا۔ بلکہ پلاؤ بھی خود بنانا۔"

"تیرے باپ کی نوکر نہیں ہے یہ۔" نصرت نے سیڑھیوں سے نیچے جھانک کر کہا۔

اگرچہ ریتا کے آگے اس کی خاص چلتی نہیں تھی۔ گھر میں ہوتا وہی تھا جو وہ چاہتی تھی۔ سب کچھ اکیلے اصغر کی مٹھی میں تھا اور اصغر ریتا کی مٹھی میں۔ سب سیاہ و سفید کی مالک وہ تھی اور اپنے اختیارات کا خوب خوب فائدہ بھی اٹھاتی تھی۔ لیکن جب بھی موقع ملتا، نصرت اپنی بھڑاس ضرور نکال لیتی۔ خصوصاً منزہ کی ڈھال بننے کے لیے تو ہر وقت تیار رہتی۔

"نوکر تو یہ تمہارے باپ کی بھی نہیں۔" اصغر نے بتا رکھا ہے مجھے، کیسے تم ماں بیٹی نے اسے کولہو کا بیل بنا رکھا تھا اور وہ بھی شوہر کی زندگی میں۔ میں نے اس گھر میں چھ نوکر رکھ چھوڑے ہیں، جب کہ پہلے ان چھ کا کام یہ اکیلی نمٹاتی تھی۔ اب اگر ضرورت کے وقت میں نے اسے کوئی کام کہہ دیا تو غلط کیا گیا ہے۔ آخر یہ میرے گھر میں رہتی ہے، کھاتی ہے پیتی ہے۔"

"تیرا گھر۔۔۔؟ یہ گھر میرے مظہر کا بھی ہے۔"

"تو جا وہ بڑا ہوا ہے۔ کہو آ کے سنبھالے اپنا گھر۔"

وہ اطمینان سے کاؤچ پہ نیم دراز ہو کے باقی کا سیب کھانے لگی۔

اس دل جلانے والی بات پہ جہاں منزہ کی پلکیں بھیگ گئیں۔۔۔ وہیں نصرت کے منہ سے گالیوں کا طوفان بہہ نکلا۔

"دادی! کیوں اپنا دماغ خراب کر رہی ہیں، اس پہ کیا اثر ہوتا ہے۔"

شمیم کمرے سے نکلی اور ماں کو پکڑ کے کھینچنے لگی جو جواب بولتی بولتی کوسنے اور بددعائیں، غلیظ گالیاں دیتی دیتی بے حال ہو رہی تھی۔

منزہ بھی تھکے تھکے انداز میں سوہا کو اٹھائے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

"کون کہتا ہے، ریتا کی زندگی بدل گئی۔"

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لیتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"کون کہتا ہے کہ ریتا اب ایک عزت دار، شریف گھرانے کی بہو ہے۔ وہی بازاری گالیاں۔۔۔ وہی گندی زبان تم سے ساس جی! تمہارے ہوتے ہوئے میں اپنے میکے کے لیے اداس نہیں ہو سکتی۔"

"کسی نے کہا ہے ناں، اس بدذات کے منہ مت لگا کرو۔ یہ ایسے ہی کلسا کلسا کے مار دے گی تمہیں جیسے اس نے بابا جی کو مارا ہے۔"

شمیم کی اس بات پہ ریتا اچھل کے بیٹھ گئی۔

"اے بڈھی! شوخی۔ تیرا باپ تیرے کسی کرتوتوں کے ہاتھوں مرا ہو گا۔ میرا نام نہ لگا۔ ویسے بھی جس کی ایسی

بیوی ہو گئے تو عرصہ پہلے مر جانا چاہیے تھا۔"

اور سچ تو یہ تھا کہ نجفی صاحب اپنی بیوی کی جھگڑالو طبیعت کے ہاتھوں مرے۔ اصغر کے ایک بازاری عورت کے گھر ڈالنے اور سب کچھ اس کے حوالے کرنے سے موت کا شکار ہوئے۔ انھیں تو مظہر کی سعید بخت جدائی نے مار ڈالا تھا۔ مظہر کے بعد وہ بمشکل تین ماہ ہی جی سکے۔

☼ ☼ ☼

"مامی... مامی..."

وصی پتا نہیں کب سے متوجہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا اور وہ جان بوجھ کے نظر انداز کرتے ہوئے مگن تھی۔ ماموں تو شاید اماں جی کے کھنکھارنے کی آواز آتی۔ وہ شاید کمرے سے نکل رہی تھیں۔ اور ایسا کبھی نہیں ہوتا تھا۔ ناچار پروین نے دانتوں سے دھاگا توڑتے ہوئے اس پہ نظر کی۔

"کیا بات ہے وصی! کیوں تنگ کر رہے ہو؟" اس کی آواز دبی ہوئی مگر خشک تھی۔

وصی چند سیکنڈ خاموشی سے اس کا چہرہ تکتا رہا جیسے اس اجنبی مامی میں اپنی اس پرانی مامی کو ڈھونڈ رہا ہو۔ جیسے اس تبدیلی کی وجہ تلاش کر رہا ہو۔

پروین اس کی معصوم نظروں کے معصوم سوالوں کی تاب نہ لا سکی اور دوبارہ بڑے دھیان سے سلائی کرنے لگی۔ اچانک اسے اپنے ماتھے پہ وصی کے ننھے سے گرم ہاتھ کا نرم لمس محسوس ہوا۔

اس کے ہاتھ تھم گئے۔

بڑے تعجب سے اس نے وصی کو دیکھا جو اب گھٹنوں کے بل آگے کو جھکا ہوا تھا اور بڑی تشویش سے اس کے ماتھے کو ہاتھ لگا کے کچھ دیکھ رہا تھا۔

"کیا ہے وصی؟"

اس بار اس کا لہجہ اتنا کھردرا نہیں تھا۔ اس گیلے گیلے لمس کی حدت نے اسے اندر سے گداز کرنا شروع کر دیا تھا۔

"مامی! آپ کو بخار ہے؟"

"نہیں تو... میں..." وہ کہنے لگی تھی کہ

"کس کو بخار ہے؟"

شوکت جہاں نے نزدیک آتے ہی وصی کی یہ بات سنی تو پوچھنے لگیں۔

"مامی کو۔" وصی چھلانگ مار کے نیچے اترا اور اپنی اس دریافت یا انکشاف پر پرجوش ہو کے بتانے لگا۔ "مامی کو بخار ہے مجھے پتا ہے۔"

"ارے واقعی! بتایا کیوں نہیں پروین تم نے۔ صبح ناشتہ وغیرہ میں بناتی اور اب بھی یہ سلائی کا کام کیوں لے بیٹھی ہو۔ بہت ضروری چاہیے تو لاؤ میں کر دیتی ہوں۔"

"نہیں اماں جی...! ایسی کوئی بات نہیں کوئی بخار وخار نہیں ہے۔"

"لو۔ اچھے ہی بھلا... بچہ یونہی تو نہیں کہہ رہا۔"

"بچہ ہی تو ہے پتہ نہیں کیا کہے جا رہا ہے۔ میں تو اچھی بھلی ہوں۔"

"مامی! آپ کچھ بول نہیں رہی تھیں۔"

وصی نے اپنے اندازے کی وجہ بتائی تو پروین کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ اس کے اندر کا چور دبکنے لگا مگر شوکت جہاں نے اس بات کو سرسری سا لیا۔ یا شاید وہ اصل بات کی تہہ تک ہی نہ اتر سکیں۔

"ارے میرے بدھو میاں!" وہ ہنس کے وصی کو گود میں لیے وہیں پروین کے پاس بیٹھ گئیں۔

"کوئی بات نہ کر رہا ہو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ بیمار ہے۔ اب جس طرح تم بولتے ہو اور جس قدر بولتے

ہو... اور کیسے بولے..."

"... تم بھی... بیں۔" "اپنی بات میں زور پیدا کرتے ہوئے بولا۔" "اور اداس بھی۔"

شوکت جہاں نے غور سے بہو کا چہرہ دیکھا۔ جس کے رویے میں بتدریج آتی تبدیلی کسی سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ اور نواور ... تو راتے وصی نے بھی محسوس کر لیا اور برملا کہہ بھی دیا۔

"... سے کوئی کھٹ پٹ ہوئی؟"

انھوں نے ... سر سری رکھنا چاہا مگر پروین کا جواب بہت کچھ بتا یا جا رہا تھا۔

"اب کہاں کوئی کھٹ پٹ ہوتی ہے آپ کی نصیحت پہ پورا پورا عمل کر رہی ہوں۔"

... بچھے کچھ مہینوں سے اس کا میکے میں جانا نہ جانے کے برابر تھا۔

... نے ان گھیرا جیسے اسے اس کے میکے سے دور رکھنے کی ذمہ دار وہی تو تھیں۔

"بہت دنوں سے تم اپنی اماں کے ہاں نہیں گئیں؟"

"دنوں سے نہیں اماں جی! مہینوں سے۔"

بہت ضبط کرتے کرتے بھی پروین کی آواز بھرا گئی۔ اپنی اس کمزوری کا اثر زائل کرنے کے لیے اس نے سلائی پہ سر جھکا لیا۔

"ہاں یہ بات تو ہوئی ہوگی۔ کیسی ہیں شمشاد بہن؟"

"جی ٹھیک ہیں۔"

اس نے کہا حالانکہ دل تو چاہا کہ اس سوال کے جواب میں کوئی تنتناتا ہوا جواب دے مارے۔ جیسے جیسے... بہت بری بقول آپ کے بیٹے کے۔ مگر لحاظ مانع آ گیا۔ ویسے بھی اس کے اکھڑے رویے اور سرد مہری کو مسلسل نظر انداز کرتے ہوئے وہ بڑی اعلا ظرفی کا ثبوت دے رہی تھیں۔ آج کی بات نہیں۔ کافی عرصے سے وہاں سے اور گھر کے باقی لوگوں سے یونہی الگ تھلگ سی تھی اور وہ جان کے بھی انجان بنی حسب سابق رویہ اپنائے ہوئے تھیں۔

"اور ثمرہ؟"

"مجھے نہیں پتا۔"

ثمرہ کے نام پہ اسے بہت کچھ یاد آ گیا اور اس نے ایک دم سلائی کا کام روک کے تو جی سلی قمیص گول مول کر کے رکھ دی۔

"پروین! کس بات کی سزا دے رہی ہو خود کو؟"

"سزا...؟ خود کو...؟ کیا میں نے ایسا کچھ کیا ہے جس کی سزا ملنی چاہیے؟"

اس نے دل سوزی سے پوچھے سوال پہ اس نے الٹا سوال کر دیا۔

"نہیں۔" شوکت جہاں نے فوراً کہا۔ "مگر اب تم جو کچھ کر رہی ہو اس حماقت کے بدلے تمہیں واقعی سزا ملنی چاہیے اور وہ بھی مجھ سے۔"

انھوں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

ان کے لہجے میں ایک استحقاق بھری سختی تھی۔

... میں ... بھری ... جھڑکی۔

جب کہ ... لمس اس کے لمس میں ایک محبت بھری شفقت تھی جس نے پروین کو پل میں پگھلا ڈالا۔ وہ ان کے گلے لگ کے رونے لگی۔

"تنہائی کو کیا ہوا نانو!"

وصی روہانسا ہو گیا۔

"شش۔۔۔ چپ۔ بچہ پریشان ہو رہا ہے۔ دیکھو تو۔ اتنی بڑی ہو کے ننھی منی کی طرح بال [illegible] رہی ہے۔ چلو چپ کرو اب۔"
پروین نادم سی مسکراہٹ کے ساتھ آنسو صاف کرنے لگی۔
"تم دونوں میاں بیوی تماشا ہو پورے۔"
وہ مصنوعی خفگی سے کہہ رہی تھیں۔ پروین نے شکایت بھری نظران پہ ڈالی۔
"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ کم وہ بھی نہیں۔ اور کم تم بھی نہیں۔ دونوں انتہا پسند ہو۔ اور [illegible] اب جاؤ بھلا، تم نے جو ضد پکڑی ہوئی ہے، اس کا کیا اثر ہوا سراج پہ؟ ذرا برابر بھی نہیں۔ پھر کیا فائدہ جلانے کا۔"
"میں نے سوچا انہیں خود ہی احساس ہو گا۔" وہ آنسو صاف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"مگر ہوا تو نہیں۔ اب چھوڑو یہ ضد اور اٹھو تیار ہو جاؤ۔"
"کہیں جانا ہے؟"
"ہاں، میرے ساتھ چلنا ہو گا تمہیں۔ ابھی بچوں کے آنے میں خاصا وقت ہے۔ ان کی چھٹی تک [illegible] اور اگر بالفرض دس پندرہ منٹ کی دیر سویر بھی ہو گئی تو رخشندہ ہے نا گھر پہ۔ تم بس دس منٹ [illegible] میں۔"
اور وہ واقعی مزید کوئی سوال کیے بغیر دس منٹ میں ہی تیار ہو کے اپنے کمرے سے نکل آئی۔
"چلیں اماں جی!" وہ چادر اوڑھتے ہوئے بولی۔
"آپ نے میاں صاحب سے کہہ دیتیں بازار جانے کا تو وہ گاڑی بھجوا دیتے۔"
"صبح میرا کہیں جانے کا ارادہ نہ تھا اور ویسے بھی مجھے بازار نہیں جانا ہے۔ رہی گاڑی تو رکشے ٹیکسی میں کیا مضائقہ ہے۔"
"رکشہ تو رہنے دیتے ہیں۔ ٹیکسی منگوا لیتی ہوں، کسی کو بھیج کے۔ ہاں واپسی پہ تایا جان کے ہاں چھوڑنے آ جائے گا۔"
"یہ تمہارے تایا جان کہاں سے آ گئے بیچ میں۔ کرشن نگر کہاں، راوی روڈ کہاں۔"
"میں سمجھی آپ زیتون آپا کی عیادت کے لیے جانا چاہ رہی ہیں۔"
"اس کی عیادت کی بھلی کہی تم نے۔ چھبیس سال ہو گئے اس کے بیاہ کو، چلن نہ چھوڑا اس نے۔ مہینے بیماری کا بہانہ بنا کے بال بچوں سمیت میکے میں پڑے رہنا اس نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے۔ [illegible] صاحب کی کوئی بہو سال بھر سے زیادہ نہیں ٹک سکی۔"
"اور راوی روڈ۔" اس نے اٹک کے پوچھا۔ وہاں تو اس کا میکہ تھا۔
"تمہاری اماں کی مزاج پرسی کر آتے ہیں۔"
"نہیں اماں جی!" وہ جھجک کے دوبارہ بیٹھ گئی۔ اسی طرح چادر اوڑھے اور پرس ہاتھ میں تھامے۔ "میاں صاحب برا مانیں گے۔"
"خوامخواہ برا مانیں گے۔ وہ ڈھائی ماہ بعد جا رہی ہو اور اس سے پہلے بھی جو گئی تھیں تو گھڑی بھر کو [illegible] خسر لگا تھا۔ اور اس سے پہلے عید کے دوسرے دن دو گھنٹے کے لیے۔ شاید اس سال میں یہی دو [illegible] تمہارے، وہ کچھ کہہ کر تو دیکھیں۔"
"لیکن میں نے ان سے پوچھا نہیں ہے، وہ اس بات پہ فساد کھڑا کر دیں گے۔"
"میرے ساتھ کہیں بھی جانے کے لیے تمہیں اس کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی وہ مجھ [illegible] ہوا۔"

"[illegible] نہیں چلی جاؤں گی۔ کل پرسوں ہی ان سے بات کر کے چلی جاؤں گی، وعدہ آپ کے سمجھانے پہ میں [illegible] لیکن آپ اس طرح میاں صاحب سمجھیں گے۔ میں نے آپ سے شکایت کی ہے یا کوئی ضد چھوڑ دی ہے۔"
"[illegible] رہنا تم بھی۔ خیر۔ بچوں کے ساتھ جانا بے شک ایک آدھ دن رہ آنا مگر ابھی تو میرے ساتھ چلو [illegible] سے چند ایک ضروری باتیں کرنا ہیں۔"
"[illegible] کس کی بات؟"
"[illegible] تمہارے سامنے ہی کروں گی۔ پتا چل جائے گا۔ جاؤ جا کے برابر والوں کے ملازم کو ٹیکسی لانے [illegible] کر کے لائے۔"
[illegible] انہیں کہہ کے خود ہی نکلیں۔

☆ ☆ ☆

"[illegible] نوید کا بیاہ کر دو؟"
شوکت جہاں کا مشورہ سن کر شمشاد بیگم اچھل ہی تو پڑیں۔ بڑی ناگواری اور اچنبھے سے انہوں نے یہ بات [illegible] اور پروین کو یوں دیکھنے لگیں جیسے کہہ رہی ہوں۔
"سن لو اپنی ساس کی لن ترانی۔ سٹھیا گئی ہے بڑھیا۔"
خود پروین کے لیے بھی یہ بات غیر متوقع تھی۔ وہ بھی حیرت سے انہیں دیکھ کے رہ گئی۔ جب کہ وہ اطمینان سے [illegible] گھونٹ بھرنے کے بعد کہنے لگیں۔
"[illegible] ایسی انوکھی بات بھی نہیں کہہ دی میں نے۔ کیا دنیا میں عقد ثانی نہیں ہوا کرتے۔"
"کیا نہیں ہوا کرتے؟" شمشاد نے بھنویں کو ٹھوکا دے کر اس کی وضاحت چاہی۔
"میرا مطلب ہے دوسری شادی کوئی ایسی انہونی بھی نہیں۔ لوگ تو بلاوجہ اور بے ضرورت بھی کر ڈالتے ہیں۔ [illegible] جہاں ایک ٹھوس وجہ موجود ہے۔ نوید کے آگے زندگی پڑی ہے۔ کب تک ساجدہ کی یاد میں اکیلا رہے [illegible]؟"
"نوید کا خیال مجھے بھی ہے لیکن وشمہ کے بارے میں بھی تو سوچنا ہے۔" وہ منمنائی۔
"وشمہ ہی تو اصل وجہ ہے نوید کی دوسری شادی کے لیے۔"
"وشمہ؟"
"ہاں، بہن۔ آپ کب تک اکیلی اس کی نگہداشت کریں گی۔ آپ کی عمر بھی نہیں ابھی اتنی سی بچی کو پالنے [illegible]"
"[illegible] یہ سال سوا سال گزر گیا۔ باقی کے سال بھی گزر جائیں گے۔ لڑکیوں کو بڑے ہونے میں کون سی دیر لگتی [illegible] کون سا بیٹا ہے جس کے جوان ہونے کے انتظار میں آنکھیں گل جائیں۔ دیکھنا۔ اور کچھ سالوں بعد دیوار [illegible] ہو گی۔"
"[illegible] اس کی زیست کے لیے ضروری ہیں۔"
"نوید نے تو کرائی دلہن ہو لیت آپا!" شمشاد نے بڑی نخوت سے جتایا۔ "اللہ نے بڑا دے رکھا ہے میرے [illegible] کسی کے آسرے پہ نہیں بیٹھا۔"
[illegible] واضح طور پر بیٹی کو اس کے عدم تعاون کا طعنہ دیا تھا۔ جہاں پروین سر جھکا کے رہ گئی وہیں شوکت جہاں [illegible] بات کو نظر انداز کر کے متانت سے سر ہلا کے کہنے لگیں۔
"[illegible] ماشاء اللہ"
"مگر مجھے [illegible] ہے وہ بچی کو پالنے کی۔"

"میں صرف پال پوس کر بڑا کر دینے کی بات نہیں کر رہی' تربیت کرنے کی بات کر رہی ہوں۔ تربیت دال آیا نہیں کرے گی۔۔۔ یہ ماں کا فرض ہے۔"

"ماں نہیں ہے قسمت میں تو کیا کرے بدنصیب۔۔۔ سوتیلی ماں نے بھی کبھی ماں والے فرض نبھائے۔"

"سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں' آپ نیت تو کیجیے' ارادہ تو باندھیے۔ مل جائے گی کوئی نیک خاتون۔"

"نہ نوید مانے گا نہ میرا دل راضی ہے۔"

شمشاد بیگم نے فوراً" صاف انکار کیا۔

"ہاں اماں جی! اس بات پہ تو میرا دل بھی نہیں ٹھہر رہا۔"

پروین کی جانب سے بھی اختلاف سامنے آیا۔

"مگر وجہ؟" انہوں نے تحمل سے دریافت کیا۔

"وجہ وہی سوتیلی ماں..."

"اور کیا۔۔۔؟ ایک تو پہلے ہی سے قسمت کی ماری ہے یہ کہ پیدا ہوتے ہی یتیم ہو گئی' اب میں اس سے چھین لوں۔۔۔ نہ جی ناں۔"

"وجہ وہی سوتیلی ماں۔"

"اور کیا۔۔۔؟ ایک تو پہلے قسمت نے اس بے چاری کے ساتھ ناانصافی کی۔۔۔ پیدا ہوتے ہی یتیم کر دیا اس سے باپ بھی چھین لوں۔۔۔ نہ جی ناں۔۔۔"

"کیسی بات کر رہی ہیں آپ بہن!"

"سولہ آنے درست کہہ رہی ہوں' نوید کو اس عمر میں دوبارہ بیوی لا دوں۔۔۔ تاکہ وہ ماں تو ماں' بیٹی بھی جائے۔ میرا دماغ خراب نہیں ہے۔ رہنے دو جی آپ۔۔۔ پل جائے گی وشمہ بھی۔ بغیر ماں کے بھی بچیاں پل جاتی ہیں۔۔۔ ہوتی ہی ڈھیٹ ہیں۔ یہ بھی جی لے گی۔ دیکھ لینا تم' میرے جیتے جی اس کے سر پہ سوتیلی ماں نہیں آئے گی۔۔۔ بالکل بھی نہیں۔"

اس کے دوٹوک اعلان کے بعد شوکت جہاں نے مدد طلب انداز میں بہو کو دیکھا۔ مگر وہ بھی آمادہ نظر نہ آئی تو فی الحال مزید اصرار کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

بعد میں بھی وہ گاہے بگاہے پروین کے ذریعے ان تک یہ بات پہنچاتی رہیں۔ پروین کو بھائی کی اجڑی بے رونق زندگی کا احساس دلایا' وہ بھی کچھ کچھ سوچنے پہ مجبور ہوئی مگر وشمہ کے لیے سوتیلی ماں لانے کا تصور ہی تھا کہ وہ بھائی کی زندگی میں بہار لانے کی خواہش کو کچل دیتی۔ ہاں پھر وشمہ جب دو سال کی ہوئی' ایچھی خاصی تب شمشاد بیگم کو اپنے دعوے کی حقیقت معلوم ہوئی۔ جب اسے قدم لگے۔ اور وہ گھر کے ہر کونے میں کوشش کرنے لگی۔ کبھی دروازہ کھلا دیکھ کے باہر نکل جاتی۔ کبھی سیڑھیاں چڑھنے لگتی۔ تب انہیں دکھ ہوا کہ بوڑھی ہڈیوں میں اس وقت بچی کے پیچھے بھاگنے کی سکت نہیں ہے۔ آیا تو صبح نو بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک ہوتی اور اتنے وقت کی بھی وہ اچھی خاصی تنخواہ لیتی جو ہر ماہ اس کے ہاتھ پہ رکھتے ہوئے شمشاد بیگم جب آخر کار ایک روز اس نے خود پروین سے کہہ ڈالا۔

"بھئی مجھ سے مصیبت اٹھائی نہیں جاتی۔ نوید رات جلدی سو جاتا ہے۔ سویرے اس نے کام پہ جانا ہوتا ہے۔ اور یہ فتنی۔۔۔ ساری دوپہر سوئی رہتی ہے۔ ہوہرے وہ مسٹنڈی آیا دے افیم کھلا کے سلا جاتی ہے۔ رات تک پھر اس نے جاگنا ہوتا ہے اور مجھ بڈھی کو جگانا ہوتا ہے۔ میں سوچتی ہوں' تمہاری ساس امتحان لے رہی ہے۔ آزمانے میں کیا جاتا ہے' کر دیں نوید کی شادی۔"

"اماں۔۔۔! یہ کوئی کھیل ہے جو صرف آزمانے کے لیے آپ بھائی جان کی شادی کر دیں گی؟ اگر آزمائش ناکام ہو گئی تو؟"

"ہو نوید بابا ہر گز نہیں گے۔۔۔ کیوں۔۔۔"

شمشاد نے سوال کی گولی سے تر کہا۔

"مجھے اب نوید لانے کی کوئی چاہ نہیں ہے۔ نوید کے لیے بیوی نہیں' وشمہ کے لیے ماں لانی ہے۔ لے آئیں گے کوئی غریب بچی (غریب) اگر نہ سنبھال سکی بچی کو تو دفع دور۔"

"سوتیلی ماں۔ اسوتیلی ماں! ان سے کم نہیں ہوتی۔"

"فکر نہ کرو۔ میرے ادھر ہوتے ہوئے کون سی ڈائن آنے کی ہمت کرے گی۔"

"بھائی جان مان جائیں گے؟"

"ہوں۔۔۔ نہ۔۔۔" (پتہ نہیں)

"وہ تو اپنی شادی کے لیے اتنی مشکل سے مانے تھے' کہتے تھے اب چالیس کے قریب ہو گیا ہوں اب کیا سہرا باندھنا' اب کہاں مانیں گے۔"

"میں منوا لوں گی۔ اور تو کیا نہیں منوا سکتی تو بھی اپنی ماں کو جانتی کتنا ہے۔"

اس نے بڑے فخر سے دعوا کیا مگر نوید مراد کے سامنے اس کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ وہ دوسری شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں تھا۔

"اگر اتنی بھاری ہے یہ لڑکی تو مجھے بتا دیں میں یتیم خانے ڈال آتا ہوں۔"

ماں کی ساری دلیلیں سننے کے بعد اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا تو شمشاد کو آگ لگ گئی۔

"ہاں بڑے ولیے ماں کے سر میں گھے (خاک) ڈلوا' دنیا تھو تھو کرے گی۔ بابی سے اکوآک (اکلوتی) پوتری نہ پال سکی۔"

"تو پھر مجھے دوسری شادی کا کوئی نہ کہے۔"

وہ کہہ کر اٹھ گیا لیکن اب شمشاد کو بھی ضد سوار ہو گئی۔ اس نے اٹھتے بیٹھتے ہر وقت نوید کے سامنے یہی ذکر چھیڑ چھیڑ کے اسے زچ کر ڈالا۔

❁ ❁ ❁ ❁

"اب کیا ہو گا؟"

نصرت کو گزرے آج بارھواں دن تھا اور ان بارہ دنوں میں وہ بارہ ہزار مرتبہ یہ بات سوچ چکی تھی۔

جتنے بھی مظہر کے جانے کے بعد نصرت نے یہ تین سال کیسے گزارے تھے۔ ورنہ پچھتاوا اسے اندر ہی اندر گھن کی طرح چاٹ رہا تھا اور یہ گھن تیسرے سال اسے کھوکھلا کر گیا۔ جاتے جاتے اس نے منزہ کا ہاتھ تھام کے کہا تھا۔

"مجھے معاف کر دینا' بڑا دل دکھایا تھا میں نے تمہارا۔۔۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں امی آپ؟"

"سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔ تیرے مکرنے سے بات بدل تو نہیں جائے گی۔ جو میں نے تیرے ساتھ کیا اور جو مظہر کے ساتھ کیا اس پہ۔"

"بس کریں امی! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں۔" اس نے نصرت کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے خاموش کرانا چاہا۔

"کہہ لینے دے مجھے۔۔۔ دل ہلکا کر لینے دے۔۔۔ ہلکی ہو جاؤں گی تو سفر آسان ہو گا۔ مظہر تو اتنی جلدی چلا گیا۔۔۔ ماں کو منانے کا موقع بھی نہ دے سکا۔ اس کے دل میں کتنے گلے رہ گئے ہوں گے۔ خیر جاؤں گی اس کے پاس تو خود ہی منا لوں گی مگر تجھ سے تو گناہ بخشوا لوں۔"

"اللہ آپ کو لمبی زندگی دے۔"

اس نے یہ بات صدق دل سے کہی' پچھلے تین سالوں سے یہ عورت اللہ کے بعد اس زمین پہ اس کا سب سے بڑا سہارا بنی ہوئی تھی۔ یہ عورت جس نے شادی کے بعد کے تین سال اس کے لیے عذاب کر دینے میں کوئی کسر نہ

چھوڑدی تھی۔

"منظر آپ سے بہت محبت کرتے تھے۔ اور میں بھی آپ کو اپنی ماں سے بڑھ کے سمجھتی ہوں۔ جو بیت گیا۔ اگر کوئی تنگی تھی بھی تو ان تین سالوں میں آپ نے جو محبت دی ہے۔ اس کے سامنے کیا حیثیت ہے ان باتوں کی۔"

"اگر مجھے ماں سمجھتی ہے تو پھر میری ایک بات مانے گی؟" نصرت نے اپنی پھولی ہوئی سانسوں پہ قابو پاتے ہوئے بڑے مان سے کہا۔

"ضرور امی! آپ حکم کریں۔"

"میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اگر میری آنکھیں بند ہو جائیں گی تو..."

"آپ کو کچھ نہیں ہوگا امی!" اس نے بات کاٹی۔

"لے... جھلی نہ ہووے تو۔ اک نہ اک دن تو مجھے جانا ہی ہے مگر تو وعدہ کر کہ میرے جانے کے بعد تو ایک دن ادھر نہ رہے گی۔"

"کیا مطلب امی؟" وہ حیران ہوئی۔

"تو سوہا کو لے کر اپنے میکے چلی جانا۔"

"مگر... مگر میں تو..."

وہ یاد دلانا چاہتی تھی وہ سارے دعوے۔ جو کبھی نصرت نے کیے تھے کہ یہ گھر ہمیشہ ہمیشہ اس کا رہے گا۔

"میرے بعد ادھر تیرا کوئی آسرا نہیں رہے گا۔ تو رل جائے گی۔ تیرے بھائی اچھے ہیں' سنبھال لیں گے تجھے۔"

"مگر امی! میں بہت دعووں کے ساتھ ان کے گھر سے نکلی تھی۔ اب گئی تو کیا سمجھیں گے وہ۔"

"جو بھی سمجھتے رہیں... مگر یہاں نہ رہنا تم۔"

"اور شمیم؟"

"اس کے تو بھائی کا گھر ہے' پڑی رہے گی کسی کونے میں۔"

نصرت کے چہرے پہ آنسو پھیل گئے شاید شمیم کا گھر نہ بس سکنے کا غم تازہ ہو گیا تھا۔

"وہ اکیلی ہو جائے گی امی!"

"نہیں ہوتی۔ اس کا اللہ مالک ہے۔ بس تم نہ رہنا ادھر ورنہ برباد ہو جاؤ گی۔"

"آپ کا وہم ہے امی! ریٹا کیسی بھی کیوں نہ ہو۔ اصغر اچھے دل کا ہے۔ ہماری سوہا کو کتنا پیار کرتا ہے۔ میرا بہت لحاظ کرتا ہے وہ ہمارا خیال رکھے گا امی!"

"یہی تو دکھ ہے...... اس میں ابھی لحاظ ہے۔ بھائی کی اولاد سے منہ نہیں موڑ سکتا وہ... اور تیری بھی عزت کرتا ہے۔ میں جانتی ہوں وہ تیرا خیال رکھے گا لیکن اس کا خیال رکھنا اس کی ریٹل بیوی کو برا چبھنے لگے۔ وہ ناگن ہے منزہ! میں نہیں چاہتی کہ منظر کی عزت پہ نام آئے تو سمجھ رہی ہے نا۔"

وہ ہکا بکا رہ گئی۔ کیونکہ وہ نصرت کا اشارہ سمجھ گئی تھی۔

"شمیم بہن ہے۔ اس کے ساتھ ریٹا جو بھی برا کرلے کم از کم اس کی عزت تو محفوظ ہوگی بھائی کے گھر اس طرح تم اپنے بھائی کے گھر محفوظ رہو گی۔ میری بات پر غور کرنا۔"

اس بات کے تیسرے دن ہارٹ فیل ہو جانے سے نصرت کی وفات ہو گئی۔

منزہ کو اس کی آخری نصیحت بار بار یاد آتی رہی۔

"میرے مرنے کے بعد ایک دن بھی یہاں مت رہنا۔"

لیکن وہ جاتی تو کیسے۔ گو کتنا اصرار کرتے تھے بھائی اور بھابھیاں مگر وہ بڑے طمطراق سے سسرال میں رہنے کا اعلان کر کے وہاں سے آئی تھی' پھر جلد ہی بھائیوں نے بھی سمجھوتا کرلیا۔ اب وہ اپنے منہ سے کیسے ان کو کہتی

نے کی بات کرتی۔

جنید کا تحرک فون کبھی آیا۔ جمیل بھائی جان بھابھی کلثوم کے ساتھ وفات پر آئے لیکن ابھی کوئی بات نہ ہوئی۔ منظر کے مرنے پہ وہ خود کو صرف اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ لیکن اب خود کو بے سائباں بھی تصور کرنے لگی۔ ریٹا کی جانب وہ ایسے دیکھتی جیسے بکرا قصائی کی جانب دیکھتا ہے۔ مگر فی الحال وہاں خاموشی تھی۔ اصغر کے تو سامنے سے بھی وہ کتراتی۔ سوہا کو آواز دیتا تو منزہ اسے گود میں چھپا کے کمرے میں بند ہو جاتی کہ کہیں چاچا بھتیجی کے لاڈ کے ظاہر ہے ریٹا کو مشتعل نہ کریں۔

کیا۔ سوچتے سوچتے اچانک اسے باہر آہٹ کا احساس ہوا اس کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔

سوئی ہوئی سوہا پہ کمبل درست کیا اور وال کلاک پہ وقت دیکھا۔ رات کا سوا ایک بج رہا تھا۔

"کون ہو سکتا ہے؟"

وہ سوچنے لگی۔ اتنے میں ایک اور آہٹ سنائی دی' جیسے کرسی گھسیٹی گئی ہو۔ اسے شمیم پہ غصہ آنے لگا جو اس کے ہزار کہنے پہ بھی اس کے کمرے میں سونے پہ تیار نہ ہوئی تھی۔

شمیم بھی ان گزرے سالوں میں بہت بدل چکی تھی۔ مگر منزہ کے ساتھ اس کے تعلقات سرد سے تھے۔ اگرچہ وہ اب اس کے ساتھ بدزبانی نہیں کرتی تھی۔ مگر بلا ضرورت کلام بھی نہ کرتی تھی۔ سوہا کے لیے بھی اس کے دل میں کوئی خاص جگہ نہ تھی۔ ریٹا کی اجارہ داری قائم ہونے اور ماں کے پسپائی اختیار کر لینے کے بعد اس نے جیسے ہر چیز میں دلچسپی لینا چھوڑ دی تھی' عجیب نفسیاتی مریضہ بن کے رہ گئی تھی اور ماں کی وفات نے اسے ایک طرح چپ سادھ لینے پہ مجبور کر دیا تھا۔

بہت ہمت کر کے منزہ نے کمرے کی لائٹس آف کیں اور پردہ سرکا کے ٹیرس پہ جھانکا۔

وہاں ایک کرسی پہ ٹانگیں رکھے اور دوسری پہ شمیم بیٹھی ہوئی تھی۔

"شمیم کیا کر رہی ہو یہاں؟"

اس نے آواز دی۔ مگر وہ پلٹ کے دیکھنے یا کسی بھی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر کرنے کی بجائے کسی بُت کی طرح بیٹھی تھی۔ منزہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

"رات کے اس پہر تم ٹیرس پہ کیا کر رہی ہو۔ چلو اٹھو...... سردی بھی کس قدر بڑھ رہی ہے۔"

منزہ نے اس کے کسی بھی قسم کی حرکت نہ کرنے پہ خود اس کا ہاتھ پکڑ کے اٹھانا چاہا...... جو برف کی طرح سرد تھا۔ "تم کتنی ٹھنڈی ہو رہی ہو شمیم۔ بیمار ہو جاؤ گی۔"

شمیم کوئی مزاحمت کیے بغیر اس کے پیچھے معمول کی طرح چلنے لگی۔ منزہ نے اسے اس کے بستر پہ لٹایا۔ کمبل اوڑھایا اور سونے کی تاکید کرتی چلی گئی۔

اس کے بعد بھی دو تین بار اس نے شمیم کو اسی طرح رات گئے ٹیرس پہ بیٹھے دیکھا تو اٹھا کے اندر لے آئی۔ اس کی ذہنی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اپنے آپ سے بالکل بے گانہ ہوتی ہوئی وہ کئی کئی پہر کچھ کھاتی بھی نہ تھی۔ منزہ کو اس کی خاصی فکر رہنے لگی اپنی فکر کے ساتھ ساتھ......

اس رات بھی وہ سوہا کو سلا کے لیٹی ہی تھی کہ باہر ایک عجیب سے شور نے اسے ہڑبڑا کے اٹھنے پہ مجبور کیا۔ وہ فوراً کھڑکی تک آئی۔ پردہ ہٹا کے باہر دیکھنے پہ ایک عجیب ہی منظر آیا تھا۔

شمیم ٹیرس پہ تھی مگر کرسی پہ نہیں بیٹھی تھی۔ نیچے گری ہوئی تھی۔ جبکہ دونوں کرسیاں اوندھی گری ہوئی تھیں۔

اصغر اس کی کمر پہ ٹھڈے رسید کر رہا تھا اور ریٹا دونوں بازوؤں کو سینے پہ باندھے اس کے ایک قدم پیچھے کھڑی مسکرا رہی تھی۔

"اصغر یہ کیا کر رہے ہو؟"

وہ بھاگتی ہوئی کمرے سے نکلی اور حیا کے دونوں ہاتھوں سے اس کو بچانے کی کوشش کرنے لگی اس کوشش میں اسے بھی کئی ضربیں لگیں۔

"ہٹ جاؤ بھابھی! مجھے آج اسے ٹھیک کر لینے دو۔ ماں کو مرے دن ہی کتنے ہوئے ہیں یہ بے حیا سوگ والے گھر کا بھی لحاظ نہیں کر رہی اور آدھی رات کو بہت سے پتا نہیں کہاں بھاگ آیا ہے؟"

شمیم چپ چاپ مار کھا رہی تھی اور الزام سن رہی تھی۔ اس نے اپنے بچاؤ میں کچھ کہنے صفائی میں ایک لفظ تک کہنا تو دور کی بات ایک آنسو تک نہ بہایا تھا۔

"کیسا گندا ذہن ہے تمہارا اصغر! اپنی بڑی بہن کی بارے میں ایسا سوچتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی۔"

"تو یہ دوسری کر کیا رہی تھی بجائے رات کے اس وقت ماں کے پتنے پڑھ رہی تھی؟"

رینا نے اصغر کو مزید بھڑکانا چاہا۔

"اصغر تم اس کی بات پہ کان مت دھرو۔ اس کا اب تمہارے خاندان سے کیا واسطہ۔ اور کیا پتہ اس کی عزت کی، مجھے تو شک ہے شمیم کو بھی بھگا دینے والی یہی ہے۔"

"چل! تو اپنے کمرے میں۔"

وہ دونوں شمیم کو دھکے دیتے اس کے کمرے میں لے گئے۔ اور وہ خود پہ لگے الزام پہ ششدر بیٹھی رہ گئی اوپر سے آتی آوازوں سے صاف لگ رہا تھا وہ اسے زدوکوب کر رہے ہیں

"شمیم کے بھائی کا گھر ہے یہ... بیٹی رہے گی وہ عزت سے؟"

مرتی ہوئی ساس کی بات اسے یاد آئی اور ساتھ ہی یہ احساس اسے کپکپا گیا کہ یہ گھر اس کے تو کسی بھی کا اپنا نہیں ہے۔ اگر شمیم کے لیے یہ سائبان تنگ ہو سکتا ہے تو اس کی ذات تو کسی بھی وقت زد میں آ سکتی ہے۔

وہ اپنے کمرے میں جانے کے بجائے تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آئی اور کپکپاتی انگلیوں سے جمیل بھائی کے گھر کا نمبر ملانے لگی۔

* * *

اس کی ہمت نہ ہو رہی تھی دوبارہ اوپر جانے کی۔ نجانے کیسا عجیب سا خوف تھا جو اس کی ہڈیوں تک میں اترا جا رہا تھا۔

اس نے اصغر کی مار جہاں جہاں شمیم کے لگتے دیکھی تھی۔ اسے اپنے بدن کا وہ حصہ بے طرح دکھتا محسوس ہو رہا تھا۔ کچن کے بند دروازے سے لگی وہ اپنی ہچکیاں روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ آنسوؤں نے اس کا چہرہ، گردن اور ٹھنڈے پسینے نے اس کے کپڑے تک بھگو کر رکھ دیے تھے۔ اسے اپنے دھڑ دھڑ کرتے دل کے سوا کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ پتہ نہیں کب اصغر اور رینا نیچے اترے ہوں گے۔

پتہ نہیں شمیم کا اس وقت کیا حال ہو گا؟

وہ اب تک وہیں پڑی ہو گی یا...

منزہ اتنی تھڑدلی کبھی بھی نہ رہی تھی لیکن اس وقت وہ شمیم کی ہر تکلیف بھلائے بس اپنی فکر میں تھی۔ اسے ایک بار بھی یہ خیال نہ آیا کہ اسے شمیم کے پاس جانا چاہیے، اس کا حال جاننا چاہیے۔ اس وقت تو ایک ہی خیال تلوار کی طرح سر پہ لٹک رہا تھا۔

"مجھے یہاں سے نکلنا ہے... صبا کو لے کر ابھی اور اسی وقت نکلنا ہے ورنہ یہ مظہر کا گھر نہیں ہے۔ یہ میرا گھر نہیں ہے یہ صبا کا گھر بھی نہیں ہے... یہ... تو کچھ بھی نہیں ہے مجھے یہاں ایک منٹ بھی اور نہیں رکنا۔"

وہ خود کو مضبوط کرنے کی کوشش کرتے ہوئے دل ہی دل میں دہراتی جا رہی تھی۔

* * *

"بس چلیں بھائی جان... مجھے لے جائیں یہاں سے۔ جلدی کریں بھائی جان!"

وہ سوتی ہوئی صبا کو کاندھے پہ ڈالے جمیل کا ہاتھ پکڑے باہر نکلنے لگی۔

"بات کیا ہے منزہ! کیا ہوا ہے؟ کچھ تو بتاؤ..."

وہ اصل بات جانے بغیر اسے لے جانے پہ تیار نہیں تھا۔

"بس مجھے یہاں سے جانا ہے۔ آپ مجھے لے جائیں۔"

وہ بے حد خوفزدہ لگ رہی تھی۔ سہمی ہوئی، زرد سی۔

"کسی نے تمہیں کچھ کہا ہے منزہ؟" کلثوم نے بھی ہمدردی سے پوچھنا چاہا۔

وہ دونوں اس وقت رینا کے سجے سجائے ڈرائنگ روم میں کھڑے تھے۔ صبح کے آٹھ بجے تھے اور یہ وقت اصغر اور رینا کے جاگنے کا نہیں ہوتا تھا اس کے باوجود کلثوم کے سوال پہ وہ سہم کر ان کے بیڈ روم کے بند دروازے کو تکنے لگی۔

"کیا تمہاری دیورانی نے کوئی بکواس کی ہے؟ یا پھر یہ تمہاری سڑیل نند اس نے کچھ کہا ہے؟ کچھ تو بتاؤ۔"

کلثوم نے خود ہی اندازے لگائے... مگر شمیم کے ذکر پہ منزہ پہ پھر سے لرزہ طاری ہو گیا۔ وہ بھابھی کے گلے لگ کے رو پڑی۔

"شمیم... اسے بہت بہت مارا انہوں نے... وہ..." اس کی ہچکیوں کے ساتھ کہی بات جمیل کے پلے پوری طرح نہیں پڑی۔ جتنا وہ سمجھ سکا اس پہ ہی آپے سے باہر ہو گیا۔

"کیا کہا؟ انہوں نے تم پہ ہاتھ اٹھایا؟... اتنی جرأت ان لوگوں کی...؟ میں ایسے خاموشی سے تمہیں نہیں لے کر جاؤں گا میں ان کی..." وہ طیش میں آ کر دروازے کی جانب بڑھا مگر منزہ نے بازو سے تھام کے منت کی۔

"نہیں... نہیں بھائی جان! مجھے نہیں اس نے شمیم کو۔ بس آپ مجھے لے جائیں نا ورنہ وہ مجھے بھی... شمیم اس کی سگی بہن ہے۔ اور... اور میں تو کچھ بھی نہیں۔"

وہ رینا کی زبان کے جوہر جانتی تھی اور یہ بھی کہ اصغر رات سے نشے میں دھت ہے۔ وہ دونوں جمیل کے ساتھ کچھ بھی کر سکتے تھے اس لیے اس نے روکنا چاہا۔

"اب تمہیں احساس ہوا کہ تم ان کی کچھ بھی نہیں لگتیں۔ جب میں اور جمشید تمہیں سمجھاتے تھے تب تمہاری عقل میں یہ بات نہیں بیٹھتی تھی۔ بعض لوگ ٹھوکر کھا کے ہی ہوش میں آتے ہیں۔"

"حد کرتے ہیں آپ۔" کلثوم نے ٹوکا۔

"یہ کون سا وقت ہے ان طعنوں کا۔ اس کی حالت تو دیکھ کے ہی غصہ آ رہا ہے کہ پتہ نہیں اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا رہا ہے اور یہ بے وقوف چپ چاپ برداشت کرتی رہی۔"

"یہ سوچیں کہ اب ایسا کیا ہوا ہو گا جو اس کی برداشت کی حد ختم ہو گئی۔"

"آپ بس مجھے یہاں سے لے جائیں مجھے یہاں نہیں رہنا۔ میں یہاں بالکل غیر محفوظ ہوں۔ یہ گھر مظہر کا ضرور تھا لیکن اب وہ مجھے بچانے کے لیے یہاں نہیں آ سکتے۔ ہم چلتے ہیں بھابھی...!"

وہ صبا کو ایک کاندھے سے دوسرے کاندھے پہ منتقل کرتے ہوئے جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ جیسے "فوراً" سے پیشتر اس اذیت کدے سے نکلنا چاہتی ہو۔

"کیا...؟ ایسے ہی...؟ خالی ہاتھ...؟" کلثوم نے اس کا ہاتھ تھاما اور اوپر کا رخ کیا۔

"اپنا سامان تو لے لو۔"

"بھابی! مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ مجھے صرف یہاں سے جانا ہے۔" وہ ایک دم قدم آگے بڑھانے پہ آمادہ نہ ہوئی بلکہ کلثوم کا ہاتھ بھی کھینچ کے واپس لانے کی کوشش کی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو منزہ؟" جمیل ذرا جز بز ہوا۔

"ہم تمہیں لے جانے ہی آئے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ چلو گی مگر اپنا اور بچی کا سامان تو لے لو۔ کلثوم! یہ تو

بے وقوف ہے اور اس وقت جذباتی بھی ہو رہی ہے۔ مگر تم پریشان نہ ہو۔ اس کے تمام زیورات اور قیمتی اشیاء پیک کر لینا۔ فرنیچر اور دوسرے بھاری سامان کے لیے میں ٹرک منگوا رہا ہوں۔ اور ہاں مظہر کے کوئی ضروری کاغذات وغیرہ بھی ہیں کیا؟ کوئی سیونگ اکاؤنٹس، کوئی بینک یا پراپرٹی کے ڈاکومنٹس وغیرہ۔"

منزہ گم صم کھڑی یوں ٹکر ٹکر انہیں دیکھتی رہی۔ جیسے وہ کوئی اجنبی زبان میں بات کر رہا ہو۔ یا کسی اور سے مخاطب ہو۔

"تمہارے بھائی جان تم سے کچھ پوچھ رہے ہیں منزہ؟"

کلثوم نے اس کا شانہ ہلایا تو وہ جیسے ہڑبڑا کے چونکی۔

"پیپرز؟ نہیں شاید۔۔۔ نہیں۔۔۔ مگر آپ ٹرک کیوں۔۔۔"

"تمہارے جہیز کا سامان کیا ہمیں چھوڑ دیں؟"

"جہیز۔۔۔؟"

وہ ماؤف ہوتے دماغ پہ زور ڈال کر سوچنے لگی کہ اس کے جہیز کا کون سا سامان اس کے پاس ہے۔ دونوں بھائیوں نے متوسط طبقے کی اوقات کے عین مطابق مناسب سا ہی جہیز دیا تھا۔ نہ فریج تھا نہ ٹی وی نہ ہی کوکنگ رینج۔ ہاں جمشید نے قسطوں پہ ایک چھوٹا سا ٹی وی ضرور لیا تھا اور جمیل نے ایک لوکل کمپنی کی واشنگ مشین تحفے میں دی تھی۔ فرنیچر بھی درمیانہ سا تھا اور صرف بیڈ روم کے استعمال کے لیے تھا۔ جسے اگلے ہی سال مظہر نے چینج کر لیا تھا اور اسٹائلش سا خاصا مہنگا والا بیڈ روم سیٹ اور صوفہ خریدا تھا۔ پرانا والا کہاں گیا۔ یہ منزہ نے جاننے کی کوشش ہی نہ کی۔ کمرے میں رکھے فرنیچر کے ساتھ ساتھ وہاں بچھے قیمتی قالین، بھاری پردے، فانوس، روم فریج، ایل ای ڈی، سی ڈی ڈیک اور الماری میں سے کچھ بھی تو اس کے جہیز کا نہ تھا۔ ہاں اسٹور روم میں پڑے صندوق اور اس میں بھرے بستر، کمبل اور رضائیاں، استری اسٹینڈ اور اس پہ رکھی استری ضرور اس کے جہیز کی تھی۔ جو چند ایک برتن اس کے جہیز کے تھے کچن میں زیر استعمال تھے یا وہ اس نے کب کے ملازموں میں بانٹ دیے تھے۔

یہ حقیقت اس نے دبے لفظوں میں بیان کرنا چاہی۔

"تو کیا ہوا؟ یہ تو سب کچھ تمہارا ہی۔ تمہارے میاں کی کمائی کا ہے۔ تم کیوں دوسروں کے لیے چھوڑ کے جاؤ اور وہ بھی ان کے لیے جن کو نہ ضرورت ہے ان چیزوں کی نہ ہی کوئی قدر۔"

"اور کیا۔۔۔؟ تمہارے لیے یہ صرف لکڑی اور لوہے کی بے جان چیزیں نہیں ہیں۔ مظہر کی یادیں، اس کی نشانیاں ہیں۔ ان پہ صرف تمہارا حق بنتا ہے۔"

کلثوم کی بات سیدھا اس کے دل کو لگی۔

"واقعی ریحانہ کے لیے یہ سب کاٹھ کباڑ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ میرے جاتے ہی وہ ان سب چیزوں کو بھی نوکروں میں تقسیم کر دے گی۔ یا گلی میں پھینک دے گی۔" اس نے مزید کوئی تعرض نہ کیا اور چپ چاپ سب کچھ ہوتے دیکھتی رہی۔

کلثوم نے ہی الماری میں سے اس کے اور سوہا کے کپڑے اور دیگر اشیاء نکال کر سوٹ کیس میں پیک کیے۔ بچا سامان اس نے اسٹور میں رکھے خالی کارٹن میں ٹھونسا۔

"یہ اپنا زیور رکھو تو منزہ یہی ہے نا سارا۔"

"ہوں۔۔۔" وہ کسی گہرے خیال سے چونکی۔

یہ سب تماشا اسے بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔

"جی۔۔۔ یہی ہے۔" ایک گہری سانس لے کر اس نے کہا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

اب جب بھائی بھابھی کے آنے سے ذرا ڈھارس بندھی تو وہ شمیم کے پاس جانے کی ہمت کرنے لگی۔

"شمیم۔۔۔" ذرا سا دروازہ کھول کے اندر جھانکتے ہوئے اس نے آواز دی۔ "شمیم۔۔۔ کہاں ہو تم؟"

وہ دروازہ کھول کے اندر آ گئی مگر شمیم اسے نظر نہ آئی۔

وہ پلٹنے لگی تھی کہ کھلے دروازے کے پیچھے دیوار سے کمر ٹکائے اسے زمین پہ بیٹھے دیکھا۔

اس کے خشک ہونٹوں کے ایک سرے سے خون بہہ کر جم چکا تھا۔ اس کے گرد آلود بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے۔

اور مٹی سے اٹے ہوئے چہرے پہ آنسوؤں کے خشک ہوتے نشانات عجیب گڈمڈ راستے بنائے ہوئے تھے۔

"شمیم۔۔۔" وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اور اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

منزہ کے پاس اس سے کہنے کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ تسلی کے چند بول نہ ہمدردی کے کچھ الفاظ۔

"میری اماں مر گئی۔"

اچانک شمیم کے اندر سے ایک کراہ سی ابھری۔

"میری ماں مر گئی۔ میں یتیم ہو گئی۔"

اس کے آنسو خشک تھے۔ مگر اس کے لہجے میں آنسو تھے۔ منزہ بری طرح رو پڑی۔

"مجھے معاف کرنا شمیم! مجھے تمہیں چھوڑ کے واپس جانا پڑ رہا ہے۔ میں اتنی کم ظرف نہیں ہوں کہ جس عورت نے اتنے دن تک میرا خیال رکھا، میری حفاظت کی، میری ڈھال بنی رہی۔ میری دیکھ بھال کرتی رہی، اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی میں اس کی بیٹی کو چند دن بھی نہ سنبھال سکوں اور اس کو سہارا دینے کی بجائے اپنا راستہ الگ کر لوں۔ مگر مجھے یہ کم ظرفی دکھانی پڑ رہی ہے۔ کیونکہ میں ایک عورت ہوں۔ مجھے اپنا عورت پن اور اپنی بیوگی کی حرمت بہت عزیز ہے۔ مجھے اسے بچانا ہے۔ مجھے جانا پڑ رہا ہے۔ شمیم مجھے تمہیں اس حال میں ان درندوں میں چھوڑ کے جانا پڑ رہا ہے۔ مجھے معاف کر دینا۔"

اس نے روتے ہوئے اس کے آگے ہاتھ جوڑے۔ شمیم چند سیکنڈ اپنی ویران آنکھوں سے اس کے بندھے ہاتھ دیکھتی رہی پھر اس کے لب حرکت میں آئے۔

"میری ماں مر گئی۔"

منزہ کو اپنا دل پھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ وہ اٹھی اور تیر کی طرح اس کے کمرے سے نکل گئی۔

"سامان تو پیک ہے۔" کلثوم نے اس کے اندر آتے ہی اطلاع دی۔ وہ حیرت سے اپنے کمرے کو دیکھنے لگی جسے اس نے اور مظہر نے دل کے کتنی محبت اور شوق سے سجایا تھا۔

ڈریسنگ ٹیبل اور کارنر ٹیبلز بالکل خالی اور اجڑی ہوئی پڑی تھیں۔ کلثوم نے بستر کی چادر تک کھینچ لی تھی اور کمبل بھی۔ دیواروں پہ سے تصویریں تک اتار لی تھیں۔

یہ اجڑی ویران دیواروں والا کمرہ اسے یکسر اجنبی محسوس ہوا۔ اس نے اپنے دل کو ٹٹولا، یہاں اسے کمرے سے وابستہ کوئی جذبہ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔

"یعنی یہ آخری وابستگی بھی ختم ہو گئی اس گھر سے۔ پہلے مظہر بچھڑا اور اب یہ کمرہ۔ شاید اچھا ہی ہوا۔ اب یہاں سے جاتے ہوئے اتنی تکلیف بھی نہیں ہو گی۔"

"تمہارے بھائی جان مظہر کے کچھ کاغذات کی بات کر رہے تھے۔"

"ایسے کوئی کاغذات نہیں ہیں بھابھی! مظہر اپنی جاب میں مگن تھے ان کا کبھی دھیان ہی نہیں گیا اس جانب۔"

"تم سیف چیک تو کرو۔"

ان کے اصرار پہ وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھی اور مظہر کی ذاتی استعمال کی چابیوں کا گچھا اٹھا کر سیف چیک کرنے لگی۔

منزہ اور سوہا کی چند تصاویر، اس کی تعلیمی اسناد… کچھ ضروری امور سے متعلق کاغذات اور بس…"

سیف دو پارہ ڈالی کرتے سے پہلے اس نے دفتری فائلز کھنگالیں… سب کچھ سمیٹ کر اس نے بیگ میں رکھا اور چابیاں نکالتے نکالتے رک گئی۔ آگے بڑھ کے آٹھ پاؤں۔ لاؤنج کی چابی بھی اس کے بیگ میں تھا۔ جس کے سرے پہ دو نقرئی بندے جگمگا رہے تھے۔ M-M

پیچھے سے آتے شور پہ وہ متوجہ ہوئی۔

"لاؤ یہ ٹیبل ٹرک لے کر آئے ہیں تم سوہا کو اٹھاؤ… پیچھے چلتے ہیں۔ وہ خود مزدوروں کے ساتھ کمرے کی جانب بڑھ گئے۔"

"بھائی میں تو کہتی ہوں اس کی ضرورت نہیں ہے خواہ مخواہ میں…" لیکن اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ پیچھے سے آتی اصغر کی چیخ و پکار نے اسے پھر بولنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

دونوں فوراً سیڑھیوں کی جانب لپکیں۔

"تم کس کی اجازت سے میرے دروازے تک ٹرک لائے ہو؟"

وہ اب نشے کی حالت سے خاصا باہر آ چکا تھا مگر سرخ ہوتی آنکھوں اور بوجھل غصیلی آواز کے ساتھ منزہ کو اب بھی اتنا ہی خوفناک لگ رہا تھا جتنا رات کو۔

"مجھے یہاں سے اپنی بہن کو لے جانے کے لیے کسی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔"

"تم شوق سے اپنی بہن کو لے جا سکتے ہو… مگر سامان کو ہاتھ مت لگانا۔ تم نے جہیز میں جو پرانی لکڑیاں دی تھیں اب تک کباڑیا بھی راکھ کر چکا ہوگا۔ یہ سب سامان اس گھر کا ہے۔"

"یہ سامان میری بہن کے استعمال میں ہے۔ اس کے مرحوم شوہر کی ملکیت… تم کون ہوتے ہو اسے لے جانے سے منع کرنے والے۔"

"بھائی جان رہنے دیں۔ کیوں بات بڑھاتے ہیں۔"

وہ کمزور سی آواز میں انہیں منع کرنے لگی۔

"تم چپ رہو… کوئی ضرورت نہیں اس سے دبنے کی۔"

"ارے! یہ کیا ہنگامہ مچا ہوا ہے… سویرے سویرے۔"

ریتا بھی کمرے سے نکل آئی۔ نائٹ ڈریس میں ملبوس، مندی مندی آنکھوں کے ساتھ صبح کے ساڑھے نو بجے کو پوری معصومیت کے ساتھ سویرے سویرے کہہ رہی تھی۔

"تم اندر چلو ریتا! میں ان سے نمٹ کے آتا ہوں۔ بڑے بھلے سے آئے ہیں یہ اصغر کے گھر سے سامان لے جانے والے۔"

"کیا کروں اندر جا کے… نیند تو خراب کر ہی دی ہے۔"

اس نے ایک بھرپور انگڑائی لی تو منزہ نے بے اختیار نظریں جھکا لیں۔ وہ اس وقت جس نائٹی میں ملبوس تھی وہ اسے ڈھکنے کے لیے ناکافی تھی۔

"بے غیرت… ادھر اچھل اچھل کے چلا رہا ہے۔ پیچھے کھڑی بیوی کی بے حیائی نہیں نظر آ رہی۔"

کلثوم نے بھی بڑبڑا کے تبصرہ کیا۔

"دیکھو اصغر! بدزبانی کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے منزہ سے تمہارے رشتے کا احساس ہے اس لیے لحاظ کر رہا ہوں ورنہ دیکھتا ہوں تم کیسے مجھے یہ سامان لے جانے سے روکتے ہو۔"

"کون روک رہا ہے تمہیں… لے جاؤ جو لے جانا ہے… لے جاؤ۔" ریتا نے شاہانہ انداز میں مداخلت کی۔

"ریتا! تمہیں کچھ نہیں پتہ۔ تم اندر جاؤ۔ یہ بھرجائی کا بھائی… اسے تو لے جا ہی رہا ہے، ساتھ ساتھ یہ سارا سامان…"

"ہوں… سامان…" اس نے اصغر کی بات کاٹی۔

"یہ کار… گھر کا فرنیچر… یہ پرانا فریج، ایل ای ڈی… کیا کرنا ہے ہم نے اس کا… لے جانے دو… غریب آدمی ہے کچھ تو کام آ جائے گا۔"

جمیل تلملا کے رہ گیا وہیں منزہ کا سر اور جھک گیا۔ وہ ریتا کی جانب سے ایسی ذلیل باتوں کی توقع نہیں کر رہی تھی۔

اصغر کے ہونٹوں پہ لطف لینے والی مسکراہٹ ٹھہر گئی۔

"بیوی ٹھیک ہے۔ آخر یہ میرے بھائی کی نشانی ہے۔"

"… اصغر! کن باتوں میں پڑ رہے ہو۔ جانے والوں کی نشانیوں کو سینے سے لگا کے کیا ملے گا۔ آنے والوں کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ ویسے بھی ہم نے اوپر والا پورشن سیٹ تو کرنا ہی تھا۔ تم اپنی اس بچی کا خیال کر کے رکے ہوئے تھے۔ چلو اچھا ہے بھابھی محترمہ کو بھی خیال آ گیا۔ جانے دو انہیں اور لے جانے دو سوغات لے جانا چاہتے ہیں۔"

"تمہارا دل کتنا بڑا ہے ریتا!" اصغر متاثر ہی تو ہو گیا۔

"جاؤ… لے جاؤ… میری ریتا نے اجازت دے دی ہے۔"

منزہ کو پتہ نہیں کس چیز سے گھن محسوس ہوئی۔ ایک عجیب کراہت کا سا احساس ہونے لگا۔

"رہنے دیں بھائی جان! کسی چیز کو ہاتھ مت لگایئے گا۔ میں اب یہاں سے اپنی بچی کے سوا کچھ نہیں لے کر جاؤں گی۔"

"جذباتی مت ہو منزہ… یہ تمہاری اپنی چیزیں ہیں۔ کسی کی بکواس کی وجہ سے…"

جمیل نے سمجھانا چاہا مگر ریتا نے استہزائیہ قہقہہ لگا کے اس کی بات کاٹ دی۔

"ہاں ہاں بھابھی… بات مان لو اپنے بھائی کی۔ اب یہ غریب بار بار تمہارا جہیز کہاں بنا پائے گا۔" منزہ نے تڑپ کے اسے دیکھا۔

"ظاہر ہے لے جا رہا ہے تو ساری عمر سر پہ تو بٹھا کے نہیں رکھے گا۔ کہیں نہ کہیں رخصت ہی کرے گا۔ ہو سکتا ہے تمہارا اپنا ارادہ ہو کسی سے نکاح پڑھوانے کا جبھی بھائی کو بلوا کر بوریا بستر سمیٹ رہی ہو۔ لے جاؤ سارا سامان۔ نئی شادی پہ پرانے شوہر کا تحفہ سمجھ لینا۔" اس نے ایک زہریلا قہقہہ لگایا۔

منزہ کو زور کا چکر آیا۔ اس سے پہلے کہ وہ چکرا کے گر جاتی کلثوم نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے لے کر آگے بڑھ گئی۔

"چاچو…"

ماں کی انگلی تھامے باہر نکلتی سوہا نے پیچھے مڑ کے اصغر کو دیکھ کے مسکراتے ہوئے پکارا۔

اصغر کو عین اسی لمحے اپنے نشے کے سارے اثرات زائل ہوتے محسوس ہوئے۔

"کدھر…؟" ریتا نے اس کا بازو تھام کے آگے جانے سے روکا۔

"وہ سوہا… اسے پیار تو دے دوں۔"

"اسے تمہارے پیار کی ضرورت ہوتی تو اس کی ماں خود ہی یہاں رہتی اور اسے بھی رکھتی۔ دفع کرو… جانے دو انہیں۔ اتنے سال تم نے پلکوں پہ بٹھایا۔ بھرجائی بھرجائی کرتے منہ سوکھتا تھا تمہارا اور آج یہ سب کیا کرایا کنویں میں ڈال کے بھائی کے گھر چل پڑی۔ لوگ تو تمہیں ہی باتیں سنائیں گے کہ بیوہ بھابھی کو چار دن سنبھال نہ سکا۔ اب لوگوں کو کیا بتایا جائے کہ بھابھی اپنی راہ نکالنے کے لیے نند کا استعمال کر رہی تھی۔ اسے خراب کر رہی تھی۔"

"ہاں بس یہ بات نہ ہوتی تو میں کبھی اسے یہاں سے نکلنے نہ دیتا لیکن بھرجائی نے اس گھر کی عزت اچھال کے اچھا نہیں کیا۔ میں کتنا مان دیتا تھا اسے… اور سوہا… اسے تو ہمیشہ اپنی اولاد ہی سمجھا تھا۔"

"چلو بھول جاؤ سب۔ بلکہ وقت خود بھلا دے گا' جب اپنی اولاد ہوگی تو۔"

"یہ تو صحیح کہا تم نے۔"

وہاں بکھرے مسکراہٹیں پھیل رہی تھیں۔ قہقہے اور سرگوشیاں ابھرنے لگیں۔ یہ یکسر فراموش کرتے ہوئے کوئی اس دہلیز پہ چند لمحے قبل ہی اپنے آنسوؤں کے نشان چھوڑ کے گیا ہے۔

✲ ✲ ✲

"یہ کیسی قید ہے ابا جی؟"

کئی ماہ تک جلنے کڑھنے اور خاموش احتجاج کرنے کے بعد بالآخر وہ پھٹ پڑا۔

"جعفر پتر! قید کیسی؟ تیری زمینیں ہیں' تیری جاگیر ہے یہ ساری بس راکھا بننے کے مزے لوٹ۔"

محمود احمد نے اپنے بیٹے کو ٹھنڈا کرنے کی کوشش کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں کہا جس کے لہجے سے سرکشی اور بغاوت کی بو آرہی تھی۔

"مجھے یہ مزے لوٹنے ہوتے تو میں اتنی تعلیم کیوں حاصل کرتا۔ آپ اچھی طرح جانتے ہیں ابا جی! کہ مجھے زمین جائیداد سے بھی کوئی دلچسپی نہیں رہی۔"

"تیرے پاس ہے نا' اس لیے۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔ "اسی لیے قدر نہیں ہے۔ پاگلا! یہ اپنی زمین اپنی ماں ہوتی ہے۔ اس کی خاطر تو جان لینے اور جان دینے تک کا سودا کرنا پڑتا ہے اور تو کہہ رہا ہے کہ تجھے دلچسپی نہیں ہے۔ بس اب تو اب لینا شروع کر۔"

"آپ نے خود مجھے ملازمت کرنے کی اجازت دی تھی۔" اس نے یاد دلانا چاہا۔

"ملازمت کرنے کی دی تھی' حرام کاریاں کرنے کی نہیں دی تھی۔" نرمی سے بات کرتے کرتے محمود احمد ایک دم گرجے۔ جعفر محمود کا سارا طنطنہ ہوا ہو گیا۔

"تو اپنا گھر تو خراب کر رہا تھا' ساتھ ساتھ بہن کی گھر بستی بھی اجاڑنے چلا تھا جس بے چاری کا کہیں بڑھ کے ولیمے جا کے جوڑ ملا تھا۔"

"مجبوراً جوڑے اس بے جوڑ رشتے کے احسان تلے دبا کے ہی تایا جی اور اب بھائی صاحب شیر ہو گئے ہیں۔"

"بکواس بند کرو' اب تمہیں اپنے بڑوں سے بات کرنے کی تمیز بھی نہیں رہی اور کیوں رہے' بازاری لوگوں میں اٹھ بیٹھ کر تم نے اپنا بیڑہ غرق کر لیا ہے۔"

"میری اس ایک غلطی کے طعنے کب تک دیں گے آپ؟" وہ زچ ہوا تھا۔

"کیا میں کوئی سولہ سترہ سال کی لڑکی ہوں جسے کسی غلطی کی پاداش میں آپ ٹانگیں توڑ کے چار دیواری میں بٹھا دیں گے۔"

"تم مرد ہو' اسی لیے تمہاری ٹانگیں سلامت نظر آرہی ہیں۔" ان کا لہجہ بدستور سخت تھا۔

"خاندان کی عزت کے معاملے میں مرد اور عورت دونوں کی ذمہ داریاں ایک سی ہیں۔ تم یہ ذمہ داری نبھا نہیں سکے' اس لیے۔"

"بس کیجیے ابا جی! ایسا کون سا دنیا سے نرالا کام کر لیا ہے میں نے۔ اکرم بھائی صاحب کیا کچھ نہیں کرتے' آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی' میرا منہ مت کھلوائیے۔ سب جانتا ہوں میں۔ جاگیرداروں کے شوق کس قسم کے ہوتے ہیں۔"

"اکرم کا نام لینے کی گستاخی مت کرو۔" وہ جیسے کہ اپنے لاڈلے بھتیجے اور سرچڑھے داماد کا نام لینے پہ راضی نہ تھے۔

"[illegible] نہیں بابا! کیا یہ دن نہیں روک سکتا یہاں۔" جعفر محمود نے رکھائی سے اعلان کیا۔

"[illegible] مستحق تو لوا دیا ہے۔ مگر یہ نہ سمجھیں کہ میں باقی کی عمر آپ کے داماد کا اسسٹنٹ بن کے گزار [illegible] خوش ہیں۔ میرے کرنے کے لیے یہاں ہے ہی کیا؟"

"[illegible] نے شروع سے ہی اس کام میں دلچسپی نہ لی تھی۔ میں کیا باپ دادا کی جاگیر مٹی ہونے دیتا۔ یہ تو اکرم کا [illegible] ہے کہ اپنی زمینوں کے ساتھ ساتھ میری بھی دیکھتا ہے۔ تم کچھ عرصہ اس کے ساتھ ساتھ رہو' سیکھو کہ اتنی [illegible] زمینیں اور جائیدادیں کو کیسے سنبھالتے ہیں۔ آخر کل تمہیں ہی یہ ذمہ داری اٹھانی ہے۔"

"[illegible] کل کس نے دیکھی ہے۔ آپ بہت بھولے ہیں ابا جی! اکرم بھائی صاحب اتنی آسانی سے ہاتھ آئی [illegible] جانے نہیں دیں گے۔"

"[illegible] فکر ہو رہی ہے اپنے حق کی۔ پہلے اپنی آوارگی کے شوق میں اور گھر' بچوں اور بیوی سے دور رہنے کے لیے اپنی مرضی سے سب کچھ اس کے حوالے کیا تھا۔ بات صرف اتنی ہے کہ تم اکرم پہ اپنا غصہ نکال رہے ہو اور اس وجہ سے بے کار کے الزام لگا رہے ہو اس پہ۔"

وہ کچھ دیر کڑے لبوں سے مٹھیاں بھینچتا رہا اور اس کے بعد ایک جھٹکے سے مڑ کے کمرے سے نکل گیا۔

اپنے کمرے میں آکے اس نے زور سے ہینڈل گھما کے دروازہ کھولا۔ حساب کی کاپی پہ جھکی مدیحہ اور تحریم ایکدم سے اچھل گئیں۔

"کیا ہوا؟"

مدیحہ نے اس کا لال بھبھوکا ہوتا چہرہ اور اضطراری کیفیت دیکھ کر پوچھا۔

جواب میں جعفر نے اسے ایسی خونخوار اور کھا جانے والی نظروں سے گھورا کہ وہ چپ کر گئی اور دوبارہ تحریم کو پڑھانے لگی۔

"تحریم فوراً کو باہر سے ڈیوائڈ کرو تو......"

"تم اپنا یہ ٹیوشن سینٹر کہیں اور جا کے نہیں کھول سکتیں؟ جہالت تو ختم ہے اس عورت پہ۔ بچیوں کا الگ کمرہ ہے مگر عین اس وقت انہیں اندر گھسائے دماغ چاٹنے لگتی ہے جب میرا آرام کا موڈ ہو۔"

اس کی بڑبڑاہٹ کے جواب میں مدیحہ نے ایک گہری سانس لی اور وضاحت پیش کی۔

"آپ کو پتہ تو ہے تنزیلہ کو ٹمپریچر ہے۔ میں ابھی ابھی اسے سلا کے آئی ہوں۔ نظیر کو بھی اماں جی کے کمرے میں چھوڑا ہے اور اسے یہاں لا کے پڑھا رہی ہوں تاکہ اس کی نیند ڈسٹرب نہ ہو۔"

ایک لمحے کے لیے وہ چپ ہوا۔ اس کے بعد مزید گرجے۔

"سب کے آرام کا خیال ہے۔ ایک میرے آرام کے علاوہ۔"

"میں کہاں جا کے پڑھاؤں اسے۔" وہ بھی زچ سی ہو گئی۔

"آپا آئی ہوئی ہیں۔ ان کے بچے کھیل کود میں مصروف ہیں۔ بھائی صاحب اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھک میں ہیں۔ اماں جی کے ساتھ والے کمرے میں آپا نے اپنے بچوں کو آیا ٹھہرائی ہوئی ہے۔ اتنا بڑا گھر ہے اور کہیں جگہ نہیں' جہاں میں سکون سے بچی کو پڑھا لوں۔ تحریم کا حساب کا پرچہ ہے صبح اور اسے تیاری کرنی ہے۔"

"ایک تو تمہارے بھائی صاحب کو اپنے گھر چین نہیں ہے۔"

"معاف کیجیے گا۔ اس وقت جو یہاں بیوی بچوں سمیت موجود ہیں' وہ میرے بھائی صاحب نہیں' آپ کے بہنوئی صاحب ہیں۔" مدیحہ نے بھی فوراً ترخ کے جواب دیا۔

"وہ اپنے چچا کے گھر یا بہن کے سسرال میں رہنے نہیں آئے۔ یہ ان کی بیگم ہیں جن کا دل گھر میں نہیں لگتا۔ اماں کے چچا چچا کے کہنے پہ۔" جعفر کو شدید غصہ آگیا۔ وہ نوٹ کر رہا تھا کہ اب مدیحہ اس کے آگے دوبدو جواب دینے لگی ہے۔ پہلے والا ادب لحاظ تو جیسے اسے یاد ہی نہیں رہا تھا۔ اس کے خیال میں بیوی کی نظر میں بے وقعت

کرتے تھیں اپاجی اور عظیم بڑے ہی پیش پیش تھے۔

"بچی ہے، دوسرے بچوں کو دیکھ کر ضد کرتی ہے اور مچلنے لگتی ہے۔ اس کا بھی تو پڑھائی سے اچاٹ ہو رہا ہے۔ اس لیے تو دالان میں جا کے پڑھا سکتی ہوں نہ باغیچے میں اور نہ ہی حویلی کے اندر۔ کیا علم آپ تو اس کا دھیان کر لیں۔"

"تمہیں بڑا دھیان ہے۔"

"ہاں ہے۔ مجھے اپنی بچیوں کی پڑھائی کا خیال نہیں ہوگا تو اور کسے ہوگا؟"

"اتنا ہی خیال ہوتا تو یہاں اس قصبے میں رہتے ہوئے اپنے بھائی کے احمقانہ فیصلے پہ سر نہ جھکا دیتیں۔ یہاں رہ کر وہ کون سی اعلا تعلیم حاصل کر لیں گی۔"

"آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

"ہم اسلام آباد جا کے دوبارہ سیٹل ہو سکتے ہیں۔ اعلا تعلیمی اداروں میں بچیوں کو پڑھا سکتے ہیں۔ اس حویلی کی گھٹن سے دور ایک صاف ستھرے ماحول میں۔ یہاں گھر کے مکینوں کی زیادہ تعداد ان پڑھ اور گنوار ملازموں کی ہے، خانہ بدوش عورتوں اور ان کے ریں ریں کرتے بچوں کی صحبت میں ہماری بچیاں کس قسم کی تربیت حاصل کریں گی۔"

"یہ آپ بچیوں کے لیے کہہ رہے ہیں یا پھر...؟"

مدیحہ نے بڑے جھجکتے انداز میں اپنی بات ادھوری چھوڑی تھی۔

"تمہارا دماغ خراب ہے مدیحہ!" وہ جھنجلا گیا۔

"اور آپ کی نیت۔" بڑے آرام سے جواب دے کر وہ تحریم کا بیگ بند کرنے لگی۔

"جاؤ تم جا کے کھیلو۔ باقی پڑھائی ذرا ٹھہر کے۔" تحریم کے جانے کے بعد جعفر نے سنجیدگی سے اسے مخاطب کیا۔

"دیکھو مدیحہ! میں مانتا ہوں۔ پوری دیانت داری سے یہ تسلیم کرتا ہوں کہ میری اس خواہش کے پیچھے بچیوں کا محفوظ مستقبل نہیں ہے لیکن میں قسم کھا کے کہتا ہوں کہ ایسا بھی کچھ نہیں ہے جیسا تم سمجھ رہی ہو۔ میں... میں بس یہاں سے نکلنا چاہتا ہوں۔"

وہ اتنا بے بس نظر آ رہا تھا کہ مدیحہ کو یک بارگی اس پہ ترس سا آنے لگا۔

"میں تمہارے بھائی کی مٹھی سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ میرا دم گھٹنے لگا ہے اب۔"

"نہ بھائی صاحب مانیں گے نہ اباجی۔"

"تم منا سکتی ہو۔" وہ بڑی آس سے اسے دیکھنے لگا۔

"لیکن آپ تو مستعفی ہو کے آئے تھے۔"

"کوئی کاروبار شروع کر لوں گا۔ کچھ بھی مگر یہ زمینوں، فصلوں اور قرضوں کے حساب کتاب میرے بس کی بات نہیں اور مدیحہ! اگر تم بھی اپنے بھائی کی طرح یہ سمجھتی ہو کہ مجھے زبردستی اس حویلی میں قید رکھ کے تسلط قائم کر سکتی ہو تو تمہاری یہ سوچ غلط ہے۔ ایک ہی چھت کے نیچے رہتے ہوئے ہمارے درمیان ایسے فاصلے آ سکتے ہیں جو تمہیں پچھتانے پہ مجبور کر سکتے ہیں لیکن اگر... اگر غلامی کے اس احساس سے چھٹکارا مل جائے شاید... شاید حالات میں بہتری ہو۔ اگر ذہن و دل کو تازہ ہوا ملے تو..."

"یعنی تمہیں حاصل کرنے کے لیے مجھے تمہاری ڈور کو ایک بار پھر ڈھیل دینا ہوگی۔" مدیحہ نے اس کی بات سننے کے بعد سوچا۔

"یہ تو بہت بڑا رسک ہے۔ پتا نہیں مجھے یہ رسک لینا چاہیے یا نہیں۔"

"کیا سوچ رہی ہو؟"

"پتا نہیں... بچیوں کی بات کرتی ہوں بھائی صاحب سے۔"

٭ ٭ ٭

"نانو..."

وصی ابھی سو کر اٹھا تھا اور آنکھیں مسلتا کمرے سے نکلا۔ نانی اسے کہیں نظر نہیں آئیں تو اس کے انداز میں بے چینی آ گئی۔ نہ صرف نانی بلکہ امی بھی کہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔

"نانی... امی...!"

صحن کے درمیان کھڑا ہو کے وہ حلق پھاڑ کے چلایا اور پھر رونے لگا۔

باتھ روم میں نہانے کے بعد اپنے گیلے بال تولیے میں لپیٹتی ہوئی پروین کا دل ایک بار تو کانپ ہی اٹھا۔

وہ افتاں و خیزاں باتھ روم سے باہر نکلی۔

"کیا ہو گیا اماں جی کو۔ ابھی اچھا بھلا تو سوتے پہ چھوڑ کے آئی تھی۔" وصی کے یوں ہلکان ہو کر رونے اور نانو کو پکارنے پہ یہی اندیشہ آ سکتا تھا اسے۔

"اماں جی...!" وہ بھی پکارتی ہوئی باہر آئی۔ دیکھا تو صحن میں وصی آنسوؤں اور چیخوں کے ساتھ رو رہا تھا۔

"امی..." اسے دیکھتے ہی وہ دوڑ کے آیا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ گیا۔

"امی... آپ کدھر تھیں؟"

"نانو کو کیا ہوا ہے وصی؟ کہاں ہیں نانو؟" وہ بھی گھٹنوں کے بل بیٹھ کے اسے ہلا ہلا کے پوچھنے لگی جو اس کی ٹانگوں سے الگ ہونے پہ تیار نظر نہ آتا تھا۔

"نانو نہیں مل رہیں امی! آپ بھی نہیں مل رہی تھیں۔" وصی ڈر گیا۔

"میں تمہاری ہی بیٹا! نانو... نانو کہاں ہیں؟"

وہ بھی کچھ پریشان سی ہوئی۔ اتنے میں رخشندہ نے اوپر سے جھانکا۔

"وصی کو کیا ہوا ہے؟ گر گیا ہے کیا؟"

"بھابھی! اماں جی پتہ نہیں کہاں چلی گئیں۔"

وہ اس کا سوال نظرانداز کرتے ہوئے فکرمندی سے بتانے لگی۔

"وہ بھلا کہاں جا سکتی ہیں۔"

رخشندہ کا اطمینان قابل دید تھا۔

"یہ تو پریشانی کی بات ہے۔ وہ بغیر بتائے کہیں جاتی نہیں بلکہ اکیلی تو کہیں بھی نہیں پھر..."

قریب تھا کہ وہ رو دیتی کہ رخشندہ نے کہا۔

"ابھی میں نے اوپر سے دیکھا تھا، سبزی والے سے بھاؤ تاؤ کر رہی تھیں۔" اتنا کہہ کر وہ جھپاک سے اندر غائب ہو گئی۔ پروین کی جان ہی جل کے رہ گئی۔

"یہی جلدی اطلاع دی ہے۔ ایک تو رخشندہ بھابھی نہ سمجھ میں آنے والی چیز ہیں۔"

ابھی وہ یہ کڑھ رہی تھی کہ شوکت جہاں سبزی کی ٹوکری اٹھائے اندر آ گئیں۔

"نانو... نانو کہیں..."

وصی بھاگ کر آ کے ان کی ٹانگوں سے ایسے ہی چمٹ گیا جیسے پروین سے چمٹا ہوا تھا۔

"ہائے! کہاں کھو گئی تھیں تیری نانو...؟"

وہ اس کے بال سہلاتے ہوئے اسے الگ کرنے لگیں۔

"اماں یہ وصی رو رہا تھا۔"

شک کرنے لگیں جیسے میں اپنے لیے یہ جائیداد ہتھیانا چاہتا ہوں۔"

تنزیلہ بیگم نے بیٹے کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش کی مگر جمیل کچھ سننے پہ تیار نہ ہوا اور کمرے سے نکل گیا۔ جمشید کا فون آیا تو اس نے اسے بتایا۔

"میں نے تو ان کے بھلے کے لیے یہ کہا تھا۔ یہ کوئی چند ہزار کا فرنیچر یا استعمال شدہ ٹی وی اور فریج کی بات نہیں ہے جو اتنی آسانی سے لیا جائے۔ اس کا اٹھنا بیٹھنا جرائم پیشہ لوگوں میں ہے اور بیوی بھی وہ جس قتل کی سازش کے بعد اس سے کچھ بھی بعید نہیں۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بھائی جان یا ان کی فیملی میری وجہ سے کسی مشکل میں پڑے۔ دوسری بات یہ کہ وہ کیس اتنا آسان نہیں جتنا وہ سمجھ رہے ہیں۔ ان کے پاس سے کیا تو وہ برسوں عدالتوں کے چکر میں پڑ کے پیسہ لٹا دیں گے۔ آپ انہیں سمجھائیں کہ جائیداد میں حق وغیرہ کی بات مقدمے بازی میں پڑ کے حاصل وصول کچھ نہیں ہونے والا الٹا مصیبت گلے پڑے گی۔"

جمشید بات کی تہہ تک اتر گیا اور بھائی کو سمجھانے کا وعدہ بھی کر لیا منزہ سے۔

"تمہیں منزہ نے بھڑکایا ہے؟" جمیل چھوٹتے ہی بولا۔

"اس نے صرف آپ کو سمجھانے کی بات کی تھی اور یہ ایسا غلط بھی نہیں۔ آپ خود سوچیں۔ چار پانچ... یا شاید اس سے بھی زیادہ برسوں تک وکیلوں کی فیسیں اور عدالت کی پیشیاں بھگتانے کی ہمت ہے آپ میں؟"

"ایک لحاظ سے تم بھی ٹھیک کہہ رہے ہو لیکن غلط میں بھی نہیں۔ دراصل یار...!"

جمیل کچھ ڈھیلا پڑا اور جمشید کو احساس ہوا کہ اصل بات کوئی اور ہے۔

"میں نے سوچا تھا منزہ کو اس کا حصہ مل جائے گا تو اسے اور اس کی بچی کو تحفظ بھی حاصل ہوگا۔ دونوں کے نام سے کوئی پراپرٹی خرید دوں گا۔ فلیٹ لے کر وہیں سیٹل کر دوں گا۔"

"کیا؟" جمشید حیرت سے اچھل گیا۔

"الگ فلیٹ میں؟ مگر کیوں؟ ایک اکیلی عورت، ننھی سی بچی کے ساتھ اکیلی... کیا ہو گیا ہے آپ کو۔ میں نے اس سے پہلے بھی منزہ اور اس کی بیٹی کے لیے جیب خرچ بھیجا ہے۔ اگلے ماہ سے خرچہ دگنا بھیج دوں گا۔ آپ کو تردد کرنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کے گھر میں اتنی جگہ تو ہوگی کہ وہ دونوں سر چھپا کے کہیں رہ لیں۔ باقی کا سارا خرچہ میں اٹھاؤں گا۔"

"بات دو وقت کے کھانے یا رہنے کی نہیں ہے جمشید! جیسے اکیلی عورت کا ہمارے معاشرے میں رہنا برا سمجھا جاتا ہے، ایسے ہی ایک گھر میں کسی غیر مرد کی موجودگی میں رہنا بھی اچھا نہیں جانا جاتا۔"

"غیر مرد؟"

"بھول گئے...؟ ایک بار ذکر تو کیا تھا کہ کلثوم کا چھوٹا بھائی آسٹریلیا سے واپس آ گیا ہے اور سکھر اپنے گھر رہنے کے بجائے ہمارے ہاں رہ رہا ہے کیونکہ وہ اپنا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس یہاں سیٹ کر رہا ہے۔"

جمشید کو یہ بات سن کر چپ لگ گئی۔ اسے بھائی کی خود غرضی پہ جی بھر کے افسوس ہو رہا تھا اور اس سے بھی کہیں زیادہ افسوس اپنے اتنے دور رہنے پہ۔

"ابھی تو وہ دوبارہ آسٹریلیا گیا ہوا ہے بزنس کے ہی کسی سلسلے میں مگر اگلے ہفتے واپس لوٹ رہا ہے۔ ہو سکتا ہے چند دن اور لگ جائیں مگر خاندان والے اور محلے والے باتیں کریں گے۔"

"تو آپ اپنے سالے کو ساری صورت حال بتا دیں۔ شریف کی اولاد ہے تو خود نکل جائے گا۔ مرد ذات ہے، مناسب حیثیت ہے، کہیں بھی رہ سکتا ہے۔ اس کی خاطر کیا آپ بہن کو بے گھر کریں گے؟"

"کیسی بات کر رہے ہو، وہ کیا مجھے بہن سے بڑھ کے عزیز ہو گیا۔ میں منزہ کو بے گھر نہیں کر رہا، صرف یہ چاہ رہا تھا کہ اگر اس کا حصہ مل جاتا تو وہ کہیں سیٹ ہو جاتی لیکن ایک تو وہ مان نہیں رہی دوسرا یہ طریقہ کار بہت وقت طلب ہے۔ عرفان کو میں جب کہوں، وہ چلا جائے گا۔ وہ کہاں عادی ہے ایسے گھروں میں رہنے کا۔"

"ضروری نہیں بن ماں کے سب ہی بچوں کا حال ایک سا ہو۔ وصی کے باپ نے دوسری شادی کر لی، اپنے ساتھ رکھنے پہ رضامند نہ ہوا مگر یہاں اتنے سر آنکھوں پہ بٹھانے والے بستے ہیں۔ پوچھنے والے کہیں بڑھ کے لاڈلا ہے۔ اماں جی کا، دونوں ماموں بھی خیال رکھتے ہیں اور روشنہ... ننھیال والے کبھی پوچھنے آئے نہ داری نے اصل سے سوتیلے پن کی مثال کو سچ کر دکھانے کی کوشش کی پھر ایسا بھی تو ہو سکتا ہے جیسے یہ معاملہ الٹ ثابت ہو۔ ویسے بھی سوتیلی ماں کے معاملے میں بھی سب انتہائی ہو۔ وشمہ کو ماں کا پیار مل جائے اور نوید بھائی جان کو ایک مخلص اور محبت کرنے والی شریک حیات۔"

اس نے کئی روز سے ادھیڑ بن کا شکار اپنے دل کو اس ایک نتیجے پہ ٹھہرا ہی لیا۔

❁ ❁ ❁ ❁

"بھائی جان! آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟"

وہ ابھی یہاں آ کے خود کو صحیح طرح سنبھال بھی نہ پائی تھی کہ جمیل کی بات نے اس کے ہوش اڑا دیے۔

"میں نے وکیل سے بات کر لی ہے، کل تم میرے ساتھ چلنا اور چند ضروری کاغذات پہ دستخط کر دینا۔"

"مگر اس کی ضرورت کیا ہے؟"

"حق ضرورت کے لیے نہیں جاتا۔ حق تو حق ہوتا ہے۔"

"کیسا حق؟"

"کیا بے وقوفوں والے سوال کر رہی ہو۔ مظہر کی جائیداد پہ تمہارا اور سوہا کا پورا حق ہے۔"

"مگر مظہر بے چارے کون سی جائیداد بنا پائے۔"

"باپ کی جائیداد میں اس کا جو حصہ نکلتا ہے میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ اتنا بھی نہیں سمجھتیں۔"

"مکان اور فیکٹری میں نکلتا ہے مگر ابا جی نے جو مکان آج سے پچیس سال پہلے تعمیر کیا تھا اس میں اور اس کوٹھی میں بہت فرق ہے۔ اس میں یہ سب تبدیلیاں اصغر نے وقتاً فوقتاً کرائی ہیں۔ لاکھوں لگا ہے ان پر۔"

"وہ لاکھوں اس نے اپنے گھر سے نہیں لگایا۔ اسی مشترکہ کاروبار کی کمائی سے لگایا ہے۔"

"لیکن محنت تو اسی اکیلے کی تھی۔ مظہر ہمیشہ کاروبار سے الگ رہے۔"

"عجیب عورت ہو، اس ذلیل انسان کی حمایت کرتی جا رہی ہو اور اپنی اولاد کا جائز حق نظرانداز کر رہی ہو۔"

جمیل بھی اس بحث سے اکتا گیا۔

"میں تو انصاف کی بات کر رہی ہوں، اس نے اس کاروبار کو اپنی برسوں کی محنت اور وقت دے کر اس نہج پر پہنچایا ہے ورنہ ابا جی تو ایک معمولی دکان کے مالک تھے۔"

"تم پتہ نہیں کون سے انصاف کی بات کر رہی ہو۔ قانون کی نظر میں مظہر ہر چیز میں برابر کا شریک ہے۔ ابا جی تو نہیں رہے تھے اور ماں کی وفات بھی ہو چکی ہے۔"

"مجھے ایسے کسی جھگڑے میں نہیں پڑنا۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔"

"تمہاری بیٹی کو تو ضرورت ہے۔"

"کیسی ضرورت؟ کیا آپ اس کا خرچہ نہیں اٹھا سکتے۔" اس نے بھائی کے چہرے پہ نظریں گاڑ کے سوال کیا۔

"لعنت ہے مجھ پہ جو میں تمہارا بھلا سوچنے نکلا تھا۔ تم الٹا مجھ پہ ہی شک کرنے لگیں۔ میرا کیا مفاد ہو سکتا ہے اس بات سے؟ یا مجھے اس تین چار سال کی بچی کا خرچہ چبھنے لگا ہے۔" وہ غصے میں آ کے تیز تیز بولنے لگا۔

"میرا یہ مطلب نہیں تھا بھائی جان..."

"رہنے دو... تم اپنا مطلب اپنے پاس رکھو۔ اتنے مان سے میں تمہیں یہاں لے کر آیا۔ جی جان سے تمہاری اور تمہاری بچی کی ذمہ داری سنبھالنے پہ تیار ہوں... ہاں صرف سوہا کا مستقبل محفوظ کرنے کے لیے یہ

"تو مسئلہ کیا ہے؟"

"مسئلہ یہ ہے کہ اس نے بہن کی فرمائش پہ اوپر والا پورشن تعمیر کرنا شروع کر دیا ہے۔ جلد اسے سوچا ہے کاروبار سیٹ ہونے کے بعد گھر پیر ہونا کے شادی کر کے وہاں سیٹ ہو جائے گا۔ ہم اوپر کا پورشن کرائے پر دے کے اضافی دس پندرہ ہزار آ جایا کریں گے۔"

"اور بس؟"

"اور بچے بھی عادی ہو گئے ماموں کے۔ بیٹے عیش و آرام اور آسائشات کے۔ اس ایک سال میں ماہانہ خرچہ ہی اس نے اٹھا رکھا ہے۔"

جمشید کو بھائی کی سوچ سے کراہیت محسوس ہوئی۔ بہت مشکل سے اس نے خود کو کوئی سخت جملہ کہنے سے روکا۔

"میں کوشش کرتا ہوں منزہ کو اپنے پاس بلوانے کی۔"

"تب تک تو سونے کا انڈا دینے والی مرغی ہاتھ سے نکل جائے گی۔ اس نے تو کاشف کو او لیول کے بعد باہر کے لیے بھیجنے کا وعدہ بھی کر لیا ہے اور تم جانتے ہو ایسی رشتے داریوں میں آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل والا معاملہ ہے۔ ادھر وہ یہاں سے نکلا۔ ادھر بہن اور بھانجے بھانجیوں کی محبت کا خمار اترا۔ مجھے منزہ کی بھی فکر ہے۔"

جمشید نے اسپیکر آن کر رکھا تھا۔ ثنا کچھ فاصلے پہ بیٹھی ساری گفتگو سن رہی تھی اور مسلسل پیچ و تاب کھا رہی تھی۔ بار بار وہ بولنے کے لیے منہ کھولتی مگر جمشید اشارے سے منع کر دیتا۔ اب کے وہ خاموش نہ رہ سکی۔

"آپ منزہ کے لیے کوئی اچھا سا رشتہ کیوں نہیں دیکھتے۔ اس جانب کیوں نہیں دھیان جاتا آپ دونوں بھائیوں کا۔"

جمیل کے ساتھ ساتھ جمشید بھی بری طرح چونکا۔

"کیا؟"

"اس کی ابھی عمر ہی کیا ہے؟ کیا وہ باقی کی ساری زندگی یونہی آپ دونوں بھائیوں کے لیے مسئلہ بنی رہے گی۔ آپ دونوں فون پہ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں کی گردان کرتے رہیں گے۔ اگر آپ دونوں اپنی جان سے اس ذمہ داری اٹھانے سے قاصر ہیں' دونوں کو ہی اپنے اپنے مفادات عزیز ہیں۔ ایک نوکری چھوڑ کر بہن کے پاس نہیں آ سکتا کہ اپنا مستقبل خطرے میں ڈالنا نہیں چاہتا' دوسرا تھوڑے سے مالی مفاد کے لیے بہن کو نظر انداز کر رہا ہے تو پھر دنیا کے سامنے اس دکھاوے کی کیا ضرورت ہے۔ کسی شریف بندے سے اس کا نکاح پڑھا دیجیے اس نے بھلا کسی کا کیا بگاڑا ہے۔ یقیناً اللہ نے اس کی زندگی میں بہت سی آسانیاں اور خوشیاں لکھی ہوں گی۔ وہ اپنی نئی زندگی میں بہت مگن رہے گی۔"

اس وقت تو دونوں بھائیوں میں اس مسئلے پہ بحث ہوئی۔ بعد میں دونوں ہی متفق ہو گئے۔

جمیل نے ثنا کی تجویز کلثوم کے سامنے رکھی۔

وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

"ثنا غلط نہیں کہہ رہی۔ اسلام میں بھی بیوہ کی جلد شادی کر دینے کا حکم ہے اور ابھی اس کی عمر کیا ہے ستائیس اٹھائیس سال۔ ٹھیک ہے اللہ کا نام لے کر رشتہ ڈھونڈتے ہیں۔"

"ایسے رشتہ مل جائے گا؟"

"کیوں نہیں لاکھوں میں ایک ہے ہماری منزہ۔ سیرت کے لحاظ سے بھی اور صورت کے لحاظ سے بھی۔ سلیقہ شعار' صبر والی اور محبت والی۔ جہاں جائے گی برکت لے کر جائے گی۔"

"تو پھر۔ تو پھر تم عرفان سے کیوں نہیں بات کرتیں منزہ کی؟" کلثوم کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔

● ● ●

جمیل کا حوصلہ کلثوم کی چند سیکنڈ کی خاموشی سے بڑھا۔

"منزہ کے لیے اچھا رہے گا عرفان کے ساتھ۔"

"آپ کا دماغ تو خراب نہیں ہو گیا؟" وہ اچانک پھٹ پڑی۔

"آپ میرے بھائی کے متعلق بات کر رہے ہیں۔"

"ہاں۔ اور میں اپنی بہن کی بات کر رہا ہوں۔ کیا غلط ہے اس میں؟"

"ٹھیک کہا ہے؟ کوئی تک بھی تو ہو۔ بھلا عرفان سے منزہ کا کیا جوڑ؟"

غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا کہ ابھی اسی وقت جا کے منزہ کو یہاں سے غائب کر دے۔

"کیوں۔ تم ابھی تو خود کہہ رہی تھیں کہ منزہ لاکھوں میں ایک ہے۔ ایسے رشتوں کی کیا کمی ہے؟"

جمیل نے چند منٹ پہلے کہی اس کی بات یاد دلائی۔

"ہاں کمی نہیں ہے۔ بہت رشتے مل جائیں گے۔ طلاق یافتہ' رنڈوے یا بڑی عمر کے کنوارے ۔۔۔ میرے کنوارے اور کروڑ پتی بھائی پہ آپ کی نظر کیسے گئی؟ اس کے لیے کیا ایک اٹھائیس سالہ بیوہ ہی رہ گئی ہے وہ بھی ایک چھ سالہ بچی کی ماں۔"

"اس کے علاوہ بھی اس میں کئی خوبیاں ہیں۔ ابھی تو تم اسے صورت اور سیرت کے لحاظ سے یکتا قرار دے رہی تھیں۔ سگھڑ' سلیقہ شعار' صابر اور محبت کرنے والی کہہ رہی تھیں اور یہ فتویٰ بھی دیا تھا کہ وہ جہاں جائے گی برکت لے کر جائے گی۔"

"غلطی کر رہی تھی میں۔" کلثوم کی آواز بلند ہوئی۔

"اپنی ہمدردی کا اور خدا ترسی کا اچھا نتیجہ دیکھ لیا میں نے۔ اچھا ہوتا آخر میں دوسری بھابیوں کی طرح اس کی چھوٹی چھوٹی شکایتیں لگا کے آپ کا دل اس کی جانب سے میلا کرتی۔ اس کی دوسری شادی کی تجویز نہ کرنے کا بندوبست کرتی تاکہ وہ ساری عمر میرے گھر اور بچوں کی چاکری کرتی رہے۔ گھر میں الو کی پٹھی ایک نمبر کی بے وقوف پرلے درجے کی احمق اس کی بچی کے لیے کیا کیا نہ کیا۔"

آپ نے سگے بھائی ہو کر وہ کچھ نہ کیا جو میں نے بھابھی بن کے کیا۔ مگر یہ میری غلطی تھی جو دیا اسے کافی سمجھیں۔ میں کوئی ظالم قسم کی بھابھی ہوں نہ بننا چاہتی ہوں' اور اسے بھی میرے لیے ایک بے ضرر مددگار رہنے دیں۔ خطرناک بنا کے پیش مت کریں۔"

"کیسا خطرہ؟"

"مجھے اپنے بھائی سے زیادہ عزیز کوئی نہیں۔ ایک مثالی بھائی بننے کے شوق میں بہن ہونے کے فرض کو نہیں بھول سکتی۔ ایک بہن ہونے کے ناتے میرے بھی کوئی ارمان ہیں۔ میں اسے خوبرو اور دل سے مالا مال بھائی کے نصیب منزہ جیسی لڑکی سے کیسے پھوڑ دوں؟ جب کہ بڑے بڑے امیر گھرانے اپنی اکلوتی کم عمر لڑکیوں کے لیے اس پہ آس لگائے بیٹھے ہیں۔"

"مجھے یقین نہیں آ رہا کلثوم کہ یہ واقعی تم ہو۔" جمیل نے تاسف سے کہا۔

"میں تمہیں کیا سمجھتا تھا مگر آج تمہاری باتیں سن کر خیال آ رہا ہے کہ میں کتنا غلط تھا۔ وہ سب ایک دھوکا تھا۔ ایسا ہے تو بہتر تھا تم کبھی اس کے لیے اچھے الفاظ استعمال نہ کرتیں۔ کبھی اس سے ہمدردی اور محبت نہ جتاتیں تب شاید تمہارے یہ تحقیر آمیز الفاظ مجھے اتنے برے نہ لگتے۔"

"کیا لگا ہے جمیل۔۔۔ جو آپ کو اتنا برا لگ گیا۔ ذرا باہر نکل کے دیکھیں۔ سنیں کہ لوگ منزہ کے بارے میں کیا کچھ کہتے ہیں۔"

"کیا کہتے ہیں؟"

جمیل کے اندر بھائیوں والی غیرت یکایک بیدار ہوئی۔

"یہی کہ وہ ایک منحوس لڑکی ہے۔ شادی کے بعد جس گھر میں گئی۔ چند سالوں کے اندر اندر اس گھر کے افراد کو نگل لیا۔ پہلے شوہر، سسر اور پھر ساس..... یہ تو میری اچھائی تھی کہ میں نے ان چیزوں کو نہیں دیکھا۔ کبھی اس منحوس کو آپ تک میں جیسے آنکھیں بند کر کے اپنے بھائی کے لیے نحوست مول لی تھی۔"

"کلثوم تم ان لغویات پہ یقین رکھتی ہو؟"

"یقین رکھتی ہوں یا نہیں یہ الگ بات ہے اس مسئلے کو جانے دیں۔ بلکہ اس بات کو یہیں ختم کر دیں تو بہتر ہو گا آپ کے اور میرے لیے بھی اور منزہ کے لیے بھی۔ کیونکہ مجھے تو کسی قیمت یہ رشتہ منظور نہیں ہے۔ اگر آپ بار بار دہراتے رہے تو اس سے صرف ہمارے درمیان تلخیاں ہی پیدا ہوں گی اور منزہ کو بھی ابھی یہیں رہنا ہے تب تک اس سے میرے اور اس کے تعلقات بھی خراب ہوں گے۔"

"اب اور خرابی کہاں رہ گئی ہے۔" جمیل بڑبڑایا۔

"تمہاری محبت کی اصلیت کھل گئی ہے کلثوم! اور میں اب منزہ کے معاملے میں تم پہ مزید اعتبار نہیں کروں گا۔"

"کیا مطلب؟ ارے میرے سارے کیے کرائے کو پانی میں غرق کر رہے ہیں آپ؟ میں نے صرف اپنے بھائی سے اس کا رشتہ کرنے پہ اعتراض کیا ہے ناں۔ کوئی دشمنی تو نہیں کر رہی اس سے....."

"بہرحال مجھے منزہ کی شادی کرنا ہے۔"

"ضرور کیجیے۔ اب تو میں بھی یہی چاہوں گی۔ عرفان کا دل ٹوٹ گیا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ آپ اس کے آنے کے بعد اسے ایسی پٹی پڑھائیں کہ وہ خود....."

باقی کی بات اس نے بڑبڑاتے ہوئے مکمل کی مگر مفہوم پوری طرح جمیل کی سمجھ میں آگیا۔

وہ بھڑک گیا۔

"مجھ میں ابھی اتنی غیرت زندہ ہے۔ اپنی بہن کو کسی کے سامنے یوں پیش نہیں کرتا پھروں گا۔ تمہارے بارے میں ایک خوش فہمی تھی اس لیے منزہ کے لیے عرفان کی بات کر بیٹھا ورنہ..... تم بے فکر رہو..... منزہ کو میں جلد عزت سے رخصت کر دوں گا مگر تم کچھ عرصہ عرفان کو یہاں آنے سے روکے رکھنا۔ میں نہیں چاہتا کہ منزہ کی موجودگی میں وہ یہاں رکے۔"

"یہ کیا پابندی ہوئی؟ کیا جب تک منزہ کی شادی نہیں ہو گی میرا بھائی اپنی بہن کے گھر نہیں آسکتا۔" وہ تاؤ کھا کے رہ گئی۔

"آئے ضرور آئے۔ میں نے صرف رکنے کے بارے سے منع کیا ہے۔"

"واہ..... کیا شان سے منع فرمایا جا رہا ہے۔ کس منہ سے منع کروں گی میں اسے۔ لاکھوں لگا کے وہ اوپر کا پورشن بنوا رہا ہے۔ جس کے بارے میں آپ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔"

یہاں آکے جمیل بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے اندر کی غرض اور تن آسانی نے اس کے قدم لڑکھڑا دیے۔ کا مقدمہ لڑتے لڑتے وہ تھکن محسوس کرنے لگا۔

* * *

"بھابی! گاجریں کش کر دی ہیں دودھ ڈال کر چڑھا دوں یا آپ خود حلوہ بنائیں گی؟"

کلثوم کے دل سے ابھی تک رات والی بحث کی تلخی زائل نہیں ہوئی تھی اس لیے جب منزہ نے معمول کے انداز میں آکر اس سے سوال کیا تو وہ اجنبی نظروں سے اسے دیکھتی رہ گئی۔

منزہ کو ایسا لگا جیسے کسی دھیان میں گم ہونے کی وجہ سے وہ اس کی بات سن نہیں سکی اس لیے اس نے اپنا سوال دہرایا۔

کلثوم کی پیشانی یکایک بے شمار سلوٹوں سے اٹ گئی۔

"ہوں ہونہہ..... بہری نہیں ہوں میں۔"

"الٰہی خیر..... بھائی جان سے کوئی کھٹ پٹ ہو گئی ہے؟" اس نے بے تکلفی سے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

"اس میں اتنا خوش ہونے والی بات نہیں ہے۔ یہ کھٹ پٹ تو شاید اب روز کا معمول ہو گی۔ مسکراہٹیں بچا کے رکھو۔"

"بھابی جی! آپ؟" اتنے درشت لہجے اور سخت الفاظ پہ وہ دم بخود رہ گئی۔ پھر خیال آیا کہ ضرور جھگڑا سنجیدہ نوعیت کا ہو گا سو خراب ہو گیا بھابی کا..... اس لیے یہ چڑچڑی ہو رہی ہیں۔ اس لیے یہ ذکر چھوڑ کے پھر سے گاجروں پہ آگئی۔

"آپ نے کل کہا تھا کہ آپ گاجر اور بادام کے حلوے بنا کے رکھیں گی..... کیا اب بھی فریز کریں گی۔ آپ نے نکالے ہیں اس لیے میں نے کبابوں کا مسالا بھی تیار کر دیا ہے اور گاجریں بھی کش کر دی ہیں۔ صبح دودھ والے سے پانچ کلو دودھ بھی زیادہ لے لیا تھا۔ آپ فارغ ہیں تو میں کام شروع کر دوں یا آپ....."

وہ آرام سے پوچھتی ہوئی ساتھ ساتھ ان کے بیڈ کی بکھری ہوئی چادر اور کمبل درست کرنے لگی۔

"تمہیں اتنے تردد کی کیا ضرورت..... تمہی بھائی میرا آرہا ہے..... پھر تم کیوں پریشان ہو رہی ہو۔"

"اوہ....." منزہ جیسے سارا معاملہ بھانپ گئی۔

لگتا ہے بھائی جان بھابی سے ان کے بھائی کی آمد کے بارے میں ہی کوئی بحث کی ہے۔ یہ بھائی جان بھی بس..... کبھی کبھی بہت عجیب سے ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کے جذبات کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ عورتیں تو یوں بھی اپنے میکے والوں کے لیے بے حد حساس ہوتی ہیں۔ اس لیے غصہ آرہا ہے بھابی کو۔"

اس نے سوچا اور اپنی بھابی کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے ان کے قریب آئی اور مسکرا کر ان کے شانے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بھئی ہماری بھابی کے بھائی ہوئے تو ہمارے بھی خاص مہمان ہوئے ناں۔"

وہ آج کل جس کیفیت کے زیر اثر رہتی تھی اس میں یہ مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پہ خاصی اوپری اوپری سی لگ رہی تھی۔

"لگتا ہے بھائی کے ارادوں کی بھنک پڑ گئی ہے جب ہی ہنسی چھپائے نہیں چھپ رہی۔" اس نے تلخی سے سوچا اور اپنے شانے سے منزہ کے ہاتھ جھٹک دیے۔

"اگر گاجریں کش کر دی ہیں تو حلوہ بنانے کو دل چاہتا ہے بنا لو نہ دل چاہے مت بنانا..... مگر میرے بھائی کے لیے یہ تکلف کرنے کی ضرورت نہیں وہ نہیں آرہا۔"

رکھائی سے بولتے بولتے کلثوم نے آخری الفاظ اس کی جانب بڑی گلہ آمیز نظروں سے دیکھ کر کہے جیسے اس کے نہ آنے کا ذمہ دار اسے ٹھہرانا چاہتی ہو۔

"کیوں؟"

منزہ کی عادت نہیں تھی اتنے سوال کرنے کی مگر وہ تو اتنا چاہتی تھی کہ کلثوم اپنا دل ہلکا کر لے اور اسے یہی سوال بری طرح کھل گیا۔

"یہ جا کے تم اپنے بھائی سے پوچھو۔" وہ پھاڑ کھانے والے انداز میں بولی۔

"میں سمجھاؤں گی بھائی جان کو۔"

"کیا..... کیا سمجھاؤ گی؟"

"یہی کہ..... کہ وہ میرا مطلب ہے کہ....." وہ گڑبڑا کر رہ گئی۔

"رہنے دو..... رہنے دو۔" کلثوم نے بے زاری سے ہاتھ جھٹکا۔

"یہ میرا اور میرے بھائی کا معاملہ ہے۔ ویسے میں خود نہیں چاہتی کہ ابھی وہ یہاں آئے کم از کم اس کے

لیے تو اچھا ہے۔ ہمارے لیے چاہے ہوتے ہو۔۔۔۔ اکبر کا داخلہ ہو جاتا آخر ڈیڈا! لیکن آ سکے کیسے وہ یہاں تو جال بچھ پڑے ہیں چندے انگار کھے ہیں۔"

وہ بے یقینی رہی اور منزہ بھی کچھ میں نہ آنے پہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ گئی۔ پھر دروازے تک جاتے جاتے رک کر پلٹی۔

"آج دوپہر میں کیا پکے گا بھابھی؟"

یہ سوال وہ روزانہ پوچھا کرتی تھی۔ دوپہر کا کھانا تیار کرنے کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے سر لے رکھی تھی۔

"کھانا میں خود بناؤں گی۔"

"آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی رہنے دیں۔"

"طبیعت ٹھیک ہے اور اگر خراب بھی ہو تو اپنے گھر کے کام تو کرنے ہی ہوتے ہیں، کسی کے آسرے پہ تو نہیں ڈالے جا سکتے۔"

منزہ چپ کھڑی رہ گئی اور اس چپ نے کلثوم کے اندر رات سے بھڑکتے لاوے کو ذرا شانت کیا۔ وہ مزید بولی۔

"ویسے بھی بچے دوپہر کو ہی ٹھیک طرح سے کھانا کھاتے ہیں اور میرے ہاتھ کے ذائقے کے عادی ہیں۔ کل جان سے دیکھ رہی ہوں کم کم کھا رہے ہیں اس لیے کھانا میں ہی بناؤں گی۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں آرام کرو۔"

اس نے غیر محسوس طریقے سے اسے گھر کے معاملات سے الگ رہتے ہوئے اپنے کمرے تک محدود رہنے کا اشارہ دیا۔

☆ ☆ ☆

"ماما آپ کیوں رو رہی ہیں؟" سوہا نے اپنی ننھی منی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھے۔

"کچھ نہیں بیٹا! سر میں درد ہو رہا ہے۔" منزہ نے آنکھیں رگڑتے ہوئے اس کے ہاتھ چومے۔

"لائیں میں سر دبا دوں۔" وہ ماں کا سر دبانے لگی۔

"نہیں میری جان!۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔ تم نے ہوم ورک کر لیا؟"

"آپ نے کروایا ہی نہیں۔"

"چلو پھر آؤ پڑھتے ہیں۔" وہ اس کا بیگ کھولنے لگی۔

"ماما آج آپ نے کھانا کیوں نہیں کھایا؟" سوہا کا دھیان پڑھتے ہوئے بھی ماں میں اٹکا تھا۔

"میرے پیٹ میں درد تھا۔۔۔ کھاتی کیسے نا۔۔۔"

"سر میں بھی درد۔ اور پیٹ میں بھی درد۔۔۔ نانی سے آپ کے لیے دوائی لاؤں۔"

"دھیان سے کیوں نہیں پڑھ رہی ہو۔ ابھی ان سب کی اسپیلنگ بھی یاد کرنی ہیں۔" وہ ڈانٹنے لگی تو وہ چپ چاپ سر جھکا کے اپنی ننھی انگلیوں میں پنسل دبا کے اے بی سی لکھنے لگی۔ منزہ کی آنکھیں ایک بار پھر بھر آئیں۔

"ماما! آج سونیا اور اکبر بھائی آپ سے پڑھنے کیوں نہیں آئے۔۔۔ میں بلا کے لاؤں؟" سوہا کو ایک اور خیال آیا۔

"وہ اپنی ماما سے پڑھ رہے ہوں گے۔"

"کیوں ماما! وہ تو روز آپ سے پڑھتے ہیں۔"

"جب ہم یہاں نہیں تھے تب بھی وہ اپنی ماما سے پڑھتے تھے۔۔۔"

"اور اب پھر اپنی ماما سے پڑھیں گے؟ ۔۔۔ تو کیا ہم یہاں سے جا رہے ہیں؟"

"خاموشی سے پڑھو سوہا! مجھے تنگ مت کرو۔"

وہ اسے ڈانٹنے لگی۔ آج صبح سے اس کا دل دکھا ہوا تھا۔ کلثوم کی باتوں سے وہ حد درجہ آزردہ تھی۔ اگرچہ اس کی نسبت کلثوم سے وہ بہت زیادہ قریب نہیں تھی کیونکہ شادی کے کچھ عرصے بعد جمیل بیوی اور بچے کو لے کر الگ ہو گیا تھا۔

تھا۔ جب جمیل کی شادی ہوئی تو دونوں نند بھاوج میں خوب گھٹنے لگی تھی، جبکہ ابھی بھی کچھ ایسے ہی دوستانہ اور پرخلوص مزاج کی حامل کلثوم کبھی بری نہیں تھی۔ وہ نند جو تھی۔ اس کے لیے روایتی بالادستی نہیں ہوئی تھی۔

اور اس حویلی میں آنے کے بعد بھی اس نے بہت خندہ پیشانی سے اسے قبول کیا تھا۔ پھر اس کا یہ رویہ ہاں؟ گر اس کی سمجھ میں آ رہی تھیں۔

"اگر بھائی کی بھابھی جان سے کوئی لڑائی یا رنجش ہوئی ہے تو وہ اس کا غصہ مجھ پہ کیوں نکال رہی ہیں۔ مجھے یہ بھی بتا تیں اگر وہ صرف غصہ نکالتیں ڈانٹ دیتیں ڈرا دیتیں۔۔۔ مجھ سے اتنی طنزیہ باتیں کیوں کیں؟ مجھے اس گھر میں پرایا ہونے کا احساس کیوں دلایا؟ جبکہ میں نے گھر پہ کوئی حق ملکیت نہیں جتایا۔ بلکہ ان کی ممنون و مشکور رہتی ہوں کہ مجھے اس عزت کے ساتھ یہاں پناہ دی۔ پھر یہ سلوک کیوں؟ ... بھائی جان کے تنازعے کی وجہ میں ہوں؟ میں نے ایسا کیا کیا ہے؟ شاید سوہا کی وجہ سے۔۔۔ مگر یہ معصوم کسی کا کیا لیتی ہے۔۔۔ یا پھر میری ہی وجہ سے؟۔۔۔ آخر ایسا کیا ہو گیا کہ انہیں ہم دونوں کا وجود کھل رہا ہے؟"

ان سوچوں میں غلطاں وہ سارے دن کمرے تک محدود رہی۔ سوہا کو جمیل نے اسی اسکول میں داخل کرا رکھا تھا جہاں اس کے اپنے بچے پڑھتے تھے۔

وہ ابھی نرسری کلاس میں تھی اور سب بچے پیدل ہی اسکول آتے جاتے تھے کیونکہ اسکول گھر سے زیادہ فاصلے پہ نہیں تھا۔

جن دنوں کلثوم کا بھائی عرفان یہاں تھا، وہ اپنی گاڑی پہ چاروں کو لاتا لے جاتا تھا۔ آج بھی ٹھیک پونے دو بجے کال بیل مسلسل بجنا شروع ہوئی تو وہ کمرے سے نکل گئی۔

اکبر نے نہ صرف سونیا اور سوہا کا بیگ اٹھا رکھا تھا بلکہ سوہا کو بھی گود میں اٹھا رکھا تھا۔ جبکہ سویرا نے سوہا کی واٹر بوتل اپنے کاندھے پہ لٹکا رکھی تھی۔

منزہ کو بے اختیار چودہ سالہ اکبر پہ پیار آ گیا تھا۔ وہ اسی طرح آدھے راستے تک اسے گود میں اٹھا کے لاتا تھا۔ شروع میں تو منزہ نے منع کیا تو کلثوم نے خود کہا تھا۔

"رہنے دو نا منزہ! سوہا پھول سی تو ہے اس کا وزن ہی کتنا ہے بھلا۔ اکبر بہنوں کے لیے ایسا ہی حساس اور ذمہ دار بچہ ہے۔ پچھلے سال تک سونیا کو بھی گود میں اٹھا کے لاتا تھا۔ میں نے تو کہہ دیا ہے عرفان سے کہ بھیا ہمیں لیزنگ پہ گاڑی نکلوا دو بینک سے قسطیں تمہارے بہنوئی بھرتے رہیں گے ڈیڈو انکل گاڑی آ جائے تو میں اور تم ڈرائیونگ سیکھ لیں گے۔ کبھی تم لینے جانا کبھی میں۔"

"تو کیا بھابھی! بھائی جان نے وہ گاڑی کیوں بیچی؟"

"وہ بھی کوئی گاڑی تھی۔۔۔ کھٹارا۔۔۔ جہیز کے آتے تھے ہم تو اب ہنڈا اکارڈ لیں گے۔۔۔ دیکھنا۔"

"تب تک سوہا کی ہنڈا اکارڈ میں ہوں۔۔۔" اکبر اسے بازوؤں پہ جھلاتے ہوئے کہنے لگا۔

آج۔۔۔ آج نجانے ایسا کیا ہوا تھا کہ کلثوم نے کچن سے نکل کر اکبر کو کڑی نظروں سے گھورا۔

"اتار دو اسے۔۔۔ پسینے پسینے ہو رہے ہو۔۔۔ یہ کوئی طریقہ ہے اتنی بڑی لوتھا کی لوتھا کو اتنا لمبا راستہ گود میں اٹھا کر لاتے ہو۔"

"تھک جاتی ہے نا ماما!" اکبر نے اتارتے ہوئے دزدیدہ نظروں سے اپنے کمرے کے دروازے پہ کھڑی پھوپھو کو دیکھا۔ جس کے بارے میں شاید اس کی ماں انجان تھی۔۔۔ یا شاید جانتی تھی کہ وہ کھڑی سب سن رہی ہے۔

"زیادہ حاتم مت خراب کرنے کی ضرورت نہیں ہے سویرا اور سونیا بھی تو چل کے آتی ہیں۔ سونیا اس سے ڈیڑھ دو سال ہی تو بڑی ہے۔"

سوہا کی سمجھ میں تو نہیں آیا مگر اتنا احساس ضرور ہوا کہ اس کی وجہ سے اکبر بھائی کو ڈانٹ پڑ رہی ہے۔ وہ سہم کر اس سے الگ ہوئی اور ماں کی ٹانگوں سے لپٹ گئی۔

منزہ کو اسینے بدن پہ اس کے جسم کی ہلکی سی کپکپاہٹ اور خوف سے دل کی تیز دھڑکن بُری طرح محسوس ہوئی، اسے اسی طرح اپنے ساتھ چپکائے اندر لے گئی۔

کچھ دیر بعد باہر سے ٹیبل پہ کھانا لگنے اور بچوں کو بلانے کی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ آج اسے اس گھر سے اتنی اجنبیت محسوس ہو رہی تھی کہ اسے اپنا آپ بن بلائے مہمان جیسا لگنے لگا اور اس کا بالکل دل نہ چاہا کہ خود یا سوہا کو کھانے کے لیے باہر بھیجے۔

"ماما..... کھانا۔"

سوہا منہ ہاتھ دھو کر یونیفارم تبدیل کرنے کے بعد اب منتظر تھی کہ وہ اسے باہر کھانے کے لیے لے کر جائے۔

"آج تمہاری پسند کا کچھ نہیں بنا۔ دودھ کے ساتھ بسکٹ لے لو۔" اس نے بہلانا چاہا۔ شاید وہ آزمانا چاہتی تھی کہ بھابی اسے یا سوہا کو کھانے کے لیے بلاتی ہیں یا نہیں۔

"مجھے بھوک لگی ہے ماما!" وہ رونے لگی۔

"پھپھو! ماما کہہ رہی ہیں کھانا لگ گیا ہے۔ آپ کیوں نہیں آ رہیں؟" سویرا نے اندر جھانک کے کہا۔

یعنی میرے خدشات بے بنیاد تھے۔ بھابی کا موڈ کسی اور ہی وجہ سے خراب تھا.....

وہ فوراً خوش امید ہو گئی اور دل سے ساری بدگمانی پل میں جھٹکتی سوہا کا ہاتھ تھام کے باہر نکل آئی۔

کلثوم ڈائننگ ٹیبل پہ ماتھے پہ ہزار بل ڈالے بیٹھی تھی۔

"بھئی کھانے کا وقت جب یہی ہے تو خود نکل آیا کرو۔ مجھے کھاتی ہوئی بچی کو اٹھا کر بھیجنا پڑا۔"

"میں آ رہی تھی بھابی! لو سوہا کو چیئر۔"

"یہ لو اکبر..... ! تم یہ آملیٹ لے لو۔ مجھے پتہ ہے کہ تم کدو شوق سے نہیں کھاتے لیکن میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے کچھ اور نہیں بنا سکی۔" کلثوم نے اس کی بات پہ توجہ دیے بغیر بیٹے سے کہا۔

"ماما میں کدو نہیں کھاؤں گی۔"

سوہا بھی کھانے پینے میں بہت نخرے کرتی تھی۔ منزہ نے اس کی عادتیں بدلنے کی بہت کوشش کی تھی مگر وہ رہی تھی۔

"تو میں آپ کو جیم لگا دیتی ہوں سلائس پہ۔"

"مجھے سینڈوچ بنا دیں کچھپ کے ساتھ۔" منزہ اٹھنے لگی کہ کلثوم بڑبڑائی۔

"کسی آئے گئے کے لیے کباب بنا کے رکھنے پڑتے ہیں فریزر میں..... یونہی ایک ایک کر کے ختم ہوتے جاتے ہیں۔"

وہ بیٹھ گئی۔

"لاؤ میں خود آپ کو کھلاتی ہوں۔ آپ ایک بار کھا کر تو دیکھو یہ بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ پتہ ہے آپ کے پاپا کو تو بہت پسند تھے وہ بہت مزے لے لے کر کھاتے تھے۔"

"سچی؟..... پاپا کو کدو بہت پسند تھے؟" سوہا کے لیے باپ کا ذکر کسی خواب کی مانند تھا۔

"ہاں ان کے فیورٹ تھے اور آپ ہیں کہ کھا نہیں رہیں۔ پاپا کو کتنا برا لگے گا۔"

"نہیں..... میں کھاؤں گی۔" اس نے منہ کھول دیا اور منزہ نے روٹی کا چھوٹا سا نوالہ بنا کے اسے کھلا دیا۔

"پھوپھو! آپ مجھ سے آدھا آملیٹ لے لیں..... سوہا کو پسند ہے۔"

اکبر نے ماں کو سراسر نظرانداز کرتے ہوئے آفر کی۔

"نہیں اکبر بھائی! مجھے تو کدو اچھا لگتا ہے..... میں تو یہی کھاؤں گی۔"

اپنے آنسو اندر اتارتے ہوئے وہ سوہا کو چھوٹے چھوٹے لقمے کھلاتی رہی۔ اس کی شکل سے صاف لگ رہا تھا وہ زہر مار کر رہی ہے۔

کلثوم نے ایک بار بھی منزہ سے یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ خود کھانا کیوں نہیں کھا رہی اور یہ بات اسے زیادہ دکھ دے رہی تھی۔ کھانے کے بعد وہ چپ چاپ سوہا کو لے کر کمرے میں چلی آئی تھی۔ نہ کوئی پیچھے اسے کھلانے کے لیے بلانے آیا نہ کوئی اور.....

اسے یقین تھا کہ شام کو سونیا اور سویرا اپنا اپنا ہوم ورک لے کر جو اندر اس کے پاس آتی ہیں وہ بھی یقیناً "ماں کے کہنے پہ" نہیں آئیں گی اور ایسا ہی ہوا تھا۔

"اتنی جلدی؟..... بھابی اتنی جلدی آپ مجھ سے بیزار ہو گئیں۔ حالانکہ میں نے اپنی طرف سے پوری کوشش کی تھی کہ میرا وجود کسی کو ناگوار نہ گزرے پھر بھی..... مجھے امید نہیں تھی کہ آپ جیسی درد مند دل رکھنے والی اور محبت کرنے والی بھابی بھی میرے ساتھ ایسا دل آزار سلوک کر سکتی ہیں شاید آپ بُری نہیں..... میرے نصیب ہی بُرے ہیں۔"

وہ سوہا کو ہوم ورک کراتے ہوئے آزردگی سے سوچتی رہی۔

"پھوپھو! جمشید چاچو کا فون ہے آپ کے لیے....."

سویرا نے یہ خبر دی تو اسے دھند کے بادل چھٹتے ہوئے محسوس ہوئے جیسے کسی اپنے نے اچانک بہت اداسی کے عالم میں ہاتھ تھام لیا ہو۔

"ہیلو بھائی جان!" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

"کیا ہوا منی؟" جمشید کا لہجہ ویسا ہی تھا۔ ہمیشہ کی طرح پیار اور شفقت سے بھرا۔

"کچھ نہیں..... بہت دنوں بعد آپ سے بات ہوئی نا اس لیے دل بھر آیا۔"

"میں بھی تمہارے اور سوہا کے لیے بہت اداس ہوں۔ کوشش کر رہا ہوں مگر چھٹی آتے آتے ابھی دو تین سال اور لگیں گے۔ بار بار ایک جگہ سے دوسری جگہ فیملی سمیت شفٹ ہونا آسان بات نہیں ہے۔"

"آپ اپنا دل وہیں لگانے کی کوشش کیجیے۔"

"دل تو شاید لگ جاتا..... اگر تم اپنے گھر بار میں مگن اور خوش ہوتیں۔"

"آپ میری وجہ سے اپنی جاب کو نقصان نہ پہنچائیں۔ پتہ نہیں یوں واپس آ کر پھر ایسی ملازمت ملے یا نہ ملے۔ میں ٹھیک ہوں خوش ہوں۔"

تھوک نگلتے ہوئے اس نے کہا جو کم از کم اس وقت تو سراسر جھوٹ تھا۔

"یہ آپ دونوں کیسی باتیں لے بیٹھے ہیں۔ لائیں مجھے دیں فون۔"

پیچھے سے ثنا کی آواز آئی۔ اس کی آواز نے ہی منزہ کی طبیعت کا بوجھل پن دور کر دیا۔

"بھائی سے بات کروائیے۔"

"ہاں بھئی لو..... میں کون ہوتا ہوں دو نندوں سے نرالی نند بھابی کے درمیان میں آنے والا۔"

جمشید نے ہنستے ہوئے ریسیور ثنا کو پکڑا دیا۔ وہ اس کی آواز سنتے ہی کھٹک گئی۔

"کیا ہوا تمہیں؟ کوئی بات ہوئی ہے کیا؟"

"مجھے..... مجھے کیا ہونا ہے۔" پہلے اس کا دل چاہا ثنا سے سب کہہ ڈالے..... جمیل بھائی جان کی بے اعتنائی..... کلثوم بھابی کی بے رخی اور بدلتے اطوار اپنی بے کسی و بے بسی.....

مگر یہ سب کہنا اسے اول درجے کی کم ظرفی لگا۔ آخر اتنے دنوں سے یہی کلثوم بھابی اس کے ساتھ اتنی محبت سے پیش آ رہی تھیں۔ یہی بھائی تھا جو اس گھر سے اور اس عورت کے چنگل سے چھڑا کے لایا تھا۔ اسی گھر میں سوہا کو اتنا پیار اور محبت ملی تھی..... پھر وہ ایک دن میں سب بھلا کے گلے شکوے کرنے پہ اتر آئے۔ یہ سب سوچ کے اس نے اپنا غم اندر ہی اندر اتار لیا۔

"تمہاری آواز سے لگ رہا ہے جیسے....."

"بس ایسے ہی۔۔۔ رات ٹھیک طرح سے سو نہیں پائی، سر میں درد ہو رہا ہے۔ شاید اس لیے تم اتنی بوجھل لگ رہی ہو۔"

"اچھا سنو تمہیں تو پتہ ہے مجھے گھما پھرا کے بات کرنا نہیں آتی۔ ہم سب نے تمہاری شادی کے بارے میں سوچا ہے اور اس سلسلے میں۔۔۔"

"کیا؟۔۔۔" وہ بات کاٹ کے چلا اٹھی۔

"آپ نے یہ سوچا بھی کیسے؟"

"دھیرج سے منزہ! آرام اور تحمل سے سنو۔ یہ ہم نے تمہاری بھلائی کے لیے ہی۔"

"آپ سے یہ بات کلثوم بھابی نے کی ہوگی؟" وہ ایک بار پھر بات کاٹ کر بولی۔

"لگتا ہے جمیل بھائی جان کو ایک ہی مہینے میں میں بوجھ لگنے لگی ہوں۔ ان دونوں نے ہی آپ کے کان میں یہ بات ڈالی ہوگی اور آپ کو یہ فرض سونپا ہوگا کہ آپ مجھے تیار کریں۔"

"بالکل غلط! اتنا عمدہ خیال تمہارے جمیل بھائی جان اور کلثوم بھابی کو زندگی بھر نہیں آسکتا۔ یہ نیک خیال صرف اور صرف میرے ذہن کی پیداوار ہے، اور میں اس کا کریڈٹ کسی اور کو نہیں لینے دوں گی۔"

شنا نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا اور منزہ چونکہ جانتی تھی کہ وہ مذاق نہیں کرتی اس لیے چپ کر گئی۔

"میں مانتی ہوں مظہر جیسے ساتھی کو بھلانا مشکل ہے مگر جب تم اس کے بغیر رہ سکتی ہو تو اس کی یادوں کے بغیر بھی رہ سکتی ہو۔"

"میں اللہ کی رضا میں راضی ہوں۔ اس کے آگے دم مارنے کی میری کیا مجال۔۔۔ میں نے اسے قدرت کا فیصلہ سمجھ کر قبول کر لیا تھا مگر اس کی یادوں سے مجھے جدا کرنے کا فیصلہ جس کا بھی ہے مجھے بالکل قبول نہیں۔"

"تم جذباتیت سے سوچ رہی ہو۔ ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا۔ ابھی تمہارے پاس وقت ہے۔"

"وقت؟۔۔۔ آپ مجھے سوچنے کے لیے وقت بے شک نہ دیں صرف اتنی مہلت دے دیں کہ میں اپنے اور اپنی بچی کے لیے کسی مستقل ٹھکانے کا بندوبست کر سکوں۔ ابھی مجھ میں اتنی سکت ہے کہ میں اپنی اولاد کا بوجھ اٹھا سکوں۔"

"تمہارا دماغ خراب ہو چکا ہے منزہ!" شنا کو غصہ آگیا۔

اس کا منزہ سے تعلق ایسا تھا کہ وہ اس سے تلخ ترش بھی بول لیتی تھی۔۔۔ ڈانٹ ڈپٹ بھی کر لیتی تھی۔۔۔ مگر منزہ کو برا نہیں لگتا تھا کیونکہ اسے یقین تھا کہ وہ کبھی اس کا برا نہیں چاہ سکتی۔

"اس وقت تم حد سے زیادہ زود رنج ہو رہی ہو۔ تمہیں ہر شخص اپنا دشمن نظر آرہا ہے حالانکہ ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ مانا کہ مظہر ایک مثالی شوہر تھا مگر تم بھی ایک مثالی بیوی تھیں اور میں حلفیہ کہتی ہوں کہ اگر اس کی جگہ تم مری ہوتیں تو وہ اب تک دوسری شادی کر چکا ہوتا۔"

"شنا۔۔۔ بس کرو۔" جمشید شاید اسے روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"مجھے بات کرنے دیں جمشید۔۔۔ میں اسے اس خود فریبی کے اندھیرے سے باہر لانا چاہتی ہوں۔ دیکھو ابھی تمہاری عمر کیا ہے۔۔۔ صرف اٹھائیس سال اور تمہاری کوالی فکیشن کیا ہے؟ ڈگری کے لحاظ سے صرف گریجویشن اور پریکٹیکل زیرو۔ اس دنیا میں کیسے سروائیو کرتے ہیں تم اس بارے میں کچھ نہیں جانتیں اور دعوے کر رہی ہو خود اپنا اور اپنی بچی کا بوجھ اٹھانے کا۔"

ٹھیک ہے تم کہیں تین چار ہزار والی جاب کر کے فی الحال اپنا اور سوہا کا خرچہ اٹھا سکتی ہو۔ لیکن تم اکیلے اور خود مختار زندگی گزارنا افورڈ نہیں کر سکتیں۔۔۔ مکان کا کرایہ، بجلی پانی کے بل اس کے علاوہ تم جاب پر جاؤ گی تو بچی سنبھالنے کا مسئلہ اور سب سے بڑا مسئلہ ایک جوان عورت کا اکیلے رہنا۔

تمہیں اندازہ تو ہوگا کہ اس سے کیا کیا پیچیدگیاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہاں! ان چار ہزار کمائے پیسوں کے ساتھ

خرچہ پورا کرتے ہوئے تم بھائی جان کے گھر رہ سکتی ہو مگر کب تک؟ کل سوہا بڑی ہوگی اس کے تعلیمی اور دوسرے اخراجات بڑھیں گے مگر تمہاری آمدنی وہیں کی وہیں رہے گی کیونکہ ایک چپڑاسی سے کو اس سے زیادہ ملنے کی امید بھی نہیں رکھنی چاہیے۔

اور سب سے بڑی بات کہ یہ کوئی زندگی ہے کہ تم صبح سے شام تک کما کما کے ہلکان ہو جاؤ اس کے باوجود جس چھت کے نیچے تم اتنا عرصہ گزارو گی وہ تمہاری نہیں ہوگی۔

آج کل کے بچے بیٹے والدین کو برداشت نہیں کر پاتے کل کو اکبر وغیرہ بڑے ہوں گے شادی شدہ ہوں گے تب بھی تو تمہیں جوان بچی کو لے کر وہاں سے نکلنا ہوگا سوچو منزہ! سوچو۔"

"بس بھی کریں بھابی! میں نہیں سوچنا چاہتی۔ میرا دماغ پھٹ جائے گا۔" اس نے ریسیور رکھ دیا۔

کہنے کو تو اس نے کہہ دیا تھا کہ میں نہیں سوچنا چاہتی۔ مگر رات بھر رہ رہ کے شنا کے الفاظ یاد آتے رہے اور اس کی تاکید بھی۔

"سوچو منزہ! سوچو اپنے لیے نہ سہی سوہا کے لیے سوچو۔"

☆ ☆ ☆

"یہ بچیوں کا کمرہ ہے پنک اور وائٹ کمبی نیشن کے ساتھ انہیں یقیناً پسند آئے گا اس کے ساتھ ان کا اسٹڈی روم ہے۔" جعفر نے ایک اور دروازہ کھولا۔

"میں ان کا ٹیوٹر شام کو انہیں پڑھانے آیا کرے گا۔ نہ تمہیں یہ مسئلہ در پیش ہوگا کہ بچیاں کہاں بیٹھ کر سکون سے پڑھیں نہ تمہیں خود پڑھانا پڑے گا۔"

مدیحہ ایک خاموش نظر اس پہ ڈال کے اثبات میں سر ہلا کے رہ گئی۔

"میں نے اسی لیے اپنا اور تمہارا بیڈ روم بچیوں کا روم اور اسٹڈی وغیرہ اوپر والے پورشن میں بنوائے ہیں تاکہ کوئی یہاں رہنے آئے بھی تو ہم اور ہماری بچیاں ڈسٹرب نہ ہوں۔ ڈرائنگ روم گیسٹ رومز اور سرونٹ کوارٹر نیچے ہیں۔"

کوئی سے اس کی مراد اس کے اور مدیحہ کے گھر والے تھے۔

"یہ ہمارا بیڈ روم اس گھر کا سب سے خوب صورت گوشہ ہے یا نہیں؟"

وہ امیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مدیحہ انکار نہ کر سکی۔ واقعی اس کمرے کا انٹیریر دیکھنے کے لائق تھا۔

"یہ سلائیڈنگ ونڈو ہمیں سامنے کا حسین منظر دکھاتی ہے اور ہر صبح سورج بھی یہیں سے طلوع ہو کر ہمیں گڈ مارننگ کہا کرے گا۔"

وہ بڑے شوق سے کہہ رہا تھا اور مدیحہ حیرت کے عالم میں اسے دیکھ رہی تھی۔ ان گزرے سالوں میں اس نے کبھی جعفر محمود کو اپنے سامنے اتنا پرجوش نہیں دیکھا تھا۔ وہ جس جعفر محمود سے واقف تھی وہ ایک بے زار، بددل اور اکتایا ہوا شخص تھا۔ اور یہ جعفر محمود جو اس کے سامنے تھا ایک زندہ دل پرجوش اور امنگوں سے بھرپور لگ رہا تھا۔

"کیا یہ سب یہاں سے نکل آنے کا اثر ہے۔" اس نے خود سے سوال کیا پھر آپ ہی خود ہی جواب بھی خود ہی دے دیا۔

"وہ عمر قید کے بعد تو وہاں سے نہیں نکلے ہیں۔ ساری عمر ہی ہاسٹلز میں گزاری۔۔۔ تعلیم کے لیے بیرون ملک بھی رہے پھر شادی کے فوراً بعد سے سول سروس کی وجہ سے بھی اس شہر تو کبھی اس شہر میں پوسٹنگ رہی۔ اسی اسلام آباد میں تین چار سال رہ گئے ہیں۔ پھر واپس آ کر اتنے ایکسائٹڈ؟ کہیں اس کی وجہ کوئی اور تو نہیں؟۔۔۔ کوئی اور؟" ایک شک سرسراتا ہوا اس کے ذہن کو چھو کر گزرا۔

"تمہیں کیسا لگا پسند آیا یہ گھر؟"

وہ مڑ کے اس سے پوچھ رہا تھا جو تنے ہوئے اعصاب کے ساتھ اس تنک کو جھٹلانے کی کوشش کر رہی تھی [illegible] کامیاب نہ ہو پا رہی تھی۔

"گھر؟... ابھی یہ گھر کہاں ہے، یہ تو مکان ہے۔" اس نے چاروں طرف سجے سجائے ہر سہولت، آرام آسائش سے مزین در و دیوار کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں شاید تم سچ کہہ رہی ہو۔ میں تو مکان ہی سجا سکتا ہوں۔ گھر تو اسے تمہیں بنانا ہے تم نے اور ہماری [illegible] نے۔" جعفر نے اس کے نزدیک آ کر شانوں پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"وہ بھی تو گھر تھا جو ہم چھوڑ آئے۔" ہلکا سا گلہ اس کے لبوں پہ آ ہی گیا حالانکہ جعفر کا یہ ارادہ کبھی [illegible] تک نہ پہنچتا اگر وہ اسے اپنی خواہش کا نام نہ دیتی اور بھائی اور سسر کے سامنے ڈٹ کے کھڑی نہ ہو جاتی۔

"ہر وہ جگہ جہاں سر چھپانے کو چھت مل جائے گھر نہیں ہوتی مدیحہ! گھر وہ احساس ہے جو آپ میں [illegible] تسکین پیدا کرتا ہے۔ یہ میرا گھر ہے مدیحہ تمہارا گھر ہے ہمارا گھر، ہماری بیٹیوں کا گھر۔"

"ملکیت کی تسکین؟... کیا واقعی یہاں سب کچھ میرا ہوگا؟"

"سب کچھ حتیٰ کہ یہ گھر بھی اگر تم کہو تو میں یہ گھر تمہارے نام کر دوں؟"

"کیا اس سب کچھ میں آپ بھی شامل ہیں جعفر؟" اس کے سوال پہ وہ ٹھٹک کر خاموش ہوا۔

"تمہیں یقین کیوں نہیں آتا؟"

"آپ نے کبھی ڈھنگ سے دلایا ہو تا۔"

"کیا؟"

"یقین۔" وہ ہلکا سا مسکرائی۔

"ہاں... پہلے مجھے خود تو یقین آ جائے۔" وہ گہری سانس بھر کے انگڑائی لینے لگا۔

"ابا جی کی وجہ سے میں تو سخت یاسیت کا شکار تھا۔ مجھے لگ رہا تھا میں حویلی کی دیواروں سے اور بھائی [illegible] سے کبھی نکل ہی نہیں سکوں گا مگر یہ ہوا اور بہت جلدی ہوا اور سب تمہارے تعاون سے ممکن ہوا ہے مدیحہ! اس کے لیے میں ہمیشہ تمہارا ممنون رہوں گا۔ کبھی تمہارا احسان نہیں بھولوں گا۔"

"تم میرا احسان مت یاد رکھو جعفر! میری محبت اور میری وفا ضرور یاد رکھنا۔"

وہ دل ہی دل میں کہہ کے رہ گئی۔ آج اس کا یہ گلہ اور بھی بڑھ گیا تھا کہ جعفر اسے اپنی محبت اور وفاداری [illegible] دلانے کے معاملے میں ہمیشہ ٹال مٹول کر جاتا ہے۔

"مائنڈ بدلتے کبھی دیر نہیں لگتی۔" اس نے شانے اچکائے۔

"مجھے آپ کے پل پل بدلتے ذہن اور دل دونوں سے خوف محسوس ہوتا ہے۔"

"میں نے ذہن کی بات کی ہے دل کی نہیں۔"

"تو کیا آپ کے دل و دماغ الگ الگ رہتے ہیں؟"

"کیا مصیبت ہے یار!" وہ جھنجلا کے اٹھ گیا۔

"ہر وقت بحث پہ کیوں تلی رہتی ہو تم۔ میں تمہیں گھر دکھانے لایا تھا کہ تمہیں اس پہ کوئی اعتراض ہو [illegible] آئے تو میں شفٹ ہونے سے پہلے پہلے پوری کرا لوں مگر تمہیں تو میری ہر بات پہ اعتراض ہے کیا مجھ میں ہی نقص ہے۔"

"بھڑک کیوں رہے ہیں؟"

"تو اور کیا کروں؟ تم پچھلے آدھے گھنٹے سے بھڑکانے کی ہی کوشش تو کر رہی ہو۔" اس نے غصہ کے عالم میں اپنے سن گلاسز اور چابیاں اٹھائیں۔

"چلو اب۔"

♣♣♣♣

"اوہو... بڑی جلدی آ گئیں اس بار، تمہارا تو ریکارڈ ہے کہ جب تک پانچ چھ بار پیغام نہ بھیجو، بلاوے نہ دو تب تک آتی ہی نہیں، اس بار ایک ہی فون پہ؟ تعجب ہے۔"

کلثوم نے صبح سویرے حمیدی بوا کی آمد پہ حیرت کا اظہار کرتے ہوئے کہا۔ حمیدی بوا ان کی خاندانی رشتے کرانے والی خاتون تھیں۔ کلثوم کا رشتہ جمیل سے اور کلثوم کے دوسرے بہن بھائیوں کا رشتہ بھی انہی نے کروایا تھا۔ کل ہی کلثوم نے حمیدی بوا کے پڑوس میں فون کر کے اپنے ہاں آنے کا پیغام دیا تھا اور آج دن کے پونے دس بجے ہی وہ برقعے کی بنی [illegible] سامنے بیٹھی تھیں۔

"بات وقت کی ہے بٹیا! ایک وقت تھا کہ حمیدی کو لوگ ہاتھوں ہاتھ لیتے تھے۔ ایک وقت میں درجنوں عمدہ عمدہ رشتے جیب میں پڑے رہتے تھے۔ اپنی لڑکیوں کے اچھے بر کے لیے باپ میری ہتھیلی پہ قرضہ اٹھا اٹھا کے بھی منہ مانگا معاوضہ رکھتے تھے اور مائیں اپنے بیٹوں کے لیے نیک بہوئیں لانے کے لیے میرے آگے ناک رگڑتی تھیں... مگر اب۔"

انہوں نے ایک طویل سرد آہ بھری اور کلثوم کے ہاتھ سے پانی کا گلاس لے کر بڑے بڑے گھونٹ بھرنے لگیں۔

"اب تو لڑکے لڑکیاں خود ہی آنکھ مٹکا کر کے اپنا اپنا بر ڈھونڈ لیتے ہیں۔ ماں باپ تک کو تکلیف نہیں دیتے پھر حمیدن کی روزی روٹی کا کہاں خیال کریں گے اور اگر کسی بدنصیب کا عشق نہ چل سکے تو ماں باوا جا بھاگتے ہیں ان کم بختی مارے شادی دفتروں میں جو ہزاروں روپیہ بٹور کے فراڈ کرتے ہیں۔ اب وہ [illegible] کہاں تمہاری حمیدی بوا! میں کہ دس بلاووں کا انتظار کرے۔ پڑوس کے چھوکرے نے تمہارے پیغام کا بتایا تو میں تو سویرا ہوتے ہی گھر سے نکل آئی۔ تین بسیں بدل کے پہنچی ہوں۔ ایک تو تمہارا گھر بھی اللہ میاں کے پچھواڑے ہے، بدن کی چولیں ہل گئیں۔"

"ہمارا گھر تو شہر کے بیچوں بیچ ہے بوا! تم ہی راوی پار جا بسی ہو۔"

"ہاں... اب کیا کریں، شہر کے اندر تو کٹیا کے کرائے بھی آسمان سے باتیں کر رہے ہیں، وہاں کم از کم کرایہ تو کم ہے۔ ہاں مگر یہ ہے کہ کہیں آنا جانا ہو تو مشکل ہوتی ہے۔"

"رکشہ کر لیتیں بوا!"

"رکشہ؟... توبہ... توبہ! ہمارے محلے سے یہاں تک کا رکشے کا کرایہ اتنا بنتا ہے جتنا میری کٹیا کا مہینے بھر کا کرایہ۔ ہاں تم کچھ دے دلا دو تو شاید واپسی پہ یہاں سے رکشہ لے کر آدھا رستہ تو سکون سے کاٹوں پھر آخری اسٹاپ تک کی بس پکڑ لوں گی... اے بٹیا! چائے وائے تو پوچھ لیتیں بڑھیا کو۔" کلثوم اٹھنے لگی تو پیچھے سے آواز دی۔

"میں تو جلدی میں نہار منہ ہی اٹھ کر بھاگی۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔"

کلثوم نے جلدی سے چائے کا پانی رکھ کے توے پر پراٹھا ڈالا۔ چائے تیار ہونے تک پراٹھا اور قرانی انڈا تیار کیا۔ رات کا سالن گرم کر کے ٹرے میں رکھا اور بوا کو پیش کرنے کے بعد وہیں بیٹھ کر انتظار کرنے لگی کہ کب وہ اصل مدعا بتانے کے موڈ میں آتی ہیں۔

"میرا تو بس نہ چل رہا تھا کہ میں رات کو تمہارے فون کا سنتے ہی نکل پڑوں۔ بڑی مشکل سے دن نکلنے کا انتظار کیا۔"

بوا نے صرف ابتدائی چند لقمے ہی خاموشی سے لیے اور پیٹ میں کچھ جاتے ہی اس کی زبان پھر روانی سے چل پڑی۔

"کیا سمجھا ہے کہ حمیدی کا کام بالکل ہی چوپٹ اور ٹھنڈا پڑا ہے۔ آ جاتے ہیں بھولے بھٹکے کوئی نہ کوئی مگر تمہارے فون کا سن کر تو دل خوش ہو گیا۔ عرصے بعد کسی رشتے کو کرانے میں دل بھی لگے گا اور محنت بھی۔ بھئی آخر عرفان میاں جیسے نوجوان کے لیے ہم کوئی ایری غیری تو پسند کرنے سے رہے۔ ہاں بس آسمان کی حور لائیں گے تم دیکھنا۔"

"ماشاء اللہ۔ مگر بوا میں نے فی الحال آپ کو عرفان کے لیے زحمت نہیں دی۔"
"ہائیں۔۔۔ تو پھر؟" بوا کا لقمہ حلق میں اٹک گیا۔
"اے بی بی! اب بیاہ کرو گی اپنے بھائی کا خیر سے پینتیس کا تو عمر ہو گئی ہے۔ تمہارے ماں باپ بھی نہ رہے اپنے گھر بار کا کرو۔"
"کر دیں گے بوا! کر دیں گے وہ بھی ہو جائے گا۔ اس کی مجھے فکر نہیں۔ لے دے رشتوں کی کیا کمی ہے۔ لوگ منہ سے کہہ رہے ہیں اپنی بیٹیوں کے لیے۔"
"بے غیرتوں کے یہی چلن ہوتے ہیں۔ اپنے منہ سے کہہ کر ہم غریبوں کے پیٹ پہ لات مارتے ہیں۔ ہمارے وقتوں میں ایسا ہوتا تھا کہ لڑکی کے ماں باپ کو کوئی لڑکا اپنی بٹیا کے لیے بھا گیا مگر کوئی خود اپنے منہ سے اظہار کوئی اشارہ کنایہ کریں توبہ کرو ڈوب مرنے کا مقام ہوتا تھا۔ اس بات سے کہ ہم جیسوں کو دیتے جیسے تیسے طرح اس لڑکے کے گھر والوں کا دھیان ہمارے ہاں لگا مگر انہیں بھنک نہ پڑے کہ ہم نے خود کہا ہے۔"
"بوا۔۔۔ اب میری بھی سنو گی یا نہیں۔" کلثوم نے اکتا کر کہا۔
"ہاں ہاں کیوں نہیں سنوں گی۔۔۔ تم کس لیے آئی ہو؟"
"مجھے اپنی نند کے لیے رشتہ چاہیے۔"
"نند؟۔۔۔ تمہاری تو ایک ہی نند تھی۔"
"تھی نہیں ہے۔"
"ہاں وہی جو۔۔۔ بدنصیب بیوہ ہو گئی تھی نا۔"
"ہاں بوا اور ابھی اس کی عمر کیا ہے۔ جوان ہے۔ خوب صورت ہے' مزاج کی بھی اچھی ہے' جہاں جائے گی بس جائے گی کیا قصور ہے اس کا جو بھائیوں کے در پہ جوانی برباد کرے۔"
"یہ تو تم نے بڑی نیک بات سوچی ورنہ آج کل کی بھاوجوں کو نند پہ ایک بار خرچا کرنا کھلتا ہے کہاں کہ دوبارہ اسے رخصت کرنے کا سوچیں۔"
"پھر ہے کوئی رشتہ؟" اس نے بڑی آس سے پوچھا۔
"ابھی تو ذہن میں نہیں۔ میں تو عرفان کا سوچ کر بڑے گھرانوں سے حسین اور امیر گھرانوں کی بیٹیوں کے اکٹھے کر کے لائی تھی اب جا کے نئے سرے سے دیکھتی ہوں اپنی کاپی ہاں آتے رہتے ہیں کئی دوہاجوں کے رشتے۔۔۔ دیکھتی ہوں جا کر۔"
"دوہاجو؟۔۔۔ بوا کوئی اچھا رشتہ نہیں ہے؟"
"دوہاجو کا رشتہ کیا برا ہے؟ تمہاری نند بیوہ ہے' رنڈوے سے شادی ہو جائے تو کیا زمانے سے الگ ہو گا۔ میں نے پچھلے سال دو سال اٹھارہ سال کی کنواریوں کے رشتے رنڈووں سے کرائے ہیں۔ بھئی ایک بیوی کے مرنے سے کون سے بال جھڑ جاتے ہیں مرد کے جو کنواری عورت سے شادی نہیں ہو سکتی۔ مرنے والی مر گئی۔ کوئی بھوت تو چپٹ کے نہیں بیٹھا اس مرد سے۔"
"ٹھیک۔۔۔ مگر بوا! آپ منزہ کو بھی تو دیکھیں وہ اتنی کم عمر ہے' بلکہ جتنی عمر ہے اس سے کہیں کم نظر آتی ہے۔ صورت بھی لاکھوں میں ایک ہے' پڑھی لکھی بھی ہے۔"
"ایسی بیواؤں کو کنوارے مردوں کے رشتے تب ملتے ہیں جو ان کے پلے کچھ ہو' کوئی جائیداد' مکان وغیرہ۔"
"ہاں۔۔۔ وہ تو نہیں ہے۔"
"ارے ہاں۔۔۔" بوا کو اچانک کوئی خیال آیا۔
"اس کا تو بال بچہ بھی ہے نا؟"

"ہاں ایک بیٹی ہے چھ برس کی۔" کلثوم نے دھیمے لہجے میں بتایا جیسے منزہ کی کوئی خامی بڑے شرمندہ انداز میں بتا رہی ہو۔
"وہ تو اپنے ددھیال میں ہی ہو گی۔" بوا نے قیاس ظاہر کیا۔
"نہیں اس کے ساتھ ہی ہے۔"
"اے لو۔۔۔" بوا اچک گئیں۔
"اس کا ننھا کیوں پال لیا۔"
"بیٹی ہے وہ اس کی بوا!" کلثوم کو نجانے کیوں برا محسوس ہوا۔
"ہاں بیٹی ہے تو ٹھیک ہے اور بیوہ یا تو عزت سے چار دیواری میں بیٹھ کے اولاد پال پوس کر جوان کرے یا پھر عقد ثانی کرے۔ اگر تمہیں نند کا گھر دوبارہ بسانا ہے تو پہلے بچی ان کے حوالے کرو جن کی امانت ہے۔"
"اور اگر وہ امانت لینے سے انکاری ہوں تو پھر؟"
"کیوں بھلا؟۔۔۔ ان کے بیٹے کی اولاد ہے۔۔۔ مرے ہوئے بیٹے کی آخری نشانی۔۔۔ انھیں تو سر آنکھوں پہ بٹھانا چاہیے۔"
"اگر زندہ ہوتے تو سر آنکھوں پہ بٹھاتے۔۔۔ بلکہ بٹھایا بھی۔ بے مظہر کو گزرے تو چار برس ہونے کو آئے اس کی ساس نے بہو اور پوتی کو کلیجے سے لگا کر رکھا مگر وہ بے چاری گزر گئی تو منزہ پہ سسرال کی دیواریں تنگ ہونے لگیں' دیور' دیورانی نے جینا دوبھر کر دیا تھا۔ وہاں تو بچی کا رہنا نا ممکن ہے۔"
"اور بچی کے ہوتے ہوئے اچھا رشتہ ملنا نا ممکن۔ لڑکا ہوتا تو شاید بات بن جاتی۔ ہر کوئی سوچتا ہے' چلو پلا پلایا لڑکا مل جائے گا تو کل بازو بنے گا۔۔۔ نہ بھی بنا تو چار جماعتیں پڑھ لیں' ذرا قد نکال لیا تو خود اپنا ٹھکانہ کرے گا۔ اس لیے بچے کی مطلقہ یا بیوہ ماں کو لوگ پھر بھی قبول کر لیتے ہیں مگر بچی والی سے نکاح پڑھواتے جھجکتے ہیں کہ ایک تو پرائی بچی کی ذمہ داری ہی بڑی۔ پھر پالنا پوسنا بعد میں بوجھ اٹھانے والا کر پایا یہ تو مشکل کام ہے۔"
وہ زچ ہو کر بولی۔
"آسان ہوتا تو گھر بیٹھے خود نہ کر لیتی۔ تمہیں اسی کام کے تو پیسے ملیں گے کہ اس مشکل کو آسان کر کے دکھاؤ۔ مگر خدا کا واسطہ ہے ٹیڑھے میڑھے' اوٹنگے بوٹنگے رشتے نہ لانا۔ مجھے منزہ کا گھر بسانا ہے' اسے بوجھ کی طرح سر سے نہیں اتار پھینکنا۔ اچھے لوگ ہوں۔۔۔ لڑکا شریف اور کچھ پڑھا لکھا بھی ہو' پتا ہے نا کہ منزہ بی اے پاس ہے۔"
"ہاں ہاں پتا ہے اور بھی بہت کچھ پتا ہے۔" بوا بڑبڑائیں۔
"میرے بھی آگے دو بیٹیاں ہیں' منزہ کے سلسلے میں کوئی زیادتی ہو گئی تو اللہ نہ کرے' نتیجہ مجھے بھی بھگتنا پڑ سکتا ہے اس لیے دیکھ بھال کے رشتہ لانا بوا! بس یہ سمجھنا کہ اپنی بیٹی کا گھر بسا رہی ہو۔" کلثوم نے منت کی۔
کچھ خدشات کے زیر اثر وہ منزہ کی موجودگی سے خائف ضرور ہو گئی تھی اور اسی وجہ سے کچھ دنوں سے اس کا رویہ بھی نہ چاہتے ہوئے اس سے بدل گیا تھا مگر اس کے دل میں ابھی بھی اس کے لیے کوئی برے جذبات نہ تھے نہ وہ اس کا برا چاہتی تھی۔
"ہاں کر رہی ہوں کوشش۔ تم کوئی ہزار پانچ سو روپے تو دو۔"
"ہزار پانچ سو؟۔۔۔ رشتہ تو لاؤ بوا۔۔۔ پھر بھی رہنا ہزاروں فی الحال یہ دو سو رکھ لیں۔ اور ہاں یہ جوڑا تمہارے لیے نکال کے رکھا ہے' گرم ہے اور بالکل نیا' مجھے تنگ ہو گیا۔"
"چلو ابھی کے لیے اتنا کافی ہے مگر بٹیا! آئندہ یہاں آنے جانے کا کرایہ ہر بار تمہاری طرف سے ہاں۔" وہ برقعہ سنبھالتی اٹھیں۔
اسی وقت منزہ اپنے کمرے سے نکلی حمیدی بوا کو اس نے پہلی نظر میں پہچان لیا حالانکہ کافی عرصے بعد آمنا سامنا ہوا تھا۔ جمیل اور جمشید کے رشتے انہی نے کرائے تھے۔

"یہ آج یہاں کیسے؟" منزہ ٹھٹکی۔ وہ ابھی برقع کے بٹن بند کرتے کرتے ٹھٹھک کے اسے دیکھنے لگی اور سلام کا جواب دیتے ہی کہا۔

"کیسی ہے تاں منزہ؟... اے لو یہ تو ویسی کی ویسی ہے عمر تو جیسے تمہیں گزری نہ عمر کا اثر نہ بیوگی کے غم کا، ویسی کی ویسی حسین بھئی کلثوم! اب میری مشکل آسان ہوتی نظر آرہی ہے۔ اچھی صورت کا تو جیسے کال پڑ چکا ہے اب تمہارے مطلوبہ معیار تک شاید پہنچ ہی جاؤں۔" انہوں نے منزہ کے سر پہ ہاتھ پھیرا اور نکل گئیں۔

موئے ملے کی بو تک پہنچتی منزہ کے چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔

کلثوم کو اس کی فق رنگت اور گم صم انداز دیکھ کے بہت تاسف ہوا، مگر اب یہ ناگزیر ہو چکا تھا۔

سب ہی متفق تھے کہ منزہ کی آئندہ زندگی بہتر انداز میں گزرے۔

"بھابی... یہ؟" اس نے پوچھنا چاہا۔

"ہاں... وہ حمیدی بوا۔"

کلثوم نے نظریں چرا کے خود کو مصروف کرنا چاہا۔

"میں جانتی ہوں مگر یہ جاننا چاہتی ہوں کہ یہاں کیوں آئیں؟"

"میں نے بلوایا تھا۔" کلثوم نے بغیر نظریں اٹھائے کمزور لہجے میں کہا۔

"مگر کیوں؟" اس کی نسبت منزہ کا لہجہ پست نہیں تھا۔

"تمہارے بھائیوں کے کہنے پہ۔" کلثوم بھی اب کمزور نہ رہ سکی اور چڑ کے کہا۔

"میں اتنی چبھنے لگی ہوں آپ کو؟"

"ایسی بات نہیں۔" اس نے تحمل سے کام لینے کی کوشش کی۔

"ہم تمہارا بھلا چاہتے ہیں اور صرف ہم نہیں، جمشید کی بھی یہی خواہش ہے اور زندگی کی خوشیاں حاصل کرنا تمہارا بھی حق ہے۔ تم کیوں خود پہ زندگی کے دروازے بند کرلی ہو۔"

"حق؟... مجھے میری مرضی سے جینے کا حق تو دے دیں اور میری خوشی کس میں ہے یہ آپ لوگ کیا جانیں؟"

"دیکھو منزہ! زندگی بھائی بہنوں کے آسرے پہ نہیں گزرتی۔ اولاد جوان ہو رہی ہوتی تو یہ بولی اتنی پہاڑ سی نہیں [illegible] مگر تمہارے آگے ایک لمبی زندگی پڑی ہے اور بغیر مرد کے اور اپنے گھر کے اس زندگی کو گزارنا تمہارے لیے نہیں ناممکن ہے۔ تمہارے دونوں بھائی تمہارے لیے پریشان رہتے ہیں، ٹھنڈے دل سے سوچو، مثبت [illegible] میں اس سے صرف تمہاری ہی نہیں ہم سب کی زندگیاں آسان ہوں گی۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر چلی گئیں۔

منزہ کو لگا اس کے پاس کہنے کو اب کچھ نہیں رہا۔ وہ تھکے تھکے انداز میں بیٹھ گئی۔

اسے لگا جیسے اس کے سامنے مظہر کا بے جان وجود پڑا ہو، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ اس وجود سے لپٹ کر دھاڑیں مار مار کے روئے۔
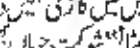
☆ ☆ ☆

"ذرا جلدی چلائیں..." پروین نے کوئی تیسری بار کہا تو سراج دین چڑ گئے۔

"اب کیا تمہارے بھائی تک پہنچنے کی جلدی میں میں گاڑی کہیں دے ماروں۔"

"اللہ نہ کرے... خیر کا کلمہ منہ سے نکالا کرو بیٹا!" شوکت جہاں بھی ساتھ ہی تھیں، دہل کے بولیں۔

"اسے سمجھائیں... مسلسل تیز ڈرائیونگ کے مشورے دے رہی ہے۔"

"آرام سے بیٹی... ٹریفک بھی تو دیکھو کس قدر ہے۔ اللہ خیر کرے گا۔" انہوں نے دوپٹے سے آنسو پونچھتی پروین کو تسلی دی۔

"چار گھنٹے ہو گئے ہیں اسے گھر سے نکلے... اماں بتا رہی تھیں، آس پاس کا سارا علاقہ چھان مارا ہے نہیں مل رہی۔"

"اتنی سی بچی کتنی دور جا سکتی ہے بھلا؟"

"کوئی اٹھا کے لے گیا ہوگا... ہائے میری وشمہ۔" وہ پھر رو پڑی۔

"اللہ پہ یقین رکھو وہ بہتر کرے گا۔"

"بھائی جان پہ پہلے کیا کم آزمائشیں ہیں جو یہ... ایک تو وہ پہلے ہی بیمار رہنے لگے ہیں... آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف..."

"اسے اپنا خیال رکھنا چاہیے۔"

"خیال رکھنے والا کون ہے؟"

"جب اور کوئی نہ ہو تب ہی تو اپنا خیال خود رکھنا پڑتا ہے۔"

"ہائے اماں جی... دروازے کے آگے پولیس کھڑی ہے اور... اور اتنا رش۔"

دور سے دیکھ کے ہی پروین کے ہوش اڑ گئے۔ وہ ساس کا کاندھا تھام کے کپکپاتے لہجے میں کہنے لگی۔

"گھبرا کیوں رہی ہو، بچے لاپتہ ہو جائیں تو پولیس آتی ہی ہے، نوید نے بلوائی ہوگی۔"

اس بار سراج دین کا لہجہ بھی قدرے نرم اور دلاسا دیتا ہوا تھا۔

تینوں گاڑی سے نکلے گھر کے باہر تک شمشاد کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ جس کی وجہ سے پروین نے بالکل ہی ہاتھ پیر چھوڑ ڈالے۔

شوکت جہاں اسے بمشکل سہارا دے کر اندر تک لائیں جہاں شمشاد صحن کے بیچوں بیچ بیٹھی سینہ پیٹ پیٹ کر بین ڈال رہی تھی۔ ان تینوں کو ہی کسی انہونی کا احساس ہوا۔ پروین تو کھڑے کھڑے قدموں وہیں گر گئی۔

"ہائے میری پھول سی بچی... میری اکلوتی پوتی... اچھی بھلی کھیل رہی تھی باہر پتہ نہیں کون بدبخت اٹھا کے لے گیا۔

ہائے اسے کسی کی آئی آ جائے کمبخت کی موت مرے حرامی میرے نوید کی خوشی کسی سے ہضم نہیں ہوتی۔ اس کا بیڑہ ڈوبے کیڑے پڑیں کسی مردار کی اٹھا کے لے گیا اس کی اکلوتی بچی کو اب آتا ہوگا فون بیس تیس لاکھ لے کر ٹلیں گے حرام خور۔"

"اماں آپ نے وشمہ کو اتنی دوپہر میں نکلنے کیسے دیا؟"

"نکل گئی مجھ سے پوچھ کے تھوڑا نکلی تھی۔ میرے کہنے میں کہاں ہے وہ۔"

"شمشاد بہن! تین سال کی بچی کیا کسی کے کہنے میں ہوگی۔ اسے اس بات کی کیا سمجھ کہ اسے کس بات سے روکا جا رہا ہے اور ٹوکا جا رہا ہے اور یہ اس کے بھلے کے لیے ہے یا نہیں۔ بچوں پہ نظر رکھنی پڑتی ہے اور وشمہ کو تو جب دیکھو باہر پھر رہی ہوتی ہے، کبھی ننگے پیر کبھی بغیر گرم کپڑوں کے، کتنی بار گاڑی یا رکشہ کے نیچے آتے آتے بچی ہے۔"

کسی پڑوسن نے سچ اگلنے کی جرأت کی۔

"ہاں تو بچی کی بات ہے... آئی تو نہیں۔" شمشاد اس پہ گویا جھپٹ پڑی۔

"اور جو دل میں رہی تمہیں اپنی مصیبت پڑی ہے یہ فساد پھیلا رہی ہے... جا جا اپنے گھر تو جا کے اپنے بال بچوں پہ نظر رکھ۔"

رہی سہی وہ تین اور عورتیں بڑبڑ کرتی وہاں سے اٹھ گئیں۔

"نوید بھائی جان!" رشتے کا ایک بھائی... کم عمر سا لڑکا بھاگتا ہوا اندر آیا۔

"ایک آدمی باہر آیا ہے، اس نے بتایا ہے کہ ایک تین سال کی بچی ادھر ریلوے اسٹیشن کے پاس اس کے بھائی کو ملی ہے جو ریڑھی پہ لنڈے کے کپڑے بیچتا ہے۔ اس نے مسجد میں اعلان سنا ہے تو پتہ کرنے آیا ہے، وشمہ کی تصویر دیکھ کے اس نے پہچان لیا ہے۔ پولیس پوچھ گچھ کر رہی ہے۔ آئیں ہم بھی ساتھ چلیں وشمہ کو لینے۔"

نوید مراد جو مایوس انداز میں سر جھکائے بیٹھا تھا' نئے سرے سے جی اٹھا اور تیزی سے اٹھا۔

"میں بھی ساتھ چلتا ہوں۔" سراج دین بھی ہمراہ ہو لیے۔

"یا اللہ! تیرا شکر ہے' بچی خیریت سے مل گئی۔" شوکت جہاں نے ہاتھ بلند کیے۔ پروین بھی سربسجود ہو گئی۔

"یا اللہ! شکر ہے۔ بڑھے ویلے میں اپنا جو ڑا منڈوانے سے بچ گئی۔ ورنہ ساری دنیا کی جوتیاں ہوتیں۔ مجھے سب کو یہ نظر آتا ہے کہ میں اس پہ نظر نہیں رکھتی۔ یہ کوئی نہیں دیکھتا کہ میری عمر کیا ہے؟ اب میری ہڈیاں اس قابل رہ گئی ہیں کہ میں بچوں کے پیچھے بھاگتی پھروں۔"

جب تک نوید وشمہ کو لے کر آ نہیں گیا وہ ایسے ہی اپنی بھڑاس نکالتی رہی۔

"بس بھی کرو اماں! شکر کرو کہ بچی صحیح سلامت آ گئی ہے ورنہ عمر بھر کا روگ لگ جاتا۔"

ہمیشہ خاموش رہنے والے نوید مراد سے بھی ماں کی بے جا تنقید کی راگنی برداشت نہیں ہوئی۔

"ہاں۔ ہاں صحیح سلامت آ گئی ہے' اس لیے ماں کو چپ کرا رہا ہے' نہ آئی ہوتی تو دیکھتی۔ سب مجھے کو الزام دیتا کرتا۔ تب تو تو نے بھی اوروں کے ساتھ مل کے ماں کو نشتر لگانے تھے۔ وہ تو آج زیادہ سکی ہو گئی ہے ورنہ سب پتہ ہے مجھے تو بھی یہی سمجھتا ہے کہ میں اس کا خیال نہیں رکھتی۔"

چور کی داڑھی میں تنکا کے مصداق وہ خود ہی بولے جا رہی تھی۔

کسی نے اسے خاموش کرانے کی زحمت نہ کی کیونکہ سب جانتے تھے ایسی کوئی بھی کوشش ناکام ہوگی۔

شوکت جہاں نے سراج دین سے کہہ کر پروین کو وہاں رات رکنے کی اجازت دلوا دی۔

"بھائی جان اب تو سنجیدگی سے سوچ لیں کہ آپ کی دوسری شادی کتنی ضروری ہے۔ آپ اس لیے تو ڈر رہے تھے کہ وشمہ کے لیے نئی آنے والی ماں نجانے کیسی ثابت ہو' مجھے بھی یہ خطرہ تھا مگر اب سوچتی ہوں کہ اس سے برا کیا ہو گا۔

ایسا نہیں ہے کہ انہیں وشمہ سے محبت نہیں مگر اب ان کی عمر بھی تو دیکھیں۔ نانیاں دادیاں لاڈ پیار تو کر سکتی ہیں مگر نگہداشت نہیں' اسے سنبھالنے کے لیے کسی ذمہ دار عورت کی ضرورت ہے۔"

"پروین! میں تھک گیا ہوں۔ میں اپنی ہار تسلیم کرتا ہوں مجھ سے اکیلے یہ بچی نہیں پالی جائے گی۔ تم وہ کرو جو تم بہتر سمجھتی ہو مگر ایک بات کا خیال رکھنا۔"

"وہ کیا بھائی جان؟"

پروین نے اس کے راضی ہونے کی خوشی کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

"نہ تو اپنے لیے بھائی پسند کرنا نہ میرے لیے ایسی شریک حیات جو میرا ساتھ دے سکے نہ اماں کے لیے بہو جو ان کو آرام دے سکے صرف اور صرف وشمہ کے لیے ماں تلاش کرنا۔"

"ایسا ہی ہوگا بھائی جان! انشاء اللہ۔" پروین نے یقین دلایا اور جاتے جاتے ماں کو بھی یہ خوشخبری سنا دی۔

"میں اپنے سسرال میں نظر دوڑاتی ہوں' آپ بھی تلاش جاری رکھیے۔"

"رہنے دو بی بی! تم اپنی سسرال تو رہنے دو' ساری تمہاری ساس جیسی بد مزاج ہوں گی۔ میں نہیں چاہتی کہ میرا نواسا کسی چالاک عورت کے ساتھ گزارا کرے۔"

"برابر والی خالہ بتا رہی تھیں ان کی جاننے والی شاہدہ کے پاس کہیں رہتی ہے' عرصے سے رشتے کرا رہی ہے اور اس کی شہرت بہت اچھی ہے۔ آپ ان سے کہیں وہ آپ کو لے جائے۔"

"ہاں' دیکھوں گی۔ اب تو یہ چھوٹا کچھ کرنا ہی ہو گا۔ یہ تو وارے نہیں کھاتی۔ ذرا سی کڑی آنت کی پڑی۔"

ابھی چار ہی دن گزرے تھے کہ پروین کے یہاں ماں کا فون آ گیا۔

"میں نے لڑکی دیکھ لی ہے تو آ جا پسند کر لے۔"

"دیکھ لی؟ کہاں ہے؟ میرا مطلب کہاں رہتی ہے؟ کون ہے؟"

"وہ جو آپا نہیں رکھی تھی منتظر نے۔ وشمہ کے واسطے۔"

"ہاں ہاں اس نے بتائی ہے لڑکی؟"

"بیٹی کہاں ہے؟ اس کی بہن ہے۔"

"بہن؟ ہے۔ آپا کی بہن۔"

پروین کی نظروں کے سامنے اس گنوار اطوار والی عورت کا حلیہ آ گیا جسے اس کی ماں نے پوتی کی نگہداشت کے لیے منتخب کیا تھا اور جو اسے کبھی بھی پسند نہ آئی تھی۔

"آپا کہہ رہی ہو اماں! کسی اچھے گھرانے میں دیکھتیں۔"

"اے بیبی! تو غریب گھر سے ہی لائی تھی میں' دیکھا نہیں تو نے کیسا اچھا بیرا چھانا تھا میں نے۔ غریب گھر کی لڑکیاں سب نکی تھی کیا آتے ہی۔"

"وہ غریب گھر کی تھی مگر شریف سلجھے ہوئے خاندانی لوگ تھے۔ ساجدہ بھی واجبی سا ہی سہی مگر پڑھی لکھی تھی اور پھر تو یہ ہے کہ سسرال میں نباہ کے وقت غریب گھر کا ہونا کام نہیں آتا' صرف مزاج کا سلجھا ہونا اور صابر ہونا ہی کام آتا ہے۔"

"رہنے دے۔ رہنے دے یہ لڑکی صرف اٹھارہ سال کی ہے اور ہے بھی خوب تگڑی۔"

"اٹھارہ سال؟ خدا کا خوف کرو اماں! بھائی جان چالیس پینتالیس کے درمیان ہیں۔ اٹھارہ سال کی بچی سے کیا نباہ کریں گے۔"

"تو نہ کرے نباہ ہم کون سا اس کے نباہ کے لیے لا رہے ہیں۔ وشمہ کے لیے لا رہے ہیں۔ کچی عمر کی لڑکی ہے۔ وہاں سے آگی ہاں شکل کی ذرا ماٹھی ہے بے چاری۔"

"وہ تو مجھے اندازہ ہے۔ ظاہر ہے آپا سے ملتی جلتی ہو گی اس کی بہن۔" پروین کو موٹے بھدے نقوش والی فربہ آپا یاد آئی۔

"مگر صحت اچھی ہے' اس ساجدہ جیسی سوکھی سڑی نہیں۔ جو ایک بچہ تک آرام سے جن نہ سکی اور چلی گئی۔"

"اماں! مرے ہوؤں کو تو بخش دو۔" وہ ناگواری سے بڑبڑائی۔

"اللہ بخشے۔ میں نے کیا بخشنا ہے۔ مگر مجھے تو اس لڑکی کا تگڑا ہونا اچھا لگا ہے۔ یہ میرے نوید کے بیٹے آرام سے پیدا کر لے گی۔"

"اماں۔" پروین نے بے بسی سے سر تھام لیا۔

"دیکھ بیٹے۔ اللہ بھائی جان کو زندگی دے اور ہمیں ایسی خوشی دیکھنے کا موقع بھی فی الحال ہمیں اس ایک بچی کو دیکھنا ہے۔ میرے خیال میں وہ اٹھارہ سالہ ان پڑھ لڑکی کسی بھی طرح وشمہ کی ایک ذمہ دار ماں بننے کے لائق نہیں ہے۔ آپ برابر والی خالہ کو کہہ دیں۔ وہ اپنی جاننے والی عورت کو لے آئے جو رشتہ کراتی ہے۔"

"اچھا۔ کہہ دوں گی۔"

☆ ☆ ☆

"مجھے آپ سے منزہ کے رشتے کے سلسلے میں بات کرنا ہے۔" کلثوم نے جمیل سے کہا۔

"پہلے منزہ سے اس سلسلے میں بات کرنا ہوگی پھر کوئی قدم آگے بڑھانا چاہیے۔"

"میں بات کر چکی ہوں' اسے بھی سمجھایا ہے' میرا خیال ہے اب وہ رضامند ہے اور اسے اعتراض ہونا بھی نہیں چاہیے۔ اپنے بھائی بھابیوں پہ اسے اتنا اعتماد تو ہونا چاہیے کہ وہ اس کے لیے کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔"

"منزہ تم تو اعتماد کی بات مت کرو کلثوم! اگر منزہ جان لے کہ تم اس کے بارے میں کیا خیالات رکھتی ہو تو کتنا دکھ ہو گا اسے۔"

"کیوں ہوگا؟... میں نے کیا برا کیا ہے اس کے ساتھ؟" وہ بولا اٹھی۔ جیسے اس کی چوری پکڑی گئی ہو۔

"کیا میں اندھا ہوں؟ دیکھ نہیں رہا کہ پچھلے ایک دو ہفتوں میں تمہارا سلوک اس کے ساتھ کیسا بدلا ہے۔"

"اس کے ذمہ دار آپ ہیں۔ نہ آپ وہ فضول خیال ظاہر کرتے نہ میرا دل میلا ہوتا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کے لیے دل وسیع نہیں کر سکی۔ آپ کی بہن ہونے کے ناتے وہ مجھے عزیز ہے اور میں یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ ایک بے مثال نند ہے۔ کسی کے لیے تکلیف کا باعث نہیں بن سکتی مگر جو آپ چاہتے ہیں وہ بھی نہیں ہو سکتا۔ پوری نیک نیتی سے چاہتی ہوں کہ اس کا گھر بس جائے۔"

"تم عرفان کی بہن بن کے بھی سوچو تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے۔ دیکھو تمہیں عرفان کی شادی کہیں نہ کہیں تو کرنی ہے یا وہ خود بھی نہ کبھی کر لے گا۔ پتہ نہیں اس کی بیوی کیسی ہو؟ کس مزاج کی ہو؟ ہم سے میل جول رکھنا پسند کرے یا نہیں۔

پھر وہ ہمارے سارے پلانز... وہ آگے کی تعلیم... وہ میرے بزنس میں فنانس کا ارادہ... سب دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔ منزہ سے رشتہ ہونے کی صورت میں عرفان ہمارے اور قریب آجائے گا۔ منزہ بھی تمہاری مشکور ہو جائے گی... سب کچھ۔"

"بس کریں جمیل...!" کلثوم نے کراہیت سے جھرجھری لی۔

"بس کریں... مجھے گھن آرہی ہے آپ کی باتوں سے۔"

"بکواس مت کرو۔" وہ خجل سا ہو کر بولا۔

"میرے دل میں ندامت کا ایک ہلکا سا احساس تھا کہ شاید میں نے منزہ کے ساتھ ٹھیک نہیں کیا آج وہ بھی ڈھل گیا۔ میں نے جو کہا... جو کیا چاہے بدگمانی میں گھر کے یا چاہے کسی خطرے کے تحت... مگر وہ خالص تو تھا۔ آپ کی طرح غرض میں ڈوبا ہوا نہیں تھا۔

عرفان سے میں جو لینا چاہتی تھی یا کروانا چاہتی تھی صرف اس لیے کہ وہ صاحب حیثیت ہے اور بہن ہونے کے ناتے میرا حق ہے کہ میں ضرورت پڑنے پہ اس کی مدد لے سکوں مگر آپ... آپ تو باقاعدہ منصوبہ بندی کے ذریعے اسے گھیرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ بھی اپنی بہن کو چارہ بنا کے... اب تو میں ایسا ہرگز نہیں ہونے دوں گی۔ کیونکہ غرض کے تحت باندھے جانے والے رشتے کبھی پائیدار نہیں ہوتے۔

اور میں اسے یہاں بیٹھا بھی نہیں رہنے دوں گی ورنہ آپ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی صورت میں دوبارہ اسے استعمال کرنا چاہیں گے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو وہ میری بہن ہے۔" جمیل نے کمزور انداز میں اپنا دفاع کرنا چاہا' جسے کلثوم خاطر میں نہ لائی۔

"جمشید اور ثنا کو فون کر دیتی ہوں کہ منزہ راضی ہے۔ اب ہمیں حتمی فیصلہ لینا ہے۔ ایک اچھا رشتہ ہے میری نظر میں۔"

"کس کا؟"

"حمیدی بوا نے کل ہی بتایا ہے۔ راوی روڈ کے رہائشی ہیں اچھے کھاتے پیتے خوشحال لوگ ہیں۔ مختصر خاندان ہے۔ لڑکے کی بہن شادی شدہ ہے' صرف ایک ماں ہے اور ایک بچی۔"

"بچی؟"

"ہاں' تین سال پہلے اس کی بیوی ڈلیوری کے دوران وفات پا گئی تھی۔"

● ● ● ●

"آج پھر نہیں اماں اتنی جلدی میں دوبارہ نہیں آسکتی۔" پروین نے شمشاد بیگم کا بلاوا سن کر فون پہ جواب دیا۔

"ابھی اسی دن تو رات رہ کے گئی تھی۔ اتنی جلدی میاں صاحب نہیں مانیں گے۔"

"تیرے میاں صاحب کی تو..." شمشاد نے باقی کا فقرہ دانت پیستے ہوئے دل ہی دل میں ادا کیا کہ اپنی شوہر کی بے ادبی تو کبھی دل پہ بنا نہ لے لے' نہیں اس کی یہی عادتیں تو زہر لگا کرتی تھیں۔ شوہر تو شمشاد بیگم کا بھی بھی ہوا کرتا تھا مگر کیا مزے سے اماں اور بہنوں کے ساتھ مل کے اس پہ چھبتیاں کسی جاتی تھیں۔ ٹھٹھے لگائے جاتے تھے۔ اور ایک یہ ہے' خود تو شوہر کے سامنے بھیگی بلی بنی رہتی ہے میرے سامنے بھی داماد کو ہوا بنا کے رکھ دیا ہے۔ "وہ کلس کر رہ گئیں۔

"اب دیکھ نا نوید! اتنی مشکل سے مانا ہے۔ ٹھیک مت کا ہے دماغ گھومتے دیر نہیں لگتی۔ کیا پتہ کل پھر بول پڑے۔ وہ حمیدی کہہ رہی تھی آج آنے کا۔ کوئی اچھا رشتہ ہے اس کے پاس تو آجائے گی تو بات کرے گی۔ ساتھ بھی چلی جائے گی۔"

"اماں! بات تو ٹھیک ہے مگر..." پروین تذبذب میں پڑ گئی۔

"اور پھر اس مرحلے پہ میرا جانا ایسا ضروری نہیں۔ ایسا کریں اماں! آج حمیدی بوا کے ساتھ آپ خود ہی ہو آئیں۔ اگر لڑکی اچھی ہے تو پھر بات آگے بڑھانے کے لیے میں اگلے چکر میں ساتھ چلی چلوں گی۔ ہمیں زیادہ لمبی بات چلانی ہی نہیں... لڑکی پسند آئی تو ساتھ ہی ہاتھ پہ شگن کے پیسے رکھ دیں گے اور نکاح کی تاریخ لے لیں گے۔ مگر ابھی آپ تو ہو کے آئیں... میں پھر سہی۔"

"لے... اوئیں' تجھے پتہ تو ہے کہ تیری اس حمیدی کی جھرجھر اردو مجھے کم کم سمجھ نہیں آتی۔ ہورے کی بولی چلی جاتی ہے۔ یہ نہ ہو وہ کچھ کہے میں کچھ سمجھوں... بات بگڑ کی کچھ ہو جائے۔ بس تجھے آنا ہوگا۔"

"اماں...!" وہ زچ ہو گئی۔ "ضروری تو نہیں کہ جو لڑکی ہم آج دیکھنے جائیں گے وہی ہماری مطلوبہ لڑکی ہو۔ نجانے کتنے گھر دیکھنا پڑیں' کتنے دن لگ جائیں۔ میں روز روز گھر بار اور بچے چھوڑ کر نہیں آسکتی۔ لڑکیاں دیکھنے تو آپ ہی جائیں۔ کوئی پسند آجائے تو پھر بتا دینا میں آجاؤں گی۔"

"کیوں نوید بے چارہ کسی لٹھیا رہی ہو؟"

سراج دین جو باتھ روم سے آنے کے بعد لباس تبدیل کرنے کے دوران اور اب بال بناتے ہوئے پروین کی یکطرفہ گفتگو سن رہے تھے اچانک کہہ اٹھے۔

پروین نے بوکھلا کے ماؤتھ پیس پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"جی؟ کیا مطلب؟"

"تمہیں اپنی ماں کی پسند پہ اعتبار ہے؟ جو سارا معاملہ ان کی پسند پہ ڈال رہی ہو۔ ساجدہ کی بار تک لگا' ضروری نہیں کہ ہر بار لگ جائے۔"

"تو پھر کیا کروں؟ مجبوری ہے۔"

دبے دبے الفاظ میں پروین نے اپنا عذر پیش کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی خواہش بھی بغیر الفاظ کا جامہ پہنائے بیان کر دی۔

"ٹھیک ہے چلی جاؤ... مگر شام سے پہلے پہلے آجانا... اور روز روز یہ نہیں چلے گا... کوشش کرو یہ معاملہ جلد انجام کو پہنچ جائے۔"

"کہہ دیتی ہوں ابھی اماں کو..." وہ بے یقین بھی تھی اور پرجوش بھی۔ فوراً شمشاد بیگم کو بتانے لگی۔

"دیکھو... ہاں اماں... وہ میں..."

"لے... میں چونگا کان سے لگائے بیٹھی ہوں تو کیا مرد کے پیر دبانے چلی گئی تھی؟"

شمشاد بیگم نے طنزیہ ہنکارا بھر کے کہا۔

"اماں! میاں صاحب مجھے چھوڑنے آرہے ہیں۔ بس حمیدی بوا کے آتے ہی نکل چلیں گے۔ مجھے گھر جلدی

واپس پہنچنا ہے۔"

"ایک تو تجھے ہر وقت جلدی پڑی رہتی ہے۔ سوچا تھا واپسی پہ انار کلی کا چکر لگائیں گے۔"

"پھر سہی اماں۔۔۔ وقت پہ تیار رہنا۔۔۔ اللہ حافظ۔"

فون رکھ کے وہ گھڑی باندھتے سراج دین کو مشکور انداز میں تکنے لگی۔

"بہت بہت شکریہ۔۔۔ میں بس پانچ منٹ میں تیار ہوتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"شکریہ تمہیں نہیں نوید کو ادا کرنا چاہیے کیونکہ یہ مہربانی میں نے تم پہ نہیں کی۔ بس نوید بے چارے کا خیال آگیا تھا اور ہاں۔۔۔ پانچ منٹ، پانچ منٹ ہی ہونے چاہئیں۔"

☼ ☼ ☼

"تیرا بیڑہ تر جائے حمیدیے۔"

شمشاد بیگم نے حمیدی کی زبانی رشتے کا احوال جاننے کے بعد بے ساختہ دل جلے انداز میں دہائی دی۔ غنیمت تھا کہ ساتھ وہ جوتا نہیں دے مارے۔

"میرے نویدے کے لیے رانڈی رہ گئی تھی، چن چن چھانٹنے والی؟"

"اے ہائے، کیسا چٹا چھنا کا بمن۔۔۔ مشکل سے پچیس سال کی ہوگی بچی۔۔۔" حمیدی بوا نے تین چار سال کے ہیر پھیر کو جائز سمجھتے ہوئے کہا۔

"اور تمہارا لونڈا کون سا سچ مچ کالونڈا ہے؟ چالیس سے اوپر ہے اور رنڈوا۔" وہ بھی کم صاف گو نہ تھیں۔

"مرد تو ساٹھا بھی پاٹھا ہوتا ہے حمیدی! اور میرا نوید! تو ہر مہینے ہزاروں کماتا ہے۔ یہ پندرہ مرلے کا دو منزلہ مکان۔۔۔ گڈی کا روبار۔"

"اور بچی۔۔۔" حمیدی بوا نے اضافہ کیا۔

"تو جو لڑکی تم بتا رہی ہو وہ کون سی چھٹری چھانٹ ہے۔ اک چھٹکی تو اس سے بھی چمٹی ہے۔"

"اوہو اماں۔۔۔ آپ دونوں کس بحث میں پڑ گئیں۔" قریب تھا کہ وہ دونوں آستینیں پلٹنا شروع کر دیتیں پروین نے دخل دیا۔

"حمیدی بوا! کچھ اور بتائیں لڑکی کے بارے میں۔"

"اور کیا سننا ہے تو نے۔۔۔ بتا تو رہی ہے کہ پانچ چھ سال کی بچی ہے۔ تین سال بعد خصم مر گیا تھا اور اب کیا باقی ہے سننے کو۔ دفع دور۔۔۔ میں نہیں دیکھتی ایسی زنانی۔۔۔ منحوس منہ متھے والی۔"

"اے ہائے شمشاد بہن۔۔۔ اپنی بولی والی ہو گئیں منہ بھر کے مت کوسو کسی کو۔ ہاں پروین بٹیا تو میں کہہ رہی تھی کہ لڑکی بہت خوب صورت ہے، کم عمری میں شادی ہوئی، کم عمری میں ہی بیوہ ہو گئی مگر تم دیکھو تو وہ تیزی والی معصومیت اور سادگی اب تک چہرے پہ ہے۔ اور ہاں بی اے پاس بھی ہے۔"

"لو کل ایک ہی کمی تھی۔" شمشاد نے ہاتھ جھاڑے۔

"بی اے پاس۔ تو شادی کم عمری میں کیسے ہوئی۔ بڈھی ہو کے شادی کی اب کدھر سے پچیس سال کی ہو گئی وہ۔۔۔ توبہ حمیدی! تھوڑے جھوٹ بول۔"

"اماں! انیس سال کی لڑکی بی اے کر لیتی ہے۔ وہ کون سا بڑی بات رہی ہے۔"

"شکر اپنا نوید اتو ایف اے پاس ہے ناں۔"

"وہ بعد کی باتیں ہیں اور ویسے بھی اس پہ اعتراض لڑکی والوں کو ہونا چاہیے ہمیں نہیں۔ اگر انہیں نہیں ہو گا تو ہم یہ اعتراض کیوں اٹھائیں۔ مجھے تو یہ بات دل کو لگ رہی ہے کہ لڑکی پڑھی لکھی ہے۔ روشن دل اور روشن خیالات کی ہوگی۔"

"ہاں۔۔۔ روشن دل۔۔۔ روشن خیالات۔" شمشاد نے بیزاری سے ہاتھ ہلایا۔

"بالکل صحیح اندازہ لگایا۔" حمیدی بوا باغ باغ ہو گئیں۔

"بہت اچھے طور طریقے ہیں اس کے ماں باپ رہے نہیں۔ دونوں بھائیوں کی لاڈلی ہے۔ بھابیاں تک اس کے حسن کی گن گاتی ہیں۔"

"تو بچہ کا کیوں دے رہی ہیں بھابیاں۔۔۔ چوم چاٹ کے رکھ لیں اسے اور اس کی بچی کو۔"

"تو ان بھلی بیبیوں کی نیک نیتی ہے جو انہوں نے نند کے لیے ایسا سوچا ورنہ گھر کی چاکری کے لیے بھی رکھ سکتی تھیں۔ ویسے بھی بیوہ کے نکاح کا تو شرع میں بھی حکم ہے۔ ابھی اس کی عمر کیا ہے جو وہ موت تک بیوگی کی چادر اوڑھے رکھے۔ ہاں تو پروین بٹیا میں تو کہوں۔۔۔ تم ایک بار میرے ساتھ چل کے دیکھ لو۔"

"ہاں بوا۔۔۔ اب آئی ہوں تو دیکھ لیتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

حمیدی بوا کے حسب توقع پروین کو منزہ خود۔۔۔ اس کا گھر بار اور بھائی بھابی سب پسند آئے تھے۔ شمشاد بیگم منہ بنائے بیٹھی ناقدانہ نظروں سے سب کو دیکھتی رہی۔ منزہ جو خود بھی جیسے دل ہار کے وہاں سب کے درمیان بیٹھی تھی اسے تو شمشاد بیگم نے خاص تنقیدی نظروں سے دیکھا۔ سوچ کے آئی تھی کہ اس کے بچپن اور بڑھتی عمر کے بارے میں ضرور کوئی نکتہ نکال کے حمیدی کو عین موقع پہ شرمندہ کرے گی مگر وہ اس میں ناکام رہی۔ منزہ کے چہرے پہ پھیلا عجیب سا سوز اور حزن اسے بے حد حسین بنا رہا تھا۔ عموماً اس کی انکھیں کی تھی مگر دیکھنے میں وہ چوبیس پچیس کی ہی نظر آتی تھی۔

"میرا بھائی نوید مرا والوں میں ایک ہے۔ شریف، محنتی اپنے کام سے کام رکھنے والا۔۔۔ مجھے بہن نہیں بیٹی سمجھ کے پالا ہے۔ ماشاء اللہ بہت ذمہ دار ہیں بھائی جان۔ اپنی بیوی ساجدہ کو بھی انہوں نے بہت پیار سے رکھا تھا۔ اللہ نے اس کی عمر ہی اتنی رکھی تھی۔۔۔ ورنہ بہت خوش خوش گئی تھی وہ دنیا سے۔"

"ہاں۔۔۔ بڑا زیور لادے رکھا تھا اسے۔۔۔ حالانکہ وہ آئی چھوٹے گھر سے تھی۔" یہ شمشاد کا اضافہ تھا۔

"وہ تو دوسری شادی پہ مان ہی نہیں رہے تھے ورنہ اور مرد ہوتا تو ایک بیوی کے ہوتے ہوئے دوسری خوشی لے آتا۔ اب بھی صرف اپنی بچی کے لیے مانے ہیں۔ ہمیں بھی ایسی بھابی چاہیے جو بن ماں کی بچی کو بھی ماں کا پیار دے سکے۔"

"کیا عمر ہے بچی کی؟" کلثوم نے سوال کیا۔

"پونے تین سال۔"

منزہ کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

سوہا بھی تقریباً اسی عمر کی تھی جب مظہر کے سائے سے محروم ہوئی تھی۔

"شکر جب ماں کی ممتا سے محروم ہوئی تھی تب صرف تین گھنٹے کی تھی بچاری۔" پروین نے اداسی سے کہا۔

"یہ کچھ عرصہ ہم نے جیسے تیسے اسے پال لیا مگر بچے ماں کے بغیر نہیں پلتے۔ اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اب۔"

"اور پرائی اولاد پالنے کا جگرا بھی کسی کسی عورت میں ہی ہوتا ہے۔" شمشاد بیگم نے مزید کہا۔

"ویسے بی بی۔۔۔ اللہ نے ایویں ہی ماں کے قدموں کے نیچے جنت نہیں رکھ دی۔ ماں بننا بڑا اوکھا کام ہے اور سوتیلی ماں کے لیے تو اور بھی اوکھا اور جو عورت اس اوکھے کام کو کر گزرتی ہے اس کے لیے بڑا اجر ہے، بڑا ہی ثواب ہے۔"

وہ بڑے رقت بھرے لہجے میں یہ ثواب گنوا رہی تھی۔ جب سوہا کمرے میں داخل ہوئی۔

"ماما۔۔۔ مجھے اسٹار ملا۔"

ہاتھ میں کاپی پکڑے وہ جوش سے بھاگتی ہوئی منزہ کے پاس آئی اور پھر ٹھٹک کر سامنے بیٹھی تین اجنبی خواتین کو دیکھ کر کچھ جھجکتے ہوئے اس نے توتلے لہجے میں انہیں سلام کیا۔

حمیدی بوا سرزنش کرتی نگاہوں سے کلثوم کو دیکھ رہی تھیں جبکہ شمشاد بیگم کی نظروں میں واضح بے زاری تھی۔

"شاباش میرا بچہ۔" منزہ نے کاپی دیکھ کے اس کے ماتھے پہ پیار کیا۔

"اب تم جاؤ تو..... میں ابھی آ کے ہوم ورک کراتی ہوں۔"

"او کے ماما..." وہ اسی طرح اٹھلاتی ہوئی چلی گئی۔

ڈرائنگ روم میں ایک عجیب طرح کا سکوت چھا گیا۔

کچھ دیر تک اس تکلیف دہ اور معنی خیز خاموشی کو محسوس کرنے کے بعد منزہ اٹھی اور ٹیبل سے چائے کے برتن اور لوازمات اکٹھے کرنے کے بعد ٹرالی میں رکھے اور وہاں سے چلی آئی۔

"چلیں پھر.....؟" حمیدی بوا نے شمشاد کے تاثرات اور پروین کی خاموشی سے مایوس ہو کے کہا۔

شمشاد بیگم تو فوراً اٹھ کھڑی ہوئی۔

پروین نے چلتے چلتے بے حد رسمی اور روایتی الفاظ میں کلثوم سے کہا تھا۔

"ہم بھائی جان سے بات کرنے کے بعد فون پہ بتا دیں گے آپ کو۔"

کلثوم نے بھی بجھے دل کے ساتھ مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

☆ ☆ ☆

حمیدی بوا کو یہاں سے نہ ہی مثبت جواب کی امید تھی نہ کچھ معاوضہ ملنے کی' اس لیے کلثوم کے ہاں سے نکلنے کے بعد انہوں نے ان دونوں کے ساتھ جانا ضروری نہ سمجھا اور اپنے گھر جانے والی بس پکڑ لی۔ منزہ کے بارے میں انہیں یہ خوش امیدی ضرور تھی کہ وہ ان لوگوں کو پسند آ جائے گی مگر ساتھ ہی انہوں نے کلثوم کو یہ بھی سختی سے کہہ دیا تھا کہ۔

"ان ابتدائی مراحل میں بچی کو مہمانوں سے دور اور دور ہی رکھنا۔ نہ ہی یہ جتانے کی ضرورت ہے کہ بچی بعد میں اپنی ماں کے پاس رہے گی۔ منزہ کو رخصت تو ہونے دو..... ایسی پیاری صورت ہے اور ایسے اچھے گن ہیں..... جلد ہی اپنی جگہ بنا لے گی' جب اس کی جگہ بن جائے گی تو بچی کی جگہ خود بخود ہو جائے گی۔ مگر جب تک اس کے اپنے قدم جم نہیں جاتے سسرال میں تب تک بچی کو ان لوگوں کے سر پہ مسلط کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔" کلثوم نے اس بات پہ آمادگی ظاہر کی تھی۔ ویسے بھی وہ منزہ سے خائف تھی اور وہ بھی کسی ایک وجہ سے..... ننھی سی سوہا اسے بھلا کیا کہتی تھی۔ وہ راضی خوشی اسے چند ایک سال سنبھالنے پہ تیار تھی مگر برا ہو وقت کا..... جس اس لیے جب سب صحیح سمت جا رہا تھا' سوہا کی اچانک آمد نے ماحول ہی بدل ڈالا۔ اگرچہ وہ لوگ سوہا کے متعلق سب جانتے تھے مگر شاید اس لڑکی کو ایک پانچ چھ سالہ بچے کی ماں کے روپ میں دیکھنا انہیں ہضم نہیں ہوا جسے وہ دلہن بنانے کی غرض سے آئے تھے۔

"دیکھا..... کیسی شوخ لگائی اس مکار حمیدی نے..... اسے پتا تھا کہ میرے ہاتھ آئی تو میں نے اس کی گت کا ایک بال نہیں چھوڑنا تھا۔ اچھا ہوا وہیں سے بھاگ گئی۔"

"ایسا بھی کیا کر ڈالا حمیدی بوا نے بے چاری کو سو دو سو دے ہی دیتیں۔ اس عمر میں کتنی دور تک ہمیں لے بھی گئیں اور پھر بس پہ دھکے کھاتی واپس بھی گئیں۔"

"بس کے دھکے کیا دھکے ہیں..... میرے قابو آتی تو دھکے تو میں نے دینے تھے۔ میرے نوید کے لیے وہی رہ گئی ہے..... بے بے۔"

"بھائی جان اب تو عمر لڑکے نہیں ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ میرے لیے بیوی نہیں وشمہ کے لیے ماں ڈھونڈنا اور مجھے لگتا ہے جیسے منزہ سر سے پیر تک ماں ہے۔"

"ہاں ہاں تو وہ ہے مگر اپنی لڑکی کی..... اس پہ نانے کی..... دیکھا تو نے..... کیسے آ کے چٹ گئی ماں کو۔ وہ جان چھوڑے گی اپنی ماں کی' نہ ہماری وشمہ کے حصے میں ماں آئے گی۔"

ان کی یہ بات پروین کو کچھ سوچنے پہ مجبور کر گئی۔

"منزہ کو بیاہ کے لے آئیں..... وہ اپنی چھوکری بھی ہمارے سر لا کے بٹھا دے۔ میں ایک سے تنگ (عاجز) ہوں یہ دو دو کو جائیں۔"

"معاملہ تو طے کرنا پڑے گا ان لوگوں سے۔" وہ سوچتے ہوئے کہنے لگی۔

"منزہ اچھی بات یہ ہے کہ لڑکی میرے دل کو بھائی ہے۔ سلجھی ہوئی پڑھی لکھی ہے۔ نرم زبان شائستہ بھائی جان کو بھی سنبھالے گی اور وشمہ کو بھی۔"

"اگر اپنی چھوکری سنبھالنے سے فرصت ملے تب نا۔" شمشاد نے پھر سوہا کا وجود یاد دلایا۔

"ہاں یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ بصورت دیگر منزہ ایک لاجواب لڑکی ہے' گھرانہ بھی اچھا ہے۔ میں بھائی جان سے بات کرتی ہوں۔"

نوید نے پروین کی آمادگی دیکھ کر نیم رضامندی کا اظہار کیا۔

"اگر تمہیں پسند ہے تو ٹھیک ہے۔ مجھے تم پہ اعتبار ہے پروین۔ تم وشمہ کے لیے غلط انتخاب نہیں کر سکتیں۔"

"آپ کہیں تو میں انہیں ہاں کہلوانے سے پہلے تصویر منگوا لوں منزہ کی؟"

"نہیں' تصویر دیکھ کے کیا کروں گا پروین۔"

ایسا کہتے ہوئے نوید کی آنکھوں کے سامنے ساجدہ کی ہنستی مسکراتی تصویر گھوم گئی۔ جو اس کی زندگی میں صرف گیارہ ماہ کے لیے شامل ہوئی تھی اور اس مختصر عرصے میں اس کے بے رنگ شب و روز میں رنگینی اور لطافت بھر گئی تھی۔

"اچھے گھر کی ہے' شریف اور محبت کرنے والی ہے تو بس ٹھیک ہے..... شکل و صورت کس کام آتی ہے پروین۔"

"یہ تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ میں فون کرتی ہوں پھر..... اور ان سے یہ بھی معاملہ صاف کرا لوں گی کہ بچی وہ لوگ رکھیں گے۔"

"بچی؟"

"ہاں..... منزہ کی بچی..... جو پہلے شوہر سے ہے۔ آپ نے شاید غور نہیں کیا تھا' میں نے بتایا تو تھا کہ۔"

"ہاں میں نے سنا تھا مگر وہ لوگ کون..... وہ کیوں رکھیں گے اسے؟"

"منزہ کے اپنے میکے والے..... بچی کے ماموں ممانی..... ددھیال والوں نے رکھنی ہوتی تو جانے کیوں دیتے۔"

"مگر جب وہ بیاہ کے یہاں آ رہی ہے پروین تو بچی وہاں کیوں؟"

"یہ ضروری ہے بھائی جان! اگر اپنی بچی کی محبت اس پہ حاوی رہی تو وشمہ کے قریب نہیں ہو سکے گی' اس سے انصاف نہیں کر سکے گی۔"

"اور اگر اپنی بچی کی جدائی کے خیال سے وہ یہاں کسی کے بھی قریب نہ ہو سکی تو پھر؟"

"ایسا نہیں ہو گا۔ بلکہ ہو سکتا ہے وہ اپنی بچی کی کمی وشمہ سے پوری کرنا چاہے۔"

"ہو سکتا ہے.....؟" نوید نے ایک گہرا سانس لیا۔ "یہ ہو سکتا ہے والی باتیں بڑی خطرناک ہوتی ہیں میری بہن۔ ایسی مشروط محبتیں..... اسے اگر وشمہ کو پیار دینا ہے تو وہ دے گی..... اپنی بچی کی کمی پوری کرنے کے لیے نہیں..... تم کیا پروین! ایسا مت کرنا..... مجھے اپنی بچی کے لیے ماں اس شرط پہ نہیں چاہیے کہ ایک اور بچی اپنی ماں سے محروم ہو جائے..... ایسی بچی جو پہلے ہی باپ کو کھو چکی ہے۔"

نوید بہت کم بولتا تھا مگر اس کی یہ بات پروین کے دل پہ اثر کر گئی۔ اسے اب اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

منزہ کب سے گم صم بیٹھی سوئی ہوئی سوہا کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہی تھی۔ کلثوم ہلکی سی دستک کے بعد اندر

داخل ہوئی تب بھی اس کی حالت میں خاص فرق نہ آیا۔
"منی۔۔۔!" عرصے بعد اسے اس نام سے پکارنے کے بعد وہ بیڈ کے دوسرے سرے پہ بیٹھ گئی۔ لہجے کی نرمی اور تخاطب کا یہ انداز بھی اسے نہ چونکا سکا۔
"مجھے اچھا لگا کہ آج تم نے حمیدی بوا کے ساتھ آئی خواتین کے سامنے اپنا رویہ نارمل رکھا ورنہ مجھے تو یہ امید بھی نہیں تھی کہ تم ان کے سامنے آؤ گی بھی یا نہیں۔ اچھا ہے کہ تم نے اس حقیقت کو قبول کر لیا۔ کچھ اور باتیں بھی ہیں جن کو تم جتنا جلد قبول کر لو اتنا اچھا ہے۔"
"اب میرے لیے اچھا ہے ہی کیا بھابی؟" اس نے بجھے ہوئے انداز میں بغیر نظر اٹھائے کہا۔
"ایسا مت کہو۔ ہم سب تمہارے اچھے مستقبل کے لیے دعاگو ہیں۔ آنے والا کل تمہارے لیے بہت سی خوشیاں لائے گا ان شاء اللہ۔"
"اچھا مستقبل؟" وہ زہریلے انداز میں صرف سوچ کے رہ گئی۔
"اچھے مستقبل کے لیے دعاگو تو سب ہیں اچھے حال کے لیے کوئی ساتھ دینے پہ تیار نہیں۔"
"کیا سوچ رہی ہو؟"
"کچھ نہیں اب میرے سوچنے کے لیے رہا کیا ہے۔"
"اچھی سوچیں رکھا کرو۔"
اتنا کہہ کے شاید کلثوم کو خود اپنے مشورے کے کھوکھلے پن کا احساس ہو گیا۔ وہ سر جھکا کے چادر کی شکنیں دور کرنے لگی۔
"بھابی! آپ وہ کہیے جو کہنے کے لیے آئی ہیں۔۔۔ اتنی لمبی تمہید کس لیے باندھ رہی ہیں؟"
وہ خشک لہجے میں بولی۔ کلثوم خجل سی ہو گئی۔
"نہیں۔۔۔ میں تو بس یونہی۔"
"کہیے بھابی۔۔۔ جو بھی کہنا ہے کہہ ڈالیے۔۔۔ میں اس وقت ہر کسی کی ہر قسم کی بات سن لینے کی پوزیشن میں ہوں۔"
"دیکھو منزہ! تم خواہ مخواہ خود پہ مظلومیت اور بیچارگی طاری کر رہی ہو۔"
اس کی مسلسل اس طرح کی باتوں نے کلثوم کو جھنجلا کے رکھ دیا۔
"ایسا کچھ نہیں ہوا جو زمانے سے الگ ہے۔ مظہر کو گئے تین سال سے اوپر ہو گئے ہیں۔ اتنے عرصے میں بڑے سے بڑا زخم مندمل ہو جاتا ہے۔ تمہیں سنبھلنے کے لیے خاصا وقت مل گیا ہے۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔ ہم سب نے تمہارے لیے جو فیصلہ کیا ہے وہ بہتر ہے۔ اسے یوں مجبور اور بے بس بن کے نہیں بلکہ پوری خوشی سے قبول کرو۔"
"جی اچھا۔"
خلاف توقع کچھ اور کہنے کی بجائے اس نے تابعداری سے کہا۔ یہ الگ بات کہ الفاظ کے برعکس لہجہ خاصا جھنجلاتا ہوا تھا۔
"اس کے لیے تمہیں تھوڑا اور تعاون کرنا پڑے گا۔"
"مثلاً کیا؟" پھر سے وہی چبھتا ہوا لہجہ۔ جسے کلثوم نے دانستہ نظرانداز کیا۔
"تمہیں اب سوہا کو۔۔۔ میرا مطلب ہے اسے عادی کرنا ہو گا کہ وہ تمہارے بغیر رہنا سیکھے۔"
یکدم جیسے کسی نے منزہ کی ساری سانسیں کھینچ لی تھیں۔ وہ پوری آنکھیں پھاڑے کلثوم کو تک رہی تھی جیسے خود کو یہ یقین دلانا چاہتی ہو کہ اس کی اس بات کا جو مطلب وہ سمجھی ہے کیا یہ وہی مطلب ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے بار ماننے پہ دل کو تیار کیا تھا۔۔۔ کچھ شاکے سمجھانے پہ۔۔۔ کچھ کلثوم بھابی کا رویہ دیکھتے ہوئے۔۔۔ کچھ سوہا

کے مستقبل کو معاشی تحفظ دینے کی خاطر اور کچھ مزید مجبوریوں کے آگے گھٹنے ٹیکتے ہوئے۔۔۔ اپنے دل کو کچلتی ہوئی تمام پہلا مرحلہ طے کر کے ڈرائنگ روم میں ان عورتوں کے سامنے آئی تھی مگر اسے یہ اندازہ نہ تھا کہ اس پہلے فیصلے کے بعد ایک اور کڑا مرحلہ اس کا منتظر ہو گا۔
"بھابی۔۔۔ سوہا۔۔۔"
سانسوں کے ساتھ اس نے کہنا چاہا۔
رنگت دیکھ کے کلثوم کے بھی ہاتھ پیر پھول گئے۔ وہ فوراً اسے پانی پلانے کی کوشش کرنے لگی۔
"آپ۔۔۔ آپ۔۔۔ سوہا۔"
گلاس ہاتھ سے پرے کرتے ہوئے ہانپ رہی تھی۔
"منزہ۔۔۔"
کلثوم اس کی حالت دیکھ کر پچھتا رہی تھی کہ ایسی بات کی ہی کیوں۔ ایک ماں بن کے سوچا تو اسے اپنا یہ مطالبہ واقعی سفاکانہ محسوس ہوا۔
"میں تو صرف یہ کہہ رہی تھی کہ نئی زندگی شروع کرنے کے لیے۔۔۔"
"نہیں چاہیے مجھے کوئی نئی زندگی۔۔۔ میں اپنی اس زندگی میں ہی خوش ہوں۔ میں اور میری سوہا۔ بس بس۔۔۔ بھابی اور کچھ نہیں چاہیے مجھے۔ نہ کوئی نئی زندگی۔ نہ نئی خوشیاں۔"
کلثوم کے کاندھے سے سر رکھ کے رونے لگی۔ اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے اس کی آنکھیں بھی بھیگنے لگیں۔
"تم میری بات نہیں سمجھیں۔ میں تمہیں اس سے الگ نہیں کر رہی بلکہ کوئی بھی نہیں کر رہا۔ کوئی کر بھی نہیں سکتا۔ میرا یقین کرو میں صرف اتنا کہہ رہی تھی کہ جیسے جیسے وہ بڑی ہو رہی ہے ویسے ویسے تم اسے اپنے اوپر انحصار کم کرواتی جاؤ۔ اسے دوسروں کا عادی بھی ہونے دو۔ جیسے اتنے دن ہو گئے اسے ہمارے ساتھ رہتے ہوئے مگر ہمارے بجائے تمہارے ساتھ کمرے میں ہی گھسی رہتی ہے۔ کبھی تو سونیا اور سویرا کے ساتھ ان کے کمرے میں بیٹھا کرے۔ مگر وہ بچیوں کے ساتھ کھیلتی ضرور ہے۔ لیکن ادھر تم نظروں سے اوجھل ہوتی ہو وہ گھبرا جاتی ہے اور تمہیں ڈھونڈنے لگتی ہے۔ میں تو تمہیں صرف اس کی یہ عادتیں ختم کرانے کے بارے میں کہہ رہی تھی۔ اب دیکھو نال۔۔۔ آج دن کو کیا ہوا۔ اسے اسکول سے آتے ذرا سی دیر ہوئی تھی جب وہ مہمان آئے میں نے سویرا وغیرہ کو کہا تھا کہ وہ ذرا دیر سوہا کو اپنے پاس کمرے میں رکھیں مگر اسے دس منٹ بھی تمہارے بغیر قرار نہیں۔ اندر بھاگتی چلی آئی اور مہمان۔" وہ کہتے کہتے رک گئی۔
"وہ سوہا کے بارے میں جانتے تو تھے پھر انہیں اتنی تکلیف کیوں ہوئی؟"
"وہ موقع ہی ایسا تھا منزہ۔ صورت حال کی نزاکت کو بھی تو سمجھنا چاہیے۔"
"کیسا موقع بھابھی؟ کیسی صورت حال؟ میں بھی تو وہاں تھی۔ میرے سامنے بھی تو دونوں ماں بیٹیاں اپنے رنڈوے بیٹے کی ویران زندگی، اس کی مرحومہ بیوی کی اچھائیاں اور اس کی بن ماں کی بچی کی محرومیوں کی داستانیں سنا رہی تھیں۔ میں کیوں وہاں مجرم سے بیٹھی رہی۔ مجھے بھی صورت حال کا اندازہ کر کے وہاں سے احتجاجاً اٹھ جانا چاہیے تھا۔"
"کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟"
"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ اگر وہ اپنی جگہ ٹھیک ہیں تو کیا میں ان کے سامنے مظہر کی تعریفیں نہیں کر سکتی؟ اس کے چلے جانے کے بعد اپنی حالت اور اپنے دکھ بیان نہیں کر سکتی؟ میں ایسا کرتی تو ان کا ردعمل کیا ہوتا؟ بتائیں بھابھی؟"
"ایسا نہیں ہوتا منزہ۔" کلثوم بے چارگی سے سر تھام کے رہ گئی۔
"تم کس دنیا میں رہتی ہو؟ بچی نہیں ہو ایک بچی کی ماں ہو۔ عمر میں مجھ سے چھوٹی ہو لیکن میں کہتی ہوں کہ

زندگی نے تمہیں مجھ سے زیادہ سبق پڑھائے ہیں۔ پھر ایسی احمقانہ اور بچکانہ باتیں! میری باتوں پر ٹھنڈے دل سے غور کرو۔"

"ٹھنڈے دماغ سے سوچو۔۔۔ ٹھنڈے دل سے فیصلہ کرو۔ آپ سب مل کے میرے دل و دماغ کو اتنا ٹھنڈا کر دیں گے۔ بھابھی! اب تو سب کچھ شل ہونے لگا ہے۔"

"خیر جان۔۔۔ میں صرف اتنا کہنے آئی تھی۔" کلثوم کھڑی ہو گئیں۔ "کہ ہم جہاں بھی تمہاری شادی کریں گے دیکھ بھال کے، سوچ سمجھ کے پوری نیک نیتی سے کریں گے اور ظاہر ہے کہ یہ تو تمہیں چھپائیں گے کہ تم رہ چکی ہو اور ایک بچی کی ماں ہو۔ مگر یہ ضروری نہیں ہے سنو! کہ ہر آنے والے کو تم ایک ماں ہی دکھو۔ رشتے والے اپنے لیے بہو پسند کرنے آتے ہیں۔ اپنے بھائی یا بیٹے کے لیے دلہن ڈھونڈنے۔ انہیں صرف سہاگن بنے مت ملو۔ آئندہ کوشش کرنا کہ مہمانوں کے سامنے سوہا یوں نہ آئے۔"

اس نے وہ بات کہہ ہی ڈالی جو وہ کہنے آئی تھی اور کہہ کے فوراً چلی بھی گئی۔ مگر دیر تک منزہ کے آنسو سوئی سوہا کے بال بھگوتے رہے۔

☆ ☆ ☆

"بیگم صاحب! کوئی مس جی آپ سے ملنے آئی ہیں۔" مدیحہ ڈرائیر سے اپنے بال خشک کر رہی تھی، نصیبو نے اسے کسی کی آمد کی اطلاع دی۔

"مس جی! کون سی مس؟"

وہ حیران ہوئی۔ یہاں آئے اسے مہینہ ہو رہا تھا۔ مگر اب تک کسی سے اتنی راہ و رسم نہیں ہوئی تھی کہ کوئی بلا تکلف بھری دوپہر میں ملنے چلا آئے۔ یہ اسلام آباد کا سب سے پوش علاقہ تھا اور کئی کئی کنال پر پھیلے بنگلوں میں رہنے والے لوگ ایک دوسرے سے اتنے ہی انجان اور بیگانے تھے جتنے کہ کسی ایک شہر کے رہنے والے دوسرے شہر کے باسیوں سے ہو سکتے ہیں۔

"پتہ نہیں بیگم صاحب! نام بتایا تھا پر۔۔۔ ذرا مشکل سا تھا۔ صرف مس یاد رہا ہے۔"

"دیکھنے میں کیسی ہے؟ کار میں آئی ہے؟" کچھ سوچتے ہوئے مدیحہ نے سوال کیا۔

"نہیں، جی تو پیدل۔۔۔ کوئی ٹیکسی ویکسی بھی نہیں تھی۔ اور دیکھنے میں اچھی ہے۔ بیگم صاحب! فیشن ایبل، بال کٹے ہوئے، عمر کوئی بیس یا بیس سال ساتھ میں کوئی کالی کتاب بھی ہے۔"

"اوہو۔۔۔ کوئی سیلز گرل ہوگی۔ جاؤ چلتا کرو اسے۔ فضول میں دماغ کھائے گی بک بک کر کے۔ بے کار کریموں اور شیمپو کے لیے۔"

بال خشک کرنے کے بعد اب وہ انہیں ہیئر برش سے سلجھا رہی تھی۔

"لیکن بیگم صاحب! وہ آپ کا نام لے رہی تھی۔"

نصیبو نے اس کے لانبے گھنے ریشمی بالوں کو رشک و حسد کی ملی جلی نظر سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"میرا نام؟" وہ پھر چونکی تھی۔

"ہاں جی! کہہ رہی تھی۔ مسز محمود سے ملنا ہے۔ ضروری کام ہے۔"

"احمق۔۔۔ میرا نام کب لیا اس نے؟ باہر گیٹ۔ نیم پلیٹ پر تمہارے صاحب کا اتنا بڑا نام لکھا ہے۔ سے پڑھ کے مسز محمود کہہ رہی ہوگی۔ تمہیں بھی ذرا عقل نہیں ہے۔ ذرا سختی سے کہہ کر فارغ کرو اسے۔"

نصیبو کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر بڑبڑاتے ہوئے ہاتھوں اور بازوؤں پہ بھی لوشن ملتی رہی۔

"ایسی کند ذہن ہے یہ نصیبو بھی۔۔۔" حالانکہ نصیبو سراسر اس کا اپنا انتخاب تھی۔ اماں جی تو انہیں اسلام آباد بھیجتے ہوئے وہاں کے تو دو ایک پرانے ملازم ساتھ روانہ کرنے کو تیار تھیں لیکن۔ جعفر کو ان تیل چپڑی عورتوں کا ان کے جا بجا نہ لب و لہجے سے چڑ تھی۔ اس نے صاف انکار کر دیا۔

"اس ماحول سے ہی تو دور لے جانا چاہتا ہوں اپنی بچیوں کو۔ مجھے اپنے گھر میں کوئی جاہل چیند نہیں چاہیے۔"

"آپ کیپٹن کو ہی کہیں گی تو بہتر ہوگا۔"

جاتے ہوئے ملازم بھی اپنے خود رکھے تھے۔ اس کا پرسنل ڈرائیور، گیٹ کیپر اور مالی مگر نصیبو اور دوسری دو جز وقتی ملازمائیں جنہیں مدیحہ نے پسند کیا تھا۔ جعفر نے اپنے ایک دوست سے کہہ کر دو تین میڈ بلوائی تھیں گھر پہ۔ مدیحہ انہیں دیکھتے ہی بدک گئی۔ بچیس چھبیس سال کی وہ طرحدار، خوش لباس لڑکیاں نہیں سے بھی ملازمائیں نہیں لگ رہی تھیں۔

"یہاں سرونٹ رکھنے کا بھی ایک اسٹینڈرڈ ہوتا ہے۔ یہ ہاؤس کیپرز ہیں۔ تمام کام اپنی نگرانی میں احسن طریقے سے کروا لیتی ہیں۔ بہت ٹرینڈ ہیں۔"

"یہ رونق ہی رہا ہے۔" اس نے تنقیدی نظروں سے ان کے فٹنگ والے لباس، کھلے بالوں اور میک اپ کو دیکھ کر کہا۔ "مجھے ایسی کوئی نہیں چاہیے۔ آپ اخبار میں اشتہار دے دیں۔ میں خود انٹرویو کر کے پسند کر لوں گی۔"

اور پھر اٹھارہ عورتوں میں سے اس نے نصیبو کو بطور فل ٹائم میڈ کے پسند کیا تھا۔ چالیس بیالیس سالہ نصیبو کے چہرے پہ چیچک کے پرانے داغ تھے۔ ایک آنکھ میں ہلکا سا نقص تھا۔ جسم بھدا اور بے ڈول تھا مگر تھی بے حد چست اور چاق و چوبند۔ تھوڑی بہت پڑھی لکھی بھی تھی حساب کرنے کا سلیقہ تھا۔ مدیحہ کو اس کا بن سنور کے رہنا اور صاف ستھرا جدید انداز کا سلا لباس پہننا بھی برا نہیں لگتا تھا کیونکہ ان سب کوششوں سے اس بیچاری کو کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔

"بیگم صاحب! وہ مس کہہ رہی ہے کہ اسے صاحب جی نے بلوایا ہے۔" نصیبو پھر آن موجود ہوئی۔

"کیا؟"

مدیحہ اس بری طرح چونکی کہ اس کا لپ اسٹک لگاتا ہاتھ کہیں کا کہیں پہنچ گیا۔

"بلاؤ ذرا۔۔۔ دیکھوں تو۔۔۔" لہجے میں بے حد تپش تھی۔

نصیبو اپنی مسکراہٹ چھپاتی پلٹی۔ ان چند دنوں میں ہی اسے اپنی بیگم صاحب کے اندر چھپے شکوک و شبہات کا بخوبی اچھی طرح اندازہ ہو گیا تھا۔ اس کی وجہ سے تو وہ لاعلم تھی۔ مگر اتنا ضرور جان گیا تھا کہ بیگم صاحب شکی مزاج ہے اور نزدیک سے گزرتی ہوا سے بھی گھبرا کر اپنے میاں پہ آڑ کر دیتی ہے۔

مدیحہ سٹنگ روم میں آئی تو صوفے پہ ایک خوش شکل اور خوش لباس لڑکی کو اپنا منتظر پایا۔

"جعفر نے کس لیے ملنے آئی ہے یہ؟ اور جعفر کی ہمت دیکھو۔ گھر پہ بلوا لیا۔ نہیں وہ کیا چور ہے اتنا دیدہ دلیر نہیں ہو سکتا کہ میری موجودگی میں گھر بلوا لے۔ یہ ویسا ہی چکر لگ رہا ہے جیسا وہاں لاہور والے گھر میں کھیلا گیا تھا۔"

یہ سوچتے ہوئے اسے لاہور والے گھر کے کچن میں ربتا سے ہوئی اتفاقیہ ملاقات یاد آ گئی۔

"یہ بھی شاید اسے بلیک میل کرنے کی نیت سے یہاں چلی آئی ہے۔۔۔ اف جعفر محمود۔۔۔ تم کب تک میرے صبر کا امتحان لو گے۔ شرم کرو۔۔۔ بچیاں پالوں یا بچیوں کے باپ کی آوارگیاں سنبھالوں۔"

ماتھے پہ ان گنت شکنیں لیے وہ سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگی۔ لڑکی کے چہرے پہ پھیلی رسمی سی مسکراہٹ پھیکی پڑنے لگی۔

"کون ہو تم؟۔۔۔ کیوں آئی ہو؟"

پھیکا ہوتی مسکراہٹ ایک دم غائب ہو گئی۔ شاید آنے والی کو اتنے روکھے اور سخت رویے کی امید نہیں تھی۔ مدیحہ کی لاتعداد شکنوں کے مقابلے میں اس کی پیشانی پہ بھی ایک آدھ شکن نمودار ہو گئی۔

"میں خود نہیں آئی۔ مجھے کہا گیا تھا آنے کے لیے۔" اس نے جتایا کہ وہ منہ اٹھا کے یہاں نہیں آئی۔

"کس نے؟"

"مسٹر جعفر محمود نے۔۔۔ ایکچوئلی میں مسٹر رحمان۔"

سٹنگ روم میں رکھے فون کی بیل نے اسے بات ادھوری چھوڑنے پہ مجبور کیا۔ مدیحہ اسی خطرناک تیزی کے ساتھ اب مسلسل بجتے فون کو گھور رہی تھی۔

"ہیلو۔۔۔" پھر پھاڑ کھانے والے انداز میں اس نے کہا تھا۔

"وہ جعفریات کر رہا ہوں۔"

مدیحہ نے ناگوار نظروں سے پہلے ریسیور کو پھر صوفے پہ ٹانگ رکھے بیٹھی لڑکی کو دیکھا جو اس سے مایوس اب بیزار نظر آ رہی تھی۔

"کیا ہوا؟۔۔۔ خاموش کیوں ہو؟ بزی ہو گیا؟"

"ہاں بہت بزی ہوں۔ آپ کی گھریلو مصیبتوں سے نمٹ رہی ہوں۔ بچیوں کے اسکول سے آنے کا پتا رہا ہے۔ ان کے آنے سے پہلے پہلے مجھے یہ معاملہ صاف کرنا ہے۔ اس لیے آپ تازہ ترین معلومات جاننے کے لیے کچھ دیر بعد فون کریں۔"

"کیا کہہ۔۔۔" مگر مدیحہ نے اس کی بات پوری سنے بغیر ریسیور رکھ دیا۔

"ہاں تو بی بی۔۔۔"

"مس سنتھیا رابنسن۔" اس نے اپنا تعارف خود کرایا۔ خاصے کڑے تیوروں کے ساتھ۔

"وہ۔۔۔ اب یہاں تک پہنچ ہو گئی ہے۔"

"جی؟" اس کی بڑبڑاہٹ سنتھیا کے پلے نہ پڑی۔

"میڈم آپ پتہ نہیں کیا کہہ رہی ہیں۔ مجھے تو جعفر صاحب نے کہا تھا کہ میں یہاں آؤں اور آپ سے لوں۔ بچیوں سے بات کر لوں۔ اسی لیے میں اسکول سے سیدھی یہیں چلی آئی۔ مگر آپ ہیں کہ مسلسل بولے چلی جا رہی ہیں۔ سوری مگر میں ایسے روڈلی بیہو کرنے والے لوگوں کے ساتھ کام نہیں کر سکتی۔"

اس نے اپنا شولڈر بیگ کاندھے پہ لٹکایا اور ٹیبل پہ رکھی فائل اٹھالی۔

"تھا نس ٹو میٹ یو مسز محمود۔" چبا چبا کے کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

"او ہو۔۔۔ اتنا طنطنہ۔" مدیحہ کھول کے رہ گئی۔

اتنے میں فون کی بیل پھر بجی۔

"فون کیوں رکھ دیا تھا تم نے؟" جعفر نے پوچھا۔

"ایک مہمان سے بات کر رہی تھی۔"

"کون مہمان اور کون سا معاملہ نمٹا رہی تھی تم؟ صاف صاف بات کیوں نہیں کرتی ہو؟"

"آپ نے کسی سنتھیا رابنسن کو یہاں بلوایا تھا؟"

"ارے ہاں۔۔۔ آئی تھیں مس سنتھیا؟"

"ہاں" آئی تھی آپ سے ملنے۔"

"مجھ سے؟ او خدایا۔۔۔ احمق عورت۔۔۔ وہ مجھ سے ملنے آئی ہوتی تو آفس آتی میں اسے گھر نہ بلواتا۔"

"ہاں۔۔۔ میں سوچ رہی تھی کہ اتنی عقل تو ہے آپ میں۔ آپ آفس میں ہی نمٹاتے ہوں گے ایسی لالہ تمہا۔۔۔"

"مدیحہ تم۔۔۔" جعفر بل کھا کے رہ گیا۔

"وہ سنتھیا رابنسن تھی۔"

"اتنا تو جانتی ہوں میں۔ آگے بتایئے۔" وہ جعفر محمود کا صبر آزما رہی تھی۔

"رحمان کے بچوں کی ٹیوٹر ہے وہ۔"

"آپ کسی قسم کی ٹیوشن لینا چاہتے ہیں اس سے؟"

"اسٹاپ اٹ مدیحہ! اب میں کسی قسم کی بکواس نہیں سنوں گا۔ میں اسے جانتا تک نہیں۔ ایک بار بھی

دیکھا اور تم ہو کہ فضول اندازے لگا رہی ہو۔ میری غلطی صرف یہ ہے کہ میں نے ایک باپ کی حیثیت سے اپنی بیٹیوں کے لیے کوئی فیصلہ کرنا چاہا تھا۔ رحمان کے بچے بھی اسی اسکول میں پڑھتے ہیں اور پوزیشن ہولڈر ہیں۔ میں نے اپنی بیٹیوں کو اسی کے کہنے پہ اس اسکول میں داخل کرایا تھا اور اب اسی کے کہنے پہ مس سنتھیا کو بلوایا تھا کیونکہ اپنے اسکول میں ایک ٹرینڈ اور کوالی فائیڈ ٹیوٹر کی مدد کے بغیر اور بیچ قسم کے بچوں کا چلنا ناممکن ہے اور ماشاء اللہ سے تینوں بچیاں عقل کے معاملے میں تم پہ ہی گئی ہیں۔" فون کھٹاک سے بند ہو چکا تھا۔

مدیحہ نے کچھ شرمندگی محسوس کی۔

"مجھے فوراً" اس نتیجے پہ نہیں پہنچنا چاہیے تھا۔ اب کئی دن تک جعفر کا موڈ خراب رہے گا۔"

پھر اس پہ شرمندگی پہ جعفر کی پچھلی بے وفائیوں کی تلخ یادیں غالب آ گئیں۔

"پہچان لیا میں نے۔ پہلے غافل رہتی تھی اسی لیے مار کھاتی رہی۔ جعفر میری اس بے خبری کا فائدہ اٹھا کے کھیلتا رہا۔ یہاں میں اکیلی ہوں۔۔۔ نہ سسرال والے۔۔۔ نہ میکے والے۔۔۔ مجھے اپنے گھر اور شوہر کی حفاظت خود کرنی ہے اسی طرح آنکھیں کھلی رکھنی ہیں ورنہ۔۔۔ اور یہ ٹیوٹر وغیرہ کا تو صرف بہانہ ہے۔ اتنا خیال ہے بچیوں کی تعلیم کا تو کوئی مرد ٹیوٹر بھی تو رکھا جا سکتا ہے مگر یہ تیز چھری۔۔۔ اسے تو میں کبھی گھر میں گھسنے نہ دوں۔ جعفر نے مجھے کیا ایسا ہی بدھو سمجھ رکھا ہے۔" وہ سوچ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کلثوم ٹیبل پہ کھانا لگا رہی تھی۔

سویرا کو دوبارہ منزہ کو بلانے کے لیے بھیجا تھا مگر وہ سر درد کا کہہ کے کھانے کے لیے نہیں آئی۔

"کوئی بات تو نہیں ہوئی تم دونوں کے درمیان؟" جمیل نے ٹوہ لینے کی کوشش کی جس پہ کلثوم چڑ گئی۔

"مجھے اور کوئی کام نہیں ہے کیا؟ سارا دن گھر کے کاموں سے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی ہے اوپر سے آج اماں کی طبیعت پوچھنے بھی جانا پڑا ایسے میں میرا اتنا دماغ کہاں ہو میں ضدی قسم کے لوگوں سے الجھتی رہوں۔"

"کچھ ہوا تو ہے۔" جمیل نے سر ہلایا۔

"وہ جو کل کچھ لوگ آئے تھے رشتے کے لیے۔۔۔ کیا ان کی وجہ سے؟"

"ہو سکتا ہے۔" کلثوم نے کندھے اچکائے اور پلیٹ میں سالن نکالنے لگی۔

"سویرا! یہ لو اندر اپنی پھوپھو کو دے آؤ اور چائے کا پوچھ لینا۔ اگر سر میں زیادہ درد ہے تو کہنا ٹیبلٹ لے لے گر خالی پیٹ نہیں۔ تھوڑا بہت کچھ کھا لے۔"

"مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی کلثوم! ایک طرف تو تمہیں اس کی اتنی فکر رہتی ہے دوسری طرف اس کو گھر سے نکالنے کی بھی جلدی ہے۔" جمیل کے کہنے پہ کلثوم نے اسے جتاتی ہوئی نظروں سے دیکھا۔

"سویرا کو اٹھارواں لگ گیا ہے۔ اس کا ہونے دیں۔۔۔ پھر اسے گھر سے رخصت کرنے کی جلدی صرف مجھے ہی نہیں آپ کو بھی ہوگی۔ تو کیا اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہمیں اس سے پیار نہیں ہے یا ہم اسے برداشت نہیں کر سکتے۔ مجھے منزہ کی فکر ہے۔۔۔ اور آپ سے زیادہ ہی ہے۔ اسی لیے اس کی شادی کرنا چاہتی ہوں اور چلیں۔۔۔ ٹھیک ہے آپ کو میرا اعتبار نہیں۔ آپ کو میں منزہ کی خیر خواہ نہیں لگتی۔ آپ کا خیال ہے صرف اور صرف اپنے بھائی کی وجہ سے میں اس کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتی ہوں۔ تو پھر جمشید اور ثنا بھی کیوں اس کی شادی کروانا چاہتے ہیں؟ انہیں سات سمندر پار بیٹھے منزہ بھاری کیوں لگ رہی ہے؟ ظاہر ہے کہ انہوں نے بھی منزہ کی بہتری کے لیے ہی یہ سوچا ہے۔"

"بات تو یہ ہے کہ منزہ کیا سوچ رہی ہے؟ ہمارے گھرانے میں بیٹیوں کی مرضی اتنا اہم نہیں ہوتی۔ ہاں ماں باپ بڑے غور و آرام سے اس کے مستقبل کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔۔۔ میں بھی منزہ کے بارے میں فیصلہ کر لیتا اگر وہ صرف کہتی۔۔۔ ہو تو ہاں ہے۔۔۔ اس کا ہر فیصلہ سویرا کو سامنے رکھ کے ہوگا۔"

"یہ باتیں اس کے سامنے کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں اسے یہ بھلانا چاہتی ہوں کہ وہ ماں ہے اور آپ [illegible] رہے ہیں۔"

"بھلا جائے گی؟"

کلثوم بس سوال جو سوچ میں پڑ گئی۔ اتنے میں سویرا نے کسی کے فون کے بارے میں بتایا۔ کلثوم یہ سب [illegible] جھٹکتی ہوئی فون سننے کے لیے اٹھی۔۔۔ واپس آئی تو چہرہ تمتما رہا تھا۔

"کیا ہوا۔۔۔ عرفان کا فون تھا؟ بہت خوش لگ رہی ہو۔" جمیل کھانا کھا چکا تھا' ہاتھ دھو کر تولیے سے [illegible] ہوئے بولا۔

"نہیں' وہ کل جو رشتہ آیا تھا منزہ کے لیے۔۔۔ وہاں سے فون تھا لڑکے کی بہن کا۔۔۔ انہیں منزہ [illegible] اور رشتہ قبول ہے۔ یعنی ان کی طرف سے تو ہاں ہے۔ اب ہمیں کل شام چائے پہ مدعو کیا ہے۔ اللہ کرے [illegible] ہو۔۔۔ اور معاملہ جلد طے ہو جائے۔" وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

✿ ✿ ✿

جمیل' نوید مراد سے مل کر خاصا مطمئن ہوا تھا۔ منزہ کو زندگی کے اس نئے دور کا آغاز کرنے کے لیے [illegible] اور سمجھدار شخص کی ضرورت تھی۔ معاشی آسودگی بھی تھی۔

کلثوم کو شمشاد کے اطوار سے کچھ کھٹک پیدا ہوئی تھی۔ مگر دوسری طرف پروین کے سلجھے ہوئے مزاج [illegible] اسے اطمینان بھی دلا دیا تھا۔ یوں بھی وہ جانتی تھی کہ منزہ اتنے سال تک منظر کی۔۔۔ تیز ماں اور بہن کو جھیل [illegible] ہے' تپ کے کندن بن چکی ہے۔

اب تو پہلے کے مقابلے میں اتنی ناتجربہ کار اور معصوم بھی نہیں رہی۔ خود ہی حالات کے مطابق ڈھل جا[illegible] یا حالات کو اپنے مطابق کر لے گی۔ اس لیے اس نے جمیل کے آمادگی ظاہر کرتے ہی جمشید اور رشنا کو فون کر دیا۔

"آپ لوگوں کی کیا رائے ہے؟" جمشید نے ان سے دریافت کرنا چاہا۔

"یہی بات ہے کہ ہمیں تو وہ لڑکا پسند آیا ہے۔" نوید مراد کو لڑکا کہتے ہوئے ایک بار کلثوم کی زبان بھی لڑکھڑا[illegible] اس نے خود کو سنبھال لیا۔

"اب ایک بچی کے ساتھ اسے اپنا ہم عمر تو ملنے سے رہا۔"

"ہم لوگ اتنی دور بیٹھے کیا مشورہ دے سکتے ہیں اور کیا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ ہاں اگر منزہ کو کوئی اعتراض نہیں [illegible] ٹھیک ہے' ہماری جانب سے بھی منظوری ہے۔"

"اس کا ہی تو مسئلہ ہے شنا! کبھی وہ مان جاتی ہے اور کبھی ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ کبھی سوہا کو لے کر چڑ جاتی ہے۔"

"ہاں سوہا اس کے بارے میں کیا طے کیا ہے؟"

"ابھی سے یہ بات کرنا مناسب نہیں لگتا شنا! ظاہر سی بات ہے اولاد ماں سے کتنا دور رہ سکتی ہے۔ مگر [illegible] ساتھ اولاد رخصت ہوتی اچھی نہیں لگتی۔ یہاں ہو یا کہیں اور شادی ہو' یہ بات تو طے ہے کہ سوہا کو کچھ عرصہ [illegible] ہم سے الگ ہمارے پاس رہنا ہو گا۔ جب منزہ ایک بیوی اور ایک بہو کے طور پر اپنے قدم جما لے گی تب وہ سوہا کو [illegible] ساتھ رکھنے کی پوزیشن میں ہو گی۔ مگر ایک ماں کی حیثیت سے اگر وہ نئے سسرال میں داخل ہو گی تو اپنی جگہ [illegible] سکے گی۔"

"بات تو ٹھیک ہے بھابی!"

"مگر یہ بات منزہ سمجھے تب نا۔۔۔ اسے سمجھاؤ تو خواہ مخواہ میں بگڑ گئی اور مظلومیت طاری کر لیتی ہے جیسے [illegible] کے ساتھ ہم لوگ کوئی ظلم کر رہے ہوں۔ مجھ میں تو اب بات کرنے کا یارا نہیں۔ تم ہی سمجھا سکو تو سمجھاؤ۔"

"آپ بلائیں اسے' ہم دونوں سمجھاتے ہیں۔"

[illegible] بڑے یقین سے کہا مگر جب منزہ ہچکیوں پہ ہچکیوں رونے لگی تب اسے اندازہ ہوا کہ یہ کام ایسا آسان [illegible]

"منزہ۔۔۔ میری جان! میری بات کا غلط مطلب مت لو۔"

"نہیں بھابی! مجھے آپ کی نیت پہ شک نہیں ہے' نہ آپ کی نہ ہی کلثوم بھابی اور جمیل بھائی جان کی۔۔۔ مگر۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔

"مگر ضروری تو نہیں کہ آپ جو چیز میرے لیے بہتر سمجھ رہے ہیں' وہ بہتر ہو۔ کیا میں ایسے نہیں جی سکتی؟"

"نہیں۔۔۔ بالکل نہیں جی سکتی۔ یہ میرا دعوا ہے۔ دیکھو میں تمہاری بات دہراؤں گی۔۔۔ کہ جو چیز تم اپنے لیے [illegible] ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔ کچھ فیصلے وقت پہ چھوڑ دو۔"

"وقت نے پہلے میرے ساتھ کیا اچھا کیا ہے جو اب کرے گا۔"

"ایسا نہیں کہتے میری جان! اللہ پہ بھروسا رکھو۔ وہ شخص خود ایک بچی کا باپ ہے۔ اسی تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہے جس سے تم گزر رہی ہو۔ اس کی بچی بھی اسی دکھ سے دوچار ہے جس سے سوہا ہے۔ تم دونوں ایک دوسرے کی محرومیوں کا مداوا کرتے ہوئے ایک اچھی زندگی گزار سکتے ہو۔ اس بن ماں کی بچی کو تمہارے روپ میں ماں مل جائے گی اور سوہا کو باپ کی شفقت۔"

"مگر بھابی! وہ کہہ رہی تھیں کہ سوہا۔۔۔"

"صرف کچھ دن۔۔۔ یہ ضروری ہے۔"

"مگر کیوں؟" وہ کراہی۔

"جانو۔۔۔ سمجھا کرو۔ ہمارے معاشرے کے کچھ طور طریقے ہیں' کچھ رواج ہیں۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے انجان ہو گے۔۔۔ تمہیں کچھ عرصہ لگے گا ایک دوسرے کو جاننے میں۔۔۔ اس دوران اگر تمہاری توجہ سوہا پہ رہے گی تو یہ ممکن نہ ہو گا۔"

"وہ اپنی بچی کو کہاں بھیجنے والا ہے؟"

"اف منزہ۔۔۔" شنا نے سر تھام لیا۔

"یہ مقابلہ بازی چھوڑ دو۔۔۔ یہ باتیں تمہیں سوائے تکلیف کے اور کچھ نہیں دیں گی۔ عورت کو لٹنے سے پہلے بسنا پڑتا ہے۔ تم اگر پہلے ہی اس کی بیٹی سے اپنی بیٹی کا مقابلہ شروع کر دو گی تو بات بننے کی نہیں بگڑے گی۔۔۔ اور کچھ تم وہاں جا رہی ہو' وہ یہاں نہیں آ رہا۔"

اس کے علاوہ بھی اس نے دیر تک اسے کافی باتیں سمجھائیں۔ جمشید نے بھی چند ایک نصیحتیں کیں۔ منزہ انہیں سمجھی یا نہیں۔۔۔ مگر اتنا ضرور سمجھ گئی کہ اب وہی ہو گا جو اس کے بھائی بھابیاں چاہتے ہیں۔ اس نے اسی رات کلثوم کو ہاں کہہ دی۔

◻ ◻ ◻ ◻
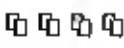
"مظہر۔۔۔ میں تم سے جدا ہو رہی ہوں۔

تمہیں مجھ سے جدا اللہ نے کیا تھا۔۔۔ اور اللہ کا کوئی بھی کام مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اللہ بے رحم بھی نہیں ہے۔ اس نے تمہیں مجھ سے الگ کیا مگر تمہاری یادوں کو نہیں۔ وہ میرے پاس رہنے دیں۔۔۔ لیکن مجھے تم سے جدا یہ لوگ کر رہے ہیں۔ لوگ جو بے رحم ہوتے ہیں۔ یہ تمہاری یادیں بھی مجھ سے چھین لینا چاہتے ہیں۔

اب میں تم سے حقیقتاً" الگ ہو رہی ہوں۔

بالکل الگ۔۔۔

ہمیشہ جدا۔۔۔

تمہاری منزہ کہہ رہی تھی کہ اب میں کسی اور کی ہو جاؤں گی۔ کیا واقعی ایسا ہو سکتا ہے۔ مظہر۔۔۔ کیا میں تمہارے علاوہ اور کسی کی ہو سکتی ہوں؟

کو مظہر کے ساتھ اپنی سہاگ رات کی اولین ساعتیں یاد آگئیں۔ وہ اس کی وارفتگی..... وہ بے قراری.... دیوانگی.....

منزہ نے گھبرا کے جھرجھری لی۔

شہ نے جب اسے مظہر کے بارے میں سوچنے سے منع کیا تھا تب اسے کتنی تکلیف ہوئی تھی مگر اب غیر ارادی طور پہ مظہر کو یاد کرنے پہ یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی ناجائز حرکت کر رہی ہو۔

"مظہر.... الوداع۔" اس کے دل نے چپکے سے کہا.....

تب ہی دروازے پہ دستک ہوئی۔

"بھائی جان! یہ وشمہ....." پروین وشمہ کا ہاتھ پکڑے اندر داخل ہوئی۔

"صبح سے اتنی مصروفیت رہی..... آپ مل نہیں سکے۔ لیجیے اچھی طرح مل لیں.... پھر میں اسے لے جاؤں۔ آج یہ میرے ساتھ سوئے گی۔"

"وشمہ پروین! یہ یہیں سوئے گی۔ میرے..... ہمارے ساتھ۔" نوید نے قطعیت سے کہا۔

پروین کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ اسے بھائی کی یہ بات پسند نہیں آئی مگر بجائے بحث کرنے کے وہ واپس چلی گئی۔

"یہ وشمہ ہے میری بیٹی۔"

نوید نے اس کا ہاتھ تھام کے منزہ کے آگے کیا۔ منزہ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کے اس بچی کو دیکھا۔

سوہا کی یاد اس کے دل کو اتھل پتھل کر گئی۔ پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ وہ پچھلے تین چار گھنٹوں سے اس سے الگ تھی..... اور نجانے کب تک اسے الگ رہنا تھا۔

پہلی بار وہ اس کے بغیر رات گزارنے والی تھی۔

"اور وشمہ..... یہ آپ کی امی ہیں۔"

"پھوپھو کہہ رہی تھیں یہ ماما ہیں۔" وشمہ صاف زبان میں بولی۔

"ہاں ہوئیں..... ماما!" نوید ہلکے سے ہنسا۔

"منزہ بی بی..... یہ بچی بڑی بد نصیب ہے۔ پیدا ہوتے ہی ماں کی گود سے محروم ہو گئی۔ اسے آپ کی ضرورت ہے۔ امید ہے آپ اسے ماں کا پیار دیں گی۔" (میری سوہا کو میری ضرورت ہے مجھے جانے دو اس کے پاس۔)

"میں نے یہ شادی وشمہ کی خاطر ہی کی ہے..... اسے ماں دینے کے لیے۔" (اور میں نے یہ شادی سوہا کے تحفظ کے لیے کی ہے)

"ساجدہ..... اس کی ماں بہت اچھی عورت تھی۔ اس کی میری زندگی میں ایک خاص جگہ تھی، ہے اور رہے گی۔ میں کوشش کروں گا کہ آپ کو بھی آپ کا جائز حق اور مقام دے سکوں۔"

"مظہر..... اس کا بھی میری زندگی میں ایک خاص مقام تھا۔ جواب نہیں ہے نہ کبھی ہو گا..... میں..... "

اس سے آگے وہ کچھ نہ سوچ سکی۔ وشمہ اچھل کے اس کی گود میں بیٹھ چکی تھی۔

"ماما..... ماما....."

اس کے ساتھ وشمہ کھڑی تھی مگر اسے سوہا کی پکار سنائی دے رہی تھی۔

اس نے تیزی سے پلکیں جھپک کے بے تحاشا امڈ آنے والے آنسوؤں کو زبردستی پیچھے کی جانب دھکیلا۔ اس نے تو رخصتی کے وقت بھی ایک آنسو تک نہ بہایا تھا۔ نہ ماں باپ کی آخری نشانی اس گھر کی دہلیز پار کرتے ہوئے جہاں بچپن اور لڑکپن کی ڈھیروں یادیں بستی تھیں نہ اپنے ماں جائے کے سینے سے لگ کر وداع ہوتے ہوئے۔ اس کا اس "دیس نکالے" کے خلاف ایک خاموش احتجاج تھا۔

"ہاں..... یہی ہے تمہاری ماما۔"

نوید مراد کے ایک بار پھر کہنے پہ وہ چونکی۔

"ماما..... ماما..... ماما....."

سوہا کی پکار ہی مظہر میں ابھی تک گونج رہی تھی۔

"کیا نہیں بھی لینڈ سے آنے کے بعد اس نے گھر پہ مجھے نہ پا کے کیا کیا ہو گا۔" اسے ایک اور خیال آیا۔ سوہا اب تک اس سے لپٹ کر سونے کی عادی تھی۔ اس نے تو اسے نہ پا کر طوفان کھڑا کر دیا ہو گا۔ اس متوقع طوفان کا تصور کرنے سے ہی اس کے اندر وحشتیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔

"بتائیں..... یہ سچ مچ کی ماما؟"

وشمہ نے ننھا سا ٹھنڈا ٹھنڈا ہاتھ اس کے گھٹنوں پہ دھرے ہاتھوں پہ رکھا تو جذبات کی یورش ذرا تھم سی گئی۔ وحشتیں خود بخود ماند پڑنے لگیں۔ اس نے اسے مسکرا کر دیکھنا چاہا۔ آنکھوں کے آگے جیسے دھند کی چادر تن گئی اور اس دھند کے پار وہ کون تھی..... وشمہ..... یا سوہا..... اسے کچھ اندازہ نہ ہو رہا تھا۔

"آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں اگر وشمہ آج رات ہمارے ساتھ سو جائے؟" نوید مراد نے اس نئے رشتے میں بندھنے کے بعد پہلی بار اسے مخاطب کیا۔

اس نے بوجھل پلکیں اٹھا کے سامنے بیٹھے شخص کو دیکھنا چاہا۔ سالوں کا سفر جس کے پژمردہ چہرے پہ رقم تھا، وہ چاہتے ہوئے بھی یہ نہ جتا سکی کہ وہ وشمہ کو رات یہاں سلانے کا فیصلہ کر چکا ہے اور اس پہ بمن کے دبے دبے اعتراض کے باوجود عمل پیرا ہو رہا ہے..... پھر یہ سوال تو بے معنی ہوا اور بے معنی سوال کا وہ کیا جواب دے..... کیا یہ جواب دے کہ

"مجھے تو اس پہ بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اگر وشمہ کے ساتھ سوہا بھی ہمارے ساتھ سو جائے۔"

مگر ظاہر ہے کہ اس کے لب یہ جواب ادا نہیں کر سکتے تھے۔

فقط اس کی گردن خفیف سی حرکت کے ذریعے اقرار کا اظہار کر سکتی تھی اور اس نے یہی کیا۔

"مجھے آپ سے یہی امید تھی۔"

اس ذرا سی گردن کے ہاں "میں" ملنے سے نوید مراد کو وہی خوشی اور سرشاری حاصل ہوئی جو کسی بھی مرد کو کسی بھی عورت کی "ہاں" سے ملتی ہے۔

"دراصل میں چاہتا تھا، آپ دونوں میں اس ابتدائی مرحلے میں ہی وہ رشتہ قائم ہو جائے جو ہمارے رشتے کی وجہ ہے۔"

بے حد محتاط الفاظ میں اس نے منزہ پہ یہ بھی جتا دیا کہ اس شادی کی اصل وجہ کیا ہے۔

"اور جو رشتہ میں چھوڑ آئی ہوں....."

اس کے دل سے ہوک نکلی..... مگر اپنی بیٹی کی کلائی میں لشکتی ہری لال چوڑیاں دیکھ کر خوش ہوتے نوید مراد تک یہ ہوک کب پہنچتی۔ اس نے بڑی حسرت سے وشمہ کو باپ سے لاڈ اٹھواتے دیکھا۔

"میری سوہا بھی مظہر کو ایسی ہی پیاری تھی، وہ بھی اسے گود میں لے کر سارے دن کی تھکن بھول جایا کرتا تھا..... بے چارہ مظہر بھی....."

سوچتے سوچتے اچانک اسے احساس ہوا کہ وہ ایک بار پھر بد دیانتی کی مرتکب ہو رہی ہے۔ مظہر کا خیال بھی اب اس کے لیے شجر ممنوعہ ہے مگر وہ سوہا کا خیال دل سے کیسے نکالے گی اور جب جب سوہا یاد آئے گی تب تب مظہر تو یاد آئے گا ہی۔

اس نے زور سے آنکھیں میچ کر جیسے اپنے ذہن کے تمام در بھی بند کرنے چاہے۔

☆ ☆ ☆

"میری طبیعت کچھ ٹھیک نہیں لگ رہی' اصغر! تم جلدی گھر آؤ۔"
ریتا نے پھولی ہوئی سانسوں کے ساتھ کہا تو وہ فون رکھتے ہی گھر کی جانب بھاگا۔

ریتا کا ساتواں مہینہ تھا مگر ایسا لگتا تھا جیسے سات طویل سال گزر چکے ہوں۔ ایک ایک دن اسے بھاری لگ رہا تھا کیونکہ ریتا کے ساتھ شروع سے ہی کوئی نہ کوئی مسئلہ رہا۔ مکمل بیڈ ریسٹ کے باوجود آئے دن کوئی نہ کوئی تکلیف پیدا ہو جاتی۔ ڈاکٹر نے اسے خاصا پیچیدہ کیس قرار دیا تھا اور مکمل احتیاط کی ہدایت کی تھی۔ اس کے بیان کردہ اندیشوں کی وجہ سے ہی اصغر کا دل کانپ رہا تھا۔

گاڑی کو جہاز کی طرح اڑاتا وہ گھر پہنچا تو ریتا تکلیف کی شدت سے بے حال تھی۔ اس کی زرد رنگت دیکھ کر اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔ ملازمہ اس کے پیر سہلا رہی تھی اور خود بھی حواس باختہ نظر آ رہی تھی جبکہ شمیم ایک جانب بے تاثر چہرہ لیے ساکت کھڑی تھی۔

اصغر نے خونخوار نظروں سے شمیم کو دیکھا۔

"تو کھڑی کیا دیکھ رہی ہے۔۔۔ اسے گاڑی تک لے جانے میں میری مدد کر۔"

شمیم کے پتھریلے چہرے پہ ایک بدہیئت دراڑ پیدا ہوئی۔ یہ اس کی مسکراہٹ تھی جس نے اصغر کو اور بھی تلملا کے رکھ دیا۔

"اصغر۔۔۔ مجھے۔۔۔ مجھے ہا۔۔۔ ہاسپٹل۔۔۔"

ریتا کی اکھڑتی سانسوں نے ایک بار پھر اس کا دھیان شمیم سے ہٹا کر اس کی جانب دلایا۔

"ہاں۔۔۔ ہاں میری جان۔۔۔" وہ اسے بازوؤں میں اٹھا کے باہر کی جانب گیا۔ ریتا کی منہ چڑھی ذاتی ملازمہ بتول پیچھے پیچھے تھی۔

گاڑی اسٹارٹ ہونے کی آواز اور پھر گیٹ بند ہونے کی آواز تک شمیم کے چٹان چہرے پہ وہ مسکراہٹ یونہی ایک بدصورت دراڑ کی طرح جمی رہی۔

چند سیکنڈ تک محسوس کیے جانے والے بے معنی سکوت کے بعد اس میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی اور وہ داخلی دروازے کی جانب بڑھی۔ نیم وا لکڑی کا منقش دروازہ اس نے پورا وا کر دیا۔

"بی بی جی۔۔۔ کیا کر رہی ہیں۔۔۔ ٹھنڈی ہوا آئے گی۔"

نصیبن جو برتن دھوتے دھوتے افراتفری میں اٹھ کر یہاں تک آئی تھی ہیٹر کے آگے ہاتھ سینکتے ہوئے بولی مگر شمیم نے کوئی ردعمل ظاہر نہ کیا۔

"بی بی جی۔۔۔ گھر پہ کوئی نہیں ہے۔۔۔ دروازہ بند رکھو۔۔۔ صاحب غصے ہوں گے۔"

یہ صدیقہ تھی' چوکیدار کی بیوی جسے کبھی کبھی کسی ملازمہ کی چھٹی کر لینے کی صورت میں یا پارٹی اور فنکشن ہونے پہ کام کی زیادتی کی وجہ سے گھر کے کام کے لیے بلا لیا جاتا تھا کیونکہ وہ یہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتی تھی۔ اب بھی ریتا کی طبیعت خراب ہونے کا واویلا سن کر بھاگی آئی تھی۔

نصیبن نے صدیقہ کی معلومات میں اضافہ کیا۔ وہ آدھے سے زیادہ دن یہاں گزارتی تھی اور اس نے اول تو شمیم کو کم ہی اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا تھا۔ کھانا تک اس کے کمرے میں ہی پہنچایا جاتا اور کبھی وہ باہر نکلتی تو اس کی بہکی بہکی باتیں اور الجھا الجھا رویہ اسے ایک نارمل انسان ظاہر نہیں کرتا تھا۔

"نہیں نصیبن! بچاری دکھاں دی ماری لگدی اے۔" (بے چاری دکھوں کی ماری لگتی ہے۔)

"دکھوں کی نہیں' عقل کی ماری۔۔۔ یہ دیکھ ذرا۔۔۔ ہا ہائے۔۔۔ یہ کیا کر رہی ہے۔"

اس نے منہ پہ ہاتھ رکھ کے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے صدیقہ کی توجہ اس جانب مبذول کرائی' جہاں شمیم بھاری فرنیچر گھسیٹنے کی اپنی سی کوشش کر رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

کمرے میں زیرو پاور کا ہلکا سبز بلب سفید لیمپ کی آڑ میں روشن تھا۔ فضا میں باسی گلابوں کی مہک سانس بوجھل کر رہی تھی۔ بڑے سے آبنوسی بیڈ پہ ایک جانب نوید مراد لیٹا تھا' دوسری جانب منزہ اور درمیان میں وشمہ بے خبر سو رہی تھی۔ اس سے ذرا فاصلے پہ لیٹے نوید مراد کے وجود سے الجھن محسوس ہو رہی تھی تو دوسری جانب بالکل نزدیک موجود وشمہ کے ہلکے ہلکے تنفس سے ایک عجیب سی بے قراری کا احساس ہو رہا تھا۔ اس کے بے ترتیب سانسوں کی آواز اور ہلکے ہلکے خراٹے اسے سوہا کی یاد دلا رہے تھے۔

شاید آج کی رات وہ سوہا کی یاد سے خود کو آزاد رکھنے میں کامیاب ہو ہی جاتی اگر وشمہ پاس نہ ہوتی۔ وشمہ کا وجود اسے سوہا کو بھلانے نہیں دے رہا تھا۔

اس نے ذرا سی گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔ اس کی پلکیں سوتے میں ہلکی سی لرز رہی تھیں۔ بالکل جیسے سوہا کی لرزتی تھیں۔

اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں جیسے کوئی میٹھا خواب دبوچے ہوئے ہوں۔

بالکل جیسے سوہا کی۔۔۔

اس کے گلابی لب تھوڑے سے وا تھے۔

بالکل جیسے سوہا کے سوتے وقت۔

"مگر کیا سوہا اس وقت سو رہی ہوگی۔۔۔؟"

اس خیال نے اسے ایکدم اٹھ کر بیٹھنے پہ مجبور کر دیا۔

نوید مراد نے آنکھیں کھول کے اسے دیکھا۔ سویا وہ بھی نہیں تھا اور اب منزہ کو پریشانی کے عالم میں بیٹھے دیکھ کر اپنے طور پہ اندازے لگا رہا تھا۔ وہ وشمہ کو یک ٹک دیکھے جا رہی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کے گر رہے تھے۔

"کیا اسے وشمہ کا وجود کھل رہا ہے؟" ایک زہریلی سوچ نوید مراد کو بے چین کر گئی۔

"کیا یہ آج کی رات اس معصوم اور بے ضرر بچی کی موجودگی کو برداشت نہیں کر رہی؟"

وہ یہ سوال خود سے کر رہا تھا اور ان کا جواب بھی اسے خود ہی مل گیا' جب اس نے منزہ کے مہندی لگے ہاتھوں کو ہلکی سی کپکپاہٹ کے ساتھ وشمہ کی جانب بڑھتے دیکھا۔

نوید مراد کا دل سکڑ سا گیا۔

"کیا کرنے لگی ہے۔۔۔ میری بچی کے ساتھ۔"

اور پھر اس کی نیم وا آنکھوں نے اس ہاتھ کو وشمہ کے ماتھے پہ ٹھہرتے دیکھا۔ اب وہ ہولے ہولے اس کے بال سہلا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اب بھی آنسو رواں تھے پھر اس کے لرزتے ہونٹوں سے بڑا مدھم سا لفظ ادا ہوا۔

"سوہا!"

نوید کو اپنے سوال کا جواب مل گیا۔

"کتنا خود غرض ہوں میں۔۔۔ اپنی بن ماں کی بچی کو ایک ہی رات میں یہ احساس دلانا چاہتا تھا کہ اب اس کی زندگی مکمل ہو گئی ہے۔ اس کے پاس باپ کے ساتھ ساتھ ماں بھی ہے مگر ایسا کرتے ہوئے میں نے ایک بن باپ کی بچی کی ادھوری زندگی کو بالکل ہی خالی کر دیا۔ اس سے اس کی ماں بھی چھین لی۔"

اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ رات کے ساڑھے تین بجے ننگے پیر بھاگتا جائے اور منزہ کی بچی کو گود میں بھر کے اٹھا لائے اور وشمہ کے برابر لٹا دے۔

اب رات کے اس آخری پہر کو گزارنا اسے اور بھی کٹھن لگ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کدھر؟"

شمشاد بیگم کے سر میں بڑے زوروں کا درد تھا۔ رات کے ڈھائی بجے جا کر تو بستر پہ لیٹنا نصیب ہوا تھا۔ اس کی ہزاروں فکریں اور پریشانیاں۔ وہ دیر تک اپنے دل کے وسوسے اور اندیشے پروین کے سامنے بیان کرتی رہی یہاں تک کہ وہ بے چاری بیٹھے بیٹھے ـــــ خود کئی دیر تک کروٹیں بدلنے کے بعد اب وہ چائے بنانے اٹھی تھی۔ گرم چائے کا کپ لے کر کمرے کی جانب بڑھ رہی تھی جب نوید مراد کو اپنے کمرے سے نکلتے دیکھا۔ وہ دروازے پہ رک گئی مگر وہ ماں پہ کوئی توجہ دیے بغیر برآمدے میں ٹنگی چابیاں اتار کر باہر کی جانب بڑھنے لگا۔

"کدھر؟"

"آتا ہوں اماں!"

"منہ سویرے سویرے۔ اور وہ بھی شادی کی اگلی سویر سے۔ گھر پروہنوں (مہمانوں) سے بھرا ہوا ہے۔"

"اوہو اماں...!" وہ جھنجلا گیا۔ "مہمان بارہ بجے سے پہلے ہوش میں آنے والے نہیں اور میں آدھے پونے گھنٹے تک واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی میں کوئی ایسا کام تو نہیں کرنے جا رہا جسے دوسروں سے چھپانا ضروری ہو پھر آپ کو مہمانوں کی فکر کیوں لگ گئی ہے؟"

"لے... کیوں نہ فکر کروں۔ سارے پوچھیں گے کہ لاڑھا (دولہا) سویرے سویرے گھر سے کیوں نکلا۔ اسے تو بے سدھ پڑا سوتا ہونا چاہیے۔"

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگا کر اپنے تئیں بیٹے سے شرمیلا سا مذاق کرنا چاہا۔ مگر نوید کے چہرے کے زاویے کچھ اور بگڑ گئے۔

"کیا ہوا...؟ وہٹی نے کوئی آڑا لگایا ہے؟" شمشاد کا ماتھا ٹھنکا۔ "سچ سچ بتا ماں کو... اگر واقعی ایسی بات ہے تو میں تیرے پروہنوں کا لحاظ کروں گی نہ اس کے ایک دن کی وہٹی ہونے کا... کھٹ پٹ کے پیکے چھوڑ آؤں گی۔"

"اماں..." وہ ماں کے جارحانہ عزائم کے سامنے بے بس سا نظر آیا۔

"مجھے تو پہلے ہی اس کی عمر اور پکے پوتھے والی کے ارادے ٹھیک نہیں لگے تھے۔ پروین ہی زبردستی گئی ورنہ میں تو لاتی کوئی ملوک سی کڑی۔ ہولی (ہلکی) سی عمر والی... معصوم بی بی اور دور کا تھے خاندان کی... ساجدہ کے خاندان کی طرح... ایسی لڑکیاں مرد اور سوہروں (سسرال) کے آگے سر نہیں اٹھاتیں مگر جس کا پیچھا اس کے پیچھے کی طرح تگڑا ہو وہ آسانی سے نہیں دبتیں۔ خیر تو فکر نہ کر... اندر چل... میں دماغ درست کرتی ہوں اس کا... عقل ٹھکانے آجائے گی۔"

"اماں! خدا کے واسطے چپ کر جاؤ اور اپنے کمرے میں جا کر آرام سے چائے پیو۔ ایسا کچھ نہیں ہوا جو آپ کو لگ رہا ہے۔ میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تھوڑی دیر میں آجاتا ہوں۔"

"اوہو... تو میں بھی تو یہی پوچھ رہی ہوں کہ کدھر جا رہا ہے؟"

نوید مراد نے ایک گہری سانس بھری۔ اسے لگا کہ اصل جواب دیے بغیر اس کی ماں ٹلنے والی نہیں۔

"میں اپنے..." لفظ سسرال اس عمر میں ادا کرتے ہوئے اس کی زبان اٹک گئی۔

"منزہ کے بھائی کے گھر جا رہا ہوں۔"

"ناشتہ دینے؟"

"کیا مطلب؟" اس عجیب و غریب سوال پہ وہ حیران ہوا۔

"شادی کی اگلی سویر لڑکی کے پیکے ناشتہ لے کر آتے ہیں تو ادھر جا رہا ہے اس لیے میں سمجھی کہ شاید رواج بدل گیا ہو۔ اب لڑکی والوں کی بجائے لاڑھا (دولہا) آپ یہ ڈیوٹی دیتا ہو۔" شمشاد نے بھولپن کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ "میں منزہ کی بیٹی کو لینے جا رہا ہوں۔"

یہ کہنے کے بعد وہ ایک پل بھی نہ رکا۔ مبادا ماں کے اگلے سوال کا جواب دینے کا مرحلہ اس سے بھی طویل ہو جائے۔

شمشاد بیگم اس جواب سے اتنی حیران ہوئی کہ فوری طور پر کوئی رد عمل بھی ظاہر نہ کر سکی۔ نوید کے گھر سے نکل جانے کے بعد ہی اسے ہوش آیا۔

"بیٹی کو لینے...؟ اس چڑیل کو...؟ اندھیر ہے اندھیر... ابھی خود کو سسرال میں بیٹھے ایک رات ڈھنگ سے نہیں گزری اور بیٹی کو یہاں لے آئے چلی ہے اپنا پورا زمانہ... اپنے قدم جمے نہیں اور اپنی اولاد کے بنانے لگی ہے۔ بی بی پروین... اٹھو... جاگو... دیکھو جیسی تمہاری یاری نے کیا چن چڑھایا ہے... مجھ کو آگے لگانے والی گھس آئی ہے میرے گھر میں۔ جیسے ڈنگر (مویشی) کی طرح ہانک کے اسے گھر سے نکالا ہے۔"

شمشاد بیگم کا واویلا سن کر پروین تو آنکھیں ملتی باہر نکلی تھی اندر لیٹی منزہ کے دل میں بھی کھٹک ہوئی۔ اگرچہ اسے شمشاد کی صرف آواز آرہی تھی الفاظ پوری طرح اس تک نہیں پہنچ رہے تھے پھر بھی اس کا دل سکڑنے لگا۔ اسے لگ رہا تھا نوید ہی اس ہنگامے کی وجہ ہے۔

"کہیں نوید صاحب نے تو میرے بارے میں ایسا کچھ نہیں کہا جس سے ان کی والدہ اتنی غضب ناک ہو رہی ہیں۔"

اسے وسوسہ لاحق ہوا اور وہ اپنے رات کے رویے کے بارے میں سوچنے لگی۔

بے شک اس کا رویہ نوید سے خاصا الگ اور ذرا مختلف تھا مگر ایک رات کی دلہن کا یہ گریز قطعی غیر معقول نہیں کہلایا جا سکتا۔ جبکہ اس کے برعکس نوید کا خشک رویہ ضرور غور طلب تھا۔

وہ اس بات سے خوف زدہ تھی کہ اپنے شوہر کی محبت اور وارفتگیوں کا جواب کس طرح دے گی۔ اب اس بات پہ خفا تھی کہ نئی دلہن کی پذیرائی اس طرح نہیں ہو سکی جیسے ہونا چاہیے تھی۔ اسے مظہر کی وارفتگیاں یاد آنے لگیں ایک بار پھر سے نہ چاہتے ہوئے بھی۔

اور وہ غیر ارادی طور پر مظہر کا موازنہ نوید مراد کی سرد مہری سے کرنے لگی اور جب اس بات کا احساس ہوا تو خود اپنے الٹے احساسات پہ دنگ رہ گئی۔

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے منزہ! کہ تمہیں ایسا شوہر ملا ہے جو تمہاری طرح خود بھی کسی کی یادوں میں گرفتار ہے جیسے تم مظہر کے بجائے کسی اور کا خود سے وابستہ ہونا ذہنی طور پہ قبول نہیں کر پا رہیں ایسے ہی شاہدہ بھی اپنی ہی بیوی کے بجائے تمہیں دیکھ کر ناخوش ہے پھر یہ بیزاری بوجھ کیوں؟"

"یہ تو یہ تو سوچا..." اس کے دل نے بھرپور مزاحمت کے ساتھ اس الزام کو جھٹلایا۔

"یہ ناانصافی نہیں تو کیا ہے۔ اپنی بیٹی سے ایک رات کی جدائی بھی گوارا نہیں اور میری بیٹی... اسے مجھ سے الگ کر دیا۔ اس پہ بھی یہ ظلم کہ اگر میں نے پہلی ہی رات اس کی بیٹی سے وہ لاڈ پیار نہیں کیا جس کی اسے خواہش تھی تو اس بات کا ڈھنڈورا گھر بھر میں پیٹ ڈالا۔ میں نے ایک بن ماں کی بچی کو ممتا دینے سے کب انکار کیا ہے۔ اتنا تھوڑے ہی ہو سکتی ہے ایک ماں... مگر نوید صاحب کو مجھے کچھ وقت تو دینا چاہیے تھا۔ یہ کیا کہ صبح صبح ناراضی دکھاتے کمرے سے بھی نکل گئے اور ماں سے بھی شکایت کر دی۔"

اس کے دل میں دوسرا گلہ توانا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ہو گیا ہے اماں؟" پروین نے کمرے سے نکل کر ناگواری ظاہر کی۔ "کیوں صبح صبح شور مچا رہی ہیں۔ گھر میں نئی دلہن ہے اس کا تو لحاظ کریں۔"

"تیری اس نئی دلہن نے تو جوتی برابر لحاظ نہیں کیا۔ نہ خصم کا نہ ساس کا۔ اور دن چڑھتے ہی اپنی اوقات دکھا دی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"ہونا کیا ہے؟ آرام سے بیٹھی ہو گی کہ پہلے میری ضد مان، پھر تیری مانوں گی اور مرد تو اس معاملے میں ایسا اندھا

ہوتا ہے کہ جو رو کنویں میں چھلانگ مارنے کی شہرت رکھے تو بھی مان لے۔ وہ بھی وہم پال تا سید جا با ہر بھاگ جاتا ہے۔

"اصل بات تو بتاؤ نا اماں! کیوں بھائی جان کو کوس رہی ہیں؟"

"رات کو بڑے نخرے سے وشمہ کو اندر لے کر گیا تھا کہ آج ہی ماں کے ساتھ سوئے گی۔ میں نے بہتیرا کہا نہ اس معصوم بچی کو کسی کی ہائے لگے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ دل ہی دل میں بددعائیں دیتے بیٹھ جائے کہ یہاں سے آ کر میری بچی خراب کرنے۔ مگر وہ تو اس کی رذیل نکلی کہ موقع دیکھ کر مقابلے پہ اتر آئی۔ نوید کو اپنے بچے سے اس نے کہ جا جا کر میری بیٹی کو بھی لا اسے بھی وشمہ کے برابر سلاؤں گی پھر میرے بیچے ٹھنڈے پڑے گئے"

"واقعی۔" اسے حیرت ہوئی۔

"لے۔ تو میں کیا کہانی سنا رہی ہوں! میرے سامنے نوید نکلا ہے۔ بکتا جھکتا۔ کرے بھی کیا وچارہ۔ سو بڑے وسیلے پڑھی لکھی رن (بیوی) مل گئی ہے۔ اب بھگتے گا۔"

"یہ عجیب حرکت کی بھابھی نے۔ حالانکہ بھائی جان پہلے ہی طے کر چکے تھے کہ ان کی بیٹی ہمیں [illegible] کے ساتھ پرورش پائے گی اور وہ اس کی تمام تر ذمہ داریاں اور فرائض پورے کریں گے اور یہ بات میں نے [illegible] کو بتا دی تھی۔ خود ان کے میکے والوں نے ہی یہ پیشکش کی تھی۔ وہ ایک ہفتہ بچی کو اپنے پاس رکھیں گے پھر انہوں نے اتنی بے اعتباری کا مظاہرہ کیوں کیا؟"

"آتے ہی اپنا رعب جمانا چاہتی ہے اور کیا؟"

"مجھے تو وہ بہت سمجھدار اور سلجھی ہوئی لگتی ہیں پھر انہوں نے ایسی حرکت کیوں کی؟ نوید بھائی جان پہ ان کا [illegible] کتنا برا اثر ہوگا۔ کیا سوچتے ہوں گے وہ میرے متعلق کہ بہن نے کیا بیوی پسند کی ہے۔" پروین کو اپنی فکر لگ گئی۔

ادھر شمشاد بیگم کے سینے میں جیسے ٹھنڈک اتر گئی۔

پروین کم ہی اس کی باتوں میں آتی تھی۔ نہ ساجدہ کی بار آئی۔ نہ اپنے شوہر اور سسرال والوں کے متعلق ماں کے شر انگیز بیانات کا کبھی کوئی اثر لیا اور اس نئی بھابھی کے متعلق تو اس کی رائے پہلے سے بہت اچھی تھی۔ اس رشتے کو طے کرنے کے لیے وہی سب سے زیادہ فعال تھی اور آج پہلے ہی دن اس کے دل میں بھابھی کے خلاف میل آتا دیکھ کر شمشاد کو سکون سا مل رہا تھا۔

"میرا تو خیال ہے [illegible] جاہل ہے۔ بک بک کرتی ہے جھلی ہے۔ اپنے آپ کو بڑی لائق فائق سمجھتی ہے نا تو کر کے دیکھ لی من مانی۔۔۔؟ اب بتا میں نہ کہتی تھی "بڑی عمر کی بال بچے والی عورت نہ لا گھر میں۔ اسے پتہ ہے کہ کیسے خصم قابو کرنا ہے۔ مال کے لیے پہلی عمر کی کڑی لائی۔۔۔ جو ماڑے (کمزور) گھر کی ہوتی پڑھی لکھی نہ ہوتی پھر دیکھتی کیسے اب تک گھونگھٹ نکال کر بیٹھی ہوتی۔ اس نے تو آتے ہی مرد کی دوڑ لگا دی۔" پروین سخت کبیدہ دل لیے سست قدموں کے ساتھ اندر گئی۔

بھائی کے کمرے کے بند دروازے کو دیکھ کر اس کے اندر غصے کی ہلکی سی لہر اٹھی۔ وہ کچھ سوچ کے اندر آ گئی۔

منزہ اپنے دھیان میں بیٹھی تھی۔ پروین کو اندر آتے دیکھ کر اس نے خیر مقدمی طور پہ مسکرانے کی ہلکی سی کوشش کی۔

مگر جواب میں پروین کا چہرہ سپاٹ ہی رہا۔

منزہ کی مسکراہٹ خود بخود بے جان ہو گئی۔

پروین نے سوئی ہوئی وشمہ کو گود میں بھرا۔ تب بھی منزہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

پروین وشمہ کو اٹھا کر باہر نکلتے نکلتے دروازے کے قریب رکی اور بڑے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"ایک بات کہوں بھابھی۔۔۔! اگرچہ یہ بات کہنے کے لیے میرا رشتہ آپ سے چھوٹا ہے مگر عمر میں اور شادی شدہ زندگی کے تجربے میں میں آپ سے بڑی ہوں اس لیے ضرور کہوں گی کہ مرد سے ضد لگانا اور وہ بھی اس ابتدائی مرحلے میں۔۔۔ بڑا خطرناک بھی ثابت ہو سکتا ہے۔"

منزہ کی آنکھوں میں تحیر سمٹ آیا۔

"زندگی بہت [illegible] اس گمان میں مت رہیے گا کہ ہمیشہ یہ مقابلے کی فضا آپ کے حق میں رہے گی۔ مرد مقابلے پہ اتری عورت کو زیادہ دیر برداشت نہیں کرتا اور دوسری بات یہ کہ وعدے پہ اعتبار کرنا سیکھیں اور وعدے کے پورا ہونے کا انتظار صبر کے ساتھ کرنا سیکھیں۔"

منزہ کو ہکا بکا چھوڑ کے کمرے سے نکلی تو شمشاد اسی جانب آ رہی تھی۔

"بہت تیکھے [illegible] میں خبر لیتی ہوں اس کی۔"

"رہنے دیں اماں! معاملہ اور بگڑ جائے گا۔ ابھی ایک دن بھی نہیں ہوا شادی کو اور گھر میں مہمان بھی ہیں۔"

"پھر بھی اب چاچا کو ماسی کو پتا تو لگنا چاہیے کہ وہ کسی ایسے ویسے گھر میں متھا نہیں لگا رہی۔ یہاں واسطہ شمشاد بیگم سے پڑا ہے [illegible] گا۔"

وہ [illegible] کے کف ملتے ہوئے اندر جا کر منزہ پہ پل پڑنے کے موڈ میں لگ رہی تھی۔

"اس کی ضرورت نہیں میں نے سنا دیا ہے کافی ہے۔"

"تو نے؟" اسے ذرا اعتبار نہ آیا۔ "مجھے تو نہیں لگتا کہ تو کسی کو کچھ سنا سکتی ہے۔"

"مجھے بھی سنانے کا کوئی شوق تو نہیں مگر بھائی جان کی گرہستی دوبارہ بسانے میں بڑا ہاتھ میرا ہے۔ بڑے ارمانوں سے میں ان کے لیے نئی بیوی اور وشمہ کے لیے نئی ماں لائی تھی۔ اب اس گرہستی کو برقرار رکھنے کی بھی میں پوری کوشش کروں گی تاکہ بھائی جان اپنی زندگی میں تلخی گھلنے کا الزام مجھے نہ دیں۔"

☼ ☼ ☼
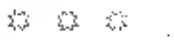
دو ہفتے بعد اصغر رینا کو لے کر ہاسپٹل سے گھر لوٹا۔ اب اس کی طبیعت کچھ سنبھل ضرور گئی تھی مگر ڈاکٹر کے مطابق خطرہ ابھی ٹلا نہیں تھا۔ ایک تو لاکھ دعاؤں کے بعد یہ خوشی ملنے والی تھی۔ اس پہ بھی خوف اور اندیشوں کی گرہیں لپٹی ہوئی۔

اس سے پہلے دو بار یہ امید پیدا ہوئی مگر ابھی اصغر اور رینا ڈھنگ سے خوش بھی نہ ہو پائے تھے کہ امید کی یہ کرن اندھیروں میں ڈوب گئی۔

اس بار وہ پہلے سے زیادہ محتاط تھی۔ شہر کی سب سے مہنگی اور قابل گائناکالوجسٹ سے مسلسل رابطہ تھا۔ اصغر نے بھی دیکھ بھال اور علاج میں کوئی کسر نہ رکھ چھوڑی تھی۔ ایک ملازمہ صرف اور صرف اس کی خاطر داری کے لیے رکھی تھی تاکہ اسے کسی کام کے لیے پیر بھی زمین پہ نہ رکھنا پڑے۔ اسی وجہ سے سات مہینے گزر گئے تھے۔ چاہے اس دوران کتنی بار ایسا لگا جیسے پہلے دو تجربوں کی طرح یہ بھی [illegible] مگر خیریت رہی۔

آج بھی وہ خطرہ ٹال کے گھر پہنچے تھے۔

"آرام سے۔۔۔ دھیرے سے۔۔۔" اصغر نے سہارا دے کر اسے گاڑی سے نکلنے میں مدد دی۔

"میں سوچ رہا ہوں تمہیں وہیل چیئر لا دوں۔"

"تاکہ میں بالکل ہی محتاج ہو کے رہ جاؤں۔" اس نے جل کر کہا۔

نقاہت کے مارے آواز مشکل سے نکل رہی تھی مگر الفاظ بھرپور زہریلے تھے۔

"دیکھو نا۔ اب یہ چار سیڑھیاں چڑھ کے اوپر برآمدے تک جانا ہے۔ تمہیں ایک ایک قدم احتیاط سے اٹھانا ہے میری رانی!" اس کے لہجے کا برا مانے بغیر اصغر نے نثار ہو جانے والے انداز میں کہا۔

شمائلہ نے رشک و حسد کے ملے جلے تاثرات لیے اپنی عام سی شکل و صورت والی اور بڑے خاص طور طریقوں والی تنک مزاج مالکہ کو دیکھا۔

"اور کتنی احتیاط کرواؤ گے۔۔۔ اب تو سانس لیتے بھی ڈر لگتا ہے۔" اس کے لہجے کی تندی بے بسی اور لاچاری میں ڈھل گئی۔

اصغر کا بس نہ چل رہا تھا اس کی ساری تکلیفیں خود مول لے لے۔

"میری جان... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔ بس تھوڑا سا انتظار... ایک بار میرا شہزادہ آجائے پھر دوبارہ تمہیں اس تکلیف سے گزرنے نہیں دوں گا۔"

اصغر اور شاہدہ بہت آہستگی اور احتیاط سے اسے کسی کانچ کی گڑیا کی طرح سنبھالے آگے بڑھ رہے تھے۔

"اور اگر شہزادی آگئی تو...؟" رینا کے کوفت زدہ چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ اصغر اس کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔

"تو پھر کیا... شہزادہ ہو یا شہزادی... ایک ہی وارث اور ایک ہی جانشین کافی ہے۔ بس یہ طے ہے۔" اس نے وعدہ کیا یا بات بدلی کیونکہ یہ بات ڈاکٹر نے صرف اسے ہی بتا رکھی تھی کہ رینا کے پاس یہ آخری چانس ہے۔

شاہدہ نے جنگلے پہ ہاتھ رکھ کے گھمایا۔

"بس میڈم! تھوڑا سا حوصلہ اور..."

رینا کی کراہ کے جواب میں اس نے تسلی دیتے ہوئے کہا مگر اندر وسیع و عریض ہال پہ نظر پڑتے ہی اس کا فقرہ وسط میں ہی رہ گیا۔

یہی حال اصغر کا تھا، وہ حیرانی سے اپنے سجے سجائے ہال کا یہ حشر دیکھ رہا تھا۔ بھاری صوفے اور دیوان کھینچ کے دیواروں کے ساتھ لگا دیے گئے۔ سینٹر اور سائیڈ ٹیبلز بھی ہٹا کے ایک کونے میں اوپر تلے رکھی گئی تھیں، بس فرش پہ سفید چادریں بچھی تھیں۔ اگر بتیاں جل رہی تھیں۔

اصغر کے دل پہ ایک عجیب سی ہیبت اور وحشت طاری ہو گئی۔ رینا بھی گنگ بنی کبھی سامنے تو کبھی اصغر کو دیکھتی ماحول کی اس تبدیلی کی وجہ جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"صاحب جی... یہ... یہ سب...؟" بالآخر شاہدہ نے اس سکوت کو توڑنے میں پہل کی اور اس کے ساتھ اصغر بھی اس منجمد حیرت کے اثر سے باہر نکل آیا۔

"صدیقہ... نصیبن۔" اس کی دہاڑ کے جواب میں وہ دونوں الگ الگ کونوں سے برآمد ضرور ہوئیں مگر آگے آنے کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ فق چہروں کے ساتھ دونوں ہی دیوار سے لگی کھڑی تھیں۔

"یہ سب کیا ہے نصیبن! کس نے یہ واہیات حرکت کی ہے؟" وہ پھر گرجا مگر اس سے پہلے کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہمت کر کے اس سوال کا جواب دیتی۔ کچن سے شمیم ٹرے اٹھائے نکلی۔

نصیبن اور صدیقہ دونوں نے گردن موڑ کے اسے آتے دیکھا اور بہت کچھ کہتی نظروں سے اصغر کو سارے جواب دے دیے۔

"شمیم..." اصغر نے بے یقینی سے اس کا نام دہرایا تھا، پکارا نہیں تھا۔ پکار بھی لیتا تو شاید وہ اس وقت سننے کی حالت میں نہیں تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ نیند میں چل رہی ہو۔ سفید چادر کے وسط میں اس نے ٹرے الٹ دی۔ کھجور کی گٹھلیاں اور چنے بکھر گئے۔ وہ دونوں ہاتھوں سے انہیں سمیٹ کر ڈھیری بنانے لگی۔

"اصغر...! یہ کیا کر رہی ہے؟" رینا چلائی۔

شمیم اب بل کے رقت آمیز لہجے میں قل شریف پڑھنے لگی تھی۔

اس بار اصغر سے رہا نہیں گیا۔ وہ رینا کو شاہدہ کے اوپر تقریباً "پھینکتا ہوا" شمیم کی جانب لپکا تھا۔ اگلے ہی پل شمیم کی چٹیا اس کے ہاتھ میں تھی اور وہ بے تحاشا اسے لاتیں رسید کر رہا تھا۔

اپنے ہوش میں یہ دوسری بار تھا، جب وہ اپنی بڑی بہن کو یوں پیٹ رہا تھا۔ ایک بار تب جب نشے کی حالت میں اس نے شمیم کو آدھی رات کے وقت ٹیرس پہ اکیلے بیٹھا دیکھا تھا اور رینا کی اشتعال انگیز باتوں کی وجہ سے وہ قابو نہ رکھ پایا تھا اور دوسری یا... جب وہ نشے میں دھت نہیں تھا لیکن مکمل ہوش و حواس میں بھی نہیں تھا۔ بس اس کی زیادتی نے اس کے ہوش و حواس سلب کر لیے تھے۔

اور جب وہ ذرا سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تھا تو اسے اپنے اس بے رحمانہ فعل پہ ندامت بھی ہوئی تھی... جب وہ تین دن تک شمیم کا سامنا نہیں کر سکا تھا۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا کہ وہ اب کبھی اس پہ ہاتھ نہیں اٹھائے گا اور اس کا خیال رکھنے کی پوری پوری کوشش کرے گا۔ اگرچہ رینا کی مداخلت اسے ایک بھائی کی ذمہ داری احسن طریقے سے نبھانے سے روکتی تھی مگر اب اس نے کم از کم یہ کیا تھا کہ شمیم کو اس کے حال پہ چھوڑ دیا تھا۔

اور آج یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کی ذہنی حالت مسلسل ابتری کی جانب گامزن ہے، وہ وحشیانہ طریقے سے اسے پیٹ رہا تھا۔ یہاں تک کہ ملازماؤں تک کی چیخیں نکل گئیں۔ ان کی چیخ و پکار سے رینا کو ہوش آیا۔ وہ اب تک بے یقینی سے یہ تماشا دیکھ رہی تھی مگر اب اس نے بڑی دل سوزی سے واویلا کرنا شروع کر دیا۔

"ارے... کوئی روکو... کوئی روکے... یہ ہوش میں نہیں ہے۔ بہن کو مار ڈالے گا... شاہدہ... نصیبن... اس بے چاری کو بچاؤ... اصغر بس کرو... تمہیں خدا کا واسطہ... تمہیں میری قسم... اپنے بچے کی قسم..." اصغر کے ہاتھ رک گئے۔

زمین پہ اوندھی گری شمیم نے آہستہ آہستہ اپنا بکھرے بالوں والا سر اٹھایا۔ اس کے ہونٹوں سے خون رس رہا تھا، چہرہ سوجا ہوا تھا۔ یہ صرف چہرہ تھا جو نظر آ رہا تھا ورنہ اس کی پیٹھ پہ نجانے ایسے کتنے اور نشان بن چکے تھے۔ رینا تک کا دل کانپ گیا۔

نصیبن اور صدیقہ اصغر کے ایک جانب ہٹتے ہی لپک کے آئیں اور شمیم کو سنبھالنے لگیں۔ نصیبن تھر تھر کانپ رہی تھی۔ صدیقہ کے تو آنسو بھی بہہ رہے تھے۔

"اصغر..." شمیم کے منہ سے ایک کراہ کی صورت اس کے بھائی کا نام ادا ہوا۔ اصغر نے چونک کے سر اٹھایا۔ اسے اچانک محسوس ہوا تھا جیسے اسے شمیم نے نہیں، نصرت نے... اس کی ماں نے پکارا ہو اور ایسا پہلی بار نہیں ہوا تھا۔ ہر گزرتا دن نصرت سے شمیم کی مشابہت کو اور بھی نمایاں کرتا جا رہا تھا۔ شمیم کی شکل پہلے بھی ماں سے ملتی تھی مگر اب آواز اور چال ڈھال تک وہی ہونے لگی تھی۔

خود سے صرف ساڑھے چار سال بڑی بہن کو ماں کی شکل و صورت میں دیکھ کے کبھی کبھی اصغر عجیب سے رعب میں آ جایا کرتا تھا۔

اس وقت بھی اس کے دل کی یہی حالت ہوئی۔

"کیوں کرتا ہے تو ایسا؟" وہ رو پڑا۔

"اصغر... میں نے کیا کیا...؟ جب مظہر اسپتال سے آیا تھا تب بھی چادریں بچھی تھیں... ابا... پھر امی... جو بھی اسپتال سے آتا ہے... سفید چادریں بچھتی ہیں... سوگ ہوتا ہے... تو بھی رانی کو اسپتال سے لا رہا تھا... اس لیے میں نے..." درد کی شدت سے اس سے مزید کچھ نہ کہا گیا اور وہ صدیقہ کی گود میں سر ڈال کے گر سی گئی۔

"منحوس... کالی زبان والی..."

رینا گویا سہم کے رہ گئی۔ سوگ والی بات پہ... وہ بے تحاشا اسے کوسنے لگی۔

"نہ کریں میڈم! آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور خراب ہو جائے گی۔" شاہدہ نے اسے روکنا چاہا۔

"چھوڑو رینا... اسے کیا کچھ کہنا... یہ تو... یہ تو بے چاری..." اصغر اپنے آنسو آستینوں کے کف سے رگڑتا رینا کے پاس آیا۔

"چلو کمرے میں... آرام کرو۔"

"اس نے سنا یہ کیا کہہ رہی ہے... یہ ہمارے بچے کو..."

"اس کا دماغ کام ہی کب کرتا ہے رینا... اسے خود نہیں پتا یہ کیا کہہ رہی ہے۔ اس کی بات پہ دھیان مت دیا

وہ اتنی حیران ہوئی کہ اس سوال کی وجہ دریافت کرنا تو درکنار "شکریہ" تک ادا کرنا بھول گئی۔

"پاپا! یہ انکل کون ہیں؟"

وہ چپ رہی۔ سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ سوہا کے اس سوال کا کیا جواب دے۔

بظاہر الماری سے اپنے کپڑے نکالتا نوید مکمل طور پر منزہ کی جانب سے اپنی بچی کے اس سوال کے جواب کا منتظر تھا۔ "مما! کہہ رہی تھیں کہ یہ تمہارے پاپا ہیں۔ ماما! کیا یہ میرے پاپا ہیں؟"

وہ اب بھی چپ رہی۔

نوید مراد کے دل کو دھکا سا پہنچا۔

اس نے منزہ کے اس گھر میں قدم رکھتے ہی اپنی بیٹی سے اس کا تعارف ایک ماں کے طور پر کرایا تھا اور بیٹی کے سوال پہ منزہ کی معنی خیز خاموشی اسے کھل رہی تھی۔ اس نے جھنجلا کے زور سے الماری کے پٹ بند کیے۔

"بتائیں نا ماما! یہ پاپا ہیں؟"

"پاپا...!" یہ وشمہ کی آواز تھی۔

وہ کمرے میں داخل ہوتے ہی باپ کو پکارتی اس کی جانب لپک رہی تھی مگر منزہ پہ نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئی۔ اس کی سیاہ چمکتی آنکھوں میں اشتیاق بھری مسکراہٹ چھلک رہی تھی۔

"یہ ماما ہیں۔" اس نے رات کو باپ کا رٹایا ہوا سبق دہرا کر خود کو یاد دلایا۔

اب وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی اس کی جانب بڑھ رہی تھی۔

منزہ نے اسے دیکھ کر مسکرانا چاہا۔

"یہ میری ماما ہیں۔" اس کے قریب آتے ہی سوہا کو جیسے خطرے کا احساس ہوا۔ اس نے وشمہ سے چلا کے کہا۔ وہ سہم کے وہیں رک گئی۔

"پاپا..." روہانسی آواز میں اس نے باپ کو پکارا۔

"بری بات سوہا...! چھوٹی سی بہن ہے۔" منزہ نے سرزنش کی۔

نوید نے آگے بڑھ کے وشمہ کو گود میں اٹھا لیا اور اسے پیار کرنے لگا۔ منزہ کے اندر خالی پن اور پھیل گیا۔

"یہ منظر کتنا جانا پہچانا لگ رہا ہے۔ سوہا بھی تو اسی عمر کی تھی جب اس نے باپ کو کھو دیا تھا۔ مظہر اس کا ایک بھی آنسو نکلنے پہ یونہی بے چین ہو جایا کرتا تھا۔ اسے ایسے ہی گود میں بھر کے سینے سے لگا لیا کرتا اور... اور کتنے سال ہو گئے ہیں میری سوہا کو باپ کے سینے سے لگے۔ وہ تو بھول بھی چکی ہو گی کہ باپ کی حرارت کیسی ہوتی ہے۔ اس کے ہاتھوں میں... اس کی گود میں جو تحفظ کا احساس ہوتا ہے وہ کیسا ہوتا ہے۔"

اس نے سوہا کو دیکھا جو نوید کی جانب ہی دیکھ رہی تھی۔ منزہ کو اس کی آنکھوں میں محرومی اور تشنگی نظر آئی تو بے ساختہ اسے کھینچ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"یہ عورت کیسی ماں ہے۔" نوید نے اسے بیٹی سے لاڈ کرتے دیکھ کر سوچا۔ "کیا ماؤں کے دل اتنے تنگ ہیں... کیا ماں صرف اپنی اولاد کی ماں ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ اس معصوم کو بھی پیار دے دیتی تو کیا اس کی ممتا میں کوئی کمی ہو جائے گی۔ مگر شاید اس نے دل سے نہ مجھے قبول کیا ہے نہ میری بیٹی کو۔ اپنی بیٹی کا رشتہ مجھ سے قائم کرتے ہیں اتنا نہ ہچکچائی۔ کیا ہو سکتی ہے اس کی وجہ؟ کیا یہ کہ وہ اب تک شوہر کو نہیں بھلا پائی؟ ہاں یہی وجہ ہو سکتی ہے۔ یہ ساجدہ نہیں ہے جس کے کورے دل پہ صرف میرا راج تھا... یہ منزہ ہے جس کے دل پہ جو شبیہ ہے اسے شاید میں عمر بھر دھندلا نہ کر پاؤں۔"

وہ دونوں ایک ہی کمرے میں موجود... اپنے اپنے پرانے رشتے کو سینے سے لگائے اس نئے رشتے کو اپنے اپنے ڈھنگ سے سوچ رہے تھے۔

☆☆☆☆

"میں نے آپ سے پہلے ہی کہا تھا مسٹر اصغر کہ آپ کی وائف کا کیس بہت کومپلیکیٹڈ ہے۔ ان کا بی پی تھرو آؤٹ کنٹرول میں نہیں رہا۔ اس کے علاوہ بھی انہیں بہت سے پرابلمز تھے۔ اسی وجہ سے پہلے بھی تین دفعہ ان کا مس کیرج ہو چکا ہے۔ اب ہم لاسٹ ہوپ کے طور پہ ان کا آپریشن کر رہے ہیں۔ آپ دعا کیجیے کہ ہم ماں اور بچے دونوں کو بچا سکیں۔"

ٹھیک پندرہ دن بعد وہ اسی حالت میں ایک بار پھر رینا کو لے کر ہاسپٹل گیا اور ڈاکٹر نے اس کی حالت کے پیش نظر فوری آپریشن کرنے کا فیصلہ کیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ابھی تو تقریباً ڈیڑھ دو مہینے باقی ہیں۔ اتنی جلدی آپریشن... یہ خطرناک تو نہیں ہو گا؟"

"آپ کو بچے کی تسلی نہیں ہو رہی... ہے تو سہی مگر زیادہ انتظار کرنا اور خطرناک ہو گا۔ ڈیڑھ دو مہینے بہت دور کی بات ہے۔ ابھی ہم فوراً کم از کم ماں کی جان تو بچا سکتے ہیں۔"

"ڈاکٹر صاحب..." اصغر کی آواز لڑکھڑا گئی۔ "آپ نے بتایا تھا کہ رینا کے دوبارہ ماں بننے کا چانس بہت کم ہے۔"

"کم ہے ناممکن نہیں۔ دراصل اسے کچھ پیچیدگیوں کا سامنا ہے مگر سائنس میں کوئی بھی بات حرف آخر نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے مکمل علاج کے بعد آئندہ کچھ سالوں میں وہ پھر سے ماں بن جائیں مگر فی الحال ان کی جان بچانا زیادہ ضروری ہے۔"

آپریشن تھیٹر کا دروازہ بند ہوتے ہی اصغر اکیلا ہو گیا۔

آج اسے شدت سے اپنوں کی کمی محسوس ہو رہی تھی۔

ایک خاندان کی کمی...

رینا کی محبت میں کھو کر وہ ہمیشہ خود کو یہ حسین دھوکا دیتا رہا کہ اس کی زندگی مکمل ہے۔ اب اسے کسی اور کی ضرورت نہیں مگر آج اسے یہ احساس ہو رہا تھا کہ وہ کتنا اکیلا ہے۔ کتنا تنہا اور کتنا بے بس ہے۔ آج اس کی ماں ہوتی تو یہاں مصلیٰ بچھائے بہو کے لیے نہ سہی کم سے کم ہونے والے پوتے اور پوتی کے لیے دعائیں مانگ رہی ہوتی۔

باپ ہوتا تو ڈھیروں صدقہ خیرات کرتا۔

بھائی ہوتا تو آج اسپتال میں دوڑ دھوپ کر رہا ہوتا۔

بہن بھی ہوتی تو رینا کو سنبھال رہی ہوتی۔

یہاں جتنی عورتیں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار تھیں سب کے ارد گرد کئی رشتے تھے۔ اس وقت ایک رینا ہی تھی جو اکیلی تھی۔ نہ سسرال میں کوئی باقی رہا نہ میکے سے وہ کوئی رشتہ لے کر آئی تھی۔

اصغر اکیلا ہی ایک سانس میں سو سو دعائیں مانگنے لگا۔ اس کی دعائیں شاید مکمل قبولیت کے درجے تک نہ پہنچ سکیں۔ دو گھنٹے کے طویل آپریشن کے بعد رینا کی زندگی تو بچا لی گئی مگر اس کا سات ماہ کا بچہ نہ بچایا جا سکا تھا۔

☆ ☆ ☆

ایک ہفتے کے بعد وہ اسے اسپتال سے گھر لے کر جا رہا تھا۔ دل بے حد بھاری ہو رہا تھا۔ اپنے بچے سے جدائی کے احساس کے ساتھ ساتھ اس راز کا بھی بوجھ تھا کہ آئندہ رینا کے ماں بننے کے امکانات بہت کم ہیں۔

رینا کے آنسو سارے راستے خشک نہ ہوئے۔

"بس کریں میڈم! طبیعت خراب ہو جائے گی۔" شاہدہ کسی رٹو طوطے کی طرح بار بار ایک جملہ دہرائے جا رہی تھی۔

"تم چپ کرو خدا کے لیے۔" اصغر نے چڑ کے اسے ڈپٹا۔ کسی نہ کسی طرح بھڑاس تو نکالنا ہی تھا۔

"اسے چپ کراؤ... اس کالی زبان والی چڑیل کو چپ نہ کراتا۔ اسی نے نحوست پھیلائی تھی۔ یاد نہیں کیسے اس

دن سفید چادر میں بچھا کے سوگ منانے بیٹھی تھی' جادو کرتی ہے ڈائن۔ پتا نہیں رات بھر جاگ جاگ کے منتر پھونکتی رہتی ہے۔ اصغر بے گاڑی روکو' مجھے وہاں نہیں جانا۔ میں کہہ رہی ہوں گاڑی روکو۔" وہ چلائی۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو منا! وہ تمہارا گھر ہے' وہاں نہیں جاؤ گی تو کہاں جاؤ گی۔"

"کسی اندھے کنوئیں میں چھلانگ مار دوں گی مگر وہاں نہیں جاؤں گی' جہاں تمہاری بھتیجی بھن کا سایہ ہے۔ گھر نہیں ہے' تمہارے ماں باپ کی روحوں کا آسیب زدہ کھنڈر ہے۔ مجھے وہاں نہیں جانا۔ ایک ایک کر کے مرتے جا رہے ہیں' سب ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ میرا ابھی بھی۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"ایک دن میں بھی مر جاؤں گی' مجھے نہیں مرنا اصغر! مجھے وہاں لے کر مت جاؤ۔"

اصغر گاڑی سڑک کے ایک جانب روک کر سر تھام کے بیٹھ گیا۔

⊛ ⊛ ⊛

"منزو! میرے کپڑے نکال دو۔"

"کھانا ابھی مت لانا' بھوک نہیں ہے۔"

"وشمہ کہاں ہے؟"

"تمہیں کسی چیز کی ضرورت تو نہیں؟"

"اماں کا خیال رکھا کرو' انہیں شوگر ہے۔ میٹھا مت کھانے دیا کرو۔"

یہ تھے وہ چند مخصوص جملے جو ان ڈیڑھ دو ماہ میں نوید مراد نے اس سے وقتاً فوقتاً دہرائے تھے' کچھ چند سوالات۔ چند ہدایات۔

اور ان کے جواب بھی وہ جس حد تک مختصر الفاظ میں دے سکتی تھی' اس نے دیے تھے۔

"جی۔"

"نہیں۔"

"اچھا جی۔"

سوہا کے یہاں آنے کے بعد کم از کم وہ اس غیر یقینی کیفیت سے تو باہر نکل آئی تھی کہ آیا وہ بھی سوہا سے اس طرح مل پائے گی یا نہیں جیسے ایک ماں پورے حق سے اپنی اولاد سے ملا کرتی ہے۔ اسے اس خیال سے ہی وحشت ہونے لگتی تھی کہ اب میکے جانے پر وہ ایک مہمان کی حیثیت سے اس سے ملا کرے گی۔ اور وہ بھی کبھی کبھار۔ اسے ڈر لگتا تھا کہ ایسے تو کچھ ہی عرصے میں سوہا کے دل سے ماں کی وہ کشش ختم ہو جائے گی جو ایک بچے کے دل میں ہوتی ہے۔ رفتہ رفتہ وہ اس کے بغیر رہنا سیکھ جائے گی۔ بالکل ایسے ہی جیسے وہ مظہر کے بغیر رہنا سیکھ گئی تھی۔

"تو کیا سوہا اب باپ کے بعد ماں کو بھی کھونے والی ہے؟"

یہ خیال اسے لرزا دیتا تھا مگر جب سے نوید نے سوہا کو ایک بن مانگے تحفے کی طرح لا کر اس کی گود میں ڈالا تھا وہ ہلکی پھلکی ہو گئی تھی۔ اس کے دل میں اس شخص کے لیے ایک خاص طرح کے جذبات پیدا ہو گئے تھے جو ایک مجبوری کا بندھن لیے اس کی زندگی میں شامل ہوا تھا۔

مگر یہ جذبات محبت یا انسیت کے نہیں تھے' احسان مندی کے تھے اور اسی احسان مندی کے جذبے سے مغلوب ہو کے وہ شعوری اور غیر شعوری طریقے سے وشمہ کو وہ توجہ دینے لگی تھی جس کے بارے میں اس کا خیال تھا کہ وہ علاوہ سوہا کے کسی اور کو نہیں دے سکتی۔

وشمہ بھی شاید محبت اور پیار کو ترسی ہوئی تھی' چند ہی دنوں میں اس سے مانوس ہو گئی۔ وہ عمر کے اس دور میں تھی جب بچے کو سگے سوتیلے' اپنے پرائے کی پہچان نہیں ہوتی' اس نے ماں کا سایہ تک محسوس نہ کیا تھا' اسے بتا دیا گیا کہ یہ تمہاری ماما ہیں اور اس نے دل و جان سے مان لیا۔ وہ منزو سے اتنی چپکی رہتی کہ کبھی کبھی منزو کو

گھبراہٹ ہونے لگتی تھی۔ البتہ نوید اس صورت حال سے بے حد مطمئن تھا۔ اور اپنی بیٹی کو نئی ماں کے گرد منڈلاتے اور زبردستی لاڈ اٹھواتے دیکھ کر تسکین حاصل کرتا رہتا۔

"ماما سے کھانا کھاؤں گی۔"

"ماما سے کپڑے۔"

"ماما! پانی پلا دیں پلیز۔"

"ماما" کے نام کی تسبیح پڑھتی رہتی۔ اور وہ نہال ہو تا رہتا۔ دل میں جو ہلکا سا خدشہ تھا' وہ نکل چکا تھا۔ خوامخواہ کا رویہ سوہا کے ساتھ نارمل تھا۔ نہ بہت حد خشک اور نہ نثار ہو جانے والا۔ شاید اس کی بڑی وجہ سوہا کی ہی طبیعت تھی جو اس سے الگ الگ رو زرد رہتی۔ یہ اس کے مزاج میں بھی شامل تھا۔

منزو نے سسرال میں ——— بیوی کے سال بہت پھونک پھونک کر گزارے تھے۔ باوجود نصرت کی حوصلہ افزائی کے اس نے صرف رینا کے خوف سے سوہا کو سمیٹ سمیٹ کر رکھا کہ کہیں اس کا بے ضرر وجود اسے نہ کھٹکے۔ اگرچہ اصغر بھتیجی کو بے حد چاہتا تھا مگر اس نے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ سوہا اس محبت کی عادی نہ ہو جائے اور رینا چچا بھتیجی کی اس محبت کو برداشت نہ کر سکے۔ اگرچہ اس کی تمام تر کوششوں کے باوجود رینا وہ کر کے رہی جس کا اندیشہ منزو کو تھا۔ مگر ان سب کا اثر سوہا پہ یہ ہوا کہ وہ سوائے ماں کے کسی اور کے قریب نہ ہو سکی۔

ماموں کے گھر آنے کے بعد بھی نہیں اور نوید مراد کو وہ ویسے بھی سہمی نظروں سے دیکھتی رہتی تھی۔ اسے یہ شخص اچھا نہیں لگتا تھا جو اس کی ماما کو اپنے گھر لے آیا تھا۔ اور وہ بھی اس سے چوری چوری' چھپا کے' اور پھر اسی وجہ سے اسے بھی یہاں آنا پڑا۔

حالانکہ یہ گھر اسے ذرا پسند نہ تھا۔ جہاں اس کی ماما صرف اس کے ساتھ ایک الگ کمرے میں نہیں رہتی تھیں۔ اس کی ماما اس انکل کے ساتھ رہتی تھیں اور اسے ان بوڑھی غصیلی سی آنٹی کے ساتھ کمرے میں رہنا پڑتا تھا جو اسے سخت برا لگتا تھا۔

گندا سا کمرہ' اور گندی سی بوڑھی آنٹی۔ جس کے بارے میں ماما نے کہا تھا کہ انہیں دادو کہنا ہے۔ مگر جب پہلی بار اس نے انہیں دادو کہا تھا تو وہ تیز لہجے میں برس پڑی تھیں۔

"پرائی مسے' آئی وڈی دادو کہنے والی۔ تیری دادی کو کب کے کیڑے پڑ چکے ہیں۔ میں کہاں سے تیری دادی ہوگئی۔ نویں نویں پیار رشتے۔ میں تو اک نوں بیاہ کے لائی تھی۔ ادھر پوری جنج نے رشتے داری باندھ لی۔"

وہ سہم کے دیوار سے لگ گئی۔ اس کمرے میں وہ بچی بھی رہتی تھی۔ وشمہ' بڑی پیاری۔ بالکل گڑیا سی۔ اسے دور سے دیکھنے پہ اچھی لگتی تھی مگر پھر اسے جلد ہی اس سے نفرت سی محسوس ہونے لگی۔ وہ سارا دن اس کی ماما سے چپکی رہتی تھی۔ ان پہ حق جتاتی تھی' کبھی کبھی اسے سخت غصہ آتا۔

"ماما! اسے اتاریں گود سے۔ پرے پھینکیں۔"

اس کی ماما گھبرا کے ادھر ادھر دیکھنے لگتیں۔ اس کے منہ پہ ہاتھ رکھ کے چپ رہنے کا اشارہ کرتیں۔

"مجھے بھی پیار کریں ناں۔" وہ فرمائش کرتی۔

ماما جھک کے فوراً اس کے ماتھے پہ پیار کرتیں۔ اس کی تسلی پھر بھی نہ ہوتی۔

"اسے اتار کے۔"

اسے ذرا اچھا نہ لگتا کہ ماما پیار تو اسے کر رہی ہیں۔ مگر سینے سے اس بچی کو لگا رکھا ہے۔ سوہا کا یہ حکم سن کر وشمہ مارے ضد کے منزو سے اور بھی زور سے لپٹ جاتی۔

"ماما! اسے اتاریں گود سے۔ مجھے لیں۔"

"اتنی بڑی ہو گئی ہو سوہا۔" انہی اطلاع ملتی۔

"اتنی بڑی کیا' میں نے گودی آنا ہے۔ نہیں تو اسے بھی اتاریں۔ یہ بھی بڑی ہے۔"

مگر ماما اس کی باتوں پہ گھبرا جاتیں۔ ڈر کے ادھر ادھر دیکھتیں کہ کسی نے سن تو نہیں لیا۔ ایک تو وہ ہر وقت ماما کو گھورتی رہتی تھی۔ اسے لگتا ماما وشمہ کو گود سے اتارنا تو چاہتی ہیں مگر ڈرتی ہیں۔ شاید یہ ہی ہے۔

جب اس کا دل چاہتا تھا کہ اس گندے کمرے والی گندی آنٹی کو زور زور سے مارے۔

"ایسا وہ کر نہیں سکتی تھی... مگر ایک دن اس نے اپنی طرف سے اس کا توڑ نکال ہی لیا۔

□ □ □
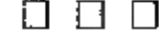
"آپ آملیٹ لیں گے یا فرائی انڈہ؟"

اس نے ناشتے کے لیے بیٹھتے نوید مراد سے پوچھا۔

اس سے پہلے شمشاد بیگم بول اٹھی۔

"اب جب وہ کرسی پہ بیٹھ گیا ہے تو پوچھ رہی ہے۔ میں نے تو سنا تھا کالجوں میں پڑھی لڑکیاں بڑی سیانی ہیں۔ پر تجھے اتنی عقل نہیں کہ کیا کھانا ہے کیا پینا ہے۔ یہ پہلے پوچھنے والی باتیں ہوتی ہیں۔ اب تو یہ انتظار کرتا رہے گا۔"

"اماں! ایک انڈہ فرائی ہونے میں کتنی دیر لگے گی بھلا..."

نوید نے ماں کا اعتراض ختم کرنا چاہا۔ مگر اسے نہیں پتہ تھا کہ وہ بحث کا آغاز کر رہا ہے۔

"ہاں اب بیوی کا خیال کر کے کہہ دیا... چاہے دل آملیٹ پراٹھا کھانے کو کر رہا ہو مگر اسے سکھ دینے کے لیے انڈہ ڈبل روٹی کھائے گا۔"

"اگر آپ نے آملیٹ کھانا ہے تو بتا دیں... دیر نہیں لگے گی۔ میں نے پیاز وغیرہ کاٹ کے رکھی ہے۔ صرف انڈا ڈال کے پھینٹنا ہے۔" منزہ نے شمشاد کو نظرانداز کرتے ہوئے براہ راست نوید سے کہا۔ یہ بات شمشاد بیگم کو لگ گئی۔

"بڑا کام کیا ہے... اگر اس نے آملیٹ نہ کھایا تو پیاز تو ضائع ہو گئی ناں... اتنی مہنگی پیاز ہے۔"

"وہ دوپہر کا کھانا بنانے کے کام آ جائے گی۔"

منزہ کے ترنت دیے جواب پہ... اور خاص طور پہ جواب دیتے ہی کچن کی طرف مڑ جانے نے تو اسے گویا آگ ہی لگا دی۔

"دیکھی ہے اس کی زبان... مرجانی... کمینی... ذلیل۔"

سوہا نے تڑپ کے اسے دیکھا۔

گندے کمرے والی گندی بوڑھی آنٹی کی عادتیں بھی گندی تھیں اور باتیں بھی۔

"بس بھی کرو اماں! کیا صبح صبح..." نوید بدمزگی سے بڑبڑایا۔

منزہ نے خاموشی سے ناشتہ لا کر اس کے سامنے رکھا۔

"ابلا انڈا کس کے لیے ہے؟" شمشاد بیگم کی تیز نظروں نے ناشتے کا جائزہ لیا۔

"وہ... سوہا کے لیے..." منزہ نے چور لہجے میں آہستہ سے کہا۔

"یہ چار انڈوں کا آملیٹ بنا تو ہے... ابالنے کی کیا ضرورت تھی؟"

"کیا ہو گیا ہے اماں آپ کو... ایک انڈہ ہی تو ہے۔"

نوید کے ماتھے پہ واضح شکنیں نمودار ہوئیں۔ یہی بات منزہ کو سہارا دیتی تھی کہ کم از کم اس کا دل سوہا کے لیے تنگ نہیں ہے۔ مگر شمشاد بیگم کی باتیں برداشت کرنا بھی کبھی کبھی حد سے باہر لگنے لگتا تھا۔

"بات ایک انڈے کی نہیں ہے نوید ے! انصاف کی ہے۔ اللہ رکھے ہمارے گھر میں رزق کی کمی نہیں! چھوڑ دس یتیموں کو بٹھا کر کھلا سکتے ہیں۔"

اس کی یہ بات منزہ کے دل میں تیر کی طرح لگی۔ مگر نوید نے اس پہ بھی ایسا ہی رد عمل ظاہر کیا جیسا ماں کی...

...کر کا جواب یعنی چند پاکو اور پستیں اور بس۔

...دانتوں پہ مظہر تو نہیں جو مجھے تپنے والے دکھ پہ پاگل ہو جائے اور دکھ پہنچانے والے پہ پل پڑے... میرے ...پاس سے ...پانی دیواریں کے کھڑا ہو جائے۔ نفرت اور غم کے زہریلے سے زہریلے فقرے بھی مجھ تک پہنچتے پہنچتے ... سے ...ملکے ہو جاتے تھے۔ کیونکہ ان سے نمٹنے کے لیے مظہر جو تھا۔"

...مظہر کے نہ ہونے کے احساس نے اس پہ حاوی ہونا چاہا۔ اس بار وہ اس خیال کو کسی ممنوعہ چیز کی طرح ... ایک بار پھر ... جھٹک نہ سکی۔

"...بیٹیں جدھر انصاف نہ ہو، ادھر تو شمشاد بولے گی۔ چھیڑ چھاڑ کر بولے گی۔ اگر اس نے اپنی بیٹی کے لیے انڈہ ... لیے بھی ابالا ہے، اس کا زیادہ حق بنتا ہے۔"

نوید بے زاری سے آخری لقمہ کھاتے ہی اٹھ گیا۔

"یا اللہ... اتنی چھوٹی سوچ؟"

اس نے بے بسی سے سوچا اور وضاحت پیش کی۔

"وشمہ ابلا ہوا انڈہ نہیں کھاتی۔"

"تجھے زیادہ پتہ ہے؟ کھاتی ہے وہ... میں خود کھلاتی رہی ہوں۔" شمشاد سے اپنی بات رد کیے جانا برداشت نہ ہوا۔

"مگر میں نے کئی بار دیا اس نے کھانے سے انکار کر دیا۔"

"پیار سے دیتی ناں، مگر تو کیوں پیار سے دے گی؟ پیار تو سارا سگی کے لیے بچا رکھا ہے۔ سوتیلی کے پلے کیا ہے؟"

نوید اب اپنی چابیاں اور والٹ اٹھا چکا تھا۔

"پیار سے کھلائے ماں... تو بچے سوکھی روٹی بھی کھا لیتے ہیں۔ تیرے ہاتھوں سے نہیں کھایا ہو گا اس نے۔ میرے تو کھا لیتی ہے۔"

اب نوید بغیر کسی کو سلام کیے گھر سے نکل رہا تھا۔

منزہ کو یہ کمزور سہارا بھی دور جاتے دیکھ کے اپنا آپ اکیلا پڑتا محسوس ہوا۔ پھر اس نے اکیلے ہی مزاحمت کا سوچا۔

"وہ میرے ہی ہاتھوں کا آملیٹ کھا لیتی ہے... اور بڑے شوق سے کھا لیتی ہے۔"

"جا بڑی آئی..." شمشاد کو فوری طور پر کوئی جواب نہ سوجھا تو صرف یہ خطاب دے سکی۔

سوہا نے غصے سے گھور کر دیکھا تو کچن میں جاتی منزہ کی پشت کو کینہ توز نظروں سے گھورتی شمشاد کی شکل اسے عجیب سی لگی۔

وہ کہانیوں کی کتابوں میں چھپی چڑیل کی تصویر جیسی لگ رہی تھی۔ سوہا کو یہ سوچ کر ہی ہنسی آ گئی۔

"ماما کو چڑیل کہہ رہی ہے اور خود ہینسل اور گریٹل کو پکڑ کر قید کرنے والی چڑیل جیسی ہے۔"

وہ یہ سوچ کر مزے لے رہی تھی اور شمشاد بڑبڑا رہی تھی۔

"زمانہ بھگت کے آئی ہے۔ چالاک کیوں نہ ہو گی... جوان جہان خصم کھا کے بیٹھی ہے۔ تگڑی تو ہو گی۔ خیر شمشاد نے بھی کم زمانہ نہیں بھگتا۔ تیرے جیسوں کو آگے لگانا بڑی اچھی طرح آتا ہے۔ سارے کس بل نکال دوں گی۔"

پھر اس نے بیٹھے بیٹھے ہنستی سوہا کو گھورا۔

"تجھے کس بات پہ ... نکالوں گی اور تیری چھوکری کے دانت..."

سوہا نے سہم کر سر جھکا لیا۔

"چل ٹھونس یہ انڈا... ہنستی کیوں ہے؟ باپ کا مال ہے اڑا..."

شمشاد نے اس پہ بھڑاس نکالی۔

سوہا نے ڈرتے ڈرتے انڈا کھانا چاہا مگر وہ اس کے حلق میں پھنس کے رہ گیا۔ وہ ہمیشہ زیادہ دودھ والی چائے کے ساتھ ابلا انڈہ ناشتے میں لیتی تھی۔ سو اب چائے کے بغیر انڈہ حلق سے نیچے اترتی نہیں رہا تھا اور چائے ابھی تک آئی نہیں تھی۔

"ماما۔" منہ میں رکھے انڈے کے ساتھ بے حد کمزور سی آواز کے ساتھ اس نے ماں کو پکارنا چاہا مگر یہ آواز اس کے اپنے کانوں تک بمشکل پہنچی۔

"پاپا!" اس بار اس نے ذرا بلند آواز میں پکارا۔ وہ منزہ کو بلا رہی تھی۔ مگر اس کی خوفزدہ نگاہیں سامنے بیٹھی شمشاد پہ ٹکی تھیں۔

"ماما... ماما..."

اس بار ابھرنے والی یہ آواز بے حد واضح اور بلند تھی مگر یہ آواز سوہا کی نہیں۔ وشمہ کی تھی۔

وہ جاگتے ہی منزہ کو پکارتے ہوئے کمرے سے نکلی تھی۔

"دادی صدقے ادھر آسو بچے۔"

شمشاد نے اسے ساتھ لپٹانا چاہا مگر وہ مچل کے اس کی گرفت سے نکلی۔

"ماما پاس جانا ہے۔"

"جا مر پھر۔" شمشاد نے خفت سے دوچار ہوتے ہوئے آہستہ سے کہا تو سوہا کو بے حد لطف آیا۔ وشمہ گرتے گرتے بچی تھی۔

اسی اثنا میں منزہ سوہا کے لیے چائے لے کر کچن سے نکلی تو وشمہ کو بسورتے دیکھا۔

"ارے کیا ہوا وشمہ؟"

"تیری جان کو رو رہی ہے کب سے۔ آواز نہیں آئی تجھے؟ ہاں "آتی کیسے؟ سگی اولاد تو تھوڑا ہی ہے۔"

منزہ ساس کی بات نظر انداز کرتی وشمہ کو چپ کرانے لگی۔

"دادو نے گرایا ہے۔" اس نے روتے ہوئے بتایا تو منزہ نے حیرت سے دیکھا۔

شمشاد بیگم تڑپ اٹھی۔

"ہائے ہائے... میں کیوں گرانے لگی۔ توبہ ذرا سی چھوکری اور سگی دادی پہ الزام دھرتی ہے۔"

لفظ "سگی" تو جیسے اس کی زبان پہ دھرا رہتا تھا۔

"سب اس نئی آنے والی کی تربیت ہے۔ اس کی تربیت اور اس کی لڑکی کی صحبت... ورنہ چھوٹی سی بچی یہ چالاکیاں کیا جانے 'ہائے نوید! تیری ہی اولاد تیری ماں کے خلاف کر دی اس عورت نے۔" وہ واویلا مچاتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"پروین کو بتاتی ہوں 'اس کی ضد نے کیا رنگ دکھایا ہے۔ بڑا شوق تھا اسے نئی بھرجائی لانے کا خود نمٹے اب آکر۔"

وہ پروین کو فون کرنے اٹھی اور منزہ کا دل گھبرانے لگا۔ پروین کے ساتھ گزشتہ دو چار ملاقاتیں خاص خوشگوار نہیں تھیں۔ اب بھی اگر وہ ماں کے بلانے پہ آ جاتی تو...

بجھے دل کے ساتھ وہ دوپہر کے کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

سوہا نے ناشتہ ختم کیا اور شمشاد کے کمرے کی طرف دیکھا۔ وہ فون کان سے لگائے اونچی آواز میں پروین سے باتیں کر رہی تھی۔ پھر اس نے گردن موڑ کے منزہ کو دیکھا جسے وشمہ نے مسلسل باتوں میں الجھا رکھا تھا اور وہ اب بھی کچن کے قریب پڑی ٹیبل پہ پڑا ناشتہ سامنے رکھے بیٹھی تھی اور ضد کر رہی تھی کہ منزہ ہی ہر نوالہ اس کے منہ میں ڈالے۔ منزہ کام کے دوران اس کی یہ ضد بھی پوری کر رہی تھی۔

اور سوہا کو پتا تھا کہ عادت کے مطابق شمشاد جیسے ہی فون سے فارغ ہو گی پھر اس کی ماما کے سر پہ سوار ہو جائے گی اور الٹی سیدھی باتیں کرے گی جنہیں سن کر ماما کی آنکھوں میں آنسو آ جائیں گے۔

کچھ سوچتے ہوئے وہ اٹھی اور شمشاد کے کمرے کے ادھ کھلے دروازے کو آہستگی سے پورا بند کیا اور باہر سے کنڈی لگا دی۔ اونچی آواز میں باتیں کرنے 'یا دوسرے الفاظ میں منزہ نامہ بیان کرنے میں مگن شمشاد کو قطعی پتہ نہ چلا۔ سوہا چپکے سے اپنی جگہ پہ آ کے بیٹھ گئی۔

"اچھا وشمہ کا خیال رکھنا میں دھلے کپڑے اوپر چھت پہ پھیلانے جا رہی ہوں۔"

منزہ دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے اوپر چل گئی۔ جو صبح ناشتے سے بھی پہلے دھو کر رکھے تھے۔ مگر انہیں پھیلانے کے لیے تیسری منزل پہ جانا پڑتا تھا اس لیے وہ کچن کے کاموں سے فراغت کا انتظار کر رہی تھی۔

ٹھنڈی چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہی سوہا نے شمشاد کے کمرے کے دروازے کو ایک جھٹکا لگتے دیکھا۔ اور پھر زوردار طریقے سے ایک اور جھٹکا...

"آؤ کمرے میں چل کے کھیلیں۔"

سوہا نے وشمہ کی انگلی پکڑ کے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

اب دروازہ زور زور سے کھٹکھٹایا جا رہا تھا اور وشمہ اپنی بڑی بڑی حیران آنکھوں سے خود سے تین سال بڑی سوہا کو دیکھ رہی تھی۔ جس کے ساتھ کھیلنے کو اس کا دل تو بہت چاہتا تھا مگر اس سے ڈر بھی بہت لگتا تھا۔ کیونکہ وہ منہ تو اسے پیار کرتی تھی نہ اس کے بلانے پہ اس کے کسی کھیل میں حصہ لیتی تھی۔

"دروازہ کھولو... کس مرجانے نے کنڈی لگائی ہے۔ کھولو دروازہ۔" اب اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

وشمہ نے کمرے میں جاتے جاتے مڑ کے دیکھا۔

"دادو..." اس نے کہنا چاہا مگر سوہا نے اسے اندر کھینچ کر جلدی سے دروازہ بند کر لیا۔

"غضب... مر گئے ہو سارے کے سارے 'مجھے اندر بند کر کے کون سا یار گھسا لیا ہے تو نے... او لوگو! دیکھو نکالو مجھے یہاں سے۔"

دہائیاں دیتی رہی 'تیسری منزل کی چھت پہ موجود منزہ کو اس کی ہلکی ہلکی آواز تو آ رہی تھی مگر اس نے خاص توجہ اس لیے نہیں دی کہ شمشاد عام طور پہ اتنی ہی اونچی آواز میں باتیں کرتی تھی۔ اس نے سوچا 'بچیاں مل کے کھیل رہی ہیں۔ ان کے شور سے تنگ آ کر بول رہی ہو گی۔ مگر جب اس کے ساتھ ساتھ دروازہ پیٹنے اور چیزیں گرنے کی آوازیں تواتر سے بھی شروع ہو گئیں تو وہ تشویش میں مبتلا ہو گئی۔

"اللہ خیر... کہیں غصے سے پاگل تو نہیں ہو گئی۔"

اس نے یہ سوچا اور باقی کے کپڑے وہیں چھوڑ کر سیڑھیوں کی طرف بھاگی۔

"کہیں سوہا کو تو نہیں پیٹنا شروع کر دیا۔"

ایک اور خیال نے اس کی رفتار مزید تیز کی مگر اس کے نیچے پہنچنے تک شمشاد کمرے کی چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پہ مارنے کے ساتھ پروین اور نوید دونوں کو فون کر چکی تھی اور اپنے کمرے میں بند کیے جانے کا سانحہ رو رو کر سنا چکی تھی۔

منزہ بجلی کی سی تیزی کے ساتھ شمشاد کے کمرے کی جانب بڑھی اور دروازے پہ نظر پڑتے ہی جیسے پتھر کی مانند ساکت ہو گئی۔ اس نے ایک نظر سامنے والے کمرے پہ ڈالی جس کا دروازہ بھی بند تھا۔ اور پھر گہری سانس لیتے ہوئے کنڈی کھولنے لگی۔ یہ جانتے ہوئے کہ دروازہ کھلتے ہی سیلاب کا رخ اس کی جانب ہو جائے گا اور کوئی عجب نہیں کہ دروازے پہ ماری جانے والی چیزوں کا ہدف اب وہ ہو۔

اس بار شاید کوئی بھاری چیز شمشاد نے اٹھا کر دروازے پہ ماری تھی۔ کوئی کرسی یا چھوٹی میز وغیرہ اور اس سے اگلے ہی لمحے منزہ نے دروازہ کھول دیا۔

بکھرے بالوں کے ساتھ ہانپتی کانپتی شمشاد بیگم اپنی لال آنکھوں سمیت اس کے سامنے تھی۔

"تیری یہ ہمت۔"

☆ ☆ ☆

"دیکھو اصغر! کتنے پیارے کپڑے ہیں۔ نرم و ملائم۔"

وہ ننھی ننھی فراکوں اور پاجامہ سوٹس پہ پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"رکھ دو انہیں رینا! کیوں بار بار دکھی ہوتی ہو اور مجھے بھی کرتی ہو۔"

اصغر کو واقعی بے حد تکلیف ہو رہی تھی۔

"سارے کہتے تھے کہ الٹرا ساؤنڈ کرالو۔ پتہ چل جائے۔ لڑکا ہے یا لڑکی پھر کپڑے وغیرہ خریدنا ... ایسے ضائع کرو گی تم میں نے بھی کہا ... بچے پیسے خرچ ہوتے ہیں 'ضائع' نہیں ہوتے۔ ہمارے پاس ہے پیسہ تو نہ لیں چیزیں ... اور میں نہیں کروائی الٹرا ساؤنڈ 'کتنا مزہ آئے گا جب ڈاکٹر بتائے گا کہ مبارک ہو مسز بھٹی آپ کے ہاں بیٹا ہوا ہے ... یا مبارک ہو' پیاری سی بیٹی ہوئی ہے۔ ہے ناں اصغر ... سسپنس میں بھی کتنا مزہ ہے ویسے اصغر! تمہیں بیٹا چاہیے کہ بیٹی؟"

جواب میں اصغر نے اسے ایسی نظروں سے دیکھا کہ وہ پلکیں جھپک کے اپنے آنسو پینے لگی۔ پھر آگے ہو کے خود پہ قابو پاتے ہوئے کہنے لگی۔

"میں تو بھول ہی گئی ... وہ بیٹا تھا ہمارا ... ہاں ... پتہ چل تو گیا تھا ... مگر تب جب وہ نہ رہا ... مجھے ڈاکٹر نے یہ نہیں کہا کہ مبارک ہو آپ کو بیٹا ہوا ہے' بلکہ ... بلکہ یہ کہا کہ آپ کا بیٹا ..."

اس کی آواز پھر کپکپا گئی۔

اصغر نے پہلی بار اسے اتنا ٹوٹتا ہوا دیکھا تھا۔ اور اس سے دیکھا نہ جا رہا تھا۔ بہرحال اس نے رینا کو دلاسا دینا چاہا تھا۔

"اچھا چھوڑو ... یہ بتاؤ ..." اس نے پلکوں پہ آئے آنسو پھر پیچھے دھکیلے۔

"اب تمہیں بیٹا چاہیے یا بیٹی؟"

"اب ...؟" اصغر نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"ہاں اب ... دوبارہ ... اگلی بار ..." وہ مسکرائی۔

"بتاؤ ناں اس بار تمہیں بیٹا چاہیے یا بیٹی؟"

"چھوڑو یہ باتیں رینا ... میرے لیے تم کافی ہو۔"

اصغر نے اس کے ہاتھ لبوں سے لگا لیے۔

"چل جھوٹے کیا میں نہیں جانتی تمہیں بچے کتنے اچھے لگتے ہیں۔ اپنے بھائی کی بیٹی سے کتنا پیار کرتے تھے کیسے گود میں اٹھا کے چومتے چاٹتے رہتے تھے۔ اب بھی اکثر اسے یاد کرتے ہو۔"

"وہ تو بس بھائی کی اولاد جو ہوئی۔ اپنا خون ..."

"تو پھر اپنی اولاد سے کتنا کرو گے ... میرا تو دل چاہتا ہے میرے دو بیٹے اور دو بیٹیاں ہوں' ہر ایک کو بھائی بھی اور بہن بھی۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہوئے تو ہماری تو بیٹے اور بیٹی دونوں کی خواہش پوری ہو جائے گی۔ تمہارے اکلوتے بیٹے اور اکلوتی بیٹی کو ..."

"رینا! کوئی اور بات کرتے ہیں۔ چلو گھومنے چلیں۔ یا پھر کافی دن سے تم نے مارکیٹ کا چکر نہیں لگایا؟ شاپنگ کرا لاتا ہوں تمہیں۔"

"نہیں بہت کر لی شاپنگ ... پچھلے تین چار مہینے تک میں نے پاگلوں کی طرح شاپنگ کرنے کے علاوہ اور کیا کیا ہے ... بچے کے لیے سیٹ کرنے والا کمرہ میں نے اوپر تک بھر کے رکھ دیا۔ بے بی فرنیچر' کپڑے' کھلونے ... اصغر وہ سامان کب تک ایسا پڑا رہے گا؟"

آخر میں اس کے لہجے میں منت اتر آئی۔

"نہیں کچھ دیر اور بس ... ابھی ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تم بہت کمزور ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں اصغر۔"

"ڈاکٹر کو زیادہ پتہ ہے یا تمہیں؟"

"پتہ ہے کیا اصغر! مجھے بچوں کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ نہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ ان کو پیدا کرنے اور پالنے کے خیال [illegible] لگتے تھے۔ مگر اس ننھی جان نے میرے اندر چند مہینے رہ کے میری ممتا جگا دی ہے۔ اب مجھ سے اور انتظار نہیں ہوتا۔ مجھے اس گود میں کوئی چاہیے۔" وہ رونے لگی۔

اصغر عجیب بے بسی سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"ان کپڑوں کو پہننے والا کب آئے گا۔ اس جھولے میں سونے والا کب آئے گا اصغر؟"

اصغر نے رینا کے سوال کے جواب میں کوئی جھوٹی تسلی دینے کی بھی ہمت نہ کی۔ بس اس کے ہاتھ سہلاتا رہا۔

"یہ دیکھو ... پنک فراک ... اور یہ بلیو سوٹ ... بیٹے کے لیے بھی سب کچھ تیار ہے اور بیٹی کے لیے بھی۔ میری طرف سے تیاری مکمل ہے۔ بس جو بھی آ جائے۔"

وہ پھر گود میں پڑے کپڑے سینے سے بھینچ کر خواب بننے لگی۔

اصغر نے نگاہیں چھت پہ جما دیں۔

اس بڑے سے گھر میں اس وقت وہ دونوں اکیلے تھے اور ساتھ والا کمرہ جو رینا نے بڑے ارمانوں سے اپنے آنے والے بچے کے لیے سجایا تھا۔ وہ اس سے بھی زیادہ اکیلا تھا۔ اپنے اندر بھرے قیمتی اور امپورٹڈ سامان کی بھرمار کے باوجود۔

رینا نے یہ گھر اپنی اولاد کے لیے ہی خالی کرایا تھا۔ اور آج ... آج وہ اس کی اولاد سے ہی خالی تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ ہی تھی ... اس کی شکل دیکھو ذرا ... فساد لکھا ہے اس کے دیدوں میں۔"

شمشاد بیگم کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ سوہا پہ پل پڑے۔ اگر نوید سامنے نہ ہوتا تو اب تک وہ اس کے چیتھڑے اڑا چکی ہوتی۔ اس کے آنے سے پہلے وہ ایک آدھ کرارا ہاتھ جڑ بھی چکی تھی۔ مگر پھر منزہ نے اسے اسٹور میں بند کر دیا اور اکیلی ہی ساس کا سامنا کرتی رہی۔

سوہا کے گال پہ اب تک شمشاد کے بھاری ہاتھ کا نشان تھا۔ وہ منزہ کے پیچھے چھپی تھی۔ سارے وحشت کے اس کے منہ سے ایک سسکی تک نہ نکلی تھی۔

"اماں ... بچی ہی تو ہے ... شرارت میں آ کر ..."

نوید نے سو ویں بار ایک ہی بات کہنا چاہی اور شمشاد نے اس بار بھی پوری بات سننے سے انکار کر دیا۔

"بچی؟ بس نہ کر ... کیسی بچی ... شیطان کی بچی ہے یہ ... اس کی شکل پہ ہی لعنت برس رہی ہے۔ جوتیاں لگانے کو دل چاہتا ہے اس کے بوتھے پہ ..."

منزہ کا دل چاہ رہا تھا وہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لے۔ یا کم از کم سوہا کی سماعت ہی کچھ دیر کے لیے معطل ہو جائے۔

اس نے پچھلے چھ سالوں میں ایک بار بھی ایسے تلخ الفاظ اس تک نہ پہنچنے دیے تھے۔ اور اب ایک غیر عورت چیخ چیخ کر حلق سے مسلسل اس پہ پتھر برسا رہی تھی۔

منزہ نے کسی آس پہ نوید مراد کے چہرے کی جانب دیکھا جو خود بھی اس صورت حال سے ناخوش اور آزردہ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے سے واضح ناگواری جھلک رہی تھی۔ مگر دکھ کا ہلکا سا بھی شائبہ نہ تھا۔ ایسے ہی ہوتا ہے خود سے وابستہ کسی عزیز ہستی کے بارے میں اتنا سب کچھ سننے اور دیکھنے کے بعد ہوتا ہے۔

اس نے خود میدان میں اترنے کا سوچا۔ شمشاد بیگم جیسی عورت کے منہ لگنا نہ اس کی فطرت تھا اور نہ اتنی ہمت تھی مگر اپنی اولاد کی خاطر اسے یہ کرنا ہی تھا۔ سوہا کے بچے بستہ ہاتھوں کی ڈوری سی سخت گرفت جو اسے پشت پہ محسوس ہو رہی تھی اس جسارت پہ مجبور کرنے لگی۔

"اماں جی! وہ ابھی نا سمجھ ہے معصوم بچی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر یا آپ کو تنگ کرنے کے لیے ایسا نہیں کیا۔"

"نہیں۔ اس نے تو مجھے مزہ دینے کے لیے ایسا کیا ہے۔ میری جوتی پہ... اس کی تو..."

وہ ناشائستہ کلمات پہ اتر آئیں۔

"اس کی طرف سے میں معافی مانگ رہی ہوں آپ سے۔"

"تو کیا... یہ خود بھی ناک رگڑے تو میں معاف کرنے والی نہیں۔ شمشاد بیگم نے کبھی کسی کو معاف نہیں کیا۔ سانپ کی فطرت ہے میری۔"

بڑے فخر سے گویا اپنی "خوبی" کا اعلان کر رہی تھیں۔

"بات ختم کرو اماں! مانگ تو لی ہے اس نے معافی... ایک چھوٹی سی بچی کی شرارت کو سر پہ سوار کر لیا ہے۔"

نوید بھی اس بار ذرا بلند آواز میں بولا۔

"تو چپ کر... زن مرید... چھوٹی بچی 'چھوٹی بچی' لگا رکھا ہے۔ اپنی وشمہ بھی تو بچی ہے۔ اس فتنی سے بھی چھوٹی۔ اس نے تو کبھی نہیں ایسی پاگلوں والی شرارت کی۔ یہ بوہتی (بہت) لاڈلی بن رہی ہے۔ ساری ماں کی ہلا شیری ہے۔ یہ سب سکھاتی ہے اسے۔ صرف مجھے تنگ کرنے کے لیے کہ اچھا ہے بڈھی کلپ کلپ کے مر جائے۔"

وہ غصے سے بے حال ہو رہی تھی۔ زیادہ غصہ اس بات پہ تھا کہ نوید بجائے ماں کی طرفداری کرنے کے بیوی کی شکل دیکھ رہا تھا۔

سوہا جو منزہ کے پیچھے چھپی کھڑی تھی اور جھانک جھانک کے انہیں چلاتے دیکھ رہی تھی، اچانک اس کا ڈر ختم ہونے لگا۔ اسے اب شمشاد کی حالت دیکھ کر مزہ آ رہا تھا۔

کتنا اچھا لگ رہا تھا، اس کی ماما کو ستانے والی، انہیں رلانے والی، اب خود رو رہی تھی۔ اسے خود پہ فخر سا محسوس ہوا۔

"دیکھا ماما... کیسا مزہ چکھایا اس بوڑھی جادوگرنی جیسی آنٹی کو... ذرا اب ڈانٹے آپ کو۔"

اس نے چپکے سے سوچا اور بے ساختہ مسکرا دی۔

شومئی قسمت کہ اس کی یہ مسکراہٹ شمشاد بیگم کی نظروں میں آ گئی سو وہ اور بھی بھڑک اٹھیں۔

"دیکھا... دیکھا اسے؟ کیسے دندیاں (دانت) نکال رہی ہے۔ میں نہ کہتی تھی یہ ہے ہی شیطان کی اولاد۔ فساد بھرا ہے اس کے اندر۔ میرے گھر سیاپا ڈال کے چسکے لے رہی ہے۔"

نوید نے مڑ کے دیکھا تب تک سوہا کی مسکراہٹ سہم کر ختم ہو چکی تھی۔

"منزہ! اسے اندر لے جاؤ۔"

نوید کو اس سے بہتر حل کوئی نظر نہ آیا ماں کو چپ کرانے کا۔

"ہاں ہاں لے جاؤ اندر... ورنہ میں چیر پھاڑ کے کھا جاؤں گی۔ میں کہتی ہوں اسے اندر لے جا رہی ہو تو باہر نہ لانا... میرے سامنے مت لانا اسے۔ مجھے شکل نظر نہ آئے اس کمینی کی۔"

وہ دیر تک چلاتی رہی اور کمرے کے اندر سوہا کو سینے سے بھینچے منزہ روتی رہی۔

"ماما!" وشمہ نے اپنے ننھے ہاتھ اس کے گالوں پہ رکھے۔

"ماما! آپ (کیوں) رو رہی ہو؟"

اور پھر کوئی جواب نہ ملنے پہ خود ہی کہا۔

"دادو نے مارا ہے؟"

"ہاں! تمہاری دادو نے... تم بھی گندی، تمہاری دادو بھی گندی۔" ماں کی گود میں چھپی بیٹھی سوہا نے دونوں ہاتھوں سے اسے زور کا دھکا دے کر کہا۔

وشمہ پیچھے کی جانب گر گئی۔ اس کا سر ڈریسنگ ٹیبل سے جا لگا۔

منزہ نے اسے غصے سے گود سے اتار پھینکا اور اونچی آواز میں روتی وشمہ کو لپک کے اٹھا لیا اور پیار کرتے ہوئے چپ کرانے لگی۔

"یہ کیا ہو گیا؟ ایک مسئلہ ختم نہیں ہوا اور یہ... سوہا... کیوں کرنے لگی ہو تم ایسا؟ میری جان تم..."

"کیا ہوا وشمہ کو؟"

نوید مراد کی آواز پہ منزہ کا رنگ فق ہو گیا۔ ماں کو بند کرنے والی حرکت تو وہ پی گیا تھا مگر اپنی بیٹی کو گرانے پہ شاید برداشت نہ کرے۔

"وشمہ... میرا پیارا بیٹا، ماں کی جان، پاپا کو یہ نہیں بتانا کہ آپا نے گرایا ہے... ماما وشمہ کو چاکلیٹ دیں گی۔"

اسے امید تو نہیں تھی کہ ایک ساڑھے تین سال کی بچی اس التجا پہ کان بھی دھرے گی۔ مگر اس نے بچانے کی آخری منت کی تھی۔

"کیوں رو رہی ہے وشمہ؟"

نوید بے تابی سے اندر آیا۔

سوہا غیر ارادی طور پہ ٹانگیں سمیٹ کر بیڈ کے کونے سے جا لگی۔ اس کا رنگ سفید پڑ گیا۔ منزہ نے اس کا رنگ اڑتے دیکھا تو اس کا دل چاہا اس گھر پہ لعنت بھیج کر اسے لے کر یہاں سے نکل جائے۔

"گر گئی تھی؟"

بیٹی کو پیار کرتے ہوئے پوچھ رہا تھا اور منزہ کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا جواب دے۔ اگر ہاں میں جواب دیتی اور وشمہ سچ اگل دیتی تو کیا عزت رہ جاتی اس کی شوہر کے سامنے... فوراً "جھوٹی" ثابت ہو جاتی۔ اور اگر سچ بتا دیتی تو...

"بتاتی کیوں نہیں ہو؟ کیا لگا ہے اس کے سر میں؟"

وہ جھنجلا گیا۔ وشمہ سر پہ ہاتھ رکھ کے رو رہی تھی۔ اس لیے اب وہ اس کے سر کی پشت کو سہلاتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

"ڈریسنگ ٹیبل کا کونا..."

اس سوال کا جواب اس نے محتاط الفاظ میں دے دیا۔

"اوہ! دیکھنا تھا کہ خون وغیرہ تو نہیں نکل آیا ہو۔"

وہ بیٹھ گیا اور گود میں اسے الٹا لٹا کر بال ہٹا کے چیک کرنے لگا۔ منزہ آگے بڑھی اور اچھی طرح دیکھنے کے بعد کہا۔

"نہیں... شکر ہے زیادہ چوٹ نہیں لگی۔"

"بچا! آرام سے کھیلا کرو۔ زیادہ بھاگتے نہیں ہیں میری جان۔" وہ اس کا گال چومتے ہوئے محبت سے کہہ رہا تھا اور منزہ کا دل حلق میں آ رہا تھا کہ وشمہ نجانے اب کیا کہہ دے۔

وشمہ آنسو ہتھیلیوں سے پونچھتے ہوئے معصومیت سے سر ہلاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ "او کے پاپا۔"

منزہ نے ایک سکون بھرا سانس لیا اور وشمہ کو نوید کی گود سے لے کر اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔ چٹاچٹ اس کے رخسار چومتے ہوئے آج شاید سچے دل سے اس سے محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ اس محبت کا جو ایک ماں کو اپنی

اولاد دے ہو سکتی ہے۔ اور ایسا کرتے ہوئے وہ سوہا کو دیکھنا بھول گئی جس کا رنگ پہلے سے زیادہ سفید ہو چکا تھا۔

"سنیے۔" رات سر پہ آن پہنچی تو اسے ایک نئی فکر نے گھیرا۔

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آج....." وہ کہتے کہتے جھجک گئی۔

"کچھ چاہیے؟" نوید نے سوال کیا۔

"نہیں وہ میں کہہ رہی تھی کہ بچیاں روز اماں کے پاس سوتی ہیں۔ مگر آج اماں... میرا مطلب ہے اماں کی طبیعت آج ٹھیک نہیں ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم آج..... صرف آج رات سوہا کو وہاں نہ سلائیں؟"

نوید چند سیکنڈ تک سوچتا رہا۔

"ٹھیک ہے مگر کیا وہ اکیلی سو لے گی؟"

اس سوال نے منزہ کو اور کچھ کہنے کی ہمت ہی نہ کرنے دی۔ وہ اپنی ڈبڈبائی آنکھیں جھکا کر اٹھ گئی اور الماری کھول کے نوید کے صبح کے لیے کپڑے نکالنے لگی۔

وہ کچھ دیر تک سوچتی نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔

"منزہ! میں جانتا ہوں۔ تم کیا کہنا چاہ رہی ہو مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔"

اس نے تڑپ کے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ نظریں صرف سوال نہیں کر رہی تھیں، کچھ جتا بھی رہی تھیں۔ اس کا پہلی ہی رات وشمہ کو اپنے اور اس کے درمیان سلانا۔

اور اس کے علاوہ بھی ان ڈیڑھ ماہ میں وشمہ ضد کر کے اور کبھی طبیعت کی خرابی کی وجہ سے کئی بار ان کے کمرے میں سو چکی تھی۔

"مجھے سوہا کو یہاں سلانے پہ اعتراض نہیں مگر اماں کو ایک اور وجہ مل جائے گی جھگڑے کی۔ ایسا کر کے ہم ان کا غصہ ہی بڑھا سکتے ہیں۔ کیا فائدہ؟" اس نے وضاحت دی۔

"مگر... میں اسے آج ان کے کمرے میں چھوڑ بھی نہیں سکتی۔ انہیں سوہا پہ بہت غصہ ہے۔ کہیں وہ..." پھر وہ چپ ہو گئی۔ کیسے اسے کہتی کہ مجھے تمہاری ماں پہ ذرا بھی اعتبار نہیں اور شاید وہ اپنی ماں کو اس سے زیادہ جانتا تھا اس لیے کچھ نہ بولا۔

"پلیز... بس ایک رات۔"

اس کی خاموشی نے منزہ کو منت کرنے پہ مجبور کیا۔

"بات ایک رات کی نہیں ہے۔" وہ زچ ہو گیا۔

"پھر وشمہ بھی ضد کرے گی۔"

"تو وہ بھی سو جائے پہلے بھی تو اکثر سوتی رہی ہے۔"

"یہ مسئلے کا حل نہیں ہے۔ تم ایسا کرو آج سوہا کو اسٹور روم میں سلا دو۔"

"اسٹور روم میں؟" اسے دھچکا لگا۔

"اس گھر میں اور بھی کئی کمرے ہیں مگر فی الحال ان میں اکیلی بچی کے سونے کا انتظام نہیں ہو سکتا۔ پھر یہ مخصوص کمرہ یہاں سے تھوڑا دور ہے ورنہ وہاں ہر سہولت موجود ہے، وہ وہاں سو جائے گی۔ اسٹور روم ہمارے کمرے کے بالکل ساتھ ہے۔ تمہیں تسلی رہے گی۔"

"مگر سوہا کبھی اکیلی نہیں سوئی۔" اس کی آواز کانپ رہی تھی۔

"عادت ڈالو۔" نوید نے نظریں چرائیں اور تکیہ درست کر کے سونے کی تیاری کرنے لگا۔

"مگر سوہا... ؟" وہ بے بسی سے اسے دیکھتی رہی مگر وہ کروٹ بدل کے لیٹ چکا تھا۔

"بچیوں کو چھوڑ کے آنے کے بعد لائٹ جلدی آف کر دینا میرے سر میں درد ہے۔"

اس نے خفگی بھرے لہجے میں کہتے ہوئے یہ باور کرا دیا کہ اب وہ کچھ اور کہنے سننے کے موڈ میں نہیں۔

سوہا اور وشمہ ذرا فاصلے پہ کارپٹ پر بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ بلکہ کھیل تو صرف وشمہ رہی تھی۔ سوہا اپنی اداس آنکھوں سے ماں کو تک رہی تھی۔ اس نے ان دونوں کی ساری گفتگو سن لی تھی۔ وہ آہستگی سے اٹھ کے ماں کے پاس آگئی۔

"ماما... میں اکیلی سو سکتی ہوں۔"

"سوہا!" وہ اسے دیکھ کے رہ گئی۔ آج وہ اسے یکدم بڑی بڑی سی لگنے لگی تھی۔

"مگر میں اس کمرے میں نہیں سوؤں گی۔ مجھے اکیلے میں ڈر نہیں لگے گا۔ وہاں لگے گا۔ آنٹی بہت زور سے مارتی ہیں۔"

"میری بچی!" منزہ نے بھیگے لہجے میں کہتے ہوئے اس کے ماتھے پہ لب رکھ دیے۔

"ماما! میں بھی..." وشمہ نے سوہا پہ جو پیار امڈتے دیکھا تو اپنا حصہ وصول لینے آگئی۔

"کیوں نہیں یہ تو میری پیاری سی گڑیا ہے۔" اس نے وشمہ کو گود میں اٹھا لیا اور پیار کرنے لگی۔

"تو آپا کو سلا کر آتے ہیں۔ پھر دادو کے کمرے میں چلیں گے۔"

"آپا دادو کے پاس نہیں سوئیں گی؟" کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے سوال کیا۔

ان کے جانے کے بعد نوید مراد نے آہستہ سے کروٹ بدلی اور چھت پہ نظریں جما کے کچھ سوچنے لگا۔

اگلے ہی دن اس نے سامنے والا کمرہ جو فالتو سامان سے بھرا ہوا تھا اور جس میں اکثر شمشاد بیگم کے گاؤں سے آنے والے غریب رشتے دار ٹھہرا کرتے تھے، صاف کروا دیا۔ اور ایک ہی ہفتے میں وہ کھلا سا ہوادار کمرہ دونوں بچیوں کے لیے سیٹ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

شوکت جہاں بھوؤں کے ساتھ مل کے اچار کا مسالا لیموں اور ہری مرچوں پہ لگا رہی تھیں۔

"رخشندہ! تمہاری چھوٹی بہنوں کے رشتے کی کہیں بات چلی؟" انہوں نے بڑی بہو سے پوچھا۔

"رشتے تو بہت آتے ہیں اماں جان۔" رخشندہ کے لہجے میں فخر سمٹ آیا۔ "ایک دن میں دو دو آ جاتے ہیں۔ نجانے کہاں سے لوگوں کو خبر ہو جاتی ہے کہ اس گھر میں تین تین خوبصورت لڑکیاں ہیں۔"

"تو کسی ایک کی ذمہ داری سے سبکدوش کیوں نہیں ہو جاتے تمہارے بھلے والدین۔" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

رخشندہ کی شادی کو دس گیارہ سال ہو رہے تھے۔ اس سے چھوٹے پانچ بہن بھائی تھے۔ دو بھائی اور پھر ان سے تین بہنیں۔ بھائی تو ان گیارہ سالوں میں گھر بار والے ہو چکے تھے مگر بہنیں اب تک بیٹھی تھیں۔ سب سے بڑی شائلہ کی عمر ہو گی کوئی ستائیس اٹھائیس سال اور پھر ایک چوبیس پچیس سال کی اور سب سے چھوٹی تقریباً بائیس برس کی۔ اس میں تو مبالغہ والی کوئی بات نہ تھی کہ حسن و خوبصورتی میں تینوں ایک سے بڑھ کے ایک تھیں اور ذہین اور اعلیٰ تعلیم یافتہ۔

شائلہ کسی کالج میں لیکچرر تھی۔ چھوٹی میڈیکل ریپ اور سب سے چھوٹی ایم بی اے کر رہی تھی۔

"رشتے بھی تو ڈھنگ کے آئیں۔"

"تو کیا دن میں دو دو آنے والے رشتے سارے کے سارے ہی بے ڈھنگے ہوتے ہیں؟" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"یوں ہی سمجھ لیں۔ کسی میں ایک بات اچھی تو تین باتیں بری۔"

"مثلاً؟"

"مثلاً تہمینہ کے لیے ایک ڈاکٹر کا رشتہ آیا..... پروفیشن دونوں کا ملتا جلتا ہے۔ لڑکا شکل و صورت کا بھی اچھا قد عمر کا فرق بھی زیادہ نہیں تھا مگر فیملی بیک گراؤنڈ اچھا نہیں تھا۔

"ذات کے کیا تھے؟"

"نہیں خیر تھے تو راجپوت۔ مگر یہاں تو بیک گراؤنڈ تھا۔ بس تپنڈو سے لوگ تھے۔ صرف لڑکا ہی پڑھا لکھا تھا
باقی سب انگوٹھا چھاپ۔ زرین بھی سیکن بھی تیا گزرا تھا۔ اسی طرح ایک بار اچھی فیملی کا رشتہ آیا۔ پڑھے لکھے لوگ
تھے۔ مگر لڑکا۔۔۔ توبہ۔ کچھ تو دیکھنے لائق صورت شکل ہو۔ ٹھیک ہے کہ مرد کی شکل نہیں ہنر دیکھا جاتا ہے
ایسا بھی نہ ہو کہ ڈرا دیں گے۔"

"اور کہیں خاندان بڑا ہوتا ہو گا۔ نندیں چھ اور دیور چار۔" پروین نے ہنس کے طنز کیا۔

"خیر جو بھی ہے۔ بیٹیاں ماں باپ سوچ سمجھ کے ہی پرائے ہاتھوں میں دیتے ہیں۔ مگر کبھی کبھی زیادہ چھان
پھٹک بھی نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ میری مانو۔۔۔ تو ہر لحاظ سے بہترین کا انتظار کرنے کے بجائے مناسب پر گزارا
کر لو۔"

"اماں جی! جب میری بہنیں ہر لحاظ سے بہترین ہیں تو رشتہ صرف مناسب اور گزارے والا کیوں ہو؟"
رخشندہ نے تنک کر کہا تو پروین نے ہاتھ روک کر ایک نظر ساس کو دیکھا۔

"ان کا جوڑ بھی ہم بہتر سے بہترین ہی ڈھونڈیں گے۔"

"ان شاء اللہ۔۔۔ میری تو دعا ہے سب بچیاں اچھے وقت میں اپنے گھر کی ہو جائیں۔"
انہوں نے صدق دل سے کہا اور پھر پروین کی جانب متوجہ ہوئیں۔

"تم بہو کیسی رہی تمہاری نئی بھابھی؟ خوش تو نظر آ رہی ہے میاں بیوی میں؟"

"اللہ جانے اماں جی! مہینے بھر بعد جانا ہوتا ہے اور وہ بھی گھڑی دو گھڑی کے لیے۔ شادی کو تین چار ماہ ہوئے ہیں
اور شاید اتنی ہی بار میرا وہاں جانا ہوا ہے۔"

"چلو۔۔۔ بچی کی جانب سے تو بے فکری ہوئی تمہیں۔"

"ہاں۔۔۔ کچھ کچھ۔۔۔"

"کیوں؟ قبول نہیں کیا اس نے تمہاری بھتیجی کو؟"
رخشندہ بولی۔

"کیا پتہ۔۔۔ دراصل وہ عجیب خشک مزاج عورت ہے۔ میں نے اسے بھی بھائی جان سے بھی کھل کے ہنستے ہوئے
نہیں دیکھا۔ اماں سے تو برائے نام ہی مخاطب ہوتی ہے۔ مجھ سے بھی بس 'تکلفاً' کلام کرتی ہے۔ میں نے سوچا تھا
بھائی جان کا گھر دوبارہ بس جائے گا تو رونق ہو جائے گی میرے میکے میں۔ مگر وہ عجیب لاش نما عورت ہے۔ نہ ہنسنا نہ
بولنا۔۔۔ نہ سجنا۔ نہ سنورنا۔۔۔" وہ اداسی سے بتا رہی تھی۔

"تمہاری پہلی بھابھی ساجدہ تو بہت ہنس مکھ تھی۔۔۔ ہے ناں۔۔۔ اب تک یاد ہے مجھے۔ مسکراہٹ ہر وقت اس
کے ہونٹوں پہ ہوتی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ بھائی جان کے ہونٹوں پہ بھی مسکراہٹ میں نے بس تب تک ہی دیکھی تھی۔ یہ تو۔۔۔" اس نے
سر جھٹکا۔

"عورت کو دوسری بار گھر بسانے میں ذرا وقت لگتا ہے پروین! دل مارنا پڑتا ہے۔ اسے ذرا وقت دو۔" شوکت
جہاں نے نصیحت کی۔

"اتنا وقت شاید نہ لگتا اسے پچھلا بھلانے میں۔ مگر وہ پچھلا ساتھ جو اٹھا لائی ہے۔ اس کی بیٹی اسے نئی زندگی
شروع کرنے نہیں دے رہی۔"

"تو کیا کرتی غریب۔۔۔ کہاں چھوڑتی یتیم بچی کو۔ ماں جو ہوئی۔"

"ہاں ہے۔ میں مانتی ہوں ہم لوگوں نے بھی کبھی نہیں چاہا تھا کہ اسے اس کی اولاد سے دور کریں۔ خاص طور
پر نوید بھائی جان نے تو پہلے ہی صاف صاف کہہ دیا تھا کہ وہ یہ ظلم نہیں کریں گے مگر میری خواہش تھی کہ میکے والوں

سے بات ہوئی تھی کہ صرف دو مہینے وہ بچی کو رکھ لیں تاکہ میاں بیوی کو اکیلے کچھ وقت مل سکے' ایک دوسرے کو
سمجھنے کا۔ مگر انہوں نے ہمارا ذرا اعتبار نہ کیا۔ دوسرے ہی دن لڑکی ہمارے سر منڈھ دی۔ شاید ڈر گئے تھے کہ وہ
بیٹی لیے ہی نہ ہو جائیں۔ ساری عمر ہی نہ سنبھالنا پڑ جائے۔ حالانکہ ہم نے زبان دی تھی مگر۔۔۔ اور اماں جان' خود
سوچیں جس بچی کو اس کے ماموں' نانی دو دن نہ رکھ سکے' وہ کتنی آفت ہوگی۔ ناک میں دم کر کے رکھ دیا ہے اس
نے میری ماں کا۔ جب جاتی ہوں وہ اس کا نئے سے نیا کارنامہ سناتی ہیں۔"
"اللہ بہتر کرے گا۔" شوکت جہاں کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا مگر انہوں نے فقط اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔

☆ ☆ ☆

مدیحہ تقدیس کے بالوں میں تیل لگانے کے بعد اب کس کے دو چوٹیاں بنا رہی تھی۔
"یہ تم کیا بنا رہی ہو بچیوں کو؟" جعفر محمود نے ناگواری جتائی۔
"کیوں؟ کیا ہوا ہے میں نے؟"
اب وہ تیل سے چپچپاتی انگلیاں اپنے بالوں پہ پھیر کر صاف کر رہی تھی۔
"اتنے بڑے اسکول میں جاتی ہیں۔ تم تیل میں ڈبو کے انہیں کارٹون بنا دیتی ہو۔ سب مذاق اڑاتے ہوں گے
ان کا۔"
"تیل لگانے میں مذاق اڑانے والی بات کون سی ہے۔ اگر اتنے بڑے اسکول کی لڑکیاں اتنی ہی بدتمیز ہیں تو کیا
ضرورت ہے وہاں انہیں پڑھانے کی۔"
"ماما! مجھے بھی منع کیا ہے کہ تیل کے ساتھ اسکول نہ آیا کریں۔" تقدیس منہ بنا کر جلدی سے بولی۔
"کیوں؟ کیا یہ بھی فیس لگتی ہے کیا؟" مدیحہ نے تنک کر کہا۔
"ہر چیز کی فیس بٹورتے ہیں یہ اسکول والے۔۔۔ پڑھانے کی فیس' کھیل کی فیس' امتحان کی فیس' لائبریری کی
فیس' پکنک کی فیس۔۔۔ ان سے کہو تیل کی فیس بھی لے لیا کریں۔ مگر ایسی نئی پابندیاں نہ لگایا کریں۔"
"کیا جاہلوں والی باتیں کر رہی ہو۔" جعفر کا مارے کوفت کے جی برا ہو گیا۔
"وہ پرانا اسکول کتنا اچھا تھا۔ نہ ایسی فضول روک ٹوک نہ ہی یہ بے کار کے چونچلے۔"
"مدیحہ۔ نکل آؤ باہر۔ نکل آؤ اب اس حویلی سے اور اس گاؤں کی آب ہوا سے۔ اسلام آباد جیسے شہر میں
رہتی ہو تم۔ جس طرح مہنگے درزیوں اور اونچے بیوٹی پارلرز کے چکر لگا کر تم نے خود کو ایک ہی سال میں پالش کیا
ہے نا' ایسے ہی اپنی سوچ کے رنگ بھی اتار لو۔ خود کو صرف باہر سے ہی نہیں بلکہ اندر سے بدلو۔"
"میں کیا گرگٹ نہیں ہوں جو رنگ بدلوں۔" مدیحہ نے ترکی بہ ترکی جواب دیا۔
جعفر زچ ہو تا کمرے سے نکل گیا۔
"یہ مرد بھی ہوتے ہیں جن کو بدلنے کی بیماری ہوتی ہے۔ کبھی ان کے خیالات بدلتے ہیں' کبھی معیار۔ کبھی پسند تو
کبھی بیٹھے بٹھائے ان کے اصول بدل جاتے ہیں۔"
وہ بڑبڑا رہی تھی اور تقدیس ان الفاظ کے مطالب سمجھنے کی کوشش کرتی رہی۔
سٹور روم میں گزاری وہ رات اس کی زندگی کی پہلی رات تھی جو اس نے اکیلے گزاری۔
بالکل تنہا رات۔
اس کی شادی والی رات بھی اس پہ بہت مشکل گزری تھی۔ مگر وہ رات تنہا نہیں تھی۔ اس رات بھی وہ روتی رہی
تھی۔ مگر اس کے آس پاس ایک ہجوم تھا۔
آشنا اور مہربان چہروں کا۔
آج بالکل اکیلی تھی۔ وہ رو ضرور رہی تھی مگر چلا نہیں رہی تھی۔

اسٹور روم میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو اس کی طرح بے کار اور فالتو تھیں۔ زائد بستر، ایک پرانی ریک، کچھ ناقابل استعمال بھاری برتن، پرانے صندوق اور جستی پیٹیاں۔ ایک جانب ایک تخت پڑا تھا جس پہ بستر لگا کر بچھا کے اس کے سونے کی جگہ بنا دی تھی۔

وہ کتنی ہی دیر تک اس کے پاس بیٹھی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔ اسے پیار سے تھپکتی رہی یہاں تک کہ سوہا کا ہلکا ہلکا بوجھل ہو کر بند ہو گئیں۔ اسے سوتا جان کے منزہ نے اس کے ماتھے سے بال ہٹا کر ایک محبت بھرا بوسہ دیا جو آنسوؤں کی آمیزش سے نمکین ہو رہا تھا۔ پھر آہستگی سے اٹھ کر اسٹور روم سے باہر آ گئی۔

اس کے نکلتے ہی سوہا نے اپنی آنکھیں فوراً کھول دیں۔ وہ کہنا چاہتی تھی۔

"ماما! مت جاؤ۔ ماما مجھے یہاں مت چھوڑو۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے۔"

مگر کچھ نہ کہہ سکی۔ اس کی آواز گلے میں ہی گھٹ کے رہ گئی۔ اس نے ماں سے یہ کہہ تو دیا تھا کہ وہ بڑی ہے اور اسے اکیلے میں سوتے ڈر نہیں لگتا۔ مگر اب اس پہ عمل کر کے دکھانا مشکل لگ رہا تھا۔

اسٹور روم میں پھیلی سیلی سیلی سی بو اسے کھل کر سانس نہ لینے دے رہی تھی۔ یہاں سردی بھی بہت تھی۔ ٹیوب لائٹ کے بجائے ایک پیلے سے بلب کی روشنی تھی جو ماحول کو اور خوفناک اور پراسرار بنا رہی تھی۔ سوہا کا حلق خشک ہونے لگا۔ منزہ اس کے نزدیک پانی کا جگ اور گلاس رکھ گئی تھی مگر کمبل سے ہاتھ نکال کر جگ تک بڑھانے میں اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایسا کرے گی تو کہیں سے دو لمبے لمبے ہوئے بازو آئیں گے اور ان کے لمبے لمبے ناخنوں والے ہاتھ اسے دبوچ لیں گے۔

اس نے کمبل منہ تک تان لیا۔

"نہیں۔ کوئی نہیں ہے یہاں۔ ماما کہتی ہیں جن بھوت نہیں ہوتے۔ وہ صرف کہانیوں میں اور ڈراموں میں ہوتے ہیں۔ اصل میں نہیں ہوتے۔ یہاں بھی نہیں ہوں گے۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔ میں یہیں سوؤں گی۔ یہاں نہیں سوؤں گی تو گندی آنٹی کے پاس جانا پڑے گا۔ وہ جن سے زیادہ گندی ہے۔ وہ ضرور مجھے کھا جائے گی۔ اس کے دانت بھی چڑیلوں والے ہیں اور پیٹ بھی بھوت جیسا بڑا سا ہے۔ وہ مجھے پورا کا پورا کھا لے گی۔ میں اس کے کمرے میں نہیں جاؤں گی۔ ماما کے کمرے میں بھی نہیں سو سکتی۔ ماما بے چاری کے پاس کوئی کمرہ ہے نا۔ وہ تو اس انکل کے کمرے میں رہتی ہیں اور انکل مجھے نہیں سلائیں گے اپنے پاس۔ وہ صرف ماما کو اپنے ساتھ سلاتے ہیں یا اس وشمہ کی بچی کو۔ اس سے اچھا ہے میں یہیں سو جاؤں۔ یہاں ڈانٹنے والا نہیں۔ کوئی غصے سے دیکھنے والا نہیں۔ میں یہیں سوؤں گی۔ مجھے ڈر نہیں لگ رہا۔"

وہ اپنے خوف پہ قابو پانے کی کوشش کرتی رہی مگر دہشت اس پہ غالب آتی رہی۔ اس کی تمام تر مزاحمت کے باوجود۔

صبح منزہ اس کے پاس آئی تو وہ تیز بخار میں جھلستی بے سدھ پڑی تھی۔

☐ ☐ ☐ ☐

"مرد کی ذات ہوتی ہی بڑی ہے۔"

مہتاب نے اپنا خود ساختہ اور پسندیدہ ترین قول ایک بار پھر دہرایا تو مدیحہ نے خائف ہو کر اسے دیکھا۔

"یہ مہتاب آپا بھی نا۔۔۔ ہر طرح کی زبان ہر ایک کے سامنے استعمال کر لیتی ہیں۔ چھوٹے بڑے کسی کی بھی پروا نہیں۔" اس نے کڑھ کے سوچا۔

"چھوڑیں آپا! جانے بھی دیں ایسی باتیں۔"

اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی جو ظاہر ہے ناکام رہی۔ مہتاب اپنے دل پسند موضوع سے ایک دم ہٹنے کی روادار نہیں تھی۔

"اس لیے چھوڑوں؟ میرے تو کلیجے میں آگ لگی ہے آگ۔"

"اسی لیے کہہ رہی ہوں کہ جانے دیں۔ کیا فائدہ اپنا دل جلانے کا۔"

"دل تو کب کا جل چکا مدیحہ۔ اب راکھ ہو چکا۔" وہ دوپٹہ آنکھوں پہ رکھ کے سسکنے لگی۔

"میرا وہ۔۔۔ اللہ کرے کبھی سکھ نہ پائے۔ جو کچھ تو نے کیا ہے۔۔۔" ان کی تسلی کو وہ مدیحہ کی کوفت سوا ہو گئی۔ بچیاں بھی ٹی وی اور کھلونوں سے دھیان ہٹا کے اسے دیکھنے لگی تھیں۔

"ایسا کیا ہوا ہے؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جعفر بھیا ایسے کردار کا نہیں ہوتا۔" مہتاب کے بیان نے جیسے مدیحہ کی دم پہ پیر رکھ دیا۔

"سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

"ایک سے ہوتے تو سب عورتوں کی قسمت بھی ایک سی ہوتی۔ سب میری طرح اجڑ کے نہ بیٹھی ہوتیں۔"

"ضروری نہیں آپا! جو نظر آئے وہی درست ہو۔ کتنی ہی ایسی عورتیں ہیں جو اولاد اور گھر کے لیے۔۔۔ تو بھی اپنا بھرم رکھنے کے لیے اندر سے اجڑ جانے کے باوجود برسوں دانت پیس پیس کر گزارتی ہیں۔"

"تو میں کون سا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی؟ کیا میرے بچے نہیں ہیں؟ میرا میکہ نہیں ہے؟ مجھے اپنی گھر بستی نہیں ہے؟ میرا کوئی بھرم یا عزت نہیں ہے؟ میں بھی ان سب کے لیے سمجھوتہ کرنے پہ تیار تھی مگر وہ موقع تو دیتا ہے تو نا، اپنا گھر اپنا مال اور اپنی زندگی سب کچھ میرے ہوتے خالی چاہیے تھا۔ بچے بھی رکھ لیے اور نکال باہر کیا مجھے۔ صرف اس لیے کہ اپنا قصور ڈکار کے دوسروں کے ہضم کرنے لگی ہے۔ بغیر مرد کے عورت بے وقعت شے بن کے رہ جاتی ہے۔ حریص اور کمینی۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپا!" ایک تو ان کی گالیوں اور کوسنوں سے مرصع زبان۔۔۔ اور اس پہ یہ زریں خیالات۔۔۔

اب اسے خود اپنے اس فیصلے پہ افسوس ہو رہا تھا جب اس نے بہ جی کی زبانی مہتاب کے اجڑ کے میکے آ بیٹھنے کی خبر سننے کے بعد کیا تھا۔

"جعفر میں چاہتی ہوں کہ مہتاب آپا کچھ دن ہمارے ہاں آ کر رہ لیں۔ بے چاری کا دل بہل جائے گا۔"

"مہتاب آپا۔" وہ تذبذب میں پڑ گیا۔

قریبی رشتے داری ہونے کے باوجود وہ اتنا قریب سے کسی بھی رشتے دار کو نہیں جانتا تھا مگر یہ اندازہ بہرحال تھا کہ اس کی آپائیں چاہے ان کے خاندان سے ہوں یا مدیحہ کے میکے سے۔۔۔ کیسی ناقابل برداشت حد تک جاہل ہیں۔

"اس کا دل تو بہل جائے گا مگر خواہ مخواہ گھر کا ماحول خراب ہو گا۔"

"ماحول خراب ہو گا؟" مدیحہ کو واقعی یہ بات بری طرح چبھی۔

"وہ صرف میری چچا زاد بہن نہیں ہیں۔ آپ کی بھی کچھ لگتی ہیں۔ اپنے ہی خاندان کی کسی عورت کے بارے میں ایسی بات کرنا کیا درست ہے؟"

"مجھ سے زیادہ بہتر جانتی ہو گی اپنی چچا زاد اور میری ماموں زاد بہنوں کو۔۔۔ اگر انہیں یہاں لا کر مستقل رکھنا ہے تو مجھے اسلام آباد سیٹل ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ بے کار کی چیخ چیخ اور رونا پیٹنا ڈال دے گی یہاں آ کر اور پھر اس کے پیچھے پیچھے اس کے 'لواحقین' ہر دوسرے دن ادھر پہنچے ہوں گے۔"

"چھوڑیں جعفر۔" مدیحہ نے تاسف سے گردن ہلاتے ہوئے کہا تھا۔

"خدا کا شکر ہے اتنا کھلا رزق دے رکھا ہے پھر بھی دل کتنا تنگ ہے۔ چار روز کسی کو روٹی کھلانے سے ہمیں کون سی کمی ہو جائے گی۔ الٹا برکت ہی ہو گی۔ جب سے یہاں آئے ہیں۔ مہمان کوئی پھٹکتا ہی نہیں ہے۔ عجیب بے برکتا گھر ہے۔"

انداز سراسر شرمندہ کر دینے والا تھا۔ شرم تو جعفر محمود کو کیا آتی طیش ضرور آ گیا۔

"تم سے اور امید بھی کیا کی جا سکتی ہے چودھرائن مدیحہ! اسکنہ موضع دھنال ضلع قصور..... تم اس سے زیادہ بات کر ہی نہیں سکتیں۔ بات صرف چار دن کی روٹی کی نہیں ہے' ذہنی سکون اور یکسوئی کی ہے..... میں تو چھوڑ چار سال تک ان کو گھر بٹھا کے کھلا سکتا ہوں۔ مگر اپنے نہیں' ان کے اپنے گھر بٹھا کے۔ ان ہمدردیوں میں اپنی روٹین اور ریسٹ آپ خراب نہیں کر سکتا۔"

"آپ گھر پہ وقت ہی کتنا گزارتے ہیں۔ وہ بے چاری اس وقت غمگین ہے' دکھی ہے' شوہر نے طلاق دے کے میکے بٹھا دیا ہے۔ بھابیاں میکے میں جینے نہیں دے رہی تھیں طعنے مار مار کے۔ اس لیے چند دن کے لیے اپنے گھر لے آئی' وہاں بھی گلیوں کی عورتیں کہاں چین لینے دیتی ہوں گی سارا دن..... سوال نئی نئی باتیں۔ یہاں رہے گی تو ذہن بدلے گا..... دل پہ جو غصہ اور دکھ کا اثر ہے وہ کم ہو گا تو شاید مستقبل کے بارے میں بھی سوچ لے۔"

"رکھو بھئی..... جسے دل چاہے رکھو۔"

وہ چڑ کے گویا چھٹی دیتا باہر نکل گیا اور تب مدیحہ اس فتح پہ کھل کر مسکراتے ہوئے خود کو مبارک باد دینے لگی اس بات سے بے خبر کہ اس کے نتائج اسے ہی بھگتنا ہوں گے۔

اس نے مہتاب کو یہاں لانے کی بات' بس سرسری سی سوچی ہی تھی اور جعفر سے کہہ بھی ڈالی مگر پھر اپنے فیصلے کو پختہ تب کیا جب اس کی جانب سے مخالفت ظاہر ہوئی۔ تب اس نے ضد میں آ کر اسے یہاں لانے کا بڑھ چڑھ کر واویلا کیا اور اپنی منوا کے رہی۔

اس وقت وہ اپنے اس فیصلے پہ کڑھتے ہوئے بے زار نظروں سے مہتاب آپا کو دیکھ رہی تھی جو چھٹی ایریا میں میلے پیر آف وائٹ صوفے پہ پسارے بیٹھی کارپٹ پہ مونگ پھلی کے چھلکوں کے ڈھیر لگا رہی تھی۔ جس رفتار سے مونگ پھلیاں اندر جا رہی تھیں اسی رفتار سے اندر کی بھڑاس گالیوں کی صورت باہر نکل رہی تھی۔

"تحریم! پنسل یہاں کیوں شارپ کر رہی ہو' ڈسٹ بن میں کرو۔ تمہارے پاپا نے دیکھ لیا تو ڈانٹیں گے پتہ ہے نال کہ انہیں گھر میں گندگی پسند نہیں ہے۔"

تحریم نے ابھی بیگ سے پنسل اور شارپنر نکالا ہی تھا کہ مدیحہ نے ڈپٹتے ہوئے کہا۔ مقصد صرف مہتاب کو باور کرانا تھا مگر وہ ہاتھ جھاڑتے ہوئے بے فکری سے کہنے لگی۔

"میں نے دیکھا ہے مدیحہ! تم بچیوں پہ کچھ زیادہ ہی روک ٹوک کرتی ہو اور جعفر کے نام پہ تو ان کا خون خشک رکھتی ہو۔ ذرا تو کھل کے سانس لینے دو بے چاریوں کو۔ دیکھو ذرا..... ان کی بڑھوتی بھی رکی ہوئی ہے۔ میری آٹھ سال کی تھی تو میرے کاندھے تک آتی تھی یہ تحریم تو نظر ہی نہیں آتی تمہارے ساتھ کھڑی۔ سب ضرورت سے زیادہ ڈانٹ ڈپٹ کا نتیجہ ہے۔"

"بچیوں پہ رعب رکھنا چاہیے آپا!"

"مگر باپ کے نام کا اتنا ہوا کیوں بنا رکھا ہے تم نے۔ مرد کو اتنی اہمیت دے کر سر چڑھانا ٹھیک نہیں۔ صفائی پسند ہے تو ہوا کرے۔ تم کیوں جان ہلکان کرتی ہو اور کیوں بچیوں کے پیچھے لٹھ لے کر پڑی رہتی ہو۔"

"باپ ہے وہ ان کا..... ان پہ فرض ہے کہ اس کی مرضی کے مطابق..... "اس نے کمزور لہجے میں کہنا چاہا۔

جعفر کے دفاع میں کچھ کہنا اب کتنا مشکل لگتا تھا۔ جب دل اور دماغ دونوں زبان کا ساتھ دینے سے انکاری ہوں تو زبان ایسے ہی رک رک جاتی ہے۔

"باپ کا کام کما کر کھلانا ہے۔ ضرور تیں پوری کرنا ہے' چاہے وہ بیوی کی ہوں چاہے بچوں کی۔ زیادہ اہمیت دو تو ان کے نئے نئے نخرے شروع ہو جاتے ہیں۔ میں نے بھی یہی غلطی کی تھی۔ مختار خود کو بڑی توپ چیز سمجھتا تھا' میں اس کے ماتا کے مارے (چیچک زدہ) بوتھے پان اور سگریٹ سے ناس ہوئے دانتوں..... لشکتی

کلائیوں کو نظر انداز کر کے اسے اپنا سرتاج..... اور پتہ نہیں کیا کیا کہتی رہی اس کے بوکے مارے گال (جبڑے) کے کونوں سے بھی بڑے پیر دبا لگی رہی۔ وہ سمجھنے لگا شاید پتہ نہیں کہ ان کا ساہوکار ہوں..... یہ زنانی میرے آگے پیچھے ضرور میرے اندر کوئی بات ہو گی۔ بس وہ کی بات آزمانے گھر سے باہر نکل گیا۔ مرد کو اس کی اوقات میں رکھنے کا بھی بہت جی ہوتا ہے۔ میں نے بے جی کی بات ذرا بھی دھیان سے نہیں سنی تھی۔ وہ ٹھیک کہتی تھیں کہ مرد کو محبت اور توجہ کی بھی ایسے روٹیوں کے جیسے بھیک دے رہے ہو۔ اس کی خدمت کرو..... کہ یہ اللہ سوہنے کا حکم ہے مگر خدمت بھی احسان جتا کر کرو تاکہ وہ آپے سے باہر نہ ہو۔"

مدیحہ کا دل ان باتوں سے ناگواری محسوس کرنے کے باوجود اتھل پتھل سا ہو رہا تھا۔ ناگواری شاید صرف بچیوں کی موجودگی میں اس طرح کی گفتگو کرنے پہ ہو رہی تھی..... ورنہ ایک ایک بات دل پہ اثر کر رہی تھی۔

"میں ذرا کھانے کا انتظام دیکھوں۔" اس نے اٹھنے کا بہانہ تراشا۔

"مسلنڈیاں کس لیے ہیں؟" مہتاب کا اشارہ ملازماؤں کی طرف تھا۔

"جعفر کو کھانا میرے ہاتھ کا پکا پسند ہے۔" وہ منہ سے یہ بات نکال کر پچھتائی۔

مہتاب نے عجیب طنزیہ اور جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

"پسند وسند کوئی نہیں..... تم کون سا آسمان سے اتار کے پکاتی ہو۔ وہی گوشت' وہی سبزی' وہی مسالے..... وہی گھی۔ نوکرانی کو پکانا آتا ہے تو اسے کام پہ رکھا ہوا ہے نا..... نہیں آتا تو نکالو باہر اور کوئی خانساماں رکھو۔"

"جعفر کو پسند نہیں گھر میں مرد ملازم رکھنا۔" ایک بار پھر غلط بات منہ سے نکل گئی۔

"اچھا..... اور وہ جو چوکیدار' مالی اور..... وہ۔"

"وہ گھر کے باہر ہیں آپا! میں گھر کے اندر کے ملازموں کی بات کر رہی ہوں۔ میں بھی سارا دن اکیلی ہوتی ہوں گھر پہ..... اور بچیاں بھی بڑی ہو رہی ہیں اس لیے وہ پسند نہیں کرتے کوئی غیر مرد اندر دندناتا پھرے۔"

"میں کہہ رہی ہوں کوئی پسند وسند کی بات نہیں' صرف تمہیں آگے لگائے رکھنے کا بہانہ ہے۔ سینہ چوڑا ہو جاتا ہو گا اس کا جب تم باورچی خانے سے پسینہ پسینہ ہو کر اس کے من پسند کھانے لے کر نکلتی ہو گی اور اس کے آگے رکھتی ہو گی۔"

"چھوڑیں آپا..... اگر ایسا ہے بھی تو کیا فرق پڑتا ہے۔ سارا دن ایک کھانا پکانے کے سوا مجھے کام ہی کیا ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی نہ کروں تو زنگ لگ جائے گا ہڈیوں میں۔"

"کہیں آیا جایا کرو۔ ملا ملایا کرو۔"

"برادری تو پیچھے چھوٹ گئی..... ادھر نہ میکہ نہ سسرال..... کس سے ملنا ملانا رکھوں۔ دل گھر پہ ہی لگانا پڑتا ہے۔"

"ہاں یہ بھی تو ظلم ہوا ہے تم پہ۔" مہتاب نے آہ بھری۔

"تمہارے اپنے چھڑوائے کالے پانی کی سزا دے رکھی ہے۔ صرف اپنے شوق کی خاطر یہ شہر چھوڑ کے دھندہ کرنے کا شوق۔ مگر اتنا بڑا شہر ہے..... کہیں تو تعلقات بناؤ..... کوئی سہیلی بناؤ آیا جایا کرو۔ اپنے آپ کو چولہے کے آگے نہ جلاؤ۔"

"صبح ناشتہ بناتی ہوں..... پھر رات کا کھانا..... وہ بھی دو نوکرانیوں کی مدد سے..... کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ کھانا پکانا ویسے بھی مجھے پسند ہے۔ اپنی بچیوں کے لیے پکا کر دل خوش ہوتا ہے۔"

اس بار اس نے دانستہ جعفر کا نام نہیں لیا۔

"اور پھر آپا..... نوکرانیوں کا کیا بھروسا..... کیا گند بلا پکا کے آگے رکھ دیں..... اپنے ہاتھ سے پکانے میں صفائی سے بچے بھی صحت مند رہتے ہیں۔"

"اللہ! یہ بات تو ہے۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ کوئی کام کر دیتی ہوں۔ کیا پک رہا ہے آج؟"

اللہ اللہ کر کے نارمل گفتگو کی طرف آئی۔

"مرغی بھون لیتی ہوں۔۔۔ گوشت کا تو ناغہ ہے۔ہاں فریزر میں قیمہ پڑا ہے تو تھوڑا سا اس میں مٹر ڈال لیتی ہوں ساتھ میں دال چاول۔"

"چلو میں مٹر چھیل دیتی ہوں تمہیں۔۔۔ پیاز، لہسن وغیرہ بھی بنا دیتی ہوں۔"

"یہ کام تو کرالی کرے گی آپا۔۔۔ آپ رہنے دیں۔ کیوں تکلیف کرتی ہیں۔"

"تکلیف کیسی؟ ہاں تم ضرور تکلف کر رہی ہو۔ مہمان سمجھ رہی ہو مجھے۔" اس نے شکایتی لہجے میں کہا۔

"نہیں آپا! ایسی بات نہیں۔"

"یہی بات ہے۔ چھ دن ہو گئے مجھے آئے ہوئے۔ مہمان کی طرح بٹھا رکھا ہے۔ بستر پہ نرے اٹکے رہتے ہو۔"

اب وہ اسے کیا بتاتی کہ جعفر کو ڈائننگ ٹیبل پہ اس کی موجودگی گراں گزرتی تھی اس لیے مدیحہ کی کوشش ہوتی کہ جعفر کے آنے سے پہلے پہلے وہ اسے اس کے کمرے میں ہی کھلا کے فارغ کر دے۔

"اچھا آپا! بنا دیں سبزی۔۔۔ جیسے آپ کی خوشی۔ کریمن! دیکھو تم گلیز لاؤ۔۔۔ کارپٹ صاف کر دو۔"

"رہنے دو ابھی..... ایک ہی دفعہ سبزی بناؤں، پھر اٹھا ہی گند اٹھا لے گی کریمن۔" وہ صوفے پہ جھٹ سے آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

"لاؤ۔۔۔ دے دو مٹر۔"

"آپ یہاں بیٹھ کے سبزی بنائیں گی؟"

"عادت تو مجھے بڑے والے رنگلے منجی (رنگین پلنگ) پہ بیٹھ کے سبزی بنانے کی ہے مگر اب اپنے گھر کا سکھ کہاں اور اپنا گھر کہاں، ہائے میرا ملتانی رنگلا منجا۔ وہ سوتی کی کڑھی چدریں (چادریں) میرے دھتے اور بھیں۔۔۔ اف وہ آگے بسرے کی۔"

وہ سوئے بہانے لگی۔

مدیحہ نے ایک نظر تصور میں کارپٹ پہ پھیلے مونگ پھلی کے چھلکوں کے ساتھ ساتھ مٹر اور پیاز کے چھلکوں پہ ڈالی۔ لاؤنج کی فضا میں پھیلی لہسن کی بو کو محسوس کیا اور اسے تسلی دے کر چپ کرانے کا ارادہ ترک کر دیا۔ کمال ہے، روتے شوہر اور اس کی معشوقہ کو کوسنے اور گھر یاد کرنے کے شغل میں وہ سبزی بنانے کا شوق تو بھولے رہے گی، چپکے سے کریمن کو صفائی کرنے کا اشارہ کرتی کچن میں گھس گئی۔

☆ ☆ ☆

منزہ کا ایک پاؤں کچن میں تھا، دوسرا نئے تیار ہونے والے کمرے میں۔۔۔ تیسرا کوئی پاؤں ہوتا تو یقیناً مستقل طور پہ اسٹور میں رکھے رہتی جہاں سوہا بخار کے بعد اپنے تمام تر چڑچڑے پن اور ضدوں کے ساتھ موجود تھی۔ فی الحال تو وہ انہی دو پیروں میں سے باری باری کوئی پیر کچن یا نئے کمرے سے نکال کر سوہا کے پاس ہو آتی۔

سوہا کے نخرے عروج پہ تھے۔ بخار اس کی طبیعت میں ایسے ہی تلخی بھر دیا کرتا تھا۔ کچھ کھاتی نہ پیتی، مرنے کو ہو جاتی۔ جب تک منزہ کے بس میں تھا وہ خوشی خوشی یہ ضدیں پوری کیا کرتی۔ سارے نخرے بھی جان سے اٹھا لیا کرتی مگر اب اس کا اپنا آپ تک اس کے اختیار میں نہیں تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح سوہا کی بیماری کے دوران گھر بھول بھال کے اس کا سر گود میں لے کر نہیں بیٹھ سکتی تھی۔ وہ جس گھر سے آئی تھی۔۔۔ وہ گھر اس کے لیے بے فکری کا مطلب رکھتا تھا کیونکہ وہ اس کے بھائی کا گھر تھا۔ یہ گھر اس کے شوہر کا تھا جو اس کے بیٹی کی پٹی سے لگ کر بیٹھنے کی صورت میں درہم برہم ہو سکتا تھا۔

"ماما! مجھے نہیں پینا یہ سوپ۔۔۔ اس میں سے اسمیل آ رہی ہے۔" اس نے یخنی کا پیالہ بدتمیزی سے پرے کیا تو سوپ چھلک کے نرے کے ساتھ رضائی پہ بھی گرا۔

"اوہو، سوہا! کیا کر رہی ہو؟" اس نے دوپٹے کا کونا رضائی پہ رگڑا۔ یہ اس کے جہیز کی نہیں تھی، اس پہ لگا ہلکا سا دھبہ بھی شمشاد بیگم کا پارہ ہائی کر سکتا تھا۔

"کیا سوپ ہے، پتلا۔۔۔ گندا۔"

"چکن کارن سوپ پی لیتی تھی۔ مگر یخنی اس کے حلق سے نیچے نہیں اترتی تھی۔ منزہ نے یخنی کے لیے چکن بنا کر، چڑھانے کے بعد سارا کچن چھان مارا تھا مگر کارن فلور، اجینو موتو۔۔۔ مکئی کے دانے وغیرہ کہیں سے نہ نکلے۔ ظاہر ہے اس گھر میں کبھی استعمال نہ ہوتے ہوں گے اس لیے نہیں منگوائے جاتے ہوں گے۔ تو پھر تب تک گھر سے باہر اور شمشاد کے سامنے کسی ملازم یا آس پڑوس کے کسی بچے سے منگوانے کا مطلب تھا ایک نئے فساد کا آغاز۔ اس نے سادہ یخنی کا پیالہ ہی اسے لا دیا جو وہ ایک چمچ بھی لینے کی روادار نہیں تھی۔

"کیوں تنگ کر رہی ہو؟ منزہ، سٹرابری، سا گو دانہ؟"

"زہر لگتا ہے مجھے سا گو دانہ....." وہ جلائی۔

"وہ کسٹرڈ؟"

"اوں۔۔۔ اچھا۔" ناک چڑھا کے وہ رضامند ہوئی۔۔۔ ساتھ ہی شرط بھی سنا دی۔

"مگر بنانا فلیور۔"

"اوہو۔۔۔ اب بنانا فلیور۔" وہ بے بسی سے اسے دیکھنے لگی۔

"سوہا میری جان ماما کو تنگ نہ کرو۔ دیکھو آپ اسٹرابری اور مینگو فلیور بھی تو شوق سے کھا لیتی ہو۔"

"مگر آج میں نے بنانا کسٹرڈ ہی کھانا ہے۔"

"رات کو پاپا آئیں گے تو منگوا دوں گی۔ اس وقت اسٹرابری یا مینگو والا لے لو۔ گھر پہ یہی ہے۔"

"تو شمسہ گندی کو پسند ہوں گے نا یہ فلیور۔۔۔ اسی لیے منگوائے ہوں گے آپ نے۔" وہ بسورنے لگی۔

"آپ بھی کھا لیتی ہو۔"

"مگر آج نہیں۔ آج صرف اور صرف بنانا۔" وہ زور دے کر بولی۔

"رات کو۔۔۔ پرامس۔ اس وقت نہیں بن سکتا۔"

"منزہ۔۔۔ منزہ کدھر جا کے مر گئی ہے یہ۔ آیا ہے نیا کوئی ہوتا سوتا۔"

شمشاد کی کراری آواز اور واہیات پکار سن کر وہ اسے منانے کی کوشش ادھوری چھوڑ کے باہر لپکی۔

"اندر ہی جم کے بیٹھ گئی ہے سویرے سے اور باہر جو یہ سیاپا ڈلوایا ہے اسے کون دیکھے گا؟"

"جی وہ ذرا سوہا کو۔۔۔"

"توبہ۔۔۔ ڈرامے ہی ختم نہیں ہو رہے بے وقوف کی چھوکری کے۔ ایک ذرا سا بخار چڑھا۔۔۔ چڑھ کے اتر بھی گیا۔ یہ تماشا کو ایسے باندھ رکھا ہے جیسے مرنے والی ہو۔"

"اماں۔۔۔" منزہ کے دل پہ برچھیاں چل گئیں۔

"دفع کرو مجھے کیا۔۔۔ میں نے کبھی کسی کی کھوری برداشت نہیں کی۔"

ان کے للکارنے پہ منزہ نے اپنی کھا جانے والی نظریں تو جھکا لیں مگر ان ظالم لفظوں کی مار نہ سہہ پا رہی تھی۔

"جا دیکھ۔۔۔ اب کیا بھیجا ہے نوید نے تیری باتیں پوری کرنے کے لیے۔"

وہ مرے مرے قدموں کے ساتھ باہر گئی۔ نوید نے بچیوں کے کمرے کے لیے فرنیچر خرید کے بھیجا تھا۔ اس کا ایک دوست فرنیچر ساز تھا، [illegible] سے وہ ادھار کے لایا تھا۔ نئے کمرے میں ٹائلز کا کارپٹ والا کارپٹ بچھا گیا تھا۔ دو دن میں ضروری مرمت اور پینٹ بھی ہو چکے تھے۔ آج صبح سے لکڑی کا کام ہو رہا تھا، الماری اور کیبنٹ وغیرہ بن رہے تھے۔

"بھابی۔۔۔ چنگا جیسا لگ رہا ہے بڑا اچھا۔"

مزدوروں کو نئے مشکل بیڈز' رائٹنگ ٹیبل وغیرہ اندر لاتے دیکھ کر اس نے کمر پہ ہاتھ رکھتے ہوئے طنزیہ انداز میں کہا۔
منزہ مجرموں کی طرح سر جھکائے کچن میں داخل ہونے لگی۔
"اچھی پٹی پڑھائی ہے چار دن میں۔۔۔ شاوا۔۔۔ تیرے جیسی ہی ہوتی ہیں زنانیاں۔۔۔ جو بندے کو مال اجاڑ کے پھونک کر دیتی ہیں۔ بس پیسہ نکلوانے کے جتن پتا ہے بیوی میں۔"
"اماں! میں نے ان سے کوئی فرمائش نہیں کی۔" جانتی تھی شمشاد بیگم یقین کرنے والوں میں سے نہیں پھر بھی اس نے صفائی دینا ضروری جانا۔
"چل چل۔۔۔ وڈی آئی۔۔۔ سارا پتہ ہے مجھے۔ اپنی لڑکی کے سکھ آرام کے لیے کر رہی ہے۔ جو سوکھا پڑ گیا ہے اسے نہ۔۔۔ میں ڈائن ہوں؟ کھا جاتی تیری لڑکی کو؟ میرے پاس نہیں سو سکتی وہ؟ آخر وہ بچی سوتی ہے۔"
"اماں۔۔۔! یہ نوید صاحب کی خواہش ہے۔ میری نہیں۔ وہی چاہتے تھے کہ بچیوں کا الگ کمرہ ہو۔ ان دونوں میں پیار بھی بڑھے تاجب ساتھ ساتھ رہیں گی۔"
"پیار بڑھا کے کیا کرنا ہے؟ رہنا تو سوتیلی ہی ہے۔۔۔ پیار بڑھا کے کون سا سوتیلا سگا بن جاتا ہے۔ پر یہ بات نوید نہیں سمجھتا۔"
وہ چپ چاپ کچن میں چلی آئی اور کسٹرڈ بنانے لگی۔

☆ ☆ ☆
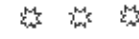
"تم نے بچیوں کا کمرہ دیکھا؟ تیار ہو کے کتنا اچھا لگ رہا ہے؟" نوید مراد نے اشتیاق سے پوچھا۔
وہ خاموش ہی رہی۔ کیا بتاتی کہ جس کی وجہ سے وہ دن رات طعنے سن رہی ہے اسے دیکھنے کا یارا حوصلہ نہیں رہا۔ جب نوید نے اسے یہ بتایا تھا کہ وہ سامنے والا بڑا کمرہ بچیوں کے لیے سیٹ کر رہا ہے تو وہ کتنی خوش ہوئی تھی۔ اس رات پہلی بار اس نے سوہا کو اکیلے سلایا تھا اور ساری رات وہ کروٹیں بدلتی اور سسکیاں روکتی رہی تھی۔ صبح اس نے سوہا کو بخار میں پھنکتے پایا تو اس کے اپنے اندر آگ بھر گئی تھی مگر اب جیسے سارا ملال دھل گیا۔ سامنے والا کمرہ۔۔۔ نظروں کے بالکل سامنے۔۔۔ اور دونوں بچیاں ایک ساتھ اکٹھی رہتیں۔۔۔ سوہا اور زرشمہ دونوں کو دو تین دن میں ہی آسانی سے اکیلے رہنے کی عادت ہو جاتی۔
پھر نوید کا خصوصی دلچسپی لیتے ہوئے دو دن کے اندر اندر سارا کاٹھ کباڑ اس کمرے سے نکالتے ہوئے صفائی کروانا۔۔۔ بے بی پنک کلر کا پینٹ دیواروں پہ اور سلور کلر دروازوں پہ کرانا۔۔۔ نئے اسٹائل کا فرنیچر بار بار بدلا۔۔۔ کارپٹ۔۔۔ کارٹونز والے پردے اور بیڈ کورز۔۔۔ فلور کشنز۔۔۔ مگر ان سب کے ساتھ ساتھ شمشاد بیگم کے دل چھلنی کر دینے والے تبصرے۔۔۔ اس کی ساری خوشی مرجھا کے چلی گئی۔
"اور پیسے لے لینا۔۔۔ کل مارکیٹ ہو آنا۔۔۔ جو اچھا لگے لے لینا۔" نوید کی آواز پہ وہ خیالوں سے باہر آئی۔ نجانے کب سے وہ ٹکٹکی باندھ کے اس کے بے تاثر چہرے کو دیکھ رہا تھا۔
"کیا ضرورت ہے؟" وہ آہستہ سے بولی۔
"کمرے کی ڈیکوریشن کے لیے کئی چیزیں چاہیے ہوں گی۔ تمہیں تو اندازہ ہو گا بچیوں کی پسند کا۔ جو ان کو پسند ہو وہ لے لینا۔۔۔ لیمپ' وال کلاک' فوٹو فریم' کھلونے وغیرہ۔"
"جو آپ لے آئے وہ کافی ہے۔ میرا خیال ہے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔"
اس نے مرے مرے لہجے میں کہا تو نوید کا سارا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔
"پتا نہیں یہ عورت کبھی خوش بھی ہوگی یا نہیں۔" اس نے مایوسی سے سوچا اور سگریٹ سلگا لی۔

"آپ۔۔۔ آپ کا شکریہ ادا کرنا تھا۔" اس کے قریب بیٹھ کر جھجکتے ہوئے منزہ نے کہا۔
وہ چونکا۔۔۔ پھر بے یقینی سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"کس بات کا شکریہ؟"
"آپ نے سوہا کے لیے اتنا سوچا۔۔۔ اس لیے۔"
"یہ بات تو۔۔۔ ہے کہ وہ اب میری ذمہ داری ہے۔"
منزہ نے ایک گہری سانس خارج کی۔ شاید اس کی سماعت کوئی اور فقرہ سننے کی متمنی تھیں۔
شاید یہ کہ۔۔۔
"وہ اب میری بیٹی ہے۔"
مگر وہ۔۔۔ صرف۔۔۔ ذمہ داری ہونے کا اعتراف کر رہا تھا۔
"دوسری بات یہ کہ میں نے اس کے اور زرشمہ دونوں کے لیے ہی کیا ہے یہ۔" وہ اعلا ظرفی سے کہہ رہا تھا اور منزہ نے دل سے اس کی اعلا ظرفی تسلیم کی۔
"یہ آپ کا بڑا پن ہے۔ ورنہ میں جانتی ہوں' زرشمہ ابھی چھوٹی ہے اور اسے اماں کے ساتھ سونے میں کوئی مسئلہ بھی نہیں ہے۔ یہ آپ نے صرف سوہا کے لیے۔۔۔ میں آپ کا یہ احسان کبھی نہیں بھولوں گی۔"
نوید کو حقیقی معنوں میں تکلیف ہوئی۔
اس نے نہ احسان کیا تھا۔۔۔ نہ وہ اسے ممنون و مشکور دیکھنا چاہتا تھا۔ یہ سچ تھا کہ اس نے ایسا صرف سوہا کے لیے کیا تھا۔ اسے کوئی بیر یا پرخاش نہیں تھی۔ نہ سوتیلے پن کی خار۔۔۔ مگر ایسا کوئی خاص پیار بھی نہیں امنڈ رہا تھا جو وہ اتنا بڑا قدم اٹھاتا۔ سچ تو یہ تھا کہ ایسا اس نے اپنے اور منزہ کے مابین فاصلے کو پاٹنے کے لیے کیا تھا جو اب بھی یوں کا توں نظر آ رہا تھا۔ "یہ احسان نہیں ہے منزہ!"
"تو پھر؟"
"بس۔۔۔ میں گھر میں سکون چاہتا تھا۔ نہیں چاہتا تھا کہ سوہا کو لے کر کوئی مسئلہ ہو۔ تمہارے اور اماں کے درمیان کوئی تلخی ہو۔ گھر کا ماحول خراب ہو اور۔۔۔"
منزہ جس نے بڑی آس سے یہ سوال کیا تھا۔ بجھ کے رہ گئی اور پژمردہ چہرے کو جھکا کے انگلی سے تکیے پہ آڑی ترچھی لکیریں بنانے لگی۔
اچانک نوید کا بھاری ہاتھ اس کی متحرک انگلیوں پہ ٹھہر گیا۔
"اور تمہیں خوش دیکھنا چاہتا تھا۔"
منزہ کے ہونٹوں پہ ایک دبی دبی سی مسکراہٹ جھلک دکھانے لگی۔

☆ ☆ ☆

"دیکھ رہی ہے پروین۔۔۔! کیسے تین مہینوں میں گھر کا نقشہ ہی بدل گیا ہے۔" شادی کے بعد پروین کا آنا ہوا اور وہ بھی ایسے دن۔۔۔ جب شمشاد بیگم ناک تک بھری بیٹھی تھیں' اسی کے سامنے بھڑاس نکالنے کو بے چین۔
"ہاں دیکھ رہی ہوں۔ بھائی نے خاصی محنت کی ہے گھر پہ۔" پروین کی نظروں میں ستائش تھی۔
شمشاد کا دل کباب ہو گیا۔
"کہے تے سواہ محنت۔۔۔ نوید کی محنت کی کمائی برباد کی ہے۔"
"نہیں اماں! برباد ہونا تو نہیں کہتے اسے۔ سنوار کے رکھ دیا ہے سارا کچھ۔ اسے تو گھر بنانا کہتے ہیں۔ بھائی جان [illegible] مکان بنا ہوا تھا۔ گھر تو یہ اب لگ رہا ہے۔"

"پہلے کیا اجڑا ہوا گھر تھا۔" وہ چپ ہی تو ہو گئی۔ بیٹی کو دیکھ کر کیسے چاؤ سے، سو کے بختے ادھیڑے بیٹھی تھی مگر ایک زمانے بھر کی نکمی۔۔۔ سارے جہان سے نرالی۔۔۔ نندوں اور بیاہی بیٹیوں والا ایک بھی گن نہیں تھا... وہ دیر تک بڑبڑاتی رہی۔

"بھائی جان ماشاءاللہ لاکھوں سے اچھا کماتے، اچھا کھاتے ہیں۔ اللہ نے رزق اور کاروبار میں اتنی برکت رکھی ہے مگر آپ لوگوں کا رہن سہن۔۔۔ آپ نے کبھی بھائی جان کی آمدنی کو ڈھنگ سے استعمال کرنے کا سوچا نہیں۔ بھائی جان بھی دنیا داری سے کوسوں دور۔۔۔ سادہ مزاج ملنگ ٹائپ بندے۔۔۔ اپنا ذاتی گھر بنا لیا تو کوئی ڈالے مگر اسی پرانے محلے میں۔۔۔ کسی اچھے علاقے میں اتنا پیسہ لگایا ہوتا تو بات بھی تھی۔۔۔ خیر اسی کو سنوار رکھتے تب بھی ٹھیک تھا۔ ساجدہ بھابی جان سے زیادہ سادہ طبیعت۔ کچھ تھی بھی الہڑ اور کم عمر دوسرا کر دیں گھرانے سے تھیں، پیسے کے صحیح استعمال کا طریقہ نہ جانتی تھیں۔ شاید زندگی مہلت دیتی تو سیکھ ہی جاتی مگر ان کے دم سے پھر بھی غنیمت تھا۔ اس کے جانے کے بعد یہ گھر واقعی اجڑا گھر سے کم نہیں تھا۔ گنوار قسم کی نوکرانیوں کی بادشاہی تھی۔۔۔ ڈرائنگ روم کسی کو بٹھانے کے لائق نہیں تھا اور کچن میں کیڑے چلتے تھے۔ دیواروں پہ بھی گھٹنے، چھت پہ جالے، چولہے پہ چکنائی در چکنائی جمی ہوئی۔۔۔ فرش پہ گرے ہوئے سالن کے دھبے، ٹوٹی پھوٹی میز، کرسی، دیگچیاں ان اور یہ لاؤنج جہاں بستر پھیلے رہتے۔۔۔ پیٹی اور الماری بھی یہیں تھی اور ڈائننگ ٹیبل پہ صندوق اور اٹیچی کیس دھرے رہتے۔ اب دیکھو ذرا کیسی کایا پلٹ ہوئی ہے۔"

وہ توصیفی نظروں سے اٹھ کر پورے گھر کا جائزہ لے رہی تھی۔

نوید نے بچیوں کا کمرہ سیٹ کراتے ہوئے فالتو کباڑ باہر کیا پھینکا۔ حمزہ کو گویا موقع مل گیا گھر سے غیر ضروری سامان نکالنے کا۔ ضروری اور کبھی کبھار استعمال میں آنے والی اشیا اس نے اسٹور روم میں منتقل کیں۔ سارے اٹیچی کیس، پیٹیاں اور لوہے کی الماریاں ایک الگ کمرے میں رکھوائیں۔ کچن سے متصل چھوٹا سا ایک اور اسٹور روم تھا جس کی دیوار نکلوا کے کچن بڑا کروایا۔ لاؤنج میں سے فریج اور فریزر لا کر یہاں رکھوایا۔ پلاسٹک کی چار کرسیاں اور گول میز ناشتے کے لیے ایک طرف رکھوائی۔ صحن کی جانب کھلنے والی کھڑکی کی جالیاں خوب رگڑ کر دھلوانے کے بعد منی پلانٹ کی بیل اس پہ لٹکائی۔ کچن میں ٹائلز لگوائے تاکہ صفائی میں آسانی رہے۔

لاؤنج کی حالت بھی بدل گئی تھی۔ صوفے وہی تھے مگر اب قرینے سے رکھے تھے، نئے کشنز۔۔۔ پینٹنگ، وال ہینگنگ، پردے۔۔۔ ڈیکوریشن پیسز ڈرائنگ روم اس کے جہیز کے بھاری فرنیچر سے سج گیا تھا۔ جہیز کا بیڈ روم سیٹ پہلے ہی اس کے کمرے میں سیٹ ہو چکا تھا جبکہ نوید کا زیر استعمال فرنیچر جو تقریباً "نیا" ہی تھا اور شمشاد نے اسٹور میں اٹھوا دیا تھا اوپر تلے پڑا برباد ہو رہا تھا۔ حمزہ نے وہ پروین کے لیے مخصوص کمرے میں رکھوا دیا تھا۔ وہاں بھی نئے پردے۔۔۔ نیا قالین۔۔۔ ڈرائنگ روم کا پرانا صوفہ پالش کروا کے وہاں رکھوا دیا تھا۔ اس کمرے کا سامان قدرے مرمت اور جھاڑ پونچھ کے بعد ایک اور کمرے میں سیٹ کر کے اضافی گیسٹ روم شمشاد بیگم کے گاؤں والے رشتے داروں کے لیے مخصوص کر دیا جو اکثر آئے رہتے اور لاؤنج میں فرشی بستر کر کے یا صوفوں پہ سو کے شب بسری کرتے۔

"چل بس کر اب۔۔۔"

شمشاد نے جل کے کہا۔ وہ سارے گھر کا جائزہ لینے کے بعد مطمئن سی ہو کر بیٹھ گئی۔

"یقین ہی نہیں آتا کہ یہ گھر وہی ہے۔ ایک بات ماننا پڑے گی، نئی بھابی ہے سلیقے اور عقل والی۔"

پروین منصفانہ مزاج کی تھی، تعریف ادھار نہیں رکھتی تھی۔ اس لیے فوراً کہہ دیا۔

"ہونہہ۔۔۔" شمشاد نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

"اس کے دل سے پوچھ جس کی جیب خالی ہوئی ہے۔"

"اماں! مرد کو اپنا پیسہ گھر اور اولاد پہ خرچ ہوتے دیکھ کر خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی جتنا پیسہ خرچ ہوا ہے وہ نظر

بھی آ رہا ہے۔ کنویں میں پھینکا گیا ہے۔ کم از کم اب گھر اس قابل تو لگنے لگا ہے کہ کسی کو بلایا، بٹھایا جا سکے۔"

"ہاں ہاں! تجھے اپنی ساس کو بلاتے شرم آتی تھی نا۔۔۔ اب بلا لا۔۔۔"

"ارے اماں! کسی دن۔"

اسے ماں کی بات سن کر لطف آیا۔ پتہ نہیں وہ اس کی ساس سے اتنا خار کیوں کھاتی تھیں۔ اصولاً تو اسے بہو کے ناتے یہ فریضہ انجام دینا چاہیے تھا۔

"وہ بھی بہت کہہ رہی تھیں کہ ملنے کو دل چاہ رہا ہے۔"

"کیوں؟ میرے سے ملنے کو کیوں دل چاہ رہا ہے پچھلے کتنی کا؟ میں کون سی اس کی "ہاتن" (بچپن کی سہیلی) ہوں۔"

"تیری شادی... کے بارے میں کہہ رہی تھیں۔ شادی پہ سرسری سا ملی تھیں۔"

"ہیں پہ ہی رہنے دے۔ زیادہ میل ملاقات والے نہ لا لا کے دکھالے اور چوڑی ہو جائے گی۔ میں پتہ نہیں کیا سمجھتی ہوں جو زمانہ آ آ کے مل رہا ہے۔"

"او ہو اماں۔۔۔! خود کو ٹھنڈا رکھا کریں۔"

"بیڑہ ترے۔۔۔ اتنی گرمی میں ماں کو "تتا" (گرم) ہونے کی بجائے ٹھنڈا ہونے کا کہہ رہی ہے۔ نمونیہ لگوانا ہے مجھے؟"

"میں دماغ ٹھنڈا رکھنے کے بارے میں کہہ رہی ہوں اماں!"

"وہ میرے ہاتھ میں تو ہے نہیں۔۔۔ سارے گھر میں لگی پھرتی ہے یہ میرے اندر بھانبڑ جلانے کے لیے۔۔۔ تیلی (دیا سلائی)۔"

اس نے دھڑ دھڑ سیڑھیاں اترتی سوہا کی جانب اشارہ کیا۔

"ذرا دیکھ۔۔۔ جب آئی تھی تو پیلا پھٹک رنگ تھا۔۔۔ دیدوں کے نیچے کالے سیاہ حلقے، پسلیاں باہر آ رہی تھیں اب پھول رہی ہے۔۔۔ مفت کی کھا کھا کر۔"

"چھوڑیں اماں۔۔۔ یہ بھی کوئی۔۔۔" اس نے کوفت سے سر جھٹکا۔ ماں کی اسی قسم کی ذہنیت سے اسے گھبراہٹ ہوتی تھی۔

"دیکھ تو سہی۔۔۔ گال کیسے لٹک کے نیچے آ رہے ہیں۔۔۔ ایک ہماری وشمہ ہے۔۔۔ اور سوکھتی جا رہی ہے۔ نہ کھایا لگتا ہے نہ پیا۔"

"میں نے تو دیکھا ہے بھابی وشمہ کا بڑا خیال رکھتی ہے۔۔۔ پہلے اسے کھلاتی ہے۔۔۔ بعد میں خود کھاتی ہے۔ گڑیا سا سجا بنا کے رکھا ہوتا ہے۔"

"ڈرامے۔"

"نہیں اماں! میں نے اس کی آنکھوں میں وشمہ کے لیے بڑا خاص احساس دیکھا ہے۔ میں خود ماں ہوں، اچھی طرح پہچان سکتی ہوں کہ کسی بچے کے لیے اس احساس کا مطلب ڈرامہ ہے یا اصل مامتا۔"

"ہاں تو ماں ہے۔۔۔ اور میں تو پھوپھی ہوں تیری۔"

ماں کے دل جلے تبصرے پہ پروین کو بے ساختہ ہنسی آ گئی۔ ماں کے موڈ کے پیش نظر اس نے فوراً منہ پھیر کے اور کھانسی کے ذریعے اس ہنسی کو چھپانے کی کوشش کی مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکی۔

"ہاں ہاں نکال دندیاں۔۔۔ ماں کو کلپانے والی کی ہمدرد۔" شمشاد بیگم کو حسب توقع تپ چڑھ گئی۔

"نہیں اماں! میں تو۔"

"رہنے دے۔۔۔ سارا پتہ ہے مجھے۔ مجھ بدنصیب کا آج تک کون سگا بنا ہے جو تو بنتی۔ ماں پیو نے ہولی عمر میں سر سے بوجھ کی طرح پھینک دیا، پٹواریوں کی کڑی لا کے بھی تیرے ماشکی دادا کے میری قدر نہ کر سکے۔ خصم بھی ناشکرا

ـــ ویلا ـــ جب تک ساہ لیتا رہا میرے ساہ (سانس) چلتا رہا، مرا تو قرضے اور غریبی چھوڑ کر اوا اوہے تو وہ میری تمہیں پتر کو اس عمرے پڑھی لکھی زنانی کیا مل گئی' اڈی (ایڑھی) ہی دھرتی پہ نہیں ٹک رہی اس کی ـــ بیٹی پیدا ہوئی سگی ہوئی ہے پر تو نے تو یہ بات بھی غلط ثابت کر دی۔"

وہ ہول ہول کر کے ناک رگڑتے ہوئے اپنی گرفت آواز میں کہہ رہی تھی۔ بین ڈالنے کے سے انداز نے اس کی آواز کو اور بھی بھدا بنا دیا تھا۔

کچن میں کام ختم کرنے کے بعد چولہے بند کرتی منزہ چونکی۔

"یا اللہ خیر ـــ یہ کون ہے؟ اماں تو باہر پروین کے ساتھ بیٹھی تھیں۔ کیا مسئلہ ہو گیا؟"

ان عجیب و غریب آوازوں پہ وہ گھبرا کے مختلف وسوسے دل میں لیے باہر نکلی۔

شمشاد بیگم واویلا مچا رہی تھی اور پروین بے بسی سے دیکھ رہی تھی۔ منزہ کی ہمت نہ ہوئی کہ آگے بڑھ کے اصل بات پوچھنے کی کوشش کرے۔ کیا پتہ شمشاد بیگم اسے ماں بیٹی کے ذاتی معاملے میں مداخلت جانتے ہوئے بگڑ جائیں۔ منزہ تو عام حالات میں اسے مخاطب کرتے سے بھی گریزاں رہتی کہ کب کیا سننے کو مل جائے' کیسے پتہ اور اس وقت تو وہ جس موڈ میں لگ رہی تھی' ایسے میں اسے چھیڑنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ وہ کچن کے دروازے پہ ہی ان دونوں کی پشت پہ کھڑی معاملے کی سنگینی کا اندازہ لگانے لگی۔

"اماں! میں تو ـــ میرا یہ مطلب نہیں تھا اماں! میں بیٹی ہوں آپ کی۔ مجھ سے زیادہ کون پیار کر سکتا ہے"

وہ ماں کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھے جیسے اسے کسی بچے کی طرح بہلانے کی سعی کر رہی تھی۔

"بس بس ـــ رہن دے اپنا پیار ـــ پیار کرتی ہے تو اپنی بھابھی تمی سس (ساس) سے ـــ میں تیری کیا لگتی ہوں تیری بلا سے میرے ساتھ جو بھی ہوتا رہے۔ کوئی بھی میرا دل جلاتا رہے۔ مجھے اپنے ہی گھر میں ستاتا رہے۔ تجھے اس سے کیا؟ تو نے تو میری بات پہ یقین ہی نہیں کرنا۔ تیری نظر میں تیری ماں جھوٹی ہے' باقی سارا زمانہ سچا۔"

وہ بلک بلک کے رو رہی تھی۔

منزہ کا دل جیسے کوئی پیچھے کی جانب دھکیلتا جا رہا تھا۔ وہ بھانپ گئی تھی کہ شمشاد کسی اور کا نہیں اس کا ذکر کر رہی ہے۔ اکیلی ساس کے سامنے ہی وہ خود کو بے دست و پا تصور کرتی تھی..... اس کی کٹیلی زبان' جاہلانہ کوسنے اور گھناؤنے الزامات سن کر بے بسی اور ذلت سے تپتی رہتی تھی اور آج تو نند بھی ساتھ تھی۔

اسے نصرت اور شمیم کی جوڑی یاد آنے لگی۔

اس بار مقابلے پہ پھر ایک جوڑی تھی ـــ وہی ساس اور نند کی۔

اور وہ بھی وہی تھی ـــ ہمیشہ کی بے زبان ـــ بزدل کم ہمت۔

اور اس بار تو اس کا جوڑی دار بھی نہ تھا۔

پہلے تو مظہر تھا جو اس کے سامنے۔

"اف....." اس نے زبان دانتوں تلے دبا لی۔

"یہ کس کا نام پھر سے لے لیا۔" اس نے زبان کو کچل کے گویا سزا دی۔

خون کا نمکین سا ذائقہ آنسوؤں کے نمکین گولے کے ساتھ حلق کے اندر اترا ـــ اور اسے کڑوا کر گیا۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے اماں! مجھے بھلا اپنی ماں سے زیادہ پیارا کون ہو سکتا ہے۔"

پروین نے آنسوؤں کے اس سیلاب کے آگے بند باندھنے کی کوشش کی۔

"میں تیری کون ہوتی ہوں..... میرے دشمن تیرے سگے ہوتے ہیں۔" وہ پروین کو اس وقت کوئی بگڑی ہوئی ناراض بچی لگ رہی تھی جسے سارا زمانہ اپنا دشمن لگ رہا تھا۔ اس نے اس ساٹھ باسٹھ سال کی بچی کو لالی پاپ تھمایا۔

"دشمن جائیں بھاڑ میں..... میں اپنی اماں کے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے اکیلی کافی ہوں..... سچ" آخر بیٹی کس کی ہوں؟ شمشاد بیگم کی۔"

شمشاد بیگم نے لالی پاپ تھام لیا۔

"بس ذرا خیر ہو جائے ـــ لگ پتہ جائے گا اس کل کی آئی کو ـــ اور اس کی چھوکری ـــ اسے تو بھگانے کا کوئی طریقہ"

بیٹی کے بہلاوے کا لالی پاپ چوستے ہوئے واقعی بہل گئی۔

"ہاں اماں! ہم ایسے ہی کریں گے.. بھگا دیں گے اسے بھی۔"

منزہ کے کچن کی دہلیز پہ جمے پیر زمین کے اندر تک دھنس گئے۔

"جب سارا کچھ پتہ چل جائے گی؟"

"ہاں ـــ یہ بھی تو دیکھیں ـــ اس گھر کو ایک عورت کی اور وشمہ کو ماں کی کتنی ضرورت ہے۔ ابھی ایسا پنگا لینا"

"میں اس گھر کی فرد نہیں ہوں ـــ ضرورت ہوں۔" منزہ نے یاسیت سے سوچا۔

دوسری جانب پروین شمشاد بیگم کی جارحیت کم کرنے کے لیے مصلحتاً کہتی جا رہی تھی۔

"ایسا نہ ہو بیٹی کے پیچھے پیچھے وہ بھی چلی جائے۔"

"چلی جائے ـــ کل کی جاتی آج مر کھپ جائے ـــ میرے نوید کو ہور بتھیریاں۔"

"نہیں اماں ـــ بھائی جان کا دل آپ کی جانب سے برا ہو گا اور یہ کوئی ایک وجہ نہیں ہے اسے برداشت کرنے کی اور بھی وجہ ہیں ـــ محلے اور خاندان کے لوگوں میں بھی آپ اور بھائی جان برے بنیں گے کہ بیاہ کر لائے اور بھی نباہ نہ سکے۔ سب سے بڑی وجہ کہ وشمہ بہت مانوس ہو گئی ہے بھابی سے۔"

"یہی تو چالاکی ہے اس ڈرامے باز نے۔" شمشاد نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔

"اب تو بھی ہے۔ چالاکی ہے یا ڈرامہ ـــ مگر وشمہ کو سنبھالنا مشکل ہو گا بھابی کے بغیر۔"

"اے ہے سنبھالنا تو پہلے کون سا سوکھا (آسان) تھا۔"

"تو خود سوچیں اماں..... آپ کی عمر ہے کیا اب وشمہ کے پیچھے بھاگنے کی ـــ یہ گھرداری سنبھالنے کی۔ ذرا ہوشیاری سے کام لیں اماں ـــ اپنا مطلب نکالنے کے لیے انسان کو بڑا کچھ کرنا پڑتا ہے۔ آپ بھی تھوڑا سا صبر ـــ اور تھوڑی سی چالاکی دکھاویں۔"

"چالاکی اور ہوشیاری ہی تو ساری عمر کرنی نہیں آئی تیری ماں کو۔" اس نے حسب توفیق بھولا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

"تو اب کر لیں۔" دل ہی دل میں توبہ توبہ کرتی پروین نے ماں کو اپنے ہی انداز میں لائن پہ لاتے ہوئے کہا۔

"رہنے دیں نا اس ذرا سی لڑکی کو ـــ یہیں پڑی رہے کسی کونے میں آپ کا کیا لیتی ہے؟ اس کی وجہ سے اس کی ماں کا بھی سنبھالا رہے گا اور آپ کی اور وشمہ کی خدمت کرتی رہے گی۔"

منزہ نے بے یقینی سے پروین کو دیکھا کہ بظاہر اتنی سلجھی ہوئی اور معقول نظر آنے والی عورت اندر سے ایسی گھٹیا اور مطلبی ذہنیت والی بھی ہو سکتی ہے۔

"پڑی رہنا ـــ وہ کونے میں ہی تو نہیں پڑی رہتی۔ تو پوچھتی ہے وہ میرا لیتی کیا ہے؟ وشمہ کے برابر خرچہ ہو رہا ہے اس کا۔ حق تو اس کا ہے' یہ برابر وصول رہی ہے..... میری پوتری کی برابری؟ اب تو اسکول بھی داخل کرا یا ہے۔ بڑا خرچہ نہیں ـــ اوپر سے کتابوں' پنسلوں کا خرچہ ـــ وین بھی لگوا کے دی ہے۔"

"آپ کما رہے ہیں بھائی جان ـــ کمانے دیں ـــ یتیم بچی ہے۔" منزہ کے دل میں ایک اور سوئی چبھی۔

"اور بچی ماں کی بھی تو نہیں پالنا ہی تھی ـــ مگر اس نے وشمہ کی ماں بنتے ہوئے صرف ثواب کمانے کی نیت نہیں کی تھی۔"

"وشمہ کے سر کا صدقہ سمجھ کر بھول جائیں۔"

اب کی بار سوئی نہیں ـــ پورے کا پورا خنجر اتر گیا۔

"صدقہ؟..... خیرات؟ میری بچی، میری سوہا مظہر کی لاڈلی اس کی شہزادی صدقے کے قابل ہے۔"

من من بھاری ہوتے قدم اس نے بمشکل اپنے کمرے کی جانب موڑے۔ مزید کچھ سننے کی تاب نہ رہی۔

"میں اسے ایسے راج نہیں کرنے دوں گی۔" شمشاد بھی اپنے نام کی ایک تھیں۔ ذرہ برابر پیچھے نہ ہٹیں۔

"توبہ اماں! آپ کو سمجھانا کتنا مشکل ہے۔"

وہ بھی تھک آ گئی۔ بلاوجہ ماں کی ہاں میں ہاں ملانے کا بھی کوئی فائدہ نہ ہوا تھا۔

"سمجھنے کی ضرورت تجھے ہے اور تیرے بھائی کو..... میں کیوں کل کی آئی کے پیچھے لگوں مجھے نہیں ...

میسنا بن کے مطلب نکالنا۔ میں تو سینہ ٹھونک کے مقابلہ کرنے والی عورت ہوں۔"

"تو کریں پھر مقابلہ..... آپ کی مقابلے بازی میں دوسری بار گھر اجڑ جائے گا بھائی جان کا۔" وہ زچ ہوا تھی۔

"پہلی بار بھی میں نے اجاڑا تھا؟ ساجدہ کو سیڑھیوں سے دھکا میں نے دیا تھا؟" وہ بھڑک اٹھی۔

"یہ تو سوچیں آپ مقابلہ کس سے کر رہی ہیں؟ سامنے ہے ہی کون؟ وہ تو آپ سے لڑنے پہ تیار نہیں ہے۔"

پروین کا اشارہ منزہ کی جانب تھا۔

"وہ گھنی ہے، میری طرح سینہ ٹھونک کے میدان میں اترنے والی جی دار نہیں وہ..... جڑیں کاٹ رہی ہے

گھر کی۔"

"یا اللہ..... " پروین نے سر تھام لیا۔ جب سے آئی تھی ماں کی ایسی ہی بے سروپا باتیں سنے جا رہی تھی۔

اس کے برعکس اس نے منزہ کو بہت دھیمے مزاج کا صلح جو اور صابر پایا تھا۔

"وشمہ کو مٹھی میں لینے کے پیچھے بھی اس کا ایک مقصد ہے۔" اس نے مزید زہر افشانی کی جسے پروین نے نظر انداز

نہ لائی۔

"مبو تو رہے..... کم از کم وشمہ کو محبت اور توجہ تو مل رہی ہے نا۔" اس نے اکتا کر کہا۔

"اس سوتیلی کی محبت؟ تیری عقل کدھر ہے پروین تو بڑی ماں بنتی ہے نہ..... تو ماں بن کے سوچ..... سوتیلی

کو اپنے جنے بچے کے برابر لائے گی؟"

"اماں..... " وہ بری طرح بدک گئی۔

"بس..... ؟" شمشاد نے فاتحانہ انداز میں بھنویں اچکائیں۔

"نکل گیا دم؟ ..... اپنی بار کیسی کلیجے میں جا کے لگی ہے بات۔"

پروین گلہ آمیز نظروں سے ماں کو دیکھنے لگی جس نے بیاہی بیٹی کے سامنے اس کی خود ساختہ سوتن کی بات

دی تھی۔

"اماں! آپ کو ایسی بات منہ سے نکالنے سے پہلے سوچنا تو چاہیے۔ کوئی وقت قبولیت کا ہوتا ہے۔"

ناراضی سے اس نے جتایا۔ شمشاد پھر بھی بات کی نزاکت کو نہ سمجھی۔

"میں تو یہ بتا رہی ہوں کہ اس جادوگرنی کا وشمہ کے لیے پیار نرا ڈھکوسلہ ہے۔ صرف نوید کی آنکھوں پر پٹی

باندھنے کے لیے ہے۔ اس پہ احسان جتا کے اسے بس میں کر رہی ہے۔ وشمہ..... ذرا سی بچی ہے اسے

مشکل ہے۔ اسے اپنے ہاتھوں پہ ڈال سکے وہ نوید کے اور بچی کو اپنے جوگا کر لے گی۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ سیانی بی بی کہ وہ وشمہ کو میرے سے دور رکھ رہی ہے۔ تیرے پاس نہیں آنے دے رہی۔

کیوں؟ کیونکہ ہم دونوں ہیں اس کی سگی۔ میں دادی تو پھوپھی، ہم سے اس کا پیار نہیں دیکھا جاتا..... وہ بچی

سیدھی پٹی پڑھا کے ہمارے سے دور اور اپنے سے پاس کر رہی ہے تاکہ اس کے ساتھ جو اچھا برا کرے

ہی نہ چل سکے۔ کوئی پوچھ گچھ کرنے والا ہی نہ رہے۔ آئی بات عقل میں؟"

جو نکتہ وہ پروین کے دماغ میں ڈالنا چاہ رہی تھی، وہ اس کی سمجھ میں آ تو گیا۔ مگر اس پہ یقین کرنے میں وہ...

... بن بتی
... ایسی لگتی تو نہیں۔"

☆ ☆ ☆

"مرد اور عورت گاڑی کے دو پہیے ہیں۔" تحریم نے اردو کی کاپی میں تحریر کرتے ہوئے زیر لب دہرایا۔

"جب ایسا سوچے۔" مہتاب جو نزدیک رکھی مسہری پہ مسند پہ مہندی تھوپے بیٹھی تھی۔ منہ پہ دوپٹے کا کولہ سا بنا کے بنس...

... نہیں پتا مدیحہ۔ شوہر آپ کے اچھے بھلے بندے اور بندیاں گاڑی کے پہیے بن جاتی ہیں۔"

"... تو مثال ہے۔" تحریم جو سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے اور کچھ فطرتاً بھی سمجھدار اور سنجیدہ مزاج

تھی، جتانے لگی۔

"اس کا مطلب ہے کہ دونوں برابر ہیں..... ایک جیسے۔"

"کوئی ایک جیسے نہیں۔" مہتاب نے ہاتھ بھر کے مزید مہندی اپنے سر پہ لگاتے ہوئے نفی میں گردن ہلائی۔

مہندی کے چھینٹے فلور کشن کے ساتھ ساتھ وائٹ پینٹ والی دیوار تک بھی گئے۔ مدیحہ جز بز ہو کے رہ گئی۔

"اب وہ زمانہ نہیں آپا! اب عورت اور مرد کی حیثیت ایک جیسی ہی ہے۔"

"اگر ایک جیسی ہوتی تو میں مختار کو گھر سے نکالتی..... وہ مجھے نہ نکالتا۔"

مدیحہ نے تحریم کو گھور کے دیکھا، وہ فوراً کاپی پہ سر جھکا کے دوبارہ لکھنے لگی۔ تقدیس البتہ ذرا ٹنگ کرتے ہوئے

صرف چور نظروں سے اپنی اس دلچسپ باتیں کرنے والی آنٹی کو تکتی رہی بلکہ کان بھی پوری طرح اس جانب لگا

رکھے تھے۔

"اور میں کسی اور وجہ سے بھی کہہ رہی تھی کہ مرد اور عورت کبھی ایک برابر ہو ہی نہیں سکتے۔ اس لیے نہیں کہ

مرد کوئی بڑی اونچی چیز ہے اور عورت کبھی اس جیسی بن ہی نہیں سکتی بلکہ اس لیے کہ مرد کی کیا حیثیت کیا اوقات کہ

عورت کے مقابلے پہ آئے۔ نہ شکل کا مقابلہ..... نہ عقل کا۔ عورت وفا کرتی ہے اس کے دل میں حیا اور لحاظ

ہوتا ہے اور مرد..... اس کا تو دل ہی نہیں ہوتا۔"

"دل نہیں ہوتا؟" تحریم نے چونک کر کاپی سے سر اٹھایا۔

"بالکل تمہارے ہیومن بینگز کا ہوتا ہے۔ ماما! کیا مرد ہیومن بینگز نہیں ہوتے؟ man کو ہی مرد کہتے ہیں نا؟

ہیومن بینگ۔"

"تحریم! اپنا بکس اٹھاؤ اور اپنے کمرے میں جا کے پڑھو۔" مدیحہ نے اس کی فر فر چلتی زبان کے آگے بریک

لگائی۔

"آپ بھی اندر آئیں..... ہمیں تو آپ نے ہی پڑھانا ہے۔"

... بھولی بھالی ... سمجھنے لگیں۔

"یہ کون سے ہیومن بینگ کا ذکر کر رہی ہے؟"

"آپا..... " مدیحہ نے ایک گہری سانس لی۔ دس منٹ میں وہ ناک تک بھر چکی تھی آپا کی میزبانی سے۔

"انسان کو کہتے ہیں انگریزی میں۔"

"انگریزی میں کوچا ہے ملتانی میں..... فارسی میں کوچا ہے سندھی میں..... مرد ہوتا ہی..... ہے۔"

ایک اور گولا ...

"بچوں کو تقریباً ہانکتے ہوئے ان کے کمرے میں لے گئی۔ انہیں پڑھنے کے لیے بٹھا کے اس نے گھر کا نمبر

... "ٹیسٹ کیسی رہی؟" بے جی کے استفسار پہ وہ پھٹ پڑی۔

"رہا خیر... ستاں خیر ہووے میری دھی رانے تے اودے سروے سائیں دی — بچے تو ٹھیک ہیں؟" وہ پوچھنے لگیں۔

"جی بے جی... شکر ہے اللہ کا بچیاں بھی ٹھیک ہیں اور بچوں کے پاپا بھی۔" اس نے پہلے ان کی تسلی کرائی پھر اپنا مسئلہ بیان کیا۔ "مصیبت تو وہ ہے جس کو میں نے دعوت دے کر بلایا ہے۔"

"اچھا... دعوت دے رہی ہے؟ ہاں ہاں ضرور آئیں گے۔ سارے آئیں گے۔"

"بے جی... میں آپا مہتاب کی بات کر رہی ہوں۔ جسے ہمدردی میں میں نے یہاں آنے کی دعوت دی تھی مگر اب پچھتا رہی ہوں۔ وہ تو جیسے یہیں کی ہو گئی ہے یہاں۔ واپس جانے کا نام نہیں لے رہی۔"

"تو چھا اچھا..." بے جی نے یوں سرسری سا کہا جیسے مدیحہ انہیں کوئی اخباری خبر سنا رہی ہو... غیر اہم سی۔

"کیا اچھا بے جی... انہیں واپس بلوائیے کسی طرح۔"

"نال پتر... ایسے دل تھوڑا نہیں کرتے۔ مہمان تو اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔ ان کو واپس نہیں موڑتے۔"

"وہ مہمان نہیں بلائے جان ثابت ہو رہی ہیں۔"

"بوہتا (زیادہ) کھاتی ہے؟" انہوں نے کمال سادگی سے پوچھا۔

کوئی اور یہ کہتا تو شاید وہ اسے اس کا طنز سمجھتی... مگر یہ بے جی تھیں۔ وہ جانتی تھی یہ سوال انہوں نے سنجیدگی سے پوچھا ہے۔

"ہاں... بہت۔" اس نے اسی سنجیدگی سے جواب دیا۔

"میرا دماغ کھاتی رہتی ہے۔" وہ کلس کے بول رہی تھی۔

"اچھا میں کہتی ہوں کسی سے... اسے لینے آ جائے۔"

"اسے اب اس کے گھر بھیجنے کی کریں۔"

"گھر کہاں رہا بد نصیب کا۔"

"ماں باپ کا تو ہے۔"

"بھرجائیاں کدھر برداشت کرتی ہیں۔"

پچھلی بار کی بات بے جی نے بتائی تھی تو اس کا دل مہتاب کی ہمدردی سے لبالب بھر کے چھلکنے لگا تھا۔ اپنی بھابیوں کی شان میں اس نے خاصے گستاخ کلمات بھی بے جی کے سامنے دہرائے تھے۔ مگر اب حالات بدل دوسرے تھے۔

آج اسے مہتاب کے بجائے اس کی بھابیوں سے ہمدردی محسوس ہو رہی تھی۔ جن کو اسے نجانے کب تک برداشت کرنا تھا۔

"اپنے شوہر سے صلح صفائی کیوں نہیں کر لیتی؟"

"بہتیرا سمجھایا ہے ساری برادری نے... مت دی ہے کہ اپنے بچوں کے لیے سر نیچا کر لے۔ مرد سے مانگنے میں شرم کیسی مگر یہ ضد پہ ہے کہ مختار نہ صرف سوت باہر نکالے بلکہ اس سے معافی بھی مانگے اور بطور جرمانہ کے طور پر اکیس مربعے لکھ کر دے۔ بھلا ایسا ہوا ہے کبھی؟"

"یہ تو صاف منہ پھٹنے والی بات ہے۔" مدیحہ چونکی۔

"یقینی نہ مختار بھائی صاحب یہ مانیں گے... نہ صلح کی نوبت آئے گی۔ تو بہ... کتنی نفرت بھری ہے اس کے اندر گھر بچانے کے لیے کیا نہیں کرنا پڑتا۔ ایسی منہ زوری تو یہاں شہر کی عورتیں نہیں دکھاتیں بے جی!"

"پتہ نہیں کی ہو گیا اسے زمانے نوں۔" انہوں نے لمبا سا ہوکا بھرا۔

"مختار نے اک چھوڑ چار زنانیاں حویلی میں رکھ لے... حویلی میں کوئی جگہ کم تھوڑی ہے۔ پتہ نہیں اس کو کیا پیڑ ہے... خیر تو فکر نہ کر میں بات کرتی ہوں تیرے بھرا سے۔ شہر کوئی پھیرا لگے تو اسے لیتا آئے۔"

"یاد سے کہنا بے جی!"

"ہاں ہاں! ابھی کہتی ہوں۔ خیر سے گھر ہی ہے آج۔"

"مہتاب بی بی... حاضری دے آئے؟ اجازت مل گئی گھر آنے کی؟" مدیحہ نے طنز کیا۔

"ہائی کرے فیر بچارہ... تیرے سوہرے کی ذمہ داری بھی اس نے ہی نبھائی ہے۔ جوائی جو ہوا اس کا اور سگا بھتیجا بھی... پتر تو اس کا مر جانے کے بس کیا ہے۔ یہ تو میرا پتر ہے جو وہ ہری ذمہ داریاں نبھا رہا ہے۔ اپنے گھر کی بھی اور بیاہے بچے کی بھی۔ کدھر ملتا ہے ایسا جوائی آج کل۔ ہمارا جوائی ہے... تیرا بندہ اللہ سلامت رکھے ہنستا کھیلتا رہے۔ تیرے کو برا تو ہوتا ہے کہ کبھی سلام دعا کا بھی فون نہیں کرتا۔ ورے کے ورے دن (تہوار) پہ بھی نہیں۔"

"بوچھا بے جی... میرا سلام کہنا بھائی جان سے۔"

مدیحہ نے خود بتنے بھی گلے ہوں کسی اور سے اس کی برائی وہ سن نہیں پاتی تھی۔ یہ اس کی محبت ہی تھی جو شوہر بے اختیاری ہونے کے باوجود وہ یہاں خاندان سے الگ رہنے پہ مجبور ہو گئی تھی۔ پھر وہ اس کی کمی نظروں نہیں دیکھ سکتی تھی۔ جب سے اس کی چوری سسر اور سالے کے سامنے پکڑی گئی تھی وہ بچے چوروں کی طرح ان سے چھپتا چھپتا رہتا تھا۔

"یہ کیا تھا؟" لاؤنج میں آتے ہی وہ دھک سے رہ گئی۔

وہ ان کے بعد اب پیروں پہ مہندی تھوپے ہوئے تھیں اور اس لیپا پوتی کے بعد صوفے پہ ہی سو گئی تھی... سر کے نیچے کشن ضرور رکھا تھا اور پیروں کے نیچے اپنا جارجٹ کا دوپٹہ بھی گول مول کر کے رکھ لیا تھا لیکن اس کے باوجود مہندی کے کئی داغ صوفے پہ لگ چکے تھے۔

"آپا!" وہ اس کے سر پہ آ کے چلائی۔

جیٹھ کی ناراضی کے خوف سے اس کی آواز پھٹ سی گئی تھی اور اس کا اپنا دل بھی برا ہو رہا تھا اتنے قیمتی صوفے کی یہ درگت بنتے دیکھ کر۔

"آئے... ہائے کیا ہوا؟" وہ ہڑبڑا کے اٹھی اور حواس باختہ انداز میں ادھر ادھر دیکھنے لگی۔

"کیا ہوا؟ بچے کدھر ہیں؟"

"وہ اپنے کمرے میں ہیں مگر... یہ آپ نے... مہندی پیروں پہ لگا کر آپ صوفے پہ ہی سو گئیں۔"

"ہاں... وہ کسی سی جمائی لینے لگی۔ جمائی ابھی تمام نہ ہوئی تھی کہ انگڑائی لینے کے لیے بازو اٹھا لیے۔ مدیحہ کے گھونٹ بھرتی اس انگڑائی کے ٹوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔

"ہاں... وہ آلکس (سستی) سی ہو رہی تھی... ادھر ہی پڑ گئی۔"

"مگر آپا! یہ دیکھیں مہندی کے داغ..." وہ روہانسی ہو چکی تھی۔

"ہائے... ستیاناس جائے اس نیند کا۔"

وہ کوتی اس طرح ہڑبڑا کے اٹھی کہ مہندی سے بھرے پیر سیدھے قالین پہ رکھ دیے۔

"یا اللہ... کس عذاب میں پھنس گئی ہوں۔"

وہ بوکھلائی ہوئی جلدی سے میز سے اخبار کھینچ کر ہی قالین صاف کرنے لگی پھر ملازمہ کو بھی آواز دے ڈالی۔

"عذاب تو تو نے خود اپنے جی کو ڈالا ہوا ہے۔ ہر طرف مصیبتیں... کہیں قالین... کہیں کپڑے... کہیں کھڑکیاں... پڑے ہیں تو کہیں چھ چھ فٹ لمبے لیمپ... پھولوں والے پردے الگ سایا ڈال رہے ہوتے ہیں۔ کل میرا دوپٹہ ہاتھ لگ گیا تھا کسی کے... صوفے ہیں تو دودھ جیسے۔ بھلا اٹھنے بیٹھنے کے لیے کوئی میلے خورے رنگ کے صوفے لینے تھے۔ میرا تو دو دن میں سارا اوکھا ہو گیا ہے۔ کیسے رہ لیتی ہے تو۔"

اس کا موڈ اتنا خراب تھا کہ بغیر کوئی جواب دیے ملازمہ کو قالین صاف کرتے دیکھتی رہی۔

مہتاب کو برا لگا۔

"میں کون سا شوق سے رہ رہی ہوں یہاں... گھر سے نکالی عورت کا بھی کوئی ٹھکانہ ہے... بھرجائیوں کے طعنے

سن کر دل گھبرایا تو نوجی کے پاس آ گئی۔۔۔ وہاں سے آپ نے یاد بھیجا" آگئی منہ اٹھا کے اب جاؤں یا کیسے
نہیں دل تنگ رہا تیرے اس جنجش نخر میں۔ اپنے چند میں ہی بھلی ہوں۔۔۔ مگر بھی اکیلی گھر سے نکلی تھیں

"بھائی جان نے کسی کام سے شہر آنا ہے کل۔۔۔ یہاں تو آئیں گے ہی۔۔۔ آپ کو جانا ہے تو ان کے ساتھ جایئے گا۔"

مدیحہ نے خشک لہجے میں کہتے ہوئے واپسی کے ارادے پر رضامندی کی مہر لگا دی۔
"اچھا۔۔۔ کب آ رہا ہے۔" وہ دلچسپی سے پوچھنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"خیریت سے تشریف آوری ہوئی ہے تمہارے بھائی کی؟" جعفر نے کمرے میں آتے ہی بریف کیس ایک جانب پھینکا اور اس سے کڑے تیوروں کے ساتھ سوال کیا۔
اسے ڈر رہا تھا کہ کہیں۔۔۔ بھائی صاحب کی اسلام آباد آمد مدیحہ کی کسی شکایت کی وجہ سے نہ ہوئی ہے۔ جعفر کے ہر عمل پہ شک رہتا تھا۔ بار بار آفس میں بھی فون کر کے چیک کرتی رہتی تھی۔ وہ اس کے ہاتھوں تنگ تھا ہی۔۔۔ ان کی آمد سے اور بھی خائف ہو گیا۔
"اپنے کسی کام سے آئے ہوں گے۔" اسے بھی جعفر کو گھبرایا گھبرایا دیکھ کر لطف آ رہا تھا۔
"تو رات رکنے کا پروگرام کیسے بنا لیا؟"
"ان کی بہن کا گھر ہے' رہ سکتے ہیں۔"
"پورے قصور کا گھر ہے یہ۔۔۔ سارا قصور آ کے رہ سکتا ہے۔" وہ تابی گلے سے نوچتا ہوا بڑبڑایا۔
"جب سے یہاں آئے ہیں' پہلی بار میرے میکے سے کوئی رہنے آیا ہے حالانکہ میرے میکے کا تو صرف ایک ہی ۔۔۔ مہتاب آپا کا آپ سے بھی وہی رشتہ ہے جو مجھ سے ہے اور بھائی جان بھی آپ کے کچھ لگتے ہیں۔ بھلے آپ کے۔۔۔ میرے بھائی ہونے کے ناتے نہ سہی' اپنی بڑی بہن کے شوہر ہونے کے ناتے ہی احترام کر لیں۔"
"میں کون سا گلہ کر رہا ہوں۔۔۔ احترام ہی کر رہا ہوں اتنے سالوں سے۔"
"وہ۔۔۔ آپا کو لے جانے آئے ہیں میں نے ہی کہا تھا۔"
"بس؟۔۔۔ دل بھر گیا میزبانی سے؟"
"آپ کو بلاوجہ تکلیف ہو رہی تھی' اس لیے مجھے خود کہنا پڑا' ورنہ کتنا برا لگتا ہے گھر آئے مہمان کو منہ سے کہہ کر بھیجنا۔"
"اگر وہ اسے لے جانے آئے ہیں تو ٹھیک ہیں۔ پھر شاید ان کی ایک رات کی میزبانی برداشت ہو سکتی ہے۔"
"جعفر! وہ میرے بڑے بھائی ہیں۔" مدیحہ کو سخت برا لگا۔ اس نے فوراً جتا بھی دیا۔
"میں تمہارے بھائی کے بارے میں نہیں' اپنے بہنوئی کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔"
جعفر نے دل جلانے والی مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

☆ ☆ ☆

"ماما۔۔۔! دیکھیں میں کتنی اچھی لگ رہی ہوں۔"
وشمہ اس کا ستاروں والا دوپٹہ سر پہ لے کر معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔
منزہ نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔
"آپی وشمہ کے سر کا صدقہ ہی سمجھ لیں۔"
پروین کے الفاظ کی بازگشت اسے ایک پل چین نہیں لینے دے رہی تھی۔

اس نے یہ شادی کر کے ٹھیک کیا یا غلط۔۔۔ ابھی تک فیصلہ نہیں کر پا رہی۔۔۔ مجھے تحفظ مل گیا۔۔۔ چھت مل گئی۔۔۔ مگر میری بچی اسے کیا ملا؟ صدقہ۔"
اس نے اپنے آنسو اندر ہی اتار لیے۔
"اس ایک قدم نے میری لاڈوں پلی کو کتنا ہلکا کر دیا ہے۔ کیا کیا سوچا تھا میں نے اس کے بارے میں اور کیا ہو گیا اس کے ساتھ۔"
"ماما! وہ نہیں ماں بس دوپٹہ۔ ماما! مجھے اور آپی کو بھی ایسا دوپٹہ لے کر دو۔"
وشمہ کی آواز پہ وہ پھر خیالوں سے باہر آ گئی۔
وشمہ سے روز بہت لیے دیے تھا۔ مگر وشمہ شاید ننھی ہی محبتیں گوندھ کر تھی کہ منزہ تو منزہ وہ خود سے بڑی بہن سوہا کے بھی آگے پیچھے گھوما کرتی۔ اپنے نام سے پہلے اس کا نام لیتی۔ جیسے ابھی ابھی اس دوپٹے کی فرمائش اس نے صرف اپنے لیے نہیں' اس کے لیے بھی کی تھی۔ اس بات سے منزہ کی سوچ نے ایک مثبت رخ اختیار کیا۔
"عمر کا رویہ تو سوہا کے ساتھ ٹھیک ہے۔ مانا کہ سگے باپ والا والہانہ انداز نہیں مگر اب سب کچھ تو ملنے سے رہا۔ کیا کم ہے کہ انہوں نے سوتیلا باپ بن کے کبھی نہیں سوچا۔ کبھی وشمہ کے ساتھ اسے میری گود میں دیکھ کر ناگواری نہیں جتائی۔ اس کی کسی ضرورت سے منہ نہیں موڑا۔۔۔ اسے بہترین اسکول میں داخل کرایا ہے۔ میں نے ان کی آنکھوں میں اب تک اس کے لیے بےزاری نہیں دیکھی۔ وشمہ بھی اس کی دیوانی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ محبت اور پروان چڑھے گی۔ مجھے پروین جیسی عورتوں کی بے سروپا باتوں پہ اپنا دل میلا نہیں کرنا چاہیے۔"
اس نے خود کو مزید یاسیت کا شکار نہ ہونے دیا۔ ایک تاسف کی لہر بھی رہ رہ کے اٹھ رہی تھی مگر وہ اب طول نہیں دے رہی تھی۔
"میری گڑیا کو ابھی سے دوپٹہ لینے کے ارمان ہیں۔" وشمہ کو گود میں بھر کے اس کے پھولے پھولے گالوں پہ چٹا چٹ پیار کرتے ہوئے وہ اپنا دھیان بٹا رہی تھی۔
اسی وقت پروین دروازے پہ آ رکی۔
جب سے آئی تھی' فرصت سے اس کے پاس بیٹھ کے کوئی ڈھنگ کی بات کرنے کا موقع ہی نہ ملا۔ کام ساں کے بکھیڑے ختم نہ ہو رہے تھے۔ وشمہ سے اس کے لاڈ دیکھتے ہوئے وہ وہیں کھڑی مسکرانے لگی۔
منزہ وشمہ کو گود میں لیے دروازے کی جانب پشت کیے ہوئے تھی' وہ اس کا چہرہ تو نہیں دیکھ پا رہی تھی مگر اس کے لہجے کی حلاوت اور وشمہ کے گرد لپٹا اس کا محبت سے بھرپور لمس اسے احساس دلا رہا تھا کہ شمشاد بیگم کے خدشے کتنے بےبنیاد ہیں۔
"میں اپنی گڑیا کے لیے اس سے بھی اچھا دوپٹہ لوں گی' بالکل پری لگے گی۔" منزہ نے اس کی پیشانی چومی۔
"پری کیا ہوتی ہے ماما؟"
"پری۔۔۔" وہ سوچنے لگی۔
"اپنی باجی جیسی پیاری سی۔۔۔ اچھی سی۔"
"مجھ سے بھی زیادہ؟"
"نہیں' وشمہ سے نہیں۔۔۔ وشمہ ساری پریوں سے پیاری ہے۔"
"سب سے زیادہ۔" وہ خوش ہو گئی۔ "آپی سے بھی زیادہ؟"
اس سوال پہ دروازے پہ کھڑی پروین کا رواں رواں جواب کا منتظر تھا۔
"ہاں۔۔۔ آپی سے بھی زیادہ۔" پروین ایک دم ہلکی پھلکی ہو گئی۔

"جیسا یہاں کوئی ہے جسے منانے کے لیے وہ اچھی بنتے ہوئے اس سوتیلی کے مقابلے میں اپنی بیٹی
کی..... یقیناً" وشمہ کو سگی ماں سے بڑھ کر چاہنے والی سوتیلی ماں ملی ہے۔" وہ مسکرا کے چلنے لگی۔
ماں بیٹی کے درمیان آنا اسے اس حسین منظر میں خلل ڈالنے جیسا لگ رہا تھا۔
"پھوپھو سے بھی زیادہ؟" اپنا ذکر سن کر غیر ارادی طور پہ وہ رکی۔
"پھوپھو؟" منزہ جو وشمہ سے چھوٹی چھوٹی باتیں کر کے اپنا دھیان پروین سے ہٹانا چاہ رہی تھی الجھ
ہو گئی۔ وہ ساری دل جلانے والی تکلیف دہ باتیں یاد آنے لگیں۔
"بتائیں ناں ماما! پھوپھو سے بھی اچھی؟"
"تمہاری پھوپھو اچھی کب ہیں؟"
منزہ تنفر سے بڑبڑائی۔ اپنی بیٹی کے بارے میں جس کے منہ سے ایسی باتیں سنی ہوں اس کے لیے دل میں
یہی غبار بھرا تھا۔
"پھوپھو بری ہیں؟" وشمہ نے حیرت سے سرگوشی کی۔
"ہاں..... بہت۔" منزہ کو دل کا بوجھ بانٹنے کے لیے اس چار سالہ بچی کا دم غنیمت لگا جس نے کچھ دیر بعد
بھول بھال جانا تھا۔ مگر وہ نہیں جانتی تھی کہ یہ بات وہ بھی سن رہی ہے جو زندگی بھر اسے بھلا نہ پانے والی تھی۔

● ● ●

مکرم باجوہ کے آنے کے بعد مدیحہ نے سکون کا سانس لیا۔ اب مہتاب آپا کے یہاں سے ٹلنے کے دن
آ رہے تھے۔
"میری توبہ جو اب کبھی جعفر کی ضد میں وہاں کے کسی فرد کو گھر پہ ٹھہرایا تو....." وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔
مہتاب کی چند دنوں کی میزبانی نے اسے توبہ توبہ کرنے پہ مجبور کر دیا تھا۔ اپنی اس حرکت پر وہ خود جو قائل
ہو گئی۔
"وہ جعفر کو شہر آ کر بدل جانے کے طعنے دینے والی مدیحہ کیا خود بھی اسی کے رنگ میں رنگتی جا رہی ہے؟" اس نے
خود سے سوال کیا۔
جواب اثبات میں ملا تو وہ جھینپ گئی۔
یہ سچ ہے کہ اب اسلام آباد کے اس پرسکون، پرفضا علاقے کی اس پرآسائش کوٹھی میں رہنے کے چند
بعد ہی اس پہ سے چوہدرائن مدیحہ کا خول اتر گیا تھا۔ حالانکہ اس کا کہیں آنا جانا، جعفر کے سرکل کے لوگوں سے
جان پہچان نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس کے باوجود اس نے تیزی سے خود کو بدلا تھا۔ جعفر کو ابتدا میں خدشہ تھا کہ
طرز زندگی کو سنبھال بھی پاتی ہے یا نہیں مگر کم از کم اس نے اس ایک معاملے میں تو اسے بے فکر کر رکھا تھا۔
جیسی قابل بھروسہ اور تجربہ کار ہاؤس کیپر جس نے مدیحہ جیسی پینڈو مالکن کو ہفتوں میں بیچ بیچ کی سیدھی
اب باقاعدگی سے پارلر جاتی، بال ڈائی کروا لیے تھے۔ لباس بھی عمدہ سلا ہوتا۔ گھر کی ڈیکوریشن دیکھنے
تھی۔ بچیاں بھی اچھے اسکول جانے کی وجہ سے جدید طور طریقے سیکھ گئی تھیں، ورنہ گاؤں سے آئی تھیں تو
اپنے مستقل بسیرے تھے جوؤں کے، اور تحریم، تفسیرات بات پہ جھگڑتا ہوا جایا کرتیں۔ جعفران کو
دیکھ کر کڑھا کرتا۔
اب سب ٹھیک تھا، بالکل ویسے ہی جیسے وہ چاہتا تھا۔
ایک نک سک سے درست بیوی۔
سجا سنورا پرسکون گھر۔
باتمیز، ذہین، صاف ستھری اولاد۔
مگر کہیں ایک کمی تھی۔

کمی اس کے اور مدیحہ کے رشتے میں تھی۔
اور جس کا ازالہ چاہ کے بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔
ہر بار مدیحہ کچھ نہ کچھ ایسا کر دیتی جس سے وہ چڑ جاتا اور چڑ کے مزید دور ہو جاتا۔
اس کا جواب مدیحہ کو پتا نہ تھا۔ وہ اور بھی اپنے میں سمٹ جاتی۔ ایسے میں فاصلے تو جوں کے توں رہنے ہی تھے۔
مہتاب آپا کی آمد بھی ایسی ہی ایک چڑ کا نتیجہ تھی مگر اب مدیحہ یہ جان چکی تھی کہ نامحسوس طریقے سے وہ رفتہ
رفتہ جعفر کے رنگ میں ہی رنگتی جا رہی ہے اور اب صرف اس کی مخالفت میں کچھ کرنے کا مطلب اپنے آپ کو
عذاب میں ڈالنا ہے۔
مہتاب آپا نے ان چند دنوں میں اسے ناک تک بھر دیا تھا۔ وہ ایک ایک منٹ گن رہی تھی کہ کب وہ اپنا بیگ
اٹھائیں اور یہاں سے سدھاریں۔
مکرم باجوہ کے آنے پہ جتنی ہلکی پھلکی وہ ہوئی تھی اتنی ہی سرشار مہتاب آپا بھی نظر آ رہی تھیں جس سے صاف
ظاہر تھا کہ ان کا بھی یہاں رہنے کا تجربہ خاص خوشگوار نہ تھا۔
"جعفر کس وقت تک آتا ہے؟" مکرم باجوہ کا انداز ٹوہ لینے والا تھا۔
"آ جاتے ہیں چھ ساڑھے چھ بجے تک۔"
اس نے محتاط جواب دیا، ورنہ جعفر کے آنے کا کوئی خاص وقت مقرر نہ تھا۔
"اور جاتا کتنے بجے ہے؟"
"دس ساڑھے دس تک۔"
"ہونہہ..... جانے کا بھی ٹائم مقرر..... آنے کا بھی..... یہ ہے وہ آزادی جس کے لیے روتا تھا؟" مکرم نے طنزیہ
ہنکارا بھر کے کہا۔
"تیرے بندے کی ہڈیوں میں تو نوکری کا رہنا رچ گیا ہے۔ جب سرکار کا نوکر تھا تب تک تو آنے جانے کے
وقت میں سرکاری نوکری کی وجہ سے پابندی سمجھ میں آتی ہے۔ اب اپنا کاروبار ہے پھر بھی وقت کی غلامی؟"
"خود وقت کی پابندی کریں گے تو ملازم بھی کریں گے نا بھائی جی۔"
"بڑی باتیں آتی ہیں تجھے مدیحہ....." مکرم مسکرایا۔
"اپنے مجازی خدا کی وکالت کرنے میں تمہاری بہن بڑی تیز ہے مکرم۔" مہتاب آپا نے اپنے سابقہ تجربات کی
بنا پہ بیان دیا۔
"اچھی بات ہے۔" مکرم نے مسکرا کے سر ہلایا۔ "بندہ چاہے جیسا بھی ہو، گھر والی کو اس کا پردہ رکھنے کا گر آنا
چاہیے۔ یہی خاندانی اور اصل عورتوں کی پہچان ہے، اسی لیے تو بندے باہر جتنا بھی منہ ماریں، نکاح کے بول
خاندانی عورت سے ہی پڑھواتے ہیں۔ پتا ہوتا ہے نہ کہ چوراہے پہ ان کے کرتوتوں کا تماشا نہیں لگائے گی۔ کسی
امانت کی طرح سنبھال سنبھال کے رکھے گی۔ اس کی بے ایمانیوں کو بھی۔"
"تجھے تجربہ ہے ہو مکرم؟" مہتاب نے تیکھے چتون کر کے پوچھا۔
مدیحہ تو خیر..... مکرم جیسا ڈھیٹ مرد بھی گڑبڑا گیا۔
اس کے گمان میں بھی نہ تھا کہ اس کی بات کو وہ اس رنگ میں بھی لے گی۔
"نہ..... جھلی نہ ہووے تے....." وہ خفت سے مسکرانے لگا۔
"بھائی نے بات تو ٹھیک ہی ایک بات کی تھی آپا؟"
مدیحہ نے بھی جلدی سے وضاحت پیش کی۔ اسے ڈر تھا کہ آپا مکرم سے بگڑ گئیں تو اس کے ساتھ جانے سے
انکار نہ کر دیں۔
"پرانی باتیں بھی بعض اوقات سیدھی کلیجے میں جا لگتی ہیں مکرم۔ دھیان رکھا کر۔"

وہ بیٹھے کے کونے سے آنکھیں رگڑنے لگیں اور مدیحہ کی جان سے سلگ اٹھی۔

"ایک تو کلیجہ ہاتھوں میں ملیے پھرتی ہیں مہتاب تیا! جلنے کو بھی ہر وقت تیار۔۔۔ کہیں تپنے کو بھی تیار۔"

اس نے جل کے سوچا۔

"مختار جیسا مرد جو ہوسی کے کالے تصیوں میں پھر میں دیکھتی ہوں کہ وہ کتنے پردے رکھتی۔ سارا زور ایک جھٹکے میں نکل جاتا' ویسے ہی اس قابل کہ اس کا تماشا چوک میں لگوایا جائے۔"

"چل چھوڑ مہتاب! جانے دے۔"

مدیحہ کو حیرت ہوئی۔ مکرم یہ بات کہہ کیسے رہا ہے اور کس دل سے۔ وہ تو عورتوں کی اس سوچ کا ہی مخالف تھا' وہ تو ان مردوں میں سے تھا جن کا اس بات پہ پختہ ایمان تھا کہ عورت صرف سہنے اور برداشت کے لیے بنائی گئی ہے اور اسے دنیا میں اپنے صرف اسی ایک جوہر کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔

"چھوڑ دیا ہے۔۔۔ جانے دیا۔۔۔ کب کا۔۔۔"

اگلے ہی پل مہتاب قہقہہ لگا کے ہنس پڑیں۔

☼ ☼ ☼

"کیا بات ہے پروین! بہت چپ چپ سی ہو۔ جب سے اپنی ماں کے ہاں سے آئی ہو۔ کوئی بات ہوئی ہے؟"

"نہیں اماں جان! بات کیا ہونی ہے۔" اس نے تھکے تھکے لہجے میں جواب دیا۔

"ٹھیک تو ہیں شمشاد بہن؟"

"شکر ہے اللہ کا۔"

"نوید بیٹا؟"

"وہ بھی ٹھیک ہیں۔ آج کل مصروف زیادہ ہیں۔ بتایا تھا نا آپ کو کہ گھر پہ کچھ کام شروع کروایا تھا انہوں نے۔ کاروباری مصروفیات بھی خاصی بڑھی ہیں۔"

"ماشاء اللہ۔ ماشاء اللہ۔ لگتا ہے نئی دلہن کے قدم مبارک ثابت ہوئے ہیں۔ دل لگ گیا ہے تمہاری ماں کا؟"

"ان کے دل کا حال میں کیا جانوں اماں جان!"

وہ پھیکا سا مسکرائی۔

اور شوکت جہاں نے جیسے اس کی اداسی کا سرا پکڑ لیا۔

"وشمہ تو بہل گئی ہو گی نئی ماں کے آنے سے اور اس کی بیٹی کی صورت میں اسے ساتھی بھی مل گئی۔"

"ہاں اماں جان! بچی ہی تو ہے۔ وہ بھی پیار اور توجہ کو ترسی ہوئی۔ ایسے پروانوں کی طرح نثار ہوتی ہے نئی ماں پہ۔۔۔"

"اور ماں؟"

"وہ۔۔۔" پروین سوچ میں پڑ گئی۔ پھر وہ جواب دیا جو سچا تھا۔ چاہے اس کی سچائی دل کو بھی لگے یا نہ لگے۔

"وہ بھی ٹھیک ہے۔ وہ پیار اور توجہ دے رہی ہے' جب ہی تو وشمہ اتنی دیوانی ہو رہی ہے اس کے لیے۔"

"ماشاء اللہ۔۔۔ ماشاء اللہ۔" انہوں نے ایک بار پھر وہی کلمات دہرائے۔

"شکر ہے اللہ کا کہ اس نے نوید کا گھر اور بچی سنبھالنے کے لیے صحیح عورت بھیجی' ورنہ دوسری شادی کا جو ہوتا ہے۔ اب تمہاری اماں بھی مطمئن ہوں گی۔"

"نہیں' وہ ابھی مطمئن نہیں ہیں۔ دراصل بھابھی کا رویہ بھائی جان اور وشمہ کے ساتھ تو ٹھیک ہے مگر اور اماں سے ویسے ویسے ہی رہتی ہے۔"

"وہ کیوں بھلا؟" شوکت جہاں کو تعجب ہوا۔

"تمہاری اماں سے تو اس کا رویہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کا مزاج ذرا سا۔۔۔ اور پھر دن رات کا ساتھ۔ ہو جاتی ہے کبھی اونچ نیچ مگر تمہارا تو کبھی کبھار کا آنا جانا ہے۔ گھڑی دو گھڑی کا جانا ہے اور جہاں تک میں تمہارا مزاج جانتی ہوں تم ایسی عورتوں میں سے ہو بھی نہیں' جو نندیں بن کے گند پھیلاتی ہیں' پھر تم سے کیوں کٹ کے رہتی ہے؟"

"یہی تو سمجھ نہیں آتا کہ مجھ سے کدورت رکھنے کی کیا وجہ ہے؟"

"تم نے ذرا پیار سے' دوستانہ انداز سے پوچھا ہوتا۔"

"رہنے دیں اماں جان!" وہ اکتا گئی۔

"نہیں بھلا ہوتا ہے کوئی تعلق۔ بعض عورتیں ہوتی ہیں ایسی کہ ہم بھلے۔۔۔ ہمارا میاں بھلا۔۔۔ سسرال جائے بھاڑ میں۔ بس ڈر لگتا ہے تو اس بات سے کہ کہیں وہ آہستہ آہستہ بھائی جان کو بھی مجھ سے اور ماں سے بیزار نہ کر دے۔"

"ایسا نہیں ہو گا' بے فکر رہو۔"

"ہو بھی تو سکتا ہے اماں جان! وہ خود ہمیں برداشت نہ کر سکتی ہو' وہ اپنے شوہر کا میل جول اور پیار ہم سے بڑھتا دیکھ کر کیسے برداشت کرے گی۔"

"جو عورت سوکن کی اولاد کھلے دل سے برداشت کر سکتی ہے پروین! پھر وہ سب کچھ برداشت کر سکتی ہے۔"

وہ رسانیت سے مسکرائیں۔

"نہیں اماں جان! مجھے اس کی جانب سے ایک دھڑکا سا لگ گیا ہے۔ اس نے وشمہ کو بھی پوری طرح سے اپنے بس میں کر لیا ہے۔ دادی کون ہے۔ پھوپھی کون ہے۔۔۔ وہ یہ جانتی ہی نہیں۔ بس اسی کی ہو کے رہ گئی ہے۔"

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

"اچھی بات یہ ہے کہ اس نے نئی ماں کو قبول کر لیا ہے مگر یہ تو اچھی بات نہیں کہ وہ اپنے سگے رشتوں کو بھول ہی جائے۔ وہ بچی ہے' کچھ اس سے نہیں ہے۔ یہ مزید بھابھی ہی کچھ اس کے ذہن میں ایسا بھر رہی ہیں اور جیسے جیسے وشمہ بڑی ہوتی جائے گی' دیکھنا اس کی یہ بیزاری بھی نفرت میں بدلتی جائے گی۔"

"اچھا۔۔۔ سچ۔۔۔" وہ یقین کرنے میں متامل تھیں مگر یہ بھی جانتی تھیں کہ پروین سنی سنائی پہ ایمان نہیں لاتی۔ ضرور اس نے کچھ ایسا مشاہدہ کیا ہو گا جس کی وجہ سے یہ رائے قائم کرنے پر مجبور ہوئی۔

"مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کرے گی کیوں؟"

"مجھے اور اماں کو نوید بھائی جان اور وشمہ کی زندگی سے نکال پھینکنے کے لیے پھر وہ جو سیاہ کرے سفید کرے کوئی دیکھنے والا ہو نہ باز پرس کرنے والا۔"

اس نے وہی رٹا رٹایا جواب دیا جو شمشاد بیگم سے سنا تھا۔

شوکت جہاں لحظہ بھر کو چپ کر گئیں۔

پھر کہا تو فقط اتنا۔

"کسی بھی نتیجے پہ اتنی جلدی نہیں پہنچنا چاہیے۔ شادی کے بعد ان گنتی کے مہینوں میں تم گنتی کے برابر ہی ملی ہو اس سے۔ پہلے جان لو۔ پرکھ لو پھر فیصلہ کرو۔ پھر رائے قائم کرو۔"

"اور کیا جاننا ہے۔" وہ بڑبڑائی۔

"تمہاری پھوپھو اچھی کب ہیں؟"

شہزادی نے تنکر جھکا ذرا سا سرگوشی سنائی دی۔

"مجھے پھوپھی کیوں ہیں؟"

وشمہ کا تجسس سے بھرپور سوال۔

"ہاں بہت۔۔۔"
اور منزہ کا وہ جواب یاد آیا اور پروین کی اس کے بارے میں رائے اور تازہ ہو گئی۔

☼ ☼ ☼

"حسان بھائی۔۔۔ آپ کے پاس سیل ہیں؟" ردا نے سیڑھیاں اترتے اترتے پوچھا۔
"کیوں' کیا کرنے ہیں؟"
وہ بیٹ گھماتا باہر جا رہا تھا' رک کر پوچھنے لگا۔
"چارجنگ نا' میرے ویک ہو گئے ہیں۔"
وہ آخری دو سیڑھیاں جست لگا کے اتری۔
"اوہو' ویک ہو گئے ہیں۔ تمہارے سیل ویک ہو گئے ہیں تو ایک طرف شفٹ کر کے پڑی ہوتیں۔ چلو [illegible] ری ہو گئی ہے۔"
احسن نے ٹھٹھا لگانے کے انداز میں کہا۔
وہ ابھی سے فقرے چست کرنے میں بڑا ماہر تھا۔
"میرے نہیں' میری ڈول کے۔"
اس نے ٹھنک کر جواب دیا۔
"او جی اچھا۔۔۔ وہی والی ڈول جسے کمر ہلا کے مٹکنے کے اور کوئی کام نہیں ہے اور گانا کون سا گاتی ہے؟ چھیاں چھیاں چھیاں۔"
وہ دونوں ہاتھ کمر پہ رکھ کے گھومتے ہوئے گانے لگا۔
وصی نے تالیاں بجا بجا کر ہنسنا شروع کر دیا۔
حسان نے بڑی مشکل سے ہنسی روکی۔ اگر وہ بھی ہنس دیتا تو شاید ردا رو ہی دیتی۔
"حسان بھائی دیکھیں نا' ان دونوں کو۔ بدتمیزی کر رہے ہیں۔"
"بدتمیز تمہاری ڈول ہے۔ ہر وقت ناچتی اور گاتی رہتی ہے۔ شور مچاتی رہتی ہے۔ اچھا ہوا اس کے سیل ویک ہو گئے ہیں۔ ایک جگہ آرام سے پڑی رہے گی۔"
"میرے پاس نئے سیل تو کوئی نہیں ہیں۔ کس سے نکال دوں؟" حسان نے اسے منہ بسورتے دیکھ کر پوچھا۔
"وہ ابھی پرسوں ہی ڈالے تھے۔"
"ٹھیک ہے' دے دیں۔"
"ہاں ہاں' دے دیں حسان بھائی! اس کی ڈول بے چاری تھک گئی ہو گی آرام کرتے کرتے۔ یہ بھی بور ہو گئی' کتنے دنوں سے سنا نہیں ہو گا۔ چل چھیاں چھیاں چھیاں چھیاں۔۔۔"
احسن پھر سے ناچنے لگا۔ وصی بھی دوبارہ تالیاں بجانے لگا۔
"چپ کرو احسن!" حسان نے ڈانٹا۔
"یہ وصی کو بھی بدتمیزی سکھا رہا ہے۔"
ردا نے جھٹ شکایت جڑی۔ حسان اندر سے سیل لانے چلا گیا۔
"تو تم تمیز سکھا دو۔" احسن نے منہ چڑایا اور مزید کہا۔
"ہمارا بھائی ہے' ہم جو مرضی سکھائیں۔"
"اوہووو۔۔۔" ردا نے جوابی منہ چڑایا۔
"بڑا آیا بھائی۔۔۔ تمہارا بھائی کہاں سے ہے یہ؟"
"او اچھا تو کیا تمہارا ہے؟"

احسن لڑنے پہ تل آیا۔
"بھی کہا نا آپ اچانک اہم ہا گھنٹے لگا" اس کی وجہ سے وہ دونوں جھگڑ رہے تھے۔ اسے ان لڑائی کو دیکھنے میں مزا آنے لگا۔
"میرا کیوں ہونے لگا؟ نہ یہ میرا بھائی ہے نہ تمہارا بھائی۔ یہ کسی کا بھی بھائی نہیں ہے' اس کا کوئی بھائی، بہن جو نہیں۔"
ردا نے عجیب ہی نکتہ نکالا۔
ذہین ردا اور حاضر جواب احسن بھی ایک لمحے کے لیے چپ کر گیا۔ البتہ وصی معاملہ سمجھا نہیں اور بول اٹھا۔
"احسن میرا بھائی ہے۔۔۔ حسان بھائی میرے بھائی ہیں۔۔۔ ندا آپا میری بہن ہیں۔ تم گندی ہو' تم میری بہن نہیں۔"
"ندا آپا بھی تمہاری بہن نہیں ہیں۔ اچھا جی۔" اس نے گردن اکڑائی۔
"اور نہ احسن اور حسان بھائی تمہارے بھائی ہیں۔ ہم صرف تمہارے کزنز ہیں' سمجھے۔ بڑے آئے۔۔۔"
"ردا! بدتمیزی کر رہی ہو۔" حسان نے باہر آتے آتے اس کے الفاظ سنے تو ڈانٹا۔
"ہنہ! حسان بھائی!" وہ سیل جھپٹ کے بھڑ بھڑ کرتی سیڑھیاں چڑھ گئی۔
حسان نے پلٹ کے وصی کو دیکھا۔ وہ گم صم کھڑا تھا۔
معصوم آنکھوں میں ایک تحیر بھرا سوال ہلکورے لے رہا تھا۔
بھولے بھالے چہرے پہ ایک سہم و ہراس چھپا ہوا تھا۔
اور گم والب جیسے بہت کچھ پوچھنے کو مچل رہے تھے۔
حسان نے اس کے بال سہلائے۔
"کرکٹ کھیلنے چلو گے میرے ساتھ؟"
سارے سوال۔۔۔ ساری حیرت۔۔۔ سارا ہراس جیسے پر لگا کے اڑن چھو ہو گیا۔۔۔ وہ خوشی سے مسکرانے لگا۔
"شوز پہن کے آؤں؟"
اس نے چپل اتارتے ہوئے بے تابی اور اشتیاق کے ملے جلے جذبے کے ساتھ پوچھا۔
"ہاں اور منہ بھی دھو کے' بالوں میں کنگھا کر کے آؤ۔ حسان بھائی کے دوست کیا کہیں گے' ان کا بھائی اتنا گندا بچہ ہے۔"
احسن نے اس کا دھیان بٹ جانے پہ مسکرا کے کہا۔
"کپڑے بدلوں حسان بھائی! یا یہ ٹام اینڈ جیری والی شرٹ ٹھیک ہے۔"
"ٹھیک نہیں' ٹھاک ہے۔"
وہ تیزی سے اندر کی جانب بھاگا۔
"ردا کتنی گندی ہے اور بدتمیز بھی۔"
احسن نے دبے الفاظ میں رائے دی۔
"ہوں۔۔۔" حسان نے تائید کی۔

☼ ☼ ☼

"ادھر کہاں بھاگی جا رہی ہے؟"
شمشاد بیگم نے منزہ کے کمرے تک جاتی وشمہ کا ننھا سا بازو دبوچ لیا۔
"دادو! چھوڑیں۔۔۔ ماما پاس۔۔۔"

اس سے پہلے کہ اس کی آواز اونچی ہوتی لمبی تڑنگی شمشاد نے اسے بغل میں کسی چابی والے کھلونے کی طرح دبایا اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ وشمہ نے بھنبھری آنکھیں چار کر لیں۔

"چپ۔" شمشاد نے لا کے اسے بستر پہ بٹھایا۔ "بند کرو اب۔"

"ماما پاس جانا ہے۔" وہ بسورنے لگی۔ ڈر کے مارے آواز اب کے ہلکی ہی تھی۔

"کیوں! ماما تیری کیا نانی بانٹ رہی ہے۔"

"ماما میرے اور آپی کے لیے نیا فراک لائی ہیں۔"

وہ جوش سے بتانے لگی۔ دادی کی ڈانٹ کے غم پہ نئے فراک کی بے جان آمیز خوشی غالب آگئی تھی۔

"تیری آپی کا آیا ہے نیا فراک...... تیرا تو پرانا ہے۔"

"نہیں دادی! میرا نیا فراک ہے...... وائٹ کلر کا...... اس پہ......"

"ہاں ہاں پتہ ہے گلابی تتلیاں بنی ہیں۔"

"سچی دادی! آپ کو بھی دکھایا ہے ماما نے؟"

"تیری وہ آپی ہے نا۔ سوہا۔ اس کو پہنے دیکھا تھا۔"

"کوئی نہیں جی۔" اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "آپی کے وائٹ فراک پہ پنک ہنی فلاورز ہیں۔"

"وہ تو اب لیا ہے نا۔ نیا والا۔ پرانا والا تجھے دے دیا ہے۔"

شمشاد بیگم نے تکیے کے نیچے ہاتھ ڈال کر دو ٹافیاں نکالیں مگر وشمہ کی آنکھوں میں ٹافیاں دیکھ کے بھی چمک نہ پیدا ہوئی۔ اس کا ننھا سا ذہن اس پہیلی کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ آپی کا پرانا فراک اسے نیا بتا کر کیوں دیا گیا۔

"آپی کو چھوٹا ہو گیا ہوگا۔"

ننھے سے ذہن نے ایک تسلی بخش جواب ڈھونڈ ہی لیا۔ "پچھلے ہفتے ہی تو ماما نے اس کی الماری میں سے ڈھیر فراک اور شرٹیں اور کئی سینڈلیں نکال کر آپا جی کو دی تھیں اور بتایا تھا کہ اب یہ آپی کو چھوٹی ہو گئی ہیں۔ آپا جی کے بچوں کے کام آجائیں گی کیونکہ وہ بے چارے نئے نہیں لے سکتے۔

اس جواب نے ایک اور نیا سوال جگا دیا۔

"کیا میں بھی نیا نہیں لے سکتی۔ میں بے چاری۔ اسی لیے آپی کا چھوٹا فراک پہنوں گی اور اگر میرے فراک بڑے ہو جائیں تو کیا آپی بھی پہنیں گی؟ آپی بے چاری۔"

"کیا سوچ رہی ہے۔ لے ٹافی......"

"دونوں؟" اس نے ہاتھ بڑھاتے بڑھاتے پوچھا۔ دادی ایسی فیاضی دکھاتی ہی کب تھی۔

"ہاں دونوں۔ تیری پھوپھی یا تیرے ہی لیے لائی تھی۔ کہتی تھی روز وشمہ کو دو دو ٹافیاں دینا۔"

"ماما کہتی ہیں زیادہ ٹافیاں کھانے سے دانت خراب ہو جاتے ہیں۔" اس نے ریپر اتارتے ہوئے کہا۔ شمشاد کا جی کلس کے رہ گیا۔

جتنا وہ چاہ رہی تھی کہ اس کے سر سے منزہ کا بھوت اتر جائے اتنا ہی وہ اسے بار بار یاد کر رہی تھی اور دلا رہی تھی۔

"بکواس کرتی ہے۔"

"دادی۔ بری بات۔" وشمہ نے تنبیہی نظر سے دیکھا۔

یہ بھی منزہ کا ہی رٹایا سبق تھا کہ نہ بری بات کرو، نہ سنو۔

"میں تیرے پاپا اور تیری پھوپھی کو روز چار چار ٹافیاں دیتی تھی۔"

"روز چار؟"

"ہاں۔ دیکھ لے۔ ان کے دانت تو کوئی نہیں خراب۔"

"احسان بھائی۔؟ جمی بھائی۔؟"

"ہاں احسن بھائی۔ وہ بھی بابا کے بچیاں کھاتے ہیں۔ کوئی نہیں خراب ہوتے دانت۔ یہ تو بس جو گندی والی ماما ہوتی ہے نا وہ بچوں کو ٹافی نہ دینے کے لیے جھوٹ بولتی ہے کہ دانت خراب ہو جاتے ہیں۔ تیری پھوپھی کتنی اچھی ہے۔ تیرے لیے اتنی ساری ٹافیاں لے کے آئی ہے اسے چاہیے نا کہ تیری ماما کو بھی دے۔ نہیں، دیکھا کتنا پیار کرتی ہے پھوپھی تیرے سے۔ تو بھی پیار کیا کر، جب وہ آئی ہے اس کے ساتھ سویا کر، ٹھیک؟"

ٹافی کا ریپر اتارتے اور دوسری کا ریپر کھولتے ہوئے اس نے فوراً تابعداری سے سر ہلایا۔

ٹافی منہ میں ڈالتے ہی ایک بار پھر منزہ کا کوئی سبق یاد آ گیا۔

"تھینک یو دادی۔"

وہ خوشی سے نہال ہو کے الماری کھولنے لگی۔

"میں یہیں رکھ دوں گی۔" الماری پھر سے بند کر دی گئی۔

"تیری پھوپھی بھی تیرے لیے لائی ہے۔"

"بڑی پھوپھو تو آپی کی بھی پھوپھو ہیں۔"

"وہ صرف تیری پھوپھی ہے۔ اس کی پھوپھو کوئی اور ہے۔"

"کون؟" تجسس جاگا۔

"ہے کوئی۔"

"وہ لاتی ہیں آپی کے لیے ٹافیاں؟"

"ہاں۔ تھیلے بھر بھر کے۔ تجھے دیتی ہے وہ؟"

وشمہ نے انکار میں سر ہلایا۔

"پھر کیوں دینے جا رہی ہے؟ بس جب کھانا ہو میرے کمرے میں آجایا کر۔ ماما کو نہ بتانا وہ مجھے ڈانٹے گی۔"

شمشاد نے مسکین سی شکل بنائی اور رونے والی آواز میں کہنے لگی۔ مقصد شاید صرف ننھی سی بچی کی ہمدردی حاصل کرنا تھا مگر اس کوشش میں وہ اس قدر مضحکہ خیز نظر آئی کہ وشمہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"آپ کو ڈانٹیں گی۔ دادی۔ آپ تو بڑی ہیں۔ اتنی بڑی......" وہ دونوں بازو پھیلا کر اس کی لمبائی چوڑائی بیان کرنے کی اپنی سی کوشش کرنے لگی۔

"آپ کو ماما کیسے ڈانٹ سکتی ہیں؟"

"تجھے پتا نہیں ہے۔" شمشاد نے ہونٹ لٹکائے۔

"تیری ماں غصے والی ہے۔ اسی لیے کہہ رہی ہوں اسے نہ بتانا۔ کوئی شرارت کر دی یا کوئی کام غلط ہو جائے تو بھاگ کے میرے کمرے میں آ چھپ جانا ورنہ وہ بڑا مارے گی۔"

"ماریں گی؟"

"ہاں۔ جب غصہ آئے بڑا مارتی ہے۔ زور زور سے۔ اسی لیے تو میں نے تجھے وہاں جانے نہیں دیا۔ اس وقت بڑے غصے میں ہے۔"

وشمہ نے دونوں ٹانگیں اوپر کر لیں۔

اب اس کا کافی دیر تک باہر جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

شمشاد بیگم طمانیت سے مسکرائی۔

"شکر کرو گل...... میں تو اسے بڑا اوکھا سمجھ رہی تھی۔ یہ تو کام ہی کوئی نہیں۔ ایویں ہی کہتے ہیں لوگ نہ پیار محبت بانٹو کوئی نہیں۔ دو میٹھے پیار کے بول بندے کا اندر بدل دیتے ہیں۔" شمشاد سمجھتی ہے کہ ذرا سے بچی

طاقت کوئی نہیں۔ بندے کا ڈر اس کا اندر باہر بدل دیتا ہے اور یہ تو ذرا سی کاکی ہے' اسے ڈرانا کون سا اوکھا ہے۔"

☆ ☆ ☆

دو ہفتے بعد پروین کا دوبارہ چکر لگا تو شمشاد نے تفریباً اپنی کار کردگی جتائی۔ پروین چپ رہ گئی۔ وہ ذاتی طور پر ایسے اوچھے ہتھکنڈے پسند نہیں کرتی تھی مگر کوئی چیز تھی جو اسے ماں کی کھل کے مخالفت سے روک رہی تھی۔

"بتا تے بھی دیں اماں!"

اس نے کہا تو بس دبے لفظوں میں اتنا ہی۔

"لے... ایسے ہی جانے دوں۔ میری پوتری کے ذہن میں زہر بھرتی رہے۔ اسے دادی پھوپھی سے نفرت بھڑکاتی رہے اور میں چپ چاپ تماشا دیکھتی رہوں۔"

پروین سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ پچھلی بار وہ جاتے جاتے منزہ کی وہ بات من و عن ماں کے سامنے دہرا گئی تھی۔

"جیسے کو تیسا نئے منہ کو لگ کرو ڑتے مت... میں تو وشیہ کو اس کے آئے دوالے نہیں ہونے دے رہی۔ کام کے لیے آئی ہے' بس وہ کرے... میں تیری بات سمجھ گئی تھی کہ اس وقت اس گھر سے اس کا جانا ہمیں وارا نہیں کھاتا تو ٹھیک ہے میں اس سے نہیں بگاڑتی مگر وہ یہاں رہے گی تو میری' میرے پتر اور میری پوتری کی مرضی کے رہے گی' چوہدرائن بن کے نہیں۔ وہ وشمہ کی دیکھ بھال کرے' اس کی خدمت کرے' یہ ماں بننے لگا ہے۔"

پروین نے سر ہلا دیا۔

اور حالات ہوتے تو شاید وہ ماں کے مقابل ڈٹ کے کھڑی ہو جاتی مگر منزہ کی جو چھاپ اس کے دل و دماغ پر ہو چکی تھی' اس کے بعد اسے ماں کی حکمت عملی قبول نہ سہی گوارا تو تھی۔

"ایسوں کے ساتھ ایسے ہی نمٹنا چاہیے۔"

اس نے سوچا اور نزدیک کھیلتی وشمہ کو اشارے سے اپنے پاس بلا لیا۔

"پھپھو... نانی۔"

دادی کی جتائی باتوں کی وجہ سے اس کے کچے ذہن میں پھوپھی کا تصور ہر وقت ٹافیاں برسانے والی پری کا سا ہو گیا تھا۔

"دیکھا... بے چاری ذرا سی چیز کے لیے کیسے ترسی رہتی ہے۔" شمشاد نے فٹ اسے گود میں بھر کے بھرے انداز میں کہا۔

"سارا کچھ تو وہ چڑ جاتی ہے... شکل دیکھی ہے اس کی... پھٹنے والا ہو رہا ہے منہ..."

"آپ نے اپنے پاس بٹھا کے کھلایا پلایا کریں۔"

☆ ☆ ☆
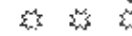
"اصغر! وہ کالے بنگلے والی شیخانی بتا رہی تھی کہ اس کی چھوٹی بہو کو گیارہ سال بچہ نہیں ہوا پھر ایک ڈاکٹر کے علاج سے وہ اب تین تین بچوں کی ماں ہے۔"

"ساری اگلی پچھلی کسریں ہی نکال دیں اس نے تو۔"

اصغر نے مذاق میں بات ٹالی۔

اندر سے وہ کچھ بے چینی محسوس کرنے لگا تھا' بہت عرصے بعد ریتا نے پھر سے یہ ذکر چھیڑا تھا ورنہ مہینے ہو گئے وہ اپنے آپ میں مست و مگن ہو چکی تھی۔

وہی میر سپاٹ...

شاپنگ... موج... مزے...

بچہ نہ ہونے کا بھی خطرہ ایا کہ اس کا دھیان تو اس جانب سے ہٹا۔ یہ الگ بات کہ اندر ہی اندر وہ خود یہ کسک... یہ اصغر نے بھی ... محسوس کیا کرتا تھا۔

"میں نے اس ڈاکٹر کا ایڈریس لیا ہے۔ اسلام آباد کا ہے۔"

"اچھا..." وہ مختصر جواب دے کر ٹی وی دیکھنے لگا۔

"چلیں پھر کسی دن؟"

"اچھا۔"

"اچھا اچھا؟" وہ چڑ گئی۔

"...اس نے چینل بدلا۔

"یہ قسط ہم نے نہیں دیکھی تھی' کہیں گئے تھے کیا؟"

اس نے بات بدلنے کی کوشش کی جو ناکام رہی۔

ریتا نے اس کے ہاتھ سے ریموٹ جھپٹ کر پرے پھینک دیا۔

"یہ منحوس ڈراما ہم نے کبھی بھی نہیں دیکھا۔ تم میری بات کیوں نہیں سن رہے؟"

"سن تو رہا ہوں سوہنے۔"

ڈاکٹر نے کہا تھا کہ اسے ہائپر نہیں ہونے دینا' اس لیے اصغر اسے ذرا سا غصہ آتے دیکھ کر ہی پریشان ہو جاتا تھا' فوراً اسے ٹھنڈا کرنے کی فکر میں لگ جاتا۔

"اس اتوار کو چلیں اسلام آباد؟"

"اس اتوار...؟" وہ سوچ میں پڑ گیا۔

"اب کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔ پہلے ہی بڑی دیر ہو گئی ہے۔"

"کوئی دیر نہیں ہوئی' زندگی پڑی ہے ابھی۔ تم خود ہی تو بتا رہی تھیں کہ کالے بنگلے والی شیخانی کی بہو کو شادی کے گیارہ سال بعد..."

"گھر بیٹھے بیٹھے ہی گیارہ سال بعد مراد نہیں پوری ہوئی۔" ریتا نے تیزی سے بات کاٹی۔ "علاج ہوا ہے تو نتیجہ نکلا ہے۔ ہم بھی ہاتھ پاؤں ماریں گے تو ہی کوئی امید نظر آئے گی۔"

"میری جان... کس چیز کا علاج... تم میں یا مجھ میں کوئی نقص ہوتا تو تم پہلے امید سے کیوں ہوتیں؟ آخر پہلے بھی بغیر کسی علاج کے اللہ نے خوش خبری سنائی تھی۔ اب بھی انتظار کرو' اللہ پھر سے کوئی امید دکھائے گا۔" اس نے تسلی دی۔

"نہیں اصغر! کچھ نہ کچھ ہے ضرور۔"

اصغر نے نظریں چرا لیں اور دوبارہ سے ٹی وی دیکھنے لگا۔

"کچھ نہ کچھ تو ہے۔ امید تو پیدا ہوتی ہے مگر... مگر بچہ... بچہ پیدا نہیں ہوتا۔" وہ سسکنے لگی۔

"میرا بچہ پتہ نہیں کیوں میرے پاس آنے سے پہلے ہی مجھ سے روٹھ کے چلا جاتا ہے۔ اصغر! مجھے میرا بچہ چاہیے۔"

"فکر نہ کر ریتا! اللہ تیری ضرور سنے گا۔"

"اصغر..." اس نے آنسو صاف کرتے ہوئے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم مجھے تسلی دیتے ہو تو مجھے تسلی نہیں ہوتی۔ تم مجھے حوصلہ دلاتے ہو تو میرا حوصلہ بلند نہیں ہوتا۔ تم مجھے امید دلاتے ہو تو مجھے امید نظر نہیں آتی۔ ایسا کیوں ہے اصغر؟"

"پاگل ہے تو۔" وہ بے چین ہو کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "تجھے کچھ پتہ ہے نا..." وہ بھی اٹھ کے اس کے مقابل کھڑی

"کیا۔۔۔ کیا بند ہے؟"
کسی چور کی طرح وہ ہکلا گیا۔
"کچھ ایسا ہو جو تمہیں میرے دل کو تسلی دینے نہیں دیتا تو تمہارے لفظوں میں وہ تاثیر پیدا نہیں ہو سکتی جس سے میں امید کا سہارا لوں۔"
"دماغ خراب نہ کرو رنا! نہ اپنا نہ میرا۔"
اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی، اس کے سوالوں کا سامنا کرنے سے کہیں بہتر تھا وہ سڑکوں پہ آوارہ پھرتا۔
"میں دماغ خراب کر رہی ہوں؟" وہ بھڑک گئی۔
"تمہیں پتہ ہے دماغ خراب ہو جائے تو کیا ہوتا ہے۔"
اس نے بیڈ شیٹ نوچ کر پرے اتار پھینکی۔
"میں دکھاؤں تمہیں کیا ہوتا ہے؟"
اس نے وحشیانہ انداز میں تکیوں میں سے مٹھیاں بھر بھر کے روئی نکالنا شروع کی۔
"کیا کر رہی ہے رنا۔"
اصغر نے اس کے دونوں ہاتھ قابو میں کرنے کی کوشش کی مگر وہ خود کو ایک جھٹکے سے چھڑا کے اب ڈریسنگ ٹیبل کی جانب لپکی۔
"وہی کر رہی ہوں جو دماغ خراب ہو جانے پہ لوگ کرتے ہیں۔" اس نے ایک ایک چیز اٹھا کے پھینکنا شروع کی۔
"یا اللہ خیر۔"
نسیم کے الجھے گندے بالوں میں تیل لگا کر کنگھا کرتی صدیقہ نے دہل کر کہا۔
نسیم البتہ اسی طرح ٹس سے مس بیٹھی رہی۔ اماں جی کی ان آوازوں کا اس پہ کوئی اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔
"اس گھر میں ایک ایک کر کے سارے ہی جیسے پاگل ہوتے جا رہے ہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اس کی چٹیا گوندھنے لگی۔ چیزیں گرنے اور رنا کے چلانے کی آوازیں اب تک آ رہی تھیں۔
"رنا بس کرو اب کیا بچا ہے اس کمرے میں توڑنے کو۔"
اصغر نے اس کے آگے ہار مانتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔
"نہیں۔۔۔ میں بچی ہوں نا اب میں اپنا سر توڑوں گی۔"
اس نے پتھر کا بھاری لیمپ اٹھا کے تان لیا۔
اصغر کے ہاتھ پیر پھول گئے۔
"رنا۔۔۔ رنا۔۔۔ چھوڑ دو اسے۔۔۔ میں کہہ رہا ہوں چھوڑو۔۔۔ پاگل نہ بنو۔"
"دماغ خراب ہو جائے تو پاگل ہی بنتے ہیں اور کیا بنتے ہیں۔"
وہ خود کو چھڑوانے کے لیے زور لگانے لگی۔
"رنا! تم پاگل نہیں ہو، مجھے پاگل کر رہی ہو۔ بس کرو اپنا جی جلانا۔"
"جلاؤں گی، ضرور جلاؤں گی۔ جب تک میرا بچہ میری گود میں نہیں آئے گا میں اسی طرح اپنا جی بھی جلاؤں گی اور تمہارا بھی اور اس کے بعد اگر اور کچھ نہ بچا جلانے کو تو یہ گھر جلا دوں گی۔"
"کیا ہوگا اس گھر کو جلانے سے؟" وہ چلایا۔
صبر کی انتہا ہو چکی تھی۔
"گھر جلانے اور اس طرح چیزیں توڑنے، گلا پھاڑ کے چلانے سے کیا ہوگا؟ بچہ مل جائے گا تمہیں؟ بچہ نہیں رنا! کبھی بھی نہیں۔ تم جو مرضی کر لو، چاہے گھر جلاؤ چاہے ساری دنیا۔ ہمیں اب بچہ نہیں ہو سکتا۔"

رنا کے ہاتھ بے جان ہو کر لٹک گئے اور وہ تب سے اس کے بکھرے ہوئے وجود کو قابو کرنے میں ہلکان ہو رہا تھا، اب ان کو قابو میں کرنے لگا۔
"نہیں بیٹا۔۔۔ ابھی نہیں۔۔۔ ڈاکٹر کہہ چکے ہیں دنیا کے کسی کونے میں بھی چلی جاؤ اب تمہارا علاج نہیں ہے۔۔۔ کبھی بھی نہیں۔
ہو سکتا۔ تم بھی بس یہ نہیں مانتیں۔۔۔"
اس کی بات پوری ہونے سے قبل ہی وہ لہرا کے نیچے آ گری۔
اصغر نے جلدی سے آگے بڑھ کے اسے سنبھالنے کی کوشش کی۔
اب اسے احساس ہوا کہ شاید رنا کو حقیقت سے آگاہ کر کے اس نے زیادہ بڑی مصیبت مول لی ہے۔

* * *

جعفر نے گھر میں قدم رکھتے ہی اس تبدیلی کو محسوس کیا اور وہیں کھڑے ہو کر ایک لمبی گہری سانس لی اور اس خوشگوار تبدیلی کو اپنے اندر اتارنے کی طمانیت محسوس کرنے لگا۔
"آج آپ بہت جلدی آ گئے؟"
بڑے نئے نئے جلیے، جوگیا رنگ کے سوٹ میں ملبوس نکھری نکھری سی مدیحہ سامنے آئی تو اسے عرصے بعد اچھی لگی۔
اس کے ابھی ابھی شیمپو کیے بال ہلکے گیلے تھے اور ان کی مہک جعفر کو یہاں تک آ رہی تھی، وہ مسحور ہو کر مسکرایا۔
"آج جلدی نہیں آیا، اپنے ٹائم پہ آیا ہوں۔ ہاں تمہاری اس آپا کی وجہ سے کچھ دن جان بوجھ کے لیٹ ضرور آتا رہا۔"
اس نے کوٹ اتار کے اسے پکڑایا۔
"اچھا ہے، وہ اپنے گھر تو گئیں۔"
"اپنے گھر کہاں؟ وہاں جانے کا تو نام نہیں لے رہیں۔ ابھی تو بھائی صاحب اپنے ساتھ ہی گاؤں لے کر گئے ہیں۔"
"جہاں بھی گئیں، یہاں سے تو گئیں۔ بچیاں کہاں ہیں؟"
"کمرے میں۔"
وہ اس کے سامنے صوفے پہ بیٹھ گئی، ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے۔
جعفر نے سلور نازک سینڈل میں پھنسے اس کے گورے گورے پاؤں بغور دیکھے۔ آج پہلی بار اسے مدیحہ کے پاؤں کی خوبصورتی کا اندازہ ہوا۔ اس سے پہلے اسے مدیحہ میں صرف ایک چیز ایسی لگتی تھی جو حسن کے مروجہ معیار پہ پوری اترتی تھی۔
اور وہ تھا اس کا صاف اور گورا رنگ۔
مگر اس گوری رنگت کے باوجود جعفر کو اس میں کبھی کوئی کشش محسوس نہیں ہوئی تھی۔
عام سے نقوش۔۔۔
ہر وقت ایک ہی انداز میں بندھے رہنے والے بال۔۔۔
ڈھیلے ڈھالے سلے ہوئے بھدے کپڑے۔۔۔
کبھی کسی تقریب میں جانا ہوتا تو بنا سنوارا جاتا خود کو مگر جعفر کو وہ تب پہلے سے کہیں زیادہ بری لگتی۔ بھڑکیلے، بے ڈھنگے اسٹائل سے مارتے کپڑے۔۔۔ بری اور جہیز کا سارے کا سارا زیور خود پہ لادنے کی کوشش میں ہلکان ہوتی، بے ڈھنگے اور اناڑی پن سے کیے میک اپ کے ساتھ وہ انتہائی مضحکہ خیز لگا کرتی۔
وہی مدیحہ اسلام آباد آ کے پالش ہو گئی تھی۔

اگرچہ اس کی سادگی کو خاص فرق نہ پڑا تھا لیکن اس سادگی میں بھی ایک نفاست اور کشش پیدا ہو چکی تھی۔ نہ اس نے بال کٹوائے تھے نہ بھنویں ترشوائیں مگر پارلر کا کبھی کبھار کا چکر اس کی صاف رنگت کو نکھار عطا کر جاتا تھا۔ میک اپ کا سلیقہ اسے آ گیا تھا۔

لباس اس کا اب بھی سادگی کا مظہر ہوتا، آستینیں کٹ کر کہنیوں سے اوپر آ گئی تھیں، نہ چاک اتنے اونچے ہوتے تھے کہ جسم کے سارے نشیب و فراز دیکھنے والوں پہ کھل جاتے مگر چبھتے ہوئے رنگ مدھم ہو گئے تھے، ہلکے رنگ کچھ شوخ ہو کر کھل گئے تھے۔ سادے موسم اور تقریب کی مناسبت سے رنگوں کا استعمال آ گیا تھا۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

جعفر کی نظروں سے وہ بجائے محجوب ہونے کے نروس سی ہو گئی اور خواہ مخواہ ہی قمیص کا دامن درست کرنے لگی۔

ایک گھٹنے پہ رکھی ٹانگ بھی سرک کے نیچے آ گئی۔

جعفر ہلکا سا مسکرایا۔

"دیکھ رہا ہوں یہ رنگ تم پہ اچھا لگ رہا ہے۔"

مدیحہ نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ کیا یہ واقعی سچ مچ کی تعریف تھی یا تنقید کا کوئی نیا انداز۔

"یا پھر یہ تم اس رنگ میں اچھی لگ رہی ہو۔"

اب کے تعریف کے الفاظ بے حد واضح تھے۔ وہ خوش کم ہوئی، حیران زیادہ۔ شادی کے اتنے سالوں میں جعفر نے کتنی بار اس کی تعریف کی تھی۔

وہ حیرت پہ قابو پاتے ہوئے سوچنے لگی۔

"بچیاں اندر کیا کر رہی ہیں؟ ٹیوٹر آئی ہے؟"

"نہیں۔ آج اس نے چھٹی کی ہے۔ کل بچیوں کے ایگزامز ختم ہوئے ہیں۔ ابھی نیا سمسٹر شاید اس ہفتے شروع ہوگا، تب تک اس نے بچیوں کو ذرا پڑھائی وغیرہ سے فراغت دینے کا سوچا ہے۔ ویسے کل آئے گی وہ، کہہ رہی تھی ان تین دنوں میں کوئی آرٹ وغیرہ کا کام کرائے گی۔"

جعفر کی بہت کچھ کہتی نظروں سے خائف ہوتی، گھبراتی، گھبرائی وہ اٹک اٹک کے بتا رہی تھی۔

"تو وہ اندر کیا کر رہی ہیں۔ بلاؤ انہیں، کہیں گھما پھرا کے لاتے ہیں۔"

جعفر نے جھٹ آؤٹنگ کا پروگرام بنا لیا۔

"ابھی بلاتی ہوں۔" وہ اٹھی۔

"پلے لینڈ لے کر جاتے ہیں اور ڈنر بھی کہیں باہر کریں گے۔"

"مگر۔۔۔" وہ جاتے جاتے رکی۔

"میں نے تو کھانا پکا لیا ہے۔"

"کل کے لیے رکھ دینا۔"

"آپ ایک دن کا پکا اگلے دن کھاتے کب ہیں۔"

اس نے دبے الفاظ میں جتایا، وہ خفیف سے مسکرا دیا۔

"ویسے بھی آج میں نے آپ کی پسند کا کھانا تیار کیا تھا۔"

"تم نے کب ایسا کھانا پکایا تھا جو مجھے پسند نہیں ہوتا۔ آج ایسا کیا خاص ہوگا۔"

مدیحہ غور کرنے لگی۔ کیا ان الفاظ میں بھی کہیں تعریف چھپی ہوئی تھی یا پھر۔۔۔

اور یہ سچ تھا اس نے کھانا بناتے ہوئے ہمیشہ جعفر کی پسند ناپسند کا دھیان رکھا تھا۔ ایک اتفاق یہ بھی تھا کہ بچیوں کی پسند کم از کم کھانے کے معاملے میں بالکل باپ پہ گئی تھی اور وہ خود تو سب ہی کچھ کھا لیا کرتی تھی، اب

جعفر کو بھی کھانے پہ کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ یہ الگ بات کہ اس کو تسلیم وہ آج کر رہا تھا۔ اتنے سالوں میں پہلی بار۔

"ہاں، مطلوبہ بتاؤ کیا پکایا ہے؟ شاید اس کے لالچ میں میں باہر کھانے کا ارادہ گول کر دوں۔"

"چنے پلاؤ، پالک کوفتے اور شکر قندی کی کھیر۔"

"ارے، سارے ہی اتنی محنت والے کھانے، خیر تو ہے؟"

"بس ایسے ہی دل چاہا۔"

"تو ٹھیک ہے جناب۔ آپ کا دل چاہا اور آپ نے اتنی گرمی میں اتنی محنت سے بنایا بھی۔ تو ہم آج یہی کھا لیتے ہیں لیکن ... گھر سے باہر جانا ضرور ہے۔ تم بچیوں کو تیار کرو میں شاور لے کر آتا ہوں۔"

وہ اس کے پاس سے آتے ہوئے کہنے لگا اور جاتے جاتے اس کے بالوں کی لٹ کو ہلکے سے چھو کر اس کے رخسار پہ چھوڑ گیا تھا۔

وہ ساکن ہوئی دیر تک وہیں کھڑی رہی۔

خواب تھا یا حقیقت؟

کتنے عرصے بعد ایسا ہوا تھا کہ وہ دونوں مقابل تھے۔ اکیلے تھے مگر ایک دوسرے پہ لفظوں کے تیر برسائے اور نشتر چلائے بغیر پندرہ بیس منٹ گزار دیے۔

اور کتنے عرصے بعد... نہیں بلکہ اس عرصے میں شاید پہلی بار اس نے مدیحہ سے اتنی ملائمت اور لگاوٹ سے بات کی تھی۔

"کیا یہ مستاب آپا کے جانے کا اثر ہے؟"

اس نے سوچا اور خود ہی نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں۔ اگر ان کے جانے کا کچھ اثر ہوا بھی ہے تو مجھ پہ ہوا ہے۔ سارا دن جلی کٹی باتیں سنتے رہنے کا عذاب، ان کی بے تکی حرکتوں پہ جعفر کی ناراضی کا خوف۔ ان سب سے نجات ملنے کا احساس ہوا ہے اور شاید اسی نجات نے، اسی ہلکے پھلکے ہو جانے کی طمانیت نے آج مجھے اتنا مسرور کیا کہ میں یوں دل لگا کے تیار ہوئی۔ جعفر کا من پسند کھانا تیار کیا اور انہیں خوش دلی سے ویلکم بھی کیا اور وہ... اس کا مطلب ہے جعفر کو تسخیر کرنے اور اسے اپنے اور صرف اپنے تک محدود رکھنے کے میرے وہ سب حربے بے کار تھے۔ کارگر رہی تو ایک ذرا سی مسکراہٹ اور ان کی پسند میں ڈھل جانے کی ادا۔"

وہ لپ اسٹک کا شیڈ تھوڑا اور ڈارک کرتے ہوئے مسکرا کے سوچنے لگی۔

بال اس نے صرف اس لیے کھلے رکھے تھے کہ وہ ابھی ٹھیک طرح سے خشک نہیں ہوئے تھے لیکن اب خشک ہو جانے کے بعد بھی اس کا انہیں باندھنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ کلپ لگا کر وہ کمرے سے باہر نکلی۔ بچیاں پوری طرح سے تیار، پلے لینڈ جانے کی خوشی سے سرشار چہک رہی تھیں اور جعفر فون کان سے لگائے کسی سے ہنس ہنس کے بات کر رہا تھا۔

"تمہیں یار، تمہیں کیسے بھول سکتا ہوں۔۔۔ او کم آن۔۔۔" مدیحہ کے قدم لڑکھڑائے۔

بلاشبہ بے مجبور اس کا ذہن شک کے تانے بانے بننے میں مصروف ہوا۔

"کون ہو سکتی ہے؟ وہ لاہور والی؟ یا وہ جو... نہیں نہیں... نئی سیکرٹری سے بات کر رہے ہوں گے یا پھر..."

اس کا ذہن اندازے لگانے میں مصروف تھا کہ جعفر نے بات کرتے کرتے ایک ستائشی نظر اس پہ ڈالی۔

شک کے سارے دھاگے ایک جھٹکے سے ٹوٹ گئے۔

"ہاں کل ملتے ہیں، پروگرام کوئی مل بیٹھنے کا۔"

وہ اسی نثار ہو جانے والے بے تکلفانہ لہجے میں بات کر رہا تھا مگر اب مدیحہ دور کھڑی اس کے الفاظ کو پرکھ کر ان کا مطلب پہچاننے کے بجائے پُراعتماد قدم اٹھاتی چلی گئی۔

"سچا ہو بچے۔" اس نے قریب آتے ہوئے کہا۔

"ہاں ہاں... اس وقت فیملی کے ساتھ جا رہا ہوں' او کے اللہ حافظ۔"

اس نے فون رکھ دیا اور تقدیس کی انگلی تھام لی۔

"چلیں بیٹا..."

"چلیں..." تینوں نعرہ لگانے کے انداز میں چلائیں۔

☆ ☆ ☆

"ارے وشمہ! آپ کہاں جا رہی ہو بیٹا؟"

وہ رات کو حسب معمول دونوں بچیوں کو دودھ کا گلاس دینے آئی۔ سوہا تو عادت کے مطابق بڑے بڑے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرنے لگی مگر وشمہ ایک ہی سانس میں سارا گلاس خالی کر گئی جیسے اسے کہیں جانے یا کام کے کرنے کی جلدی ہو۔

پھر وہ ہتھیلی کی پشت سے اپنا منہ صاف کرتی جلدی جلدی چپل پہننے لگی۔

"میں دادی کے کمرے میں جا رہی ہوں۔"

"وہ تو جلدی سو جاتی ہیں۔ سو بھی گئی ہوں گی اب تک۔"

منزہ کو حیرت بھی ہوئی کہ وشمہ اور سوہا دونوں ایک ساتھ الگ کمرے میں رہنے کی روٹین کو بڑے دل سے قبول کر چکی تھیں پھر وہ آج سونے کے لیے دادی کے کمرے میں کیوں جا رہی ہے۔

"تو پھر میں پھپھو کے کمرے میں چلی جاؤں گی۔"

پروین بھی رات یہیں رکی تھی' صبح چھٹی کا دن تھا۔

"مگر یہاں کیوں نہیں... دیکھو نا پھر آپی اکیلی سوئے گی۔"

"تو میں آپی کو بھی لے جاتی ہوں۔ آؤ آپی! بڑا مزا آئے گا پھپھو کے پاس۔ وہ بڑی اچھی کہانیاں سناتی ہیں۔ حسان بھائی اور احسن بھائی کو بہت سی سٹوریز بھی آتی ہیں۔"

منزہ نے سوہا کو دیکھا' وہ نیم رضامند نظر آ رہی تھی۔ اسے گھبراہٹ نے آن گھیرا۔ پروین کے پاس اپنی بیٹیوں کے بھیجنے کا تصور ہی اسے پریشان کرنے لگا۔

"نہیں بیٹا! آپی کو رہنے دو' آپ جاؤ۔"

"کیوں ماما؟"

اس کیوں کا جواب منزہ کے پاس نہ تھا۔

یا شاید تھا مگر وہ جواب وشمہ سمجھ نہ سکتی تھی۔

"جاؤں ماما؟" سوہا نے بھی اجازت طلب نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

منزہ نے الجھ کے اسے دیکھا۔ سوہا کی آنکھوں میں وہاں جانے کی خواہش سے زیادہ اس سوال کے جواب کی کھوج زیادہ جھلک رہی تھی جو سوال وشمہ نے کیا تھا۔

پروین سے اس کی وابستگی اس نوعیت کی نہیں تھی کہ وہ اس کے پاس جا کے سونے کے لیے مچل جاتی مگر اس تذبذب نے اس کے اندر تجسس جگا دیا تھا' وہ تھی ہی ایسی۔ ہر اس بات پہ اڑ جاتی جس کے لیے منع کیا جاتا۔

"نہیں بیٹا! آپ اپنے کمرے میں ہی سوؤ۔" وہ اس کا تکیہ درست کر کے رکھنے لگی۔

"مجھے اکیلے میں نیند نہیں آئے گی۔"

"میں ہوں نہ تمہارے پاس' جب تک تم سوتی نہیں' میں یہیں رہوں گی۔"

"اور جب میں سو جاؤں گی تب تو آپ چلی جائیں گی' مجھے اکیلے میں ڈر لگے گا ماما!"

اتنا کہہ کر وہ پاؤں اٹھا کے باہر نکلی' وشمہ دروازے کے پاس تھم گئی۔

"آپی کو میرے ساتھ آنے دیں نا' پھپھو کے ساتھ سونے میں مزا آتا ہے۔ سچی۔"

"وشمہ بیٹا! آپ جاؤ۔"

منزہ کے کہنے پہ وہ چپ چاپ باہر جانے لگی۔

"وشمہ جا سکتی ہے تو میں کیوں نہیں؟" سوہا احتجاجاً چلائی۔

"وہ ابھی چھوٹی نہیں رہیں سوہا کہ یہ جان نہ سکو' وہ وشمہ کی پھپھو ہیں' صرف وشمہ کی پھپھو۔ تمہاری نہیں۔"

وہ تقریباً چلّا اٹھی' آخری حد تک جاتے ہوئے کہے پڑتے۔ دروازے کے قریب جھک کر چپل سے اپنا جوتا اٹھاتے ہوئے وشمہ یہ بات سنی اور حیران رہ گئی۔

"صرف میری پھپھو؟"

"پتا ہے مجھے ماما! مجھے سب پتہ ہے۔" سوہا اچانک ہی منزہ کو بہت بڑی بڑی محسوس ہوئی۔

اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے سمجھداری سے سرہلاتے ہوئے وہ دس برس کی بچی نہیں' اٹھارہ انیس برس کی باشعور لڑکی لگ رہی تھی۔

"مجھے سب پتا ہے' وہ صرف وشمہ کی پھپھو ہیں' میری نہیں جیسے آپ میری ماما ہیں' صرف میری۔ وشمہ کی نہیں۔"

"سوہا..." منزہ نے دہل کے اس کے منہ پہ ہاتھ رکھا اور گھبرا کے دائیں بائیں دیکھا۔

"ایسے نہیں کہتے بیٹا!"

وہ ڈر رہی تھی کہ کوئی سوہا کے یہ خیالات نہ جان لے خصوصاً نوید مراد۔ تین سال ہونے کو آئے منزہ کو اس گھر میں مگر وہ اب تک سوہا اور نوید کے درمیان وہ رشتہ قائم کرنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے اور وشمہ کے درمیان اول روز سے بن چکا تھا پھر بھی وہ اس وقت کی منتظر تھی جب سوہا نوید کو ایک باپ کی حیثیت سے دل سے قبول کرتی۔ نوید نے اپنے دل کا راستہ کھلا رکھا تھا' یہ بات اس کے ہر عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ منزہ اب تک مایوس نہ تھی۔ بس کبھی کبھی سوہا کی حرکتیں اسے خوف زدہ کر دیتیں کہ کہیں ان کی وجہ سے نوید کے دل میں میل نہ آ جائے۔

"جس بات سے وہ ڈرتی رہتی تھی' وہ تو نہ ہوئی مگر یہ بات سنی تو وشمہ نے جو شاید اسے پوری طرح سمجھ بھی نہیں پائی تھی اور یہ آدھی ادھوری سمجھ ہی زیادہ خطرناک تھی۔

"تم جو چاہے مرضی کر لو' چاہے گھر جلاؤ' چاہے ساری دنیا' ہمیں اب کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تم دنیا کے کسی کونے میں بھی چلی جاؤ' اب تمہارا علاج نہیں ہو سکتا۔ تم کبھی ماں نہیں بن سکتیں۔"

وہ ایک ایک سیڑھی چڑھتی جا رہی تھی۔

اور اس کا دل مایوسی کی دلدل میں ایک ایک انچ اندر دھنستا جا رہا تھا۔

"کبھی بھی نہیں؟ کیا واقعی کبھی نہیں؟"

اس نے بے یقینی سے دہرایا۔

اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح بھی ناکام ہو سکتی ہے۔

جعفر نے اس کے عورت پن کو جگایا تھا اور پھر اسی نے اس کی نسوانیت کو مجروح بھی کیا تھا اور اس بار ہوئی شکست کا اپنے آپ سے یہ عہد کیا تھا کہ وہ کبھی نہیں ہارے گی۔

نہ تقدیر سے

نہ کسی مرد سے

تب سے لے کر اب تک اس نے اپنے سارے پتے بہت ہوشیاری سے کھیلے تھے۔
اپنی عمر کی دوسری لڑکیوں کی طرح اس کی بھی کچھ خواہشات تھیں' کچھ خواب تھے۔ ایک گھر' سمجھنے والے شوہر کے۔ بچوں کے....
کچھ لڑکیاں بند کواڑوں کے پیچھے آنکھوں میں یہ خواب سجائے تعبیر کے رنگ اترنے کا انتظار کرتی رہتی ہیں
کچھ تو ان خوابوں پہ پلکوں کی جھالر گرائے انھیں اپنے آپ سے بھی چھپائے رکھتی ہیں۔
مگر رانی۔۔۔ عرف ریحانہ شمع۔۔۔ ان عام سی بند کواڑوں کے پیچھے رہنے والی لڑکیوں میں سے نہیں تھی۔ کیا ہوا جو اس کے خواب ان لڑکیوں کے خوابوں جیسے تھے۔
وہ تھی تو چوباروں پہ بسنے والی لڑکی۔
جس کے خواب عام بھی ہوں تو تعبیر پا لینے کا ڈھنگ عام لڑکیوں سے جدا ہوتا ہے۔ اس نے اپنے خوابوں میں رنگ بھر لینے کی خود ٹھانی اور اصغر کی جانب قدم بڑھایا۔
شوہر ملا' صرف اور صرف اس کا ہو کر رہنے والا۔
گھر ملا۔۔۔ کسی دوسرے کی شراکت اور مداخلت سے سو فیصد محفوظ مگر یہاں تک آ کے وہ ہار ہی بیٹھی۔ وہاں نہیں بن سکتی تھی کہ اپنا تیسرا خواب پورا ہوتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔
"ماں۔۔۔ ایسا کیوں ہوا میرے ساتھ؟"
مہینوں بعد کبھی شمع خود اس سے ملنے آ جاتی ہو تو آ جاتی ہو مگر شادی کے چھ سات سال گزر جانے کے بعد ریحانہ نے خود پہلی بار شمع کے گھر کی سیڑھیاں چڑھی تھیں۔
"چل بس کر اب' رو رو کے آنکھیں گلابی ہیں۔"
شمع تھی تو بہرحال ماں۔۔۔ اس کی بکھری بکھری حالت دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو آنے لگا۔
دو دن پہلے ہی اصغر نے اسے اس روح فرسا حقیقت سے آگاہ کیا تھا اور تب سے لے کر اب تک اس کے آنسو تھمے تھے' نہ پلک لگی تھی۔ آنکھیں من من بھر کی ہو کے لال بوٹی ہو رہی تھیں۔ رنگت پیلی پھٹک۔
"کیا حال بنا رکھا ہے اپنا' سودائن لگ رہی ہے۔ کوئی دیکھے گا تو کیا کہے گا کہ شمع کی بیٹی اور ایسی۔۔۔"
"میری کوئی بیٹی نہیں ہوگی۔" اس نے ماں کی بات پوری سنے بغیر یاسیت سے کہا۔
"تو تجھے کیا فرق پڑے۔ تجھے کون سا اس نے کما کر دینا ہے جو تو نے کھانا ہے۔" شمع نے بے فکری سے کہا۔
"تو نے صحیح عمر میں صحیح فیصلہ کر لیا اور اب عیش کر رہی ہے۔ مجھے تو تیرا اتنا باپ ملا بھی تو تب جب اولاد کی امید ہی نہ رہی تھی۔" شمع نے ہلکا سا قہقہہ لگا کے خود اپنا مذاق اڑایا۔
"چالیس سے اوپر کی ہو گئی تھی میں اور تو میری بڑھاپے کی اولاد اور میرے بڑھاپے کا آسرا۔ اسی لیے تو ہر سال تیرے باپ کی برسی پہ ختم دلا دیتی ہوں کہ اور کچھ دے کر مرا ہو یا نہ مرا ہو' چلو آتی کے دن گنانے کو ایک بیٹی تو دے دی۔"
"میری کوئی بیٹی۔۔۔"
خلا میں مرکوز آنکھیں اس کی غائب الدماغی کو ظاہر کر رہی تھیں اور سرگوشی کی صورت ایک ہی بات کی تکرار اس کی ذہنی کیفیت کی نشاندہی کر رہی تھی۔
اب کے شمع نے ذرا تشویش سے اسے دیکھا۔
"ہو جاتا ہے رانی۔۔۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا ہے۔ بہتیری عورتوں کے گھر اولاد نہیں ہوتی مگر وہ سب اس طرح جی کا جنجال نہیں بنا لیتیں۔ اچھا یہ بتا اصغر کچھ کہتا ہے؟"
"اصغر۔۔۔" اس کی آنکھوں میں کچھ کچھ ہوش کی رمق نظر آئی۔
"ہاں اصغر' وہ کیا کہتا ہے؟"

"وہ کہتا ہے [illegible] کبھی بچہ نہیں ہوگا۔ چاہے میں کہیں سے بھی علاج کرا لوں۔ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔"
"میرا مطلب ہے کہ کیا وہ بچے کے لیے باتیں سناتا ہے؟ طعنے دیتا ہے؟ روتا ہے اس بات کے لیے؟"
"نہیں' اسے بچہ نہیں' صرف ریحانہ چاہیے۔" وہ تلخی سے مسکرائی۔
"تو پھر مسئلہ کیا ہے؟"
"مسئلہ یہ ہے کہ ریحانہ کو بچہ چاہیے۔ اسے صرف اصغر نہیں چاہیے۔" وہ دھاڑی۔
"بچے کی کرتوتوں کے پیچھے خود کو برباد کرے گی رانی!" شمع نے ٹوکا۔
"اب تو تیرے قابل تو رہی نہیں' سات سال گھر کے اندر بیٹھ کے تو نے خود کو گھن لگا لیا ہے۔ اب تو بیگم صاحب بن سکتی ہے' باجی جی بن سکتی ہے' میم صاحب بن سکتی ہے مگر وہ نہیں بن سکتی جو تو تھی اور تیری ماں ہے۔ اس لیے تیرے لیے یہی غنیمت ہے کہ اصغر کی جان کو چمٹی رہے۔ چاہے تجھے وہ بچہ دے یا نہیں۔ لیکن تیری حرکتیں بتا رہی ہیں کہ تو اس آخری اور اکلوتے سہارے کو بھی ہاتھ سے گنوانے کی فکر نہیں کر رہی کہ اسے اولاد کی نہیں' تیری پروا ہے۔ الٹا تو سوئے بھاگ کے اس کے دل میں بھی اولاد کی چاہ پیدا کر رہی ہے۔ کچھ اندازہ بھی ہے کہ یہ چاہ اس کے دل میں تو تو پیدا کر دے گی پھر اس چاہ کو پورا کرنے کے لیے بچہ کیسے پیدا کرے گی؟"
"یہی تو میں پوچھ رہی ہوں' میں بچہ کیسے۔۔۔؟"
وہ ماں کے ہاتھ تھام کے اس لجاجت سے بولی کہ شمع کا اس کو مزید پھٹکارنے کا سارا ارادہ دھرے کا دھرا رہ گیا۔
"پاگل' کہیں اور دل لگانے کی کوشش کر۔"
وہ نرمی سے اس کے بال سہلاتے ہوئے بولی۔
"میرا دل بچے میں اٹکا ہے۔ اس کے نرم نرم گالوں میں' سنہری بالوں میں' ننھی ننھی گلابی انگلیوں میں' ملائم ہونٹوں میں' چھوٹی چھوٹی قلقاریوں میں۔ مجھے راتوں کو اس کے رونے کی آوازیں آتی ہیں' دل ڈوبنے لگتا ہے۔ مجھے اس کے ننھے منے پیروں کے نشان زمین پہ نظر آتے ہیں۔ بس ایک وہ نظر نہیں آتا۔"
وہ ماں کی گود میں منہ چھپا کے رو پڑی۔
"بس اب اور نہیں رونا۔ ساری شکل خراب کر لی ہے رو رو کے۔ آج اصغر کو بچہ نہیں چاہیے کیونکہ وہ تیری شکل دیکھ دیکھ کے ہی راضی ہے لیکن اگر یہ شکل ہی بد شکل ہو گئی پھر کیا ہوگا؟ اور کیا ہے تیرے پلے؟"
اس کے اندر کی طوائف' ماں' غالب آ گئی جسے رنگ و روپ کی فکر زیادہ کھائے جا رہی تھی۔
"ہاں کیا ہے میرے پلے' کچھ بھی تو نہیں۔"
وہ یاسیت سے اپنی خالی گود کو تکنے لگی پھر اچانک اسے کچھ یاد آیا۔
"تم بتاتی تھیں کہ مجھے تم نے بڑی منتوں مرادوں سے لیا تھا۔"
"ہاں۔۔۔ عمر بھی تو ڈھل گئی تھی' حکیم ڈاکٹر کہتے تھے ویسے مجھ میں کوئی نقص نہیں تھا۔ اگر اللہ کی مرضی ہوئی تو کوکھ ہری ہو سکتی ہے اور میں جانتی تھی کہ میرے پاس وقت کم ہے۔ میں نے کوئی در گاہ نہیں چھوڑی۔ ہر جگہ چوکھٹ پکڑ کے اللہ میاں جی تک فریاد پہنچائی۔"
"میرے لیے بھی دعا کرو نا۔" اس نے منت کی۔
"ہاں' کروں گی مگر تو وعدہ کر کہ خود کو سنبھالے گی۔ ایسے بین نہیں ڈالتی پھرے گی۔ میں کروں گی دعا' [illegible]"
"ماں کی دعا ضرور رنگ لاتی ہے۔"
وہ مطمئن ہوئی پھر اگلے ہی لمحے چونک گئی۔

"اور بددعائیں۔۔۔؟ کیا بددعائیں بھی رنگ لاتی ہیں؟"

☆ ☆ ☆

"چائے۔" مدیحہ نے جعفر کے سامنے بھاپ اڑاتا کپ رکھا۔
"تم بھی پیو گی؟"
دوسرا کپ اس کے ہاتھ میں دیکھ کے جعفر نے حیرت سے پوچھا۔ وہ رات کو چائے پینے کی عادی نہیں تھی۔
"ہوں۔" وہ مسکرا کے اس کے برابر بیٹھ گئی۔
سارا دن گرمی رہی مگر مغرب کے بعد جو ٹھنڈی ہوائیں چلنا شروع ہوئیں تو رات کے اس پہر تک آتے آتے موسم خاصا خوشگوار ہو چکا تھا اور ٹیرس پہ بیٹھ کر باتیں کرنا اس سے بھی خوشگوار۔
"مگر تم تو۔۔۔"
"آہستہ آہستہ عادت ڈال رہی ہوں آپ کی عادتوں سے ہم آہنگ ہونے کی۔"
"خود پہ جبر کرنے کی ضرورت نہیں ہے مدیحہ! اگر تمہیں زیادہ چائے پینا اچھا نہیں لگتا تو۔۔۔"
"نہیں جعفر! میں سچ کہہ رہی ہوں، مجھے آپ کے ساتھ بیٹھ کے چائے پینا اچھا لگ رہا ہے۔"
اس نے سچے دل سے کہا۔ جب سے اس نے شک کی عینک اتاری تھی، جعفر اسے ویسا ہی لگنے لگا تھا جیسے شادی کے شروع کے دنوں میں لگتا تھا۔ اپنا اپنا سا، مہربان سا۔
جب سے اس نے اپنے رویے میں تبدیلی کی تھی، جعفر کو بھی اس سے کبھی شکایت رہا کرتی تھی۔
"اب ایسا نہ ہو کہ تم اتوار کو اپنے ساتھ ناشتہ کراتے ہوئے مجھے بھی پراٹھا کھانے پہ مجبور کرو۔ بیوی ہے... نہیں کر سکوں گا۔"
وہ ہنستے ہوئے کہنے لگا۔
مدیحہ بھی ہنس پڑی۔
"نہیں نہیں میں آپ کو مجبور نہیں کروں گی۔ یہ آپ کہیں تو میں بھی ناشتے میں پراٹھا لینا چھوڑ دوں۔"
"بس بس۔۔۔ اتنی بھی تابعدار اور پرفیکٹ قسم کی بیوی نہ ہو کہ میرے دل میں تمہارے جیسی دو تین بیویاں پانے کی خواہش جاگ اٹھے۔"
جعفر نے قہقہہ لگایا اور یکدم چپ ہو کے اسے دیکھنے لگا۔ پہلے اس کی مذاق میں بھی کہی ایسی کسی بات پہ مدیحہ کا ردعمل شدید ہوتا تھا مگر اب وہ کھل کے ہنس رہی تھی جیسے اس کے مذاق کا لطف لے رہی ہو۔
وہ بھی ہلکا پھلکا ہو کے مسکرا دیا۔ سینے سے جیسے کوئی بھاری سل سرک گئی تھی۔
اندر سے آتی فون کی گھنٹیوں نے مدیحہ کو قہقہے روکنے پہ مجبور کیا۔
"میں دیکھ کے آتی ہوں۔"
وہ کپ رکھ کے اٹھی اور جعفر نے ایک بھرپور انگڑائی لے کر ستاروں بھرے آسمان کو تکا۔
"چلو دیر سے ہی سہی، اس گھر کو سکون تو ملا۔ اگر میں پہلے والی ڈگر پہ ہی ہوتا تو شاید مدیحہ کا وہ طرز عمل مجھے کھلتا لیکن جب میں سب چھوڑ چھاڑ چکا تھا، بڑی ہوتی بچیوں نے مجھے سنبھلنے پہ مجبور کر دیا پھر میں زندگی کا... سوئی کے ناکے میں سے گزرتے ہوئے کیوں بتاتا۔ اسی لیے بھڑک جاتا تھا۔ اس کی کسی بھی بات پہ اچھا بھلا... میری ذات پہ اعتبار تو آیا۔"
اس نے گہری سانس لے کر ٹیرس میں کھلنے والی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ مدیحہ ریسیور اٹھا رہی تھی۔ کان سے لگاتے ہی اس کے چہرے پہ مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ جعفر بھانپ گیا، فون اس کے میکے سے ہوگا پھر اس نے اسی پل یہ مسکراہٹ غائب ہوتے دیکھی۔ مدیحہ پریشانی کے عالم میں کچھ کہہ رہی تھی۔ وہ اٹھا اور تیزی سے اندر لپکا۔

"کیا ہوا مدیحہ! کس کا فون ہے؟"
وہ خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی اور ریسیور کریڈل پہ ڈال دیا۔
"جعفر! وہ عکرم بھائی جان۔۔۔"
"کیا ہوا انہیں، ٹھیک تو ہیں وہ؟"
جعفر کا دل ڈوب گیا۔ عکرم سے لاکھ اختلافات سہی مگر وہ اس کی بہن کا شوہر تھا۔
اس کا دل بے معنی اندیشوں میں گھر گیا۔
"مدیحہ۔۔۔ بتاتی کیوں نہیں ہو، گھر پہ سب خیریت ہے نا؟"
مدیحہ نے لب دباتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔
جعفر کا دل ڈوب گیا۔
"عکرم بھائی صاحب۔۔۔"
اس نے پوچھنا چاہا مگر چند کپکپاتے الفاظ کے سوا کچھ نہ کہہ سکا۔
"جعفر۔۔۔ بھائی جان نے۔۔۔ انہوں نے۔۔۔"
اچانک وہ جعفر کے سینے سے لگ کے پھپک کے رو دی۔
"انہوں نے ایسا کیوں کیا جعفر۔۔۔ کیوں؟ انہوں نے اتنا بھی نہیں سوچا کہ اس سے ہمارے پورے خاندان پہ کیا اثر ہوگا۔ اچھی بھلی سوجھ بوجھ ہونے کے باوجود انہوں نے یہ حماقت کی کیسے؟"
وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی اور کچھ سمجھ میں نہ آنے کے باوجود جعفر اپنے دل سے ایک بھاری بوجھ ہٹتے محسوس کر رہا تھا۔
کسی انہونی کے خدشے نے اس کے دل و دماغ کو آزاد کیا۔ اس نے ایک گہری اطمینان بھری سانس لی۔
"کیا ہو گیا ہے مدیحہ! کیوں روتی چلی جا رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی کہ ہوا کیا ہے؟ کیا کیا ہے عکرم بھائی جان نے؟"
"انہوں نے مہتاب آپا سے نکاح کر لیا ہے۔"
"کیا۔۔۔؟" جعفر نے ایک جھٹکے سے اسے اپنے سینے سے الگ کیا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو؟"
وہ اسے بے یقینی سے گھور رہا تھا اور اس کی زبان سے ان الفاظ میں مخاطب تھی جن سے بات کرنے کا وہ عادی نہ تھا۔
"وہ اس عورت سے نکاح کیسے کر سکتے ہیں۔ میری آپا۔۔۔" وہ مٹھیاں بھینچتے ہوئے دروازے کی جانب لپکا۔
مدیحہ کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔
"یہ حرکت کرنے کی جرأت کیسے ہوئی اس شخص کو۔" جعفر کا انداز تخاطب بھی بدل گیا۔ "پہلے تو میں جا کے اباجی سے پوچھتا ہوں۔ یہ ہے ان کا وہ اندھا اعتماد جو وہ بیٹے کے بجائے بھتیجے اور داماد پہ کرتے رہے۔ اس کے بعد جا کے تمہارے بھائی کا گریبان پکڑتا ہوں۔ مجھے تو گھٹنوں پہ ڈال کے بلکتا ہوا لے گیا تھا کہ میری بہن کے ہوتے ہوئے تم نے ادھر ادھر نظر ڈالنے کی ہمت کیسے کی۔ اب میں ڈالتا ہوں پھندا۔ اتنا آسان نہیں ہے جعفر محمود باجوہ کی بہن پہ سوتن لے آنا اور خاص طور پہ یہ جانتے ہوئے کہ جعفر کے گھر میں اس کی اپنی سگی بہن بھی ہے۔"
اس نے جاتے جاتے دھماکے سے دروازہ بند کیا اور مدیحہ بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ ایک جانب گر گئی۔
اسے گزرے چند دن کسی خواب کی مانند لگ رہے تھے۔ کسی ایسے ڈراؤنے خواب کی مانند جو آغاز میں بے حد سہانا تھا مگر جس کا انجام اتنا ہی بھیانک۔

● ● ● ●

"مہتاب آپا سے بات کروائیے۔"
اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا مگر مہتاب کے فون پہ آتے ہی اس کے لہجے کی یہ سفاک سی ٹھنڈک بھاپ بن کے اڑ گئی۔

"مہتاب آپا! آپ کو شرم نہیں آتی ایسا کرتے ہوئے؟؟"
دوسری جانب سے اس کی غصیلی ہوئی ہیلو سن کے وہ پھٹ ہی تو پڑی۔
"ارے۔۔۔ مدیحہ۔۔۔ کیسی ہے تو؟"
وہ اتنے نارمل انداز میں خیریت دریافت کر رہی تھیں کہ مدیحہ کی جان جل گئی۔
"مہتاب آپا! آپ سنئے تو سہی۔۔۔"
"کیا آپا آپا لگا رکھی ہے۔" مہتاب نے بات کاٹ کر ٹوکا۔
"کہاں کی آپا۔۔۔ اور کیسی آپا۔۔۔ بھاوج ہوں اب تمہاری۔" انداز سراسر جی جلانے والا تھا۔
"ہر راہ چلنے والی کو میرا بھائی گھر بٹھائے تو آدھے شہر کی رنڈیاں میری بھابھی نہیں بن جائیں گی۔"
وہ بھی چوہدرائن تھی، اپنے اندر کی کھولن اس نے لفظوں میں کھول کے مہتاب پہ انڈیل تو دی وہ کھلا اٹھی۔
"زبان سنبھال کے مدیحہ! نہ میں کوئی راہ چلتی ہوں کہ تیرے بھائی نے دل بہلانے کے لیے مجھے گھر لا رکھا ہے۔ نکاح کیا ہے اس نے میرے ساتھ۔"
"اور بھائی ایسے ہی تو نکاح پہ مانا نہیں ہوگا۔ نہ تمہاری شکل نئی ہے اس کے لیے نہ کرتوت۔ ایسا ہی شہزادہ ہے تمہارے عشق میں پاگل ہو رہا تو کب کی شادی کر چکا ہوتا تمہارے ساتھ۔ یہ تو محض بھائی جان سے طلاق کے بعد تم نے جو ہاتھ پیر مارے ہیں دوبارہ گھر بسانے کے لیے یہ اسی کا نتیجہ ہے۔"
"ہاں تو کیا ہوا۔" مہتاب کا لہجہ ایسی کڑوی کسیلی سننے کے بعد بھی نارمل ہی تھا۔
"بیوہ یا طلاق یافتہ کو کیا دوسری شادی کا حق نہیں ہے؟؟"
"واہ آپا! جب تمہارے میاں نے ایک بیوہ سے شادی کی تو تم نے زمانہ نچا ڈالا۔ تین لفظ سن کے ہی جان چھوڑی اس غریب کی۔ کیا اسے حق نہیں تھا دوسری شادی کا؟؟ اپنے حق تو بڑے یاد ہیں تمہیں۔ غضب خدا کا۔۔۔ طلاق لیے دن ہی کتنے ہوئے ہیں۔ عدت بھی پوری کی یا نہیں؟؟"
"اپنے بھائی سے پوچھ جا کے، اسے سارا حساب یاد ہے۔" مہتاب نے بھرے دل جلانے والے انداز میں کہا۔
"دن گن گن کے گزارے ہیں اس نے میری عدت کے۔" وہ مدیحہ کے طیش سے جیسے حظ اٹھا رہی تھی۔
"شرم تو نہیں آتی ایسے اپنے کرتوتوں پہ اتراتے ہوئے۔ عدت میں بیٹھ کے ایک بال بچے دار آدمی کو انگلیوں پہ نچاتی رہی ہو۔"
"اچھا اب بس کر بہت کچھ سن لیا تو نے۔"
اچانک مہتاب نے اکتاہٹ بھرے انداز میں کہا۔
"میں نے اب تک برا نہیں مانا کہ چلو غصہ آ ہی جاتا ہے۔ ساری برادری کو کوڑ (غصہ) چڑھی ہوئی ہے۔ تیرے پاس تو پھر بھی وجہ ہے لیکن اب بس اور کچھ نہیں سنوں گی میں۔ چھوٹی ہے، چھوٹی بن کے رہ۔ اپنے اور میرے رشتے کا لحاظ کر۔"
"لحاظ۔۔۔ تم نے کیا تھا کسی رشتے کا لحاظ؟؟"
"میں نے کیا کیا ہے؟؟"
اس کے بھولپن سے کیے گئے سوال پہ مدیحہ کا بے اختیار دل چاہا کہ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے اس کا منہ نوچ لے۔
"دیکھ مدیحہ! نہ بات بڑھانے سے کوئی فائدہ ہے نہ مجھ سے بگاڑنے کا۔ میں اب تیرے بھائی کی بیوی ہوں اور وہ بھی وہ جس سے اس کا ڈھلتی عمر کا عشق۔" وہ ذرا سا ہنسیں۔ "ڈھلتی عمر کے عشق کا مطلب جانتی ہو۔ اس عمر میں ہوا عشق اتھرے سے اتھرے مرد کی مت مار کے رکھ دیتا ہے۔ سمجھو مکرم کی بھی مت ماری گئی ہے۔ اب اس عورت سے بگاڑنا کتنا نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے جو تمہارے بھائی کے سر چڑھی ہے۔ یہ تم خود سوچ لو۔"

مجھے؟ یاد رکھو مہتاب آپا! چور راستوں سے اندر آنے سے کوئی مالک نہیں بن جاتا۔ تم خود کو دھوکا دے رہی ہو۔ مجھے بھی یہ غلطی مت کرنا بلکہ اس خوش فہمی سے بھی نکل آؤ کہ تم بھائی جان کی منہ چڑھی بیوی ہو۔ میری بھابھی وہی ہے جو سارے خاندان کی رضامندی سے ان کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔ تم لاڈلی ضرور ہو سکتی ہو، عزت والی کبھی نہیں۔ ہم میں سے کوئی تمہیں وہ عزت نہیں دے گا جس کی تم خواہش کر رہی ہو۔ ایسی ہی پسندیدہ وقت رہو گی۔ زیادہ سے زیادہ بھائی جان کے ڈھلتی عمر کے عشق کا سہارا ہو گا تمہیں۔ دیکھیں گے ڈھلتی عمر کے اس مست ہاتھی والے! ڈھلتے عشق کا سہارا کب تک رہے گا۔"
"بڑا زہر اگل رہی ہو۔ تکلیف کیا ہے تمہیں؟"
مہتاب نے چبھتے لہجے میں کہا۔ "تمہارے بھائی سے ہی تو شادی کی ہے۔ تڑپ تو ایسے رہی ہو جیسے تمہارا [illegible] کر لیا ہے۔"
"مہتاب آپا!" وہ چلائی۔
"میرے بھائی بیٹھے درجن زنانیاں اور بیاہ کے لے آئیں۔ اس سے مجھے کیا فرق پڑتا ہے۔ تمہیں بھی نہیں پڑنا چاہیے مگر تم تو ایسے دہائیاں دے رہی ہو جیسے تمہاری بھاوج پہ نہیں خود تم پہ سوتن آ گئی ہو۔"
مدیحہ کی غیظ و غضب سے بری حالت تھی۔
"اچھا۔۔۔ ہاں۔۔۔ اب یاد آیا۔۔۔ وہ کوئی بھاوج ہی نہیں ہے۔ تیری۔۔۔ نند بھی تو ہے۔۔۔ ہاں اب سمجھ آیا تیرا کلسنا اور تڑپنا۔"
مہتاب نے ایسے نکتہ ڈھونڈ نکالا جیسے اس سے پہلے تو وہ اس بات سے واقف ہی نہ تھی۔
"تیرا مرد تو ویسے بھی کب کا رسیاں تڑا رہا ہے۔ بہنوئی کے نکاح پہ نکاح سے اسے چھوٹ بھی مل گئی اور دوسری شادی کا بہانہ بھی۔ چہ چہ۔۔۔ یہ تو واقعی برا ہوا۔ بچی مدیحہ! مجھے اس کا تو خیال ہی نہ آیا۔"
"تم اتو تم نہ کرتیں یہ شادی؟" مدیحہ نے استہزائیہ انداز میں کہا۔
"کیا پتا نہ بھی کرتی۔ مجھے کوئی تجھ سے بیر تو نہیں مگر سچی بات ہے۔ میرا اس طرف دھیان ہی نہیں گیا۔ بس دعا کر تیرے مرد کا دھیان ہی نہ جائے۔ ویسے وہ ایسا لگتا تو نہیں جو پہلے ہی یہاں وہاں منہ مارنے کا عادی ہو۔ اس سے ایسی امید یار کھنی۔ ابھی بھی تو غصہ دکھا رہی ہے مجھے مگر اندر سے میرا احسان مند ہو رہا ہو گا۔ اوپر اوپر سے بس ہمدردی دکھائے گا اندر اندر اپنا الو سیدھا کرے گا۔ بہنوئی کو مزہ چکھانے کے لیے اس کی بہن پہ سوتن لائے گا۔"
"بس کرو مہتاب آپا! جعفر ایسے نہیں ہیں۔"
"مکرم ایسا تھا؟" مہتاب کا سوال اسے سن کر گیا۔
"مکرم بھی ایسا نہیں تھا۔" مہتاب کا نوکیلا لہجہ ذرا مدھم ہوا۔ "کوئی بھی ایسا ہوتا نہیں ہے مدیحہ! مگر ہو جاتا ہے۔ میں نے تجھے کہا تھا نا کہ یہ مرد کی ذات ہوتی ہی بڑی۔۔۔ ہے۔"
اس کی زبان سے ایک گالی نکلی اور مدیحہ نے ڈھیلے بے جان ہاتھوں سے ریسیور رکھ دیا۔
"مکرم ایسا تھا؟؟"
مہتاب کا سوال اس کے اردگرد بازگشت کی طرح گونج رہا تھا۔
اس کی نظروں کے سامنے اپنے بھائی کے شب و روز گھومنے لگے۔ ایک سیدھی سادی سپاٹ زندگی گزارنے والا۔ اپنے کام سے کام رکھنے والا۔
گھر، زمین۔۔۔ فصل۔۔۔ جائیداد۔۔۔
زندگی کی ہر رعنائی۔۔۔ خصوصاً صنف نازک سے کوسوں دور۔
شادی شدہ زندگی کے سولہ سترہ سال ایسے ہی گزار دینے والا اس کا خشک مزاج اور خاندانی آن بان پہ جان دینے

والا بھائی اگر ہر مصلحت سے بے نیاز ہو کے ایسا قدم اٹھا سکتا تھا تو جعفر... جعفر تو وہ شوہر تھی جس سے شادی کے ان گزرے تمام سالوں میں وہ ہمیشہ خائف ہی رہی۔

ہر وقت اس کے راستہ بدل جانے کا خوف دل و دماغ پہ طاری رہتا تھا۔

اس کی رنگین مزاجی... اس کی حسن پرستی... اس کا دل دہلائے رکھتی۔

اب اگر اس کو اپنا گھر طوفان کی زد میں آتا نظر آ رہا تھا تو کچھ ایسا غلط بھی نہ تھا۔

اور مہتاب نے جو کہا وہ بھی غلط نہ تھا۔

جعفر محمود کی مکرم باجوہ سے مخالفت اور کدورت کوئی ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ صرف بہن کے حوالے سے ایک محترم رشتے کا لحاظ تھا جو اسے حد میں رکھتا تھا اور جب وہ رشتہ خود مکرم نے ہی بے اعتبار کر دیا تو کون تھا جو جعفر محمود کو لحاظ اور مروت یا جیسے لفظ یاد رکھنے پہ مجبور کرتا۔

"کیا میری شادی شدہ زندگی میں سکون، اطمینان، بھروسے اور محبت کی عمر بس اتنی ہی تھی۔ گنتی کے چار دن۔" مدیحہ کا دل سوکھے پتے کی طرح کانپنے لگا۔

✿✿✿✿

مکرم باجوہ کی مہتاب سے شادی اس خاندان کے لیے ایک بہت بڑا دھماکا ثابت ہوئی۔

بہت سے لوگوں کی زندگی اس شادی سے زلزلوں کی زد میں آ گئی جن میں سرفہرست خود مکرم باجوہ کی زندگی تھی۔ پتہ نہیں جذبات کی کس رو میں آ کے اس نے یہ فیصلہ کر تو لیا تھا مگر اس کے ایسے نتائج بھگتنا ہوں گے اس کا اسے اندازہ نہ تھا۔

زیادہ سے زیادہ اسے بہن کی ازدواجی زندگی متاثر ہونے کا ڈر تھا مگر مہتاب کے عشق کا خمار کچھ ایسا سر چڑھ کے بول رہا تھا کہ اس نے اس ڈر کو خاطر میں لانے کی ضرورت نہ سمجھی۔ جعفر کو جیسے وہ ہمیشہ سے بڑا بہنوئی اور بڑا بھائی ہونے کے ناتے رعب میں رکھتا آیا تھا۔ سوچا اب بھی ایسا ہی ہو گا لیکن جعفر کے مکرم کا لحاظ کرنے یا اس سے دبنے کی سب سے بڑی وجہ اس کی اپنی کمزوری تھی۔ سومیہ سے اس کے اسکینڈل نے جس طرح اسے خاندان بھر میں رسوا کیا تھا اس کے بعد سے وہ نہ اپنے باپ کے سامنے سر اٹھا پایا تھا نہ مکرم کے۔ پر انا پانی تو تھا نہیں کہ چور تھا۔ پکڑے جانے کی خجالت نے اسے مکرم سے گریز کرنے پہ مجبور کر دیا تھا جسے مکرم رعب میں آنا سمجھ رہا تھا اور پھر اس کے تایا محمود باجوہ یعنی جعفر کے ابا کا اس پہ اندھا اعتماد۔ یہ سب جعفر کو دبنے پہ مجبور کرتا تھا۔

اب جب محمود باجوہ کا ہی اپنے داماد اور بھتیجے پہ اعتماد ڈانواں ڈول ہو چکا تھا تو کون سی چیز جعفر کو اس کا احترام کرتے رہنے پہ مجبور کر سکتی تھی۔ وہ کھل کے مکرم کے مقابل آ گیا۔

یہ صورت حال مکرم کے لیے غیر متوقع تھی۔

بیوی کے واویلے اور گریہ وزاری کے لیے وہ ذہنی طور پر تیار تھا۔

خاندان کے دیگر سرکردہ افراد کی جانب سے بھی ہلکی پھلکی لعن طعن کی توقع تھی مگر اس محاذ آرائی کا تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

اس کے اپنے والدین، بہن بھائی سب نے اس سے منہ موڑ لیا تھا۔ جعفر اپنی بہن اور بچوں کو اس کے گھر سے لے گیا تھا اپنی چاچی کی منت و سماجت کے باوجود۔

"دیکھو... وہ مکرم... روک لے جعفر کو... وہ بہن کو لے کر جا رہا ہے۔"

"لے جانے دو بے جی... بڑا شوق ہے اسے بہن کا گھر اجاڑنے کا... کر لینے دو شوق پورا۔"

"گھر وہ اجاڑ رہا ہے یا تو اپنا اجاڑ رہا ہے، بے ہدایتا۔"

"میں نے دوسری شادی کی ہے، پہلی کو نکالا نہیں ہے۔ ایک نکاح اور کر لینے سے مردوں کے پہلے نکاح ختم نہیں ہو جایا کرتے بے جی! اتنی بات تو پتہ ہو گی آپ کو۔ میں ابھی دو اور لا کے بٹھا سکتا ہوں۔ جانے دو اپنی لاڈلی بہو اور اس کے میکے والوں کو۔"

"اس کے میکے والے...؟" بے جی کو جلال آ گیا۔

"اس کے میکے والے نہیں... تیرے اپنے ماں پیو سے سگے تھے تیرے سو ہیرے۔ آج اس کے میکے والے ہو گئے اور یہ نہ بھول کہ گھٹیا ہو تیرے... کرتے ہوں گے مرد چار چار شادیاں، نے آتے ہوں گے بیوی پہ بیوی مگر اس بیوی پہ بیوی لانے کی جی تیری ناز دا ہے... کرم! جس کے وٹے میں اپنی بہن بیاہی ہو۔"

مکرم کو ہلکا سا خوف محسوس ہوا۔

"جا کے روک لے جعفر کو۔ آج وہ اپنی بہن لے گیا تو کل تیری بہن کو اس گھر تک چھوڑنے میں دیر نہیں لگے گا۔"

مکرم کے دل کو لگی لیکن جعفر کے پیچھے جانا، اسے روکنا، یہ سب اس کے وقار کے منافی تھا۔ اسے یہ بات... کی سبکی محسوس ہوئی۔

وہ جعفر کو روک سکا نہ اس کی بہن سے معافی مانگنے مگر اندر ہی اندر ڈر ضرور گیا۔ لاشعوری طور پر اس نے اسی وقت سے مدیحہ کی واپسی کا انتظار شروع کر دیا۔

"میں نے کہا کس سوچ میں گم ہو؟"

مہتاب نے گہرے سبز سوٹ پہ جھلمل کرتی منقش کے لشکارے اس پہ ڈالتے ہوئے بڑے ناز سے پوچھا۔

"جعفر اسے لے گیا ہے۔"

"کسے؟" اس نے انجان بنتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں مکرم نے اسے عجیب نظروں سے دیکھا۔

مہتاب سے پہلے اس کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑا یا نہیں، یہ تو پتہ نہ چل سکا۔ البتہ آنکھوں کی چمک ضرور کم ہوئی تھی۔ شاید یہ گمان ٹوٹنے کا دکھ تھا کہ اس کا ہونا کسی کے نہ ہونے کا ازالہ ہو سکتا ہے۔

"تو لے جانے دو، بہن ہے اس کی۔ رہنے دو دو چار دن میکے میں۔"

"تم بھی تو میکے آ گئی تھیں جب مختار..."

مکرم نے بات ادھوری چھوڑی پھر کچھ دیر بعد بولا۔

"تم تو دو چار دن بعد واپس نہ گئی تھیں۔"

"میری بات اور تھی۔" وہ گڑبڑا گئی پھر مسکرا کے بات سنبھالی۔

"بلکہ میری کیا... تمہاری بات اور ہے، وہ مختار تھا، یہ تم ہو۔ تمہیں چھوڑنے والی عورت ناشکری ہو گی۔"

"وہ بچے بھی ساتھ لے گئی ہے۔"

"آ جائیں گے، اولاد ہے تمہاری۔"

وہ اس کے کلف لگے کھدر کے کرتے پہ لگے سونے کے بٹن سے کھیلنے لگی۔

"بے بس..." مکرم نے اکتا کر اس کا ہاتھ جھٹکا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

مہتاب کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

"تو نہ کرتے مجھ سے شادی۔ اگر اتنی فکر تھی بیوی بچوں کی... پتہ نہیں تھا کہ یہ سب ہو گا۔"

"نہیں پتا تھا۔"

"پتا ہوتا تو نہ کرتے شادی؟"

"ہاں نہ کرتا۔" مکرم کے لہجے میں پچھتاوے ہوک رہے تھے۔

مہتاب بستر پہ اوندھی گر کے رونے لگی۔

"میری تو قسمت ہی خراب ہے۔ ایک نے مجھے چھوڑ کر دوسری سے شادی کی۔ دوسرے نے پہلی چھوڑ کے میرے ساتھ شادی کی مگر نہ وہ میرا اپنا نہ یہ میرا اپنا۔ اسے دوسری پیاری تھی اسے پہلی پیاری ہے۔ نہ میں گھر بستی

بن کے سکھ پا سکی نہ سوتن بن کے ہائے میرے نصیب۔"

مکرم کو کوفت ہونے لگی۔ "دلہن کر مہتاب... کیا نحوست پھیلا رہی ہے۔"

اسے ایسا لگا جیسے مکرم نہیں مختار اس سے مخاطب ہو۔ اب اسے سچ مچ اپنے نصیب کھوٹے ہوتے لگا۔ جب مختار نے اس کے اوپر سوکن لا بٹھائی تو اس کا رواں رواں توہین سے سلگ اٹھا تھا۔

وہ اس کے سامنے اس کے منہ میں نوالے بنا بنا کے ڈالتا اس کے آگے پیچھے پھرتا۔

اس کے ایک ایک سنگھار پہ واری صدقے جاتا۔

اس کے ماتھے کے ایک بل پہ وہ ہر کسی سے لڑنے مرنے پہ تیار ہو جاتا۔

اور مہتاب حیرت سے سوچتی رہ جاتی۔

"یہ وہی مختار ہے، جس نے پندرہ سال کی دلہن کو بھی اتنی میٹھی نظر سے نہیں دیکھا تھا۔ جوانی میں بھی پتا تھا۔ یہ چوبیس سال کی گٹھے جسم والی میرے آگے کیا چیز تھی مگر میں نے تب بھی کبھی ان کی نظروں میں وہ تڑپ اور طلب نہیں دیکھی تھی۔ میری بھی عمر گزر گیا... کنوارے جذبے... میری شرم و حیا سب اس کے لیے بے کشش تھے۔ چند دن کی نئی نویلی دلہن پہ ساس اور نندیں پل پڑتیں تو وہ بے گانہ بنا دیکھتا رہتا اور اب وہی اپنی من چاہی بیوی کے آگے ڈھال بنا رہتا تھا۔ کیوں؟ کیا کمی ہے مجھ میں اور ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں اس نئی دلہن میں؟ بات صرف اس کے نئے اور میرے پرانے ہونے میں ہے۔"

وہ کسی نتیجے پہ پہنچتی اور خود ہی اسے رد کر دیتی۔

"میں سدا سے پرانی کب تھی۔ نئی تھی تب کون سا قدر کر لی اس نے۔ فرق نئے پرانے کا نہیں من چاہی بن مانگے ملنے کا ہے۔ میں بن مانگے مل گئی ہوں اسے بغیر کسی طلب کے اور اسے مختار نے ضد کر کے لیا ہے۔ لڑ جھگڑ کے حاصل کیا ہے۔ وہ تو سر چڑھ کے ناچے گی ہی مگر میں اس کا ناچنا دیکھنے یہاں کیوں بیٹھی رہوں۔ کیوں مختار اور اس کی معشوقہ کے لیے روٹیاں پکاتی رہوں۔ ان کے عاشقانے دیکھ دیکھ کے کیوں جل جاتی رہوں۔ مجھے بھی من چاہا بننا ہے۔"

اس نے یہ سوچا اور کبھی نہ آنے کا طے کر کے اس کے گھر سے نکل گئی۔ سارے خاندان نے زور لگایا۔ کئی مثالیں پیش کیں جن میں سوتنوں کو بھی خوشی قبول کر کے اپنا گھر بچایا گیا تھا مگر وہ ضد پہ اڑی رہی۔

"مختار نے اتنے سال میں ایک بار بھی مجھ سے میٹھے بول نہ بولے۔ پیار کی نظر نہ ڈالی۔ باقی کی عمر ڈالتا۔ میں جی لیتی مگر میرے سامنے وہ کل کی آئی کم ذات پہ نثار ہوتا پھرے، یہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ بس طلاق۔ صرف طلاق۔"

وہ طلاق لے کر ہی مانی۔

اس وقت اس کے دل میں کیا تھا کوئی نہیں جانتا تھا۔ مگر عدت کے فوراً بعد ہی مکرم باجوہ سے اس کے نکاح نے جہاں لوگوں کو نت نئی باتیں سوچنے پہ مجبور کر دیا، وہیں مختار کو بھی اپنی صفائی پیش کرنے کا بہانہ مل گیا۔

"لو جی کیا ثبوت۔ پتہ چل گیا ساری برادری کو۔ ایسے ہی نہیں پھڑک پھڑک کر طلاق مانگ رہی تھی۔ پہلے سے شہ ملی ہوئی تھی ورنہ یہ کوئی انوکھی تو نہیں تھی جس پہ سوتن آئی تھی۔ تکلیف اسے میری دوسری شادی کی نہیں تھی، اپنی دوسری شادی کرنے کی تھی۔"

اس نے یہ الزام بھی سہہ لیا۔ کون سا سارے کا سارا جھوٹ تھا۔ کچھ تو سچ تھا ہی۔

مگر اس سے حاصل کیا ہوا۔

مکرم نے اسے زمانے کے خاندان کے خلاف جا کے اپنایا۔ جیسا کہ وہ چاہتی تھی مگر اب اسی زمانے اور خاندان کا خوف اسے کمزور کر رہا تھا۔

مکرم نے اسے کسی اور پہ فوقیت دی تھی، کسی اور کو رد کر کے اسے اپنائی تھی، جیسا کہ وہ چاہتی تھی۔

[illegible] ہی بات اپنی بیٹی کی ہوتی نسوانیت کی تسکین چاہتی تھی اور ہوا کیا؟ وہی روتی ہوئی عورت آج مکرم کے گھر سے [illegible] اپنی سوچ سے نہ نکل پائی تھی۔ ہو سکتا ہے وہ مکرم کے دل میں نہ رہتی ہو مگر زندگی سے نکلنے کا نام نہ لے [illegible]

[illegible] بیٹی کی شکست تھی۔

اس کی خواہشوں کی۔

اس کے ارادوں کی۔

اس کے خوابوں کی شکست۔

شکست مکرم باجوہ کی بھی تھی۔

اور مکرم باجوہ جس نے زندگی بھر کسی کے آگے سر نہ جھکایا تھا۔ اپنے اس ایک غلط فیصلے کی وجہ سے اسے بہت [illegible] سے سمجھوتہ کرنا پڑ رہا تھا۔

[illegible] اپنے فیصلے پہ بری طرح پچھتا رہا تھا۔

صرف ایک عورت کو پانے کے لیے اتنا سب کھو کے وہ ابھی تک سنبھل نہیں سکا تھا۔

روحانی کمالات کا بندہ تھا۔ عورت اور عشق کے جھمیلوں سے ہمیشہ دور رہنے والا۔ عورت کی غلامی کرنا اس کی سرشت میں نہ تھا۔ اس کے برعکس حکمرانی اس کی ہڈیوں میں رچی بسی تھی۔ ایک کمزور لمحے کی زد میں آکے وہ یہ قدم اٹھا بیٹھا مگر اس کے نتیجے میں حکمرانی اس سے روٹھ گئی تھی۔ اور یہ اس سے برداشت نہیں ہو رہا تھا۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح وہ یہ فیصلہ بدل ڈالے اور وہ سب دوبارہ حاصل کر لے۔ جن کی عادت اب نشہ بن گئی تھی۔ دوسروں کو اپنے آگے سر جھکائے کھڑا دیکھنے کی عادت۔

اپنی منوانے کی۔

خود کو سب سے مقدم، سب سے آگے دیکھنے کی۔

اور پھر اسے موقع مل گیا۔

محمود باجوہ کی طرف سے پیغام آیا کہ وہ چاہے تو اپنی بیوی کو منا کے واپس لے جا سکتا ہے۔ کسی معافی تلافی کی بھی ضرورت نہیں۔ فقط مہتاب کو فارغ کرنا ہو گا۔ بصورت دیگر وہ مدیحہ کو واپس لے جائے۔

مکرم نے صرف ایک لمحے کے لیے سوچا اور فیصلہ کر لیا جس بیوی کو بے ضرر اور بے وقعت جانتے ہوئے اتنی لاپروائی سے مہتاب کو اس پہ سوکن بنا لایا تھا، اسی کو اتنی اہمیت دینا... منانا... گھر واپس لانا... اپنی ضد توڑنا... یہ سب مشکل ضرور تھا مگر اس سب سے کہیں زیادہ آسان اور قابل قبول جو یہ نہ کرنے کی صورت میں دیکھنا پڑتا۔

خاندان بھر کی ناراضی۔

بہن کا گھر اجاڑنے کا ذمہ دار۔

[illegible] وہ سر جھکا کے سرخرو ہو سکتا تھا۔ وہی خاندان والے جو ابھی منہ پھلائے پھر رہے تھے کل کو واہ واہ کرتے [illegible] ہو جاتا۔ بہن کا گھر بچانے کے لیے اپنی ضد توڑ دی۔ چاؤ سے لائی عورت نکال باہر کی۔

اور اس نے یہی کیا۔

[illegible] کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ مکرم باجوہ جیسا ہٹ دھرم اور خود پسند شخص ایسا کر سکتا ہے۔

[illegible] ہم مجبور ہو گیا۔

[illegible] اس معاملے کو طول دینا چاہتا تھا۔

"[illegible] میں نے آپ سے کہا بھی تھا کہ اس معاملے کو مجھے اپنے طور پہ ہینڈل کرنے دیں۔" وہ تلملاتے ہوئے [illegible] سے کہہ رہا تھا۔

[illegible] نے ایک بھرپور جتانے والی نظر اس پہ ڈالی۔ اس کی تلملاہٹ ہاتھ سے کچھ کھو دینے والوں جیسی تھی۔

"اپنے طور پہ کیا کرنا چاہتے تھے تم؟ وہی جو مکرم نے کیا... ایک غلطی کو دہرانا چاہتے تھے؟"

"نہیں، میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا مگر میں بس..."
"بکواس مت کرو۔" وہ گرجے۔
"باپ ہوں تمہارا۔ تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔ بہن کی زندگی اجڑنے سے بچانے کے بہانے الو سیدھا کرنے کی فکر میں تھے۔ تمہاری بلا سے وہ بسے یا اجڑے۔ اس پہ چاہے چار سوتنیں اور جا... اس سے کیا۔ مگر تم موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔"
"ہاں چاہتا تھا میں ایسا۔ ساری عمر وہ میرے سر پہ مسلط رہے، خون خشک کرتے رہے میرا۔ رشتہ... تھا۔ وہ بہنوئی تھے تو میرا بھی رشتہ بہنوئی کا تھا۔ میں سالا تھا تو وہ بھی میرے سالے تھے مگر آپ نے ... کے ایک طرح سے میرا خدا بنا دیا تھا۔ جب جب موقع ملا وہ مجھے ذلیل کرنے سے نہ چوکتے۔ اب اگر مجھے ... رہا تھا تو میں کیوں نہ فائدہ اٹھاتا مگر آپ نے سارا کھیل ہی خراب کر دیا۔"
"کھیل... ذلیل انسان... تو اسے کھیل سمجھ رہا ہے۔" ان کا فشار خون بلند ہونے لگا۔
"اسے کچھ نہ کہیے گا آپ۔ سارا زور مجھ پہ آزما لیں۔" آج وہ بھی سارے لحاظ بالائے طاق رکھ ... "کھیل تو اس نے سمجھا ہوا ہے۔ جب چاہا بیوی لے آیا، جب چاہا نکال کے چکلی والی کے آگے گھٹنے ٹیک... میں یہ غلطی معاف نہیں کروں گا۔"
"کیوں؟ اس نے معاف نہیں کی تھی؟ تو بھی تو اس کی بہن کے ہوتے ہوئے حرام کاریاں کرتا رہا ہے ... نے معاف کیا تھا تو تجھے کیا تکلیف ہے۔ وہ تو پھر بھی گھٹنے ٹیک رہا ہے، اپنی غلطی مان بھی رہا ہے تو نے تو ... غلطی مانا تھا، نہ ہی شرم کھائی تھی۔ بس اتنا اکڑ دکھا رہا تھا۔"
"ابھی بھی آپ کی نظر میں وہ اچھے ہیں..." جعفر کو صحیح معنوں میں دکھ ہوا۔
"پتر! اپنی اولاد سے آگے کوئی نہیں جعفر پتر!" محمود باجوہ کا لہجہ اور تیور دونوں دھیمے پڑے۔ اس کے شانے پہ ہاتھ رکھ کے وہ نرمی سے کہنے لگے۔
"پتر، ایسے معاملے گرمی دکھانے سے نہیں، عقل استعمال کرنے سے سلجھتے ہیں۔ خون کا رشتہ بھی ہے ... کوئی صرف "ساگے داری" نہیں ہے۔ نسلوں تک کڑواہٹ چلتی ہے ایسے غلط فیصلوں کی۔ میں نے تو ... صرف دھمکی دی تھی، ورنہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا اور میں جانتا تھا کہ مکرم اگر میرے بھائی کی حق حلال کا ... ہے تو اس دھمکی سے ڈر جائے گا۔ اتنا دید لحاظ تو ہو گا اس کے دل میں بہن کے لیے۔"
"بابا جی! میں نے بھی صرف دھمکی دی تھی۔ خدا گواہ ہے کہ میری مدیحہ کو استعمال کرنے کی نیت نہیں تھی ... میں صرف مکرم بھائی صاحب کو کچھ اور..." وہ کہتے کہتے چپ ہو گیا۔
"ستانا چاہتا تھا۔" محمود باجوہ نے مسکرا کے بات مکمل کی۔
"مرد ذات ہے وہ۔ کیا پتہ اس پہ اثر ہوتا یا نہیں۔ البتہ مجھ پہ اثر ہوتا۔ کتنا دکھ ہوتا اسے یہ جان کر کہ ... داؤ پہ لگا رہا ہے۔ ابھی تو جو کیا ہے میں نے اپنے نام سے کیا ہے۔ میں ہی بُرا بنا ہوں، بہو کی نظر میں۔ اگر ... بُرے بنتے بیوی کی نظر میں بھی، بچیوں کی نظر میں بھی۔"
بات سمجھ میں آگئی اس لیے وہ چپ ہو رہا۔
مگر یہ بات مدیحہ کی سمجھ میں نہ آسکی۔
اس کے دل میں بدگمانی اور عدم تحفظ کا احساس اور توانا ہو گیا۔
پہلے تو صرف جعفر سے بدگمانی تھی، اب اپنے ہی بھائی کے اٹھائے قدم نے اس کے دل میں مرد ذات کے لیے شک اور عداوت کا بیج بو دیا۔
وہ جو کچھ دن قبل ہی اپنے اندر سے شکوک و شبہات کے سارے دھبے دھو دینے کے بعد خود کو ہلکا پھلکا محسوس کرتے ہوئے جعفر کی رفاقت کے مزے لے رہی تھی پھر سے اپنے خول میں سمٹ گئی۔

جب مکرم بھائی جان بھٹک سکتے ہیں تو ہر کوئی بھٹک سکتا ہے اور جعفر جیسا مرد تو کبھی بھی۔ اب مجھے اس سے نہ کوئی توقع رکھنا چاہیے، نہ امید، نہ ہی محتاط رہنے کا کوئی فائدہ ہے۔ میں کتنے بھی بند باندھ لوں۔ محبت کے... پہرے کے، احتیاط کے... چاہے قید بھی کر کے رکھ لوں، یہ طے ہے کہ مرد کی ذات کبھی کسی کی نہیں رہتی۔ پھر کیا فائدہ، کیا فائدہ ساری عمر اسے سنبھال سنبھال کے رکھنے کی فکر میں ہلکان ہونے کا۔ جعفر محمود! آزاد ہو تم، جو چاہے کرو، مجھے اب تمہیں کھونے کا خوف نہیں کیونکہ میں نے تمہیں پانے کی طلب ... کر دی ہے۔"
اس نے اپنی بچیوں کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ بڑھتی عمر کی بچیاں، ایک اور مدیحہ... ایک اور مہتاب... ایک ... بچیاں۔

☆☆☆☆

"منزہ آنی منزہ..."
شمشاد کی بات دار آواز پورے گھر میں گونج رہی تھی۔
اس نے جلدی سے سوہا کی چٹیا میں آخری بل ڈال کے ربڑ بینڈ چڑھایا اور باہر نکلی۔
"جی اماں جی۔"
"ارشی کا ناشتہ تیار ہے؟"
"جی۔"
اس نے آہستہ سے جواب دیا اور کچن کی جانب مڑ گئی۔ ان گزرے پانچ سالوں میں شمشاد نے گھر پہ اور سوہا و شمہ کے لیے ایک نگران کی سی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ بظاہر منزہ پہ سارے گھر کی ذمہ داری تھی۔ وہ ہر وقت سرگرم نظر آتی تھی مگر در حقیقت اس کی حیثیت ایک پتے سے بھی ہلکی تھی۔
اس نے وشمہ کی ماں بننے کی کوشش کی تھی اور اس میں وہ کامیاب بھی رہی تھی۔ ماں کی محبت کو ترسی، سہاوا، عقل والی وشمہ اس کے کتنے قریب آگئی تھی۔ نوید کا دل بھی اس نے ایسے ہی جیت لیا تھا۔ دھیرے دھیرے وہ دوبارہ اپنی زندگی اور نئے ہم سفر کے ساتھ ایڈجسٹ کرنے لگی تھی۔ کچھ وقت جاتا تھا جب سوہا بھی اس کو دل سے قبول کر لیتی۔ وشمہ کے حوالے سے اس میں کئی خوش آئند تبدیلیاں نظر آنے لگی تھیں۔
مگر سوہا کو نہیں کیا ہوا۔ شاید شمشاد جیسی بدفطرت عورت سے محبت کی یہ فضا برداشت نہ ہوئی تھی۔ اس نے وشمہ کو اپنے پروں میں سمیٹ لیا تھا۔ منزہ کو ماں کے بجائے سوتیلی ماں کے روپ میں اس بچی کے سامنے پیش کیا۔ وشمہ منزہ سے دور کیا ہوئی، اسے ایک مکمل گھر پانے کی خواہش کوسوں دور جاتی محسوس ہوئی۔
سب گھر کی فضا ویسی ہی تھی۔ شادی کے اولین دنوں جیسی کھنچی کھنچی سی تناؤ سے بھری۔
وشمہ زیادہ تر دادی کے کمرے میں گھسی رہتی۔
سوہا کے ساتھ اس کی بے تکلفی اور لاڈ پیار گزرے کل کی بات تھی۔
سوہا کے ساتھ اس کی بڑھتی انسیت اور اپنائیت خواب بننے لگی تھی۔ دونوں میں ایک تکلف مانع رہتا تھا جو نوید کی حد تک تو پھر بھی تکلف ہی تھا مگر بارہ سالہ سوہا کے طرز عمل سے کدورت بن کے جھلکتا تھا۔
منزہ بھی اپنے خول میں سمٹ گیا تھا۔
وشمہ سے ایک کمرے بند گھٹن میں بدلتے دیکھ کے وہ خود بخود اپنا جھکاؤ منزہ اور سوہا کی جانب محسوس کرتا تھا مگر اب میکانکی انداز میں اسے اپنی بیٹی کے فرائض ادا کرتے دیکھ کے وہ بھی سوہا سے غافل ہو گیا۔ بس ذمہ داریاں بغیر کسی تغیر کے پوری کر رہا تھا۔
منزہ کے خیال میں ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی ذمہ داری اتنی ہی ہے کہ میری بیٹی کو وقت پہ ڈھلے ... ہاتھ پیلے ہو جائے اور ایسا کر کے وہ سمجھتی ہے ماں ہونے کا فرض ادا ہو گیا تو ٹھیک ہے۔ سوہا کے لیے

میرا فرض بھی اتنا ہی ہے کہ میں اس کی فیس وقت پہ ادا کر دوں اور اسے جیب خرچ دے دیا کروں۔"

شمشاد نے اس ہوشیاری سے پتے چھپائے تھے کہ نامحسوس انداز میں سب کو دلی لحاظ سے ایک دوسرے سے دور کر کے صرف اور صرف ضرورت اور مجبوری کے رشتے میں باندھ دیا تھا۔

"وشمہ... بیٹا ناشتہ کر لو۔"

نبیل پہ بشتہ لگانے کے بعد اس نے آواز دی جس میں ابھی تک اس کے لیے مٹھاس تھی اور اس پر ہمیشہ کی طرح وشمہ کو اس کی جانب کھینچا۔

"اپنی چہیتی کے لیے تو ٹرے سجا کے اندر دے کر آئی ہے' باہر میز تک آتے جیسے ٹانگیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ تجھے آواز دے رہی ہے کہ باہر پھینکا ہے ناشتہ۔ آ کے کر مر لے۔"

شمشاد کی تنفر میں ڈوبی آواز نے وشمہ کے قدم روک دیے۔ وہ تذبذب کے عالم میں کھڑی رہ گئی۔

منزہ کو سوہا کے لیے ناشتہ اندر کمرے میں لے جاتے اس نے بھی دیکھا تھا اور اس کا کچا ذہن یہ جانتا تھا کہ سوہا کو شمشاد کے سامنے کچھ بھی کھاتے پیتے ہوئے بے حد گھبراہٹ ہوتی ہے اور اس کی کڑی نظروں کڑوے لقموں کی مار سے بوکھلا کے وہ اکثر بھوکی ہی ٹیبل سے اٹھ جاتی ہے۔ منزہ کو اس کا خالی پیٹ اسکول بھیجنا گوارا نہیں تھا' اس لیے اب وہ اس کو ناشتہ کمرے میں ہی دینے لگی تھی۔

"ٹھہر... رک جا..." شمشاد کی آواز پہ اس کے باہر کی طرف بڑھتے قدم تھم گئے۔

"وہ کہیں کی نواب زادی ہے جو اندر پلنگ پہ بیٹھ کے پراٹھے ٹھونسے۔ سارا چونچلا چوکھا تو وہ چھپ چھپ کے اور تو لیا گئی گزری ہے۔ جو چل کے باہر تک جائے گی۔ ادھر آ میری رانی میں اپنی خود نوالے ڈالوں گی۔ کیا ہوا جو تیری ماں نہیں ہے۔ دادی تو ہے نا۔ میں منگواتی ہوں تیرے لیے ناشتہ۔ تو کیا کسی سے کم ہے۔"

اس کے چمکارنے پہ وشمہ کی آنکھیں بلاوجہ آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔ گلا رندھ سا گیا۔

نجانے منزہ کی بے توجہی کے دکھ نے یا دادی کی بے پناہ محبت کے دکھاوے نے۔

"لے... اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ بتا کیا کھانا ہے' میں ابھی بنواتی ہوں اور یہاں منگواتی ہوں۔ میں نہیں... تو خود جا... اور جا کے کہہ 'میرا ناشتہ دادی کے کمرے میں لے کر آ۔' جا شاباش جا کے کہہ۔"

"دادی..." وہ منمنائی۔

"جا نا نا..."

"رہنے دو دادی... میں کر لیتی ہوں۔"

اس کے لاکھ اکسانے پہ بھی وہ کبھی منزہ کے روبرو آئے یا اس کے ساتھ بدتمیزی کرنے پہ آمادہ نہیں ہوئی۔ اس بات کا بھی شمشاد کو بڑا قلق تھا۔

"ارے جانے نہ میری اولاد میرے پہ گئی نہ اولاد کی اولاد... ساری کی ساری تیری عادتیں اپنی پھوپھی جیسی ہیں۔ اسی کی طرح اگلے کے سامنے منہ من کرتی رہنا' اپنا حق نہ لینا۔ یاد رکھ اس گھر پہ اور اس کی ہر چیز پہ تیرا حق پہلے ہے۔ اگر وہ چوہی والے مارے (دانتوں سے بھری) اندر بیٹھ کے حکم چلا سکتی ہے تو تو کیوں نہیں۔ شاباش... جا کے کہہ اور ذرا رعب سے کہنا' میں اندر بیٹھی سن رہی ہوں۔ اچھا۔"

"دادی..." وہ کسمسائی۔ "اچھا نہیں لگتا دادی!"

"تو پاگل ہے بیا..." شمشاد نے آنکھیں دکھائیں پھر لہجہ نرم کر لیا۔

"تیرے بھلے کو کہتی ہوں۔ چاہوں تو میں ایک آواز دے کر تیرا ناشتہ اندر منگوا دوں۔ مجال ہے جو آگے چوں بھی کرے مگر میں تجھے سکھانا چاہتی ہوں کہ دوسروں کے ساتھ کیسے رہا جاتا ہے۔ ابھی میں زندہ ہوں۔" اس نے آواز پہ رقت طاری کی۔ "تجھے سوتیلی ماں سے بچانے کے لیے یہ میں ہوں۔"

... نہیں رہی۔ مجبور ہو کے ہی سہی مگر شرافت سے رہ رہی ہے۔ اسے اس کی سچ مچ کی شرافت نہ سمجھ۔ میری ... یہ تجھے نچا ڈالے گی۔ ابھی سے رعب میں رکھ۔"

وشمہ بڑی بڑی آنکھیں کھولے حیرت سے سوچتی رہ گئی کہ اتنی چپ چاپ سی رہنے والی' اتنا نرم نرم بولنے والی ... آنکھوں والی ماما پہ وہ کیسے رعب ڈال سکتی ہے جبکہ وہ اتنی چھوٹی ہے' وہ اتنی بڑی۔ رعب تو بڑے ... ہوتے ہیں ... بھی اس سے کتنا ڈر ڈر کے بات کرتی ہیں۔ آپ... آپ کہہ کے۔ کبھی کبھی سوہا آپی کو ... گھورتی نہیں۔ اس کی غلطی پہ بھی چپ ہو جاتی ہیں۔ اس نے کچھ توڑ دیا' کچھ گم ہو جائے' ... بولتی نہیں۔

"... ناراض ہو جاؤں گی۔"

... نے آخری حربہ آزمایا۔

اب وشمہ بڑی چپ ... تھی۔

دادی کا ناراض ہونا اسے گوارا نہیں تھی۔ سو وہ ناراض ہو جاتی تو پورے گھر میں کون ہوتا جس سے وشمہ بات کرتی۔ ... سے کھنچی کھنچی رہتی تھی۔ پانچ سال گزر چکے تھے۔ اب تو وشمہ کو یاد بھی نہیں تھا کہ کبھی وہ اس کے ... پکڑا کرتی تھی۔ شمشاد نے اسے سوہا سے ڈرا ڈرا کے دونوں میں کبھی نہ مٹنے والے فاصلے پیدا کر دیے تھے۔

البتہ منزہ کے حوالے سے کچھ ہلکی پھلکی یادیں اب بھی بے چین کرتی تھیں۔ اسے یاد آتا کیسے وہ گھنٹوں ... میں بیٹھی رہا کرتی تھی۔ ضد کر کے اس کے ہاتھ سے نوالے لیا کرتی تھی۔ اس سے کہانی اور پوئم سن کر ... کرتی تھی۔

مگر اب... اب تو صرف ایک دادی تھیں جو اسے پاس بٹھایا کرتیں' کبھی کبھی بور بھی کرتیں مگر باتیں تو کرتی تھیں۔ اسے مزے مزے کی چیزیں اور کھلونے دلاتیں' وہ ناراض ہو جاتیں تو کتنی مصیبت ہو جاتی۔

بڑے بڑے قدموں کے ساتھ وہ باہر گئی۔ دروازے کے قریب رک کر اس نے دیکھا۔ سوہا لمبے بالوں کی چوٹی ... گود میں ٹرے رکھے بیٹھی تھی اور برے برے منہ بنا رہی تھی۔ منزہ اسے پیار بھری دھمکیوں کے ساتھ ... کھانے پہ مجبور کر رہی تھی۔

وشمہ نے حسرت سے دیکھا۔

اس کے لمبے سیاہ ریشمی بالوں کی چٹیا کو بھی۔

اور اس کے منہ تک جاتے منزہ کے ہاتھ میں دبے نوالے کو بھی۔

سوہا کے بال قدرتی طور پر بے حد خوبصورت تھے۔ کچھ منزہ ان پہ محنت بھی کرتی تھی۔ ہر دوسرے دن تیل کی ... بال دھونا' خود سلجھانا۔ دن میں دو بار کس کے چٹیا کرنا۔ پہلے پہل اس نے وشمہ کے سنہری بالوں کی بھی ... کی چوٹیاں بنانی شروع کیں۔ سنہری ریشمی لچھے اس کے گالوں پہ لٹکتے کتنے بھلے لگتے تھے پھر شمشاد ... جانے کے بعد جیسے ہی وہ اس کی دسترس سے دور ہوئی ان سنہری لچھوں میں جوؤں نے بسیرا کر لیا۔ تب ... طور پر یہ بھانپ نہیں سکی تھی کہ شمشاد کو وشمہ سے اس کی قربت کھل رہی ہے۔ اس نے کسی ... کی فکر مند ہوتے ہوئے ان جوؤں کے خاتمے کا بیڑا اٹھایا اور رخصت ہی۔ شمشاد نے اس پہ بھی فضیحتا کھڑا ...

... رکھ دیا ہے' ذرا سی بچی کا سر چھوڑا ہے۔ آج تیسرا دن ہے۔ دوپہر کو سونے ہی نہیں دیتی۔ گھنٹوں ... بیٹھی رہتی ہے اس کے بال نوچتے۔"

... ایک جھٹکے سے وشمہ کو منزہ کی گود سے نکالا تھا جو پہلے ہی اس افتاد سے ہکا بکا ہوئی تھی۔ جوئیں نکلوانے ... بات سخت گراں گزر رہا تھا۔

"... اس کے سر میں جوئیں ہیں..."

"ہاں تو کون سی انوکھی بات ہے۔ بن ماں کی بچیوں کے سر میں جوئیں پڑتی ہی ہیں۔ تیری لڑکی کے نہیں؟"

"نہیں۔ دو دن سے صاف کر رہی ہوں' بس ایک آدھ بار اور۔"

شمشاد نے اسے پھر بات مکمل کرنے کا موقع ہی نہ دیا۔

"رہنے دے' اپنے پاس رکھ اپنی ہمدردیاں۔ اتنا خیال پہلے رکھتی تو اس کی نوبت ہی نہ آتی۔ جا جا اپنی چوچلے دیکھ' اس کے لیے اس کی دادی کافی ہے۔"

اور دادی کو جوؤں سے نمٹنے کا ایک ہی طریقہ سمجھ میں آیا۔

اس نے وشمہ کا سر منڈوا دیا پھر بال نکلے پھر جوئیں بسیرا جماتے آئیں پھر منڈوا دیا۔ یہ شغل تب تک جب تک وہ سات سال کی نہیں ہو گئی اور پروین نے ہاتھ جوڑ کے ماں سے التجا کی۔

"کیسی بیچاری شکل ہے اور آپ دو لے شاہ کی چوہی بنا کے رکھ دیتی ہیں۔ اسکول جاتی ہے وہ بچیاں لوگ مذاق اڑاتے ہوں گے۔ خدا کے لیے اب اس کا سر منڈوانا بند کریں۔"

یوں یہ سلسلہ بند ہو گیا مگر وہ سالوں میں بال اتنے بڑھنے بھی نہ دیے تھے شمشاد نے کہ وہ چوٹیاں بنانے کے ارمان پورے کر سکتی۔ رنگ برنگ کلپ اور پن لگانے کے شوق پورے کر سکتی۔

زیادہ سے زیادہ بس سوہا کے لمبے بال دیکھ کے اپنے سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ جاتی۔

جیسے اس وقت کر رہی تھی۔

"کیا بات ہے بیٹا! کچھ چاہیے؟"

منزہ نے نرمی سے پوچھا۔ اس کے لہجے کی نرمی دادی کے پڑھائے سبق بھلانے لگی۔

"وہ..."

"ناشتہ نہیں کیا ابھی؟"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔

"پسند نہیں آیا' کچھ اور کھانا ہے؟"

"نہیں... وہ... وہ ٹھیک ہے۔"

"تو بیٹا جاؤ ناشتہ کرو' اسکول سے دیر ہو جائے گی۔ ابھی آپ نے یونیفارم بھی نہیں پہنا۔"

"میں... میں وہاں بیٹھ کے ناشتہ نہیں کروں گی۔" بہت مشکل سے اس کے منہ سے نکلا۔

"کیوں' کیا ہوا؟"

"کمرے میں۔" اس نے کہنا چاہا مگر الفاظ کھو گئے۔

منزہ کو جیسے ترس آ گیا' وہ اٹھی اور اس کا سر سہلاتے ہوئے بولی۔

"چلو آپ میں ناشتہ اندر لگا دیتی ہوں۔"

وشمہ نے معذرت خواہانہ نظروں سے اسے دیکھا جیسے اس بے جا مطالبے پہ شرمندہ ہو اور اپنی کرنے جا رہی ہو۔

"کیوں' باہر کیا تکلیف ہے اسے؟" سوہا نے زہر خند لہجے میں کہا۔

وشمہ خائف ہو کے منزہ کے ذرا سا پیچھے ہو گئی۔

"نوکر سمجھ رکھا ہے میری ماما کو' یہاں ناشتہ لگاؤ' وہاں ناشتہ لگاؤ۔ یہ کرو' وہ کرو۔"

"سوہا!" منزہ نے اسے سختی سے گھورا۔

وہ پاؤں پٹخ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ناشتہ کرو خاموشی سے۔"

"مجھے نہیں کرنا۔" اس وقت بات کر کے ناشتہ کرانے پہ تیار نہیں تھی' اسے وشمہ کا ناشتہ اندر پہنچانا تھا' اس خواب دیکھتا اس کی ...

... باہر چلی گئی۔

"... تم بھی فارغ ہو جاؤ۔"

... خاموشی سے سوہا کو خوب شہ ملتی تھی۔ آئینے میں وہ اپنے ہی اسے دھکا کے' اس کی اڑی رنگت کا مزہ لیا۔

...

... کے الٹے قدموں پلٹی۔

"اب ہمارا ناشتہ کریں گی پھر یونیفارم پہنا جائے گا۔ اس کی وجہ سے روز مجھے بھی دیر ہو جاتی ہے۔ اسے چھوٹا ... ہیں اور پنشمنٹ مجھے ملتی ہے۔"

... نکلتے نکلتے سوہا کی بڑبڑاہٹ سنائی دی اور کم عمری کے باوجود اس نے انصاف پسندی سے سوچا۔ اسے باہر ...

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہے۔ دیر مجھے ہوتی ہے' سزا آپی کو ملتی ہے۔ کیا کروں' جلدی جلدی تیار ہوا نہیں جاتا۔ ... بھی اتنی دیر۔"

ساتھ ہی اسے پھر سے خیال آیا کہ اس نے دادی کی وجہ سے ابھی ابھی نئی ماما کے ساتھ کیا حرکت کی ہے۔

"کتنی بری بات ہے' وہ کیا سوچیں گی۔ یہ دادی بھی نا بس..."

اس نے بے دلی سے ناشتے کے نام پہ چند نوالے لیے۔ شمشاد بیگم فتح مندی کے احساس سے مغلوب مسکراتی رہیں اسے احساس تک نہ ہوا کہ وشمہ خالی پیٹ اٹھ گئی ہے۔

☼ ☼ ☼

"... مجھے پچیس ہزار روپے چاہئیں۔"

"شاپنگ کا موڈ ہے؟"

... نے مسکراتے ہوئے دراز کھولا۔

... میں رہتی ریتا اسے وارے کھاتی تھی۔ چاہے ہفتے میں لاکھوں بے کار کی شاپنگ میں اڑا دے۔

چاہے ساری ساری دوپہر جم خانہ میں کارڈز کھیلتے گزار دے۔

چاہے ساری شام سہیلیوں کے ساتھ پارلر میں بتا دے۔

چاہے غیبت پہ چٹخارے چلاتی رہے۔

... اس طرح وہ نارمل تو رہتی تھی اور وہ خوش تھا کہ ریتا پچھلے کچھ عرصے سے نارمل تھی۔ بچے کے لیے ... کال میٹنوں سے نہیں پڑا تھا۔

"... تو بتا دو۔" پچیس ہزار اسے تھماتے ہوئے اصغر نے فیاضی سے پوچھا۔

"... میرا خیال ہے کام بن جائے گا۔"

... ہنستے ہوئے میری رانی کے کام اب صرف پچیس ہزار میں بننے لگے۔" وہ ہنسا۔

"تمہاری رانی ابھی اتنی بے مول نہیں ہوئی۔" وہ ناز سے مسکرائی۔

"یہ پچیس ہزار دراصل بیگم نیاز کے لیے ہیں۔"

"... بیگم نیاز؟"

"... سوشل ورکر۔ بے سہارا بچوں کے لیے دارالامان بھی بنایا ہے اس نے۔"

"... یہ شغل کب سے پڑا ہے تجھے۔ چلو اچھا ہے' اگلے سال علاقے کے کونسلر کے لیے الیکشن میں کھڑا ... کے بعد نظم... بچو..."

... کرنے لگا۔ ریتا نے آنکھ کرا سے ٹوک دیا۔

"مجھے نہ سیاست میں آنے کا شوق ہے نہ فضول لوگوں کو ووٹ دینے کا۔ مجھے تو صرف ایک بچہ چاہیے۔"
اصغر کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔
"بچہ...؟ یتیم خانے سے؟"
"ہاں اور کیا وائٹ ہاؤس سے لاؤں گی۔" وہ جل کے بولی۔
"پچھلا تجربہ یاد نہیں ہے کیا؟" اس نے یاد دلانا چاہا۔
"یاد ہے۔" ریتا نے سر جھٹکا۔
"پھر بھی؟"
"ہاں پھر بھی۔"
اس نے فیصلہ کن انداز میں اصغر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔
"دیکھو ریتا یہ کوئی مذاق نہیں ہے۔ پہلے بھی تم یتیم خانے سے بچہ لائی تھیں۔ کتنا وقت اور پیسہ برباد، وقت اور پیسے پہ مٹی ڈالو مگر تمہاری حالت کتنی خراب ہوئی تھی۔ کتنا عرصہ لگ گیا تھا علاج میں اور پھر جب بچہ دوبارہ یتیم خانے واپس کرنے گئے تو ان لوگوں کی باتیں سنیں [illegible]۔"
"وہ تھا ہی کوئی۔۔۔" ریتا نے منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے ہوئے جملہ مکمل کیا۔
"شاید میری کسی دشمن کی اولاد تھی۔ صدیقہ وغیرہ کے پاس ٹھیک رہتا تھا، گود میں لیتے تب بھی کوئی [illegible] نہیں ہوتی تھی اسے، چڑیل کے پاس بھی مزے سے لیٹا رہتا جس کی شکل دیکھ کے ہی بچے ڈر جائیں پر میرے ہاتھ لگاتے ہی کون سے کانٹے چبھتے تھے اسے۔" ریتا نے بے زاری سے سر جھٹکا۔
اب ڈیڑھ دو سال گزرنے کے بعد اسے یہ بات بس اتنی ہی چبھ رہی تھی کہ وہ سر جھٹک کے رہ گئی، مگر [illegible] سر سے پیر تک سلگ جایا کرتی تھی چند ماہ کے بچے کی اس حرکت پر۔
پتہ نہیں اسے ریتا سے کیا چڑ تھی، اس کی شکل دیکھتے ہی وہ چیخ مارتا اور جو روتا تو چپ ہونے کا نام نہ لیتا جب تک ریتا سامنے سے ہٹ نہ جاتی۔
وہ سوتے میں بھی اسے پیار سے گود میں لیتی تو بری طرح احتجاج کرتا چلا اٹھتا۔
بہتیرے ٹوٹکے آزمائے، ڈاکٹروں، نفسیات والوں کو دکھایا مگر نتیجہ وہی ڈھاک کے تین پات۔ بچہ چلا چلا کے سوکھ کے کانٹا ہو گیا۔
ریتا کو بھی ضد سی ہو گئی تھی اس سے۔
اصغر نے کافی سمجھایا کہ وہ وقت کا انتظار کرے۔ فی الحال بچے سے دور رہے۔ رفتہ رفتہ وہ مانوس ہو جائے گا مگر ریتا کی مامتا بچے کے اس عجیب و غریب طرز عمل سے کچھ اور بھڑک اٹھی تھی۔ اس سے یہ بات برداشت نہیں ہو رہی تھی کہ جس بچے کو وہ اصغر کی مخالفت کے باوجود ضد کر کے صرف اور صرف اپنے لیے اس گھر میں لائی وہ بالشت بھر کا بچہ صرف اور صرف اسی سے بے زاری دکھائے، اسی سے دور رہے چاہے گھر کی نوکرانی [illegible] رہے۔
ریتا پہ پھر سے دیوانگی کے دورے پڑنے لگے۔
جس بچے پہ مامتا کے خزانے لٹانے کے اس نے ارادے باندھ رکھے تھے، اس کے لیے ہی اس کے محسوسات کا طوفان بہتا رہتا۔ ایک وقت تو وہ آیا کہ ادھر بچہ ریتا کو دیکھ کے رونا شروع کرتا، ادھر ریتا [illegible] لپکتی۔ صدیقہ بے چاری ذرا سے بلونگڑے کو لپیٹ کر چھپاتی پورے گھر میں دوڑتی پھرتی۔
اس ساری صورت حال سے گھبرا کر اصغر نے یہی مناسب سمجھا کہ بچہ جہاں سے آیا ہے وہیں [illegible] اگرچہ اس پہ بھی ریتا نے کافی ہنگامہ کھڑا کیا۔ بچے کے جانے کے بعد بھی اسے دورے پڑتے رہے [illegible] کے بعد اس کی ذہنی حالت ٹھیک ہوئی تو اصغر نے یہ دیکھ کر شکر ادا کیا کہ وہ بچے کی خواہش کو بھول [illegible]

[illegible] سمجھا کہ اس تجربے بلکہ تلخ تجربے کے بعد اس نے توبہ کر لی ہوگی کسی پرائے بچے کو لا کر پالنے سے۔
[illegible] سامنے بیٹھی ایک بار پھر اسی غلطی کو دہرانے کا اظہار کر رہی تھی۔
"[illegible] بہت ہو گیا۔ پہلے ہی کم طوفان نہیں کھڑا ہوا تھا۔"
[illegible] کے سامنے کھل کے مخالفت کرتا تھا مگر اب کر رہا تھا کہ یہی وقت کی ضرورت تھی۔
"[illegible] کوئی گندہ خون، خبیث کی اولاد۔ ضروری تو نہیں سارے کے سارے ویسے ہوں۔" وہ مچل کے [illegible]
"[illegible] پرائی اولاد پالنا مشکل ہے۔ تم نے دیکھا تو تھا۔ ذرا سا بچہ۔۔۔ مگر اپنی ماں کی گود اور غیر کی گود پہچانتا [illegible]"
"[illegible] بات نہیں ہے۔ میں نے کہا نا کہ وہ تھا ہی الٹے دماغ کا، ورنہ کیا وہاں یتیم خانے میں وہ ماں کی گود میں پل [illegible] اور پھر کتنے ہی بچے اپنے ماں باپ کے بجائے دوسروں کے پاس پلتے ہیں۔ پل ہی جاتے ہیں۔ پیار لیتے بھی ہیں [illegible] پیار دیتے بھی ہیں۔"
"[illegible] ہوں نا تمہیں پیار دینے کے لیے اور تمہارا پیار لینے کے لیے۔"
اصغر نے پیار سے رام کرنا چاہا۔
"[illegible] ہوں گی تب پیار کرو گے نا۔" وہ ایک جھٹکے سے اٹھی۔
"ختم کر لوں گی میں خود کو، ماں بنے بغیر بھی کوئی زندگی ہے۔ بچے کے بغیر جی کے میں نے کرنا کیا ہے۔"
اس پہ ہذیانی کیفیت طاری ہوئی۔
"ریتا۔۔۔ ریتا تم سمجھتی کیوں نہیں۔"
اسے دونوں بازوؤں سے تھام کے بٹھاتے ہوئے وہ بے بسی کی آخری حد پہ تھا۔
"اصغر یقین کرو اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں دیکھ بھال کے بچہ لاؤں گی۔"
"کیا دیکھو گی؟ ذرا سے بچے کی عادتیں؟ وہ کیسا ہے؟ کیسا نکلے گا؟ یہ سب پتا چل جائے گا تمہیں؟"
"میں اس بار ذرا سمجھ دار بچہ لاؤں گی۔ تھوڑا سا بڑا، چیں چیں کر کے رونے والا نہیں ہوگا۔ کم از کم اتنی عمر کا تو ہو کہ جسے پہلے دن سے یہ پتہ ہوگا کہ وہ کون تھا اور اس گھر میں آنے کے بعد کیا حیثیت ہے اس کی۔"
"اس سے کیا فرق پڑے گا؟"
وہ الجھا، کچھ نہ سمجھا۔
"بہت فرق پڑے گا۔ یتیمی کے احساس کے بعد اسے صحیح معنوں میں قدر ہوگی ہماری، اس گھر کی۔ جو بچہ آنکھ آسائش و آرام میں کھولے، اس کی نسبت وہ بچہ محبت کا زیادہ قدر دان ہوتا ہے جو ترس ترس کے دن گزارنے کے بعد [illegible] پاتا ہے۔ میں اسے وہ سب دوں گی جو اسے نہیں ملا اور وہ مجھے وہ سب دے گا جو مجھے اب تک نہیں ملا۔"
"[illegible] لو اور کچھ دو۔" وہ پھیکے پن سے مسکرایا۔ "اولاد کے لیے کیا سودے بازی۔"
"سودے بازی کیسی اصغر! پیار کا لین دین ہی تو کر رہی ہوں۔"
"اچھا یہ بتاؤ تمہیں لڑکا چاہیے یا لڑکی؟" اصغر نے اچانک سوال کیا۔
[illegible] کھلکھلا کر ہنس پڑی۔
"[illegible] تم نے بالکل وہی سوال کیا اصغر! جو میں نے ایک بار تم سے کیا تھا۔ جب میں پہلی بار ماں بننے والی تھی اور [illegible] بالکل اسی اسٹائل میں۔"
"[illegible] مت ٹالو بتاؤ لڑکا لو گی یا لڑکی؟"
[illegible] سنجیدہ ہوئی اور سوچنے لگی۔
"[illegible] لاؤں گی۔"

"نہیں... ایک... صرف اور صرف ایک۔"

"اچھا۔" وہ اور مشکل میں پڑی۔

"بیٹا... لڑکا... نہیں... لڑکی... دراصل اصغر... جو میرے دل کو بھایا' میں نے ابھی سے بیٹے بھی ہمیں کون سا کھانے کے لالے پڑے ہیں۔ جو لڑکی لاتے ہوئے سوچ میں پڑوں۔ اگر کوئی بچی دل کو [illegible] وہی لے آؤں گی۔"

"وہ بچی..."

"بیٹی..."

وہ صغریٰ نے آہستگی سے دہرایا اور خشک لبوں پہ زبان پھیرتے ہوئے اپنی ساری ہمت مجتمع کرنے کے بعد [illegible]

"ریشم... بیٹی تو ہے۔"

* * *

"ماما... میں اس اسکول میں نہیں پڑھوں گی۔"

ضدی تو وہ تھی ہی' ایک سے ایک نئی ضد آئے دن پکڑتی رہتی مگر اس دن اس نے عجیب ہی مطالبہ پیش کر دیا۔

"کیا برائی ہے اس اسکول میں؟" منزہ نے تحمل سے دریافت کیا۔

"اچھا بھلا تو اسکول ہے بلکہ شہر کے بہترین اسکولوں میں سے ایک۔ لوگ ترستے ہیں یہاں اپنے بچوں کو داخل کرانے کے لیے۔"

"ترستے رہیں بس مجھے نہیں جانا اسکول میں۔ وہ جائیں جو ترس رہے ہیں۔"

اس کے بدتمیزی سے کہنے پہ منزہ کو غصہ آگیا اور وہ درشتی سے اسے ٹوک کے رہ گئی۔

"بری بات سوہا! کیسے بات کر رہی ہو تم؟ کیا ہوا ہے اسکول میں؟ کسی ٹیچر سے ڈانٹ پڑی ہے یا کسی دوست سے جھگڑا ہوا ہے؟"

"نہ ٹیچر نے کچھ کہا ہے نہ دوست نے... یہ جو ہے نہ... یہ مصیبت... جو میرے ساتھ وہاں ہوتی ہے۔"

سوہا مٹھیاں بھینچ بھینچ کے غصے سے کہتی اسے مظفر کی یاد دلا رہی تھی۔

"کس کی... کس کی بات کر رہی ہو؟"

اس میں جھلکتے مظفر کے عکس نے منزہ کو بے ساختہ نظریں چرانے پہ مجبور کر دیا۔

"اسی وشمہ کی... جب تک وہ اس اسکول میں ہے میں کبھی بھی وہاں نہیں جاؤں گی۔"

"تمہارا مسئلہ کیا ہے سوہا؟" وہ زچ ہو اٹھی۔

"کیوں اس بیچاری سے خوامخواہ کا بیر باندھ رکھا ہے۔ وہ تمہیں کہتی کیا ہے' اب یہ کوئی بات ہے۔ نہ وہ تمہاری کلاس میں ہے نہ تمہارے ساتھ ہوتی ہے پھر اس کی وجہ سے اسکول چھوڑنے کی بات کیوں کر رہی ہو؟"

"کلاس میں نہیں مگر اسکول میں تو ہے۔ پتہ ہے آج اس نے کیا کیا؟ اس "بے چاری" نے..."

سوہا نے "بے چاری" چبا چبا کے کہا۔

"کیا کیا ہے؟"

منزہ نے نارمل انداز میں پوچھا۔ اس کا خیال تھا۔ ہو گا کوئی بچکانہ سا جھگڑا۔ گاڑی میں پہلے بیٹھنے کا یا [illegible] سے نیٹ ہو جانے کا۔

"میری فرینڈ شیبا کی چھوٹی بہن لیلیٰ اس کی کلاس فیلو ہے۔ اس نے وشمہ سے پوچھا کہ تم دونوں [illegible] تمہارے نام الگ الگ کیوں ہیں' تم وشمہ نوید ہو اور تمہاری آپی سوہا مظفر تو پتہ ہے اس نے اپنی ساری [illegible] میں بیٹھ کے بتا دیا کہ میں... میں پاپا کی... یعنی اس کے پاپا کی بیٹی نہیں ہوں... میرے اپنے پاپا کی ڈیتھ [illegible] بتاتے وہ رونے لگی۔"

منزہ کے دل کو گھونسا لگا۔

اسے آنسو بہاتے دیکھتی رہی۔

ملی جلی نظروں سے [illegible] اسے لگ رہا تھا جیسے مظفر کی موت پہ سب نے اپنے اپنے حصے کا دکھ رو لیا تھا۔ بین ڈال لیا تھا۔ ماتم بھی کر لیا تھا۔ ایک وہی ننھی تین سال کی بچی تھی جو یتیمی کے احساس سے بلکل انجان اپنے باپ کی چہیتی گھر میں ایک دم سے امڈ آنے والے بے شمار لوگوں کو حیرت سے دیکھے جا رہی تھی۔

وہی تین سالہ بچی... آج ٹھیک نو سال بعد اپنے حصے کے آنسو رو رہی تھی۔

منزہ نے اسے اپنے باپ کا سوگ دل کھول کے منانے دیا۔ یہ آنسو مظفر کا حق تھے جو اس کی اولاد ادا کر رہی تھی۔

"اس نے یہ بھی بتایا کہ میری ماما اس کی نئی ماما ہیں اور یہ بھی کہ میں اپنی ماما کے ساتھ ان کے گھر میں..."

وہ بہت سارا رو لینے کے بعد پھر سے کچھ بتانے پہ آمادہ ہوئی تھی مگر اتنا ہی بتا سکنے کے بعد دوبارہ رونے لگی۔

"اس میں غلط کیا ہے بیٹا؟"

منزہ نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تحمل سے کہا۔

"غلط نہیں ہے ماما؟"

سوہا نے آنسوؤں سے بھری آنکھیں اٹھا کے حیرت سے پوچھا۔

"کیا یہ غلط ہے کہ تمہارے پاپا اللہ میاں کے پاس ہیں؟ کیا یہ غلط ہے کہ میں وشمہ کی اصلی والی ماما نہیں ہوں؟ یہ سچ ہے بیٹا! اب تم اتنی بڑی تو ہو گئی ہو کہ ان باتوں کو سمجھ سکو۔"

"اور وہ جو ساری لڑکیاں مجھ سے الٹے سیدھے سوال کر رہی تھیں۔ کوئی کہہ رہی تھی سوہا! تمہارے سوتیلے پاپا تمہیں مارتے تو نہیں؟ کوئی کہہ رہی تھی' تمہاری ماما تمہیں پیار کرتی ہیں یا وشمہ کو؟ کوئی کہہ رہی تھی تم اپنے ماما [illegible] یوں سب ایسی باتیں کر رہی تھیں۔ مجھے نہیں سننا یہ سب' مجھے نہیں جانا اس اسکول میں۔"

"میں وشمہ کو سمجھا دوں گی۔"

"ہونہہ... آپ سمجھائیں گی... ڈرتی ہیں آپ اس سے۔"

اتنے میں منزہ کو دروازے کے باہر سے وشمہ گزرتی دکھائی دی۔ شاید چھت پہ کھیلنے کے لیے جا رہی تھی۔

"وشمہ..." اس کی آواز پہ وہ اندر آگئی۔

"جی ماما!" اس نے یہ کہتے ہوئے چور نظروں سے سوہا کے روئے روئے چہرے کو دیکھا۔

وہ سارا معاملہ بھانپ گئی۔

سوہا راستے بھر بھی تو روتی آئی تھی' بنا اس سے کچھ کہے اور وشمہ سارے راستے شرمندہ بیٹھی رہی۔ سوہا اس سے لڑتی' برا بھلا کہہ لیتی تو شاید اور بات تھی مگر اس کا روتے چلے جانا وشمہ کو احساس دلا رہا تھا کہ اس سے کوئی بہت سنگین غلطی ہو چکی ہے۔

اس نے اپنی آنکھوں سے سوہا کے گرد اس کی کلاس فیلوز کا جمگھٹا لگتے' انہیں تابڑتوڑ فضول سے فضول سوال کرتے اور پھر سوہا کو گھبرا کے روتے دیکھا تھا۔ وہ جانتی تھی یہ سب اس کی وجہ سے ہوا ہے۔

"مجھے لیلیٰ سے فضول کی یہ سب باتیں نہیں کرنی چاہیے تھیں۔" اس نے تب ہی پشیمانی سے سوچا تھا۔

"بیٹا! کیا آپ نے اسکول میں اپنی فرینڈز سے کوئی ایسی بات کی تھی جس سے سوہا آپی کو دکھ ہوا؟"

وشمہ نے چپکے سے اقرار میں سر ہلا دیا۔

"کتنی بری بات ہے بیٹا! ذرا سی بے احتیاطی سے دیکھو کیا ہو گیا۔ ہمیشہ سوچ سمجھ کے منہ سے بات نکالنی چاہیے۔"

"سوری ماما!" اگرچہ منزہ نے پہلی بار اس سے کسی معاملے میں بازپرس کی تھی لیکن پھر بھی وشمہ کو برا نہیں لگا تھا۔ اس کے برعکس اس کی ہلکی سی ڈانٹ اور پھر اپنے سوری کہنے کے بعد دل سے بھاری بوجھ ہٹتا محسوس ہو رہا تھا۔

"سوری مجھے نہیں' آپی کو کہو... وہ ہرٹ ہوئی ہے۔"

"آپی۔۔۔سو۔۔۔"

"معافی غلطی ہے وشمہ کی ہوتی۔"

شمشاد آندھی طوفان کی طرح اندر داخل ہوئی۔

"کمرہ بند کر کے میری پوتری سے معافیاں منگوا رہی ہے۔ اپنی لاڈلی کے آگے ناک رگڑوا رہی ہے۔ شرم نہیں آتی بن ماں کی بچی کے ساتھ ایسا کرتے ہوئے۔"

منزہ ہڑبڑا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اماں۔۔۔ اماں جی۔۔۔ یہ تو بس بچیوں کی آپس کی بات۔۔۔ بس یونہی ذرا سی بات۔۔۔"

اس نے کہنا چاہا۔

"بچیوں کی بات۔۔۔؟ اب بچیوں کی نہیں 'بڑوں' کی بات ہے۔"

منزہ نے سہمی نظروں سے دیوار گیر گھڑی کی جانب دیکھا۔

شام کے پانچ بجے تھے۔ عموماً نوید مراد سات بجے تک آتا تھا لیکن آج وہ جلدی آنے کا کہہ کے گیا تھا وشمہ سے وعدہ جو کر لیا تھا 'جوائے لینڈ' لے جانے کا۔

"آپ بلاوجہ بات کو بڑھا رہی ہیں اماں!"

اس نے تحمل سے کہا مگر شمشاد بیگم یہ سن کر اور بپھر گئی۔

"ہاں۔۔۔ میں بات ہاں بڑھانے والی اور تو بات ہاں دبانے والی میسنی۔"

"میں وشمہ کو صرف سمجھا رہی تھی کہ۔۔۔"

"ہاں صرف سمجھا رہی تھی۔ تیرے صرف سمجھانے سے ہی نمانی کے اتھرو (آنسو) نکل آئے۔ ہورے کس طرح کی دھمکیاں دی ہیں ننھی سی کڑی کو۔ بیچاری کا رنگ پیلا پھٹک ہو کے رہ گیا ہے۔"

اس نے اپنے پاس کھڑی بے آواز آنسو بہاتی وشمہ کو بھینچ کر سینے سے لگایا۔

اور دادی کے پچھڑی سانسوں والے سینے سے لگی وشمہ پورے احتجاج کے ساتھ بتانا چاہتی تھی کہ یہ آنسو ماں کے سمجھانے سے نہیں بلکہ دادی کے ان کے ساتھ اونچا بولنے اور ڈانٹنے کی وجہ سے نکلے ہیں۔

وہ شمشاد کی گرفت میں ذرا سا مچلی مگر اس نے اور بھی زور سے اسے بھینچ لیا۔

"اگر صرف سمجھانے کا اتنا رعب ہے تو جھڑکیاں دے کر تو تو اس کی جان ہی نکال لے گی۔ میں نہ آتی اس پاسے تو تو شروع تو ہونے ہی والی تھی۔ معافیاں منگوا رہی تھی۔ پھر ہاتھ جڑوائی۔"

وشمہ ایک بار پھر زور سے مچلی۔ دادی کے پسینے کی گھٹی باس اس کی سانسوں کو وحشی بنا رہی تھی۔

"ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ تم نے سوہا کو بھی۔۔۔"

"نام نہ لے اس کا میرے سامنے۔" اس نے بے دھڑک سوہا کو گالی دی۔

منزہ زہر کا گھونٹ پی کے رہ گئی البتہ سوہا نے بڑی کٹیلی نظروں سے اسے دیکھا۔

"دیکھ لے دیکھ اس کے قاتلوں والے۔ میری پوتری کو سمجھانے کے بجائے تو اپنی لڑکی پہ دھیان دے۔ اس کے چھن ٹھیک نہیں ہیں۔ زبان کا نگ برا بولتی نہیں ہے اور منہ کو آتی ہے ہر کسی کے۔ اسے سمجھا کہ جن کے پیو مر کھپ کے حوالے اللہ کو ہو جاتے ہیں ان کو اتنی اکڑ اور اتنا نخرا اچھا نہیں ہے۔"

"ٹھیک ہے میں سمجھا دوں گی۔"

منزہ نے ایک بار پھر گھڑی کی جانب دیکھا اور جلدی سے کہا۔

انداز سراسر جان چھڑانے والا تھا۔ وہ چاہتی تھی شمشاد بیگم جلد از جلد اس معاملے کو سمیٹے اور اپنے کمرے میں جائے۔ لیکن اس کے دل کی بھڑاس شاید ابھی پوری طرح نکلی نہیں تھی۔

سوہا نے ماں کو گلہ آمیز نگاہوں سے دیکھا۔ منزہ نظر چرا کے رہ گئی۔

"تو دیکھ بتا کہ دوسروں کے گھر رہنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے۔ جن کا کھاتے ہیں اس کے سامنے نخرے نہیں

اٹھاتے بلکہ جی جی کرنا سکھاتے ہیں۔"

منزہ نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ سوہا اس سے پہلے چٹخ پڑی۔

"نہیں کھاتے ہم کسی کا دیا۔ جو میری امی کماتی ہیں ہم اسی میں گزارہ کرتی ہیں۔"

منزہ نے اچانک بولنے پر گھبرا گئی اور چند لمحوں کے لیے شمشاد بیگم بھی سٹپٹا گئی۔ اگرچہ یہ بھلا بتانا سے چپ یوں دو بدو جواب کی توقع تو ہوتی تھی لیکن یہ امید نہیں تھی کہ اتنی جلدی یہ بالشت بھر کی لڑکی اس کے مقابلے میں آ جائے گی۔

اس نے خود کو سنبھالا اور پہلے سے زیادہ بپھرے انداز میں غرائی۔

"ہاں تو ماں تو جیسے پچھلوں سے مانگ کے لاتی ہے یا پھر اپنے سے عاشق ناں کے گانٹھ کے۔ بے ناں بے غیرت ماں سے لے کر کھائے گئی قبر میں پڑے باپ سے۔ آ آ تو میرے بیٹے کی کمائی ہے۔ یہ سب کچھ۔ تیرے پیٹ میں جاتا، جو کچھ ہے اور پیٹ کے اندر والا راشن۔ اندر باہر سب میرے بیٹے کی خیرات ہے۔ اور اکڑ دیکھو جیسے باپ جی کن کے پیچھے قیمتی غلط سے پہلے جائیداد ان کی لکھ گیا تھا۔"

"بس کریں اماں!"

منزہ نے اس کو مختصر کے اس تکلیف دہ انداز میں ذکر نے جیسے چیر کے رکھ دیا۔

سوہا بھی جھرجھری لے کر رہ گئی۔

"آ۔۔۔ آپ۔۔۔" شدت غصہ سے اس کے الفاظ کہیں کھو سے گئے۔

"بڑی تکلیف ہو رہی ہے پچھلے خصم کی بات سے۔ اتنی عاشقی زور مار رہی ہے دل میں تو چلی کیوں نہیں جاتی اس کے پاس جا۔ چھوڑ میرے نوید کا پیچھا۔ اس بیچارے کے حصے کیا آیا ہے۔ کسی اور کی اولاد کو پال پوس کر بڑا کرے گا مگر وہ اس کی بیٹی نہیں ہے اور کسی اور کی ہو جو رہے۔ جس کے پیچھے سارا کچھ لٹا دے گا پھر بھی ویرانے والے کی محبت اور ویرانے والے کی اولاد کو ہی سارا کچھ سمجھے گی۔"

"آپ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہی ہیں۔"

بے بسی اور توہین کے احساس سے مغلوب ہو کے وہ جیسے فرش پہ ذرہ ذرہ بکھر گئی تھی۔

سوہا نے آگے بڑھ کے ماں سے لپٹ کر شاید اس کے درد کی شدت کو کم کرنا چاہا۔ اس کے بالوں میں جذب ہوتے منزہ کے آنسو اسے بھی رونے پہ مجبور کر گئے۔

"اں بیٹیاں۔۔۔ منحوس۔ جس دن سے گھر آئی ہیں۔ رو رو کے نحوست پھیلائی ہوئی ہے۔ جس کا ماتم کرنا ہے جا کے اپنے پیو کے گھر کر۔ اگر وہ گھسنے دیں تو۔"

آخری فقرہ اس نے کمرے سے نکلتے نکلتے بڑے طنز بھرے لہجے میں کہا تھا۔ سوہا نے گریہ اور ضبط سے سرخ ہوتی آنکھیں اٹھا کر اس طرف دیکھا۔ شمشاد بیگم اپنے پہلو سے وشمہ کو چپکائے باہر نکل رہی تھی۔ وشمہ نے جاتے جاتے گردن موڑ کر منزہ کو دیکھنا چاہا۔ اس کی معصوم نظروں میں بے حد واضح معذرت خواہانہ ترحم تھا۔ جو سوہا کی خونی نظروں سے ٹکرا کے ساکت ہو گیا۔ وشمہ نے جلدی سے سہم کر گردن موڑی اور دادی سے الگ ہو کر تیز قدموں سے اپنے کمرے کی طرف بھاگ گئی۔

سوہا اب تک خفا ہونے والی نظروں سے اسی جانب تکے جا رہی تھی۔ جہاں اب کوئی نہیں تھا۔ ادھ کھلا دروازہ تھا اور دراڑ سے آتی روشنی کی ہلکی سی لکیر تھی۔

"جس کا ماتم کرنا ہے جا کے اپنے پیو کے گھر کر۔ اگر وہ گھسنے دیں تو۔"

شمشاد بیگم کا یہ طعنہ رہ رہ کر منزہ کو چوکے لگا رہا تھا۔

"میں نے کیسے کٹ کر اپنے پاؤں پہ خود کلہاڑی ماری۔ بہ ہاں مجھے تو وارث سمجھ کے اتنا پار آ رہا تھا بھلا میری ہے۔" اس نے سچائی سے اپنا محاسبہ کیا۔

بہن کلثوم، جمشید اور ثنا کے دباؤ پہ اس نے نوید مراد سے شادی کر تو لی تھی مگر اپنے بھائیوں بھابیوں کے

خلاف اس کے دل میں ایک گرہ سی پڑ گئی تھی پھر اس کی زندگی کے آغاز میں ہی در پیش آنے والی تکلیف نے بھی اور بھی بڑھا دیا۔ وہ یہی سوچتا کہ کیا ہی اچھا ہوتا اگر بھائی اپنے دل بڑے کر لیتے۔ بھائیوں نے اپنی ظرف میں اتنی گنجائش پیدا کر لی ہوتی کہ وہ سوہا کے ساتھ باقی عمر عزت اور سکون سے اپنی ماں کے گھر کے کسی کونے میں گزار دیتی۔

"ماما۔ آپ ابھی تک رو رہی ہیں؟" سوہا کی ملائم ہتھیلیاں اس کے گیلے رخساروں پر ٹھہر گئیں۔

اس نے اپنے خیالوں سے چونک کر اسے دیکھا۔

بچپن اور لڑکپن کے سنگم پہ کھڑی سوہا کی نظروں میں اسے ایک سنگلاخ بڑھاپا نظر آیا۔

وہ لرز کے رہ گئی۔

"نہیں۔ میں رو تو نہیں رہی... میں تو..."

ایک سفید جھوٹ بولتے ہوئے وہ اپنی ہی بیٹی سے نظریں چرا گئی جو آج اسے خود سے بڑی یا شاید بوڑھی نظر آ رہی تھی۔

"آپ کیوں رو رہی ہیں۔ میں کوئی رو رہی ہوں کیا؟ ان کی باتوں پہ کیا رونا ماما! ان کی تو عادت ہے۔ اگر ہر بات پہ رونے لگے تو رونا ہماری عادت بن جائے گی۔"

اب منزہ کو لگا جیسے وہ اس سے عمر رسیدہ ہی نہیں بلکہ کہیں زیادہ دنیا شناس اور تجربہ کار بھی ہو گئی ہو۔ دل ہی دل میں وہ اپنی بیٹی سے مرعوب ہو گئی۔

"میں اس لیے نہیں رو رہی بیٹا! میں تو... دراصل مجھے تمہارے ماموں کی یاد آ رہی تھی۔"

سوہا کی آنکھوں میں بے یقینی نظر آئی مگر اس نے اختلاف ظاہر نہ کیا۔

"بہت دن بھی تو ہو گئے ہیں ان سے ملے ہوئے۔" "لیکن ہم تو زیادہ تر عید وغیرہ پہ ہی ان سے ملا کرتے ہیں۔ اس میں نئی بات کون سی ہے جو آپ اداس ہو رہی ہیں۔"

سوہا کے لیے ماموؤں اور ان کے اہل خانہ سے یہ سرسری سے روابط معمول کی بات تھی کیونکہ اس نے اپنے ہوش سنبھالنے کے بعد یہی روش دیکھی تھی لیکن منزہ کا دل کٹ رہا تھا۔ اپنے دن یاد کر کے جب وہ بھائیوں کے گھر کی رونق تھی۔ بھابیوں کی سہیلی تھی۔ کتنی محبتیں سمیٹی تھیں اس نے اس گھر میں اور اب ذرا سی بات۔ گو وہ بات اتنی ذرا سی بھی نہ تھی مگر ان بے شمار محبتوں اور خلوص بھری یادوں کے سامنے اب وہ ہیچ نظر آ رہی تھی۔ اس بات کو خلش بنا کے دل میں میکے کے خلاف کدورت پال لینے کا اپنا فیصلہ اسے سراسر حماقت لگ رہا تھا۔

اپنی کم ظرفی محسوس ہو رہا تھا۔

"چلیں ماموں کے ہاں؟"

ماں کے اس خیال پہ وہ حیران ہوئی۔ "ماموں کے ہاں؟"

"ہاں کچھ دن رہ آتے ہیں۔" اس نے بیٹی کے تحیر سے نظریں چرائیں۔ "ویسے بھی لانگ ویک اینڈ ہے اسکول تو تین دن بند رہے گا۔"

"مگر تین دن ہم وہاں؟ پہلے تو آپ کبھی نہیں رہنے جاتی تھیں۔"

"جاتی تھی۔ تمہیں یاد نہیں ہے۔ تب تم چھوٹی بہت تھیں۔"

اس نے تب کا ذکر کیا جب واقعی مظہر کی بے پناہ محبتوں کے باوجود وہ میکے کی جانب کھنچ کھنچ کے جایا کرتی تھی۔ پلڑا دونوں طرف کی محبتوں کا ایک سا تھا اور مظہر اس کے بھاگ بھاگ کے میکے جانے سے چڑ جایا کرتا تھا۔

"کیا مصیبت ہے۔ تمہیں یہاں چین نہیں ہے؟" وہ استحقاق بھری گرفت میں لیے اسے جھنجھوڑ کر کہتا۔

سخت لہجے میں ایک گدگدانے والا احساس چھپا ہوتا تھا۔

"اور آپ کو پتا نہیں کیا مصیبت ہے۔ بھاگے چلے آتے ہیں میرے پیچھے۔ کبھی دو دن تک کے میکے نہیں رہنے دیا۔" وہ بھی پیار بھری خفگی جتاتی۔

"نہیں رہا جاتا۔ کیا کروں۔"

"کیوں نہیں رہا جاتا؟" وہ شوخی سے پوچھتی۔ محبت کے بھرپور اظہار کی چاہ لہجے سے ٹپک رہی ہوتی۔

"تمہارے بغیر۔" وہ چند ماہ کی سوہا کو گود میں بھر لیتا۔ "اور تم کیا کچھ رہی ہو۔ تمہارے بغیر۔"

"ٹھیک ہے پھر لے جائیں اپنی بیٹی کو کہیں تو ابھی نہیں آنے والی۔" وہ ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے اطمینان سے بیٹھ جاتی۔

"محبت تو قانونی بدلہ ہوتی۔"

"بھی آؤں گی۔ سوہا کو آپ کے پاس چھوڑ کر آؤں گی۔ ٹھیک؟"

"تمہیں اکیلے۔" وہ دانت پیستا اس کی جانب بڑھتا اور وہ قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ اپنے

سوہا کی بات پہ وہ ایک جھٹکے سے حال میں واپس آئی۔

عجیب سا احساس دل کو گھیرنے لگا جو مظہر کی بے ساختہ یاد کے بعد اسے ستانے لگتا تھا۔

نوید مراد سے غفلت کا احساس۔

بے ایمانی کا احساس۔

کچھ غلط کر لینے کا ندامت بھرا احساس۔

"کچھ نہیں۔ تم کیا لے کر جاؤ گی۔ کون سے کپڑے رکھوں تمہارے؟" وہ سر جھٹک کر پوچھنے لگی۔

"ہم واقعی جا رہے ہیں؟" سوہا کی آنکھیں چمکیں۔ شاید اب اسے ماں کی سنجیدگی کا یقین آ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ فیصلہ کن انداز میں اٹھی اور الماری کھول کر بیگ نکال لیا۔

"اب وہ جانے دیں گے؟"

نوید کب بے حد نا محسوس طریقے سے وہ نوید مراد کو پاپا کہنا ترک کر چکی تھی جسے منزہ نے نوٹ تو کیا مگر خاموش رہ گئی۔

"کیوں روکیں گے۔ ان کی بہن نہیں آ رہی رہنے کے لیے۔"

نوید کے ذکر پہ منزہ کے لہجے میں تلخی گھلی۔

"وہاں جا کے کریں گے کیا؟"

"جو بھی کریں گے تم از کم وہ نہیں کریں گے جو یہاں کرتے ہیں۔"

پیکنگ کرتے کرتے اس نے بے حد مصروف انداز میں کہا۔ اور پھر اچانک ہاتھ روک کر کہنے لگی۔

"ہم بہاں رہ رہیں گے نہیں۔"

گو یہ کہتے ہوئے وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے ایسا کرنا ہو گا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی۔
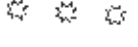
☼ ☼ ☼

گھر خرید کے لائی تھی میں
گھر خرید کے لائی
نادانی کی قسمت ماری
اپنے ہی ہاتھوں سے روز
اپنی ایک منزل چھوڑے
اور
اپنا گھر بیچا کے روز

عشق کے کاروبار میں پڑ کے
اچھا نفع کمایا
گھڑی گھڑی پل پل کو
اپنے دل کا ماس کھلایا
تن من دھن
سب بیچ دیا اور
بھاگ خرید کے لائی میں
بھاگ خرید کے لائی
کوئل لینے گھر سے نکلی
کاگ خرید کے لائی میں
کاگ خرید کے لائی

وہ کب سے آنکھیں موندے لیٹے ہوئے اسی گیت کو سنے جا رہی تھی۔ ایک ایک بول جیسے سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔

جعفر نے کمرے میں قدم رکھتے ہی ناگواری سے اسے دیکھا۔

مسلے ہوئے سلوٹوں سے پر یہ ہلکے پیلے کپڑے اس نے دو روز سے تبدیل نہیں کیے تھے اور کمرے کی تاریکی میں اس کا وجود اس میلے پیلے لباس میں اور بھی پژمردہ لگ رہا تھا۔ بکھرے ہوئے بال، مرجھایا ہوا بے زار چہرہ۔

جعفر نے آگے بڑھ کے سی ڈی پلیئر آف کر دیا۔

مدیحہ نے آنکھیں کھول کے اس دخل اندازی کرنے والے کو دیکھنا چاہا اور پھر بے اعتنائی سے دوبارہ آنکھیں موند لیں جیسے جعفر کے آنے جانے، ہونے نہ ہونے سے اسے کوئی فرق نہ پڑتا ہو۔

جعفر نظرانداز کیے جانے والے اس مسلسل عمل سے تلملا کر رہ گیا۔

کتنے دنوں سے وہ یہی تماشا دیکھ رہا تھا اور اندر ہی اندر کڑھ رہا تھا۔ مدیحہ نے اس سے بغیر کسی وجہ کے کٹ کر بے اعتنائی اختیار کر رکھی تھی۔ کم از کم اس کے نزدیک تو مدیحہ کا یہ طرز عمل بغیر وجہ کے ہی تھا۔

"یہ کیا لگا رکھا ہے، نری نحوست، عجیب سا شوق سوار ہو گیا ہے تمہیں ایسے ہی گانے سننے کا۔"

"اب آپ کو اس پہ بھی اعتراض ہے؟" مدیحہ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

"کیوں نہ ہو، کئی ہفتوں سے تمہارے بدلے ہوئے رنگ ڈھنگ دیکھ رہا ہوں۔ مجھ سے، بچوں سے، گھر کی ہر چیز سے لاتعلق ہو چکی ہو تم۔ بس تم ہو، تمہارا یہ کمرہ اور ایسے واہیات گیت..... یہ عمر ہے ان سب خرافات کو پالنے کی۔"

"کیوں کیا ہوا ہے میری عمر کو؟" وہ جھٹک کے پوچھتے ہوئے اس کے مقابل آئی۔

"مجھ سے سات آٹھ برس تو بڑے ہوں گے آپ، جب آپ اس عمر میں ایسے شوق پال سکتے ہیں تو..."

"کیسے شوق؟"

جعفر کا ماتھا ٹھنکا مگر وہ بے خوفی سے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے سوال کر رہا تھا کیونکہ فی الوقت اس کا دامن صاف تھا۔

"میرا منہ نہ کھلوائیے۔"

"تم منہ کھول ہی لو تو اچھا ہے۔ آج پتہ چل جائے کہ تمہارے دماغ میں کیا کھچڑی پک رہی ہے۔"

"کھچڑی میرے نہیں، آپ کے دماغ میں پک رہی تھی۔ جب آپا گھر آئے بیٹھی تھیں۔ آپ تو اتنے خود غرض انسان ہیں کہ بہن کی گھر بستی اجڑنے پہ بھی اپنا فائدہ دیکھ رہے تھے کہ اس موقع سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، کیسے اپنی من مانی کی جا سکتی ہے۔"

"... کو گھر بٹھا چھوڑ کیوں نہیں دیتیں۔" وہ زچ ہوا تھا۔

... اس بات کو اٹھا اور دبا بھی کیا۔ اب تو اس کی اپنی بہن بھی اپنے اس شوہر کے ساتھ راضی بہ رضا تھی جس نے ... کے چکر میں چھپن کے سارے خاندان میں پائل مجازی تھی لیکن مدیحہ تھی کہ نہ خود اس بات کو بھلا رہی تھی نہ اسے بھلانے دے رہی تھی۔ اس کا گھر اس حادثے کے بعد اب تک زلزلے کی زد میں تھا۔

"بعض اوقات تم انتہائی بے وقوف عورت ہو بلکہ میں تو کہوں گا پاگل عورت ہو۔ کوئی ہوش و حواس رکھنے والی عورت ایسا طرز عمل اختیار نہیں کرتی جو تم کر رہی ہو۔ میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جس کو بنیاد بنا کے تم گھر کا ماحول خراب کیے بیٹھی ہوئی ہو۔"

"اچھا، کچھ نہیں کیا آپ نے؟ بہت ملال ہے کچھ نہ کرنے کا؟ تو اب کر لیں۔ نکال لیں دل کی حسرت۔"

"مجھے پتہ تھا کہ اتنا ہی بھرا ہونے کی حسرت تمہارے اپنے دل میں ہے۔ عورتیں ازدواجی زندگی بچ جانے پہ شکرانے کے نفل ادا کرتی ہیں۔ خطرہ ٹل جانے پہ سکون کا سانس لیتی ہیں مگر تم اندر ہی اندر تلملا رہی ہو کہ یہ کچھ ہوا کیوں نہیں جو ہونے والا تھا۔ حالانکہ ایسا کرنے کا میرا ارادہ تھا نہ نیت۔ وہ صرف تمہارے بھائی کے عمل کا رد عمل تھا اور کچھ نہیں۔"

اس کے کہنے پہ مدیحہ نے نخوت سے سر جھٹکا جیسے اس کی کسی بات پہ بالکل یقین نہ ہو۔ اس کی یہ حرکت جعفر کو اور تپا گئی۔

"بھوسہ بھرا ہے دماغ میں۔ کچھ بیٹھتا ہی نہیں تمہاری عقل میں۔" مدیحہ کا رویہ اسے اس اسٹیج پہ لے آیا تھا جہاں اس جیسا اعلا تعلیم یافتہ، مہذب اور نفیس شخص جو اعلا سرکاری عہدے دار رہ چکا ہو۔ "تم" کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"میرا ہی دماغ خراب ہے جو روز تمہارے آگے صفائیاں پیش کرتا ہوں۔ تمہیں تو ساری تکلیف اس بات کی ہے کہ یہ رشتہ ٹوٹتے ٹوٹتے بچ کیسے گیا۔ اسی کے نوحے اور ماتم کر رہی ہو تم اتنے ہفتوں سے۔"

"ہاں۔۔ ہاں۔۔ اسی کا غم ہے مجھے۔" وہ بھی چلائی۔ "جب سر پہ ہر وقت خطرے کی تلوار لٹک رہی ہو تو اس خوف کے ساتھ جینا کہ تلوار کب آپ کے آر پار ہو جائے، مرنے سے بھی زیادہ تکلیف دہ لگتا ہے۔"

"بس، مار دو سر کھپا کے۔ اس لیے گھر لوٹتا ہوں کہ آگے تم مرنے جینے کے کھاتے کھول کے بیٹھ جاؤ۔ سنبھل جاؤ مدیحہ، اس گھر کو اپنے اور میرے لیے جہنم نہ بناؤ ورنہ......"

اس کی تنبیہہ کے انداز میں کھڑی انگلی دیکھ کے مدیحہ نے ایک استہزائیہ ہنکارا بھرا۔

"ورنہ ورنہ کیا...... اوہ، تو اب آپ اپنے اگلے کسی بھی اقدام کے لیے مجھے مورد الزام ٹھہرانا چاہتے ہیں۔ بہت خوش قسمت ہیں آپ...... ہمیشہ اپنے دفاع کے لیے آپ کو کوئی نہ کوئی بہانہ مل جاتا ہے۔ کوئی نہ کوئی جواز گھڑ لیتے ہیں یا نکل آتا ہے جیسے اس بار بھی۔" اس بار آپ مجھے الزام دے دیں گے کہ میری رونی شکل دیکھ کے، میری ... سن کر آپ باہر کی رنگینیوں میں پناہ لینے پہ مجبور ہوئے۔ بہت خوب۔"

"شٹ اپ، یو ڈیم ... کمپلیکسڈ...... پتہ نہیں کون سی رنگینیوں کے اندیشے پال رکھے ہیں تم نے۔" وہ بھنا گیا اور زور سے ڈریسنگ ٹیبل کے پاس رکھے اسٹول کو ٹھوکر ماری۔ ماربل کے فرش سے اسٹیل راڈ کے اسٹول کے ٹکرانے کی زوردار آواز نے اپنے کمرے میں بیٹھی ٹی وی دیکھتی بچیوں کو چونک جانے پہ مجبور کیا۔

... نے بے ساختہ ٹی وی کا والیم کم کیا۔

جعفر کی اونچی آوازیں، مدیحہ کے کبھی سسکنے کی تو کبھی تڑپ کے چلانے کی آوازیں...... دروازوں اور ... کو پار کر کے پورے گھر میں پھیل رہی تھیں۔ اس کے چہرے پہ سراسیمگی پھیل گئی۔

"... الٹا مزے کا ٹاک شو ہے۔"

... سالہ بڑی تحریم نے پروگرام میں رخنہ پڑتے دیکھ کے جزبز ہوتے ہوئے کہا۔

"... پاپا......"

تھکن اور بے تابی سے بھوک مٹا رہی تھی جب نوید مراد اندر داخل ہوا۔
اس نے ٹھٹک کے رکتے ہوئے ایک نظر بخار سے نیم بے ہوش بیٹی کو دیکھا اور پھر مرغی کی ٹانگ بھنبھوڑتی ماں کو
دیکھا۔ اس کی نظروں میں ایک واضح اور جتانے والی ناگواری تھی۔
"میں نے پٹیاں کی تھیں۔"
اس نے گڑبڑا کے کارکردگی جتائی مگر نوید وشمہ کو بازوؤں پہ اٹھا کے مزید کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ شمشاد نے
ناپسندیدگی سے اسے گھورتے ہوئے سر جھٹکا اور دوبارہ کھانے میں مگن ہو گئی۔ پیٹ بھر گیا تو سگے بیٹے
کی فکر جاگ اٹھی۔
"ہو رہے کس ڈاکٹر کے پاس لے گیا ہے۔ مجھے جھوٹے منہ بھی نہیں کہا ساتھ جانے کو۔ اتنا بڑا
نہیں ہو گیا۔"
وہ ادھر سے ادھر چکر کاٹتی رہی۔ کھانا بھی ہضم ہو گیا۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں نوید وشمہ کو لے کر آ گیا۔
"گلا خراب ہونے کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔ دوا انجکشن لگے ہیں۔ دوا بھی دے دی ہے ڈاکٹر نے۔ بخار
ہے رات کو کسی بھی وقت دوبارہ تیز ہو سکتا ہے مگر ڈاکٹر نے کہا ہے کہ تشویش کی کوئی بات نہیں۔ دوا
خوراک اور دینے سے اور پٹیاں کرنے سے بخار اتر جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے دوبارہ تیز ہی نہ ہو۔ البتہ
عرصہ کرنا ہوگا۔"
اس نے تفصیل بتا کے ماں کی تسلی تشفی کرانا چاہی جو چٹاچٹ وشمہ کو چومے جا رہی تھی۔
"میری شہزادی..... میری رانی..... میری جند....."
"اسے کچھ کھانے کو دیں اماں۔"
"بریانی....." وشمہ نے ٹرے میں بریانی کی باقیات دیکھ کے فرمائشی صدا بلند کی۔
"دادی صدقے....." شمشاد نے پلیٹ میں سے بریانی ہاتھ کے نوالے میں بھری اور وشمہ کے منہ میں ڈال دی
تھی۔
"کیا کر رہی ہیں اماں! میں نے ابھی بتایا ہے کہ ڈاکٹر نے اسے پرہیزی کھانا دینے کو کہا ہے۔ یہ برتن اٹھا لیتیں
تھے کم از کم تاکہ اس کا دل نہ للچاتا اور اس کے لیے سوجی یا ساگو دانہ وغیرہ بنا دیں۔"
وہ بڑبڑاتے ہوئے ٹرے اٹھا کے کچن کی طرف بڑھ گئی۔
اکلوتی اور لاڈلی پوتی سے محبت اپنی جگہ مگر کام کرنے سے اس کی جان جاتی تھی۔
رات تک طوعاً و کرہاً اس نے ہر وہ کام کسی نہ کسی طرح کر ہی لیا جو ضروری تھا مگر صبح اٹھتے ہی نوید نے
اس کا پھولا ہوا منہ دیکھا۔
"جا..... لے کر آ اپنی زبیدہ کو..... مجھ سے نہیں سنبھالا جاتا سارا گھر۔"
"اماں! وہ تین دن کا کہہ کے گئی ہے۔ آ جائے گی کل صبح تک۔" نوید نے ماں کا موڈ بھانپ کر خود ہی چائے کا پانی
چڑھا لیا۔
"ہاں تیری زبان گھستی ہے کہتے ہوئے۔ لڑکی بخار سے ادھ موئی پڑی ہے اور وہ میکے جا کے بیٹھی ہے
بے غیرت۔"
"کچھ نہیں ہوا وشمہ کو۔ معمولی سا گلا خراب تھا۔ اب ٹھیک ہے، شام تک اور بہتر ہو جائے گی۔"
"بیٹے..... زنانی کی بات آئی تو معمولی گلا خراب..... شام تک ٹھیک ہو جائے گی اور کل یہ کہہ رہا
تھا کہ میری بچی کا خیال نہیں رکھا۔ واہ جی واہ۔" وہ ہاتھ نچا نچا کے کہتی رہی اور نوید پیشانی پہ بل لیے
زبیدہ ڈھونڈتا رہا۔
"میں کہہ رہی ہوں مجھ سے نہیں ہوتے اتنے کام۔"
"یہ بھی آپ کا فیصلہ تھا۔ اچھی بھلی کام والی تھی۔ سارا دن رہتی تھی۔ سارے کام آسانی سے ہو جاتے تھے

بنا تھا اور اب کل کام والی ماسی سے پتہ نہیں کون سا پھڈا کیا ہے جو آج وہ آئی نہیں۔"
ذرا اس کا لے لو بھی تو بیچاری پیچھا چھڑا لی تھی۔ میں نے کل اسے جواب دے دیا ہے۔"
اچھی ہے۔" نوید نے تنی سے کہتے ہوئے فریج کا دروازہ زور سے بند کیا۔
"نہیں بھی ہڈیاں اس بوڑھی کمان کہ سارا کام کر سکیں۔ کام والیاں ہٹالی ہیں تو تیرے فائدے کے لیے ہی
تیری خالی سوچ بھی نہیں ہے جو کام والیوں مسٹنڈیوں پہ اڑا دوں۔ زنانی کس لیے ہے، تیری..... کھانے کے
بنانے کے لیے۔"
"چائے پی لیں وشمہ اٹھے تو گرم دودھ کے ساتھ رسک یا ابلا انڈا کھلا دیں اسے۔" اس نے ماں کے سامنے
کپ رکھا۔
"میرے سینٹ فون کرا دے وشمہ کے بخار کا بتا۔ ابھی پتہ چل جائے گا کتنا درد ہے اس کے دل میں
تیری لاڈو کے لیے۔ دیکھتی ہوں آتی ہے یا نہیں۔"
نوید نے چاہا دوسری بہت سی باتوں کی طرح وہ ماں کی یہ بات بھی ان سنی کر کے چپکے سے نکل جائے مگر بندہ بشر
ذہن میں خلش سی پیدا ہوئی۔
"آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ذرا دیکھوں تو سہی۔"
اور شمشاد کے محض ایک بار اور کہنے پہ وہ بظاہر جزبز ہوتا جمیل کے گھر کا نمبر ملانے لگا۔

☆ ☆ ☆

صرف ایک دن لگا تھا سوہا کو اپنے خول سے باہر آنے میں۔ کزنز کے ساتھ وہ ایسے گھل مل گئی جیسے سالوں سے
ان کے ساتھ ہی رہتی آئی ہو۔
جمیل نے بھی عرصے بعد میکے آئی بہن کی خوشنودی کا خیال رکھتے ہوئے خوب پروگرام بنائے۔ رات کو بھی وہ
سب بچوں کو سندباد اور جوائے لینڈ لے کر گئے۔ واپسی پہ بچوں کی ہی مرضی سے میکڈونلڈز میں کھانا کھایا گیا۔ اگرچہ
سوہا کے لیے یہ سب نیا نہیں تھا۔ نوید مراد کبھی کبھی وشمہ کو اکیلے میں کہیں لے کر گیا تھا۔ وہ اور منزہ بھی ساتھ
ہوا کرتی تھیں۔ اس شہر کے سب ہی قابل دید مقامات وہ دیکھ چکی تھی، ہر مشہور ریسٹورنٹ جا چکی تھی۔ آؤٹنگ کے
دوران جتنی شاپنگ وشمہ کی ہوتی اس کے لیے بھی اتنی ہی اور ویسی ہی شاپنگ کی جاتی مگر ایک واضح فرق تھا جو وہ
اپنے اور وشمہ کے درمیان محسوس کر لیا کرتی تھی۔
وہ ہر اس پروگرام میں شامل ہوتی تھی جو وشمہ کے لیے اس کا باپ بناتا تھا۔
کبھی اس کے لیے یا اس کی پسند اور فرمائش سے بنے کسی پروگرام میں وشمہ کو شامل نہیں کیا جاتا تھا۔
ہمیشہ اس کے لیے وہی چیز برابر خریدی جاتی جیسی وشمہ کے لیے لی جاتی مگر وشمہ کے لینے کے بعد۔
کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کی شاپنگ کے ساتھ ویسی ہی شاپنگ وشمہ کی بھی کی جاتی کہ اس کی دل آزاری نہ ہو۔
وہ اچھے ریسٹورنٹ میں نوید، منزہ اور وشمہ کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھاتی مگر ہر اس ریسٹورنٹ میں جانے کا
فیصلہ نوید مراد کرتا اور وہ یہ فیصلہ عموماً وشمہ کی فرمائش پہ کرتا۔
کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ وشمہ نے کے ایف سی جانے کی ضد کی ہو اور سوہا اچانک پزا ہٹ جانے کی فرمائش
کر دے اور نوید مراد مسکراتے ہوئے اپنی گاڑی کا رخ پزا ہٹ کی جانب موڑ دے۔
اسے ہر چیز وشمہ کے "صدقے" میں ملتی تھی۔
اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اس کا احساس پہلے سے بڑھ کے ہونے لگا تھا۔
ننھیال میں ایسا نہیں تھا۔ بھانجی عرصے بعد رہنے آئی تھی۔ باپ کی شفقت سے محروم تھی۔ سوتیلے رشتوں کے
نرغے میں رہتی تھی۔ اس کا دل خوش کرنے کے لیے ماموں اور ممانی بساط سے بڑھ کے کوششیں کر رہے تھے۔
ماموں کے بچے بھی سوہا سے عمر میں بڑے تھے اور سمجھ دار تھے۔ اس کوشش میں وہ ماں باپ کا برابر ساتھ دے رہے

تھے۔

"کہاں جانے کی تیاری ہے؟"

"کیا کھانے کی تیاری کر رہا؟"

"سوہا سے پوچھو۔"

"سوہا جیسا کہے۔"

"جو سوہا کی مرضی۔"

ایسی باتیں سننا اس کے لیے ایک نیا تجربہ تھا۔ وہ جی بھر کے اس تجربے سے لطف اندوز ہو رہی تھی اور منیزہ بیٹی کے چہرے پہ اتنی طمانیت، اتنی سرشاری اور اتنی تسکین پہلی بار دیکھی تھی۔

وہ تو اس کے چہرے پہ اضمحلال، پژمردگی اور تھکن دیکھنے کی عادی ہو چکی تھی۔

تنہائی کا احساس جیسے اس کے ہر نقش میں بولتا ہوا ہوتا۔

حسرتیں جیسے اس کی آنکھوں میں چھپائی ہوئی رہتی تھیں۔

وہ یہ سارے پرانے رنگ اترتے اور نئے رنگ آتے دیکھ کے خوش ہو رہی تھی۔

"شاید میرا یہاں آنے کا فیصلہ ٹھیک تھا۔ ہر ماہ نہیں تو ہر دوسرے تیسرے مہینے دو تین دن کے لیے یہاں آ جانا چاہیے۔ رشتوں اور محبت کی آکسیجن ملتی رہے گی میری بچی کو۔"

"ماما... ممانی نے کہا ہے سینڈوچز تیار ہیں؟"

سوہا نے اندر جھانک کے پوچھا۔

منیزہ جو اپنے سوٹ پہ استری کر رہی تھی، بات کا جواب دیتے دیتے رک کر اسے دیکھنے لگی۔

بلیک جینز پہ گھٹنوں تک آتے سفید کرتے، سفید ڈاٹس والے بلیک اسکارف کو گلے میں ڈالے، کاندھوں سے نیچے آتے بالوں کی اونچی سی پونی کے ساتھ وہ کتنی پیاری، کتنی اچھی لگ رہی تھی اور کتنی معصوم بھی۔

"نہیں بنائے؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"بنا لیے ہیں۔ کولر بھی بھر لیا ہے اور فروٹ باسکٹ بھی تیار ہے۔" منیزہ نے مسکرا کے جواب دیا۔

"مگر آپ تیار نہیں ہیں۔ جلدی کریں۔"

"بس میں شاور لینے جا ہی رہی تھی۔ یہ دوپٹہ تو پریس کر دو ذرا۔" پھر باتھ روم جانے مڑیں۔

"کر لو گی؟" اس نے تصدیق چاہی۔

"آف کورس۔"

وہ اناڑی پن سے دوپٹے پہ استری پھیر رہی تھی جب فون کی گھنٹی بجی۔

کچھ دیر بعد سونیا کی آواز آئی۔

"پھپھو...."

"نانا تمہارے ہیں۔"

سوہا کی ساری توجہ دوپٹے پہ تھی۔ اس نے مڑے بغیر جواب دیا۔

"اوہ... اچھا... تم بات کر لو۔ تمہارے پاپا کا فون ہے۔"

وہ چونک کے مڑی۔

سونیا کارڈلیس فون سائیڈ ٹیبل پہ رکھ کے جا چکی تھی۔

□□□□

"آئی کیوں نہیں فون پہ؟"

شمشاد نے نوید کو دو ہی منٹ میں فون تھما کے واپس رکھتے دیکھ کر پوچھا۔

"نہا رہی ہے۔"

"دس منٹ بعد دوبارہ کرے۔"

"... بتا دیا ہے، سوہا ہی تھی فون پہ۔"

"وہ شوخ لڑکی... اسی کا تو فساد ہے سارا۔ نہ وہ آگ لگاتی، نہ بات بڑھتی اور نہ اسے پہلے جانے کا چاؤ چڑھتا۔ ... سے تو کبھی نہیں، اب اچھا بہانہ ملا ہے۔"

... اور سوہا سے شروع ہونے والے ساس بہو کے تنازعے سے اب تک نوید بے خبر تھا مگر شمشاد کی بے دھیانی ... کی بات نے اسے چونکا کے رکھ دیا۔

"کون سی آگ... کون سی بات بڑھی تھی۔ کیا ہوا تھا؟"

شمشاد منہ سے بات نکال کر پچھتائی۔

"کچھ نہیں، آپس میں ... لڑکیاں لڑ پڑی تھیں۔"

"... میں اول تو لڑائی ہوتی نہیں اور بالفرض ہو بھی تو منیزہ ایسی نا سمجھ نہیں کہ اس لڑائی کو بنیاد بنا کے میکے جا بیٹھے۔"

"اس کا مجھ کو تو نہیں پتا۔"

... بیٹے کے منہ سے ارادتاً یا غیر ارادتاً بیوی کی تعریف سن کر شمشاد کو یوں لگا جیسے یہ اس کی برائی ہے۔

"اور کیا کچھ نہیں ہوتا گھروں میں۔ میسنی عورتیں اپنے بندوں سے باتیں چھپا لیتی ہیں جیسے تیری زنانی کرتی ہے، ... اس کی لڑکی تو ہر وقت لڑنے پہ تیار رہتی ہے۔ اس نے نہ کبھی تجھے باپ سمجھا ہے نہ وشمہ کو بہن۔"

اس بات سے اختلاف کرنے کی نوید ہمت نہ کر سکا۔ اگرچہ سوہا نے کبھی اس سے بدتمیزی نہیں کی تھی۔ ہمیشہ اس کے سامنے خاموش اور باادب بنی رہتی تھی لیکن اس کے اطوار کبھی کبھی نوید کو کھٹک جاتے تھے، وہ اسے اس اپنائیت سے پاپا کہہ کر نہیں پکارتی تھی جس اپنائیت سے وشمہ، منیزہ کو ماما کہتی تھی۔ اس کی نگاہوں میں اس گھر اور اس گھر کے مکینوں کے لیے ایک اجنبیت بھرا احساس رہتا تھا۔

"بہرحال... اگر ایسی بات ہوتی منیزہ مجھے جتاتی ضرور۔ اس کے کسی انداز سے نہیں لگ رہا تھا کہ وہ ناراض ہو کر جا رہی ہے۔"

"اسی لیے تو میں اسے میسنی کہتی ہوں۔ ہوا نہیں لگنے دیتی اپنے ارادوں کی اور میں بتاتی ہوں تجھے ہوا کیا تھا ... سن۔"

اس نے سارا واقعہ نمک مرچ لگا کے نوید مراد کو سنایا جس کا لب لباب یہ تھا کہ منیزہ اکیلے میں وشمہ کو ڈراتی اور دھمکاتی ہے۔ کیا خبر مارتی بھی ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے وشمہ کا بخار گلے کی خرابی سے نہیں بلکہ منیزہ کی دہشت سے ہوا ہو۔ یہ نکتہ بھی شمشاد بیگم کو بیٹھے بٹھائے سوجھا تھا اور اس نے اچانک نکل آنے والی دلیل پہ خود کو داد بھی دی تھی۔

"ارے ... لے ... دس منٹ کیا... آدھا گھنٹہ ہو گیا، آیا ہے اس کا فون؟ تو نے بتایا بھی تھا وشمہ کی بیماری کا، اپنی ... تو تڑپ جاتی ... ہائے... میری یتیم مسکین وشمہ... اپنی ماں ہوتی تو روتا کس بات کا تھا۔"

"... گھر کے سب لوگ تو پکنک پہ گئے ہیں۔ شام تک آئیں گے۔"

"... گھر کے لوگوں سے نہیں، مہمان سے بات کرنی ہے۔ منیزہ بی بی سے۔"

"... بھی گئی ہیں۔ ان ہی کے لیے تو پکنک رکھی گئی ہے۔"

"... نکلے ہیں؟"

... شال سے نکلتے ہوئے دریافت کیا۔

"... یہی کوئی ... بارہ منٹ پہلے۔"

نوید نے ریسیور رکھتے ہوئے وال کلاک کی جانب دیکھا۔

سوہا کو وشمہ کی بیماری کی اطلاع اس نے تین منٹ قبل دی تھی جب منزہ بقول اس کے نماز پڑھ رہی تھی۔ اس کے بعد۔ جانے سے قبل بھی اس نے فون کر کے وشمہ کی خیریت تک دریافت کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔

اور کیا جانا اتنا ہی ضروری تھا؟

متحمل مزاج اور کم گو سا نوید مراد اس وقت لاوا اگلنے کو تیار بیٹھا تھا اور آنچ تیز کرنے والی شمشاد بیگم بھی پاس ہی ...

☼ ☼ ☼

پکنک کی خوشی ابھی اس کے چہرے سے ماند نہیں پڑی تھی کہ ماں کے ہاتھ میں ریسیور اور چہرے پہ ... دیکھ کے اس کا چہرے کا رنگ اڑ گیا۔

"یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

وہ حیران کم پریشان زیادہ ہو کے بول رہی تھی۔

"نہیں۔۔۔ مجھے تو۔۔۔ کسی نے۔۔۔ دیکھیں۔۔۔ میں۔۔۔"

بار بار کچھ کہنے کی کوشش کرتی منزہ کو دیکھ کے سوہا کو ایک دم رونا سا آ گیا۔

"ماما۔۔۔" وہ سست قدموں سے اس کے برابر جا کھڑی ہوئی۔ وہ بھی شاید وہ کچھ پوچھنے آئی تھی۔ ہاتھ سے اسے رکنے کا اشارہ کرتے ہوئے وہ مسلسل صفائیاں پیش کر رہی تھی۔

"نہیں، آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے۔ ٹھیک ہے، آپ صحیح کہہ رہے ہوں گے۔۔۔ ضرور کہا ہوگا آپ نے، وہ سوہا نہیں ہوگی۔۔۔ کوئی رانگ نمبر مل گیا ہوگا۔ کسی بچے نے شرارت۔۔۔"

"ماما۔" اس بار سوہا نے ماں کا وہ ہاتھ زور سے پکڑ کے کھینچا جو ریسیور تھامے ہوئے تھا۔

"ماما۔۔۔ وہ میں ہی تھی۔" وہ چلائی۔

منزہ نے بے دھیانی میں ایک بار پھر اسے جھنجلاہٹ بھرے انداز میں چپ ہونے کا اشارہ کیا۔

"میں کہہ رہی ہوں کہ سوہا۔۔۔"

اور پھر چونک کے سوہا کو دیکھا۔ آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

سوہا نے لب کاٹتے ہوئے آنسو بھری آنکھوں کے ساتھ ایک بے جان اعتراف کے طور پہ اثبات میں سر ہلایا۔ اس کی پلکوں پہ ٹکے آنسو اس خفیف سی حرکت کے ساتھ گالوں پہ پھسل آئے۔

منزہ نے ڈھیلے ڈھالے انداز میں ریسیور کریڈل پہ رکھ دیا۔

☼ ☼ ☼

"کیسی ہے وشمہ؟"

رکشے سے اترتے ہی وہ اندر بھاگی تھی اور بے تابی سے سوال کیا۔ نوید نے سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا۔

"ٹھیک ہے اب۔"

وہ وشمہ کے پاس بیٹھ کے اس کا ماتھا چومنے لگی۔

"اتنی فکر تھی تو تب آ جاتی۔۔۔" شمشاد بھی پیچھے پیچھے اندر آئی۔ "اب اتنے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے زرا دھیان سے جائزہ لیا اور تازہ دم ہو کر نئے جوش سے حملہ کیا۔

"خالی ہاتھ۔۔۔ اکیلی آئی ہے۔۔۔ یعنی اب بھی میکے سے واپس آنے کا کوئی ارادہ نہیں۔ ایویں ہی احسان دھرنے کو گھڑی دو گھڑی کے لیے آئی ہے تو نہ آتی۔ وشمہ کوئی لاوارث نہیں بیٹھی ہے۔"

نوید کو بھی اس کا بغیر سامان کے اور بغیر سوہا کے آنا کھلا۔

سامان بکھرا پڑا تھا۔ میرا کل صبح آنے کا پروگرام تھا۔ سوچا تھا رات کو پیکنگ کر لوں گی اس لیے۔ اب وشمہ ... تو نہیں ... سوہا ... لینے ... تو رات دیر ہو جائے گی۔ بس رکشہ پکڑا اور آ گئی۔ بھائی جی پلیز آپ ... کل بھائی جان کے ہاتھ سامان بھیج دیں گی نا۔۔۔"

بلاوجہ ہی وضاحتیں پیش کرتے ہوئے وہ دوبارہ کسی بڑی اور شرمندگی سے نظریں جھکا کے کہا۔

"... سوہا پھر بھی ... ابھی وہ۔۔۔ ابھی میں خود ہی اسے نہیں لائی۔ بہت ڈری ہوئی تھی اور شرمندہ بھی۔ غلطی ہو گئی اس سے۔"

"ارے تو تمہیں یقین آ گیا کہ میں جھوٹ نہیں بول رہا۔ تمہاری بیٹی نے فون سنا تھا مگر تمہیں بتانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔"

"نہیں ... پلیز آپ کوئی غلط مطلب نہ لیں اس بات کا۔"

"کیسی بچی ہے، میری بچی کی بیماری کوئی معنی نہیں رکھتی اس کے لیے۔ میں کچھ نہیں لگتا تمہاری بیٹی کا جو اس نے میری بات کو اہمیت نہیں دی۔"

"میری بچی" "اور تمہاری بیٹی" کی تکرار نوید مراد کے منہ سے سننا کہیں زیادہ تکلیف دہ لگ رہا تھا، بہ نسبت اس اعتراف کے جو اس نے سوہا کے منہ سے سنا۔

"بچی ہے ... سمجھ ہے بات کی گہرائی میں نہیں گئی۔ صرف۔ سوچا کہ میں یہ بات سنتے ہی گھر واپس جانے کا فیصلہ کروں گی اور وہ ایسا نہیں چاہتی تھی۔ ابھی رکنا چاہتی تھی اس لیے۔۔۔" آخر وہ ... کر وہ چپ ہو گئی۔ اپنے چہرے کے تاثرات چھپا رہی تھی۔

"تو وہاں کیوں نہیں چاہتی تھی؟" اس نے بہت بھرے انداز میں پوچھا۔

منزہ اس سوال کے تسلی بخش جواب کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہی تھی جب شمشاد نے بھی طنزیہ کہا۔

"اب بولو۔ کیا ہوا ہے اس کو وہاں؟"

"وہ نہیں۔۔۔ وہ خوش تھی وہاں۔۔۔ اس لیے۔۔۔ مگر وہ بھی اب وشمہ کے لیے بہت پریشان ہے اور۔۔۔"

"بس کریں۔" نوید نے ہاتھ روک کر اسے سوہا کی مزید وکالت کرنے سے روک دیا۔

"اسے کوئی پریشان مت ہو، پریشان ہونے کی بالکل بھی ضرورت نہیں۔ بس وہ خوش رہے۔"

☼ ☼ ☼

"ارے منزہ۔۔۔ تم آ گئیں؟"

کلثوم نے منزہ کو جھجکتے جھجکتے اسے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔ ابھی دو گھنٹے پہلے تو وہ اتنی پریشانی کے عالم میں گھر سے گئی تھی۔

"جی بھابی۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ سامان وغیرہ بھی پیک کر لوں۔۔۔ ایک ہی بار صبح چلی جاؤں گی۔"

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔" کلثوم نے سکون کی سانس خارج کی۔

"سامان کا کیا ہے صبح آ جاتا منزہ۔۔۔" جمیل نے بھی ساتھ بیٹھتے ہوئے کہا۔ "اور۔۔۔ نوید بھائی صاحب کا موڈ کیسا تھا؟" انہوں نے اس بار محتاط لہجے میں اس سے پوچھا۔

"ٹھیک ہی ہوگا۔۔۔ جب ہی تو۔۔۔" کلثوم نے شوہر کو تسلی کرانا چاہی۔

"پہلے کی بات ہے، ایک بار تو میں منزہ کو آتے دیکھ کے گھبرا ہی گئی۔ مجھے لگا شاید سوہا کی غلطی کو انہوں نے سیریس لیا ہو اور بات بڑھ گئی ہے اور منزہ جھگڑ کے آ گئی ہے۔"

"آپ گھبرا گئیں کہ ابھی تو گئی ہے پھر شوہر سے لڑ کے آ گئی۔" منزہ نے پھیکی سی مردہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بات سمجھتے ہوئے کہا۔

"کیسی بات کر رہی ہو، سو دفعہ آؤ، تم جتنی خوشی بستے بستے اپنے شوہر کی مرضی سے۔ اللہ نہ کرے جو کبھی بار بار کے میکے بیٹھنا پڑے۔ ہم تو یہی دعا کرتے ہیں کہ تم اپنے گھر خوش باش رہو۔"

منزہ نے ایک گہری سانس لی۔

"یعنی میں آپ کو اس گھر میں "کبھی کبھار" قبول ہوں مگر مسز نوید مرزا کے روپ میں۔" اس نے سوچا۔ فیصلہ کرنا اب اور آسان لگ رہا تھا۔

"چلو آئی ہو تو اچھا ہے۔ سوہا کو بھی دیکھ لو۔ اب تک سوئی ہوئی ہے۔ تم نے بھی حد کر دی اتنے دن بچی کو..."

"آنا تو تھا ہی میری بچی جو تھی یہاں۔" ایک فیصلہ کن چمک اس کے چہرے پہ تھی۔

"اور اب تو ماما جی بالکل ہی رہے گا اس سے ملنے کے لیے۔"

اخبار کھولتے جمیل کے اور مٹر چھیلتے کلثوم کے ہاتھ یکدم ساکت ہوئے تھے۔ نظریں منزہ کے چہرے کی طرف سوالیہ انداز میں اٹھیں۔

"اگر آپ کی یہی خواہش ہے کہ میں اپنے شوہر کے ساتھ خوش رہوں تو... تو آپ کو سوہا کو اپنے پاس رکھنا ہوگا۔"

کتنی ہی دیر تک کلثوم کچھ کہہ نہ سکی۔

ایسا مذاق کرنا منزہ کی عادت تھی نہ فطرت۔ اس کے باوجود کلثوم نے بغور دھیان سے اسے دیکھا۔ شاید مذاق کی ہلکی سی رمق نظر آئے مگر وہاں ایک جامد سناٹا تھا۔

جمیل بھی دم بخود بیٹھا منزہ کو تک رہا تھا جو یہ دھماکا کرنے کے بعد سر جھکائے اپنے دائیں ہاتھ کی تیسری انگلی پہ پڑی انگوٹھی کو بائیں ہاتھ کی انگلی اور انگوٹھے سے گھمائے چلے جا رہی تھی۔

"مگر..." جمیل نے کھنکارتے ہوئے تفصیل جاننا چاہی۔ "اس اچانک فیصلے کی..."

لیکن اس سے آگے اس کے الفاظ کھو گئے۔ وہ مدد طلب نظروں سے کلثوم کو دیکھنے لگا جو دوبارہ مٹر چھیلنے لگی تھی۔ مگر اب اس کے انداز میں ایک واضح بے دلی اور غائب دماغی کی کیفیت جھلک رہی تھی۔

جمیل کی زبان سے ادا ہوئے ان چار الفاظ کے بعد دوبارہ ایک جان لیوا سکوت تینوں نفوس کے درمیان حائل ہو گیا۔ پلاسٹک کے پیالے میں گرنے والے مٹر کے دانوں کی ہلکی سی آواز کے علاوہ وہاں کچھ بھی سنائی نہ دے رہا تھا۔

"ماما۔ آپ؟" سوہا اندر سے نکلی، ماں کو دیکھ کے ٹھٹھک کر رکی اور پھر خوشی سے بھاگتے ہوئے اس کے گلے آ لگی۔

"ماموں نے بتایا ہی نہیں کہ آپ آنے والی ہیں۔ میں تو سمجھی کہ اب صبح میں ماموں کے ساتھ ہی..."

کہتے کہتے وہ رکی۔ ماں کے ستے ہوئے چہرے پہ ایک نظر ڈال کے اس کا اپنا منہ بھی اتر سا گیا۔ اتنی بچی تو وہ اب نہ رہی تھی کہ معاملے اور ماحول کی گمبھیرتا محسوس نہ کر سکے اور حالات نے ویسے بھی اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ حساسیت عطا کر دی تھی۔

"کیا ہوا ماما؟" اس بار آواز میں وہ کھنک نہ تھی۔ ایک موہوم سا اندیشہ جھانک رہا تھا۔ "انھوں نے ڈانٹا؟"

منزہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں... ڈانٹا تو ہو گا۔ بہت غصے میں ہوں گے۔"

وہ ماننے پہ تیار نہ تھی۔ اپنے "جرم" کی سنگینی کا احساس رہ رہ کے ہو رہا تھا۔

"تھے... اب نہیں ہیں۔"

"یعنی مجھے... مجھے ڈانٹ نہیں پڑے گی؟"

منزہ نے نظریں چراتے ہوئے نفی میں سر ہلایا۔

"پھر بھی ماما... میں ان سے سوری کر لوں گی۔"

منزہ نے ذرا سا رخ موڑا اور کلثوم کے آگے سے باؤل نامحسوس طریقے سے اپنے آگے کھسکایا اور مٹر کے دانے نکالنے لگی۔ شاید سوہا کے سوالات سے بچنے کا اس سے کمزور سہارا اور نہ ملا تھا۔

"آپ نہیں بتائیں گی تو میں ابھی آپ کے ساتھ چلی جاؤں گی۔"

اس بار منزہ کوشش کے باوجود گھبراہٹ کو خود پہ حاوی ہونے سے روک نہ سکی۔

"انہی نے مجھے سمجھا دیا ہے کہ غلطی کرنے کے بعد چھپنے کے بجائے اس پہ شرمندہ ہو کر معافی مانگ لی جائے۔"

کلثوم نے اپنے اس "قبل از وقت" لیکچر پہ خود کو کوستے ہوئے جلدی سے اس کی بات کاٹی۔

"بیٹا! سوری تو تم فون پہ بھی کر سکتی ہو سوہا! اتنی جلدی واپس جانے کی کیا ضرورت ہے۔"

پہلی بار منزہ نے اپنی مشکل آسان ہو جانے پہ ایک مشکور و ممنون نظر اس پہ ڈالی تھی، وہیں جمیل نے کلثوم کو تن تنہا یہ فیصلہ کر لینے پہ ایک تیز اور ناراض نظر سے نوازا تھا۔

"منزہ کی تو مجبوری ہے۔ جیسے تم اس کی بیٹی ہو ویسے ہی وشمہ بھی تو اب اس کی ہی ذمہ داری ہے اور بیمار بچے کو تو ویسے بھی ماں کی مکمل توجہ چاہیے ہوتی ہے۔ یہ وہاں وشمہ میں مصروف رہے گی، تم کیا کرو گی وہاں۔ بور ہی ہو گی۔ اس سے تو اچھا ہے کہ ابھی ہفتہ دس دن یہیں رک جاؤ۔"

"لیکن نانو... چھٹیاں تو صرف تین تھیں۔ اب ایک ہی رہ گئی ہے۔"

"میں اپلیکیشن بھیج دوں گی۔" منزہ نے پرس اٹھاتے ہوئے کہا۔

سوہا نے آنکھوں میں حیرت بھر کے کھڑی ہوئی ماں کو دیکھا جو بلاوجہ چھٹیاں کرانے کے حق میں کبھی بھی نہ رہی تھی۔

"لیکن ماما... چھٹیاں کیوں... ایگزامز نزدیک ہیں اور..."

اس کی ادھوری بات میں ان گنت سوال چھپے تھے۔

"ٹھیک ہے۔ میں بیگ بھجوا دوں گی۔ یہیں سے چلی جایا کرنا، ماموں کے آفس کے راستے میں پڑتا ہے تمہارا اسکول۔"

وہ جانے کے لیے مڑی... کیسی ادھورے پن کا۔ عجیب سے خالی پن کا احساس ہوا۔ پلٹ کے دیکھا تو سوہا اب تک وہیں الجھی ہوئی سی کھڑی تھی۔ بے اختیار اس کا جی چاہا اسے بانہوں میں بھر کے اس کے ماتھے پہ، بالوں پہ، رخساروں پہ، گلابی نازک ہتھیلیوں پہ ڈھیر سارے بوسے دے ڈالے مگر جانتی تھی کہ محبت کا یہ والہانہ اظہار اسے اور الجھائے گا۔ اس نے دل پہ ضبط کرتے ہوئے اپنے لب بھینچے اور تیزی سے مڑ کے وہاں سے نکل گئی۔

جمیل نے ایک تیکھی سی نظر کلثوم پہ ڈالی جو خود بھی اس اچانک ٹوٹنے والی افتاد سے بوکھلائی ہوئی لگ رہی تھی۔ اگرچہ اس نے بروقت کسی نہ کسی طرح خود پہ قابو پاتے ہوئے اس صورت حال کو سنبھالنے کی کوشش کی تھی مگر جو فیصلہ جلدی میں کر لیا تھا اس کے متوقع نتائج بھی اسے ہولا رہے تھے۔

منزہ جا چکی تھی۔ ادھ کھلے دروازے پہ اب تک سوہا کی بے یقین نظریں ٹکی تھیں۔ پھر اس نے گردن گھما کے دیکھا۔ جمیل کب کا اپنے کمرے میں جا چکا تھا۔ کلثوم سبزی لے کر کچن کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ برآمدے کی سیڑھی پہ بیٹھ گئی اور انگلی کی نوک سے گرد آلود فرش پہ لکیریں بنانے لگی۔

☼ ☼ ☼

"کسی کی اولاد کی ذمہ داری لینا اتنا آسان کام نہیں ہے جو تم نے وہیں کھڑے کھڑے پلک جھپکتے میں فیصلہ کر لیا کلثوم!"

اندر بند کمرے میں جمیل اس پہ اپنی ناگواری جتا رہا تھا۔ کلثوم جو خود بھی اس فیصلے پہ مطمئن نہیں تھی، ایک کمزور سا احتجاج کر کے رہ گئی۔

"وہ کسی کی اولاد نہیں ہے۔ آپ کی اپنی بہن کی بیٹی ہے۔"

"پتا ہے مجھے۔ اپنے رشتے مجھے تم سے جاننے کی ضرورت نہیں ہے۔"

وہ چڑ کے بولا۔ پھر ذرا تحمل سے وضاحت کرنے لگا۔

"سوہا مجھے اپنی بیٹی کی طرح ہی عزیز ہے مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کلثوم! کہ وہ منزہ کی بیٹی ہے۔ اسے اپنے باپ کے گھر میں ہی رہنا چاہیے۔"

"باپ" "تو ہے نہیں اس کا۔ یہ کیوں بھول جاتے ہیں آپ اور جب باپ نہیں ہے تو باپ کا گھر کیسا؟"

"نوید اچھا انسان ہے۔ سلجھا ہوا اور خوف خدا رکھنے والا۔ منزہ اگر اسے طریقے سے ہینڈل کرتی تو یہ نوبت نہ آتی۔ اب دیکھ لو اس لڑکی نے کیا کیا؟ مزید وہ فضول حرکت کرتی نہ اس بات کی نوبت آتی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا۔ اگر نوید نے سوہا کی حرکت پہ غصے میں آ کے ایسا کچھ کہہ ہی دیا ہے تو منزہ کو بجائے اس بات کو دل پہ لینے کے غصے میں آ کر سوہا کو ہمارے گھر چھوڑنے کے سمجھداری سے حل نکالنا چاہیے۔ معافی مانگ لے وہ نوید سے۔ اور سوہا پیار سے سختی سے بے شک ڈانٹ ڈپٹ کر کسی بھی طرح سمجھا دے۔ بات ختم۔"

وہ حد سے زیادہ جھنجھلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"بات اتنی آسانی سے ختم ہونے والی ہوتی تو منزہ ختم کر چکی ہوتی۔ وہ کوئی اٹھارہ انیس سال کی ناتجربہ کار لڑکی نہیں ہے اور آپ نوید کو ہینڈل کرنے کی کیا بات کرتے ہیں۔ اب کیا وہ اسے الو کا گوشت کھلا کے اپنے قابو میں کرلے؟ آپ بھی تو بیٹی کے باپ ہیں۔ ٹھیک ہے کہ سوہا نے نادانی کی۔ لیکن دل پہ ہاتھ رکھ کے بتائیں کہ آپ کی بیٹی سے یہ غلطی یا اس سے بھی بڑی کوئی غلطی ہو جاتی تو کیا آپ اسے گھر میں رکھنے سے اور اس کی کفالت کرنے سے انکار کر دیتے؟"

جمیل سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"چاہے وقتی اشتعال کے تحت ہی سہی۔ نہیں ناں؟..... آپ کیا کوئی بھی باپ ایسا نہیں کر سکتا۔ اور نوید مراد نے کیا۔ اس لیے کہ وہ سوہا کا اصلی باپ نہیں ہے نہ کبھی ثابت ہو سکتا ہے پھر کیا سوچ کے منزہ اس کے آگے ہاتھ رگڑ کے معافیاں مانگتی رہے۔ آج مان گیا تو کل پھر کسی بات پہ بگڑے گا۔"

"وہ تو ٹھیک ہے لیکن۔ لیکن اس میں ہمارا۔ میں پھر کہتا ہوں کلثوم! منزہ سے بات کرلو۔ یہ پریشانی مت مول لو۔"

"کبھی کبھار بڑی پریشانی سے بچنے کے لیے چھوٹی پریشانیاں مول لینا پڑتی ہیں۔"

"بڑی پریشانی؟"

"آپ نے سنا نہیں۔ سوہا کی وجہ سے منزہ کی شادی شدہ زندگی خطرے میں ہے۔ شادی شدہ بہن اجڑ کے گھر آ جائے اس سے تو بہتر ہے کہ آپ اس کی بیٹی کو ہی پال لیں۔"

"آتی ہے تو آ جائے۔" جمیل رکھائی سے بولا۔

باوجود بھائی ہونے کے۔ کلثوم کا دل کانپ گیا۔ "کیسے انسان ہیں آپ..... بہن کے بارے میں ایسی بات۔"

"انسان ہوں۔ یہ تو مانتی ہو تم۔ پھر یہ توقع کیوں کر رہی ہو کہ میں فرشتہ ثابت کروں خود کو۔"

"انسان ہی ثابت کر دیجیے۔ انسانیت دکھا کے۔" کلثوم نے جتلاتے انداز میں کہا۔

"کلثوم..... کلثوم بات کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ اگر آج ہی تم نے منزہ کو فون کر کے سوہا کو لے جانے کو نہ کہا تو یہ بوجھ ہمیشہ کے لیے ہمارے گلے پڑ جائے گا۔"

"کیسا بوجھ؟ ایک دس گیارہ سال کی بچی ہی تو ہے۔ اپنا رزق خود ساتھ لائے گی۔ آپ کی ہماری بساط ہی کیا؟ کسی کو دو وقت کی روٹی کھلا سکیں۔"

"بات صرف دو وقت کی روٹی کی نہیں ہے۔ اس کا اسکول کا خرچہ۔ اور..... اور مستقل ذمہ داری لے رہی ہو تم

کہ کل کو وہ لڑکی ہے۔ چند سال گزریں گے تو اسے دے دلا کر رخصت کرنے کا فرض بھی ہم کو ہی نبھانا ہوگا۔"

"ہماری اپنی بھی بیٹیاں ہیں۔"

کلثوم کی آواز بھرا گئی۔

"ایسے منزہ کو مایوس نہ لوٹا سکی۔ وہ بھی اس گھر کی بیٹی ہے۔ میں بس ڈر گئی تھی جمیل! کہ اس کے ساتھ کی گئی ناانصافی ہماری بیٹیوں کے آگے نہ آ جائے۔"

"ناانصافی ہم نے نہیں کی۔ بس قسمت کا ہیر پھیر ہے۔" بیٹی کا ذکر آیا تو وہ بھی دھیما پڑ گیا۔

"ٹھیک ہے۔ قسمت کے آگے کس کا زور چلتا ہے۔ آپ ہی اسے قسمت کا لکھا جان کے تسلیم کر لیں۔"

"ہماری اپنی نہیں تین بیٹیاں ہیں۔"

"میں یہ بتا رہی ہوں کہ یہ ابن لگ رہا ہے۔ ذرا وقت گزرنے دو۔ پھر خود پچھتاؤ گے اس جذباتی فیصلے پر چھتاؤ گی۔"

"پچھتاؤں گی نہیں۔" کلثوم بھی پھٹ پڑی۔ "ہاں میں مانتی ہوں۔ کسی کی اولاد کو اپنی اولاد کے برابر لا کھڑا کرنا بہت مشکل ہے۔ معاشی تنگی دلوں کی کشادگی پہ حاوی ہونے لگتی ہے۔ میں یہ بھی مانتی ہوں کہ اس کے یہاں آنے کے بعد ہو سکتا ہے میرا دل بھی تنگ ہو جائے شاید۔ لیکن کیا کروں۔ منزہ کی جانب سے آنکھیں بند کر کے بھی نہیں رہ سکتے۔ اس کا گھر اپنی نظروں کے سامنے اجڑتا بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اگر خدانخواستہ ایسا ہوا تو ہم ہمیشہ کے لیے نہ صرف اس کی نظروں میں بلکہ شاید خدا کی نظر میں بھی اس کے قصوروار ہوں گے۔"

"کیوں؟ ہم کیوں؟"

"ہاں ہم اس لیے کہ یہ شادی ہم نے بہت زور دے کر کروائی ہے۔ وہ کب راضی تھی۔ ایک بار اس کا گھر اجڑا تو ہم نے مشیت ایزدی کہہ کے صبر کر لیا۔ دوسری بار اجڑا تو ہم اپنے آپ سے کبھی نظر نہیں ملا سکیں گے جمیل! ہماری بھی بیٹیاں ہیں۔ کہیں ان کی آہ نہ لگ جائے انہیں۔"

"عجیب وہمی عورت ہو....." وہ بڑبڑانے لگا۔

"تمہارا تو وہ خون ہے۔ نوید جیسے پتھر دل نہ بنو۔"

"اب وہ پتھر دل ہو گیا۔ جب یہ رشتہ آیا تھا تب تو تمہیں اس میں سرخاب کے پر لگے نظر آ رہے تھے۔ تب یہ بات سوچنا تھی کہ پہلے سے ایک بیٹی کے ہوتے ہوئے وہ سوتیلی بیٹی کو کیا اہمیت دے گا۔ تب تو تم تلی بیٹھی تھیں کہ راتوں رات منزہ کو رخصت کرا کے دم لینا ہے۔"

"دوسری شادی تو ہونا ہی تھی۔" کلثوم اس کا اشارہ بھانپ کر دھیرے سے بولی۔ "اس کی بھی کوئی گارنٹی نہیں کہ ہم نے اس کی شادی عرفان یا کسی اور کنوارے سے کی ہوتی تو وہ سوہا کو اپنی بیٹی مان کے رکھتا۔"

"اگر کسی بھی بات کی کوئی گارنٹی نہیں تھی تو اتنا بڑھ چڑھ کے اس کی دوسری شادی کرانے کا شور کیوں مچایا تھا۔ بیٹھی رہتی وہ بیٹی..... وہاں کون سے سکھ کے جھولے لے رہی ہے۔"

"ہم اس کے دکھ کم نہیں کر سکتے تو بانٹ تو سکتے ہیں۔"

کلثوم نے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کے لجاجت سے کہا تو وہ آہستگی سے سر ہلا کے رہ گیا۔

☼ ☼ ☼

"جب تھا تو کچھ دیر اسے ڈھائی من کا بنا رکھا ہے۔"

اسے چپ چاپ اپنے کاموں میں مصروف دیکھ کے شمشاد بیگم بڑبڑائی۔ اس سے منزہ کی خاموشی برداشت نہ ہو رہی تھی۔

نوید مراد کو منزہ کا سے اپنا من چاہا نتیجہ پانے کے بعد اسے یہ توقع تھی کہ منزہ خاصا رونا دھونا مچائے گی۔ دوبارہ منت سماجت کرے گی شاید بیٹی کو واپس لانے کے لیے اس کے پیر تک پکڑ کے گڑگڑائے گی تب مزہ آتا۔ وہ تو ایک شرط میں گرفتار تھا کہ اس کی ساری تڑپتی زخمی ممتا کو پیروں تلے مسلتے ہوئے۔

"طبیعت ٹھیک ہے؟"
"جی اب ٹھیک ہے۔ میں ابھی ابھی دیکھ کے آئی ہوں۔ دوا دے کر دودھ پلا کے سلا دیا ہے میں نے۔" تکیہ درست کر کے رکھنے کے بعد وہ کمبل کی تہہ کھول رہی تھی۔
"کون۔۔۔ میں۔۔۔"
وہ بڑبڑا کے وضاحت کرنے لگا کہ اس نے اصل میں کس کی طبیعت کے بارے میں دریافت کیا ہے مگر اس کا بھی موقع نہ دیا۔
"وشمہ۔۔۔ اور کون؟" اس نے الٹا سوال کر کے نوید کو لاجواب کر دیا۔
وہ سر جھکا کے چائے پینے لگا۔ اس سے پہلے بھی عموماً دونوں کے مابین ہونے والی گفتگو وشمہ کے متعلق کرتی تھی اس لیے منزہ کا جواب۔۔۔ یا سوال برمحل تھا۔
"بخار تو اب اتر گیا ہے مگر کمزوری باقی ہے۔ ابھی کچھ دن اسکول نہیں جائے گی یہ۔"
اسکول کا ذکر سنتے ہی نوید کے دماغ میں جھماکا سا ہوا۔
"اسکول۔۔۔ اسکول کیسے جائے گی سوہا؟"
"جیسے پہلے جاتی تھی۔"
"پہلے تو میرے ساتھ جاتی تھی۔"
"اب اپنے ماموں کے ساتھ چلی جایا کرے گی۔"
"منزہ! کیا ضرورت ہے اتنی مشکل میں پڑنے کی۔ بچیاں۔۔۔ بچیاں اپنے گھر پہ ہی اچھی لگتی ہیں۔"
"اور اگر کوئی گھر نہ ہو تو۔۔۔ پھر اچھی ہی نہیں لگتیں۔۔۔ کہیں پہ بھی نہیں۔"
آہستہ آواز میں کہتے ہوئے اس نے کروٹ بدل لی۔
"یہ کب تک چلے گا؟" وہ جھلا گیا۔ "آخر تم سمجھتی کیوں نہیں کہ میں شرمندہ ہوں اور اپنی غلطی کا ازالہ چاہتا ہوں۔" دوسرا جملہ محض سوچ کر رہ گیا۔
"جب تک چل سکا۔"
اس نے دوسری جانب رخ کیے ہوئے ہی جواب دیا نہ چہرے کے تاثرات کیسے تھے۔ یہ تو وہ جان نہ سکا مگر آواز بے حد ٹھنڈی تھی۔۔۔ لہجہ بے حد میکانکی اور بے تاثر تھا۔
"اگر نبیل بھائی جان کو وقت ہوئی تو وین لگوا دیں گے یا پھر تین مہینے بعد اسکول بدل دیں گے۔ فائنل ایگزام کے بعد۔"
نوید نے چائے کا آدھا خالی کپ ٹیبل پہ پٹخ دیا اور بستر پہ لیٹ کر چھت پہ نگاہیں گاڑ دیں۔ شرمندگی تو جھلاہٹ میں بدلی تھی اب ڈھٹائی پہ تل گئی۔
"ضد ہے اکڑ دکھانے کی۔ ایک بار کہہ دے گی تو کیا شان میں فرق پڑ جائے گا۔ اب میں پیر پکڑ کے منانے سے تو رہا۔"
اس نے بھی کروٹ لے لی۔

☆ ☆ ☆

"تم میری بات مان کیوں نہیں لیتیں۔" اصغر نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔
"اور تم کیوں نہیں میری بات مان لیتے؟" زرینہ نے زچ کرنا ہی سیکھا تھا۔
"ایک بار مانی تو تھی۔ نتیجہ تم نے دیکھ لیا۔ اب میری بات آزما کے دیکھ لو۔"
"کوئی زبردستی ہے کیا؟" وہ چڑ کے بولا۔
"نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ میری طرف سے کوئی زبردستی نہیں ہے۔ نہ ہی یہ کوئی ضد ہے میری کہ میں آ کے رہے گی۔ یہ تو میں نے تمہاری ضد کا آسان سا حل نکالا تھا جو میرا دل خوشی سے قبول کر لے۔"

اور اب چھوٹے بچے کو لانے والے ناکام تجربے کے بعد تم کسی بڑے بچے کو لانا چاہتی ہو تاکہ لیے تمہیں کوئی تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ یعنی پالا پلایا بچہ۔ تو اس لیے میں نے سوچا نام لیا نہیں کی تمہارے ساتھ۔ تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی لیکن کوئی دوسرا بچہ بھی نہیں آئے گا۔"
"تو اور کیا ہے بھلا؟"
آج تک اصغر کو سر ہلا کے صرف بات مانتے ہی دیکھا تھا۔ اس کا شرطیں سامنے رکھنا رہا تھا۔
"نہیں ہے میری جان۔"
دیکھ کر پیار سے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا۔
"سب میں نے کتنی محنت سے بنایا ہے۔ کوئی غیر۔۔۔ کوئی دوسرا آ کے اس کا مالک بن برداشت نہیں ہوگا۔"
"اس غیر کو ہم اپنی اولاد مان لیں گے دل سے بھی اور کاغذوں میں بھی۔ تو وہ کوئی دوسرا نہیں رہے گا
اپنا بھی نہیں ہوگا۔"
اسے بھی اپنا صرف ماننا ہوگا۔۔۔ تو پھر کسی دوسرے کو کیوں نہیں۔"
مگر غیر بھی نہیں ہے اسے دل سے اپنانے میں کچھ وقت لگے گا اور پھر وہ میرے بھائی کا خون مظہر کے خون میں بھی اور بھر جائی۔۔۔ تم نے بھی تھوڑا بہت وقت بھر جائی کے تمہاری اس کی آپس میں بنتی نہیں وہ الگ بات۔۔۔ مگر یہ بات تو تم بھی مانتی ہو گی کہ وہ اچھی عورت شریف۔۔۔ بھلے دل کی۔"
نہیں بولی۔ ماتھے کے بل ذرا کم ہوئے۔ یعنی اسے اصغر کی اس بات سے بہر حال اختلاف نہیں تھا۔
ہم یتیم خانے سے لائیں گے پتہ نہیں کس کی اولاد ہو گی۔ حرام کی اولاد ہو گا یا حلال کی۔۔۔ شاید کسی پھینکا ہو گا۔ شاید کسی ڈاکو۔۔۔ کسی فراڈیے۔۔۔ کسی سڑک چھاپ بھکاری کی اولاد ہو۔۔۔ خون کی بڑی میں اس بات کو بہت مانتا ہوں اور ڈر لگتا ہے مجھے۔۔۔ کہ کہیں کوئی گندے خون والا بچہ اس گھر میں آ گیا تو ہمیں اپنی محبت کے بدلے میں صرف نقصان ہی ملے گا۔ مجھے ساری عمر کی محنت کے اپنا بڑھاپا خوار نہیں کرنا۔"
طور پر قائل ہوتی نظر آ رہی تھی۔ ماتھے کے گنتی کے چند بل بھی معدوم ہو رہے تھے۔
کی بیماریاں بھی لا سکتے ہیں اپنے ساتھ۔ بعض بچوں میں خاندان کی بیماریاں بھی منتقل ہوتی پورے اعتماد اور بھروسے کے ساتھ گھر لا سکتے ہیں۔ بھر جائی نے اس کی اچھی تربیت کی ہو گی۔ وہ کوئی مسئلہ نہیں بنے گی۔"
کیا؟"
اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ قائل ہو چکی تھی۔ اصغر کی پچھلے کئی مہینوں سے جاری کوشش رنگ لا رہی
نہیں؟" اس نے اپنی خوشی چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔
آخر سوہا اس کی اکلوتی اولاد ہے۔"
بھائیوں سے ایک سال بھی اس کا بوجھ نہیں اٹھایا گیا تھا اور کب کا بیاہ چکے ہیں وہ اسے اب تک دو بچے اور ہو چکے ہوں۔ نہ بھی ہوں تو اس کی دوسری شادی کر لینے سے ہمارا کیا سوچ لیے تو مجھے یقین ہے وہ مان جائے گی۔"

اس کے جتا دینے پہ وشمہ خفیف سی ہو گئی۔ ایک شرمندہ سا تاثر اس کے پورے سراپے سے جھلکا۔

"ماما..... آپی کب آئیں گی؟"

"کبھی نہیں۔" بڑی مشکل سے دھکیلی گئی پتھریلی ٹھنڈک بھرے دھٹائی کے ساتھ اس کے لہجے میں اتر آئی۔

"ماما..... آپ انہیں لے آئیں۔" وشمہ کی آواز اور پلکیں، دونوں نمکین اضطرابی سے بھیگ رہی تھیں۔ "میں کبھی جھگڑا نہیں کروں گی ان سے....."

منزہ نے ایک سرد آہ بھری اور اس کی نچلی پلکوں پہ ٹکا ایک شفاف ہیرا سا آنسو اپنی انگلی کی پور پہ لیتے پوری سچائی سے کہا۔

"تم پہلے بھی کب جھگڑا کرتی تھیں جان! وہی لڑا کرتی تھی تم سے۔"

سوہا کے لیے لفظ "تھی" کا استعمال اس کے کلیجے میں کیلیں چبھونے لگا۔ ایسا لگا جیسے وشمہ کی پلکوں پہ ٹکا ایک ہیرا اس کی پلکوں پہ ہیروں کی باڑ لگا گیا ہو۔

"پھر میں ان کی شکایت تمہیں کیا کروں گی کسی سے۔ وہ کچھ بھی کہہ لیں۔ سیڑھیوں سے دھکا دے دیں، اسکول میں کالی سے ہوم ورک والا پیج پھاڑ دیں۔ یونیفارم پہ کیچپ گرا دیں۔ باتھ روم میں بند کر کے لاک کر دیں۔ کچھ بھی کر دیں، میں کسی کو نہیں بتاؤں گی۔"

وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی اور منزہ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"یہ تو تم نے پہلے بھی کسی کو نہیں بتایا بیٹا!"

وشمہ کا کچھ اور کہنے کے لیے کھلا منہ وہیں کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چہرے پہ ایک رنگ سا آ کے گزر گیا جیسے ابھی ابھی اپنی کہی بات کا احساس ہوا ہو۔

"کیا واقعی سوہا یہ سب کیا کرتی تھی تمہارے ساتھ؟" اس نے حیرت اور بے یقینی سے پوچھا۔

"نہیں، وہ تو نہیں۔ میں بس..... ایسے ہی....."

اس کی گھبراہٹ میں منزہ کو اپنے سارے جواب مل گئے۔

"پھر بھی تم چاہتی ہو کہ وہ یہاں دوبارہ آ جائے؟"

وشمہ کا سر مجرمانہ سے اقرار کے ساتھ جھک گیا جیسے وہ خود اپنی اس بے معنی خواہش پہ شرمندہ ہو۔

"مگر کیوں؟ کیوں چاہتی ہو تم ایسا؟ کیوں تمہیں اتنا پیار ہے اس سے؟" اس بار حیرت کے ساتھ ساتھ تجسس بھی تھی۔

"کیونکہ..... کیونکہ وہ نہیں ہیں تو آپ بہت اداس رہتی ہیں ماما!"

اس نے بھیگی آواز میں چند قدم آگے سرکتے ہوئے کہا پھر اس کے ننھے گدرائے ہوئے ہاتھوں کی حدت نے اپنی گود میں دھری ہتھیلی کی سختی سے بند مٹھیوں پہ محسوس کی۔

"اور میں آپ کو اداس نہیں دیکھ سکتی۔ میں آپی سے نہیں، آپ سے پیار کرتی ہوں۔"

منزہ کی حیران اور وشمہ کی پشیمان آنکھوں سے ایک ساتھ آنسو گرے تھے اور ان دونوں کے بندھے ہاتھ آن بھیگے تھے۔ پتہ نہیں کس کا آنسو کس کی ہتھیلی پہ ٹھہرا تھا۔

"آئی لو یو ماما!"

وشمہ نے منزہ کے گلے میں باہیں ڈالیں تو وہ رو نہ سکی اور اسے اپنے سینے سے بھینچ کر سسک اٹھی۔

☼ ☼ ☼

پرائی اولاد سے محبت کرنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے پرائی اولاد کو سگی اولاد کی جگہ دینا۔

منزہ نے وشمہ کو کبھی سوکن کی اولاد کی نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ ایک تو سوکن کا بھی

کے لیے بھی کہ اسے اس انجانی ان دیکھی سوکن سے کبھی رقابت کا احساس ہوا بھی نہیں تھا۔ رقابت کے لیے محبت کا ہونا ضروری ہے اور غالباً اس کے اور نوید مراد کے رشتے میں ابھی وہ موڑ نہیں آیا تھا کہ اسے نوید کے حوالے سے ایسے کسی جذبے کا احساس ہوتا۔

پہلی نظر میں ہی وشمہ ایک سہمی ہوئی چڑیا سی لگی تھی جسے دونوں ہاتھوں کی اوٹ دے کر تحفظ کا احساس دینے کو بے ساختہ دل چاہا تھا اور پھر اس بچی کی والہانہ محبتیں، اپنائیت جگا گدگداتا لمس..... وہ اس سے کبھی لاتعلق رہ ہی نہ سکی۔ سوہا کی دلی ناپسندیدگی اور ناگواری کے باوجود۔

اس نے کبھی یہ سوچ کر وشمہ کو توجہ اور محبت دینے کی کوشش نہیں کی تھی کہ اس سے متاثر ہو کر بدلے میں شفقت و عنایت کرے۔ اس نے کسی غرض سے بے نیاز ہو کے وشمہ پہ ممتا نچھاور کی تھی۔

اس کی بیٹی کو تو "دیس نکالا" ملے اور وہ ایسا سنگدلانہ حکم سنانے والے کی بیٹی کو اپنے سینے سے چپکا لے۔ فطری سی بات تھی کہ اس کے دل میں بھی ملال آیا۔ وشمہ کے لیے۔ وقتی ہی سہی مگر ایک بیزاری پیدا ہوئی۔ یہی وجہ تھی کہ پچھلے کئی روز سے اس کا رویہ اس کے ساتھ لیا دیا اور خشک سا تھا۔ اسی کے ساتھ ساتھ نوید مراد کے ساتھ بھی اور شمشاد بیگم کے ساتھ تو خاصا جارحانہ ہو چکا تھا جو اس کے مزاج اور فطرت کے خلاف تھا۔

"کسی پناہ گزین کی طرح اس گھر میں ہر شرط مان کر رہنے پہ مجبور ہوں مگر میرے دل پہ کوئی جبر نہیں ہے۔ جس پیار کی حق دار ہو کر بھی میری بیٹی اپنے حق سے محروم کر دی گئی ہے اس پیار کو میں کسی اور پہ کیوں لٹاؤں۔ میری بچی کو تنہائیوں کے حوالے کر کے یہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی بچی کی محرومیاں دور کروں۔ کس لیے؟ کیوں؟ میں ایسا کبھی نہیں کروں گی۔"

یہ اس کا ارادہ تھا جو وشمہ کے معصوم اور بے ریا پیار کے سامنے ریت کی بھربھری دیوار ثابت ہوا۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ

پرائی اولاد سے محبت کرنا مشکل نہیں ہے۔ مشکل ہے پرائی اولاد کو سگی اولاد کی جگہ دینا۔

اور منزہ نے یہ مشکل کام آخر کار کر ہی ڈالا تھا۔ اس نے اپنی لٹی پٹی زخم خوردہ محبت پہ وشمہ کا پھاہا رکھ لیا تھا اور سوہا۔ کیا اس کے نصیب میں بھی کوئی مرہم تھا؟

☐ ☐ ☐

"تم؟" جمیل نے خلاف توقع اصغر کو سامنے دیکھ کر بے ساختہ کہا تھا۔

اس کے سوال میں موجود حیرت، تنفر اور بیزاری اس کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھی۔ جتنی اس کی آنکھوں میں اس کے لیے نظر آ رہی تھی۔ اسے سالوں پہلے کی اپنی اور اصغر کی وہ آخری ملاقات یاد آ گئی جس کی تذلیل وہ بھلائے نہیں بھول پا رہا تھا۔

"کیوں، کیا لینے آئے ہو؟"

"بتا کے بھیجا ہے۔"

اصغر نے ڈھیٹ سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتے ہوئے یوں خوش دلی سے کہا جیسے عرصے سے دونوں میں دوستانہ مراسم چلے آ رہے ہوں۔

"تو گویا تو مجھ سے لینے ہی آیا ہوں۔"

"دیکھو، میرا موڈ اس وقت پہلے ہی خراب ہے۔ اب دماغ مت خراب کرو تم۔ اور جہاں سے آئے ہو وہیں منہ اٹھا کے چلے جاؤ۔"

اس نے گیٹ بند کرنا چاہا۔ اس کا خیال تھا کہ یہاں اس علاقے میں وہ کسی سے ملنے یا کسی اور کام سے آیا ہو گا، راستے میں اس کا گھر دیکھ کر اس کی شیطانیت پھڑک گئی ہو گی۔

"میں تو خاص طور پر آپ سے ملنے آیا ہوں۔" اس نے آگے بڑھ کے گیٹ بند ہونے سے روکنا چاہا۔ جمیل ابرو اچکا کے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔
"آپ سے اور بھرجائی سے۔"
"کیسی بھرجائی؟ کون سی بھرجائی؟" جمیل بھڑک اٹھا۔
"یہاں تمہاری کوئی بھرجائی نہیں رہتی۔ تم شاید ولی کے آئے ہو۔ یہ شریفوں کا گھر ہے اصغر بھٹی! جو سسرالی کوٹھے پہ اپنے کرتب دکھاؤ۔ وہاں یہ سب چلتا ہوگا۔" جمیل نے طنز کیا تھا۔
اصغر کی باچھوں سے پھوٹتی مکروہ اور تپا دینے والی مسکراہٹ ایسے بھڑ بھڑ کرتی راکھ ہوگئی جیسے کسی نے اس پر تیزاب ڈال دیا ہو۔
"میں منزہ بھابھی کی بات کر رہا ہوں۔"
موقع کی نزاکت ایسی تھی ورنہ جس طرح جمیل نے ریتا کے حوالے سے اس کی دم پہ پیر رکھا تھا وہ تلملاتے کتے کی طرح اس کو بھنبھوڑ کے رکھ دیتا۔ فی الحال بڑے روکھے لہجے میں فقط اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔
"وہ تمہاری بھابھی اب نہیں رہی اور تمہاری معلومات کے لیے اتنا بتا دوں کہ میری بہن کی شادی ہو چکی ہے اب وہ کسی کی بیوی ہے۔ تمہارے جیسے ایرے غیرے سے بلاوجہ نہیں مل سکتی۔"
"میری معلومات اتنی کمزور نہیں ہیں کہ بھرجائی کی شادی کے اتنے سال بعد تک بھی میں بے خبر رہتا۔"
"تم یہی ساری بکواس کرنے آئے ہو میرے دروازے پہ؟"
"نہیں۔ بتایا تو ہے کہ کچھ لینے آیا ہوں۔"
"اب یہاں کیا ہے تمہارا؟" وہ الجھا۔
"میری بھتیجی، میرے بھائی کی آخری نشانی سوہا۔"
جمیل کتنی دیر تک کچھ بول نہ سکا۔

☆ ☆ ☆

جمیل کے ڈرائنگ روم میں ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کے بیٹھے وہ بڑی بے چینی سے اپنے پیر ہلا رہا تھا۔ اس کی مضطرب نگاہیں کسی ایک منظر پہ ٹک ہی نہ رہی تھیں۔ ایک چیز سے دوسری چیز پہ پھسلتی تیجانے کے ڈھونڈ رہی تھیں۔
"شکر ہے میں ریتا کو ساتھ نہیں لایا۔"
اس نے انگلیاں چٹخاتے ہوئے سوچا۔
اور یہ شاید اس کی زندگی کے ان چند گنے چنے فیصلوں میں سے ایک فیصلہ تھا جس پہ وہ شکر ادا کر رہا تھا۔ ریتا ساتھ آنے کے لیے بضد تھی مگر وہ حالات خراب ہونے کے خدشے کے پیش نظر اسے ساتھ لانے پہ تیار نہ ہوا تھا۔
اگرچہ جمیل اسے سامنے پا کے بھی کم نہیں بھڑکا تھا لیکن وہ اصغر بھٹی تھا، اپنا مطلب نکالنے کے لیے سب کچھ سہہ لینے کا حوصلہ رکھنے والا اور وہ ریتا تھی۔ پل میں شعلہ جوالا بن جانے والی، ہر مصلحت سے عاری، مصلحت شناسی کے فن سے نا آشنا۔ اس کو ساتھ لایا ہوتا تو اس وقت جمیل کے گھر کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا سوہا کا انتظار کر رہا ہوتا۔
"سلام کرو بیٹا! تمہارے چچا ہیں یہ۔"
جمیل کی آواز پہ وہ چونکا۔
اس کے ساتھ کھڑی وہ دس گیارہ سال کی لمبے قد کی دبلی پتلی مگر مضبوط کاٹھی کی لڑکی تو اپنی عمر کے برعکس بڑا معصوم سا چہرہ رکھتی تھی اور حیران آنکھوں میں اجنبیت بھرے اسی کو دیکھ رہی تھی۔

اصغر کے اندر ایک لمبی انگڑائی لے کر بیدار ہوئی تھی۔ وہ بہت سالوں کے بعد اس کے سامنے تھی۔ درمیان کے اتنے سال گویا یک غائب ہو گئے تھے۔ اسے لگا تھوں میں نرم روئی کے گالے جتنی چند سال پہلے کی سوہا کا لمس محسوس ہوا جسے وہ بڑے شوق سے گود میں لیا کرتا تھا۔
گول مٹول گڑیا جسے وہ موٹر سائیکل کی ٹنکی پہ بٹھا کے گھر کے پورچ میں گول گول چکر لگایا کرتا۔ فراک ہوا سے پھڑپھڑاتا اور اس کی کلکاریاں سارے میں گونج رہی ہوتیں۔ وہ باپ کی سیٹ کے پاس سہمی بیٹھی خوف کے مارے اس کی انگلی تھی اور وہ چاہتے ہوئے بھی خود کو اس کی ننھی منی مٹھیوں کی گرفت سے آزاد کرانے پہ مجبور ہو گیا۔ اپنے بھائی کو اس کے آخری سفر پہ لے جانے کے لیے اپنا کاندھا پیش کرنا تھا۔
اس کے گھر سے جا رہی تھی بلکہ اس کی نظروں کے سامنے نکالی جا رہی تھی اور جاتے ہوئے اس نے جس طرح مڑ کے اسے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔
"چاچو۔"
اصغر اب بھی کبھی کبھی زمانوں کا سفر کرتی اس تک آتی اور وہ اندر تک سرد پڑ جاتا۔ ایسے لگتا جیسے مرا ہوا بھائی اپنے بچے کا سوال کرتا اس کے سامنے آکھڑا ہوا ہو۔
"چاچو۔"
اس نے دھندلی ہوتی آنکھیں رگڑ کے دیکھا۔ اس بار یہ صدا زمانوں کا نہیں، صرف چند قدموں کا فاصلہ طے کر کے اس تک آئی تھی اور وہ بھی آنکھوں میں پہچان لیے جانے کی چمک لے کر۔
اصغر نے بازو وا کیے اور مظہر کی خوشبو کو سینے سے لگا کر محسوس کرنے لگا۔
"میری سوہا۔۔۔ میری بچی۔۔۔ چاچو کی جان۔۔۔"
وہ والہانہ پیار کرتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ اس ایک مختصر سے وجود نے اس کے اندر کتنے بچھڑے رشتوں کی تڑپ جگا دی تھی۔
ماں کی۔۔۔ باپ کی۔۔۔ اور اس بہن کی جو ابھی مری نہیں تھی۔ زندہ تھی مگر وہ اسے کب کا اوپر کی منزل کے ایک کمرے میں دفنا چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ضرورت تھی اسے گھر میں گھسانے کی؟"
منزہ کو جمیل کی یہ حرکت ذرا پسند نہیں آئی۔
"مجھے کیا پتا ہے اب وہ بھائی کی بیوہ کو تو پلٹ کے پوچھا تک نہیں اتنا عرصہ۔۔۔ اور جب یہ اپنے گھر بار والی ہے تو اسے منہ اٹھا کے۔۔۔ منزہ بے چاری پہلے ہی تلوار کی دھار پہ چل رہی ہے۔ پچھلے رشتوں کی ایسی دخل اندازی اسے خراب کر سکتی ہے۔ آپ اسے منع کر دیں۔ اب نہ آئے یہاں۔"
"اپنے گھر میں بیٹھی ہے۔ وہ یہاں آیا ہے۔ منزہ کو بھلا کیا کہہ رہا ہے وہ۔ ویسے بھی اصغر کو منزہ یا اس کے بہت کیا لینا دینا۔ کیا واسطہ؟"
"اس کا ہم سے کیا لینا دینا۔ اور کیا واسطہ؟"
"سوہا سے کچھ واسطہ تو ہے۔"
"کیا واسطہ؟"
"وہ اس کے بھائی کی اولاد ہے۔ سگی بھتیجی۔ اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ میں کیسے روک سکتا تھا۔"
"تایا اور کس کی بھتیجی؟" منزہ نے چمک کر کہا۔ "اب یاد آیا ہے اسے کہ اس کے مرحوم بھائی کی کوئی

"اب یاد آیا ہو کہ تب یاد آیا ہے۔ بہر حال میں منع کرنے والا کون ہوں۔ ویسے بھی خون کا رشتہ ہے لیکن حق بات تو یہ ہے کہ مجھ سے زیادہ حق سوہا پر اس کے چچا کا بنتا ہے۔"

"واہ بڑا آیا حق جتانے والا۔ اب آیا تو وہ خبر لوں گی اس کی کہ....."

"بس کرو کلثوم۔" جمیل نے ناگواری سے ٹوکا۔ "خبردار جو تم نے معاملہ بگاڑنا چاہا تو۔"

"معاملہ؟" وہ کھٹکی۔ "کن چکروں میں ہیں آپ؟"

"لاحول ولا۔ میں کسی چکر میں ہوں گا۔ تمہیں پتہ ہے کہ میں نہیں گیا تھا اس کے پاس، وہ خود آیا ہے خون کی کشش اسے کھینچ کر لائی ہے۔"

"دفع کریں اس کے خون کی کشش کو۔ مجھے اصل بات بتائیں۔ آپ کہنا کیا چاہتے ہیں؟"

کلثوم کی چھٹی حس بار بار اسے کوئی اشارہ دے رہی تھی۔

"میں نے کچھ نہیں کہنا۔" جمیل نے بے اعتنائی سے کہا۔ "وہ کہہ کے گیا ہے کہ.... سوہا کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔"

"کیا؟ اس کی ہمت کیسے ہوئی یہ بات کہنے کی۔ پہلے یتیم بچی کو خود نکالا۔ اب خود لینے آ گیا ہے۔ بے غیرتی اور ڈھٹائی کی۔ اس نے یہ سوچا بھی کیسے کہ ایک یتیم بچی کو ماں کی مامتا سے محروم...."

"سوہا کو اس کی ماں اپنی مامتا سے محروم کر چکی ہے کلثوم۔" جمیل کے سرد لہجے پہ کلثوم کو چپ لگ گئی۔

"وہ..... وہ اور بات ہے۔"

کافی دیر بعد اس نے اپنی ہمت مجتمع کرتے ہوئے کہا مگر اس کے الفاظ کا کھوکھلا پن خود اس پہ عیاں ہو رہا تھا۔

"ایک ہی بات ہے۔ منزہ اسے ساتھ رکھنا نہیں چاہتی۔"

"چاہتی ہے، صرف رکھ نہیں پا رہی۔ مجبور ہے۔"

کلثوم نے اس کی بات کاٹ کر جلدی سے منزہ کی جانب سے صفائی پیش کی۔

"چلو یونہی سہی۔" جمیل نے بدمزگی سے بھنویں سکیڑتے ہوئے کہا۔

"بات تو وہی ہے کہ بیٹی کی وجہ سے اس کا گھر نہیں بس پا رہا تو اگر اللہ کی جانب سے سبب بن رہا ہے تو تم نے کیا ہے۔"

"منزہ کبھی نہیں مانے گی۔"

"اس کے ماننے نہ ماننے کا کیا سوال۔ اس نے لڑکی پہلے ہی ہمیں سونپ دی ہے۔"

"عجیب باتیں کر رہے ہیں آپ۔ امانت جان کے ہمیں سونپی ہے، اس لیے نہیں کہ ہم اسے ادھر ادھر پھریں۔ اس سے تو اچھا ہے سوہا کو دوبارہ منزہ کے پاس پہنچا دیں۔ اگر اتنی ہی وہ بھر لگ رہا ہے بھائی کو پالنے۔"

"بات کی نزاکت کو نہ سمجھنا تم بس مجھ پہ طنز کے تیر چلاتی رہنا۔" وہ بھڑک اٹھا۔

"میں نے جو فیصلہ کیا ہے، منزہ اور سوہا کی بھلائی کے لیے کیا ہے۔ حق دار کو اس کی امانت پہنچا دینا اصول ہے۔ باپ کے بعد اس کی اولاد کی کفالت اصغر کا حق بھی ہے اور فرض بھی۔ ٹھیک ہے، وہ ایک عرصہ اس فرض کی ادائیگی سے غافل رہا لیکن اگر اب اللہ نے اس کے دل میں اپنے خون کے لیے محبت جگا ہی دی ہے تو ہمیں بلاوجہ ضد دکھانے کے بجائے مصلحت سے کام لینا چاہیے۔ اگر منزہ کی شادی نہ ہوئی ہوتی تو بات دوسری تھی۔ اصغر کا باپ بھی اس سے سوہا کو لینے کی بات نہیں کر سکتا تھا اور یقیناً میں بھی یہ نہیں چاہتا کہ منزہ کی گود سونی کر دوں۔ فی الوقت حالات دوسرے ہیں۔ منزہ اب کسی اور کی بیوی ہے۔ اس کی بیٹی کی ماں ہے۔ ہو سکتا ہے کچھ وقت میں اللہ اس کے نصیب میں اور اولاد بھی لکھ دے مگر سوہا کی حالت وہی رہے گی جو اب ہے۔ جو اسے مل رہی ہے۔ یہاں وہ حق سے رہ پا رہی ہے۔ وہاں کم از کم اسے یہ احساس تو ہو گا کہ وہ اپنے باپ کے گھر میں ہے اور میں بھی کچا کام نہیں کروں گا۔ میں نے اصغر سے ساری بات طے کر لی ہے۔ باقاعدہ قانونی کارروائی کے سارے ضابطے قاعدے پورے کرتے ہوئے نہ صرف سوہا کو قانونی طور پر ایڈاپٹ کرے گا اور اپنی ساری جائیداد

بنائے گا بلکہ منظر کا حصہ جو اس وقت اس نے ہڑپ کر لیا تھا، وہ بھی سوہا کے نام لگائے گا۔ سوچو، اس صورت میں سوہا کا مستقبل کتنا محفوظ ہو جائے گا۔"

جمیل نے تفصیل اور وضاحتی بیان پہ کلثوم چپ چاپ اسے دیکھے گئی۔

اس کی باتوں میں کوئی لگ بھی رہی تھیں اور نہیں بھی۔

کبھی اس کی دلیلوں پہ دل متفق ہو جاتا تو کبھی ان سے مطلب پرستی اور منافقت کی بو آنے لگتی۔ یہ خدشہ ستانے لگتا کہ جمیل بغیر کسی غرض کے کسی کے لیے اتنا اچھا سوچنے والا تو نہیں۔ کہیں سوہا کا مستقبل محفوظ کرنے کے پیچھے اس نے اپنا بھی کوئی فائدہ تو نہیں رکھا۔

جمیل اس کی ... جھلاتے ہوئے کہتا۔

"بھلا اصغر کو ایسی بھی کیا مجبوری ہے جو وہ جمیل کی ہر جائز ناجائز شرط مان کے سوہا کو لے جائے۔ چلو سوہا کے لیے وہ کرے، بات سمجھ میں آتی ہے مگر جمیل کا فائدہ وہ کیوں سوچے گا؟"

"سوچ کیا رہی ہو؟ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟"

اس کے سوال پہ وہ چونکی اور ایک گہرا سانس لیا۔

"نہیں، کچھ ایسا غلط بھی نہیں مگر ہمارے صحیح یا غلط کا فیصلہ کرنے سے کیا ہوتا ہے۔ اصل بات تو یہ ہے کہ منزہ کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔"

"اس کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں رہ جاتی اب۔"

"وہ ماں ہے سوہا کی۔"

"ہاں مگر اس کے شادی کر لینے کے بعد قانون کی نظر میں اس کا سوہا پہ وہ حق نہیں رہتا جو پہلے تھا۔ اگر وہ اصغر کا مقابلہ کرنے کی کوشش بھی کرتی ہے تو وہ قانون کا دروازہ کھٹکھٹا کے بڑی آسانی سے سوہا کو حاصل کر سکتا ہے۔"

کلثوم نے ایک اور گہری سانس بھری۔

پہلی سانس میں کشمکش اور بے بسی کا اظہار ہو رہا تھا اور دوسری میں ہار مان لینے، ہتھیار ڈال دینے والی رضامندی جھلک رہی تھی۔

"تو پھر اب؟"

آگے کے بارے میں اس کا ارادہ جاننے کا اظہار کرتی وہ کچھ کچھ قائل نظر آ رہی تھی۔

"اب یہ کہ منزہ سے بات کی جائے۔"

"اور یہ بات کرے گا کون؟"

"تم۔ ظاہر ہے اور کون؟"

"میں؟"

اس کے اطمینان سے کہہ ڈالنے پر وہ بدک سی گئی۔

"میں کیسے؟ نہیں نہیں.... مجھ سے نہیں ہو گا یہ۔ آپ خود بات کریں۔"

"میں کیا کہوں گا۔" پہلی بار وہ گھبراہٹ کا شکار نظر آیا۔

"یہی سب جو ابھی مجھ سے کہا۔"

"تم سے اس لیے کہا کیونکہ تم سن رہی تھیں۔ وہ پوری بات سنے گی ہی نہیں اور سے کار کار روتا دھوتا مچا دے گی۔ تم بات کرو تو شاید بن جائے، تم سے وہ دبتی بھی ہے اس کی اور میری بجائے وہ تمہیں اپنا زیادہ ہمدرد سمجھتی ہے۔"

"ہاں اب تک تو سمجھتی ہے۔ آگے کا پتہ نہیں۔" کلثوم تلخی سے مسکرائی۔

"میں کوشش کروں گی لیکن مجھے پتہ نہیں کہ وہ اس بات کا کیا مطلب لیتی ہے۔"

اس نے ابھی سے اپنی ہمتیں مجتمع کرنا شروع کر دیں۔ منزہ سے یہ بات کرنے کے لیے۔

وہ سوچنے لگی کہ کس بہانے اسے فون کرے اور پھر بات سے بات نکالتے ہوئے یہ بھی کہہ ڈالے۔

"نہیں فون پہ نہیں۔ آمنے سامنے بات ہو تو زیادہ بہتر ہے۔"
اس نے خود ہی فون والے آئیڈیا کو رد کرتے ہوئے وہاں جانے کا سوچا مگر پھر اسے بھی مسترد کر دیا۔
"نہیں... وہاں نہیں... وہاں تو اس کی ساس سر پہ سوار رہے گی... منزہ کا موڈ خراب ہوگا تو وہ ٹھیک
نہ کر سکے گی نہ سمجھ پائے گی۔ یہاں بلوا لیتی ہوں۔ ہاں یہ ٹھیک رہے گا۔"
لیکن ابھی اس نے منزہ کو بلانے کے لیے کوئی بہانہ بھی نہ سوچا تھا کہ منزہ خود وہاں آ گئی۔

☆ ☆ ☆

"بات نہ کر مجھ سے۔"
شمشاد بیگم نے ساتھ جڑ کے بیٹھنے کی کوشش کرتی وشمہ کو پرے دھکیلتے ہوئے کہا۔
"گھسی رہتی ہے اس ڈائن کے پاس۔ آج وہ دفع ہوئی ہے تو آ گئی ہے۔ پھاپھے کٹنیاں دکھاتی۔ جا بہ
انتظار کرا اپنی اس سگی کا۔ میں کوئی مری نہیں جا رہی تیرے بغیر۔"
اس نے کسی لگی لپٹی کے بغیر وشمہ کو سنا ڈالا۔
"کیا کرتی ہیں اماں!"
پروین نے وشمہ کی اتری ہوئی صورت پہ پھیلا ہراس دیکھ کر ماں کو ٹوکا۔
اس کا کافی دنوں بعد آنا ہوا تھا اور آتے ہی یہ دیکھ کر اس کا موڈ آف ہو گیا کہ منزہ تیار ہو کے بھائی کے گھر
کے لیے نکل رہی تھی۔
پہلے والی منزہ ہوتی تو نند کی خاطرداری میں جُت جانے کے لیے اسی وقت اپنا پروگرام کینسل کر دیتی لیکن اب
اتنی زیادہ پروا نہ رہی تھی کسی کی۔ اس نے پروین کی آمد کو سرسری سا لیا۔ معمول کی چند ایک باتیں کی اور
اجازت طلب نظروں سے دیکھنے لگی۔
"آپ چلیں گے مجھے چھوڑنے یا پھر میں ٹیکسی منگوا لوں۔"
نوید نے ایک نظر پروین کے رنگ بدلتے چہرے کی جانب دیکھا ماں کی چبھتی نظروں سے نظر چرائی اور
سپاٹ انداز کو ٹٹولا۔
"میں... بس... چلنے ہی والا تھا۔ وہ پروین آ گئی تو..."
"جی میں اسی لیے کہہ رہی تھی کہ اگر آپ کچھ دیر رک کر آفس جانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں چلی جاؤں گی
خود ہی۔"
وہ پروین یا شمشاد کی جانب ذرا سا بھی دیکھے بغیر روانی سے کہہ رہی تھی اور یہ سوچ سوچ کر ہی اس کے
مزے آ رہے تھے کہ ان دونوں کا کیا حال ہو رہا ہوگا بے بسی کے مارے۔ شمشاد بیگم کا تو بس نہ چل رہا ہوگا
گرا کے اس پہ بیٹھ جائے۔ بس نوید مراد کے سامنے ہونے سے وہ چپ رہنے پہ مجبور تھی۔
اور نوید... وہ چپ رہنے پہ مجبور تھا اپنے اس ندامت اور پچھتاوے کے احساس کی وجہ سے...
بھیج دینے کے بعد بھی منزہ اس کے سامنے جس نارمل انداز میں اور بغیر کسی شکوے یا ناراضی کے رہ رہی
نوید کو اندر ہی اندر ایک مجرمانہ احساس سے دوچار کر رہا تھا۔ اب منزہ کے سامنے اس کے الفاظ یونہی ساتھ
جایا کرتے تھے۔
لیکن ماں اور بہن نے اسے اس کی زن مریدی پہ محمول کیا۔ پروین نے تو ان دونوں کے نکلتے ہی
دیا۔ "آپ تو کہہ رہی ہیں آپ نے بڑا کارنامہ انجام دے دیا ہے، یہ ہے وہ کارنامہ؟ بھائی جان کو دیکھ کے تو
جیسے بھابھی نے ان کی گردن دبا رکھی ہے۔"
"گردن تو میں مروڑوں گی اس کی اور ایسی مروڑوں گی کہ اُف نہ کر سکے گی۔ آج لڑکی بھجوائی ہے کل

...بچاؤں گی۔"
"یہ بابا... یہ سب کرنے کا اماں! بھائی جان ہی پریشان ہوں گے۔ ساری زندگی انہوں نے دیکھا ہی کیا ہے۔
... ذمہ داریاں... فرائض... نہ تعلیم مکمل کر سکے... نہ کم عمری کی بے فکر زندگی جی سکے... کام کام بس
... کے آنے سے جو دور ان کی زندگی میں خوشی کی لہر آئی بھی تو بس جیسے کوئی وہم سا گزرا ہو۔ اب جو بھی
... بھی ہے ہمارے ساتھ چاہے اچھی ہو یا نہ ہو مگر ان کے ساتھ ٹھیک رہے وہی کافی ہے۔"
"... کے ساتھ کدھر اچھی ہے؟ دیکھا نہیں کیسے لک (کمر) پہ ہاتھ رکھ کے کھڑی دیدے نکال رہی تھی اور
... میں آ کے نوید اور بک کے پیچھے پیچھے اس کے چلا گیا۔ اتنا نہیں کہہ سکا کہ میری بہن پہلی آئی ہے۔
... نکلے۔ آرام تال سے جا کر ہاں جی... وہ تو ایسا جل ہو گیا ہے کہ..."
"... بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بھابھی اتنی آسانی سے مان کیسے گئیں کیسے دل چاہا ان کا اپنی بیٹی کو خود سے جدا
کرنے کا؟"
"ایسی زنانیوں کو اپنی بوہتی فکر ہوتی ہے، کیسا خصم اور کیسی اولاد۔ تیرے میرے جیسی نہیں ہوتیں کہ بچوں
کے لیے کاروبار کے رہ تیں۔ ... خصم کرنے والیوں کے دیدے میں ویسے ہی شرم نہیں رہتی۔ اس نے سوچا۔ جالی
... میں بیاہ بند و سال سے ڈھونڈوں گی، ورنہ میرے کرنے سے کیا ہوتا تھا۔
... اڑ جاتی تو میں زبردستی تو اس کی کڑی کو نہیں بھیج سکتی تھی۔ اسے خود ہی پروا نہیں۔"
"ہاں۔ لگتا تو ایسا ہی ہے، ورنہ جب آپ نے بتایا تھا تو بڑی بات ہے بھابھی سے گلے شکوے اپنی جگہ مگر ایک
... کے لیے میرا تو دل ہل کے رہ گیا۔ خود ماں ہوں اسی لیے یہ بات ہضم کرنی بڑی مشکل ہو رہی تھی۔ اب یہاں
آ کے دیکھ رہی ہوں تو اتنی بڑی بات کا کوئی اثر ہی نہیں نظر آ رہا۔"
"اور بھوک لگی ہے۔"
وشمہ کی شامت آئی تھی جو عین اسی وقت وہ داری سے لاڈ جتاتی اس کے ساتھ جڑ کے بیٹھ گئی اور شمشاد نے
سارا غصہ اسی پہ نکال دی۔
"... کو ہاں! وشمہ بے چاری کا کیا قصور۔"
"سارا قصور اسی بدذات کا ہے۔ اس نے بوہتا سر چڑھایا ہے اسے۔ ذرا اکڑ کے رہتی تو کیا مجال تھی اس کی جو وہ
... نیچے کو نیچے لگاتی مگر... یہ تو ایسے مرتی ہے اس کے لیے جیسے اس کے بغیر وہ جا سانس نہیں آنے لگا۔ یہی دیکھ
دیکھ کے نوید اچھلا ہوا ہے۔"
"... ماں کی بچی پیار کی بھوکی ہوتی ہے شاید اسی لیے۔" پروین نے وشمہ کا سر سہلایا۔ ہمیشہ کی طرح وشمہ کا گلا
آنسوؤں کے ریلے سے بوجھل اور کڑوا نمکین ہو گیا مگر وہ رو نہیں سکی۔
"... پیار کا بچپن بھی تو ہونی چاہیے۔ اتنی کالی بھی نہ رہی یہ کہہ ذرا اس نے پچ پچ کی تو یہ دم ہلاتی اس کے پیر
... آ گئی۔"
"... مجبور نہ اماں!" پروین نے وشمہ کو مرجھائے انداز میں اپنے کمرے میں جاتا دیکھ کے اور اس کی اتری صورت
دیکھ کے پروین کے دل کو کچھ ہونے لگا۔
وشمہ اپنے کمرے میں آ کے بیڈ پہ ٹانگیں لٹکا کے بیٹھ گئی گردن اٹھا کے سامنے والی دیوار پہ تکنے لگی۔
... دیوار پہ تین تصویریں لگی تھیں۔ ایک چھ ماہ کی عمر کی جس میں وہ سرخ رنگ کی گوٹا لگی فراک میں عجیب سی
... رہی تھی۔ اسی رنگ کے کپڑے کی ٹوپی تھی سر پہ منڈھی ہوئی تھی جس کے کناروں پہ لگا الاسٹک اسے
... ہوئے تھا۔ اس ٹوپی پہ بھی جا بجا گوٹے کی کلیاں لگی تھیں۔ یہ فراک اور ٹوپی اس کی دادو نے خود سی تھی اس
... اور اس تصویر میں بھی وہی اسے گود میں اٹھائے ہوئے تھیں۔ اگرچہ تصویر میں نظر نہیں آ رہی تھیں مگر
تصویر کھنچوانا انہی کی فرمائش پہ بڑی کروا کے لگائی تھی اور وشمہ کو اپنی یہ تصویر زہر لگتی تھی۔

گہرے سرخ رنگ کے سلک کے چمکیلے فراک میں اس کا اچھا بھلا رنگ سانولا لگ رہا تھا۔ یہ سنولاہٹ شاید سر سے بہتے سرسوں کے تیل اور ڈیلوں سے باہر اُبل اُبل جاتے دو دھاری سرمے کی وجہ سے بھی تھی۔

دوسری تصویر ڈھائی سال کی عمر کی تھی۔

نوید مراد اور منزہ کی شادی کے موقع پر کھینچی گئی تصویر جس میں وہ پیلے رنگ کے ستارے ٹنکے چمکیلے غرارے میں چنا ہوا سبز دوپٹہ گلے میں ڈالے مسکرا کے کیمرے کی جانب دیکھ رہی تھی۔

تیسری تصویر آٹھویں سالگرہ کی تھی اور چند مہینے قبل کی تھی۔ اس میں وہ منزہ کا لایا ہوا سفید فراک پہنے ہیر بینڈ بالوں میں لگائے بڑی خوبصورت اور سنجیدہ سنجیدہ سی نظر آ رہی تھی۔

کچھ دن پہلے تک یہاں تین نہیں پانچ تصویریں تھیں۔ ایک سوہا کی دسویں سالگرہ کے موقع پر کھینچی گئی تصویر جو پچھلے سال ہی منائی گئی تھی اور دوسری بھی سوہا کی ہی جس میں وہ وشمہ کے ساتھ [illegible] نظر آ رہی [illegible]

یہ دونوں تصویریں سوہا کے چلے جانے کے تیسرے چوتھے دن ہی شمشاد بیگم نے یہاں سے ہٹا دی تھیں [illegible] کے احتجاج کے باوجود۔

اور جب اگلی صبح منزہ اسے اسکول کے لیے جگانے آئی تو وشمہ کا دل چاہا وہ دیوار سے جا کے چپک جائے [illegible] کے علم میں یہ تبدیلی نہ آ سکی۔ وہ ڈر رہی تھی کہ سوہا کی تصویریں نہ پا کے وہ نجانے کیسا محسوس کرے [illegible] ردعمل کیسا ہو مگر منزہ نے دیوار کی جانب دیکھا بھی۔ پانچ میں سے دو تصویریں غائب دیکھ کے ٹھٹکی بھی مگر [illegible] وشمہ کو تھا ویسا کچھ نہ ہوا۔ اگلے ہی لمحے سر جھٹک کے وہ وشمہ کا یونیفارم ہینگر سے اتار رہی تھی۔

وہ سارے آنسو جو منزہ کی آنکھوں میں آنے چاہیے تھے وہ وشمہ نے چپکے سے اپنے اندر اتار لیے تھے۔ جب کوئی کسی کے آنسو اپنے اندر اتار لیتا ہے تو ساتھ ساتھ وہ اس کی ساری کڑواہٹ بھی اپنے اندر سمو لیتا ہے۔ منزہ کے آنسو وشمہ کے اندر وہ ساری نفرتیں بو گئے تھے جو اس کے دل میں شمشاد بیگم اور پروین کے خلاف تھیں۔ اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی وہ ان دونوں کے قہقہے اور خوشگوار چہلیں سن رہی تھی اور اندر ہی اندر کڑھ رہی تھی۔

بالکل منزہ کی طرح۔

□ □ □

"سوہا کہاں ہے؟"

منزہ کو اندر آتے دیکھ کے سب سے پہلا خیال بلکہ سب سے پہلی دعا جو کلثوم نے مانگی وہ یہ تھی۔

"کاش۔۔۔ اسے یہ یاد ہی نہ آئے کہ اس کی سوہا نام کی کوئی بیٹی بھی ہے یا۔۔۔ یا وہ یہ بھول جائے کہ وہ اسے یہاں چھوڑ کے گئی تھی۔"

مگر اس کی دوسری بہت سی دعاؤں کی طرح یہ دعا بھی نجانے کس مصلحت کے تحت واپس لوٹا دی گئی۔

"سوہا۔۔۔۔۔"

دل چاہا کوئی بہانا بنا دے "بچوں کے ساتھ کہیں گئی ہے، سو رہی ہے یا۔۔۔ یا پھر۔۔۔" لیکن نہیں۔۔۔ [illegible] اس سے وہ بات کرنے کا۔

"سوہا تو اپنے چچا کے ساتھ گئی ہے۔"

"چچا۔۔۔ مگر۔۔۔"

وہ اچنبھے سے بولی۔ یہ اچنبھا بڑا نارمل سا تھا۔ اس میں چونکا دینے والی، جھٹکا لگا دینے والی بات کوئی نہیں تھی ایسے جیسے وہاں وہ اکثر جاتی رہتی ہو۔ اس کے برعکس کلثوم کے چہرے پہ وہ ساری حیرت در آئی۔

اسی حیرت نے منزہ کو کسی غیر معمولی پن کا احساس دلایا۔ اس نے ذہن میں اس کے کہے الفاظ دہرائے اور وہ حقیقی معنوں میں تھرا اٹھی۔

"چچا۔۔۔ اصغر؟"

"تمہاری چاچی تمہیں بڑا یاد کرتی ہے۔"

اصغر نے سارے راستے میں کوئی تیسری بار اس سے یہ بات کہی۔

"جب کبھی ملی ہیں مجھ سے تو یاد کر رہی ہیں۔"

سوہا تیسری بار خود کو یہ کہنے سے روک نہ سکی۔

"تمہیں یاد نہیں؟ جب تم اتنی سی تھی۔ ذرا سی۔" اس نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا۔

"تب بڑا وقت تمہاری چاچی کی گودی چڑھی رہا کرتی تھیں۔"

"[illegible] نے کب بتایا۔"

"تمہاری ماما کے پاس تو جانا ہی نہیں تھیں۔"

"[illegible] کیا ہوتی۔"

"پھر کیوں گئی؟"

اس سوال نے مسلسل چہکتے اصغر بھٹی کی بولتی بند کر دی۔ وہ چپ چاپ گاڑی ڈرائیو کیے گیا۔

"تمہیں پتا ہے!"

"تمہارے پاپا نے تمہاری ماما۔۔۔ ہم نے تو بڑا روکا تھا۔"

اس نے سوچا "ایک اور جھوٹ سہی۔"

"وہاں پہ اور کون کون رہتا ہے؟"

"پہلے تو سارے رہتے تھے۔ میں، تمہاری چاچی، تم۔۔۔ تمہاری ماما۔۔۔ تمہارے پاپا۔۔۔ دادی، دادا اور پھوپھی بھی۔ تمہاری ایک۔"

"میرے پاپا۔۔۔" سوہا کے دماغ میں ایک ہی لفظ اٹک گیا۔

"وہ بھی رہتے تھے یہاں۔"

"ہاں اور کیا۔"

اصغر نے کنکھیوں نظروں سے اس کے چہرے پہ پھیلتے اشتیاق کے رنگ دیکھے اور قدرے مطمئن ہوا۔

آج وہ اسے اپنے گھر لے جا رہا تھا رہنا سے ملوانے کے لیے۔ پچھلے تین دن سے وہ روزانہ شام کو اسے چند گھنٹوں کے لیے لے جاتا تھا۔ اس کی خصوصی اجازت اسے جمیل نے دی تھی۔ رہنا نے تو پہلے ہی دن اسے ساتھ لانے کی فرمائش کی تھی بلکہ اصغر کے ساتھ جانے کی ضد بھی کی تھی لیکن وہ سوہا کو اپنے طریقے سے ہینڈل کرنا چاہتا تھا۔

پہلے دن وہ اسے پلے لینڈ لے کر گیا، اس کے فیورٹ ریسٹورنٹ میں شاندار کھانا کھلایا۔ ٹوائے شاپ سے ڈھیر ساری باربی ڈولز، ڈول ہاؤس اور اسٹینڈ ٹوائز لے کر دیے۔

دوسرے دن بھی شاپنگ ہوئی۔ اس بار ڈھیر سارے برانڈڈ ریڈی میڈ سوٹس، امپورٹڈ مہنگے والے جوگرز اور [illegible] بکلس اور [illegible] اور اب تیسرے دن وہ اسے گھر لے جا رہا تھا۔

"یہ ہیں تمہاری چاچی۔"

سوہا نے حیرت سے سامنے کھڑی عورت کو دیکھا۔

"چاچی" کی تکرار سے اس نے اپنے ذہن میں جو خاکہ کھینچ رکھا تھا وہ شمشاد اور پروین کے قبیل کی ایک [illegible] اور سادہ سی عورت کا تھا۔ بڑے بڑے پھولوں والی تیز رنگوں کے کپڑے پہنے سیدھی مانگ نکال کے [illegible] بالوں پہ بڑا سا کلپ لگائے، میرون لپ اسٹک اور سونے کے موٹے موٹے [illegible] ویسے بھی اصغر سے مل کے اس کی بات چیت اور طور اطوار کو بھانپ کے یہی اندازہ لگایا [illegible] جیسا چاچا، چاچی بھی ویسی نکلی مگر یہ عورت جو اس کے سامنے تھی اسے متاثر کرنے کے لیے کافی تھی

کہ اس عمر میں "ظاہر" ہی دل کو لبھاتا ہے۔ وہ بھی "ظاہر" دیکھ کے بہل گئی۔

بے حد اسٹائلش انداز میں سلے نفیس سی شیفون کے سوٹ میں ملبوس وہ عورت یقیناً "باقاعدہ [illegible] جانے کی عادی" تھی کیونکہ اس کی گندمی جلد جھلک رہی تھی۔ نقوش عام سے تھے مگر ملک [illegible] تھی۔ سیاہ اور کاہی رنگ کے امتزاج سے بنا سوٹ اس کی گندمی رنگت کو دلکش بنا رہا تھا۔ کاندھوں [illegible] سرخی مائل بھورے بال بے حد چمکیلے اور ملائم لگ رہے تھے۔ اتنے زیادہ کہ بے اختیار انہیں [illegible] چاہے۔

خوشبوؤں کی لپیٹیں بلاوجہ ہی پلکوں کو بھاری اور مخمور سا کر رہی تھیں۔ ہلکے زیورات اور نفاست سے میک اپ نے اسے پُر رعب بنا رکھا تھا۔

"چاچی...! اور یہ...؟"

ریتا کے ہونٹوں پہ سجی مسکراہٹ پل بھر کے لیے غائب ہوئی۔

"اتنی پیاری... چاچیاں ایسی تھوڑا ہی ہوتی ہیں۔ میں انہیں آنٹی کہوں گی۔"

مسکراہٹ دوبارہ آئی۔ پہلے سے کہیں بھرپور اور جاندار۔

"آنٹی نہیں، ماما کہو مجھے۔"

ریتا کا یہ مطالبہ ذرا قبل از وقت تھا اس لیے سوہا نے بے حد الجھ کے اصغر کو دیکھا۔

"وہ دراصل بہت پیار کرتی ہے نا یہ تمہیں، اس لیے۔" اس نے گڑبڑا کے وضاحت دیتے ہوئے آنکھوں ہی آنکھوں میں ریتا کو جلد بازی سے کام لینے سے منع کیا۔

"آؤ میں تمہیں گھر دکھاؤں۔"

ریتا نے اس کا ہاتھ تھاما۔

"یہ لاؤنج ہے، ہمارا لیونگ روم... یہ دیکھو... یہاں سے سارا لان نظر آتا ہے اور اس طرف ڈائننگ روم..."

سوہا نے بڑے اشتیاق سے سامنے رکھے بڑے سے ٹی وی سیٹ کو دیکھا اور پھر گردن گھما کے گلاس وال کے دوسری جانب نظر آتے بڑے سے لش گرین لان کو جس کے وسط میں بنے فوارے کے ساتھ ماربل کے مجسمے نظر آ رہے تھے۔

"اور یہ ساتھ ڈرائنگ روم ہے۔ وہ گیسٹ روم ہے... سامنے کچن... میرا خیال ہے انہیں دیکھنے کا تمہیں خاص شوق نہیں ہوگا۔ آؤ تمہیں اوپر لے کر جاتی ہوں۔ وہاں تمہارے پاپا کا کمرہ تھا... اب وہاں اصغر کا اسٹڈی روم ہے۔"

اسٹڈی کرنے سے اصغر اور ریتا دونوں کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں تھا مگر شہر کے ٹاپ کے انٹیریئر ڈیکوریٹر سے گھر سنوارتے، سجاتے ہوئے انہوں نے دوسری بہت سی آرائشی اضافوں کے ساتھ اسٹڈی کا شوق بھی پال لیا۔ یہ الگ بات کہ وہاں جانے کا اتفاق دونوں کو ہی نہ ہوتا تھا۔

"اور یہ دیکھو سوہا! تمہارے پاپا۔"

اصغر نے اسے کاندھوں سے تھام کے ایک تصویر کے سامنے کھڑا کیا۔

وہ گنگ ہو کے رہ گئی۔

"میرے پاپا..."

اس کے لبوں نے ایک نامحسوس سی حرکت کی اور آنکھیں... وہ یہ موہوم سی حرکت تک کرنے سے قاصر تھیں۔ وہ منظر کی تصویر کے ایک ایک نقش کو اپنے اندر اتارنے میں مصروف تھیں۔

"تمہیں یاد ہیں اپنے پاپا؟"

ریتا کا سوال اسے سماعتوں پہ دستک کرتا محسوس ہوا مگر جواب دینے کی ہمت تھی نہ فرصت۔

تھے۔ سیاہ بال بڑے دلکش انداز میں کشادہ پیشانی پہ بکھرے ہوئے تھے۔ سیاہ چمکدار آنکھوں سے ذہانت جھلک رہی تھی۔ گرے سوٹ، وائٹ شرٹ اور گرے ریڈ ٹائی میں اس کے پاپا مردانہ وجاہت کا ایک شاہکار نظر آ رہے تھے۔ [illegible] بتا رہا تھا کہ وہ بے حد تعلیم یافتہ اور قابل بھی تھے۔

"پاپا یاد آتے ہیں؟"

ریتا کے سوال مسلسل جاری تھے۔ سوال تھے یا شاید گرم لوہے پہ لگتی ضربیں۔ اس نے بھیگی پلکیں تیز تیز جھپکتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"تمہارے پاس پاپا کی کوئی تصویر نہیں ہے؟"

اصغر نے اسے یک ٹک تصویر کی جانب تکتے پا کر پوچھا۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔

[illegible] کی کوشش کرتی وہ اپنے آنسو باہر چھلکا گئی۔ ریتا نے اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا۔

"[illegible] اور کو پاپا کہتے ہوئے اس کے گھر میں رہتے ہوئے وہ اپنے اصلی پاپا کی تصویر رکھ بھی کیسے سکتی تھی۔"

سوہا اس کے سینے سے اٹھتی دلفریب مہک سے مسحور ہوتے ہوئے منمنا کے بولی۔

"نہیں، میں انہیں پاپا نہیں کہتی۔ کبھی بھی نہیں کہا۔"

"اچھا...؟" ریتا نے حیرت سے اسے خود سے الگ کرتے ہوئے اس کے چہرے کو غور سے دیکھا جہاں دبا دبا فخر جھلک رہا تھا۔ جیسے وہ اپنے کسی کارنامے پہ داد طلب کر رہی ہو اور یہ داد اصغر اور ریتا نے جی بھر کے دی اپنے بھرپور قہقہوں کی صورت۔

"یہ ہوئی نا بات۔" ریتا کو اس کی جی داری جی جان سے بھائی۔ اصغر کے سینے میں بھی ٹھنڈ پڑتی محسوس ہوئی۔

"بہت اچھا کرتی ہو سوہا! پاپا تو وہی ہوتا ہے جو اصلی ہوتا ہے۔ کسی اور کو پاپا کہو گی تو اوپر اللہ میاں کے پاس تمہارے اپنے پاپا کو کتنا دکھ ہوگا۔"

یہ دونوں وہ تھے جنہوں نے اس کی اس حرکت کی حوصلہ افزائی کی تھی ورنہ ماں سے لے کر ماموں اور ممانی تک سب نوید سے اس کے گریز پہ ٹوکتے ہی آ رہے تھے۔

پھر دیر تک وہ ان کے سامنے بیٹھی اپنے کارنامے سناتی رہی۔

شمشاد کو چڑانے کی کوششوں سے لے کر وشمہ کو زچ کرنے تک کے۔

اور پھر نوید سے فون پہ بولے جھوٹ تک بھی۔

☼ ☼ ☼

"کہا نا نہیں... تھوڑی سی دیر کے لیے لے کر گیا تھا۔"

کلثوم جو ساری بات من و عن اسے بتانے کا تہیہ کیے ہوئی تھی، ہکلا کے وضاحتیں دینے اور بہانے گھڑنے لگی۔ نوید کی [illegible] ہوتی رنگت اور ٹھنڈے پڑتے ہاتھ اسے بوکھلانے پہ مجبور کر گئے۔

"مگر تھوڑی سی دیر کے لیے بھی کیوں؟"

اس کیوں کا جواب کلثوم کے پاس تھا مگر وہ طے نہیں کر پا رہی تھی کہ یہ جواب اسے دے یا نہ دے۔

"اور آپ نے لے جانے کیسے دیا؟"

"میں کیسے منع کر سکتی تھی... وہ بہرحال چچا ہے سوہا کا۔ اس کا حق بنتا ہے۔"

آخر کار اس نے جمیل کے پڑھائے سبق ایک ایک کر کے دہرانے شروع کیے۔

"حق... کیسا حق... یہ حق اسے اتنے سالوں بعد یاد آیا۔"

"جب بھی آیا ہو، آیا تو ہے اور یہ اچھی بات ہے۔ سوہا کی شخصیت ویسے ہی باپ کی محرومی کے باعث ادھوری تھی۔ اب کم از کم اس ایک رشتے سے اسے..."

میں بہت پیارے بڑی تھیں۔
"تمہارا شوہر سوہا کو رکھنے پہ تیار ہوا بھی تو تمہاری ذات پہ سو احسان دھر کے۔ عمر بھر تم اس کے اس ایک احسان کی وجہ سے زیر بار رہو گی اور پھر بھی سوہا خوش نہیں رہے گی۔ ان چاہا ہونے کا احساس' وشمہ کا [illegible] حیثیتی' شمشاد بیگم کے طعنے۔"
ایک ایک کر کے ساری باتیں گونج رہی تھیں۔
"جائیے ناما! آپ کب مجھے ساتھ لے کر جا رہی ہیں؟" سوہا نے اسے جھنجوڑا۔
"سوہا... میری جان...! آپ میرے ساتھ نہیں جا سکتیں۔" اس کے بازوؤں پہ سوہا کی ہتھیلیوں کی گرفت کمزور ہوئی۔
"آپ کو یہیں اپنے ماموں کے پاس رہنا ہوگا۔"
سوہا نے ہاتھ اٹھا کے اپنے بازوؤں میں دبا لیے۔ اس کے چہرے پہ ایک سپاٹ تاثر تھا۔
"کیونکہ....." منزہ نے خشک ہوتے حلق کو تر کرتے ہوئے اسے بہلانے کے لیے کوئی عذر تراشنا چاہا مگر سوہا نے اسے کچھ کہنے کا موقع ہی نہ دیا۔
"پھر آپ مجھے چاچو کے ساتھ جانے دیں۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔ اگر نہیں تو یہاں بھی نہیں۔ میں چاچو کے پاس رہوں گی۔"
"یہ تمہارے ماموں کا گھر ہے سوہا!"
"وہ میرے پاپا کا گھر ہے۔"
"تمہارے پاپا اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔"
"مگر وہاں ان کی تصویر تو ہے... مجھے وہاں محسوس ہوتے ہیں۔ سب ان کو یاد کرتے ہیں' ان کی باتیں کرتے ہیں۔ چاچو... پھوپھو... سب... اور یہاں... نہیں نہ یہاں... نہ ہی آپ کے گھر... کہیں بھی میں پاپا کو محسوس نہیں کر سکتی۔ ان کی تصویر اپنے کمرے میں نہیں لگا سکتی۔ یہاں میرا کوئی کمرہ ہی نہیں ہے میں آپی کے کمرے میں سوتی ہوں... وہ مجھے اپنے کمرے میں میرے پاپا کی تصویر نہیں لگانے دیں گی اور آپ کے گھر میں بھی کوئی مجھے نہیں کرنے دے گا۔"
وہ آج واضح طور پر "آپ کا گھر" کہتے ہوئے اپنے اور اس کے درمیان پیدا ہوتے فاصلے کی نشاندہی کر رہی تھی۔
"میں وہیں رہوں گی۔"
اس نے فیصلہ کن انداز میں کہا تو منزہ کو غصہ آ گیا۔
"کوئی نہیں ہے وہ تمہارا چاچو! ایک دھوکے باز اور برا انسان ہے وہ۔ تمہارے پاپا بھی اسے پسند نہیں کرتے تھے اور تم وہاں جانے کے لیے مری جا رہی ہو۔"
"پلیز ماما! وہ پیار کرتے ہیں مجھ سے اور مجھے کوئی شوق نہیں ہے وہاں جانے کا۔ میں تو کہہ رہی ہوں میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں مگر اس گھر میں نہیں۔ آپ اور میں اکیلے رہیں گے کسی اور گھر میں۔"
"بے وقوف مت بنو سوہا! ایسا نہیں ہو سکتا۔"
اس سے پہلے کہ منزہ کچھ کہتی' جمیل نے کھٹکا' اسے ڈر سا لگا کہ منزہ کمزور نہ پڑ جائے اور بیٹی کی اس بچکانہ ضد پہ ہتھیار نہ ڈال دے۔
"منزہ! یہ تو بچی ہے مگر نہیں تم اس کے کہے میں آ کے مشکل سے بستا گھر اجاڑ نہ دینا۔ تم نے چند سال بیوگی میں گزارے ہیں' تم اس تجربے سے گزر چکی ہو کہ مرد کے بغیر جوان عورت کا تنہا رہنا کتنا دشوار ہے اور باپ یا کسی اور سرپرست کے بغیر بچی کی پرورش کرنا اس سے بھی بڑھ کے مشکل۔"
کلثوم نے بھی اسے سمجھانا چاہا۔

منزہ خاموشی سے سوہا کو دیکھے گئی جو سینے پہ بازو باندھے کھڑی بڑی الگ' بڑی غیر غیر سی لگ رہی تھی۔
"تمہارے بعد... تمہاری یہ نشانی بھی کھو دی میں نے۔"
[illegible] مقدر سے ہار... اولاد سے ہار... شوہر سے ہار... حالات سے ہار...

☆ ☆ ☆

"[illegible]" شمشاد بیگم نے اس کے چہرے پہ رقم درد کو دیکھ کے سوال کیا۔
اس استفسار میں ہمدردی کا نام و نشان نہ تھا۔ تشویش دور دور تک نہ تھی۔ ایک تضحیک اور تحقیر بھرا احساس [illegible] جھلک رہا تھا۔
"[illegible] یہ اُتھرو نہیں رک رہے تیرے... کوئی مرگ ہو گئی ہے؟"
[illegible] نوید مراد سے وہ ساری صورت حال جان چکی تھیں پھر بھی کچوکے لگانے کا جو الگ ہی سواد ہوتا ہے' اس سے بھی وہ محروم نہیں رہ سکتی تھیں آخر۔
"کس کی [illegible] ہوئی ہے؟"
منزہ کی خاموشی اسے اور بھی اکسا رہی تھی۔
"میری بیٹی کی۔" بڑے ہی ٹھنڈے لہجے میں' بنا اک آنسو ٹپکائے منزہ نے سفاکی سے کہا۔
شمشاد جیسی پتھر دل عورت بھی ایک ثانیے کو اس فقرے میں چھپی موت کی سی خنکی محسوس کر کے جھرجھری لے کر رہ گئی۔
"اگر موت کا مطلب کسی کو کھو دینا ہی ہے تو آج میری ممتا کی موت ہوئی ہے۔ گود اُجڑی ہے میری۔"
اس نے بین ڈالنے کے انداز میں دہائی دی۔ شمشاد کی نوکیلی باتوں نے جیسے رات بھر سے باندھے بند میں دراڑیں ڈال دی تھیں اور وہ بھربھری ریت کی طرح بہہ گیا تھا۔
"لاحول... نیستی... منحوس...."
خود پہ قابو پاتے ہوئے شمشاد نے بے حد ناگواری سے اس کا رونا دھونا نحوست قرار دے دیا اور جانے کے لیے مڑیں۔
"میرے گھر پہ پھٹکار ڈال کے رکھ دی ہے نیستی صورت نے۔ جب دیکھو بین ڈال رہی ہوتی ہے چڑیلوں کی [illegible]"
کمرے سے نکلتے نکلتے اس نے اندر گھستی وشمہ کو گھورا۔
"کہاں [illegible]؟ اندر کیا ہے...؟ چل۔"
بے حد غصے سے اس کا بازو پکڑ کے اس نے وشمہ کو اپنے ساتھ باہر لے جانا چاہا۔
وشمہ نے ایک نظر اندر ڈالی' جہاں ہچکیاں لے لے کر روتی منزہ بے حال ہوئے جا رہی تھی اور پھر جھٹکے سے اپنا بازو چھڑا لیا۔
"کمبخت..." شمشاد نے بلبلا کے اسے کوسا مگر اگلے ہی پل وہ اندر تھی۔
"[illegible]" وشمہ نے منزہ کے ہونٹوں سے پانی کا گلاس لگانا چاہا۔
[illegible] ہچکیوں کی اوٹ سے دیکھنے پہ منزہ کو وہ سوہا کا ہیولا لگی۔
"سوہا... میری بچی...!"
منزہ نے اسے زور سے سینے سے بھینچ لیا۔
"میں سوہا کو کہیں نہیں جانے دوں گی۔ میں سوہا کو... سوہا میرے ساتھ رہے گی... سوہا...!"
وہ بلک بلک کے روئے جا رہی تھی اور وشمہ کا ماتھا' اس کے گال' اس کے بال' اس کے ہاتھ چومے جا رہی تھی۔
[illegible] جہاں جہاں سے اسے آنسوؤں میں بھیگے بوسے دے رہی تھی' وہاں وہاں سے وشمہ اس کے لیے سوہا بنتی [illegible]

"ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ پلیز بس کریں۔"

وشمہ بھی رو دی' بلاوجہ' بس یونہی۔

"پلیز نہ روئیں۔"

وہ سچ مچ اس کے آنسو دیکھ کے ڈر گئی تھی۔ اس نے اپنی آٹھ ساڑھے آٹھ سالہ زندگی میں کبھی کسی کو یوں روتے نہیں دیکھا تھا۔

وہ اپنی ننھی منی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔

پلکوں سے دھند چھٹی' منظر واضح ہوا۔ تب تو منزہ نے دیکھا' وہ سوہا نہیں' وشمہ تھی' وشمہ۔

سوہا کو تو وہ کہیں پیچھے کسی اور موڑ پہ کھو آئی تھی۔

جمیل کے ہاں اس نے خود اسے چھوڑا تھا' دل تب بھی بے تحاشا دکھا تھا۔ کئی راتیں تکیے بھگوتے گزاری تھیں۔ کتنے ہی دن ایک نوالہ تک کھائے بغیر ٹیبل سے تب بھی اٹھتی رہی تھی' کروٹیں تب بھی ساری بدلی تھیں مگر دل کے لیے تھی' وہاں ہونے کا یہ جان لیوا احساس نہیں ہوا تھا۔

دل کو ایک امید تھی' وہ جب چاہے سوہا کو واپس لا سکتی ہے۔ کبھی بھی حالات اس کے حق میں ہو سکتے ہیں۔ خود غرضی اور سفاکی سے کام لیتے ہوئے اس نے یہ تک سوچا تھا۔

"ماں سارے فساد کی جڑ ہے' نوید دل کے برے نہیں۔ لاپروا اور کانوں کے کچے ضرور ہیں۔ اگر اماں نہ رہیں تو۔۔۔ تو پھر میری سوہا کو ساس کیا تکلیف ہو گی بھلا۔ باپ کی شفقت نہ ملے' نہ سہی۔ انسان ہر چیز تو نصیب میں لکھوا کے لاتا مگر وہ میری نظروں کے سامنے تو ہو گی۔ نوید برا بھلا خیال رکھ ہی لیں گے اس کا۔ بس یہ اماں کا کانٹا نکل جائے۔ اس کے ہوتے تو میں کبھی نہ لاؤں سوہا کو۔ ایسے حالات میں اسے رکھنے کا مطلب ہے اس کی شخصیت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا۔ بھلا زیادہ سے زیادہ کتنا جی لے گی' دھرتی کا بوجھ۔ اللہ کو مجھ پہ ترس آیا تو میرے دن بھی پھریں گے۔ وہ جلد اسے اٹھا لے گا اور میں۔۔۔"

مگر اصغر کے پاس جانے سے اس نے گویا یہ فرض کر لیا کہ وہ سوہا کو ہار چکی ہے۔ اب اس کا دل ہر امید' ہر آس' ہر خواب سے خالی تھا اور اس خالی دل میں آنسوؤں کا تالاب بھرتا جا رہا تھا۔

"پانی پئیں ماما!"

کسی نہ کسی طرح وشمہ اسے دو گھونٹ پانی پلانے میں کامیاب ہو گئی۔

"میں بابا سے کہوں گی' وہ آپی کو لے آئیں گے۔ آپ مت روئیں پلیز۔"

وشمہ نے اس کے ماتھے پہ پیار کرتے ہوئے بڑے سیانے پن سے دلاسا دیا۔

ٹھنڈے پانی کے دو گھونٹ اور تپتی جلتی پیشانی پہ میٹھے لبوں کا بوسہ۔ اسے شانت کرنے لگا۔

اس نے تشکر بھری نظروں سے اسے دیکھا اور اس کی ہتھیلیاں لبوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

"نہیں بیٹا! کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اب کبھی نہیں آئے گی۔ ناراض ہو گئی ہے مجھ سے۔"

"آپ سے۔ مگر آپ تو کچھ نہیں کہتیں۔ ڈانٹتی بھی نہیں۔"

"تم تو ناراض نہیں ہو گی مجھ سے۔"

"نہیں ماما! کبھی بھی نہیں۔" وہ ایک بار پھر اس سے لپٹ گئی۔

"میں آپ سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی۔"

"چاہے کوئی کچھ بھی کہے' دادی۔۔۔ پھوپھو؟"

وہ پتہ نہیں کیا سننا چاہ رہی تھی' شاید سوہا کی جانب سے ملی نا اعتباری پہ وہ وشمہ کے اعتبار کا پھاہا رکھنا چاہتی تھی۔

"ہاں' کچھ بھی۔۔۔ میں آپ کو سب سے زیادہ پیار کرتی ہوں۔"

☼ ☼ ☼

"تمہیں ہمارا روم پسند آیا؟"

رینا نے مسکراتے ہوئے اس سے پوچھا۔

وہ بہت سی اثبات میں سر ہلانے لگی۔

"کچھ چاہیے تو بتا دینا۔ فوراً آ جائے گا۔"

"اور کچھ؟"

اس نے ادھر سے ادھر' یہاں سے وہاں' اتنے بڑے سارے کمرے میں نظر دوڑاتے ہوئے سوچا۔

وائٹ اور پنک کے کھلے کھلے شیڈز سارے کمرے میں پھیلے تھے۔ آنکھیں جیسے گلابی خمار سے بوجھل ہوئے جاتی تھیں۔ کھڑکیوں پہ نیٹ اور ویلوٹ کے بھاری پردے بندھے ہوئے تھے اور نیٹ سے باہر کی روشنیاں چھن چھن کے آ رہی تھیں۔ سفید ماربل کے جھاگ سے فرش پہ راؤنڈ شیپ کا بے بی پنک دبیز قالین بچھا تھا۔ اطراف میں چار منقش اور منفرد ڈیزائنوں والی جدید چیئرز۔ ایک جانب رائٹنگ ٹیبل اور بک شیلف جس پہ خوبصورت ٹیبل لیمپ' پیپر اور کرسٹل کا پنسل اسٹینڈ رکھا تھا۔ رائٹنگ ٹیبل کے اوپر ہی ایک بڑا خوبصورت فوٹو فریم تھا جس کے ایک جانب مظہر کی اور دوسری جانب سوہا کی تصویر تھی۔

سوہا کی ہی ایک اور خوبصورت تصویر انلارج کرا کے بیڈ کے اوپر آویزاں کی گئی تھی۔ بیڈ کے ساتھ ہی شیشے کے دروازوں والی الماری بے شمار ڈولز اور اسٹفڈ ٹوائز سے بھری ہوئی تھی۔

بائیں جانب کی دیوار کے ساتھ ٹی وی رکھا تھا' اسی کے ساتھ بنا دروازہ ڈریسنگ روم اور واش روم کی جانب کھلتا تھا۔ جن میں بھی آسائش اور آرائش دونوں عروج پہ تھے۔

اتنی بے شمار چیزوں کی بھرمار ہونے کے باوجود کمرہ تنگ تنگ اور بھرا بھرا نہیں لگتا تھا کیونکہ ایک تو کمرہ وسیع بہت تھا' دوسرے بڑے طریقے سے تمام چیزیں سیٹ کی گئی تھیں۔

اس کی نظروں میں ستائش دیکھ کے رینا کے اندر سکون اترا۔

"کل اصغر تمہارے ساتھ جا کے شہر کے سب سے بڑے اور اونچے اسکول میں تمہارا ایڈمیشن کرا دے گا۔"

"نہیں' میں اسکول چینج نہیں کروں گی۔"

"یہ کوئی خاص اسکول نہیں ہے۔ میں تمہیں جس اسکول میں بھیجوں گی' وہ۔۔۔"

"نہیں آنٹی! یہاں میری فرینڈز ہیں۔ میں انہیں نہیں چھوڑ سکتی۔"

"جیسی تمہاری مرضی۔ میں کوئی کام تمہاری مرضی کے خلاف نہیں کرنا چاہتی۔"

رینا نے اس کے گال تھپتھپائے۔

"تمہارے لیے ٹیوٹر بھی رکھوا دوں گی۔ ایک ڈرائیور الگ سے رکھ دیا ہے جو صرف تمہیں اسکول سے لانے لے جانے کے لیے مخصوص ہو گا۔ ایک گاڑی بھی صرف اور صرف تمہارے لیے ہر وقت گھر پہ کھڑی رہا کرے گی' اوکے۔"

"صرف کھڑی رہا کرے گی۔"

اس کے جواب میں رینا نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔

"نہیں' میری جان! جہاں تم کہو گی وہاں چل بھی پڑا کرے گی۔ مگر صرف اور صرف تمہارے کہنے پہ۔"

"میں اگر گاڑی کو کہوں کہ وہ میری ماما کے گھر لے چلے تو وہ جائے گی؟"

سوہا نے بڑا عجیب سا سوال کیا تھا اور اتنا اچانک کہ پل بھر کے لیے رینا کے چہرے اور لبوں پہ کھلتی مسکراہٹ سمٹ سی گئی۔

"بیٹا! تم کیا چیز ہو' اصغر نے میرے لیے اولاد بھی میری فکر کی ڈھونڈی ہے۔ مزا آئے گا۔"

وہ اپنی ہی سوچ سے محظوظ ہوتے ہوئے دوبارہ مسکرانے لگی۔

"یہ تمہارا تحفہ۔"

صبح سے ابھی تک بھائیوں، بھابھیوں کے فون آ رہے تھے اور ہر بار مبارک باد وصول کرتے ہوئے منزہ کو عجیب سا احساس ہوتا۔

"کس چیز کی مبارک باد؟"

"ایسا کیا خاص ہوا تھا آج کے دن؟"

"اور اگر ہوا بھی تھا تو یہ دن ہر سال آتا ہے۔ ہر سال اسے نئے سرے سے یاد کرنے اور مبارک باد دینے کا کیا تک ہے بھلا۔"

مگر اب شام ڈھلے اس کے کاندھوں پہ ہاتھ رکھے سامنے کھڑے اس شخص نے جب اس کی کلائی میں نازک بریسلٹ پہناتے ہوئے یہ تین لفظی فقرہ کہا تو اسے احساس ہوا کہ کوئی خاص بات ہے آج کے دن میں۔

"میرے لیے؟" اس نے اس بے یقینی سے پوچھا کہ تحفہ دینے والا بھی شرمندہ ہو گیا اور اس کی شرمندگی منزہ کو شرمندہ کر گئی۔

"میرا مطلب تھا کہ..." اس نے وضاحت پیش کرنا چاہی مگر نوید نے ہاتھ اٹھا کے روک دیا۔

"ٹھیک ہو تم بھی... واقعی یہ دن پچھلے پندرہ سالوں سے آ رہا ہے مگر تحفہ دینے کا خیال مجھے پہلی بار آیا ہے۔ تمہاری حیرت بجا ہے۔"

نوید کے کہنے پہ اس نے سر جھکا لیا اور کلائی میں جھولتے دلکش ڈیزائن والے بریسلٹ کو تکنے لگی۔

"سچ پوچھو تو اس کا خیال اب بھی مجھے نہیں آیا۔"

اس کے جھجکتے ہوئے اعتراف پہ منزہ نے سر اٹھایا اور پورے اعتماد سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر وثوق بھرے انداز میں کہا۔

"جانتی ہوں 'میری بیٹی' نے یہ خیال دلایا ہوگا۔"

وہ ہر بار اتنے حق سے وشمہ کو "میری بیٹی" کہا کرتی تھی کہ کئی بار نوید مراد کا اپنا استحقاق ڈگمگا سا جاتا تھا۔

"ہاں۔" وہ کھسیانی سی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

"اور یہ پسند بھی اسی کی ہوگی۔"

"وہ تمہاری پسند ناپسند زیادہ اچھی طرح جانتی ہے۔"

"آپ بھی جان سکتے تھے نوید! اگر کوشش کرتے۔" برسوں سے دل میں دبا گلہ اب بھی دل میں ہی چٹکی لے کر رہ گیا۔

"حالانکہ مجھے یہ بریسلٹ تحفے میں دینے کے لیے جچ نہ رہا تھا۔"

اس بار منزہ نے صرف سوالیہ نظروں سے دیکھنے پہ اکتفا کیا۔

"پندرہ سال کی رفاقت کا صلہ نہ تو چند تولے کے زیور سے چکایا جا سکتا ہے، نہ ہی چکانا چاہتا ہوں۔ میں یہ بار تا عمر اپنے کاندھوں پہ اٹھائے رکھنا چاہتا ہوں منزہ!" اس کی آواز بوجھل ہو گئی اور منزہ کی سانسیں مہک...

عرصے بعد نوید نے اس کی قربانیوں کا نہ صرف اعتراف کیا تھا بلکہ سراہا بھی تھا۔ اسے اپنا وجود ہلکا پھلکا محسوس ہونے لگا۔

"تم نے میرے لیے... میری بیٹی کے لیے اور اس گھر کے لیے جو کچھ کیا ہے وہ..."

"پلیز نوید۔" منزہ نے روک دیا۔

"آپ کچھ بھی کہیے مگر وشمہ کو میرے سامنے "میری بیٹی" کہہ کر نہ پکارا کریں۔ مجھ سے برداشت نہیں ہوتا۔"

وہ دل سے ہنس دیا۔

"اچھا بھئی 'تمہاری بیٹی'، اب خوش؟" اس نے منزہ کی جانب مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا اور وہ سوچ میں پڑ گئی۔

"تمہاری بیٹی... کاش ہمارے درمیان کوئی ایسا ہوتا جسے ہم "ہمارا" یا "ہماری" کہہ پاتے۔"

میری بیٹی... نجانے کتنی بار یہ خواہش اس کے دل میں سے جاگی اور ویسے اچانک کہ وہ خود حیران رہ گئی۔

بھلا اب یہ خواہش کرنے کا کون سا موقع ہے۔ پندرہ سال بعد... دو جوان ہوتی بیٹیوں کے ہوتے ہوئے...

اس نے متعجب ہوتے ہوئے خود کو ٹوکا۔

اور نوید مراد دلچسپی سے منزہ کے چہرے پہ اترتے رنگ دیکھتا رہا۔

عورت جو پندرہ سال پہلے اس کی زندگی میں شامل ہوئی تھی۔

ایک بے حد مضبوط اور اٹوٹ بندھن میں بندھ کر۔

مگر اس رشتے میں نہ چاہ تھی نہ طلب۔

بس ضرورت کا رشتہ تھا... ضرورت... جو دونوں جانب ایک سی تھی۔ کچھ لو اور کچھ دو کے اس رشتے میں اس نے مرد ہونے کے ناتے بس لیا ہی لیا تھا۔ منزہ جس ضرورت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس رشتے میں بندھی تھی وہ ضرورت عرصہ پہلے دم توڑ چکی تھی۔

اور اس عورت نے خالی ہاتھ، خالی گود ہونے کے باوجود جس اعلیٰ ظرفی اور کشادہ دلی سے اس کی ضرورتیں پوری کی تھیں، وہ تمام ضرورتیں جو اسے یہاں تک کھینچ لائی تھیں، وہ ان گزرے سالوں میں اس کا گرویدہ ہو گیا تھا۔

لیکن محبت کے بجائے وہ ایک عجیب سا ممنونیت بھرا احساس تھا جو اس کے دل پہ غالب رہا۔ وہ اسے ہمیشہ بہت اونچی لگی اور محبت تو ان سے کی جاتی ہے جو دل کے قریب ہوں۔ اتنی اونچی مسند پہ بٹھا دینے کے بعد تو صرف اس کی تعظیم کی جا سکتی ہے اور اس نے منزہ کے لیے ہمیشہ اسی جذبے کو محسوس کیا۔ یہ محبت کی ہری کونپل تو نئی پھوٹی تھی دل میں۔ عمر کے پچھلے دو برس میں۔ شادی کے پندرہ سال بعد اسے اپنی چھیالیس سالہ بیوی سے یکایک بڑی طوفانی سی محبت ہو چلی تھی۔

بڑی نوخیز... بڑی بھرپور... بڑی چنچل محبت۔

اور نوعمری کی محبت کی طرح وہ اب تک اس کا اظہار کرنے کی ہمت نہ پا رہا تھا خود میں۔

"کیا دیکھ رہے ہیں؟"

"تمہیں۔" اس کے سوال پہ نوید نے برجستہ کہا۔ "اور کیا ہے یہاں دیکھنے کے قابل۔"

وہ شرما کے رہ گئی۔ عادی نہیں تھی اس کی جانب سے ایسے فقرے سننے کی مگر لگتا تھا اب عادی ہونا پڑے گا۔ پچھلے کئی روز سے وہ ایسی ہی شوخیوں پہ آمادہ نظر آ رہا تھا۔

"اتنے سال گزر گئے منزہ ابھی نہیں بدلیں۔"

"جانے یہ تعریف تھی یا کچھ اور۔" وہ سوچنے لگی۔

☼ ☼ ☼

"یہ اوپر والے کو کیا ہوا؟"

وشی نے گھر میں داخل ہوتے ہی منہ اونچا کر کے حیرت سے چلایا۔

"بچے، اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔ شاید تمہیں پتہ نہیں، اس لیے اچانک رسید ہونے پہ ہڑبڑا اٹھی ہو۔"

حسن نے کمپیوٹر سے ذرا کی ذرا توجہ ہٹا کے کہا۔

"میں اوپر والے کی نہیں حسن بھائی! ان اوپر والوں کی بات کر رہی ہوں۔"

اس نے نظریں اور انگلی دونوں اوپر کی جانب اشارہ کر کے جواب دیا۔

"میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ یہ اوپر والوں کو کیا ہوا ہے۔ بریانی کی خوشبو وہ بھی اوپر والے کچن سے۔"

وہ اپنی حیرت کی شدت سے بے ہوش ہی ہونے والی تھی۔

"السلام علیکم۔ امی کیا پکا ہے؟"

حسان نے اندر داخل ہوتے ہی اپنا روزانہ کا سوال کیا۔

"امی گھر پہ نہیں ہیں۔ بھنڈی گوشت اور آلو کی بیسن والی ٹکیاں ہیں۔ تل دوں؟"

پروین کی غیر موجودگی میں شروع سے ہی حسن نہ صرف بڑے بیٹے اور بڑے بھائی کی ذمہ داریاں نبھاتا آیا تھا، کبھی کبھی بوقت ضرورت بیٹی اور بہن کی کمی بھی بغیر کسی شرم یا جھجک کے پوری کر دیا کرتا تھا۔

"تل دے... آپا..." وصی نے گردن اونچی کر کے ندا کو آواز لگائی۔ "بریانی پک رہی ہے کیا؟"

"ہاں... بس دم پہ ہے۔"

اس کی جوابی چیخ سنائی دی۔

"حسن بھائی! میں آج کھانا اوپر کھاؤں گا۔ بریانی پکی ہے۔" وہ ایسے بولا جیسے کسی ناقابل یقین کرشمے کا ذکر ہو۔

"کبھی بریانی کھائی نہیں کیا؟" حسن کو اس کا ندیدا پن کھٹکا۔

"ہفتے میں دو بار تو پک ہی جاتی ہے۔ ابھی پرسوں ہی تو تم نے ٹھونسی ہے۔"

"ہاں مگر اس بریانی کی بات ہی اور ہے۔ یہ اوپر والوں کی بریانی ہے۔ روز روز کھانے کو نہیں ملتی اور نہ ہر کسی کو کھانے کو ملتی ہے۔"

وہ تیزی سے دو دو سیڑھیاں پھلانگتا اوپر چڑھا۔

"تمہارے لیے لاؤں کھانا یا تمہیں بھی اوپر سے امید بندھی ہے۔" اب کے اس نے اکتائے ہوئے انداز میں حسان سے پوچھا جو کہ مچھ کی طرح صوفے پہ الٹا ڈھیر تھا۔

"کون اوپر چڑھے۔" وہ انگڑائی لیتے ہوئے بولا۔

"نیچے ایک آدھ پلیٹ بھیج دی تو الگ بات۔"

"ہاں بھیجتے ہیں نا اچھی طرح۔ وہ جو دادی جان کے لیے ایک پلیٹ آجاتی ہے نیچے آج وہ بھی وصی کے بار جا کے تناول فرمانے پہ نہیں آنے والا۔"

اس نے "تناول فرمانے" پہ خاصا زور دیا اور بڑی مہارت کے ساتھ کڑاہی میں گرم ہوتے تیل میں بیسن کا چھینٹا ڈال کر اندازہ کر رہا تھا کہ آلو کی ٹکیاں ڈالے یا نہیں۔ پروین جاتے ہوئے روٹیاں پکا کے ہاٹ پاٹ میں رکھ گئی تھیں۔

"امی گئی کہاں ہیں؟"

"دادی جان کے ساتھ کسی جاننے والے کے ہاں شاید میلاد شریف ہے۔"

اب وہ سلیقے سے ٹرے میں چٹنی اور اچار کی پیالیاں سیٹ کر رہا تھا۔

"جلدی سے کھاؤ اور اکیڈمی سدھارو۔ یہیں کھانے کے لڑھک مت جانا۔ پیٹ بھرنے کے بعد بڑی نیند آتی ہے تم پہ۔"

"آپ کے ہوتے کوئی مر نہیں سکتا سونے کا خاک۔"

وہ بھوک سے بے چین کچن میں چلا آیا اور دیگچی میں چمچہ ہلا کے بھنڈیوں پہ ستم ڈھانے لگا۔

"تیرا بیڑا غرق ہو سوئے..." حسن نے لتے پہ دھکا دے کر پرے کیا۔

"اتنی محنت سے امی کھڑی کھڑی بھنڈیاں پکا کے گئی تھیں اور تو لگا ہے ملیدہ کرنے۔ تمہیں پتہ تو ہے امی اس معاملے میں کتنی سخت ہیں۔ انہوں نے سبزی کا یہ حشر دیکھ لیا تو..."

"اف..." وہ کانوں پہ ہاتھ رکھ کر کچن سے بھاگا۔

اوپر وصی بے چینی سے بریانی کے دم کھلنے کا انتظار کر رہا تھا۔

کہیں میرا دم نہ نکل جائے... لے بھی آؤ... صبح ناشتے میں بھی بس ڈبل روٹی پر اٹھا کھایا تھا اور وہ بھی

"ارے... کے ساتھ... قسم سے ممانی! ایک ملا ہوا انڈا سامنے دیکھ کے پیٹ میں آگ لگی جیسے میں آپ کے گھر نشہ

بچے انڈے کے ساتھ۔ میں تو ایک پراٹھا دو انڈوں کے ساتھ بمشکل ختم کرتا ہوں۔ وہ پراٹھوں کے ساتھ تم از کم تین چار

ہوتا ہوں۔ میں تو ایک پیالہ دہی اور ایک پلیٹ سالن تو ہو گر میری قسمت۔ رات کو چھوٹی ممانی سالن فریج میں رکھنا بھول

گئی۔ ایک پیالہ دہی اور تو اور ماموں جو ناشتے کا سامان لائے وہ بھی باہر ڈائننگ ٹیبل پہ پڑا رہ گیا۔ گرمی

صبح تک خراب ہو گیا اور تو اور ماموں جو ناشتے کا سامان لائے... بھی خراب نکل آئے۔ آپ کے ہونے کا بھی کوئی فائدہ نہیں ممانی! بندہ ضرورت کے وقت

کچھ انڈے... بھی خراب نکل آئے۔ مگر مجھے پتہ ہے کہ آپ رات کو بھی سالن ناپ کے بناتی ہیں۔ آخری نوالہ

بھی آپ پڑوس سے ہی مانگ لیتا ہے۔ اس کی زبان فراٹے بھر رہی تھی اور رخشندہ صبر کے گھونٹ

بھی ماں۔ اور انڈے بھی گن کے آتے ہیں۔" "اور انڈے تو نہیں آئے۔" انہوں نے روٹھے لہجے میں کہا۔ "تو اتنی دودھ لسی وغیرہ کے ساتھ

لیتی ہیں... ہاں انڈے تو نہیں آئے۔" انہوں نے روٹھے لہجے میں کہا۔

لیتے ہیں یا پھر جیم بریڈ وغیرہ۔ میرے بچوں سے گرم چیزیں برداشت نہیں ہوتیں۔"

"اور مجھ سے بھوک۔" وہ چلایا۔

"ظل الٰہی! بریانی۔" وہ کچن تک چلا آیا۔

"کتنی بار کہا ہے میرا نام ٹھیک طرح سے پکارا کرو۔" ظل ہما نے دیگچی کا ڈھکن ہٹاتے ہوئے ٹوکا۔

"اچھا میں مکس کرتا ہوں۔" وہ بڑا سا کفگیر اٹھا کے آگے بڑھا۔

"یہ چاولے میں چمچی یا پالی میں شربت مکس کرنے والا کام نہیں، سارے چاول ٹوٹ جائیں گے۔"

"نہیں ٹوٹتے بھئی۔ میں تو دیگ کی بریانی بھی مکس کر لیتا ہوں۔"

"پروین نے سارے لڑکیوں والے کر کھا دیے ہیں انہیں۔"

رخشندہ نے طنزیہ انداز میں کہا جسے وصی نے سراسر نظر انداز کرتے ہوئے بریانی ہلانے کی کوشش جاری رکھی۔

"میں اس صفائی اور مہارت سے چاول... مسالوں اور بوٹیوں کو ایسے... جیسی بولی ہے۔" اس قدر رو ٹھیلی...

"نکل آئی... لگی کی... جیسے کوئی چھیچھڑا۔ مگر وہ بھی کالا نہیں ہوتا ہے، اس کے چھلکے لٹک رہے ہوتے ہیں۔ کیا

یہ بھی کیا... کس چیز کا گوشت ہے؟"

پیچھے کے سرے سے ٹنگی مسالے میں لتھڑی چیز کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔

"یہ گوشت تھوڑا ہی ہے۔ یہ تو... یہ تو بینگن ہے۔"

ظل ہما نے کچھ اس انداز میں سرگوشی کی جیسے بینگن کوئی نازیبا یا معیوب قسم کا لفظ ہو اور اسے ادا کرنے میں اسے حیا مانع آرہی ہو۔

"بینگن۔" وہ صدمے سے چلا اٹھا۔ "یعنی کہ بینگن... جس کا رنگ شرمناک حد تک جامنی ذائقہ افسوس ناک حد تک پھیکا اور سرے پہ ایک انتہائی بھدی سی ڈنڈی ہوتی ہے 'وہ والا بینگن؟"

اس نے مکمل تشریح بیان کی اور ہما کے مجرمانہ انداز میں اعترافی سر ہلانے پہ وہ ہاتھ میں پکڑا چمچہ پٹخ کے رہ گیا۔

"یہ بینگن کی بریانی کب سے بننے لگی۔ بھئی یہ تو سنا تھا۔ اب بھئی کیا مرغی کا بنا کرے گی۔ اونہہ! بریانی بنانے کا حوصلہ کر ہی لیا تھا تو چکن بریانی بناتیں۔"

"زیادہ گوشت صحت کے لیے کتنا نقصان دہ ہے اس کا اندازہ بھی ہے تمہیں۔"

رخشندہ نے ناگواری سے ٹوکا۔ انہیں وصی کے طنز جتنے برے لگ رہے تھے اتنی ہی ظل ہما کی شرمندگی کھل رہی تھی۔

"سبزیاں کھانے سے بیماریاں دور رہتی ہیں۔"

"بیٹی! زیادہ گوشت نقصان دہ ہے مگر کم گوشت تو..." وہ بڑبڑا کے رہ گیا۔ یہ اس کی پروین ممانی نہیں تھیں جن کے سامنے وہ بے تکان بے دھڑک بولتا چلا جاتا۔ رخشندہ ممانی کے ماتھے کی چتون اسے ایسے ہی بریک لگا دیا کرتی تھی۔

"ارے لو۔" وہ سر پہ ہاتھ مار کے رہ گئیں۔ "ایک تو کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ بھلا ہوا کہ میں نے تم کو پوچھ لیا۔ اٹھا نہیں جا رہا تھا اپنی جگہ سے... ورنہ دل میں کئی بار آئی کہ جا کے ان خاتون سے اس بارے بات کروں...."

"یہ بھی شکر ہے کہ آپ سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔"

وہ ذرا سا ہنسیں پھر ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"بڑی خاموشی ہے۔ حسن تو کھانے کے فوراً بعد فیکٹری چلا جاتا ہے۔ مگر حسان اور وصی کے ہوتے ہوئے خاموشی؟"

"دونوں میں سے ایک ضرور سویا ہوگا' ورنہ خاموشی ہو تو نہیں سکتی۔"

"نانو۔" وصی کمرے سے برآمد ہوا اور دوڑ کے ان کے گلے لگ گیا۔ بچپن کی عادت تھی۔ چاہتے ہوئے بھی جاتی تھی۔

"حسان کہاں ہے؟" پروین نے پوچھا۔

"اکیڈمی...."

"ارے ہاں۔ حسن نے بتایا تو تھا کہ اسے کسی اکیڈمی میں داخل کروایا ہے۔ اللہ کرے اس میں ہو جائے۔"

"آمین۔" شوکت جہاں کے کہنے پہ پروین نے دزدیدہ نظروں سے ان کی گود میں منہ چھپائے لیٹے وصی کو دیکھا جو حسان سے چند ماہ ہی چھوٹا تھا مگر امتیازی نمبروں سے بی اے کرنے کے بعد اب مختلف یونیورسٹیوں سے رابطے میں تھا۔ کبھی ایم بی اے کرنے کا ارادہ باندھتا۔ کبھی سی ایس ایس کی تیاری کرنے کا مشورہ تھا اور سب جانتے تھے کہ وہ کچھ بھی کرے۔ کسی بھی میدان میں جائے۔ جھنڈے ہی گاڑے گا۔ اور حسان... شروع سے پڑھائی کی جانب اس کا رجحان کم تھا۔ سادہ سا بی اے بھی اب سے پچھلے دو سالوں سے ہو ہی نہیں پا رہا تھا۔

حسن کے ذہن میں ابتدا سے ہی یہ خیال پختہ تھا کہ بڑا بیٹا ہونے کے ناتے اس نے سراج الدین کا بزنس سنبھالنا ہے اس لیے ڈاکٹر' انجینئر' وکیل یا پائلٹ بننے کا کوئی خواب بچپن سے ہی اس نے نہیں دیکھا۔ بی ایس سی کے بعد ٹیکسٹائل ڈیزائننگ کے چند کورسز کیے ڈپلومے لیے اور باپ کی فیکٹری سنبھال لی مگر اس کا جتنا بھی تعلیمی ریکارڈ رہا بہترین رہا۔ ایسے میں حسان کی جانب سے پروین کو ہمیشہ مایوسی ہی ہوتی اور یہ مایوسی اس وقت شرمندگی اور دبے دبے غصے میں بدل جاتی جب حسان کا مقابلہ دانستہ نادانستہ وصی سے کیا جاتا۔

☼ ☼ ☼

"آج ذرا جلدی گھر آ جائیے گا۔"

عرصہ دراز کے بعد اس کی جانب سے ایسا کوئی مطالبہ ہوا تھا۔ اگرچہ لہجے میں وہ بشاشت اور گرم جوشی سرے سے مفقود تھی جو یہ فقرہ ادا کرتے ہوئے بیویوں کے لہجے میں در آتی ہے پھر بھی جعفر محمود نے بڑے تعجب سے اسے دیکھا۔

اپنی کہی بات کے برعکس اس کا چہرہ بے حد سپاٹ تھا۔

اس کے کسی انداز سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ اسے جعفر کے جلدی گھر آنے یا نہ آنے سے کوئی دلچسپی ہو۔ ہمیشہ کی طرح وہ مدیحہ کے یہ مستقل بے زار اور لاتعلق سے تاثرات دیکھ کر وہ چڑ گیا۔

"کیوں؟... کیا رکھا ہے یہاں... جو کوئی جلدی آئے۔"

یہ چڑ اسے ایسے ہی دل جلے فقرے ادا کرنے پہ مجبور کرتی تھی۔ "شام کو مجھے خاصی مصروفیت ہے۔ جلدی نہیں آ سکتا۔ آنا تو پڑے گا۔ جس سے ملنے کا وعدہ کیا ہے وہ کہیں بھاگی تو نہیں جا رہی' کل پرسوں کا وقت دے دیجئے

...سکون سے کی بات اسے بھسم کر گئی۔

...بے حد ... کچھ لوگ آ رہے ہیں۔ اب ظاہر ہے آپ کو یہ بتاتے ہوئے شرم آتی ہوگی کہ آپ ایک نہیں ... بیٹیوں کے باپ ہیں' جن میں سے ایک کے رشتے کی بات آج چلنے والی ہے۔ اس لیے کوئی اور ...

"... اب تو بس کر دو۔ خدا کے واسطے۔"

... جعفر نجانے کیسے ٹوٹے ہوئے انداز میں اس کے سامنے گڑگڑا اٹھا۔

... تم سے کہہ رہا ہوں کہ تم ایک نہیں تین تین... جوان ہوتی بیٹیوں کی ماں ہو جن میں سے ایک ... آج ہونے جا رہی ہے۔ میری عمر کا نہیں' اس بات کا ہی لحاظ کر لو۔"

...

... رشک و حسد سے بھرپور نظر سامنے کھڑے اس ترپن سالہ مرد پہ ڈالی جو اس کا شوہر تھا۔ اور جس پہ عمر ... اپنی تیزی اور بے رحمی سے واضح نہیں ہوئے تھے جیسے خود اس پہ ہوئے تھے۔ اسے دیکھ کر تو ایسا لگتا ... گزرتا سال اسے بری طرح روند رہا تھا حالانکہ عمر میں وہ جعفر سے چند برس چھوٹی ہی تھی۔ مگر ... بے اطمینانی اور اندر ہی اندر کڑھنے کی عادت اسے کھا گئی تھی۔

"... آپ بھی ہونے دیں کے اپنی عمر کو... آپ کیوں نہیں لحاظ کرتے اپنی عمر کا۔ چھوڑیں بال ڈائی کرنا ... بغیر ہی لگا کے چلے جائیں۔ کبھی پرفیوم کا اسپرے کرنا ہی بھول جائیں۔ مگر نہیں... آپ سب ... بیوی بھی۔ بیٹیاں بھی۔ مگر خود پہ توجہ دینا نہیں بھول سکتے۔ خود پہ توجہ دیں گے تو دوسرے آپ پہ ... دیں گے ناں۔"

"... نہیں بدل سکتیں... مدیحہ... کبھی نہیں۔"

... سے کہتے ہوئے ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

"ماما..." دوسرے دروازے سے چپکی کھڑی تقدیس نے اندر جھانکا وہ کوئی بات کرنے آئی تھی مگر ماں باپ کی ... سے گھبرا کے وہیں رک گئی تھی۔

"... کیا ہے؟"

مدیحہ کا سارا دھیان اب نیچے کی جانب تھا۔ وہ کھڑکی سے نیچے ڈرائیو وے میں جھانک رہی تھیں جہاں جعفر ... غصے کے عالم میں چلا ہوا نظر آ رہا تھا' ڈرائیور کے دروازہ کھولنے... جعفر کے آف موڈ کے ساتھ اس میں ... گاڑی کے گیٹ سے نکلنے تک وہ مستقل پردہ ہاتھ میں تھامے وہیں کھڑی رہیں۔

"... پوچھ رہی ہیں' چائے کے ساتھ کیا کیا تیار کرنا ہے' بتا دیں۔"

... گاڑی کے نظروں سے اوجھل ہونے پہ وہ مکمل توجہ دینے کے قابل ہوئیں۔

"... سے کچھ سامان آ جائے گا۔ پیسٹری' پیٹیز' نمکو اور ڈونٹس وغیرہ۔ شامی کباب کا مسالا میں نے رکھ دیا ... خود تیار کر لوں گی' چاٹ اور ذرا تلنا تم تیار کر لو۔ اور تحریم سے کہو اسے زیادہ سر کھپائی کی ضرورت نہیں ... چکن ہو تو وہ خود تیار کر لے۔ اچھے بناتی ہے۔ اس سے زیادہ ضرورت نہیں کچن کے کام کرنے ... کروایا ہے اس کا... ذرا دھیان سے اس کا کوئی ڈھنگ کا جوڑا نکال دینا اور بال وغیرہ بنوا دینا... ... سے ایک مکمل ہاں لگ رہی تھیں... اپنی عام سی شکل و صورت کی چوبیس سالہ بیٹی کے لیے فکر ...

... کوئی روپ پسند تھا۔

... مدیحہ اسے بے حد اجنبی لگا کرتیں۔

☼ ☼ ☼

"یہ وائٹ پنک سوٹ ٹھیک رہے گا۔"
اس نے ہینگر سے میرون پھولوں والا بے بی پنک سوٹ اتارنا چاہا۔
"نہیں تقدیس۔ یہ نہیں۔ بس یہ ہاں وہ اسکن کلر والا۔"
"یہ؟" تقدیس نے ناک چڑھائی۔
"ہاں، ویسے اس کا ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ خاصا کلرفل ہے۔ اور بھی زبردست لگتا اگر آپ میرون کے بجائے اس کے دامن پہ بھی کڑھائی کروا لیتیں۔ نہیں میں نہیں نکال رہی یہ۔ ماما نے کہا ہے آپ بہت ... لگنا چاہیے۔"
"یہ نہ تمہارے بس میں ہے نہ میرے بس میں۔"
تقدیس کی عام سے انداز میں کہی بات اسے بری طرح چبھی تھی اسی لیے وہ آزردگی سے کہہ اٹھی۔
"کیا ہے آپا؟ ...... کیوں اتنے عجیب و غریب اور بے بنیاد کمپلیکس پال رکھے ہیں آپ نے ... ناک والی، سیاہ رنگت والی۔ سب کی سب پوری زندگی سے ہر قسم کا فیشن کرتی ہیں اور کیوں نہ کریں ... ہر لحاظ سے خوشی کشید کرنا ان کا بھی حق ہے اور آپ۔ آپ میں ایسی کون سی کمی ہے جو آپ اپنے ... کرتی رہتی ہیں۔ اچھی بھلی تو ہیں۔ اور بھی اچھی لگیں گی اگر یہ خود ساختہ خول توڑ کے اعتماد سے جینا سیکھیں۔"
اس سے پورے چار سال چھوٹی ہونے کے باوجود وہ اکثر اس کے لیے ناصح کا کردار بھی ادا کیا کرتی۔ جس کا کوئی اثر تحریم پہ پڑتا نظر آئے یا نہ آئے۔
"توبہ۔ تم تو شروع ہی ہو جاتی ہو۔ موقع ملنا چاہیے بس۔"
وہ جھنجلا گئی۔ "میں نے صرف اتنا ہی تو کہا ہے کہ میں پنک سوٹ نہیں پہنوں گی۔"
"کیوں نہیں پہنیں گی۔" اس نے جرح کی۔
"مجھ پہ یہ کلر سوٹ نہیں کرتا۔"
"کس نے یہ کہا آپ سے؟ نہیں ناں۔ اپنی طرف سے فرض کر کے بیٹھ گئی ہیں۔ اتنا اچھا لگتا ہے یہ رنگ تو گندمی رنگت پہ۔"
"نہیں، پنک کلر صرف سفید رنگت پہ جچتا ہے۔"
"اُفوہ۔ آپ کو سمجھانا مشکل ترین کام ہے۔ لیں بھئی، ٹھیک ہے۔ پہن لیں یہ اپنا اسکن کلر کا سوٹ۔ آپ کو تیار میں خود کروں گی۔"
اس نے تحریم کے نہ نہ کرنے کے باوجود اس کے لمبے سلکی بالوں کی اونچی سی پونی کر کے کھلے چھوڑ دیے۔ میچنگ کلر نگینوں والے چاندی کے آویزے پہنائے۔ ایک کلائی میں سادہ کانچ کی تین چار رنگوں کی چوڑیاں۔ تحریم کے لانبی انگلیوں والے گندمی ہاتھ اسے بے حد پسند تھے۔ فراغتی روان ہے۔ مگر دل سے بھی تعریف ... تحریم کو لگا وہ اسے بنا رہی ہے۔ ان ہاتھوں کے سادگی سے ترشے ناخنوں پہ ڈیپ میرون نیل پالش لگا کے گویا انہیں مکمل طور پہ سجا دیا۔ ہلکا سا میک اپ۔ جو پاؤڈر، نیچرل کلر لپ اسٹک اور بلیک آئی لائنر تو تحریم کو نیا روپ دے گیا۔
"کیا دیکھیں۔ ذرا سا خود پہ توجہ دیں لیں آپ تو کیا سے کیا بن جاتی ہیں۔ پتہ نہیں کیا ... جوڑے لپیٹے رکھتی ہیں یا کس کے چٹیا۔ منہ بھی دھلا دھلا ایک برابر۔ کتنا کہتی ہیں ماما کہ اور کچھ نہیں تو کاجل ہی لگا لیا کریں۔"
"تقدیس۔ مجھے بے حد گھبراہٹ ہو رہی ہے۔"
اس میں آئینے کے عکس نے بھی اعتماد پیدا نہ کیا تھا۔

"... گھبرانے والی کون سی بات ہے۔ پہلے بھی تو دو بار یہ پریڈ کر چکی ہیں آپ۔"
"... اگر اس بار بھی ریجیکٹ کر دی گئی تو؟"
"... یہ بات ذہن سے نکال دیں کہ آپ ریجیکٹ کر دی گئی تھیں۔ پہلے والے رشتے پہ پاپا کو بھی اعتراض تھا ... معمولی تعلیم یافتہ تھا اور دوسرے میں ماما کو یہ برائی نظر آئی تھی کہ فیملی بہت بڑی تھی۔ اور بہت ... قسم کی عورتیں تھیں۔ بقول ماما کے، تحریم کو بھون کے کھا جاتیں اس کی نندیں اور جٹھانیاں۔"
"... یہ سب دل رکھنے کے لیے ماما پاپا نے کہا ہوگا۔ ورنہ اصل میں تو۔"
اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔
"چلیں۔ چھوڑیں۔ آپ نے بھی یقین کیا ہے کسی بات کا۔" تقدیس کو بھی غصہ آ گیا۔ "اور یہ والے جو لوگ ... پاپا کے جاننے والے ہیں۔ مسز خورشید کے گھر پارٹی پہ ملے تھے مجھے۔"
"... ؟" تقدیس نے اشتیاق سے پوچھا۔
"ہمارے ہونے والے جیجا جی؟"
"نہیں بھئی۔ ان کی بہنیں وغیرہ۔"
"... " وہ مایوس ہوئی۔
"... بہت خوبصورت ہیں۔ بڑی بڑی براؤن آنکھیں، سرخ و سفید رنگت، بھرے بھرے جسم۔ لانبے قد۔ ... بھائی جان بھی ویسا ہوگا۔"
"ضروری تو نہیں۔ اور ہو بھی تو اچھا ہی ہے۔ آج کل پتہ نہیں کیا رواج سا چل نکلا ہے۔ اتنی پیاری پیاری ... کے برابر میں پتا نہیں کیسے دلہا بٹھا دیتے ہیں۔ میں نے اپنی کزنز، کلاس فیلوز جس کے پاس بھی اس کی ... اس کے بہن بھائیوں کی شادی کی تصویریں دیکھی ہیں۔ سب میں ایک چیز کامن دیکھی۔ ... دولہا۔ چلو اچھا ہے۔ فرینڈ تھوڑا سا بدلے گا۔"
"... اگر وہ اتنا ہی اچھا ہوا تو مجھے کیوں پسند کرے گا بھلا۔"
"... آپ تو۔" مارے جھنجلاہٹ کے اس سے کچھ کہا نہ گیا اور وہ ڈریسنگ ٹیبل پہ برش پٹخ کے کھڑی ہو گئی۔
"... میں جا رہی ہوں۔ آپ کا تو کچھ ہو نہیں سکتا۔ جا کے ذرا کچن کی تو خبر لوں۔"
اس کے نکلنے کے بعد تحریم نے تھوڑا آگے ہو کر غور سے آئینے میں اپنا جائزہ لیا۔
"صاف کھلتی ہوئی گندمی رنگت۔ مگر عام سے نقوش جن میں کم از کم اسے تو کوئی جاذبیت نظر نہیں آتی تھی۔ ... آنکھیں، پتلے پتلے ہونٹ۔ قدرے پھیلا ہوا دہانہ۔ ناک متوازن تھی مگر چہرے کی ساخت لمبی ہونے کی ... ناک ضرورت سے زیادہ تیکھی لگا کرتی۔ اس میں مدیحہ کی خاصی مشابہت نظر آتی تھی۔ ... تھا کہ مدیحہ کا جسم شروع سے بھرا بھرا تھا اور اب عمر کے ساتھ ساتھ وزن میں مزید اضافہ ہوا تھا۔ اس ... دیکھنے والوں کو یہ مشابہت صاف محسوس ہوتی تھی۔ مدیحہ کے چچا، خالائیں وغیرہ تو جب تحریم کو دیکھتے ... کی ہو بہو ... قرار دیتے۔ اور تحریم بجائے اس بات پہ مسرور اور نازاں ہونے کے بجھ سی جاتی۔ اس نے ... بدصورتی کے دکھڑے روتے سنا تھا۔ کم عمری میں ہی یہ بات اس کے دل و دماغ میں گھر کر گئی تھی۔ ... میں باپ کا نہیں زیادہ وجیہہ ہونا بلکہ تعلیم اور ذہانت کے لحاظ سے برتری رکھنا بھی واضح طور پہ ... تھا۔ اور اس کے خیال میں ان دونوں کے درمیان ذہنی مطابقت نہ ہونے کی سب سے بڑی وجہ یہی ... اس نے از خود فرض کر لیا تھا کہ چونکہ اس کے پاپا کو اپنے معیار اور مقابلے کی شریک حیات نہیں ... ماما کے ساتھ کبھی خوش نہیں رہ پائے۔ اور ماما ... ان کا احساس کمتری انہیں پاپا کے مقابل ... وہ اپنے ساتھ ایسی کوئی بات دہرانا نہیں چاہتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا چیخ چیخ کر اعلان ... کہ میرے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش مت چھوڑو مجھے اس بھٹی میں جس میں میری ماں پچیں

سالوں سے جل رہی ہے مجھے یوں گھٹن کے زندگی نہیں گزارنی۔۔۔

مگر اس کی فطرت میں جرأت ہی تو نہیں تھا۔۔۔

سب سے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ شروع سے ہی ماں کے بہت نزدیک تھی۔ اس کے ہر درد سے آشنا، ہر دکھ سے آگاہ۔ اس کے تمام موسموں کی ساتھی۔۔۔

مدیحہ پچھلے دس بارہ سالوں میں جس قدر جتنا چلائی تھی۔۔۔ اتنا ہی تحریم کی آواز اندر ہی اندر گھٹتی چلی گئی تھی۔

مدیحہ نے جتنے آنسو بہائے تھے۔۔۔ اتنا ہی تحریم کو اپنے آنسو اندر اتارنے کی عادت ہو گئی تھی۔

جتنے اس نے تقدیر سے گلے کیے تھے۔۔۔ اتنا ہی تحریم کو سارے شکوے دل میں دبانے کا فن آ گیا تھا۔

وہ چاہ کے بھی دل کی بات زبان پہ لانے کا حوصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ اس نے بیڈ پہ رکھا اپنا موبائل اٹھایا۔ ڈائل میں Save واحد نمبر ملایا۔

"ہیلو!" وحید کی سوئی سوئی سی آواز آئی۔

"وحید۔۔۔ آپ سو رہے ہیں؟" تحریم نے بھیگی آواز میں گلہ کیا۔ اس کی جان پہ بنی تھی اور وہ۔۔۔

"ارے نہیں یار۔۔۔ اب کیا سونا۔۔۔ تم کہو۔" وہ لہجے میں بشاشت پیدا کرتے بول رہا تھا۔

"وہ۔۔۔ آج پھر گھر پہ کچھ لوگ آ رہے ہیں۔"

"او نو۔ پھر؟"

"پھر کیا؟۔۔۔ میں کیا کر سکتی ہوں۔"

"تم منع کر دو۔۔۔ ظاہر ہے تمہارے گھر والے تم سے پوچھیں گے تو سہی۔"

"اور اگر انہوں نے وجہ پوچھی!"

"وجہ؟۔۔۔ تم۔۔۔ تم کہہ دینا۔۔۔ کہ تم مزید پڑھنا چاہتی ہو۔"

"مگر مجھے آگے نہیں پڑھنا۔"

"جاب کرنے کا بہانہ بنا دینا۔۔۔ کہہ دینا تمہارا دل چاہتا ہے کچھ عرصہ انڈی پینڈنٹ رہنے کا۔"

"وہ نہیں مانیں گے۔"

"کیوں بھئی۔۔۔ لگتا تو نہیں کہ تمہارے گھر والے اتنے سخت اور پرانے خیالات کے ہوں گے جو تمہیں جاب نہ کرنے دیں۔"

"ہم رہتے الف میں ہیں وحید۔۔۔ مگر ہمارے گھر میں اب تک موضع کلالاں کے اصول اور روایات ہیں۔۔۔ میرے پاپا گھر سے باہر کچھ بھی ہوں مگر گھر کے اندر وہ چوہدری ہی ہوتے ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں ہم لوگ مگر ۔۔۔ کے علاوہ بھی۔۔۔ میرے جاب کرنے کی مخالفت تو سب اس لیے بھی کریں گے کہ سب کے خیال میں میں بہت زیادہ سادہ۔۔۔ بلکہ بے وقوف ہوں۔۔۔ مجھے نہ زمانے کی چال کا پتہ ہے نہ لوگوں کی پہچان ہے۔"

"ہاں۔۔۔ وہ تو ہے۔" وحید بڑبڑایا۔۔۔ پھر سنبھل گیا۔۔۔

"تو اور کیا راستہ ہو سکتا ہے ان چاہے مہمانوں سے نمٹنے کا۔"

"یہ سوچنا تو آپ کا کام ہے۔" وہ دبے دبے انداز میں کچھ جتا گئی۔

"ہاں۔۔۔ کر رہا ہوں نا تمہیں بس تم اس بار کسی طرح ٹال دو ان کو۔۔۔ آگے کے لیے میں وعدہ کرتا ہوں کہ۔۔۔"

"اچھا۔۔۔" تحریم نے ایک گہری سانس لی۔

"اب تو یہی امید کر سکتی ہوں کہ یہ لوگ خود ہی مجھے ناپسند کر جائیں۔۔۔ مجھ سے تو کچھ نہیں ہو سکتا۔"

"تمہیں کون ناپسند کر سکتا ہے۔ کوئی اندھا ہی ہو گا۔"

وحید کے بجائے کوئی اور یہ بات کہتا تو تحریم سر جھٹک کے اسے جھٹلا دیتی۔۔۔ مگر وہ وحید تھا۔ جس کی آمنا و صدقنا کہہ یہ احمق لڑکی اب بھی شرما کے مسکرا دی۔

۔۔۔ کہیں آپ کو نظر نہیں ہو جاتی وحید۔"

۔۔۔ ابھی نہیں چاہتے۔۔۔ کیونکہ تم صرف میرے لیے بنی ہو۔"

۔۔۔ مہمان آ گئے۔"

۔۔۔ تھوڑی ہو کر کچھ کہنے ہی والی تھی کہ تطہیر نے اندر جھانک کر اطلاع دی۔

۔۔۔ چہرے پہ رنگ بکھر بکھر گئے۔۔۔

۔۔۔ آپ کتنی اچھی لگ رہی ہیں۔"

۔۔۔ تحریم کو وہ روپ عطا کیا تھا کہ وہ چونک کر سراہے بغیر نہ رہ سکی تھی۔

۔۔۔ بعد میں فون کرتی ہوں۔۔۔ کچھ مہمان آئے ہیں۔"

۔۔۔ تم اچھی لگ رہی ہو۔"

۔۔۔ ہنستے ہوئے انداز میں پوچھا اس طرح کہا کہ اسے ہنسی آ گئی۔

۔۔۔ کوئی حق نہیں سوائے میرے کسی اور کو اچھا لگنے کا۔۔۔ سمجھیں؟"

۔۔۔ چھوڑیں ناں فون۔۔۔ آئیں تو۔۔۔"

۔۔۔ پھر فون کرتی ہوں۔"

۔۔۔ نے جلدی سے موبائل دوبارہ بیڈ پہ پھینکا۔

۔۔۔ چلیں میں آتی ہوں۔۔۔ تطہیر کو کمرے سے چلتا کرنے کے بعد وہ دوبارہ آئینے کے سامنے آئی۔۔۔ ہونٹوں پہ لگی لپ اسٹک کو ٹشو سے رگڑ کے صاف کیا۔ کانوں کے آویزے اتار کے رکھے۔۔۔ لمبے بال جو پونی ۔۔۔ اونچے باندھنے کے باوجود کمر سے نیچے تک آ رہے تھے ان کو لپیٹ کر جوڑے کی شکل میں باندھا اور ۔۔۔ ایک تنقیدی نظر ڈالتی کمرے سے نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

۔۔۔ دوپہر کے سوا تین بجے گیٹ پہ کھڑا تھا۔

۔۔۔ اہٹ اور بے چینی اس کے ہر انداز سے جھلک رہی تھی۔

۔۔۔ بار اس نے سوچا کہ بائیک نکالے اور کالج تک ہو آئے۔۔۔

۔۔۔ تھوڑی دیر دیکھتا ہوں۔۔۔ شاید آنے والی ہوں۔"

۔۔۔ کا ماحول سنسان علاقہ۔۔۔ اور اس کی پیاری ندا آپی ابھی تک گھر تک نہیں لوٹی تھیں۔۔۔ ان کے ۔۔۔ ہمیشہ ڈیڑھ بجے باہر ہوتی تو وہ اتنا فکر مند ہوتا۔ مگر ندا جو کہنے کو سب سے بڑی تھی۔۔۔ ایک میچور تعلیم یافتہ ۔۔۔ اور پچھلے ڈیڑھ سال سے ایک پرائیویٹ گرلز کالج میں لیکچرار تھی یعنی عملی میدان میں بھی قدم رکھ چکی ۔۔۔ باوجود اس کی سادہ لوحی خطرناک حد تک برقرار تھی۔ یہی وجہ تھی گھر والوں نے اس کے بھرپور احتجاج ۔۔۔ کے پک اینڈ ڈراپ کے لیے وین کا بندوبست کیا تھا۔

۔۔۔ اب کیا میں ساری عمر کالج گرلز کی طرح وین میں آتی جاتی رہوں گی۔۔۔ میں اب لیکچرر ہوں۔۔۔ اسی وین ۔۔۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر آنا جانا کیا اچھا لگے گا؟"

۔۔۔ ہم آپ کو پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔"

۔۔۔ ہوتے ہو اجازت دینے والے؟ چھوٹے ہو مجھ سے۔"

۔۔۔ بابا۔۔۔

۔۔۔ بات کر رہی ہوں۔" وہ معراج الدین کی جانب متوجہ ہوئی۔

۔۔۔ میری جان بیٹا تم پبلک ٹرانسپورٹ سے آنے جانے کی عادی نہیں ہو۔ ہمیشہ سے میں ہی تم لوگوں کو

فائدہ۔"

"تو بس بس کرو وصی۔۔۔ اور خبردار میرے پیچھے نہ آنا۔" تیز تیز قدموں سے سیڑھیاں چڑھتے ہوئے لمحہ بھر کو رک کر پیچھے مڑتے ہوئے اسے وارننگ دی۔

وصی نے بے ساختہ اپنا قہقہہ روکا۔

مگر تب وہ اپنی ہنسی روک نہ سکا۔ جب ٹھیک بارہ منٹ بعد وہ اوپر سے لٹکی اسے آوازیں دے رہی تھی۔

"وصی۔۔۔ ذرا آنا تو۔۔۔ بڑے مزے کی بات ہے۔"

وصی صرف اس کا بھائی ہی تو نہیں تھا' سب سے اچھی سہیلی بھی تھا۔

☆ ☆ ☆

اس کے ہاتھ میکانکی انداز میں شمشاد بیگم کی بے جان ٹانگ پہ متحرک تھے اور بے تاثر نگاہیں سامنے اسکرین پہ جمی تھیں۔ جیسے اس وقت اس سے اچھا منظر دیکھنے کے لائق ہی نہ ہو جبکہ اس کی ذہنی [illegible] سب پہ واضح تھی۔

شمشاد خاموش ہونٹوں مگر بولتی آنکھوں کے ساتھ مسلسل اسے تک رہی تھی۔ اس کی گدلی آنکھوں میں ایک تحریر نہیں تھی۔

مگر منزہ ان میں سے کسی ایک تحریر کو بھی پڑھنے پہ آمادہ نہ تھی۔

وہ کسی معمول کی طرح دن میں کئی بار اس کمرے میں آتی۔ کبھی اس کو دلیہ کھلانے' کبھی چائے پلانے' کبھی کپڑے تبدیل کروانے۔ کنگھا کر کے چوٹی بھی بنا دیتی۔ ہفتے میں ایک آدھ بار نہلا بھی دیتی مگر یہ معاملات جیسے وہ کسی روبوٹ کی مانند ادا کرتی۔ اس کی جانب دیکھنے سے بھی گریز کرتے ہوئے۔

اور شمشاد بیگم جس کی آواز کی گونج سے محلہ بھرا اٹھتا تھا اور جو پچھلے تین ساڑھے تین سالوں سے ایک لفظ تک بولنے سے بلکہ اپنے جسم کے دائیں حصے کو حرکت دینے سے ہی معذور تھی۔ وہ ایک بار۔۔۔ ایک بار پوری شدت سے بولنا چاہتی تھی۔ منزہ کو اتنا کہنے کے لیے کہ وہ اسے دیکھ تو لے' اس کی آنکھوں میں جھانک لے۔ مگر منزہ سب کچھ کرنے پہ تیار تھی' صرف اسی ایک بات کے لیے نہیں۔

"میں کبھی معاف نہیں کر سکتی' کچھ بھی نہیں۔ میری بیٹی مجھ سے دور ہی نہیں ہوئی' پرائی بھی ہو گئی۔ [illegible] نے پلٹ کر اتنے سالوں میں ایک بار مجھے نہیں پوچھا۔ شاید۔۔۔ شاید نفرت کرتی ہے مجھ سے اور ان سب [illegible] جو ہے' اس کو معاف کرنا۔۔۔ کتنا مشکل کام ہے یہ۔۔۔ یہ میں نہیں کر سکتی۔ خوف خدا سے لرزتے [illegible] اپنے تعلق کا لحاظ کرتے ہوئے میں اس کی ماں کی خدمت تو کر سکتی ہوں مگر معاف نہیں۔"

واش بیسن میں ہاتھ دھوتے ہوئے وہ یہی سوچ رہی تھی' جب اسے وشمہ کی آواز سنائی دی۔

"ماما۔۔۔ ماما۔۔۔ کہاں ہیں آپ؟"

شاید وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے دادی کے کمرے تک آئی تھی۔

منزہ نے دزدیدہ نظروں سے شمشاد بیگم کو دیکھا جو بڑی ترسی ہوئی نظروں سے پوتی کو دیکھ رہی تھی [illegible] کھڑی تو اس کے سامنے تھی' اسی کے کمرے میں مگر اس نے ایک بار بھی دادی پہ توجہ نہیں دی [illegible] آنے کے بعد وہ سارے دن کی روداد جب تک منزہ کو سنا نہ ڈالتی تھی' اسے گویا چین نہ پڑتا تھا۔

شمشاد بیگم کی پیاس دیکھ کر منزہ کے دل میں جیسے سکون سا اترا۔

اس نے ایک بار بھی وشمہ کو ٹوک کر دادی کا حال چال پوچھنے کا خیال نہ دلایا اور کیوں دلاتی۔ [illegible] تھی۔ یہی تو اس کا حاصل تھا۔

پندرہ سال کا حاصل۔ "آج تمہاری پسند کا کھانا بنا ہے۔"

"آپ میری پسند کا نہیں بنانا۔" وہ ناز سے مسکرائی اور بازو اس کے گلے میں ڈال دیے۔

"[illegible] میں نے اپنی [illegible] فرینڈز کو گھر بلایا ہے۔ صرف اور صرف آپ سے ملوانے کے لیے۔"

"[illegible] کے ساتھ کیا۔۔۔"

[illegible] ایک ساتھ کمرے سے باہر نکل گئیں اور شمشاد بیگم نے ادھ کھلے دروازے سے نظر آتی ان [illegible] کو چھپتے دیکھا۔ ایک سرد آہ بھری اور خالی خالی نظریں دوبارہ چھت پہ ٹکا دیں۔

□ □ □

اس نے ایک ایک کر کے اپنی انگلیوں سے بیش قیمت انگوٹھیاں اتاریں۔ اور ان پہ آئل آف اولے کا مساج [illegible]

پھر اس نے اپنا چہرہ ذرا سا اونچا کرتے ہوئے اپنی لانبی گردن کا آئینے میں جائزہ لیا۔۔۔ کہیں کوئی دھبہ نظر نہ آیا۔ وہ مسکرائی اور پھر روز واٹر میں بھیگی ہوئی کاٹن سے آنکھیں تھپتھپانے لگی۔

"ثریا۔۔۔!" اصغر نے جمائی کے لیے بھاڑ سا منہ کھولتے ہوئے اسے بھی پکارا۔

"چل اب بس کر۔"

اسے رنج کا زیادہ دیر آئینے کے سامنے بیٹھنا برداشت نہ ہوا۔ ایک وقت وہ تھا' جب وہ گھنٹوں اس کے سامنے [illegible] کی طرح گھٹنے موڑے بیٹھا رہتا۔۔۔ اس کی اداؤں اور حسن پہ قربان ہو جاتا۔ دل اب بھی اس کا اسیر تھا۔ اب بھی اس کی محض ایک جنبش ابرو پہ وہ کچھ بھی کرنے کو تیار ہو جاتا۔ لیکن وہ روپ' وہ حسن' وہ جوانی جس پہ وہ فدا ہوا تھا' وہی سب اب کھٹکنے لگا تھا۔ شاید اس لیے کہ برسوں پہلے دماغ کے سب دروازے اور آنکھیں بند کر کے صرف اور صرف دل کی مانتے ہوئے وہ جس عورت کو اپنے گھر اور زندگی میں لایا تھا۔۔۔ وہ اب بھی ویسی کی ویسی تھی۔ ویسی ہی حسین' ویسی ہی بھرپور۔۔۔ امنڈنے کو بے تاب' چھلک جانے کو بے قرار' جسم کا لوچ۔۔۔ آنکھوں کا [illegible] زلف و رخسار کا سحر بھی' وہی ادائیں۔ عمر نے جیسے اس کے ایک بال تک پہ کوئی اثر نہیں کیا تھا' اور خود [illegible] کی مشین میں ڈھل چکا تھا' ایک ایسی مشین جو کثرت استعمال کی وجہ سے اب گھرر گھرر کر کے چل رہا تھا۔ جس کے پرزے پرزے گھس چکے تھے۔

ایسے میں اسے اس عورت کا سنگھار' اس کا جوبن' کیا راحت دیتا' جو اب اس کے برابر کھڑی اسے صرف اور [illegible] احساس کمتری میں مبتلا کر رہی تھی۔

"اور کتنا وقت لگاؤ گی؟"

"کیا مسئلہ ہے اصغر۔ سو کیوں نہیں جاتے تم۔" اب وہ ناخنوں سے کیوٹکس اتار رہی تھی۔

"رات کے وقت میک اپ کرنا ضروری ہے؟"

"میں میک اپ نہیں کر رہی' اتار رہی ہوں۔" وہ بڑبڑائی۔

"[illegible] لگانے میں بھی دو گھنٹے' اتارنے میں بھی دو گھنٹے۔"

"حد ہے جہالت کی۔" وہ تلملا کے کھڑی ہوئی۔

اور اس وقت قطعی طور پہ بھول گئی کہ وہ خود لاہور کے شاہی محلے کے اس پار بنے اسٹیشن کے پاس والے پیلی [illegible] والے اسکول سے بمشکل میٹرک کر پائی تھی۔

[illegible] اصغر نے بھی پڑھا تھا۔ مگر دونوں میں فرق یہ تھا کہ وہ اتنا پڑھنے کے بعد کمانے میں جت گیا۔ اس نے [illegible] کمایا۔ ایک درمیانے درجے کے جنرل اسٹور کو۔ جو اس کا باپ بمشکل سے بنا پایا تھا' اس نے چند ہی [illegible] ایک نامور ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں تبدیل کر دیا۔ باپ کی اور مظہر کی زندگی میں ہی وہ اس کی دوسری برانچ [illegible] کھول چکا تھا اور اب ملک بھر میں یہ ڈیپارٹمنٹل اسٹورز کی سب سے بڑی چین تھی۔ اس کے علاوہ پلاٹ [illegible] بزنس' کاروں کا شوروم' غرض جس جس کام میں ہاتھ ڈالا۔ وہ سونے کا ہو گیا مگر خود اصغر بھٹی سونا

بن سکا نہ کندن۔۔۔ وہ اب بھی کچے لوہے کا ٹین ٹھن کرتا اب کھڑ باڑ ول تھا۔ نہ بولنے کا سلیقہ نہ پہننے اوڑھنے کا ڈھنگ۔۔۔ خیر پہناوا تو کسی حد تک ریتا نے بدل بھی ڈالا تھا مگر سلیقہ وہ چیز تھی جسے وہ گھول کے اصغر کے اندر انڈیل سکتی تھی۔ وہ اسے برانڈڈ سوٹس تو دلوا سکتی تھی مگر انہیں پہن کے باوقار انداز میں چلنا سکھانے سے یہ سکون نہ اس کے پاس وقت تھا نہ برداشت۔ کیونکہ اصغر ان معاملات میں انتہائی نالائق پھسڈی شاگرد تھا اور خفتی تیز وہ تھی۔

وہ بھی کسی بہت اچھے بیک گراؤنڈ سے نہیں آئی تھی بلکہ اصغر کی نسبت اس نے زیادہ فاقوں تنگ دستی اور معاشی و اخلاقی پستی کا بھی سامنا کیا تھا۔ اصغر گلیوں میں پلا تھا۔ معمولی تعلیم یافتہ باپ اور ان پڑھ ماں کا بیٹا تھا مگر آگے کی خوشحالی ضرور دیکھی تھی۔۔۔ جو وقت کے ساتھ ساتھ بڑھتی گئی۔۔۔ تعلیم حاصل کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی باپ نے مقدور بھر فراہم کر رکھے تھے۔ جن سے مظہر نے فائدہ اٹھایا اور نہ صرف کالج یونیورسٹی کے اعلیٰ تعلیم اور اچھی جاب حاصل کی بلکہ اپنی شخصیت کو بھی سنوار لیا۔ مگر وہ شروع ہی سے تعلیم کے میدان میں آگے نہ آسکا اس لیے زمانے کے رنگ ڈھنگ اپنانے اور نئے دور کے ساتھ چلنے کی صلاحیت خود میں پیدا نہ کر سکا اور یہی صلاحیت ریتا میں کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔

اس نے گندی، تاریک اور بدنام گلیوں میں پرورش پائی تھی۔۔۔ باپ کے نام پہ اس نے تیوریاں چڑھائے ہمیشہ زمانے بھر کے سگے مرد دیکھے تھے اور ماں کے نام پہ ایک ایسی عورت جو ہمیشہ اپنی سانولی رنگت، رقص نہ جاننے کی خامی اور انگوٹھے پہ ناچنے کا ماتم کرتی رہی۔ ان کے خاندان میں حسن کی جتنی زیادہ اور جتنی خوب صورت بیٹیاں ہوتیں وہی بھاگوان کہلاتا اور اس لحاظ سے اس کی ماں خود کو خاصا بدنصیب سمجھا کرتی تھی۔ جو دو مرد پالتی پالیوں کی طرح ماسٹر جی کے توڑوں اور طبلے والے کی تال پہ تھرکنے کے سبق لینے کے بجائے چار آنے کرائے پہ کہانیاں لا لا کے چاٹتی رہتی تھی۔۔۔ اور یہی کہانیاں ریتا کے دل و دماغ پہ حاوی ہو گئیں۔ وہ کسی اچھے اچھوتے گھرانے کی ہوتی تو یہ اثر یقیناً مثبت ہوتا مگر وقت آنے سے پہلے ہی وہ جان گئی کہ وہ کیا ہے، کس کی بیٹی ہے۔

اس نے حقیقت پسندی سے یہ تسلیم کر لیا تھا کہ وہ کچھ بھی کر لے کسی کہانی کی شہزادی کی طرح کوئی شہزادہ اس کے گلے میں مالا ڈالنے نہیں آئے گا۔۔۔ مگر وہ ان گندی گلیوں کا تعفن بھی نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس نے جس حد تک ہو سکا خود کو پالش کیا۔ بازار کی رونق وہ بھی بنی۔۔۔ رقص و سرود کی محفلیں اس نے بھی سجائیں۔ عشاق کی جیبیں اس نے بھی خالی کروائیں۔۔۔

مگر اپنے اسی افسانوی انداز میں۔۔۔ وہ کام وہی کرتی تھی جو اس کی ماں نانی کرتی آئی تھیں مگر ان کا رنگ ڈھنگ، زبان، پہناوا وہ نہ اپنا سکی۔۔۔ اسی انفرادیت کا پہلے جعفر اسیر ہوا اور پھر وہ خود جعفر کی اور اس اسیری و رہائی کے بیچ میں جب سارا خسارہ اس کے دامن میں آیا تب اسے پتہ چلا کہ وہ خود پہ کتنے بھی نفیس اور معطر پردے ڈال لے رہے گی وہی۔۔۔ ناچنے والی۔

تب اس نے اپنی حیثیت کو کیش کرایا اور اصغر جیسے مال دار مگر شریف اور خاندانی شخص کی زندگی میں آگئی۔ اس میں اضافی قابلیت یہ تھی کہ وہ حد سے زیادہ بے وقوف تھا۔ اور ریتا کے عشق میں اندھا بھی۔

ریتا نے اس کی بیوی بننے کے بعد وہ سب کیا جو کوئی بھی عام خاندانی شریف زادی کر سکتی تھی۔ ساس نندوں کو کانٹا سمجھا۔۔۔ تو وہ عام گھرانوں کی عورتیں بھی سمجھتی ہی ہیں۔ جٹھانی کو نکلوایا۔ وہ بھی طوائف ہونے کے ناتے نہیں ایک حریص اور حاسد عورت ہونے کے ناتے۔ وہ جو بیوہ ہونے کے باوجود اسے خود سے زیادہ باحیثیت اور بااعتبار لگا کرتی تھی۔ شاید اس لیے کہ وہ اس سے زیادہ تعلیم یافتہ تھی۔ اس سے زیادہ اچھے خاندان سے تھی۔ جس کی اس کے سسرال والے بھی عزت و تکریم کرنے پہ مجبور تھے حالانکہ اس کے سر پہ تو شوہر کا سایہ بھی نہیں تھا اور وہ شوہر کے ہوتے ہوئے "اس کے بل بوتے" زور زبردستی سے بھی اپنی عزت کروانے میں ناکام رہی۔ برداشت کرتی اسے۔۔۔ سو نکال دیا اسے اور اس کی یتیم بچی کو۔

شادی کے بعد اس نے رلوا کپ کا رنگ خود پہ سے اتارنے کی بھرپور کوشش کی تھی۔۔۔ اصغر سے وفادار رہی۔ جیسے ان سے کر سکتی یا نہیں اسے دل سے عزت دے سکی یا نہیں یہ الگ مسئلہ ہے۔ مگر کم از کم اپنی شادی شدہ زندگی میں دوبارہ کسی اور مرد پہ نظر نہ ڈالی۔ ہاں وہ جو عرصے سے دل کے اندر تھا جعفر محمود اسے نکال کر باہر بھی نہ پھینک سکی وہ اس کے دل میں موجود تھا مگر محبت بھری ایک یاد ان کے نہیں ایک پھانس، ایک کسک بن کے۔ اب وہ اصغر کے بچے پیدا کرنا چاہتی ہے بالکل کسی گھریلو وفا شعار بیوی کی طرح اور یہ کوشش کرتے کرتے وہ خود بھی بل میں یہ حسرت پال بیٹھی۔۔۔ ماں بننے کی۔

ایک اور شریف زادیوں والی خواہش۔۔۔ یعنی ماں بننا۔۔۔ طوائفیں بھی بھلا ماں بنتی ہیں وہ صرف بچے پیدا کرتی ہیں۔ اس نے بھی اسے پیدا کیا تھا مگر ماں بن کے پالا ہوتا تو زندگی کے ابتدائی اکیس سال اس نے ٹھوکروں میں نہ گزارے ہوتے۔ تیج اور اس جیسی کتنی ہی عورتیں تھیں۔۔۔ بدنصیب عورتیں جو مائیں ہوتے ہوئے بھی بائیاں اور آپا جی کہلاتی تھیں اور ریتا تو سچ کی ماں بننا چاہتی تھی۔

پھر اس نے کسی اچھی بیوی کی طرح اصغر کی اس بات پہ بھی خاموشی سے سمجھوتہ کر لیا کہ وہ باہر کا کوئی بچہ گود لینے کی بجائے مظہر کی بچی سوہا کو اپنا لے۔

اس نے سوہا کو کھلے دل سے اپنایا۔ کسی ماں کی طرح پالا۔۔۔ اس کی کسی فرمائش، کسی ضد سے یہ سوچ کر ہاتھ نہیں کھینچا کہ وہ کون سا اس کی سگی اولاد ہے۔ اب تو جیسے وہ خود بھی بھولنے لگی تھی کہ سوہا اس عورت کی بیٹی ہے جس سے کبھی ریتا نے نفرت کی تھی۔

اور کتنا بدل گئی وہ خود کو۔ اصغر کو یہ یقین دلانے کے لیے کہ وہ اب ماضی کی ریتا عرف رانی نہیں ہے جو آٹھ سو روپیہ فی ڈالر کے حساب سے نائٹ فنکشن کیا کرتی تھی۔ کیا یہ ضروری تھا کہ وہ برتن مانجھ کے ہاتھوں کی لکیروں میں کوئلے کی سیاہی اور ناخنوں میں ریت بھر لیتی۔ ایڑیاں پھٹ جاتیں۔ کمر کے گرد سائیکل کی ٹیوب کے برابر چربی کے ٹائر لٹکتے گردن سے گوشت ڈھلک کے چہرے کو بدنما کر دیتا "ماتھے سے بال اڑ جاتے" آنکھوں کے نیچے حلقے اور کالے گرداب بن جاتے تب جا کے اسے یقین آتا کہ ہاں ریتا نے حق ادا کر دیا بیوی ہونے کا۔

وہ خود سے غافل نہیں رہتی تھی۔۔۔ بس ایک یہی گلہ تھا اصغر کو۔۔۔ حالانکہ نوے فیصد شوہروں کو گلہ غافل ہونے کا ہوتا ہے کہ بیوی گھر داری میں مگن ہو کے خود کو بھول گئی ہے۔ وہ شاید خود کو ضرورت سے زیادہ یاد رکھے ہوئے تھی جو اصغر کو کھلتا تھا۔ اب تو اسے ریتا کے ساتھ کہیں جاتے ہوئے بھی عجیب سا لگتا۔ لوگ اسے ریتا کا ڈرائیور سمجھتے تھے "چاہے وہ کتنے ہی مہنگے لباس میں ہوتا۔ قیمتی سگریٹ بھی اس کے منہ میں دبا کے سونا لگانے کی وجہ سے بیڑی کا ٹوٹا لگنے لگتا۔

"اب تو مجھے صحیح طرح یاد بھی نہیں کہ تیرے بالوں کا اصل رنگ کیا تھا۔"

اصغر نے اسے شہد رنگت کاندھوں تک آتے لہریے بالوں کو نائٹ بینڈ میں لپیٹتے دیکھا تو رشک و حسد سے جلے بھنے لہجے میں کہا۔

"اور اصل رنگ کوئی تھا بھی یا نہیں۔" وہ یونہی ہنسا۔

"اور مجھے کون سا یاد ہے کہ تمہارے سر پہ کبھی بال تھے۔" ریتا نے کون سا ادھار رکھنا سیکھا تھا۔

"تجھے کبھی ہی یا نہیں۔"

اصغر اپنے ملنسار گنجے سر پہ ہاتھ پھیر کے رہ گیا۔

"کتنی بار کہا ہے کہ ہیئر ٹرانسپلانٹ کروا لو کتنا عام ہو چکا ہے اب۔"

"تم نے نہیں لگوانے گھوڑے کی دم کے بال۔" وہ بدکا۔

"بچوں جیسی باتیں۔ پتہ نہیں کس نے تمہارے دماغ میں یہ غلط اطلاع بھر دی ہے۔ ٹھیک ہے نہ لگواؤ۔۔۔ خدا کا واسطہ ہے وِگ ہی لگا لیا کرو۔ بڑی شرمندگی۔"

"تمہیں تو اب میرے ساتھ جانے میں ہی شرمندگی ہوتی ہے۔ چاہے وِگ کے ساتھ "چاہے وِگ کے بغیر۔"

اصغر کے دل کا ملال گویا ہوا۔

"یہ تمہارا اپنا احساس کمتری ہے۔" ریتا نے تنفر سے کہا۔ "جس سے تم مر کے بھی نکل نہیں سکتے۔"

اصغر کے دل کو دھچکا سا لگا۔

کتنی آسانی سے..... اور کتنی سفاکی سے وہ اس کے لیے لفظ "مر" استعمال کر گئی تھی۔ وہ جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا، عورتوں کو اپنے شوہر کے لیے ایسے الفاظ شاید کسی سے سننے کی بھی ہمت نہ ہو کجا کہ خود کہنا۔

"زندگی ختم ہو گئی ہے تمہارے ساتھ مغز ماری کرتے ہوئے۔ اتنے سال تو انسان کسی جانور کو سدھا لے تو وہ بھی انسان کی طرح دو پیروں پہ چلنا سیکھ لے مگر..."

اس نے سر جھٹکا اور زور زور سے گردن پہ موئسچرائزر کا مساج کرنے لگی۔

اصغر دکھ سے اسے تکتا رہ گیا۔ یہ وہی تھی جس نے اسے اصغر جی اصغر جی کہہ کے سر آنکھوں پہ بٹھایا تھا۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور سگریٹ سلگانے لگا۔

"ٹیرس پہ جا کے سگریٹ پیو۔ یہ بھی تمہیں روز بتانا ہوگا؟"

"میرا گھر ہے، جہاں میرا دل چاہے گا پیوں گا..... تمہیں کیا تکلیف ہے۔" وہ بھی بالآخر بھڑک اٹھا۔

"ٹھیک ہے۔" خلاف توقع وہ آرام سے اٹھی۔

"ٹھیک ہی تو ہے 'تمہارا گھر ہے۔" وہ اس کے مقابل آکھڑی ہوئی۔

"تو سنبھالو اپنے اس گھر کو۔ بس اس میں سے وہ سب نکال کر مجھے واپس دے دو جو میرا ہے۔"

"تمہارا؟"

"ہاں میرا..... یہ زندگی جو ان دیواروں میں نظر آ رہی ہے 'میری دی ہوئی ہے' ورنہ کیا تھا یہاں..... سوائے تمہاری ماں کے کوسنے اور بددعاؤں کے 'تمہاری پاگل بہن کی چیخ و پکار کے اور تمہاری بیوہ بھابی کے ماتم کے۔ یہ رنگ جو بکھرے ہوئے ہیں میرے ہیں۔ ورنہ کتنے لوٹے تھے تمہارے اس بنگلے کے بھائیں بھائیں کرتے خالی کمروں میں۔ ہونہہ۔ جن عورتوں کو بالوں میں ڈھنگ سے مانگ تک نہ نکالنی آتی ہو وہ کیا سنواریں گی گھر۔ اگر یہ تمہارا گھر ہے اصغر! تو اسے ویسا ہی بنا لو..... جیسا یہ میرے آنے سے پہلے تھا۔ اجڑا ہوا، بے رنگ و بے کشش۔ اور تمہیں پتا ہے ایسا کرنے کے بعد تم خود بھی ایک دن یہاں نہیں رہ سکو گے کیونکہ تم بھی اس لائف اسٹائل کو دیکھنے کے عادی ہو گئے ہو۔ بے شک اس لائف اسٹائل کو برتنے کے نہ تم عادی ہوئے ہو نہ تمہاری یہ اوقات ہو سکتی ہے مگر دیکھنے کے عادی تو ہو ہی گئے ہو۔ تمہارے دن رات کی روٹین اسی سسٹم کی محتاج ہو چکی ہے جو سسٹم میں نے اس گھر میں رائج کیا ہے ورنہ کیا تھا یہاں۔ ڈائننگ ٹیبل پہ گرد جمی رہتی اور روٹی پہ سالن ڈال کے کھایا جاتا..... ڈرائنگ روم میں ہزاروں لاکھوں کا فرنیچر پڑا اسٹر رہا ہوتا اور سارا خاندان آلتی پالتی مارے دھوپ سینک رہا ہوتا۔"

اس نے کمبل ایک جھٹکا دیا اور لیٹ کر کروٹ بدل لی۔ اصغر کے پاس کہنے کو کچھ نہ تھا۔
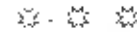
☼ ☼ ☼

"چائے دس پندرہ منٹ بعد لانا۔"

ریتا نے گریپ فروٹ جوس کے سپ لیتے ہوئے ملازمہ سے کہا۔

"لیکن میرا ناشتہ ابھی اور اسی وقت۔" سوہا ساتھ والی چیئر پہ دھپ سے آ کے بیٹھی تھی۔

"تم گھر پہ ہو؟" ریتا نے اسے تعجب سے دیکھا۔

"کالج نہیں گئیں آج پھر۔" خفگی جتاتے لہجے میں کہا۔

"آنکھ ہی نہیں کھلی....." لاپروائی سے کہتے ہوئے اس نے ماں کے سامنے رکھا اخبار اٹھایا اور کسی ہولناک سی ہیڈ لائن پہ ایک نظر ڈالتے ہی برا سا منہ بناتے ہوئے رہے کھنکاری۔

"رات کو دیر سے سونے کی عادت کب چھوڑو گی تم؟"

"کیا کروں ماما..... نیند ہی نہیں آتی۔ ناشتہ۔" بات کے اختتام پہ اس نے ایک بار صدا دی۔

"ابھی ہو تو تمہارے لیے؟"

"نہیں ماما! پلیز۔" سوہا نے ناک چڑھائی۔

"مجھے تو بہت برا لگتا ہے... بچپن کی عادت ہے اس کے بغیر ناشتہ 'ناشتہ نہ لگتا ہی نہیں۔"

...احساسات کی پروا کیے بغیر اپنی دھن میں کہہ رہی تھی اور ریتا کے چہرے پہ ایک رنگ سا آ کے گزر ... سوہا کے ماضی سے اس کے بچپن کو کھرچ کر نہیں پھینک سکتی تھی..... ماں کی گھٹی میں ڈالی ... نہیں بدل سکتی تھی۔

... مسکراتے ہوئے اس نے سراہا۔

... بات ہے ' بھی ایک ناشتہ ہی تو ڈھنگ کا کرتی ہو۔ اس کے علاوہ سارا دن کچھ کھانے پینے کا ہوش ... ہوتا نہیں۔"

... آیا تھا اور وہ رغبت سے پراٹھے اور آملیٹ سے انصاف کرنے لگی 'پھر اچانک اسے خیال آیا۔

"چاچو چلے گئے؟"

... ہوتے بھی اب ماما تھی... وجہ اس کا عدم تحفظ کا وہ احساس تھا جو اسے حصار میں لیے رہتا تھا اور اصغر ... ہونے کے باوجود چاچو ہی رہا کیونکہ اسے کوئی عدم تحفظ کا احساس نہیں تھا۔ سوہا اس کا خون تھی اور ... ثابت کرنے کے لیے اسے کسی اور رشتے کا نام استعمال کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔

"آپ کہیں جا رہی ہیں؟"

"ہاں....." ریتا نے کسی خیال میں گم مختصر جواب دیا۔

"میں بھی۔" اس نے باقی کا پراٹھا آملیٹ لپیٹ کر رول بنا لیا۔

"ہاں" اور ناشتہ تو سکون سے کر لو۔" ریتا نے ٹوکا۔

"راستے میں کر لوں گی۔"

"سنو سوہا! کہاں تک جانا ہے... دور جانا ہے تو ڈرائیور کو لے لو..... اکیلے مت جانا۔"

... نہ کہہ سکی کہ خود ڈرائیو نہ کرنا۔ کیونکہ سوہا جب بھی کار لے کر نکلتی ضرور ہی کہیں نہ کہیں مار کے آتی تھی ... کے باوجود وہ بالکل برداشت نہیں کر سکتی تھی کہ اس کی ڈرائیونگ کو برا کہا جائے۔

"اچھا ماما!" وہ کسی ہدایت کو خاطر میں لانے والی نہیں تھی۔ ریتا نے سر جھٹکا اور جوس پینے لگی۔ سوہا کی خود سری اور من مانیوں کی وہ عادی ہو چکی تھی۔ سوہا کو ان کا عادی اس نے خود ہی تو بنایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"عاطف کا کنسرٹ ہو رہا ہے پی سی بھوربن میں۔"

"اچھا..... لاہور میں کب ہوگا۔ پچھلے سال جب ہوا تھا اسی دن میری سسٹر کی شادی تھی مس ہو گیا۔"

... کرتی اس پونی ٹیل والی دبلی پتلی سی لڑکی نے مایوسی اور دل گرفتگی سے کہا۔

"... ابھی تک اتنا افسوس ہے کہ بتا نہیں سکتی۔ حالانکہ چانس میری اپنی تھی کہ کنسرٹ پہ نہیں جانا اور دو ... سارا لیے اٹینڈ کرنا ہے۔ اگر میری سسٹر کی میرج اک ایک سال بھی پیچھے جاتی تو شاید یہ کنسرٹ مس ہونے کا ... نہ ہوتا مجھے۔"

... بات پہ ان تینوں لڑکیوں نے کھل کے قہقہہ لگایا۔

"... بات تو اچھا تھا میں عاطف کا لائیو کنسرٹ ہی دیکھ لیتی تم لوگوں کے ساتھ۔"

"اور کیا ... اس سے بڑا کرنے 'لائف انجوائے کرنے کے مواقع تو کم ملتے ہیں۔"

ذرا سے بگل بیکرو والی بے تحاشہ گوری رنگت کی شیبا نے تھوڑا سا اضافہ کیا۔

"اپسیشلی تمہاری فیملی میں۔"

پھر سے قل قل کرتی ہنسی بکھر گئی۔

چیونگم چباتی پونی ٹیل والی سبیکا کے منہ میں چیونگم کی گردش ذرا کی ذرا تھمی۔۔۔ پھر وہ کھسیانے سے انداز میں ہنس پڑی۔ اس کی فیملی میں شادیوں کا ریکارڈ واقعی قابل رشک تھا۔ دوست کم کسی کی نہیں تھیں۔۔۔ بعض تو تین چار تک چلے گئے تھے۔

"ہالی وڈ اسٹارز کو مات دے دی تم لوگوں نے۔"

سانولی سلونی قیامت سے سراپے والی وریا نے قہقہہ لگایا۔ ہنستے ہوئے اس کی چھوٹی سی خوش نما ناک کے عین درمیان پھنسی چاندی کی نتھنی لشکارے مار رہی تھی۔

"سوہا نہیں آئی ابھی تک۔" سبیکا نے موضوع بدلنا چاہا۔

"سو رہی ہوگی۔" وریا نے قیاس کیا۔

"یار! میں عاطف کے کنسرٹ کی بات کر رہی تھی۔" شیبا نے جھنکتے ہوئے سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

"میری کزن ہے اسلام آباد میں۔۔۔ اس نے بتایا ہے وہ تو اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ اسی ویک اینڈ پہ نکل رہی ہے بھوربن کے لیے۔"

"اسلام آباد والوں کے عیش ہیں یار۔ ایک گھنٹے کی ڈرائیو پہ کیسے زبردست ڈیٹنگ پوائنٹس ہیں۔۔۔ سبز آجا کے وہی ہوٹلز اور ریسٹورنٹ۔"

"گیسٹ ہاؤس بڑائی کیا کبھی؟" وریا نے مسکراتی آنکھوں کے ساتھ پوچھا۔

اسے نت نئے تجربے کرنے کا شوق تھا۔

"اوہ نو۔۔۔ اٹس سو لو اسٹینڈرڈ۔" سبیکا نے ناک بھوں چڑھائی۔

"ویسے بھی وہاں پر ایسے ویسے لوگ جاتے ہیں۔"

"اور پولیس ریڈ بھی ہوتے رہتے ہیں۔" شیبا نے ان کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تمہیں خاصا شوق ہے ایسے ایڈونچر کرنے کا بٹ بی کیئر فل۔ ایسے کسی ریڈ میں پکڑی گئی تو۔۔۔" اس نے ہاتھ سے اوپر اٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

"کم آن یار! ایک تو اس کنٹری میں انسان اپنی مرضی سے لائف بھی انجوائے نہیں کر سکتا۔ میں تو کبھی بھی یہاں نہ رہوں اگر میرے پاس چوائس ہو۔"

"لو سوہا بھی آ گئی۔"

شیبا نے اسے گاڑی پارک کرنے کے بعد ہاتھ ہلاتے ہوئے یہیں آتے دیکھا تو جواباً ہاتھ ہلایا۔

"ہائے۔۔۔" وہ نزدیک آتے ہی ان تینوں کے گال سے گال مس کرتے ہوئے ملنے لگی۔

"اتنی لیٹ؟"

"اتنی نہیں صرف ایک گھنٹہ یار۔۔۔ ہم تھنکنگ فریش؟" اس نے وریا کا شولڈر بیگ اٹھا کے اپنی گود میں رکھا اور ہاتھ مار کے اس کی تلاشی لینے لگی۔

"ہاں عاطف کا کنسرٹ۔"

"ڈیم اٹ۔۔۔ اس میں فریش کیا ہے۔" آخر اس نے اپنی مطلوبہ چیز وریا کے بیگ سے برآمد کر ہی لی۔ سگریٹ کیس اور لائٹر۔

"کم آن شیبا۔۔۔ اب یہ ٹین ایجرز والی ایکسائٹمنٹ چھوڑ دو ان پاپ اسٹارز کے لیے۔"

"اور کیا انسان بریڈپٹ کے پیچھے مرے تو بات بھی ہے۔" بلیک چیزوں کے پیچھے جان چھڑکنے والی وریا نے کہا۔

ڈارلنگ کا بنفشہ انفارمیشن۔۔۔ آئم اسٹل ان ہائی ٹین ایج۔۔۔ اسی لیے میں ٹین ایجرز کی طرح تالیاں بجا کر ہیو کروں گی۔"

شیبا نے تیز لہجے میں کہا۔

"تم ابھی ٹین ایج میں۔۔۔ میں تو ان گن گن کر گزار رہی ہوں کہ کب اس کی پیڑھ سے نکلوں گی۔"

سوہا نے سگریٹ کا کش لگا کے دھواں اپنے اندر اتارا۔

"ٹین ایج کب ختم ہوتا ہے؟"

سبیکا نے آنکھیں میچتے ہوئے قہقہہ لگایا۔

"تھرٹی پلس۔" سوہا نے اس کی کمر میں دھمو کا جڑا۔

"چھوڑو یار۔ اچل رہی ہو پھر میرے ساتھ بھوربن؟" شیبا اب تک وہیں اٹکی تھی۔

"بھوربن؟ سو بورنگ یار۔ تمہارا میریڈ کپل ہیں کیا ہم؟" سوہا نے دھواں اگلا۔

"تو پھر عاطف۔۔۔"

اس سے آگے وہ ایک لفظ نہ کہہ سکی کیونکہ سبیکا نے اپنا ہاتھ اس کے ہونٹوں پہ زور سے جما دیا تھا اور وہ اسے گھور رہی تھی۔

"اب وہاں اس ڈھیلی ٹائی والے کا نام لیا تو اس سے برا ہوگا تمہارے ساتھ۔"

سوہا نے ہنستے ہوئے وارننگ دی۔

☆ ☆ ☆

"لوگ تو اچھے ہیں۔ لڑکا بھی خوش شکل اور تعلیم یافتہ ہے۔" مدیحہ نے صبح ناشتے کی ٹیبل پہ بغیر کسی کو مخاطب کیے کہا۔ مگر جسے سنانا تھا اس تک پہنچ گیا۔

"ہوں۔۔۔" جعفر نے ایک نظر تحریم کے جھکے ہوئے سر پہ ڈالی جس کے تاثرات وہ بھانپ نہ پایا۔

"مگر ایک آدھ ملاقات میں کیا پتہ چلتا ہے کسی کا۔" تحریم نے فوراً سر اٹھا کے باپ کو دیکھا۔۔۔ اس کی نظروں سے ناامید جھلک رہی تھی۔

"ٹھیک۔۔۔ پتہ تو بعض اوقات ساری عمر ساتھ گزار کے بھی نہیں چلتا۔"

مدیحہ کے لہجے میں تپش تھی۔ جعفر نے بے حد ناگواری سے اس کے چہرے کو دیکھا۔۔۔ جو حسین و دلکش تو کبھی بھی نہیں رہا تھا مگر اب شک، حسد اور طنز کے مستقل اثرات نے جیسے اس کے سارے نقوش مسخ کر کے رکھ دیے تھے۔

"اتنی اچھی فیملی ہے ہماری تحریم خوش رہے گی وہاں۔"

"ایک بار تحریم سے بھی پوچھ لو۔"

نہ جانے کیسے جعفر نے اس کے جھکے ہوئے چہرے پہ ناگواری کے تاثرات جانچ لیے اور کہا۔

"اس سے کیا پوچھنا۔۔۔" مدیحہ نے لاپروائی سے کہا۔

"یہ اس کا حق ہے۔"

"اور یہ حق استعمال کرنا تب اچھا لگتا ہے جب سامنے دو تین آپشنز ہوں۔ اگر ہوتے کوئی دو چار رشتے تب میں اس کے سامنے رکھتی اور پوچھتی کہ بتاؤ ان میں سے کون سا تمہیں بہتر لگتا ہے لیکن اس ڈیڑھ سال کے عرصے میں یہ پہلا تو رشتہ آیا ہے۔ اس میں وہ کیا نقص نکالے گی۔۔۔ اور آپ بھی زیادہ مین میخ نہ نکالیے گا۔۔۔ آج کل اچھی بھلی لڑکیوں کی شادی بھی۔۔۔"

تحریم کو ایک جھٹکے سے اٹھتا دیکھ کے مدیحہ چپ ہو گئی۔۔۔ وہ ناشتہ جوں کا توں چھوڑ کے چلی گئی تھی۔۔۔ مدیحہ کو ملال سا ہوا۔

"تم کبھی نہ بدلنا مدیحہ!" جعفر بھی غصے سے کھڑا ہو گیا۔ "آپ کو تو موقع چاہیے میرے خلاف کچھ کہنے کا۔"

"بس۔۔۔ بارہ ہزار۔۔۔" ظلِ ہما کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔ یہ ندا کی سیلری کا تقریباً ۔۔۔
تھا۔ "اتنا مہنگا؟؟"

"میرے بھائی سے زیادہ تو نہیں۔" وہ بڑے مان سے مسکرائی۔

"ماما کو بتایا تم نے؟؟"

"نہیں، اور خبردار جو تم نے بتایا۔" ندا نے اس کی جانب سے کروٹ لیتے ہوئے تنبیہہ کی۔

"میں تو نہیں بتانے والی مگر کسی کو پتہ چل گیا تو؟؟"

"نہیں چلے گا۔۔۔ میں کون سا پیک کر کے اسے کیک کاٹتے وقت ہاتھ میں پکڑاؤں گی۔ اس کی ۔۔۔
رہی ہوں۔ ایک دن پہلے یا ایک دن بعد میں۔" اس نے جمائی لینے کے لیے بات روکی۔ "اول ۔۔۔
ہے۔" وہ تکیہ ٹھیک کرتے کرتے چونکی۔ "سوچا تم نے؟ کیا دو گی؟"

"ٹھینگا۔" وہ چڑ گئی۔

"ماما ٹھیک ہی تو کہتی ہیں۔ کیا ضرورت ہے گفٹ دینے کی اور وہ بھی ایسے مہنگے۔" اس کی آواز بھرا گئی۔
"تمہیں بھی ماما کی طرح کنجوسی صرف دوسروں کو تحفے دیتے ہوئے یاد آتی ہے۔"

ندا نے اس کی آواز کا بھیگا پن محسوس نہ کیا۔ ظلِ ہما دوسری جانب کروٹ لے کر چپ چاپ تکیہ بھگو ۔۔۔
"کاش میں بھی ندا آپی کی طرح کوئی جاب کرتی ہوتی۔۔۔ میرے ہاتھ میں بھی میری تنخواہ کے پیسے ہوتے
خرچ کرتے ہوئے میں کسی کے سامنے جواب دہ نہ ہوتی۔"

یکدم اسے ایک انوکھا خیال آیا۔

☆ ☆ ☆
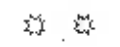
"کیا؟ جاب؟ مگر کس لیے؟ اور تمہیں جاب دے گا کون؟ بی ایس سی کا رزلٹ تک تو نکلا نہیں تمہارا۔"
رخشندہ نے اس کی بات تعجب سے سننے کے بعد تابڑ توڑ سوال کر دیے اور اس سے پہلے کہ وہ ان کی ۔۔۔
ایک آدھ کی تسلی بخش جواب دیتی۔۔۔ چند اور سوالوں کا اضافہ ہو گیا۔

"اور تمہیں جاب کی ضرورت کیا ہے؟ ایسا کون سا فارغ وقت ہے جو کاٹے نہیں کٹتا۔۔۔ ۔۔۔
ہیں گھر کے اور کون سی ضرورت ہے جو ہم پوری نہیں کر رہے۔"

"ندا آپی کی بھی تو سب ضرورتیں پوری ہو رہی تھیں۔ انہوں نے کی ناں جاب؟ جاب صرف ضرورت ۔۔۔
کرنے کے لیے نہیں کی جاتی، کیریئر بنانے کے لیے بھی کی جاتی ہے۔"

"ندا ایم ایس سی گولڈ میڈلسٹ ہے۔ تم سیکنڈ ڈویژن میں بھی بی ایس سی کلیئر کر لو تو بڑی بات ہوگی۔"
رخشندہ ایسی ہی سفاکانہ صاف گوئی کی عادی تھیں چاہے مقابل ان کی اپنی اولاد ہی کیوں نہ ہو۔

"اور اس کے بعد کرنا چاہو تو کسی عام سے پرائیویٹ سکول میں پرائمری ٹیچر کی جاب مل جائے گی تو ۔۔۔
چار ہزار روپلی۔۔۔ کیا! اسے کیریئر بنانا کہتے ہیں؟؟"

"لیکن ماما۔۔۔!"

"بس۔۔۔ چپ۔" رخشندہ نے اپنا تکیہ کلام دہرایا۔
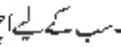
"اس معاملے میں مزید بحث نہیں ہو گی۔ میں جاب کے خلاف نہیں ہوں مگر پہلے تعلیم پھر ۔۔۔
بوریت سے نپٹنے کے لیے یا تم اس کے لیے جاب کا سہارا تلاش کر رہی ہو تو کوئی اور ایکٹیویٹی ۔۔۔
نے بیوٹیشن کا کورس کیا ہے، اس سے کچھ سیکھ لو۔ کام آئے گا۔" رخشندہ نے اپنے بھائی کی بیٹی کا نام ۔۔۔

"اس سے کیوں سیکھوں، وہ جس انسٹیٹیوٹ سے سیکھ کر نکلی ہے وہاں سے کیوں نہیں۔"

"دماغ خراب ہے تمہارا۔ اس فضول کام کے لیے ہمائی جیسی بے وقوف عورتیں ہی کو چاہیں ۔۔۔
ہیں میں نہیں۔"

۔۔۔ ہزار روپے دینا تو فضول کام ہے، مفت میں سیکھنے کو ملے تو کام آئے گا۔"
۔۔۔ ظلِ ہما کے بولنے کی ہمت نہ تھی۔
۔۔۔ وہ۔۔۔ تنی باتیں سنائیں گی کہ میری نیلی نے یہ کورس مفت میں سکھانے کے لیے۔۔۔"
۔۔۔ ہے۔" رخشندہ کو بھی خیال آگیا۔
۔۔۔ ہے رہنے دو۔"
۔۔۔ دوست کی اکیڈمی ہے وہاں پہ۔۔۔" اس نے دوبارہ منت سماجت والی شکل بنا کے کہنا چاہا۔ مگر رخشندہ ۔۔۔

۔۔۔ کی اکیڈمی؟"
۔۔۔ مطلب ہے اس کے پاپا کی اکیڈمی۔۔۔ نا منتہیٰ تمین اور ایف اے ایف ایس سی کے بچوں کی ٹیوشن کے
۔۔۔ تمین اور فرینڈز بھی وہاں پہ آج کل پڑھا رہی ہیں۔ صرف رزلٹ نکلنے تک۔۔۔ اچھا ہی فائدہ ہے۔
۔۔۔ ائس ہو جاتی ہے اور انکل مناسب پے کے ساتھ پک اینڈ ڈراپ بھی دیتے ہیں۔"
۔۔۔ اچھا۔" وہ سوچ میں پڑ گئیں۔
۔۔۔ صرف رزلٹ نکلنے تک کے لیے ہے تو ٹھیک ہے، کر لو۔۔۔ مگر رزلٹ آتے ہی تم نے یہ ٹیچنگ وغیرہ
۔۔۔ ہے یا تو آگے ایڈمیشن لینا ہے یا پھر۔۔۔"
۔۔۔ ظلِ ہما کو شہنائیاں سی گونجتی سنائی دیں۔ زرتار آنچل لہراتے نظر آئے اور اس نے بڑی آس سے

۔۔۔ ہاں ماما۔۔۔ یا پھر؟"
۔۔۔ اگر فیل ہو گئی تو دوبارہ پیپر دینے ہوں گے۔"
۔۔۔ اچھل پڑ گئی۔

☆ ☆ ☆ ☆

۔۔۔ ما شاء اللہ آپ برسرِ روزگار ہو گئے ہیں۔"
۔۔۔ پہلی بار وہ اکیڈمی جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی اور عجیب کہ اس موقع پہ پہلی پہلی بار جو سب کے ساتھ ہوتا
۔۔۔ اس کے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔
۔۔۔ بے حد نروس تھی۔ اس پہ مستزاد یہ کہ وصی وارد ہو گیا۔
۔۔۔ بارک ہو۔۔۔ بھئی مبارکاں۔"
۔۔۔ میری فرینڈ ہے ناں اس کے پاپا۔ ان کی اکیڈمی میں انہیں ضرورت تھی۔ ریکونسٹ کی تو میں۔۔۔"
۔۔۔ اٹک کے بتانے لگی۔
۔۔۔ ریکونسٹ کی؟" وصی نے قہقہہ روکا۔
۔۔۔ ریکونسٹ کی کہ آؤ اور اپنی کارکردگی سے میری اکیڈمی کی ساکھ کو بٹہ لگاؤ۔ میرے اسٹوڈنٹس کی لٹیا ڈبو دو۔"
۔۔۔ کہتے کہنے لگا اور ظلِ ہما آنسو پیتی اندر بھاگی۔
۔۔۔ کہا ہے اسے ایک میرا ہی نہیں ہے۔ سب کے لیے اچھا ہے بس میرے لیے۔۔۔"
۔۔۔ روم کے بند دروازے سے لگی رو رہی تھی۔
۔۔۔ دیر ہو گئی ہے تمہاری۔" رخشندہ نے دروازے پہ دستک دی۔
۔۔۔ وہ چونکی اور جلدی سے واش بیسن پہ لگے آئینے میں خود کو دیکھا۔ آنسوؤں نے شکل کو بد شکل بنا دیا تھا
۔۔۔ سرخ ہو گیا تھا اور ناک پکوڑا سی سرخ ہو رہی تھی۔ وہ جلدی جلدی منہ پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگی۔
۔۔۔ نکل آئے۔ آپ کی وین نے ہارن بجا بجا کے کان "بولے" (بہرے) کر دیے ہیں۔"
۔۔۔ جس کی آواز سنتے ہی وہ منہ سر سے جل گئی۔

"آ رہی ہوں..." جتنی شدت سے اپنا غصہ وہ اس دھاڑ میں بھر سکتی تھی اس نے بھرا۔ اور [illegible] دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا وصی مسکرا اٹھا۔

"ابھی تو کھانا بھی نہیں کھایا اس لڑکی نے دوپہر کا۔"

رخشندہ نے ٹرے کی جانب دیکھتے ہوئے فکرمندی سے کہا۔

وصی نے ٹرے پہ ایک نظر ڈالی۔

مولی پالک کی بھجیا، آلو مٹر کا شوربہ اور بس۔

"اچھا ہی ہے جو نہیں کھایا۔" وہ بڑبڑایا سبزیوں سے اسے ویسے ہی چڑ تھی اور خاص طور پہ جب [illegible] ساتھ ایک اور سبزی ہو۔

"دو نوالے تو لے لو۔" اس کے نکلتے ہی سیڑھیوں کی جانب لپکنے پہ رخشندہ جلدی سے بولی۔

"کینٹین سے کچھ لے لوں گی... وہاں سے۔" تیزی سے سیڑھیاں اترتی ہما نے جواب دیا۔

"لو... یہ نیا خرچہ... پانچ ہزار میں سے آدھے تو یہ لڑکی کینٹین میں اڑا دے گی۔ اسی لیے میں جیب [illegible] تھی۔ ہاتھ میں جتنے پیسے آئیں لڑکیوں کے، اتنے ہی زیادہ خرچ کرنے کی عادت پڑتی ہے۔"

ہما کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں اترتے وصی نے بیگم ممانی کے خیالات سنے۔

وہ نیچے بیگم شوکت جہاں کے سامنے بھی دہائی دے رہی تھی۔

"زکام ہے تمہیں؟" انہوں نے اس کی روئی روئی آنکھیں دیکھ کر پوچھا۔

"جی..." اور کیا کہتی۔

"تو گھر بیٹھو... ضرور جانا ہے زکام میں۔" انہوں نے فوراً مشورہ دیا اور اس مشورے کی تائید فوراً [illegible] جانب سے آئی۔

"اور کیا... وہاں معصوم طالب علموں میں بھی جراثیم پھیلاؤ گی... بے چاروں کے امتحان سر پہ ہیں۔"

"تم سے بات نہیں کر رہی میں۔" وہ چپ کے کہتی باہر نکلی۔

"لعنت ہے مجھ پہ جو میں اس کی خاطر یہ چخ چخ والی جاب کر رہی ہوں۔ صرف اس کو گفٹ دینے کے [illegible] کبھی بھی نہیں میں تو اسے ٹھینگا بھی نہیں دوں گی۔"

وین میں بیٹھی وہ کڑھ کڑھ کے سوچتی رہی اور کینٹین میں برگر کھاتے ہوئے اسمارہ سے کہہ رہی تھی۔

"اسمارہ... یار اپنے پاپا سے کہہ کے مجھے ایڈوانس سیلری دلوا دو۔"

یہ پلان وہ پہلے سے سوچے ہوئے تھی... ظاہر ہے چھ دن بعد ہونے والی برتھ ڈے پہ گفٹ دینے کے [illegible] پورے مہینے تو تنخواہ کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

"پہلی بات تو یہ ہے کہ یہاں وہ میرے پاپا نہیں، سر ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ کسی بھی صورت ایڈوانس [illegible] کے نہ تمہیں نہ مجھے۔"

"اچھا..." اسے قدرے مایوسی ہوئی۔

"کیا فائدہ ہوا پھر..." اس نے منہ لٹکا لیا۔ وہ تو دوپہر کے کھانے کے بعد لمبی تان کے سونے [illegible] سونے سے پہلے... یا جاگنے کے بعد ڈائجسٹ پڑھنے کا چسکہ بھی تھا اور یہ دونوں شوق بستر میں [illegible] کیے جاتے تھے۔ اپنے پیارے بیڈ سے جدائی اس لیے تو نہیں برداشت کی تھی کہ...

"اچھا، تم تھوڑے پیسے دے دو۔" اس نے جھٹ اپنی اور اسمارا کی دوستی پہ ادھار کی قینچی چلانا چاہی۔

"کتنے؟" برگر کا نوالہ حلق سے اتارتے ہوئے اس نے پوچھا۔

"تین دے دو... تین ہزار۔"

اسے فوراً بیگ میں ہاتھ ڈال کے سو سو کے نوٹ نکالتے دیکھ کے ہما نے اضافہ کیا۔

"[illegible] رہے ہیں؟"

"[illegible] کیا؟... دیتے ہیں تو دے دو۔"

[illegible] میں پانچ ہزار رکھنے کے بعد اس نے بڑی مشکل سے نائنتھ اور ٹین کی لڑکیوں کو فزکس پڑھائی کہ [illegible] کے سامنے مختلف چیزیں گھوم رہی تھیں۔

[illegible] کبھی ٹائی، کبھی کف لنکس، کبھی کوئی اچھی کتاب۔

[illegible] تک کلاسز لینے کے بعد اس نے سیدھا شاہ دمان مارکیٹ کا راستہ پکڑا۔

☼ ☼ ☼

"[illegible] اپنے گھر میں بات کیوں نہیں کرتے؟"

[illegible] کے ایک خوب صورت ریسٹورنٹ میں بیٹھے تھے جب تحریم نے وحید سے کہا۔

"[illegible]" وحید نے مینیو کارڈ سے نظر ہٹائے بغیر کہا۔

"[illegible] لگتا ہے جیسے آپ نے بات کی ہے مگر وہ مانے نہیں اور آپ مجھے اس لیے ٹال رہے ہیں کہ مجھے برا نہ [illegible] کا خدشہ زبان تک لے آئی۔

"[illegible] بات نہیں ہے تحریم! میں صرف مناسب وقت کا انتظار کر رہا ہوں۔"

"[illegible] مناسب وقت؟ آپ اسٹیبلش ہیں... اچھی جاب پہ ہیں، کوئی خاص ذمہ داری بھی آپ پہ نہیں، پھر اتنا [illegible]"

[illegible] کے جرح کرنے پہ وحید کو اچھا خاصا غصہ آ گیا۔

"[illegible] تحریم! میں کوئی تمہارے ساتھ فلرٹ نہیں کر رہا۔ سیریس ہوں اور شادی بھی ایک نہ ایک دن [illegible] ساتھ کروں گا۔ لیکن تمہارے انداز سے لگ رہا ہے جیسے تمہیں مجھ پہ شک ہے۔ ٹھیک ہے اگر تمہیں [illegible] اعتبار ہی نہیں تو کیا فائدہ اتنی دور تک آنے کا۔"

[illegible] ہو گیا اور تحریم کی جان پہ بن آئی۔

"[illegible] یہ مطلب نہیں تھا وحید! میں تو... پلیز آپ ناراض نہ ہوں۔"

[illegible] بات اور آنسو بھری آنکھوں کے آگے وحید کی خفگی ہار مان گئی۔

"[illegible] لیکن تم وعدہ کرو کہ بار بار یہ ذکر کر کے مجھے اری ٹیٹ (مشتعل) نہیں کرو گی۔"

"[illegible]" وہ دکھ سے لب کچل کے رہ گئی۔

"[illegible] کوئی نیت نہیں... میں تو صرف... دراصل جب کوئی پرپوزل آتا ہے اور گھر والے مجھ پہ پریشر [illegible]"

"[illegible] سارا پریشر مجھ پہ ڈال رہی ہو۔" وحید نے اس کی بات مکمل کی۔ "فار گاڈ سیک تحریم! اس رشتے کی [illegible] حرکت کو ان باتوں سے تباہ مت کرو۔ اگر میں کسی بھی لڑکی کو شادی کے نام پہ صرف اور صرف [illegible] اور مجبوریوں سے جکڑنے کے گھر میں قید کرنے والا ہوتا تو کب کا شادی کر چکا ہوتا۔ جب تم میری زندگی [illegible] اس سے بھی پہلے...!"

[illegible] نے خاموشی سے گردن جھکا لی... واقعی ایسا ہو بھی سکتا تھا کیونکہ وحید کی عمر اس وقت لگ بھگ [illegible] تھی۔

"[illegible] ایسا نہیں کیا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ میں نہ تو یہ چاہتا تھا کہ میری بیوی گھر کی ذمہ داریاں نبھانے [illegible] معاشی تگ و دو میں بھی میرا ہاتھ بٹائے اور نہ یہ کہ گھر بیٹھی میری محدود آمدنی کا بجٹ بنا بنا کے ہلکان [illegible] میں عورت کے کام کرنے کے خلاف نہیں ہوں لیکن یہ کام وہ صرف اپنی ذات اور شوق کی تسکین [illegible] وقت گزارنے کے لیے یا پھر اپنی اعلیٰ تعلیم کو بروئے کار لانے کے لیے تو ٹھیک ہے۔ لیکن یہ مجھے

گوارا نہیں کہ میری نااہلی کا اعلان کرتی۔ تم سے مایوس ہوتی وہ گھر سے باہر نکلے۔ اپنی ضرورتیں [illegible] کرنے کے لیے۔"

وہ بول رہا تھا اور بہوش کی طرح تحریم سحرزدہ سی سن رہی تھی۔ اس کے یہی اچھوتے خیالات تو پسند تھے۔

"تم خود سوچو..... کسی دوسری عورت کے لیے میرے یہ جذبات ہیں تو تم۔ تم سے تو میں پیار کرتا [illegible] ہے مجھے تم سے۔"

تحریم کی پلکیں لرزتی ہوئی جھک گئیں۔

"میں نے تمہارے لیے بہت کچھ سوچ رکھا ہے..... بہت کچھ۔ ایک اچھا مستقبل دینا چاہتا ہوں میں تم کو ہر آسائش، ہر سہولت، دنیا جہاں کی تمام نعمتیں میں تمہارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا ہوں۔"

"آپ۔ آپ ہی میرے لیے کافی ہیں وحید۔ یقین کیجیے مجھے اور کچھ نہیں چاہیے۔"

"پھر وہی بات..... تمہیں کچھ چاہیے ہو یا نہ ہو..... بس اسے میری خواہش سمجھ لو۔ میں ابھی خود کو قابل نہیں پاتا تحریم!"

"مگر۔" اس نے کچھ اور کہنا چاہا مگر وحید نے اپنا بھاری ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ دیا۔

"میرے لیے اتنا سا بھی انتظار نہیں کر سکتیں۔ ہوں۔"

"ساری عمر کر سکتی ہوں۔ مگر ماما بار بار..."

"میری خاطر یہ معاملہ کچھ دیر اور سنبھال نہیں سکتیں؟" اس نے ہاتھ کا دباؤ ڈالتے ہوئے پھر سے بات کی۔ تحریم اسے دیکھ کے رہ گئی اور خاموشی سے سر ہلا دیا۔

"چلو..... اب آرڈر دو۔"

"ایک شرط پہ۔"

"وہ کیا؟"

"اس بار بل میں پے کروں گی۔"

"وہ کس خوشی میں؟" وحید نے ابرو چڑھائے۔

"آپ ہر بار اتنے مہنگے ریسٹورنٹس میں لے آتے ہیں اور؟"

"شش۔" وحید نے اس کے لبوں پہ انگلی رکھی۔

اس کا رواں رواں لرز کے رہ گیا۔ وہ اب تو کیا۔ دیر تک کچھ بولنے کے قابل نہ رہی تھی۔

"دوبارہ ایسا مت کہنا۔ ابھی میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں کہ تم سے ملنے کے لیے یہ اہتمام بھی نہ کر سکوں۔ ویسا میں نے تمہارے لیے لیا ہے۔"

اس نے جیب سے ایک ڈبیا نکال کر کھولی۔ اس میں نازک سی سونے کی انگوٹھی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپی۔! آپ نے جھوٹ کیوں بولا؟"

مدیحہ کو تو اس نے ٹال دیا تھا مگر وہ تقدیس تھی۔ اس کی چھوٹی بہن، اس کی دوست، اس کی سب سے [illegible] اور اس کا سب سے زیادہ خیال رکھنے والی۔

"میں سارا وقت آپ کے پاس، بالکل ساتھ بیٹھی تھی، پھر کیوں کہا ماما سے آپ نے کہ ان لوگوں نے فضول باتیں کی ہیں۔"

تحریم سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تو جھنجلا کے زور زور سے بالوں میں کنگھا پھیرنے لگی۔

"میں کچھ پوچھ رہی ہوں آپی؟"

تمہیں پتہ چل ہی چکا ہے کہ میں نے جھوٹ بولا تھا تو یہ بھی جان لو کہ جھوٹ کس لیے بولا جاتا ہے۔ میں وہاں شادی نہیں کرنا چاہتی۔"

"[illegible] کرنا چاہتی ہیں؟"

[illegible] واضح سوال پہ وہ تھم گئی۔

[illegible] جواب اس کے پاس تھا۔ وہ دے بھی سکتی تھی لیکن اس کے بعد جو سوال ہوتے ان کے جواب دینے کی [illegible] اس لیے نہیں تھی کہ وحید سے کیے وعدے کی پابند تھی۔ یعنی انتظار کرنے کی۔ [illegible] کر سکتی تھی۔ مگر اس کے گھر والے نہیں۔ وہ جانتی تھی کہ جس دن مدیحہ کو وحید کے بارے میں پتہ [illegible] گھر بلوانے کے لیے زور دینے پہ تل جائیں گی۔

"[illegible] بھی نہیں۔"

[illegible] آہستہ سے کہتے ہوئے بالوں میں بل دینا شروع کیے۔ مگر اپنے سوال پہ تقدیس نے تحریم کا ٹھٹھکنا [illegible] محسوس کر لیا تھا۔ وہ اس جواب پہ مطمئن نہیں ہوئی۔

"[illegible] اور کوئی ہے ناں؟"

[illegible] نہیں۔" وہ گھبرا کے اسے سامنے سے ہٹاتے ہوئے آگے نکلنے لگی کہ بیڈ پہ رکھے موبائل کی بیل پہ رکی۔ [illegible] ایک نظر فون کو دیکھا اور پھر تقدیس کو..... پھر آہستہ سے اٹھا کے کانوں سے لگا لیا۔

"ہوں۔ اچھا نہیں کل۔ اوکے۔"

[illegible] واپس رکھ کر کن انکھیوں سے تقدیس کو دیکھتی باہر نکل گئی۔

[illegible] بری طرح الجھ رہی تھی۔

[illegible] بھی جو اسے آگے بڑھ کے کچھ کرنے پہ اکسا رہی تھی۔ باآخر وہ رہ نہ سکی اور فون اٹھا کے اس کا کال [illegible] چیک کیا۔ ڈیڑھ منٹ پہلے آنے والی کال جس نمبر سے آئی تھی وہ نمبر "سپیشل" کے نام سے Save تھا۔

☼ ☼ ☼

"[illegible] کہاں گھوم رہی ہو؟" دھمی کی آواز سن کر وہ کرنٹ کھا کے اچھلی تھی۔

[illegible] اسے بالکل سامنے پا کے وہ حواس باختہ ہو گئی۔

"[illegible] تم نے جاب اکیڈمی میں کی ہے یا اس کارمنٹس اسٹور میں سیلز گرل کی۔"

[illegible] نگاہ لیے اسے گھور رہا تھا۔

"[illegible] میں کیوں بننے لگی سیلز گرل۔"

"[illegible] کیا لگا رکھا ہے سامنے؟"

[illegible] پہ پھیلے سامان پہ نظر ڈالی..... مردانہ پرفیوم، آفٹر شیو..... ٹائی اور کف لنکس۔ جیکٹ اور [illegible] سیلز مین اس کا مطلوبہ گفٹ ریپر لینے گیا تھا۔

"[illegible] یہ سب تمہارے کام کا تو ہے نہیں۔"

"[illegible] ہے کہ اگر میں سیلز گرل ہوتی تو کاؤنٹر کے اس طرف نہیں اس طرف ہوتی اور رہا یہ سامان تو..... یہ تو [illegible] پیار رکھا ہے۔"

"[illegible] نا کہ خیر ہو کہ موقع ملتے ہی ایک آدھ چیز پار کر لو۔ ویسے اس وقت تو تمہیں اکیڈمی ہونا چاہیے۔"

[illegible] سے آ رہی ہوں۔ یہ سامنے تو ہے۔ روڈ کے اس پار پوسٹ آفس کے بالکل ساتھ۔ مجھے پتہ لگا تھا اس [illegible]

[illegible] اطمینان سے کھڑا تھا۔ "تمہیں کیا لگتا ہے؟" وہ جز بز ہوئی۔ "کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"اکیڈمی کی پک اینڈ ڈراپ ہے۔" اس نے یاد دلایا۔

"مگر ممانی کہہ رہی تھیں کہ تم دو گھنٹے میں فارغ ہو جایا کرو گی اور وین تمہیں ڈیڑھ گھنٹہ انتظار کروا کے لیے میں تمہیں لے آؤں۔۔۔ چلو آؤ۔"

اس نے بھی بہتری اس میں جانی کہ چپ چاپ اس کے پیچھے چلی آئے ورنہ سیلز مین آجاتا تو سارا تماشا بن جاتا۔

دکان سے نکلتے نکلتے اچانک اسے یاد آیا کہ پے منٹ تو وہ کر چکی تھی۔ اس کے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک گئی۔

اس نے ایک نظر پیچھے مڑ کے دیکھا اور پھر ساتھ کھڑے وصی کو۔۔۔ چار ہزار روپے کے ضائع ہو جانے کے بجائے کہ وہ اسے بیچ ہی دے۔۔۔ بھاڑ میں جائے سرپرائز گفٹ۔

"تم تو کہہ رہی تھی کہ کچھ لینا ہے؟" اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی وصی بول اٹھا۔ "لیا بھی تھا یا صرف مٹر گشت پھرنے کا شوق پورا کرنے کے لیے بہانہ بنایا تھا۔ میں بھی سوچ رہا تھا ظلِ الٰہی نے بیٹھ کر روٹیاں توڑنے کے بجائے کام کرنے کا کیسے سوچ لیا۔ اب پتہ چلا کہ مارکیٹ یہاں سے قریب ہے۔"

"لیکن میں۔۔۔" وہ رکی اور پیچھے مڑ کے دیکھا اسٹور کے گلاس ڈور سے سیلز مین کاؤنٹر پہ چیزوں کے ساتھ حیران پریشان سا نظر آ رہا تھا۔

"اب میری بر تھ ڈے کا بہانہ مت بنا دینا کہ تمہارا گفٹ لینا تھا۔۔۔ کیونکہ اس کی تو تمہیں کبھی توفیق ہوئی نہیں۔" ہمانے چپ چاپ قدم آگے کی جانب بڑھا دیے۔

"اور یہ ہے میرا گفٹ۔۔۔"

ردا نے جو کر زدا لی بڑی سی رنگین کاغذی ٹوپی اس کے سر پہ پہناتے ہوئے کہا۔ وہ ایک نمبر کی پڑھاکو تھی کتابی کیڑا۔ اسی وقت اپنے کمرے سے نکلا کرتی جب ایسی کوئی کیدر رنگ ہوتی۔ ورنہ وہ تھی اور اس کی کتابیں۔

"شرم کرو۔۔۔ اس نے کم از کم کچھ تو دیا ہے۔"

وصی نے سر کو دائیں بائیں جھٹکتے ہوئے ٹوپی کے پھندنے کو گھمایا اور اپنے اوپر ہنستے ہوئے حاضرین کی غیرت جلا ڈالی۔

"تم تو سب کے سب بس کیک ٹھونسنے کو تیار آگئے ہو۔ خالی ہاتھ تالیاں بجاتے۔"

"ہاتھ خالی ہوں گے تو تالیاں بجیں گی۔" حسان نے خالی ہاتھ آنے کا جواز پیش کیا۔

"تمہارا لگے گا تم موم بتی پہ پھونکیں مار رہے ہوگے یا کیک پہ چھری چلا رہے ہوگے اور بیک گراؤنڈ میں تالیوں کی گونج نہ ہو۔"

"ویسے بھی ہم کب تک لاتے رہیں تحفے۔۔۔ تم تو کیک کاٹنے کا تکلف بھی نہیں کرتے۔۔۔ ہم تحفے لا لا کے تھک گئے ہیں بھائی۔"

ندا نے ہاتھ جوڑے۔۔۔ اپنا تحفہ وفی الحال سب کے سامنے دے کر رسک نہیں لینا چاہتی تھی۔ رخشندہ کی موجودگی کا لحاظ کیے بغیر نہ صرف منہ بنا لیتیں بلکہ شاید دو چار کڑوی کسیلی سنا بھی دیتیں۔ وہ وصی کی سالگرہ کا مزہ کرکرا نہ کرنا چاہتی تھی اس لیے ابھی تک اپنا تحفہ خفیہ رکھا ہوا تھا۔ بعد میں بعد میں دینے کا ارادہ تھا۔

"دیکھ لیا نانو! آپ کی ضد کی وجہ سے مجھے ہر سال شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔"

اس نے مڑ کے شوکت جہاں سے گلہ کیا جن کی فرمائش پہ ہر بار اس کی سالگرہ اہتمام سے منائی جاتی تھی۔

"ہر سال اتنی سال میں صرف ایک بار؟۔۔۔ کیوں کسر نفسی سے کام لے رہے ہو یار!" حسن نے بانہیں ہنستے ہوئے کہا اور اسٹول سے نیچے اتر آیا۔

"چلو بھئی کیک کاٹو۔ کسی کا انتظار ہے؟" حسان نے صدا بلند کی اور یہ صدا وہ پچھلے پون گھنٹے میں سات بار بلند کر چکا تھا۔

"آ جاتی ہیں اب۔۔۔" حسان ڈھونڈ ڈھانڈ کے سب کو اکٹھا کرنے لگا تاکہ کیک کٹے اور وہ اپنا فرض بخوبی ادا کر کے پلیٹ پہ پلیٹ خالی کرے گا۔

"نیلی نیچے اترو۔" منہ اونچا کر کے اسے بھی آواز دی۔

"شاید تحفہ پیک کر رہی ہے۔" وصی نے ایسے آس بھرے لہجے میں کہا کہ سب کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہما کی کنجوسی سے وہ سارے ہی واقف تھے۔ رخشندہ نے البتہ ناگواری سے پہلو بدلا۔ کچھ کچھ سن گن تھی انہیں بھی کہ جب بھی کنجوسی اور کفایت شعاری کا ذکر ہوتا ہے تو تانے بانے ان ہی کی ذات سے ملائے جاتے ہیں۔

وہ جب ہی نیچے اتر آئی اور حسب سابق خالی ہاتھ اسے آخری سیڑھی اترتے دیکھ کے سب سے پہلے وصی کا چہرہ اترا تھا اور پھر کسی وبا کی طرح سارے میں ہی پھیل گیا۔ بیگم شوکت جہاں اپنی بے ساختہ مسکراہٹ دباتے ہوئے انہیں ہلکی پھلکی سرزنش کر رہی تھیں۔ جبھی رخشندہ کے چہرے کے بدلتے رنگ دیکھتیں تو یہ تڑپ فوراً ہی غائب ہو جاتی اور وہ بوکھلا کے پروین کو اشارے کرنے لگتیں کہ وہ سب کو روکے۔

"بس۔۔۔" پروین نے اونچی آواز میں کہا۔

"اب مزید کوئی بدتمیزی ہوئی تو کھانا نہیں ملے گا۔۔۔ بھوکے رہنا پارٹی میں۔"

"ہاں۔۔۔ میری لمبی عمر کے لیے نفلی روزہ مان کر۔" وصی نے لقمہ دیا اور پل بھر کو تھمی ہنسی کی قل قل پھر سے بحال ہو گئی۔ اس بار بھی ہما نے اس ہنسی کا ساتھ نہ دیا۔ اسے رہ رہ کے اپنے چار ہزار کا دکھ ستا رہا تھا۔۔۔ اور اس سے بھی بڑھ کے یہ غم کہ ہر بار وہ رقم نہ ہونے پہ تحفہ نہ دینے کی سبکی سہتی تھی اور اس بار پورے چار ہزار گنوا دینے کے بعد بھی وہی حال۔۔۔

"رمی۔۔۔ بھیا کا فون ہے تمہارے لیے۔" ردا نے کارڈلیس اس کی جانب بڑھایا۔

"چلو۔۔۔ تھینک یو یار۔۔۔ انہیں ایمان سے اتنی خوشی ہو رہی ہے تمہارے فون کی کہہ نہیں سکتا۔۔۔ کم از کم تم یہ تو کہہ سکتا ہوں اب کہ میرے برتھ ڈے پہ کسی نے چار پیسے تو خرچ کیے۔۔۔ چاہے فون کال پہ ہی۔"

حالانکہ وہ جانتا تھا ہر بار ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیک کٹتے ہی سب کے چھپا چھپا کے رکھے گفٹس اچانک نکل آتے ہیں۔ پیارے بھرے چھوٹے چھوٹے تحفے۔۔۔ جن کی قیمت ان کے دینے والوں کا خلوص تھا۔

"ہیلو! ابا اب کلیئر آ رہی ہے آواز؟" وہ ذرا اور دور چلا گیا۔ رخشندہ کے چہرے پہ بے تابی سی تھی۔۔۔ پردیس بیٹھے بیٹے سے بات کرنے کی بھی۔۔۔ اور کال لمبی نہ ہو جائے اس فکر کے رنگ بھی نمایاں تھے۔

"کیوں! آپ نے وشمہ کو بلایا؟"

پھوپھو بیگم شوکت جہاں کو ان کے رات کے کھانے سے قبل کھائی جانے والی دوا دے رہی تھیں جب حسن نے ان کے بیڈ کے پاس بیٹھ کر ٹیبل پہ ان کا اخبار ٹھیک سے سمیٹ کر رکھتے ہوئے پوچھا اور انہوں نے دوا اسے تھماتے ہوئے سرسری سے انداز میں کہا۔

"نہیں بھئی بس دھیان ہی نہیں رہا۔"

"کل سے ایک فون کرنا تھا بس۔" وہ جھنجھلایا۔ سارا سرسری پن یکدم سے غائب ہو گیا۔ شوکت جہاں نے دوا نگلتے ہوئے پل بھر کو اس پہ نظر ڈالی اور چونک سی گئیں۔

"بات یہ ہے کہ بھائی اس کا یہاں زیادہ آنا جانا پسند نہیں کرتیں۔"

"یہ بھی تو اس کی پھوپھو کا گھر ہے۔۔۔ وہ کیوں اعتراض کرنے لگی بھلا؟"

"بہت سالوں سے اماں جان! جب سے اماں کسی بے جان وجود کی طرح بستر پہ پڑی ہیں اور بھائی نے اپنے آپ کے ساتھ اس گھر کے کل اختیارات اسے سونپ دیے ہیں تب سے میں نے تو ایسے سوالوں کے بارے میں سوچنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ بھائی کے ساتھ ساتھ بھتیجی بھی اس کی مٹھی میں ہے۔ وہ جہاں کا حکم دے گی وہاں جائے گی۔ جہاں سے منع کرے گی وہاں نہیں جائے گی۔"

"آجاتی تو ذرا دل بہل جاتا۔" حسن بڑبڑایا۔

"میں لے کر آؤں؟"

"نہیں..... رہنے دو۔ میں نے بابا دے کا فون کیا ہوتا اور بعد میں تم لینے جاتے تو بات بھی تھی۔ اب اعتراض ہو گا کہ وقت سے لینے آگئے۔"

"تو کون سا کوئی باقاعدہ تقریب منعقد کیے بیٹھے ہیں۔ بچوں کے مل بیٹھنے کا بہانہ ہے بس۔ گھر کی بات ہے اور وشمہ کون سا غیر ہے۔ جاؤ حسن بیٹے لے آؤ وشمہ کو..... کیک کٹنے کے بعد کٹ جائے گا۔"

شوکت جہاں نے گویا اس کے دل کی بات کی اور پھر اپنی بات کا رد عمل اس کے چہرے سے کھوجتے گئیں۔ یکایک روشنیاں سی پھوٹنے لگیں تھیں۔ کے وہ خود کو تیر کی طرح باہر لپکا تھا۔ اپنے اندازے کی درستی پر وہ مسکرائیں۔ اور قدرے ملول سی بیٹھی پروین کی جانب دیکھا۔

"اماں جان! آپ نے ایسے ہی بھیج دیا حسن کو۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے بھائی کے موجودہ رویے کا۔ ہماری منزہ نہیں ہے۔ مجھے تو بڑا خوف محسوس ہوتا ہے اس سے۔ پتہ نہیں کیوں لیکن ایسا لگتا ہے جیسے کسی کے ہاتھ اچانک بہت زیادہ طاقت بہت سے اختیارات آجائیں اور اسے موقع مل رہا ہو ان کے استعمال کا۔"

"سارے خدشے جھٹک دو پروین..... اور مطمئن ہو جاؤ۔ وشمہ تمہارا خون ہے۔ ٹھیک ہے منزہ سے اس کی وجہ سے وہ تم سے اتنی نزدیک نہیں ہے جتنی بچیاں عموماً پھوپھیوں سے ہوا کرتی ہیں مگر اس کی وجہ عدم تحفظ بھی ہو سکتا ہے۔ سوتیلی ہونے کے باوجود اس نے وشمہ کو ہتھیلی کا چھالا بنا کے پالا..... اس کا اعتراف بھی کرتی ہو..... کہیں کوئی دوسرا رشتہ اس پہ غالب نہ آجائے اس لیے اس نے وشمہ کو باقی سب سے دور رکھا ہوا گا۔ لیکن جو بھی ہو ایک ماں چاہے سگی ہو..... چاہے سوتیلی بیٹی کو کب تک پردوں میں چھپا کے رکھ سکتی ہے۔"

انہوں نے مسکراتے ہوئے ادھوری سی بات کی اور پروین کچھ چونک کر اس ادھوری بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کرنے لگیں۔

"ایسے ہی اچانک؟" وشمہ حسن کی بات پہ حیران رہ گئی۔

"تو کیا ہوا؟ گھر کی ہی تو بات ہے۔"

پورے ڈیڑھ ماہ بعد دیکھ رہا تھا وہ اسے..... پھر بھی احتیاط لازم تھی کہ کہیں دل کی بے تابی نگاہوں کی راہ سے ظاہر نہ ہو جائے۔

"پھر بھی..... کیا تھا جو پھوپھو مجھے ایک فون ہی کر دیتیں۔"

"میں خود جو آگیا ہوں لینے فون کی کیا ضرورت تھی؟"

"وہ تو ٹھیک ہے حسن بھائی لیکن پھوپھو..... خیر ان سے کیا گلہ..... انہیں میں یاد تھوڑا ہی رہتی ہوں۔" اسے اپنی اکلوتی پھوپھی سے وہی گلے تھے جو پھوپھی کو اس سے تھے اور ہر دو جانب ان شکووں کی وجہ منزہ ہی تھی۔

"وشمہ..... امی تمہیں اتنا یاد کرتی ہیں کہ ایک وقت وہ تھا جب مجھے تم سے حسد ہونے لگا تھا۔"

"اب نہیں ہوتا؟" وہ یونہی ہنس پڑی۔

"اب..... اب میں خود تمہیں اس سے بڑھ کے یاد کرتا ہوں۔"

اس کا دل چاہا کہ دیتے کو بے اختیار ہوا مگر اس نے فوراً "ڈپٹ کر اسے قابو میں کیا اور بولا تو اتنا۔"

"وہ پچھلی بات تھی..... رہا ان کے فون نہ کرنے کا سوال تو صاف کوئی ہے کہوں گا کہ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں انکار کر دیں گی تمہیں اکیلے بھیجنے سے خود ممانی کو ہم نے اس لیے نہیں بلایا کہ خاندان کے اور کسی کو نہیں بلایا۔ پس گھر کے لوگ مل کے ہلا گلا کر رہے تھے ان کو بلانے سے پھر اور لوگوں کو اعتراض اور شکایت ہوتا۔ بس یہ تھی ساری بات۔"

"تو آپ کیوں آئے؟ آپ کو ڈر نہیں تھا اس بات کا کہ ماما انکار کر دیں گی؟"

"ہاں..... امید تو مجھے بھی نہیں تھی..... پھر بھی میں نے سوچا ہو آؤں شاید وہ مان جائیں..... اور اگر نہ بھی مانیں تو کم از کم میں تم سے مل ہی لوں گا۔ تمہیں دیکھ ہی لوں۔"

آخری فقرہ کہتے کہتے اس کی آواز بوجھل سی ہو گئی تو اس نے فوراً "خود کو نارمل کیا۔

"کافی عرصہ ہو گیا ہے نا ہمیں ملے ہوئے۔"

"ہاں..... یہ تو ہے..... اچھا میں پوچھتی ہوں ماما سے۔ آپ چائے..."

"نہیں نہیں اس کا ٹائم نہیں ہے۔ وہاں سب انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"ہوں..... کس کا انتظار کر رہا ہے بھئی؟"

منزہ سلام پھیرتے ہی جائے نماز سے اٹھ آئی تھی..... جیسے ہی ماسی سے پتہ چلا کہ پروین کے گھر سے کوئی آیا ہے اور وشمہ ڈرائنگ روم میں اس کے ساتھ ہے تب سے نماز کے دوران بھی سارا دھیان اسی جانب تھا۔

"ماما یہ حسن بھائی مجھے لینے کے لیے آئے تھے۔ وجی کا برتھ ڈے ہے آج۔"

"وجی؟..... اچھا اچھا۔ وہ تم لوگوں کا کزن۔ اس کا برتھ ڈے ہے تو وشمہ..... میرا مطلب ہے تمہارا یا احسان کا ہوتا تو اور بات تھی۔"

اس بات پہ حسن نے بڑی گلہ آمیز نظروں سے وشمہ کو دیکھا جیسے کہہ رہا ہو۔

"میں نہ کہتا تھا۔"

"خیر کوئی بات نہیں۔ برتھ ڈے چاہے تمہارے کزن کا ہو گھر تو وشمہ کی پھوپھو کا ہے۔ وہ جب چاہے وہاں جا سکتی ہے خاص طور پہ تم لینے آئے ہو تو میں انکار تو نہیں کر سکتی۔ جاؤ وشمہ! تیار ہو جاؤ۔"

اب جتاتی نظروں سے حسن کو دیکھنے کی باری وشمہ کی تھی۔ پھر اس نے بڑے مان اور فخر بھرے انداز میں منزہ کے گلے میں بازو ڈالے۔

"تو کے ماما..... آپ بور تو نہیں ہوں گی اکیلی..... آج پاپا بھی دیر سے آئیں گے۔"

"نہیں ہوتی..... تم ہو آؤ..... پھر دیر تک باتیں کریں گے۔ صبح تمہاری کالج سے چھٹی ہے نا..... اور حسن! اسے ٹائم پہ چھوڑنے آجانا..... یا میں اس کے پاپا کو فون کر دوں؟ وہ لینے آجائیں۔"

"نہیں میں آجاؤں گا۔" وہ ابھی تک وشمہ کے سامنے اپنے خیال کے اظہار پہ شرمسار تھا۔

"اور پروین سے کہنا مجھے بہت اچھا لگا اس نے بھتیجی کو یاد رکھا..... ویسے کچھ کمی سی تھی ہے وشمہ! ایسے ہی کبھی کبھی اپنے گھر بار کی مصروفیت سے وقت نکال کے ملنے آجایا کرے اس سے۔ رشتے باندھے رکھنے کے لیے ملنا جلنا بھی ضروری ہوتا ہے۔"

وہ مسکرا کے کہتی وہاں سے جانے لگی۔ حسن مجرم سا بنا کھڑا تھا..... جیسے ماں کے ہاتھوں یہاں فون نہ کرنے اور منزہ کا دھر کا رخ نہ کرنے کا سبب وہی ہو۔

"دیکھا..... کوئی منع کیا میری ماما نے؟" وہ اترا کے پوچھ رہی تھی۔ اور منزہ منع کر بھی کیسے سکتی تھی۔ اس نے حسن سے ملنے کے لیے آتے ہوئے اس کا لہجے بارے میں قائم کیا اندازہ سن جو لیا تھا..... منع کرتی تو شاید وہ وہی کرتی۔ یعنی وشمہ کو وہاں بھیجنے سے سختی سے انکار اور دو چار طنزیہ پیغام پروین کے لیے۔ مگر وہ اس منفی خیال کو غلط ثابت کرنا چاہتی تھی جو حسن دانستہ یا نادانستہ اس کے ذہن میں بھر رہا تھا..... اس نے زندگی میں سب کچھ ہارا تھا۔

محبت۔

خون کے رشتے۔

اولاد۔

جیتا تھا تو بس ایک وشمہ کا دل اور اس جیت کو وہ کسی بھی طرح قائم رکھنا چاہتی تھی۔ ذرا سی لغزش کے باعث وہ اپنا قیمتی خزانہ ہاتھ سے جانے دیتی۔

☐ ☐ ☐

"آپ یہ پڑھتے ہیں؟"

اس نے بڑی حیرت سے ڈیش بورڈ میں رکھی "طلوعِ اشک" اور "شاید" کو نکالتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں۔۔۔ اکثر۔" وہ ڈرائیونگ کے دوران مسلسل اس کے صبیح اور معصوم چہرے کے خدوخال حفظ کر رہا تھا۔

"گاڑی میں؟ ڈرائیونگ کرتے ہوئے؟"

اس کے کمال سادگی سے کیے سوال پہ وہ جی بھر کے ہنسا۔

"نہیں بھئی۔ اپنے کمرے میں رات کے وقت۔ یہ گاڑی میں اس لیے ہیں کہ کل خریدی تھیں اور گھر لے جانا بھول گیا۔ یہیں پڑی رہ گئیں۔ تمہیں ہے کوئی شوق پڑھنے کا؟"

"نہیں۔۔۔" اس نے ناک چڑھائی۔

"کورس کی بکس سے ہی ٹائم نہیں ملتا۔۔۔ ویسے بھی میری سمجھ میں شاعری تو آتی ہی نہیں۔۔۔ ایسی مشکل مشکل باتیں ہوتی ہیں۔"

"آسان سی چیز سناؤں تمہیں!"

پتا نہیں کیوں آج دل اتنا ہاتھوں سے نکلا جا رہا تھا ورنہ اس کی وشمہ سے چاہت بڑی قدیم تھی۔ کوئی نیا نویلا جذبہ تو تھا جو اپنا آپ دکھانے کو بے چین ہوتا۔ کتنے عرصے سے سینت سینت کر رکھتا آ رہا تھا اپنے جذبوں کو پھر شاید آج اس کے اتنا قریب ہونے کا اثر تھا جو وہ کھلنے پر آمادہ نظر آ رہا تھا۔

"خوشبو ہے، دھنک ہے، چاندنی ہے
وہ اچھے وقتوں کی شاعری ہے
بھیگے ہوئے پھول، حرف اس کے
رم جھم کی زبان میں بولتی ہے
پاتوں میں کھنکن ہے شام جیسی
لہجے میں سحر کی تازگی ہے
یہ اس کی صدا کا بھولپن ہے
یا شمع سخن پگھل رہی ہے
چہرے پہ حیا کا روپ، جیسے
دریا میں شفق سی گھل گئی ہے
آنکھوں میں گلاب کھل رہے ہیں
کیا جانے وہ کب سے جاگتی ہے
برسا ہے خمار چاندنی کا
یا اس کی جبیں دمک اٹھی ہے
کیا جانے وہ کیسے مسکرائی
ہیرے سے کرن سی چھن پڑی ہے
چہرے پہ بکھر کے زلف اس کی
سورج سے خراج مانگتی ہے
پل بھر کو سرک گیا جو آنچل
کلیوں کی طرح سمٹ گئی ہے
پروا ہی نہیں اسے کسی کی
اپنے سے وہ کتنی اجنبی ہے
آئینہ ہی دیکھتا ہو گا اس کو

آئینہ کہاں وہ دیکھتی ہے"

حسن آنکھوں کی چلمنوں میں اس کا پیکر سموئے ایک جذب کے سے عالم میں پڑھتا جا رہا تھا۔ کیمپس کی سنسان سڑک پہ گاڑی سبک خرامی سے رواں تھی۔۔۔ وہ کسی معمول کی طرح سامنے تکتا ڈرائیونگ کر رہا تھا ورنہ نگاہ تو وہ شاید طرح طرح کے رنگ بدل کے آ رہی تھی۔ کسی اسپیڈ بریکر سے گزرتے ہوئے ہلکا سا جھٹکا کھایا تو اس سحر کے عالم سے نکلا اور خود کو دل ہی دل میں سرزنش کرتے ہوئے اس نے ساتھ بیٹھی وشمہ کو گردن موڑ کے دیکھنا چاہا۔ اس کا خیال تھا جو یقیناً "اس طویل غزل پہ وہ برے برے منہ بنا رہی ہو گی۔۔۔ مگر وہ تو سیٹ سے سر ٹکائے سو رہی تھی۔ حسن بے ساختہ مسکرا اٹھا۔۔۔

وشمہ کے چہرے کو چھوتی بھورے بالوں کی ریشمی لٹ کو ہٹانے کے لیے اس کا ہاتھ آگے بڑھا۔۔۔ پھر رک گیا ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے دوبارہ سے دھیان ڈرائیونگ کی جانب لگانا چاہا۔

"میری جان۔۔۔!" پروین نے جس والہانہ انداز میں اسے ساتھ لپٹا کے ماتھے پہ پیار کیا۔۔۔ وہ پھر سے ڈانواں ڈول ہونے لگی۔ منزہ کے پڑھائے سبق ذہن سے محو ہونے لگے۔

"ماشاءاللہ بڑی پیاری صورت نکلی ہے۔"

شوکت جہاں نے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے تبصرہ کیا تو وہ کچھ اور بھی گلابی سی ہو گئی۔

"شروع سے ہی ایسی ہے۔ ذرا کسی نے تعریف کی 'ادھر یہ بیر بہوٹی بن گئی۔" پروین نے ہنستے ہوئے کہا اور رخشی بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے اپنی بیٹیوں کو دیکھنے لگیں۔۔۔ جو تینوں وشمہ کے آگے ماند پڑتی نظر آ رہی تھیں۔۔۔ خدا پہ بڑھتی عمر کے اثرات اب واضح ہونے لگے تھے۔ رِدا کا رنگ تو سانولا تھا ہی اوپر سے پڑھ پڑھ کے موٹا سا چشمہ بھی لگا لیا تھا، ثنا بس ہاشکل و صورت کی اچھی تھی قد کاٹھ بھی مناسب تھا مگر اس وقت ایسا پرامنہ بنا کے بیٹھی تھی کہ ایک کے بعد دوسری نظر ڈالنے کو دل نہ کرے۔ انھیں خواہ مخواہ پہ غصہ آنے لگا 'دل چاہا اٹھ کے جائے اور سب کی موجودگی کی پروا کیے بغیر اسے رکھ کے دو طمانچے لگائے۔

"وصی کیا مایوس ہو کر سو گیا ہے؟"

حسن نے اسے غیر حاضر پا کے پوچھا۔ وصی کو نیند بہت آتی تھی اور رات کو جلدی سونے کی عادت بھی تھی۔

"تجھے لیے بغیر میں سوؤں گا نہیں۔" وہ کمرے سے جمائیاں لیتا برآمد ہوا پھر وشمہ کو دیکھ کے ٹھٹک گیا۔ شاید باقی سب کی طرح اسے بھی اس کے آ جانے کی امید نہیں تھی بلکہ وہ تو بور ہو تا بھی رہا تھا کہ حسن نے بے کار کے آنے جانے میں اس کی برتھ ڈے کا کیک لٹکا دیا۔

"سوری۔۔۔ میں تحفہ نہیں لا سکی۔" وشمہ نے اسے اپنی جانب دیکھ کر یہ بات کہتے پایا تو شرمندہ سی کہنے لگی۔

"حسن بھائی بس کھڑے کھڑے لینے آ گئے مجھے تو تیار ہونے کی بھی مہلت نہیں دی۔"

"لو۔۔۔ ابھی اس نے تیار ہونا تھا۔ تیار ہو کے نجانے کون سی قیامت ڈھاتی۔" رخشندہ نے جل بل کے سوچا۔

ابھی تو مرے سے وصی کے چونچلے ہی پسند نہ تھے۔ جو ان کی ساس بڑے چاؤ سے اٹھاتی تھیں اور پروین احمق ان کے کہنے پہ سارا اہتمام بھی کروا لیتی۔۔۔ اتنے لاڈوں سے تو اس نے اپنے اکلوتے بیٹے کو نہ پالا تھا جس طرح اس کی پرورش کر رہا تھا۔

"چلو کوئی بات نہیں تمہارا آنا ہی میرا تحفہ ہے۔"

"ہوا!!" الیلی۔ سے وصی نے رواداری سے کہتے ہوئے کیک کاٹنے والی چھری اٹھائی اور اس سادگی سے کہے گئے فقرے نے جیسے وشمہ کے نوخیز جذبوں کو اتھل پتھل کر ڈالا۔

وصی نے پھونک مار کے موم بتی بجھا دی تھی۔ مگر وشمہ کا چہرہ اب تک لو دے رہا تھا۔۔۔ حسن نے تالیاں بجاتے بڑی دلچسپی سے دیکھا جہاں پہلے سے زیادہ گہرے رنگ پھیل رہے تھے۔

□ □ □

"ہیلو......"

دوسری جانب سے آتی گمبھیر مردانہ آواز سن کر تقدیس لرز ہی گئی۔ اگرچہ اس نے اپنے اسی اندازے کی تصدیق کے لیے یہ کال ملائی تھی مگر اس اندازے کی درستی کا اتنا یقین نہیں تھا اس لیے حیرت کے مارے کچھ بول نہ سکی۔

"تحریم... ہیلو۔" اس بار آواز میں تحیر زیادہ تھا۔ اس کے ہاتھ کپکپا گئے۔ اب تو یہ پہچان بالکل ہی محال تھا۔ تو اس کے دھیان میں ہی نہیں تھا کہ وہ اس خاص نمبر پہ تحریم کے فون سے کال کرے گی تو ظاہر ہے دوسری جانب جو بھی ہے وہ اسے تحریم ہی سمجھے گا۔ اس نے بوکھلا کے کال ڈس کنیکٹ کر دی۔

"کون ہو سکتا ہے یہ؟" کتنی ہی دیر وہ سوچتی رہی۔ تحریم سے پوچھنا فضول تھا۔ اسے بتانا ہوتا تو تب ہی بتا دیتی جب تقدیس نے بڑے دوستانہ انداز میں اس سے پوچھا تھا۔

"آپی! کوئی ہے ناں؟"

اور اس کا صاف مکر جانا یہ ظاہر کرتا تھا کہ وہ چھوٹی بہن کو اپنے راز میں شریک کرنے کے موڈ میں نہیں ہے۔

"پھر کیسے پتا لگایا جائے...... یہ آپی بھی ناں دل کی بات کسی کو بتانے والی نہیں۔ ایسے تو کچھ بھی نہیں ہونے والا بابا کو پتہ چلے گا نہ وہ کوئی عملی قدم اٹھائیں گے اور یہ اسپیشل موصوف جو بھی ہیں شاید زور ڈالتے ہوں گے آپی پر...... اپنے گھر والوں کو بھیجنے کے لیے مگر مجھے پکا یقین ہے آپی ہی گھبرا کے منع کر دیتی ہوں گی...... وہی ان کی پرانی عادت اور کومپلیکس مگر جاننا پڑے گا کون ہے یہ طرم خان...... جس نے آپی جیسی ڈرپوک سی لڑکی کو محبت کی سرحد پار کرا دی جہاں بڑے بڑوں کے کلیجے پانی ہو جاتے ہیں۔" وہ خود بخود مسکرا دی۔

تطہیر نے مشکوک نظروں سے اسے گھورا۔

"یہ اکیلے میں مسکرانے کی عادت تمہیں کب سے ہوئی؟"

"جب سے دل ہی دل میں باتیں کرنا شروع کی ہیں۔"

"دل ہی دل میں باتیں...... یعنی خود کلامی اور سوچتے سوچتے مسکرا دینا...... یہ تو خاصی خطرناک علامات ہیں۔" تطہیر فکر مند نظر آئی۔

"فکر تو کرنی چاہیے مگر میری نہیں کسی اور کی۔" وہ مسکرائی۔

"ہاں...... پاگلوں کو ایک اپنے علاوہ ساری دنیا ہی پاگل لگتی ہے۔"

وہ کتاب اٹھا کے باہر نکل گئی اور تقدیس نے ایک بار پھر اس نمبر کو دل ہی دل میں دہرایا۔ اب وہ اپنے سیل فون پہ یہ نمبر ملانے لگی مگر عین منٹ ہی دبا کے اس نے فون رکھ دیا۔

"میں اپنا تعارف تو چھوٹتے ہی نہیں کرا سکتی...... وہ آپی کو بتائے گا اور آپی...... تو یہ آپی اور میری جان ایک کر دیں گی رونا دھونا مچا کے۔ پھر؟ نہیں اپنے نمبر سے نہیں کرنا...... کہیں اس نے اس نمبر پہ دوبارہ کال کر لی یہ جاننے کے لیے کہ میں کون ہوں تو؟"

اور یہ خطرہ گھر کے نمبر سے کال کرنے میں بھی تھا۔ اس لیے اس نے سوچا شام کو مارکیٹ جائے گی تو پی سی او سے فون کرے گی۔

* * *

"خیریت؟ آپ نے اس وقت فون کیا؟"

سراج دین کے فون کرنے پہ پروین کو اتنی حیرت نہیں تھی جتنا ان کا انداز کھٹک رہا تھا...... بڑی گمبھیر سی "ہیلو" کے بعد وہ چپ سے ہو گئے تھے۔

"ہاں...... وہ بتانا تھا کہ......"

ان کے تمہید باندھنے پہ پروین کا دل تیز تیز دھڑکنے لگا۔

"میرا دوست ہے خورشید راٹھور اس کا فون آیا تھا میرے پاس۔ وصی آج کہیں انٹرویو کے لیے گیا تھا؟"

بتاتے بتاتے جس طرح بات بدل کے یہ سوال کیا گیا اس پہ پروین جھنجھلا اٹھیں۔

جوان بچے ہیں۔ اب ہر بار کہیں آتے جاتے بتاتے تھوڑا ہی ہیں۔"

بتایا ہے... نیشنل فرم میں انٹرویو کے لیے گیا تھا وہیں خورشید بھی ہیڈ آف ایچ آر ڈیپارٹمنٹ ہے۔ انٹرویو بھی تھا۔"

"تو پھر آپ اس سے کہیں ناں...... وصی کے لیے سفارش کرے۔"

نے بڑی سادگی سے کہا تھا۔ مگر نجانے کیوں سراج دین بھڑک اٹھے تھے۔

کیا ضرورت ہے اس کی سفارش کرنے کی؟"

کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ بھانجا ہے وہ آپ کا...... بیٹوں جیسا۔" پروین کی سمجھ میں ان کا رویہ نہ آ رہا تھا۔ وصی کے آگے کچھ نظر نہ آتا تھا اور کہاں یہ عالم کہ اس کی ذرا سی سفارش کرانے کے مخلصانہ مشورے پہ گئے۔

بیٹوں جیسا۔" سراج دین نے طنزیہ ہنکارا بھرا۔

سفارش کرانے والی ذلالت میں اپنے اصلی بیٹے کے لیے کیوں نہ سنبھال کے رکھوں جسے اس جیسا کچھ کیا زیادہ ضرورت ہے...... بلکہ شاید وہ تو اس کے ساتھ بھی دو قدم نہ چل سکے۔ وصی کو وہاں کسی بھی قسم کی کے بغیر جو جاب ملی ہے 'وہ ایف اے بمشکل پاس کرنے والے گدھے کو کبھی بھی نہیں مل سکتی چاہے وہ سفارش ہی کیوں نہ لے آئے۔"

وصی کو جاب مل گئی؟" پروین کو قطعاً "ملال" نہ تھا اس کا...... نہ کوئی حسد۔ عام حالات میں عام سے انداز میں دی جاتی تو ان کے لیے خوش خبری ہی ہوتی اور وہ کھل کے اپنی دلی مسرت کا اظہار کرتیں مگر جس طرح نے حسان کی نااہلی کے طعنے دیتے ہوئے یہ بات بتائی تھی چاہ کے بھی خوشی ظاہر نہ کر پا رہی تھیں۔

"ظاہر ہے خورشید نے یہی بتانے کے لیے فون کیا تھا مجھے اتنی تعریف کر رہا تھا وہ وصی کی ذہانت اور قابلیت کی اس نے یہ کہا کہ میں نے اپنی مرحومہ بہن کی اولاد کی ایسی تربیت کی ہے تو اپنے بیٹوں کو کس انداز میں پڑھایا ہوگا...... پانی پانی ہو رہا تھا میں یہ سوچ کر کہ کہیں وہ ان کی قابلیت اور تعلیم کے بارے میں کوئی سوال نہ لے۔"

"حسن کے بارے میں تو آپ جانتے ہی ہیں۔ آپ کی صحت ٹھیک نہ رہنے کی وجہ سے کاروبار پہ کتنا فرق پڑ رہا آپ کی خاطر ہی اس نے تعلیم ادھوری چھوڑ کے......"

حسان...... اس نے کس کی خاطر یہ عظیم قربانی دی؟" وہ چپ کی چپ رہ گئیں۔

"اب تو سانپ سونگھ ہی گیا ہے تمہیں اور تمہیں کیا فرق پڑتا ہے 'بچے پڑھیں یا نہ پڑھیں' تمہارے پورے میں کسی نے کالج کی شکل نہیں دیکھی...... مگر مجھے تو ہر جانب سبکی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ معراج بھائی کی آمدنی مجھ سے کہیں کم ہے...... مگر بیٹا لائق فائق ہے' اس لیے پیٹ کاٹ کاٹ کر بھی اسے آسٹریلیا میں ہیں یہ جو سوچتے ہیں کہ اس کا پھل اچھا ملے گا۔ ندا گولڈ میڈل کے ساتھ ایم ایس سی کرتے ہی شہر کے سب کالج میں لیکچرار لگ گئی...... رہ گئی...... "

وہ بھی اپنے ہی بچے ہیں...... اس پہ کڑھنے کا کیا فائدہ۔"

رہا ہوں؟" وہ دھاڑے۔

عورت...... میں اپنے ہی بھانجے اور بھتیجے بھتیجیوں کی ترقی اور لیاقت پہ کڑھ رہا ہوں؟ میں اپنا پھل آنے پہ کڑھ رہا ہوں۔"

نے کھٹاک سے فون رکھ دیا۔ پروین بڑے پژمردہ سے انداز میں پلٹیں۔ اسی وقت شوکت جہاں کی خوشی آواز سنائی دی۔

منزہ کی گاڑی کی ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھے نوجوان مگر اجڈ اور غصیلے سے نظر آتے پٹھان ڈرائیور نے سر پہ پگڑ باندھ کے اوپر بیٹھے ٹریفک کو ٹس سے مس نہ ہوتے پایا تو غصے سے بڑبڑاتے ہوئے جما کے ہارن پہ ہاتھ رکھ دیا۔ بے ہنگم سی آواز ایک ناگوار تواتر کے ساتھ گونجنے لگی۔ سوہا نے رخ پھیر لیا اور سامنے دیکھنے لگی۔

"ماڑا... پتہ نہیں کون پاغل کا بچی اے... خو بہرا ہے شاید۔" اب ڈرائیور قدرے بلند آواز میں بڑبڑایا تھا۔ منزہ نے اس سے اس طرح ہارن بجانے کی وجہ دریافت کی تھی۔

سوہا نے بیک ویو مرر سیٹ کر کے دیکھا... منزہ ڈرائیور سے کچھ کہہ رہی تھی... سوہا کی آنکھوں میں دھند چھانے لگی۔ پورے گیارہ ماہ بعد دیکھ رہی تھی وہ اپنی ماں کو... گیارہ ماہ پہلے اس کے برتھ ڈے پہ منزہ اس کے لیے گفٹ لے کر... جسے اس نے کھولنے کی زحمت کیے بغیر واپس کر دیا تھا۔

"دنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو میری ماں نے مجھے لے کر نہ دی ہو۔"

اس نے ریتا کی طرف مسکرا کے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ تب ریتا کا چہرہ فخر سے جگمگا اٹھا تھا اور منزہ کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔

پتہ نہیں کیوں جب بھی منزہ اس سے ملنے آتی تھی... وہ ایسا ہی سلوک کرتی۔ ایسی ہی بے رخی سے پیش آتی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا منزہ کے ساتھ کچھ ایسا کرے جو اسے جھنجھوڑ کے رکھ دے وہ اس طرح بچوں کی طرح رخسار پہ دو طمانچے لگائے اور اس کا ہاتھ پکڑ کے زبردستی گھسیٹتی ہوئی اپنے ساتھ لے جائے یہ کہتے ہوئے۔

"بہت بگڑ گئی ہو تم میری نظروں سے دور ہو کے... ڈانٹ تمہیں پڑتی ناں چلو میرے ساتھ... ورنہ سیدھا کر کے رکھ دوں گی تو میں بھی تمہاری ماں نہیں۔"

مگر اس کا گمان گمان ہی رہتا... منزہ اپنے آنسو پیتی خاموشی سے واپس پلٹ جاتی۔ اگلے کئی ماہ تک نہ ملنے کے لیے۔

"او بی بی کان بند کر کے بیٹھا اے سارا ٹریفک بند کر کے رکھ دیا ہے ماڑا۔"

پہلے ڈرائیور کی آواز آئی... پھر اس کی گاڑی کا دروازہ زور سے بند ہونے کی۔

سوہا نے ڈیش بورڈ میں رکھا سگریٹ کیس اور لائٹر نکالا۔ تب تک پٹھان ڈرائیور اس کے سر پہ تھا۔

"او تم اور بیٹھ کے شوق پورا کر لی اور ام لوگ خوار ہو رہی ہے۔"

"صرف خوار ہونے سے دل نہیں بھرا جواب ذلیل ہونے آ گئے ہو۔" وہ ایک لمبا سا کش لینے کے بعد بولی۔

"کیا بکواس کرتی اے... باپ کا موٹر میں بیٹھی اے تو ام کو اکڑ دکھاتی اے۔" حسب توقع وہ بگڑ گیا۔

"خان... بدتمیزی مت کرو۔" منزہ کی آواز سنائی دی۔ "کسی لڑکی سے بات کرنے کا یہ کیا طریقہ ہے؟"

"بی بی! یہ لڑکی ام کو نری لگتا اے۔"

"صرف نری؟ ابھی تو تمہیں پھینٹی بھی لگ سکتی ہوں۔"

سوہا اپنی جانب کا دروازہ کھول کے نکلی اور اس کا گریبان مٹھی میں جکڑ لیا... بے چارہ اس افتاد پہ ہکا بکا رہ گیا۔ کسی لڑکی سے اس حسن سلوک کی اسے قطعاً توقع نہ تھی اس لیے چند سیکنڈ تو وہ کچھ کر ہی نہ سکا۔

"کیا بکواس کر رہے تھے الو کے پٹھے بول اب بولتی کیوں بند ہو گئی ہے۔"

سوہا نے اس کی وقتی حیرت کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اسے زور سے دو تین جھٹکے دیے۔ وہ جیسے ہوش میں آیا ساتھ ہی اس کا غصہ بھی بھرپور انداز میں پلٹ آیا۔

"او خنزیر کا بچی... مرد پہ ہاتھ اٹھاتی ہے۔"

روکتے روکتے اس کی کلائی مروڑ رہا تھا... آس پاس کھڑے لوگ رک کر دلچسپی سے یہ انوکھی نوعیت کا واقعہ دیکھ رہے تھے... ایک پچیس چھبیس سالہ گنوار شخص اور ایک بیس اکیس سالہ خوب صورت اور ماڈرن امیرزادی ایک ہی سطح کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے گتھم گتھا تھے۔

بیچنے کے عالم میں تھی۔

نظروں کے سامنے اس کی جوان بیٹی ایک ہاتھ میں سگریٹ پکڑے دوسرا ہاتھ ایک غیر مرد کے گریبان پہ ڈالے گالیاں بکتے ہوئے سارے بازار کے لیے تماشا بنی ہوئی تھی۔ چست جینز جو ٹخنوں سے کافی اونچی تھی، کافی نیچے تک کھلے گلے والی شرٹ جو جینز تک پہنچنے میں ناکام تھی اور اسی وجہ سے اس کی کمر پشت دور تک کا بیشتر حصہ عریاں ہو کے دعوت نظارہ دے رہا تھا۔

نہیں جانتی تھی کہ وہ اتنا پھڑک کیوں رہی تھی... شاید منزہ کے ابھی تک گاڑی میں بیٹھے رہنے پہ۔ دوسرے راہ گیروں کی طرح وہ بھی اس کا تماشا دیکھ رہی تھی۔ یہ احساس اسے اور مشتعل کرتا جا رہا تھا۔ اس کا دل چاہا کہ اپنے اندر کی ساری کھولن اس دو ٹکے کے ڈرائیور پہ نکال دے اور وہ یہی کر رہی تھی۔ گالیوں سے تسلی نہ ہوئی تو اس نے دو تین زوردار تھپڑ اسے دے مارے۔

"...نشے میں ہے۔"

نے سر اٹھا کے تبصرہ کرنے والے کی جانب دیکھا جو اس کی گاڑی کے پاس ہی کھڑا تھا اور ہوس بھری نگاہ سے سوہا کو تک رہا تھا... منزہ کا سکتہ ایک پل میں ٹوٹ گیا۔ اس کے اندر باہر بہا نجر چلنے لگے۔ نظر آتے اس منظر کی ساری جزئیات ایک بار پھر واضح ہو گئیں... وہ ننگی گالیاں پھر سے کانوں میں زہر گھولنے لگیں۔ ان کے بیچ وشمہ خفت سے سرخ ہوتی ہوئی چہرہ جھکائے بیٹھی تھی اور اس کا ہاتھ منزہ کے کندھے پہ رکھے ہوئے لرز رہا تھا۔ ڈرائیور نے تھپڑ کھانے کے بعد سوہا سے باقاعدہ ہاتھا پائی شروع کر دی تھی۔ گالیوں کا سلسلہ تب سے زور و شور سے جاری تھا۔

منزہ تیزی سے گاڑی سے اتری۔ سوہا نے اسے اس جانب آتے دیکھا تو روانی سے مغلظات اگلتی پٹھان کو بھی ڈرائیور کے دھکا دیتے ہوئے وہ ہلکا سا لڑکھڑا کے پیچھے ہٹی۔

"پٹھان کی بی وار ہے... جان بوجھ کے لڑائی کے بہانے مزے لوٹ رہا ہے۔" اسی تبصرہ کرنے والے کی آواز پھر سے منزہ کے قدم روک گئے۔

اگر بیٹی کی جوانی سامنے ہو اور وہ بھی بے قابو ہوتی ہوئی تو کس کا دل نہ چاہے گا اس بارود کے ڈھیر سے ٹکرانے کا۔ وہ آہستگی سے واپس پلٹ گئی۔

سوہا نے پلٹتے دیکھا تو اس کے اندر کی آگ کو جیسے کسی نے ایک ہی پھونک میں بجھا کر رکھ دیا۔ لڑکھڑاتے قدموں سے اپنی کار کی جانب بڑھی اور ایک جھٹکے کے ساتھ اسٹارٹ کرتی ہوئی وہاں سے تیزی سے نکل گئی۔

"دماغ خراب کر کے رکھ دیا اے... کیا بدتمیز اور بے حیا لڑکی اے۔"

آگے بیٹھے پٹھان ڈرائیور نے کہا تو وشمہ چور نظروں سے منزہ کو دیکھ کے رہ گئی جہاں ضبط کے مراحل کی تمام تر تکلیف رقم تھی۔

"نظر آتا ہے بی بی صیب... لیکن ام کہتا ہے یہ امارا صیب کے پاس بھی تو اللہ کے فضل سے کم نہیں جو حرام کا کمائی ہوتا اے ناں بی بی صیب وہ ایسا ہی اولاد پیدا کرتا اے۔"

پیچھے بیٹھے دیکھ کے وشمہ کا دل چاہا وہ ڈپٹ کر ڈرائیور کو چپ کرا دے جس کی زبان مسلسل اس کی ماں کو تکلیف پہنچانے کا کام کر رہی تھی۔

"سب تربیت کی قصور ہے بی بی صیب... سب ماں آپ کے جیسا نہیں ہوتا... یہ تو ماڑا کسی بہت ہی بے حیا بے غیرت کا ورثہ ہے ماں لگتا۔"

"بس... منزہ چلائی تو وہ سہم کے چپ ہو گیا۔ پھر ذرا بے یقینی سی نظروں سے بیک ویو مرر سے اپنی بی بی کو دیکھا جس کا چلانا اس کی فطرت میں ہی نہ تھا۔

"تم نے کیا کم گھٹیا پن دکھایا ہے" ایک لڑکی کے ساتھ بھرے مجمع میں دست درازی کرتے ہوئے تمہاری غیرت اور حیا کہاں سوئی ہوئی تھی؟ کیا اسی کو مردانگی کہتے ہو تم۔"

بھرائی آواز کے ساتھ وہ کہہ رہی تھی تو ڈرائیور نے بڑی مشکل سے خود کو باز رکھا ورنہ دل تو چاہ رہا تھا لڑکی کے بارے میں ایسی ویسی بات سے کہ بی بی صاحب کانوں کو ہاتھ لگا کر اس کی مزید حمایت سے خود کو بمشکل ضبط کر پایا۔

"معاف کرنا بی بی صاحب۔"

منیبہ نے لب سختی سے بھینچتے ہوئے سیٹ کی بیک سے سر ٹکا لیا۔ اس کی پلکوں کے سرے بھیگے ہوئے تھے۔ اور ان آنسوؤں سے وشمہ کا بڑا عجیب رشتہ تھا اس کے گلے میں نمکین سے پھندے اٹکنے لگے۔

"گاڑی واپس موڑ لو۔"

اس نے ڈرائیور سے کہا تو تب بھی مڑ کے کچھ نہ کہا۔

گھر کے راستے پہ واپس مڑتے ہوئے وشمہ نے ایک بار اور اسی دل گرفتگی سے اسے دیکھا۔

"پتہ نہیں کتنے دن لگیں گے ماما کو اس ملال سے نکلنے میں۔"

☆ ☆ ☆

"سوہا۔۔۔ ادھر جلدی آؤ۔"

ربیعہ کی بات منہ میں ہی رہ گئی سوہا تیزی سے اس کے پاس سے گزرتی ہوئی اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ ربیعہ ہکا بکا اسے دیکھتی رہی۔۔۔ اور پھر اس کے کمرے کا دروازہ دھڑ سے بند ہونے پہ چونکی۔

"نخرہ باز نہیں آئے گی اس کے پاس آنے سے۔" وہ بڑبڑائی۔

اتنے سال سوہا کو گھر میں نہیں۔۔۔ پلکوں میں رکھ کے پالا تھا اس نے۔ کیسے نہ جان پاتی اس کے بگڑنے کا سبب۔

"سوہا۔۔۔ بیٹا دروازہ کھولو۔"

اس نے دستک دیتے ہوئے ملتجی لہجے میں اسے پکارا۔ حالانکہ جانتی تھی وہ جواب نہیں دے گی۔

"سوہا۔۔۔ میری جان کچھ کھا لو اچھا جوس ہی لے لو۔" دس بارہ منٹ تک وہ یونہی وقفے وقفے سے دہراتی رہی تو نگہت سے برداشت نہ ہوا۔

"بیگم صاحب۔۔۔ وہ جواب نہیں دے رہیں تو آپ ہی ہٹ جائیں دروازے سے سال بھر کی ایک بچی ہے۔"

پچھلے آٹھ سالوں سے ملازم تھی وہ اس گھر کی اور تین چار بار تو دیکھ ہی چکی تھی یہ تماشا۔

"وہ کون سا دروازہ کھولنے والی ہیں چاہے آپ رات تک کھڑی پوچھتی رہیں۔"

"میں جانتی ہوں نگہت۔۔۔ جانتی ہوں وہ دروازہ نہیں کھولے گی نہ جواب دے گی لیکن اسے یہ تو لگے کوئی اسے پکار رہا ہے۔ کسی کو اس کی فکر ہے۔۔۔ کوئی پوچھ رہا ہے اسے۔"

تکیے پہ سر رکھے بے تاثر نگاہیں چھت کے پنکھے پہ جمائے ساکت لیٹی وہ کسی بت کی طرح پڑی تھی کہ کانوں سے ربیعہ کے یہ الفاظ ٹکرائے۔ اس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں میں حرکت ہوئی۔۔۔ اور وہ بھیگ گئیں۔ اس نے مرتعش آواز کے ساتھ کہا۔

"ماما۔۔۔ آپ جائیں آرام کیجیے۔۔۔ بھوک لگی تو میں منگوا لوں گی کچھ۔"

"لیکن۔۔۔" ربیعہ نے اس کی بات پہ جو صلہ کر کے کچھ کہنا چاہا مگر اس بار وہ ہلکا سا چیخ پڑی تھی۔

"پلیز ماما۔"

اور پھر دروازے کے اس پار گہری خاموشی چھا گئی۔۔۔ کچھ دیر تک ربیعہ کی ہیل کی ٹک ٹک سنائی دی

اور پھر مکمل خاموشی چھانے کو تھی کہ اس کے سینے پہ دھرا سیل فون بج اٹھا۔۔۔ سوہا نے کوفت سے دیکھا۔ نادیہ کی کال تھی۔ جس کا نمبر اسکرین پہ جگمگا رہا تھا۔ یقیناً "اسے یہی پوچھنا تھا کہ کافی پینے کے بعد وہ ان دونوں کو پک کرنے کیوں نہیں آئی۔

سوہا نے فون آف کرنا چاہا پھر جانے اس کے جی میں کیا آئی کہ اٹھا کے فون سامنے والی دیوار پہ دے مارا۔

☆ ☆ ☆

"وحید بہت اچھے ہیں۔"

"اللہ کرے۔"

تحریم کے شرما کے جھجکتے ہوئے کہنے پہ تقدیس نے ایک مایوسی بھری گہری سانس کے ساتھ بے ساختہ کہا تو وہ اسے گھورنے لگی۔

"میرا مطلب تھا۔۔۔ یقیناً" ظاہر ہے آپ کی پسند کوئی ایسی ویسی تو نہیں ہو گی۔" وہ گڑبڑا کے وضاحت کرنے لگی۔ مشکلوں سے تو وہ کھلنے پہ آمادہ ہوئی تھی۔ اگر دوبارہ اپنے خول میں سمٹ جاتی تو وہ کیا کر لیتی بھلا اس کا۔

"بس۔۔۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اچھے ہی ہوں۔۔۔ دیکھیں نا انسان کو جانچنے پرکھنے کے لیے وقت چاہیے ہوتا ہے۔ آپ کو ملے کتنے دن ہی ہوئے ہیں۔"

"بہت کم عرصے میں وہ مجھے اتنی اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ مجھے لگتا ہے اب تک کسی نے مجھے اس طرح سمجھا ہی نہیں۔ وہ تو جیسے میرے اندر تک اتر کے ساری باتیں جان لیتے ہیں۔"

"وہ بزنس مین ہیں کیا؟"

"نہیں بھئی۔۔۔ بزنس ہے ان کا۔۔۔ الیکٹرونکس کا۔"

"اچھا مجھے لگا کسی انڈسٹریلسٹ کی اولادوں کے موصوف۔" تقدیس نے وحید کی کہی بات کا حوالہ دیا۔

"ویسے آپ کی جان پہچان کیسے ہوئی؟"

"میری ایک کلاس فیلو کے کزن ہیں۔۔۔ بلکہ کلاس فیلو بھی کہاں پچھلے سال جو ہینڈی کرافٹ کے شارٹ کورس میں ایڈمیشن لیا تھا میں نے وہاں پہ ہلکی سی جان پہچان ہوئی تھی۔ ایک بار غلطی سے میں اس دن چلی گئی جب میری کلاس نہیں تھی۔ ڈرائیور واپس چلا گیا تھا تو اسی لڑکی نے لفٹ دی تھی۔"

"اور یقیناً" اس وقت وہ اپنے کزن کے ہمراہ ہو گی۔"

"ہاں۔۔۔" تحریم نے مسکرا کے سر جھکایا۔

"پتہ نہیں وحید کو مجھ میں کیا اچھا لگا انہوں نے میرا فون نمبر بھی لے لیا اپنی کزن سے۔ پھر فون کرنے لگے مجھے۔ پہلے پہل تو مجھے یقین ہی نہیں آتا تھا تقدیس کہ کوئی مجھ میں۔۔۔ مجھ جیسی عام سی لڑکی میں بھی دلچسپی لے سکتا ہے مجھے ڈر لگتا تھا کہ کہیں یہ سب مذاق نہ ہو۔۔۔ مگر بالآخر مجھے وحید کی محبت کے آگے سر جھکانا پڑا۔"

"محبت سر جھکانا تو نہیں سکھاتی آپی!"

تقدیس نے اس کی ہتھیلی سہلاتے ہوئے ملائمت سے کہا تو تحریم الجھ کے اسے دیکھنے لگی۔

"مطلب یہ کہ بات یہاں تک ہی رکی رہے گی کیا؟ آگے بڑھانے کا کوئی ارادہ نہیں؟"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ ہی کہ کب تک آپ اپنے لیے آنے رشتوں کو مختلف حیلوں بہانوں سے واپس لوٹاتی رہیں گی۔ اس سے بہتر ہے بات کریں ماما سے۔ انہیں اپنی پسند کے بارے میں بتائیں اور وہ جو وحید صاحب ہیں انہیں کہیں کہ اپنے گھر والوں کو لے کر آئیں۔"

"نہیں تقدیس۔۔۔ ابھی نہیں۔"

"کیوں؟ کیا مسئلہ ہے انہیں؟"

"آہستہ بولو۔" ریتا نے ناگواری سے اسے ڈپٹا۔

"چلو اپنے کمرے میں۔ اسے آرام کرنے دو۔" وہ اپنا نائٹ گاؤن سوہا کی بند مٹھی میں سے آہستگی سے چھڑاتے ہوئے اٹھی۔

"وہاں جا کے کر لینا اپنی جہالت کے مظاہرے۔"

☆ ☆ ☆

"یہاں بلانے کی خاص وجہ؟"

تقدیس نے ٹیکسی سے اترتے ہوئے جناح سپر میں واقع اس ریسٹورنٹ کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"ہم ہمیشہ یہیں ملتے ہیں۔" تحریم نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔ اسے چھوٹی بہن سے بے حد شرمندگی محسوس ہو رہی تھی مگر ایک تو وہ خود ہاتھ دھو کے پیچھے پڑ گئی تھی کہ وحید سے مل کے رہے گی۔ وہ سراسر وحید سے سرسری ساذکر کیا اس اچانک ٹوٹ پڑنے والی افتاد کا تو وہ بھی ایک دم ہی ... کہ اپنی بہن کو ضرور لے کر آؤ۔

"اگر تم اسے مجھ سے ملانے میں ٹال مٹول سے کام لوگی تو وہ کیا امپریشن لے گی میرا۔ یہی سمجھے گی کہ کوئی فلرٹ لڑکا بے وقوف بنا رہا ہے اور پکڑے جانے کے خوف سے ملنا نہیں چاہ رہا۔ تم لے کر آؤ تاکہ اسے پتہ چلے کہ اس کا ہونے والا بہنوئی کوئی ایسا ویسا بندہ نہیں ہے۔"

اس بات پہ تحریم کا دل کھل سا گیا۔ کبھی کبھی ہی تو وحید ایسی کوئی حوصلہ افزا بات کیا کرتا تھا۔

"دراصل وحید کا اسٹور اسی مارکیٹ کے قریب ہے انہیں لنچ پہ یہاں آنا قریب پڑتا ہے اس لیے۔"

"ہنہ۔" تقدیس نے ریسٹورنٹ کے گلاس ڈور کو دھکیل کر اندر جاتے ہوئے زیر لب دہرایا۔ یہاں کا لنچ شاید ہزار یا بارہ سو پر ہیڈ تھا۔ "مزے آ گئے بھئی تمہارے وحید صاحب کے۔"

اس نے فوراً یہ اندازہ قائم کر لیا کہ وحید جو اس سے کسی انڈسٹریلسٹ باپ کا اکلوتا وارث ہونے کا ... سے بڑھ کر بزنس مین ہونے کا دعوا کرتا ہے اصل میں ہوگا کوئی ٹٹ پونجیا۔ جو اچھے کھاتے پیتے گھرانے کی سادہ لڑکی کو احمق بنا کے اس کے طفیل اچھے ہوٹلوں میں عیش کیا کرتا ہے۔ نجانے گفٹ وغیرہ بھی بٹورا کرتا ہے۔

"آپ کی ساری پاکٹ منی تو مہینے میں یہاں تین چار بار وحید صاحب کو لنچ کرانے میں ہی اڑ جاتی ہوگی۔ مارکیٹ بھی نزدیک ہے بعد میں کوئی شاپنگ وانگ گفٹ شفٹ۔"

بظاہر مسکراتے ہوئے ہلکے پھلکے دوستانہ انداز میں اس نے ٹٹولنا چاہا۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" تحریم کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔

"وحید بالکل پسند نہیں کرتے کہ میں ان کی ذات پہ ایک آنہ بھی خرچ کروں۔ ان کی مردانہ انا پہ کاری ضرب ہے۔ حتیٰ کہ پچھلے دنوں ان کی برتھ ڈے پہ میں نے گفٹ دینا چاہا تب بھی بہت بحث کے بعد صرف بوکے لینے پہ رضامند ہوئے۔ لنچ اور شاپنگ تو تم رہنے ہی دو۔ وہ آج کل کے چھچھورے لڑکوں جیسے نہیں۔"

وہ اتنے یقین سے کہہ رہی تھی کہ تقدیس کو اعتبار کرنا ہی پڑا۔

"پھر کیا وجہ ہو سکتی ہے کہ وہ ندہ فون پہ بات کے دوران ہی مجھے بری طرح کھٹک رہا ہے۔" وہ سوچنے لگی۔

"آ گئے وحید۔"

تحریم کی دبی دبی جوش میں ڈوبی آواز پہ اس نے چونک کر دیکھا۔ وہ دونوں گلاس ونڈو کے ساتھ والی ٹیبل پہ تھیں اور پارکنگ ایریا صاف نظر آ رہا تھا۔ چمکتی نئی کرولا کا دروازہ کھل رہا تھا۔ تقدیس کا اس کی ہیئت میں قائم پہلا اندازہ ذرا ڈانواڈول سا ہو گیا۔ اس نے قصداً نگاہیں پھیر لیں۔ وہ ظاہر نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس شخص کے ساتھ اپنی دلچسپی اور تجسس۔

"آئی ایم سو سوری۔ آپ کو ویٹ کرنا پڑا۔"

بے حد شائستہ لب و لہجے اور گمبھیر آواز میں تقدیس نے سر اٹھا کے سامنے کھڑے خوش لباس شخص کو دیکھا۔

... بیت من گلا صاف کرتے ہوئے مسکرا کے کہہ رہا تھا۔

... کو حیرت کا شدید دھچکا لگا۔

... "آپ کیوں معذرت کر رہے ہیں۔ ہم ہی شاید کچھ زیادہ جلدی آ گئے۔"

... خود اعتمادی ویسے بھی کہیں گفتگوؤں میں سر دیے بیٹھی رہتی تھی مگر اس وقت اس کی شخصیت کچھ زیادہ ... لگ رہی تھی۔ تقدیس کو اس کا معذرت خواہانہ لہجہ برا ہی کھلا۔

... تو کچھ جلدی بھی نہیں، صرف ساڑھے تین منٹ پہلے آئے تھے مقررہ وقت سے اور یہاں بیٹھے بیٹھے ... ہوچکے ہیں۔ اتنی معذرت کرنا تو فرض ہے ان پہ۔"

... جتاتے ہوئے خشک لہجے میں کہا۔

... "مجھے پتا ہوتا یہ کوڑیا حساب کتاب کی اتنی ماہر ہے تو میں خود اٹھارہ منٹ پہلے آ جاتا۔"

... والی مسکراہٹ ہونٹوں پہ پھیلا کے اسے دیکھ رہا تھا اور تقدیس کو اس بناوٹی لہجے، زبردستی کی ... اور اوپرے الفاظ سے سخت وحشت محسوس ہو رہی تھی۔ وہ سر جھکا کے لیمن سوڈا پینے لگی۔ کوئی بھی ... جیسے الجھ ...

... "بہت اچھی لگ رہی ہو، کوئی خاص وجہ؟"

... مسکرا کے تحریم کی تعریف کر رہا تھا مگر اسے لگا جیسے تعریف کے پردے میں طنز کر رہا ہو۔

... "آج؟" اس نے چھیڑتے ہوئے انداز میں کہا تو تحریم جو وحید کی بات پہ انکساری سے مسکرا رہی تھی ... نگاہوں سے دیکھ کے رہ گئی۔

... مطلب ہے۔" وہ سنبھل سنبھل کے کہنے لگا۔ "آج پہلے سے... یعنی معمول سے کہیں زیادہ اچھی لگ ... تحریم۔"

... کے بعد اس نے تقدیس کو مخاطب کرنے کی حماقت نہیں کی اور وہ اور تحریم دھیمی آواز میں کچھ باتیں کرنے ... تقدیس بظاہر انجان بنی لیمن سوڈا کے ڈرنک لے رہی تھی اور نگاہیں یہاں وہاں.... تقریباً خالی پڑی ٹیبلز پہ ... تھیں مگر دھیان سارا کا سارا وحید کی جانب تھا۔

... فٹ تین انچ کے قریب قد.... مناسب اور درمیانی جسامت۔

... رنگ سانولا چہرے پہ مہاسوں کے نشان اور گڑھے چھوڑ گئے تھے جو کبھی نوعمری میں نکلے ہوں گے۔

... عیار قسم کی گول گول آنکھیں جن کے دیدے بے حد متحرک اور بے چین تھے۔ پان یا شاید سگریٹ سے ... ہوئے بدنما اور بے ڈھب دانت.... عمر بھی ہوگی کوئی پینتیس اڑتیس کے آس پاس۔

... سرسری سی نظریں ڈالنے کے بعد ہی اس کا جی متذبذب ہو گیا پھر اچانک ایک خیال کوندا۔ اتنی عمر ہونے کے ... نوعمر چھوکروں کی طرح ہوٹلوں میں بیٹھا ڈیٹ کیوں مار رہا ہے؟

... "آپ کے گھر میں کون کون ہے؟"

... اچانک سوال کیا کہ وحید واضح طور پر بوکھلا گیا۔ شاید اسے کافی دیر سے لاتعلق بیٹھی اس لڑکی کے ... کی۔

... "سب ہی ہیں..." گلا کھنکھارنے کے بعد اس نے قدرے توقف سے کہا۔

... بہن بھائی... ایک والدہ..."

... "شادی شدہ ہیں؟"

... میں اکلوتا سہارا ہوں اپنے گھرانے کا۔" وہ اچانک بڑا مدبر بڑا سنجیدہ نظر آنے لگا۔

... والد کی وفات کے بعد کاروبار اور فیملی کی ساری ذمہ داری میرے ہی ناتواں کاندھوں پہ ہے۔"

... تو آپ کسر نفسی سے کام لے رہے ہیں۔ اچھے بھلے "سیمپور" شخص ہیں آپ... ناتواں کاندھے ...

اس نے مسکراتے ہوئے "بیچیورز" پہ خاصا زور دے کر کہا۔ وہ جز بز ہو کے رہ گیا۔

"میں اس وقت کی بات کر رہا ہوں جب میرے والد گزرے تھے، تب میری عمر صرف اکیس سال تھی۔"

"اوہ..." اس نے متانت سے سر ہلا دیا۔ ایسی متانت اور بردباری جو وحید کو حیران کر رہی تھی کیونکہ عام طور پر لڑکیوں کا خاصا نہیں ہوتی۔ وہ تو سمجھا بیٹھا تھا جیسی عقل سے پیدل' تحریم خود ہے' ویسی اس سے کوئی بڑی بہن ہوگی یا شاید اس سے بڑھ کے ہو۔ اپنی کم عمری کی وجہ سے۔

"آپ کی بہنوں کو تو بہت شوق ہوگا آپ کے سر پہ سہرا سجانے کا؟" وہ اس کے اب تک کنوارے رہنے کے معمے کو حل کرنا چاہ رہی تھی۔

"بے شک... یہ تو فطری سی بات ہے۔ میری والدہ کو بھی بڑا ارمان ہے میرا گھر جلد سے جلد بس جائے۔"

"تو پھر...؟" تقدیس نے ادھورا سا سوال کر کے چھوڑ دیا۔

"تو یہ کہ میری والدہ اور بہنوں کی خواہش سے کہیں بڑھ کے میری یہ خواہش ہے کہ میں اپنی چاروں بہنوں کو جلد از جلد ان کے گھر کا کر دوں۔ چاروں چھوٹی ہیں مجھ سے۔ ایک ابھی تعلیم سے فارغ ہوئی ہے دو پڑھ رہی ہیں۔ سب سے بڑی اسکول ٹیچر ہے اور اس کی منگنی ہی بڑی مشکل سے کی ہے میں نے اسے رخصت کرنے کے بعد کم از کم ایک اور بہن کی شادی اور دوسری کی منگنی کرنے کے بعد اپنے بارے میں کوئی فیصلہ کروں گا۔ چار سب سے چھوٹی کی شادی میں تو ابھی پانچ چھ برس ہیں۔ دراصل لڑکیوں کے رشتے دو وجہ سے جلد ہوتے ہیں یا تو ان کی غیر معمولی حسن ہو یا پھر بے شمار دولت۔ میری بہنیں قبول صورت ہیں اور مالی حالات سے ظاہر ہے میں اتنا امیر نہیں ہوں خاندان کا ٹھیک ٹھاک گزارا ہو رہا ہے مگر ہر بہن کو جہیز میں کروڑوں کی مالیت کی جائیداد تو نہیں دے سکتا، ہاں ابھی بساط بھر کوشش کر رہا ہوں کہ ان کے لیے زیادہ سے زیادہ جتنا بھی ہو سکے جمع کر لوں تاکہ ان کی معمولی شکل صورت کو نظر انداز کر کے کوئی..."

اس نے بات ادھوری چھوڑ کے ایک گہری سانس بھرتے ہوئے تحریم کی جانب دیکھا جو افسردہ سے تاثرات لیے اپنے ناخن سے ٹیبل کی سطح کھرچ رہی تھی۔ تقدیس نے لفظ "معمولی شکل و صورت" پہ اس کو رنگ بدلتے بھی دیکھا تھا۔ وہ الجھ کے وحید کا جائزہ لینے لگی۔

اس کی ظاہری شکل و صورت' بناوٹی مسکراہٹ اور عیار و مکار سی آنکھیں مسلسل اسے کھٹک رہی تھیں اور کسی گڑبڑ کی نشاندہی کر رہی تھیں۔

دوسری جانب اس کی لچھے دار گفتگو میں ایسا کوئی سقم نہ تھا جس سے وہ گرفت میں آتا۔

اس نے اس معاملے کو کسی اور طریقے سے حل کرنے کا سوچا۔ "اچھا... میں بھی ساتھ چلوں گی۔"

ندا کو شولڈر بیگ اٹھاتے ہوئے دیکھ کر وصی نے جلدی جلدی بالوں میں برش پھیرتے ہوئے کہا۔

"لیکن تمہارا ٹائم تو..."

"ہاں... وہ سر نے آج میٹنگ کے لیے جلدی بلایا ہے۔"

"چلو پھر... ورنہ وصی کے ہارن پہ ہارن بجنا شروع ہو جائیں گے۔"

ندا کے کالج آنے جانے کا مسئلہ جوں کا توں تھا۔ وین یا بس پہ وہ جانے کو تیار نہ تھی اور اپنی گاڑی لینے کی اس کی خواہش کے آڑے وصی آ رہا تھا۔ سو یہ فریضہ بھی اس کے سر ہی سونپا گیا۔ اب وہ پک اینڈ ڈراپ کرنے کی ڈیوٹی نبھا رہا تھا۔ ندا کے کالج اور اس کے آفس جانے کی ٹائمنگ ایک ہونے میں آ جانا' قسمت تھی ہمارا رز بالکونی سے دیکھ دیکھ کر کڑھا کرتی۔ کاش وہ بھی کبھی وصی کے ساتھ... اس کے جانے کا وقت بھی تو نرالا تھا۔

"آہا... آج تو بڑے بڑے لوگ سیاہ رنگ سی آف کرنے آئے ہیں۔"

وصی نے اسے آتا دیکھ کے جملہ کسا۔ وہ کچھ کہے بغیر پچھلی جانب کا دروازہ کھولنے لگی۔

ندا کے کالج کی اور میرے آفس کی ٹائمنگ بھی ایک ہی ہے اور روٹ بھی۔ انہیں ڈراپ کرنے کے بعد شہر کے دوسرے کونے پہ پہنچنے جاؤں گا تو آفس سے لیٹ نہیں ہو جاؤں گا۔"

"پک اینڈ ڈراپ کرو' ٹائم بھی بچے گا اور میرا دماغ بھی۔" آخری الفاظ اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کے کہے۔

"نہیں' میری کلاس مس ہو جائے گی۔ پہلے مجھے۔" ندا نے مداخلت کی۔ جلا بھنا وصی مسلسل بڑبڑاتا رہا اور قلق ہما اپنے دل ہی دل میں ٹھونکتی رہی۔

ایک تو مرے اس کی قربت کے۔ بڑا ترس رہی تھی نا۔ اس کی گاڑی میں بیٹھنے کے لیے جیسے تمہیں ساتھ بٹھا کے سیدھا چاند پہ لے جائے گا یا شہر کنارے روک کر ہاتھ پہ ہاتھ رکھ کے گانا ہی گانے لگ جائے گا۔

مجھے تو ہمارے تلخ تجربے کے بعد بھی باز نہیں آئی۔

"تھینکس..."

تب چونکی جب ندا آپی نے اترتے ہوئے ٹھک سے دروازہ بند کیا۔

"میں یہیں اتر جاتی ہوں۔" اس نے وصی کے چہرے پہ کوفت اور دیر ہو جانے کی جھنجلاہٹ دیکھ کر کہا۔

"یہاں کیا بانٹے بٹ رہے ہیں؟" وہ چڑچڑے پن سے پھاڑ کھانے کو دوڑا۔

"زرا آفس نزدیک ہے تم جاؤ۔ میں رکشہ لے لیتی ہوں۔"

حسب توقع اس نے خاصی پس و پیش نہ کی۔ وہ بجھے دل کے ساتھ گاڑی سے اتری اور دو چھوٹے قدم اٹھا کے گردن گھما کے دیکھا۔ وہ زن سے گاڑی آگے بڑھا کر جا چکا تھا۔

بارہ بجے کے قریب معتزہ اور دو تین سہیلیاں لینے والے میٹرک کے اسٹوڈنٹس کو حالی کی نظم کی تشریح کرواتے ہوئے اس کا بارہا دل چاہا یہاں سے بھاگ جانے کو۔ ادھار — تنخواہ ملتے پہ چکانے کا وعدہ کر چکی ہوئی تھی، یہ بیزار بھی گزرتی گئی...

○ ○ ○

"مصیبت ہے...؟"

اس نے زور سے اسٹیئرنگ پہ ہاتھ مار کے بڑبڑا کے رہ گیا۔

"زرا دیر ہو جائے تو کیا ہے مگر یہ خاتون نہیں سدھر سکتیں۔ پتہ نہیں قوم کی معصوم بچیوں کو کیا پڑھاتی ہوں گی یہ۔"

اسے ندا کی مظلوم اسٹوڈنٹس پہ ترس آنے لگا اور سخت خراب موڈ کے ساتھ اس نے یوٹرن لے کر گاڑی واپس ندا کے کالج والے روڈ پہ ڈالی۔ ندا اپنی لاپروا طبیعت کی مہربانی سے خالی ہاتھ باڈی کالج چلی گئی تھی۔ اس کی وہ فائلیں یہیں دھری کی دھری رہ گئی تھیں جو یقیناً "ضروری" ہوں گی۔ جب ہی تو وہ ساتھ لائی تھی۔ پہلے تو دل چاہا سیدھا آفس چلا جائے' بھاڑ میں جائیں فائلیں لیکن جانتا تھا جیسے ہی اسے فائلیں یاد آئیں گی' فون پہ فون آنا شروع ہو جائے گا اور آفس ایک بار جانے کے بعد دوبارہ نکلنا خاصا مشکل تھا۔ یہ بھی ہو سکتا تھا کہ وہ فائلوں کی خاطر سیدھی گھر جائے لیکن اس صورت میں زیادہ خواری ہو سکتی تھی۔ پہلے تو فون پہ رو رو کے سیلاب لائے گی پھر منت سماجت کر کے گھر جانے کو کہا جائے گا۔

"کیا تو نے سوچا ہے کہ میں انہیں من ہانی کرنے دوں' لے لیں اپنی کار اور روڑاتی پھریں ہر جگہ۔" اس نے جو سوچا وہ ظاہر ہے صرف سوچا ہی جا سکتا تھا' جو خاتون اپنی ضروری فائلیں کار میں گھر کی چابیاں کمرولاک ہونے کے بعد کمرے ہی کے اندر' اور پانی نکالتے ہوئے والٹ فریج میں رکھ کے بھول سکتی ہے' کیا بعید کے پارکنگ سے گاڑی پارک کرنے کے بعد نکالنا بھول جائے اور رکشے میں گھر آ جائے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پارکنگ سے نکلتے اور اپنی ہی گاڑی کا نمبر بھول جائے۔

کافی دیر تک کالج کے گیٹ کے سامنے جھنجلا کر سوچتے رہنے کے بعد اس نے موبائل فون نکالا اور ندا کا نمبر ملایا۔ دوسری جانب نمبر آف مل رہا تھا۔ کلاس میں جاتے ہی وہ فون آف کر دیا کرتی تھی۔

"اف... جاتے ہی لیکچر دینا شروع کر دیا اور فائلز کا ہوش نہیں۔" وہ اور جل گیا۔

فائلز اٹھا کے وہ گاڑی سے نکلا اور گیٹ تک آیا تاکہ گیٹ کیپر کے ہاتھ اندر بھجوا سکے مگر اس وقت بھی کوئی تھا۔ عین اسی وقت ایک لمبی سی سیاہ مرسڈیز گیٹ کے سامنے رکی اور باوردی ڈرائیور نے نکل کر پچھلا دروازہ کھولا تو وہ بھی وہاں متوجہ ہوگیا۔

"شاید کوئی ٹیچر یا اسٹوڈنٹ ہے' اس کے ہاتھ اندر بھجوا دیتا ہوں۔"

اس نے ایک ہی قدم آگے بڑھایا تھا کہ کار سے برآمد ہوتی اس لڑکی کی ایک جھلک نے اسے ٹھٹک جانے پر مجبور کردیا۔

❁ ❁ ❁ ❁

"کیا ہوا تھا اماں کو؟"

تین گھنٹے تک ڈاکٹروں کے ساتھ مغز ماری اور اس لیب سے اس لیب تک چکر کاٹنے کے بعد نوید مرزا لمبے سانس لے رہے تھے۔

"وہی بدپرہیزی۔" منزہ نے دبے لہجے میں کہا۔

"مگر کیسے؟ جبکہ تم ان کے لیے خاص پرہیزی کھانا تیار کرتی ہو' باقاعدہ چارٹ بنا رکھا ہے تم نے اور وہ ایک قدم تک اٹھانے کے قابل نہیں پھر کیسے ہوئی یہ بدپرہیزی۔"

"میرے پرہیز کرانے کا کیا فائدہ؟ میں تو ان کے بھلے کے لیے پرہیزی کھانا پکاتی ہوں۔ ایک ایک قطرہ گن کے ڈالتی ہوں مگر سب کو تو یہ نظر نہیں آتا۔ کچھ کا تو یہ خیال ہے کہ میں نے ان پہ دنیا کی نعمتیں جان بوجھ کے بند کر رکھی ہیں۔ ان کی حالت پہ رونا رویا جاتا ہے' وہ بھی ان کے سرہانے بیٹھ کے۔ ایسے میں مریض کی حالت کیا سنبھلے۔ وہ خود بھی اپنے آپ پہ ترس ہی کھانے لگے گا۔ دل مچلے گا الٹا سیدھا وہ سب کچھ کھانے کو جس سے میں نے محروم کر رکھا ہے۔"

وہ بھی جیسے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔

"تمہارا مطلب ہے پروین؟"

"اور کون ہے؟ اماں خود چل کے کچن جا نہیں سکتیں۔ میں یا وشمہ ایسی بے وقوفی کر نہیں سکتیں کہ شوگر' بلڈ پریشر اور انجائنا کی اس پیشنٹ کو گاجر کا حلوہ کھلا دیں جو پچھلے کئی سالوں سے فالج کا بھی شکار ہیں۔"

"پروین ایسی حماقت کیسے کر سکتی ہے؟"

"میں تو اتنی عادی ہوگئی ہوں اس کے رویے کی کہ اب توجہ دینا ہی چھوڑ دی تھی لیکن مجھ سے بالکل نہیں دیکھی جا رہی تھی اماں کی یہ حالت۔ میرے اتنے سالوں کے کیے کرائے پہ پانی پھیر دیا پروین نے۔ گاجر کا حلوہ گھی سے بنا یا وام کھویا۔ اف۔ اماں کی تباہی کا پورا سامان۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے آنکھیں رگڑ رہی تھی' جب نوید نے ہسپتال کے کاریڈور کے آخری سرے سے اتنی حیران نمودار ہوتی پروین کو دیکھا۔

"میں اماں کے پاس جاتی ہوں۔"

منزہ نے پروین کو دیکھا مگر نہ دیکھنے کی ایکٹنگ کرتے ہوئے آئی سی یو کی جانب بڑھ گئی۔

"کیا ہوگیا اماں کو بھائی جان! ان میں اب کہاں سکت رہی تھی کسی اور بیماری کو جھیلنے کی۔"

وہ سسکتی ہوئی نوید کے سینے سے لگیں' نگران کا ہاتھ دلاسہ دینے کے لیے بہن کے سر کی جانب بڑھا۔ پروین کو کسی خالی پن کا احساس تو ہوا مگر بھائی کے عجیب و غریب رویے کو اس کی پریشانی پہ محمول کر کے پوچھنے لگیں۔

"ابھی کل تک تو اماں بھلی چنگی تھیں' میں خود دیکھ کے آئی تھی' بات بات پہ مسکرا رہی تھیں۔ پیلی آنکھوں میں آنسو بھر آتے تھے جیسے کسی معمول کی طرح رہتی تھیں۔ بھا دیا' بیٹھ سکیں۔ گلاس ہونٹوں سے لگا دیا' گھونٹ بھر لیا۔ جو منہ میں ڈالا' بے دلی سے نگل لیا مگر کل خود ہاتھ سے پرے کر رہی تھیں' اپنے ہی

نکالا ہے مجھے سمجھایا انھوں نے کہ میٹھا کھانے کو جی کر رہا ہے۔"

تم نے کھلا دیا؟" نوید نے خشک لہجے میں پوچھا۔

ٹک گئی۔ غور سے بھائی کی آنکھوں میں جھانکا اور کسی گہرے احساس نے ان کے ہاتھ پیر سن کر دیے۔

"صرف۔۔۔ صرف ایک چمچ۔" انھوں نے مجرمانہ انداز میں سر جھکایا۔ اب جا کے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا

بھائی جان! دراصل۔۔۔ وہ اماں۔۔۔ پتہ نہیں کیا ہوگیا تھا۔"

شرمساری اور التجا کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ کہہ رہی تھیں۔

بیمار کا کسی چیز کے لیے خواہش ظاہر کرنا بھی تو اچھی علامت ہے۔ مجھے لگا اماں کے اندر جینے کی خواہش امید جاگی ہے زندگی کی' بس اسی لیے۔۔۔ مگر بھائی جان صرف ایک چمچے سے تو ان کا یہ حال نہیں ہو سکتا۔"

ان کو ہارٹ اٹیک ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے ہوا ہے اور ہائی بلڈ پریشر یا تو کسی ٹینشن یا ذہنی دباؤ سے ہو سکتا ہے یا بدپرہیزی کی وجہ سے۔ تم نے خود دیکھا کہ کل تک تو انہیں کوئی فکر یا پریشانی نہیں تھی پھر ظاہر ہے کہ بدپرہیزی کی وجہ سے وہ اس حالت کو پہنچی ہیں۔ مجھے تم سے اس بے وقوفی کی امید نہیں تھی پروین!"

اپنی صفائی میں جو کہنا چاہتی تھیں اور جو کچھ بھی کہنے کے قابل تھیں' وہ سب تو کہہ چکی تھیں۔ اب اور کہنا جو تھیں' چپ چاپ آئی سی یو میں زندگی اور موت کی کشمکش میں گرفتار ماں کو دیکھتی اور آنسو بہاتی رہیں۔ ضد میں وہ اس سے بھی زیادہ حماقت کا ثبوت دے سکتی ہے۔"

قت عادت منزہ خاصا بول رہی تھی' جو نوید کے لیے بھی باعث حیرت تھا۔

آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ کچھ غلط نہیں کہا میں نے۔ میں کچھ جتاتی نہیں' آپ کو تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ آپ دیتے کچھ بتاتا ہو۔ میں ہمیشہ سب کچھ نظرانداز کرتی رہی' مگر حد ہوتی ہے کسی بات کی۔ صرف مجھے نیچا دکھانے کے لیے پروین نے بیمار ماں تک کو۔۔۔"

ان کا گلا رندھ گیا اور نوید ہارڈ پریشر ککر کی طرح اندر ہی اندر پھنکارنے لگے۔

عشرت بیگم کا کمزور وجود اس اٹیک کو سہار نہ پایا اور رات کے آخری پہر وہ اپنا اعمال نامہ سنبھالتی لرزتی کانپتی اپنے رب کے حضور پیش ہوگئی۔

✿ ✿ ✿

"یہ کتنے کا ہے۔"

سیلز مین سے کہتے ہوئے تقدیس متلاشی نظروں سے اسٹور کا جائزہ بھی لے رہی تھی۔

خاصا بڑا اسٹور تھا' ہر طرح کے الیکٹرانکس ویئر کی وسیع رینج موجود تھی۔۔۔ مائیکروویو اوون سے لے کر واشنگ مشین اور ٹی وی کی نگہداشت سات آٹھ افراد پہ مشتمل عملہ اسے سرگرم نظر آ رہا تھا مگر وحید کا نام و نشان نہ تھا۔

"یہ بیسٹ ڈیل ہے کمپنی کی۔ اس میں بیک وقت آٹھ سلائس ٹوسٹ ہو سکتے ہیں۔"

سیلز مین کے کہنے پر اس نے بے دلی سے ایک نظر سامنے رکھے دو تین کمپنیوں کے ٹوسٹرز پہ ڈالی۔

"یہ ماڈل لیٹسٹ ہے' میکر کی نئی رینج آئی ہے۔ وہ چیک کریں گی آپ؟"

اس نے اس کی بے توجہی بھانپ کر کہا۔

"ایک مہینہ پہلے بھی میں اس دن میں آئی تھی تو میں نے کوئی اور ٹوسٹر پسند کیا تھا تب میں لے نہیں سکی' وہ اب نظر نہیں آرہا۔"

"کس کمپنی کا ہے؟"

"نام مجھے یاد نہیں۔"

"میڈم! اس وقت جتنے برانڈز مارکیٹ ہیں' میں نے آپ کو دکھا دیے ہیں۔ کیا اسی اسٹور پہ پسند کیا تھا

"جی۔۔۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے اور یہ بھی کہ اس دن مجھے کسی سیلز مین نے نہیں' خود اس اسٹور کے مالک نے ڈیل کیا تھا۔"

"وحید صاحب نے؟" وہ اچنبھے سے بولا اور تقدیس کا کچھ دیر پہلے لگایا اندازہ بھی زمیں بوس ہو گیا۔ اسے لگ رہا تھا کہ وحید کا اس اسٹور سے کوئی تعلق نہیں۔ وہ یونہی گپ چھوڑ رہا ہے۔

"کمال ہے۔۔۔ وہ کسٹمرز کو یوں ڈیل کرتے تو نہیں۔"

زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ ٹوسٹرز اٹھانے لگا۔ اس سے ذرا فاصلے پہ کھڑے دوسرے سیلز مین نے دبی آواز میں کہا۔

"کسٹمر لیڈیز ہوں تو کر بھی لیتے ہیں۔"

اگرچہ آواز بے حد ہلکی اور مسکراہٹ مبہم تھی مگر تقدیس نے بخوبی سن بھی لی اور دیکھ بھی لی۔ خاموشی سے وہ اسٹور سے نکل آئی۔

اس نے ایک متلاشی ہوئی نظر اسٹور کے باہر کھڑے سیکورٹی گارڈ کو دیکھا جو گن سنبھالے بیٹھا تھا۔ کچھ سوچ کر آتے خیال کو جھٹک کر اس نے قدم آگے بڑھائے۔

اور اگلی نظر اسٹور کے سامنے بنے پارکنگ ایریا کے ایک کونے میں ڈالی جہاں زمین پہ چادر بچھائے فال والا طوطا لیے ایک شخص بیٹھا تھا۔ اگلے ہی لمحے وہ اس کے سامنے بچھی چادر پہ پچاس کا نوٹ رکھ رہی تھی۔

"چل میرے بادشاہ! بی بی کو فال نکال کے دے۔"

"مجھے طوطے سے نہیں' آپ سے کچھ جاننا ہے۔"

"بی بی ہمارا علم تو یہی ہے' جو ادھر بیٹھا۔ وہ سامنے والے پلازہ کی بغل میں پروفیسر حمیدی بیٹھتا ہے' وہ ہاتھ دیکھ کے بتاتا ہے لیکن بی بی! میں کہتا ہوں جو علم اس بے زبان کے پاس ہے' وہ اس پروفیسر کے پاس نہیں۔ وہ کسی لالچ یا کسی مجبوری میں جھوٹ بھی بول سکتا ہے اور سچ بھی چھپا سکتا ہے مگر یہ معصوم وہی کرتا ہے اور وہی بتاتا ہے جس کا اسے اشارہ ہوتا ہے۔"

"اور آپ مجھے وہ بتائیں جو آپ جانتے ہیں' اس اسٹور کے اور اس کے مالک کے بارے میں۔"

اب کے وہ ٹھٹکا' غور سے سامنے بیٹھی لڑکی کی جانب دیکھا جس نے بڑی سی سرمئی چادر اس ڈھنگ سے اوڑھ رکھی تھی کہ نہ جسم کے خطوط واضح ہو رہے تھے' نہ چہرے کے خدوخال کا صحیح طرح اندازہ ہو رہا تھا۔ آدھے سے زیادہ چہرہ چادر تلے پوشیدہ تھا۔ لیکن اتنا تو وہ بھانپ سکتا تھا کہ یہ کوئی نوجوان لڑکی ہے اور لب و لہجے سے اس کے کسی اچھے خاندان سے ہونے کا اندازہ بھی ہو رہا تھا۔

"یہ دس روپے لے کر فال نکالنے والا طوطا ضرور پچاس کا نوٹ دیکھ کے اوقات سے باہر ہو سکتا ہے بابا! لیکن میرا منہ کھلنے کے لیے یہ پیسہ کم ہے۔"

تقدیس نے چپ چاپ سو سو روپے کے دو نوٹ نکال کر سامنے رکھ دیے۔

"وحید نام ہے اس دکان کے مالک کا۔"

"اتنا تو مجھے پتا ہے۔" وہ بے تابی سے بولی۔

"سیٹلائٹ ٹاؤن میں کوٹھی ہے۔ ایسی دو دکانیں شہر میں اور بھی ہیں۔ ایک گل ریز میں' دوسری صدر میں۔ صدر والی میں اس کا باپ بیٹھتا ہے اور گل ریز والی میں بڑا بھائی۔"

"باپ۔۔۔ بڑا بھائی۔۔۔؟" اسے حیرت کا جھٹکا لگا۔

"اور۔۔۔ جلدی بتاؤ۔" مگر وہ اس کے بے تابانہ سوالات نظر انداز کرتا انگلی کان میں گھماتے ہوئے دوسری جانب تکنے لگا۔ تقدیس نے چڑ کے پانچ سو کا نوٹ اس کے آگے پھینکا۔

"چار بہنیں ہیں اس کی؟" تقدیس نے وحید کے بیان کی تصدیق چاہی۔

"شادی شدہ ہیں' دو بیاہی' ایک کنواری۔"

"تم سچ کہہ رہے ہو؟" اچانک تقدیس کو شبہ سا گزرا کہ کہیں یہ شخص صرف رقم کی لالچ میں اپنی طرف سے گھڑ کر جواب نہیں دے رہا۔ بھلا اسٹور کے باہر بیٹھنے والے اس مفلوک الحال شخص کو اسٹور کے مالک کے گھریلو اندرونی حالات کا کیا علم۔ اس کی کتنی بہنیں شادی شدہ ہیں اور کتنی غیر شادی شدہ' یہ اتنے وثوق سے کیسے بتا سکتا ہے۔

"بی بی مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے بی بی! یہ تو کھلا سچ ہے۔ میں جھوٹ کیوں گا تو کسی دوسرے کو پکڑ کے پوچھ لیں' سارے جانتے ہیں۔ وحید صاحب کا ایک بہنوئی تو ادھر بڑی طرف پراپرٹی کا دفتر کھول کے بیٹھا ہے اور وہ جو گورا لالہ ہے جو وحید صاحب کا بہنوئی بھی ہے اور سالا بھی' وہ ڈاکٹر ہے۔ آتا جاتا رہتا ہے ادھر۔"

"سالا بھی' کیا مطلب؟" آسانی سے سمجھ آنے والی بات تھی مگر انکشافات ہی اتنے تابڑ توڑ تھے کہ دماغ سن ہو کر رہ گیا تھا۔

"وٹے سٹے میں بیاہے گئے تھے دونوں۔ شریکے (رشتہ دار) بھی لگتے ہیں ایک دوجے کے۔"

"کب۔۔۔ کب ہوئی تھی شادی؟"

"یہ نہیں پتا جی۔" وہ کان کھجانے لگا۔

"مجھے تو تین چار سال ہی ہوئے ہیں اس علاقے میں مگر وحید صاحب کا بڑا لڑکا ہو گا کوئی بارہ تیرہ سال کا۔ اسی سے اندازہ لگا لو۔"

وہ ایک گہری سانس بھرتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بی بی! ایک بات اور۔" وہ دبی' ہاتھ پرس کی جانب گیا۔

"یہ بات پیسے لے کر نہیں بتاؤں گا۔ خدا خوفی کے خیال سے بتا رہا ہوں۔ میری بھی دو بچیاں ہیں' ان کا واسطہ دے کے کہہ رہا ہوں۔ مجھے شک پڑ رہا ہے کہ وحید صاحب نے۔۔۔ دراصل وہ بندہ عورتوں کے معاملے میں ایسا ہی ہے۔ اس کا بہنوئی اور سالا۔۔۔ وہ خود بھی ایسا ہے۔ دونوں اپنی اپنی گھر والیوں کے ساتھ دھوکا کر رہے ہیں اور۔۔۔ دونوں ایک دوسرے کے کالے کرتوتوں کو جانتے بھی ہیں لیکن کوئی بہن کے خیال سے دوسرے کا گریبان نہیں پکڑتا کہ اگلا ہاتھ اس کے اپنے گریبان تک آئے گا۔"

تقدیس کے پاس کچھ کہنے کی ذرا سی سکت نہ تھی۔ وہ چپ چاپ سر جھکا کے وہاں سے چل دی۔

☆ ☆ ☆

"کیسے بتاؤں آپی کو' انہیں شاک لگے گا۔ بکھر جائیں گی وہ۔ پہلی بار انہوں نے کسی پہ اعتبار کیا' پہلی بار اپنے خول سے نکل کر ایک عام اور نارمل لڑکی کی طرح کوئی خواب بنا اور اس پہلی جسارت کی اتنی بڑی سزا۔"

لیکن نہ بتاتی تو چپ چاپ اس کی بربادی کا تماشا کیسے دیکھتی اور اگر بتاتی تو اسے کیسے سنبھال پاتی۔

"کیا سوچ رہی ہو؟" ظہیر نے الماری سیٹ کرتے ہوئے اس کی جانب دھیان دیا' جو کب سے ایک ہی رخ پہ بیٹھی الجھی ہوئی حالت میں پیر ہلائے جا رہی تھی۔

"اور یہ پیر ہلانا تو بند کرو' بڑی نحوست۔"

"آپا کہاں ہیں؟"

"ماما کے ساتھ مارکیٹ گئی ہیں۔"

"مجھے کوئی اطلاع۔" وہ چونکی۔

"نکال کے لگا۔" ظہیر ایک ہینگر سے فراک اتارتے ہوئے مسکرا کے پوچھنے لگی۔

"بڑی مشکل سے کہیں نکلنے پہ تیار ہوئی تھیں۔ آج ماما کو مارکیٹ جاتے دیکھ کر خود ساتھ جانے کا کہنے لگیں۔ شاید کوئی ارادہ تھا ان کا۔ ریلی مجھے تو بڑا اچھا لگا آپی کا یہ قدم۔"

وہ خالی خالی نظروں سے اس کے مطمئن اور آسودہ چہرے کی جانب دیکھنے لگی۔

"کاش میں بھی بے خبر ہوتی تو آپی ہی مطمئن نظر آتی۔ میں بھی لاعلم ہوتی تو آپی کی اس تبدیلی پہ خوشی کا اظہار کر رہی ہوتی لیکن میں بے خبر ہوتی ہی کیوں یا "باخبری" یہ "آگہی" تو ہمیشہ سے میرے مقدر میں تھی۔ میری فطرت میں شامل ہے۔ جب ماما اور پاپا کے درمیان جھگڑا شروع ہوتے پہ آپی سہم کے کمبل کے اندر گھس جاتی تھیں اور تطہیر لاپروائی سے کارٹونز کا والیم اور تیز کر لیا کرتی تھی تو یہ میں ہی تھی جو دروازے سے چپکی کھڑی دونوں جانب سے ایک دوسرے پہ برسائے جانے والے زہر میں بجھے تیروں کی کڑواہٹ اپنے اندر اتار رہی ہوتی تھی۔ پاپا کے گھر سے نکل جانے کے بعد روتی اور کلستی ماما کے آنسو پونچھتے ہوئے ان کی خود کلامیوں سے آگہی کے کڑوے گھونٹ پیتی تھی۔ مجھے تو ابتدا ہی سے چسکا ہے باخبر رہنے کا۔ چاہے یہ باخبر رہنا مجھے کتنے ہی ڈنک کیوں نہ لگاتا ہو۔"

وحید کے بارے میں ملی اطلاعات اسے اور بہت کچھ یاد دلا رہی تھیں۔ ماضی کی وہ ساری کہانی جو تصویر کی صورت میں ہر آنے والے ہر جھگڑے کے بعد نئے سرے سے دہرایا کرتی تھیں۔

وہی وٹے سٹے کی شادی۔

وہی گھر میں بیوی کے ہوتے ہوئے ادھر ادھر کی منہ ماری۔

وہی باہر کے معاشقوں میں اپنا شادی شدہ اسٹیٹس چھپانا۔

"کیا ماما سچ کہتی ہیں۔ سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔"

یہ خیال اسے اچانک آیا اور اس سے پہلے کہ وہ اسے مزید پختہ کرتی یا اسے جھٹلاتی، تحریم اندر داخل ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کسی مشہور بوتیک کے شاپنگ بیگز تھے۔

وہ خاموشی سے اس کے کھلے کھلے چہرے کو تکنے لگی۔

"آج میں نے شاپنگ کے سارے ریکارڈ توڑ کے ماما کو بھی حیران کر دیا۔"

"کیا مجھ میں اتنا حوصلہ ہے کہ میں حقیقت بتا کے اس چہرے سے مسکراہٹ نوچ لوں جس سے مسکراہٹ کی شناسائی بس ابھی ابھی ہوئی ہے۔ اس آواز سے بشاشت کو چھین لوں جس میں کھنک پیدا ہوتے چند ہی دن ہوئے ہیں۔ کتنا مشکل مگر کتنا ضروری ہے یہ کام۔"

"کیا دیکھ رہی ہو؟ تمہارے لیے بھی ایک زبردست سی چیز لائی ہوں۔ یہ دیکھو، تمہارے فیورٹ کلر کا کارڈیگن۔"

وہ پھولے پھولے بیگز میں ہاتھ ڈال کے نکالنے لگی۔

"وہ تطہیر کے لیے بالکل نئے ڈیزائن کا ہینڈ بیگ۔ تمہیں تو پتہ ہے بیگز کے معاملے میں کتنی ندیدی ہے وہ۔ دل نہیں بھرتا اس کا، چاہے جتنے مرضی رل رہے ہوں کمرے کی الماریوں میں اور یہ بھی۔" اچانک اس کی آواز سرگوشیانہ ہو گئی اور رخساروں پہ حیا کے رنگ بکھرنے لگے۔

"وحید کے لیے بھی ایک تحفہ لیا ہے۔ ویسے تو انہیں مجھ سے تحفے لینا پسند نہیں ہے لیکن..."

"آپ کو ان کی ساری پسند ناپسند کا علم ہے؟"

اچانک اس کشمکش و پیچ سے نکلنے کا اس نے حتمی فیصلہ کر لیا۔ آر یا پار۔ دونوں صورتوں میں تحریم کو نقصان ہی تھا۔ کیوں نہ بڑے نقصان سے بچنے کے لیے کم نقصان گوارا کر لیا جائے۔

"ہاں۔" تحریم فخریہ سی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

"بس..." تقدیس نے دہرایا تو تحریم کو اس کی آواز و انداز میں کسی غیر معمولی پن کا احساس ہوا۔ وہ ٹھٹک گئی۔

"کیا مطلب؟"

"کیا آپ ان کے بارے میں یہ بھی جانتی ہیں کہ ان کی شادی کو کم از کم پندرہ سال گزر چکے ہیں۔ ان کی بیوی

بھی ہے، نیک، خاندانی اور خوش شکل عورت ہے۔ ان کے چار بچے ہیں اور..."

تحریم کا فق ہوتا چہرہ اسے نظر آ رہا تھا مگر اس نے رکے بغیر کہہ ہی ڈالا۔

"کوئی چارہ نہیں یہاں رشتوں کا بوجھ نہیں ہے۔ ان کے والد زندہ سلامت..."

مگر تحریم اس کے آگے مزید کچھ سننے سے قبل ہی ہوش سے بیگانہ ہو چکی تھی۔

٭ ٭ ٭

"چلیں امی۔" حسن نے کھڑے ہو کر پینٹ کی جیب میں ہاتھ پھنساتے ہوئے بوجھل پن سے کہا۔

"ہاں۔ بس۔ چلتی ہوں۔"

پروین کی آواز میں اس سے کہیں بڑھ کے بوجھل پن تھا۔ آج شمشاد بیگم کو گزرے تیسرا دن تھا۔ صبح ہی وہ قل ادا ہوئے تھے۔ گاؤں سے اور دور پرے کے شہروں سے آنے والے رشتہ دار قل کے فوراً بعد واپسی کے لیے روانہ ہو گئے تھے مگر پروین کا فی الحال کوئی ارادہ نہ تھا۔ گھر پہ وہ بیگم شوکت جہاں سے اجازت لے کر آئی تھی چالیسویں تک رکنے کی۔ اگرچہ اس پہ بھی سراج دین خاصا جز بز ہوا تھا لیکن انہوں نے سمجھا دیا۔

"زمانے کے تقاضوں کو بھی سمجھا کرو سراج! اب خود اپنے بچے بیاہنے کی عمر میں آ گئے ہو۔ اس کی ماں کی وفات ہوئی ہے۔ کون سا بہت سے بہن بھائی ہیں۔ ایک پروین، دوسرا نوید۔ دونوں کو اس وقت ایک دوسرے کی ضرورت ہے اور پھر تعزیت کے لیے لوگ آتے رہیں گے۔ کتنا برا لگے گا اگر تب پروین وہاں نہیں ہو گی۔"

مگر پروین نے ماں کی تدفین کے فوراً بعد بھانپ لیا کہ میکے کے حالات اب اس کے لیے سازگار نہیں رہے۔ بھابی سے اچھے تعلقات تو کبھی بھی نہیں رہے تھے مگر انہیں ساتھ رکھ لینے کی نوبت بھی کبھی نہیں آئی تھی۔ عام بھاوجوں کی طرح نہ تو اس نے کبھی پروین سے نوک جھوک کی تھی نہ طنز میں بھگو بھگو کے وار کیے تھے اور نہ ہی بہنوں کی طرح دوستانہ ماحول بھی قائم نہ ہونے دیا تھا۔ کبھی دونوں نے سہیلیوں کی طرح ایک دوسرے سے دکھ سکھ نہیں کہے تھے۔ اس کے باوجود پروین کو قطعاً یہ امید نہیں تھی کہ جب وہ ماں کے آنسو رونے کے لیے اس کے گلے لگنے آگے بڑھیں گی تو منہ ہوا لوگوں کی موجودگی کی پروا کیے بغیر ہی کترا جائے گی۔ اس وقت وہ صدمے کے باعث اس الجھن پہ زیادہ توجہ نہ دے سکیں۔ نہ اندر باہر کی مصروفیت میں مگن بھائی کے بدلے بدلے تیور بھانپ سکی تھیں۔

شمشاد بیگم کی تدفین کے بعد جب آنسو ذرا تھمے تو دھند صاف ہوئی۔ انہیں سب صاف نظر آنے لگا۔

نوید مراد کا اکھڑا اکھڑا انداز اور بے رخی۔

نازیہ کا نپا تلا اجنبیت۔

ان کا ایک منٹ بھی یہاں مزید گزارنا مشکل لگنے لگا مگر دور پرے کے تمام رشتہ دار، آس پڑوس کے جاننے والے سب موجود تھے۔ کیسے اٹھ کے چلی جاتیں۔ شوکت جہاں نے تو خیر یہ بدلا ہوا ماحول اس ماں کی حالات میں بھی نہیں دیکھا تھا جو پروین کو جتانا مناسب نہیں سمجھا یا بعد میں حسن کو بھیجا۔

"جاؤ ماں کو خیر خیر سے لے آؤ۔"

"بیٹی ہے، مزے سے ہو گی۔" جواب سراج دین کی جانب سے آیا۔

شوکت جہاں کا انداز سراج! "وہ وہاں بیٹھے کی اس سفاکی سے متاثر ہے۔"

"بہت اپنا گھر ہے، وہ وہاں کون سے مزے لے رہی ہو گی۔ ماں تھی وہ اس کی ہم کیا میرے مرنے کے اگلے دن..."

"میں ایسا نہیں کہہ رہا۔" سراج نے انہیں بات مکمل نہ کرنے دی۔ "میرا مطلب صرف یہ تھا کہ ابھی رات کو ہی تو سسرال سے آئے ہیں۔ چند گھنٹوں میں ایسا کیا ہو گیا ہو گا کہ آپ صبح سویرے حسن کو وہاں دوڑا رہی ہیں۔"

"اس کی بھی نانی تھی اللہ بخشے مرنے والی۔۔۔" ان کی تیوریاں ابھی تک ناگواری ظاہر کر رہی تھیں۔

"ماموں بے چارہ نڈھال ہوگا۔ اس کا فرض بنتا ہے کہ وہاں جائے اور اسے دلاسا دے، ہاتھ بٹائے، اس کا کوئی بیٹا نہیں تو اس صورت میں بھانجوں پہ زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔"

"چلو بھیجنا ضرور وہاں، کبھی ماں کی خیر خبر لانے کے بہانے تو کبھی ماموں کا ہاتھ بٹانے۔"

وہ چڑ کے ناشتے کی ٹیبل سے اٹھ گئے۔

"دنیا بدل گئی۔ عمر کیا سے کیا ہو گئی۔ بچے جوان ہو گئے مگر سراج کی سسرال سے خار نہ گئی۔ نجانے کیسی مردانگی اور شوہرانہ انا کی کون سی تسکین ہوتی ہے۔ سسرال والوں کو نیچا دکھا کے اور ان سے لاتعلقی جتا کے۔"

وہ کڑھنے لگیں تو حسن اپنا چائے کا مگ اٹھائے ان کے قریب آ گیا۔

"کیوں پریشان ہو رہی ہیں دادو! میں اور حسان ابھی چلے جاتے ہیں۔"

"حسان کو تو تم رہنے ہی دو، فوتگی والے گھر میں بھی جا کے ناشتے ہی بنوا تا رہے گا۔ میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔"

وصی نے آخری گھونٹ بھرتے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی مگر حسان نے فوراً اس کے گلے لگتے ہوئے اسے کرسی پہ گرا دیا۔

"شکریہ میرے عظیم دوست..... بھائی۔۔۔! میں تمہارا یہ احسان مرتے دم تک نہیں بھولوں گا۔ آج تم میری نانی کی وفات پہ میرے کام آ رہے ہو، ان شاء اللہ کل میں بھی تمہاری نانی....."

"اوئے....." اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے وصی چلایا۔

"دیکھو ذرا اس لڑکے کو، باؤلا۔ یہ بھی نہیں یاد کہ وصی کی نانی اس کی بھی تو دادی لگتی ہے۔"

بیگم شوکت جہاں نے ماتھے پہ ہاتھ مار کے کہا تھا اور حسان بے چارہ خجل ہو کر ایک اور پراٹھا پلیٹ میں رکھ کے سر جھکا کر نوالے توڑنے لگا۔

اور اس دن بے شک دادی کی ہدایت پہ حسن، پروین کی خیریت معلوم کرنے گیا تھا مگر اس وقت اور پھر اگلے دن قل کے ختم کے موقع پر اس نے جو کچھ محسوس کیا، اس کے بعد شام کو وہ کسی کے کہے بغیر ماں کو لینے کے لیے وہاں سے موجود تھا۔

"ابھی تو گئے تھے تم سب کے ساتھ۔"

وہ بھی اسے غیر متوقع طور پر دیکھ کے حیران تھیں۔

"اس وقت بہت لوگ تھے ان کے سامنے آپ کو ساتھ لے جانا مناسب نہیں لگا۔ اب لینے آیا ہوں۔"

"مگر بیٹا!" وہ متذبذب ہو گئیں۔ اگرچہ گزرے دو دن درمیان میں نہ آئے ہوتے تو یہ تذبذب دور تک نہ [illegible] ڈانٹ کر رکھ دیتیں حسن کو اس نامعقول مطالبے پہ۔

"کوئی اگر مگر نہیں، سب دیکھ رہا ہوں میں۔ اب بھی آپ کو یہاں مزید رہنے کی خواہش ہے؟"

"وہ تو ٹھیک ہے مگر لوگ کیا کہیں گے۔" وہ دبی زبان میں کہہ رہی تھیں۔

"رشتہ دار یہ تمیں بنائیں گے کہ ایسی عزیز تھی بیٹی کو اپنی گھر گرہستی، دس دن ماں کا سوگ نہ منا سکی۔"

"کیسا سوگ امی! جانے والے کو صرف دعائے مغفرت کی حاجت ہوتی ہے، وہ آپ اپنے گھر بیٹھ کے بھی کر سکتی تھیں۔ اتنا ہی کوئی پوچھے تو بتا دیں اصل وجہ۔۔۔"

"چائے پئیں گے حسن بھائی!" اس جھجکی جھجکی، جھجل سی آواز پہ حسن نے پلٹ کر دیکھا۔ دروازے کے درمیان وہ ڈھلے ڈھلے شفاف چہرے کے ساتھ موجود تھی۔

"نہیں۔" اس کی تلخی خود بخود کم ہوئی۔ لہجہ نرم پڑ گیا۔ ہلکے سبز رنگ کے ڈھیلے ڈھالے کرتا پاجامہ میں وہ مضمحل نظر آ رہی تھی۔

"تم ٹھیک ہو؟"

"جائے نہیں تو کھانا کھا لیں۔ ٹائم تو ہو گیا ہے۔"

"نہیں، شکریہ۔ میں بس امی کو لینے آیا ہوں۔"

"پھپھو آپ جا رہی ہیں؟"

"ہاں بیٹا۔" پروین نے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"دل نہیں لگا ہمارے ہاں؟"

"ایسی بات کرتی ہو بیٹا! یہ کوئی موقع ہے دل لگانے کا۔ بس گھر پہ بچے کچھ پریشان ہیں میرے نہ ہونے سے۔"

"تم بیٹا! کیوں پریشان کر رہی ہو اپنی پھپھو کو۔" ممانی نے اندر داخل ہوتے ہوئے بڑے عام سے لہجے میں کہا۔ "تم نے ہوش سنبھالنے کے بعد بھلا کتنی بار انہیں یہاں آ کے رہتے دیکھا ہے؟ دو بار یا تین بار۔۔۔؟ اور وہ بھی دل امی کے پاس۔۔۔ اب ماں نہیں رہی تو کون سی کشش انہیں میکے سے باندھے گی۔"

"بھابھی!" پروین نے پہلی بار ممانی کو اتنی طویل بات کرتے سنا تو مارے حیرت کے کچھ کہہ نہ سکیں۔

"سچ ہی تو کہہ رہی ہوں۔ ہمارے گھر میں وہ آسائشیں، وہ آرام کہاں، اسی لیے تو حسن، حسان بھی بس کھڑے کھڑے آتے ہیں، ورنہ بچے اپنے ننھیال سے جانے کو تیار نہیں ہوتے۔ خیر۔۔۔ دل کے رشتے زور زبردستی سے تو نبھتے نہیں جا رہے لیکن تم خود ہی رشتوں میں پائیداری نہیں چاہتیں۔ کیا کیا جا سکتا ہے۔"

حملہ اتنا اچانک اور غیر متوقع تھا کہ پروین جہاں کی تہاں کھڑی رہ گئیں۔

"اب تو چلیں امی!" حسن نے جھنجھلا کر کہا۔ پروین شکستہ قدموں کے ساتھ باہر کی جانب بڑھنے لگیں۔

"وشمہ بیٹا! اپنے بابا کو بتا دینا۔ پھپھو جا رہی ہیں۔ آ کر مل لیں۔ اچھا سنو، رہنے دو۔ ان کے سر میں درد ہے، سختی سے منع کر کے سوئے تھے کہ معمولی باتوں کی وجہ سے پریشان نہ کرنا۔"

وشمہ ماں کا لہجہ اور طور پہچانتے بنا سر ہلاتی اندر کی طرف مڑ گئی۔ حسن نے بڑے بھاری دل کے ساتھ اسے جاتے دیکھا۔

"ابا جانی آتے ہی نہیں گے۔"

پروین نے اپنی پشت پہ اس کی آواز سنی اور بڑی دیر سے رکے آنسو رخساروں پہ بہہ نکلے۔

☼ ☼ ☼

وہ بتے پیر کی بلی کی طرح سارے گھر میں پھر رہی تھی۔

"یہ میرا گھر ہے۔۔۔ میرا۔۔۔"

ایک ایک چیز کو ہاتھ سے چھوتی، ایک ایک کونے کو نظروں سے کھنگالتی وہ خود کو یقین دلا رہی تھی۔

"عورت کا کوئی گھر نہیں ہوتا۔ پہلے باپ کے گھر پھر شوہر کے گھر پناہ گزین ہوتی ہے۔ پہلے میکہ پھر سسرال ٹھکانہ ہوتا ہے۔ گھر کوئی نہیں ہوتا مگر میرا ہے اور یہ گھر مجھے ایسے نہیں مل گیا، بہت بڑی قیمت دے کر حاصل کیا ہے۔ اپنے جگر کا ٹکڑا نوچ کے پھینکا ہے۔ اپنے ضمیر کو تھپکی دے کر سلایا ہے۔ وہ سب کیا ہے جو میرے مزاج، میری فطرت کے خلاف تھا۔ اس سب کے بدلے مجھے اتنا صلہ تو ملنا چاہیے۔ یہ گھر۔۔۔"

اس نے رات کے اندھیرے میں ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک چکر کاٹتے ہوئے سوچا۔

"اور سوہا کو اپنی ماں کے گھر رہنے سے کون روک سکتا ہے بھلا، میری بچی۔۔۔ میری سوہا۔ تمہاری ماں صرف تمہارے لیے اس سطح تک گری ہے۔ اب اسے نظروں سے نہ گرانا یہاں آنے سے انکار کر کے۔"

● ● ●

وہ لڑکی بھی تھی۔۔۔ عام سی نہیں تھی۔۔۔

عام سی ہو ہی نہیں سکتی تھی۔۔۔ لیکن وصی کا بولنا۔۔۔ اس کا شگفتگی، اس کے بے حد خاص نظر آنے کی وجہ

"بیٹا! اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کرو۔ کل تمہارے پاپا آنے والے ہیں۔ کیا بتائیں گے انھیں تمہارے بارے میں۔"

مدیحہ نے لہجے کی درشتی کو چھپانے کی بہت کوشش کی مگر وہ چھلک سی پڑی۔ تحریم نے شکوہ کناں نظروں سے ان کو دیکھا اور منہ پھیر لیا۔

کرب زدہ سا ایک لکیر کی صورت اس کے زرد چہرے پہ سے ہوتا تکیے میں جذب ہونے لگا۔ دیوار کے ساتھ کھڑی تقدیس کا دل اس کی حالت دیکھ کے کٹ رہا تھا مگر اپنی جلد بازی پہ پشیمان وہ خود میں اتنی ہمت نہیں پاتی تھی کہ بہن کے سامنے آ کے کچھ کہہ پاتی۔ پہلے وحید کا بھانڈا پھوڑنے میں جلد بازی کا مظاہرہ، اس کے بعد ماں کے سامنے سب کچھ اگل دینے کا اناڑی پن۔

اس نے تو اس وجہ سے سب کچھ کہہ ڈالا تھا کہ یہ بوجھ وہ اکیلے سہار نہیں پا رہی تھی۔ اور تحریم کی حالت توقع سے زیادہ شدید اور خطرناک تھا۔ وہ پریشان ہو گئی تھی۔ ایسے میں مدیحہ کی تفتیش۔ اس کے اعصاب جواب دے گئے اور اس نے یہی بہتر جانا کہ ماں سے زیادہ بہتر ہمراز اور دمساز کوئی ہو سکتا ہے؟ وہ اس معاملے کو اچھے طریقے سے ہینڈل کر لیں گی مگر اب ان کا رویہ دیکھ کر پچھتا رہی تھی۔

ڈاکٹر کی ہدایت کے پیش نظر مدیحہ مجبور تھیں کہ تحریم سے نارمل انداز میں بات کریں۔ مگر اندر ہی اندر وہ بری طرح مشتعل تھیں۔ اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ تحریم کو آڑے ہاتھوں لیں مگر وہ جلے پیر کی بلی کی طرح اندر باہر کمرے میں جاتیں۔ اس کی نیم غشی کی کیفیت۔ پیپڑی جمے سفید لبوں۔ زردی کھنڈے گالوں کو دیکھتیں اور پھر اندر ہی اندر خود سے لڑتی باہر نکل آتیں۔ اور پھر چیزیں پٹخ پٹخ کے بڑبڑاتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالتیں۔

"میری ساری عمر کی ریاضت کو پل بھر میں خاک میں ملا کے رکھ دیا ہے اس لڑکی نے۔ لوگ اسی لیے تو بیٹی کی پیدائش پہ کانوں کو ہاتھ نہیں لگاتے ——— بیٹی کو پالنا مسئلہ نہیں ہے۔ بیٹی کو سنبھالنا مسئلہ ہے۔"

"ایسا تو نہ کہیں ماما۔ آپی نے ایسا کچھ نہیں کیا جو۔"

تقدیس سے رہا نہ جاتا اور بول اٹھتی۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" مدیحہ ساری کھولن اس پہ نکال دیتیں۔

"اور کیا باقی رہ گیا تھا کرنے کو؟ ماں کے سر میں خاک ڈال کے باپ دادا کی عزت پاؤں میں رول کے بھاگ کر فرار ہی کے ساتھ تب کا انتظار تھا تمہیں؟"

"ماما!" تقدیس ہکا بکا رہ گئی۔ یہ تحریم ہی تھی جو مدیحہ کے نزدیک تینوں بیٹیوں میں سب سے زیادہ سیدھی سادی، سب سے زیادہ فرماں بردار تھی۔ اور ایک معمولی سی لغزش کی وجہ سے اس قدر بدگمانی؟

"ماما! پلیز آہستہ بولیں۔ آپی سن لیں گی۔ انھیں صدمہ ہو گا۔"

وہ جانتی تھی کہ اس وقت تحریم کی طرف داری کرنا مدیحہ کو اس سے بھی برگشتہ کر سکتا ہے اس لیے اس نے اتنا کہنے پہ اکتفا کیا۔

"ہونہہ صدمہ اور ہمیں جو صدمہ پہنچانے چلی تھیں محترمہ اس کا خیال نہیں تمہیں۔ جو بیٹیوں کے لیے ہوتا ہے۔ یہ دھچکا نہ لگتا اسے تو۔ تو سوچو کیا ہو سکتا تھا۔ اپنی بے وقوفی کے ہاتھوں پورے خاندان کی ناک کٹ سکتی تھی وہ۔"

"آپی سادہ ہیں۔ نا سمجھ ہیں مگر بے وقوف نہیں ہیں۔ خاندان کی عزت کا خیال انھیں بھی ہے۔ اور انھوں نے ایسا تو کچھ کیا ہے۔ نہ کرنے کا کوئی ارادہ تھا جس سے ہمیں کوئی دکھ ملتا۔ ایسی باتیں کرنے کے بجائے انھیں حوصلہ دینا چاہیے۔ انھیں احساس دلانا چاہیے کہ ہم سب ان کے ساتھ ہیں۔ ان کے پاس۔"

"ہاں اب یہی کام تو رہ گیا ہے کہ جوان بیٹیوں کے ناز اٹھائیں۔" ان کے آنسو پونچھتی پھریں۔

وہ بڑبڑاتے ہوئے وہاں سے ہٹ جاتیں اور تقدیس اور تطہیر ایک دوسرے سے نظریں چراتی رہ جاتیں۔

ان کے سامنے تحریم کی اس حرکت پہ بے بھاؤ کی سنانے والی مدیحہ بیٹی کے کمرے میں جاتے ہی ایک بے بسی کے حصار میں آ جاتیں۔

ان کا جی چاہتا تحریم کی منت کریں، اس چھپ چھپ کے رونے والی بیٹی سے پوچھیں کہ اس کے اندر کا غصہ تھا جو اس پھڑپھڑاتے جذبے کو کھل کے حاوی نہ ہونے دیتا تھا۔ عجیب کشمکش میں گھری وہ اسے دیکھتی رہ جاتیں۔ یا پھر بے معنی سی باتیں کر کے اسے معمول کے انداز میں واپس لانے کی کوشش کرنے لگتیں۔ اور یہ کوشش بار آور اس لیے نہ ہو پاتی تھی کہ ان میں وہ گرمجوشی، وہ ہمدردی، وہ سوز مفقود تھی جو ایک ماں ہونے کے ناتے اس کی ذات سے تحریم کو محسوس ہونی چاہیے تھی اسی لیے تحریم کسی بے جان بت کی طرح انھیں تکے جاتی۔

"میں تم سے کچھ کہہ رہی ہوں تم نے اس پہ غور کرو اور رحم کھاؤ میرے حال پہ۔"

بالآخر وہ اس چپ کے آگے ہار مان کے پھٹ پڑیں اور دونوں ہاتھ بیٹی کے سامنے جوڑ دیے۔ تقدیس ۔ دیوار سے ہٹ کر جلدی سے معاملہ سنبھالنے آگے بڑھی۔

"آپی! ماما بہت پریشان ہیں آپ کی وجہ سے۔ میرا مطلب ہے کہ آپ کی حالت دیکھ کے۔"

اس نے ملتجی نظروں سے مدیحہ کو دیکھتے ہوئے تحریم سے کہا تھا۔ مدیحہ نے جز بز ہوتے ہوئے منہ پھیر لیا۔

"اسی لیے وہ چاہتی ہیں کہ آپ جتنا جلدی ہو سکے خود کو سنبھال لیں۔ اور پھر ایسے شخص کے لیے خود کو مزید کیا تکلیف دینا جو اس قابل ہی نہ ہو۔ آپ کو اس کے بارے میں اب اپنی زندگی کا ایک منٹ ایک سیکنڈ بھی ضائع نہیں کرنا۔ ہمارے بارے میں سوچیں۔ ماما کے بارے میں۔ پاپا کے بارے میں۔ میرے اور تطہیر کے بارے میں۔ ہم سب آپ کو چاہتے ہیں۔ ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ ہمارے لیے زندگی کی جانب لوٹیں۔ توڑ دیں یہ خود ساختہ اپنی حصار۔ پلیز آپی! بھول جائیں اس حادثے کو پلیز۔"

اس نے تحریم کے ٹھنڈے پڑتے ہاتھ اپنی مٹھیوں میں بھینچ لیے۔ وہ تحریم سے چھوٹی تھی۔ مگر اس کی ہتھیلیوں سے ممتا کی حرارت اسے اپنے اندر جذب ہوتی محسوس ہوئی۔ اسے دل کو چھو جانے والی شاید اسی آنچ کی ضرورت تھی۔ وہ پگھلنے کے لیے شاید اسی تنکنے لمس کا انتظار کر رہی تھی۔

مدیحہ نے اسے تقدیس کی انگلیاں لبوں کے ساتھ لگا کے روتے دیکھا اور غیر محسوس انداز میں ان کے پاس سے ہٹ گئیں۔

"پاپا بس۔ نہیں آج نہیں۔ کل آ رہے ہیں۔"

لاؤنج میں تھکی تھکی سی تطہیر کو فون پہ کہتے سنا تو ان کی تمام حسیات متحرک ہو گئیں۔

وہ تیزی سے آگے بڑھیں۔

"آج گھر میں کچھ مصروفیت تھی۔ نہیں کچھ خاص نہیں۔ بس وہ۔"

مگر اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکی۔ مدیحہ اس کے ہاتھ سے ریسیور چھین چکی تھیں۔ تطہیر کچھ نہ سمجھتے ہوئے حیرت سے انھیں دیکھنے لگی۔

"غضب ہو گیا۔ بڑی چھوٹ دے دی میں نے تم لوگوں کو۔ اب یہ سب نہیں ہو گا۔" انھوں نے ریسیور پٹختے ہوئے کہا۔

"مگر ماما۔ ہوا کیا ہے؟"

"ہونے کو اور رہ ہی کیا گیا ہے۔ جس سے میں مر کے بھی ایسی امید نہیں کر سکتی تھی اس نے یہ کارنامہ کر دکھایا۔ اب تم پہ کیسے بھروسہ کر لوں۔ جو ان کے چوبیس میں سے اٹھارہ گھنٹے باہر گزارتی ہے۔"

"ماما! سوچ سمجھ کے بات کریں۔"

تطہیر سے ضبط کرنا مشکل ہو گیا۔ ویسے بھی وہ کسی کی بات مشکل سے ہی برداشت کرتی تھی۔ خاص طور پہ ناجائز بات۔

"ارے... آمال کی آرٹسٹک چیز بن گئی ہے۔"

ہما نے ہاتھ میں پکڑے پیپر کو توصیفی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کیا کر رہی ہیں آپ نے؟" نقل ہما چہرے پہ سنگترے کے چھلکوں کا ابٹن ملتے ہوئے پلٹ کر پوچھنے لگی۔

"تمہیں کیسے پتا ہے کہ انہوں نے ہی پچھ کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے کسی اسٹوڈنٹ کے بارے میں بات کر رہی ہوں۔" روا نے کتاب سے سر اٹھا کے اسے ٹوکا۔

"اڈرن ہوں۔ وہ بات نہیں کر رہیں۔ تعریف کر رہی ہیں۔ اور تعریف وہ صرف اپنی کیا کر سکتی ہیں۔ ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں آپی؟" ہما نے مسکراتے ہوئے تصدیق چاہی۔ ابٹن ملے چہرے پہ پھیلتی مسکراہٹ اس لیپا پوتی کے باوجود چھپا نہ پانے والے اندر چھپے طنز کا اعلان کر رہی تھی۔

"تم تو بڑی تاڑو ہو۔" ندا مائنڈ کر گئی "میرا تجزیہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اور پھر روا کی جانب جھکی۔

"یہ دیکھو، زبردست بنا ہے ناں؟"

"مگر یہ ہے کیا؟" اس نے چشمہ اوپر نیچے کرتے ہوئے ہونق پن سے پوچھا۔

"کارٹون اور کیا؟" ندا نے قدرے غصے سے کہا۔

"توبہ آپی۔! اتنی بڑی ہو گئی ہیں آپ۔ اور لیکچرار بھی کہلا رہی ہیں خیر سے۔ مگر کارٹون بنانے کا شوق نہیں جاتا۔"

"تو تمہارا خیال ہے یہ جو اتنے بڑے اور نامور کارٹونسٹ حضرات ہیں یہ سارے دودھ پیتے بچے ہیں؟ بڑے ہو جانے کے بعد کارٹون بنانے پہ پابندی لگ جاتی ہے کیا؟ اس "باربے" کو بھول گئیں جس نے وزنی لینڈ بنایا تھا تو بچپن میں بنایا تھا کیا؟ جناب یہ بھی آرٹ ہے۔ اسے تم جیسے سطحی سوچ اور اوپر کی ذہنیت رکھنے والے لوگ پہ سمجھ نہیں لیتے ورنہ دنیا بھر میں کارٹونسٹ کی بڑی قدر و قیمت ہے۔"

"مگر یہ بغیر ونڈی کا حلوہ کدو بنانا کون سا آرٹ ہے؟" ہما نے رخسار رگڑتے ہوئے غور سے اس کا بنایا شاہکار دیکھا۔

"کدو۔ تمہیں یہ کدو نظر آ رہا ہے؟" صدمے کے مارے ندا کی آواز پھٹ گئی۔

"نہیں... حلوہ کدو۔" اس نے تصحیح کی۔

"اسٹوپڈ... یہ بلقیس آنٹی کا کارٹون بنایا ہے میں نے۔"

"کل... نہیں... آن... تی..." روا اور ہما ایک دوسرے پہ گرتے ہوئے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہونے لگیں۔

ندا نے اسے بھی اپنے فن پہ داد دینے کا ایک انداز جانا اور فخر سے گردن اونچی کر ادھر ادھر ٹہلنے لگی۔

"دیکھا... کتنا اچھا کارٹون ہے۔ تم لوگوں کی ہنسی نہیں رک رہی۔"

"اور بلقیس آنٹی کا ہاتھ نہیں رکے گا اگر انہوں نے یہ کارٹون دیکھ لیا۔"

"تو انہیں دکھا کون رہا ہے۔ یہ تو میں نے کالج میگزین کے لیے بنایا ہے۔"

"کیا؟" ہما نے روا کو اشارہ کیا اور روا تاسف سے سر ہلا کے رہ گئی۔

"تو اب نہیں آپی آپ کا... یہ بلقیس آنٹی کا کارٹون ہے یہ نہیں بھی آپ کے بتانے کے بعد پتا چلا تو آپ کے کالج والوں کو کیا پتا یہ کس کا کارٹون ہے کس سے متاثر ہو کے بنایا گیا ہے۔ بنایا تھا تو کسی ٹیچر وغیرہ کا بنا تیں تاکہ انہیں دیکھ کے حظ تو اٹھاتیں۔"

"مشورے کا شکریہ۔ میں نے ایسا بھی کیا ہے۔ ایک آدھ نہیں، پورے اسٹاف کے کارٹون بنائے ہیں اور تو اور پرنسپل کا بھی۔"

"اور وہ چھپ بھی جائیں گے؟"

"سوچ سمجھ کر ہی کہہ رہی ہوں۔ پہلے جو بغیر سوچے سمجھے تم لوگوں پہ اندھا اعتماد کیا ہے اس کا کیا نتیجہ نکلا۔ تمہارا باپ پہلے ہی مجھے کچھ نہیں سمجھتا۔ بیوی کی حیثیت سے میں کبھی اس کی نظروں میں جچی ہی نہیں۔ اب یہ اولادیں مجھے اور رسوا کروائے گی۔ اسے موقع دے گی کہ وہ مجھے ایک بری ماں بھی ثابت کر سکے۔"

سالوں بعد ان پہ وہی ہیجان طاری تھا جو جعفر محمود کو اس سے مزید متنفر اور تینوں بچیوں کو دہشت زدہ کر دیتا تھا۔

"ماما! آپ کو ہو کیا گیا ہے۔ کس طرح بی ہیو کر رہی ہیں آپ؟"

قریب تھا کہ تطہیر کا یہ دبا دبا احتجاج گستاخی کی حد کو چھونے لگتا۔ تقدیس انہیں تھپتھپا کر تھوڑا سے ہوئے آگے بڑھی۔

"ریلیکس ماما! اتنی ٹینشن نہ لیں آپ۔ آپی اب..."

"تم اپنے لیکچر اسے سناؤ۔" مدیحہ نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی تیز لہجے میں کہا۔

"بجائے اسے یہ احساس دلانے کے کہ وہ کیا کرنے چلی تھی" الٹا اور ہلا شیری دی جا رہی ہے ہمدردی سے... کر۔"

"تو کیا کروں میں۔ ان کی حالت تو دیکھیں آپ۔ انہیں اس وقت محبت اور ہمدردی کی ضرورت ہے۔"

"اور میں... مجھے ضرورت نہیں ہے ہمدردی کی؟ سب سے زیادہ ہمدردی کی مستحق میں ہوں۔ میں تمہاری ماں جو ہمیشہ تم تینوں کو دیکھ کر اپنی ساری محرومیاں بھلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اس حویلی سے نکال کر تم تینوں کو یہاں لائی۔ کس لیے! تمہارے اچھے مستقبل کے لیے۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے۔ ورنہ وہاں رہ کے اپنی ماں اور پھوپھیوں، خالاؤں کی طرح میٹرک، ایف اے کرتے ہی خاندان کے کسی بھی بے جوڑ مرد کے سر پہ ان چاہے بوجھ کی طرح دھری جاتیں۔ میں نے وہاں سے نکلتے ہوئے یہ بھی نہ سوچا کہ میں تنہا ہو رہی ہوں۔ اپنا میکہ، اپنا سسرال... اپنی محلّہ چھوڑ دی میں نے۔ اس شخص کے ساتھ رہتے آ رہی تھی، جس کے لیے میرا ہونا نہ ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا تھا۔ کم از کم وہاں میں کوئی حیثیت تو رکھتی تھی۔ کسی کی بیٹی، کسی کی بہن۔ کسی کی قابل احترام بہو۔ ڈھیر سارے رشتے چھوڑ کر تمہارے باپ کے لیے تحقیق... مشق بند گوارا کیا میں نے صرف اور صرف تم تینوں کے مستقبل کے لیے اور... اور یہ مستقبل سنوارا ہے تم نے؟ عشق و عاشقی کے چکروں میں پڑ کے بیڑا غرق کرنے لگی ہوا اپنا!"

"پلیز ماما! آپ آپی کی غلطی کا غصہ ہم دونوں پہ تو نہ نکالیں۔"

ہمیشہ کی گرم مزاج تطہیر تنک کر بولی۔

"اس کی غلطی تو سامنے آ گئی۔ تم دونوں نہ جانے کیا کیا گل کھلا رہی ہو گی۔ وہ ایک نمبر کی بے وقوف۔ گھر گھسی جب وہ ایسا چاند چڑھا سکتی ہے تو تم تو ساتویں آسمان پہ تھگلی لگا کے آ جاؤ تم سے کیا بعید ہے۔"

"حد ہو گئی ہے اب تو۔" تطہیر نے بھرائی آواز میں کہا اور پیر پٹختے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"اس کی بے وقوفی نے اس کا راز کھول دیا۔ تم دونوں جو ایک دوسرے سے بڑھ کے ہو کان کترنے میں تم نے کیا کیا چھپا کے رکھا ہو گا مجھ سے۔"

"ماما! آپ اپنی بیٹیوں کے بارے میں ایسی سوچ رکھتی ہیں؟" تقدیس نے بڑے دکھ کے ساتھ پوچھا تھا۔

"نہیں اپنی بیٹیوں کے بارے میں نہیں جعفر محمود کے خون کے بارے میں۔"

مدیحہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔

"تمہیں پروان چڑھانے میں لگا ہے، مجھے دھوکا دینا مجھے کچھ کے لگانا۔ تمہارے خون میں شامل ہے اعتبار توڑنا۔"

تقدیس کو اپنے اندر کچھ ٹوٹتا ہوا محسوس ہوا۔ کرچیاں بہت دور دور جا کے گری تھیں۔

❁ ❁ ❁

"نہیں ___ خیر ___ اتنی بے وقوف نہیں ہوں میں ___ وہ تو ویسے ہی موڈ میں تھی میں اس وقت اور کارٹونز بنا رہے تھے مزے کے ___ اس لیے بناتی چلی گئی ___ لیکن کم از کم پرنسپل کا یا ان دو چار ٹیچرز کا تو نہیں ___ وہاں کی جو پہلے ہی مجھ سے خار کھاتی ہیں ___"

"اوہ ___ رئیلی ___ یعنی آپ سے خار کھانے والے وہاں بھی موجود ہیں؟"

وصی نے حسب عادت انٹری دیتے ہی گفتگو کا آخری سرا پکڑا۔

"جینئس لوگوں سے ہمیشہ خار ہی کھایا جاتا ہے۔ حسد کرنے والوں کی کمی تو نہیں ہے ___"

ندا نے اسے بُری طرح گھورا۔ ایک تو ویسے ہی بڑی ہونے کے باوجود اس کا بچپن اب تک مشکوک تھا اوپر سے وصی کے بے لاگ تبصرے اسے اور بگولا سا کر دیتے۔

"تھوڑے ہی عرصے میں، میں اپنی اسٹوڈنٹس کی ہر دلعزیز ٹیچر بن گئی ہوں اور پرنسپل کی گڈ بکس میں بھی آ گئی ہوں۔ اس وجہ سے اسٹاف کی پرانی مگر اب تک ناپسندیدہ ٹیچرز جلتی ہیں مجھ سے ___ ایسے میں اگر میں ان کے کارٹونز منظر عام پر لے آتی تو بس ___"

"پھر بھی دکھائیں تو سہی ___" ہما کے اندر اشتیاق سا جاگا۔

"پتا نہیں یار ___ کہاں رکھ دیے ___ مل ہی نہیں رہے ___"

"یہ تو حال ہے جینئس لوگوں کا ___" وصی کو موقع ملا۔

"ان خاتون کو اپنا آپ یاد رہ جائے تو بڑی بات ہے ___"

"تمیز سے بات کرو تم ___" ندا بھڑک اٹھی ___ "ادب کیا ہوتا ہے بالکل ہی بھول گئے ہو ___"

"مجھے پتا ہے ادب کیا ہوتا ہے۔ لٹریچر کو کہتے ہیں ___" وصی نے چڑانے والی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"اور میں اس سے کام ضرور لوں گا مگر آپ بھی ذرا عقل شریف سے کام لیں۔ اپنے ضروری پیپرز ادھر ادھر رکھ دیتی ہیں ___ فرض کریں کبھی امتحانی پرچے یہاں وہاں بھول گئیں اور آپ کی اس غلطی کی وجہ سے پرچہ آؤٹ ہو گیا تو پھر؟ آپ کی تو یہ نوکری گئی جس پہ آپ پھولے نہیں سماتیں اور لیکچرر بن کے قوم کی معصوم بچیوں کو دھوکا دے رہی ہیں ___"

"کون سے ضروری پیپرز؟"

ندا نے تحمل سے اس کا تفصیلی بیان سننے کے بعد پوچھا۔

"وہ بھی کوئی فائل ___ جسے آپ میری گاڑی میں بھول گئی تھیں ___"

"اوہ ___ وہ میں بھول نہیں تھی ___ بلکہ بھول کے ساتھ لے جانے لگی تھی۔ اچھا ہوا وقت پہ یاد آ گیا اور میں نے گاڑی میں ہی چھوڑ دی ___ ہاں صرف تم سے کہنا بھول گئی تھی کہ اسے واپس گھر لے جانا اور میرے روم میں پہنچا دینا۔ کہاں ہے اب؟ گاڑی میں پڑی ہو گی ابھی تک ___ اتنی توفیق تو تم سے ہوئی نہیں کہ ساتھ لیتے آتے ___"

"نہیں ___ وہ تو میں نے اسی وقت ___"

اس نے کہنا چاہا مگر اس سے پہلے ہما کہہ اٹھی۔

"کون سی فائل؟"

"اس میں میں نے سارے اسٹاف اور پرنسپل کے کارٹونز بنائے تھے ___" ندا ہنستے ہوئے بتانے لگی۔

"سوچا تھا اپنی فرینڈ کو دکھاؤں گی ___ پھر خیال آیا کسی جل ککڑی "چغل خور" کولیگ کی نظر پڑ گئی تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ اس لیے وہاں لے جانے کی حماقت نہیں کی ___ اپنے آرٹ کی داد تم لوگوں سے ہی وصول کر لوں گی وصی ___" وہ وصی سے مخاطب ہوئی تو وہ گڑبڑا کے رہ گیا۔

"کیا ___؟"

"وہی فائل ___ قسم سے پرنسپل کی ناک تو ایسی کلاسک قسم کی بنی ہے اور آنکھیں ___ چشمے کی اوٹ سے

جیسے لومڑی صندوق ___" وہ قل قل کرتی ہنسی کے ساتھ بتانے لگی۔

"میں ___ ڈیپارٹمنٹ کی سینئر ہیڈ ہیں ناں ___ میڈم مزاکرے ___ جنہیں بڑی تکلیف ہوتی ہے میری اور ٹیچرز میں مقبولیت دیکھ کے اور بقول جن کے ہمارے جیسی ٹیچرز نے اسٹوڈنٹس کو سر پہ چڑھا رکھا ہے۔ ان جھائیوں کو میں نے ایسا کمال کا ابھارا ہے جیسے کسی نے سیاہ رنگ کی پچکاریاں پھینکی ہوں ان پہ ___ لاؤ ___

___ وہ تو میں ___"

اسے اپنی موت سی ندا آپی کی متوقع حرکت کا سوچ کر دل بیٹھتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بس ایک بار پتا چل جائے وہ الو کا پٹھا تھا کون؟" سوہا تلملاتے ہوئے چکر کاٹ رہی تھی۔

"تمہارا زخم خوردہ تو نہیں تھا؟" سبیکا نے ٹٹولا۔

"ہو سکتا ہے کسی پرانی چوٹ کا بدلہ لینے کے لیے یہ گھٹیا چال چلی ہو ___"

"فضول مت کرو۔ کیا میری یادداشت اتنی کمزور ہے کہ میں پہچان نہ پاؤں ___" وہ بھڑک کے بولی۔

"کیا کرے یار ___ کیا یادداشت بیچاری کیا کرے ___ کوئی دو چار ہوں تو یاد بھی رہ جائیں۔ اتنے یوتھے کون یاد رکھے ___"

شیبا نے ذہانت سے منہ بنا کر تے ہوئے کہا تو باوجود شدید غصے کے اسے ہنسی آ گئی۔

"شٹ اپ ___" اس نے شیبا کی پرگوشت کمر پہ دھپ ماری۔

"یہ فاریہ لوگوں کی شرارت ہو سکتی ہے ___"

"انہوں نے کالج میں اپنے مخالف گروپ پہ شبہ ظاہر کیا۔

"انہیں بڑی تکلیف ہو رہی ہے آج کل ___"

"یہ پتا نہ ہو وہ لمڈھینگ فاریہ رو رو کے تو اسے کوئی ڈھنگ کا بوائے فرینڈ ملا تھا اور سبیکا ایسی مین ہے ___ کہ اس نے چھین لیا ___"

"سبیکا جانے اور فاریہ ___ مجھے اس معاملے میں گھسیٹ کر اس نے اچھا نہیں کیا ___"

تب پہلی بار شیبا کو سوہا کے تاثرات سے ذرا خوف محسوس ہوا۔ چھوٹے موٹے تنازعے تو ان کے اور فاریہ کے بیچ میں ہوتے ہی تھے لیکن اگر سوہا اس میں براہ راست ملوث ہو رہی تھی تو اس کا مطلب تھا یہ تنازعہ معمولی نہیں رہنے والا۔

"لیو اٹ یار ___ جسٹ لیو اٹ ___" اس نے سوہا کے اشتعال کو کم کرنا چاہا۔ "یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے ___ کوئی ___"

"ہو گا ___ مگر میرے ساتھ نہیں ___ اگر تو فاریہ نے یہ پنگا لیا ہے تو

She should pay ___"

اس نے اپنا سیل فون نکالا اور کوئی نمبر پش کرنے لگی ___ سبیکا اور شیبا نے ایک دوسرے کو معنی خیز نگاہوں سے ___

"یار ___ یہ ٹھیک ___ صحیح نہیں ہے ___

this is not a right ___ ہمیں اس سے بات کر کے اس معاملے کو ___ حل کرنا چاہیے ___"

___ کی ہمت کی۔

"کیا ___ تم پاگل ہو؟" وہ غرائی۔

"___ میرا مطلب تھا یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ یہ سب کوئی مس انڈر اسٹینڈنگ ہو ___ ہم فاریہ

گروپ کی حرکت سمجھ رہے ہوں اور اصل میں یہ......"

"Now its too late ...... "اس نے درشتی سے کہا اور فون کی جانب متوجہ ہو گئی۔

"ہائے رومی۔۔ Whatsup یار؟ تھنکنگ اسپیشل... او لیس... اچھا سنو ایک کام تھا۔ اوہ نو..." قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔ "وہ کام تم رہنے دو۔۔ سوہا ل ہاتھوں میں لے کر نہیں چیخی جو کوئی آئے اور اڑا کے جائے۔ فی الحال تو تم سے بڑا معمولی سا کام تھا۔ ایک لڑکی ہے۔۔ فاریہ۔۔"

"سوہا۔۔ سنو تو۔" سبیکا نے اسے متوجہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ ذرا سا رخ موڑتے ہوئے مزید انہماک سے بات کرنے لگی۔ سبیکا بے بسی سے شیبا کو دیکھ کے رہ گئی۔

وہ بے چارگی سے کاندھے اچکا کے سوہا کو دیکھنے لگی۔

"نہیں بھئی اتنا زیادہ نہیں its too much تم تو موقع کے انتظار میں رہتے ہو۔" اور پھر ایک بے تکلفانہ قہقہہ لگانے کے بعد اس نے قدرے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"تو ذرا سا ذرا دینا بس بچی کو۔۔ سمجھ جائے گی اگر عقل مند ہوئی تو۔ اوکے بس گریٹ۔" چند لمحوں بعد فون بند کر کے فاتحانہ نظروں سے انہیں دیکھنے لگی۔

"کالج میں تو یہ سب چلتا رہتا ہے سوہا! تمہیں نہیں لگتا کہ تم اوور ری ایکٹ کر رہی ہو؟"

شیبا نے ملامتی انداز میں کہا۔

"اس نے مذاق کیا... مانا کہ بڑا چیپ مذاق ہے۔ تمہارا غصہ سمجھ میں آتا ہے لیکن اس میں رومی جیسے انسان کو انوالو کرنا ٹھیک نہیں ہے۔۔ مجھے تو اس سے تمہاری فرینڈشپ بھی پسند نہیں ہے۔ وہ بڑا کرمنل مائنڈ بندہ ہے۔"

سبیکا نے بھی ناپسندیدگی ظاہر کی تو وہ اس کے ناراض ناراض چہرے کو دیکھتے ہوئے مسکرانے لگی۔

"سوئٹ ہارٹ۔۔ پاور جہاں سے ملے اکٹھی کرنی چاہیے کہ یہاں جینے کا ایک ہی ڈھنگ اب تک کام آ رہا ہے سوہا کو... رومی سے میری کوئی فرینڈشپ نہیں ہے۔ آئی تھنک وہ ایسا انسان ہی نہیں ہے جس سے کوئی بھی دوستی کر سکے۔ ہاں وہ ایسا انسان ضرور ہے جس سے دوستی کے نام پہ اس کی طاقت اور اختیارات کو استعمال ضرور کیا جا سکتا ہے اور میں یہی کر رہی ہوں۔"

"فاریہ بھی کسی معمولی فیملی سے تعلق نہیں رکھتی۔ یہ بات بہت دور تک جائے گی سوہا! ابھی بھی بات ختم کر دو۔"

"جانے دو دور تک... ویسے بھی مجھے جلدی ختم ہو جانے والی نہ باتیں اچھی لگتی ہیں نہ عادتیں۔" وہ مسکراتے ہوئے وہاں سے اٹھ گئی۔

"میرا بیلنس ختم ہو گیا ہے۔ لوڈ کروا کے آتی ہوں۔ جسٹ کمنگ۔"

اور اس کے جانے کے بعد سبیکا نے پریشانی سے کہا تھا۔

"سوہا دن بدن..." اسے شاید کوئی مناسب لفظ نہیں مل رہا تھا یا کہنے سے ہچکچا رہی تھی۔

"دن بدن لوفر ہوتی جا رہی ہے۔" شیبا نے اس کی مشکل آسان کی اور اسے اس سچویشن میں بھی ہنسی آ گئی۔ "بیا! عجیب لفظ لگا ہے لوفر۔"

"Dont say یار۔۔"

"رنگیلی۔۔ Imustsay یہ وہ سوہا لگتی ہی نہیں جو چار سال پہلے تھی۔"

"چار سال پہلے وہ ایک اسکول گرل تھی۔ ہم دونوں بھی تو چار سالوں میں اتنے چینج ہوئے ہیں... یہ چینج نیچرل ہے۔ ہر ایج کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں جس طرح ہم تیرہ سال کی عمر میں رنگین ڈریس پہن کے ویسا ہی سولہ سال کی عمر میں نہیں کرتے تھے اور جو تھنکنگ ہماری سولہ سال کی عمر میں تھی وہ اب نہیں ہے۔ اس کے اندر جو چینج آ رہا ہے بلکہ آ چکا ہے وہ صرف چینج نہیں ہے disaster (تباہی) ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم بھی کسی دن پھنس جائیں گے۔"

ڈیئر، فلمی ڈائیلاگ... ایسی بے حیا... بولڈ... من موجی اور رنگیلی۔"

"ویسے یہ سب اور چیز ہے یار... تھرل کسے پسند نہیں اس ایج میں... لیکن لائف میں تھرل پیدا کرنے کے لیے مشکل میں ڈالنا پسند نہیں کرنا اور رومی جیسے لڑکے کے ساتھ اتنی دوستی رکھنا نری مصیبت ہے۔ مجھے تو سمجھ میں نہیں آتی۔ کبھی ایسا لگتا ہے جیسے اس میں اس کی عمر سے زیادہ عقل اور سمجھ بوجھ ہو۔ اپنا اس کے سامنے بالکل بچہ لگتا ہے اور کبھی ایسی چائلڈش حرکتیں... فاریہ نے ایک شرارت کی... کنفرم نہیں ہو سکا کہ یہ شرارت اس کے گروپ کی تھی یا کسی اور کی شامت آئی ہے جو اس نے سوہا کو اٹینشن لے جانے کی حرکت کروا ڈالی اور اس بات پہ وہ فاریہ کا کیس رومی تک کو دے بیٹھی ہے۔ یار بدلہ لے لیتی... بدلے میں کوئی ایسی ہی شرارت... چلو کوئی لڑائی جھگڑا ہی سہی۔ تھوڑا بہت ہم بھی ساتھ دیتے لیکن یہ بات مجھے تو ذرا اچھی نہیں لگی۔"

"ڈر نہیں لگتا اس نے کیا کہا... وہ پاور کا استعمال کر رہی ہے۔ رومی کی صورت اسے ایسی بیک ملی ہے کہ وہ اس کا کھیل جی بھر کے انجوائے کرنا چاہتی ہے۔"

"وہ اٹھی، رومی..." وہ اکتا کے کھڑی ہو گئی۔

"میں تو سخت بور ہو گئی ہوں ان بے کار لڑکوں سے۔"

"Exactly ۔۔ اب تک کے کچھ تجربے یہ بتاتے ہیں کہ بوائے فرینڈز سوائے ٹینشن اور خواری کے کچھ نہیں دیتے۔"

"کیسے؟" اس نے شرارت سے اسے دیکھا۔

"تو پھر کرو گی؟"

"میں بوائے فرینڈ پالوں پہ Depend نہیں کروں گی۔ کوئی فیانسی ہونا چاہیے یار..."

وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے گیٹ کی طرف بڑھنے لگیں۔

"اور تو کوئی منگنی شنگنی..."

"تو پہلے تم..."

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نہیں چاہتی کہ میری کوئی بھی فرینڈ میرے فیانسی پہ بری نظر رکھے۔ ہاں اگر وہ پہلے سے انگیج ہو تو ایسا ہو سکتا ہے۔"

اور تب سوہا بیلنس لوڈ کروا کے واپس اپنی مخصوص جگہ تک آئی تو گراؤنڈ میں اس کا بیگ اور فولڈر رکھا تھا۔ سبیکا اور شیبا دور... بہت دور جاتی نظر آ رہی تھیں۔

◆ ◆ ◆

ٹائٹ جینز... کیپری... اور... سلیولیس پرنٹڈ ٹاپ میں وہ سو فیصد وہی تھی۔ ... اصغر نے اس کی ایک ہی جھلک دیکھی تھی مگر وہ یقین سے کہہ سکتا تھا کہ وہ وہی ہے اور یقین ہونے کے باوجود بے یقینی کی کیفیت اس لیے تھی کہ اس کے ساتھ جو بھی تھا اور جس انداز میں تھا وہ اس قابل نہ تھا کہ اصغر بآسانی اس کے "وہی ہونے" کا اعتراف کر لیتا۔

"بس ذرا... روکنا ذرا۔"

اس نے ذرا تیزی سے کہا۔ مگر پھر اسے فوراً ہی اندیشہ ہوا کہ جو منظر اس نے دیکھا ہے وہ اگر اس ذرا دیر رکنے میں بھی ... رہ جائے گی اس کی وہ کوڈی سے ملازم کے سامنے۔

"... بس" اس نے گھبرا کے فوراً ہی اسے گاڑی آگے بڑھانے کو کہا مگر گردن موڑ کے پیچھے دیکھا ضرور... ... پشت اصغر کی جانب تھی مگر ایک ہاتھ سے سگریٹ کے کش لگاتی دوسرا ہاتھ ساتھ چلتے ہوئے اس

اوباش سے نظر آنے والے نوجوان کے کاندھے پہ بے تکلفی سے مارتی اس ریسٹورنٹ کے اندر داخل ہوئی
بالکل وہی نظر آ رہی تھی۔ اور یہ شہر کے پوش ایریا کی معروف ترین روڈ پہ بنا مہنگا ترین اور ڈیٹنگ کے حوالے سے
بدنام زمانہ یا مشہور زمانہ ریسٹورنٹ تھا۔

"روکو۔" اس نے بے تابی سے پھر کہا۔

"جی صاحب... خیریت؟" اب کی بار ڈرائیور بھی چونکا۔

"کچھ نہیں بس... وہ سگریٹ... سامنے اسٹور سے سگریٹ لا تا۔"

"یہ تو میڈیکل اسٹور ہے صاحب... یہاں سے سگریٹ کیسے ملیں گے... وہ ذرا آگے جو اسٹور ہے وہاں سے۔"

"نہیں بس..." اصغر یہاں سے ہلنا نہیں چاہتا تھا۔ یہاں سے وہ ریسٹورنٹ چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ اور اس کے
ہونے کی تصدیق کے بعد وہ...

"تم جوس لے کر آؤ۔"

ڈرائیور پیسے تھام کر اترنے لگا۔

"اور سنو... اپنے بچوں کے لیے جوس کا کارٹن اور ٹافیوں کے پیکٹ بھی لے لینا۔"

یہ اہتمام اسے اسٹور میں کچھ دیر اور روکنے کے لیے تھا۔

"ہیلو..." اس کے کار سے نکلتے ہی اصغر نے گھر کا نمبر ملایا۔

"ہوں... کیا ہے؟" ربنا کی سوئی سوئی سی آواز سنائی دی۔

"یہ کون سا وقت ہے سونے کا۔" وہ جھنجلایا ہوا لگ رہا تھا۔

"تم نے وقت پوچھنے کے لیے فون کیا ہے؟"

وہ اس سے بڑھ کے جھنجلائی ہوئی آواز میں بولی۔

"سوہا کہاں ہے؟"

"کالج میں ہوگی اور کہاں؟"

"تمہیں پکا پتا ہے وہ کالج میں ہے؟"

اس کے تیکھے لہجے اور گھبرائے انداز پہ ربنا چونکی۔ ساری نیند پلک سے اڑ گئی۔

"کیا مطلب؟"

"نمبر کون سا ہے آج کل اس کا؟" سوہا کو چونکہ آئے دن اپنا سیل نمبر چینج کرتے رہنے کی عادت تھی اس لیے
اصغر نے پوچھا۔

"میں نے اسے ابھی ابھی ایک ہوٹل میں جاتے دیکھا ہے۔"

"اوہ... تو اس میں تمہیں کیا مصیبت ہے... گئی ہوگی دوستوں کے ساتھ۔"

"پہلی بات تو یہ کہ یہ کالج کا وقت ہے۔ پڑھنے کے بجائے وہ ہوٹلوں میں کیوں پھر رہی ہے۔ دوسری بات
میں نے اسے ایک لڑکے کے ساتھ اندر جاتے دیکھا ہے اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ
ہے لفنگوں والا۔"

"تمہیں کوئی غلط فہمی ہوئی ہوگی۔" ربنا نے سنبھل کر کہنا چاہا مگر وہ بپھرا ہوا تھا۔

ساری تبدیلیاں ایک طرف مگر اس کے اندر کا روایتی مڈل کلاس مرد ابھی تک وہی تھا۔

"میں اپنی بیٹی کو نہیں پہچانوں گا؟"

"آج کل سب ہی لڑکیاں ایک جیسی لگتی ہیں۔ اچھا جاؤ اس نے پہنا کیا تھا؟" ربنا اس سے بڑے
میں پوچھ رہی تھی مگر اس کا دماغ تیزی سے کام کر رہا تھا۔

"تم نے اسے ڈھنگ کے کپڑے پہننے سکھائے ہی کب ہیں۔" اب کہ رکا ہوا دل میں دبا ہوا شکوہ بھی
ملنے پہ باہر آ گیا۔

ہوئی پینٹ... کالے رنگ کی... اور شرٹ پھولوں والی تھی۔ بڑے بڑے لال پیلے پھول۔ تم نمبر دو

ابھی۔"

رہی ہوں... لکھو..."

کا موجودہ سیل نمبر لکھوایا پھر بھرپور چونکنے کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔

ایک منٹ... مجھے یاد آیا... ابھی نیند میں، میں نے اس کی آواز سنی تھی... وہ ملازمہ کو ناشتے کا
منٹ...
اور شاید اپنے سردرد کا بتا رہی تھی۔ یعنی وہ تو کالج گئی ہی نہیں... میرا مطلب ہے گھر پہ ہی ہے تم ذرا
دیکھ کے آتی ہوں۔"

پھر ایک جانب رکھ کے اپنے کمرے میں گئی اور سوہا کا نمبر اپنے سیل فون سے ملایا۔

"دوسری جانب سے اس کی بشاشت سے بھرپور آواز سنائی دی۔

ٹراؤزر اور فلورل شرٹ میں ہو؟"

سرپرائز ملا؟"

میں جواب دو... جلدی۔"

ریسٹورنٹ میں اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ہو؟"

لیے چپ ہوئی پھر صاف گوئی سے بتانے لگی۔ notexactly بٹ یس آئی ایم وِد بوائے
فرینڈ بھی... مگر ان معنوں میں بوائے فرینڈ نہیں ہے جن میں آپ سمجھ رہی ہیں۔"

مطلب پاپا کو نہیں، اپنے چاچو کو سمجھا نا سوئٹی۔"

"چاچو...؟" وہ ہلکا سا چلائی۔

سے پہلے میرا فون بند ہوتے ہی اپنا سیل آف کرو... اور جتنی جلدی ہو سکے گھر پہنچو مگر ایم ایم عالم روڈ
کسی دوسرے راستے سے ہری اپ۔"

اصغر کے فون کی جانب آئی۔

تم اصغر... پریشان کر کے رکھ دیا ہے تم نے وہ بے چاری تو سردرد لے کر بیٹھی ہے اندر کمرے
اس کا سر درد رہتا ہے بتا رہی ہے کہ ابھی ابھی ٹیبلٹ لی ہے اور سر دبواتے دبواتے آنکھ لگ گئی

تم نے تو... وہ بالکل ویسی ہی ہے..."

"اب ربنا اسے سنا ڈالنے کا پورا حق رکھتی تھی۔

تمہاری... بیٹی پہ شک کر رہے ہو؟ اسے پتا چلا تو کتنا دکھ ہوگا بے چاری کو... خدا کا واسطہ ہے
میں تو ہار مان چکی ہوں میرے لیے نہ سہی اپنی بیٹی کے لیے ہی بدل لو خود کو۔"

زیادہ باتیں سنانے کی ضرورت نہیں ہے۔" وہ شرمندہ تو تھا مگر ابھی تک الجھا ہوا بھی تھا۔

درمیان رہنا ہی پڑتا ہے۔ زیادہ لاپروائی اچھی نہیں ہوتی ہے۔ تم مجھے پٹیاں پڑھانے کے بجائے خود
کام کرو۔"

رکھ دیا مگر اتنی دیر میں سوہا وہاں سے نکل چکی تھی۔

☆ ☆ ☆

"[illegible]"

کر کے لیٹی سوہا کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں شاید۔" وہ جعفر کا دھیان دوسری جانب لگانے میں کامیاب ہو کر ریلیکس سی ہو گئیں۔
"ہم سارے خاندان سے کٹ کر بھی تو بیٹھے ہیں۔ ورنہ ایسے معاملوں میں رشتے داریاں بہت [illegible] جاتا ہو تو رشتے کی بات بھی کہیں نہ کہیں چل نکلتی ہے۔"
عرصے بعد وہ مدیحہ کے ساتھ اس طرح کوئی بات کر رہا تھا ورنہ ایک چھت کے نیچے رہنے والے [illegible] دونوں۔ ایسے اجنبی جو نامعلوم وجوہ کی بنا پر ایک دوسرے کو خاموش مگر ناگواری سے گھورتے ہوئے [illegible] ڈھونڈتے رہیں۔
"اور ساری برادری سے کٹ کر رہنے کا فیصلہ کس کا تھا؟" مدیحہ کو شاید اس کا نارمل انداز میں بات کرنا [illegible] آیا اس لیے سلگتے لہجے میں پوچھا۔
"میرا۔" جعفر نے خلاف عادت تحمل سے کہا۔ "میں مانتا ہوں وہ فیصلہ میرا تھا۔ تب بھی وہ فیصلہ میں [illegible] کی بہتری کے لیے کیا تھا اور اب بھی۔"
"نہیں۔" مدیحہ نے اس کی بات کاٹی۔ "آپ نے وہ فیصلہ اولاد کے لیے نہیں اپنے لیے اپنی انا کی [illegible] کیا تھا۔"
"مدیحہ تم۔" وہ تلملا اٹھا۔
"بات پوری کرنے دیں مجھے۔ بچیوں کی تعلیم کے لیے ہم یہاں شفٹ ہونا چاہتے ہیں۔ یہ مطالبہ [illegible] کے سامنے پیش کیا تھا اور وہ بھی صرف آپ کے بھرم کے لیے اور آپ کو میرا احسان مند ہونا چاہیے [illegible] تک سارا خاندان حتیٰ کہ ہماری بچیاں بھی یہی سمجھتی ہیں کہ یہ اقدام میری خواہش کے نتیجے میں [illegible] تھا۔"
"بس تم احسان جتاتی رہنا اپنا۔ کبھی ماں بن کے مت سوچنا مدیحہ! خدا کا واسطہ ہے میرے ماضی [illegible] اور بچیوں کے مستقبل کے بارے میں سوچو۔"
کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ اس کے تلخ اور بپھرے ہوئے تیور مدیحہ کی مستقل مزاج بدگمانی کے سامنے [illegible] روہانسے سے ہو جاتے تھے۔
"آپ کا ماضی۔ بچیوں کا مستقبل۔ اور میرا حال؟ وہ کہاں ہے جعفر! میں نے اپنا حال [illegible] تو کبھی [illegible]
"او خدایا۔ یہ عورت کبھی نہیں بدل سکتی۔ کبھی بھی نہیں۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے اٹھ گیا۔
"اپنا حال، ماضی اور مستقبل تم نے خود برباد کیا ہے مدیحہ! میں جب بھی تمہاری جانب بڑھا [illegible] کھاتے کھول کر مجھے پیش قدمی سے روک دیا۔ تم اب بھی یہی کر رہی ہو حالانکہ اس بار میں نے تم [illegible] کر دو انگوٹھا [illegible] بیٹیوں ہی کی وجہ سے مجبور تھا۔ میں لاہور میں سیٹل ہونا چاہتا ہوں۔"
"کیا۔؟" وہ حیران رہ گئیں اس اچانک فیصلے پر.....
"مگر کیوں؟ بار بار نئی جگہ پہ سیٹل ہونا آپ کو کھیل لگتا ہے؟"
"بار بار؟ آج سے دس بارہ سال پہلے ہم اپنے گاؤں سے اسلام آباد سیٹل ہوئے تھے اب [illegible] ہوں کیونکہ گاؤں میں کوئی رہا ہی نہیں۔ نہ تمہارا۔ نہ میرا۔ سب قریبی رشتے دار لاہور میں [illegible] برنس اس نوعیت کا ہے کہ مجھے خاص فرق نہیں پڑتا یہاں سے اسے لاہور میں منتقل کرنے میں [illegible] کرو؟" اور مدیحہ سوچ میں پڑ گئیں۔

✡ ✡ ✡

"مجھے لگتا ہے جو ہو رہا ہے، بہتر ہے۔" تقدیس نے اس کا بی پی چیک کرتے ہوئے کہا۔
"گڈ۔ یہ ہوئی ناں بات۔ بی پی بالکل نارمل ہے۔ ایسے ہی ریلیکس رہا کریں۔ الٹی سیدھی سوچیں [illegible] جھٹک دیں۔ پھر دیکھیں دو تین دن کی بات ہے، بالکل ٹھیک ہوں گی آپ۔"

"پاپا نے لاہور جانے کا فیصلہ کیوں کیا تقدیس؟" تحریم نے اس کی بات نظر انداز کرتے ہوئے پریشانی سے [illegible]
"پاپا نے انہیں۔ نہیں۔ میں ان کا سامنا کیسے کروں گی؟"
"کچھ نہیں ہوا آپی! ماما نے انہیں کچھ نہیں بتایا۔"
"نہیں۔ تم یا تو مجھ سے چھپا رہی ہو یا تمہیں خود بھی علم نہیں ہو گا۔ ہو نہ ہو ایسی ہی بات ہے۔ اسی لیے پاپا ہم [illegible] یہاں سے لے جا رہے ہیں میری غلطی کی سزا تم سب کو۔"
[illegible] لگی تو تقدیس زچ ہو گئی۔ ابھی وہ اس کا بی پی نارمل ہونے پہ شکر ادا کر رہی تھی اور ابھی وہ پھر سے ایک [illegible] بیٹھی تھی۔
"[illegible] سزا۔ لاہور جا رہے ہیں ہم۔ کوئی کالا پانی تو نہیں بھیجا جا رہا اور اسلام آباد بھی کوئی رہنے کی جگہ ہے [illegible] آپ کے پسندیدہ شہر کی شان میں کوئی گستاخی نہیں کرتی لیکن یہ تو آپ کو بھی پتا ہو گا کہ جس نے لاہور [illegible] وہ جما۔ یعنی پیدا ہی نہیں ہوا۔ ہم نے لاہور دیکھا تو ہے مطلب پیدا تو ہوئے ہیں مگر ہوش نہیں [illegible] اب ہوش سنبھالتے وہاں جا رہے ہیں۔"
[illegible] نے آگریات سنبھالی.....
"مجھے تو اتنا شوق تھا کنیرڈ کالج میں جانے کا چلو اسی بہانے یہ خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور سنڈے [illegible] چڑیا گھر کا بھی چکر لگ جایا کرے گا۔ لبرٹی کے گول گپے، انارکلی کی فروٹ چاٹ..... مزے ہی مزے۔"
"اور ایک بات اور بھی ہے آپی!"
[illegible] کے ڈھیر سارے پلس پوائنٹ گنوا دینے کے بعد تقدیس نے بھی ایک پوائنٹ اٹھایا۔
"وہاں ماما اور پاپا کے بہت سے رشتے دار ہیں۔ ماموں کا گھر بھی وہیں ہے۔ مجھے لگتا ہے وہاں جانے کے بعد ماما [illegible] لگانے میں بزی رہا کریں گی تو ان کا دھیان بٹے گا۔ ان کے اور پاپا کے درمیان ہر وقت جاری ٹینشن میں کمی [illegible]"
"[illegible] تو لوگ خواب بہت دیکھتے ہیں۔"
[illegible] نے بظاہر ہنس کے طنز کیا۔ مگر اس طنز میں کتنا کرب پوشیدہ تھا، یہ وہ دونوں اچھی طرح محسوس کر سکتی [illegible] اور خواب بھی وہ جو دیکھے جانے کی پاداش میں آنکھوں میں خار ہی خار بچھا جاتے ہیں۔"
تحریم ہولے سے بڑبڑائی۔
"آپا۔ پلیز۔" تقدیس نے اس کا ہاتھ دبایا۔
"آپ بھول کیوں نہیں جاتیں یہ سب اور ویسے بھی وہ شخص یاد رکھے جانے کے قابل بھی نہیں تھا۔"
"مجھے وہ شخص نہیں اپنی غلطیاں نہیں بھولتیں۔ اب سوچتی ہوں تو حیرت ہوتی ہے کیسے۔ کس طرح میں اس [illegible] میں گرتی چلی گئی۔ جھوٹ در جھوٹ مجھے اس جال میں پھنستی چلی گئی۔ میرا شعور کہاں سو گیا تھا۔ میں اتنی [illegible] کیوں تھی عاقبت نا اندیش تو نہ تھی تقدیس..... قصور اس کا نہیں میرا تھا۔ اگر میری شخصیت مضبوط ہوتی۔ [illegible] اپنی عزت کا پاس ہوتا، اپنا اور اپنے خاندان کا وقار عزیز ہوتا تو میں کبھی اسے اس کے ارادوں میں کامیاب نہ [illegible]"
"[illegible] کبھی چاہ کے نہیں مانگی جاتی آپی! چاہے وہ خوابوں کی ہو، چاہے توقعات کی ہو۔ آپ خدا کے لیے خود کو [illegible] سمجھنا چھوڑ دیں۔ کسی کو پسند کرنا بری بات نہیں ہے اور آپ کی غلطی صرف یہیں تک محدود ہے اس کے [illegible] بھی غلط ہوا، وہ دوسری جانب سے ہوا۔"
"[illegible] تقدیس یہ میری غلطی ہے۔ ماما ٹھیک کہتی تھیں۔ مرد کبھی بھروسے کے لائق نہیں ہوتا اور میں نے ایک [illegible] بھروسہ کرنے کی غلطی کی۔"

"فارگاڈ سیک آپی... ہمارے پاپا بھی تو مرد ہیں۔ کیا آپ اور میں ان پہ بھروسہ نہیں کرتے؟"

"کرتے ہیں مگر ہم اپنے پاپا پہ بھروسا کرتے ہیں۔ کسی مرد پہ نہیں۔ ہمارے لیے وہ مرد نہیں، اتنا قابل اعتماد ... کے لیے ہیں اور ماما نے ان پہ بھروسا کیا تھا۔ بتاؤ کیا ملا انہیں اس بھروسے کے بدلے؟"

اس سوال پہ اسے گہری چپ نے گھیر لیا۔

تحریم اس کی خاموشی کو اس کا لاجواب ہونا سمجھتے ہوئے ایک گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

"پتا ہے تقدیس! میں نے ماما کو کہتے سنا تھا کہ..." وہ ذرا سا ہچکچائی۔ پھر جی کڑا کر کے کہہ دیا۔

"وہ کہہ رہی تھیں کہ پاپا کا کیا ان کی بیٹیوں کے آگے آ رہا ہے۔"

اس بات پہ اس نے تڑپ کے تحریم کو دیکھا۔

"ماما کا کہنا ہے کہ پاپا نے بھی ایسے ہی کتنے ہی دل توڑے ہیں۔ اپنی شادی شدہ زندگی اور بیٹیوں سے دور ... انہوں نے ... ایسے کتنے ہی دھوکے دیے ہیں اور اب وہ بددعائیں پیچھا کرتے کرتے ہماری زندگی میں شامل ہو چکی ہیں۔"

"ماما تو..." وہ سر جھٹک کے رہ گئی۔

اسے حقیقتاً اس بات سے بے حد تکلیف ہوئی تھی۔ وہ آج تک ماں باپ کی اس جنگ سے یہ نتیجہ اخذ نہ کر پائی تھی کہ کون سچا ہے کون جھوٹا ہے۔ کبھی اسے ماں کے آنسو سچے لگتے اور دل باپ کے خلاف شکوؤں سے بھر جاتا اور کبھی ایسا لگتا جیسے ماں نے بلاوجہ کی بدگمانیوں کا ایک گھنا جنگل اپنے ارد گرد بن رکھا ہے۔

"مجھے بہت ڈر لگنے لگا ہے تقدیس... میرے ساتھ جو ہوا وہ تو ہو گیا۔ مجھے تمہارے اور تطہیر کے لیے ڈر لگنے لگا ہے۔"

"فضول باتیں نہ سوچیں آپی... ماما کی تو عادت ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔ آپ وہم نہ کریں اور چپ چاپ لیٹ جائیں... شاباش۔"

اس نے تحریم کو تو بہلا دیا مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا دل ان گنت اندیشوں سے بھرتا جا رہا تھا۔

❋ ❋ ❋

"سنیے۔"

"ایکسکیوز می۔" میں باڈی اسپرے کی رینج دیکھتے ہوئے اس نے اپنی پشت پہ بے حد مہذب آواز سنی اور پلٹ کے دیکھا۔

"آپ وہی ہیں نا... اس دن والی!"

بلیک ٹراؤزر اور کرتے اور وائٹ لائننگ والی شرٹ میں ملبوس وہ بے حد صاف رنگت اور بے حد چمکیلی آنکھوں والا لڑکا...

سوہا تی یادداشت کو کھنگالنے لگی۔

"وہ جو کالج گیٹ پہ ملی تھیں اور میں نے آپ کو ایک فائل..." یکدم جیسے کوئی پردہ ہٹ گیا۔

وہ پہچان کر زور سے چلائی تھی۔

"تم...؟"

سوچا تھا کہیں وہ نظر آ گیا تو ادھیڑ کے رکھ دے گی... ایسی ایسی سنائے گی کہ کانوں پہ ہاتھ بھی رکھ لے۔ سماعتیں مفلوج ہو کر رہ جائیں گی... سر عام چیٹنگ تک لگوا کے رہے گی۔

لیکن اب وہ سامنے کھڑا تھا... فٹ بھر کے فاصلے پر اور وہ مٹھیاں بھینچے بس دیکھے چلے جا رہی تھی۔

"تم...؟" شدید غصے کے عالم میں فقط اتنا ہی کہہ سکی۔ باقی کے الفاظ اور ارادے کہیں آپس میں الجھ ہو کے بہت پیچھے رہ گئے۔

"وہ فائل... وہ ایکچولی..."

الفاظ تو شاید وصی کو بھی نہیں مل رہے تھے۔ اگلے ہی دن ندا کی زبانی اسے پتہ چلا تھا کہ کسی لڑکی نے ...

... فائل پہنچائی تھی اور پھر اس کا ذو خشر ہوا۔ توبہ توبہ...

"... نے فائل آپ تک کیوں نہیں پہنچائی۔ آپ نے ... بھی نہیں لیا؟" وصی حیران ہوا۔

"... پارٹمنٹ کی نہیں گئی تھی... نہیں جانتی ہوں گی مجھے اور یوں بھی مجھے اپائنٹ ہوئے عرصہ ہی کتنا ہوا ہے ... قسمت بوکھلاہٹ کے مارے وہ میرا نام تک بھول گئی اور میں بھی نا..." وہ خود ہی مزے لے لے کر ...

"... کے نیچے جلی حروف میں نام لکھ رکھے تھے۔ میں نے پرنسپل کا... وائس پرنسپل کا... ہیڈ آف دی ... کا۔ بس نہیں لکھا تو اپنا نام نہیں لکھا۔ ظاہر ہے اس بے چاری کی شامت تو آنا ہی تھی۔"

"... آپ چپ چاپ تماشا دیکھتی رہیں؟" وصی نے افسوس سے سر ہلایا۔

"... تو دیکھتی نا... مجھے تو اگلے دن پتہ چلا۔ جب یہ تماشا ہوا میں تو سیکنڈ ایئر کی کلاس لے رہی تھی۔" ندا ... افسوس تھا جیسے کچھ زبردست چیز مس ہو گئی ہو۔ اسی شام کو تو میں تم سے اپنے فونڈر کے بارے میں ... رہی تھی۔"

"بے چاری..." وصی افسوس اور ہمدردی جتانا چاہ رہا تھا مگر کچھ سوچ سوچ کر ہنسی بھی آئی جا رہی تھی۔ وہ ندا کو ... ذمہ داری کا احساس دلانا چاہتا تھا۔

"آپ کی لاپروائی کی وجہ سے ہے۔" وہ اتنا کہتا اور پھر سے ہنسنے لگ جاتا... مشکل سے دانت اندر کر کے ... سنجیدگی کا خول چڑھاتا۔

"... کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ اس سے ملتیں، معذرت کرتیں بلکہ مجھے بھی معذرت کرنی چاہیے۔ آخر ... وجہ سے بے چاری کو آئی...؟"

... ایک بار پھر چٹکلہ چھوڑا اور ہنسی بے قابو ہو کے بکھر جاتی۔

... اجازت بھی کیا ہوا۔ وہ معذرت کے لیے بڑے مناسب اور موزوں الفاظ چن کر... صورت یہ مقدور بھر ... اور متانت کی آمیزش کر کے گویا ہوا تھا مگر مزا لینے والی چٹخارے دار مسکراہٹ تھی کہ اس لڑکی کے تپ ... کھاتے چہرے کو دیکھ کے ہونٹوں کے گوشوں سے اُبلی جا رہی تھی اور یہ بات سوہا کو مزید تاؤ دلا رہی تھی۔

"... وجہ سے آپ کو بہت زحمت اٹھانا پڑی اس دن... لیکن بلیو می۔ ساری غلطی میری نہیں ہے۔ وہ ... میری سسٹر... میری کزن ہیں نا... وہ... آپ کے کالج میں..."

"... جانتی ہوں تم نے یہ حرکت کس کے کہنے پر کی ہو گی۔"

... مشکل سے خود پہ قابو پا کے سوہا نے ٹھنڈے ٹھار لہجے میں کہا۔

"... تم نہیں جانتے کہ تم اور تمہاری کزن قاریہ کس مصیبت میں پھنسنے والے ہو۔"

"...؟" وہ بھرپور طریقے سے چونکا۔ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا کہ وہ دوبارہ گویا ہوئی۔

"... بھی بھڑوں کا چھتہ ہے مسٹر... چھیڑو گے تو جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا۔"

... پھر چونکا۔ اسے پہلی بار دیکھ کے ہی جو ہلکا سا شناسائی کا احساس جاگا تھا وہ اس نام کو سن کر اور توانا ...

"... مظہر بخشی..."

... سنا ہوا نام تھا۔ بہت جانا پہچانا حوالہ تھا۔ مگر... کب... کیسے... کس طرح... وہ اس گتھی کو سلجھا ہی رہا تھا اور ... گزار رہی تھی۔

"... تو میں دیکھ ہی لوں گی مگر تم یہ نہ سمجھنا کہ صرف سوری کر لینے سے تم سستے میں چھوٹ جاؤ گے۔ ڈیڑھ ... کے سامنے میری جو انسلٹ ہوئی... جو جو باتیں مجھے سننا پڑیں... جس جس طرح سے وضاحت پیش کرنا ... سب کے تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو۔ صرف اپنی کزن پہ سارا الزام سر ڈال کے تم بری نہیں ہو سکتے۔"

"... کزن" میں ایک جھماکا ہوا۔

"آپ حسن بھائی اور حسان کی کزن ہیں؟"
وائت کچکچا کے اسے دھمکاتی سوہا پہ جیسے کسی نے اچانک برفیلے پانی کی بالٹی گرا دی۔ وہ شرمندہ ہو گئی۔

"پروین مامی کی بھانجی یا پھر شاید بھتیجی۔ وہ دراصل مجھے رشتوں کی اتنی ورائٹی سمجھ میں نہیں آتی۔"

"تم...؟" وہ الجھی۔

"میں وصی..." وہ چونکا۔ "یاد آیا... ؟ مامی کے ساتھ اکثر آتا تھا تمہارے گھر؟"

"وہ میرا گھر نہیں تھا۔" وہ جلدی سے پانی پلیٹ کر منہ پھیر کے کھڑی ہو گئی۔

"اور نہ تمہاری مامی کی بھانجی یا بھتیجی ہوں میں۔ وہ وشمہ تھی۔ اور تمہارے اس حسن نہ حسان... what کی کزن بھی وہی تھی... گیٹ آؤٹ۔"

سخت قسم کا تنفر اس کے انداز سے جھلک رہا تھا جسے محسوس کر کے وصی کا جوش کم ہوا۔ اب اسے بھی ساری تفصیل یاد آ گئی۔

"اوہ... یہ تو مامی کی بھانجی کی وہ بیٹی ہے جو..."

"آپ اسی شہر میں ہوتی ہیں... مامی نے کبھی بتایا نہیں۔"

"تمہاری مامی میرا آپا تمہیں کیوں بتانے لگیں مسٹر؟"

پہلی بار وصی کو اس کا لہجہ ذرا برا لگا۔ اس سے پہلے وہ اس کے تند رویے کے لیے اسے حق بہ جانب سمجھ رہا تھا ظاہر ہے اس کی وجہ سے بے چاری کی اتنی خواری ہوئی تھی۔

"اور فاریہ... وہ بھی تمہاری؟" وہ مزید تفصیل جاننے کے لیے پوچھنے لگی۔

"سوری... اس بار غلط فہمی آپ کو ہوئی ہے۔" اب کے وصی کا لہجہ بھی اکھڑا ہوا تھا۔ وہ مسلسل آپ جناب کر کے بات کر رہا تھا اور وہ چھوہارے کے سے انداز میں تو تکار کر رہی تھی جو اسے سخت گراں گزر رہا تھا۔

"میں کسی فاریہ کو نہیں جانتا... مجھ سے جو غلطی ہوئی اس کی وجہ وہی تھی جو میں نے آپ کو بتائی... میری آپ کے کالج میں حال ہی میں اپائنٹ ہوئی ہے بطور لیکچرر سائنس ڈپارٹمنٹ میں... میں نے وہاں تک پہنچانے کے لیے آپ سے ریکویسٹ کی تھی... یہ آپ کی قسمت کہ آپ ان کا نام بھول گئیں۔"

سوہا چند سیکنڈ جانچنے والی نظروں سے اسے تکتی رہی۔ اب وہ کافی سنجیدہ لگ رہا تھا اور کچھ خفا بھی۔

"ایکسکیوزمی مس... آپ کون سا شیمپو یوز کرتی ہیں؟" کسی کمپنی کی جانب سے آئی... سیلز گرل شائستگی سے سوہا کو مخاطب کیا۔ وہ اس دخل اندازی پر بدمزگی سے اسے گھورنے لگی۔

"آپ ہمارا یہ اینٹی ڈینڈرف..."

"او شٹ اپ..." وہ دھاڑی۔

○ ○ ○

"تمہاری وشمہ اب بڑی ہو گئی ہے۔"

نوید مراد نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے پرسوچ انداز میں کہا۔

منزہ ان کے صبح کے لیے پہننے والا سوٹ ہینگر سے اتارتے اتارتے ٹھٹک کر انہیں دیکھنے لگی۔

"پتا ہی نہیں چلا کیسے اتنا وقت گزر گیا۔"

وہ تھکے سے انداز میں مسکرا دی۔ ان کی بات پہ...

"کوئی میرے دل سے پوچھے کیسے گزرا ہے یہ وقت۔"

"بیٹے جوان ہوں تو بڑھاپے میں بھی انسان کے اندر توانائی بھر جاتی ہے۔" وہ تھکے تھکے سے لہجے میں بولے۔ "اور بیٹیاں جوان ہو جائیں تو بڑھاپے کا احساس زیادہ شدت سے ستانے لگتا ہے۔"

"تو اب آپ کے افسوس ہو رہا ہے بیٹے کے نہ ہونے کا؟" منزہ نے حیرت سے پوچھا... کیوں کہ اس کمی کا اظہار نوید کی جانب سے نہیں ہوا تھا۔

"نہیں... ہرگز نہیں... افسوس بالکل نہیں ہے۔"

وہ سیدھا ہو کے بیٹھے اور سختی سے جھٹلانے لگے۔

"بس یونہی ایک خیال سا آیا تھا۔ کہ لوگ کیوں بیٹوں کے لیے اتنا جذباتی ہوتے ہیں۔ ایک ہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ وہ چیز دل کے زیادہ قریب ہوتی ہے جس کے اپنے ہونے کا احساس توانا ہو۔ یہ ڈر نہ ہو کہ کوئی اسے ہم سے دور کر دے گا یا ہمیں اسے کسی کے ساتھ بانٹنا ہو گا جب کہ بیٹیاں جتنا مرضی سینے سے لگا کے پالو۔ اتنا پیار کرو اور پھر کسی غیر کو سونپ دو۔"

"یہ تو ریت ہے زمانے کی۔" منزہ کے دل سے ہوک سی اٹھی۔ آنکھوں میں ریت بھر گئی۔ وہ خوامخواہ ہی پلکیں جھپکانے لگی۔

"پھر بھی... کتنا مشکل ہے۔"

نجانے کیوں نوید مراد کو آج یہ احساس رہ رہ کے ہو رہا تھا۔ منزہ نے شاکی نظروں سے اسے دیکھا۔

"مشکل اور وہ آسان تھا نوید مراد جو میں نے کیا؟ میں نے بھی تو اپنے جگر کے گوشے کو خود سے الگ کیا تھا... تم تو بس لڑکے اپنا فرض ادا کرنے کے لیے... اور میں نے سارے فرائض بھی بھلا دیے تھے ماں ہونے کے... ہر دوری سے چھٹکارا پانے کے لیے اسے..."

"ارے تم رو رہی ہو؟" نوید اس کے آنسو دیکھ کر چونکے۔

"بس یونہی۔" وہ ہتھیلی کی پشت سے آنسو رگڑنے لگی۔

"ابھی تو صرف بات کی ہے میں نے... اور تم نے دریا بہا دیے ہیں... جب اسے واقعی رخصت کرنے کا وقت آئے گا تب کیا کرو گی؟"

"تب...؟" اس نے سرخ ہوتی آنکھیں نوید کی جانب اٹھائیں۔

"آپ فکر مت کریں... گزر جاؤں گی اس مرحلے سے اور بڑی آسانی کے ساتھ... بڑے حوصلے سے برداشت کر لوں گی۔ کیونکہ یہ مرحلہ میری زندگی میں پہلی بار نہیں آئے گا... میں پہلے بھی ایک بار اپنے حوصلے کا امتحان دے چکی ہوں اور اس میں سرخرو بھی ہو گئی ہوں۔"

نوید ساکت بیٹھے رہ گئے۔

منزہ اطمینان سے ان کا استری شدہ سوٹ صوفے پر پھیلانے کے بعد خالی ہینگر الماری میں لٹکا رہی تھی۔

"منزہ..." وہ دھیرے سے پکارے۔

"جی۔" اس نے جواب ضرور دیا... مگر پلٹی نہیں۔ وہیں الماری کے اندر سر دیے سامنے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

"میں نے تم سے کئی بار کہا تھا کہ اسے لے آؤ۔"

منزہ نے کمزور لہجے میں اپنا دفاع کرنے کی کوشش کی۔

"اور میں نے کئی بار بتایا ہے آپ کو کہ جانے کے سو دروازے ہوتے ہیں واپسی کا کوئی نہیں۔"

"لیکن مجھے لگتا ہے تم نے ابھی تک میرا وہ ایک قصور معاف نہیں کیا... اور نہ کبھی کرنا چاہتی ہو۔"

انہوں نے شکوہ کیا۔

"آپ کو ایسا لگتا ہے؟"

منزہ پلٹ کے ان کے سامنے کھڑی ہو گئی اور بڑے اعتماد کے ساتھ پوچھنے لگی۔ کچھ دیر پہلے کی کیفیت سے وہ گزر چکی تھی۔ اب اس کے چہرے پہ مکمل سکون اور اطمینان کے تاثرات تھے۔ نوید مراد کو ڈھونڈنے سے بھی شکست کی کوئی نشانی نہ نظر آئی۔ وہ سر جھکا کے رہ گئے۔

"اگر میری اتنی ریاضتوں کے بعد بھی آپ کو یہ لگتا ہے کہ میں آپ کے لیے دل میں ایسے جذبات رکھتی ہوں تو مجھ سے زیادہ ناکام عورت کوئی نہیں ہوگی۔ ہر عورت کے اندر موجود ماں... باقی تمام رشتوں پر حاوی ہے۔ گھر میں نے ایک بیوی ایک بہو کو تو اتار پھینکا اور ماں کو سر جھکا کے پسپا ہونے پہ مجبور کر دیا اور میں پھر بھی بانجھ نہیں رہی۔ اللہ نے مجھے سوہا کے بدلے وشمہ دے دی۔ میں خوش ہوں۔ بہت خوش۔"

اور نوید نے ہمیشہ کی طرح یقین کر لیا اور اس کا ہاتھ مشکور انداز میں تھپتھپانے لگا۔

"اب تمہیں کیا بتاؤں... کہ جس بیٹی کو وقت کی مصلحتوں کے پیش نظر خود سے الگ کیا تھا اس نے مجھے ہی ماننے سے انکار کر دیا ہے۔ اب تم لاکھ وسیع القلبی کا مظاہرہ کرو لاکھ تحفے بھیجو۔ لیکن میں اسے نہیں پا سکتی۔ بہت دور چلی گئی ہے... بہت دور... اب تمہاری معافی اس کی تلافی نہیں کر سکتی۔ تمہارا جھکا ہوا سر بھی اس زخم کو مندمل نہیں کر سکتا۔ نہیں لوٹا سکتا۔ اب تو اس دل کو سکون صرف اس صورت مل سکتا ہے کہ......"

"دراصل وشمہ کے لیے میرے ایک جاننے والے صاحب نے بات کی تھی۔ اپنے بیٹے کے لیے۔"

نوید کی بات پہ وہ اپنے خیالوں سے باہر ابھری۔

"وشمہ کے لیے؟" وہ حیران ہوئی۔ یہ وقت آ بھی گیا۔

"ہاں۔ اسی لیے مجھے رہ رہ کے ایسے خیال آ رہے تھے۔"

"ابھی اس بارے میں سوچنے کی قطعی ضرورت نہیں۔" اس کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہو گیا۔

"بہت اچھے لوگ ہیں۔ خاندانی۔ کھاتے پیتے۔ لڑکا بھی پڑھا لکھا ہے خوبرو ہے اور پھر اکلوتا۔"

"لیکن وشمہ ابھی چھوٹی ہے۔" وہ جز بز ہوئی۔

"ماں باپ کی نظر میں بیٹیاں بچیاں ہی ہوتی ہیں لیکن جب بیری پہ پتھر آنے لگیں تب اس حقیقت کو قبول کرنا پڑتا ہے۔"

"ابھی وہ پڑھ رہی ہے' ناتجربہ کار اور معصوم ہے۔ میں اسے اس جھنجٹ میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ آپ منع کر دیں۔"

"وہ کون سا فوراً ہی... میرا مطلب ہے بات آگے تو بڑھنے دو۔ منگنی کر لیتے ہیں شادی دو سال بعد یا تین سال بعد کر لیں گے۔ زیادہ سے زیادہ کتنا پڑھ لے گی؟"

"اوہ... تو منگنی کے دورانیے تک طے ہو گئے۔" اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"تو صرف خانہ پری کے لیے مجھ سے بات کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ میں اس کی لگتی کیا ہوں۔ جب سب فیصلے آپ کو خود کرنے ہیں تو جائیں کریں۔ میرا کیا حق ہے آپ کی بیٹی پہ۔"

وہ اٹھنے لگی تو نوید مراد نے گھبرا کے اس کی کلائی تھام لی۔ ان کے حقیقتاً ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"کیا کہہ رہی ہو حمیرہ... تمہارا حق نہیں ہے؟ مجھ سے زیادہ حق ہے تمہارا جو تم کہو گی وہی ہو گا۔ وشمہ کی زندگی کا ہر فیصلہ کرنے کا اختیار صرف تمہیں ہے۔"

وہ دوپٹے کے پلو سے پلکیں خشک کرتے ہوئے مسکرا دی۔

☆ ☆ ☆

"آر یو شیور... کہ اس سارے قصے سے فاریہ کا کوئی لنک نہیں ہے؟"

اس نے بلا مبالغہ کوئی بیسویں بار پوچھا تو وصی کا دل چاہا ہاتھ میں پکڑی کون اس کے منہ پر مار دے۔

"ویسے کیا فائدہ... اس آئس کریم سے زیادہ ٹھنڈے اس کے اپنے تاثرات ہیں؟ اسے کیا فرق پڑتا؟"

وہ سوچ کے ہنس پڑا اور ساتھ ساتھ وضاحت کی۔

"کتنی بار بتاؤں... میں کسی فاریہ کو نہیں جانتا۔"

"یہ جو تمہاری ہنسی ہے نا... یہ مجھے مشکوک کر دیتی ہے۔"

"تم میری ہنسی پہ نہ جاؤ۔ یہ میری عادت ہے۔"

آئس کریم کھانے کے بعد اب کون چبا رہا تھا۔ دونوں اس وقت سکنڈ ونڈو میں بیٹھے تھے۔

"پہلی بار ایسا شخص دیکھا ہے ہنسنا جس کی عادت ہے۔" وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔

"تم نے بتایا نہیں کہاں ہوتی ہو آج کل؟"

"دارالامان۔"

"نہیں... تمہیں بابا... اتنی بھی نہ پھینکو۔"

"تو پھر تم بتاؤ... کہاں ہوتی ہوں؟" وہ جاننا چاہتی تھی کہ منزہ نے اس کے بارے میں دوسروں کو کیا بتا رکھا ہے۔

"تم بتا رہی تھیں اپنے انکل کے ہاں... انہوں نے تمہیں ایڈاپٹ کیا تھا نا۔" اسے کچھ کچھ یاد تھا۔ چند سال پہلے خاصا گرما گرم موضوع تھا یہ ان کے گھر کا۔

"انہوں نے نہیں میں نے انہیں ایڈاپٹ کیا ہے۔ میری مرضی کے بغیر مجھے کوئی اپنے ساتھ نہیں رکھ سکتا۔ میرے پاپا بھی نہیں۔"

اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا کہ لاپروا سا وصی کھوجنے کے انداز میں اسے دیکھنے لگا۔

"تم... تم سے بہت مختلف ہو۔ بہت الگ۔" پتہ نہیں کیوں اس نے یہ کہا تھا اور سوہا زور سے ہنس پڑی۔

"مختلف اور انجان لوگ ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہی ہیں۔ اس کے اور میرے ایک جیسے ہونے کی وجہ بھی تو نہیں بنتی۔ نہ ہمیں پیدا کرنے والے ماں باپ ایک ہیں نہ پالنے والے۔"

"تم ہر وقت ایسی ہی جلی کٹی باتیں کرتی رہتی ہو یا یہ اس دن وہ کار ٹوٹنے والے فولڈر کے نتیجے میں پڑنے والی ڈانٹ کا نتیجہ ہے۔"

وہ ہنسنے ہنسانے والا... زندگی کے ہر رخ کو رنگوں سے بھرپور دیکھنے والا محبت بھرا شخص تھا۔ چند منٹ بعد ہی اس کی وحشت زدہ آنکھوں' جھلستی باتوں اور طنزیہ مسکراہٹ سے خائف ہو گیا۔ شدت سے یہاں سے بھاگ جانے کو دل چاہا۔

"میں ایسی ہی ہوں۔" سوہا نے شانے اچکائے۔

"اور وہ تمہاری وشمہ... وہ کیسی ہے؟" اس نے بڑی کوشش کی اپنا لہجہ عام سا سرسری رکھنے کی۔ مگر ایک فطری سا تجسس جھلک رہا تھا۔

"لیکن ہی جیسی لڑکیاں ہوتی ہیں... نہ آپی جیسی... نہ ریدا اور ہما جیسی۔"

"یعنی میں لڑکیوں جیسی نہیں ہوں؟" اس نے کھوکھلے لہجے میں کہا۔ وصی گڑبڑا اٹھا۔

"نہیں۔ میرا مطلب ہے نارمل لڑکیوں جیسی ہے۔" اس نے روانی سے بات سنبھالنا چاہی مگر وہ بالکل ہی ہاتھ سے نکل گئی اور وہ دھڑے منہ جا گری۔

"تمہارا مطلب ہے میں ابنارمل ہوں؟"

"نہیں... بس!" وہ بدک کے کھڑا ہو گیا۔

"بس... بتیس روپے کی کون کے پیچھے میں اتنا سر نہیں کھپا سکتا۔" وہ روالٹ میں سے پیسے نکالنے لگا۔

"بے شک یہاں آنے کی دعوت تم نے دی تھی لیکن میرا خیال ہے میں نے تمہارے سوالوں کے تسلی بخش جواب نہیں دیے اس لیے اس دعوت پہ میرا کوئی حق نہیں بنتا۔ یہ لو... یہ میری طرف سے ایک کون تم کھا لینا اور حساب برابر کر لینا۔"

سوہا تلملائی ہوئی اسے باہر نکلتے دیکھتی رہی پھر ٹیبل سے پچاس کا نوٹ ہاتھ میں لے کر دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ آ گئی۔

"ابھی دنیا میں اس قسم کے نمونے باقی ہیں۔"

☆ ☆

"وہ اتنی عجیب کیوں ہے؟"
سارے راستے وہ رہ رہ کے یہی سوچتا رہا۔
"ہوتی رہے۔۔۔ مجھے کیا۔" اس نے سر جھٹک کے اس خیال سے نکلنا چاہا لیکن وہ وحشت زدہ خالی خالی نظریں بے تابی سے گرد و پیش میں کچھ کھوجتی نظر آتیں اور وہ پھر سے الجھ جاتا۔
"اتنی بے چینی اس قدر اضطراب کیوں نظر آتا ہے اس کی ذات میں۔"
"ہو گی ہو گا۔۔۔ تم نے جان کے کیا کرنا ہے؟"
وہ دوبارہ خود کو لتاڑنے لگا لیکن۔۔۔
"مجھے اس کے ساتھ اتنی بے رخی سے پیش نہیں آنا چاہیے تھا۔ وہ صرف چند بے ضرر سے سوال ہی تو کر رہی تھی۔ میں نے ہی جواب کچھ الٹے دیے تھے۔ شاید میں اس کے تفتیشی انداز سے چڑ گیا تھا لیکن مجھے سمجھنا چاہیے تھا۔ کیا میرا دل نہیں چاہتا کہ میں اپنے پاپا کے بارے میں جانوں۔ وہ کیسے ہیں۔۔۔ مجھے یاد کرتے ہیں یا نہیں۔۔۔ اتنا تو پتہ ہے کہ دوسری شادی کے بعد وہ اپنے بچوں کے ساتھ ایک مکمل زندگی جی رہے ہیں لیکن اس کے باوجود کیا کبھی انہیں کسی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ اگر میں یہاں نانو کے گھر میں اتنی محبتوں کے درمیان رہتے ہوئے ان کے بارے میں جاننے کے لیے کبھی کبھی بے چین ہو جاتا ہوں تو وہ کیوں نہیں؟ شاید وہ بھی اس متعلقہ سے وشمہ کے بارے میں۔۔۔ اور میں خوامخواہ گرم ہو گیا۔"
اس نے یوٹرن لے کر گاڑی دوبارہ اس راستے پر موڑ لی۔

☼ ☼ ☼
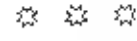
لاہور آنے کے بعد پورا ہفتہ بھرپور مصروف گزرا۔
نکرم باجوہ سالوں سے یہاں سیٹل تھا۔ بہن کے بھی یہاں منتقل ہو جانے کی خوشی میں اس نے شاندار تقریب منعقد کی اور اسی میں مدیحہ کو اپنے ان دور و نزدیک کے رشتے داروں سے ملنے کا موقع ملا جن کو وہ تقریباً بھول چکی تھی۔
"پاپا اتنے بہت سے انکل۔۔۔؟ یہ کہاں تھے اب تک؟" تینوں میں سے تطہیر جعفر سے کچھ قریب بھی تھی اور نسبتاً "بے تکلف بھی" اس نے باپ کو درجن بھر رشتے کے بھائیوں میں گھرے گپیں مارتے دیکھ کر حیرت سے پوچھا۔
"سب میری طرح اپنا اپنا الگ محور بنائے بس ایک معمول کی طرح گھوم رہے تھے۔۔۔ تھک گئے تو اصل کی جانب لوٹ آئے۔"
جعفر نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔
"نوجوانی میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہر وہ چیز، ہر وہ بات بری لگتی ہے جو زندگی میں پہلے سے موجود ہے۔ دل خود discover کی دنیا کے لیے ہمکتا ہے۔ روایتیں۔۔۔ رواج۔۔۔ رسمیں۔۔۔ وضع داری لحاظ۔۔۔ سب بے معنی لگتا ہے۔ زندگی کی دوڑ میں آگے بڑھنے سے روکتی ہوئی۔۔۔ تب یہ گرم خون جوش دلاتا ہے کہ ان پابندیوں سے آزادی ہے۔۔۔ اور یہی خون جب ٹھنڈا پڑنے لگتا ہے تو پتہ نہیں کیسے مگر قدرتی طور پر اس میں وہی آمیزش ہونے لگتی ہے جو اس کے اصل میں تھی۔"
یہ سب جو یہاں موجود تھے ان میں اکثریت جعفر محمود جیسے لوگوں کی ہی تھی۔
بیرسٹر کمال ساجد۔۔۔ جعفر کی پھوپھی زاد بہن کے شوہر محمود رہے کے رشتے دار بھی تھے۔ [illegible] انگلینڈ میں رہنے کے بعد دونوں میاں بیوی پچھلے برس ہی وطن لوٹے تھے۔ دونوں بیٹے وہیں سیٹل تھے [illegible] شادی بھی کر لی تھی۔۔۔ تینوں نے ماں باپ کے جذباتی فیصلے کا ساتھ دینے سے انکار [illegible] جو بیٹے کمال ساجد نے کیا تھا اور بہت خوش قسمت تھے کہ فیملی کو لے کر انگلینڈ شفٹ ہو گیا تھا یہ کہتے ہوئے

[illegible] میں کیا رکھا ہے؟"
[illegible] کچھ رکھے ہوئے کی تلاش میں لوٹا تھا۔ اس کے بیٹوں نے اگرچہ صاف کہہ دیا تھا کہ ان کا پاکستان [illegible] کا کوئی ارادہ نہیں۔ ان کا جینا مرنا اب اسی ملک میں ہے جہاں انہوں نے ہوش سنبھالا لیکن کمال ساجد [illegible] کے نام سے حال ہی میں ایک کاٹن مل قائم کی تھی۔ شاید وہ جانتا تھا کہ آج نہ سہی کل کچھ سالوں کے [illegible] خون آج گرم ہے ذرا ٹھنڈا پڑتے ہی مٹی کی آغوش میں حدت تلاشنے ضرور آئے گا۔
[illegible] بھی ساری عمر جس حوالے سے جان چھڑاتا اور گھبراتا رہا۔ اب بڑے فخر سے اپنے نئے سرکل میں اس کا [illegible] کروا رہا تھا۔
[illegible] سالے، بہنوئی اور چچا زاد نکرم سے اسے ہمیشہ خدا واسطے کا بیر رہا۔ اسی کے ساتھ پارٹنر شپ کے امکانات [illegible] کر رہا تھا۔ کوئی اور جانے نہ جانے مدیحہ جانتی تھی کہ جعفر کی اس تبدیلی کی وجہ کیا تھی۔
[illegible] تین بیٹیاں۔۔۔
[illegible] چاہے جتنا بھی لبرل ظاہر کرتا وہ خود کو۔۔۔ لیکن اندر سے ایک روایتی باپ تھا۔ انجان بیگانے لوگوں [illegible] بیٹیاں سونپتے ہوئے اسے ہزار دھڑکے تھے۔ جس خاندان سے کٹ کر جینے کے دعوے کیے تھے اسی [illegible] اب بیٹیوں کے لیے سہارے تلاش کرنے کی نیت سے ان کے قریب ہوا تھا۔
[illegible] مدیحہ کو بیٹیوں کی ماں ہونے پر فخر ہوا۔
[illegible] سے پہلے وہ ہمیشہ دل ہی دل میں خدا سے شاکی رہی کہ جعفر محمود کے بیٹے کی ماں بن کے اس پہ حاوی نہ [illegible] لیکن اب اسے احساس ہو رہا تھا کہ بیٹے کا باپ بن کر تو خود جعفر نے حاوی ہو جانا تھا۔ اب تو وہ زیر ہوا [illegible] تین بیٹیاں ہی ہیں جو اسے ہاتھ پکڑ کے واپس لائی ہیں۔
[illegible] جعفر محمود کا جھکا سر اور اپنے بھائی کے سامنے اس کی انکساری دیکھ دیکھ کے ایک کمینی سی راحت [illegible] اب تحریم کی وجہ سے لگا کھاؤ بھی بھولنے لگا تھا۔ واپسی پہ وہ خلاف معمول بڑی مطمئن نظر آ رہی تھی۔
"پاپا انکل ہے جی جیسی لگنے لگی ہیں۔"
[illegible] نے ذرا نوک جھونک کرتے ہوئے کہا۔
"اور بھائی صاحب بالکل تایا جی جیسے۔۔۔"
[illegible] نے کھوئے ہوئے انداز میں کہا پھر کچھ توقف کے بعد دہرایا۔
[illegible] نہیں کیوں ہم جانے والوں کی شبیہ رہ جانے والوں میں تلاشتے ہیں؟ اگر آپا، آپا جیسی لگیں اور بھائی [illegible] صاحب جیسے ہی۔۔۔ تو کیا ہمارے لیے محترم ہوں گے؟ کیا ضروری ہے کہ ان سے قریب ہونے کے [illegible] پر ان رشتوں کے خول چڑھائیں۔ کیا ان کے موجودہ رشتے کافی نہیں ہیں ہمیں ان سے قریب رکھنے [illegible]
[illegible] نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔ اتنی گہری بات کی توقع اسے مدیحہ کی جانب سے نہیں تھی۔ اس کے پاس [illegible] جواب نہیں تھا اس لیے خاموشی سے ساری توجہ سامنے پر ہجوم سڑک پہ مرکوز کر دی۔

☼ ☼ ☼
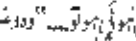
[illegible] بھی خاصی سمجھدار لڑکی ہو گیا۔۔۔ میں تمہیں ایسے ہی کند ذہن اور بُدھو سمجھ رہا تھا۔"
[illegible] سوہا نے تحریم کے [illegible] دیکھا۔
[illegible] تو تم ابھی تک تھوڑی سی ہی [illegible] ہوتی ہو تو۔۔۔" وہ وضاحت دینے لگا مگر سوہا نے بات کاٹ دی۔
[illegible] تمہیں شعری [illegible] میدان میں جھنڈے گاڑنے کا شوق ہے۔"
[illegible] "وہ میں نے [illegible] ضرورت ہونے کی دادا جی [illegible] لیکن سوہا نے دوبارہ اس کی بات کاٹ

"لیکن اس کے باوجود..." وہ پُرزور اور بلند آواز میں بولی۔

"میرے تھرڈ ایئر میں ہونے کی وجہ میرا فیل ہونا نہیں ہے بلکہ اسکولنگ کے دوران کچھ عرصے تک کے لیے میری ایجوکیشن کا سلسلہ رک گیا تھا۔"

"تب ہی... ورنہ وشمہ تو تم سے کئی سال چھوٹی ہونے کے باوجود..." اس بار سوہا نے اس کی بات نہیں کاٹی تھی، وہ خود ہی کچھ محسوس کر کے چپ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارا زیادہ تر وقت خواتین میں گزرتا ہے، خاصے گھریلو قسم کے لڑکے ہو۔" سوہا نے اندازہ لگایا۔

"کیوں؟" اس نے ابرو چڑھائے۔

"تمہاری باتیں بڑی زنانہ قسم کی ہوتی ہیں... جیسے نانیاں، دادیاں کرتی ہیں نا۔ فلاں یہ... فلاں وہ..." وہ ہنستے ہوئے اس کی ذات کا تجزیہ کر رہی تھی... اتنے دن کی دوستی کے بعد یہ حق تو رکھتی تھی وہ۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" وصی کے مردانہ زعم کو اچھی خاصی ٹھیس پہنچی۔ "اس طرح تو تمہاری گفتگو بھی اچھا خاصا مردانہ ٹچ لیتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ تم اپنا زیادہ وقت مردوں میں..."

وہ کچھ نامناسب سی بات کرتے کرتے رک گیا۔ جھینپ مٹانے کے لیے کان کی لو مسلنے لگا۔

سوہا نے اس کے شانے پہ دھپ لگاتے ہوئے ایک زوردار قہقہہ لگایا۔

"لڑکیوں کی طرح ہی پیش بھی کرتے ہو۔"

"شٹ اپ۔" وصی نے جھنجلا کے اس کا ہاتھ جھٹکا۔

پارکنگ سے کار نکالتے حسن نے بڑے تعجب سے یہ منظر دیکھا۔

وصی... اور کسی لڑکی کے ساتھ؟

وصی کی عمر تھی... اور زمانہ جس رخ پہ جا رہا تھا اس کے پیش نظر یہ ایسی انہونی بھی نہیں تھی... وہ لڑکی کوئی بھی ہو سکتی تھی... اس کی کولیگ... کوئی کالج کے زمانے کی فرینڈ... مگر حسن کے اچنبھے کی وجہ وصی کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا نہیں تھا بلکہ اس طرح کی لڑکی کے ساتھ ہونا تھا۔

کھلے سے گریبان والی سلیولیس اسکن ٹائٹ شرٹ کے ساتھ اسکن ٹائٹ جینز... جو گھٹنوں سے ذرا نیچے تھی... بے تکلفی کے ساتھ ایک پبلک پلیس پہ وصی کے ساتھ دھول دھپہ کرتی... بلند قہقہے لگاتی پہلی نظر میں ہی حسن کو سخت ناپسندیدہ لگی۔

○ ○ ○

"اک گرم چائے کی پیالی ہو۔"

حسان لاؤنج میں صوفے پہ اوندھا گرا، بڑے دردناک سُروں میں گا رہا تھا۔

"اک گرم چائے کی پیالی ہو۔"

"کوئی اس کو پلانے والی ہو۔"

"چاہے گوری ہو یا کالی ہو؟"

"لو مرو..." وصی نے چائے کا گرم گرم مگ اس کی کمر سے چھوا۔ وہ تڑپ کے اٹھا۔

کپ چھلکتے چھلکتے رہ گیا تھا۔

"او یے آرام سے... ابھی وہ تمہاری گوری یا کالی نہیں آئی چائے بنانے کے لیے... یہ گر جاتی نا تو [illegible] پتا کے نہیں دینے والا تھا۔"

"کمر جلا کے رکھ دی ہے۔" وہ کمر سہلاتے ہوئے مگ پکڑ رہا تھا۔

"کمر؟ خدا کا واسطہ ہے اتنی انکساری سے کام نہ لیا کرو۔ کیوں اس سلطنتِ خداداد کو اتنا مختصر کیے رہتے ہو۔ اچھا بھلا کمرستان ہے۔"

"جی" چائے کے بدلے دس باتیں نہ سناؤ۔ عنقریب میں چائے اور کھانے کے معاملے میں خود کفیل ہونے والا ہوں۔" حسان نے فخریہ اعلان کیا۔

"کیوں، کسی لنگر کے باہر ڈیوٹی لگ گئی ہے دیگوں کے ڈھکن اٹھانے اور رکھنے کی؟"

"تمہاری بھابی لانے کا سوچ رہا ہوں۔" حسان نے شرماتے ہوئے کہا۔

"پہلے اپنے رزلٹ تو لے آؤ۔ پھر لاتے رہنا بھابیاں۔"

"کون لا رہا ہے بھئی بھابیاں؟"

حسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے بظاہر سرسری انداز میں کہا مگر نظریں وصی کو ٹٹول رہی تھیں۔

"حضرت خود تو ویسے ہی کام کے نہ کاج کے... ڈھائی من اناج کے... اب ایک اور ذمہ داری آپ کے سر ڈالنا چاہ رہے ہیں۔ تیار ہو جائیں... اس کے ساتھ ساتھ عنقریب آپ ان کے بیوی بچوں کی بھی ذمہ داری اٹھانے والے ہیں۔"

"نہیں نہیں..." حسن کو سامنے پا کے حسان فوراً اپنے کہے الفاظ سے منحرف ہو گیا۔

"میں نے بیوی کی بات کب کی... میں تو بھابی کی بات کر رہا تھا۔"

"تمہاری بھابی کی۔" وصی نے تصحیح کی۔

"ابھی تو جو میری بھابی ہو گی وہ تمہاری بھابی بھی تو ہو گی۔ ہم دونوں کی بھابی... بھابی پیاری بھابی... ممتا اور محبت سے بھرپور... ہمیں تین ٹائم پراٹھے پکا کے کھلانے والی... ہر بیس منٹ بعد چائے کا کپ بمعہ حلوے اور [illegible] کے دینے والی۔"

"نہیں یہ خواب دن کے وقت کہاں سے آ گیا؟"

"ظاہر ہے حسن بھائی جیسے خود ہیں ویسی ان کی بیگم ہوں گی... ان ہی طرح... ہو بہو۔"

"[illegible] ایک جیسے جڑواں بہن بھائی ہوتے ہیں، میاں بیوی نہیں۔" وصی نے اس کی معلومات میں اضافہ کیا۔

"تم دونوں میری ہونے والی بے چاری بیگم کو کیوں موضوع گفتگو بنا بیٹھے ہو۔ اپنی بات کرو۔"

"اپنی... یعنی وہ جو ابھی آئی بھی نہیں... اس سے اتنی ہمدردی کہ زبانی کلامی بھی محترمہ کو تکلیف دینا گوارا نہیں... تو حسان! تم ادھر پراٹھوں اور پکوڑوں کی آس لگائے بیٹھے ہو اور یہاں ہمیں اپنا اپنا بندوبست خود کرنے کو کہا جا رہا ہے۔"

وصی نے حسان کو بھڑکانا چاہا تھا لیکن حسن نے اس پہ براہِ راست حملہ کیا۔

"اور تم تو شاید بندوبست کر بیٹھے ہو۔"

"کیا مطلب؟" وہ حسن کی سنجیدگی پہ ٹھٹکا۔

اب تک تو بات ہلکے پھلکے انداز میں ہو رہی تھی۔

"پارکنگ... کلب میں تم کیا کر رہے تھے؟"

"ٹینس کھیلنے کے لیے اکثر جاتا ہوں وہاں۔"

"اور..." حسن نے ذرا توقف کیا۔

"اس لڑکی کے ساتھ؟"

وہ ذرا چونکا... پھر سنبھل کے بیٹھ گیا۔

"وہ سوہا... پہلی بار آئی تھی وہاں... آئی نہیں میرے ساتھ پہلی بار آئی تھی... ہو سکتا ہے پہلے بھی آتی رہی ہو۔"

"دوست ہے تمہاری؟" حسن کو اس کے پُراعتماد اور بے فکر انداز کی وجہ سے مناسب الفاظ نہیں مل رہے تھے اپنی بات کے اظہار کے لیے۔

وہ ذرا سا بھی گھبرایا ہوا نہیں لگ رہا تھا۔

وصی اور حسان نے اپنی مشترکہ "اوہو" سے حسن کو خجل ہو جانے پہ مجبور کر دیا۔
وہ مسکراہٹ چھپاتا وہاں سے اٹھ گیا۔
وہ کسل مندی سے پتھر کے بنچ پہ نیم دراز تھی۔
دھوپ اب چبھنے لگی تھی۔ مگر اسے خاص اثر نہ ہو رہا تھا۔ جہاں جہاں چھاؤں تھی۔ وہاں وہاں لڑکے بالے جمگھٹے بھی تھے اور وہ ان سب چہلیں کرتی لڑکیوں سے بے زار تھی۔
حتیٰ کہ سبیکا اور شیبا سے بھی۔
جب سے سبیکا کے رشتے کی بات ممتاز صنعت کار اور زمین دار گھرانے کے چشم و چراغ شہاب پگڑی والا سے چلنا شروع ہوئی تھی۔ وہ ان تمام سرگرمیوں کے نام سے ہی بدکنے لگی تھی جو ان تینوں کے گروپ کا خاصہ تھیں۔
"اوہ۔ فیوڈل سسٹم کا حصہ بننے کی تیاری ہے؟"
سوہا نے طنزیہ تبصرہ کیا۔
"یعنی خول پہ خول چڑھا کے رکھنا۔ ابھی سے بہروپ بھرنے کی پریکٹس کر رہی ہو تا کہ پگڑی والا فیملی کی بہو بننے کے بعد کام آ سکے۔"
"اس میں بہروپ بھرنے والی کون سی بات ہے؟"
سبیکا تپ ہی تو گئی۔
"زندگی کے ہر فیز کے الگ تقاضے ہوتے ہیں۔ ہم اپنی ٹین ایج سے نکل چکے ہیں۔ اور اس ایج کی نادانیاں اسی پیریڈ کے ساتھ ختم ہو چکی ہیں۔ تمہیں بھی یہ لاابالی پن چھوڑ کے سنجیدگی کی طرف آنا چاہیے۔"
"**مثلاً**" کس قسم کی **سنجیدگی**؟ تم آج کل سگریٹ کو ہاتھ تک نہیں لگا رہی۔ اگر اسموکنگ سے پرہیز مطلب ہی سنجیدگی ہے تو تمہارے ہونے والے فیانسی کی پھوپھو محترمہ۔ جو ہمارے کالج کے بورڈ ممبرز میں سے ایک ہیں۔ دن بھر سگارے سوٹے لگاتی ہیں۔ ہو سکتا ہے تمہاری ہونے والی ساس بھی۔"
"رشتوں میں منتخب کرنے کے ایسی فیملیز کے الگ ہی معیار ہوا کرتے ہیں۔ تم جانتی ہو کہ وہ فیملی میڈیا میں کتنی ان ہے۔ ایسے میں ہر ایرے غیرے سے ملنا افورڈ نہیں کر سکتی۔ اس دن بھی جیم خانہ میں تم نے ہم کو بتائے بغیر رونی کو انوائٹ کر لیا تھا۔ رونی کا بڑا بھائی موسٹ وانٹڈ کرمنل ہے' اس کے فادر کرپشن کے الزام میں نیب کی زیر حراست ہارٹ اٹیک سے گزرے تھے اور خود رونی۔ اس کی شہرت کون سی ڈھکی چھپی ہے۔ اسی لیے میں نے وہاں سے واک آؤٹ کیا تھا' میرے ان لاز میں سے کسی کو پتہ چل جاتا کہ میری فرینڈز میں ایسے تھرڈ کلاس اور بدنام لوگ شامل ہیں تو کیا عزت رہ جاتی میری۔"
"تم تو ایسے کہہ رہی ہو جیسے یہ رشتہ نہ آتا تو تم کنواری مرنے والی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں اتنی پاگل ہو رہی ہو شہاب پگڑی والے کے لیے۔ ٹھگنے کی ڈھائی تین گز گھیر والی شلوار پہننے والا۔ بڑی بڑی مونچھیں خاندانی علامت۔ من بھر کی پگڑی سر پہ رکھی ہوئی۔ شادی کے بعد ساہیوال کی کسی حویلی کے اندر بند کر دی جاؤ گی تمہیں۔"
"ایک بار شادی ہو جانے دو۔ ایسی حویلیوں کے خفیہ دروازے بھی ہوتے ہیں۔ شہاب اپنے ماں باپ کا اکلوتا ہے۔ بھائی تو بھائی کوئی بہن تک نہیں ہے۔ اور شہاب کے پیرنٹس بھی سب بہن بھائیوں میں بڑے ہیں۔ وہ نہ صرف اپنے پیرنٹس کی پراپرٹی کا اکلوتا وارث ہو گا' بلکہ پگڑی والا خاندان کا بھی سب سے بڑا ہو گا۔"
سوہا کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس سے سبیکا کو کون سا فائدہ ہونے والا ہے۔ وہ مزید پوچھ لیتی لیکن ایک استہزائیہ مسکراہٹ ضرور اس کے چہرے پہ رنج کے ان دونوں کو تاؤ دلانے لگی۔
"اور ایک نمونہ اور آج کل تمہارے بڑا کلوز ہے۔ وہ ویرانی سی آنکھوں میں جو آتا ہے۔ مڈل کلاس کا چلتا پھرتا اشتہار۔"

"وہ بھی ہے۔" سوہا سنجیدہ ہو گئی۔
"اور میرا بہت اچھا دوست ہے۔"
"تمہیں سوٹ نہیں کرتی ایسے ٹٹ پونجیوں کی دوستی۔" شیبا نے ناک چڑھائی۔
"Exactly" سبیکا نے تائید کی۔
"پتا نہیں تمہارے ٹیسٹ کو کیا ہو گیا ہے۔ ذرا بھی سینس نہیں رہی کہ کن لوگوں سے فرینڈ شپ کرنی چاہیے۔"
"یو آر رائٹ۔" سوہا ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔
"مجھے واقعی سینس نہیں ہے اس بات کی۔ ہوتی تو کبھی تم دونوں سے بھی دوستی نہیں کرتی۔"
وہ تیز تیز قدم اٹھاتی ان سے دور ہو گئی۔
"بدتمیز۔" سبیکا بڑبڑائی۔
"مجھے تو لگتا ہے اس کا اپنا بیک گراؤنڈ بھی ایسا ہی ہو گا' اسی لیے اس قسم کے لوگوں کی جانب اٹریکٹ ہوتی ہے۔"
"دیکھا ہے اس کے انکل کو دیکھا ہے نا تم نے۔" اور دونوں اصغر کا حلیہ اور بولنے کا ڈھنگ یاد کر کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے ہنسنے لگیں۔
تب سے سوہا کا کالج آنا برائے نام تھا۔
رونی سے بھی فاریہ کے معاملے میں پھڈا چل رہا تھا۔ وصی کے ذریعے ساری حقیقت جان لینے کے بعد اس نے سب سے پہلا کام یہی کیا تھا کہ رونی کو فون کر کے فاریہ سے دور رہنے کا کہا... لیکن رونی جیسے لڑکوں کو تو موقع چاہیے ایسے کارناموں کا۔ وہ ہاتھ آیا شکار چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔
"تم آن پاپ۔ لانا تمہارا اس سے اب کوئی لینا دینا نہیں رہا لیکن مجھے تو کھاتے کھولنے دو۔ ابھی تو فون کیے ہیں کہ بلبلاتی ہوئی رونے لگ گئی۔ ذرا سا دھمکانے کی دیر ہے جہاں بلاؤں گا وہاں آ جائے گی۔"
"یہ سب میرے کہنے پہ کر رہے تھے۔ اب میں ہی کہہ رہی ہوں کہ رہنے دو۔"
"سوری۔ میں کام ادھورا نہیں چھوڑتا۔ اتنی محنت سے اس کی اور اس کے بوائے فرینڈ کی تصویریں اتاری ہیں۔ اب جب تک ان کے بدلے کچھ مل نہ جائے۔ ایسے تو بات ختم نہیں کروں گا۔"
وہ فاریہ کو بلیک میل کر رہا تھا کیوں کہ اس کی پہلے ہی اپنے فرسٹ کزن سے منگنی ہو چکی تھی۔
سوہا نے غصے میں آ کے اسے کھری کھری سنائیں یوں یہ نیا فرینڈز سرکل تو خود بخود ختم ہو گیا۔ سبیکا اور شیبا اسی بات کی بنا پر دور سے دور ہوتی جا رہی تھیں۔ خالی پن کی اس کیفیت میں وہ بیزار... وہ ماضی اس پہ زیادہ شدت سے حملہ آور ہونے لگا جس سے چھٹکارا پانے کے لیے اس نے خود کو ان بے کار مشغلوں میں الجھا رکھا تھا۔
ایسے میں وصی سے اس کا بار بار ٹکراؤ بے شک اتفاق تھا لیکن دو مخالف فطرت رکھنے والے مگر قریب قریب ایک سا مزاج رکھنے والے ایک دوسرے کے نزدیک آتے ہی گئے۔
کبھی تنہائی میں سوچنے پہ سوہا کو بھی اس تعلق کے بارے میں حیرت ہوتی۔ وہ اس کی زندگی کا پہلا مرد دوست نہ تھا۔ اس سے پہلے بھی اس کے سرکل میں کئی لڑکے آ جا چکے تھے۔ اور یہ بھی ٹھیک تھا کہ نہ ان سے اس کی دوستی اس نوعیت کی تھی نہ وصی کے لیے کوئی احساس جاگا تھا لیکن وہ سب کسی نہ کسی طرح سوہا کی بے چین طبیعت سے میل کھاتے تھے اور وصی... وہ کسی ٹھہرے ہوئے پانی کی مانند تھا۔ پرسکون... گہرا۔
سوہا کی ساری تلخ باتیں اس کے اندر ایسے گم ہو جاتیں جیسے گہرے کنوئیں میں کنکر... وہ گھنٹوں اس کی باتیں سنتا رہتا... اور وہ ذرا بھی نہ تھکتا۔
کالج کبھی جاتی تو ایک آدھ کلاس لے کر اسی طرح کسی نہ کسی کونے میں پڑی رہتی جیسی اس وقت تھی۔
"سیکیورٹی۔"

میں رکھا ہوا تھا۔ برتن اتنے تھے کہ سالگرہ اور عقیقہ یا میلاد' ختم شریف جیسے محدود پیمانے
کے لیے بھی برتن کرائے پہ نہ منگوائے گئے۔ آج کل جیسی شادیاں تھوڑا ہوا کرتی تھیں تب کہ کارڈ
تاریخ چھپوا کے مسٹر اینڈ مسز کے نام بھیج دی اور مہمان بھی ہاتھ ہلاتے شادی ہال یا ہوٹل میں وقت سے
گئے۔

ہفتوں پہلے برادری کے لوگ آنا شروع ہو جاتے تھے۔ گھر بھر جاتا تھا۔ آنگن میں بڑی بوڑھیاں
کرتیں۔ کوئی ٹولی بیٹھی جوڑے ٹانک رہی ہے' کوئی دوپٹوں پہ کرن لگا رہی ہے۔ چند بیٹھی شادی پہ پکنے
کے لیے منوں چاول چن رہی ہیں۔ لڑکیاں بالیاں ڈھولک بجا رہی ہیں۔ اتنے لوگوں کے لیے ہر وقت
سارے بستروں کا انتظام موجود رکھنا پڑتا تھا۔

شادیاں بھی تو سردیوں میں آتی تھیں۔ بڑی بڑی پیٹیاں اوپر سے نیچے تک لحافوں اور ریشمی غلاف والی
رضائیوں سے بھری رہتی تھیں' کئی کئی درجن تکیے۔ چادریں۔ اور سردیوں کے آنے سے پہلے ہر سال انہیں
دھوپ لگوانا' لحافوں' رضائیوں میں ڈورے ڈلوانا۔ یہ سارے کام۔ مگر کرنا پڑتا تھا۔ ہمیں تو اپنی ناک
ہوتی تھی۔ ہمسائیوں کے گھر جا کے بستر اور برتن مانگتے ہوئے۔ مگر ان دو چیزوں کے علاوہ میں نے کسی چیز کا
میں نہیں ہونے دیا۔

دوپہر کا کھانا کبھی رات کے لیے نہیں رکھا۔ ہمیشہ ملازمہ کو ساتھ باندھ کے دے دیا۔ اللہ رکھے اتنا کچھ ہے گھر
میں... جب نئے سے نیا خرچا برداشت کیا جا سکتا ہے تو ایک بچے کی چیز دوسرے کے لیے کیوں رکھی جائے۔
کوئی پتا تھوڑا ہی تھا کہ اس بار بھی بیٹا ہی ہوگا۔ اس لیے سراج دین کے سارے کرتے شلواریں' سوئٹر' جیکٹ
ذرا سے تنگ ہوتے ہی کسی نہ کسی کو دے دیے۔ نئے نکور مہنگے والے کپڑے' کسی غریب ماں کو کبھی لنڈے
اپنے بچے کو ایسے اچھے کپڑوں میں دیکھ کے... وہی دعائیں دیتی ہیں تو اللہ رزق اور کھول کے دیتا ہے
ان سے' اچھی چیزیں مل گئیں' یہ اس کا نصیب..."

رخشندہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھنے لگیں۔

"پروین کھانا وغیرہ پکا کے گئی ہے؟ نہیں تو میں بھیج دوں؟" انہوں نے دوبارہ موضوع بدلنا چاہا۔

"پکا گئی ہے۔ پتہ تو ہے تمہیں کہ سراج دین کھانا ہمیشہ ساتھ لے کر جاتا ہے۔ پہلے تو صرف وہی کھانا تھا' پرہیزی پھیکے کھانے۔ اب مجھے بھی کھانے پڑتے ہیں۔ بے چاری روز صبح جاگ کے چار چار کھانے پکاتی ہے۔"

"کوئی ملازمہ رکھ لیں اور کاموں کے لیے بھی تو ہیں۔"

رخشندہ نے دبے دبے اعتراض والے انداز میں کہا۔ انہیں پروین پر کبھی رشک آتا' کبھی حسد محسوس ہوتا۔
تین بیٹوں کی ماں ہونے کی رعایت لے کر تقریباً سارا کام ہی ملازماؤں سے کرواتی تھیں۔ کپڑے دھو کے
استری کر کے الماریوں میں رکھنے کے لیے الگ ملازمہ' برتن دھونے اور کچن کے دوسرے چھوٹے بڑے کاموں
جیسے آٹا گوندھنا' سبزی کاٹنا وغیرہ کے لیے ایک ملازمہ اور صفائی کے لیے الگ' جس سے رخشندہ بھی اپنے
کی صفائی کرواتی تھیں۔ البتہ باقی سب کام وہ خود یا بیٹیوں کی مدد سے کرتی تھیں۔ اگرچہ ان کے
شاید ان کی کفایت شعار طبیعت بھی کسی دوسری ملازمہ کا خرچا برداشت نہ کرتی لیکن چونکہ ساس کی جانب سے
یہ آرڈر پہلے صادر ہو چکا تھا کہ تین تین بیٹیاں گھر پہ ہوتے کے بعد اتنی ملازمائیں رکھو گی تو لوگ بیٹیوں کو
نکمی سمجھیں گے۔ اس لیے دل میں گلہ سا تھا ان کے لیے۔

"کھانا تو سراج ہی کے ہاتھ کا بنا کھاتا ہے۔" وہ مسکرائیں۔ اون کے گچھے پھر سے الجھ گئے تھے۔

"اوہو... باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا۔" وہ جھنجلا کے سرا ڈھونڈنے لگیں۔ "ذرا دیکھنا تو...
سرا کہاں الجھا ہے؟"

اور رخشندہ کو دھیان ہی نہ رہا... سرا ڈھونڈتے ڈھونڈتے اس نے پھر سے ایسا سوال پوچھ لیا۔

کہ اس موضوع سے ہٹی تھیں۔ پھر سے وہیں آ گئیں۔

"آپ نے بھی کیا جھنجٹ پال لیا ہے۔ کرنا کیا ہے اس کا؟"

"...نوبیاہتا تھی۔" انہوں نے تمہید باندھنے کے انداز میں سانس بھری۔ اور رخشندہ کا اوپر کا سانس اوپر
نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

"بچے تو یہ سوئیٹر پہنتے نہیں ہیں۔ نہ اپنے نہ ملازموں کے۔ نجانے پروین نے کب رکھے تھے یا اسٹور میں
سے جا کے اتروا رہی تھی تو کالے والے صندوق سے نکلے۔ بڑا کہا اسے کہ تو لے لے۔ مگر اس کے
کے بھی اپنے نخرے ہیں۔ لنڈے کے پہنیں گے مگر وہی مشین والے۔ میں نے سوچا ان کو ادھیڑ کے اون دری
والے کو دے دوں۔ ایسی ایسی رنگین دریاں بنتا ہے وہ ہاتھ کی... فرش پہ بچھی ہوں تو فرش کی شان بڑھ جاتی

"...چند ایک سوئیٹر اور شالیں میرے پاس بھی رکھی ہیں۔ وہ بھی لے لیجئے گا۔ میں خود ادھیڑ دوں گی۔
مجھے بھی دو تین دریاں بنوا دیں۔"

"مگر تم تو قالین اور دری وغیرہ نہیں بچھواتیں۔ بچے کی تکلیف ہے نا تمہیں۔"

"بچیوں کے جہیز میں رکھ دوں گی۔ سال کا مسئلہ... اگلے گھر ساتھ تو نہیں لے کر جائیں گی۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔ پہلے وقتوں میں لوگ جہیز میں سوئی تک رکھتے تھے۔ میرے جہیز میں مجھے آٹا پیسنے کی چکی
بھی ملی تھی۔ سونے کے کیل گڑے تھے اس میں۔"

"سونے کے کیل...؟"

"ہاں ہاتھ سے جھلنے والے پنکھوں سے لے کر چاندی کے چمچوں تک' مسہری اور چھپر کھٹ سے لے کر اودائن
والی چارپائیوں تک' بھاری صوفوں سے لے کر لکڑی کی چوکیوں تک' فرانس سے منگوائے چینی کے ڈنر سیٹ
سے لے کر انگ سے لائے پتھر کے سل بٹے تک... ہر چیز موجود تھی۔"

"میری ندا کے لیے بھی خیر سے ہر چیز موجود ہے۔"

رخشندہ فخر سے مسکرائیں۔ پھر ساتھ ہی ان کی مسکراہٹ پھیکی پڑ گئی۔

"اور پتہ نہیں میں کب تک سنبھالتی رہوں گی۔"

شوکت جہاں کے متحرک ہاتھ تھم گئے۔

"ایسا کیوں سوچتی ہو۔ دیکھنا ندا کے لیے اللہ کیسا در کھولے گا اور ہماری بیٹی میں کسی چیز کی کمی ہے۔ ماشاء اللہ
صورت سیرت دونوں میں اچھی ہے اور پھر تعلیم۔"

"اور عمر بھی..." رخشندہ نے دبے لفظوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا جس سے وہ نظر چرا رہی تھیں۔

"ہاں... اگر میں اپنے وقتوں کے لحاظ سے دیکھوں تو عمر کچھ بڑھ گئی ہے مگر آج کے زمانے کے لحاظ سے دیکھو
تو عمر کچھ ایسی زیادہ بھی نہیں۔ اتنی تعلیم اٹھارہویں سال میں تو حاصل نہیں کی جا سکتی۔ ہر دوسرے گھر میں
پچیس سے لے کر پینتیس سال تک کی کنواری بچیاں موجود ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا عام ہو چکا ہے کہ اتنی انہونی نہیں

"مجھے تو سوچ سوچ کے ہول اٹھتے ہیں۔ حالانکہ ندا ابھی چھبیس سال کی ہے اور اللہ کرے عمر کے تیس
پورے کرنے سے پہلے پہلے وہ اپنے گھر کی ہو جائے۔"

"وظیفے... ٹلنے کے بھی سلیقے قرینے ہوا کرتے ہیں۔ سب کہنے کے بجائے یہ مانگو کہ جو ندا کے حق میں بہتر ہو
اللہ تب اس کے نصیب کھولے۔"

...کے بعد کہنے لگیں۔

"...بھی تو ہے اپنے حسن سے ورنہ پروین کبھی بھی پیچھے نہ رہتی۔"

"میرے پاپا کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

سوہا نے بے تاثر چہرے کے ساتھ سامنے تکتے ہوئے کہا اور مٹھی بھر کے گھاس زمین سے نوچ ڈالی۔

"اوہ... سوری۔" تقدیس کو حقیقتاً افسوس ہوا۔

"اپنے نانا نانی کے ہاں رہتی ہو ماما کے ساتھ؟"

اس نے وہی اندازہ لگایا۔ جو عموماً "ایسے کیسز" میں ہوا کرتا ہے۔

"نہیں' وہ میرے پیدا ہونے سے پہلے گزر چکے تھے۔"

"اوہ پھر دادا' دادی...؟"

"وہ میرے پیدا ہونے کے بعد گئے۔" پھیکی سی ہنسی کے ساتھ اس نے ہلکے پھلکے لہجے میں کہا۔

ہمیشہ کی نرم دل' ہمدرد طبیعت تقدیس ایک سرد آہ بھر کر رہ گئی... اس کے سامنے جیسے سوہا کا سارا بچپن بکھر گیا... نہ ددھیال... نہ ننھیال... ایک جوان بیوہ عورت... ایک چھوٹی تنہا بچی... اگرچہ سوہا کو دیکھ کے اس کے [illegible] بے حد مضبوط فیملی بیک گراؤنڈ کا پتا چلتا تھا اس کے باوجود وہ اندازہ کر سکتی تھی کہ اس کی ماں کو ان تمام [illegible] کیا کیا مشکلات پیش آئی ہوں گی اور وہ جو پچھلے ایک ہفتے کے دوران سوہا کی چند عادتیں... چند باتیں اسے کھٹکی تھیں' ان کا سرا بھی اس نے اسی ایک وجہ پہ باندھ دیا۔

"شخصیت میں توڑ پھوڑ تو ہونا ہی تھی... آخر بچپن میں یہ سب سہنا پڑا۔"

اس نے از خود فرض کر لیا اور بڑی ہمدردی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہنے لگی۔

"میں سمجھ سکتی ہوں لیکن تمہیں اداس نہیں ہونا چاہیے۔ فخر کرنا چاہیے کہ تمہارے پاس ایسی ماں ہیں جو تن تنہا تمہاری پرورش کرنے کا حوصلہ رکھتی تھیں۔"

سوہا نے چبھتی نظروں سے تقدیس کو دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہر کی اوس میں بھیگی مسکراہٹ آ گئی۔

کڑوی کڑوی... کسیلی کسیلی سی مسکراہٹ۔

"بے شک انہیں کوئی فنانشل کرائسس سے نہ گزرنا پڑا ہو گا لیکن پھر بھی ایک عورت کے لیے کسی کی مدد کے بغیر خود سروائیو کرنا کسی کارنامے سے کم نہیں۔"

"کارنامہ...؟" کڑوی کسیلی مسکراہٹ زہر اگلتے قہقہے میں بدل گئی۔

"اس میں ہنسنے کی کیا بات ہے۔" تقدیس متعجب ہو گئی۔

"آج تمہیں یہ بات معمولی لگ رہی ہے لیکن سوچو تو غیر معمولی ہے۔ تم نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ تم نانا' نانی کے پاس رہتی ہو اور نہ دادا' دادی کے پاس... لیکن اگر ایسا ہوتا تو یہ بتاتے ہوئے تمہارا دل احسان مندی کے بوجھ تلے دبا ہوتا۔ تمہاری ماما نے تمہیں اس بوجھ سے بچایا ہے۔"

"میرے پاپا کی ڈیتھ کے فوراً بعد دوسری شادی کر کے؟"

اس نے اتنا اچانک یہ کہا کہ تقدیس چپ کی چپ رہ گئی۔ اس بار اس کے پاس کہنے کو کچھ بھی نہ تھا۔

☆ ☆ ☆

"یہ دیکھیں کیسا خوب صورت بارڈر ہے۔" پروین نے شوکت جہاں کی آنکھوں کے سامنے دوپٹہ پھیلایا۔

"ہوں... اچھا ہے۔"

"اور کپڑا ذرا ہاتھ میں پکڑ کے دیکھیں کیسا نفیس ہے... ویسے تو میں آپ کے لیے ہمیشہ ہی بڑھیا سے بڑھیا [illegible] ہوں کیونکہ مجھے پتہ ہے کہ آپ کو زیادہ جوڑے سلوانے کی نہ عادت ہے نہ شوق... کم سلواتی ہیں مگر اچھے سلواتی ہیں۔ رنگ آپ کی پسند کا ہے نا؟"

"ہاں... اچھا ہے۔"

[illegible] بازار نکلیں...

[illegible] ہوں ہاں میں جواب دے رہی تھیں حالانکہ ہمیشہ ہی ان کی خریداری میں بے حد دلچسپی لیا کرتی [illegible] کسی زمانے میں ساس بہو یہ کام اکٹھے کیا کرتی تھیں۔ باہمی مشورے کے ساتھ اور اس سے بھی پہلے یہ کام [illegible] کے لیے شوکت جہاں پروین کو ساتھ لیے پھرتی تھیں تاکہ انہیں گھر کے ہر فرد کے مزاج' عمر اور ضرورت [illegible] شاپنگ کا سلیقہ سکھا دیں۔ چند ہی برسوں میں بہو ان شاپنگ کے فن میں طاق ہو گئیں اور شوکت جہاں [illegible] کے لیے ان ہی پہ انحصار کرنے لگیں۔ اب عمر کے اثرات نمایاں ہونے کی وجہ سے وہ خود تو جا نہ پاتی تھیں [illegible] کے ساتھ مگر اس کی شاپنگ ذوق و شوق سے دیکھا کرتیں۔

"کیا بات ہے اماں جان' طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"جی ٹھیک۔" انہوں نے بشاشت دکھانا چاہی۔

"اور یہ شیفون کے سوٹ اپنے لیے لائی ہو؟"

"ہاں جی... دو تو میں نے خود لیے ہیں اور یہ..."

[illegible] رنگ کا کچھ فینسی سوٹ دکھاتے ہوئے وہ اس عمر میں بھی نوبیاہتاؤں کی طرح تھوڑی سی لجا گئیں۔

[illegible] اگلے جمعہ کو ہماری شادی کی سالگرہ آ رہی ہے تو انہوں نے کچھ پیسے الگ سے دیے تھے کہ اپنے لیے کوئی اچھا [illegible] لینا۔ میری طرف سے۔"

"اچھا۔" شوکت جہاں کو خوشگوار حیرت ہوئی۔ چلو دیر سے ہی سہی۔ پتھر کو جونک تو لگی... وہ مسکرا اٹھیں۔ [illegible] ساتھ ان کا ہاتھ پروین کے سر کی جانب چلا گیا' جو بڑی مطمئن سی مسکراہٹ لیے سوٹ تہہ کرتے ہوئے واپس [illegible] میں رکھ رہی تھیں۔

"اور یہ ایک ایک سوٹ میں نے بچیوں کا لیا ہے۔" شوکت جہاں سمجھ گئیں۔ بچیوں کا لفظ وہ جیٹھ کی تینوں [illegible] کے لیے استعمال کیا کرتی تھیں۔

"ایسے تو آج کل کی لڑکیاں زیادہ تر سوتی جوڑے پہننا پسند کرتی ہیں اور وہ بھی بازار کے سلے سلائے۔ بوتیک [illegible] ریڈی میڈ لیکن اس میں شاپنگ کا مجھے خاص تجربہ نہیں ہے۔ نجانے کسی کو پسند آئے یا نہ آئے۔ اسی لیے یہ [illegible] شیفون کے لے آئی... بڑے سے لیے ہیں۔"

"[illegible] خیر۔ رخشندہ نے بچیوں کو سب کچھ سکھایا ہے۔ بوتیکوں کے مہنگے مہنگے کپڑے وہ بھی کہاں پہنتی ہیں۔ [illegible] کہیں سلے سے لے آئے تو لے آئے ورنہ تمہیں تو پتہ ہے رخشندہ نے ہمیشہ خود اپنے ہاتھ سے سی کر [illegible] اور ایسے ایسے خوب صورت کہ لوگ رک رک کر پوچھتے تھے کہاں سے لیا ہے یہ فراک...؟ [illegible] خود نہیں سیتی مگر دیکھ لو... اپنا ہنر ہما تک کیا منتقل کیا ہے۔ اب اس کے ہاتھ میں کمال کی صفائی ہے۔ میرا [illegible] ایسا کمال کا سیا ہے ورنہ میں تو پچیس سالوں سے سوائے اقبال بیگم کے ہاتھ کی سلائی کے اور کسی سے [illegible] نہیں ہوئی تھی۔ اس نے آنکھوں کا آپریشن کرایا اور میرے ہاتھ پیر پھولے کہ اب نئی درزن یا درزی [illegible] میرے دل [illegible] ٹھکتا ہی نہیں کسی پہ... مگر [illegible]"

"[illegible] ہے ہی بہت سگھڑ... سلائی کے معاملے میں ہی ہاتھ صاف نہیں ہے' ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت ہے۔ سلیقہ [illegible]"

"[illegible] اس کے ماموؤں کو یہ سب نظر نہیں آتا۔" انہوں نے سرد آہ بھری۔

"[illegible] باہر سے بہوویں لے آئے۔"

"[illegible]" پروین کچھ متذبذب ہو گئیں۔

"[illegible] پہلے تو ہندائے نا... اور [illegible] ویسے ہما کے لیے تو سوچنا چاہیے تھا نہیں۔"

[illegible] نہیں رہا کہ بڑی نند کی وجہ سے چھوٹی کو بٹھا کر رکھا جائے۔ خصوصاً [illegible] کے معاملے میں اتنی کڑی

روایت پہ عمل کرنا بے کار ہے۔ ہاں چار پانچ ہوں اور پہلی کو چھوڑ کر چوتھی یا پانچویں بیاہ دی جائے تو ذرا عجیب لگتا ہے لیکن ندا ماشاءاللہ ہما اور رودا دونوں سے زیادہ خوب صورت اور تعلیم یافتہ ہے۔ سرکاری ملازم بھی ہے۔ قدرت کی جانب سے کوئی بندش ہے ورنہ کمی تو کوئی نہیں اس میں۔ شاید اللہ کی کوئی مصلحت ہو اس میں لیکن میرا ایمان ہے اس کے لیے جب بھی کوئی رشتہ آیا لاکھوں میں ایک ہوگا۔ بڑی روشن پیشانی ہے اس کی۔"

"ان شاءاللہ۔" پروین نے صدقِ دل سے کہا۔

"لیکن اس وقت تک کے لیے ہما کو بٹھائے رکھنا سمجھ میں نہیں آتا۔ یہی میں رخشندہ سے بھی کہہ رہی تھی کہ کوئی اچھا رشتہ آئے تو یہ بات رکاوٹ نہ بننے دینا کیونکہ ہما بھی ماشاءاللہ پیاری شکل و صورت کی ہے لیکن ندا کے مقابلے میں دبتی ہے۔ کچھ کاٹھی اس کی ایسی ہے کہ عمر سے بڑی لگتی ہے۔ بالکل ندا کے برعکس۔ جسے دیکھو وہ عمر کے چھبیسویں یا ستائیسویں سال میں ہے۔ لیکچرر بننے کے بعد بھی اکیس یا بائیس سے زیادہ کی نہیں لگتی اور ہما ہے ہی بائیس برس کی۔ مگر مجھے نہیں لگتا کہ اگلے پانچ سال بعد وہ بائیس کی بھی لگے گی۔ وہ شاید تمیز کی کمی لگتی ہے ندا لاابالی ہے۔ ہنستے کھیلتے مزاج کی اور ہما شروع سے سنجیدہ اور حساس ہے۔ اس لیے ڈر ہے بڑھتی عمر کے اثرات اس پہ جلد نمایاں ہوں گے۔ ہاں اللہ کرے اپنے گھر میں ہنس بس جائے تو بچیوں کی عمر رک جاتی ہے۔ خوشحالی اور جوبن ہی الگ ہوتا ہے۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" وہ متفق ہوئیں۔

"پھر کیا کہا رخشندہ نے؟"

جواب میں شوکت جہاں بے بسی بھری نظروں سے اسے دیکھنے لگیں۔

"کیا کہتی بے چاری۔ یہی کہ رشتے آتے ہی نہیں تو کیا فیصلہ کیا جائے۔ نہ ندا کا نہ ہما کا نہ رودا کا۔ کسی ایک کا بھی آجائے تو دوست لگے۔"

"یہ تو واقعی فکر والی بات ہے اور اماں جان! مجھے تو ایک ڈر اور بھی رہتا ہے۔ رخشندہ بھابی کی جب شادی ہوئی تو ان کی عمر بھی تب اچھی خاصی تھی اور ان کی چھوٹی بہن اب تک کنواری ہے۔ اب تو خیر بڑھاپے کی دہلیز تک آن پہنچی۔ کہیں یہی اثرات خدانخواستہ بچیوں تک۔۔۔۔"

"کیسی جاہلانہ باتیں کر رہی ہو پروین۔"

شوکت جہاں نے بلاتوقف ٹوک دیا۔

"ہر کسی کا اپنا نصیب ہے۔ کسی کی قسمت کے اثرات کسی دوسرے پہ کیوں ہونے لگے۔ یہ تو توہم پرستی اور کمزور عقیدے کی نشانیاں ہیں۔"

"توبہ توبہ۔ واقعی۔" وہ فوراً متفق ہو گئیں اور یہی ادا ان کی تھی جو شوکت جہاں کو سب سے زیادہ اچھی لگتی تھی۔ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے میں ہچکچاتیں نہ ہی شرمندگی کا اظہار کرنے میں دیر لگاتیں۔

"میں کہوں۔۔۔" اشارے کنائے میں بات بنتی نہ دیکھ کر بالآخر انہوں نے واضح کہنے کی ٹھانی۔

"میں کہوں۔۔۔ کیوں نہ تم ہی پہل کر لو۔"

"کس معاملے میں اماں جان؟" وہ بھولپن سے پوچھنے لگیں تو انہوں نے ایک خفگی بھری نظر ان پہ ڈالی۔

"نہ جانے کون ہیں ساں ہیں جو اشارے کنائے اور رمزیں تک بھانپ لیتی ہیں۔" انہوں نے پہلے تو گھر کا ... اور پاس سرک کر رازداری سے کہا۔

"ہما کے معاملے میں۔۔۔"

پروین حق دق ساس کا چہرہ تکنے لگیں۔

بات سمجھ میں آ گئی تھی۔ مگر حیرت کا حملہ بھرپور تھا۔

"ندا حسن سے بڑی سہی۔ چاہے سال بھر ہی کا فرق ہے مگر ہے تو سہی۔ خاندان میں ایسی باتیں سب سے زیادہ

ہونے کی وجہ سے زیادہ اچھالی جاتی ہیں جس سے میاں بیوی کے مابین تلخی کو ہوا ملتی ہے اس لیے میں ذاتی طور پر ایک دو سال کے فرق کو اہمیت نہ دینے کے باوجود اس رشتے پہ تیار نہیں۔ جب ہی ہلکا سا اشارتاً بھی نہیں کہا تم سے لیکن ہما تو حسن کے لیے بے حد مناسب رہے گی۔"

"واقعی۔ اس بارے میں تو کبھی میں نے۔۔۔ بلکہ کسی نے بھی سوچا تک نہیں۔" پروین نے حیرت کے جھٹکوں سے سنبھلتے ہوئے کہا اور ان کے لہجے کی خوشگواری محسوس کر کے شوکت جہاں نے مطمئن ہوتے ہوئے مسکرا کے کہا۔

"میں نے تو کئی بار سوچا۔ کئی سالوں سے سوچ رہی تھی۔ ہاں مگر کہا نہیں۔"

"کیوں اماں جان؟"

"بس یہی سوچتی رہی کہ اولاد پہ حق ماں باپ کا ہوتا ہے اور ان کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار بھی سب سے زیادہ ان ہی کا ہوتا ہے۔"

"یہ کیا بات کی آپ نے۔۔۔؟ ہم سب آپ کی اولاد ہیں۔ ہم بھی ہمارے بچے بھی۔ آپ کا حق اس گھر کے ہر فرد پہ ہر فرد سے زیادہ ہے۔"

انہوں نے ساس کے ہاتھ تھام کر اپنی نم ناک آنکھوں سے لگاتے ہوئے صدقِ دل سے کہا۔

شوکت جہاں کا مان کئی گنا بڑھ گیا۔

لیکن وہ ان ماؤں اور ساسوں میں سے نہیں تھیں جو خود کو ملی عزت، مان اور اختیار کا کھل کے فائدہ اٹھاتی ہوں اس لیے رسانیت سے کہنے لگیں۔

"میرے بچے۔۔۔ تم اور سراج فوراً رشتہ لے کر اوپر چلے جاتے اور یہی میں نہیں چاہتی تھی کہ تم یہ فیصلہ صرف میری خواہش کے احترام میں کرو۔ میں چاہتی تھی کہ تمہارے دلوں میں خود ہما یا رودا کے لیے خواہش پیدا ہو۔ ابھی بھی اگر میں نے بہت مجبور ہو کر یہ بات کی ہے تو صرف تمہارا دھیان اس جانب دلانے کے لیے۔ میری جانب سے کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اسے تم صرف ایک رائے سمجھو۔ یا پھر ایک گزارش کہ حسن کے بارے میں سوچتے ہوئے میری پوتیوں کو بھی نظر میں رکھنا۔"

"خدا کے لیے اماں جان!"

پروین آبدیدہ ہو گئیں۔

"ایسے تو نہ کہیں۔ آپ کی پوتیاں ہماری بھی کچھ لگتی ہیں۔ مجھے تو شرمندگی ہو رہی ہے یہ سوچ کر کہ آپ کو یہ بات اتنے انتظار کے بعد کہنا پڑی۔ یقین کیجیے ہمیں بھائی جان کی بچیوں سے پیارا کوئی نہیں لیکن شاید میں یہ بھول بیٹھی تھی کہ وہ میری بیٹیاں نہیں ہیں، بھتیجیاں ہیں اس لیے ہونے والی بہو کے طور پہ کبھی سوچا ہی نہیں۔ ہمیشہ ان کی شادی اور رشتوں کے لیے رخشندہ کے ساتھ مل کر فکرمند ہوتی رہی، یہ خیال کبھی نہ آیا کہ انہیں رخصت کرانے کی فکر کرنے کے بجائے لے کر آنے کا سوچوں۔ میری طرف سے تو کوئی اعتراض نہیں۔ مجھے بھلا ہما سے اچھی لڑکی کون ملے گی۔"

"اور سراج۔ اس سے تو پوچھا ہوگا۔"

ان کے اندر دبے اندیشے نے سر اٹھایا۔

"آپ کے بیٹے ہیں، اتنا بھی نہیں جانتیں ان کے بارے میں، ایسی باتوں کی طرف میرا دھیان کم کم جاتا ہے اتنے سالوں کی بیاہتا اور گھرستی ہونے کے باوجود وہ تو پھر مرد ہیں۔ کاروبار کے علاوہ کچھ سوچتا ہی نہیں۔ دیکھیے گا وہ تو سنتے ہی اچھل جائیں گے۔ خوشی کے مارے۔"

آخری الفاظ انہوں نے ذرا توقف سے کہے اور خود ہی مزا لیتے ہوئے ہنس دیں۔

شوکت جہاں کو اپنے شانوں سے کوئی بھاری بوجھ ہٹتا ہوا محسوس ہوا، جو رخشندہ کی پژمردہ حالت دیکھ کر خود بخود ان پہ آن پڑا تھا۔

اب وہ پھر سے پرانے ذوق و شوق کے ساتھ اس کی شاپنگ گنگنانے لگیں۔

"یہ گلاس تو بالکل نئے ڈیزائن کے ہیں۔"

"جی اماں جان... تین سو کا ایک پڑا ہے۔"

"میرے خدا... اتنے مہنگے... اچھا سنو، میں پچھلی بار بھی پوچھتے پوچھتے رہ گئی تھی... اب تم ہر بار خریداری میں ایک فرد کو بھول جاتی ہو... ایسا کیوں؟"

"کون...؟ میاں صاحب کے کرتے لائی تو ہوں... اور یہ بنیائیں... اور..."

"میں سراج کی بات نہیں کر رہی۔"

"ارے اماں جان! اللہ کے اب کہاں میری پسند کا لایا پہنتے ہیں، اب کی بات تھوڑا ہی ہے... سالوں ہو گئے۔"

"میں وشمہ کی بات کر رہی ہوں۔"

"وشمہ...؟" پروین جو نئے! وہ جوڑا کھول کر، بار بار کتے ہوئے لپیٹ رہی تھیں، ٹھٹھک گئیں۔

"مجھے یاد ہے جب سے وہ پیدا ہوئی، تم با قاعدگی سے اس کے لیے کچھ نہ کچھ لاتی رہتی تھیں... حالانکہ تب سراج کا مزاج ساتویں آسمان کو چھو رہا تھا... خواہ مخواہ کا بیر تھا اسے اس معصوم بچی سے... پھر بھی تم اپنی جانب سے پھوپھی ہونے کا فرض ادا کرتی رہیں۔ بن ماں کی بچی کی ضرورتوں اور خواہشوں کا دھیان رکھتے ہوئے اور اب جب سراج بھی خاصا بدل گیا ہے... میں میخ نکالنے کی عادت کافی حد تک ترک کر چکا ہے... تم اپنی یہ روش کم کرتے کرتے تقریباً چھوڑ چکی ہو... کیوں؟"

"اماں جان... اس کا خیال رکھنے کو اس کی ماما ہے نا... ہمیں وہ سمجھتی ہی کیا ہے؟"

وہ اداسی سے کہنے لگیں۔

"ایسا تو مت کہو... بڑی با ادب اور تمیز والی بچی ہے۔"

"یہ تو ہے... مگر منزہ بھابی سے زیادہ اہمیت کسی کو نہیں دیتی۔"

"تمہارے بچے بھی تو تم سے زیادہ اہمیت کسی کو نہیں دیتے ہوں گے... یہ ایک حقیقت ہے۔"

"لیکن وہ اس کی ماں تو نہیں ہے... ہم زیادہ سگے ہیں۔" پروین جھنجلا اٹھیں۔

"ہم کون...؟"

"ہم یعنی... میں... پھوپھی اور اماں یعنی دادی۔"

"بہن جی تو رہیں نہیں... تم پھوپھی ہو مگر اپنے گھر بار اور بچوں والی... اگر وہ منزہ کو سگی ماں اور منزہ اسے سگی اولاد سمجھتی ہے تو تمہیں خوش ہونا چاہیے... اگر صورت حال اس کے برعکس ہوتی تو تم زیادہ دکھی ہوتیں۔"

"نہیں اماں جان! مجھے اعتراض ان دونوں کے رشتے کی نوعیت پہ نہیں... دراصل ایک عجیب سا احساس ہے... بس کچھ ہے... اماں جان... جو بری طرح محسوس ہوتا ہے مگر بیان نہیں کیا جا سکتا۔"

پروین کی حسیات اتنی تیز نہ سہی... مگر بہرحال تھیں تو سہی... اس لیے اس گڑبڑ کو وہ بھانپ تو رہی تھیں مگر نشاندہی نہ کر پا رہی تھیں... اسی لیے دانستہ، نادانستہ وہ اپنے آپ کو سمیٹ رہی تھیں... وہاں جانا نہ ہونے کے برابر کر دیا تھا کیونکہ ہمیشہ وہاں جا کے اسی الجھن میں گرفتار ہو جاتی تھیں۔

"جو بھی ہے تمہارا اور اس کا رشتہ تو ہے... اس سے پیچھے نہ ہٹو... کل یا پرسوں جا کے مل بھی آؤ اور اپنی بھتیجی کے لیے ایک جوڑا اس کے لیے لے جاؤ۔"

"جی اچھا..."

☼ ☼ ☼

"ارے نہیں یار... ایسی کوئی بات نہیں ہے۔"

سوہا نے تقدیس کی بات پہ قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

...سے ہے... لیکن..."

...چاہیے تم مجھے بیک ورڈ سمجھو یا کنزرویٹو مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ لڑکا اور لڑکی کبھی بھی ...دوست نہیں ہو سکتے۔"

...صرف" پہ خاصا زور دیا تھا۔

...ہوں؟" خلافِ عادت وہ تائید میں سر ہلانے لگی۔

...ہے اس بات کا کیونکہ وصی سے پہلے بھی میری کئی لڑکوں سے دوستی رہی لیکن اس دوستی سے میرے ...کی وجہ یہی تھی کہ وہ اس دوستی کو سیریس نہیں کرتے تھے... انہیں واقعی "صرف" دوستی نہیں چاہیے ...سب سے الگ ہے... اس کے ساتھ ہوتے ہوئے مجھے کبھی یہ احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ لڑکا ...لڑکی ہوں... ان فیکٹ اتنا زیادہ کمفرٹ ایبل تو میں تمہارے ساتھ بھی محسوس نہیں کرتی۔"

...نے کی خاطر مسکرا کے بولی۔

...ہو تو مان لیتی ہوں... ورنہ مجھے دال میں کچھ کالا کالا لگ رہا تھا۔"

...ان ایا... وصی بہت نائس بندہ ہے... اور مجھے بہت پسند بھی ہے لیکن... وہ میرے ٹائپ کا نہیں ...مطلب دوستی کے لیے انسان کے اسٹینڈرڈز اور ہوتے ہیں لیکن رومانس کے لیے اور وصی میرا رائٹ ...

"...بھی کوئی آئیڈیل ہے؟"

...دلچسپی سے پوچھا۔

...یار میں نارمل ہوں..."

...بھی ہوں لیکن میرا کوئی آئیڈیل نہیں ہے۔"

...نے شانے اچکائے۔

...یار... امپاسبل..."

...کیوں؟"

...لائف پارٹنر کے لیے تم نے کوئی خاکہ تو کھینچ رکھا ہو گا ذہن میں... یا مدر ٹریسا بننے کا ارادہ ہے؟"

...وہ سوچنے لگی۔

...میں ارینج میرج پہ یقین کرتی ہوں۔"

...مگر ارینج میرج ہی سہی... کچھ تو سوچا ہو گا کہ کاش میرے پیرنٹس میرے لیے ایسا لائف پارٹنر ...

...ایسا سوچنے کا... جب پیرنٹس کے ہاتھ میں اختیار دے ہی دیا تو الٹی سیدھی توقعات باندھنے سے کیا ...زندگی میں آنے والا تصورات کے بالکل برعکس نکلا تو سوائے مایوسی کے اور کیا ہاتھ آئے گا... اس لیے ...بہتر ہے۔"

...اس سوچ سے ہی گھٹن ہوتی ہے۔"

...نے آنکھیں پھیرا اور وہ جھرجھری لے کر کہنے لگی۔

...ارینج میرج کے خیال سے؟ یعنی تم لو میرج پہ یقین کرتی ہو؟"

...اس بات پہ یقین رکھتی ہوں کہ انسان کو اپنی پسند اور معیار پہ کبھی کمپرومائز نہیں کرنا چاہیے ...والے سیریل سے لے کر سر پہ لگانے والے کلپ اور پیر میں پہننے والی چپل تک اور یہ تو پھر لائف ...ضروری نہیں کہ میں لو میرج ہی کروں... میں تو ایک Possibility کی بات کر رہی ...ساری عمر کسی کے لیے دل میں ایسا کوئی جذبہ نہ جاگا تو کنواری تو مرنے والی نہیں میں۔"

...گی۔

"لیکن ارینج میرج میں بھی میں کم از کم اپنی پسند اور معیار تو سامنے رکھ ہی سکتی ہوں۔ عمر کتنی ہو
ارینج میرج کے لیے پیرنٹس کے سامنے سرنڈر کرنا ضروری ہے۔ تم انہیں یہ بتاؤ کہ تمہیں اپنے لائف پارٹنر
کیا یکھنا پسند ہے۔ اس میں کیا خوبیاں ہونی چاہئیں۔ دیکھنے میں کیسا لگتا ہو، کس پروفیشن سے ہونا چاہئے
وغیرہ بس۔ پھر وہ ایسا ہی بندہ ڈھونڈ کے لائیں اور یہ ہو گئی ارینج میرج۔"
تقدیس سن کر ہنسنے لگی۔
"ہماری فیملی میں ایسے نہیں ہوتا۔ ارینج میرج کا ہمارے ہاں دو طرح کا تصور ہے۔ ایک تو یہ کہ بچپنے میں
نسبت طے کر دی جاتی ہے، جس سے انحراف کی صورت میں خاندانوں میں صدیوں تک جاری رہنے والا بیر
پیدا ہو جاتا ہے اور دوسرے طریقے میں لڑکی بی۔اے کے پیپرز دے کر جیسے ہی گھر لوٹتی ہے تو اسے بتا دیا جاتا ہے
وہ اپنی ماں، چچی، خالہ وغیرہ کے ساتھ جا کے شادی کا لہنگا پسند کر آئے کیونکہ فلاں تاریخ کو اس کی شادی ہے۔"
"مائی گاڈ۔ یعنی لڑکیوں کی پسند کو ذرا بھی اہمیت نہیں دی جاتی؟"
"بالکل دی جاتی ہے۔ زیورات پسند کراتے وقت دی جاتی ہے کہ ملتانی سیٹ لینا ہے یا گلوبند۔ کنگن نمبر
لینے ہیں یا جڑاؤ۔ جہیز کا دوسرا سامان خریدتے وقت بھی پسند ناپسند پوچھی جاتی ہے۔"
وہ مزے لے لے کر بتا رہی تھی اور سوہا حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس بات سے بے خبر کہ اس کا ننھیال
اور ددھیال بھی ماضی قریب میں ایسی ہی روایات رکھتا تھا۔ اگرچہ مظہر اور منزہ کی شادی کو لو میرج ہی کہا جاتا
لیکن زیادہ تر بھی لوگ جانتے تھے کہ یہ پسندیدگی یک طرفہ تھی۔ کم از کم اظہار کے معاملے میں تو مظہر ہی آگے تھے
منزہ بے شک دل میں اسے پسند کرتی تھی لیکن اگر اس کے ہاں سے آیا رشتہ اس کے بھائی بھائی مسترد کر دیتے تو
چپ چاپ کسی اور سے۔ یعنی ان کی پسند کے کسی بھی انجان بندے سے شادی کر لیتی۔ احتجاج تو بہت دور کی بات
تب وہ شاید کبھی دل کی بات زبان پہ بھی نہ لاتی۔ یہ تو قسمت کی بات کہ اس کی اور مظہر کی چپ چاپ منگنی ہو گئی
بات ہوئی اور مظہر کی وارفتگیوں اور دیوانہ وار محبتوں نے یہ چرچا کر دیا کہ دونوں کی محبت کی شادی ہے۔
اور ددھیال تو عورتوں کے معاملے میں اور بھی دقیانوسی روایات کا حامل رہا ہے، جہاں انہیں تعلیم جیسے بنیادی
حق سے بھی محروم رکھا جاتا تھا تو شادی میں اختیار دینا تو دور کی بات تھی۔
وہ یہ سب نہیں جانتی تھی۔ اسے تو آج کا پتہ تھا۔
اپنے آج کا.....
جو رتنا کے سائے تلے بیت رہا تھا۔
اور اس کا اٹھنا بیٹھنا جن لوگوں میں تھا وہ سب اپر کلاس سے تو تھے مگر تھے نو دولتیے اور نئی نئی دولت جب آتی
ہے تو انسان سب سے پہلے اپنے اصل سے چھٹکارا حاصل کرتا ہے۔ اپنی خاندانی روایات کا چولا اتار کر
کوشش کرتا ہے نئی پوشاک پہننے کے لیے۔ ان میں سے کوئی بھی خاندانی لوگ نہیں تھے۔ اس لیے ہر کوئی
سے آزاد خیالی کے نام پہ ٹریپ ہو کر مغرب زدہ زندگی گزار رہے تھے۔ چاہے وہ شیبا کی فیملی ہو۔ چاہے
چاہے رتنا کی کسی دوست کی۔ چاہے اصغر کے کسی یار کی۔ سب مادر پدر آزادی کے شکار تھے
اور ایلیٹ کلاس کا نمائندہ سمجھ رہے تھے۔ سوہا کا خیال تھا شاید ایسی باتیں صرف مڈل اور لوئر کلاس
ہو کر رہ گئی ہیں۔ ایسے میں اسے تقدیس جیسی لڑکی کے خیالات اور فیملی کی روایات جان کے حیرت ہوئی
باوردی شوفر کے ساتھ نویوٹا ہائی لکس پہ آتی تھی لیکن سر اسکارف میں لپٹا ہوتا تھا۔ جس کے بیوٹی
امپورٹڈ شوز اور کاندھے پہ زیرا نئو بیگ ہوتا مگر یونیفارم سادہ تراش کا اور پوری آستینوں والا بغیر
اور ایک مشہور صنعتی اور سیاسی پس منظر رکھنے کے باوجود اس کی باتوں سے کبھی اس کا اظہار نہیں ہوتا
وہ چار لوگوں میں بیٹھ کے اپنے اس ماموں کا ذکر کرتی جو لاہور کی معروف سماجی شخصیت تھے نہ اپنے اس

میں ہیں پارٹی جو موجودہ — حکومت میں نوجوان قیادت کے طور پہ نمایاں تھا۔ نہ اپنے اس نانا دادا کے
کے کارنامے بیان کیے ملک کی صنعتی ترقی میں جن کا بڑا ہاتھ تھا اور جو یہاں کی اولین فیکٹریوں کے مالک
تھے۔ اس کی طبیعت کی یہی سادگی اور انکسار آمیز وقار سوہا کو متاثر کرتا تھا۔
"تم کر لوگی ایسی شادی؟"
اس نے بے حد حیرت سے پوچھا۔
"شاید۔" تقدیس کی آواز اور لہجہ دونوں دھیمے پڑے۔
"اگر تمہیں کسی سے محبت ہو گئی تو؟"
وہ سٹپٹائی۔ تقدیس بے حد گھبرائی۔
"ہاں۔ اگر ہو گئی تو؟"
"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔"
"فرض کرو یار۔ ہونے کو تو کچھ بھی ہو سکتا ہے اور میں کون سا محبت کر لینے پہ زور دے رہی ہوں لیکن ذرا سوچو
کسی اور سے محبت کر لی ہو تمہارے پیرنٹس تمہاری بات کہیں اور طے کر رہے ہیں۔ تم کیا کرو گی؟"
"تمہارا سر پھاڑ دوں گی۔"
تقدیس نے جھلا کے اس کے سر پہ فائل ہلکے سے دے ماری۔
"جس کے امکانات صفر ہیں اس کے بارے میں فرض بھی کیوں کروں۔ تم میرا دماغ مت خراب کرو۔ بات
کہاں سے چلی تھی اور تم نے کہاں پہنچا دی۔ میں وصی کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔"
"وہ بھی تمہارے بارے میں پوچھ رہا تھا۔"
سوہا کے کہنے پہ وہ چونکی اور اس کی پیشانی ناگوار شکنوں سے بھر گئی۔
"میرے بارے میں؟ اس کا مجھ سے کیا تعلق؟"
"مجھ سے تو ہے۔" سوہا نے کہا اور فوراً ہی اس میں اضافہ بھی کیا۔
"تمہارا تعلق۔ اور وہ اسی حوالے سے کہہ رہا تھا کہ تمہاری نئی دوست نے تمہارے اندر کافی تبدیلیاں پیدا کی
ہیں۔ مثبت تبدیلیاں۔"
"مثلاً؟"
"مثلاً یہ میں اسموکنگ سے پرہیز کرنے لگی ہوں اس لیے نہیں کہ تم کوئی ملانی ہی ہر وقت مجھے نصیحتیں کرتی
ہو بلکہ اس لیے کہ میں خود ہی بور ہو گئی تھی۔ مگر یہ بات اسے کون سمجھائے۔ وہ اس کا سارا کریڈٹ تمہیں
دیتا ہے۔ یہ بھی کہتا ہے کہ اب میں لڑکی لڑکی نظر آنے لگی ہوں۔ بول چال کے لحاظ سے بھی اور اٹھنے بیٹھنے پہننے
اوڑھنے کے لحاظ سے بھی۔ ہاں اس کا تھوڑا بہت کریڈٹ تمہیں دیا جا سکتا ہے کیونکہ میں نہیں چاہتی تھی کہ ہم
ساتھ ہوں تو ہم میں سے کوئی ایک عجوبہ لگے۔ بالکل ہی زمین آسمان کا فرق تو نہیں ہونا چاہیے دوستوں
میں۔"
"بہت نوٹس لیتا ہے وہ تمہارا۔"
تقدیس نے نئے رخ سے معاملہ کھنگالا۔
"ہاں میں کالا مجھے اب بھی نظر آ رہا ہے مگر اس کی دال میں۔"
"وہ ایک نمبر کا... ایکچوئلی وصی بالکل سیلفی ٹائپ بندہ ہے یار۔"
"سیلفی ٹائپ۔ اور بندہ؟" وہ ہنسنے لگی۔
"اچھا بہت ہو گیا وصی نامہ۔ چلو کوئی کلاس ہی لے آئیں۔"
"آج تو آخر میں صرف دو کلاسز ہیں... وہ میں نے نہیں لینی... باقی فری ہیں... تم لے آؤ۔"

"مجھے ایسا خاص شوق نہیں ہے پیشیاں بھٹکنے کا، چلو گھر چلتے ہیں۔"
"سمیرا! ذرا نیور تو پہنچنا تم یہی آئے گا۔"
"تمہارے نہیں۔ میرے گھر۔ آؤ تمہیں اپنی ماما سے ملواتی ہوں۔"
"یعنی تمہاری آنٹی؟"
"نہیں۔ وہ میری ماما ہیں۔ اگر وہ ماما نہیں ہو سکتیں تو دنیا کی کوئی عورت بھی ماں نہیں ہو سکتی۔"

☼ ☼ ☼

"بھولنا کیسا۔ کوئی اپنی بیٹی کو بھول سکتا ہے بھلا۔"
پروین نے وشمہ کے گلے کے جواب میں بڑے ولار سے کہا۔ وہ اس وقت وہاں جانے کے لیے بالکل تیار [illegible] سے فون پہ بات کر رہی تھیں۔ فون کرنے کا مشورہ وصی کا تھا۔ کہ پتہ نہ ہو کہ ہم وہاں جائیں اور وہ لوگ [illegible] ملیں۔
"بس۔ مصروفیت اتنی رہتی ہے کہ۔ بچے چھوٹے تھے تو ان کے اسکول وغیرہ کی وجہ سے نکلنا مشکل [illegible] سوچتی تھی کہ بڑے ہو جائیں گے تو ذمہ داریاں کم ہوں گی۔ جی بھر کے ملنے ملانے کے آنے جانے کے پروگرام [illegible] کروں گی مگر اب اور بھی پھنس گئی ہوں۔ لیکن گھر داری میں گھر کے بھی کوئی اپنوں کو نہیں بھولتا۔ تم تو پھر [illegible] یاد آتی ہو۔ آخر اکلوتی بھتیجی ہو۔"
وصی جو ان کے کہنے پہ دوست کے ساتھ جانے کا پروگرام کینسل کیے تیار کھڑا تھا' اتنی لمبی تمہید پہ [illegible] رہا تھا۔
"تنانو کے ساتھ دن رات کی محبت اثر دکھا رہی ہے۔ آپ یہ ممانی جان۔ پلیز!"
وہ وصی پہ ایک تیز نظر ڈال کے بادل نخواستہ اصل بات کی جانب آئیں۔
"سچ کہہ رہی ہوں۔ میں تو آنے کے لیے تیار بیٹھی ہوں سوچا نکلنے سے پہلے تمہیں فون کر لوں [illegible]"
"ہاں ہاں۔ تمہیں بھی زیادہ دیر رکنے کا وعدہ نہیں کر سکتی۔ کھانے پہ؟۔ اچھا دیکھتی ہوں۔"
وہ امید بھری نظروں سے وصی کو دیکھنے لگیں اور وصی دانستہ نظریں چراتا بال سنوارنے لگا۔
"وشمہ۔ بچے۔ میرا کیا ہے' رات تک رک جاؤں مگر وصی کو کہیں جانا تھا۔ شاید کسی دوست کی شادی ہے وہ اتنی دیر نہیں رک سکتا۔"
"ہاں وہی لے کر آ رہا ہے۔"
"میں تو لا رہا ہوں مگر کوئی جانے پہ تیار بھی تو ہو۔"
وصی چڑ کے چابی ہلاتے ہوئے اٹھا۔
"[illegible] ہوئی جو آپ کو فون کرنے کا مشورہ دے دیا۔ میں گاڑی میں ہوں۔ جلدی آئیں پلیز۔"
وہ جھلی دیتا نکل گیا۔
[illegible] سے نکلتے ہی وہ ظل ہما سے ٹکرا گیا جو تیزی سے سیڑھیاں اترتی نیچے آ رہی تھی۔ اس کا سر [illegible] ٹھوڑی سے بری طرح ٹکرایا تھا۔
"ظل الٰہی۔ رحم۔" وہ ٹھوڑی پہ ہاتھ رکھ کے ہائے لگا۔
ہما شرمندہ سی ہو گئی۔ اور خجالت کو خواہ مخواہ کی خفگی سے مٹانے کی کوشش کرنے لگی۔
"تو دیکھ کے نہیں چل سکتے؟"
"تمہیں ڈاکٹر نے منع کیا ہے دیکھنے سے؟"
وہ اس کا پہلے سے خراب ہو رہا تھا۔

"[illegible] تیار ہوئے۔ کہاں جا رہے ہو؟"
[illegible] ایک پسندیدگی سے بھرپور نظر اس کی تیاری پہ ڈالی۔ رااسلک کا لیش گرے کرتا۔ لشکے کی کھڑ کھڑاتی [illegible] رنگ کے بھاری شیو۔ جیل سے جمائے بال۔ اور تیز پرفیوم کے بے تحاشا لپٹے۔
"[illegible] کو لے کر جا رہا ہوں ان کے میکے۔"
"[illegible] کے ساتھ؟"
[illegible] ہوئی اور حیران بھی۔
"[illegible] کیا تکلیف ہے' میرا دل چاہے گا تو اچکن پہن کے جاؤں گا۔"
[illegible] رہا تھا۔ شاید اس لیے کہ ممانی کو انکار نہیں کر سکا تھا اور دوست بھی بڑا قریبی تھا جس کی آج مہندی [illegible] تھی۔ حالانکہ ممانی نے کون سا رات بھر رکنا تھا' ایک ڈیڑھ گھنٹے کی بات تھی' اسے بعد میں جانا ہی [illegible] کے فنکشنز تو رات گئے تک چلتے ہیں لیکن اسے اس متوقع بوریت کا سوچ سوچ کے کوفت ہو رہی [illegible] وہاں ایک گھنٹے تک جھیلنا تھی۔
"[illegible] تم سہرا باندھ کے چلے جاؤ۔"
[illegible] آ کے ہما نے کہہ تو دیا مگر دل لمحہ بھر کے لیے سکڑ کے رہ گیا۔
[illegible] رعنائیوں سے بھرپور سراپا تصور میں آیا۔ اور وہ اپنی حماقت کو کوسنے لگی۔
"[illegible] بیچ پہ کلہاڑی مارنا۔ اس کا چاہے اس جانب کبھی دھیان نہ گیا ہو مگر میں نے سہرا باندھ [illegible] کا مشورہ دے کر ڈالا دیا۔"
[illegible] پچھتانے لگی۔
[illegible] حسن تھکا ہارا۔ اندر داخل ہوا۔
"[illegible]؟" اس نے ٹھٹھک کر دونوں کو دیکھا۔
[illegible] گھما تھے پہ تیوریاں لیے کھڑا تھا۔
[illegible] ایک پیر آخری سیڑھی پہ۔ دوسرا نیچے ٹکائے انگلیاں مروڑ رہی تھی۔ چہرہ خفت سے سرخ ہو رہا تھا۔
"[illegible] پھڈا؟"
"[illegible] سے پوچھیں۔" وصی نے ظل ہما کی جانب اشارہ کیا۔
"[illegible] سہرا باندھنے کے ارمان ظاہر کیے جا رہے ہیں۔"
"[illegible]" وہ بدک اٹھی۔
"[illegible] کس بات پہ جلا بیٹھا ہے' سارا غصہ مجھ پہ نکال رہا ہے۔"
[illegible] بھائی۔ آپ ہی انصاف سے کام لیں۔ اسد کی مہندی ہے آج۔ سارے دوستوں نے تقاضا کیا کرنا [illegible] ہیں کر بیٹھے بٹھائے انہیں بھتیجی کی یاد ستا رہی ہے۔"
"[illegible] کے آس پاس کھسنیاں بجیں۔"
[illegible] محترم۔ چلو۔ میں لے جاتا ہوں مگر صرف نکلتے نکلتے ہی انہوں نے سات بجا دیے ہیں وہاں [illegible] بجا کے ہی کیا کرو۔"
"[illegible] میں لے جا رہا ہوں امی کو۔"
"[illegible] حسن بھائی۔ میرا مطلب یہ نہیں تھا۔" وہ سنبھلا۔
[illegible] دیر سے آئے ہیں گھر۔ تھکے ہوں گے۔ میں تو صرف یہ کہہ رہا تھا کہ پلیز انہیں جلدی بھیجیں۔
[illegible] کے ساتھ کہ وہاں جا کے جم نہ جائیں۔"
[illegible] کہا۔ تم جاؤ۔ میں لے جاتا ہوں۔"

"تو پرابلم وصی۔۔۔ میں شاور لے کر چینج کرتا ہوں۔۔۔ اتنے میں امی وادی کے ساتھ مذاکرات سے فارغ ہو جائیں گی۔"

"ابھی خاصا ٹائم ہے میرے پاس۔۔۔"

وہ کھل کے۔۔۔ مسکرایا تو وصی کو اطمینان ہوا۔

"آر یو شیور۔۔۔؟"

"ہنڈریڈ پرسینٹ۔"

وصی گنگناتا ہوا باہر نکل گیا۔۔۔ ہما پہ ایک نگاہ غلط بھی ڈالے بغیر۔

ہما نے بھاری ہوتے دل کے ساتھ نگاہیں باہر نکلتے وصی سے ہٹائیں اور حسن سے پوچھنے لگی۔

"کھانا کھائیں گے حسن بھائی؟"

وہ نیچے آئی تھی تو پروین سے کہے بغیر کتنے ہی کام اپنائیت سے اپنے ذمے لے لیتی تھی۔

"نہیں۔۔۔ لیٹ ہو جاؤں گا۔۔۔ تم چائے بناؤ۔۔۔ ساتھ میں کچھ لائٹ سا۔۔۔ میں امی کو بتا دوں کہ وصی کس نے بھیج دیا ہے۔"

وہ اندر گیا اور ہما نے ایک اطمینان بھرا سانس لے کر خود کو تسلی دلا دی۔

"ایسے ہی دل چھوٹا کر رہی تھی میں۔۔۔ وہ تو وہاں جانا ہی نہیں چاہتا۔ کجا کہ سرا باندھ کے۔"

اپنے اندیشوں پہ اسے خود ہی ہنسی آنے لگی۔

آج بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے پھوپھو کا؟"

منزہ نے بظاہر سرسری انداز میں لیکن در حقیقت خاصی تشویش سے پوچھا۔

"جی۔۔۔ نہیں تو ماما۔۔۔" وہ گھبرا اٹھی۔۔۔ جیسے چوری پکڑی گئی ہے حالانکہ نہ بھی کرتی۔۔۔ تو پھوپھو کے انتظار میں کون سی قابل اعتراض بات تھی۔

"کچھ بتایا انہوں نے کس لیے آرہی ہیں؟"

وہ بیکری سے منگوایا سامان پیکٹ کھول کے برتنوں میں نکالتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"مجھ سے ملنے۔"

"بس؟"

"جی۔"

"اچھا۔" منزہ کی "اچھا" میں بے یقینی سی تھی۔

اسی وقت گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ وشمہ بے تابی سے فرائی پان میں چمچہ پھینک کر کچن سے نکلنے لگی۔

"وشمہ۔۔۔ خان کھول دے گا گیٹ۔۔۔ کہاں جا رہی ہو؟"

منزہ کو یہ وارفتگی ذرا نہ بھائی۔

"یہ کباب جل رہے ہیں۔۔۔ انہیں نکالو۔ اندر ہی آنا ہے تمہاری پھوپھو نے مگر ذرا تمہارے پاپا کو فون کر دوں۔۔۔ پھر کہیں گے اطلاع نہیں دی بہن کے آنے کی۔"

وشمہ خاموشی سے کباب پلٹنے لگی مگر سماعتیں باہر کی جانب لگی تھیں۔۔۔ سینے میں اتھل پتھل ہو رہی تھی۔ پھر پھوپھو کی آواز آئی۔۔۔ اور اس کے ہاتھ کپکپاتے ہوئے پھرتیاں دکھانے لگے۔ ایک جانب سے کباب سرخ بھی نہ ہوئے تھے کہ اس نے پلیٹ میں نکال لیے۔ اور جلدی سے باہر نکلی۔ منزہ شاید ابھی فون ہی کر رہی تھی۔

"پھوپھو۔۔۔"

وہ والہانہ انداز میں ان کی جانب لپکی۔ اور ان کے گلے لگتے ہوئے اطلاع راستے پہ نظریں دوڑانے لگی۔

آگئی ہیں؟۔۔۔ کب سے انتظار کر رہی تھی۔"

پھوپھو نے اس کا ماتھا چوما اور اسی وقت وشمہ کی مسلسل سامنے بھٹکتی نظروں نے حسن کو اندر آتے دیکھا۔ اس کا ہمک ہمک کر بے چین ہوتا دل جیسے برف کی سل تلے دب گیا۔

"تھی مگر حسن کو تیار ہونے میں کچھ وقت لگ گیا۔ ابھی آیا تھا کام پر سے۔"

"اور وہ۔۔۔" وہ وصی کا نام لیتے لیتے رک گئی۔

"اور بھائی کہاں ہیں۔۔۔؟"

وشمہ کو دیکھتے ہی وہیں ساکت ہو گیا تھا، ماں کی پکار پہ سنبھل کر نظروں کا رخ بدلتا آگے بڑھا۔

گلے لگی کھڑی تھی، بے دلی سے الگ ہوئی۔

"ون کرنے گئی ہیں۔ آرہی ہیں۔"

اس کی آواز بھی پژمردہ تھی۔

نظروں سے ایک بار پھر اسے دیکھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دل میں اترتی محسوس ہوئی۔ اور پہلی بار رکھنا مشکل لگنے لگا۔۔۔ دل چاہا۔۔۔ دل میں قدم بہ قدم اترتی اس من موہنی ہستی کو وہ گھر میں اتار

بھائی کو دیکھ کے آئی ہوں۔"

جہیز کے بعد جب سے منزہ نے بڑے ہی نامحسوس طریقے سے نوید مراد پہ۔۔۔ اور اس گھر پہ تمام حاصل کر لیے تھے۔ پروین اس سے خاصا دب کے رہتی تھیں اس ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ کسی نہ انہیں بھائی سے اور اس گھر سے دور نہ کر دے۔۔۔ شروع سے ہی منزہ سے کوئی ذاتی پرخاش نہ چھوٹے گلے پیدا بھی ہوئے تو انہوں نے روایتی نندوں کی طرح طعنے تشنے دے کر اسے جتایا نہیں کے باوجود اسے ایک بے ضرر سی عورت سمجھتی رہیں۔ اب صورت حال مختلف تھی۔ اب وہ منزہ سے تھیں۔ انہیں ہر وقت یہ ڈر رہتا تھا کہ وہ کبھی بھی کوئی بھی ایسا قدم اٹھا سکتی ہے جس سے وہ اپنے سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دور ہو سکتی ہیں۔

وہ اسی کی خوشنودی کے لیے مہمان ہونے کے باوجود خود اٹھ کر اندر اس سے ملنے جا رہی تھیں۔

ہی دل میں جھنجلاتی پیر کے ناخن سے کارپٹ کرید رہی تھی۔۔۔ اسے رہ رہ کے وصی کے نہ آنے اور مصیبت تو یہ تھی کہ وہ اس کے نہ آنے کا سبب بھی کسی سے نہیں پوچھ سکتی تھی۔۔۔ وصی اس کا لگتا تھا۔۔۔ اس لیے اس سے کبھی دوستانہ بے تکلفی نہ پیدا ہو سکی، ورنہ اسی سے پوچھ لیتی۔۔۔ اسے تو یہ تھی کہ وہ بھی صرف اسی سے ملنے۔ اسی کو دیکھنے کی خاطر یہاں آرہا ہے۔

جا رہی ہو آج کل؟"

نے خاموشی کو توڑنے میں پہل کی۔

انتظار۔۔۔"

مختصر جواب دیا۔

ایک بات کہنا تھی تم سے۔"

حسن نے اتنی ہمت کر لی۔ شاید یہ حوصلہ اس تنہائی نے دیا تھا جو قسمت سے آج میسر ہوئی

خود کو حاضر ظاہر کرنا چاہا۔

تو آئی تھی مگر الفاظ کھو چکے تھے

"امی! آج کل میری شادی کے بارے میں سوچ رہی ہیں۔" اچانک ایک سرا ہاتھ آہی گیا۔ وہ پچھلی بار بھی
پروین نے واقعی آج راستے میں دو تین بار اشارتاً اسے ذہنی طور پہ شادی کے لیے تیار رہنے کی بات کی تھی۔
پہلے بھی کبھی کبھار وہ اس کی دلہن لانے اور اپنی ذمہ داریاں اسے سونپنے جیسے ارمان ظاہر کرتی رہتی تھیں۔
حسن نے اپنی مسکراہٹ کے ذریعے اس خیال پہ اپنی آمادگی ظاہر کرکے گویا پروین کو گرین سگنل دے دیا تھا۔
سوچ رہا تھا ابھی اچھا موقع ہے بات کرنے کا... وشمہ سے بھی اور ماں سے بھی۔

"یہ تو اچھی بات ہے۔"

وہ رواداری سے مسکرائی۔

"ہماری فیملی کی... میرا مطلب ہے اس جنریشن کی پہلی شادی ہوگی یہ..."

"تم... میرا مطلب ہے... تمہارا کیا خیال ہے؟"

"بتا تو رہی ہوں۔" وہ کچھ حیران ہوئی۔ "بس یہ دھیان رکھیے گا کہ کر مہاں نہ ہو، ورنہ مزا نہیں آتا۔"

وہ اس کی معصومیت پہ ہنس دیا۔ یا شاید اپنے اناڑی پن پہ...

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

اس کے الفاظ اب بھی بے حد سادہ اور مبہم تھے اس کے باوجود وشمہ کھٹک گئی۔ اس کے پیچھے مفہوم کو بھانپ
گئی اور بھانپ جانے کے باوجود جھٹلانے لگی۔

"آپ... میں... یعنی... کیا خیال ہو سکتا ہے۔ آپ؟" وہ بری طرح نروس ہوگئی۔

"اگر امی نے مجھ سے میری پسند پوچھی تو کیا میں تمہارا نام لے لوں؟"

"جی...؟" وہ آنکھوں میں وحشت بھر کے اسے دیکھنے لگی۔

"بہت مشکل سوال تو نہیں کیا میں نے؟"

حسن مبہم سا مسکرایا۔ دل ہی دل میں اس کے رد عمل کی وجہ سے متردد بھی تھا۔ جو بات اس نے ہمت کر کے
کہہ ڈالی تھی... وہ بہت انوکھی بہت ناقابل یقین نہ سہی... بہرحال بہت بڑی بات ضرور تھی۔

حسن کے لیے بھی۔

اور وشمہ کے لیے بھی۔

وہ جانتا تھا کہ وشمہ جیسی چھوٹی موٹی سی لڑکی اس سے یہ سن کر حیرت زدہ بھی ہوگی... گھبرا بھی جائے گی۔ اس
کے رنگ بھی کھل جائیں گے اس کے چہرے پہ... وہ سارے ممکنہ رد عمل جانتا تھا مگر یہ وحشت... یہ بے یقینی اس
کی عقل و فہم سے ماورا تھی۔

"صرف اتنا ہی تو پوچھا ہے کہ امی مجھ سے شادی کے لیے میری پسند پوچھ رہی ہیں۔ تمہارا نام رکھ دوں ان کے
سامنے؟"

"میرا؟" اس کے چہرے پہ ہوائیاں اڑنے لگیں۔ "میرا کیوں؟"

حسن بے ساختہ ہنس پڑا۔

"یعنی تفصیل بھی بتانی پڑے گی۔ مکمل حال دل سننا ہے؟" وہ قدرے شوخ ہوا۔

ادھر وشمہ کی سراسیمگی بڑھی...

"نہیں... میں ماما کو..." گھبرا کے وہ اٹھی اور کمرے سے باہر جانے کو لپکی۔

"وشمہ... سنو... رکو تو..." مگر وہ جا چکی تھی۔ حسن وہیں اوجھڑپن میں کھڑا رہا۔

"پتا نہیں میں نے ٹھیک کیا یا غلط..."

○ ○ ○

"آج رات میں تمہارے ابا سے ایک اہم بات کرنے والی ہوں۔" واپسی پہ پروین نے بڑے سرشار سے لہجے
میں بتایا۔

"خیر... لگتا ہے ان کی جیب پہ خاصا بار پڑنے والا ہے۔"

"بس باپ کی جیب سے ہمدردی جتاتے رہنا۔ ماں سے تو کوئی ہمدردی ہے ہی نہیں۔"

"یہ بات ذرا سن لیں نا تو آپ کو گھنٹہ بھر کا لیکچر تو ضرور دیں گی کہ ہمدردی اور تین تین جوان کنواری بیٹیوں کی...

"ارے امی! آپ پہ تو رشک کرنا چاہیے۔"

گو کہ اگرچہ اب بھی وشمہ نے عجیب و غریب طرز عمل کی وجہ سے الجھا ہوا تھا مگر وہ دانستہ اس ہلکی پھلکی چھیڑ
چھاڑ کے ذریعے اپنا دھیان بٹا رہا تھا۔

"تین تین بیٹیوں کی بہاں سے ہی تو ہمدردی کی جاتی ہے... بھئی بیٹے اگر آپ کے کاہل ہوں تو..."

"دیکھیے کون سی کاہلی ملاحظہ فرمائی آپ نے میری یا وصی کی۔ سنان کا نام نہیں لے رہا میں۔ وہ تو کاہلی کا چیمپئن
ہے۔"

"تو کون سا تم ہو؟ تمہاری عمر میں تمہارے ابا دو بچوں کے باپ تھے اور تم ابھی تک شادی شدہ تو کیا منگنی شدہ
بھی نہیں ہو۔"

"اس میں قصور میرا نہیں آپ کی کاہلی کا ہے۔" وہ مزے سے کہنے لگا۔ "میں خود بخود تو نکاح پڑھا کے کسی کو
لانے سے رہا۔ آپ ہی اپنے فرض سے چشم پوشی کر رہی ہیں اتنے عرصے سے۔"

"اب... بہت اچھے بیٹا۔"

اندر ہی اندر پروین کے دل میں لڈو پھوٹنے لگے کہ صاحبزادے سہرا باندھنے کے لیے تیار ہیں مگر اوپر سے ڈانٹنے
لگیں۔

"سارا الزام ماں کے سر۔ ٹھیک ہے اب میں خود اس الزام کو دھو دوں گی۔ پھر مجھے نہ کہنا بچو..."

"کیا نہ کہوں؟"

"یہی کہ پوچھا کیوں نہیں...؟"

"اچھا یہ تو بہت پوچھنا تو چاہیے۔"

"تم کو تو غیر و تک تو کسی میں دلچسپی نہیں لیتے تھے اسی لیے تو میں جانتی ہوں" آخر ماں ہوں۔"

"تو کالج سے نکلنے کے بعد کیا مجھ پہ کسی میں دلچسپی لینے پہ پابندی عائد ہوگئی ہے۔ یا دلچسپی صرف کالج میں ساتھ
پڑھنے والیوں میں لی جاسکتی ہے۔"

"نہیں... لیکن تم..." پروین ٹھٹکیں۔

اور حسن ماں کی پریشان صورت دیکھ کر ہنس پڑا۔

"مذاق کر رہا ہوں امی..."

"شکر ہے... تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی۔ دراصل حسن! اب میں سنجیدگی سے کچھ کہنے جا رہی
ہوں سنجیدگی سے سننا۔"

"جی..." وہ بھی کچھ حد درجہ سنجیدہ ہوگیا۔

"ہمارا ارادہ خون کے رشتوں کو مزید مضبوطی سے باندھنے کا ہے۔ میں تمہارے ابو سے آج یہی بات کرنے والی
ہوں۔ سوچا پہلے تم سے عندیہ لے لوں۔ تمہیں کوئی اعتراض تو نہیں؟"

"کیا مطلب... آپ کا مطلب ہے کہ..."

اس کے دل خوش فہم نے اپنی ہی غرض کے مطلب تراشنے شروع کردیے۔

"بیٹا! اگر اپنی ہی بچیوں سے ہم لوگ غافل رہیں گے تو پرایوں سے کیا گلہ۔"

"جی۔۔۔ آپ نے ٹھیک سوچا ہے۔"

دل کی خوشی کو دل کے اندر ہی چھپاتے ہوئے اس نے بظاہر بردباری سے جواب دیا تھا۔

● ● ● ●

بڑا سا آہنی گیٹ۔۔۔

اس پہ طلوع ہوتے سورج کا منظر پیش کرتا سنہری کنگرہ۔

بڑا سا ڈرائیووے۔۔۔ جس میں کھڑی دو قیمتی کاروں کے نئے ماڈل۔

گیٹ پہ بیٹھا باوردی اور مسلح سیکورٹی گارڈ۔۔۔

اندر ایک بڑے رقبے پہ پھیلا لان۔۔۔ جس میں لگے سنگی مجسمے، آبشاریں، فوارے، سنگی چبوترے، قسم قسم کے ملکی اور غیر ملکی پھول، حوض، اس پہ تیرتے آبی پرندے۔

فلش گرین گھاس پہ پر پھیلائے پھرتے دو رنگین اور ایک سفید مور۔

سفید اور نیلے رنگ کی بنی تین منزلہ عمارت۔ جس کے رہائشی افراد کی تعداد صرف تین۔۔۔ مگر رہائشی کمروں کی تعداد تیرہ تھی۔۔۔

سب کے سب ہر سہولت، آسائش اور آرائش سے مزین۔

وسیع و عریض ڈرائنگ روم بیش قیمت فرنیچر اور نایاب پینٹنگز سے آراستہ۔

لاؤنج بے حد آرام دہ اور جدید انٹیریئر کا حامل۔۔۔

اور خود سوہا کا بیڈ روم۔۔۔ ایک ایک چیز دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور تقدیس وہی کر رہی تھی۔

یعنی دیکھتی جاتی تھی اور سراہتی جاتی تھی۔

دولت کی اس کے ہاں بھی ریل پیل تھی۔ مگر ایسی صاف جھلکتی نہ تھی۔ جعفر محمود نے باپ دادا کا پیسہ ہوا بھی سنبھال کے رکھا تھا اور خود بھی جو کمایا تھا، سمجھداری سے خرچ کیا تھا۔ وہ بے حد نفیس ذوق کا مالک تھا۔ ایک عمر باہر گزارنے کے سبب نمود و نمائش سے دور تھا۔

اور مدیحہ اسے ایسے شوق ہی نہیں تھے۔ یا یوں کہیے کہ جو تھے، وہ ناقدری کے ڈر سے دبا کے رکھ دیے کیونکہ شروع شروع میں اس نے ایک عورت ہونے کے فطری ذوق و شوق کے تحت اپنا گھر اپنی جنت جیسے خواب بنتے ہوئے اس کو سجانے سنوارنے کی کوشش بھی کی مگر وہ جعفر کے معیار پہ پوری نہ اتری اور اس نے جس انداز میں اور جس تیور کے ساتھ اسے آئندہ ایسی زحمت نہ کرنے کی تنبیہہ کی تھی، اس کے بعد، مدیحہ جیسی ذرا سی ضدی عورت بھول کے بھی ایسی کوئی کوشش کب کر سکتی تھی۔

"تمہارا گھر بہت خوب صورت ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ بہت خوبصورتی سے سجایا گیا ہے۔ جیسے ایک ایک دیوار، ایک ایک ستون پہ محنت کی گئی ہو۔" اس نے دل کھول کر تعریف کی۔

"ایک ایک اینٹ کہو۔۔۔" سوہا نے خود کو واٹر بیڈ پہ گراتے ہوئے کہا۔

"ماما کا شوق ہے۔۔۔ ایک خود کو سنوارتے رہنے کا، دوسرا اس گھر کو۔"

اس نے اندر داخل ہوتی ملازمہ کو ہاتھ سے وہیں رکھنے کا اشارہ کیا۔

"تقدیس! تم لے لو خود جو پسند ہے بلکہ مجھے بھی دو یار!" وہ کسل مندی سے لیٹے لیٹے ٹانگیں جھلاتی کہہ رہی تھی۔

ملازمہ تین منزلہ ٹرالی اوپر سے نیچے لدی وہیں چھوڑ کے چلی گئی۔ دروازہ آہستگی سے بند ہوا۔ کمرے میں اے سی کی خنکی غنودگی پیدا کر دینے کی حد تک سکون بخش تھی۔

"یہ تم کیا لوگی؟" تقدیس نے ٹرالی اپنی جانب کھینچتے ہوئے جائزہ لیا۔ اوپر ہر طرح کے کولڈ ڈرنکس کے ٹن تھے۔ ملکی بھی اور غیر ملکی بھی۔ کولڈ ڈرنکس بھی۔۔۔ تین چار اقسام کے فروٹ جوسز بھی۔ فلیورڈ ملک۔۔۔ وائٹ ڈرنکس۔ انرجی ڈرنکس۔۔۔ نچلے خانے میں ڈرائی فروٹ، فریش فروٹ کاک ٹیل، فرائی اسنیکس۔ کباب اور پیسٹری تھے جبکہ سب سے نیچے آئس باکس اور گلاس وغیرہ تھے۔

"اتنا تکلف؟"

"تکلف کیسا یار۔۔۔ دراصل میرا سب کو پتا ہے کہ اس وقت کچھ منگواؤں اپنے کمرے میں تو رات کا کھانا گول۔۔۔ اس لیے ماما کی ہدایت ہوتی ہے انہیں ٹرالی بھر کے بھیجنے کی۔ ماما کو لگتا ہوگا جیسے اتنا سب کچھ دیکھ کر میں کچھ تو کھا ہی لیا کروں گی۔"

"بہت پیار کرتی ہیں تمہاری ماما تم سے۔"

وہ بھی جوس کے سپ لیتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"ہوں۔۔۔ بہت۔۔۔" سوہا نے فورک (کانٹا) کی مدد سے اسنیکس کا ایک ٹکڑا منہ میں ڈالتے ہوئے تائید کی۔

"تمہاری اصل ماما جتنا؟"

تقدیس کے سوال پہ یہ لقمہ اس کے حلق میں پھنس سا گیا۔ اس نے لیمن بارلے کا بڑا سا گھونٹ لیتے ہوئے اسے اندر اتارا اور پھر نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔۔۔ ان کے جتنا نہیں۔۔۔ ماما مجھے بہت پیار کرتی ہیں۔ بہت زیادہ۔۔۔ تم کسی کا مقابلہ نہیں کر سکتیں ان سے۔"

تقدیس اور بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی۔ مگر کچھ سوچ کے چپ ہو رہی۔

"تم شاید اپنی ماما سے ملوانے لائی تھیں مجھے۔" اس نے یاد دلایا۔

"ہاں۔۔۔ دیکھتی ہوں۔۔۔ اٹھیں کہ نہیں۔" اس نے دوبارہ خود کو پیچھے کی جانب دھپ سے گرایا اور بیڈ کے سرہانے لگے انٹر کام پہ بات کرنے لگی۔

"کیا ہے ماما یار۔۔۔ میری فرینڈ اسپیشلی آپ کے لیے آئی ہے اور آپ کی تیاریاں ہی ختم نہیں ہو رہیں۔۔۔ اوکے ذرا فاسٹ پلیز منٹ۔"

تقدیس تعجب سے اس کی بے تکلفی ملاحظہ کر رہی تھی۔

"آرہی ہیں یار! تھوڑی دیر میں۔۔۔ ویسے اٹھی ہیں ابھی۔۔۔ اوپر سے تیار ہونے میں بھی کمال وقت لگاتی ہیں۔ چلو کچھ کھا لو تب تک۔"

وہ ہنستے ہنستے پلیٹ میں سے ٹونگ رہی تھی۔

"تیار ہو رہی ہیں؟ کیا جاگتے ہی پھر سے کہیں جانا ہے؟"

"نہیں یار!" وہ قہقہہ لگانے لگی۔

"یہ ان کی روٹین کی تیاری ہے۔ ریگولر۔"

"ریگولر؟" وہ مزید حیرت میں مبتلا ہوئی۔

اور یہ ساری حیرت تب دور ہو گئی جب ٹھیک پندرہ منٹ بعد سوہا اسے لے کر لاؤنج میں داخل ہوئی۔۔۔ جہاں نیلوفر کی ہلکے کاسنی رنگ کی نفیس قیمتی ساڑھی میں ملبوس رعنا ان دونوں کی منتظر تھی۔

پور پور سجی۔ پلک پلک سنوری۔
ایک بے حد متاثر کن ظاہری شخصیت کی مالک۔ تقدیس کے اندازے سے بہت کم عمر نظر آنے والی۔
"ماما! یہ تقدیس ہے۔ میری فرینڈ۔"
سوہا نے بہت فخریہ اس کا تعارف کرایا کیونکہ "عموماً" رینا اس کی دوستوں شیبا' سبیکا وغیرہ سے نالاں ہی رہتی تھی۔
"سو سویٹ۔" رینا نے بڑے اسٹائل سے اس کے گال سے لب مس کیے ایک مسحور کن خوشبو نے تقدیس کو اپنے حصار میں لے لیا۔
"سوہا بہت ذکر کرتی ہے تمہارا۔ اور ایسا بہت کم ہوا ہے ورنہ فرینڈز تو اس نے پہلے بھی کئی بنائی ہیں لیکن نہ تو ان کے نام کی مالا جپی ہے نہ ان سے اتنی متاثر رہی ہے اور نہ یوں بطور خاص مجھ سے ملوانے لائی ہے۔ تمہیں دیکھ کر لگ رہا ہے کہ تم میں ایسی خاص بات ہے ضرور۔ کہ تمہیں بطور خاص ملوایا جائے۔"
تقدیس محجوب سی ہو گئی۔ "یہ تو سوہا کی محبت ہے۔"
اس کے سوا اور کیا کہتی وہ۔ لیکن رینا یہ جواب سنتے ہی قہقہہ لگا کے ہنس پڑی۔
"محبت۔ اور سوہا۔" ایسے جیسے تقدیس نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہو۔
سوہا بھی رینا کے قہقہوں کا ساتھ دینے لگی تو تقدیس اور شرمندہ ہو گئی۔
"سوہا! تم نے بتایا نہیں کبھی! تمہیں محبت بھی کرنا آتی ہے؟ اور وہ بھی میرے علاوہ کسی اور سے؟"
رینا ہنستے ہنستے آنکھوں میں آجانے والے آنسو ٹشو پیپر سے صاف کرتے ہوئے پوچھ رہی تھی اور تقدیس کو اس لمحے اس کے لہجے... اس کے انداز میں ایک جتاتا ہوا تفاخر محسوس ہوا۔
"اوہ پلیز ماما۔" سوہا اپنی ہنسی کنٹرول نہ کر پا رہی تھی۔ "اس بے چاری کی شکل دیکھیں ذرا۔"
اس نے ہنستے ہنستے تقدیس کی جانب اشارہ کیا جس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ رہا تھا۔
"کیا سوچ رہی ہو گی وہ آپ کی ان باتوں سے۔ یار پلیز۔" وہ بمشکل ہنسی کنٹرول کر پائی۔
"پلیز۔ ماما کی باتوں کا مائنڈ نہ کرنا۔ وہ تو۔" اور ایک بار پھر ہنسی کا دورہ شروع۔
"سوری۔ سوری تقدیس۔" رینا نے نرمی سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔
"دراصل تمہاری بات سے مجھے سوہا کی وہ قسم یاد آ گئی۔ جو یہ اکثر و بیشتر دہراتی رہتی ہے کہ ماما کے علاوہ میں نے نہ کبھی کسی سے محبت کی ہے نہ کبھی کروں گی اور میں ہمیشہ کہتی تھی اسے کہ مت بولو اتنے بڑے بول ورنہ خدانخواستہ تمہارے ہی آگے آئیں گے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ سوئٹی! کم از کم اس ایج میں آ کے ایسے دعوے نہیں کرنے چاہئیں۔ میں نے تمہاری ساری ویکسی نیشن کرائی ہے مگر محبت سے بچاؤ کے ٹیکے نہیں لگوائے۔" ایک اور قہقہہ۔
تقدیس نے کسی عورت کو ایسے مردانہ وار بلند بانگ قہقہے لگاتے نہ دیکھا تھا نہ سنا تھا۔ اس کے باوجود یہ قہقہے اس نفیس اور شائستہ خاتون پہ جچ رہے تھے حیرت کی بات تو یہ تھی۔ البتہ تقدیس کو جو چیز نہیں جچ رہی تھی وہ اس کی صاف گوئی تھی۔
"دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میرے ہی پاس آؤ گی اپنی محبت کو لے کر اور لو۔ وہی ہوا لیکن فرق صرف یہ ہے کہ میں کسی لڑکے کو Expect کر رہی تھی۔ اور نکلیں تم۔"
وہ ہنستی جا رہی تھی اور تقدیس کی حیرت دو چند ہوتی جا رہی تھی' اس نے ماں بیٹی کے رشتے میں اتنی بے تکلفی اور اس قدر بے باکی اس سے پہلے نہیں دیکھی تھی۔

"سوری۔ سوری جانو۔" ایکا ایکی وہ اپنے قہقہے سمیٹ کر اس کا گال ہولے سے چھو کر معذرت خواہانہ لہجے میں کہنے لگی۔
"تم نے اپنی فرینڈ کی کوئی خاطر وغیرہ بھی کی یا صرف ماما سے ملوانے پہ ہی ٹرخا دیا ہے۔" اب وہ مہمان نوازی کے جوہر دکھانے لگی۔
"تم کہاں رہتی ہو؟"
"ماڈل ٹاؤن۔" تقدیس نے اپنا اعتماد بحال کرتے ہوئے جواب دیا۔
"کیا کرتے ہیں تمہارے فادر؟"
"فیوڈل فیملی سے ہیں محترمہ۔"
جواب اس کے بجائے سوہا نے دیا۔
"اوہ۔ کہاں سے Belong کرتی ہے تمہاری فیملی؟"
"جی۔ ہمیں پنجاب سے اور میری فیملی ضرور فیوڈل سسٹم پہ عمل پیرا رہی ہے مگر میرے فادر بہت روشن خیال اور تعلیم یافتہ انسان ہیں۔ وہ اس سسٹم کا حصہ نہیں ہیں۔ پہلے گورنمنٹ سروس میں رہے پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اب بزنس اسٹارٹ کیا ہے۔"
"وینس گریٹ۔ کس قسم کا بزنس؟"
"ماربل کا۔"
"اور گورنمنٹ سروس میں؟" اس نے بلاوجہ تفصیل جاننا چاہی۔ مقصد صرف سوہا کو اطمینان دلانا تھا کہ وہ اس کی خاص الخاص دوست کو خاص الخاص اہمیت دے رہی ہے۔
"بیورو کریسی میں تھے 'جعفر محمود' نام ہے ان کا۔"
اور سرسری انداز میں ایسے سوال کرتی رینا' جسے سوالوں کے جوابوں سے کوئی خاص دلچسپی ہی نہ تھی۔ سہ چونک زرد گئی۔
"جعفر محمود"
عرصہ بعد اس کے لبوں نے پھر سے وہی سرگوشی کی۔

💎💎💎💎

"اماں جی نے ایک بڑی عجیب سی بات کی ہے مجھ سے۔" پروین نے سراج دین کا موڈ اچھا دیکھ کے تمہید باندھی۔
"اب؟" انہوں نے اخبار کے پیچھے سے ہی سوال کیا۔
"کیا مطلب؟" وہ الجھیں اس بے تکے سوال سے۔
"میرا مطلب ہے اب کیا ہے؟ اتنے سالوں کے بعد؟ جبکہ اب سوخاصی پرانی بھی ہو گئی ہے۔"
انداز سراسر غیر سنجیدہ اور تضحیک سے بھرپور تھا جس پہ اچھے بھلے خوشگوار موڈ میں بھی پروین جل کے خاک ہو گئیں۔ یہی تو کمال تھا سراج کا۔ اگر سادہ سے سادہ الفاظ بھی استعمال کیے جاتے تب بھی لہجہ ایسا سوئیاں چبھونے والا ہوتا کہ سننے والا دیر تک کسک محسوس کرتا۔
"صاف صاف کہیں کیا کہنا چاہتے ہیں؟"
"یعنی میرا کہنے کا مقصد یہ ہے کہ ایسی باتیں بیویاں شادی کے ابتدائی سالوں میں کیا کرتی ہیں اپنی ساسوں

کی..... تم اب کر رہی ہو۔ اب میں کیسے مان لوں کہ میری ماں نے اتنے سالوں میں تم سے کوئی بات نہیں کی نہ عجیب... نہ غریب... تو اب کیا کریں گی۔ ویسے بھی تم دونوں دنیا کی سب سے انوکھی ساس بہو ہو ایک دوسرے کا عکس۔ اب چوتھائی صدی کا ریکارڈ کیوں خراب کرتی ہو ساس کی جھوٹی شکایتیں لگا کے۔"

"توبہ توبہ....." پروین نے کلے پیٹے

"میں کیوں لگانے لگی شکایتیں۔ وہ بھی جھوٹی اور وہ بھی اماں جان کی۔ میں تو صرف یہ بتا رہی ہوں کہ انہوں نے میرا دھیان ایک ایسی بات کی جانب دلایا ہے جہاں کبھی ہمارا خود سے دھیان گیا ہی نہیں۔"

"مثلاً"..... کس جانب؟" وہ سنجیدہ ہوئے

"حسن کی شادی کے بارے میں۔"

"جہاں تک میرا خیال ہے تمہارا دھیان اس مسئلے کی جانب پچھلے ڈیڑھ سالوں سے ہے۔"

"لیکن عملی قدم تو نہیں اٹھایا اب تک۔ جہاں تک اماؤں کی بات ہے تو وہ تو بیٹے پیدا ہوتے ہی دل میں خود بخود جاگ جاتے ہیں میں نے بھی کب سے اس گھر میں بہو لانے کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ شکر ہے کہ کچھ حسن کے دلچسپی نہ دکھانے کی وجہ سے اور کچھ قدرتی طور پر یہ کام ٹلتا رہا۔ ورنہ میں اگر کسی لڑکی کو منتخب کر بیٹھی ہوتی اور بعد میں اماں جان کی خواہش کا علم ہوتا تو کتنی شرمندگی اور پچھتاوا ہوتا۔"

"کیا انہوں نے کسی لڑکی کے بارے میں خواہش ظاہر کی ہے حسن کے لیے؟"

"جی..... بالکل..... اور پتا ہے کس کے لیے؟"

سراج دین نے اخبار سمیٹ کر ایک جانب رکھ دیا اور ذرا سا آگے ہوئے۔

"کون؟"

"ہما..... اپنی گل ہما۔" پروین نے خوشی سے کپکپاتی آواز میں بتایا۔

رد عمل کے طور پر سراج کتنی دیر کچھ بول نہ سکے۔

اور جب بولے تو الفاظ حلق میں اٹک رہے تھے۔

"ہما..... یہ..... یہ والی ہما.....؟"

"جی..... "انہوں نے سر ہلا کے انہیں یقین دلایا۔

سراج دین نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کرتے ہوئے اپنا سر تکیے سے ٹیک دیا۔

"یا اللہ..... تیرا شکر ہے....."

"کس بات کا شکر ادا کر رہے ہیں آپ؟"

پروین کے لیے ان کا یہ طرز عمل حیرت انگیز تھا۔ وہ سمجھ رہی تھیں کہ یہ بات جاننے کے بعد وہ حیران بھی ہوں گے اور خوش بھی..... لیکن وہ حیران اور خوش ہونے کے باوجود اس سے کہیں زیادہ مطمئن اور مسرور نظر آ رہے تھے۔ "تو نے میرا دین کے پوری کر دینے پہ....." انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

"کبھی میں یہ خواہش زبان پہ نہیں لایا..... لیکن دیکھو ماں ماں ہوتی ہے کیسے بنا کہے سمجھ گئیں وہ....."

"اگر آپ اتنا ہی چاہتے تھے تو کہا کیوں نہیں؟"

"بس عجیب سی جھجک آتی تھی..... اور کوئی خاص ہما کے لیے نہیں بلکہ میں صرف یہ چاہتا تھا کہ میری ایک بچی میری بہو بن کے آ جائے پھر چاہے وہ ہما ہو ندا یا ردا..... لیکن کہا اس لیے نہیں کہ یہ گھریلو..... اور خالصتاً "زنانہ امور" تھے۔ مجھے ان میں دخل دینا مناسب نہیں لگا۔"

"کیا بات ہوئی بھلا۔ آپ باپ ہیں حسن کے اس کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کے بارے میں ایسی جھجک۔"

"چلیں۔ جو ہوا..... ہو گیا۔ اچھا ہی ہوا۔ اماں جان کا بھی مان بڑھا..... بے شک ہماری رضامندی اور خوشی اس میں شامل ہے لیکن انہیں یہ خوشی تو حاصل ہو گی کہ یہ ان کے ایما پہ ہو رہا ہے۔"

"ہاں..... یہ تو ہے۔"

"بھائی صاحب اور بھابی کیا کہتے ہیں؟"

"ابھی..... ان سے کب بات ہوئی ہے ابھی....."

"تو کرنے دیر کس لیے۔" وہ آتاؤلے ہو رہے تھے

"ہاں..... بس ایک آدھ دن میں کرتے ہیں۔ بے شک گھر کی بات ہے۔ چار سیڑھیاں چڑھ کے اوپر جانا ہے لیکن یہ معاملہ ایسا ہے کہ پورے وضع داری اور طور طریقے نبھاتے ہوئے ہی کرنی پڑے گی۔ اماں جان باقاعدہ طور پر بھائی کے کان میں یہ بات ڈال دیں گی پھر ہم باضابطہ رشتہ لے کر چلے جائیں گے۔"

"ٹھیک....."

زندگی میں بہت کم ایسے مواقع آئے تھے جب سراج دین نے پروین کی کسی بات کے جواب میں "ٹھیک" کہا

✡ ✡ ✡

"امی مجھ سے شادی کے لیے میری پسند پوچھ رہی ہیں..... تمہارا نام رکھ دوں ان کے سامنے؟"

حسن کی کہی بات بار بار اس کے اطراف گونج رہی تھی اور وہ ہر بار نئے سرے سے ہراساں ہو جاتی تھی۔

"یہ کیا کہہ دیا حسن بھائی نے..... کیوں کہا.....؟ انہیں ایسا نہیں کہنا چاہیے..... ایسا نہیں سوچنا چاہیے تھا۔ آخر میں نے بھی تو کبھی ان کے بارے میں ایسا نہیں سوچا۔ پھر کیوں وہ میرا نام لینا چاہتے ہیں۔ کیوں؟"

وہ الجھ رہی تھی..... ساتھ ساتھ خود کو ملامت کر رہی تھی کہ کیوں نہ صاف الفاظ میں اسی وقت منع کر دیا۔

"نجانے کیا ہو گیا تھا مجھے..... کیوں نہیں کچھ کہہ سکی..... اور پتا نہیں انہوں نے میری خاموشی کا مطلب کیا لیا ہو؟" پھر ایک نئی فکر لاحق ہوئی۔

"یا اللہ..... کہیں وہ جو کہہ رہے تھے اس پہ عمل نہ کر دیں۔ کہیں عمل کر ہی نہ دیا ہو..... یا اللہ میں کیا کروں۔ کیسے روکوں انہیں.....؟ کیا فون کروں.....؟ ہاں یہ ٹھیک ہے۔" اس کے ہاتھ تیزی سے فون کی جانب بڑھے

"السلام..... " وہ ست ہو کر پیچھے ہٹی۔

"آپی..... آپ بھی تو کیا کہوں گی.....؟ یہ تو مر کے بھی نہیں کہہ سکتی کہ میں آپ کے بجائے وصی سے..... نہیں ..... اس نے تب زور سے پلکیں ڈالیں۔ "تو کیا کہوں؟ سچ کہنے لائق نہیں ہے..... اور جھوٹ بولنے لائق نہیں ہے مجھ.....؟ ہاں..... تھوڑا سچ..... تھوڑا جھوٹ....."

وہ دل ہی دل میں مناسب اور موزوں جواب ترتیب دینے لگی۔

"حسن بھائی میں نے کبھی آپ کے بارے میں ایسا نہیں سوچا بلکہ ہمیشہ آپ کے روپ میں اپنے بڑے بھائی کو دیکھا ہے آپ نے ایسی بات کر کے انجانے میں مجھے بہت بڑا دکھ دیا ہے۔ اس کی تلافی اسی صورت ہو سکتی ہے کہ آپ میرے متعلق ایسا ہر خیال جھٹک دیں۔ جو آپ چاہتے ہیں وہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ میں بڑے واضح طور پہ آئیڈیلائز کر چکی ہوں اسے..... امید ہے آپ میرا نکتہ نظر سمجھ گئے ہوں گے اور اس سے اتفاق کرتے ہوئے میری بات کا برا بھی نہیں مانیں گے۔"

بڑے ہی نپے تلے الفاظ پہ مشتمل یہ مختصری تقریر اس نے فوراً "تیار" تو کرلی مگر اسے پیش کرنے کا حوصلہ کہاں سے لاتی۔۔۔۔

حسن کا نمبر ملا کے ایک بھی بیل کا انتظار کیے بغیر اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"نہیں۔۔۔ میں نہیں کرسکوں گی۔۔۔ ناممکن۔۔۔ کبھی بھی نہیں کہہ سکتی میں یہ سب۔" وہ بے دم ہو کر بیٹھ گئی۔

"کاش۔۔۔ کاش وصی! تم میرے دل کی آواز سن چکے ہوتے۔ کاش تمہارے دل میں بھی میرے لیے وہی محبت جاگ چکی ہوتی جو میرے دل میں تمہارے لیے عرصے سے ہے۔ تو۔۔۔ تو یہ مرحلہ کتنی آسانی سے سر ہو جاتا۔ تم مجھے زحمت دیے بغیر خود سارا معاملہ سنبھال لیتے لیکن اب۔۔۔ اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب جب کہ تم میرے دل کے حال سے واقف تک نہیں ہو۔"

وہ تکیے کو بھگوتی اس کے تصور سے چپکے چپکے گلے کر رہی تھی۔ اپنی نوعمری کی محبت کے دکھ اکیلے ہی جھیل رہی تھی، جب منزہ نے آہستگی سے اس کے کمرے کا دروازہ دھکیلا۔۔۔ نیم تاریکی کے باعث وہ اسے فوری طور پر نظر نہ آسکی مگر اس کی ہلکی ہلکی سسکیاں ضرور منزہ کے کانوں تک پہنچ گئیں۔

حیران ہوتے ہوئے اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ اس سے پہلے کسی ہچکی کی صورت ایک نام وشمہ کے لبوں سے آزاد ہوا۔

"وصی۔۔۔" منزہ کے ذہن نے ایک دم ہی وصی تک رسائی حاصل نہیں کی بلکہ بے حد تعجب کے ساتھ وہ وشمہ کے کسی کلاس فیلو کے بارے میں سوچنے لگی۔ پھر اسے یاد آیا کہ وشمہ تو کو ایجوکیشن میں پڑھتی ہی نہیں۔ پھر؟

"شاید کسی فرینڈ کا بھائی یا کزن وغیرہ ہو۔۔۔" اور لفظ "کزن" کے ساتھ ہی اس کے ذہن میں جھماکا ہوا۔

"کزن۔۔۔ وصی۔۔۔ حسن اور حسان کا کزن۔۔۔ پروین کی نند کا بیٹا۔" وہ فوراً "نتیجے" پہ پہنچ گئی۔ اور اسی آہستگی سے دروازہ بند کر کے پلٹ گئی۔

اپنے کچی عمر کے کچے خوابوں کے دکھ روتی وشمہ کو نہ اس کے آنے کی خبر ہو سکی نہ جانے کی۔

☆ ☆ ☆

"ایک اچھی خبر ہے اماں جان!"

ابھی شوکت جہاں بیگم رخشندہ کے پاس جانے کا ارادہ ہی باندھ رہی تھیں کہ وہ خود مسرت سے دمکتا چہرہ لیے سامنے تھیں۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ کیا خبر ہے؟"

"ندا کے لیے رشتہ آیا ہے۔۔۔ بلکہ آیا کیا۔۔۔ آنے والا ہے۔ ابھی تو انہوں نے آنے کا قصد ظاہر کیا ہے۔"

"کون لوگ ہیں؟"

"ان کے جاننے والے ہیں۔۔۔ بہت قریبی دوست تو نہیں مگر شناسا ضرور ہیں۔ آپ کو یاد ہو گا ... لوگ گئے بھی تھے ان کے ہاں شادی پہ۔۔۔ بلاوا تو سب کا تھا مگر صرف میں اور ندا جا سکے تھے۔"

"ہاں۔۔۔ کچھ یاد تو پڑتا ہے۔"

"ان کے جاننے والوں کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہیں پہ اپنے بیٹے کے لیے ہماری ندا کو پسند کر لیا۔ اب باقاعدہ رشتہ لے کے آنا چاہ رہے ہیں۔"

"بسم اللہ۔۔۔ جلدی بلاؤ۔"

"یہی مشورہ کرنے آئی تھی۔۔۔ اتوار کی شام کو بلا لوں؟"

...زار میں پانچ روز ہیں۔ جمعہ کے مبارک دن کیوں نہیں۔"

"...بھی ٹھیک ہے۔"

"...ندان کیسا ہے؟" انہوں نے مزید تفصیلات جاننا چاہیں۔

"...اں جان۔۔۔ اگر پتا ہوتا کہ ان کا یہ ارادہ ہے تو میں جب گئی تھی تو گہری نظر سے جائزہ لے کر آتی۔ لیکن میں ...رکی سی شرکت کی وہ بھی صرف ایک فنکشن میں۔۔۔ لڑکے کا بھی تعارف ہوا تھا تب لیکن میں نے ...ور نہ لیا۔"

"...ں بیٹیوں کی ماؤں کو آنکھیں کھلی رکھنی چاہئیں۔"

"...لیے خاندان تو اچھا ہے۔ پڑھا لکھا۔۔۔ مناسب اور میانہ روی کی حد تک روشن خیال۔۔۔ ملنسار لوگ ...لڑکا ہو گا کوئی 33، 34 سال کا مگر دیکھنے میں لگتا نہیں ہے۔ اپنی ندا کی طرح عمر چور ہے۔" وہ ہنسیں۔ ...بہنیں بیاہی ہیں۔ ایک بڑی اور ایک چھوٹی جس کی دو ماہ پہلے شادی تھی۔۔۔ ماں باپ اور بس۔۔۔ الیکٹرونکس ...کا ...ال روڈ پہ۔۔۔ باپ بھی اس کاروبار میں ہے بس یہ ہے اماں جان کہ۔۔۔" وہ ذرا سا ہچکچائیں۔ پھر ...توقف کے بعد بولیں۔

"...ذات برادری سے باہر کا ہے۔"

"کوئی بات نہیں۔۔۔ میں نے نہ پہلے کبھی اسے مسئلہ بنایا ہے نہ آئندہ بننے دوں گی۔ بس لڑکا تعلیم یافتہ، ہنر مند ...اور شریف ہو۔ گھرانہ سادہ اور پر خلوص ہو۔"

"...خوبیاں تو ہیں ان میں۔۔۔ میرا مطلب ہے نظر تو آئی ہیں۔"

"ان شاء اللہ ہوں گی بھی۔۔۔ اتنی اچھی خبر سنائی ہے تم نے۔۔۔ لو اب ایک اچھی خبر مجھ سے سنو۔۔۔"

...مسکراہٹ دباتے ہوئے بہو کے قریب ہو گئیں اور یہ سوچ سوچ کے ہی مزا لینے لگیں کہ خوشیاں حقیقی معنوں ...میں کیسے ہوتی ہیں، یہ آج وہ رخشندہ کو بتائیں گی۔

○ ○ ○

"...اتنی جلدی کریں۔۔۔ ایسے کام نہیں چلے گا۔" رخشندہ کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے۔

...ایسے گم ہوئے تھے کہ کسی کو یہ بتانے تک کا ہوش نہ تھا کہ ندا کو دیکھنے نیازی فیملی تو آ ہی رہی ہے۔ اس ...ساتھ ساتھ شکیل ہما کے لیے پروین بھی اپنی خواہش ظاہر کرنے والی ہے۔ زیادہ شور نیازی صاحب کے گھرانے ...کا تھا۔۔۔ کہ دوسری بات تو گھر کی تھی۔ گھر میں ہی نمٹ جاتی۔ معراج بیگم کو بھی شوکت جہاں نہ بتاتیں تو وہ ...بے خبر ہی رہتے۔ سن کر جہاں بے پایاں مسرت ہوئی وہیں رخشندہ پہ ہلکا سا غصہ بھی کیا۔

"...ہے۔ اتنی اہم بات اور تم نے مجھ سے ذکر تک کرنا مناسب نہیں سمجھا۔"

"...گھر کی ہی تو بات ہے۔ میں نے تمہیں بتایا تب بھی پتا تو چل گیا آپ کو۔۔۔ اماں جان نہ بتاتیں تو کوئی اور ...آپ کے علاوہ نہ ندا جانتی تھی نہ ہما۔۔۔"

"...تبھی کے کور تو بدلو۔۔۔" رخشندہ نے پردے دھلائی کے لیے اتارتے ہوئے کہا۔

"...دھوائی۔۔۔ پردوں، کشنز کی حد تک تو ٹھیک ہے۔۔۔ مگر گاؤ تکیے تو اندر آپ کے کمرے میں ہیں۔ وہاں کے ...نہ کوئی بیٹھے آئے گا۔ اور پرسوں ہی تو نئے چڑھائے تھے۔"

"...نئے نہیں۔۔۔ بھلے ہوئے۔۔۔ نئے تو یہ ہیں۔۔۔ دیکھو میرے جہیز کے اب تک سنبھالے ہوئے ہیں۔ کام والا ...

"ایسی کوئی نرالی بات بھی نہیں۔ کتنے دنوں سے تو ذکر کر رہی تھی میں۔"

"وہ تو ٹھیک ہے۔ مگر۔ اچانک۔ کیسے؟"

وہ ٹھیک ٹھاک الجھ کے رہ گیا۔ "کیسے" کے بجائے "کس سے" کا سوال زیادہ چلک چھیروں کھا رہا تو تھا [illegible] تھی۔

"اچانک ہی سہی۔ مگر بے وقت فیصلہ۔ اور ایسا جس میں ہمارے سارے گھر کی خوشیاں وابستہ ہیں۔"

"اور میری؟" اس کا دل کراہ کے رہ گیا۔

"ہم سب نے تمہارے لیے ہما کا انتخاب کیا ہے۔"

"شگل ہما کا۔۔۔؟" وہ بے یقینی سے انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"کیوں۔۔۔ ہے ناں ہمارا انتخاب لاجواب۔"

پروین اتنے مان سے اس کے سامنے کھڑی پوچھ رہی تھیں کہ وہ فوری طور پہ انکار میں سر ہلانے کی ہمت نہ کر سکا۔

ماں کی آنکھوں میں جھلملاتے آس کے دیپ اس کے چہرے کو اتنا حسین بنا رہے تھے کہ وہ منہ پھیر نے پہ مجبور ہو گیا۔

"امی۔۔۔ میں۔۔۔ "ایک بار جی میں آئی۔ انکار کر دے۔۔۔ صاف انکار۔۔۔ وشمہ کا نام لے لے مگر۔۔۔"

"تمہاری دادی کی برسوں پرانی خواہش تھی۔۔۔ اور تو اور تمہارے ابو بھی یہی چاہتے تھے۔۔۔ دونوں کو اتنا پرسکون اور مطمئن میں نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا۔"

وہ خشک ہونٹوں پہ زبان پھیر کے رہ گیا۔

طبیعت میں نہ اتنی خود سری تھی نہ اپنی بات ضد کر کے منوا لینے کی عادت۔۔۔ ہمیشہ سے ہر معاملے میں بڑوں کے ہاں کر دینے کی خوشی میں بڑی تھی اب کیسے سینہ ٹھونک کر اس فیصلے سے اختلاف ظاہر کرتا جس فیصلے پہ ماں باپ اور دادی اتنے مطمئن نظر آ رہے تھے۔

"لیکن وشمہ۔۔۔ اگر میں نے اس سے اپنے دل کا حال نہ کہا ہوتا تو دوسری بات تھی۔ اب وہ سب جان گئی ہے۔ میرے اظہار کے بعد اس نے ایک لفظ تک نہیں کہا۔ مگر وہ منتظر تو ہو گی میرے اگلے قدم کی اور میں سوچتا کیا کرنے جا رہا ہوں۔ فقط اپنی فطری بزدلی کی وجہ سے میں ایک معصوم لڑکی کے جذبات کو چھیڑ کے اسے دکھ دے دوں۔ آج میں اس سے اظہار محبت کر کے آ رہا ہوں' کل میری شادی کی۔۔۔ کسی اور سے شادی کی خبر اسے ملے گی۔۔۔ کیا گزرے گی اس گھٹیا مذاق سے اس کے نازک دل پہ۔۔۔ نہیں۔۔۔ میں ایسا نہیں کر سکتا۔"

آخر کار دل کڑا کر کے اس نے کہہ دیا۔

"امی! میں یہ کہہ رہا تھا کہ اتنی جلدی۔۔۔ ابھی اس سب کی کیا ضرورت ہے؟"

"جلدی۔۔۔؟ کیوں بھئی سترہویں سال میں لگے ہو کیا؟" وہ چھیڑنے لگیں۔۔۔ حسن مسکرا کے رہ گیا۔

"ابھی ہما کا معاملہ تو طے پانے دیں۔ اچھا نہیں لگتا کہ ایک غیر خاندان باہر سے آ رہا ہے رشتہ لے کر۔ بیچ میں ہم اپنی ٹانگ گھسائیں۔۔۔ تایا' تائی کیا سوچیں گے۔"

"سوچنا کیا ہے' وہ تو بے حد خوش ہیں۔ تم بے کار کے وہم پال رہے ہو۔ ماں باپ کے لیے اس سے بڑی خوشی کیا ہو گی کہ ان کی بیٹیوں کے اللہ مناسب سبب پیدا کر دے اور ایک ہی دن میں اگر دونوں کا رشتہ طے ہو جائے تو اس سے زیادہ خوشی کا مقام ان کے لیے کیا ہو گا۔ تمہاری تائی کے تو قدم زمین پہ نہیں ٹک رہے۔"

"کیا مطلب۔۔۔؟ وہ۔۔۔ وہ جانتی ہیں؟" وہ بری طرح چونکا۔

"[illegible] لوگ تو آج جانے والے ہیں رشتہ لے کر۔"

"ایسا ہی ہوتا ہے۔۔۔ پہلے سے اطلاع کرنی ہوتی ہے۔ کوئی اچانک جا کے دھماکہ تھوڑا ہی کرتا ہوتا ہے۔ [illegible] کچھ پہلے اشارتاً یا کسی اور کے ذریعے کانوں میں بات ڈالی جاتی ہے پھر جایا جاتا ہے۔ یہ نہیں کہ منہ [illegible] دیے وہاں جا کے پتا چلے کہ ان کی مرضی کچھ اور ہے اور پھر اپنا سا منہ لے کر واپس آ گئے۔ سامنے والے [illegible] کے بعد جایا جاتا ہے۔ بعد میں تو رسمی کارروائی ہوتی ہے۔ یہ جو نیازی فیملی آ رہی ہے' انہوں نے بھی [illegible]"

"[illegible] آپ نے بھی۔۔۔؟" وہ بے دم ہو کر بیڈ پر گر گیا۔

"[illegible] جو طریقہ ہے اس کے مطابق ہی چلنا ہے۔ کیوں؟"

[illegible] کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

[illegible] سے لوگوں کی امید توڑ دینا اس کے بس میں نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

"[illegible] توجہ تم پلاؤ کو دم دینے میں دے رہی ہو' اس کی آدھی توجہ بھی اپنے چہرہ مبارک پر دے لو تو نتائج اچھے [illegible]"

[illegible] جو آیا تو ہیلپ کرنے تھا۔۔۔ مگر اب اس کا دماغ اور گاجریں مسلسل کھا رہا تھا۔

[illegible] جو اس کے اپنے پیچھے کشاں کشاں چلے آنے پہ مسرور و مغرور ہو گئی تھی۔۔۔ پل بھر میں کئی خوش [illegible] بیٹھی تھی۔ اب اس کی بے سروپا گفتگو من کو ہل چلا رہی تھی۔

"[illegible] کیا ہے میرے چہرے کو۔۔۔؟ کیا خرابی ہے؟"

"[illegible] خرابی کوئی نہیں ہے۔۔۔" اس نے اطمینان بھری نظر اس کے لال بھبھوکا چہرے پہ ڈالی جو کچھ گرمی [illegible] کچھ غصے سے ایسا ہو رہا تھا۔

"[illegible]"

"[illegible] دیکھو۔۔۔" وہ ہنسا کے آٹے پہ زور زور سے مکے مارنے لگی۔

"[illegible] ساری عمر دیکھنا پڑے گا آپ کو۔۔۔"

[illegible] معنی خیز انداز میں کہتے ہوئے اس کے ناراض ناراض سے چہرے پہ شرارت سے بھرپور نظر ڈالی۔

[illegible] اندر جیسے جھنجھنا اٹھا۔

"[illegible] بزرگوں کے فیصلے کے آگے ہم کل کے بچے کیا دم مارنے کی مجال رکھتے ہیں۔"

"[illegible] کر رہے ہو؟"

[illegible] کی باتیں جو مطلب اس پہ کھول رہی تھیں وہ یقین نہ کر پا رہی تھی۔۔۔ بھلا ایسے کیسے۔

"[illegible] فضول باتیں۔۔۔ تو اب یہ باتیں فضول ہیں۔ یعنی میں جا کے کہہ دوں دادی جان سے۔۔۔ آپ جس [illegible] ہمیشہ کے لیے اپنی نظروں کے سامنے رکھنے کے پروگرام بنا رہی ہیں' اس کے خیال میں ایسے تمام [illegible] ہیں۔"

[illegible] نے فوراً آٹے سے ہاتھ آگے کیے۔

"[illegible]"

"[illegible]" شرارت آنکھوں سے ٹپک رہی تھی۔

"یہ۔۔۔ یہ کیسا مذاق ہے وصی؟" وہ روہانسی ہو گئی۔

دل تھا کہ ناچنے کو بے چین ہو رہا تھا اور وصی کی سابقہ شرارتیں اور لاابالی رویہ یاد آ جاتا تو خواہ مخواہ ہو جاتی۔ کہ کہیں یہ بھی اس کا کوئی مذاق۔۔۔ کوئی شرارت نہ ہو۔

"مذاق؟ لگتا ہے تمہیں تب یقین آئے گا جب امی تمہارے ہاتھوں میں انگوٹھی پہنائیں گی۔"

ہما کے جسم کا سارا خون چہرے پہ جمع ہو گیا۔

وصی شوشہ چھوڑ کے جا چکا تھا اور وہ تصدیق کے لیے جلے پیر کی بلی کی طرح کبھی ہما تک جاتی۔ کبھی پلٹتی۔۔۔ پھر امی کے کمرے تک جاتی۔ ایسے ہی اس کا تیسرا پھیرا تھا جب رخشندہ نے نوٹ کیا اور اسے آواز دی۔

"ہما۔۔۔!" وہ سرعت کے ساتھ پلٹی۔

"جی!"

"کیا بات ہے۔۔۔؟ کچھ کہنا ہے؟"

"نہیں۔۔۔ وہ۔۔۔ ہاں۔۔۔ وہ پوچھنا تھا۔"

"کیا۔۔۔؟"

"کیا؟" وہ خود بھی دہرا کے رہ گئی۔۔۔ "ہاں۔۔۔ یہ کہ۔۔۔ کڑاہی میں مسالے تیز رکھنے ہیں یا ہلکے؟"

"ہلکے ہی رکھو۔۔۔ وہ لوگ تو نجانے کیسا کھانا پسند کرتے ہیں مگر تمہارے چچا اور دادی دونوں پھیکا کھانے ہیں ان کو مسئلہ ہوگا۔"

"وہ۔۔۔ وہ بھی ہوں گے۔"

"ہاں۔۔۔ ظاہر ہے۔۔۔"

اب کے رخشندہ کو سنجیدگی سے دھیان آیا ہما کو تفصیل سے آگاہ کرنے کا۔

"ابھی ایک تو ندا پہ جتنا حق ہمارا ان کا بھی اتنا۔۔۔ دوسرا وہ ندا کے علاوہ بھی کسی خاص مقصد کے لیے آ رہے ہیں۔"

ہما خاموش رہی۔۔۔ مگر اس کی آنکھیں شدت سے سوالیہ انداز میں ماں کے چہرے پہ جمی تھیں۔

"تمہارے لیے۔۔۔"

"یعنی۔۔۔ وصی مذاق نہیں کر رہا تھا"

وہ بے ساختہ کہہ اٹھی۔۔۔ پھر رخشندہ کی مسکراہٹ دیکھ کر جھینپ گئی۔

"یعنی وصی نے پہلے ہی سب بتا دیا۔۔۔ چلو۔۔۔ میرا کام آسان کر دیا۔" وہ ہنسیں اور ہما۔۔۔ گلابی پڑتے چہرے کے ساتھ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔

☆ ☆ ☆

"تیار نہیں ہوئے تم ابھی تک؟" پروین اندر آئیں تو اسے ابھی تک اسی حالت میں پایا تھا۔

"میں کیا کروں گا اب جا کے۔"

وہ روٹھے ہوئے لہجے میں بولا۔۔۔ خفگی آواز سے ظاہر ہو رہی تھی۔

"ندا کے بھائی کی حیثیت سے تو جانا ہی ہوگا یا اپنی خوشی میں یہ بھی بھول گئے؟"

پروین نے چھیڑا۔۔۔ مگر وہ مسکرا تک نہ سکا۔

"جلدی کرو۔ تیار ہو جاؤ۔۔۔ نیازی فیملی آ چکی ہے۔"

وہ بے دلی سے اٹھا اور بیڈ پہ کب کا نکالا سوٹ اٹھا کے واش روم میں گھس گیا۔ بیس منٹ بعد کمرے

ڈرائنگ روم خالی تھا۔ اوپر سے باتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ سب وہیں جمع تھے۔ وہ بھی بوجھل قدموں کے ساتھ

کچن روم کے دروازے کے بروبر تھا۔ وہ اندر جانے کا سوچ ہی رہا تھا کہ کچن سے نکلتی ہما کی جھلک دکھائی دی۔ حسن نے کبھی اسے ان نظروں سے دیکھا تو نہیں تھا اس کے باوجود اسے شدت سے محسوس ہوا کہ تیکھے نقوش اور سادہ سی شخصیت والی لڑکی ہما آج بے انتہا خوب صورت لگ رہی تھی۔ حالانکہ اس کی سادگی ویسی ہی تھی۔ شاید یہ خوب صورتی اس مسکراہٹ کی تھی جو اس کے لبوں پہ سجی تھی۔۔۔ اس خوشی کی تھی جو اس کے پور پور سے جھلک رہی تھی۔

"بس کرو ہما۔۔۔ بیٹھ جاؤ ایک جگہ۔۔۔ کتنے چکر لگاؤ گی ادھر ادھر کے۔" کچن میں موجود روا نے چھیڑا تھا۔

اور پھر ندا کا جوابی مذاق۔۔۔

"اسے بے قراری ہے کہ کب چچا چچی کا نمبر آئے گا۔۔۔ کب اسے اندر بلایا جائے گا۔۔۔ کیوں ہما؟"

جواب میں سرخ پڑتی ہما کی نظریں اسی وقت حسن سے ٹکرائیں۔ حسن گھبرا کے ڈرائنگ روم میں داخل ہو گیا جہاں نیازی فیملی سب کا منہ میٹھا کرا رہی تھی۔۔۔ ہاں ہو چکی تھی۔

حسن نے غائب دماغی کی کیفیت میں ندا کے متوقع شوہر ارسلان نیازی کا تعارف حاصل کیا۔۔۔ اس کھوئے کھوئے انداز میں اس نے پروین کو کہتے سنا۔۔۔

"ہم بھی اپنے بیٹے حسن کے لیے ندا سے چھوٹی ہما کا ہاتھ مانگ رہے ہیں۔"

معراج دین نے خوش دلی سے بھائی کو گلے لگا لیا۔

یہ اقرار اور رضامندی کا ثبوت تھا۔

مبارک سلامت کے شور نے کچن میں بیٹھی ہما کے وجود کو رنگ دیے۔

"جلدی اندر۔۔۔" روا ماں کا پیغام لیے اسے بلانے آئی۔

"ماشاء اللہ۔۔۔ کتنی پیاری لگ رہی ہے میری ہما آج۔" پروین نے آگے بڑھ کے اس کا ماتھا چوما۔۔۔ اور اسے اپنے پاس بٹھا لیا۔

"بھئی۔۔۔ آج سے آپ کی ہما اب ہماری۔۔۔"

ہما کے وجود پہ لگے پر۔۔۔ اسے اونچا۔۔۔ بہت اونچا اڑانے لگے۔

"پھر آپ کا بیٹا بھی ہمارا۔۔۔ بھئی اصول تو یہی ہونا چاہیے۔" معراج دین نے مذاقاً کہا۔

"حسن تو پہلے ہی آپ کا۔۔۔ کہنے کی کیا بات ہے۔" چچا کی آواز پہ اس کے پھڑپھڑاتے پر ساکت ہوئے۔

"حسن۔۔۔" اس کے اندر یہ لفظ بازگشت بن کے گونجا۔

"ماشاء اللہ جوڑیاں بڑی اچھی جچ رہی ہیں۔" شوکت جہاں نے مطمئن لہجے میں کہا۔

"دونوں کی دونوں۔۔۔ ندا اور ارسلان کی بھی۔۔۔ اور اپنے حسن اور ہما کی بھی۔"

"حسن اور ہما۔۔۔"

"ہما اور حسن۔۔۔"

سب ایک کر کے الگ ہوئے تھے۔ اور وہ دھڑام سے نیچے آن گری۔

سب ایک ایک کر کے الگ ہوئے تھے اور وہ دھڑام سے نیچے آن گری تھی۔ اتنی زور سے کہ ذات کے پرخچے اڑ گئے تھے۔

"ہما اور حسن۔"

"ہما اور حسن..... حسن محسن محسن محسن۔"

ان کی سماعتوں میں دھماکے ہو رہے تھے۔ اس نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنی ارد گرد بیٹھے نفوس کو دیکھا
اس وقت ساری شرم و حیا فراموش کر چکی تھی۔ یہ بھی یاد نہ تھا کہ اس کو رخشندہ نے خاص طور پر تاکید کی تھی
اور نظریں جھکا کے رکھنے کی۔

وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہی تھی کہ شاید مذاق کی کوئی رمق نظر آ جائے۔

سب خوش باش.....

سب راضی اور مگن.....

یہ سب اس کے اپنے تھے۔ مگر اس کے درد سے یکسر انجان۔

سب اس کو چاہنے کا دعوا رکھتے تھے مگر اس کی چاہت سے بے خبر۔

"بھائی جان! اجازت ہو تو میں حسن کے نام کی انگوٹھی ہما کو پہناؤں؟" پروین نے اجازت طلب کی۔

معراج دین نے ماں کی جانب اجازت طلب نظروں سے دیکھا وہاں اجازت ہی اجازت تھی۔

اب کے انہوں نے شریک حیات سے نظروں ہی نظروں میں رائے طلب کی۔ وہاں اس سے بھی بڑھ کے رضا مندی اور سرخوشی رقم تھی۔

"بسم اللہ کیجئے۔ آپ کی اپنی بیٹی ہے۔"

ہما کے اندر کوئی چیز بڑے زور سے پھڑپھڑائی تھی۔ جیسے روح نکل بھاگنے کو تیار ہو۔ اس نے ہراساں انداز میں ماں کو دیکھا..... رخشندہ کے چہرے پہ ایک انوکھی چمک تھی۔

پھر اس نے باپ کے چہرے پہ نگاہ ڈالی..... وہ شانے جواب تک نادیدہ بوجھ تلے دبے نظر آتے تھے اٹھے ہوئے تھے۔ دادی کی نظروں میں ایک اطمینان ہلکورے لے رہا تھا۔

"میں..... میں نہیں مطمئن میں نہیں راضی۔" اس کا اندر چلا رہا تھا۔ کرلا رہا تھا مگر کون سنتا۔

"بھئی کب سے آس لگائے دروازے پہ کھڑے ہیں ہم۔"

وصی کی آواز پہ وہ جھٹکا کھا کر مڑی..... وہ پردہ ہٹا کے اندر جھانکتے ہوئے آنکھوں میں شرارت بھرے پتہ نہیں کس سے مخاطب تھا۔

"ہاں ہاں تم سنو گے۔ تم سے دل کا ناتا ہے۔ روح کا ناتا ہے۔ میرے دل کی پکار تمہارا دل سنے گا۔ میری روح کی صدا پہ تمہاری روح لبیک کہے گی۔" اسے آس سی بندھی۔

"کب مبارک بادوں کا شور سنائی دیتا ہے اور کب مٹھائیاں ہمیں بھیجی جاتی ہیں۔ ہم ہیں کہ منہ میٹھا کرنے کا موڈ بنائے بیٹھے ہیں اور آپ انگوٹھی ہاتھ میں لئے کسی سوچ میں گم ہیں کہ پہناؤں یا نہ پہناؤں۔"

ہما کی آس کے دھاگے کچے پڑنے لگے۔

"یہ میرا نواسا ہے..... وصی..... بڑا شریر ہے۔" شوکت جہاں نے مسکراتے ہوئے اس کا تعارف کروایا۔

"نانی جی! نہیں پہنائی جا رہی انگوٹھی۔ تو میں پہناؤں آکر۔" اس کی بات پہ جہاں اور سب کھلکھلا پڑے وہیں ہما کا دل سکڑ کر پھیلا اور پھر سے سکڑ گیا۔

"پروین سے بڑا پیار ہے اس کا۔" انہوں نے مزید وضاحت کی۔ "ان کے ہاتھ میں پلا ہے۔ ان کے ساتھ مذاق بھی ایسے ہی چلتا رہتا ہے اس کا۔"

"اور یہ مذاق؟" وہ سوچ کر رہ گئی۔ "یہ کیا مذاق کیا ہے میرے ساتھ؟ پتہ نہیں وصی! یہ مذاق تم نے کیا ہے میرے دل نے کیا ہے یا تقدیر نے۔ میں کیا یہ سمجھے بیٹھی تھی کہ تمہارے دل میں بھی کہیں نہ کہیں میں کنڈلی مارے بیٹھی ہے جو میرے دل پہ راج کر رہی ہے۔ اس حقیر چھوٹی سی نوک جھونک کے پیچھے بھی..."

مگر۔ اس سے آگے وہ کچھ سوچ نہ سکی۔

پھر اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے اس کے برف کی سل جیسے ہاتھ پر کسی نے دہکتا انگارہ رکھ دیا ہو۔

اس نے چونک کر دیکھا۔ اس کا ہاتھ پتا نہیں کب رخشندہ نے تھام کر پروین کے سامنے کیا تھا اور وہ دہکتا انگارہ نہیں حسن کے نام کی انگوٹھی تھی۔

☆ ☆ ☆

"اور جب یہ خبر وشہ تک پہنچے گی۔ کیا گزرے گی اس پہ۔" حسن نے اپنے تاریک کمرے میں ٹہلتے ہوئے سوچا۔

سارے گھر میں رات کے سوا بارہ بجے بھی زندگی جاگ رہی تھی۔

نہ جانے کہاں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کے ڈھولک نکال لی تھی اور سب لڑکیوں کو جمع کیے حسن کا سہرا گا رہی تھی۔

تیرے سہرے توں میں واری آں
سہرے والے توں بلہاری آں

جوش اور ممتا کے غرور سے لبریز آواز کھنک رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کا ساتھ دینے کو شوکت جہاں کی بوڑھی آواز بھی شامل ہو جاتی اور تانوں میں شدت کچھ اور بڑھ جاتی۔ ڈھولک کی پہلی تھاپ سنتے ہی آس پڑوس کے چند بچے تجسس کے مارے جھانکنے آ گئے۔ وجہ دریافت ہونے پہ تالی بجانے والے ہاتھوں میں چند کا مزید اضافہ ہو گیا۔

وہ کروٹ بدلے پریشانی سے ٹہل رہا تھا..... کسی کی دخل اندازی کا خطرہ نہ رہے اس لیے لائٹ تک آف کر رکھی تھی تاکہ سب اسے سوتا سمجھ لیں۔ البتہ باہر سے آنے والے گیتوں کی آواز وہ روک نہیں پا رہا تھا۔

"تیرے سہرا..... عمراں ساریاں۔"

تھوڑی دیر پہلے اس نے پروین کو فون پہ نوید مراد کے گھر اطلاع دیتے ہوئے سنا تھا۔ تب سے اس کا بجھا ہوا دل رہ رہ کے ٹیسیں دے رہا تھا۔

"کاش میں نے وشہ سے حال دل کہنے میں اتنی جلد بازی کا مظاہرہ نہ کیا ہوتا۔" وہ آزردگی سے سوچ رہا تھا۔ شعور کے پردے پہ اسے اپنے کمرے میں تکیے میں منہ دیے گھٹ گھٹ کر ہچکیاں لے لے کر روتی نظر آ رہی تھی۔

"تب یہ دکھ صرف میرا ہی ہوتا۔ کم از کم وہ اس دکھ کی حصہ دار نہ ہوتی۔ میں نے کیوں اس کے معصوم نوخیز دل کو اپنا بنا کر آگ لگائی۔ وہ انجان تھی۔ انجان رہتی۔ میں چپ چاپ پی جاتا اس زہر کو۔ بزدلی کا طعنہ وہ تو میں نے لیا ہی اپنی نظر میں بے وفائی کا مرتکب تو نہ ٹھہرتا۔"

"سہرے دیاں لڑیاں دا سہرا جدوں لڑیا۔"
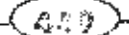
خوشی سے کھنکتی آواز ایک بار پھر کمرے کی خاموشی کو جھنجوڑ رہی تھی۔

"سب عزیز ہستی کو غم سے بچانے کے لیے میں دوسری اتنی ہی محترم اور عزیز ہستیوں کو ملال سے دوچار نہیں کر سکتا تھا وشہ..... میں نہ بزدل ہوں نہ بے وفا۔ کاش تم بھی جان سکو۔ مگر تم کیسے جان سکو گی۔ کون سنے گا نہیں کہ یہ فیصلہ میں نے کس صورت حال کے پیش نظر مجبوراً کیا ہے۔ کم از کم میں تو نہیں بتا سکتا۔ شاید کبھی پھر تمہارا سامنا کرنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا۔" وہ نڈھال ہو کر کرسی پہ بیٹھ گیا۔

☆ ☆ ☆

وہ عجیب سوچ رہا تھا۔ اس غم میں وہ اکیلا نہیں تھا۔ یہ رشتہ جہاں گھر بھر کو خوشیوں کی وجہ دے گیا تھا وہاں اس کے ساتھ کوئی اور بھی تھا جس کا دل ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کسی بھاری سل تلے دب کر رہ گیا تھا۔

ایسا کا اندازہ درست تھا ۔۔۔ کوئی تھی جس کی یہ رات تکیے میں منہ چھپا کے ہچکیاں لیتے ہوئے گزر رہی تھی۔ کوئی تھی جس کے آنسو بستر بھگو رہے تھے۔ مگر وہ وشمہ نہیں ظل ہما تھی۔

"الوداع ۔۔۔ اے محبت الوداع۔"

ظل ہما نے رات کے آخری پہر اپنے آنسو صاف کرتے ہوئے گویا دل کی سلیٹ پہ لکھے اس نام کو بھی صاف کر دیا اور صبح کے اولین پہر کے استقبال کی تیاری کرنے کے لیے وضو کرنے کھڑی ہو گئی۔

وہ ایک لڑکی تھی۔ ایک مکمل مشرقی لڑکی ۔۔۔ دل اس کا بھی ٹوٹا تھا۔ سینے اس کے بھی مجروح ہوئے تھے آرزوئیں اس کی بھی کرچی کرچی ہو کر بکھری تھیں۔ جرات اس نے بھی سہا تھا ۔۔۔ اس رشتے پہ وہ بھی ہمت کر مجبوریوں اور مصلحتوں کے تحت راضی ہوئی تھی لیکن حسن کی نسبت اس نے سمجھوتہ بہت جلدی کر لیا۔ رات کی سیاہی کو دن کے اجالے میں بھی بدلنے سے پہلے پہلے ۔۔۔ وہ اس نئی زندگی کے سفر کا آغاز دو حصوں میں بٹے دل کے ساتھ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ اپنے دل سے پرانی محبتوں اور گزرے خوابوں کی ہر شبیہہ مٹا کر اسے صاف کر دینا چاہتی تھی کہ نئے حوالے اس پہ بددیانتی کے بہتان نہ لگائیں۔

مگر حسن ایک مرد تھا ۔۔۔ باشعور، سمجھدار اور ایک ستھری سوچ کا مالک ہونے کے باوجود ایک مرد۔

جو سمجھوتا کرنے پہ مشکل سے تیار ہوتا ہے۔

جو کبھی تو اتنا کمزور ہوتا ہے کہ دل کی سب سے بڑی خوشی کو بھی پورا کرنے سے خود کو قاصر پاتا ہے۔

اور کبھی اتنا منہ زور کہ تقدیر کے کیے ہوئے ایک مذاق کو سہنے سے بھی صاف انکار کر دیتا ہے۔

اس نے مصلحت کے تحت اور اپنی فطری تابع داری کے باعث اس فیصلے پہ سر تسلیم خم تو کر دیا تھا مگر وہ ظل ہما کے لیے دل کے دروازے وا کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ وہ آنسوؤں سے وشمہ کی شبیہہ مٹانے پہ تیار نہیں تھا۔ وہ اسے کھونے کی کسک "اسے نہ پانے کی محرومی کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے زندہ رہ جانے والے دکھ کے طور پہ پالنا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"یہ مٹھائی آئی ہے پروین کے ہاں سے۔" نوید مراد نے منزہ کے سامنے ڈبہ رکھتے ہوئے بتایا۔

ان کے سادہ سے لہجے میں خوشی کی ہلکی سی رمق بھی تھی۔ "ڈرائیور دے کر گیا ہے۔"

"ظاہر ہے خود کس منہ سے آتیں۔" منزہ کے چہرے پہ تناؤ تھا۔

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ اکلوتے ماموں ہیں آپ ۔۔۔ منگنی کر ڈالی اور آپ کو فون پہ اطلاع دے کر ڈرائیور کے ہاتھ مٹھائی بھیج کر کیا بھائی کا حق ادا ہو گیا؟"

"میں نے کون سا باہر جا کے ساتھ منگنی کی ہے جو میں نہ بلائے جانے کا گلہ کروں۔" نوید مراد نے بات ٹالنا چاہا۔ "گھر کا معاملہ تھا ان کا ۔۔۔ گھر میں نمٹا لیا۔"

"کوئی صلاح مشورہ تو لے سکتی تھیں آپ سے۔"

"چلو چھوڑو۔ جیسے اس کی خوشی تم کیا نیا مسئلہ لے کر بیٹھ گئی ہو۔"

وہ بہن بھائی کا کوئی نیا تنازعہ کھڑا ہونے کے خدشے سے گھبرا اٹھے۔

"میرے لیے یہ اہم نہیں کہ انہوں نے آپ سے مشورہ کیا تھا یا نہیں۔ مجھے تو اس بات کی تکلیف ہے کہ ہمیں بلایا کیوں نہیں۔ بیٹی کی ماں ہوں۔ اپنی بیٹی کی حق تلفی پہ دل جلے گا یا نہیں؟"

"کیا مطلب؟ وشمہ؟" نوید مراد بری طرح چونکے۔

"ویسے تو حق جتانے کو پھوپھی صاحبہ ہمیشہ آگے آگے ہوتی ہیں میری وشمہ، میری بیٹی، میری جان اور اب بیٹے کا رشتہ طے کرتے ہوئے وہ نظر نہیں آئی۔"

اس بار نوید نہ ٹال سکے نہ جھٹلا سکے ۔۔۔ پرسوچ انداز میں منزہ کے سائیڈ ٹیبل پہ رکھی وشمہ کی تصویر کو تکنے لگے۔

"کیا میری وشمہ کسی سے کم ہے؟ صورت شکل میں؟ تعلیم اور سلیقے میں ۔۔۔ اب انسان غیروں سے کیا گلہ کرے گا جب اپنے ہی طوطا چشم نکل آئیں تو۔"

وہ اب بھی چپ رہے ۔۔۔ شاید دل ہی دل میں وہ بھی گلے شکوے کر رہے تھے۔

"میں تو کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنے والی ۔۔۔ صاف جتا دوں گی پروین سے۔"

"منزہ ذرا ایسا کچھ نہ کرنا۔" نوید مراد جیسے خواب سے ہڑبڑا کے جاگے تھے۔

"دیکھیے آپ جانتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح مجھے عادت نہیں ہے بلاوجہ کی کل کل گھر میں ڈالنے کی۔ میں نے کبھی اماں کے سامنے زبان کھولی نہ کبھی پروین کی کسی زیادتی پہ۔ دو بدو بات کی۔ بتائیے کبھی کیا ایسا؟"

وہ تائید بھری خاموشی کے ساتھ سر جھکا کے رہ گئے۔ واقعی منزہ نے کبھی نوبت نہیں آنے دی تھی۔ پہلے اس کی طبیعت کا صبر اور برداشت اس سے یہ کرواتا رہا۔

بعد میں جب یہی صبر زہر بنا تو وہ اسے موقع کا انتظار کرنے کی تاکید کرتے خاموش رہنے پہ مجبور کرتا رہا۔

وہ اصل وجہ جانے بغیر منزہ کی خاموش رہ کر سہنے کی صلاحیت کے البتہ دل سے معترف تھے اور جیسے اس نے سوہا سے علیحدگی کے بعد لب سیے تھے۔ کبھی پلٹ کے نوید کو اس بات کا طعنہ دینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ کبھی وشمہ کی ذات سے اپنی اس محرومی کا بدلہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس کے بعد تو وہ خود ہی اس کے سامنے شرمسار رہتے تھے۔ ازالے کے طور پہ اس کی ہر بات کی تائید کرنا اور اس کے ہر فیصلے کو جوں کا توں تسلیم کرنا انہوں نے اپنا وتیرہ بنا لیا تھا۔

"لیکن اپنی بات اور تھی۔ اپنے ساتھ ناانصافی میں نے چپ چاپ برداشت کر لی۔ بیٹی کے ساتھ برداشت نہیں کروں گی۔ آپ کو بھلا لگے یا برا ۔۔۔ میں کہہ کے رہوں گی۔"

وہ بھی نوید مراد کی اس کمزوری سے آگاہ ہو چکی تھی اس لیے ببانگ دہل اعلان کر رہی تھی۔

"مگر اس سے فائدہ کیا ہوگا؟" نوید مراد نے کمزوری مزاحمت کی۔ "کیا فائدہ اپنی بیٹی کی ذات کو ہلکا کرنے کا۔"

"ہلکا کیوں کروں گی۔ حق کی بات کروں گی۔"

اس نے طے کر رکھا تھا ۔۔۔ مگر کیا ۔۔۔ یہ وہ ابھی نوید مراد کو بتانے کے موڈ میں نہیں تھی۔

☼ ☼ ☼

"میں نے ساری بات بتائی تھی بھائی جان کو کہ کیسے صرف گھر کے افراد نے بیٹھ کر آپس میں یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر کوئی تقریب کرتے اور آپ کو نہ بلاتے تب آپ کا گلہ جائز تھا بھابھی۔"

پروین نے منزہ کے اکھڑے رویے سے یہی نتیجہ اخذ کیا کہ وہ اس ایمرجنسی میں کی گئی منگنی پہ خفگی جتا رہی ہے۔ رشتے داریوں میں ایسے نخرے ایسے شکوے معمول کی بات تھی۔

"گلہ تو میں تب بھی کرتی۔" منزہ نے بڑے جتاتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"میں سمجھی نہیں بھابھی!"

"آپ ناسمجھ تو ہیں نہیں ۔۔۔ ماشاء اللہ جوان بچوں کی ماں ہیں۔ مجھ سے زیادہ بھرے پرے خاندان میں رہتی ہیں۔ آپ کو تو مجھ سے بھی پہلے اس بات کا خیال آنا چاہیے تھا۔"

"کس بات کا بھابھی؟ کھل کے کہیے۔"

"بیٹی کی ماں ہوں اور کتنا کھل کے بات کروں۔ گھر کے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ میری وشمہ بھی آپ کے سامنے تھی۔ آپ کو اس سے محبت کا دعوا بھی ہے اور یہ تو سب سے اچھا موقع تھا اپنی محبت جتانے کا۔ آپ نے اپنے حسن کے لیے وشمہ کا کیوں نہیں سوچا؟"

بات ایسی تھی کہ پروین کو جواب نہ سوجھ سکا۔ سانپ سونگھ گیا ہو جیسے۔

بات تو غیر متوقع تھی ہی..... مگر وہ یہ کبھی سوچ بھی نہ سکتی تھیں کہ منزہ جیسی معاملہ فہم عورت یہ بات اتنے دو ٹوک انداز میں اور بلا جھجک کہہ دے گی۔ وہ بھی اس موقع پہ جب وہ حسن اور فلک ہما کی باقاعدہ منگنی کا دعوت نامہ دینے وہاں آئی تھیں۔

"پہلا حق اپنوں کا ہوتا ہے۔ مانا کہ فلک ہما بھی غیر نہیں مگر میکے سے بڑھ کے اپنا کون ہوتا ہے۔ اگر آپ کہتیں تو آپ کے سسرال والے کبھی انکار نہ کرتے مگر دکھ تو اس بات کا ہے کہ آپ نے ہی ایسا نہ چاہا۔"

"بھابھی! میں تو دراصل۔" وہ ہمت اور الفاظ دونوں مجتمع کرنے لگیں۔

"اب بھی کیا بگڑا ہے۔ اگر آپ ـــــ"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں۔" پروین یکدم حواسوں میں آئیں "بات طے ہو چکی ہے اور کیا میکہ کیا سسرال میرے لیے سب بچیاں ایک سی ہیں۔ میں بھائی کی بیٹی کی خاطر جیٹھ کی بیٹی کا تماشا نہیں بنا سکتی۔"

"سب کہنے کی باتیں ہیں۔ اصل میں آپ کا اپنا جی نہیں ہوگا۔"

منزہ نے زندگی میں پہلی بار نند سے اتنی رکھائی سے بات کی تھی۔ "کیونکہ آپ نے وشمہ کو کبھی بھائی کی بیٹی جان کے محبت دی ہی نہیں۔ میری وجہ سے اس سے بیر باندھے رکھا۔"

"حد ہو گئی بھابھی! آپ کے میرے کون سے پرانے جھگڑے تھے بھلا جو میں دشمنیاں نکالتی۔"

"یہ تو آپ کو زیادہ پتہ ہوگا..... میں تو اتنا جانتی ہوں کہ میرے اور وشمہ کے درمیان پیار کو نہ کبھی اماں نے کھلے دل سے قبول کیا نہ آپ نے پسند کیا۔"

"آپ پتہ نہیں کون سے پرانے کھاتے کھولے بیٹھی ہیں۔ کبھی ایک مسئلہ چھیڑ کبھی دوسرا گلہ۔" اب کے پروین واقعی برا مان گئیں۔

"چلیں..... پرانی باتیں رہنے دیں۔ انہیں نہیں چھیڑتی میں، لیکن یہ بات تو منوا کے رہوں گی۔ یا تو آپ تسلیم کریں کہ آپ سے وشمہ کے معاملے میں کوتاہی ہوئی اور اس کا ازالہ کیجیے۔ یا پھر آئندہ اس پر کسی قسم کا کوئی حق نہ جتائیں..... کیونکہ خالی خولی پیار سے اس کا کیا بھلا ہونے والا ہے۔"

"بھابھی....." پروین دم بخود رہ گئیں۔

یہ تو وہ شروع سے مانتی تھیں۔ اور شمشاد بیگم بھی بارہا یہی یاد کراتی آئی تھیں کہ منزہ وشمہ کو باقی سب سے دور رکھ کے صرف اور صرف اپنے جوگا رکھنا چاہتی ہے۔ لیکن اب ثابت بھی ہو رہا تھا۔ اور وہ بالکل امید نہیں کر رہی تھیں کہ منزہ ایسے نازک وقت میں ایسا وار کرے گی۔

"ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم ہما کے ہاتھ میں حسن کے نام کی انگوٹھی پہنا آئے ہیں۔ اول تو میں خود ایسا نہیں چاہتی کہ اس طرح بغیر کسی مناسب جواز کے..... ظاہر ہے زبان بھی کوئی چیز ہوتی ہے اور بالفرض میں ایسی کوشش کر بھی لوں تو کون مانے گا میری۔ اس عمر میں شوہر کی نظروں میں بے وقعت ٹھہروں گی اور چلیں ماننے کو یہ بھی مان لیں کہ وہ راضی ہو گئے تب بھی بھائی بھائی کے درمیان دیوار کھڑی ہو جائے گی۔ یہ ناممکن ہے بھابھی! حسن اور وشمہ....."

وہ یکدم جھجک کر چپ ہو گئیں۔

"چلیں..... حسن نہ سہی..... آپ وشمہ کے لیے دل بڑا تو کریں گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔" منزہ نے بڑے عجیب سے انداز میں کہا۔

"یعنی..... یعنی..... حسان۔"

پروین نے چونک کر کہا۔

✿ ✿ ✿
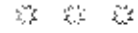
"جعفر محمود۔" اس کے لبوں نے عرصے بعد وہی سرگوشی کی۔

انداز ایسا تھا کہ تقدیس بھی چونک گئی۔

"آپ جانتی ہیں میرے سائز کو؟"

"ہیں؟" وہ سالوں پیچھے چلی گئی۔

"مجھے آج تک کوئی نہیں جان پایا رینا..... سوائے تمہارے تم شاید میری روح کا وہ گمشدہ حصہ ہو جس کے بغیر میں اب تک ادھورا پھر رہا ہوں۔"

جعفر محمود کی بھولی بسری..... مگر ساحر آواز پھر سے سماعتوں میں گونجنے لگی۔

"نہیں میں نہیں جانتی....." اس نے تیزی سے سنبھلتے ہوئے خود کو منجمد کر لیا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔

"میں جان بھی کیسے سکتی ہوں۔" اس کی ہلکی سی بڑبڑاہٹ تقدیس سن نہ سکی۔

"ایکسکیوز می! مجھے کسی ضروری کام سے جانا ہے۔" وہ ساڑھی کا پلو نزاکت سے سمیٹتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"ساڑھی تو جیسے بنی ہی تمہارے لیے ہے۔"

اس کی توصیف کا وہ انداز ـــــ

اس نے آگے جانے کے لیے قدم بڑھائے۔

"اس لباس میں جتنے باوقار انداز میں تم قدم بڑھاتی ہو وہ بس تمہارا ہی خاصہ ہے۔"

عادت کے مطابق رینا نے اضطراری حالت میں انگلیاں بالوں پہ پھیریں۔

"اور تمہاری یہ ادا..... ختم ہے میری جان ختم ہے۔"

اس کے وہ نثار ہو جانے والے اظہار۔

نجانے کہاں کہاں سے تاک تاک کر یادیں حملہ کر رہی تھیں۔

✿ ✿ ✿
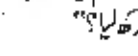
"یہ نیا ڈرائیور ہے مجھے کچھ ٹھیک نہیں لگتا۔"

مدیحہ نے توس پہ مکھن لگاتے ہوئے متفکر لہجے میں کہا اور جعفر محمود کی جانب دیکھا۔ جو سن کر بھی ان سنی کرتا چائے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتا اخبار میں مگن تھا۔

مدیحہ نے بڑی مشکل سے اس کی بے توجہی کو ہضم کیا اور دوبارہ گویا ہوئیں۔

"چھان پھٹک تو کی تھی ناں..... یا ایسے ہی رکھ لیا؟"

اس بار بھی جواب ندارد۔

اب کے وہ برداشت نہ کر پائیں اور ہاتھ میں پکڑی بٹر نائف زور سے ٹیبل پہ پٹخی۔

"میں دیواروں سے باتیں نہیں کر رہی۔"

جعفر نے آخری گھونٹ لے کر کپ میز پر رکھا اور ایک سرد لاتعلق سی نگاہ اس عورت پہ ڈالی جو اس کے بالکل سامنے بیٹھی تھی۔ مگر درمیان میں صدیوں کا فاصلہ تھا۔

"اطلاع کا شکریہ۔" کہہ کر وہ دوبارہ اخبار میں گم ہو گیا۔

"یہ آپ نے نیا کام پکڑ لیا ہے۔" وہ تلملا کے رہ گئیں۔

"پہلے تو مجھ سے اجنبی بنے رہتے تھے اب گھر کے ہر معاملے سے لاتعلقی اختیار کر لی ہے۔"

"میرے پاس اتنا فارغ وقت نہیں ہے مدیحہ! آئندہ میں گھر کے ڈرائیوروں اور ماسیوں کے دکھڑے سنوں۔"

"گھر کے ڈرائیور ہوں یا ماسی یا جمعدار ہیں تو گھر سے وابستہ معاملات۔ جبکہ یہ جو اخبار چاٹ رہے ہیں آپ گھنٹہ بھر سے یہ کون سے سگوں کی خبریں دے رہے ہیں آپ کو۔"

وہ تند و تیز لہجے میں بولیں تو حسب توقع جعفر محمود کا پارہ ہائی ہو گیا۔ اس نے اخبار گول مول کر کے ایک جانب پھینکا..... ایک جھٹکے سے اٹھا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے کرسی پرے کی۔

"بس۔۔۔ بس ہو گیا جہالت کا مظاہرہ۔۔۔ تمہاری زبان اور تمہاری حرکتیں دونوں اب ناقابل برداشت ہوتے جا رہے ہیں بدیجہ!"

"اور آپ نے کبھی اپنی حرکتوں پہ غور فرمایا ہے؟" وہ کون سا دبنے والی تھیں۔

"یا بھول گئے ہیں ماضی۔۔۔ میں یاد دلا دوں؟"

اب کے گویا انھوں نے جعفری کی دم پہ پاؤں رکھ دیا۔

"یا۔۔۔ احمق عورت تم نے میرا ماضی 'ماضی' بننے ہی کب دیا ہے۔ زخموں پہ کھرنڈ آنے سے پہلے انہیں کھرچ کر تازہ کرنا تمہاری عادت ہے۔"

اس نے ہاتھ سے ٹیبل پہ رکھے کپ کو ٹھوکر رسید کی۔۔۔ کپ دور تک گلاس ٹاپ پہ لڑھکتا چائے کے چھینٹے اڑاتا چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

واپسی کے سارے رستے وہ گم صم رہیں۔۔۔ حسان نے ایک دوبار پوچھا بھی۔ اس بار وہ ماں کے ساتھ آیا تھا ماموں کے گھر ورنہ اس سے پہلے حسن یہ ذمے داری جی جان سے نبھایا کرتا تھا۔ مگر آج اس نے صاف انکار کر دیا۔

"میرے پاس وقت نہیں ہے امی۔۔۔ پلیز آپ کسی اور کے ساتھ۔۔۔ بلکہ میں تو کہتا ہوں جانا اتنا ضروری بھی نہیں ہے۔"

کچھ خیال آنے پر اس نے جھجکتے ہوئے کہا تھا جس پہ پروین انتہا پر امان گئی تھیں۔

"میرے میکے میں اور ہے کون۔۔۔ اور تم کہہ رہے ہو جانے کی ضرورت کیا ہے؟ ویسے بھی مجھے لگ رہا ہے تمہارے ماموں اور ممانی کو اچھا نہیں لگا چپ چاپ تمہاری منگنی کر دینا۔"

"صرف انہیں نہیں کسی اور کے دل پہ بھی بڑی بری گزری ہو گی۔"

وشمہ کا خیال کر کے وہ سوچ کر رہ گیا۔ کہہ نہ سکا۔

"تم فارغ نہیں ہو تو میں حسان کو لے جاتی ہوں۔ وصی تو کہہ کر گیا ہے دیر سے آئے گا کسی دوست کے ساتھ جانا تھا اسے دفتر سے واپسی پہ۔"

اور یوں وہ حسان کے ساتھ چلی آئیں۔

پروین کا اندازہ درست تھا۔ حسن کی منگنی اور بغیر مشورے اور پیشگی اطلاع کے منگنی کا گلہ بھی تھا انہیں۔ مگر مزید ناراضی جتائی گئی وہ ان کے وہم و گمان سے آگے کی چیز تھی۔

"ایسا کیا کہہ دیا ہے مامی جی نے جو آپ گم صم ہو گئی ہیں۔" پروین کے ہوش ایسے اڑے ہوئے تھے کہ حسان جیسا لاابالی لڑکا بھی نوٹ کیے بغیر نہ رہ سکا۔

"ہاں کہا تو ہے کچھ۔" وہ حسان کو دیکھ کے رہ گئیں۔

"کیسے بتاؤں اسے ساری تفصیل۔۔۔"

"چلیں حسن نہ سہی آپ وشمہ کے لیے دل بڑا تو کریں۔ گنجائش نکالی جا سکتی ہے۔"

شہرہ کے عجیب سے انداز پہ وہ چونک گئی تھیں۔ پھر مطلب واضح ہونے پہ بڑی مطمئن سی سانس خارج کرتے ہوئے بولیں۔

"یعنی۔۔۔ یعنی حسان۔"

یہ مسئلہ اتنی جلدی اور اتنی آسانی سے حل ہو جائے گا اس کا تو پروین کو اندازہ بھی نہیں تھا۔ وہ تو یہ سمجھ رہی تھیں کہ یہ کیسا کڑا وقت آن پڑا ہے۔ بھائی سے رشتہ بھی خطرے میں پڑ رہا تھا دوسری جانب سسرال میں پوزیشن ڈگمگا جاتی۔۔۔ لیکن اب شہرہ نے خود گنجائش نکال کر انہیں ہلکا پھلکا کر دیا۔

"ہاں۔۔۔ واقعی حسن نہ سہی حسان ہی سہی اگر اس صورت وشمہ میرے نزدیک آتی ہے اور بھائی بھابی کا دل صاف ہوتا ہے تو اس سے اچھی بات کیا ہے۔"

رضامند ہو گئیں۔۔۔ مگر اگلے ہی پل شہرہ کی بات نے انھیں ایک اور جھٹکا دیا۔

بے شدید جھٹکا۔

"عجیب سی بات کہہ دی آپ نے حسن کہاں حسان کہاں 'بات کرنے سے پہلے سوچتیں تو آپ؟"

پروین کی بات کو دھچکا لگا۔

"حسن بھی میرا بیٹا ہے اور حسان بھی۔ میرے نزدیک دونوں میں کوئی فرق نہیں۔"

لہجے کی تلخی نے شہرہ کو ذرا دھیما پڑنے پہ مجبور کیا۔

"اگر آپ کو برا لگا ہو تو معذرت چاہتی ہوں۔ میرا مقصد آپ کا دل دکھانا نہیں تھا۔ میں صرف یہ بتانا چاہ رہی تھی بے شک دونوں بھائی ہیں مگر دونوں میں فرق تو ہے۔ ممتا کی پٹی اتار کے دیکھیں تو آپ کو بھی یہ فرق محسوس ہو گا۔ تعلیم، ذہانت، شکل و صورت، پرسنالٹی، عادات۔۔۔ ہر لحاظ سے یہ فرق موجود ہے۔ معاف کیجئے گا مگر وشمہ کے ساتھ حسان کا جوڑ بالکل بھی مناسب نہیں ہے۔"

"تو پھر کیا چاہتی ہیں آپ؟" پروین کا لہجہ خود بخود روکھا سا ہو گیا۔

"وصی۔"

شہرہ نے بے دھڑک اس کا نام سامنے رکھ دیا تھا۔

□□□□
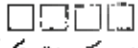
"وصی۔۔۔ یار ایک بات تو بتاؤ۔" سوہا نے اس کے ساتھ واک کرتے ہوئے پوچھا۔

جواب میں وہ بے ہنگم طریقے سے ہنسنے لگا۔

"اب تمہیں کیا ہوا ہے؟ میں نے کوئی لطیفہ سنایا ہے؟"

سوہا نے چند لمحے اس کی ہنسی رکنے کا انتظار کیا پھر جھنجھلاتے ہوئے بولی۔

"یار۔۔۔ واہ۔" وہ بمشکل ہنسی روک پایا۔

"اگر میری نانی اماں نے۔۔۔ یعنی میری سویٹ نانو نے تمہیں اتنی بے تکلفی کے ساتھ مجھے یار پکارتے سنا تو پتہ ہے میرا کیا حال ہو گا۔"

"تمہاری فیملی کیا بہت بیک ورڈ ہے؟"

"بالکل نہیں۔" وہ اپنی فیملی کے خلاف کبھی ایک لفظ تک نہیں سن پاتا تھا۔ "تمہیں کس نے کہا۔۔۔ ہاں مگر روایتیں انھیں جان سے زیادہ عزیز ہیں اور ہونی بھی چاہئیں۔ نانو کہتی ہیں جڑ کے بغیر کوئی پودا ہرا بھرا نہیں رہتا۔"

"تو کیا ایسی ہی اقدار بس تمہاری فیملی کی بھی ہیں۔"

"تو تمہاری بھی فرینڈز؟"

"ہاں اگرچہ میں اس کی فیملی سے کبھی ملی نہیں مگر وہ جو کچھ بتاتی ہے اس سے ایسا ہی لگتا ہے۔" پھر کچھ سوچ کر فکر مند ہو گئی۔ "اس نے بھی مجھے کہا ہی نہیں اپنی فیملی سے ملوانے کے لیے جیسے تم نے بھی نہیں کہا۔"

وہ اس کی بات ان سنی کرتے چلتا رہا۔

سوہا نے اس کا گلہ کیا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

"کیا میں اتنی بری ہوں وصی کہ۔۔۔"

"فضول۔" وصی نے مزید اسے کچھ کہنے سے روک دیا۔ "فضول سوچیں ہیں تمہاری۔"

"سچ کہہ رہی ہوں۔۔۔"

ندیم و نجم خانہ کے لان میں واک کر رہے تھے۔۔۔ نزدیک ہی سوہا کے کچھ اور دوست گروپ کی شکل میں کھڑے گپ شپ میں مصروف تھے۔ وصی سوہا کے اصرار پہ آ تو گیا تھا مگر اس کے فرینڈز کے ساتھ اس کی جم نہیں رہی تھی۔ سوہا۔۔۔ اس کی بیزاری محسوس کرتے ہوئے اسے چپکے سے لے کر نسبتاً الگ گوشے میں آ گئی۔

"بہت بولنے لگی ہو آج کل؟"
"صحبت کا اثر ہے۔" وہ مسکرائی۔
"کس کی؟۔۔۔ میری صحبت کا یا تمہاری نئی فرینڈ کی صحبت کا؟"
"میں نوٹ کر رہی ہوں تم بہانے بہانے سے اس کا ذکر لے بیٹھتے ہو چکر کیا ہے؟"
"پھر سے وہی فضول سوچیں۔"
"اتنی فضول ہوں میں تو دوستی کس لیے کی ہے۔" حسب عادت وہ پل میں بھڑک گئی۔
"یہ تو میں بھی نہیں جانتا۔" اور یہ تو وہ بھی سچ کہہ رہا تھا۔
کسی بھی لڑکی سے دوستی کرنے کا یہ اس کا پہلا تجربہ تھا اور وہ بھی اتنا عجیب و غریب۔
ان کے ہاں یہ بات خاصی معیوب سمجھی جاتی تھی۔ وہ اور ندا یونیورسٹی میں کوایجوکیشن میں پڑھتے رہے تھے لیکن کبھی ندا نے کسی لڑکے کو یا اس نے کسی لڑکی کو دوست بنانے کی ہمت نہیں کی۔ اپنے گھر کے احول سے واقف جو تھے۔ حتیٰ کہ گھر میں کزنز کے درمیان بھی بے تکلفی ایک حد کے اندر ہی تھی۔
وہ سب سے زیادہ ندا سے قریب تھا۔ لیکن اس کی وجہ ان کے درمیان موجود عمر کا فرق تھا۔ ندا اسے بچپن میں گودوں کھلاتی رہی تھی۔ باقی سب کے ساتھ بات چیت ہنسی مذاق چلتا رہتا مگر ایک دائرے میں رہ کے۔
اور اب اس کی سوہا کے ساتھ دن بدن بڑھتی دوستی۔۔۔ جو اس کے گھر والوں کے علم میں آتی تو ہنگامہ تو یقینی تھا۔۔۔۔۔ مزے کی بات یہ کہ وہ اکیلے میں اس کے بارے میں سوچ کر خود بھی حیران رہ جاتا۔
بھلا۔۔۔۔ وہ اور سوہا؟"
کوئی ایک بھی قدر مشترک نہ تھی دونوں کے مزاج اور شخصیت میں۔
ایک شعلہ ایک شبنم
ایک پارہ ایک سبک خرام ندی۔۔۔۔۔
اکیلے میں کئی بار اس نے اس دوستی کی وجہ تلاشنی چاہی۔
کیا وہ فطری کشش جو صنف نازک کی جانب کھینچتی ہے؟
"نہیں۔۔۔" اس نے سختی سے تردید کر دی۔
سوہا کی جانب اس کا جھکاؤ ضرور تھا مگر ان معنوں میں نہیں۔۔۔ وہ کسک وہ تڑپ جو ایسی کشش میں محسوس ہوتی ہے وہ بھی محسوس نہ ہوئی تھی اسے۔
"تو کیا ہمدردی؟"
ہاں اس سوال پہ وہ کچھ تذبذب میں پڑ جاتا۔
اس نے پہلی بار اپنے دل کا ایک گوشہ سوہا کے لیے تب نرم پڑتا محسوس کیا تھا جب اس کی آنکھوں کے گوشے نم دیکھے تھے۔ تب اس کے دل سے سوہا کے بارے میں وہ سارا تاثر جیسے دھل سا گیا تھا جو اس سے پہلی بار مل کر قائم ہوا تھا۔
"میں جانتی ہوں تم اور اقدار مجھے کچھ خاص پسند نہیں کرتے۔"
سوہا مسلسل اس کی مہربانیوں اور التفات کا پوسٹ مارٹم کرنے میں مصروف تھی۔
"نہ مجھے نہ میری عادتوں کو لیکن مجبور ہو۔"
"ہاں۔۔۔۔ مجبور ہیں ہم۔ کس پوائنٹ پہ رکھا ہوا ہے کسی نے ہمیں۔" وہ ہنستا گیا۔ "ہم اس مرحلے کی رسے بتہ رہو گر خیریت مطلوب ہے۔"
"کس پوائنٹ پہ نہ سہی۔۔۔ مگر خدا ترسی کے جذبے کے آگے ضرور مجبور ہو۔۔۔ ہاں ہم بھی یہ سمجھتی ہوں بے چاری سی لڑکی جس کا دماغ سب پھر تا ہے تو اپنے آپ کو واقت بچکانے اور مجھوڑنے تک سے ریہ

سال کی عمر تک تین بار خودکشی کی کوشش کر چکی ہے اور جس سے کالج کی ساری لڑکیاں بدکتی ہیں۔ جو مروتاً کام نہیں لیتی اور جسے ایک اچھی لڑکی کہلانے کا رتی بھر شوق نہیں ہے چلو اس سے دوستی کر کے محبت کچھ نرمی سے ہینڈل کیا جائے۔ کچھ سدھارنے کی تدبیریں اختیار کی جائیں۔"
"آپ سوہا۔۔۔ بند کرو اپنا ماہرانہ تجزیہ۔" وہ سچ مچ ناراض ہو کر پلٹ گیا۔
جانے تیز تیز قدموں کے ساتھ خود سے دور ہوتے وصی کو دیکھا اور ایک اذیت پسند سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آ گئی۔ یہی تو مشغلہ تھا اس کا۔
پاس آنے والوں کو دور کرنا اور اس دور جانے کے کرب کو محسوس کرنا۔
اپنائیت جتانے والوں کو خفا کرنا اور پھر اس خفگی کے دکھ کی ٹیس کو لطف لے لے کر جھیلنا۔

☐ ☐ ☐ ☐

"تمہیں اتنی بڑی بات منہ سے نہیں نکالنی چاہیے تھی۔" نوید مراد نے ساری تفصیل جان کے ذرا الجھتے ہوئے کہا تھا۔
"کیا ضرورت ہے اپنی بیٹی کو خود دوسروں کے سامنے۔۔۔"
وہ سر جھٹک کر اس ناگواری کو کم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔
"کون دوسرا؟۔۔۔ بہن ہے وہ آپ کی وشمہ کی سگی پھوپھی۔۔۔ دوسروں میں کب سے شمار ہونے لگا ان کا۔" اور ذرا نیولہ لیجے کے سے انداز میں جتایا۔
"کل تک تو وہ مجھ سے زیادہ اپنی تھی وشمہ کی۔"
"اگر وصی تو۔۔۔ دیکھو جہاں تک پروین کے اپنے بیٹوں کی بات تھی پھر بھی قابل قبول تھا میں حق سے نام لے کر کسی کا بھی لیکن وصی کا نام ہمارے لیے خود سے لینا مناسب نہیں تھا منزہ! وہ پروین کا نہیں اس کی نند کا بیٹا ہے ایک غیر خاندان کا لڑکا۔"
"شادیاں غیروں میں بھی ہوتی ہیں۔۔۔ پرائے خاندانوں میں بھی رشتے جڑتے ہیں یا نہیں؟ جیسے آپ کا اور میرا، پروین کا اور بھائی صاحب کا۔"
"ایسے رشتے خود طلب کیے جاتے ہیں۔۔۔ چاہ کے ساتھ۔۔۔ زبردستی اپنی بیٹیاں اوروں کے سر نہیں تھوپی جاتیں۔"
"میں نے بھی ایسا بالکل نہیں کیا۔ کیا آپ مجھے اتنا ناسمجھ سمجھتے ہیں افسوس ہے۔" اس کے ناراض ناراض انداز پہ نوید ہنسے پڑے۔
"خیر یہ تو میں جانتا ہوں تم کتنی معاملہ فہم اور سمجھدار ہو۔ اسی لیے تو زیادہ حیران ہو رہا ہوں کہ آخر کیا سوچ کر تم نے۔۔۔"
"میرا ایسا کہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ہوتا بھی تو ظاہر ہے میں ایسے بے دھڑک ہو کر کیسے یہ بات کہہ سکتی تھی۔ جب پروین نے حسن کے بجائے حسان کا نام لیا تو میں نے سوچا یہ اچھا موقع ہے۔۔۔ وہ خود طلب گار ہو رہی ہے تو کیوں نہ میں حسان سے بہتر انتخاب کروں اپنی بچی کے لیے۔"
"بھئی حسان سے بہتر انتخاب کیسے ہو سکتا ہے؟ حسان میرا اپنا خون ہے۔"
منزہ جو اپنے ہاتھ سے بنی کھیر نوید مراد کو بڑے فخر سے کھلانے اور داد وصول کرنے آ رہی تھی اگلی بات سن کر ... پر ... کرنے کے لیے اٹھا اس کا ہاتھ اٹھا ہی رہ گیا۔
"وشمہ کے لیے حسان سے بہتر کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے؟"
... کے اس بار کڑی وشمہ کا دل جیسے پاتال میں گرتا چلا جا رہا تھا۔
"بھئی وصی اور حسان کا مقابلہ کیسے کر سکتے ہیں؟ وہ ہر لحاظ سے حسان سے کمتر ہے۔"

"وصی ..." وشمہ نے یہ نام سنا اور پاتال سے ابھرنے کے لیے اس کا دل ہاتھ پیر مارنے لگا۔

"صرف اپنا خون ہونے سے آپ اسے فوقیت نہیں دے سکتے۔ سوال بچی کے مستقبل کا ہے اور وصی ہر لحاظ سے وشمہ کے قابل ہے۔"

وشمہ کا دل آہستہ آہستہ گہرائیوں سے اوپر ابھرنے لگا۔

"حسان کے پاس کون سا پلس پوائنٹ ہے سوائے اس کے کہ وہ پروین کا سگا بیٹا ہے۔ یہ مت بھولیں کہ وشمہ آپ کی بیٹی ہے۔ آپ نے اس کی خوشی دیکھنی ہے۔ حسان کی نہ ظاہری شخصیت متاثر کن ہے کہ ہماری پیاری بیٹی کے ساتھ جوڑ بیٹھے۔ نہ ہی تعلیم اور مزاج کے لحاظ سے وصی سے پاسنگ ہے۔ چلو مردوں کی جیب دیکھی جاتی ہے شکل نہیں' اس مقولے پہ عمل کرتے ہوئے اس کے بھاری بھرکم وجود اور واجبی سی صورت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو دوسری سب باتیں؟ آپ کو پتہ بھی ہے کہ وہ کتنے سالوں سے بی اے کرنے میں ناکام ہے؟"

"تو تعلیم تو حسین کی بھی خاص نہیں ... اس کے لیے تمہیں اعتراض نہیں تھا؟"

"اس کے تعلیم حاصل نہ کرنے کی وجہ حالات تھے' اس کی ذمہ داریاں تھیں' اس کی نالائقی نہیں تھی۔ جبکہ حسان ... وہ ماشاء اللہ سے کتنی عقل والا ہے یہ اس کے بچپن سے ہی سب پہ واضح ہے۔ ذرا سا بھی احساس ذمہ داری نہیں ہے۔ نہ کسی سے بات کرنے کا سلیقہ ... جبکہ حسن ... اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا ہے کہ اس نے تعلیم کے دوران تعلیم کو خیر باد کہہ دیا تھا اور پھر اعلیٰ ڈگریاں نہ سہی' قابلیت تو ہے اس کے پاس جو باپ کا کاروبار سنبھالے ہوئے ہے۔ اس کے مقابلے پہ پروین کو حسان کا نام لیتے ہوئے خود سوچنا چاہیے تھا ... جو خود کسی قابل نہیں وہ ہماری بیٹی کی ذمہ داری کیا لے گا جبکہ وصی ... تعلیم' ذہانت' شخصیت' مزاج' ہر لحاظ سے وشمہ کے ہم پلہ ہے۔"

وشمہ کو منزہ پہ ٹوٹ کے پیار آ رہا تھا۔

"یہ ہوتا ہے ماں کا دل ... اولاد کی چاہ اس کی طلب بن جائے جان لی۔"

وہ چپ چاپ پلٹ گئی۔ اسے نوید مراد کا جواب سننے کی بھی خواہش نہیں رہی تھی۔ کیونکہ منزہ کے تیور ایسے تھے کہ اسے یقین تھا وہ اپنے دلائل سے یہ بات ان سے منوا کے ہی رہیں گی۔

☼ ☼ ☼

پروین کے دل کو پنکھے لگے ہوئے تھے۔

بات ایسی تھی کہ کسی سے کہی بھی نہ جا سکے ... اور کہے بغیر بھی وہ رہ نہیں سکتی تھیں۔ ان کے دل میں وشمہ کے لیے فطری محبت تھی' اس پہ حرف آ رہا تھا۔ میکے کا آخری رشتہ واحد ناتا خطرے میں تھا۔ ویسے تو وشمہ ہر لحاظ سے ایک مثالی لڑکی تھی۔ شاید یہی معاملوں میں شکل بنا پر بھی برتری حاصل تھی اسے۔ شکل و صورت کے لحاظ سے بھی اس سے کئی گنا بڑھ کے تھی۔

عمر بھی نسبتاً کم تھی۔

اور پھر وہ ان کے بھائی کی اکلوتی بیٹی تھی ... بھائی بھی حیثیت میں ہم پلہ تھا جبکہ بھائی ... دارومدار اکلوتے بیٹے کی کمائی پہ رہ گیا تھا۔ اس پہ تین تین بیٹیوں کی ذمہ داری۔

"کاش بھائی نے پہلے منہ سے بھاپ نکالی ہوتی۔ اماں جان کے ہما کے لیے کہتے سے بھی پہلے ... اور میں بھی کیسی بے وقوف ہوں۔ جوان بیٹیوں کی ماں ہو کر بھی میرا دھیان کیوں نہیں جاتا ان باتوں کی جانب ... بھی اماں جان نے توجہ دلائی اور اب وشمہ کے لیے بھائی ..."

وہ خاصی خود غرض بن کے سوچ رہی تھیں۔

"وصی کے بارے میں کوئی فیصلہ بھی کیسے کر سکتی ہوں۔ بے شک میں نے پالا پوسا ہے' ماں مانتا ہے ... لیکن میں یہ فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتی۔"

... نے خود کو بے بس سا محسوس کیا اور دوپٹہ منہ پہ ڈال کے لیٹ گئیں ... جب کچھ نہ سوجھ رہا ہو تو حالات کا ... واحد حل ہوتا تھا ان کے پاس۔

"... ہے پروین ... اماں جان کی آواز نہیں سنائی دے رہی کیا؟"

... سے نکلتے سراج دین نے کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ اتنے سالوں بعد بھی وہ ان کی معمولی سی ... کو چاہتے تھے بلکہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے ان کی کمزوریاں اور کوتاہیاں تلاش کیا کرتے تھے۔

"... جا رہی ہوں۔"

... سے انداز میں کہتے ہوئے انہوں نے پیر نیچے کیے۔ اتنے میں شوکت جہاں خود اندر آ گئیں۔

"... ہے اماں جان؟"

... نے پیر پھر واپس رکھا اور لپک کر ماں کا ہاتھ تھام کر انہیں چیئر تک لانے لگے۔

"... پروین کو دیکھنے آئی تھی۔"

... انہوں نے غور سے پروین کو دیکھا جو معمول سے ہٹ کر خاموش اور بے چین سی تو انہیں پہلے بھی لگی ... انہوں نے دھیان نہیں دیا۔ اب غور کیا تو خاصی مضمحل بھی محسوس ہوئیں۔

"... کام تھا اماں جان! تو میں آ رہی تھی۔ آپ نے کیوں تکلیف کی؟"

... نے معمول کے لہجے میں کہنے کی پوری کوشش کی تھی مگر لہجے سے تھکن عیاں ہو رہی تھی۔

"... ہاں تھا تمہاری طبیعت خراب ہے؟ اچھی بھلی تو گئی تھیں بھائی کے ہاں؟"

"... بس ویسے ہی۔" وہ کوئی مناسب جواب ڈھونڈنے لگیں کہ سراج دین کے استہزائیہ تبصرے نے ان کی ... ختم کر دی۔

"... بھلی تو یہ ہمیشہ ہی وہاں جاتی ہیں' واپس آنے کے بعد البتہ اچھی بھلی نہیں رہتیں۔ اوروں کی بیٹیاں ... سے دکھ سمیٹ کر میکے لے جاتی ہیں' دل ہلکا کر کے ہشاش بشاش دامن میں خوشیاں سمیٹ کر لے آتی ہیں۔ ... الٹا رواج ہے' خوش باش جانے والی بیٹیاں میکے کے دکھ پوٹلی باندھ کے ساتھ لے آتی ہیں۔"

... کے گھورنے کی پروا نہ کرتے ہوئے وہ مسلسل بولتے رہے۔

"... اب تازہ ترین فکر کون سی سمیٹ لائی ہو۔ اماں تو تمہاری رہیں نہیں جو ہر بار میکے سے واپسی پہ سوغات ... کوئی فکر کوئی نہ کوئی پریشانی تمہارے ساتھ کر دیتی تھیں۔"

"... اور بھی کوئی نہ رہے ... تب خوشی ملے گی آپ کو جب میرا میکہ ہوگا ہی نہیں۔" وہ تو پھٹ ہی پڑیں۔

"... سراج ..." شوکت جہاں بھی دم بخود رہ گئیں۔ اس طرح ضبط کھونا پروین کا شیوہ کبھی نہیں رہا تھا۔

"... کر رہی ہو؟"

... کی پیشانی شکنوں سے پر ہو گئی اس جسارت پہ۔

"... جھوٹ کیا ہے۔ ہمیشہ میرے میکے والے آپ کو اسی طرح کھٹکتے رہے جیسے آپ مجھے خانہ بدوشوں ... سے بیاہ کر لائے ہوں۔" ان کی آواز مارے طیش کے کپکپا رہی تھی۔

"... زبان! آپ کی شہہ پا کے یہ اتنی زبان دراز ہو رہی ہے۔ اگر مزید ایک لفظ اس نے نکالا منہ سے تو میں ... گا میرے ہاتھ کا۔"

"... خاموش۔" شوکت جہاں نے ہاتھ اٹھاتے ہوئے سختی سے کہا۔

"... بیٹا بیٹے کی تیاری ہے اور اپنا یہ حال ہے کہ تم دونوں کا کہ نئے نویلے میاں بیوی کی طرح لڑ رہے ... ایک دوسرے کو جاننے کے عمل سے گزر رہے ہو۔ بہو آئے گی تو کیا اس کے سامنے بھی یہی تماشے ... اثر لے گی وہ اس سب سے۔"

"... فکر تو ہے نہیں۔ سب جانتی ہے یہی دیکھتی آئی ہے۔" سراج دین نے ڈھٹائی کا مظاہرہ کیا جس پہ

کوئی برسوں پرانا عہد توڑ کے بیٹے کی نسبت کہیں اور کر دی ہو۔ ہماری وشمہ میں ماشاءاللہ کس چیز کی کمی ہے اس سے بھی اچھے رشتے ملیں گے۔ ابھی اس کی عمر ہی کیا ہے۔"

"مل سکتے ہیں اس سے بھی اچھے رشتے۔ لیکن کیا کروں۔۔۔ لاڈوں سے پالی بیٹی ہے میری پرائے گھر بھیجتے ڈر لگتا ہے۔ سوچا تھا آپ پھوپھی ہیں' چاہ سے لے کر جائیں گی پیار سے رکھیں گی لیکن۔" انہوں نے ایک آہ بھری۔

"خون سفید ہو جائے تو کیا کیا جا سکتا ہے۔"

"خدا کے لیے بھائی طعنے تو نہ دیں۔ جو بات میرے اختیار میں نہیں ہے میں کیسے کر سکتی ہوں آپ سمجھ کیوں نہیں رہیں سسرال کا معاملہ ہے میری ایک نہیں چلتی۔ وشمہ مجھے لاکھ عزیز سہی مگر جیٹھ کی بیٹی رد کر کے بھائی کی بیٹی کا نام لوں گی تو ہر جانب سے انگلیاں ہی اٹھیں گی۔"

اور منزہ کو سالوں سے تپتے سلگتے سینے میں ایک ٹھنڈی لہر اترتی محسوس ہوئی۔

"اب پتا چلا پروین بیگم۔۔۔ سسرال کے آگے دم نہ مارنے کی بے بسی کیسی ہوتی ہے۔ دل کچھ چاہتا ہے مصلحتیں کچھ اور کرنے پہ مجبور کر رہی ہوتی ہیں۔۔۔ یہ کیفیت تم پہ اب صادق آئی ہے' میں کب سے اسی کرب سے گزر چکی ہوں۔"

اس نے سفاکی سے سوچا اور کن اکھیوں سے وشمہ کو دیکھا جو بظاہر کتابوں کی جانب متوجہ تھی مگر اس کی ساکت نظریں اور کھویا کھویا انداز اس کی اندرونی کیفیت کی چغلی کھا رہا تھا۔

"کوشش کرنا چاہیں تو ہو بھی سکتا ہے۔ آپ نے دل سے ایسا چاہا تو ہوتا۔"

یہ کہتے ہوئے اس نے وشمہ کے تاثرات جانچے وہاں ایک شکوہ سا رقم نظر آیا۔ جو بجا طور پہ پروین کے لیے تھا۔ وہ اور بھی مطمئن ہو گئی۔

"میں ایک کوشش اور کروں گی۔۔۔ مگر وعدہ نہیں کر سکتی خدا کے لیے مجھے مجبور نہ کریں بھائی!"

"مجبور تو میں ہوں پروین۔"

وشمہ کو اٹھ کر اندر جاتے دیکھ کر منزہ نے دل گرفتگی سے کہا۔

"میں کہنا تو نہیں چاہتی تھی۔۔۔ بچی کا پردہ ماں نہیں رکھے گی تو اور کون۔۔۔ پھر سوچا میں ماں ہوں تو آپ بھی شاید آپ بھی اس مجبوری کو محسوس کر سکیں۔"

"صاف صاف کہیں بھابی!"

پروین نے ایک سیکنڈ میں سینکڑوں اندیشے پال لیے۔

"اگر میں یہ کہوں کہ آپ پہ وصی کے لیے دباؤ میں وشمہ کے دباؤ میں آ کے ڈال رہی ہوں تو کیا اب بھی آپ خود کو بے اختیار پائیں گی؟"

منزہ کے سوال نے پروین کو گنگ کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"کسی دن تقدیس سے ملنے اس کے گھر بھی جاؤ ناں۔"

حسب معمول وہ کالج سے واپسی پہ لنچ کرتے ہوئے اپنے دن بھر کا معمول اور تازہ ترین واقعات سنا رہی تھی۔ پچھلے چند دنوں سے اس معمول کی گفتگو میں تقدیس کا ذکر لازمی ہوتا تھا۔ ربا کی عادت تھی کہ سوہا چاہے گھنٹوں بولتی رہتی۔ وہ باقی سارے کام پس پشت ڈال کے بیٹھی سنتی رہتی۔ پوری توجہ کے ساتھ۔ ایک لطف اندوز ہونے والی مسکراہٹ اس دوران اس کے ہونٹوں پہ رہتی۔ شاذ و نادر ہی ایسا ہوتا تھا کہ اس نے سوہا کو ٹوک کر درمیان میں کچھ کہا ہو۔ لیکن آج جب غیر متوقع طور پر اس نے چونک کے یہ مشورہ دیا تو سوہا لمحہ بھر کو چپ سی ہو گئی۔

"مگر۔۔۔؟"

بے جا ہی۔۔۔ تقدیس نے کبھی اس قسم کی دعوت ہی نہیں دی تھی۔ اگرچہ وہ سوہا کو اندر تک جان چکی تھی کہ وہ بے ضرر لڑکی ہے' صرف اس کی ظاہری شخصیت اور کچھ عادتیں ضرور خراب تاثر چھوڑتی ہیں مگر وہ کردار کی۔۔۔ فطرت کی۔ اب تو وہ رفتہ رفتہ اس کی بہت سی عادتیں نامحسوس طریقے سے چھڑوا بھی چکی تھی۔

…تک کی۔۔۔

…بیٹھنے کی۔۔۔

اور اس کی ڈریسنگ بھی بہت حد تک مناسب ہو گئی تھی لیکن اب بھی وہ اخلاقیات کے اس معیار پہ پوری نہیں تھی' جو اس کے گھرانے میں قائم تھا اور اسی لیے وہ اسے اپنے گھر لے جانے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتی تھی۔ مدیحہ نے تو اس کی سلیولیس شرٹ' کمر تک ادھڑی چاک دیکھ کے تقدیس سے وہ لتے لیے تھے کہ بس۔

"…دوسرے کے گھر آنے جانے سے۔۔۔ فیملیز سے انٹروڈیوس ہونے سے دوستی اور گہری ہوتی ہے۔"

…کے چہرے پہ تذبذب دیکھ کر ربا نے وضاحت کی۔

"…نام کس کے پاس ہے ماما؟" اس نے لاپروائی اختیار کرتے ہوئے بات ٹالنا چاہی۔

"…نا ہو سویٹ ہارٹ۔"

…الجھن بھری نظروں سے ربا کو دیکھا۔ وہ ایسی ماؤں میں سے نہیں تھی جو بیٹی کی "پرسنل لائف" میں جھانکیں۔

"…تم اس کے گھر جاؤ۔ کبھی اسے اپنے گھر بلاؤ مجھے اچھی لگی ہے وہ لڑکی۔ پرخلوص سی۔ میرا دل چاہ رہا ہے …دونوں کی دوستی اور بھی مضبوط ہو۔ تمہیں کسی اچھی دوست کی بہت ضرورت ہے سوہا! بالکل تقدیس جیسی۔"

"…ان انوائٹ کر لیتے ہیں اس کی فیملی کو۔"

…آئیڈیے پہ وہ فوراً انکار میں سر ہلانے لگی۔

"…ابھی نہیں۔ میرا مطلب ہے فیملی کو نہیں۔ ابھی صرف تقدیس سے اپنا رشتہ مضبوط کرو۔"

"…آپ کیسی الجھی الجھی باتیں کر رہی ہیں۔"

"تمہاری ماما کی تو ساری زندگی الجھی ہوئی ہے میری جان۔ اب جا کے ایک سرا ہاتھ آیا تھا۔۔۔ شاید کوئی …تھی میں سلجھا ہی لوں تمہاری مدد سے۔" وہ سوچ کے رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

…کی آنکھ رات دیر سے لگی تھی۔ لہٰذا صبح کالج بھی نہ جا سکی۔ منزہ نے تکیے پہ پھیلے اس کے ریشمی بال پیار سے سہلاتے ہوئے اسے جگانا چاہا۔

"…اٹھو بیٹا! بارہ بج رہے ہیں۔" پہلی آواز پہ وہ ہلکا سا کسمسائی مگر بارہ بجنے کا سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔

"…بج گئے؟ اتنی دیر؟ مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" وہ جلدی جلدی سلیپر پہنتے اور بال سمیٹنے لگی۔

"…پہلے دونوں پیریڈ مس ہو گئے۔ اب بھی اگر ساڑھے دس تک پہنچ گئی تو شاید تیسرا۔۔۔"

"…اب بس۔" منزہ نے پیار سے اسے منع کر دیا۔ "تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ آرام کرو۔" اس نے …کی متورم آنکھوں اور ان میں نظر آتے سرخ ڈوروں کو دیکھ کر کہا۔

…نظریں چرا گئی۔ "میں ٹھیک ہوں ماما۔" بات بدلی۔ "آپ نے مجھے جگایا کیوں نہیں؟"

"…جانتی ہوں تم رات دیر سے سوئی تھیں۔"

…وشمہ کو جانچتی ہوئی نظروں سے دیکھ کر کہا۔

"…آج ٹیسٹ تھا نا۔ تو تیاری۔" وہ ماں کی ٹٹولتی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔

"…بیٹی کا ماں سے بہترین دوست کوئی اور نہیں ہوتا اور تم مجھ سے اپنے دل کی بات چھپاتی ہو۔" اس

نے وشمہ کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر محبت سے کہا تھا۔

"ماما! میں نے تو کچھ بھی نہیں۔" اس سے کوئی بات مکمل نہ ہو پا رہی تھی۔

ایسا لگ رہا تھا جیسے منزہ نقب لگا کر اس کے اندر کے سارے تو خیز راز چرا کے رہے گی۔

"ماں ہوں تمہاری..... تمہاری ہر خواہش سے آشنا۔ وہ بھی جو تمہارے لبوں پہ ہے اور وہ بھی جو تمہارے دل میں ہے..... جیسے کہ وصی۔"

وشمہ کا چہرہ جھک کر سینے سے جا لگا۔ منزہ کو اس کی اس ادا پہ بے ساختہ پیار آ گیا۔

"پگلی۔" وہ اسے گلے لگا کر ماتھا چومنے لگی۔

"ماں سے کیا پردہ..... اور مجھے تو فخر ہے اپنی بیٹی پہ۔ اس نے کوئی غلط قدم نہیں اٹھایا..... جذبات کے ہاتھوں بے لگام ہو کر اپنا وقار نہیں کھویا..... رہا دل کا سوال تو دل تو ہوتا ہی بے اختیار ہے۔ میں جو تمہاری پھوپھو پہ مسلسل دباؤ ڈال رہی ہوں وصی کے لیے تو وہ تمہاری اس تابعداری کا انعام ہے کہ تم نے اپنے دل کی بات کو دل تک رکھا۔ اسے کسی اور کے تو کیا وصی تک کے علم میں نہ آنے دیا اور دیکھنا میں یہ انعام تمہیں دے کر رہوں گی۔"

"ماما!" وہ حیا کے بوجھ سے دہری ہوتی اب اس کے سینے میں چھپی جا رہی تھی۔

"چاہے تمہاری پھوپھو کتنی ہی آنا کانی کرے۔"

منزہ کی بات پہ اس کا دل سہم سا گیا۔

"تو کیا پھوپھو راضی نہیں ہیں؟"

اس نے دل ہی دل میں پوچھا..... جبکہ منزہ اس سوال سے آگاہ تھی۔

"نجانے کیوں وہ راضی نہیں ہے حالانکہ تم سگی بھتیجی ہو اس کی۔ اسے تو میرے کہنے سے پہلے خود یہ ادا کرنا چاہیے تھا۔ خیر وہ چاہے اپنا فرض نبھائے نہ نبھائے میں تو ماں ہوں ناں..... میں نے بھی تمہارے دل کا مان نہ رکھا تو اور کون رکھے گا۔" وہ مسکراتے ہوئے اس کا سر سہلا رہی تھی۔

❁ ❁ ❁

رخشندہ پہ ان دنوں الگ ہی موسم اترا ہوا تھا۔

وہ دو بیٹیوں کے رشتے طے ہو جانے کی خوشی۔

اور وہ بھی اتنی اچھی جگہ ہو جانے کی خوشی..... ایسی خوشی جس میں اطمینان کی چاشنی بھی شامل ہو۔

وہ کھل کے مسکرا رہی تھیں..... کھل کے چاؤ پورے کر رہی تھیں۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے کہ ورنج کلر کا ایک بھی سوٹ نہیں ہوگا۔"

ندا نے صاف اعلان کر دیا۔ اورنج کلر اسے سخت ناپسند تھا۔

"اور اگر بری میں وہ تین سوٹ اورنج کلر کے ہو گئے تو؟"

روا نے تنگ کرنے کی نیت سے شوشہ چھوڑا۔

"میں پہلے سے منع کر دوں گی..... لاؤ دو فون۔"

"ہوش کرو ندا!" رخشندہ جو اب تک خاموشی سے مسکرا مسکرا کر سنتے ہوئے بڑے سے اچانک نہیں سوٹ نکال رہی تھیں ایک دم چونک کر بولیں۔

"اب تم ہونے والے سسرال خود فون کرو گی؟"

"خود کب کر رہی ہوں..... روا کا کرو گے گی نمبر۔"

"ایک ہی بات ہے۔"

"ویسے..... جب وہ فون کریں تو آپ خاص تاکید کے ساتھ مجھے ریسیور تھماتی ہیں کہ بے شک وہ شخص کچھ بولتا رہے..... تم صبر کے ساتھ بیٹھی ان محترماؤں کی بے سروپا گفتگو کانوں میں اتارتی رہو۔ تب کوئی فرق نہیں پڑتا اور اب میں فون کر لوں تو حرج ہے؟"

"بالکل حرج ہے۔ باتیں سنو ذرا اس لڑکی کی..... ذرا عقل نہیں ہے کہ سسرال والوں سے خصوصاً ہونے والی سسرال کے ساتھ کیسے پیش آتے ہیں۔ نجانے کالج میں کیا کرتی ہے؟"

"کالج میں ہونے والی سسرال سے نمٹنے کے لیے کوئی کورس نہیں ہے۔" وہ ہنسنے لگی۔

"ہاں ہے..... میں کیا کبھی کالج نہیں گئی۔" وہ برا مان گئیں۔ اسی بات کا تو زعم رہا تھا ہمیشہ..... کہ جس خاندان کی خواتین بمشکل میٹرک پاس تھیں وہاں وہ پہلی گریجویٹ بہو تھیں۔

"خبردار روا! کوئی ضرورت نہیں اسے نمبر ملا کے دینے کی۔ کل میں نے کتنا کہا کہ تمہاری ساس کو زکام ہے، فون کر کے خیریت معلوم کر لو۔ مگر یہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آج بری کے لیے۔ اپنی ہی بری کے لیے منہ پھاڑ کے دینے فون کر رہی ہے۔ رکھو وہ فون۔"

"اوہو..... میں کب آپی کو نمبر ملا کے دے رہی ہوں۔ میں تو اپنی فرینڈ کو فون کر رہی ہوں۔" روا جھنجلا کے بولی۔

"اور زکام ہی تو ہوا تھا جی بی کو..... کون سا ہارٹ اٹیک ہوا تھا جو میں..."

"توبہ!" رخشندہ نے دل سے ندا کی بات کاٹی۔

"کوئی سن لے گا تو کیا کہے گا ندا!" وہ روہانسی ہو گئیں۔

"تم تو میری تربیت پہ حرف لانے کا پورا پورا انتظام کیے بیٹھی ہو۔" وہ سخت خوف زدہ انداز میں کہہ رہی تھیں پہ اپنے چلے جا رہی تھی۔

"اللہ کیا ہو گیا ہے آپ کو میں تو مذاق کر رہی تھی۔ آپ تو سیریس ہی ہو گئیں۔ اچھا بتائیں..... انہیں بڑی بی کہا ہے ناں میں نے..... کون سی غلط بات کی؟..... جی اتنی تو بزرگ ہیں وہ..... پہلے میں سمجھی تھی کہ میری ہونے والی کی بھی ساس ہیں..... دادو جتنی عمر کی تو ہوں گی۔"

"تمہیں کیا ان کی عمر سے؟" رخشندہ اس کی گفتگو سے جھلائے جا رہی تھی۔

"شادی ہونے جا رہی ہے اور بات تک کرنے کا سلیقہ نہیں..... کیسے نبھائے گی یہ رشتے داریاں۔ اتنی لمبی چوڑی ہو اور یہ نکمی لڑکی..... اور دوں کی بھی لڑکیاں کالج یونیورسٹی جاتی ہیں۔ نوکریاں کرتی ہیں مگر سب ہی کی عقل بھی گھاس چرنے نہیں چلی جاتی..... انہیں گھرداری کا بھی سلیقہ ہوتا ہے۔ نانا بانا بھی آتا ہے مگر یہ..."

"ویسے ایک بات کہوں؟" ندا کی آنکھوں میں ابھی تک شرارت ناچ رہی تھی۔

"آپ بالکل دادو جیسی ہوتی جا رہی ہیں۔ ان ہی کی طرح بے تکان بولے چلی جاتی ہیں۔ لگتا ہی نہیں کہ آپ پڑھی لکھی ہیں۔"

"تمہیں دیکھ کے کون سا لگتا ہے کہ تم..... تم ہو..... بچی بنی رہتی ہو۔ روا تم سے چھوٹی ہے مگر کتنی سمجھدار۔ شادی بات چلتے ہی کتنی بردبار اور سنجیدہ ہو گئی ہے۔ طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا ہے اس کے..... اور ایک تم ہو۔"

اور وہ کچن سے گلاس لے کر نکلتی تو کمال ہما کے قدم سست ہو گئے۔

طبیعت میں ٹھہراؤ آ گیا؟ ہاں! زندگی ہی ٹھہر گئی ہے اور نجانے کب تک اس اجاڑ بیاباں موڑ پہ رکی رہے..... پتا نہیں کب یہ بھاری پتھر سرکے گا..... پتا نہیں کب اس دل پہ جمی کائی چھٹے گی..... پتا نہیں کب؟ نجانے کب؟

❁ ❁ ❁ ❁

"ہیلو؟"

ہما کی آواز سنتے ہی وشمہ کی ہتھیلیاں بھیگ گئیں۔ دل دھڑ دھڑ کرنے لگا۔

اس نے گھبرا کے جلدی سے فون رکھ دیا اور اپنی منتشر دھڑکنوں کو شمار کرنے لگی۔

ہما سے اس کی پہلے بھی کئی بار بات ہوئی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی دھڑکنوں کی ترتیب ہمیشہ ہی تلپٹ ہو جاتی لیکن یہ حال..... شاید اس کی وجہ منزہ سے ہونے والی وہ گفتگو تھی۔ جو کر لیا وہ اعتماد تھا۔

"ماں ہوں میں تمہاری۔ میں نے بھی تمہارے دل کی نہ جانی تو اور کون جانے گا۔ میں تمہاری شادی وصی سے ہی کرواکے رہوں گی۔ دیکھنا تم۔"

اور شمہ کے دل کے اندر دبک کے بیٹھی وصی کی نوخیز سی چاہت ایکدم سینہ تان کے تن آور ہو کر پھیل گئی۔ اسے کسی کی ذات سے اعتماد ہی ایسا ملا تھا۔

اس کا دل چاہ رہا تھا اس احساس میں کسی اور کو بھی شریک کرے اور "یہ کسی اور" سوائے وصی کے کون ہو سکتا تھا۔ اس نے بے اختیار ہو کر اس کا نمبر ملا ڈالا۔ مگر اس کی آواز سنتے ہی ساری ہمت ہار بیٹھی۔

کانپتی انگلیوں کے ساتھ دوبارہ نمبر ملایا۔

"ہیلو۔" پھر سے وہی آواز۔ سماعتوں کے اتنے قریب۔ دھڑکنوں کے اتنے پاس۔

وہ ایک بار پھر بکھر گئی..... ریسیور کریڈل پہ رکھ کے گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے دھڑکنوں کو اعتدال پہ لانے لگی۔

اس بار اس شرارت میں الگ ہی مزا محسوس ہوا۔

چھپنے چھپانے کا مزا۔ ستانے کا مزا۔

صاف چھپتے بھی نہیں، سامنے آتے بھی نہیں کا مزا۔

اس نے تیسری بار نمبر ملایا اور اس ہشاش بشاش دل میں اترنے والی آواز کی منتظر ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔ ہیلو کون ہے بھئی..... کیا مصیبت ہے یار؟"

جھنجلا کے اس نے فون رکھ دیا۔

"کون ہے وصی؟" پروین نے اس کے لیے لسی لے کر آتے ہوئے پوچھا۔

"اللہ جانے۔" اس نے لسی کے فل سائز گلاس کو دیکھ کر نظروں کو تراوٹ پہنچائی۔

"واؤ..... جھاگ والی لسی..... جئیں امی! اس وقت اس کی اشد ضرورت محسوس ہو رہی تھی ورنہ ان بلینک کال نے تو دماغ پلپلا کر کے رکھ دیا تھا۔ پتہ نہیں کون ہے..... جو۔"

اس نے ایک بڑا سا گھونٹ لیا..... ہونٹوں پہ لگا جھاگ زبان سے چاٹا اور پھر اطمینان سے بات مکمل کی۔

"جو پچھلے بیس منٹ سے تنگ کر رہا ہے۔ یا کر رہی ہے۔"

"بس دس منٹ میں تنگ آ گئے؟"

حسان نے ساتھ والے صوفے سے انگڑائی لے کر اپنی بیداری کا اعلان کیا۔

"امی! ایک گلاس لسی مجھے بھی۔" اور ساتھ فرمائش بھی بلند کی۔

"صرف دس منٹ میں میرے بھائی بیس منٹ اور سترہ کالز یہ دیکھو سی ایل آئی میں۔"

اس کی اس بات پر پروین نے ایک سرسری سی نظر فون پہ ڈالی اور سی ایل آئی پہ ایک جانا پہچانا نمبر دیکھ کر چونک گئی۔

اور اس نمبر سے وصی کو کون خاموش پیغامات دے رہا ہے۔ وہ شاید کل تک بالکل بھی نہ سمجھ پاتی۔ لیکن اب سمجھ سکتی تھی..... منزہ کی اس بات کو اس نے سنا ضرور تھا مگر ہضم نہ کر پائی تھی اور اب سی ایل آئی پہ چمکتا نمبر اسے یقین دلا رہا تھا منزہ نے بالکل سچ کہا تھا کہ وصی کے سلسلے میں ان پہ واہ شمہ کے دماغ میں آ گیا خیال ہے۔

"امی..... لسی۔"

حسان فریادیں کر رہا تھا۔ مگر پروین کے ہوش اڑے ہوئے تھے کہ اسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا۔

☆ ☆ ☆

"ہیلو۔"

اس بار وصی حد سے زیادہ جھنجلایا ہوا تھا اور اس نے سوچ رکھا تھا کہ اب بھی کوئی نہ بولا تو وہ ساری مروت بالائے طاق رکھتے ہوئے دو چار ستھری ستھری تو سنا ہی دے گا۔

"کیا بات ہے..... لڑکے بیٹھے ہو کسی سے؟" دوسری جانب سوہا تھی۔

"اوہ۔ سوہا!" وہ الجھا۔ "نہیں پچھلے آدھے گھنٹے سے تنگ کرنے والی وہی تو ہیں۔"

"کیوں؟ تمہیں کسی اور کے فون کا انتظار تھا؟"

"نہیں۔ تنگ کر رہی ہو یار؟"

"میں تنگ کر رہی ہوں یا تم؟..... پتا ہے کتنے دنوں سے ملنے نہیں آئے تم۔ ذرا سی بات پہ ناراض ہو جاتے ہو لڑکیوں کی طرح۔"

"اس کا مطلب یہ تو نہیں کہ تم بار بار مجھے فون کر کے تنگ کرو۔ یہ کون سا طریقہ ہے بدلہ لینے کا۔"

اس نے ہوا میں تیر چلایا..... جانتا تھا۔ وہ آنا کانی کرنے والوں میں سے نہیں..... اگر یہ شرارت اسی کی تھی تو ہنستے ہنستے مان جائے گی۔ اور بے کار کی جو الجھن سوار ہے۔ وہ ختم ہو جائے گی کہ آخر یہ کون ہو سکتی ہے۔

"واٹ..... میں؟ تمہارا دماغ تو خراب نہیں؟"

وہ حسب عادت پھٹ پڑی۔

"ماشاءاللہ مسٹر وصی! یہاں کوئی اتنا ترسا نہیں بیٹھا نہ کسی کے پاس فالتو وقت ہے۔"

"یار پتا نہیں کون تنگ کر رہا ہے فون پہ..... کل سے بار بار فون آ رہا ہے مگر کوئی بولتا نہیں۔ سوری مجھے ایسے لگا جیسے شاید لیکن نہیں تم ایسا کیوں کرو گی؟"

وہ صحیح طور پر ڈسٹرب لگ رہا تھا۔

"ہاں اور بھی ایسا کیوں کرے گا؟" سوہا نے قہقہہ لگایا۔ "کتنے فون کیے اس حسینہ نے؟"

"تمہیں کیا پتا وہ حسینہ ہے یا پہلوان؟"

وہ جل کے رہ گیا۔ اس کا حشر ہو گیا تھا اس بارے میں سوچ سوچ کر اور اسے مذاق سوجھ رہے تھے۔

"فون سیل پہ آ رہے ہیں یا لینڈ نمبر پہ؟"

"دونوں پہ۔"

"انٹرسٹنگ۔"

"میں کیا کوئی فلم کی اسٹوری سنا رہا ہوں جو تمہیں انٹرسٹنگ لگ رہی ہے؟"

"پہلی بار تو تم سے کوئی مزے کی بات سنی ہے۔"

وہ مزے لے رہی تھی اور وصی تپتا جا رہا تھا۔

"ورنہ تو وہی تایا کے..... تائی کے آپی کے قصے۔"

"تمہارے لیے تو ہر بات مذاق ہے۔"

"نہیں۔ تم تو نہیں۔" وہ فوراً کہہ اٹھی۔ یونہی بے ارادہ.....

اور کہہ دینے کے بعد لب بھینچے سوچ رہی تھی کہ بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا۔

لیکن دوسری جانب سننے والا وصی تھا..... جس نے یہ بھی سوچنے کی زحمت نہ کی کہ اس بات کا مطلب کیا ہوا۔

"مجھے تو اب شک سا ہو رہا ہے کہ اگر یہ فون تم نہیں کر رہیں۔ تب بھی کسی سے کروا ضرور رہی ہو۔"

"شٹ اپ وصی!" وہ پیار بھری ڈانٹ کے ساتھ ناک چڑھا کے بولی۔

"تم میرے دوست ہو صرف میرے۔ تمہیں تنگ کرنے کا حق بھی صرف مجھے ہے۔ میں یہ اختیار کسی اور کو کیوں دوں؟" یہ بات بھی اس نے یونہی کی تھی۔

بے ارادہ
گنگنانے کے بعد پھر سوچ میں پڑ گئی۔
"بھلا اس بات کا کیا مطلب ہوا۔"

کچھ بنا مطلب کی باتیں.....
کچھ بے مقصد سوال.....
کبھی یونہی روٹھ جانا.....
کبھی یونہی چڑ جانا.....
پھر یونہی مَن جانا.....
یونہی.....
یونہی دیکھنے لگتی ہیں آنکھیں
وہ چہرہ
جو نظروں سے اوجھل ہو کر بھی
منظر سے گم نہیں ہوتا
وہ بنا مطلب کی باتیں
جن کا کوئی سرا نہیں ہوتا
وہ بے مقصد سے سوال
جن کا کوئی جواب نہیں ہوتا
ان سوالوں میں ان باتوں میں
من الجھنے لگے تو
جان لینا
اک نیا رشتہ شروع ہونے کو ہے
محبت کا اور اک سلسلہ
شروع ہونے کو ہے۔"

سوہا نے زور سے کتاب بند کی۔
"کیا فضول چیزیں پڑھتی ہے یہ تقدیس بھی۔"
وہ سر جھٹک کے اس احساس کو جھٹلانے لگی جو اس نظم کو پڑھنے کے بعد اسے جکڑ رہا تھا۔
"تمہیں کیا ہوا؟" تقدیس نے اس کے چہرے کے زاویے بگڑتے دیکھ کر پوچھا۔
"تمہاری یہ نظم..... یہ ہو گئی ہے مجھے۔"
اس کا جواب تقدیس کی سمجھ سے بالاتر تھا۔ وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگی۔
"نری بکواس ہے یہ....."
"تو نہ پڑھو..... ویسے بھی یہ میری پرسنل ڈائری ہے۔ تمہیں کھولنی بھی نہیں چاہیے۔"
"میں تو یہ دیکھ رہی تھی کہ تم کیا لکھتی رہتی ہو۔"
"بس..... جو دل چاہتا ہے اور جو اچھا لگتا ہے۔ لکھتی ہوں۔"
"لیکن اس میں میرے بارے میں تو کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے میں تمہیں اچھی نہیں لگتی۔"
اس کی تسلط پسندی اور خود پسند شخصیت کو دھچکا سا لگا۔
تقدیس اس کی ناراضی دیکھ کر ہنسنے لگی۔

"پوچھا ہے..... سنو۔" سوہا نے لہجے کو سرسری سا بنانے کی بھرپور کوشش کی لیکن چہرے پہ لکھی الجھن صاف پڑھی جا سکتی تھی۔
"جب کوئی اچھا لگتا ہے..... آئی مین..... یہ..... محبت..... محبت ہوتی ہے تو اس کے کیا سمٹم (علامات) ہوتے ہیں؟"
یہ سوال پہلے سے اس کی تقدیس کی کھنکھناہٹ قابو سے باہر ہو گئی۔
"اس میں ہنسی کیا ہے؟" وہ برا مان گئی۔
"تم تو ایسے پوچھ رہی ہو جیسے کسی بیماری کی علامات کے بارے میں جاننا چاہ رہی ہو۔"
"بیماری ہی تو ہے یہ۔"
"نہیں بھئی..... محبت تو بڑا خوب صورت جذبہ ہے۔ بہت نرم..... بہت لطیف..... اگر آلودہ نہ ہو تو..... اگر پراگندہ نہ ہو تو۔"
"پلیز..... فار گاڈ سیک..... ہم اردو کی کلاس میں نہیں بیٹھے تقدیس!" وہ کراہ اٹھی۔
"اتنے بھاری بھرکم الفاظ کے ساتھ تو محبت اور بھی مشکل لگنے لگی ہے۔ پہلے ہی حلق سے نہیں اتر رہی۔"
"یہ کوئی چاکلیٹ نہیں ہے جسے تم حلق سے اتارو گی۔ یہ جذبہ دل میں اتارنے کے لیے ہوتا ہے۔"
"تمہارے دل میں اترا کبھی؟"
سوہا کو جاننے کا اشتیاق ہوا حالانکہ اثبات میں جواب ملنے کی ایک فیصد بھی امید نہیں تھی۔

"ہاں۔"
جواب توقع کے بالکل برعکس تھا۔
"ہیں؟..... واقعی ایمان سے؟"
سوہا اچھل پڑی۔
"کس سے؟" یہ اس کا اگلا سوال تھا۔
"ہے کوئی۔" تقدیس نے نظریں چرائیں..... مگر اس لمحے اس کے چہرے پہ دھنک اور تاریک سایوں کا جو امتزاج بکھر اٹھا تھا اسے وہ سوہا کی نگاہوں سے چھپا نہ سکی۔
"اور مزید کوئی سوال نہ کرنا..... میں اس کے بارے میں زیادہ کچھ نہیں جانتی نہ یہ کہ وہ کون ہے نہ یہ کہ اب کہاں ہو گا اور نہ یہ کہ مجھے دوبارہ کب ملے گا۔ کبھی ملے گا بھی یا نہیں۔"
سوہا کے پاس بہت سے سوال تھے۔ یہ بھی جو تقدیس نے دہرائے اور اس کے علاوہ اور بھی کئی مگر وہ خاموشی سے تقدیس کو دیکھتی چلی گئی۔ جو اس لمحے اسے بڑی الگ الگ سی منفرد سی لگی۔ پہلے سے بالکل مختلف۔
بمشکل اس نے تقدیس کے اداس چہرے سے نظریں ہٹائیں اور دوبارہ اس کی ڈائری کے ورق پلٹنے لگی۔
"اجنبی تھا وہ
گزر جاتا تھا میرے دل کے سارے راستے
آشنا تھا وہ
مگر توڑ گیا مان کے سارے آسرے.....
مہربان تھا وہ.....
مگر پھر بھی"
سوہا نے ڈائری بند کی اور اس کی جانب دیکھا۔
وہ پن کی نوک سے کتاب میں چھپی مٹی کرید رہی تھی۔
اس کا دل اپنی دوست کے اس انجانے دکھ سے بھر گیا۔
"تقدیس!" اس نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے پکارا۔ "میں تمہارا درد محسوس کر سکتی ہوں۔"

"نہیں سوہا! یہ درد صرف وہی محسوس کر سکتا ہے جو اس کرب سے گزرا ہو جس نے محبت کا ذائقہ چکھا ہو... جس نے خواب دیکھے ہوں۔ تم یہ درد محسوس کر ہی نہیں سکتیں۔"
"لیکن میں کر رہی ہوں تقدیس!"
اس نے زور دے کر کہا۔
"کیسے؟" اس نے نظریں اٹھا کر تحیر سے دیکھا۔
"تو کیا... کیا تم بھی..."
سوہا متردد نظر آنے لگی۔
"میں..." وہ تانے بانے جوڑنے لگی۔
وصی کو آنے والی فون کالز کے بارے میں سنتے ہی اس کی تمام حسیات کا منتشر ہو جانا۔
کسی متوقع رقابت کے خدشے سے دل کا سہم جانا۔
یہ سب اسے وصی کے حوالے سے کبھی محسوس نہیں ہوا تھا۔
یہ تو ایک عام سی بے ضرر سی دوستی کا رشتہ تھا۔ اسے وصی اپنا دوست نہیں "سہیلی" محسوس ہوتا تھا۔ کبھی تقدیس نے اسے وصی کے حوالے سے ستانا بھی چاہا تو وہ بجائے چڑنے کے ہنسنے لگتی۔ تقدیس کے اس خیال پہ۔
"بھلا میں اور وصی... پاگل ہوئی ہو تم۔"
پھر یہ کیا تھا۔
یہ ایک الگ احساس... بالکل الگ۔
صرف یہ سوچتے ہی کہ کوئی دوسری لڑکی ہے جو وصی کو فون کر کے اپنی جانب متوجہ کرنا چاہتی ہے۔ صرف یہ سوچنے کی دیر تھی کہ یہ احساس پورے وجود میں پھیل گیا۔
پھر غیر ارادتاً اس کے لبوں سے نکلتے وہ الفاظ...
"نہیں سب مذاق ہے مگر تم نہیں۔"
کتنی سچی تھی وہ بات... واقعی یہ وصی ہی تھا جس کے آنے کے بعد اس نے زندگی کو مذاق سمجھنا ترک کیا تھا... خود کو سنجیدگی سے لینا شروع کیا تھا۔
"تم میرے دوست ہو۔ صرف میرے۔ تمہیں تنگ کرنے کا اختیار میں کسی اور کو کیوں دوں؟"
اور اس نے وہ بات بھی کہہ دی تھی... جو اس کے خیال میں اب تک صرف اس کی ما ربتا تک محدود تھی۔
صرف ربتا کی ذات وہ واحد ذات تھی... جس کے بارے میں وہ حد سے زیادہ تسلط پسند تھی کیونکہ اس کا خیال تھا پوری دنیا میں صرف ایک وہی ہستی ہے جسے وہ سب سے زیادہ چاہتی ہے۔
"تو کیا وصی کو بھی میں..."
"کیا سوچنے لگی ہو؟" تقدیس نے اسے جھنجھوڑا۔
"آں... کچھ نہیں۔" وہ چونکی۔
"میرے سوال کا جواب نہیں دیا تم نے؟"
"کیا جواب دوں۔ مجھے خود نہیں پتا۔"
"یعنی کچھ بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں؟"
تقدیس کے لہجے میں مایوسی بھری تھی۔
"لو میں نے بے کار میں اتنی لمبی چوڑی کہانی سنائی... سفید جھوٹ بول کر اپنے گناہوں میں اضافہ کیا۔"
"کیا؟ کیا مطلب۔" سوہا چونکی۔
"اور کیا... صرف تمہارے اندر سے اندر کی بات اگلوانے کے لیے۔" وہ پھر سے ہنسنے جا رہی تھی چند منٹ

بلا کی سنجیدگی اور گمبھیرتا کا شائبہ تک نہ تھا اس کے چہرے پہ۔
"اس قدر جھوٹی ہو تم۔"
سوہا اس کی کمر میں ایک دھموکا جڑ کے اٹھ کھڑی ہوئی۔
"اور خبیث بھی... یعنی وہ سب جھوٹ تھا؟"
"سو فیصد۔"
"ایکٹرس... فراڈ... مکار۔"
وہ اپنی یادداشت کھنگال کر قدرے مہذبانہ گالیاں ڈھونڈ رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"آپ نے وصی کے لیے روا کا نام..."
وہ بڑی ہچکچاہٹ کے عالم میں کہہ رہی تھیں۔
حالانکہ یہ بات اماں جان سے سن لینے کے بعد انہوں نے قسم کھائی تھی اس بارے میں سوچنا تک نہیں۔ چاہے منزہ کتنا بھی دباؤ ڈالے لیکن آخری بار اس نے جو ٹرپ کا پتہ چلا تھا... وشمہ کا ذکر کر کے... اس کے بعد وہ اپنی قسم پہ قائم نہ رہ سکیں۔
"ہاں... لیکن تم اتنی پریشان کیوں لگ رہی ہو؟"
شوکت جہاں ان کی حالت دیکھ کر ٹھٹھکیں۔
"اماں جان! یہ آپ کی دلی خواہش ہے یا محض رخشندہ بھابی کا بوجھ ہلکا کرنے کی نیت سے آپ..."
"تم کہنا کیا چاہتی ہو پروین! کھل کے کہو۔"
"کہہ تو یوں رہی ہوں کہ آپ غلط مطلب نہ نکال لیں... یا ناراض نہ ہو جائیں۔"
انہوں نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔
"نہیں تم کہو۔"
خلاف عادت انہوں نے مختصر الفاظ میں معاملہ سمیٹا۔ شاید پروین کے دل کی بات جلد سے جلد جان لینے کی بے تابی تھی۔
"اگر تو یہ آپ کی دیرینہ خواہش ہے اماں جان تو سر آنکھوں پہ... لیکن اگر صرف وہی وجہ ہے جو میں نے پہلے بتائی ہے تو روا کے لیے میں حسان کا رشتہ دینے پہ تیار ہوں۔"
"حسان نے کہا تم سے؟"
شوکت جہاں کے سوال پہ وہ بری طرح چونکیں۔
"ارے... یہ خیال تو مجھے آیا ہی نہیں... یہ تو بہت آسان حل تھا کہ میں کہہ دیتی روا کے لیے میں حسان کا سوچ کے بیٹھی ہوں اور جب وہ وصی کا نام لیتیں میں کہہ دیتی سوچتے ہیں اس کے بارے میں بھی کچھ اور پھر انکار کی خواہش ظاہر کر دیتی۔ کمال ہے میں بلاوجہ اتنا ڈر ڈر کے بات کر رہی تھی۔"
اب ان کا اعتماد لوٹ آیا اور وہ آرام سے اپنا مدعا بیان کرنے لگیں۔
"حسان اور یہ بات کرے گا؟ آپ کیا جانتی نہیں ہیں اپنے پوتے کو۔" وہ بلاوجہ ہنسنے لگیں۔ شاید اپنی خجالت کم کرنے کے لیے۔
"بلکہ میری شروع سے یہ خواہش تھی۔"
"کبھی ذکر نہیں کیا تم نے۔"
شوکت جہاں کو شروع کی خواہش والی بات کچھ ہضم نہ ہوئی اس لیے فوراً جتا دیا۔
"کبھی وقت کہاں آیا تھا... وہ تو اس دن آپ نے وصی کے حوالے سے روا کا نام لیا تو..."

"تب کچھ کیوں نہیں کہا تم نے؟"

"مجھے لگا۔۔۔ میں وصی اور حسان میں فرق کر رہی ہوں مگر بخدا میرا ایسا کوئی مقصد نہیں۔ میرے لیے حسان اور وصی ایک برابر ہیں۔ ردا تو میری اکی بہو بن کے آئے گی دونوں صورتوں میں لیکن بس خواہش تو خواہش ہے میں نے سوچا" آپ سے ذکر تو کروں" آگے جو آپ کی مرضی تاکہ دل میں یہ ملال نہ رہے کہ میں نے کہہ کے دیکھا ہی نہیں۔"

"ہاں۔۔۔ ٹھیک سوچا تم نے دل کی بات کہہ دینی چاہیے۔ خصوصاً" اپنوں سے۔"

"پھر کیا خیال ہے آپ کا اماں جان؟" انہوں نے بڑی آس کے ساتھ پوچھا۔

"حرج تو کوئی نہیں اس میں۔۔۔ دونوں کی عمر بھی ایک سی ہے۔ صرف فرق ہے تو یہ کہ وصی تعلیم مکمل کر کے اپنے پیروں پہ کھڑا ہو چکا ہے جبکہ حسان کی ابھی تک تعلیم بھی۔۔۔"

پروین دل مسوس کر رہ گئیں۔

"اور ردا کا تم جانتی ہو۔۔۔ ماشاء اللہ سے شروع سے ہی پڑھائی میں کتنی اچھی ہے۔"

یہ دوسرا موقع تھا جب انہیں اپنے بیٹے کی کم اہلی کا طعنہ سننے کو مل رہا تھا اور زندگی میں پہلی بار انہیں حقیقی معنوں میں حسان پہ سخت تاؤ بھی آ رہا تھا۔

"لیکن میں یہ بات درخشندہ سے کہوں گی ضرور۔"

اب شوکت جہاں نے ان کے ڈوبتے دل کو امید کی پتوار تھائی۔

"اپنوں میں ایسی معمولی باتیں نظر انداز کر دی جاتی ہیں اور پھر حسان تو ہے بھی بڑا سیدھا۔۔۔ بڑا پیارا۔"

پروین نے ایک اطمینان بھری سانس خارج کی۔

☆ ☆ ☆

"کیا کر رہے ہیں آپ؟"

منزہ نے یونہی سرسری سی نظر ڈالی تھی نوید مراد کے ہاتھوں کی حرکت پہ۔۔۔ اور ایک جانا پہچانا نمبر ملاتے دیکھ کر چونک گئی۔

"پروین کو فون کر رہا تھا۔۔۔ بہت دنوں سے بات نہیں ہوتی۔"

منزہ نے تیزی سے آگے بڑھ کے فون اس کی گود سے اٹھا لیا۔

وہ بھونچکا رہ گیا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ آپ کو اپنی بیٹی کی پروا ہے کہ نہیں۔"

"تم ابھی تک وہی بات لیے بیٹھی ہو؟"

"وہ بات ختم ہوئی کہاں ہے؟"

"منزہ! تم نے کبھی اس طرح کا برتاؤ نہیں کیا۔ مجھے حیرت ہو رہی ہے تمہارے طرز عمل پہ۔۔۔ اور افسوس بھی۔ تمہیں اتنا تو سوچنا چاہیے کہ پروین کس ذہنی کرب سے گزر رہی ہو گی۔ یقیناً" وہ اس معاملے میں بے بس ہے۔ کیا میں اس بات پہ اس سے لاتعلق ہو کر اس کی بے بسی اور مجبوری کا مذاق اڑاؤں؟"

منزہ نے ایک گہری سانس لی اور اپنی نظریں نوید مراد کے چہرے پہ گاڑ دیں۔

کیا نہیں تھا ان نظروں میں۔

گزرے کل کی ساری دکھن تیں۔۔۔

ساری بے بسی۔۔۔ ساری مجبوریاں۔

نوید مراد نے نظریں چرا لیں۔

"انہیں کم از کم اس بات کا احساس تو ہونا چاہیے کہ ہماری بیٹی کی حق تلفی ہوئی ہے۔"

[illegible] کے نصیب میں جو بات آ کے مل کے رہے گی منزہ؟"

[illegible] بڑے دھیمے اور پست لہجے میں بولا۔

"تمہاری فکر مندی سمجھ سکتا ہوں لیکن اس کے لیے"

[illegible] منزہ نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔

[illegible] سکرین پہ چمکتے نمبر کو دیکھ کر حیرت سے دُہرا کے رہ گیا۔

[illegible] کہتے ہیں دل کو دل سے راہ ہوتا ہے۔ پروین کا فون خود ہی آ گیا۔"

[illegible] سرشاری سے کہتے، دیکھ کر وہ کلس کے رہ گئی اور اچانک کمرے سے نکل گئی۔

[illegible] پروین!"

[illegible] دل ہی دل میں منزہ کے بے موقع، بے محل مطالبے پہ نادم سا تھا اور یہی توقع کر رہا تھا کہ دوسری جانب [illegible] بھی شاید یہی گلہ کرنے کا ارادہ باندھا ہو گا لیکن خلاف توقع ان کا رویہ نارمل تھا۔ وہ روٹین کی باتیں بھائی [illegible] رہے تھیں۔

[illegible] باہر نکل تو آئی تھی مگر اب دھیان سارے کا سارا اندر ہونے والی گفتگو کی جانب تھا۔ وہ بہانے [illegible] سے دو تین بار کمرے کے آگے سے گزری اور آدھ کھلے دروازے سے سن گن لینے کی کوشش کی۔ ہر بار [illegible] آئی نوید مراد کی شگفتہ آواز اور ہلکا پھلکا لہجہ سن کر حیران ہوتی رہی۔

[illegible] منی کی بچی ہے یہ پروین۔ یا تو اسے واقعی وشمہ کی ذرا برابر پروا نہیں یا پھر یہ جان بوجھ کر مجھے باور کرا [illegible] کہ اس پہ ان باتوں کا کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

[illegible] سے رہا نہ گیا تو اندر آ گئی۔

[illegible] میں آج۔ کیوں نہیں ضرور۔ آئیں گے۔ آخر تمہارے گھر کی پہلی خوشی ہے اور ماموں ہونے کے ناتے [illegible] ہے کہ میں تمہارے گھر آ کے حسن کی منگنی کی مبارکباد تمہیں اور سراج بھائی صاحب کو دوں۔"

[illegible] ہوئے اس نے دانستہ منزہ کی جانب سے رخ پھیرا جو بیڈ کی چادر بدلتے ہوئے بڑے جارحانہ انداز میں [illegible] جھٹکے دے رہی تھی۔

[illegible] ہونے کا پورا حق ہے بھائی صاحب کو۔۔۔ واقعی یہ میری کوتاہی ہے۔ تو میں اس کی معذرت بھی ان [illegible] لوں گا۔ تم فکر مت کرو۔"

[illegible] ساری عمر معذرتیں ہی پیش کرتے رہیے گا آپ۔"

[illegible] کے اور نوچ کر اتارتی ہوئی بڑبڑانے لگی۔

[illegible] اراد تھا ہے۔۔۔ فون کر کے اطلاع دے دوں گا۔۔۔ خیال رکھنا اپنا۔ اللہ حافظ۔"

[illegible] بند ہوتے ہی منزہ نے ہاتھ میں پکڑی چادر پرے پھینکی اور تیزی سے نوید کی جانب گئی۔

[illegible] میرا نہ سہی بیٹی کا مان تو رکھ لیں۔"

[illegible] کا مان؟"

[illegible] نے ایک ہی سوال نے اسے چپ سادھ لینے پہ مجبور کر دیا۔

[illegible] نہیں کمرے سے نکلنا ہی بھولی رہی اور تھکے تھکے انداز میں بیڈ کے کونے پہ بیٹھ گئی۔

[illegible] کون ہیں جن کی سازشیں کامیاب ہو جاتی ہیں۔ نجانے کون ہیں وہ جن کی برائیاں بھی مراد پا لیتی ہیں [illegible] بھی رائیگاں گیا اور صبر بھی۔"

☆ ☆ ☆ ☆

[illegible]"

[illegible] جھنجلاہٹ اور بے زاری نہیں۔۔۔ آواز میں تھکن لیے پوچھ رہا تھا۔ مگر حسب سابق کوئی آواز

...کریں۔ گھروں میں نوکروں کی فوج کیوں نہ ہو لیکن انہیں ہر کام میں طاق ضرور ہونا چاہیے۔
...بیرا کیا قصور ہے امی۔! اسے دیکھیں اس کا پناجی چل رہا ہے سسرال میں حاضری دینے کا۔"
...یت سے ہما ایسا چپ کہ پلیٹ دوبارہ پٹخ دی۔
"...اب خود ہی۔"
...کہہ کر چھتائی۔
"...سنو تو... میں تو مذاق کر رہی تھی۔"
...تیز تیز قدموں سے کچن کی جانب چل دی تھی۔
"...فضول گوئی کی عادت ترک کر دو روا... یہ ہمیشہ خجالت ہی دیتی ہے۔"
...شندہ کو بھی اس کا یہ کہنا اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ اس کے رد عمل کے طور پر وہ ہما کے چہرے پہ کچھ عجیب سے
...تذبذب کی جھلکیاں تھیں۔
...تو اس کے چچا کا گھر ہے۔ یہ سسرال وسسرال بعد کی باتیں ہیں۔ جاؤ شاباش ہما! تم دے تو یہ بریانی نیچے۔
...وہ ویسے بھی دوپہر کا کھانا جلدی کھاتی ہیں۔"
...نہیں جانا چاہتی تھی لیکن ماں کو صاف انکار بھی نہیں کر سکتی تھی اس لیے تذبذب کے عالم میں
...کھڑی رہی۔
"...ویسے بھی حسن کون سا اس وقت گھر پہ ہوتا ہے جو تم جھجک رہی ہو۔"
...کی جھجک کو رخشندہ نے اپنی فہم کے مطابق معنی پہنائے۔ اب ہما مزید کچھ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی
...اس لیے پلیٹ اٹھا کے نیچے آ گئی۔
...بعد وہ اس پورشن میں آئی تھی۔ سب کچھ الگ الگ اور اجنبی اجنبی سا لگ رہا تھا۔
"ارے ہما..." پروین اسے دیکھ کر نہال ہو گئیں۔ "آؤ بیٹا... شکر ہے تم نے بھی قسم توڑی... میں تو تم سے
...شکوہ کرنے والی تھی۔ اس نے منع کیا ہو گا نا... حالانکہ رشتہ تو وہی ہے جیا... وہی گھر تمہارا اپنا
...چچا کا گھر، چچی کا گھر، دادی کا گھر۔"
"...بلکہ نہیں چچی..." وہ عجیب سی ہو گئی۔ "انہوں نے منع نہیں کیا بس ٹائم ہی..."
"...بس وقت کی نئی نئی مصروفیت ہے تمہاری جو میرے پاس آنے کا ٹائم اب نکالنا پڑے گا۔"
...انہوں نے ہما کا ہاتھ تھام کے اپنے پاس بٹھایا۔
"...لاؤں کیا...؟ کوک یا شربت اور یہ کیا لائی ہو؟"
"...کچھ نہیں چچی... ابھی ابھی چائے پی ہے اور یہ بریانی امی نے بھیجی ہے۔"
...نے بھی دونوں سوالوں کے جواب اکٹھے ہی نمٹائے۔
"...نے بنائی ہے...؟"
"...نہ۔"
"...شندہ نے بنائی ہوگی..."
"...کے کہنے کا مطلب ہے کہ رخشندہ بھابی بڑی فضول بریانی پکاتی ہیں۔"
...کی گھبراہٹ کم ہوتے ہوتے اب ختم ہی ہونے والی تھی کہ وصی کی آواز سن کر وہ اچھل پڑی۔
...پہ سمت آیا۔
...اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ یہاں آتے ہی اس سے بھی سامنا ہو سکتا ہے... وہ تو اسی پہ مطمئن ہو گئی تھی کہ
...حسن سے مڈبھیڑ نہیں ہوگی۔ اس لیے تو اس نے رشتے کے بعد یہاں آنا کم کر دیا تھا۔ لیکن نا معلوم
...شاید وصی کے بھی اوپر کے چکر لگنے گھٹنے غائب ہو چکے تھے۔

سے بغیر کال ڈس کنیکٹ ہونے کی ٹون سنائی دی۔
اس نے الجھن بھرے انداز میں ریسیور رکھا... اور اسکرین پہ نظر آتے اس نمبر کو دیکھنے لگا۔
مسئلہ سامنے تھا مگر حل بھی سامنے تھا۔
چاہتا تو اس نمبر پہ کال کر کے اپنے سارے سوالوں کا جواب پا سکتا تھا... ضروری نہیں تھا کہ کال ریسیو کرنے والا یا کرنے والی وہی ہوتی جس نے پچھلے کچھ دنوں سے اسے پریشان کر کے رکھا ہوا تھا۔ لیکن کم از کم اتنا تو پتہ چل جاتا کہ وہ ہے کون؟
جاننے والوں میں سے کسی کی شرارت تھی یا کسی انجانے فرد کی شرانگیزی۔

● ● ●

"بہت ہی سست لڑکی ہو تم... بریانی پڑے پڑے ٹھنڈی ہو گئی... مگر تم نہیں اٹھیں... اٹھتی ہو کہ میں جاؤں خود...؟"
رخشندہ نے پڑھائی میں غرق روا کو تیز نظروں سے گھورا۔ اس پہ مطلق اثر نہ ہوتے دیکھ کر بھرے انداز میں بولیں۔
"زیادہ سے زیادہ لوگ یہی کہیں گے کہ تین تین بیٹیوں کی ماں خود ہاتھ میں ڈش پکڑے دوسرے ہاتھ سے گھٹنہ پکڑے سیڑھیاں اتر رہی ہے۔"
ان کے گھٹنوں میں پچھلے تین چار روز سے تکلیف تھی۔
اور یہ بلیک میلنگ کچھ کچھ کارگر رہی۔ روا نے زور سے کتاب بند کی۔
"تو میں ہی... دیں... ان دونوں کو تو منگنی ہوتے ہی آپ نے ہتھیلی پہ بٹھا کے رکھ لیا ہے۔ کوئی کام ہی نہیں کرنے دیتیں۔ میرے ایگزامز ہو رہے ہیں اور پھر بھی سارے گھر کے کام مجھ ہی کو کرنے ہیں۔"
وہ ناراض ناراض سی اٹھ گئی تھی۔
"مثلاً...؟ کون کون سے گھر کے کام...!"
اس شدید جھوٹ پہ رخشندہ کو تاؤ تو بہت آیا... پھر بھی ضبط کرتے ہوئے پوچھا۔
"وہ جیسے... جیسے کل رات فریج میں پانی کی ساری بوتلیں میں نے بھر کر رکھیں... اور ہاں کل شام کو چائے میں نے بنائی تھی... وہ بھی... سب کے لیے... صبح آملیٹ کے لیے پیاز بھی ہما نے مجھ سے کٹوائی... لاؤنج میں بکھرے اخبار بھی آپ نے مجھے ہی سمیٹنے کو کہا تھا۔"
"جو پھر بھی تم نے نہیں سمیٹے۔"
ہما اس بحث سے اکتا کے کچن سے نکل آئی۔
"ہاں تو میں دوسرے کاموں میں بزی تھی۔ تمہارے پاس تو اچھی جگہ ہے چھپنے کی... کچن۔"
"میں کچن میں چھپ کر کیا کرتی ہوں...؟ پتا ہے تمہیں...؟"
ہما نے بریانی کی ڈھکی پتیلی سے خوان اٹھا کے سرسری سی نظر ڈالی اور پلیٹ اٹھا لی۔
اس کا ارادہ بھانپ کر روا پھر سے بیٹھ گئی اور کتاب کھول لی۔
"پھر سے بیٹھ گئیں... میں تمہارا کیا کروں روا..."
رخشندہ کو غصہ تو اس کی کام چوری پہ آتا ہی رہتا تھا... اب مایوس بھی ہونے لگی تھیں۔ ندا اور ہما... میں مصروف رہا کرتی تھیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ گھر کے کاموں میں بھی ان کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں... جب سے کالج جوائن کیا تھا۔ وہ چھٹی کے دن ہی شاذونادر ہی کچن کو رونق بخشا کرتی۔ اس کی ایک وجہ... بڑھتی مصروفیت تھی۔ دوسرے تھکن کے پیش نظر رخشندہ نے خود ہی اس پہ کم ذمہ داریاں ڈالی ہوئی تھیں اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ ہما نے اپنی گھرداری، دلچسپی کی وجہ سے خود ہی تن تنہا بہت سی ذمہ داریاں... لی تھیں۔
روا، ندا اور خود رخشندہ کے لیے بہت کم کام باقی بچتا لیکن رخشندہ کی خواہش بھی فطری تھی کہ بیٹھے بٹھائے...

نہیں ہوتی تھی۔ وہ ان کی خوشی میں خوش رہا کرتیں۔ یہی وجہ تھی کہ سب ان کی خوشی کو مقدم جانتے تھے اور ان سے جانتے تھے ورنہ زبردستی کرائی قدریں کتنی کھوکھلی ہوتی ہیں اس کا اندازہ مشکل نہیں۔ ایسے کردے بے شمار مثالیں بکھری ہیں۔

"آپ تو جانتی ہیں۔ سردیاں ہوتیں تو گھر میں ہر وقت بنا کے رکھے حلووں میں سے کچھ نہ کچھ پیش کیا جاتا مہمانوں کو۔ بادام کا حلوہ۔ پپیتے کا۔ دال کا۔ گاجر کا حلوہ لیکن حلووں کا موسم تو ہے نہیں اور حلوے کے علاوہ مجھے بس ایک کھیر بنانا آتی ہے میٹھے میں۔ کھیر بنانے کا وقت ہی کہاں ہے اس لیے قلفہ منگایا ہے اور سیخ کباب تازہ گرما گرم تلوانے بھیجوں گی حسان کو۔ مجھے تو وہی روز مرہ کے کھانے پکانے آتے ہیں۔ پلاؤ، کباب، قورمہ۔ بھائی جان کو مرغی کے بجائے بکرے کا گوشت بھاتا ہے اس لیے پلاؤ بھی گوشت کا بنایا ہے اور ساتھ قیمے کے کباب، مرغی بس نمک اور کالی مرچ کے ساتھ ہرا مسالہ ڈال کے بھون لی ہے۔ آج کل کی بچیاں بڑا چائنیز اور نوڈلز اور پیزا وغیرہ شوق سے کھاتی ہیں۔ شاید وشمہ کو بھی پسند ہو اس لیے حسان سے کہا ہے کہ آتے ہوئے کسی چائنیز ریسٹورنٹ سے نوڈلز پیک کروا لائے۔"

"تو کل ہما سے کہتیں وہ بنا دیتی تمہیں۔ پچھلی بار سراج کے کوئی ملنے والے قطر سے آئے تھے تو اس نے تم قسم کے کتنے ہی پکوان بنائے تھے۔ ہم تم تو نام سن کر ہی چکرا گئے تھے۔ اس بھلی نے کون سا انکار کرنا تھا۔"

"وہ تو انکار نہ کرتی لیکن اماں جان پہلے کی بات اور تھی اب کی اور۔ اب وہ میری ہونے والی بہو ہے۔ مجھے اس سے کوئی بھی کام کہتے جھجک سی آتی ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ شادی سے پہلے ہی بے گار لینا شروع کر دی۔"

"بے گار کی کیا بات ہے؟ اور کون سے لوگ کیا لوگ نہیں جانتے کہ اس کا اس گھر سے کیا رشتہ ہے؟ وہ اس گھر کی بیٹی پہلے ہے بہو تو ابھی بننا ہے اسے۔"

"اوروں کی کیا بات ہے۔" وہ بے الفاظ میں گلہ کرنے لگیں۔

"میری بھابی ہی کم نہیں۔ اسے تو میری ذات میں میری ہر بات میں خامی تلاشنے کا کوئی بہانا چاہیے۔ اسی لیے تو ہاتھ پیر پھولے جا رہے ہیں میرے کہ کسی قسم کی کوئی کسر نہ رہ جائے ورنہ اسے شکایت کا موقع ملے گا اور وہ میاں کے سامنے جتا بھی دے گی کہ لو دیکھو سالوں بعد آئے بہن کے ہاں اور یہ حال ہے۔"

بات ادھوری چھوڑ کے وہ تلخی سے ہنس دیں۔

"عجیب معاملہ ہے۔ عموماً تو نندیں ایسی صورت حال پیدا کیا کرتی ہیں میکے آ کر اور ہاتھ پیر بھاوجوں کے پھولا کرتے ہیں کہ بہن کے ماتھے پہ بل دیکھ کے میاں آگ بگولا نہ ہو جائے۔"

شوکت جہاں کی ہلکے پھلکے انداز میں کی گئی بات الماری کی دراز میں سے پیسے نکالتی پروین پہ پل بھر میں [illegible] لا دی۔

ماضی کے دھندلکوں میں سے عکس ابھارنے لگے.....

"میں نے تو کہہ دیا نویدے سے کہ میری پروین وہاں جانے کے بعد آئی اور تیری زنانی کا منہ [illegible] تمہیں سیدھا [illegible] سر پے بوٹے والی....."

"کیا ضرورت تھی اماں... رہنے..."

پروین کو بھی اچھا تو نہیں لگا تھا کہ اس کے آنے کے بعد منزہ نے سرسری سا سلام اور خیر خیریت دریافت کرنے کے بعد سے دوبارہ مخاطب تک نہ کیا تھا۔

"کیوں... ضرورت کیوں نہیں ہے؟ اپنا غلے... تو کلی کلی (اکیلی) بہن ہے۔ بھائی کو مٹھی میں رکھے گی تو تیرا کلا مضبوط رہے گا۔ بھائی کو یقین والی رہ کہ زنانی نہیں ماں اور بہن اس کی خیر خواہ ہیں۔"

"وہ تو خود جانتا ہے اماں! کون کس کا خیر خواہ ہے۔ کیا ضرورت ہے بے کار کی کوشش کرنے کی [illegible] میں ہوں... آپ ہوں یا پھر بھابی کیا فرق پڑتا ہے۔ اچھی بات تو یہ ہے کہ بھائی کے زیادہ سے زیادہ خیر خواہ

"یہی تو کل ہے... وہ کب ٹکتی ہے اپنے خصم کی۔ پچھلے کا وہ روا ہی نہیں نکلتا اس کے کلیجے سے۔ اس کا عشق کم ہو میرے نویدے کی خیر خواہ بنے۔"

"بھی اماں...؟"

کتنی بھی صاف نیت رکھنے کی کوشش کرتی... شمشاد کے زہر کے چھینٹے اسے آلودہ کر ہی دیتے تھے۔

"بھولی ہے؟ کتنی واری میں نے آپ دیکھا ہے اسے راتوں کو ہوکے بھرتے۔ اور وہ جو چھپکلی ہے اس کی باپ اس کی آنکھیں چوم چوم نہیں تھکتی۔ میں نے سنا ہے وہ کو نہ کرلی ہو سو اپنے پیو کی شکل اور آنکھیں لے رہی ہے۔"

"اچھا۔" وہ بدگمان سی ہو گئی اور کچھ کچھ متاسف بھی۔ کہ اس کا بھائی اپنی تمام تر نیک نیتی اور خلوص کے ہوا ایک عورت کی مکمل اور خالص توجہ اور محبت سے محروم تھا۔

"اسی لیے تو میں چاہتی تھی کہ وہ منحوس کم از کم اس گھر سے چلی جائے۔ وہ دفع ہو تو شاید اس بد ذات کے دل سے پچھلے خصم کا عشق کم ہو اور میرے نویدے کا بھاگ کھلے۔ نویدا تو پاگلوں کی طرح اس کے پیچھے گھوم رہا ہے۔ بیرے وار الو کا گوشت کھلا دیا ہے۔ نہ شکل نہ عقل نرا تعویذوں کا آسرا۔"

"تعویذ گنڈے؟" وہ متحیر ہوئی۔ اور کچھ کچھ خوف زدہ بھی۔ اسے ان تعویذوں اور عملیات وغیرہ سے بڑا ڈر لگتا تھا۔

"اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کچھ ہوش کر۔ بھائی کو نکال اس ڈائن کے چنگل سے۔ میں کون سا طلاق کروانے کو کہہ رہی ہوں۔ خوف خدا ہے بڑا۔ بے چاری۔ اک تے بیوہ دوجی طلاق... اوپر سے یتیم... میں نے کوئی پاگل نہیں لیکن اتنا بھی اندھیر نہیں ہے کہ میں اسے من مانی کرنے دوں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ڈوریں کھینچتی رہتی ہوں۔ تو بھی جب آیا کر اپنا رعب ڈال کے رکھا کر۔ نویدے سے چھوٹی ہے تو کیا ہوا... ہے تو اکلوتی نناں (نند) آنا نویدا تو جتاتا اسے کہ نہ میٹھے میں کچھ بنایا نہ بچوں کو شام کو کوئی کباب چپس تل کے دیے اور سراج کو معدے کی تکلیف ہے پھر بھی بریانی میں مرچیں دبا کے ڈال دیں اور کباب بھی بڑے تیکھے کے بنا دیے۔"

"لیکن اماں! انہوں نے تو کھانا کھایا ہی نہیں۔ کام تھا بہت ضروری... اس لیے جلدی۔"

"نہ ہو... تو کام نہ ہوتا تو [illegible]"

"شمشاد... ؟"

"تیرے [illegible] مرچوں والی بریانی اور تیکھے گوشت کے کباب۔ تو کہہ دینا نویدے سے کہ سراج نے اس لیے کھانا نہیں کھایا اور خالی [illegible] پہ ہی اٹھ کے چلا گیا۔ نویدے سے برداشت نہیں ہو گی یہ بات کہ اس کا بہنوئی اس کی بیوی کی وجہ سے ناراض ہو۔ وہ چنگی خبر لے گا اس مسنی کی۔"

"لیکن اماں...؟"

وہ متذبذب تھی۔ یہ سب اس کی فطرت کے خلاف تھا۔ منزہ سے اس کے تعلقات قابل رشک نہ سہی۔ بھلے [illegible] سے ایک نہ سمجھ میں آنے والی سرد مہری اور گریز کا رشتہ تھا۔ اس کے باوجود ایسی سیاست وہ اس کے خلاف بھی نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے اس نے ماں کی ہدایت پہ عمل نہیں کیا۔ یہ قابل ستائش تھی۔

لیکن قابل مذمت حرکت یہ تھی کہ اس سے مایوس ہونے کے بعد جب شمشاد نے یہی بات اس کے سامنے ہی نویدے سے کہی تو وہ کھل کے تردید نہ کر سکی۔ نہ اکیلے میں بھائی کو لے جا کر معذرت کر سکی۔ صرف نظروں ہی نظروں سے باز رہنے کی التجا کی جسے شمشاد نے لاپروائی سے مسترد کر دیا تو وہ سانس بھر کے دوسری جانب دھیان کر لیا اور اس نے یہ جاننے کی کوشش ہی نہ کی کہ اس دن کے بعد جب جب وہ میکے آئی تو نوید مراد نے منزہ کو کس طرح ٹریٹ کیا اور اس کے ہر ہر عمل کو بے پناہ تنقید اور شک کے گھیرے میں لیا۔

"کیا سوچنے لگیں؟"
شوکت جہاں کی بات پر وہ چونکیں۔
"کچھ نہیں۔۔۔ بس ویسے ہی۔"
وہ بوجھل دل کے ساتھ چپسے کترنے لگیں۔

☆ ☆ ☆

"یہ لڑکی بالکل تم پر گئی ہے۔"
اصغر نے جھنجلا کے کہا تو رینا کی گردن تفاخر کے احساس کے ساتھ خم لے کر بلند ہوگئی۔
"تمہارے جیسی ضدی اور ہٹ دھرم۔"
"یہ ضد اور ہٹ دھرمی نہیں مستقل مزاجی اور لگن ہے۔ اپنے مقصد کو پانے کا جنون ہے۔"
اس نے نادیدہ گرد کو اپنی کیپری سے جھاڑتے ہوئے تنفر سے جواب دیا۔ ایک تو ویسے ہی اصغر اس کے سامنے کم مائیگی کے بوجھ تلے دبا نظر آتا تھا۔ اوپر سے وہ جان بوجھ کے اس سے باتیں بھی ایسی بھاری بھرکم کیا کرتی تھی جن سے وہ سٹپٹایا ہوا لگتا۔
"اچھا جنون ہے۔ یعنی اب بھٹی صاحب کی پوتی ہارمونیم بجانا سیکھے گی۔" وہ تپا بیٹھا تھا۔
"کلاسیکل میوزک سیکھنا ہائی کلاس کا Latest ٹرینڈ ہے اصغر! تم نہیں سمجھو گے۔"
"میں صرف اتنا سمجھتا ہوں کہ ہائی کلاس ہو چاہے پرائمری کلاس۔۔۔ ہے تو یہ کنجروں میراثیوں کا کام اب ہمارے خاندان کی لڑکی ہارمونیم بجاتی طبلہ بجاتی اچھی لگے گی۔"
"وہ کوئی پروفیشنلی یہ سب Own نہیں کر رہی اصغر! اپنے شوق کے لیے کر رہی ہے۔"
"ایسی کی تیسی اس کے شوق کی۔ مجھے ایسے سارے شوق تاک کے راستے باہر نکالنے آتے ہیں۔"
وہ آپے سے باہر ہو رہا تھا اور ایسا پہلی بار نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ اس قسم کے غیرت کے دورے وقتاً فوقتاً پڑتے رہتے تھے۔ پہلے جب رینا نے ساڑھی کے بلاؤز کا سائز پہلے کی نسبت مختصر کردیا۔ جب اس نے تنہائی کے علاوہ سر عام اسموکنگ شروع کی اور تب جب اس نے سوئمنگ کلاسز جوائن کی تھیں اور تب جب کئی سال پہلے اس نے دوستی کے نام پہ سوہا کے جیفس کے ٹیوٹر سے اچھی خاصی بے تکلفی پیدا کرلی تھی۔ وہ کلبلا کلبلا کے اپنی غیرت کے مظاہرے کر رہی ہوا کرتا تھا اور بدلے میں رینا سے خاطر خواہ تواضع بھی کروایا کرتا تھا۔
"رہنا تم سدا کے وہی اندرون لاہور کے باسی۔"
رینا نے چبا چبا کے انتہائی حقارت سے کہا۔
"میں باسی ہوں تو تم کون سی سولہویں سال چڑھی ہو۔ تین چار سال ہی چھوٹی ہوگی مجھ سے۔"
اس کی سمجھ میں نہ تو رینا کی وہ انگریزی آئی تھی جس میں خود رینا بھی طاق نہیں تھی مگر دوسروں کو متاثر کرنے کے لیے چند سکّہ بند جملے اور الفاظ ضرور رٹ رکھے تھے اس نے جن کو وہ اپنی گفتگو میں کچھ ایسی مہارت اور بے ساختگی سے ٹانکتی کہ سب اسے کانونٹ کا تعلیم یافتہ سمجھتے۔
اور نہ ہی اس کے بنے رینا کی وہ اردو آئی تھی۔ جو اس نے رسالوں ناولوں اور شعری مجموعوں سے سیکھی تھی ورنہ جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں زبان اس سے کہیں زیادہ کرخت، تلخ اور شرمناک تھی جس کا چلن اصغر کے ہاں تھا۔
"ویسے ہی کالی بنتے کا شوق چڑھا رہتا ہے۔ اب یہ کوئی تک ہے اس قمیص کے نیچے یہ تنگ موری کا پاجامہ پہنے کی۔ جو ہے بھی ٹخنوں (ٹخنوں) سے اونچا۔ آدھی پنڈلیاں نظر آرہی ہیں۔"
"یہ کیپری ہے اسٹوپڈ۔۔۔"
رینا تخت بد مزہ ہوئی۔

"جو بھی ہے۔ پہلے تو شوخوں والا لباس اور قمیص کون سی ڈھنگ کی ہے۔ پہلے چھوٹی قمیصوں نے آخر ڈالی ہوئی تھی اب لمبی سلانے لگی ہے تو چاک پہلوانوں کی طرح بغلوں تک ادھیڑ رکھے ہوتے ہیں" آدھا پیٹ اور کمر نظر آرہی ہوئی ہے۔"
"اصغر۔ تم میرے ڈریس میں کیڑے نکالنے کے بجائے وہ بات کرو جس کے لیے تڑپتے ہوئے آئے تھے میرے پاس۔ مجھے دیر ہورہی ہے۔"
"کہاں جانا ہے؟ ہونکوں کو اجاڑنے؟"
رینا نے گہری سانس لی اور بغور اس کا جائزہ لیا۔ ڈولتا جسم ڈھلتی بند ہوتی مخمور آنکھیں، سوچے بولے لڑکھڑاتی آواز وہ بے تحاشا پیے ہوئے تھا اور اتنی بحث بھی تب ہی کرنے کی ہمت کرتا تھا جب اس حالت میں ہوتا تھا اور وہ جانتی تھی کہ جب تک مدہوش ہو کر گر نہیں جائے گا کام ایسے ہی اپنا اور اس کا دماغ خالی کرتا رہے گا۔
"پارلر جارہی ہوں اصغر۔۔۔ راستہ دو مجھے۔"
"پارلر ہی جارہی ہو ناں۔۔۔ کون سے دفتر جارہی ہو یا اسکول جو ٹائم پہ نہ پہنچیں تو گیٹ بند ہوجائے گا۔ بیٹھو آرام سے ضروری بات کرنی ہے تم سے۔"
"میں نے جس سیلون سے ٹائم لیا ہے وہاں اپائنٹ منٹ لینے میں ہی کئی دن لگ جاتے ہیں۔ سوری! میں یہ اپائنٹ منٹ مس نہیں کرسکتی اور وہ بھی تمہاری بے سروپا بکواس سننے کے لیے۔"
آخری فقرہ اس نے زیر لب دہرایا۔ نشے میں چور اصغر سے کوئی بعید نہیں کہ اس حالت میں ایسی اشتعال انگیز بات سننے کے بعد وہ کوئی ہنگامہ برپا کردیتا۔
"پہلے اس بات کا فیصلہ کرو۔۔۔ میں نے کہہ دیا ہے کہ سوہا کوئی استاد وغیرہ نہیں رکھے گی اس گھر میں۔ گانا بجانا سکھانے والا شریفوں کا علاقہ ہے یہ بڑی عزت ہے میری۔ لوگ کیا کہیں گے جب یہاں سے طبلے کی تھاپ ہارمونیم کی اور ستار کی آوازیں آئیں گی۔"
"لوگ یہی کہیں گے کہ اصغر بھٹی کے گھر کوئی خوش ذوق انسان رہتا ہے۔ پتا نہیں کس دنیا میں رہتے ہو تم۔ جسے تم شریفوں کا علاقہ کہہ رہے ہو۔ وہ شریفوں کا نہیں صرف پیسے والوں کا علاقہ ہے۔ وہ زمانہ گیا اصغر۔ جب انسان کے درجے اس کے کردار کے لحاظ سے بانٹے جاتے تھے۔ شریف لوگ۔۔۔ نیک لوگ۔۔۔ بے ایمان لوگ۔۔۔ بددیانت لوگ۔۔۔ اب صرف دو کیٹیگریز ہیں۔ امیر اور غریب۔ یہاں جتنے لوگ رہتے ہیں اپنے کریکٹر سرٹیفکیٹ کی وجہ سے نہیں بینک بیلنس کی وجہ سے رہتے ہیں۔ ہماری لین میں دو مشہور ترین خواتین رہتی ہیں۔ ایک ملک کی نامور سنگر ہے۔ جس کے نام سے کنسرٹ کے مہنگے ترین ٹکٹس بھی کھڑے کھڑے بک جاتے ہیں اور وہ کسی بازار سے نہیں شرفاء ہی کے خاندان سے ہے کیا ہوا جو اس پیشے سے وابستہ ہونے کے بعد شہرت میں اضافے کے لیے اس نے حرکتیں بازار والی ہی شروع کردی ہیں۔ ظاہر ہے بارہ میٹر کی ساڑھی پیٹ کر ناف سے لپیٹ کر گانا گانے والی سنگر کو کون پیسہ خرچ کرکے دیکھنے آئے گا۔ اسے تو کوئی مفت میں ٹی وی پہ دیکھنے کو تیار نہیں ہوتا۔ فوراً چینل بدل دیا جاتا ہے اور وہ دوسری محترمہ وہ ڈنکے کی چوٹ پہ خود کو بازار کی بتاتی ہے لیکن اب اس کا بازار ذرا نئے طریقے سے سجتا ہے وہ نہ کوٹھا سجاتی ہے نہ اپنے چار کنال کے بنگلے میں مجرے کی محفل سجاتی ہے۔ وہ تھیٹر پہ پیسے خرچ کرکے آنے والوں کو تفریح مہیا کرتی ہے "آرٹ اور فن کے نام پہ" اگر ان کے گھروں سے ہر طرح کے آلات موسیقی کی آواز آسکتی ہے تو اصغر بھٹی کے گھر سے کیوں نہیں۔"
"کیونکہ اصغر بھٹی کسی۔۔۔ کی اولاد نہیں۔"
اصغر کے منہ سے بھاری بھرکم گالی سن کر رینا کے گال دہکنے لگے۔ اسے لگا جیسے اصغر کے منہ سے بدبودار بھبکوں کے ساتھ تیزاب کے چھینٹے اڑ کے اس تک آگئے ہوں۔
"میں نے ڈول دو دکھاؤ؟"

وہ پوری طاقت سے چلائی اور اپنے کمرے میں جنونی انداز میں اپنے کمرے میں چلتی ٹھیلتی سوہا کو اس کے باوجود اس کی آواز سنائی دی۔
اس نے جلدی سے ایئرفون اتارا اور بیڈ سے اتر کے دروازے تک آئی۔ وہ کتوں کے لڑنے کی آوازوں جیسی غرغراہٹ، خراہٹ اور جھنجھلاہٹ باہر سے آ رہی تھی۔ اصغر اور ریتا کے روم سے.....
وہ ہینڈل پہ ہاتھ رکھ کے سوچنے لگی کہ باہر جائے یا نہ جائے۔

"ہاں ہوں میں وہ اولاد... نہ کرتے مجھ سے شادی۔ نہ ناک رگڑتے میری ماں کے سامنے۔ کر لیتے اپنے خاندان کی کسی بانو، سلمیٰ یا رشیدہ سے شادی۔ اور جن بھر بچے پیدا کرتے اپنے جیسے 'نکمے' کم عقل، بد شکل اور بدزبان، کتے لوٹ رہے ہوتے تمہارے اس گھر میں۔ وہی نقشہ ہوتا جو تمہارے اعلیٰ نسب کے خاندان کے اکثر گھروں کا ہوتا ہے۔ قالینوں سے بدبو کے بھبکے اٹھ رہے ہوتے۔ صوفوں پہ سالن اور پان کے داغ لگے ہوتے۔ پردوں سے جھول جھول کر بچوں نے حشر کر دیا ہوگا۔ فریج بچے ہوئے باسی کھانوں سے اٹا پڑا ہوتا اور تمہارے بیڈ پہ چربی کے ڈھیر کی صورت وہ عورت پڑی ہوتی جو اس فلکو کے باوجود بھی پہنتی جو میں نے پہن رکھا ہے۔ تم کیا سمجھتے ہو تمہارے شریف خاندان کی عورتیں اب تک کلائیوں تک بند آستینوں والی بند گلے کی قمیصیں پہنتی ہیں۔ وہ تمہارے کزن ارشاد کی شوگر کی ماری بیوی، کبھی اس کی قمیص کے آگے پیچھے سے پھٹے ہوئے گلے ملاحظہ کرنا اور وہ تمہاری پھوپھو کی آدھ درجن پوتیاں۔ کنیرڈ کالج کی دیواروں تک میں جن کی شرافت کی داستانیں لکھی پڑی ہیں۔ ہاں ہوں میں بازاری، تمہارے لیے اتنا کچھ کر کے بھی میں بازاری ہوں؟ تمہارا گھر بنا کے... تمہاری بھتیجی کو سینے سے لگا کر پالنے کے بعد، تمہاری پاگل بہن کو جھیلنے کے بعد، تمہیں کہاں سے کہاں پہنچا دینے کے بعد، تمہیں اپر کلاس سوسائٹی میں ایک نمایاں حیثیت دینے کے بعد بھی میں بازاری ہوں۔"
نشے میں اصغر تھا۔ جبکہ آپے سے باہر وہ ہو رہی تھی۔ اصغر پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ بولتے بولتے جب اس کا حلق خشک ہونے لگا اور دماغ ماؤف... تو وہ لہرا کے نیچے گری اور سوہا نے ہینڈل پر رکھے ہاتھ کو خفیف سی حرکت دی۔

☆ ☆ ☆

"بڑی پیاری بچی ہے وشمہ..."
شوکت جہاں نے جھینپی جھینپی... شرمائی شرمائی سی وشمہ کو پسندیدہ نظروں سے دیکھا۔
اس نے اپنی متلاشی نگاہیں فوراً جھکا دیں۔ وہ جب بھی یہاں آتی اس کا رواں رواں وصی کی جانب ہی متوجہ ہوتا تھا لیکن پروین کو آج ہی اس کے انداز اور تیور کچھ بدلے بدلے لگ رہے تھے۔ اس کا شرمانا... اس کا جواسیاپن... اس کا بار بار راہداری کی جانب تکنا۔ بیٹھے بیٹھے مسکرا دینا۔ ان سب کو وہ اپنے مرضی کے معنی پہنا رہی تھیں اور انہیں ایک نامعلوم سی انجانی سی خفت بھی ہو رہی تھی۔ حالانکہ پھوپھی ہونے کے ناتے انہیں وشمہ سے بہت محبت تھی اور جس طرح وہ پیدا ہوتے ہی ماں کی گود سے محروم ہو گئی تھی۔ اس سے پروین تو کیا باقی متعلقین کی بھی اس کے لیے ہمدردی محبت میں ڈھل کے اور توانا ہو گئی تھی۔ وہ صرف اور صرف اپنی نظر سے دیکھتیں تو انہیں وصی اور وشمہ کا جوڑ بڑا بھلا لگتا۔ یہ خیال بھی خوش کن لگتا کہ وشمہ کو ان کے گھر بسنا تھا، کہ بنا کی ماں... شمشاد کی روح کو بھی سکون ملے گا کیونکہ ان کی مرتے دم تک یہ خواہش تھی کہ وہ پوتی کو سوتیلی ماں کے بجائے پھوپھی سے زیادہ قریب رکھے۔ ماں کی خواہش نے پروین کے اندر بھی یہ کسک جگا دی تھی کہ ان کے اور وشمہ کے مابین روایتی پھوپھی اور بھتیجی والی انسیت اور لگاؤ نہیں ہے۔ اب تو انہیں خوش ہونا ہی چاہیے تھا اور وہ چاہ کے بھی خوش نہیں ہو پا رہی تھیں۔ ان کی خوشی میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی منزہ۔
وہ جب جب وشمہ کے کھلے کھلے چہرے پہ محبت بھری نگاہ ڈالتیں برابر بیٹھی منزہ کے ہونٹوں پہ پھیلی استہزائیہ مسکراہٹ انہیں نظر جھکانے پہ مجبور کر دیتی۔ ایسا لگتا جیسے منزہ وشمہ کی کم عمری کی جذباتیت کی تشہیر کر کے انہیں شرمندہ کر رہی ہو۔ جو بھی تھا وشمہ کا اور ان کا خون کا رشتہ تھا۔ اس کی کسی بھی کمزوری کا کسی دوسرے کے ہاتھ آ جانا پروین کے لیے سبکی کا باعث تھا۔

انہیں یاد تھے منزہ کے وہ الفاظ۔
"میں وشمہ کی ضد کے آگے مجبور ہوں۔ ورنہ ناواں تو میں تب بھی نہیں تھی جب عمر جذباتی پن پہ اکساتی ہے۔ پروین! تم جانتی ہو کہ مجھے دل مارنا آتا ہے۔ جب میں نے اپنی بیٹی کو خود سے دور جاتے دیکھ کر احتجاج کی آواز بلند نہیں کی۔ کوئی اسٹینڈ نہیں لیا تو صرف اتنی سی بات۔ شوہر اور سسرال کے سامنے کیا تو یہ کہ وشمہ کو تمہاری بہو بنانا میری دیرینہ خواہش ہے۔ میں کیا اور میری خواہش کیا۔ میں تو وشمہ... اس نے جھکایا ہے مجھے۔ ماں ہوں اس کی اور مائیں جھک ہی جایا کرتی ہیں اولاد کے ہاتھوں۔ مجھے ڈر ہے کہ کہیں وہ کسی انتہا پہ نہ چلی جائے۔"
اور ایسا کہتے ہوئے اس کے الفاظ اور لہجے میں بے شک بہت عاجزی اور انکسار تھا۔ ٹوٹ کر بے بسی جھلک رہی تھی لیکن پروین کو اس کی آنکھوں میں استہزاء کے رنگ صاف دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نظریں جھکانے کے سوا کچھ نہ کر سکی تھیں۔
"بس بیٹیوں کے نصیب اچھے ہونے چاہئیں۔"
منزہ پروین کی ساس کے سامنے بہت متانت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ ویسے بھی پروین کی باتوں پہ وہ وقتی طور پر چاہے منزہ کے بارے میں بددل ہو جاتیں مگر مجموعی طور پہ ان کی رائے بہو کی اس بھاوج کے بارے میں ٹھیک ٹھاک تھی۔ جب انہوں نے ہمیشہ اسے بڑی معقول گفتگو کرتے پایا تھا۔
"بیٹیاں اپنے نصیب لکھوا کے لاتی ہیں۔ کسی کا دیر سے، کسی کا سویرے۔ مگر نصیب کھلتا ضرور ہے۔ اب میری پوتیوں کا ہی دیکھ لو... ایک کے بعد ایک کے مقدر کھلتے گئے۔ نداکا رشتہ تو چلو غیروں سے آیا۔ مگر پھر بھی اتنے اچھے قدر کرنے والے لوگ اور ہما تو خیر چچی کے پاس آ رہی ہے۔ ویسے ہی دل کو سکون مل گیا۔ اب خیر سے رداکے لیے بھی اچھے..."
"میاں صاحب کو کہا بھی تھا کہ جلدی آ جائیں۔ حسان کو کہتی ہوں کہ دوبارہ فون کرے۔"
پروین نے کبھی شوکت جہاں کی بات کاٹنے کی جرأت نہیں کی تھی۔ آج مصلحتاً انہوں نے یہ گستاخی کی تو وہ پل بھر کو چپ ہو گئیں۔ غور سے ان کا چہرہ دیکھا اور بھانپ گئیں کہ وہ قبل از وقت یہ اطلاع کسی کو دینا نہیں چاہتیں۔ اس لیے موضوع تبدیل کرنا چاہا۔
"میں تو کہتی ہوں بچی ہو یا بیٹا... بس اللہ سے اس کی دعا مانگنی چاہیے۔"
"لیکن خالہ جان۔ آپ کی پوتیوں کی بات اور ہے۔ ماشاء اللہ سے ان کے چچا، ماموں وغیرہ کو ان کا خیال ہے۔ کم از کم انہوں نے اپنے بھائی کا بوجھ ہلکا کرنے کا سوچا تو ورنہ اس نفسا نفسی کے دور میں کون کس کے بارے میں سوچتا ہے۔ اب تو رشتے ناتے بھی لوگ اپنے مفاد اور سہولت کو مدنظر رکھتے ہوئے طے کرتے ہیں۔"
پروین اپنا جملہ کٹ کے رہ گئیں۔
"اور نوید تو اکیلے اکیلے ہیں۔ میرا مکمل بدقسمتی سے وشمہ کا ننھیال نہیں ہے۔ میں نے خود سالوں کی رفاقت کے بعد اس کی ماں کا درجہ پایا ہے اور ابھی شاید کئی سال لگیں گے ان لوگوں کو وشمہ کے اپنے بنانے میں۔ یہی وجہ ہیں جنھیں شکتے تو خاندان کا بھی آسرا نہیں اور با ہر بیٹی دیتے ہوئے سو سو ڈر کے ہوتے ہیں۔ خاص طور سے اتنے لاڈوں سے پلی بیٹی کے لیے۔"
"یہ سب تو ہے..." شوکت جہاں نے غائب دماغی کی کیفیت میں کہا۔ ان کا سارا دھیان منزہ کی اسی بات پہ اٹکا تھا۔

"نوید تو اکیلے اکیلے ہیں۔"
"کیا کیوں... بھائی نہ سہی... بہن تو ہے... پھر منزہ نے ایسا کیوں کہا... کہیں وہ..."
انہوں نے پرسوچ انداز میں اپنی چوڑیوں سے کھیلتی وشمہ کو دیکھا۔ ہزار بار کی دیکھی ہوئی ان کے سامنے پل کر جوان ہونے والی وشمہ... جو ان کی نظر میں آج تک کتابوں میں ایک تھی۔

کھلتی ہوئی چمپئی رنگت۔۔۔
کمر سے نیچے آتی گھنی چوٹی۔۔۔
نرم لب و لہجہ۔۔۔ شائستہ اطوار۔۔۔

"یہ خیال تو پروین کو۔۔۔ لیکن نہیں۔۔۔ جن کے ساتھ دن رات کا ساتھ ہے۔ ان بچیوں کا دھیان بھی میں نے ہی اسے دلایا۔ تو وشمہ کا خیال کیسے آتا۔ یہ پروین بھی ناں جوان بیٹوں کی ماں ہے اور سمجھ بوجھ۔۔۔ کب تک رہوں گی میں اس کی انگلی پکڑنے کے لیے۔"

وہ مسکرا دیں۔

اور منزہ جو بڑی دیر سے ٹٹولتی نظریں ان پہ جمائے وشمہ میں ان کی دلچسپی کو محسوس کر رہی تھی۔ اس مسکراہٹ سے ایک حوصلہ سا پاتے ہوئے مطمئن ہو گئی۔

"شاید میں ان تک اپنی بات پہنچانے میں کامیاب رہی ہے۔"

"ماما۔۔۔ جوس۔۔۔"

سوہا نے سہارا دے کر ربنا کی کمر تکیے سے ٹکائی اور جوس کا گلاس اس کے لبوں سے لگانا چاہا۔ جسے ربنا نے ہاتھ سے پرے کر دیا۔

"نہیں۔۔۔ پانی۔۔۔ بہت زیادہ ٹھنڈا۔۔۔"

سوہا نے بیڈ روم کے کارنر میں رکھے Chiller سے گلاس بھرا اور ربنا کے سامنے کیا۔ جسے اس نے ایک گھونٹ بھرنے کے بعد منہ بنا کے پیچھے کر دیا۔

"میں نے کہا ناں بہت زیادہ ٹھنڈا پانی۔۔۔"

نقاہت اس کی آواز سے جھلک رہی تھی۔

بی پی شوٹ کر جانے کی وجہ سے وہ بے ہوش ہو گئی تھی۔ فوری ٹریٹ منٹ کی وجہ سے اس کی حالت سنبھل گئی۔ ورنہ ڈاکٹرز کے مطابق ذرا سی بھی دیر ہو جاتی تو نتیجہ ہارٹ اٹیک یا فالج کی صورت میں ظاہر ہو سکتا تھا۔

ساڑھے چھ گھنٹے تک ہاسپٹل میں رہنے کے بعد اسی کے ضد کرنے پہ اسے گھر لایا گیا اور اب مسکن انجکشن کی وجہ سے لی گئی ایک لمبی نیند کے بعد بھی وہ خود کو بے حد تھکا ہوا اور نڈھال محسوس کر رہی تھی۔

سوہا نے انٹر کام پہ ملازمہ کو آئس کیوبز لانے کی ہدایت دی۔

"کچھ کھائیں گی آپ۔۔۔؟"

"بہت گرمی لگ رہی ہے۔۔۔ آگ برس رہی ہے کمرے میں۔"

وہ وحشت کے عالم میں گاؤن کی ڈوریاں کھینچ کر ڈھیلی کر رہی تھی۔

"اے سی فل کولنگ دے رہا ہے ماما! ایسا کریں آپ شاور لے لیں فریش فیل کریں گی۔"

"شاور۔۔۔ لیکن آگ میرے باہر نہیں میرے اندر لگی ہے سوہا۔۔۔"

وہ آنسوؤں کے ساتھ رو رہی تھی۔

سوہا پریشان ہوا تھی۔ ڈاکٹر نے سخت تاکید کی تھی کہ ربنا کو ٹینس ہونے سے بچانا ہے۔

"شعلے دہک رہے ہیں میرے اندر۔۔۔ ایسے لگتا ہے جیسے ابھی بھسم ہو جاؤں گی۔"

"آئس کریم کھائیں گی آپ؟"

"آئس کریم۔۔۔؟"

وہ زور سے ہنس پڑی اور ہنسی ہی چلی گئی۔ ہنستے ہنستے اس کی پلکوں پہ آنسو ستاروں کی مانند چمکنے لگے۔

"ہاں۔۔۔ آئس کریم۔۔۔ اب میری ہی بیٹی مجھے آئس کریم دے کر بہلائے گی۔ کسی بچے کی طرح۔"

"ماما پلیز۔۔۔ ریلیکس۔۔۔ زیادہ ہائپر ہونا آپ کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"میں نے آج تک کچھ بھی ایسا نہیں کیا سوہا! جو میرے لیے اچھا ہو۔ ہر وہ چیز جو میرے لیے اچھی تھی۔۔۔

لیے بنی ہی نہیں۔"

ربنا۔۔۔ سوہا اسے زبردستی لٹانے کی کوشش کرنے لگی مگر ربنا اس کے ہاتھ جھٹک کر اٹھ بیٹھی۔

"تم بتاؤ۔۔۔ کیا ہے میں نے کچھ اچھا۔۔۔؟ یہ۔۔۔ یہ تمہارے چچا سے شادی۔۔۔؟ یہ کر کے میں نے کیا اچھا کیا؟ کیا یہ میرے قابل تھا۔۔۔؟ کیا میں اسی ساہو کار کو ڈیزرو کرتی تھی۔۔۔ بولو۔۔۔"

وہ ہذیانی کیفیت میں بول رہی تھی۔

سوہا نے لاجواب ہو کر سر جھکا لیا۔

سوال تو ہوش سنبھالنے سے لے کر اب تک اس نے بھی کئی بار خود سے کیا تھا۔ بھلا کوئی جوڑ تھا مام اور چاچو میں؟

دیکھنے میں بھی بے ڈھب۔۔۔

اور مزاج بھی "شرفا" "غربا"۔۔۔

لیکن آج پہلی بار ربنا خود اس کے سامنے یہ تسلیم کر رہی تھی۔

"تو نہ کرتیں آپ ان سے شادی۔"

"ڈوبتا تنکے کا بھی سہارا نہ لے تو کیا کرے۔۔۔"

"جس طرح آپ اندر ہی اندر گھلتی رہتی ہیں۔ پچھتاتی رہتی ہیں اس سے تو اچھا تھا آپ خود کو ڈوبنے دیتیں۔"

سوہا بھی سچ ہو گئی۔ پچھلے نو گھنٹے اس نے ربنا کی خرابی طبیعت کی وجہ سے جلتے پیر کی بلی کی طرح گزارے تھے اور ربنا تھی کہ اپنی حالت مزید خراب کرنے کے درپے تھی۔ اس کی لاکھ تاکید کے باوجود ڈپریشن کے شکنجے میں خود کو دیتی چلی جا رہی تھی۔

"میں گھلتی ہوں۔۔۔ پگھلتی ہوں۔۔۔ مگر پچھتاوے کی آگ میں نہیں۔۔۔ مجھے غم ضرور ہے مگر ڈوبتے ہوئے اس تنکے کا سہارا لے لینے کا نہیں، اس تنکے کا قصور نہیں ہے سوہا! قصور اس کا ہے جو کنارے پہ کھڑا مجھے ڈوبتا دیکھ رہا تھا مجھے بچا اس سے۔۔۔ سوہا۔۔۔ اس نے۔۔۔"

وہ بے تحاشا روتی اس کی گود میں گر گئی اور سوہا کچھ سمجھتے ہوئے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس کے بکھرے بالوں میں انگلیاں پھیرتی رہی۔

☼ ☼ ☼

"ارے مامی جی! لیتا آؤں گا۔ مجھے نانو کی سب دوائیں یاد ہیں۔ آپ کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔"

نبیل نے ڈرائیونگ کے دوران کہا۔ ساتھ والی سیٹ پر منزہ بیٹھی تھی جبکہ وشمہ پیچھے بیٹھی چور نظروں سے بیک ویو مرر میں نظر آتی اس کی جھلک کو تک رہی تھی۔

کھانے کے دوران ہی نوید مراد کو اس کے کسی دوست کا فون آ گیا تھا۔ کسی ایمرجنسی کی وجہ سے انہیں کھانے کے فوراً بعد جانا پڑا۔ منزہ اور وشمہ بھی ساتھ نکلنے کو تھیں کہ شوکت جہاں نے اصرار کیا۔

"اتنے عرصے بعد آئے اور غیروں کی طرح کھانا کھاتے ہی چلے گئے۔ ابھی تو منزہ بھاوج نے جی بھر کے باتیں بھی نہیں کیں۔"

ان کی اس بات پہ منزہ اور پروین ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئیں۔ ان کے درمیان بھلا کون سی باتیں تھیں کرنے کو۔

"اور وشمہ کے لیے اس کی پھوپھو نے خاص منگوا کے رکھا ہے اس کی پسند کا فالودہ۔"

"لیکن خالہ جان۔۔۔ نوید انکل جا رہے ہیں۔ وہاں سے نجانے کب فارغ ہوں۔ پھر یہاں تک آنا۔ یہاں سے گھر جانا۔ بہت لمبا چکر پڑے گا ورنہ رک ہی جاتے۔"

منزہ نے نیم رضامندی کے عالم میں توجیہہ پیش کی۔

"کوئی بات نہیں آنی! مجھے گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ بعد کسی کام سے وہاں جانے کے لیے نکلنا ہے۔ آپ میرے ساتھ

چلی چلے گا۔"

وصی کی پیشکش پہ جہاں وشمہ کا چہرہ کھل گیا وہیں پروین نے ایک گہری نظر وصی پہ ڈالی مگر وہاں کسی غیر معنی خیز بات کا شائبہ بھی نہ تھا۔

"آنٹی! ایک بات پوچھوں۔۔۔ آپ مائنڈ تو نہیں کریں گی؟"

وصی نے تھوڑی ہی دیر بعد پوچھا تھا۔

"آپ کی۔۔۔ تب کی ایک بیٹی بھی تو ہوا کرتی تھی۔"

اس نے تمہید باندھی لیکن اس کے "ہوا کرتی تھی" کہنے پہ منزہ کے دل پہ گھونسا سا لگا۔

اس کی مسکراہٹ پل بھر میں سمٹ گئی۔

"میری بیٹی میرے ساتھ ہی ہے۔"

اس کے ٹھنڈے لہجے میں کہنے پہ وصی ذرا سنبھلا۔

"سوری۔ اشاید میں غلط کہہ گیا۔ میرا مطلب تھا ایک اور بیٹی۔۔۔ سوہا۔"

"تمہیں اس کا نام تک یاد ہے ابھی؟"

اسے وصی کی یادداشت پہ حیرت ہوئی۔

"میں صرف اس کے نام سے نہیں اور بھی بہت باتوں سے واقف ہوں۔۔۔ وہ۔۔۔ میری۔۔۔

دوست۔۔۔" کہتے کہتے اس کی زبان رک گئی۔ وہ جس ماحول کا پروردہ تھا۔ منزہ بھی اسی ماحول سے تعلق رکھتی تھی۔ دونوں گھرانوں میں اس قسم کی دوستی کو معیوب سمجھا جاتا تھا لیکن اس کے یوں کہتے کہتے رک جانے پہ وشمہ نے معنی خیز انداز میں اسے دیکھا تھا۔

"تم ملے ہو اس سے؟"

منزہ کے لبوں سے سرسراہٹ کے انداز میں الفاظ نکلے۔

"جی۔۔۔ آنٹی۔۔۔" دل میں کوئی چور نہ ہوتے ہوئے بھی وہ شرمندہ تھا۔ پھر خواہ مخواہ ہی وضاحتیں پیش کرنے لگا۔

"دراصل وہ۔۔۔ ندا آپی کے کالج میں پڑھتی ہے۔ ایک بار ندا آپی کو ڈراپ کرنے گیا تو۔۔۔ ایکچوئلی۔۔۔ میں اسے پہلی نظر میں ہی پہچان گیا تھا۔۔۔ وہ اب بھی ویسی کی ویسی ہے جیسی بچپن میں تھی۔"

"ہاں۔۔۔ مگر بچپنے میں۔"

ایک ادا سی۔۔۔ لٹی پٹی سی مسکراہٹ منزہ کے چہرے کو وحشت ناک بنانے لگی۔

"میرے بارے میں کچھ پوچھا بھی اس نے؟"

جزبی آس سے پوچھے اس سوال کے جواب میں وصی سچ بتانے کی ہمت نہ کر سکا۔

"جی۔۔۔ آنٹی۔۔۔" مختصر الفاظ میں اس نے تسلی دینا چاہی۔

مگر سوال۔۔۔ اور۔۔۔ جواب ان دونوں کے درمیان موجود معنی خیز توقف نے منزہ پہ اصلیت کھول دی تھی۔

اس کی وحشت ناک مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

اسی وقت پروین کا فون آ گیا۔ شوکت جہاں کی کچھ دواؤں کی یاد دہانی کرنے کے سلسلے میں۔۔۔

"آنٹی! اگر آپ کو دیر نہیں ہو رہی تو میں اس میڈیکل اسٹور سے میڈیسنز لے لوں۔۔۔ واپسی پہ ہو سکتا ہے مجھے یاد نہ رہے۔ فضل میں میری یادداشت کچھ۔۔۔"

اس کی مسکراہٹ کو وشمہ نے اپنے اندر اترتے محسوس کیا۔ اس کا اندر گدگدا ہو کر جگمگانے لگا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ میں بھی ذرا سامنے والے اسٹور سے ہو کر آتی ہوں۔ چلو گی وشمہ۔۔۔؟"

اس نے اترتے اترتے پوچھا۔

وشمہ نے انکار میں گردن ہلا دی۔

وہ سات منٹ میں ہی فارغ ہو کر آ گیا لیکن منزہ ابھی تک اسٹور سے نہیں نکلی تھی۔ وشمہ اپنے سیل فون پہ F.M سن رہی تھی۔

"آنٹی۔۔۔" وصی نے یک لفظی استفسار کیا۔

"ابھی نہیں آئیں۔"

ان دونوں کے درمیان یہ پہلی گفتگو تھی شاید۔۔۔

وہ کار کا دروازہ کھولتے کھولتے رہ گیا۔ اسے منزہ کی عدم موجودگی میں وشمہ کے ساتھ بیٹھنا معیوب لگ رہا تھا۔ کار کے ساتھ ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا۔

اسی اثناء میں اس کے سیل فون پہ پروین کی پھر سے کال آ گئی۔

"ماشاء اللہ۔ اتنی بھی میری یادداشت کمزور ضرور ہے مگر قریب المرگ ابھی نہیں ہے۔ لے لی ہیں میں نے میڈیسنز ابھی تو نہیں۔۔۔ فی الحال میرے ساتھ ہی ہیں۔ نہیں بھی ٹریفک زیادہ نہیں ہے۔ بس میڈیسنز لینے میں کچھ وقت لگ گیا اور اب آنٹی بھی کافی ٹائم لگا رہی ہیں۔۔۔ پر اسٹور میں۔ نہیں میں تو یہیں ہوں پارکنگ میں۔ وشمہ بھی ساتھ ہے۔ صرف آنٹی۔۔۔"

مگر اس کی بات پوری سننے سے پہلے ہی پروین لائن کاٹ چکی تھیں۔

✡ ✡ ✡

یہ بھی تھا اس تغافل کی امید نہیں تھی بھابی سے۔ حد کر دی انہوں نے۔"

وہ کلستی ہوئی چکر کاٹ رہی تھیں۔

"وصی اور وشمہ اکیلے۔۔۔ یہ محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔ بھابی نے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت انہیں یہ موقع دیا ہے۔ اب یہ خبر نہیں کہ وصی بھی انوالو ہے اس سارے معاملے میں یا؟ نہیں۔۔۔ ایسی بات ہوتی تو وہ یہ بھی صاف صاف بتا نہ دیتا منزہ بھابی کی غیر موجودگی کے بارے میں اور ہاں۔۔۔"

انہیں ایک بات اور یاد آئی۔

"اسے تو ان کے فون نمبر کے بارے میں بھی کچھ پتا نہیں۔ کتنا الجھ رہا تھا وہ اس دن کی بلینک کالز سے۔ نہیں یہ وشمہ کی یک طرفہ پسندیدگی ہے جسے بھابی جان بوجھ کر ہوا دے رہی ہیں۔ میری مجبوری بھانپ گئی ہیں نا۔ جبھی میرے اور وشمہ کے درمیان مزید دراڑیں پیدا کرنے کے لیے ایک طرف اس کے کم عمر جذبات بھڑکا رہی ہیں دوسری طرف مجھے دباؤ میں لے رہی ہیں۔۔۔ دونوں صورتوں میں تسکین ان کو ملے گی۔ اگر میں وصی کے معاملے میں وشمہ کا نام نہ لے سکی تو تمنے استحقاق سے وہ وشمہ پہ جتا سکیں گی کہ میں نے ہی ایسا نہ چاہا۔ خیر وہ سب الگ بات، یہ آگ اور خون کا کھیل وہ کھیل رہی ہیں۔ اس سے سب سے زیادہ نقصان نوید بھائی جان کی عزت کو ہے۔ جن کے ہاتھوں کا پالا ہے۔ جانتی ہوں اسے۔ اس کے حوالے سے مجھے کوئی دھڑکا نہیں ہے لیکن اگر بھابی اپنی ہی لاڈلی وشمہ کے ساتھ یہ کچھ کر سکتی ہیں تو۔۔۔ تو۔۔۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ صرف ہم سب کی خام خیالی ہے کہ وہ رشتوں میں کھری ہوں نہ ہوں۔۔۔ وشمہ کے لیے ایک اچھی ماں ضرور ہیں۔ نہیں وشمہ اس عورت کے ہاتھ میں بھی محفوظ نہیں ہے۔ وہ ماں بن کے پال رہی ہوتی اسے تو اس کی ڈھال بنتی۔ اسے زمانے کی اونچ نیچ سمجھاتی نہ کہ اس طرح۔ نہیں۔۔۔ اب کچھ بھی ہو۔۔۔ مجھے وشمہ کو بچانا ہے اس سے۔ اب تک بہت دیر کی لیکن اب نہیں۔"

انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا۔ وشمہ کو اپنے پاس لانے کا۔

✡ ✡ ✡

وہ سکون آور دواؤں کے زیر اثر بھرے گہری نیند سو رہی تھی۔ لیکن اس کے چہرے پہ گہری نیند کی طمانیت کے بجائے تفکر تھا جو کسی بہت پیارے، بہت اپنے کو وفا کے آنے والے کے پاس ہوتی ہے۔ اس نے بھی

آج ایک بہت بڑا راز اپنے سینے سے نکال کر سوہا کے اندر دفن کیا تھا۔

اور سوہا کاؤچ پہ نیم دراز لیمپ کی مدھم روشنی میں نظر آتے ربنا کے زرد رو چہرے کی جانب دیکھتی ہوئی اس مدفن امانت کے بوجھ تلے نڈھال نڈھال سی لگتی تھی۔

"وہ مجھے وہ سب کچھ دے سکتا تھا جو میں چاہتی تھی لیکن اس نے مجھے دیا تو بھی نہ بھرنے والا زخم۔ ایک ایسا زخم جس سے کبھی ابھرنہ سکی۔ آج میرے تن پہ قیمتی کپڑا ہوتا ہے لیکن مجھے وہ وقت نہیں بھولتا سوہا جب میں اس کی بیوی کی نظروں سے بچنے کے لیے بروے کو اپنے گرد لپیٹے ہوئے تھی۔ آج میں نایاب خوشبوبات سے مہکی رہتی ہوتی ہوں تو مجھے اس کی وہ کراہیت آمیز نظریں وہ ذلت بھرا گریز نہیں بھولتا۔ جیسے میں کسی گندگی کا ڈھیر تھی۔ جب تک میرا وجود اس کے لیے ایک سربستہ راز تھا میں اس کی محبوبہ تھی اور جب اس نے میرا حرف حرف پڑھ لیا تو ایک داشتہ تک ماننے میں اسے اپنی بے عزتی محسوس ہوتی تھی۔

میں گندی گلیوں کی پیداوار تھی۔ میں نے ایک جدی پشتی طوائف کی کوکھ سے جنم لیا تب مجھے بارہ سال کی عمر میں ہی سستے میک اور بھڑکیلی ساڑھی میں لپیٹ کر مجرا کرنے دھکیل دیا گیا تھا لیکن وہ سدہ تو شریف زادہ تھا۔ اس کی رگوں میں تو ستھرا خون دوڑ رہا تھا۔ پھر وہ ہی اپنے جذبے میں کھرا اور قول کا پکا نکل آتا۔ میں تا لیا ای گندگی میں کم ذات سے بد ذات میں پنچی۔ میں تو پھر بھی کم از کم ایک چیز میں تو اس سے اوپر ہی رہی۔ وہ تعلق توڑنے میں میں نہیں۔ وہ شریف زادہ قصور وار تھا۔ میں لاکھ گناہ گار سہی مگر قول توڑنے کا گناہ میں نے نہیں کیا تھا۔ اس نے وعدے توڑے میرا دل توڑا میرا مان توڑا سب کچھ توڑ کے بھی وہ معتبر رہا اور میں... میں خالی ہاتھ رہ گئی۔ اس نے مجھے اندر باہر سے زہریلا کر دیا تھا۔ اسی زہر کی کاٹ ڈھونڈنے میں اصغر کے پاس چلی آئی۔ اصغر جس سے مجھے نہ محبت تھی نہ نفرت۔ اس کے باوجود میں نے پوری وفا سے اس کے ساتھ اتنے سال گزار دیے۔ تم گواہ ہو سوہا۔ اس سے میرا مزاج ملے نہ ملے دل ملے نہ ملے لیکن میں نے اسے دھوکا نہیں دیا۔ صرف یہ ثابت کرنے کے لیے کہ ایک طوائف زادی بھی اچھی بیوی بن سکتی ہے لیکن میں ثابت کس پہ کر رہی ہوں؟ کس پہ؟ کہاں ہے وہ؟ اسے آ کر دیکھنا چاہیے۔ کہ میں... میں ایک عزت دار شخص کی بیوی ہوں۔ ایک بچی کی ماں ہوں۔ میں اسے دکھانا چاہتی ہوں کہ میرے کتنے روپ ہیں۔ وہ دیکھتا تو سہی۔ مجھے دریافت تو کرتا۔ مگر اس نے..."

کہتے کہتے وہ بے دم ہو گئی اور سوہا نے اس کے ہونٹوں پہ ہاتھ رکھ کے اس سے آنکھوں ہی آنکھوں سے مزید کچھ نہ بولنے کی استدعا کی تھی۔

اور اب وہ ان ہی خاموش نظروں سے اسے دیکھتی جا رہی تھی۔ اس عورت کو... جس سے اس کا خون کا رشتہ کوئی نہیں تھا لیکن جس کی باہیں ہمیشہ اس کے لیے کشادہ رہتی تھیں اور جس کا دل ہمیشہ اس کے لیے گداز رہتا تھا پھر کیسے ہو سکتا تھا کہ سوہا کا دل اس کے لیے گداز نہ ہوتا۔

"وہ دیکھتا تو سہی مجھے دریافت تو کرتا۔"

وہ کاش میں کہیں سے اس شخص کو ڈھونڈ کر لا سکتی اور دکھا سکتی ماما کے وہ روپ۔ جو اس بد قسمت شخص نے نہیں دیکھے۔ دیکھے ہوتے تو آج اس چہرے پہ اتنا کرب نہ ہوتا..."

اس نے درد مندی سے ربنا کے غافل چہرے کی جانب دیکھا... میک اپ سے ہر وقت چھپا رہنے والا چہرہ دھلا دھلا! نظروں کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ ہونٹوں کی رنگت سیاہ و سفید کا امتزاج لگ رہی تھی۔ نقاب سا اور بھرے بھرے خم سفید پڑے تھے۔ پلکیں گہری نیند میں بھی لرز رہی تھیں۔

"کیوں کرتے ہیں لوگ محبت... ؟کیوں کرتے ہیں کسی پہ اتنا اعتبار؟"

اس ایک پل میں اس نے بھی اس انجانے شخص سے اتنی ہی شدید نفرت محسوس کی جتنی ربنا کے دل میں تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

میرے دل میں اپنے پاپا کے لیے جتنی عزت جتنا پیار ہے وہ میں کبھی ظاہر ہی نہیں کر پائی۔"

نزہت کے کہنے پہ تطہیر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر کچھ سوچتے ہوئے خود ہی جواب دے دیا۔

بابا کی وجہ سے؟"

"شاید..." وہ سر جھکا کے پھر سے لسٹ بنانے لگی۔

"بابا کو ہمیشہ یہ عدم تحفظ رہا ہے کہ ہم ان سے زیادہ پاپا کے قریب نہ ہو جائیں۔ ان کے بجائے پاپا کو حق پہ نہ سمجھیں۔"

"تمہارے خیال میں کون حق پہ ہے؟" تطہیر نے ٹٹولا۔

"پتا نہیں... شاید اپنی اپنی جگہ دونوں ٹھیک ہوں یا پھر اپنی اپنی جگہ دونوں غلط۔"

"اسے کہتے ہیں سیاسی جواب۔"

تطہیر نے داد دی۔

"لیکن ایک بات ہے تطہیر۔ جسے تم بھی تسلیم کرو گی کہ ہر جھگڑے کے بعد ماما نے ہمیشہ ہم پہ یہ ثابت کرنا چاہا کہ صحیح ہیں اور پاپا غلط... وہ مظلوم ہیں اور پاپا... لیکن پاپا نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے ہمارے ذہنوں میں ماما کے خلاف کچھ بھرنے کی کوشش نہیں کی۔"

"تمہارے ساتھ وقت بھی کتنا گزارتے ہیں۔"

"لیکن پھر بھی..."

"اچھا چھوڑو یار! یہ بے کار کی باتیں... کم از کم آنٹی کے سامنے اتنے بور قسم کے ٹاپک نہ چھیڑنا۔ ایک تو ویسے ہی قنوطیت چھائی رہتی ہے اور سے گھر کا ماحول... ذرا نہیں لگتا کہ یہ شادی والا گھر ہے۔ اوروں کے ہاں تو کئی ہفتہ پہلے ہی فنکشن شروع ہو جاتے ہیں۔ مہینہ مہینہ پہلے رونق لگ جاتی ہے۔ اور سال سال بھر پہلے مہمان آ کے ڈیرے جما لیتے ہیں۔ اس سے تو ہم ایسے ہی اچھے۔"

"لیکن یار! تھوڑا ہلا گلا تو ہونا چاہیے۔"

"تو تم بلاؤ نا اپنی دوستوں کو... میرا تو تمہیں پتا ہے کہ اس شہر میں آنے کے بعد کوئی دوست بنی ہی نہیں سوائے سوہا کے۔"

"ہاں ٹھیک ہے... وہ بھی کبھی بلاؤ نا اسے ماما سے۔" تطہیر نے شرارت سے آنکھ دباتے ہوئے کہا۔

تب ہی تو وہ "توبہ فورا" کانوں کو ہاتھ لگانے لگی۔

"ماما یہاں آنے کے بعد اور بھی وہمی ہو گئی ہیں۔ مجھے اپنی شامت نہیں لانی۔"

"ضرورت کیا تھی ایسی لڑکی سے دوستی کرنے کی۔"

"ایسی لڑکی سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"مطلب نہ کرنا دوست ہے تمہاری لیکن تمہیں بھی کچھ اندازہ تو ہو گا کہ میں نے یہ بات کیوں کی۔"

"ہاں... پریشانی ضرور ہوتا ہے تطہیر... لیکن وہ لڑکی بہت بری نہیں بہت اچھی ہے دل کی۔"

"اور ہم سے بے حد مختلف ہے بالکل الٹ۔ حیرت ہے تم دونوں کی دوستی ہوئی کیسے؟"

"کہتے ہیں ویسے بھی مخالف قوتیں ایک دوسرے کو کھینچتی ہیں۔"

"اسی لیے ماما نے بھی آپی کے لیے ایسا ہی رشتہ ڈھونڈا ہے جو ماحول، فیملی بیک گراؤنڈ، عادات، ہر لحاظ سے ہمارے بالکل مختلف ہیں۔"

تطہیر کی بات پہ وہ بھی سوچ میں پڑ گئی۔

کافی دیر سے اسے بھی یہ بات پریشان کر رہا تھا اور پھر اس نے اپنے خدشے کا اظہار کر دیا۔

"مگر اس فرق کا ماما کو محسوس کیوں نہیں ہوا۔ پاپا نے تو پہلے دبے الفاظ میں اور واضح طور پر کھل کے مخالفت ظاہر

کی تھی۔"
"نہیں کرنی چاہیے تھی؟"
"کیا مطلب؟"
"ان کی مخالفت نے ہی تو انہیں اپنی ضد میں پکا کیا۔ یوں سمجھو کہ انہوں نے پاپا سے چڑ کے۔ بان کو نیچا دکھانے
کی خاطر۔"
"نہیں تطہیر۔" اس نے فوراً ٹوک دیا۔ "اتنی بدگمانی اچھی نہیں۔"
"مجھے جو لگا میں نے کہہ دیا۔"
اس نے بے نیازی سے شانے اچکائے۔
"وہ ماں ہیں ہماری۔ پاپا سے ان کا ضد کا رشتہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں ہے لیکن اس ضد اور انا کے کھیل میں وہ
اپنی بیٹیوں کو قربان نہیں کر سکتیں۔ رہا آپی کا معاملہ تو ظاہر ہے۔ ہمارا اتنا تجربہ کہاں جتنا ماما کا ہے۔ ہم اتنے دور
اندیش ہیں نہ مردم شناس۔ ماما نے یہ فیصلہ کیا ہے تو کچھ سوچ سمجھ کے کیا ہوگا۔ ہو سکتا ہے انہوں نے کوئی ایسی
خوش آئند بھانپ لی ہو جس کے بارے میں ہم ابھی اندازہ لگانے کے قابل نہ ہوں۔"
"I hope so ...."

☼ ☼ ☼

"بیٹھو پروین۔ تم سے ایک مشورہ کرنا تھا۔"
وہ آئیں تو اپنی بات کرنے تھیں مگر شوکت جہاں بھی ان سے کوئی مشورہ مانگنے تیار بیٹھی تھیں۔
وہ جو اپنے تئیں بڑے مناسب الفاظ اور موزوں توجیہات تلاش کرکے آئی تھیں دل مسوس کے رہ گئیں۔
"جی۔ کہیے اماں جان۔"
"یہ جو منزہ ہے تمہاری بھابی۔"
پروین کا حلق تک کڑوا ہو گیا اس کے ذکر سے۔
"جی۔!"
ان کے انداز میں تلخی تھی جسے اپنی دھن میں بات کرتی شوکت جہاں نے محسوس نہ کیا۔
"ہے سمجھ دار عورت۔"

● ● ●

"کہاں گم ہو اتنے دنوں سے؟"
وصی کے سوال نے سبا کو گم صم کر دیا۔
وہ سارے ان چاہے۔ ان سوچے جواب پھر سے لبوں تک آ کے بولنے کو کسمسانے لگے۔
"تم میں گم ہوں۔" لیکن پہلے کی طرح اب بھی اس نے ان جوابوں کو جھٹک کر پرے دھکیلا جو اتنا زیادہ
حیران کر دیتے تھے تو وصی کا نجانے کیا حال ہوتا۔
"یونہی۔ طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔"
"خیریت؟ ... کیا ہوا؟" الفاظ عام سے۔ مگر اس کا لہجہ بے حد تشویش لیے ہوئے تھا۔ سبا کو اس کا
اچھا لگا۔
"اتنی فکر ہے تو دیکھنے آ جاؤ۔"
اچانک بے ساختہ ہی اس کا جی وصی کو سامنے دیکھنے کے لیے مچلنے لگا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی وہ کبھی ایسا نہیں
کرے گا۔
"کیا ہوا؟ ... تم تو کسی گہری سوچ میں چلے گئے۔ وہ کیا ہوتا ہے مقابلہ۔ نہیں ہاں۔ مراقبہ میں چلی گئی
ہو؟"

دوسری جانب گہری خاموشی تھی۔
وصی۔! ہیلو۔"
بند ہو چکا تھا۔
ایک گہری سانس لی اور انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ گئی۔ تقریباً ساری رات ریتا کے کمرے میں اٹھتے بیٹھتے
اسے کسی اور کے کمرے۔ خصوصاً ریتا کے بارو بیڈ پہ نیند نہیں آتی تھی۔ صبح جاگنے۔ جب ریتا
اور کل کے اثرات سے یکسر پاک دیکھا تو مطمئن ہو کر اپنے کمرے میں آئی۔ ابھی لیٹنے کا سوچا ہی تھا
کا فون آ گیا۔ لیکن اس دو منٹ کی کال نے اسے اور بھی بوجھل کر دیا۔
فون بند کر دینا۔ یہ ظاہر کر رہا تھا کہ وہ نہ تو اسے صاف انکار کرنا چاہتا تھا۔ شاید اس کی دل آزاری
اور نہ وہاں آنا چاہتا تھا۔ غالباً" بلکہ یقیناً" اپنی دل آزاری کے ڈر سے۔
قدموں سے چلتی ٹیرس کی جانب کھلتی ونڈو تک گئی۔ بھاری پردے ہٹانے۔ کمرہ دن کے اجالے سے
بے دھیانی سے وہ دیر تک نیچے لان میں جھانکتی رہی۔ ہارن کی آواز پہ وہ چونک کر گیٹ کی جانب دیکھنے
گیٹ کھول رہا تھا اور وصی کی کار اندر داخل ہو رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

سمجھ دار عورت۔"
جہاں کے کہنے پہ پروین نے کوفت محسوس کی۔
کیا لگی تھی مگر بھی کبھی دور ابھی نہیں لگا بلکہ رہ رہ کے خیال آ رہا ہے کہ کاش یہ میں نے سوچا ہوتا۔"
پروین چونکیں۔
کی جانب سے دھڑکا لگا رہتا تھا کہ نجانے کب کس وقت کیا کہہ دے۔
کے اشاروں کنایوں میں کہہ رہی تھی ظاہر ہے لڑکی والے کھل کے تو کہہ نہیں سکتے۔ مجھے تو
اسے یہ بات کرنے کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ یہ تو میرا یا تمہارا فرض بنتا تھا کہ خیال کرتے۔ ہمارے
بچے جوان ہوتے تو باہر مارے مارے پھرنے کے بجائے خاندان میں ہی دیکھ بھال کے رشتے ناتے
ایسا وقت نہیں آتا تھا کہ لڑکی والوں کو خود منہ سے کہنا پڑے۔"
کا مطلب ہے کہ۔" پروین نے دھڑکتے دل کے ساتھ پوچھا۔
کی سوچ رہی تھی کہ وشہ دیکھی بھالی بچی ہے شکل بھی اچھی۔ عادتیں بھی اچھی۔ کیوں نہ
ہو جائے۔"
مرحلے کو مشکل سمجھ رہی تھیں وہ اتنی آسانی سے حل ہو جانے کا یقین نہ آ رہا تھا۔ وہ دل ہی دل میں
قائل ہو گئیں۔
رشتہ ہے۔"
ہے؟"
تو ندا سے فارغ ہونے کے بعد سوہا نے کی فکر میں ہے تاکہ ہما کے جانے کے بعد گھر بالکل ہی
چاہے بیاہ کے اس کو پیچھے ہی آنا ہے لیکن پھر بھی اپنے گھر کی رونق تو جاتی ہی ہے بیٹی کے رخصت
ہونے کا احساس تو تب بھی اتنا ہی ہوتا ہے اس لیے کل ذکر کر رہی تھی۔ میں نے سوچا اس کا
جانب۔"
آپ۔" پروین کا بس نہ چل رہا تھا کہ ان کی غلط فہمی پہ زور زور سے چیخنے لگیں۔
چیخ چیخ کر رو دیں۔
تک تو نہ سوچیں ہو سکتا ہے بھابی نے اپنے میکے میں کسی کو پسند کر رکھا ہو۔"

"ایسا ہوتا تو وہ مجھ سے ذکر کرتی۔"

"پھر بھی۔۔۔ اماں جان۔! میں یہ مناسب نہیں سمجھتی۔"

بہت ہمت کر کے انہوں نے کہہ ہی دیا۔۔۔ جانتی تھیں اب بھی نہ بولی تو سوائے پچھتاوے کے اور کچھ نہ رہے گا۔

شوکت جہاں کو ان کی جانب سے اس کھلی مخالفت کی امید نہیں تھی۔

"وشمہ تمہارے بھائی کی بیٹی ہے پروین!"

"جانتی ہوں۔۔۔ میں اس کا برا نہیں چاہتی۔ لیکن آپ میری پوزیشن سمجھنے کی کوشش بھی کریں۔ رخشندہ بھابی سے دو دو رشتے ہیں بھابی کا بھی سمدھن کا بھی۔۔۔ دونوں رشتے بے حد نازک ہیں۔ اپنی بھتیجی کو ان کی بہو بنانے کا مطلب ہے ایک طرح سے ونڈسٹہ۔"

یہ جواز انہیں بڑا بروقت سوجھا تھا۔

وہ بھی متفق ہو گئیں۔

"ہاں۔۔۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔۔۔ کل کلاں کو کوئی بات ہوئی تو اثر دونوں رشتوں پہ پڑے گا۔۔۔ شادی کے بعد معمولی مسائل آسانی سے حل ہو جایا کرتے ہیں ونڈسٹے کی صورت میں ان ہی مسائل کی وجہ سے گھر کے گھر برباد ہوتے دیکھے ہیں۔ پھر۔۔۔"

انہوں نے پروین کی جانب سوالیہ انداز میں دیکھا۔

"پھر کیا کیا جا سکتا ہے' ورنہ میں نے تو سوچا تھا کہ اچھی لڑکی ہے۔ ہمارے گھر آ جائے گی تو۔۔۔"

"اب بھی سکتی ہے۔" پروین نے آج سارا معاملہ صاف صاف کرنے کا تہیہ کر لیا' ویسے بھی بات کرنا مشکل ہوتا' بات کو شروع کرنا مشکل ہوتا ہے اور بات شروع شوکت جہاں نے کی تھی۔

"اگر آپ۔۔۔ آپ وصی کے لیے رضامندی دے دیں تو۔۔۔"

"وصی کے لیے؟" شوکت جہاں حیران ہو گئیں۔

"ارے ہاں۔۔۔ کیا بات کی ہے تم نے پروین!"

ان کے پہلے ردِعمل پہ پروین کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا تھا لیکن پھر خوشی کے بے ساختہ اظہار نے یہ سانس آسان کر دی۔

وہ کھل کے مسکرانے لگیں۔۔۔ کئی دنوں کے بعد۔

"بس ٹھیک ہے۔۔۔ یہ طے ہے کہ اب ہم جلد ہی تمہارے بھائی کے گھر جائیں گے۔۔۔ وصی کے لیے منشہ کا ہاتھ مانگنے۔"

"یا اللہ! تیرا شکر ہے۔ میرے بھائی کے گھر کی عزت' عزت سے گھر کی ہو جائے گی اور میرا مان بھی۔۔۔"

پروین نے اسی وقت شکرانے کے نوافل کی نیت باندھ لی۔ منزہ کو فون کرکے بتانا۔۔۔ [illegible] ٹالا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے یہ کہا تھا کہ طبیعت خراب ہے یہ تو نہیں کہا تھا کہ میری طبیعت خراب ہے۔"

وصی کی ناراض ناراض سی شکل دیکھ کے وہ بمشکل ہنسی ضبط کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"ایکچوئیلی۔۔۔ میری ماما کی طبیعت ٹھیک نہیں۔۔۔ اسی وجہ سے چند دن تک سوائے ان کے کسی بات کا ہوش ہی نہیں رہا۔"

"یہ تم فون پہ صاف صاف بھی تو بتا سکتی تھیں۔۔۔ دوڑ لگوا دی ہے میری آفس سے۔"

"دوڑ نہیں۔۔۔ ریس۔۔۔ پیدل نہیں تھے تم۔" اس نے تصحیح کی۔

...بڑی بات ہے۔۔۔ میری ماما نہ سہی۔۔۔ میری ماما کی عیادت کر لو۔۔۔ چلو آؤ تمہیں ملوا کے لاتی ہوں اپنی ماما سے۔"

...کا ہاتھ کھینچتی اندر لے گئی۔

...نے ربا کے بارے میں سرسری سا سن رکھا تھا اور وہ سرسری سا ذکر اتنا خوشگوار نہ تھا جتنی خوشگوار حیرت ...دیکھ کر ہوئی تھی۔

...کا اضمحلال چہرے سے واضح تھا لیکن سوگواری اور کسلمندی نے بھی شخصیت کے پُرکشش اسرار پہ ...اضافہ۔ یہ ٹھیک ہے بہت مسحور کن حسن کی مالک نہ تھی لیکن اس کی خوش گفتاری' خوش لباسی اور خوش ذوقی جو ...ساتھ ساتھ نکھرتی ہی جا رہی تھی' سامنے والے پہ بڑا خوش کن اثر ڈالتی تھی۔

...بہت محبت کرتی ہے آپ سے اس کی دس باتوں میں سے نو آپ کے بارے میں ہوتی ہیں۔"

...آخری ایک۔۔۔" ربا نے قہقہہ لگا کے پوچھا۔

...نے اسے اس موڈ سے نکلتے دیکھ کر اطمینان محسوس کیا جس میں وہ گزشتہ دو دنوں سے محصور تھی۔

...that's not fair ماما آپ بہانے بہانے سے میری سیکرٹس جاننا چاہ رہی تھیں۔"

...ہوئے بولی تو سے جا۔ دیکھ کر وصی نے کچھ بے چینی محسوس کی۔۔۔ کسی لڑکی سے ہی دوستی کرنے کا یہ ...تھا اور سے یہ تجربہ۔۔۔ کہ اس کی ماں کے سامنے بیٹھ کر اس کے سوالوں کے جواب دیے جائیں۔

...کا شعور زمانہ اعتماد کسی کونے کھدرے میں جا چھپا تھا۔

"...میں چینج کر کے آتی ہوں۔۔۔ پھر چائے پیوں گی تمہارے ساتھ۔۔۔ سستی سی ہو رہی ہے۔"

"...ہے جاؤ۔۔۔ کہیں گھوم پھر آؤ تا وصی کے ساتھ۔ دو دن سے میرے ساتھ بند ہی ہوئی ہو۔ فریش ہو جاؤ گی۔"

"...میں آفس جا رہا تھا۔۔۔ سوہا کی۔۔۔ میرا مطلب ہے آپ کی طبیعت کا پتا چلا تو دیکھنے آ گیا۔۔۔ مجھے یہاں سے ...جانا ہے۔"

...اوہ!" ربا کو وصی سے صاف جواب ملنے کی امید نہیں تھی۔

"...ڈونٹ وری ماما۔! سوہا کو فریش ہونے کے لیے کسی دوسرے پہ depend نہیں کرنا پڑتا۔"

...اس نے جاتے جاتے وصی کو چڑانے کے انداز میں کہا۔

"...میری دعا ہے۔۔۔ اسے واقعی کسی پہ depend نہ کرنا پڑے۔" ربا نے اس کے نکلتے ہی سنجیدگی سے کہا۔

"...خوش رہنے کے لیے۔۔۔ نہ زندہ رہنے کے لیے۔"

"...لیکن وہ آپ پہ تو depend کرتی ہے۔"

"...نہیں۔۔۔ وہ مجھ پہ depend نہیں کرتی۔۔۔ صرف مجھ پہ ٹرسٹ کرتی ہے۔۔۔ یہ اعتماد کرتی ہے کہ میں اس کے ...سوچوں گی' اچھا سوچوں گی جو کروں گی بہتر کروں گی۔۔۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتی کہ میرا اس کی زندگی میں ہونا ہی ...کے لیے اچھا نہیں ہے۔"

"...کیا مطلب۔۔۔ میں سمجھا نہیں۔"

"...صرف سوہا کے دوست نہیں ہو۔۔۔ کسی نہ کسی تعلق سے اس کی ماں کے عزیز بھی ہو۔ اس کے باقی دوستوں ...فیلوز کے برعکس صرف تم ہو جو یہ جانتے ہو کہ میں اس کی اصل ماں نہیں ہوں اور یہ بھی کہ میں۔۔۔"

...کہتے کہتے رکی۔۔۔ وصی نے دانستہ نظریں چرا لیں۔

"...اس سے محبت ہے اور رہے گی لیکن اب میں پوری دیانت داری سے یہ اعتراف کرتی ہوں کہ میری ...خود غرض تھی' اور اپنی خود غرضی میں' میں نے سوہا کی زندگی برباد کر دی۔"

"...آپ نے اس کی زندگی برباد نہیں کی۔ سنواری ہے۔ اسے ایسے موڑ پہ جذباتی سہارا دیا' جب وہ اپنی شخصیت ...سنوار رہی تھی۔ اس مقام پہ' جہاں اس کا اعتبار ہر رشتے اور محبت سے اٹھنے والا تھا' آپ نے اسے اپنی محبت کا ...آسرا دیا۔"

"ہاں کیونکہ میری اپنی زندگی میں اس اعتماد اور محبت کی کمی تھی ۔۔۔ مجھے سوہا کی ضرورت تھی ۔۔۔ ورنہ میں ختم ہو جاتا ۔۔۔ فنا ہو جاتا ۔۔۔ میں نے خود کو بچانے کے لیے ایک معصوم بچی کی محبت کا سہارا لیا ۔"
وہ نجانے کیسے پہلی ملاقات میں ہی یہ باتیں وصی سے کہہ گیا ۔۔۔ جو اس نے کبھی اپنے آپ سے بھی نہیں کہی تھیں ۔۔۔ شاید یہ گزشتہ دو روز سے طاری فرسٹریشن کا غبار تھا ۔۔۔ جس کا نکلنا ضروری تھا ۔
"دو تنہا لوگ ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہی ہیں ۔ اس میں احساسِ جرم والی کون سی بات ہے ؟"
"ہے ۔۔۔ کیونکہ جب تک سوہا بچی تھی ۔ اسے میری محبت سے اور میرے ساتھ سے فیض پہنچ رہا تھا لیکن اب مجھے لگتا ہے میری بیٹی کہلانے سے اس کے نصیب میں صرف خسارہ آئے گا ۔۔۔ کس کس کو بتاؤں کہ وہ میری بیٹی نہیں ۔۔۔ ایک بڑے ہی عزت دار گھرانے کی عورت نے جنم دیا ہے اسے ۔۔۔ لوگ تو اسے ... سمجھتے ہیں ۔ میرا اس کی ماں ہونا ۔۔۔ اس کا سب سے بڑا خسارہ ہے ۔ تم نہیں سمجھو گے ۔"
وصی کا دل انجانے بوجھ تلے آن دبا ۔
پھر راستے بھر وہ سوہا کے بارے میں سوچتا آیا ۔
"ابھی اتنی ملتی جلتی ہے ہماری کہانی کی ۔۔۔ مگر اتنا ؟"
"نہیں ہر کوئی اتنا خوش قسمت نہیں ہوتا جتنا میں ہر کسی کو وہ سب نہیں ملتا جو مجھے ملا ۔۔۔ نانو جیسی شفیق ہستی کا سایہ ۔۔۔ چاہنے والے ماموں ۔ جنہوں نے بہن کے جانے کے بعد مجھے اپنے بہنوئی کے ذمے داری سمجھتے ہوئے ان کے سر زبردستی منڈھنے کے بجائے خلوصِ دل اور محبت سے اپنایا ۔۔۔ پروین ممانی جیسی وسیع قلب خاتون کی تربیت جنہوں نے کبھی مجھ میں اور اپنے بیٹوں میں کوئی فرق روا نہ رکھا ۔۔۔ یہ گھر جس نے بانہیں پھیلا کے مجھے سمیٹا ۔۔۔ ایک ماں کا رشتہ واپس لیا خدا نے ۔۔۔ مگر بدلے میں کتنے رشتے لوٹائے اور سوہا ۔۔"
اپنی خوش قسمتی پہ شکر ادا کرنے کے ساتھ ساتھ سوہا کے لیے اسے ملال بھی محسوس ہو رہا تھا ۔
"کاش اسے بھی یہ سب ملا ہوتا تو اس کی شخصیت کتنی مکمل ہوتی ۔۔۔ ایسا ہی گھر جیسا میرا ہے ۔ اماں ... جیسی میری ہیں ۔ پروین ماں جیسی ماں ۔۔۔ آپی محسن اور حسان جیسے بھائی بہنیں کاش یہ سب اسے ۔۔"
اچانک اس کے پاؤں بریک پہ جا لگے
کار ایک جھٹکے سے رک گئی ۔
اور ایسا ہی ایک جھٹکا اس کے ذہن کو بھی لگا اس اچانک وارد ہونے والی سوچ سے ۔
"یہ سب اس کا ہو سکتا ہے یہ گھر نانو ماں اور ۔۔۔ اور میں بھی ۔۔!"
دل سے بوجھ پرے سرکتا ہوا محسوس ہوا تو وہ مسکرایا اور کار ریورس کی ۔
وہ ایک بار پھر سے سوہا کے گھر کی طرف جانے والی روڈ پہ گامزن تھا ۔
وہ ایسا ہی تھا ۔ فوری فیصلہ کرنے والا ۔۔۔ آر یا پار ۔۔۔
اور پھر اس فیصلے کو ایک پل کے لیے بھی دل میں نہ رکھنے والا ۔
فوری فیصلہ ۔۔۔ فوری اظہار ۔

○ ○ ○

"امی ۔۔۔ آپ وصی کی شادی کا کیا ذکر ہو رہا تھا ؟"
ندا نے کالج سے آنے کے بعد شوکت جہاں ، پروین اور رخشندہ کی گفتگو کا کچھ حصہ سنا تھا مگر ... تھا ۔۔۔ اور جانتی تھی کہ ان تینوں کی ٹولی میں کسی کو گھس کر ٹن گن لینے کی اجازت نہیں تھی ۔ اس لیے ... بعد یاد آتے ہی سب سے پہلے یہ سوال کیا ۔
دھلے ہوئے کپڑے تہہ کرتی رخشندہ نے ہاتھ روک کے اسے دیکھا ۔۔۔ پھر سر جھٹک کے دوبارہ اپنے کام میں ...
"ہاں ۔۔۔ سنا ہے پروین اپنی بھتیجی کے بارے میں سنجیدہ ہے ۔"

"ہاں ۔۔۔ وہ تو ہے ۔۔۔ ویسے ہے تو پیاری اپنے وصی کے ساتھ اچھی لگے گی ۔" ندا مسکرائی ۔
عالی جما نے ہاتھ میں رکھی قمیص بغیر تہہ کیے صوفے پہ پھینکی اور بے زاری سے بڑبڑانے لگی ۔
"کیا مصیبت ہے ۔ ایک گھنٹہ ہو گیا ہے ۔ کپڑے ختم ہی نہیں ہو رہے ۔ مجھ سے نہیں ہوتا یہ سب ۔"
وہ چڑچڑے پن سے کہتی اندر چلی گئی ۔
"اسے کیا ہوا ؟" ندا نے حیرت سے پوچھا ۔
"ہوتا ہے ۔۔۔ شادی کے دن نزدیک آئیں تو میکے سے بچھڑنے کا دکھ ۔۔۔ نئی جگہ ایڈجسٹ ہونے کا خوف ۔۔۔ سب لڑکیوں کو ایسا ہی چڑچڑا کر دیتا ہے ۔"
رخشندہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا ۔ جسے ماننے سے ندا ایک دم انکاری تھی ۔
"کیوں ایسے ہی ۔۔۔ میری بھی تو تاریخ طے ہو گئی ہے ۔ مجھے تو ایسے بے زاری کے دورے نہیں پڑتے ۔"
"میں نے لڑکیوں کی بات کی ہے ، تمہاری نہیں ۔"
رخشندہ نے تپ کے کہا اور وہ کھلکھلا کر ہنسنے لگی ۔
"اگر مجھے لڑکی نہیں سمجھتی ہیں تو رخصت کیوں کر رہی ہیں ۔۔۔ داماد کو رخصت کرا کے گھر لے آئیں نا !"
"توبہ ہے ندا ! بچپنا اور نادانی نہیں جاتی تمہاری ۔ کالج میں لیکچرار ہو اور باتیں اسکول گرلز والی ۔"
"ویسے امی ۔۔۔ ! حسان اور وصی دونوں چھوٹے ہیں بھائی سے اور دونوں کی شادی کی باتیں بھی ہو رہی ہیں ۔ آخر آپ سستی کیوں کر رہی ہیں ، بہو ڈھونڈنے میں پروین چاچی کی طرح آپ بھی بھائی کی بیٹی لے آئیں نا !"
"رہنے دو تم ۔۔۔ عجیب بے تکے خیال آتے ہیں تمہیں ۔"
"کیا برائی ہے امی ؟"
"میری تین تین بیٹیوں کے لیے کسی بھائی نے سوچا ۔"
"ضروری تو نہیں آپ بھی خود غرضی سے کام لیں ۔"
"ہاں ضروری نہیں ۔۔۔ مگر یہ بھی ضروری نہیں کہ میں بلاوجہ عظمت کے مظاہرے کرتی پھروں ۔۔۔ میں غیر خاندان سے ہی کوئی بہو لاؤں گی ۔ بس دو شرطیں ہیں ۔ ایک تو لڑکی تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ ساتھ سلجھی ہوئی اور عزت دار ہو کیونکہ وہ اکلوتی بھابھی ہو گی تم سب کی اس گھر کی مکمل ذمے داری اٹھانے کی تمام تر صلاحیت ہونی چاہیے اس میں ۔ تمہاری طرح پڑھ لکھ کے ڈبویا نہ ہو اس نے ۔"
"اور بس پھر میری کھنچائی ۔"
"اور دوسری بات ، خاندان اچھا ہو ۔۔۔ سسرال نام والا ہو ، رعب دبدبہ والا ہو تو بڑا فرق پڑتا ہے ۔ اس کے برعکس داماد جتنا بھی برا ، اچھا ہو اگر خاندان ذرا سا بھی ہو تو بہو ساری عمر بیچ میں گزر جاتی ہے ۔ مرد بیوی میں ہلکی پھلکی برداشت کر لیتا ہے کہ اس کا سدھارنا پھر بھی بس میں ہوتا ہے مگر سسرال کی کمی گویا ناک کٹنے کے مترادف ہوتی ہے ۔"
"رہنے دیں امی ۔۔۔! یہ سب فرضی باتیں ہیں ۔۔۔ بس میاں بیوی کی آپس میں انڈرسٹینڈنگ ہونی چاہیے ۔ اپنے چچا کی مثال لے لو ۔ کس بات کی کمی ہے تمہاری چچی کی ذات میں ہر لحاظ سے بے مثال عورت ہے بلکہ ان دونوں میں مجھ سے ۔ بہتر بہو اور بیوی ثابت ہوئی ہے ۔"
رخشندہ نے پہلی بار کھل کے پروین کی اچھائی تسلیم کی ۔ شاید اس لیے کہ ان کی ... بیٹیوں کا وجود ... کرنے میں ... ثابت ہوئی تھیں ۔
"بچپن میں نے ہمیشہ سراج بھائی کو ان سے نالاں ہی دیکھا ہے ۔ اور وجہ تنازعہ رہا ہے پروین کا میکہ ۔ آج ... کا بھائی ماشاء اللہ ایک کامیاب بزنس مین ہے کسی چیز کی کمی نہیں ہے اس کے پاس اور پھر بیوی بھی پڑھی لکھی ... ہے جس نے گھر کا نقشہ بدل کے رکھ دیا ہے ۔ لیکن جب پروین کی شادی ہوئی تب بے چاری اس کا بھائی ... بنانے کی کوشش کر رہا تھا ۔ کم عمری میں گھرانے کی کفالت کا ذمہ کاندھوں پہ آ جانے کی وجہ سے وہ تعلیم بھی

مکمل نہ کر پایا۔ ویسے خاندانی لوگ تھے۔ پیچھے سے کھاتے پیتے زمین دار لوگ مگر تعلیم کے فقدان اور دیہاتی طور طریقوں کی وجہ سے عجیب سا لگتا تھا ان کے گھر کا ماحول.... خاص طور پر پروین کی والدہ جن سے سراج کو خدا واسطے کا بیر تھا.... ظاہر ہے مردوں نے باہر بھی ملنا جلنا رکھنا ہوتا ہے۔ آخر سسرال ایسا تو ہو کہ کسی کو فخر سے بتایا جا سکے؟

"مجھے تو آپ کی اس سوچ سے بالکل بھی اتفاق نہیں ہے.... پلیز.... مائنڈ مت کیجیے گا۔"

"مائنڈ کیا کرنا.... تمہیں ویسے بھی میری کسی بات سے اتفاق ہوتا ہی کب ہے؟"

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا؟ کچھ بھول گئے کیا؟"

سوہا بھی اسی وقت گیٹ سے گاڑی باہر نکال رہی تھی۔ جب وصی اس جانب آتا نظر آیا.... وہ گرین بیلٹ کے ساتھ گاڑی پارک کر کے اس کے پاس آئی۔

"ہاں.... بھول گیا۔"

"Let me guess—"

"موبائل۔"

"نہیں...." وہ مسکرایا۔

"keys؟"

"نہیں۔" نظریں سوہا کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ آج پہلی بار اسے اس نظر سے دیکھا تو وہ بہت بدلی بدلی.... بہت الگ الگ سی محسوس ہو رہی تھی۔

نظریں کیا بدلیں.... جیسے سب کچھ بدل گیا۔

سوچ کیا تبدیل ہوئی۔ زندگی کا منظر نامہ ہی تبدیل ہو گیا۔

"گلاسز بھول گئے ہو گے؟"

"نہیں.... میں کچھ کہنا بھول گیا تھا۔"

"what" وہ ہلکا سا چلائی۔

"کہنا بھول گئے تھے؟ مگر کیا؟"

"ایک بہت ضروری بات.... کہہ دوں؟"

"ہاں بولو۔" سوہا کو حقیقتاً تشویش ہونے لگی اس کی سنجیدگی سے۔

"شادی کرو گی مجھ سے؟"

اس بار سوہا کچھ نہ کہہ سکی۔

حیرت کا اظہار تک نہ کر پائی۔
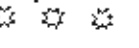
☼ ☼ ☼

"پروین اتنی اتاؤلی نہ بنو.... ایسی باتیں فون پہ نہیں ہوتیں۔ تسلی سے جا کے کریں گے.... ملنوہ شریف شوکت جہاں کے ٹوکنے پہ وہ جز بز ہو کے رہ گئیں۔ اب انہیں کیا بتاتیں کہ یہ خبر منزہ تک پہنچا دینے کے بعد سکون ملے گا انہیں بھی اور منزہ کو.... وہ اس کے سامنے سرخرو ہونا چاہتی ہیں، یہ جتانے کہ وہ اتنی بھی بے اثر نہیں جتنا وہ سمجھتی ہے۔

"جائیں گے اماں جان ظاہر ہے.... وہ تو جانا ہی ہے میں تو بس فون پہ صرف آنے کی اطلاع دینے کا سوچ رہی تھی.... کل کا پروگرام رکھ لیں؟.... بتا دوں منزہ کو؟"

"کل؟ وصی سے بات ہو جاتی تو...."

"آپ نے میاں صاحب سے بھی بات کر لی.... انہیں بھی کوئی اعتراض نہیں ہے.... وصی کو کیوں ہو گا۔"

"میں جانتی ہوں وصی کو کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔ اگر اس کی نظر میں کوئی لڑکی ہوتی تو وہ ہمیں بے خبر نہ رکھتا بے شک.... لیکن کم از کم اسے اطلاع تو دینی چاہیے۔ مشورہ تو لینا چاہیے۔ زمانہ بدل گیا ہے پروین! بچوں کو بھی اچھا لگتا ہے اگر انہیں اعتماد میں لے کر فیصلے کیے جائیں۔"

"زمانہ واقعی بدل گیا ہے اماں جان!"

وہ ریسیور ہاتھ میں لیے سوچنے لگیں۔

"اب بچے ہمیں اعتماد میں لے کر فیصلے کرنے کے بجائے خود فیصلہ کر لینے کے بعد اس اعتماد سے ہمیں کہہ چکے ہوتے ہیں کہ ہم لازماً ان کے اشاروں پہ ناچنے لگیں گے۔"

"اب کیا ہوا؟ کیا سوچنے لگیں؟"

"کچھ نہیں۔" انہوں نے ریسیور واپس کریڈل پہ رکھ دیا۔

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.... وصی سے پہلے بات کر لینا مناسب ہو گا۔"

"کیا کر ڈالا وصی نے؟" حسن نے اندر داخل ہوتے ہوئے سوال کیا۔

"اس جھلے نے کیا کرنا ہے.... کرنے والے تو ہم ہیں.... اس کا رشتہ۔"

"او خدا! یہ آپ لوگوں کو ہو کیا گیا ہے.... اوپر نیچے بس ایک ہی موضوع.... سارا خاندان جیسے ایک ہی مہم میں جت گیا ہے.... قسم کھائی ہے آپ سب نے کیا؟ کہ اسی مہینے خاندان کے ہر لڑکے اور لڑکی کو ٹھکانے لگانا ہے۔ ایک ہی بچا تھا بس اب اسے بھی قابو کر لیا۔"

وہ شوز اتارتے ہوئے خفگی سے کہہ رہا تھا۔

"ایک وصی بچا تھا اور ایک وشمہ۔"

پروین کے مسکرانے.... اور وشمہ کے نام پہ وہ ٹھٹکا۔

"یہ وشمہ کا یہاں کیا ذکر؟"

اس کی پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

"اسی سے تو کرنا چاہتے ہیں ہم وصی کی شادی۔"

موزے اتارتے ہوئے حسن کے ہاتھ وہیں کے وہیں رک گئے۔

"میں پروین کو مشورہ دے رہی تھی کہ اتنی جلد بازی سے کام مت لو.... پہلے وصی سے اس کی رضامندی جان لو۔"

"بہت جلدی خیال آ گیا آپ کو یہ مشورہ دینے کا۔"

اس نے شکوہ کناں نظروں سے انہیں دیکھا۔

"ہاں جلدی آ گیا ورنہ تو یہ فون کرنے ہی والی تھی۔ اتنی اتاؤلی ہو رہی ہے بھتیجی کو گھر لانے کے لیے۔"

"بھتیجی کو گھر لانے کا شوق بھی کچھ اچانک ہی ہوا ہے امی کو اس سے پہلے تو یہ خیال نہیں آیا۔"

اس کے ساتھ ساتھ دبا دبا حسد بھی اس کے لہجے سے جھلک رہا تھا، جسے اپنی ہی خوشی میں مگن پروین اور شوکت جہاں نے محسوس نہ کیا۔

○ ○ ○

"وصی تم...."

دروازے پہ اسے دیکھ کے آتے سوہا کے الفاظ گم ہو گئے۔

لبوں پہ قطار در قطار رکے آنسوؤں نے سامنے کا منظر دھندلا کر دیا۔

وصی نے ہاتھ بڑھا کے اپنی پوروں پہ اس کے آنسو چن لیے۔

"یقین نہیں آ رہا؟ یاد کھو رہا ہے میرے اتنے عجیب و غریب طریقے سے بتانے پہ.... کیا کروں یار.... فرصت ہی نہیں ملی ہے نا۔"

وہ آنسوؤں کے ساتھ کھلکھلا اٹھی۔
"جھوٹ... جھوٹ... جھوٹ۔"
"تمہیں لگتا ہے مذاق کر رہا ہوں میں؟"
اور اگرچہ سوہا نے اس کی آنکھوں میں سچائی کے سارے رنگ دیکھ لیے تھے لیکن صرف اس کی زبان سے ایک بار پھر یہ اقرار سننے کے لیے کہہ دیا۔
"ہاں۔"
"کیسے یقین دلاؤں تمہیں... تمہاری ماما سے بات کر کے؟"
"تم کیا بات کرو گے؟"
"آں... نہیں... میں تو نہیں... میرا مطلب تھا میری ماما!"
"ماما؟" اور جیسے اچانک سوہا کسی سہانے خواب سے جاگ گئی۔
بچپن کی وہ سب یادیں تازہ ہو کر سامنے آگئیں جن کو اس نے بہت کوشش کے بعد بھلایا تھا۔
شمشاد بیگم کی کریہہ آواز اور دل چھلنی کرنے والے طعنے جو اس کے معصوم دل نے سہے تھے۔
نوید مراد کی بے گانگی... جسے سمجھنے سے وہ قاصر تھی۔
پروین کی خاموش مگر ناگوار چبھتی نظریں... جن کا مفہوم اس کا کم عمر ذہن تلاش نہیں کر سکتا تھا۔
"وہ نہیں آئیں گی وصی!"
وصی کے اظہار نے اسے ساتویں آسمان پہ ضرور لا بٹھایا تھا لیکن پروین کا خیال اسے ایک بار پھر نیچے لے آیا۔
"میں جانتی ہوں وہ عورت مر جائے گی لیکن مجھے"
بے حد ناز کے ساتھ کہتے کہتے اس نے وصی کی جانب نگاہ کی اور اس کے چہرے کے بنتے بگڑتے زاویے دیکھ کر جلدی سے بات بدلی۔
"نہیں وصی! بہت مشکل ہے تمہاری ماما میری کچھ نہیں لگتیں مجھ سے ذاتی تنازعہ کوئی نہیں ہے ان کا لیکن وہ میری ماما You know very well! پھر کیسے تم کوئی امید دلا سکتے ہو مجھے۔"
"مجھے امید دلانی ہی نہیں ہے... مجھے یقین دلانا ہے۔" وصی نے اس کا ہاتھ دبا کے کہا۔

☼ ☼ ☼
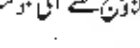
"حد ہو گئی... کیا میں انسان نہیں تھا؟ ایک جیتا جاگتا انسان... کیا میری کوئی مرضی... کوئی رائے نہیں تھی؟"
حسن اپنے کمرے میں لیٹا کڑھ رہا تھا۔
لائٹس آف تھیں... دروازہ بند... اور لاؤنج سے آتی شوکت جہاں اور پروین کی گفتگو کی ہلکی ہلکی آوازیں اس کا اور بھی پارہ ہائی کر رہی تھیں۔
"وصی کو رائے دینے کا حق ہے۔ مجھے نہیں ہے؟ اس کی مرضی جاننا ہی فرض ہے میری مرضی جاننا ضروری نہیں اور... اور آخر اس کے لیے ہی کیوں سب کو وشمہ کا خیال آیا... کیا آج سے پہلے امی کے ذہن میں بھتیجی کی محبت نہیں جاگ سکتی تھی؟ آخر وصی ہی کیوں؟ اور کیا وشمہ کو میں دن رات اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے ہی گھر میں دیکھ سکوں گا؟ میں نے یہ تمنا تو کی تھی... مگر اس طرح نہیں کہ وہ میرے سامنے ہو اور کسی دوسرے کے ساتھ ہو۔ نہیں اس رشتے سے وصی کے حوالے سے اسے ایک ہی چھت کے نیچے برداشت کرنا بہت مشکل ہو گا میرے لیے۔"
وہ خوف زدہ تھا کہ اگر پروین کی یہ خواہش پایۂ تکمیل تک پہنچ گئی تو اس کا ردعمل کیا ہو گا؟ اب تک وہ دبا کے بندھے اپنے تعلق پہ ناپسندیدگی بڑی کامیابی سے چھپاتا آیا ہے کیا وشمہ سے اپنی پسندیدگی بھی اس کامیابی سے چھپا پائے گا۔

باہر سے مدھم مدھم آتی آوازیں اچانک تیز ہوئیں اور ان میں تندی ترشی کا تاثر جھلکنے لگا تو وہ چونک گیا۔
حیران ہونے پہ وصی کی آواز صاف سنائی دی۔
"وجہ کیا صرف یہی ہو سکتی ہے کہ وشمہ میں کوئی کمی ہے؟" اس نے بے حد جھنجلا کر پروین کے کسی سوال کا جواب دیا تھا۔
حسن اٹھ کے بیٹھ گیا۔
"کیا یہ وجہ کافی نہیں کہ... کہ میں کسی اور کو پسند کرتا ہوں۔"
اس کے جواب نے جہاں پروین اور شوکت جہاں کو دنگ کر کے رکھ دیا... وہیں حسن کا دل ہلکا پھلکا ہو گیا۔
"نہیں کولیگ نہیں ہے وہ تو ابھی پڑھتی ہے اسٹوڈنٹ ہے اور ندا آپی کے کالج میں ہوتی ہے۔"
"اچھا تو ندا کے کالج کے پھیرے اسی لیے لگا کرتے تھے۔" شوکت جہاں نے مسکراتے ہوئے اسے چھیڑا۔ وصی ان کا لاڈلا چہیتا نواسا تھا۔ اس کی مرضی اور خوشی جاننے کے بعد جیسے وہ پل بھر میں فراموش کر گئی تھیں کہ کچھ دیر پہلے پروین کے ساتھ کیا باتیں کی جا رہی تھیں... لیکن پروین...
وہ تو سن ہو کر بیٹھی تھیں۔
طمانیت کے احساس نے بس چند لمحوں کے لیے انہیں آغوش میں لیا تھا۔ اور اب وہ پھر اسی کشمکش میں گرفتار تھیں جس کشمکش نے اسے گزشتہ کئی روز سے حصار میں لیا ہوا تھا۔
پہلے اس کشمکش کے ساتھ ایک امید بھی تھی۔
یہ امید کہ کبھی نہ کبھی وہ یہ مسئلہ حل کر ہی لے گی۔
اور اس بار تو آس نے بھی ہاتھ چھڑا کے راستہ بدل لیا تھا۔ اب صرف مایوسی ہمراہ تھی... اور یہ مایوسی کمبخت جس سفر میں ہم سفر بن جائے وہ سفر صدیوں پہ محیط ہو جاتا ہے۔
"ایسی بات نہیں ہے نانو! اور ویسے بھی میں اسے پہلے سے جانتا ہوں میرا مطلب ہے بچپن سے آپ سب بھی واقف ہیں اس سے اور خاص طور پر ماما!"
پروین نے سوالیہ نظروں سے وصی کو دیکھا۔
وہ بہت مضطرب نظر آ رہا تھا... ابھی ابھی سوہا سے دل کی بات کہہ کے آ رہا تھا... ابھی ابھی اس سے ایک نئے رشتے اور نئے احساس سے بندھا تھا اور ابھی ابھی اس رشتے کو سب کو سامنے define بھی کرنا پڑ رہا تھا۔ اس نے ابھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یہ مقام اتنی جلدی آ جائے گا... بغیر سنبھلنے یا کچھ سوچنے کا موقع دیے بغیر۔
"وہ... وہ سوہا ہے۔"
اس کے بتانے پہ بھی سامنے کھڑی شوکت جہاں اور پروین دونوں ٹکر ٹکر اسے دیکھتی رہیں... شوکت جہاں نا سمجھی سے کیونکہ ان کی یادداشت میں سوہا نام محفوظ نہیں تھا اور پروین اس لیے کیونکہ یہ نام سننے کے بعد بھی انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا یا شاید وہ یقین نہیں کرنا چاہ رہی تھیں۔

☼ ☼ ☼
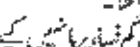
"حسن! تم بلاوجہ اس کی حمایت کر رہے ہو۔ تمہارے ابا کو پتہ چلا تو وہ میری ایسی درگت بنائیں گے جیسے سارا قصور میرا ہو۔ میں نے ہی اسے اس آفت لڑکی سے ملوایا ہو۔ حالانکہ میری غلطی اگر تم اسے واقعی غلطی سمجھو صرف اتنی ہے کہ اس کی ماں میرے بھائی کی بیوی ہے۔"
"امی! آپ بے کار میں پریشان ہو رہی ہیں... آپ اسے نہ جانتی ہیں نہ اس سے ملی ہیں پھر مخالفت کس لیے؟"
حسن وصی کی حمایت میں مضبوطی سے کھڑا تھا۔
"اچھی طرح جانتی ہوں اس نے بچپن میں کم تماشے برپا نہیں کیے تھے اب کون سا سدھر گئی ہو گی۔"

"حد ہو گئی امی۔۔۔! آپ ایک بچی کی حیثیت سے اسے پرکھ رہی ہیں۔ تب کی باتیں یاد کر رہی ہیں۔ جب وہ ایک تو کم عمر تھی‘ دوسرا عجیب و غریب حالات سے گزر رہی تھی۔ وصی کوئی ناسمجھ نہیں ہے۔ اگر اس نے سوہا کو پسند کیا ہے تو ضرور اس کی شخصیت میں کوئی ایسی بات ہو گی۔"

"اور وشمہ۔۔۔!"

پروین کے سوال پہ حسن چپ کر گیا اور اس کی یہ چپ دانستہ تھی۔

وہ نہیں چاہتا تھا اس کے منہ سے کوئی ایسی بات نکل جائے جس سے یہ ظاہر ہو جائے کہ اصل میں وہ وصی اور سوہا کے حق کے لیے نہیں‘ وصی اور وشمہ کی مخالفت میں کھڑا ہے۔

"آپ نے کون سا ابھی بات کی ہے وہاں۔۔۔ یہ محض آپ کی ذاتی خواہش تھی۔۔۔ وصی کی خواہش اور مرضی زیادہ اہم ہے۔"

"تم نہیں سمجھ رہے حسن! اس سے بہت سے مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ مجھے اعتراض صرف اس پہ نہیں کہ وہ منیزہ بھابی کے پہلے شوہر کی بیٹی ہے۔ اعتراض والی اصل بات یہ ہے کہ اس نے منیزہ بھابی کی نہیں اپنے بدقماش چچی کے یہاں تربیت پائی ہے۔"

حسن جز بز ہو کے رہ گیا۔

اس معاملے میں وہ کوئی دلیل نہ دے پا رہا تھا انہیں قائل کرنے کے لیے۔

"اور یہ اعتراض صرف مجھے نہیں بلکہ سب کو ہو گا اماں جان اور میاں صاحب کو بھی۔"

"لیکن۔۔۔ لیکن ہے تو وہ شریف ماں باپ کی اولاد۔"

"ہاں ان شریف ماں باپ کی اولاد۔۔۔ جن کی پرورش اس کے نصیبوں میں نہیں تھی اور پرورش کا بڑا اثر ہوتا ہے بیٹا!"

"تو اس میں قصور کس کا ہے بھابی؟"

وصی نے حسن سے وعدہ کیا تھا کہ وہ اس دوران بالکل بھی دخل نہیں دے گا۔ لیکن اس وقت اس سے رہا نہیں گیا۔

"باپ کو تو موت نے چھین لیا اسے تو اللہ کی مرضی قرار دے کر صبر کیا جا سکتا ہے لیکن ماں کی تربیت سے محروم کرنے والے تو آپ لوگ ہی تھے۔"

پروین ششدر رہ گئیں۔

بات سچ تھی۔۔۔ مگر اپنے ہی کسی چھوٹے کے منہ سے یہ سچ سننا بڑا تکلیف دہ امر تھا۔

"اس لڑکی نے تمہیں اتنا بدلحاظ کر دیا کہ اب تم میرے سامنے کھڑے ہو کر میری آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مجھے الزام دے رہے ہو۔۔۔ نجانے اور کتنا زہر بھرا ہو گا اس نے۔"

"وہ ایسی نہیں ہے بھابی۔۔۔! آپ اس سے ایک بار مل کے تو دیکھیں۔"

وہ منت سماجت پہ اتر آیا۔

شوکت جہاں بھی نیم رضامند لگ رہی تھیں۔

"ٹھیک ہے وشمہ کے لیے سب سے پہلے خواہش میں نے ظاہر کی تھی۔ لیکن جب وصی ہی راضی نہیں ہے تو..... آخر زندگی تو اس نے گزارنی ہے۔ رہا وشمہ کا سوال تو اس کے لیے میں تم سے معذرت کر لیتی ہوں کہ میں نے بات کر لی نہ تمہارے دل میں ارمان جاگتے۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں اماں جان۔۔۔ معذرت کیسی؟ بات اب صرف وشمہ کی نہیں ہے۔ سوال سوہا کا ہے۔ وہ کسی بھی طرح ہمارے گھرانے کے لیے مناسب نہیں ہے۔ میں اس کے چچا اور چچی دونوں کے بارے میں بہت کچھ سن چکی ہوں۔"

شوکت جہاں بھی کشمکش و پیچ میں پڑ گئیں۔

ایک جانب پروین اتنے وثوق سے یہ بات کر رہی تھیں۔

دوسری جانب وصی بضد تھا اور سوہا کی شان میں رطب اللسان بھی۔

"ہم ایک بار وصی کے کہنے پہ ہمیں اس سے ملنا ضرور چاہیے۔"

پروین بے بسی سے انہیں دیکھ کے رہ گئیں۔

وصی کے ساتھ شوکت جہاں تھیں۔۔۔ حسن تھا۔۔۔ ندا تھی‘ رخشندہ کی دبی دبی صلاح بھی یہ تھی کہ لڑکی کو جانچے پرکھے بغیر کوئی فیصلہ کرنا مناسب نہیں ہو گا۔

دوسری جانب وہ تنہا تھیں اور کمزور پڑ رہی تھیں۔

ندا کو بہت زور دینے پہ بھی یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس کے کالج کی وہ کون سی سوہا نام کی اسٹوڈنٹ ہے جس پہ وصی کا دل آیا ہے۔

ہانیہ نے بھی کل سے گھر میں گردش کرتی یہ خبریں سنیں۔۔۔ مگر دل پتھر کر لیا۔ اب اسے کیا فرق پڑنا تھا کہ وصی کی زندگی میں وشمہ شامل ہو یا سوہا۔۔۔ وہ خود پہ بے حسی طاری کرتی کسی اور جانب خود کو مشغول کر لیتی جب بھی یہ چرچا آس پاس ہو رہا ہوتا۔

سراج اور معراج تک یہ سارا معاملہ شوکت جہاں کی ہدایت پہ پہنچنے نہ دیا گیا۔

"پہلے یہ طے ہو لینے دو کہ سوہا یا وشمہ‘ اس کے بعد گھر کے مردوں تک بات پہنچے ورنہ بلاوجہ بدمزگی ہو گی‘ معراج کے مزاج کا تو پتہ ہے تم سب کو۔"

اور ایک لمبی بحث اور کشمکش کے بعد یہ طے پا گیا کہ یہاں سے پروین اور ندا‘ سوہا سے ملنے جائیں گی۔

"صرف اور صرف ملنے۔"

شوکت جہاں نے اپنے الفاظ پہ زور دے کر وصی کو باور کرایا۔

"ابھی وہ اس سے یا اس کی چچی سے ایسی کوئی بات نہیں کریں گی۔۔۔ پہلے پروین کو یہ تسلی کر لینے دو کہ سوہا تمہارے لیے مناسب رہے گی یا نہیں۔۔۔ اور یاد رکھو وصی۔۔۔! میں نے سالوں پہلے تمہاری پرورش کا ذمہ پروین کو سونپا تھا۔ آج میں اسے تمہارے بارے میں سارے اختیار بھی سونپ چکی ہوں۔"

شوکت جہاں کی بات پہ وصی نے تابعداری سے سر جھکا دیا۔۔۔ وہیں پروین کا بھی کچھ حوصلہ بڑھ گیا۔

"لیکن ندا کا جانا سمجھ میں نہیں آ رہا اماں جان! آپ بڑی ہیں‘ بزرگ ہیں آپ چلی جائیں۔"

رخشندہ نے خدشہ ظاہر کیا۔

"اسے تو ان معاملات کی ذرا بھی سمجھ بوجھ نہیں ہے۔ نجانے کیا کہہ دے۔"

"ایسے ہی آئے گی سمجھ بوجھ۔۔۔ اگلے مہینے شادی ہونے والی ہے اس کی اب بھی ان معاملات میں دلچسپی نہیں لے گی تو کب لے گی۔ ویسے بھی اسے بھیجنے کی صرف یہی اکلوتی وجہ نہیں ہے۔ ایک تو سوہا اس کے کالج میں پڑھتی ہے ہو سکتا ہے اس کے بارے میں زیادہ تفصیل سے جانتی ہو اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ندا وصی سے بہت قریب ہے۔ اس کی پسند ناپسند کو ہم سب سے بہتر جانتی ہے۔"

ندا نے اتراتے ہوئے ماں کو دیکھا۔

☼ ☼ ☼

"آخر مجھے میرے حال پہ چھوڑ کیوں نہیں دیتے اصغر؟"

زینا نے پھوڑے کی طرح دکھتے سر کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر بڑی التجا بھرے لہجے میں اس سے کہا تھا۔

"جب ذرا کوئی حال بھی تو ہو جس پہ چھوڑوں۔۔۔ یہ حال ہے؟" اس نے بھری ہوئی ایش ٹرے کی جانب اشارہ

"شکل دیکھو اپنی شیشے میں آنکھوں کے نیچے حلقے پڑے ہوئے ہیں‘ رنگ پیلا ہو گیا ہے۔"

"میں خوب صورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے... میں بدصورت نظر آؤں تب بھی تمہیں تکلیف ہوتی ہے۔"

"تو خوب صورت لگو... مگر صرف مجھے۔"

اصغر نے اس کا زرد و پرنقاہت کا مارا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھامتے ہوئے کہا۔

"اور تو یہ ہے کہ جب خوب صورت لگتی ہے تو باہر والوں کے لیے اور جب کچھ دنوں سے باہر جانا چھٹا ہوا ہے تو یہ بیمار شکل میرے لیے لے کر بیٹھ گئی یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔"

ریتا یک ٹک اسے دیکھے گئی۔

یہاں تک کہ اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"جھلی... اب رونے کیوں لگی؟ سچ سچ بدصورت تھوڑا ہی کہا ہے میں نے تو بدصورت ہو بھی نہیں سکتی۔ کبھی بھی نہیں دس دن منہ نہ دھوئے تب بھی نہیں۔"

اس کی بات پہ ریتا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

"تم بہت اچھے ہو اصغر!"

"چل تجھے پتا تو چلا۔"

"پتہ تو مجھے تھا... پہلے سے تھا کہ تم بہت اچھے ہو لیکن کیا ہے اصغر! کہ کبھی کبھی انسان کو کسی بہت اچھی چیز کی بھی خواہش نہیں رہتی۔ کبھی کبھی اچھی چیزیں راس بھی نہیں آتیں۔"

"پھر سے وہی مشکل مشکل باتیں کتنی بار کہا ہے۔ آسان باتیں کیا کر' آسان زندگی جیا کر۔"

"اپنے بس میں ہے زندگی کا آسان کرنا؟"

"ہے کیوں نہیں ہے... تین چار سال ہو گئے ہیں ہمیں اکٹھے ملک سے باہر نکلے۔ چل سنگاپور یا ملائیشیا ہو کے آتے ہیں یہ ذرا سستے پڑتے ہیں۔"

نرمی سے اسے دیکھتے دیکھتے ریتا پھر سے ہنسنے لگی۔

"کوئی لطیفہ سنایا ہے میں نے؟"

"محبت میں بھی نفع نقصان پورا سوچ کے رکھتے ہو۔ پکے کاروباری ہو تم اصغر...! میری خوشی کے لیے مجھے باہر بھی لے جا رہے ہو یہ خیال بھی ہے کہ ذرا سستا پڑے۔"

وہ پھر سے ہنسنے لگی اور اصغر خجالت مٹانے کے لیے خوامخواہ مسکرانے لگا۔

"اچھا چل سنگاپور یا ملائیشیا بعد کی باتیں ہیں۔ سوہا آتی ہے تو کرتے ہیں پروگرام سیٹ۔ ابھی تو چل میرے ساتھ گھومتے پھرتے ہیں۔ کھانا کھاتے ہیں شاپنگ کرتے ہیں پرانی یادیں تازہ ہوں گی۔"

بہت عرصے بعد وہ موڈ میں آیا تھا۔

بہت عرصے بعد ریتا کو اس کا چونچال پن برا نہیں لگ رہا تھا لیکن باہر جانے کے خیال سے پھر سے کسلمندی چھانے لگی۔

"نہیں آج نہیں بہت تھکن ہو رہی ہے۔"

"تھکن... صوفے پہ بیٹھے بیٹھے؟"

"ہاں... پیروں میں اینٹھن سی ہو رہی ہے۔"

"ادھر... دکھا۔"

تو پیس قیمتی سوٹ میں ملبوس... وہ وہیں اس کے ساتھ صوفے پہ بیٹھ گیا اور اس کا پیر اپنی گود میں رکھ لیا۔

"پھر سگریٹ؟"

"بس ایک... پلیز۔"

ریتا نے اس کی جانب مسکراہٹ اچھالی... اور اس مسکراہٹ کے پیچھے تو وہ سالوں سے ہارتا آرہا تھا۔

[illegible] اور جب وہ سگریٹ کے کش لگاتی اصغر کی گود میں پیر رکھے ہوئے تھی اور اصغر بڑی مہارت سے اس کے تلووں کا مساج کر رہا تھا عین اسی وقت ملازمہ پروین اور ندا کو لے کر اندر داخل ہوئی۔

"[illegible] سوہا بی بی سے ملنے آئی ہیں۔"

[illegible] نے اس منظر سے بے حد کراہیت محسوس کی اور ندا بھی شرم سے نظریں چرا گئی۔

"[illegible] ہے؟"

[illegible] نے پیر تو اٹھا لیے اصغر کی گود سے مگر دھوئیں کا ایک بھاری کش چھوڑتے ہوئے ان دونوں کے چہرے بغور [illegible]

"پروین سوہا کی دوست ہو سکتی تھیں نہ ندا۔"

"میں... میں وصی کی ممانی ہوں اور یہ اس کی بہن۔"

[illegible] نے اس کی آنکھوں میں استفسار دیکھ کر نہ چاہتے ہوئے بھی آپ اپنا تعارف کروایا۔

"او..." اس نے جلدی سے سگریٹ ایش ٹرے میں بجھائی اور کھڑی ہو گئی۔ اصغر نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے اس [illegible] تقلید کی۔

"کھڑی کیا منہ دیکھ رہی ہو... جاؤ سوہا کو لے کر آؤ۔"

"[illegible] انہوں نے منع کیا تھا انہیں کوئی نہ جگائے۔ رات پونے تین بجے تو وہ گھر آئی تھیں۔"

ملازمہ کی اطلاع پہ پروین اور ندا ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔

"آپ باہر تشریف رکھیں۔"

ریتا کھلا کے آداب میزبانی نبھانے لگی۔ اس کے انداز دیکھ کے اصغر کو بھی لگا کہ آنے والے مہمان خاص [illegible] گے ورنہ ریتا ہر ایک کو گھاس ڈالنے والوں میں سے نہیں۔

[illegible] اور ندا بہت تکلف کے ساتھ صوفے پہ ٹک گئیں۔ بارہ پندرہ منٹ کے انتظار کے بعد سوہا زینے سے اترتی نظر آئی... اور ندا اس پہ پہلی نظر ڈالتے ہی حیرت سے کھڑی ہو گئی۔

☆ ☆ ☆

[illegible] سر جھکائے سن رہا تھا اور پروین اور ندا دونوں دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

"سوہا ہے... وہ؟"

ندا بے یقینی سے انداز میں اس پہ چلا رہی تھی۔

"[illegible] کالج کی سب سے بدنام لڑکی! کیا ہو گیا ہے تمہاری پسند کو وصی؟"

"[illegible] خراب ہو گیا ہے اس کا اور کیا؟"

[illegible] میں... ذہن سے وہ منظر محو نہیں ہو رہا تھا۔

"غضب خدا کا... یہ شرفاء کے اطوار ہوتے ہیں کیا؟ سگریٹ کے کش لگاتی مسنڈوں کی طرح لیٹی تھی... بغیر [illegible] اور وہ جورو کا غلام ٹائی لگائے کوٹ پہنے گود میں اس کے پیر رکھے مالشیا بنا ہوا تھا۔ یہی حال وہ لڑکی [illegible] ہوگی' جس عورت نے اس کی تربیت کی ہے وہ وہاں کی ہے جہاں مردوں کو اسی طرح جوتے کی نوک [illegible] جاتا ہے۔"

"[illegible] بہت حساس اور دکھی لڑکی ہے' اسے ہمارے گھر کا ماحول اور آپ سب کی محبت ملے گی تو وہ سنبھل [illegible]"

"[illegible] وصی! یہ گھر کوئی تجربہ گاہ نہیں ہے بس یہ طے ہے کہ اس گھر میں ایسی کوئی لڑکی نہیں آئے گی۔"

[illegible] جہاں نے حتمی انداز میں کہا۔

"[illegible] تم اپنے بھائی کے ہاں فون کرو... انہیں اطلاع دو کہ ہم اس اتوار ان کے ہاں آرہے ہیں۔"

"جی۔۔۔ اچھا۔" وہ پھرتی سے اٹھیں۔
"اور یہ بھی بتاؤ نا کہ کس مقصد سے آرہے ہیں۔" ان کے اضافہ کرنے پہ وصی پہلو بدل کے رہ گیا۔
"تائی۔۔۔! ٹھنڈے دل سے غور کریں تو آپ۔"
"وصی پلیز۔۔۔! غور تم کرو۔" ندا نے ڈانٹتے ہوئے کہا۔
"ہمیشہ تم مجھے اچھا برا اونچ نیچ سمجھاتے رہے ہو۔ پھر آج تمہاری عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ لڑکی کسی بھی طرح تمہارے قابل نہیں۔ کل کو تم کسی کے سامنے سر اٹھانے کے قابل نہیں رہو گے۔"
"اور ذرا سمجھداری سے کام لو۔۔۔ ندا کی شادی ہونے والی ہے اور وہ بھی غیروں میں کتنا اثر پڑے گا اس کے رشتے پہ بھی اس عورت سے تعلق قائم ہونے کا۔"
وصی بے بسی سے گہرا سانس بھر کے رہ گیا اور اٹھ کر بوجھل قدموں سے اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔

○ ○ ○

"اصغر۔۔۔! تم کہیں جانے کا بات کر رہے تھے؟"
ربنا نے بے حد سنجیدگی سے اس سے پوچھا۔
"ہاں۔۔۔ لیکن بھئی ہماری بیگم کے شایانِ شان نہیں ہمیں ملائیشیا اور سنگاپور۔۔۔ سستے پڑتے ہیں ناں اس لیے۔۔۔ تو جناب اب ہم پلاننگ کریں گے لندن کی۔۔۔ یا پھر۔"
"ملائیشیا ٹھیک ہے۔ ٹکٹ جلدی مل جاتا ہے وہاں کا کل کی سیٹ بک کروا لو۔"
"خیر تو ہے؟" وہ اس سنجیدگی پہ ٹھٹکا۔
"ہاں فی الحال تو خیر ہے ویسے ہی سوچا سوہا کا دل بھی بہل جائے گا۔ کچھ وقت ہمیں بھی ایک ساتھ گزارنے کو مل جائے گا۔" بہت مشکل سے وہ اپنے چہرے پہ مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئی اور اصغر بہل گیا۔
لیکن سوہا کو بہلانا اتنا آسان نہیں تھا۔
"اتنا اچانک پروگرام۔"
"تم جاؤ گی تو میں جاؤں گی ورنہ۔۔۔ تمہیں تو پتہ ہے تمہارے چاچو سے زیادہ بور کوئی اور نہیں ہے اس دنیا میں۔"
"میں نے منع نہیں کیا لیکن کل ہی؟"
وہ سمجھ رہی تھی کہ اصغر سے گزشتہ دن بلا کی کشیدگی رہنے کے بعد ربنا پہلی بار خود سے پیش قدمی کر رہی ہے اور ان دونوں کا چند دن کسی اچھے مقام پہ رہنا بہت خوشگوار اثرات مرتب کرے گا لیکن دوسری جانب وصی سے دور رہنے کو بھی جی نہیں چاہ رہا تھا۔۔۔ دو دن تو گزرے تھے پہلے پہلے پیار کی بارش میں بھیگتے ہوئے۔۔۔ ابھی تو دل کی مٹی پوری طرح نم بھی نہ ہوئی تھی۔۔۔ سیرابی کا ہلکا سا بھی احساس نہ جاگا تھا۔ ایسے میں وہ چند دنوں کے لیے بھی [illegible] دور کیسے چلی جاتی۔۔۔ پھر اس کی ممانی کا وہاں آنا۔۔۔ بغیر کچھ کہے سنے چند منٹ بعد ہی روٹھے روٹھے انداز میں چلا جانا۔۔۔ یہ بھی اسے الجھا رہا تھا۔
اس نے وصی کا نمبر ملایا۔
"ہاں سوہا بہت جلدی جاگ گئیں تم؟"
اس وقت وہ اس سے بات کرنے کے لیے ذہنی طور پہ تیار نہ تھا اس لیے گڑبڑا کے اتنا ہی کہہ سکا۔
"طنز کر رہے ہو؟"
"طنز؟"
"ہاں۔۔۔ کل تمہاری ممانی آئیں تو میں دوپہر تک سو رہی تھی اس لیے۔۔۔ شاید وہی غصہ نکال رہے ہو لیکن یار! تم نے بھی تو اطلاع نہیں دی ان کے آنے کی۔۔۔ ورنہ میں کسی نہ کسی طرح جاگ ہی جاتی [illegible] کو سوئی دیر سے تھی۔"

"[illegible] ہوں۔ ظاہر ہے جب گھر تین بجے آئی تھیں تو سوئی چار بجے ہو گی۔"
[illegible] کے خشک لہجے پہ غور کرتے ہوئے سوہا لمحہ بھر کو چپ ہوئی پھر تلخی سے بولی۔
"[illegible] کو تین بجے گھر آنا میرا معمول نہیں ہے اور نہ ہی دن کو ڈیڑھ بجے جاگنا۔ ایسا ہوتا تو میں کالج کیسے جاتی۔ [illegible] کو میں ایک مہندی کے فنکشن میں تھی اور مہندی کے فنکشنز تو رات تین چار بجے تک چلا ہی [illegible]"
[illegible] عادت کے خلاف وضاحتیں پیش کرتے ہوئے سوہا کو بڑا عجیب سا لگا۔
"[illegible] چھوڑو یہ باتیں۔۔۔ میں نے یہ پوچھنے کے لیے فون کیا تھا کہ میں ماما اور چاچو کے ساتھ دو دن کے لیے [illegible] چلی جاؤں؟"
"[illegible] میں مجھ سے پوچھنے والی بات کون سی ہے؟"
[illegible] بجھے بجھے انداز میں زبردستی بشاشت پیدا کرنا اسے بہت مشکل لگ رہا تھا۔
"[illegible] سے ہی تو پوچھنا ہے اب سب کچھ۔"
[illegible] کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔
"[illegible] بھی مجھے لگا۔۔۔ کل تمہاری ممانی ہمارے ہاں آ کے کچھ اپ سیٹ ہو گئی تھیں۔۔۔ ہونا بھی چاہیے اتنے [illegible] انہیں سامنے دیکھ کر مجھے بھی بہت عجیب سا فیل ہوا۔ وہ سب کچھ یاد آ گیا جو مجھے بھلے موڈ کو برباد کرنے [illegible] لیے کافی تھا۔ مجھے یقین ہے انہیں بھی مجھے دیکھ کر کچھ خوشگوار احساس نہ ہوا ہو گا۔ میں کچھ دنوں کے لیے [illegible] غائب ہو جاؤں گی تو شاید تم بھی اس مہم میں کامیاب ہو جاؤ۔"
"[illegible] مہم؟" وہ غائب دماغی سے پوچھنے لگا۔
"[illegible] منانے کی مہم یار۔۔۔! اور کیا لگتا ہے تمہاری اچھی خاصی کھنچائی ہوئی ہے گھر میں۔۔۔ تبھی ہوش اڑے [illegible]"
[illegible] کے انداز اندر ہی اندر سوہا کو بھی ڈرا رہے تھے مگر وہ بات کو مذاق میں اڑا رہی تھی۔
"[illegible] نے تو کہا تھا تمہیں کہ میری محبت تمہیں خوار کرائے گی مگر تم خود دل و جان سے راضی تھے خوار ہونے [illegible] لیے۔" وصی پھیکے پن سے مسکرا دیا۔
[illegible] ہونے کے بعد اس نے اطمینان کا سانس لیا۔
[illegible] چاہتا تھا کر نہیں سکا۔
[illegible] ہونے جا رہا تھا۔۔۔ اسے روکنے پہ وہ قادر نہیں تھا۔
[illegible] اور اپنی بے بسی کا اظہار وہ اس لڑکی کے سامنے کر بھی نہیں سکتا تھا۔ چند دن پہلے جس کے سامنے بڑے [illegible] ہوئے کیے تھے تو بہتر یہی تھا کہ وہ جو کچھ ہو رہا تھا ہونے دیا جاتا۔ جو قدرت کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یعنی سوہا کا منظر سے [illegible]
[illegible] میں یہ جانتا ہوں کہ وہ صرف ملک سے باہر نہیں جا رہی۔۔۔ میری زندگی سے بھی دور جا رہی ہے۔ [illegible] آنے کے بعد سب کچھ بدلا ہو گا۔ میں، میرا دل، میری زندگی، میرے خواب سب کچھ اس کے باوجود [illegible] جانے کے خیال سے میرا دل بوجھل کیوں نہیں ہو رہا۔ میری آنکھوں میں آنسو کیوں نہیں ہیں؟ میں [illegible] کیوں نہیں چاہ رہا میں اسے چاہنے کی دل سے کوشش کیوں نہیں کر رہا؟ کیا مجھے اس سے محبت تھی ہی نہیں؟ [illegible] جو اچانک میرے دل میں اس کے لیے جاگا تھا۔۔۔ یہ محبت کا نہیں ہمدردی کا جذبہ تھا؟ کیا میں ایک [illegible] سے صرف اس کی زندگی میں کچھ آسانیاں کچھ خوشیاں لانا چاہتا تھا۔"
[illegible] محسوس کی تھی۔۔۔ جس کے لیے سوہا نے اپنے دل میں سب سے بڑھ کے محبت محسوس کی تھی۔
[illegible] سا۔۔۔ وہ لڑکا۔۔۔ جس سے سوہا نے زندگی کی سب سے سچی اور بے لوث دوستی کی تھی۔۔۔ وہ لڑکی بھی

اس کے جانے کی خبر سن کر شانت سی ہو گئی۔

"I will miss you یار!"

"میں بھی۔"

تقدیس دل ہی دل میں اس کی محبت اور خلوص کے سامنے شرمندہ ہو رہی تھی۔

"کیا لاؤں تمہارے لیے؟"

اس کے احساسات سے بے خبر سوہا سے پوچھ رہی تھی۔ تقدیس کو اس کے جانے سے اطمینان کا احساس صرف اس لیے ہو رہا تھا کہ اگلے ہفتے تحریم کی شادی تھی۔ ایسا کیسے ہو سکتا تھا کہ تقدیس کی بہن کی شادی ہو اور اپنی سب سے عزیز اور قریبی دوست کو وہ نہ بلائے۔ دوسری جانب اسے اپنی ماں کی جانب سے شدید خطرہ تھا۔

اگرچہ سوہا نے اپنے رنگ ڈھنگ سے اپنا پہناوا۔۔۔ اپنی بول چال عادتیں سب خاصی حد تک بدل ڈالی تھیں لیکن اب بھی وہ مدیحہ کے مرتب معیار سے بہت دور تھی۔ انہیں تو بلند و بانگ قہقہے تک لگانے والی لڑکی واہیات لگا کرتی تھی۔ ایسے میں جب سوہا نے دو ہفتے کے لیے بیرون ملک جانے کی خبر سنائی تو یہ تقدیس کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

مشرو نے ریسیور رکھا اور بڑے جوش کے ساتھ پلٹی۔ اندر داخل ہوتے نوید مراد نے تعجب کے ساتھ دیکھا۔ اس کے چہرے پہ یہ چمک اب کم کم نظر آتی تھی۔

"اب تو آپ کو ماننا ہی ہو گا میں ایک بار جو ٹھان لیتی ہوں کر کے رہتی ہوں۔"

"کیا ہوا؟"

"پروین کا فون تھا۔" فتح کی سرشاری اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

"وہ اپنی ساس اور میاں کے ساتھ آ رہی ہے۔ وشمہ کا رشتہ لے کر۔"

"واقعی؟" انہیں خوشگوار حیرت ہوئی۔

وشمہ کے لیے ایسی سسرال اور ایسے لڑکے کے انہوں نے خواب دیکھ رکھے تھے اور وہ جانتے تھے وہ صرف خواب دیکھنے تک محدود رہنے والے شخص ہیں۔ یہ مشرو تھی جس نے ان خوابوں میں تعبیر کا رنگ بھرنے کے لیے تگ و دو کی تھی۔

"تم نے وشمہ کی ماں ہونے کا حق ادا کر دیا۔"

نوید کے اعتراف نے اسے آسمان پہ پہنچا دیا۔

اس آسمان پہ۔۔۔ جہاں اس وقت اس کی بیٹی پرواز کرتی اس ملک سے دور جا رہی تھی۔

وہ بیٹی۔۔۔ جس کی ماں ہونے کا حق وہ ادا نہ کر سکی تھی۔

● ● ●

"اسے بھی ابھی بیمار ہونا تھا۔۔۔ پہلے ہی صورت پہ مردنی چھائی رہتی ہے اوپر سے یہ بخار [illegible] لے رہا۔"

تیسرا دن تھا جب مدیحہ تحریم کے بخار سے چڑ کے بولیں۔۔۔ بخار دواؤں کے زیر اثر ٹوٹ جاتا تھا۔ [illegible] ہوتے ہوتے پھر سے تیز ہو جاتا تھا۔ وہ بے چاری نچڑ کے رہ گئی تھی۔

"شادی میں دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔۔۔ اور اسے دیکھو ذرا۔" ان کے لہجے میں کوفت اور بے زاری [illegible] کر کے تحریم نے تپش سے سلگتی آنکھیں کرب سے موند لیں۔ پلکیں جڑتے ہی اندھیرے اندر تک اترتے محسوس ہوئے۔

"اس میں آپی کا کیا قصور ہے بھلا؟" تطہیر کو بھی برا لگا۔

قصور نہیں ہے۔ لیکن تم نے سنا ڈاکٹر کیا کہہ رہا تھا کہ اس بخار کی وجہ نفسیاتی ہے۔ سارے ٹیسٹ تو کلیئر ہیں۔ نہ ٹیریا، نہ جانڈس، نہ ٹائیفائیڈ نہ کسی اور قسم کا انفیکشن۔۔۔ اب اسے خود ہمت کر کے اس بیماری کا [illegible] کرنا ہو گا۔ مگر یہ ہے کہ نہ کچھ کھا رہی ہے نہ پی رہی ہے۔ دن میں تین بار رو لیتی ہے۔ مگر ایک ہی بار میں اتنا [illegible] ہے کہ دوسری بار ہمت جواب دینے لگتی ہے۔ اتنا تنگ تو اس نے کبھی بچپن میں بھی نہیں کیا۔"

"مسلسل بخار کی وجہ سے چڑچڑی ہو رہی ہیں۔۔۔ اور کوئی وجہ نہیں ہے۔" تقدیس نے یہ کہتے ہوئے تحریم کی بند [illegible] لرزش کو دکھ سے دیکھا۔

(یہ کاش وہ اندازہ کیوں نہیں لگا سکتیں کہ ان بند آنکھوں کے پیچھے کون سا سیلاب ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔)

"میں کس کس کو سمجھاؤں گی کہ کوئی اور وجہ نہیں ہے۔" مدیحہ کا لہجہ اور آواز دونوں تیز ہوئے۔

"گھر میں مہمان آنا شروع ہو گئے ہیں اور تم اچھی طرح جانتی ہو۔ اپنے باپ کے رشتے داروں کو۔ سو سو سوال [illegible] گے وہ اس کی اتری صورت اور فق رنگت دیکھ کر۔"

[illegible] کہتے ہوئے مدیحہ ہمیشہ کی طرح اب بھی بھول گئیں کہ جعفر محمود کے رشتے دار جتنے جعفر محمود کے سگے ہیں [illegible] سگی قرابت داری ان کی۔۔۔ بھی ہے۔

"[illegible]۔۔۔ کیا ان کے گھروں میں کبھی کوئی بیمار نہیں ہوتا۔۔۔" تقدیس تو ماں کے انداز پہ ناگواری محسوس کرنے [illegible] چپ رہی۔۔۔ مگر تطہیر الجھ پڑی۔

"اچھا۔۔۔ بس بھی کریں۔۔۔ آپی کے سر پہ کھڑے ہو کر یہ بحث کرنا کیا بہت ضروری ہے۔۔۔ آرام کرنے دو [illegible]۔"

"بستر کی ہو کے رہ گئی ہے۔۔۔ اور اب بھی تم اسے مزید آرام کرانے کے درپے ہو۔۔۔ اسے لان میں لے [illegible] واک کراؤ۔۔۔ تاکہ کچھ فریش نظر آئے۔۔۔ کہیں گھمانے لے جاؤ۔۔۔ شادی کے دن قریب ہوں تو لڑکیوں کے [illegible] کے چکر ہی ختم نہیں ہوتے۔۔۔ ایک یہ ہے نہ تو شاپنگ میں دلچسپی لی۔۔۔ نہ کسی اور معاملے میں۔۔۔ ایسا کب [illegible] چلے گا۔۔۔ مجھے تو ڈر ہے اس کے سسرال والے اس کی بے دلی محسوس نہ کر لیں۔۔۔ اب تک تو میں نے اس کی [illegible] اور عدم دلچسپی پہ اس کی سنجیدہ طبیعت اور شرم و حیا کا بھرم ڈالا ہوا ہے مگر کب تک؟"

مدیحہ کے خدشات بھی بے بنیاد نہ تھے۔۔۔ اپنی جگہ وہ بالکل ٹھیک تھیں۔۔۔ اپنے سسرال والوں کے سامنے تحریم [illegible] انداز۔۔۔ اور مسلسل منہ سی کر بیٹھنا انہیں خفت میں مبتلا کر دیتا تھا اور وہ خجالت بھری ہنسی کے ساتھ کہا [illegible]

"[illegible] تحریم ایسی ہی ہے۔۔۔ آج کل کی لڑکیوں کے برعکس بے حد پرانی قسم کی لڑکی ہے۔۔۔ شرم کے مارے یہ تو [illegible] سامنے تک آنے سے گھبراتی ہے۔۔۔ آپ ہی کیا۔۔۔ پورے خاندان میں شاید ہی کسی نے اس کی اونچی آواز [illegible]۔"

[illegible] ایسا لگتا جیسے سامنے بیٹھے چہروں پہ ان کی بات سن کر تمسخر پھیل گیا ہے۔

[illegible] ہر نکلیں تو تقدیس نے تاسف سے تحریم کو دیکھا جو اب تک آنکھیں بند کیے ہوئے تھی۔

"[illegible] کان بھی بند کر لیتیں آپی؟"

[illegible] نے تطہیر کو بڑے خراب موڈ میں مدیحہ کے پیچھے پیچھے کمرے سے نکلتا دیکھا تو کچھ سوچ کر روک لیا۔

"[illegible] تم آپی کے پاس بیٹھو۔۔۔ ان کا خیال رکھنا۔"

"[illegible] ٹھیک ہوں۔۔۔ مجھے اکیلا چھوڑ دو۔"

[illegible] نے نقاہت بھری آواز میں منت سی کی۔

"[illegible] بالکل نہیں۔۔۔ ماما نے ہر بات غلط نہیں کی آپی! آپ کو اپنی دل پاور سے کام لینا ہو گا۔ ایسے بیمار پڑے [illegible] کچھ نہیں ہو گا۔ آپ کی زندگی کے ساتھ ایسا کچھ نہیں ہونے جا رہا جو انہونی بات ہو۔۔۔ کیا ہر لڑکی کی [illegible] ہوتی؟"

"ہوتی ہے۔ مگر کبھی لاش کی بھی شادی ہوئی ہے؟"
تقدیس اس کی بات سن کر لرز کے رہ گئی۔
"خدا کا خوف کرو آپی! کیسی باتیں کر رہی ہو؟"
تطہیر نے دہل کر کہا جبکہ تقدیس تو سن سی ہو کر رہ گئی تھی۔ کچھ کہہ نہ سکی۔
"وحید نے میری جان نچوڑ کے رکھ دی تھی۔ اس بے جان پتلے پہ رنگ و روغن کر کے ماما کیوں کسی کو دھوکا دینا چاہتی ہیں۔ کیا میں اس قابل ہوں کہ کسی کی زندگی میں پورے اعتماد سے شامل ہو سکوں۔"
"کیوں نہیں ہیں آپ اس قابل؟ کیا کمی ہے آپ میں؟ کیا کیا ہے آپ نے؟ صرف ایک چرب زبان اور شاطر شخص کی باتوں میں ہی آ گئی تھیں نا... ذرا سا قدم لڑکھڑائے تھے پھسلے تو نہیں تھے۔ ایسی چھوٹی موٹی لغزشیں تو ہر انسان سے ہوتی ہی رہتی ہیں۔ ان ہی سے انسان سبق سیکھتا ہے اور پھر آئندہ زندگی میں ایسا کچھ نہ کرنے کا عہد کرتے ہوئے اگلے قدم مضبوطی سے دھرتا ہے۔"
"تو... تو کیا جب اسے پتا چلے گا تو وہ کھلے دل سے مجھے قبول کرے گا؟"
تحریم کا سوال کچھ دیر تو تقدیس کی سمجھ میں نہیں آیا اور جب آیا تو وہ چلا اٹھی۔
"کچھ نہیں کیسی کی آپ زاہد بھائی سے۔ ایسے کوئی اہم بات نہیں تھی یہ جو ان کو بتانا ضروری ہو۔"
"بددیانتی کی بنیاد پہ قائم رشتہ..."
"مائی گاڈ! کیا فضول کی بحث لے بیٹھی ہیں آپ دونوں۔" تطہیر اس بحث سے تنگ آ گئی۔
"آپی! تقدیس ٹھیک کہہ رہی ہے۔ آپ بہت نگیٹو تھنکنگ رکھنے لگی ہیں۔ آپ کو خود کو بدلنا ہو گا۔ اور تقدیس پلیز! اتم اور ماما..."
"Please give her a break انہیں سنبھلنے تو دو۔ پتا نہیں ماما کو کیا جلدی تھی۔ کچھ ٹائم آپی کو تو وہ خود ہی اس احساس سے باہر آ جاتیں۔ اب یہ فائنل ہے کہ کوئی یہ بحث دوبارہ نہیں چھیڑے گا۔"
"او کے... تم بیٹھو آپی کے پاس... اور انہیں چیئر اپ کرنے کی کوشش کرو۔ میں ماما کو سمجھاتی ہوں۔"
وہ ڈرتی تھی... ہر وقت ڈرتی تھی کہ تطہیر اپنی دو ٹوک اور بے جھجک زبان کی وجہ سے کسی دن ماما سے زیادہ گستاخی نہ کر بیٹھے۔ اسی لیے ایسے کسی بھی موقع پہ اس کی کوشش ہوتی کہ ان دونوں کا آمنا سامنا کم سے کم ہو۔

● ● ● ●

"تو تم نے ہتھیار ڈال دیے۔"
وہ بیڈ پہ آڑا ترچھا لیٹا چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ جب حسن نے اندر آتے ہوئے چبھتے ہوئے انداز میں سوال کیا۔
"میں نے ہتھیار اٹھائے ہی کب تھے۔" وہ پھیکی سی ہنسی ہنس دیا۔
"یہ تمہاری زندگی کا سوال ہے وصی۔ جس کو چاہتے ہوں اس سے دستبرداری پھر بھی کچھ آسان مرحلہ ہوتا ہے۔ مگر کسی ان چاہے کا زندگی میں زبردستی داخل ہونا... اس مرحلے سے گزرنا اتنا آسان نہیں ہے... تم کیوں اپنی آئندہ زندگی میں مشکلات پیدا کر رہے ہو... آج تمہیں بڑوں کے خلاف اسٹینڈ لینا مشکل لگ رہا ہے۔ مگر اپنے فیصلے کو سراہو گے۔ یہ ذرا سی ہمت دکھا لینے پہ تم باقی کی ساری زندگی محبت کے ساتھ گزارو گے۔ ورنہ ایک ٹوٹے ہوئے ہارے ہوئے تم خود دو انسان بن کر جیو گے۔"
حسن پورے جوش کے ساتھ اسے اکسا رہا تھا۔ حالانکہ وہ وشمہ سے شادی کرنے پہ مانے یا نہ مانے۔ حسن کو تو پھر بھی نامراد ہی رہنا تھا۔ اس کی زندگی میں ظل ہما کا نام کی سیاہی سے لکھ دیا گیا تھا۔ لیکن وہ شدت سے وصی کی جانب سے اس بغاوت کا متمنی تھا جو بغاوت اس سے نہ ہو سکی۔ ایسا کرنے اور چاہنے کے پیچھے ان کے پاس بے شمار وجوہات تھیں۔

بڑی وجہ وہ اب بھی وشمہ کے حوالے سے اپنے دل میں کسک محسوس کرتا تھا۔ اسے اپنا نہیں بنا سکا الگ بات ہے۔ لیکن اسے کسی اور کا ہوتا دیکھنا... یہ بہت تکلیف دہ ہوتا اس کے لیے۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ کبھی نہ کبھی کسی سے وشمہ کی شادی ہونا ہی ہے۔ مگر وہ کسی نہ کسی اس کا اپنا بھائی ہو یہ بات ناقابل برداشت تھی۔

دوسری بڑی وجہ اس کا وہ اظہار محبت تھا جو اس نے بے اختیار ہو کر وشمہ سے کر دیا تھا۔ تب وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ اس کی رسائی سے باہر ہے۔ اگر یہ اظہار دل تک رہتا تب شاید وہ کسی نہ کسی طرح زندگی میں اس کا سامنا کرنے کے قابل ہوتا۔ ابھی تو یہ خیال سوہان روح تھا کہ اسے وشمہ کے سامنے آنکھیں بھی اٹھانا پڑیں گی۔ یہ ڈر گھیرے میں لیے رہتا کہ وہ معصوم لڑکی اسے ہرجائی اور بھنورا صفت سمجھتی ہو گی جو اس سے محبت کا اقرار کرنے کے دو دن بعد ہی کسی اور کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی پہنا رہا تھا۔ اور ایسے میں اگر وہ اس گھر میں آنے کے امکان پیدا ہو رہے ہوں تو اس کا بدکنا لازمی تھا۔ کہاں تو وہ اس سے سامنا کرنے سے کترا رہا تھا اور کہاں اب عمر بھر اس کے سامنے نظریں جھکا کے اور کنی کترا کے رہنا پڑے۔
تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ اس نے وصی کو ہمیشہ حسان کی طرح اپنا چھوٹا بھائی سمجھا تھا۔ اپنے چھوٹے بھائی کے روپ میں اس لڑکی کو دیکھنا کتنی شرم کی بات تھی؟ جس لڑکی سے کبھی اس نے ٹوٹ کر محبت کی ہو... جس کے نقش کو تصور میں بسا کے گھنٹوں سرور لیا ہو...
یہی وہ تین وجوہات تھیں جن کی وجہ سے اسے اپنے موقف پہ قائم رہنے پر ورغلا رہا تھا۔
"خود کو کمزور کیوں سمجھ رہے ہو۔ میں ہوں نا تمہارے ساتھ۔ اور یہ کون سا بچپن کی منگنی کا قصہ ہے جو مسئلے پیدا ہوں۔ ابھی ابھی تو یہ خیال پیدا ہوا ہے امی اور دادو کے دل میں۔ ان کی خواہش زیادہ اہم ہے یا تمہاری خوشی۔ میں خود تمہارا مقدمہ لڑوں گا۔ بس تم ڈٹ جاؤ کہ شادی کرو گے تو سوہا کے ساتھ کیونکہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔"
"لیکن میں اس کے ساتھ محبت نہیں کرتا۔"
حسن کے لمبے چوڑے بیان کے جواب میں وصی کا بڑی بے بسی سے کہا گیا صرف ایک جملہ تھا۔ جس نے اسے چپ کرا دیا۔ وہ خاموشی سے اس کے چہرے کے تاثرات دیکھتا رہا پھر پھٹ پڑا۔
"پھر یہ ڈرامہ لگا رکھا ہے تم نے۔ صرف سب کی توجہ اپنی جانب کھینچنے کے لیے؟ سب کو ایک ذہنی آزار میں مبتلا کرنے کے لیے؟ تم ایک انتہائی کمزور شخصیت کے مالک ہو وصی۔ اتم میں ابھی تک فیصلہ کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ ایسے زندگی نہیں گزرتی... سمجھے تم؟"
وہ سر جھکائے سنتا رہا۔ اسے حسن کا غصہ برا لگ رہا تھا نہ ڈانٹ ڈپٹ۔
"لیکن اگر واقعی تمہیں سوہا سے محبت نہیں تھی تو تمہارے چہرے سے رونق کیوں ختم ہو گئی ہے۔ کیوں زمانے سے منہ چھپا کے اندر چھپے بیٹھے ہو؟"
حسن نے جاتے جاتے دروازے پہ رک کر ایک چبھتا ہوا سوال کیا۔
اس نے فوراً سر اٹھایا... وہ اس سوال کا جواب دینا چاہتا تھا۔ مگر حسن اپنی بات کہہ کر جا چکا تھا۔
"ہاں میں منہ چھپائے بیٹھا ہوں... حالانکہ مجھے احساس ہو گیا ہے کہ مجھے سوہا سے محبت نہیں تھی۔ لیکن یہ احساس کہ میں نہ سہی... وہ بے وقوف تو مجھ سے محبت کرنے لگی تھی... اور یہ کچھ کھونے کا نہیں ندامت کا احساس ہے جو مجھے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے... کہ جب میرے دل میں اس کے لیے اتنی اسٹرانگ فیلنگ نہیں تھی تو کیا ضرورت تھی اس جذباتی لڑکی کے اندر پہلے سے موجود محبت کی طلب کو اور بھڑکانے کی۔ میں نے سوچا تھا ہم دونوں ایک سے ہیں... ساتھ رہتے رہتے ہو جائے گی محبت بھی... اور میں ایک دوست کی حیثیت سے اس کا سب سے اچھا ساتھی ثابت ہوں گا جس کے لیے وہ عمر بھر ترسی ہے۔ لیکن گھر والوں کا رویہ دیکھ کے لگا... میں ایک دوست ہوتے

کے ناتے اس کے ساتھ یہ ظلم نہیں کر سکتا ہے کہ اسے ایک ایسے گھر میں لے آؤں جہاں کوئی اسے پسند نہیں کرتا۔ کوئی اس کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتا۔ نفرتوں کی یہ دھوپ اسے کملا کے رکھ دیتی۔ مجھے اس سے محبت کرنے میں کچھ وقت لگتا۔ اور اس دوران وہ محبت کو ترسی لڑکی اتنی ڈھیر ساری نفرتوں کا مقابلہ کیسے کرتی؟ یا تو میری محبت اتنی توانا، اتنی طاقت ور ہوتی۔ کہ وہ اس میں سرشار رہتی۔ مگر میرے دل میں اس کے بارے میں جو جذبات ہیں، ان کی حقیقت سے واقف ہونے کے بعد میں کیسے اسے یہ سہارا دے سکتا تھا۔ محبت کے سہارے ہر جنگ جیتی جا سکتی ہے، ہر وار الٹا جا سکتا ہے۔ لیکن صرف ہمدردی اور خدا ترسی کی نیت سے کسی کے ساتھ بھلا کرتے کرتے میں اتنے ڈھیر سارے لوگوں سے نہیں لڑ سکتا جن سے میرا قلبی ربط اس چند روزہ زندگی سے کہیں بڑھ کے ہے۔"

وصی نے اداسی سے سوچا۔ اور ایک گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔

"یہ ہار کا احساس محبت میں شکست کھانے والوں کا نہیں ہے حسن بھائی۔ یہ ہار میرے اندر کے کمزور انسان کی ہے۔ ٹھیک کہا آپ نے۔ میں ایک کمزور شخصیت کا مالک ہوں۔ ادھار میں ملی محبتوں پہ زندہ رہنے والے کمزور ہی ہوتے ہیں۔ آپ۔ یا کوئی اور۔ آپ لوگ اپنی ماں سے، باپ سے، بہن بھائیوں سے بڑے حق سے خفا ہو سکتے ہیں، جانتے ہیں کہ گوشت سے ناخن جدا ہو ہی نہیں سکتا۔ لیکن میں ایسا کرتے ہوئے ڈرتا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ احسان فراموشی کا طعنہ نہ مل جائے۔ میں ماں کی محبتیں۔ نانو کی شفقتیں کیسے نظر انداز کر دوں؟ صرف سہا کے لیے، جسے میں صرف اپنے چند اچھے دوستوں میں سے ایک سمجھتا ہوں اور جس کی زندگی میں صرف ایک اچھا خوشگوار موڑ لانا چاہتا تھا۔ میری یہ شکست محبت کی نہیں، ارادے کی شکست ہے۔"

✡ ✡ ✡

"یہ والے بندے پہن لو اس سوٹ کے ساتھ۔"

منزہ نے دشمہ کے کانوں میں سونے کے ہلکے سے بندے پہنائے جن میں سفید نگ دمک رہے تھے۔ وہ لائٹ گلابی شفون کے سوٹ میں ملبوس تھی جس پہ سفید ریشمی دھاگے کی نفیس کڑھائی تھی۔ اور سفید اور گلابی ٹائی اینڈ ڈائی دوپٹہ۔ جس کے چاروں اور روپہلی پٹی لگی تھی۔

"میک اپ بے شک نہ کرنا۔ بس لائٹ سی لپ اسٹک لگا لینا۔"

منزہ نے اس کے گلابی پڑتے چہرے سے نظر ہٹائی، مبادا اس کی اپنی نظر نہ لگ جائے۔ دشمہ کا چہرہ سوٹ کے ہم رنگ ہو کر رہا تھا۔

"اوور تو نہیں ہو جائے گا؟" وہ بے حد نروس نظر آ رہی تھی۔

"نہیں۔ اوور کیسا؟ لپ اسٹک ہی تو لگانی ہے۔ پہلے کبھی نہیں لگائی کیا؟"

"وہ۔ پہلے کی بات اور تھی۔ اب تو۔"

دشمہ بات پوری نہ کر سکی۔ اس کے رخسار تو دہک رہے تھے۔ منزہ کو اس پہ ٹوٹ کے پیار آیا۔ اس نے بے ساختہ اس کی پیشانی چوم کر اسے دل سے دعا دی۔

"اللہ نصیب اچھے کرے۔"

دشمہ کی آنکھیں نم ہو گئیں اور وہ منزہ کے گلے میں بانہیں ڈال کر اس سے لپٹ گئی۔

"ماما۔ آئی لو یو۔"

منزہ کے دل کو کوئی اندر سے کاٹنے لگا۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکتے ہوئے امڈ آنے والے آنسو پرے دھکیلے اور دشمہ کے گرد اپنی گرفت اور والہانہ انداز میں سخت کرتے ہوئے اسے اپنے اندر سمونے کی کوشش کی۔ "میری بچی۔!"

وہ اس کی ریشمی چٹیا پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔ بند آنکھوں کے ساتھ اس کے نرم و نازک وجود کو اپنے اندر سموئے اس کی دھڑکنوں کو اپنے سینے پہ محسوس کرتے ہوئے۔ اس کی گرم سانسوں کو اپنی گردن کے پاس مہکتا محسوس کرتے ہوئے وہ کئی سال پیچھے چلی گئی۔

اب اس کے سینے سے لگا وجود دشمہ کا نہیں سہا کا تھا۔ منزہ نے اور بھی بے اختیار ہوتے ہوئے اسے زیادہ زور سے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمہیں کیا پتا۔ میں تم سے کتنی محبت کرتی ہوں۔ میرا دل چاہتا ہے تمہیں ننھی سی گڑیا بنا کے سارا وقت اپنی گود لیے رہوں۔ تمہاری انگلیوں کی پوریں اپنے لبوں سے لگا لگا کر ان کی نرمی محسوس کروں۔ تمہاری آنکھوں کے چمکتے جگنوؤں کے واری صدقے ہوتی رہوں۔ تمہاری آواز کا رس چوبیس گھنٹے اپنی سماعتوں میں اتارتی رہوں۔ تمہیں۔"

"ماما۔!" دشمہ کی گھٹی گھٹی سی آواز نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا۔

اس کی وحشت نے دشمہ کو ہراساں کر کے رکھ دیا تھا۔ منزہ نے چونک کر اپنی گرفت ڈھیلی کی اور ایک جھٹکے سے اسے خود سے الگ کر کے بغور اس کا چہرہ دیکھا۔ جس پہ حیرت تو نظر آ رہی تھی مگر کوئی سوال نہیں تھا۔ وہ اب تک نہ سمجھ پائی تھی۔ اتنے سالوں میں یہ اندازہ نہ کر پائی تھی کہ منزہ اس کی ذات سے محبت نہیں کرتی۔ اس کے وجود کو چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ اپنے تصورات میں اس کے پیکر میں اپنی حقیقی بیٹی کی روح اتار کے اسے بیٹی بنانے کی کوشش کرتی ہے۔

"بس۔ تمہارے دور جانے کے خیال سے ذرا سا۔"

وہ پھیکے پن سے مسکرا کے وضاحت دینے لگی۔ مگر یہ کوشش اس کی پلکیں بھگو گئی۔ کیونکہ دشمہ عقیدت بھرے انداز میں اسے والہانہ تکے جا رہی تھی۔

اس کی یہ عقیدت۔ اس کی یہ محبت منزہ کو پل پل کچلتی تھی۔ اندر ہی اندر مارے جاتی تھی۔

"مت اتنی محبت کرو مجھ سے۔ کیسے رہو گی میرے بغیر۔" آنسوؤں سے بوجھل آواز کے ساتھ کہتے اس نے دشمہ کے گال تھپکے۔ وہ ایک بار پھر اس کے گلے لگ گئی۔

"ماما۔! I really love you! آپ جیسی ماں شاید ہی کسی کی ہو۔ سب مائیں اپنی اولاد سے محبت کرتی ہیں۔ مگر کیا کوئی اور ماں اپنی بیٹی کے دل کے اتنے اندر تک اتر سکتی ہے؟ ہر اس کی خواہش کا مان رکھنے کے لیے اتنا آگے تک سوچ سکتی ہے۔ ماما! مجھے صرف فخر ہی محسوس نہیں ہوتا۔ بلکہ کبھی کبھی تو میں یہ سوچ کر مغرور ہو جاتی ہوں کہ میں آپ کی بیٹی ہوں۔ آپ جیسی ماں ملی ہے مجھے۔"

منزہ نے اپنی نظریں چرا لیں اور خود کو سنبھالتے ہوئے کہنے لگی۔

"اچھا اب باتیں مت بناؤ۔ بہت دیر ہو گئی کم بخت پارلر ہے۔ جلدی سے تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آنے ہی والے ہیں اور تم نے ایک چکر کچن کا لگا لینا۔ سب کچھ تیار ہے۔ بس ذرا پلاؤ دم پہ ہے۔ وہ دیکھ لینا اور سلاد بھی چیک کر لینا۔ ٹھیک بنے ہیں؟ اگر فضل آئس کریم لے آیا ہے تو فریزر میں رکھ دینا اور نسرین سے وہ ڈنر سیٹ صاف کروا کے ڈائننگ ٹیبل پہ لگوا دینا جو میں نے اسٹور سے نکلوا کے کچن میں رکھوا دیا ہے۔ اب ذرا میں بھی تیار ہو جاؤں۔"

پروین، شوکت جہاں اور رخشندہ کے ساتھ آئی تھیں۔ سراج دین اور معراج دین دونوں بھائی فیکٹری سے سیدھا یہاں پہنچنے والے تھے جبکہ حسن کو پروین نے لاکھ کہا تھا ساتھ چلنے کا۔ لیکن حسن نے سختی سے صاف منع کر دیا تھا۔ پروین نے ندا کو بھی بڑی بہن ہونے کی حیثیت سے ساتھ لے جانا چاہا تھا مگر شوکت جہاں نے کچھ سوچ کر سہولت سے منع کر دیا۔ کہ کچھ دن تک وہ یہاں بیٹھنے والی ہے اور اگر اسی وجہ سے اسے کالج سے چھٹیاں لینے پہ مجبور کیا گیا ہے تو کسی اور جگہ جانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ندا نے یہ سن کر اطمینان کا سانس لیا۔

سوہا سے ملنے کے بعد سب سے زیادہ زور و شور سے اس کے اور وصی کے رشتے کی مخالفت ندا نے ہی کی تھی مگر وصی سے بے پناہ لگاؤ ہونے کے باعث اندر سے اس کا دل بھی بجھا ہوا تھا۔ اسے مناسب نہ لگا کہ جس رشتے وصی کا دل نہیں مان رہا اور وہ بحالتِ مجبوری صرف اپنے بڑوں کی خاطر اس پہ سر جھکا رہا ہے اس رشتے میں وہ اتنا جوش و خروش دکھائے۔

"ارے۔ بچوں کو ساتھ نہیں لائیں آپ؟ اور نہ بھائی صاحب نظر آرہے ہیں؟"
منزہ کو ان تین خواتین کو دیکھ کے دھچکا سا لگا گرچہ ٹیبل پہ رکھا نزلا لا کی مٹھائی کا بڑا سا رنگین ٹوکرا خاصی تسلیاں دے رہا تھا۔
"وہ دونوں بھائی فیکٹری سے سیدھا یہیں آنے والے ہیں تھوڑی دیر میں۔" شوکت جہاں نے جواب دیا۔
"ہم گر فیکٹری سے گھر جاتے۔ ادھر پھر یہاں آتے مل کر۔ تو بہت وقت لگ جاتا۔"
"اور بچیاں؟" اب منزہ رخشندہ سے مخاطب تھی۔ پروین کا روکھا پھیکا رویہ اس نے محسوس کر لیا تھا۔ لیکن اس رویے کو وہ دل سے لگانے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اسے ذرہ برابر لفٹ نہ کرانے کا سوچتے ہوئے ہی اس نے سراسر پروین کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ سوال رخشندہ سے کیا تھا۔
"روا ابھی ابھی کالج سے تھکی ہوئی آئی ہے۔ ہما کا تو سب کو پتہ ہے زیادہ تر گھر کے کاموں میں الجھی رہتی ہے ویسے بھی اسے کہیں آنے جانے کا خاص شوق بھی نہیں اور ندا۔"
وہ ایک دم چپ ہو گئیں۔ پروین نے گھبرا کے جٹھانی کو دیکھا کہ کہیں روانی میں وہ یہ نہ اگل دیں کہ ندا وصی کا دل رکھنے کی خاطر ساتھ نہیں آئی۔
"وہ تو پرسوں مایوں بیٹھ رہی ہے۔ ایسے میں مناسب نہیں لگا اسے ساتھ لانا۔"
"ہاں یہ تو ہے۔ اب یہ روایتیں ہمارے اور آپ کے جیسے خاندانوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہیں۔"
پروین نے نزلائی اندر لائی وشمہ کو دیکھا تو بے اختیار زیرِ لب ماشاءاللہ کہہ کے رہ گئی۔ دل میں دبی دبی سی خفگی اپنی جگہ۔ لیکن اس وقت تو اس کے گلابی چہرے سے نظر نہیں ہٹائی جا رہی تھی۔
وشمہ سب کو جوس سرو کرنے کے بعد منزہ کے برابر جڑ کے بیٹھ گئی۔ پروین کے لبوں پہ اسے دیکھ کے آجانے والی مدھم مسکراہٹ ایک دم توڑ گئی۔
"اچھا بھئی پروین۔ بسم اللہ کرو۔ تمہیں وصی کے بارے حق سونپے ہیں اس لیے دست سوال بھی تم دراز کرو۔"
شوکت جہاں نے پروین کو عندیہ دیا تو منزہ کے ہونٹوں پہ ایک جی جلانے والی فخریہ مسکراہٹ آگئی۔
"سب معاملات تو طے ہی ہیں۔ میں نے تو ایک رسمی سی کارروائی ادا کرنا ہے۔"
پروین نے بھی بدلہ چکانے کی نیت سے یہ بات کی جس کے سیاق و سباق سے صرف منزہ واقف تھی اس لیے دوسری دونوں عورتوں پہ اس کا خاص اثر نہ ہوا۔
جس پہ ہونا تھا۔ ہو چکا۔
اب صرف ردِ عمل آنا باقی تھا۔
"یہ تو صحیح کہا۔ غنیمت ہے کہ رسمی کارروائی بھی ہو رہی ہے۔" اس کے جھنجھنے لہجے میں جو دھمکی تھی۔ اس سے پروین کو تو جو تاؤ آیا۔ سو آیا۔ شوکت جہاں بھی چونک گئیں۔
منزہ نے اس بات کو مسکراہٹ اور لہجے کی شیرینی میں لپیٹ کر اس کا اثر زائل کرنے کی کوشش کی۔
"میرا مطلب ہے۔ اتنے قریبی رشتے داروں میں یہ ضابطے کی کارروائیاں بس نہ ہونے کے برابر ہونی چاہئیں۔ میری بچی پروین کی بھی تو بچی ہے۔"
شوکت جہاں طمانیت سے مسکرا دیں۔ صرف پروین تھیں جو اس کی ذومعنی باتوں کے مطلب سمجھ

رہی تھیں۔
"ویسے بھی مثل مشہور ہے پھوپھی بھتیجی کی ایک ذات۔ مائیں بے شک پیار کریں۔ لیکن پھوپھیوں کا پرتو ہوتی ہیں بھتیجیاں۔"
کھلم کھلا پروین پہ حملہ تھا۔ وہ ڈھکے چھپے الفاظ میں پروین کو نشانہ بنا رہی تھی۔ یہ باور کرا رہی تھی کہ وشمہ کی تربیت کرنے میں اس سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی۔ بلکہ اگر وہ کوئی نادانیاں کر رہی ہے تو یہ اس کے اس خون کا اثر ہے جو پروین کی رگوں میں بھی دوڑ رہا ہے۔
وہ منزہ سے کچھ اور بھی کبیدہ نظر آنے لگیں۔ وشمہ کے لیے بھی وہ التفات دکھانا خاصا مشکل امر لگ رہا تھا جس کی وہ عادی تھی۔ یہ بات رخشندہ اور شوکت جہاں نے شاید اتنی محسوس نہ کی البتہ وشمہ کو بری طرح کھلی۔ ایسے بھی منزہ نے رو رو کے کہہ رکھا تھا کہ پروین آخری وقت تک وشمہ کے لیے دل سے راضی نہیں تھیں۔ اور اب انجانے میں وہ اپنے رویے سے یہ ثابت بھی کر رہی تھیں۔
پہلے وشمہ نے اس بات پہ دل برا کیا۔ بعد میں نوید مراد نے بھی بہن کا لیا دیا انداز دیکھ کے کچھ ناگواری محسوس کی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بحالتِ مجبوری یہاں آئی ہوں۔
مراج دین اور معراج دین بھی آگئے۔ رسمی باتوں کے دوران باضابطہ طور پر وشمہ کا ہاتھ وصی کے لیے مانگ لیا گیا۔ اور شگن کے طور پہ وشمہ کے ہاتھ پہ شوکت جہاں نے پچاس ہزار کی رقم اور سرخ جوڑا بھی رکھ دیا۔ لیکن پروین کی سرد مہری نے نوید مراد کے دل پہ بوجھ سا لا دیا تھا۔ وہ اس اہم فرض کی سبکدوشی کے احساس سے ہلکا پھلکا نہ ہو سکے۔
پروین کے اپنے جذبات و احساسات تھے۔ وشمہ سے فطری محبت اپنی جگہ۔ لیکن جس طرح اس کی کمزوری کو بھانپ کے منزہ نے ان پہ دباؤ ڈالا تھا اس وجہ سے ان کے دل میں وشمہ کے لیے گلہ سا پیدا ہو گیا تھا۔ جی چاہتا اپنا پھوپھی ہونے کا استحقاق استعمال کرتے ہوئے اسے سخت الفاظ میں ڈانٹیں۔ اسے بتائیں کہ کچی عمر کا تقاضا ہے خواب دیکھنا۔ مگر ان خوابوں کا راز دار کسی ایسی ہستی کو نہیں بنانا چاہیے جو ان کے اشتہار زمانے بھر میں لگاتا پھرے۔
وہ اسے ایک ماں بن کے بتانا چاہتی تھیں۔ کہ ممتا وہ نہیں جو بچے کے ایک اشارے پہ اسے ہر چیز لا دینے کا عہد کر لے۔ ممتا میری کا احساس دلاتی ہے۔ ممتا تن سے سر اٹھا کے جینا سکھاتی ہے۔ لیکن وہ جانتی تھیں کہ وہ اس وقت پوری طرح منزہ کے زیرِ اثر ہے اور وصی کے معاملے میں منزہ نے ناجائز طور سے اس کا ساتھ دے کر اسے گویا زر خرید کر لیا ہے۔ اس وقت وہ جس جذباتی کیفیت سے گزر رہی ہے اس میں پروین کی نصیحتیں اسے بدگمان کر سکتی ہیں۔ اس لیے انہوں نے مصلحتاً لب سیے رکھے۔ مگر چونکہ کوئی بہت کامیاب اداکارہ نہیں تھیں اس لیے ان کے جذبات پوری طرح چھپانے میں ناکام رہیں۔

☼ ☼ ☼

نوید مراد کے دل میں چھپے ہلکے ہلکے گلے کو بعد میں منزہ نے خوب ہوا دی۔
"آپ نے نوٹ کیا پروین کا اکھڑا اکھڑا رویہ؟"
نوید سر جھکا کے رہ گئے۔
"ٹھیک ہے نہیں کیا۔ اماں جان نے اتنی محبت اور اپنائیت جتائی ہے۔ ایسے میں پروین کا رویہ کیا معنی رکھتا ہے۔ ہاں پھر بھی ملال تو ہوتا ہے۔ کہ سگی پھوپھی ہوتے ہوئے بھی ان کے دل میں وشمہ کے لیے ذرا بھی محبت نہیں۔"
"اب تو مجھے لگ رہا ہے شاید میں نے وشمہ کے معاملے میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔"
بیٹی کا معاملہ تھا۔ اس لیے نوید مراد زندگی میں پہلی بار پروین سے مکمل طور پہ بے زار ہو کر سوچ رہا تھا ورنہ اس سے

پہلے ہر بار رشتوں کا بھرم رکھتے ہوئے اس نے بہن کو خاص رعایت دی تھی۔

"پروین کے میکے سے بچے رہنے کی وجہ چاہے کچھ بھی ہو۔ لیکن مجھے ڈر لگ رہا ہے اب اپنی بیٹی کو وہاں بھیجتے ہوئے۔ مجھے وشمہ اتنی بھاری تو نہیں ہے کہ میں کسی کے گلے میں اسے ان چاہے طوق کی مانند ڈال دوں۔"

"کیسا ان چاہا طوق؟ وصی بہت سمجھ دار لڑکا ہے۔ وہ ہماری وشمہ کو پلکوں پہ بٹھائے گا اور اتنی چاہت سے طلب کرنے والی نانی بھی بے قدری نہیں کریں گی۔ آپ یہ کیوں بھول رہے ہیں کہ پروین وصی کی ماں نہیں ہیں۔ آپ صرف اپنی بیٹی کی خوشی کو مدِنظر رکھیں۔ اور بس۔"

حسن کی شادی ہما سے ندا کے ولیمہ کے روز ہونا قرار پائی تھی۔ اور اس کے تین ماہ بعد ہی وصی کی اور وشمہ کی شادی طے کر دی گئی تھی تاکہ تب تک وشمہ اپنے امتحانات سے فارغ ہو جائے۔ شادی کی بھرپور تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔

منزہ بے حد جوش و خروش سے کھل کے اس کے لیے شاپنگ کر رہی تھی۔ نوید نے کسی قسم کی کسر نہ رہنے دی تھی۔ خرچ میں اعلا سے اعلا فرنیچر۔ نفیس اور بیش قیمت زیورات، عمدہ ملبوسات، الیکٹرانکس کا جدید سامان۔ وقت کم تھا اور منزہ اپنے گزشتہ کئی سالوں کی محنت اس ایک شادی کے ذریعے ثابت کرنا چاہتی تھی کہ سوتیلی مائیں ضروری نہیں سب کی سب ایک سی ہوں۔ دن بھر بازاروں کی خاک چھاننے، جیولرز کے پاس چکر لگانے، بوتیکوں پہ دماغ کھپانے کے بعد جب وہ رات کو نڈھال ہو کر تکیے پہ سر رکھتی تو دماغ گھومنے لگتا اور اس چکر پھیریاں لیتے دماغ کے سامنے ایک ہی چہرہ گردش کرنے لگتا۔

سوہا کا۔۔۔

"پتا نہیں کبھی میں اس کا جہیز بھی اکٹھا کر پاؤں گی یا نہیں۔ کبھی اسے رخصت کرنے کی حسرت بھی پوری ہو گی یا نہیں؟ کبھی اس کا گھر بھی بستے دیکھوں گی یا نہیں؟"

اور جب ان سوالوں کے جواب میں صرف ایک سناٹا گونج کے رہ جاتا، تب اس کا دل چاہتا وحشت کے عالم میں وشمہ کے ارمانوں سے خریدے جہیز کا ایک ایک چیز تہس نہس کر کے رکھ دے۔

☆ ☆ ☆

"میں اس کی دشمن نہیں ہوں۔ میرا بھی دل دکھتا ہے ایسی بچی سے کوئی سخت بات کہتے ہوئے جو اس گھر میں صرف دو دن کی مہمان ہو لیکن میں کیا کروں تقدیس! مجھے وحشت ہوتی ہے اسے اس حال میں دیکھ کے۔ پہلے میں نے سوچا گیا نیا حادثہ ہے۔ بھلانے میں وقت لگے گا۔ مگر کتنا وقت؟ وہ تم دونوں سے بڑی ہے۔ اپنی تعلیم مکمل کر چکی ہے۔ کیا میں اسے پانچ چھ سال رونے کی پوزیشن میں ہو وہ پانچ چھ سال؟ صرف ایک دھوکے باز شخص کی تکلیف دہ یادیں بھلانے کے لیے؟ یہ بہت زیادہ عرصہ ہوتا ہے تقدیس! ہو سکتا ہے بھی کسی کی دوری سے نکل کر وہ سرے دور میں جانے سے اس دور سے وابستہ اچھی بری یادیں خود بخود دماغ سے نکل جاتی ہیں۔ اس کی حالت میں بہتری لانے کا واحد اور فوری حل اس کی شادی ہے مگر وہ یہ بات تسلیم کرنے پہ تیار ہی نہیں۔ خود کو اس سوگ کی کیفیت سے نکالنا ہی نہیں چاہتی۔"

مدیحہ نے اکیلے میں تقدیس کے سامنے اپنا دل کھول کے رکھ دیا۔ وہ سارے وسوسے، وہ سارے اندیشے جو انہیں ڈس رہے تھے، سب بتا دیے۔

تقدیس کسی ایک بات کو بھی جھٹلا نہ سکی۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں ماما! لیکن آپا سے میرا مطلب ہے آپ کا رویہ ذرا بلکہ خاصا سخت ہو جاتا ہے۔ جس سے انہیں اپنے آپ سے اور بے زاری ہونے لگتی ہے۔ پہلے تو آپ یہ گمان دل سے نکال دیں کہ وہ اپنی ناکام محبت کا سوگ منا رہی ہیں۔ وہ تو الٹا اس بات پہ شرمندہ ہیں کہ یہ آصف ان کے دل سے جا نہیں رہا کہ اچھی بھلی سمجھ بوجھ رکھتے ہوئے وہ اس کے جنگل میں کیسے پھنسیں۔ وہ خود کو مجرم محسوس کرتی ہیں۔ آپ کو دکھ پہنچانے کا قصوروار

سمجھتی ہیں اور ایسے میں آپ کی باتیں۔۔۔ انہیں ندامت کے دریا میں اور بھی غرق کر دیتی ہیں۔"

"تو اب بتاؤ اس مسئلے کا کیا حل ہو؟" مدیحہ نے بے چارگی سے کہا۔

"دو دن بعد اس کی شادی ہے۔ ایسے تو مجھے چین نہیں آئے گا۔ تم نہیں جانتیں مرد کی خصلت۔۔۔ تحریم کی حالت پکار پکار کے کہتی ہے کہ اس کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے اور نادانی میں، کم عمری میں بہت سے لوگ اس جذباتی غلطی سے گزرتے ہیں لیکن مرد جب شوہر بن جاتا ہے تو وہ ہر غلطی کو صرف گناہ قرار دیتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ ان شروع کے دنوں میں جب میاں بیوی کے درمیان انڈر اسٹینڈنگ اور محبت کو پروان چڑھنا چاہیے، شک کا ناگ اس کے دل میں اندیشے پروان چڑھا دے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہو گا ماما۔ ان شاء اللہ۔"

"اللہ کرے مگر تحریم کو اب خود کو سنبھالنا ہو گا۔ جب خود ہی ہوش میں نہیں تو وہ کیا خاک شوہر کو قابو کرے گی۔" "قابو؟" تقدیس نے تحیر سے دہرایا۔

"ہاں تو اور کیا؟ یہ رشتہ صرف پیار، محبت اور انڈر اسٹینڈنگ کے بل بوتے پر نہیں چلتا۔ یہ عناصر بھی ضروری ہیں مگر سب سے اہم چیز ہے قابو پانا اور جس کے ہاتھ میں دوسرے کی کمزوری آ جائے وہ دوسرے پہ قابو پا لیتا ہے۔ مجھے ڈر ہے کہ تحریم کی کمزوری اس کے شوہر کے ہاتھ میں نہ آ جائے۔"

تقدیس گہرا سانس لے کر رہ گئی۔ وہ اب تھک کے ہار ماننے کے قریب تھی۔ کتنے دنوں سے کوشش کر رہی تھی کہ دونوں میں سے کوئی ایک ہی بات کی نزاکت کو سمجھ لے لیکن نہ تحریم اپنی روش سے ہٹنے پہ تیار تھی نہ مدیحہ اپنے موقف سے۔ جھکنے پہ آمادہ نظر آتی تھیں۔

"ماما۔۔۔ یہ کارڈ دیکھا آپ نے؟"

تطہیر ہاتھ میں ایک انوی ٹیشن کارڈ لیے آئی۔ "کس کا ہے؟"

"پاپا کے کسی دوست کے ہاں سے آیا ہے۔ ان کے بیٹے کی شادی کا۔ آپی کی مہندی کے روز ہے یہ شادی۔" "مشکل ہو گا جانا۔ مگر خیر کسی طرح آدھے گھنٹے کے لیے ہو آئیں گے۔"

"لیکن ماما۔۔۔ اپنے گھر میں فنکشن ہو تو ہم کیسے جا سکتے ہیں؟ اور کون سا کسی قریبی عزیز کی شادی ہے جو جانا ضروری ہے۔"

"قریبی نہ سہی۔ مگر تمہارے پاپا کے دوست ہیں اور انہوں نے خاصی تاکید کی تھی وہاں جانے کے لیے۔"

"او ہو۔۔۔ آپ نے کب سے پاپا کی تاکیدوں پہ اتنا عمل کرنا شروع کر دیا۔"

تطہیر نے مسکراتے ہوئے چھیڑا۔ مگر مدیحہ پہ اس شرارت کا خاص اثر نہ ہوا۔ وہ سنجیدگی سے کہہ رہی تھیں۔

"میں کسی کی تاکید پہ عمل نہیں کر رہی۔ میں بیٹیوں کی ماں ہونے کا فرض نبھا رہی ہوں۔ اب مجھ سے وہ غلطی نہیں ہو گی جو تحریم کے معاملے میں ہوئی۔ پرانے لوگ ٹھیک کہا کرتے تھے کہ جوان لڑکی گھر پہ رکھا اناج ہوتا ہے۔ زیادہ عرصہ رکھو تو گھن لگنے لگتا ہے۔"

"پلیز ماما!" تطہیر نے برا سا منہ بنا کے احتجاج کیا۔

"تب میں تم دونوں کا بندوبست جلد از جلد کرنا چاہتی ہوں۔ اللہ کے فضل سے کسی چیز کی کمی نہیں ہے۔ میں ان ماؤں میں سے نہیں ہوں جو شادی کے وقت تک ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھی رہتی ہیں۔ عرصے سے تیاریاں کر رکھی ہیں۔ اچھے رشتے ہوں تو ایک ہی رات میں رخصت کرنے کی پوزیشن میں ہیں ہم۔ پیا اور رکھنا۔ بعد میں مت کہنا کہ ذکر نہیں کیا۔ مجھے کسی قسم کی کوئی ڈھیل نہیں دینا چاہیے۔ اس فنکشن میں بھی اس لیے جانا چاہ رہی ہوں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔ خاندانی اور کھاتے پیتے۔ ایسے ہی نظر میں تو کئی تم دونوں۔"

تطہیر اور تقدیس ایک دوسرے کو دیکھ کے رہ گئیں۔

❀ ❀ ❀ ❀

آنگن میں اپنی چہکار کی گونج چھوڑ گئیں بس۔ اور کیسی میری راتوں کی نیند اڑی رہتی تھی ان کی وجہ سے۔ کہتی تھی کہ سب اپنے گھر کی ہوں گی تو چین کی نیند سوؤں گی۔ اب میں ہوں اور اکیلی راتیں۔ ساری ساری رات کروٹ بدلنے میں گزر جاتی ہے۔ پلک سے پلک نہیں جڑتی۔ بیٹی دم ساز ہوتی ہے ہم راز ہوتی ہے غم گسار ہوتی ہے اور بڑی خوش نصیب ہو رخشندہ! بیٹی کی رحمت کے ساتھ ساتھ تمہارے پاس بیٹے کی نعمت بھی موجود ہے۔ تین بیٹیاں بیاہی ہیں تو ایک بیٹی آئے گی۔"

"صحیح کہا بھابھی آپ نے۔"

"پھر کب کر رہی ہو خرم کی شادی؟"

"ان شاء اللہ جلدی۔ اس سال کے آخر تک اس کا پاکستان آنے کا ارادہ ہے۔"

"تو ڈھونڈ رکھو کوئی لڑکی۔"

"ہاں ایک پہ نظر ٹھہری تو ہے۔ بس ذرا شادی سے فارغ ہو جاؤں تو کرتی ہوں کچھ۔"

☼ ☼ ☼

غلِ ہما رخصت ہو کر اوپر سے نیچے آ گئی۔

دیکھنے کو بس یہ اتنی سی تبدیلی آئی تھی ان کی زندگی میں۔ مگر یہ تو صرف وہ اور حسن جانتے تھے کہ تبدیلی کہاں کہاں آ چکی ہے۔

دل۔ ذہن۔ سوچ۔ حالات۔ جذبات سب بدلے ہیں۔ جو نہیں بدلے انہیں بدلنا پڑا تھا ہے من مار کے۔

حسن نے سوچا تھا اپنے اندر کی ساری کھولن اس ذات پہ الٹ دے گا جس نے اس کے اور روشمہ کے درمیان آنے کی جرأت کی۔ نہ وہ ہوتی نہ اس کی محبت میں پروین حسن کو پیش کرتی۔ اس نے نجانے کیسے نوکیلے فقرے چن رکھے تھے اس کے پندار کو زخمی کرنے کے لیے۔

"تم میرے کمرے میں آ چکی ہو میری زندگی میں شامل نہیں ہوئیں۔"

"تمہارے نام کے آگے میرا نام لگا ہے مگر میں تم سے اتنا ہی الگ رہوں گا جتنا پہلے تھا۔"

"تم کبھی میرے لیے اہم تھیں نہ ہو اور نہ کبھی ہو سکو گی۔"

لیکن کمرے کا دروازہ بند ہوتے ہی اس کی زبان گنگ ہو گئی۔

ریشمی جھلملاتے عروسی لباس میں گٹھڑی بنا وہ وجود ایک جیتا جاگتا وجود تھا۔

ایک ایسا وجود جو اس کا من چاہا بے شک نہیں تھا مگر انجان اور بیگانہ بھی نہیں تھا۔ وہ اسے اس کے بچپن سے جانتا تھا۔ اور اس کی معصومیت پاکیزگی اور صاف دلی کا قائل بھی تھا۔ ایسی لڑکی جو شروع سے ایک بے ضرر سا مزاج رکھتی ہو اسے ایسے دل جلے الفاظ کہنے کی حسن کی ہمت نہ ہوئی۔

وہ یہ سادہ معصوم دل توڑنے کی ہمت نہ کر سکا۔

اگرچہ وہ خود کو اس سے محبت کرنے پہ مجبور نہیں کر سکتا تھا لیکن خود کو اس سے نفرت کرنے پہ مجبور کرنا بھی از حد مشکل تھا۔ اس نے سست قدموں سے اس کی جانب آتے آتے ایک ٹھنڈی سانس بھری۔

"یعنی مجھے اب ایک ایسا رشتہ جینا ہو گا جس میں نہ محبت سانس لیتی ہے نہ نفرت رگوں میں دوڑتی ہے۔ مصلحت کا آکسیجن ماسک لگا کر زبردستی کا تنفس بحال رکھنا ہے۔"

اس نے بے دلی سے ہما کا گھونگھٹ اٹھایا۔

مگر وہاں الوہی حسن کی دمک اس کی بے دلی کا سدباب کرنے کو بے چین تھی۔

☼ ☼ ☼

اور اکیلے کمرے میں بیڈ پہ سر جھکا کے گھونگھٹ گرائے بیٹھی ہما نے سوچا تھا۔

"ماما! پتا نہیں کیا بات ہے۔ دو دن سے وصی کا نمبر آف مل رہا ہے۔"

سوہا نے بے حد پریشانی کے عالم میں ریتا سے کہا تو اس کا دل سوہا کی اڑی اڑی رنگت دیکھ کے کٹ سا گیا۔

"ہو جاتا ہے۔ یہاں سے پاکستان کال مشکل سے ہی ملتی ہے۔"

"پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا۔"

"او ہو۔ تم کیا فکریں لے کر بیٹھ گئی ہو۔ ہم یہاں انجوائے کرنے آئے ہیں ڈیئر۔"

ریتا نے بمشکل اس کا دھیان بٹایا مگر اندر سے وہ بھی قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ وصی سے رابطہ نہ ہونے کا مطلب تھا اس کے وہ بدترین اندیشے سچ ثابت ہونے جا رہے تھے۔ واپسی پہ اس کی بیٹی کو وہ جھٹکا ملنے والا ہے جو آج سے کئی سال پہلے اس کے مقدر نے اسے دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کتنی پیاری لگ رہی ہیں آپی!"

تطہیر نے اس کا میرون بھاری کام والا گھونگھٹ اٹھا کے گویا مسحور ہوتے ہوئے کہا۔

ہمیشہ سادہ رہنے والی تحریم واقعی اس عروسی بناؤ سنگھار کے ساتھ غضب ڈھا رہی تھی۔ اور اس کے چہرے پہ چھائی سوگواری اس حسن کو عجیب سی پراسراریت بخش رہی تھی۔

"اب میری ساری باتیں یاد رکھنا۔"

چند منٹ بعد مدیحہ گھبرائے ہوئے انداز میں اندر قدم رکھتیں اور تحریم کو فت بھرے لہجے میں تاکید کرتی ہوئی بہت نروس نظر آ رہی تھیں۔ تقدیس کو ماں کی اس حالت پہ ترس سا آنے لگا۔

"ہیلو۔" اب وہ جاتے جاتے رک کر فون سن رہی تھیں۔

"جی مسز نیاز۔ بالکل پہچانا۔ اتنی جلدی کیسے بھول سکتے ہیں ابھی کل تو ملے تھے آپ کے بیٹے کی شادی میں اور آپ آ رہی ہیں ناں ہماری بیٹی کو رخصت کرنے۔"

دوسری جانب جعفر کے اس دوست کی بیوی نے نجانے کیا کہا کہ مدیحہ کے چہرے پہ حیرت کے رنگ پھیل گئے۔

"جی۔۔۔؟"

☼ ☼ ☼

ندا گولڈن شرارے میں اور اس کے برابر غلِ ہما سرخ اور رائل بلیو کنٹراسٹ والے لہنگے میں دلہن بنی بیٹھی تھی۔ ہما اور حسن کا نکاح ابھی ابھی پڑھایا گیا تھا۔

"مبارک ہو رخشندہ! دو دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو رہی ہو۔"

رشتے کی ایک بھابھی نے انہیں گلے لگا کر مبارک باد دی۔

"بس اللہ کا کرم ہے۔ اس کے ہاں کیا مشکل ہے۔ جو کام مجھے پہاڑ سا بھاری لگا کرتا تھا۔ میرے مولا نے کیسے سبک انداز میں نمٹا دیا۔"

وہ آبدیدہ ہو گئیں اللہ کے حضور شکرانہ پیش کرنے کو الفاظ نہ ملے۔

"تمہارا گھر تو خالی خالی سا ہو جائے گا۔ رونق تو بیٹیوں کے دم سے ہوتی ہے۔"

"ہاں۔ یہ تو ہے۔ بیٹی پیدا ہوتے ہی ہم اس وقت کے بارے میں سوچنے لگتے ہیں۔ تدبیریں کرنے لگتے ہیں جب اس کو باعزت رخصت کر سکیں۔ اور جب رخصت کرنے کا وقت آتا ہے تو دل اور آنگن دونوں کے خالی ہو جانے کا احساس مارنے لگتا ہے۔"

"مجھ سے پوچھو۔ اس درد کو مجھ سے بہتر کون جان سکتا ہے۔ اوپر تلے کی پانچ بیٹیوں نے ہوش اڑا رکھے تھے مگر ماشاء اللہ ساری شکل صورت کی پیاری۔ سیرت اور عادتوں میں بے مثال۔ پڑھنے لکھنے میں ہوشیار۔ گھرداری میں طاق۔ ایک کے بعد ایک کا رشتہ آتا گیا اور ساری کی ساری چڑیوں کی طرح اڑ گئیں۔ چڑیاں ہی تو تھیں سب۔

"میں وصی کو بھلا دوں گی۔ آنکھیں ہوتے ہوئے اندھی اور سماعتیں رکھتے ہوئے بہری بن جاؤں گی سو وہ سامنے آئے گا بھی تو ان دیکھا کر دوں گی۔ کچھ کہے گا تو ان سنا کر دوں گی۔ مجھے اب اس رشتے کو نبھانا ہے' سچے دل سے نبھانا ہے۔ جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حاضر ناظر جان کے قائم ہوا ہے۔ میں حسن سے محبت نہیں کرتی' لیکن کیا ہوا۔ نفرت بھی تو نہیں کرتی اور جس سے نفرت نہ ہو' اس سے محبت کرنے کے امکان پیدا ہو ہی جایا کرتے ہیں۔ محبت صرف ہوتی نہیں ہے۔ کبھی کبھی کی بھی جاتی ہے۔ اور اسے منافقت نہیں کہتے' ماں کیا پاک رشتے کی حرمت کہتے ہیں۔ جس اللہ نے میرا حسن سے رشتہ بنایا ہے' وہ میرے دل میں حسن کے لیے محبت بھی پیدا کرے گا۔"

☼ ☼ ☼

"امی! میری خالہ ساس بتا رہی تھیں" آپ شادی والے دن ان سے کسی لڑکی کے بارے میں معلومات لے رہی تھیں؟"

ندا شادی کے بعد پہلی دعوت میں میکے آئی تو رخشندہ سے پوچھا۔ مگر رخشندہ کے جواب دینے سے پہلے ردا بول اٹھی۔

"امی کو اتنا ہوش کہاں؟ انہیں تو صرف ہم تینوں ہی نظر آتے ہیں۔ ایک مہینے کے اندر اندر دو بیاہ دیں۔ تیسری کی منگنی کر دی۔ یہ بھول گئی تھیں کہ ایک بیٹے کی ماں بھی ہیں۔"

"اللہ خیر کرے۔ بھولنے کیوں لگی۔" وہ برا مان گئیں۔

"ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ ان کے بھی کچھ حقوق ہیں بھئی۔ کیوں آپی!" ردا نے شریر سا اشارہ کیا' ندا ہنس دی۔

"میں نے ہی امی کو دکھائی تھی وہ لڑکی۔ بڑی سلجھی ہوئی گریس فل۔ سمجھ دار اور کیوٹ سی بھی۔"

"کون تھی؟" ندا تفصیلات جاننے کے لیے بے چین ہوئی۔

"تمہارے سسرالی عزیزوں میں سے تھی؟"

"نہیں قریبی عزیز کہاں؟ کوئی ملنے جلنے والے تھے۔ تم دیکھنا مووی میں۔ بلیک ڈریس میں تھی۔ ریڈ امبرائیڈری والا۔ کھلے لمبے بال۔ لائٹ سا میک اپ۔ لمبا قد' گورا رنگ۔ کھڑے تیکھے نقش۔"

ردا نے پورا حلیہ بتا دیا۔

"اور بھلا سا نام تھا۔ کیا ہاں؟" رخشندہ نے ذہن پہ زور دیا۔

"ہاں یاد آیا' تقدیس۔"

☼ ☼ ☼

آج منزہ نے حسن اور رہا کی دعوت رکھی تھی۔ آخر اب دوہری رشتے داری تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے کچھ سوچ کر ندا اور اس کے شوہر کو بھی دعوت نامہ بھیج دیا۔

وشمہ کو جتنا پرجوش ہونا چاہیے تھا' اتنی وہ نہیں تھی۔ پروین کے رویے نے اسے سہما کر رکھ دیا تھا۔ شادی کے موقع پہ وہ باقاعدہ اس پہ کڑا پہرہ رکھے ہوئے تھیں۔ اس نے جتنے شوق سے ساری تیاریاں کی تھیں۔ ان کی نذر بے مزہ سی ہو گئی' جہاں جہاں وصی کی موجودگی کے امکان ہوتے' پروین نا محسوس طریقے سے وشمہ کی ڈیوٹی ادھر چوکس ہو جاتیں۔ اول تو دونوں کا سامنا ہونے کا موقع ہی نہ آنے دیا۔ کبھی دور سے بھی اس پہ نظر پڑ جاتی تو پروین کے گھورنے پہ خجل ہو کر چوری پکڑی جاتی۔

مہندی والی رات ہی کتنے خشک لہجے میں پروین نے اس سے کہا تھا۔

"اتنا میک اپ؟ دیکھو ہما اور ندا کتنی سج رہی ہیں' صرف اس لیے کہ ہمیشہ سادگی سے رہیں۔ تم ابھی سے بیاہتا عورتوں کے برابر بناؤ سنگھار کرو گی تو شادی پہ کیا روپ آئے گا۔ آئی شیڈ صاف کرو۔ اور دوپٹہ پھیلا کر لو۔ تمہاری قمیص تو ضرورت سے زیادہ تنگ والی ہے' منزہ کچھ سمجھاتی نہیں تمہیں؟"

ہے ذرا بھی سے ساس بن گئیں۔ خیر پھوپھی تو بھی بنی ہی نہیں تھیں جی"

[illegible] محسوس کر رہ گئی۔ اور بارات کے فنکشن بے دلی سے اٹینڈ کیے۔ منگنی کے بعد پہلا واسطہ پڑنا تھا وصی سے۔ [illegible] نجانے کیا کیا سوچ رکھا تھا لیکن۔۔۔

اور وصی کا انداز بھی بہت لیا دیا سا تھا۔

اس نے اس پہ کوئی پرشوق نظر نہیں ڈالی۔

ایک بھی شوخ فقرہ نہیں اچھالا۔

[illegible] انداز سے ثابت نہیں کیا کہ وہ اپنے اور اس کے اس نئے رشتے کے حوالے سے خوش ہے۔ سپاٹ سا نارمل رویہ تھا اس کا بس۔ جیسے پہلے ہوتا تھا۔ اور وشمہ کو حیرت تو اس پہ تھی کہ اس بار منزہ نے بھی کسی [illegible] میں دخل نہیں دیا تھا۔ پروین اس کے ساتھ بڑے استحقاق سے درشت لہجے میں پیش آتی رہیں اور منزہ [illegible] جیسے اسے اس بات سے فرق نہ پڑتا ہو۔ اس بات کا بھی رنج تھا وشمہ کو۔ اور اسے پکا یقین تھا کہ اس [illegible] بھی وصی کو آنے نہیں دیا جائے گا اس لیے اس نے کسی قسم کی سرگرمی نہیں دکھائی۔ بس سے [illegible] بیٹھی رہی۔

"اٹھو بیٹا! تیار ہو جاؤ۔ وہ لوگ آنے والے ہوں گے۔"

"میرا دل نہیں چاہ رہا۔" وہ اسی طرح روٹھے انداز میں بولی۔

"دل چاہے نہ چاہے۔ تیار تو ہونا ہی پڑے گا۔ وہ اب صرف تمہاری پھوپھو کا گھر نہیں' ہونے والا سسرال ہے۔"

"صرف ہونے والا سسرال کہیے۔ پھوپھو تو ایک دم بدل گئی ہیں۔" وہ پھٹ پڑی۔

[illegible] پراسرار طریقے سے مسکرائی۔

"بھابھی مجھے تو نہیں لگتا۔ وہ تو شروع سے ایسی ہی ہیں۔ روکھی پھیکی' سرد مزاج' پرتکلف۔"

"اور وہ مجھے آپ کے سامنے ڈانٹتی ہیں۔ میری عادتوں' میرے لباس تک پہ تنقید کرتی ہیں' آپ چپکے سے سنتی [illegible] کیوں؟"

"کیونکہ اب مجھ سے زیادہ حق ان کا ہے تم پہ۔"

"کیسے امی۔" وہ ہاتھ ہلا کے بولی۔ "آپ سے زیادہ حق کسی دوسرے کا کیسے ہو سکتا ہے؟"

"ہوتا ہے میری جان! بیٹی تو پرائی امانت ہے۔ اس پہ ماں یا باپ کا کیا حق؟ جب وہ تمہاری پھوپھی تھیں' میں [illegible] حال تھی۔ اب وہ ایک نئے رشتے سے سامنے آئی ہیں۔ میں کچھ کہہ کر تمہارے لیے مشکلات نہیں [illegible] چاہتی۔ اتنا تو تم نے بھی بھانپ لیا ہو گا کہ وہ دل سے اس رشتے پہ تیار نہیں۔ اس لیے بہانے بہانے سے [illegible] رہی ہیں۔ ایسے میں تمہارا یا میرا کچھ کہنا انہیں یہ رشتہ توڑنے کا بہانہ فراہم کر دے گا۔ صبر سے کام [illegible] تمہارا ہے' میاں بیوی کے رشتے میں ایسی معمولی باتیں اثر انداز نہیں ہوتیں۔ ہاں منگنی بہت [illegible] ہے۔ تم میرا مطلب سمجھیں؟"

[illegible] سر ہلا دیا۔ وہ بخوبی سمجھ گئی تھی کہ منزہ اسے کیا باور کرانا چاہتی ہے۔ یعنی منگنی کا دورانیہ اسے اور منزہ کو [illegible] مصلحت کے ساتھ صبر سے گزارنا ہو گا۔ ہاں شادی کے بعد نہ صرف وہ پروین کو ہینڈل کر سکتی ہے بلکہ [illegible] میں اسے منزہ کی بھی بھرپور سپورٹ حاصل ہو گی۔

☼ ☼ ☼

"[illegible]! آپ کا رویہ وشمہ کے ساتھ مناسب نہیں تھا۔"

[illegible] آنے کے بعد حسن مسلسل پروین سے الجھ رہا تھا۔ پہلے تو وہ وہاں جانے پہ تیار نہیں تھا۔ اب جب [illegible] کوشش کر رہا تھا کہ وشمہ سے سامنا اسے دوبارہ اسی مقام پہ لا سکتا تھا لیکن نہ جانے کا کوئی معقول بہانہ بھی

نہیں تھا۔ اس لیے جانا پڑا۔

پروین کے ساتھ وہ پہلے بھی وہاں جاتا رہا تھا اور پروین کا وشمہ کے لیے والہانہ پن بھی دیکھا تھا اس لیے اس بار پروین کو اس سے کھنچا کھنچا محسوس کر کے حیرت لازمی تھی۔ پہلے ہی وہ اپنی جگہ چور سا بنا ہوا تھا۔ پژمردگی دیکھ کر۔ وہ وصی کے نہ آنے سے اپ سیٹ اور بجھی بجھی سی تھی۔ لیکن حسن نے یہ محسوس کیا جیسے اس سے اپنی ناراضی جتا رہی ہو۔

"آپ نے خود اپنی مرضی سے کی ہے وصی کی منگنی اس سے۔ اور اب ایسے ظاہر کر رہی ہیں جیسے وصی نے آپ کو مجبور کیا ہو۔ کسی ان چاہی بہو والا سلوک کر رہی ہیں آپ اس سے۔"

"اونہہ۔ اپنی مرضی۔" پروین بڑبڑا کے رہ گئیں۔ مجبور تو وہ کی گئی تھیں اس رشتے کے لیے۔ ایسا نہیں تھا کہ وشمہ کو اپنی بہو کے روپ میں دیکھنے سے انہیں کوئی تکلیف تھی لیکن یہ بات ان کے اختیار سے باہر تھی اور انہیں مجبور اور بے بس دیکھ کر منزہ نے جس طرح وشمہ کی پسندیدگی ان پر جتائی تھی اور یہ بھی خبردار کیا تھا کہ اس پسندیدگی میں بہت آگے تک جا چکی ہے۔ تو اس صورت حال میں پروین جس کرب سے گزری تھیں اس سے وہی واقف تھیں۔ لیکن یہ راز وہ کس کو بتاتیں۔

وشمہ سے لاکھ گلے سہی۔ مگر تھی تو اپنی بھتیجی۔ اپنا خون کیسے اس کا بھرم سب کے سامنے کھوتیں۔

"اور تم کیوں اتنا اچھل رہے ہو؟ پتا ہے تمہیں کسی بات کا۔ اور بلاوجہ دوسروں کی حمایت میں اس کے سامنے سینہ پھلا کر جواب طلب کر رہے ہو۔"

"جب آپ کو کوئی جواب نہیں بن پڑتا تو وہ ڈانٹنے لگتی ہیں۔"

وہ ناراض ہو کر پیر پٹختا اپنے کمرے کی جانب چل دیا۔ جہاں ہما اپنے گیلے بال سکھا رہی تھی۔

"تمہارے بال بے حد خوبصورت ہیں۔ کوئی کسی کی آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتا ہے۔ کوئی کسی کے لبوں کے پیچ و خم میں۔ مجھے لگتا ہے میں کسی دن تمہاری گھنی زلفوں کے جنگل میں بھٹک جاؤں گا۔"

ابھی پرسوں شام ہی وہ اس کی ایک لٹ کو انگلی پہ لپیٹتے ہوئے خواب ناک لہجے میں کہہ رہا تھا لیکن اب اگر اسے یہ بات یاد آئی بھی۔ تو خود کو ملامت کرنے لگ جاتا۔ اتنی جلدی وشمہ سے دست بردار ہو کر کسی اور کی محبت میں گرفتار ہو جانے کے جرم کی پاداش میں۔ وہ اسے نظرانداز کرتا بیڈ کی جانب بڑھ گیا۔ اور جوتوں سمیت لیٹ کر چھت کو تکنے لگا۔

ابھی کل تک ہما ایک مثالی بیوی بنتے ہوئے اس کے کمرے میں داخل ہوتے ہی الرٹ ہو کر اس کے لباس، کھانے پینے اور دوسری باتوں کی فکر میں لگ جایا کرتی تھی۔ لیکن آج اسے یہ احساس تک نہ ہوا کہ وہ اس کے پاس سے گزر کر جا چکا ہے۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پہ لیٹا ہے۔

وہ وشمہ سے ملنے کے بعد کھوئی کھوئی سی تھی۔ پہلے بھی چند ایک بار اس سے ملی تھی۔ مگر اب وصی کی ہونے والی بیوی کی حیثیت سے اس سے ملنا اتنا تکلیف دہ ہوگا۔ اس کا اندازہ اسے نہ تھا۔ ہوتا تو شاید جانے سے انکار کر دیتی۔

دونوں ایک دوسرے سے بندھے۔ ایک دوسرے میں کشش تلاشتے اب دوبارہ سے۔ بزنس بھی ٹکرا ... اپنے حصار میں واپس جا رہے تھے۔

بوجھ کی طرح لادے رشتے۔
ان چاہے بندھن۔
مجبوری کے سودے۔
مصلحتوں کے فیصلے۔

ان سب کے پیچھے بے لوگ ایسے ہی جیون بتاتے ہیں۔ غیر یقینی۔ غیر واضح۔ مبہم اور موہوم سے کبھی رجانے۔ کبھی انجانے۔ کبھی اپنے۔ کبھی بیگانے۔ کبھی آشنا تو کبھی ناآشنا بن کر ایک ساتھ چلتے رہتے

ندی کے دو کناروں کی طرح۔ جو ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بھی کبھی ایک نہیں ہو پاتے۔ حتیٰ کہ سفر ختم بھی ہو جائے تو ایک کنارہ دوسرے کنارے سے جدا ہی رہتا ہے۔ میلوں کا سفر اکٹھا طے کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں

☼ ☼ ☼

"بیٹیے۔ مسز نیاز نے کسی خاتون کے بارے میں ذکر کیا تھا؟"

ریحہ نے جعفر محمود کو مخاطب کیا۔ اگرچہ وہ انہیں کم کم ہی مخاطب کیا کرتی تھیں۔

"کس سلسلے میں؟"

"ظاہر ہے۔ ہماری بیٹی کے سلسلے میں۔ انہوں نے مسز نیاز کے بیٹے کی شادی پہ تقدیس کو پسند کیا تھا۔"

"کون لوگ ہیں۔ کیا کرتے ہیں؟"

"مسز نیاز کے سمدھی ہیں۔ ان کی بہو کا بھائی ہے۔ باپ کا کارمنٹس کا بزنس ہے۔ لڑکا باہر ہوتا ہے۔"

"منع کر دو۔" جعفر محمد نے سگریٹ کی راکھ ایش ٹرے میں جھاڑ کر حتمی فیصلہ فوراً سنا دیا۔

ریحہ کے تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

☼ ☼ ☼

"ارے ہو گئے۔ ذرا پرے ہٹ۔ صوفے کو سانس لینے دو۔ بے چارا وب کے سسکیاں بھر رہا ہے۔"

وصی نے حسان کو پرے دھکیلنا چاہا۔

لاؤنج میں ٹی وی دیکھنے کے لیے دونوں کا یہی پسندیدہ مقام تھا اور دونوں کی کوشش ہوتی تھی کہ اس صوفے پہ قابض ہو۔

"سسکیاں تو وہ بھر رہی ہے۔ تمہاری منگیتر۔ جسے اتنا ہرجائی قسم کا بچہ ملا ہے۔"

حسان نے شوارما کا بڑا سا لقمہ توڑتے ہوئے کہا تو وصی کی شوخی رخصت ہو گئی۔

"کیوں۔ میں نے کون سے ظلم کے پہاڑ توڑ ڈالے ہیں جن کے شکوے وہ آ آ کے تم سے کر رہی ہے۔"

اس نے لہجے میں مصنوعی بشاشت بھرنا چاہی۔

"بے چاری آئی کہاں ہے۔ اور ایک ہماری والی ہے۔" اس نے مسکراہٹ دباتے ہوئے ہوا کا ذکر کیا۔ "اوپر کے پھیرے لگا لگا کے سیڑھیاں گھس دی ہیں۔"

"ظاہر ہے۔ اسے ہی لگانے تھے بیچ کے چکر۔ اگر کہیں تم یہ کام شروع کر دیتے تو ابھی سیڑھیاں صرف نشان ثبت ہو تیں۔"

"بات کو نالو مت۔ یار! ہم سے کیا پردہ۔ بتاؤ نا۔ کبھی فون پر ہلکی پھلکی گفتگو بھی نہیں ہوئی؟ کوئی نہ؟" "نہیں یار۔" وصی کے لہجے میں تھکن اتر آئی۔

"کیسے ہوا؟"

"نہیں۔" اس نے سچائی سے تسلیم کیا۔

وہ ڈرتا تھا۔ اپنے آپ سے ڈرتا تھا۔ اس کا دل عمر کے چھبیسویں سال میں آ کے بھی کسی کے نقش سے خالی، پھر بھی وہ ڈرتا تھا۔

اسے سہا سے محبت نہیں تھی۔ پھر بھی وہ اس کا دل دکھانے کا گناہ گار ہوا تھا۔ اس کا سامنا کرنے سے ڈرتا تھا۔ اس کی آہ لگ جانے سے ڈرتا تھا۔

اسے اس معصوم لڑکی وشمہ سے بھی فی الوقت محبت نہیں تھی۔ جس کے ہاتھ میں اپنے نام کی انگوٹھی اس نے پہنائی تھی۔ لیکن وہ اپنے آپ سے اقرار کرنے سے بھی ڈرتا تھا کہ وہ اب اس کے رشتے میں بندھ گیا ہے۔

"گھامڑ ہے تو بھی۔۔۔ منگیتر ہے تیری۔۔۔ ڈر کیسا؟۔۔۔ لگتا ہے کس چکر میں تو نے اتنی سینڈلیں اور اتنے جوتے کھائے ہیں کہ اب جہاں ڈرنے والی بات نہیں ہے وہاں بھی ڈر رہا ہے۔"

"ایسا ہی سمجھ لو۔" ہنسی کا وصی سے پرانا اور گہرا تعلق تھا مگر اب وہی ہنسی اس کے لبوں پہ روٹھی روٹھی سی نظر آتی تھی۔

"میں تو کہتا ہوں کسی دن باہر ملنے کے لیے۔"

ابھی وہ اور بھی کار آمد مشورے دینے والا تھا کہ حسن نے کمرے سے نکل کر اسے خشمگیں انداز میں گھورا۔

"حسان۔۔۔!"

"وہ بھائی میں۔۔۔ میں دراصل وصی کو بتا رہا تھا کہ کامیاب زندگی گزارنے کے گر کیا ہیں۔"

گڑبڑا کے اس نے عجیب بودا سا بہانہ تراشا جس پہ باوجود بھاری دل کے وصی مسکرا اٹھا۔

"پہلے تم خود تو سیکھ لو یہ گر۔۔۔ اور کامیاب زندگی صوفے پہ ٹانگیں پھیلا کے لیٹنے سے اور ٹی وی کے آگے بیٹھنے سے نہیں گزاری جاتی۔"

وہ نجانے کس بات کا غصہ حسان پہ نکال رہا تھا۔ ورنہ اس سے پہلے حسان کو ہمیشہ دوسروں کی ڈانٹ سے بچاتا آیا تھا۔ عین اسی وقت وصی پہ عجیب سا انکشاف ہوا کہ بھلے حسن 'حسان کو ڈپٹ رہا ہے' اس کے ساتھ درشتی سے پیش آرہا ہے 'لیکن مخاطب تو کر رہا ہے' جبکہ کتنا عرصہ ہوا اس نے بھی دوستانہ انداز میں یا ازراہ شفقت و محبت وصی کو مخاطب نہیں کیا۔۔۔ کبھی بات کرنا بھی پڑی تو جیسے بحالت مجبوری۔۔۔ بہت اکھڑے انداز میں۔۔۔ رسمی طریقے سے۔۔۔ یہ وصی کو اب محسوس ہو رہا تھا۔

"حسن بھائی۔۔۔!" بے اختیار وہ اسے پکار بیٹھا۔ شاید اس رویے کی وجہ جاننا چاہتا تھا۔

حسن رکا مگر کچھ کہنے کے بجائے سرد نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ اس خنکی نے اسے اور بھی خائف کر دیا۔

وہ دل کی بات زبان پہ نہ لا سکا۔

"شام کو مال تاؤن چلیں۔۔۔ کتنا عرصہ ہو گیا ہے اکٹھے شاپنگ کیے ہوئے۔"

"چلے جاؤ۔۔۔ کسی نے منع تھوڑی کیا ہے۔"

عجیب سے انداز میں جواب دے کر وہ رکا نہیں۔۔۔ اور جس انکشاف نے کچھ دیر قبل وصی کو حیرت میں مبتلا کیا تھا اسی نے حسان کو بھی گنگ کر دیا۔

وصی اس احساس کو زائل کرنے کے لیے کھسیانی سی ہنسی ہنسنے لگا۔

"انہیں کیا ہوا؟" حسان پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"شادی شدہ ہو گئے ہیں بھئی۔۔۔ رعب دکھا رہے ہیں۔"

"تو اپنی زوجہ محترمہ کو دکھائیں۔۔۔ ہم پہ خار کیوں نکال رہے ہیں۔۔۔ مسئلہ کیا ہے؟" ناراض ہیں تجھ سے۔" شاید اپنے خیال کا اظہار کرنے کے بعد اس نے شے کا عنصر بھی شامل کر دیا۔ یعنی وہ خود بھی پر یقین نہیں تھا۔

"مگر کیوں؟۔۔۔ تم نے ان کی بھینس کھول لی تھی؟"

"وہ چاہتے تھے میں دشمہ سے شادی کے سلسلے میں کسی کے دباؤ میں نہ آؤں۔۔۔ وہ سوچتے تھے۔۔۔ سپورٹ کر رہے تھے۔۔۔ میرے لیے ماموں اور ممانی کے سامنے ڈٹ کر کھڑے ہو گئے تھے۔۔۔ کہاں کہاں سے بلائیں اکٹھی کر دی ہے تھیں اور میں۔۔۔ میں ہی میدان چھوڑ کے بھاگ گیا۔"

وہ کھسیانی ہنسی کے ساتھ وجہ بتانے لگا۔

"اس پہ اب تک ناراضی؟"

"یار! مجھے تو اس کے علاوہ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔"

وہ فرق ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

نے مجھ سے پوچھے بغیر اتنا بڑا قدم اٹھا لیا۔" جعفر غصے سے پھنکار رہا تھا۔

بھی کیا ہے۔ آپ نے تو ذکر سنتے ہی صاف منع کر دیا تھا۔" مدیحہ نے ڈھٹائی سے جواب دیا۔

اس کے باوجود تم باز نہیں آئیں؟"

تقدیس کی بات طے نہیں کر رہی۔۔۔ نہ آپ کی مرضی کے خلاف اسے رخصت کر رہی ہوں۔۔۔ ایک بار مل کیا حرج ہے۔ بعد میں دیکھتے ہیں اقرار کرنا ہے یا نہیں۔۔۔ یہ کیا کہ صرف ذکر سن کر انکار کر دیا۔۔۔ نہ جانا۔

کسی کے بارے میں رائے دینے کے لیے اسے جاننا پرکھنا ضروری نہیں ہے۔ میں اس کلاس میں بھی نہیں سکتا۔"

بتاتے بڑے صاحب حیثیت لوگ ہیں۔"

جس بزنس سے تعلق رکھتے ہیں وہاں تعلیم کا رجحان کم پایا جاتا ہے اور یہ باہر جانے والے لڑکے کیا کرتا بڑا ہے؟۔۔۔ ڈاکٹر۔۔۔ انجینئر؟ ہرگز نہیں۔۔۔ پتہ نہیں کسی سی گریڈ پروفیشن سے وابستہ ہو گا۔"

مسز نیاز بتا رہی تھیں کہ وہ مستقلاً پاکستان آنے والا ہے اور لیدر کا بزنس شروع کرنے والا ہے اور رہی بات تو مسز نیاز کی اپنی بہو۔۔۔ یعنی لڑکے کی بہن لیکچرر ہے۔ سب سے چھوٹی بہن میڈیکل کی اسٹوڈنٹ ہے میں پہلی بار مدیحہ نے جعفر محمود کے انکار کو انا کا مسئلہ بنانے کے بجائے تحمل سے اسے دلائل دیے۔۔۔ زندگی میں پہلی بار ہی جعفر محمود نے مدیحہ کے دلائل سنے بھی۔۔۔ اور ان سے متفق نظر آیا۔

☼ ☼ ☼

کے لینڈ کرتے ہی سوہا نے اپنا سیل نمبر آن کیا۔ ربتا نے کن انکھیوں سے اس کی یہ حرکت دیکھی اور اس جھل ہو گئے۔ وصی کا نمبر اب بھی آف مل رہا تھا۔

خیر۔ دا تنے دن تک کوئی کیسے اپنا نمبر آف رکھ سکتا ہے۔۔۔ کہیں کوئی مس پراپلم ہو گیا ہے۔۔۔ سیل فون بھی تو اتنی وارداتیں ہوتی ہیں۔۔۔ لیکن میرا نمبر تو ہے اس کے پاس۔۔۔ وہ نئے نمبر سے مجھے کال کر لیتا۔۔۔ آخر ہے جو۔۔۔"

اپنے آپ سے الجھتی وہ گاڑی میں آبیٹھی۔۔۔ "ماما! وہ وصی۔۔۔"

سوہا! اتنی پریشان مت ہو۔۔۔ کیوں بلاوجہ ٹینشن لے رہی ہو؟"

ربتا کو چڑتے دیکھ کر مزید کچھ کہنے کا ارادہ ترک کیا اور اب تقدیس کا نمبر ملایا۔۔۔

ناز بات کالج کی۔۔۔؟"

کپ شپ لگانے کے بعد وہ تھوڑی نارمل نظر آرہی تھی۔ ربتا نے اس کا دھیان بٹ جانے پہ شکر

میں تو اتنے دن گئی ہی نہیں کالج۔"

۔۔۔ طبیعت تو خراب نہیں تھی؟"

ایکدم پرفیکٹ۔۔۔ اکچوئیلی آپا کی شادی ہوئی بڑی ایمرجنسی میں۔۔۔ اس لیے۔"

میں سوہا سے کتنی دیر کچھ بولا نہ گیا۔

ایمرجنسی؟" اس نے ذرا سرد لہجے میں پوچھا۔ اور اس سے پہلے کہ تقدیس جواب دیتی وہ دوبارہ بول اٹھی جانے سے پہلے تمہیں فون کر کے اپنی روانگی کی خبر دی تھی تب تمہاری آپا کی شادی کی ڈیٹ فکس ؟" اس کے سوال پہ ربتا نے چونک کر اسے دیکھا تھا۔

"اکچوئیلی سوہا۔۔۔ میں۔۔۔"

"وضاحتیں دینے کی ضرورت نہیں ہے تقدیس۔!" سوہا اداسی سے مسکرائی۔
" I can understand " ("میں سمجھتی ہوں۔")

اور واقعی تقدیس نے مزید وضاحتیں دینے کی کوشش نہ کی۔ حالانکہ ذہنی طور پر وہ خود کو کب سے اس مرحلے کے لیے تیار کر رہی تھی۔ جانتی تھی کہ جب بھی سوہا آئی۔ اس کی ناراضی بھی سہنا پڑے گی۔ اور بعد سے بہانے پیش کر کے اسے مطمئن بھی کرنا ہوگا۔ منانے کے سو سو جتن کرنے ہوں گے۔

مگر ان سب کی ضرورت پیش نہ آئی۔

"او کے۔ خدا حافظ۔"

سوہا نے سرد لہجے میں کہتے ہوئے لائن ڈس کنیکٹ کر دی۔ تقدیس "ہیلو۔ ہیلو" کرتی رہ گئی۔ اور پھر جھنجلا کے سوہا کا نمبر ملانے لگی۔

سوہا نے ریتا کی جانب دیکھا۔ وہ دانستہ نظریں چرا کے اپنے بیگ میں کچھ تلاشنے لگی تھی۔

"کیا ڈھونڈ رہی ہیں ماما؟"

"وہ۔ ہاں۔ گلاسز۔ پتا نہیں کہاں رکھ دیے۔" وہ ٹٹولنے میں مگن تھی۔ سوہا کے ہونٹوں پہ پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔

"گلاسز آپ نے لگا رکھے ہیں ماما۔!" ریتا اور نروس ہو گئی۔

"اوہ۔ ہاں۔" شرمندگی سے وہ گلاسز اتار کے ٹشو سے صاف کرنے لگی۔ شاید سوہا کا سامنا کرنے سے کترا رہی تھی۔

ایک عجیب سا مجرمانہ احساس ہو رہا تھا۔ جیسے اسے ابھی ابھی پہنچنے والی ٹھیس کی ذمے دار وہی ہو۔ اور وہ چوکا جو اسے کچھ دیر میں ہی کے حوالے سے لگنے والا ہے وہ بھی ریتا کی ذات سے ملنے والا تحفہ ہو۔

اور دفعتاً سوہا کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ ریتا نے چونک کر تعجب سے اسے دیکھا۔

"ماما! آپ بھی نا۔ ماتی نہیں ہیں۔ لگتی بھی نہیں ہیں۔ مگر ہو ضرور گئی ہیں۔" وہ ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کیا؟" ریتا نے پوچھا۔

"بوڑھی۔" اور ریتا بھی اس کی ہنسی کا ساتھ دینے لگی۔

"ماما۔! میں آپ کو شرمندہ شرمندہ سا نہیں دیکھ سکتی۔ ابھی نہیں۔" کھوکھلی ہنسی کے پیچھے اس کا دل مجھ سے کہہ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہو گیا ہے امی آپ کو؟" خرم کھل کر ہنس رہا تھا۔

"ذرا سانس تو لیں۔ کیا جیت ترک کرنی ہے شادیوں کی۔ ابھی تو ہما اور ندا کی شادیوں کی دعوتیں تک ختم نہیں ہوئی ہوں گی۔"

"وہ بیٹیاں تھیں۔ شادی تھوڑی ہی کی ہے ان کی۔ فرض سے سبکدوش کیا ہے۔ شادی تو اب کروں گی تمہاری۔" رخشندہ کے کہنے پہ وہ پھر سے ہنسنے لگا۔

"دیکھیے۔ کھل گیا آپ کے دعووں کا پول۔ صحیح کہتی ہے روا۔ کہ آپ نے ہمیشہ ان کے معاملے میں ڈنڈی ماری ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہی امی محترمہ! کہ آپ ہمیشہ سے روا کے اس دعوے کو جھٹلاتی رہیں۔ اور فخر سے اعلان کرتی رہیں کہ آپ کی نظر میں بیٹی بیٹا سب برابر ہیں۔ لیکن آخر آپ نے ثابت کر ہی دیا کہ اندر سے آپ وہی روایتی ماں ہیں۔ بیٹے کو فوقیت دینے والی۔"

زندگی میں مت ٹالو بات کو۔ میں تو اب بھی کہوں گی کہ شادی۔ جس کا مطلب ہی مسرت اور خوشی ہے۔ وہ بیٹے کی ہوتی ہے۔ بیٹی کی شادی پہ دل بوجھل ہوتا ہے۔ اداس ہوتا ہے۔ اسے رخصت کرنے کے بعد آنگن دیکھ کے ہول اٹھتے ہیں۔ اور اگر خوشی کا کوئی احساس ہوتا بھی ہے تو وہ صرف ذمے داری کم ہونے کا ہے۔ سبکدوش ہونے کا۔ لیکن رونق تو تمہاری شادی سے ہوگی۔ آنگن بھرے گا۔ دل بھرے گا۔"

"کون سی فلم دیکھی ہے رات میں؟" خرم نے سنجیدگی سے پوچھا۔ پھر رازدارانہ سرگوشی کی۔

"کیمدان پہ سو گا۔؟ یا پھر ساس ہو تو ایسی؟"

"بس۔ بہت ہو گئی مسخری۔ سیدھی طرح سے بات سنو میری۔ میں نے ایک لڑکی پسند کی ہے تمہارے لیے۔"

"اب بالا ہی بالا فیصلے بھی ہو گئے۔ حد ہے امی پہ حیرت کی۔" خرم کے شکایتی انداز پہ وہ خفگی سے۔

"نہیں۔ فیصلہ کوئی نہیں ہوا۔ صرف پسند کی ہے۔ اور باقاعدہ رشتہ ڈالنے سے پہلے تم سے بات کر رہی ہوں تاکہ تم بلا جھجک اپنی رائے دے سکو۔ یہ مت سوچنا کہ میں ناراض ہوں گی یا تم پہ زبردستی اپنی پسند ٹھونسنے کی کوشش کروں گی۔"

"دراصل امی۔! ابھی میں۔"

"نہیں۔" رخشندہ نے اس کی بات کاٹی۔

"یہ مت کہنا کہ ابھی تم شادی نہیں کرنا چاہتے۔ بس اس ایک بات کے علاوہ جو چاہے کہہ دو۔"

"امی۔!" وہ بے بسی سے کراہ کے رہ گیا۔

"کون لڑکی وہاں ہے نظر میں؟"

"کہاں ہے سر اٹھانے کی فرصت نہیں ملتی۔ آپ پتا نہیں کیا کیا سوچ رہی ہیں۔"

"خاندان میں کوئی؟"

"سچ پوچھیں تو یہ آپ کا ڈیپارٹمنٹ ہے۔ میں ابھی ذہنی طور پر اس کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن اگر آپ نے فیصلہ کر ہی لیا ہے تو یہ ذمے داری بھی آپ سنبھالیں۔ خود پسند کریں اپنے لیے بہو۔"

"یہ بھی ٹھیک ہے۔" اطمینان بھرا سانس لے کر وہ ہلکی پھلکی ہو گئیں۔

روشن خیالی کا ثبوت دیتے ہوئے انہوں نے بڑے کھلے دل سے سوچا تھا کہ وہ جس لڑکی کو ان کی بہو بنانا چاہے گا اسے خوشی خوشی قبول کر لیں گی۔ لیکن جب اس نے یہ کام ان کے سر ڈالا تو اندازہ ہوا کہ اندر سے وہ بھی پرانی سوچ کی حامل ہیں۔ ابھی بھی ان کے اندر وہی خواہش ہے۔ خود بہو پسند کر کے لانے کی۔

"پھر بھی۔ کچھ تو سوچا ہو گا۔ لمبا قد۔ گورا رنگ۔ تعلیم۔ عادت وغیرہ؟" انہوں نے دوستانہ انداز میں کہا۔ خرم جھینپ گیا۔

"اوفوہ۔ جب اختیار آپ کو دے ہی دیا ہے تو اعتبار بھی ہے آپ کی پسند اور ذوق پہ۔ مجھے کوئی آسمانی حور یا پری کی ضرورت بھی نہیں۔ سلجھی ہوئی مناسب حد تک تعلیم یافتہ ہو۔ زیادہ کم عمر نہ ہو۔ اس گھر کی اکلوتی بہو میں بننا بہو جا بھی نہیں چاہیے۔"

"مجھے تو تقدیس تمہیں ضرور پسند آئے گی۔ ایسے ہی نہیں وہ پہلی نظر میں مجھے بھائی تھی۔ ماشاء اللہ۔ شکل و صورت کی بھی پیاری ہے۔ خاندان بھی اعلا اور نام والا ہے۔ تعلیم یافتہ اور سلجھی ہوئی ہے۔ بہت سنجیدہ بھی ہے۔ بہت چنچل۔ تم ہاں کہہ دو تو میں آگے بات بڑھاؤں؟"

"جی ٹھیک ہے۔" اس نے جھجکتے ہوئے مبہم سی رضامندی ظاہر کی۔

"چلو اچھا۔ تو معاملہ جلدی آگے بڑھے۔"

"کہیں آپ کیا تو پھنس جاؤں گا امی۔!"

"کیا مطلب؟"

"واپس جانے میں مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

"لڑکی والوں کے بھی کئی تحفظات ہوتے ہیں۔ انہیں بھی تم سے ملنا، تمہیں پرکھنا ہوگا۔ محض تصویر دیکھ کے تو کوئی بھی بیٹی نہیں دیتا۔"

"لیکن امی! مسئلہ نہ ہو جائے۔ آپ کو تو پتا ہے کہ اسٹوڈنٹ ویزا پہ آیا تھا... ڈگری بھی مل گئی۔ جاب کے ساتھ ساتھ کبھی کوئی... کبھی کوئی پروفیشنل کورس کرتا رہتا ہوں کہ اسٹوڈنٹ ویزے کا جواز بنا رہے۔ جب تک پیپرز نہیں بن جاتے۔"

"نہ بیٹا... فکر نہیں۔" رخشندہ نے اطمینان سے اس کی بات کاٹی۔

"تمہارے ابو بھی کہہ رہے تھے کہ خرم سے کہنا... یہاں کی لوکل ڈگری پہ ہی لوگ ساٹھ ستر ہزار ماہوار والی نوکری آرام سے کر رہے ہیں۔ خرم کے پاس تو باہر کی ڈگری ہے۔ کسی بھی اچھے بینک میں آسانی سے جاب مل جائے گی... کیا کرنا ہے پردیس کی زندگی کا۔ نری خواری۔ وہاں کون سا پیسے درختوں پہ لگے مل جاتے ہیں۔"

"آپ نے تو بڑا دل کر کے بھیجا تھا مجھے۔ اب یہ تبدیلی کیسے؟"

"تمہاری بہنوں کی شادی کے وقت تمہارے نہ ہونے نے یہ احساس دلایا۔ کہ ہماری زندگی کتنی ادھوری۔ کتنی خالی ہے تمہارے بغیر... تم لوٹ آؤ خرم! تمہارے ابا کے شانے اب جھکنے لگے ہیں۔ تم اکلوتے سہارے ہو ان کے۔ اس وقت انہیں۔ مجھے۔ اس گھر کو تمہاری ضرورت ہے۔"

"چلیں... یہ آپشن بھی ذہن میں رکھتا ہوں... لیکن آپ اسے حتمی نہ سمجھیں۔ بس یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے جا نہ سکا۔ یا یہاں آنے کے بعد ویزا ایکسپائر ہو گیا تو آپ کا سمجھایا ہوا راستہ تو ہے ہی۔"

"جیتے رہو... بس تم آنے کی تیاری کرو... میں دوسری تیاری رکھتی ہوں۔" انہوں نے فون رکھا۔

☆ ☆ ☆

وہ لاکھ کترا رہا تھا اس کا فون اٹینڈ کرنے سے، مگر کب تک۔ آخری حل کے طور پہ اس نے اپنا نمبر چینج کر لیا... جانتا تھا۔ واپس آنے کے بعد اس کے نئے نمبر کا پتا لگانا اس کے لیے خاص مشکل نہ ہوگا۔ لیکن پھر بھی... کچھ دن... کچھ دن تو وہ اس کا سامنا کرنے سے بچ سکتا تھا۔

اور وہی ہوا۔ سوہا نے اس کے آفس سے رابطہ کر کے اس کا نیا نمبر اپنے پاکستان لوٹنے کے چوتھے روز ہی حاصل کر لیا۔

موبائل کی اسکرین پہ سوہا کا جانا پہچانا نمبر دیکھ کے وہ گہری سانس لے کر رہ گیا۔

اب کال ڈس کنیکٹ کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوتا... وہ دوسری بار کرتی۔ تیسری بار کرتی۔ بار بار کرتی۔ کب تک اس کی کال کاٹتا۔

کیا تب تک؟... جب تک وہ اس کے گھر یا آفس آ پہنچتی؟

اس سچویشن سے بچنے کا واحد حل یہی تھا کہ وہ فون پہ ہی اس سے بات کر لیتا۔

"ہیلو..."

"وصی...! بے ایمان... بدتمیز... نمبر چینج کر لیا تو بتا نہیں سکتے تھے۔ میرا نمبر تو وہی تھا۔ یا بھول گئے تھے؟"

چپ رہا...

سوہا ٹھٹک گئی۔

"کیا ہوا وصی؟... تم ٹھیک تو ہو؟"

"ہوں..." اس نے چور نظروں سے کیبن کی گلاس وال سے نظر آتے اپنے کولیگز کو دیکھا اور پیشانی سے پسینہ پونچھا... مگر وہ چہرے کی اڑی رنگت کو بحال کرنے پہ فی الحال قادر نہیں تھا۔

"کیا ہوا؟ بخار؟"

"نہیں... بس... وہ..."

"ناراض ہو؟" اس کے اچانک سے اتنی معصومیت سے اور اتنی محبت سے پوچھنے پہ وصی کی آنکھیں بھر آئیں۔

"نہیں... میں کیوں ناراض ہوں گا... ہاں... مگر... تم ہو سکتی ہو۔"

"نہیں... تم سے ناراض؟ ہو ہی نہیں سکتا... تم نے مجھے فون نہیں کیا... اپنا نیا نمبر نہیں دیا۔ تب بھی نہیں۔ کیونکہ مجھے پتا ہے کہ کوئی نہ کوئی وجہ ضرور ہوگی۔"

"ہاں... وجہ تو تھی۔" وصی نے اپنا حلق خشک ہوتا ہوا محسوس کیا۔

"دفع کرو وجہ کو۔ بس ہو گئی بات۔ کافی ہے۔ آج شام ملیں؟"

"آج... نہیں آج مجھے..."

دل چاہا۔ کہہ دے کہ آج مجھے اپنی منگیتر کو ڈنر پہ لے جانا ہے... یا آج شام میرے ہونے والے سسرال والے چائے پہ آ رہے ہیں۔ یا پھر یہ کہ... آج تو میں ممانی کے ساتھ اپنی شادی کی شاپنگ کرنے جا رہا ہوں۔ اپنی ہونے والی دلہن کے لیے عروسی لباس خریدنے۔

رونمائی کا تحفہ پسند کرنے۔

مگر یہ سب کہنے کی خواہش ہوئی... ہمت نہیں۔ صرف خواہش ہو جانے سے سب ممکن تو نہیں ہو جاتا۔ وہ اپنے خشک ہوتے لبوں پہ زبان پھیر کے رہ گیا۔

"ڈنر میرے ساتھ کرنا... میں نے تمہارے لیے کچھ گفٹس بھی لیے ہیں۔ اور ہاں تمہاری فیملی کے لیے بھی۔ تمہاری ممانی۔ اور وہ تمہاری آپی... جو تمہاری بیسٹ فرینڈ بھی ہیں... ان کے لیے بھی... کیسے ہیں سب؟"

وہ اس کی ایک نہ سن رہی تھی۔ اپنی سنائے جا رہی تھی۔

"ٹھیک ہیں۔ لیکن سوہا! میں آج نہیں مل سکوں گا... آج مجھے..."

"so rude وصی! میں اتنے دنوں بعد لوٹی ہوں۔ اتنی اداس ہوں اور تم... جاؤ... اب میں واقعی ناراض ہوں۔" وصی کو اپنا آپ کمزور پڑتا محسوس ہوا۔

اسے لگا جیسے ہر طرف سے اسے سنگسار کیا جا رہا ہو۔ فوراً ہی اس نے اس سے ملنے کا فیصلہ کر لیا۔

سب کچھ صاف صاف بتانے کا۔ ایک بار... ایک آخری بار اس سے ملنا ضروری تھا۔

"ٹھیک ہے... ملتے ہیں۔ مگر میں تمہارے گھر تمہیں لینے نہیں آ سکوں گا۔ تم آ جانا۔"

"شکر ہے... گفٹس... اچھا ساتھ لے آتی ہوں... وہیں ملیں گے نا۔ جہاں پہلی بار ہم نے اکٹھے ڈنر کیا تھا؟"

"ہاں۔" وصی نے بوجھل لہجے میں کہا... اور ریسیور رکھتے ہوئے سوچا۔

"پہلی بار... اور اب آخری بار۔" دل کسی نے مٹھی میں لیا۔ وہ حیران رہ گیا۔

کیا ہو رہا ہے یہ مجھے... میں تو اس سے محبت نہیں کرتا۔ پھر دل کو اتنی تکلیف کیوں ہو رہی ہے؟ اسے یہ بتاتے ہوئے کہ میں اپنے کیے وعدے سے پھر گیا ہوں۔ کیا یہ اس کو دینے والی تکلیف سے ہونے والی تکلیف ہے؟ یا یہ شرمندگی ہے جو [illegible]

"میں اس سے محبت نہیں... ہمدردی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ وہ دوستانہ [illegible] ہے... یہ اس کی سچائی کے جواب میں رکھائی دینے کی خجالت ہے۔ اور [illegible] اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو میں اتنے سہل طریقے سے اس کی خواہش سے دستبردار کیسے ہو سکتا تھا... [illegible] کیسے راستہ بدل سکتا تھا؟ محبت کمزور نہیں [illegible] اور میں کمزور [illegible] تھا۔ مجھے اس سے محبت... تھی... نہ ہے۔"

اور خود کو یقین دلاتے دلاتے وہ یہ کہنا بھول گیا کہ..... "نہ ہو سکی ہے۔"

☼ ☼ ☼

"اب تو آپ کو کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ لڑکے کے بیرون ملک ہونے پہ آپ ہچکچا رہے تھے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ واپس آرہا ہے۔ اور مجھ سے بھی معلومات لینے میں کچھ غلطی ہو گئی تھی۔ لیدر فیکٹری لگانے کا ارادہ اس کے ابا کا تھا' جو ابھی تک اپنے بھائی کے ساتھ ہوزری کے بزنس میں شراکت دار تھے۔ لڑکا تو بینکنگ کی اعلا تعلیم حاصل کر کے لوٹ رہا ہے۔ ملٹی نیشنل بینک میں ایسے ہاتھوں ہاتھ لیا جائے گا۔" مدیحہ بیگم نے بتایا۔

"ہوں۔ ٹھیک ہے۔ تم تفصیلات لے لو۔ میں اپنے طور پر پتا کرواتا ہوں' خاندان اور لڑکے کے کردار وغیرہ کے بارے میں۔"

جعفر محمود نے بھی دلچسپی لی۔ اور تمام اطلاعات تسلی بخش ہونے کے بعد انہوں نے مدیحہ کو گرین سگنل دے دیا۔ مدیحہ نے ان خاتون کی وساطت سے اپنی رضامندی کہلوا دی۔ جو یہ رشتہ کروانے میں پیش پیش تھیں۔ تقدیس کے احساسات نارمل تھے۔

وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھی۔ جانتی تھی کہ تحریم کے ساتھ ہونے والے تلخ حادثے کے بعد اس کے ماں' باپ اسے زیادہ موقع نہیں دیں گے' اور جلد از جلد اسے سر سے اتارنے کی کوشش کریں گے۔

یہ اطمینان بہرحال تھا۔ کہ جلدی جلدی میں کیا فیصلہ اتنا برا بھی نہیں تھا۔ لڑکا نہ صرف تعلیم یافتہ تھا' بلکہ پوری فیملی سے ملنے کے بعد اسے تمام لوگوں کے سلجھے ہوئے ہونے کا اندازہ ہو گیا تھا۔ تینوں نندوں میں اس نے روایتی نندوں والی بات نہ دیکھی تھی۔ دو تو ویسے بھی شادی شدہ تھیں۔ تقریباً "ہم عمر اور ہم مزاج۔ دیورانی' جٹھانی کا جھنجٹ نہ تھا۔ اور ساس بھی معقول خاتون لگ رہی تھیں" اس لیے وہ مطمئن تھی۔

اور زیادہ خوش اس لیے نہیں تھی۔ کہ عمر سے زیادہ حاصل ہونے والا تجربہ اور مشاہدہ اسے زیادہ توقعات باندھنے سے روک رہا تھا۔ وہ آنے والی زندگی کے بارے میں پُرامید ضرور تھی۔ مگر خود کو خواب بننے سے باز رکھ رہی تھی۔

○ ○ ○

کافی دنوں بعد مل رہا تھا اس سے۔ اس کے نقوش اجنبی اجنبی لگ رہے تھے۔ یا شاید اس نے اس سے پہلے کبھی اتنے غور سے سوہا کو دیکھا ہی نہیں تھا۔

کبھی سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کی گندمی رنگت میں کہیں کہیں سونے کی سی دمک ہے۔ اس کی پلکوں کے کنارے مڑے ہوئے ہیں۔

اس کی آنکھوں کے نیچے یہ گہری سرمئی لکیر کسی مصنوعی سہارے کی مرہون نہیں۔ قدرتی ہے۔

اس کے نچلے لب کا دایاں گوشہ مسکراتے ہوئے اندر کی جانب دب کر کتنا دلکش لگتا ہے۔

کسی بات پر پُرجوش ہو کر ہتھیلیاں مسلتی وہ کتنی چھوٹی سی معصوم سی بچی لگتی ہے۔ آج دیکھ رہا تھا تو احساس ہو رہا تھا۔ "ایسے۔ کیا گھور رہے ہو؟" وہ اس کی نظروں سے خائف ہوئی۔

"کچھ نہیں۔" وہ چونکا۔

"اتنے کھوئے کھوئے سے کیوں ہو؟"

"ابھی تک تو نہیں کھویا۔ اب کھونے والا ہوں۔"

"مجھ میں؟" وہ لب دبا کے مسکرائی۔

"تم میں نہیں۔ تم سے کھونے والا ہوں سوہا!"

"پلیز ذرا ڈفلی باتیں نہ کرو۔ یہ دیکھو میں سارے کفت ساتھ لائی ہوں۔" اس نے بیگ کھولا۔ اور ایک پیکٹ نکالا۔

"سوہا! پلیز۔ میری بات سن لو۔"

"نہیں پہلے یہ....."

"سوہا۔! پلیز۔ پھر شاید میں بھی کہہ نہ پاؤں۔ یا شاید کہنے کے لیے مل نہ پاؤں۔"

"وصی۔!" وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

"ایسا کیوں کہہ رہے ہو؟"

"سوہا۔ تمہیں یاد ہے میں نے تم سے ایک وعدہ کیا تھا۔"

"وہ میں کیسے بھول سکتی ہوں وصی!"

"کسی بھی طرح۔ مگر بھول جاؤ۔ اب اسے بھولنا ہی ہو گا۔" سوہا کے اندر سے جیسے خون کا آخری قطرہ تک نچڑ گیا۔

وصی کو اس کے سفید بے جان پڑتے چہرے کی طرف دیکھتے خوف آیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا اٹھی۔

"میں۔ میں مجبور ہوں۔"

"وہ نہیں مانتے؟" سوہا نے بڑی دقت سے پوچھا۔ "تمہارے گھر والے؟ نہیں مانتے؟"

وصی نے سر جھکا لیا۔

"میں منالوں گی۔ تم بھی کوشش کرو۔ اتنی جلدی ہمت نہ ہارو وصی۔! میں بدل لوں گی خود کو۔ جیسا وہ چاہیں گے ویسی بن جاؤں گی۔ کچھ وقت لگے گا۔ مگر ہو جائے گا۔ مایوس کیوں ہوتے ہو۔ وہ مان جائیں گے۔"

وہ جلدی جلدی کہہ رہی تھی۔ جیسے وصی یہ سب سننے سے پہلے ہی اٹھ کے چلا نہ جائے۔

"وہ ضرور مانیں گے۔ محبت سب منوا لیتی ہے۔ محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔"

"ہاں۔" وہ اٹھا۔

"محبت۔" اس نے سانس لے کر سینے پہ دھرا بوجھ پرے سرکایا۔

"محبت سب منوا لیتی ہے۔" اس نے ٹیبل سے اپنا سیل فون اور کار کی چابیاں اٹھائیں۔

"محبت اپنا راستہ خود بنا لیتی ہے۔" اس نے دونوں ہاتھ جیبوں میں ٹھونسے۔

"لیکن۔ اگر محبت ہو تو۔"

اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور اس کا ہاتھ لگنے سے میز پہ رکھی پرفیوم کی شیشی نیچے گر کر ٹوٹ گئی۔ کرچیاں پھیلنے پہ وصی نے بے ساختہ مڑ کے دیکھا وہ کسی بت کی طرح۔ کسی بے جان بت کی طرح بیٹھی تھی۔

اس کی بے روح پتلیاں ساکت تھیں۔

اس کے سفید خشک لب نیم وا تھے۔

نجانے وہ سانس بھی لے رہی تھی یا نہیں۔

یہ آخری نظر۔ جو وہ کبھی نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ کبھی بھی نہیں۔ یہ نادانستہ والی آخری نظر اسے اندر تک جھنجوڑ گئی۔ اس کی رگوں میں تلاطم جگا گئی۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ریسٹورنٹ سے نکل گیا۔ تیز ڈرائیونگ کے دوران اسے خیال آیا تو اس نے ونڈ اسکرین کے وائپر چلا دیے۔ اسے احساس تک نہ ہوا کہ باہر بارش نہیں ہو رہی۔ آسمان صاف تھا۔

ایک بوند تک نہیں برس رہی۔

یہ جھڑی تو اس کی آنکھوں سے لگی تھی۔ جو اسے سامنے کا منظر دھندلا دھندلا۔ بھیگا بھیگا نظر آ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"ماما۔!" وہ ربتا کے گلے لگی بلک رہی تھی.....

اور ربتا کے پورے وجود پہ جیسے کوڑے برس رہے تھے۔ اسے لگ رہا تھا جیسے اس کے ایک ایک آنسو' ایک ایک زخم کی ذمے دار وہ ہے۔

"سوہا۔۔۔ بس میری جان!۔۔۔ بس۔۔۔ یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔۔۔ میری وجہ سے ان لوگوں نے تمہیں۔۔۔ میں نہیں بتاؤں گی کہ میں تمہاری ماں نہیں ہوں۔۔۔ منزہ ہے تمہاری ماں۔۔۔ وہ شریف خاندانی عورت ہے! اس نے جنم دیا ہے تمہیں۔۔۔ اس کا دودھ پیا ہے تم نے۔۔۔ میں تمہاری ماں نہیں ہوں، میں تمہاری ماں ہو بھی کیسے سکتی ہوں۔" اسے چپ کراتے کراتے وہ خود رو پڑی تھی۔

جو اعتراف وہ کبھی مر کے بھی نہ کرتی۔۔۔ وہ جیتے جی کرنا پڑ رہا تھا۔۔۔ جس حقیقت کو وہ ہمیشہ جھٹلاتی رہی۔۔۔ اب خود اس کا اعلان کر رہی تھی۔۔۔ اپنی زبان سے سوہا کی ماں نہ ہونے کا اعتراف کر رہی تھی۔

"میں بتاؤں گی۔۔۔ انہیں یقین دلاؤں گی۔۔۔ کہ تم میری کچھ نہیں لگتی۔۔۔ تم چلی جاؤ۔۔۔ اپنی ماں کے پاس چلی جاؤ۔۔۔ پھر وہ لوگ تمہیں قبول کر لیں گے۔"

"نہیں ماما!۔۔۔ لوگ تو کہیں ہیں ہی نہیں اس سارے قصے میں۔۔۔ بات تو اس کی ہے۔۔۔ اس کی۔۔۔ جس نے کبھی مجھے چاہا ہی نہیں۔"

"کیا؟۔۔۔ وصی۔۔۔ وصی کی بات کر رہی ہو تم؟"

"ہاں۔۔۔ وہ کہتا ہے۔۔۔ اسے مجھ سے محبت نہیں۔۔۔ وہ کہتا ہے میں اسے بھول جاؤں۔"

اور ربابہ کو لگا۔۔۔ سالوں پہلے کی کہانی پھر سے دہرائی جا رہی ہو۔۔۔ اسے چپ لگ گئی۔۔۔ گہری چپ۔

اس نے اپنے سینے سے لگی ہچکیاں لے لے کر روتی سوہا کے بالوں پہ ہاتھ پھیرا۔۔۔ اس کے ماتھے پہ بوسہ دیا اور کہا۔

"اسے تم سے محبت نہیں ہے۔۔۔ تو تمہیں کیوں ہے؟ محبت، محبت مانگتی ہے سوہا؟ اور جہاں بدلے میں نفرت ملے۔۔۔ وہاں نفرت لوٹاؤ۔۔۔"

☼ ☼ ☼

خرم سے مل کر جعفر محمود کو بہت تسلی ہوئی۔

ظاہر ہے کہ ایک مرد ہونے کے ناتے وہ اس معاملے میں خود کو کورا سمجھتے تھے۔ بیوی پہ اعتماد سہی۔۔۔ نہ سہی اس کی صلاحیتوں اور ذوق کے بارے میں کتنے ہی شکوک ہوں۔۔۔ یہ اختیار تو اسے سونپنا ہی تھا۔ کیونکہ یہ خالصتاً عورتوں کا شعبہ تھا۔۔۔ اس کے باوجود وہ بہت سے شبہات کا شکار تھے۔

اور معراج دین کی ساری فیملی سے ملنے کے بعد۔۔۔ خصوصاً خرم سے ملنے کے بعد ان کے یہ سارے شبہات دھل گئے۔۔۔ یہ خاندان ویسا ہی تھا۔۔۔ جیسے وہ لوگ خود تھے۔

نئی سوچ سے ہاتھ آگے بڑھا کے چلنے والے۔۔۔ مگر اپنے قدم اپنی زمین پہ مضبوطی سے جما کے کھڑے ہونے والے۔

دونوں بھائی اپنی اولادوں کے ساتھ اکٹھے بھی رہ رہے تھے اور ایک انفرادی خاندان کے طور پہ بھی زندگی بسر کر رہے تھے۔ خرم اکلوتا تھا۔۔۔ مگر اس کی تینوں بہنیں تعلیم یافتہ اور خوش گفتار تھیں۔۔۔ تقدیس کو وہ اچھی ہونے والی بھابی کے طور پہ نہیں، کسی دوست کے طور پر ڈیل کر رہی تھیں۔

گھر کی واحد بزرگ خاتون شوکت جہاں بیگم بھی بہت زیرک تھیں۔۔۔ بہت شفیق اور معتدل مزاج کی۔ اس نے تقدیس سے رضامندی لینے کے بعد یہ رشتہ اوکے کر دیا۔ شادی چھ مہینے بعد قرار پائی۔

☼ ☼ ☼

"یار! پہلے تو تم حسن کے ہوا کرتے تھے۔۔۔ شادی میرے ساتھ کیوں کر رہے ہو؟"

خرم نے وصی کے ہاتھ پہ ہاتھ مار کے کہا۔۔۔ دونوں اس وقت واک کرتے ہوئے مارکیٹ کی طرف نکلے تھے۔

"خدا کا نام لیں خرم بھائی۔۔۔ میں۔۔۔ اور آپ کے ساتھ شادی؟۔۔۔ مجھے کیا سمجھ رکھا ہے آپ نے؟" وہ کانوں کو ہاتھ لگانے لگا۔

"وہ مسکرا دیا۔۔۔ میرے ساتھ نہیں۔۔۔ مگر میری شادی والے دن تو کر رہا ہے نا شادی۔۔۔ تجھے کوئی اور دن نہیں ملا۔"

"اکیلے ڈوبنے میں کیا مزا۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ آپ کو بھی اکیلے ڈوبتے میں اداسی ہو گی۔۔۔ تو ہم بھی ڈوب جاتے ہیں صنم۔" اس نے مصرعے میں ردوبدل کیا۔

"ڈوبتے اڑتے سنا ہے کہ تیرا کسی سے دھانسو عشق بھی چلا تھا؟"

خرم کے ٹٹولنے پہ وصی کی وہ نمائشی مسکراہٹ ماند پڑ گئی جو پچھلے دو ڈھائی مہینوں سے اس نے کسی نقاب کی طرح اوڑھ رکھی تھی۔

"سنی سنائی پہ یقین نہیں کرتے۔" اس نے جھٹلانا چاہا۔

"پھر بھی یار! مجھ سے کیا پردہ۔" وہ تفصیل جاننے پہ مصر تھا۔

"بس ایسے ہی۔۔۔ غلط فہمی ہو گئی تھی سب کو۔"

اور اس سوال کے جواب کی تلاش میں تو وہ خود تھا، پچھلے کئی روز سے۔۔۔ کہ غلط فہمی اصل میں ہوئی کسے تھی۔۔۔ اسے؟ یا سوہا کو؟

کیا سوہا کو غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے؟

یا اسے یہ غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ سوہا سے محبت کرتا ہے؟۔۔۔ اور پتا نہیں۔۔۔ محبت کرتا ہے؟ یہ غلط فہمی تھی؟ یا۔۔۔ محبت نہیں کرتا۔۔۔ یہ غلط فہمی ہے؟

اور ہر بار اس سوال کے جواب میں اسے ایک سناٹا ملتا تھا۔۔۔ ایک ہولناک سناٹا۔۔۔ اور تب اپنے اندر کے اس سناٹے اور اس تاریکی سے گھبرا کے وہ بلند و بانگ قہقہے لگانے لگتا۔۔۔ اونچی آواز میں باتیں کرنے لگتا۔۔۔ کار کے ڈیک کا والیوم فل کر دیتا۔

اس کا بس نہ چلتا تو بلاوجہ ہارن پہ ہارن دیے جاتا۔۔۔ مگر یہ خالی پن تھا کہ بھرنے پا رہا تھا۔

"نام کیا تھا محترمہ کا؟" خرم کے سوال پہ وہ چونکا۔۔۔ پھر شرارت سے مسکرایا۔

"تقدیس۔۔۔ حیرت ہے۔۔۔ شادی کی تاریخ بھی طے ہو گئی ہے۔۔۔ اور آپ اپنی ہونے والی دلہن کا نام تک بھول گئے۔"

"تا دوست۔۔۔ میں جو پوچھ رہا ہوں اس کا جواب دو۔"

"یار! آپ کیا ہیں۔" بات کرتے کرتے اس کی نظر فاسٹ فوڈ اسپاٹ کے پاس کار پارک کرتی سوہا پہ پڑی۔۔۔ وہ وہیں جم گیا۔

"سوہا۔۔۔!" ایسا لگا جیسے مہینوں نہیں۔۔۔ بلکہ مدتوں بعد اس نے یہ نام لیا ہو۔

"او ہو۔۔۔ تو سوہا نام تھا محترمہ کا۔" مزید معلومات دیں کیا تھا۔ کون تھی؟۔۔۔ کلاس فیلو؟۔۔۔ یا کسی دوست کی ہمشیرہ؟ عموماً ایسی فلمی واردا تیں ایسی جگہ پہ ہوتی ہیں یا پھر پڑوس میں۔۔۔ لیکن ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ سوہا نام کی کوئی پڑوسن ہماری ہوتی اور میں اس سے ناواقف ہوتا۔۔۔ بھئی! خرم اس محلے میں بچپن اور لڑکپن گزرا ہے۔"

وہ خوش دلی سے کہتا ایک دکان کے باہر رکھے کرشوکیس میں سجے کھلونے دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔۔۔ جو اس کی کمزوری تھے۔ بچپن چلا گیا مگر کھلونوں سے اس کا لگاؤ ختم نہ ہوا تھا۔ لیکن وصی کا دھیان اس کی گفتگو کی جانب نہیں تھا۔۔۔ وہ مکمل طور پہ سوہا میں گم تھا۔۔۔ جو اب کار سے باہر نکل رہی تھی۔۔۔ وصی کو دیکھ کر ٹھٹکی۔

وصی تنگ گھٹنوں سے خاصی اونچی شرٹ۔۔۔ وہی ڈھیلی ڈھالی سلیولیس اور کھلے گریبان کا شیفون کا کرتا۔۔۔ دوپٹہ انگلیوں میں دبا سگریٹ۔۔۔ وہی چہرہ۔۔۔ پہ پہلی معصومیت کی جگہ ناچتی ہوئی وحشت اور چھائی ہوئی کرختگی۔

سگریٹ ہونٹوں تک لے جاتے ہوئے وہ چلتی ہوئی نے وہ کونٹر کی طرف متوجہ کر رہی تھی۔

"یار۔۔۔ اتنے عجیب عجیب کھلونے بننے لگے ہیں اب۔۔۔ کھلونے کم اور جنگی آلات زیادہ لگتے ہیں۔۔۔ ٹینک۔۔۔ لڑاکا طیارے۔۔۔ ریوالور۔۔۔ مجھے تو لگ رہا ہے کہ کھلونے کی دکان کے آگے نہیں۔۔۔ اسلحے کے ڈپو کے آگے کھڑا ہوں۔۔۔ دیکھنا

ذرا۔" یہ کہتے ہوئے خرم نے وصی کی جانب دیکھا تو چونک گیا۔۔۔ وصی کے چہرے پہ ویرانی ہی ویرانی تھی۔
"وصی!" گھبرا کر خرم نے اسے کاندھے سے پکڑ کر جھنجھوڑا۔ وہ ہڑبڑا کے خرم کو دیکھنے لگا۔ خالی خالی نظریں۔۔۔ دماغ ماؤف۔

"کیا ہوا ہے؟" جواب نہ ملنے پہ خرم نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا۔ کوئی فاسٹ فوڈ ٹیک اوے تھا۔ جہاں ایک لڑکی کسی ویٹر کو آرڈر نوٹ کروا رہی تھی۔

خرم کو وصی کی بدلتی کیفیت کی وجہ سمجھ میں نہ آئی۔

"سوہا۔۔۔!"

کسی لڑکی کے زور سے چلا کے متوجہ کرنے پہ جہاں سوہا نے پلٹ کر اسے ہاتھ ہلا کے جواب دیا۔۔۔ وہیں خرم بھی سارا معاملہ سمجھ گیا۔

"او۔۔۔ تو یہ ہے سوہا!"

اس نے مایوسی سے پہلے وصی کو۔۔۔ پھر سوہا کو دیکھا۔ وصی کے چہرے پہ اتنی ویرانی تھی کہ خرم کو خوف سا محسوس ہوا۔۔۔

دوسری جانب سوہا کو دیکھنے کے بعد خرم کو پھر سے خوف نے آن گھیرا۔

"کہیں خدانخواستہ یہ لڑکی وصی کی زندگی کی ساتھی بن جاتی۔ ہمارے گھر کی بہو۔۔۔ ہمارے خاندان کا حصہ تو؟"

سوہا کے موجودہ حلیے اور انداز کو دیکھنے کے بعد خرم کی یہ سوچ غلط نہیں تھی۔ ہاں اگر وہ اسے ان دنوں دیکھتا جب وہ وصی کی چاہت کے رنگ میں رنگی تھی۔۔۔ تو تب ضرور کچھ اور سوچتا۔ اس نے وصی کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔

"چلو۔۔۔ گھر چلیں۔۔۔"

وصی کسی معمول کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ خرم نے اس سے کوئی اور سوال نہ کیا۔۔۔ نہ سوہا کے بارے میں نہ اس کے ملنے کے بارے میں۔۔۔ نہ اس سے الگ ہونے کے بارے میں۔۔۔

○ ○ ○

سوہا کب سے کالج جانا چھوڑ چکی تھی۔۔۔ وہ تو پتا نہیں کیا کیا چھوڑ چکی تھی۔
جینے کی امنگ۔۔۔
جینے کا ڈھنگ۔۔۔
ہر قسم کی امید۔۔۔ ہر قسم کی توقع۔۔۔ بس جیے جا رہی تھی۔۔۔ جیسے خودرو جھاڑیاں بڑھتی جاتی ہیں۔
ربینا اسے دیکھ دیکھ کے کڑھتی رہتی۔ مگر فی الحال اسے ٹوکنے سے گریز کر رہی تھی۔۔۔ وہ اسے سنبھلنے کا موقع دینا چاہتی تھی۔ جانتی تھی۔۔۔ کہ ابھی کسی بھی قسم کی نصیحت یا روک ٹوک اسے برانگیختہ کر دے گی۔
سوہا نے دوبارہ وصی سے ملنے کی کوشش کی نہ کبھی رابطہ کیا۔۔۔ وہ جو خوفزدہ تھا کہ پتا نہیں وہ کیا کچھ کرے گی۔ منتظر ہی رہا کہ وہ اس کا گریبان تھام کر کوئی سوال کرے۔
وصی تو وصی اس نے تقدیس سے بھی ہر طرح کا تعلق منقطع کر رکھا تھا۔۔۔ اسی لیے اسے اچانک اپنے گھر پہ دیکھ کے حیران رہ گئی۔
"تم۔۔۔؟"
تقدیس نے مسکرانے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ وہ تو سوہا کو پہچاننے کی کوشش میں بھی ناکام ہو گئی تھی یہ وہ سوہا تو نہیں لگ رہی تھی۔ جس سوہا سے اس کی دوستی چند مہینوں میں سالوں کے یارانے کا سفر طے کر گئی تھی۔

سوہا تو اس سوہا سے کہیں زیادہ بدحال اور بگڑی ہوئی حالت میں تھی۔ جس سوہا کو اس نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اور جو کچھ اس کی دوستی کی وجہ سے اور کچھ وصی کی محبت اور توجہ کی وجہ سے بتدریج بدلتی گئی تھی۔
اس سوہا نے واپسی کا سفر بھی اتنی ہی تیزی سے طے کیا تھا۔ تباہی کے دہانے تک واپسی۔
سگریٹ نوشی سے سیاہ پڑے ہونٹ۔۔۔ بکھرے 'اجڑے' روکھے۔۔۔ بے رونق بال۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور متورم پپوٹے۔۔۔ جیسے بے شمار راتوں کے رت جگے کا اعجاز ہوں۔
رنگت جھلسی ہوئی۔ تقدیس کو حقیقتاً" دکھ ہوا۔۔۔

"کیسے آئی ہو؟" سوہا چاہنے کے باوجود لہجہ ایک حد سے زیادہ روکھا نہ کر سکی۔
"یہ کارڈ دینے آئی تھی۔" سات آٹھ ماہ کے تعطل نے اس دوستی کو کتنا پر تکلف کر دیا تھا۔
"میں وہی سوہا ہوں تقدیس جعفر محمود۔۔۔" سوہا نے تلخی سے کہا اور اپنے کمرے سے لاؤنج کا رخ کرتی ربینا اس بات پہ ٹھٹک کر رک گئی۔
"جسے تم نے ایک بار اپنی بہن کی شادی پہ بلانا گوارا نہیں کیا تھا۔ اسے اپنے خاندان کی ہتک سمجھی تھی تم۔۔۔ پھر اب کس لئے بلانے آئی ہو۔ میں وہی تو ہوں۔"
"نہیں سوہا۔۔۔! تم وہ نہیں ہو۔۔۔" تقدیس نے دکھ سے چور چور لہجے میں کہا۔
"بہت بدل گئی ہو تم۔۔۔ پہلے مجھے لگتا تھا لوگ تمہارے بارے میں بکواس کرتے ہیں۔۔۔ تم اندر سے وہ نہیں۔۔۔ جیسی سب کو نظر آتی ہو۔۔۔ اور پھر تم نے ویسا نظر آنا بھی چھوڑ دیا تھا۔ لیکن اب تم وہی لگنے لگی ہو۔۔۔ وہی۔۔۔ جیسا سب تمہارے بارے میں کہا کرتے تھے۔"
ربینا سنگ سی رہ گئی۔ اسے لگا یہ تقدیس نہیں ہے جو سوہا کے سامنے کھڑی ہے۔۔۔ یہ جعفر محمود ہے جو ربینا کی ذات کے پرخچے اڑا رہا تھا۔
"بہرحال۔۔۔ یہ کارڈ ہے۔۔۔ میری شادی کا۔ اگر میری خوشیوں میں شامل ہونا گوارا ہو تو آ جانا۔۔۔"
"کیوں اپنی خوشیوں کو نظر لگوانی ہے۔۔۔" سوہا نے اس کی پشت پہ زہر اگلا۔
"آئے گی۔۔۔ کیوں نہیں آئے گی۔ ضرور آئے گی۔" ربینا جلدی سے آگے بڑھی تو باہر نکلتی تقدیس کو رکنا پڑا۔
"السلام علیکم آنٹی۔۔۔!"
"وعلیکم السلام۔۔۔ بہت عرصے بعد نظر آئی بیٹا۔۔۔!"
"جی۔۔۔ وہ۔۔۔" تقدیس سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔
"شادی ہو رہی ہے تمہاری۔۔۔" ربینا نے کارڈ پہ نظریں دوڑائیں۔
"مسز اینڈ مسٹر جعفر محمود" پہ نظریں دوڑاتے ہی دل پہ گھونسا سا لگا تھا۔ بہت مشکل سے وہ مسکرائی۔۔۔ اور کھلے دل سے کہا۔
"مبارک ہو بیٹا۔۔۔! ضرور آئے گی سوہا۔" سوہا نے جز بز ہوتے ہوئے ربینا کو دیکھا۔
"لیکن ماما۔۔۔!"
"ایسے موقعوں پہ دوست ہی تو رونق بڑھاتے ہیں۔۔۔" ربینا نے اسے بات مکمل نہ کرنے دی۔
"آپ۔۔۔ آپ بھی۔۔۔ آئیے گا آنٹی!" محض مروتاً۔۔۔ منہ دیکھے کے لحاظ میں تقدیس نے ربینا کو بھی دعوت دے ڈالی۔ مگر اس کی ہکلاہٹ اور ہچکچاہٹ اندرونی کیفیت کا پتا دے رہی تھی۔
ربینا یوں مسکرائی جیسے اس کا بھرم بھی رکھ رہی ہو۔۔۔ اور اسے یہ بھی باور کرا رہی ہو جیسے اس کو کھلی دعوت کی حقیقت سے بخوبی آگاہ ہو۔ تقدیس خفت زدہ سی نظریں جھکا گئی۔
"ضرور آتی۔۔۔ دراصل اس دن میری کسی دوست کے ہاں بھی ایک اہم فنکشن ہے۔۔۔ وہ مس کرنا بھی ممکن نہیں۔۔۔ ورنہ ضرور شرکت کرتی تمہاری شادی کے فنکشن میں۔۔۔ ویسے بھی میری بڑی خواہش ہے تمہارے۔۔۔"

اس نے ذرا سا توقف کر کے "تمہارے والد" کو لبوں سے ادا ہونے سے روکا اور فقرہ کچھ یوں مکمل کیا۔
"تمہارے والدین سے ملنے کی۔"
"تو تم آؤ گی نا سوہا۔۔۔؟" تقدیس نے پوچھا تو سوہا کچھ سخت جواب دیتے دیتے رک گئی۔۔۔ رہنا نے اس کا ہاتھ بہت سختی سے دبایا تھا۔
"کیوں نہیں۔۔۔ میں خود چھوڑ کے جاؤں گی۔" اور اس کے جانے کے بعد سوہا نے بہت الجھ کر کہا تھا۔
"کیوں جاؤں میں وہاں۔۔۔ کس منہ سے اب مجھے بلانے آئی تھی۔۔۔ کیوں اس دو ٹکے کی چڑیل کے چھینٹے دینے آئی تھی یہ۔۔۔ ویسے بھی میرا کہیں جانے کو دل نہیں چاہتا۔۔۔ خصوصاً" ان جیسوں کے ہاں تو بالکل بھی نہیں جو دوغلے۔۔۔ منافق لوگ۔۔۔ وہ وصی۔۔۔ اس کی فیملی بھی تو ایسی تھی۔۔۔ اس کی فیملی جیسی۔۔۔ کہاں پسند کریں گے یہ مجھے۔۔۔ بڑے مان سے دعوت دینے آئی ہے۔ تب چھپاتی پھرے گی مجھے۔۔۔ ہونہہ۔۔۔ جہاں عزت نہ محبت۔۔۔ وہاں کیا کرنے جاؤں میں۔۔۔ میں لعنت بھی نہیں بھیجنا چاہتی ایسے کھوکھلے شریف زادوں پہ۔۔۔"
"بھیجو۔۔۔ لعنت تو ضرور بھیجو۔" رہنا کے سرد لہجے میں بھری سوہا ٹھٹکی۔
"جن کے پاس تمہارے لیے سوائے ملامت کے کچھ نہ ہو، ان پہ کم از کم لعنت تو بھیجو۔۔۔ تم ضرور جاؤ گی اس کی شادی میں۔۔۔ نہ صرف شادی پہ۔۔۔ بلکہ ہر فنکشن پہ۔۔۔ اور کوئی ضرورت نہیں خود پہ کوئی لبادہ۔۔۔ کوئی نقاب ڈالنے کی۔۔۔ جیسی ہو۔۔۔ ویسے جاؤ۔۔۔ فخر سے بتاؤ سب کو۔۔۔ کہ تم رہنا کی بیٹی ہو۔۔۔ کیا تمہیں اس پہ شرم محسوس ہوتی ہے؟"
"نہیں۔۔۔ شرم تو مجھے وصی اور تقدیس جیسے دوستوں پہ اعتبار کرنے کے خیال سے آتی ہے۔"
"تو اب انہیں شرم سے منہ چھپانے دو۔۔۔ جس دوستی سے انہوں نے دامن جھٹک کر پیچھا چھڑایا ہے۔ اس چند روزہ دوستی کا مزہ تو چکھنے دو انہیں۔۔۔ وہ ہنگامہ مچانا۔۔۔ وہ طوفان اٹھانا اس کی شادی پہ کہ ساری عمر اسے یاد رہے کہ روٹھے منہ کس کو بلانے آئی تھی۔۔۔"
بات سوہا کی سمجھ میں آ گئی۔

☼ ☼ ☼

"آپ کسی کے ساتھ جا رہی ہیں؟" وصی نے چادر اوڑھتی پروین سے پوچھا۔
"حسان کے ساتھ۔۔۔ حسن کے ساتھ جانا چاہتی تھی کہ وہ بڑا ہے۔۔۔ ایسے موقعوں پہ تو ہم کسی وقتوں میں برادری کی ساری عورتیں لے کر جایا کرتے تھے۔۔۔ آخر شگنوں کے لہنگے کا ناپ لینا ہوتا تھا۔۔۔ رسم ہوتی ہے یہ بھی۔۔۔ لیکن اماں جان کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔۔۔ اب ہر بات پہ انہیں ساتھ لیے لیے پھرنا مناسب نہیں لگتا۔۔۔ رخشندہ بھابی کو ساتھ جانے کا ارادہ تھا۔۔۔ ندا کو بھی بلاوا بھیجا تھا۔۔۔ لیکن ندا کا آج لیڈی ڈاکٹر سے ملنے کا وقت تھا۔۔۔ رخشندہ بھابی اسی کے ساتھ گئی ہے اور حسن۔۔۔ وہ تو ویسے ہی خار کھاتا ہے وہاں جانے کے نام سے نجانے ماموں نے کون سی بھینس کھول لی ہے اس کی۔" وہ پرس میں نوٹ گن کے رکھتے ہوئے بے زاری سے کہہ رہی تھیں۔
"حسان ساتھ جا رہا ہے نہ بس۔۔۔ اکیلے بھی تو جانا مناسب نہیں لگتا۔"
"میں چلوں ساتھ؟"
وہ بے قراری سے بولا تو پروین چونک گئیں۔۔۔ غور سے اسے دیکھا۔۔۔ وہاں جانے کے لیے ایسے والہانہ پن اور بے تابی کا اظہار اس کی جانب سے اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔
"تم کیا کرو گے؟" وہ حیرت اور ناگواری کے دبے دبے اظہار کے ساتھ دریافت کرنے لگیں۔
"وشمہ کی چوڑیوں کا ناپ لینے جا رہے ہیں۔۔۔ تمہاری کیا ضرورت ہے وہاں۔۔۔"
"میں۔۔۔ ویسے ہی۔۔۔ حسان بھی تو جا رہا ہے۔۔۔ اس کے بہانے میں لے چلتا ہوں۔۔۔" پروین نے چند ثانیے بغور اسے دیکھا۔

ایک عجیب سا اضطراب اس کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہا تھا جسے وہ کوئی نام نہ دے سکیں۔
"چلو۔"
"اجازت دے کر وہ مڑیں۔۔۔ مگر موڈ آف ہو چکا تھا۔۔۔ ان کا خیال تھا شاید وصی وشمہ سے ملنے کی تڑپ کے ساتھ کھنچا چلا آ رہا ہے۔
وہ اتنی تنگ نظر نہیں نہ دقیانوسی خیالات کی مالک۔۔۔ ویسے بھی اب ایک دو ہفتے میں وشمہ اور وصی دونوں رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے والے تھے۔۔۔ لیکن وشمہ کے معاملے میں ایسی دل میں گرہ پڑی تھی۔۔۔ جو نکلنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔۔۔ بڑے بجھے دل کے ساتھ وہ اس کا ناپ لینے گئیں۔

☼ ☼ ☼

جب سے اس نے سوہا کو اسی پرانے رنگ ڈھنگ میں دیکھا تھا۔۔۔ دل کا عجیب سا حال تھا۔۔۔ کسی ایک رات کی نیند اس نے پوری نہیں پائی تھی۔۔۔ کسی ایک وقت کا کھانا اس نے رغبت سے نہیں کھایا تھا۔
کسی ایک بات پہ بھی اس کے لب کھل کے نہیں مسکرائے تھے۔
جس کا بھلا کرنے چلا تھا۔۔۔ اسے ڈبو آیا۔۔۔ اس کا ہاتھ تھام کے اسے دلدل میں دھنسنے سے بچانے چلا تھا۔۔۔ خود کھائی میں۔۔۔ دونوں ہاتھوں سے دھکا دے آیا۔۔۔ بہت ظلم کیا میں نے اس پہ۔۔۔ بہت ظلم۔۔۔ پتا نہیں اللہ مجھے معاف کرے گا یا نہیں؟۔۔۔ پتا نہیں وہ مجھے معاف کرے گی یا نہیں؟۔۔۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی جو یہ دکھ سہ جاتی۔۔۔ وہ تو محبت کو ترسی ہوئی۔۔۔ ازل سے پیاسی لڑکی تھی۔۔۔ اس کے آگے بھرا جام رکھ کے۔۔۔ آس لگا کے واپس اٹھا لینا۔۔۔ نہیں، یہ نہیں کرنا چاہیے تھا مجھے۔۔۔ میں اس کی آہ لے کر۔۔۔ اس کی بددعائیں سمیٹ کر کیسے زندگی کے نئے دور میں قدم رکھ سکتا ہوں۔۔۔ میں اپنے ساتھ ساتھ وشمہ کو بھی ان بددعاؤں میں جھونک رہا ہوں۔"
ہر رات ملامت اور خود اذیتی کا یہ سلسلہ جاری رہتا۔۔۔ سونے کے لیے آنکھیں بند کرتا۔۔۔ تو سوہا کا چہرہ پتلیوں میں گھوم جاتا۔
اس بے قرار کو حاصل کرنے کے لیے کوئی راہ نہ سجھائی دے رہی تھی۔۔۔ پھر جب پروین کو وشمہ کے ہاں جاتے دیکھا تو اسے دھیان بٹانے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہو گا۔۔۔ وہ جب سے وشمہ سے اس بندھن میں بندھا تھا۔۔۔ اس نے اس انداز سے سوچنے کی فرصت ہی نہیں پائی۔۔۔ جیسے کہ اس نازک بندھن کا تقاضا تھا۔۔۔ یہ خیال تو ابھی ابھی ذہن میں آیا تھا کہ سوہا سے ذہن ہٹانے کے لیے وشمہ کا سہارا بھی بہت ہو سکتا ہے۔۔۔ اتنا احساس تو اسے تھا کہ وہ اتنا ... اور لیا دیا رویہ وشمہ سے روا رکھتا تھا لیکن وہ ضرور اس کے بارے میں نازک احساسات رکھتی تھی۔
یہ تو اس کی ہر اس نظر سے واضح ہو جاتا تھا جو وہ وصی پہ کبھی ڈالتی تھی۔۔۔ ہاں وصی اس کا اندازہ نہیں لگا سکتا تھا کہ اس کے دل میں یہ جذبات منگنی ہو جانے کے بعد پیدا ہوئے ہیں یا پہلے سے تھے۔
"اب اس رشتے سے بندھ جانے کے بعد وہ سادہ دل لڑکی مجھ سے محبت کرنے لگ سکتی ہے تو مجھے اس سے کیوں نہیں ہو سکتی؟ ضرور ہو سکتی ہے۔۔۔ میں نے کبھی کوشش ہی نہیں کی۔۔۔ کبھی نظر بھر کے اسے دیکھا نہیں۔۔۔ کیا کمی ہے اس میں۔۔۔ ہاں۔۔۔ ضرور ہو گی۔۔۔ مجھے اس سے محبت ہو گی۔۔۔ میری محبت پہ سب سے پہلا حق اسی کا ہے۔"
خود کو تسلی دیتا وصی یہ سوچ رہا تھا۔ اور اس کا دل منہ چھپا کے اسی پہ ہنس رہا تھا۔
محبت کوشش کرنے سے نہیں ہوتی۔۔۔ نہ کسی کو نظر میں رکھنے سے ہوتی ہے۔۔۔ نہ کبھی اس سے ہوتی ہے۔۔۔ محبت تو نقب زن ہے۔۔۔ محبت تو رہزن ہے۔۔۔ یہ ہمیشہ چور راستوں سے آتی ہے۔۔۔ یہ ہمیشہ وہاں آتی ہے جہاں اس کے پل بھر ٹھہرنے کی توقع نہ ہو۔"

☼ ☼ ☼

وشمہ کے گھر والے زمین پہ نہ ٹک رہے تھے۔۔۔ منگنی کے بعد پہلا موقع تھا کہ وصی یوں آیا تھا۔۔۔ اور پروین تو شاید کبھی

نہ بتاتیں۔ حسان نے ہنستے ہنستے بتا دیا تھا کہ وصی کس طرح اصرار کر کے ساتھ آیا تھا۔ اور وشمہ کے اندر دور تک پھول ہی پھول کھل گئے تھے۔

اس کا اپنا چہرہ بھی کسی پھول کی مانند کھلا ہوا تھا... پروین نے نظر بھر کے دیکھا تو ان کے اندر کی خفگی جیسے پل بھر میں ڈھل گئی۔

"ماشاء اللہ۔" وہ زیر لب کہہ کے رہ گئیں۔

اور وصی نے ایک نظر تو کیا۔ دوسری۔ تیسری۔ چوتھی نظر تک ڈال کے دیکھی۔ وہ دل ربا بکش سا چہرہ جو دل میں نہ اترتا تھا نہ اترا... وہ پتھرائی نگاہیں وشمہ کے سراپے پہ ڈالتا رہا۔ اور سوہا کی شبیہہ اس کی روح میں شگاف اور دراڑیں ڈالتی رہی۔ وحشت زدہ سا ہو کر وہ چائے کا ایک ہی گھونٹ لینے کے بعد میز پہ پٹخ کر کھڑا ہو گیا۔

"کیا ہوا بیٹا؟" منزہ جو گاجر کا حلوہ اس کے سامنے کر رہی تھی حیرت سے پوچھنے لگی۔

"جی۔ وہ۔ میں ابھی آیا۔" وہ فوراً باہر نکلنے لگا۔

"وصی۔!" پروین نے پیچھے سے پکارا... مگر وہ ان سنی کرتا باہر نکل چکا تھا۔

پروین نے منزہ کی سوالیہ نظروں سے خائف ہو کر نظریں چرائیں اور کمزور لہجے میں وضاحت پیش کی۔

"کوئی ضروری کام یاد آ گیا ہو گا۔"

منزہ نے انہیں تو کچھ نہ کہا البتہ کمرے میں موجود وشمہ سے جا کر یہ ضرور کہا۔

"اچھا بھلا بیٹھا تھا وصی۔ پروین نے نجانے کس بات پہ گھور کے تنبیہہ وتی نظروں سے دیکھا کہ بے چارہ اٹھ کے ہی چلا گیا۔"

اور وشمہ نے فوراً یہی سوچا کہ پھپھو کو وصی کا یہاں آنا... خصوصاً اس سے ملنے کی خواہش لے کر ملنا پسند نہیں آیا۔ اس کے اندر کڑواہٹ پھیل گئی۔

✡ ✡ ✡

تیزی سے کار لے جاتی سوہا کو یونہی وہم سا ہوا کہ فٹ پاتھ پہ کھڑی وہ تقدیس ہے... اسے اچنبھا ہوا۔ وہ تو ہمیشہ اپنی گاڑی پہ آتی جاتی تھی۔ دو، دو گاڑیاں بمعہ ڈرائیور کے اس کے باپ نے صرف بیٹیوں کو لانے لے جانے کی غرض سے رکھ چھوڑی تھیں۔

سوہا نے بریک لگائے اور بیک ویو مرر میں غور سے دیکھا۔ وہ تقدیس ہی تھی۔ اس نے کار ریورس کی اور اس کے پاس لے جا کے روکی۔

"تقدیس۔! کیا کر رہی ہو یہاں؟"

"ہوں۔" وہ بری طرح چونکی۔ پھر سوہا کو دیکھ کے اس کی جان میں جان آئی۔

"اوہ۔ تم۔"

"یہاں کیوں کھڑی ہو؟ بس کا ویٹ کر رہی ہو؟"

"نہیں۔ بس وغیرہ کے روٹ کا کہاں پتا ہے مجھے۔ رکشہ، ٹیکسی جو بھی مل جائے۔"

وہ کافی نروس اور پریشان لگ رہی تھی۔ سوہا جو ایسے ہی کسی موقعے کی تلاش میں تھی۔ زیر لب مسکرائی۔

"کار اور ڈرائیور کہاں گئے تمہارے؟"

"کب سے فون کر رہی ہوں اسے۔ مگر ڈرائیور کا موبائل نمبر آف مل رہا ہے... دراصل میری پوزیشن اپائنٹمنٹ تھی۔ ڈرائیور مجھے ڈراپ کر کے ماما کو نیلم کے پاس لے جانے والا تھا، لیکن پوزیشن کو کسی وجہ سے ڈراپ کرنا پڑا۔ اس کے گھر میں کوئی ایمرجنسی ہو گئی۔ کوئی سیریس بات لگ رہی ہے، جب بھی اس نے کبھی چھٹی نہ کی۔"

"گھر پہ فون نہیں کیا؟"

"نہیں۔ ماما کا تو تمہیں پتا ہے کہ پریشان ہو جائیں گی اور پاپا کو کیا تو وہ الٹا ڈانٹنے لگیں گے کہ ڈرائیور کو جانے کیوں دیا۔"

"بیٹھو۔ میں ڈراپ کر دیتی ہوں۔"

"نہیں۔ میں۔"

"بیٹھ جاؤ تقدیس! آخر او مت۔ گھر پہ ہی ڈراپ کروں گی۔"

سوہا نے سنجیدگی سے کچھ ایسے کہا کہ تقدیس شرمندہ ہو کے رہ گئی۔ اور مزید کچھ کہے بغیر چپ چاپ اس کے برابر بیٹھ گئی۔

✡ ✡ ✡

"مجھے تو یہ مہندی وغیرہ کی رسمیں فضول لگتی ہیں۔ مگر امی کا اصرار ہے۔"

"قوال اور تو ازن کے ساتھ ہوں تو رسمیں بری نہیں ہیں یار!" خرم کے پرانے دوست نے اس سے کارڈ لیتے ہوئے کہا۔

"امی اور باجیوں کو بھی لانا... رضوانہ باجی اور سدرہ باجی کے کارڈ الگ سے لایا ہوں۔"

"ضرور جناب! آج شام کو ہی بھجوا دوں گا۔"

بات کرتے کرتے اس کی نظر سامنے پلازہ کے پارکنگ میں رکتی کار پہ پڑی... وہ کارڈ سے توجہ ہٹا کے وہیں تکنے لگا۔ خرم نے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا۔

وہ تھی... اس دن والی لڑکی... جس کا تعارف وصی نے سوہا کہہ کر کروایا تھا... اور جس کے بعد وہ اس طرح الجھا تھا کہ چاہنے کے باوجود خرم کوئی اور سوال نہ کر سکا تھا۔

وہ کار سے نکلی۔ پیر کی ٹھوکر سے دروازہ بند کیا... حسب سابق سگریٹ ہونٹوں میں دبا تھا اور وہ بے حد لاابالی اسٹائل سے کش لگاتی پلازہ کی بیسمنٹ کی جانب جا رہی تھی۔

"لگیا تو ہمارے محلے کا لگتا ہے۔" خرم کا دوست بے حد مکدر لہجے میں بڑبڑایا۔

"کیا کہا تم نے؟" خرم نے چونک کر استفسار کیا۔

"یہی۔ واہیات کپڑوں والی۔ سگریٹ پیتی سیڑھیاں اتر رہی ہے جو۔"

"تم جانتے ہو اسے؟"

"اسے کون نہیں جانتا... آدھے سے زیادہ شہر واقف ہے اس کی آوارگیوں سے... طوائف زادی ہے۔"

"زادی؟" خرم نے سرے سے الجھ گیا۔

اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وصی جیسے سیدھے سادے لڑکے کی کہانی اس طوائف زادی سے کیسے ٹکرائی۔

"ان لوگوں نے اب ہر علاقے میں گند پھیلا رکھا ہے۔ پورا علاقہ تنگ ہے اس قسم کے لوگوں سے۔ شریف اور خاندانی لوگ جائیں تو کہاں جائیں... ہر جگہ یہ گھسے ہوئے ہیں اور اچھی بھلی خاندانی لڑکیوں کو بھی اپنی راہ پہ لگائے ہوئے ہیں۔ اب اسے ہی دیکھ لو۔ اس کی سہیلی کیسی شکل سے سیدھی سادی شریف سی۔ معصوم سی لگ رہی ہے۔ مگر یہ تو اس کے ساتھ ہے۔ اس کے جیسی ہی ہو گی۔"

خرم نے تب پہلی بار کار کے اندر بیٹھی تقدیس کو ذرا توجہ سے دیکھا... اور اس کے اندر جھماکا ہوا۔ اس شکل کو بھلا وہ کیسے فراموش کر سکتا تھا...

اس صورت کو تو آج کل دن رات دیکھا کرتا تھا... آنکھوں میں ان گنت سپنے سجا کے۔

جس کی تصویر اسے رخشندہ نے دی اری تھی... اور پہلی نظر اس پہ ڈالتے ہی وہ اس کے حسن ظن کا قائل ہو گیا۔ وہ بہت حسین... بہت دلکش نہیں تھی مگر کوئی بات تھی ضرور اس میں... جو سادہ سی مسکراہٹ اور معصوم آنکھوں والا یہ چہرہ دل میں اترا جاتا تھا۔

اس چہرے کو وہ کیسے نہ پہچانتا۔

"میں کیا کروں گا جاکے؟"

وہ بہت الجھا ہوا تھا۔ ابھی کل شام اس نے تقدیس کو اس کار میں اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا اور اب تک کوئی فیصلہ نہ کر پا رہا تھا کہ یہ نظروں کا دھوکا تھا یا کسی قسم کا ابہام اور آج اس کی مہندی کی تقریب تھی۔ رخشندہ اسے ساتھ جانے کے لیے کہہ رہی تھیں۔

"مہندی پہ لڑکے کا ساتھ جانا ہمارے ہاں کا رواج ہے بھی نہیں۔ لیکن صبح ہی سب نے یہ طے کیا ہے کہ نکاح کی ادائیگی آج ہی کر دی جائے۔"

"کیوں۔ کیا میں کہیں بھاگا جا رہا ہوں۔" وہ بات بے بات چڑ رہا تھا۔

"خدا نخواستہ۔" رخشندہ دہل گئیں۔

"یہ صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ کل کا فنکشن وقت پہ ختم ہو جائے۔ بارات کے جاتے ہی دوسری چھوٹی موٹی رسمیں ہوں اور کھانے کے فوراً بعد رخصتی ہے۔"

"اوہ، امی پلیز۔" خرم بے بس سا ہوا تھا۔ کل سے جس الجھن کا شکار تھا سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا ذکر کس سے کرے۔ کبھی دل چاہتا۔ وصی کو اعتماد میں لے۔ لیکن وصی خود اتنا بکھرا بکھرا شکستہ سا نظر آ رہا تھا ان دنوں کہ اس سے سوہا کا ذکر کرنا اس کے زخموں پہ نمک چھڑکنے کے مترادف ہو گا۔

"اچھا، شاباش تیار ہو جاؤ جلدی سے۔ اچھا ہے اس بہانے مہندی کا فنکشن بھی وقت پہ ختم ہو جائے گا ورنہ کب ہم وہاں سے واپس آتے کب وہ لوگ آ کے تمہیں مہندی کی رسم کراتے۔"

"آپ کو صرف وقت کی بچت کی پڑی ہے۔"

"ہاں تو اچھا ہے نا۔ امی تو سمری ہیں۔ چھوٹے چھوٹے بچے ساتھ ہیں۔ جلدی تیار ہو جاؤ سب انتظار کر رہے ہیں تمہارا۔" وہ بے دلی سے راسلک کا کرتا ہاتھ میں لیے اسے دیکھتا رہا۔

سوہا کو یہاں آنے کے بعد یکے بعد دیگرے کئی جھٹکے لگے تھے۔ پہلا جھٹکا اسے وصی کو دیکھ کے لگا۔

اسے نہیں پتا تھا کہ تقدیس کی شادی وصی کے خاندان میں ہو رہی ہے۔

دوسرا جھٹکا اسے منزہ کو دیکھ کے لگا۔ جو شمہ کے ساتھ فنکشن میں موجود تھی۔

اتنا تو وہ جانتی تھی کہ منزہ میں اور وصی کی منگنی میں کیا رشتہ ہے۔ مگر یہ نہیں پتا تھا کہ یہ رشتہ وصی اور شمہ کے حوالے سے ایک نیا رخ اختیار کر چکا ہے۔ جیسے ہی کسی کے توسط سے یہ حقیقت اس پہ واضح ہوئی اس کے اندر کھولن تیزابی سی ہو گئی۔

منزہ۔ جس کی کیفیت عرصے بعد سوہا کو سامنے پا کے عجیب سی ہو رہی تھی۔ اب اس سے چھپتی پھر رہی تھی۔ کہاں تو اسے سامنے پا کے ایک بار کو دل اس سے گلے لگانے کو مچل رہا تھا اور کہاں اب وہ کتراتی ہوئی نظریں چرا رہی تھی۔ وجہ سوہا کا حلیہ اور دانستہ کی جانے والی حرکتیں تھیں۔ جن کی خاص تیاری وہ کر کے آئی تھی رمیز کے مشورے سے اس نے اس شادی میں تماشا لگانے کا سوچا ضرور تھا۔ مگر اب وصی، منزہ اور شمہ کی وجہ سے صرف تماشا نہیں بلکہ ڈرامہ کرنے کے موڈ میں آ گئی۔

لباس تو وہ پہلے ہی خاصا قابل اعتراض پہن کے آئی تھی۔ ستم یہ کہ کوئی بھی مسلسل [illegible] کسی معمولی سی بات پہ اس نے تقدیس کے ہونے والے خرم کے شوہر کا گریبان پکڑ لیا اور ایک کے بعد ایک [illegible] دینے لگی۔

اسے خود بھی احساس نہیں رہا تھا کہ وہ کیا کر رہی ہے۔ بس اتنا محسوس ہو رہا تھا کہ ایک لاوا سا [illegible] اندر ابل کے باہر گر رہا تھا۔

کچھ لوگ حق دق سے دیکھ رہے تھے۔

کچھ لوگ مزا لینے کے سے انداز میں۔

مدیحہ یہ جاننے کے بعد کہ یہ تقدیس کی دوست ہے اور اسی کی دعوت پہ آئی ہے۔ اپنے سر پہ [illegible]

با پھر رہی تھی۔

جعفر محمود کا بس نہ چل رہا تھا اس چند فٹ کی چھوکری کو اٹھوا کے باہر پھینک دے۔ اس نے سیکورٹی کو بے انتہائی سخت الفاظ میں کچھ کہا۔

منزہ کی نظریں پاؤں پر گڑی جا رہی تھیں۔ کیونکہ یہاں موجود سب لوگ نہ سہی۔ مگر چند ایک تو تھے جو جانتے تھے کہ وہ اس کی بیٹی ہے۔

پروین۔ ندا اور شوکت جہاں بیگم تاسف کے ساتھ ساتھ شکرانے کا اظہار بھی کر رہی تھیں کہ خدا نے انہیں ایسا تماشا اپنے گھر میں لگوانے کی ذلت سے بچا لیا۔

اور تقدیس مایوں کے جوڑے میں سر جھکائے بیٹھی اس وقت کو کوس رہی تھی جب پرانی دوستی کے لحاظ میں بلا بیٹھی۔ اس کے ساتھ ساتھ وہاں سے ہونے والی متوقع عزت افزائی کے لیے بھی خود کو تیار کر رہی تھی۔

خرم ہاتھ میں قلم لیے۔ نکاح نامہ سامنے رکھے سوچ رہا تھا کہ اب کون سا موقع ہے اس سے بچنے کا۔ اس نے صبح ہی دل کڑا کر کے یہ فیصلہ کر لیا ہوتا تو آج زندگی میں اس لڑکی کو شامل نہ کرنا پڑتا۔ جو ایسی صحبت اختیار کر رہی ہے اور کون جانے۔ اس کی اپنی ذات میں اس کی اس دوست کے کون کون سے رنگ شامل ہیں۔

ان سب سے الگ۔ ایک کونے میں کھڑا وصی پتھرائی نظروں سے دو سیکورٹی گارڈز کو سوہا کو کھینچتے ہوئے ہال سے باہر لے جاتے دیکھ رہا تھا۔

"یہ ہے کون؟"

کسی نے بہت نزدیک کھڑے ہو کر سوال کیا تھا اور منزہ بے ارادہ ہی چند قدم آگے بڑھ گئی تھی۔ حالانکہ سوال پوچھنے والے نے اسے مخاطب نہیں کیا تھا لیکن اسے لگا۔ جواب وہ دے۔

"یہ نہیں کیسے ماں باپ ہوتے ہیں۔ پیدا تو شوق سے کر لیتے ہیں۔ تربیت کرنا بھول جاتے ہیں۔"

اب وہ جہاں کھڑی تھی وہاں ایک عورت بے حد تنفر سے یہ تبصرہ کر رہی تھی۔ بڑے عرصے بعد منزہ کی یادوں پر پڑی بھولی بسری آواز نے دستک دی۔

"کہا ہے منزہ ہم اپنی سوہا سے جتنا لاڈ پیار کریں گے اس سے کہیں زیادہ توجہ اس کی تربیت پر دیں گے۔ میں نہیں چاہتی کہ جو دیکھے وہ بے اختیار کہہ اٹھے کہ یہ کسی سمجھدار اور تعلیم یافتہ ماں کی گود سے نکلی ہے۔ میرے گھر والے جو ابھی میرے انتخاب پہ مجھ سے نالاں ہیں قائل ہو جائیں کہ ایک اچھی نسل کی تشکیل کے لیے ایک اچھی شریک حیات کا ہونا کتنا ضروری ہے۔"

وہ گھبرا کے کرسی پہ بیٹھ گئی۔ اس کا جسم پسینے میں بھیگ رہا تھا اور ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو رہے تھے۔

پروین نے دور سے اس کی یہ حالت دیکھی۔ مگر اپنے دل میں کسی قسم کا ترحم محسوس نہ کیا۔ حالانکہ وہ جانتی تھی کہ منزہ بلڈ پریشر کی مریضہ ہے۔

"وہ کیا اپنا دیا ہوا کاٹتا ہے۔ میں تو سمجھتی تھی بھائی کی تربیت ہی خراب ہے۔ یہ نہیں پتا تھا کہ خون بھی گندہ ہے جس نے ان کی گود میں پرورش پائی۔ اس کا بھی ستیاناس کیا اور جسے گود سے دور کیا۔ اس میں بھی اپنا رنگ دکھایا۔"

اس سے پہلے پروین نے کبھی اس انتہا پہ جا کے منزہ کے خلاف کچھ نہیں سوچا تھا۔

☆ ☆ ☆

[illegible] بے حد خوف زدہ نظروں سے جعفر محمود کو دیکھ رہی تھی جس کا چہرہ ضبط کی کوشش میں نقوش کھو رہا تھا۔ [illegible] کی نزاکت کا خیال نہ ہوتا تو وہ اتنے اندھیرے سوچوں میں نہ گھری ہوتیں تو یقیناً وہ ابھی سارے حساب بے باک کر لیتا۔

اور اس نے اسٹیج پہ بیٹھے خرم کی جانب دیکھا۔ جس کا چہرہ خطرناک حد تک سپاٹ تھا۔ اس کا ہاتھ جس میں قلم

تھاما ہوا تھا وہ ساکت تھا۔ نکاح خواں بھی نکاح کی کارروائی روک کے ایک ایک کا منہ تک رہا تھا۔ جعفر رستے مدد کے نظروں کے تعاقب میں وہاں دیکھا اور جیسے یکدم ہوش میں آگیا۔ تیزی کے ساتھ وہ اسٹیج کی جانب بڑھا۔

"مسولانا۔ آپ نکاح شروع کیجیے۔ یہ تو ایسے ہی....."

پہلی بار ہدیحہ نے اس کے اکھڑ اور بے نیاز لہجے میں معذرت خواہانہ رنگ گھلتے دیکھا۔

معراج دین خود تین تین بیٹیوں کے باپ تھے' جعفر محمود کے دل کو لاحق خدشات کو اچھی طرح بھانپ سکتے تھے۔ انہوں نے خرم کے کاندھے پہ ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ ڈالا۔

"بسم اللہ کرو۔"

اور خرم نے دستخط کردیے۔

○ ○ ○

"تمہیں تو خوش ہونا چاہیے سوہا! تم نے اپنی بے عزتی کا بدلہ لے لیا ہے۔"

ریناا سے روتا بلکتا دیکھ کے تسلی دے رہی تھی۔

"مجھے تو یہ نہیں پتا کہ مجھ سے کس بات کا بدلہ لیا گیا ہے۔" اس کی ہچکیاں بندھ گئی تھیں۔

"اگر پاپا کی ڈیتھ ہوگئی تو کیا یہ میرا قصور تھا؟ ہر ایک کی زندگی سیٹ ہوگئی۔ سب اپنے اپنے مدار میں لوٹ گئے ان کے جانے کے بعد..... لیکن ان کے جانے کی سزا میں نے اکیلے بھگتی۔ کیا ماما کی دوسری شادی میں نے کرائی تھی..... پھر ان کی خوشیوں کے لیے میری ذات ہی کیوں بھینٹ چڑھائی گئی؟"

"اب..... ان سب باتوں..... میرا مطلب ہے اس دل دکھانے والے ذکر سے کیا حاصل.....؟"

ہمیشہ کی طرح یہ معاملہ ایسا تھا جس پہ رینا بے بس ہوجاتی تھی۔ چاہ کے بھی وہ اس کے ذہن سے یہ محرومی نہیں نکال پائی تھی' اس کا ادراک اسے بے دست و پا ہونے کا احساس دلا دیتا تھا۔

"حاصل..... حاصل..... حاصل.....!" وہ حلق پھاڑ کے چلائی۔ "اس سے پہلے میں نے زندگی میں کیا حاصل کرلیا ہے۔ جو دل کی ذرا سی بھڑاس نکالنے سے پہلے بھی یہ سوچوں کہ اس سے مجھے حاصل کیا ہوگا۔"

"ہاں..... نکال لو دل کی بھڑاس..... اگر اتنا تو سوچو تمہاری ماں کا دل تمہاری کڑواہٹ سے مسلا جارہا ہے۔"

رینا نے آنکھوں میں آنسو بھر کے اس کا چہرہ ہاتھوں میں تھامنا چاہا۔ مگر اس نے بری طرح جھٹک دیا۔

"کوئی نہیں ہے میری ماں..... میں کسی کی اولاد نہیں۔"

ایک لمحے کے لیے رینا کی رگوں میں دوڑتے خون میں ریت سی گھل گئی۔ جھکتے نگاہ شریانوں میں.....

"سوہا....." وہ کراہی۔

"غلط نہیں کہہ رہی ہیں۔ مجھے اس لفظ سے ہی خوف آنے لگا ہے اب..... ماں....." اس نے استہزائیہ ہنکارا بھرا۔ "وہ سب حکایتیں..... وہ ساری کہانیاں جو ممتا کے متعلق مشہور ہیں۔ سب ایک فریب ہے۔ ایک جھوٹ تھی ہیں مجھے۔"

"سوہا.....! میں..... میں نے کچھ نہیں کیا تمہارے لیے..... ؟ میری ممتا ایک جھوٹ ہے؟ فریب ہے؟ ماؤں سے خوف آتا ہے تمہیں.....؟"

رینا کی رنگت زرد پڑ گئی۔ مگر سوہا کو کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔

"مائیں ایسی ہوتی ہیں..... ؟ یہ کرتی ہیں اپنی اولاد کے ساتھ..... ؟ جیسا میری ماں نے کیا۔ صرف اپنے عیش و آرام کے لیے اس نے پہلے مجھے دربدر کیا اس کے بعد اپنے نام نہاد سہاگ' اپنے اس خود غرض حسن شوہر کو خوش کرنے کے لیے میرے حصے کی ساری محبت اس کی بیٹی پہ لٹائی۔ پھر اس بیٹی کو خوش کرنے کے لیے میرا نصیب بھی اس کے نام لکھ دیا۔ آپ کو پتا ہے تقدیس کی شادی جس شخص سے ہورہی ہے وہ میرا فرسٹ کزن....."

"اوہ.....!" رینا اپنے تئیں معاملے کی تہہ تک پہنچ گئی۔

"ہاں..... اور وہ صرف تقدیس کی مہندی کا فنکشن نہیں تھا' وصی کی مہندی بھی....." وہ بات کرتے کرتے پھر ہچکیاں لینے لگی۔

"اور کسی اور سے نہیں..... وشمہ سے..... ماما کی لاڈلی بیٹی سے....." یہ بات شاید رینا کے گمان سے بھی باہر تھی۔ جبھی وہ فوری طور پر کچھ کہہ نہ سکی۔

"میں بھی تو اسی ماں کی اولاد ہوں۔ سگی اولاد..... پھر مجھے کیوں ٹھکرایا اس نے اور اس کے خاندان نے اور وہ جس کی خیرات میں محبت پائی ہے ماما کی..... وہ..... اسے وہ لوگ سر آنکھوں پر بٹھا رہے ہیں..... کیوں؟"

چلا چلا کے اس کے حلق میں خراشیں پڑ گئی تھیں۔

ضبط کر کر کے اس کے دل پہ داغ پڑ چکے تھے۔

کبھی دل چاہتا..... دیواروں سے ٹکریں مارنے لگے۔

کبھی اس کا بس نہ چلتا کہ سامنے ہینگر سے لٹکی شیروانی تار تار کر ڈالے۔

"ہاں..... وہ مجھ سے محبت کرتا ہے..... یہ احساس کتنی دیر سے ہوا تھا اور کس برے وقت میں ہوا تھا۔

وشمہ کے ہاتھ میں اس کے نام کی مہندی لگی تھی۔

چند گھنٹوں بعد طلوع ہونے والا سورج ان دونوں کو ایک گہرے رشتے میں باندھنے والا تھا اور وہ..... وہ اب سوہا کی جلن کی تپش میں جھلس رہا تھا۔

"میں نے تم سے اظہار کرنے میں جلدی کی۔ محبت کا اظہار کرنے میں بھی اور محبت کے نہ ہونے کا اظہار کرنے میں بھی..... اور محبت کرنے میں دیر کردی..... اتنی دیر کہ اب اس کا کوئی مداوا نہیں۔"

کہتے ہیں محبت دل کے دروازے پر بار بار دستک نہیں دیتی۔ اس نے سوہا کی دستک کو نظر انداز کیا تھا اور اب بند دل کے دروازے پہ پڑے اسی قفل کو دیکھ رہا تھا جس کی چابی اس سے کھو چکی تھی۔ ہمیشہ کے لیے۔

☼ ☼ ☼

آج شوکت جہاں کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ آج ان کے گھر سے دو دو باراتیں نکل رہی تھیں۔

ایک ان کے سب سے بڑے پوتے کی۔

دوسری ان کے اکلوتے نواسے کی۔

مارے خوشی کے ان کا ضعیف چہرہ دمک رہا تھا۔ ہلکے موتیا رنگ کے شیفون بریزے کے سوٹ میں وہ کشمیری شال اوڑھے بڑی معتبر لگ رہی تھیں۔

"اماں جان..... سردی تو نہیں لگ رہی؟ ہیٹر کے پاس بٹھاؤں؟" آتے جاتے کوئی نہ کوئی پوچھتا رہتا۔

"کمال ہے سردی..... ہمیشہ سردی کے آغاز میں ہی سر سے پیر تک گرم کپڑوں میں لد جانے والی شوکت جہاں کو جنوری کی اس سرد ترین بھیگی ہوئی رات سے بھی کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ بس نثار ہوتی نظروں سے سامنے بیٹھے خرم اور وصی کی سہرا بندی کی رسم ہوتے دیکھ رہی تھیں۔

"ماشاء اللہ سے دونوں دولہا دونوں میں..... جھگڑا ہوا ہے۔" کسی نے اپنی بہنسی دبا کے ہنستے ہوئے کہا۔

"دونوں کے دونوں منہ سجا کے بیٹھے ہیں' خفا خفا سے۔"

ان کے تبصرے پہ انہوں نے اپنی بے پایاں خوشی کے احساس سے باہر نکلتے ہوئے دھیان لگا کے دیکھا۔ واقعی دونوں کے چہرے پتھریلے سے لگ رہے تھے۔ جیسے خوش ہونا نہ چاہتے ہوں۔ ناخوش نظر نہ آنا چاہتے ہوں۔

خوشی میں انہوں نے یہ خیال تو کیا ہی نہیں کہ جو جوش و خروش گھر کے باقی افراد میں نظر آرہا ہے۔ اس کی جھلک تک بھی نہ وصی کے چہرے پہ نظر آرہی تھی نہ خرم کے۔

بچپن میں لڑا کرتے تھے تاکہ تمہاری نہیں' میری ذرا تنگ اچھی بنی ہے یا یہ کہ تمہاری نہیں' میری

سائیکل زیادہ تیز دوڑتی ہے لگتا ہے رات بھی خوب معرکہ ہوا ہوگا کہ تمہاری تھیں۔ میری دلہن زیادہ خوب صورت ہے۔"

ندا اپنی عادت کے مطابق زیادہ گہرائی میں جانے کے بجائے یہ نتیجہ نکال رہی تھی۔ اس کی نند بھی ہنس دی یہ اور بات آئی گئی ہوگئی۔ وہ دونوں تو اب کسی خاتون کے ساڑھی باندھنے کے بے ڈھنگے اسٹائل پہ تبصرے کر رہی تھیں لیکن شوکت جہاں کے شاداں و فرحاں چہرے پہ اب تفکر کی گہری لکیریں تھیں۔

☼ ☼ ☼

"ماشاءاللہ... کسی کی نظر نہ لگے۔"

منزہ نے وشمہ کی پیشانی چومی جو گہرے سرخ اور سیاہی مائل سبز رنگ کے راجستھانی لہنگے میں دلہن بنی غضب کی خوب صورت لگ رہی تھی۔

"سدا خوش رہو۔" منزہ کی آنکھوں کے ساتھ ساتھ اس کا لہجہ بھی بھیگا ہوا تھا۔

وشمہ جانتی تھی کہ یہ دکھ صرف اس سے جدائی کا نہیں ہے' یہ اس جدائی کا رستا ناسور ہے جو جدائی آج سے کئی برس پہلے مقدروں میں لکھی گئی تھی۔ کل کی تقریب میں جو بدمزگی ہوئی تھی' اس کی تفصیل وہ کئی ایک سے سن چکی تھی۔ بس منزہ سے تسلی کے چند بول کہنے کا حوصلہ نہ ہو رہا تھا۔

"ماما... آپ رات والی بات سے اب تک اپ سیٹ ہیں؟" اس نے منزہ کے ہاتھ تھامتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں تو..." منزہ نے مسکرانے کی کوشش کی مگر اس کوشش میں وہ اتنی زیادہ بے بس نظر آئی کہ وشمہ اپنے آنسو روک نہ پائی۔

"کیا کر رہی ہو وشمہ؟ میک اپ خراب ہو جائے گا۔"

"ماما کیا تھا جو آپ آپی کے معاملے میں اتنی جلدی ہار نہ مانتیں... کیا تھا جو وہ آج ہمارے ساتھ رہ رہی ہوتیں۔"

منزہ چند سیکنڈ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی' پھر آہستہ سے اپنے ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑاتے ہوئے کہا۔

"یہ سوال تم اپنی ساس سے کرنا... جا تو رہی ہو۔"

آج پہلی بار اس نے پروین کو وشمہ کی پھوپھو نہیں۔ ساس کہا تھا۔ ایک طرح سے وشمہ اور پروین کے درمیان حد بندی قائم کر دی تھی۔

☼ ☼ ☼

وہ دونوں ہاتھ کانوں پہ رکھے بیڈ پہ اوندھی پڑی تھی۔

بند دروازہ زور سے اور ایک تسلسل کے ساتھ کھٹکھٹایا جا رہا تھا۔ ساتھ ایک تواتر سے آتی ریتا کی آواز بھی۔

"سوہا...! دروازہ کھولو۔ سوہا میں کہہ رہی ہوں دروازہ کھولو... سنا نہیں تم نے۔" چلا کے حکم دیتی ریتا... اچانک ہی منت سماجت پہ اتر آئی۔

"سوہا... میری جان! میرے بچے... تمہیں میری قسم ہے یہ دروازہ کھول دو۔ دیکھو میں ہاتھ جوڑ رہی ہوں۔ [illegible] روکتی تمہیں گھر سے باہر جانے کو۔ میں خود لے کر جاؤں گی۔ کہاں جاؤ گی؟"

اور پھر کوئی جواب نہ ملنے پہ وہ ایک بار پھر دھمکیوں سے اسے رعب میں لانے لگی۔

"دروازہ کھولو۔ ورنہ میں تڑوا دوں گی۔ تمہارے پاپا کو فون کرنے لگی ہوں میں۔"

تھک ہار کے وہ وہیں دروازے کے پاس بیٹھ کے اونچی آواز میں رونے لگی۔

"سوہا... امتحان مت لو میری ممتا کا۔ میرا دل پھٹ رہا ہے' مجھے پتہ ہے تم کچھ کر لو گی۔ تم [illegible] گی۔" پھر وہ چونک کے اٹھی۔

"نہیں... میں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گی۔" وہ پھر سے دروازہ دونوں ہاتھوں سے پیٹنے لگی۔

ہمیں خالی ہاتھ نہیں ہونا چاہتی۔ میں تمہیں نہیں کھو سکتی سوہا! تم میری ساری زندگی کا حاصل ہو۔ ایک ہی تو چیز کمائی ہے میں نے۔"

ملازم دور کھڑے تماشا دیکھ رہے تھے۔ کسی کی نہ ہمت ہو رہی تھی پاس جانے کی۔ نہ ضرورت... بڑی کوٹھیوں میں ایسے نت نئے ہنگامے دیکھنا ان کے لیے معمول کی بات تھی۔

"صدیق...!" ریتا نے چلا کے ڈرائیور کو بلایا۔ "جاؤ... لان کی طرف سے جا کے کھڑکی کا شیشہ توڑو..."

صدیق نے دروازہ توڑ کے گرل کے اندر ہاتھ ڈال کے لاک کھولا۔ ریتا اب بھی وحشیانہ طریقے سے دروازہ پیٹ رہی تھی' صدیق نے کمرے میں داخل ہو کر دروازہ کھولا تو وہ تیر کی طرح اندر لپکی اور بیڈ پہ اوندھی گری سوہا کو کندھوں سے پکڑ کر سیدھا کیا۔

اس کے ناک اور منہ سے خون کی لکیریں بہہ رہی تھیں اور چہرے پہ غیر مانوس سی سوجن تھی۔

☼ ☼ ☼

خرم بھاری قدموں کے ساتھ چلتا اس کے پاس آیا۔ جو نارنجی مائل سرخ لہنگے میں ملبوس گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ خرم نے دل کو ٹٹولا۔

کوئی جوش... کوئی جذبہ... کوئی احساس... کوئی لطافت کچھ بھی تو نہ تھا۔

اس نے بڑی سیدھی سپاٹ زندگی گزاری تھی۔ نوعمری اور کالج لائف میں بھی ان چکروں سے دور رہا تھا۔ وجہ اس کے مزاج کی خشکی نہیں تھی۔ صرف یہ تصور تھا کہ وہ محبت میں توحید کا قائل تھا۔ اپنے گھر کے ماحول سے بھی واقف تھا... اپنی ذمے داریوں کا بھی ادراک تھا اسے۔ کسی بھی بڑھتے ہاتھ کو تھامنے سے پہلے اب یہ خوف لاحق رہتا کہ کہیں اگر وہ اس عہد کے تقاضے نبھانے میں ناکام رہا تو...؟

اگر اس کے گھر والے اس تعلق کو نہ قبول کر پائے تو...؟

کسی اور سے محبت کے عہد و پیمان کر کے شادی اپنے ماں باپ کی پسند سے کرنا اسے بڑا بزدلانہ فعل لگتا تھا' دوسری جانب اپنی محبت کے لیے خاندان اور زمانے سے ٹکرا جانے کے باہمت فعل کے لیے بھی وہ خود کو اہل نہیں پاتا تھا۔

پہلے سے دل پہ کسی اور کا عکس لیے کسی اور کو زندگی میں شامل کرنا اسے بددیانتی لگا کرتا تھا۔ اس لیے اس نے یہی بہتر سمجھا کہ اس کی نوبت ہی نہ آنے دی جائے۔ بہت سے قدم اس کی جانب اٹھے۔ بہت سے ہاتھ اس کی جانب بڑھے لیکن اس نے کسی کی حوصلہ افزائی نہیں کی۔ وہ محبت کے لیے سر پہ کفن باندھ لینے والوں میں سے نہیں... اس لیے اسے اس قسم کے تعلق کا حصہ بھی نہیں بننا... وہ محبت صرف اسے دے گا۔ جو اس کی جائز حق دار بھی ہوگی اور رفیق کار بھی۔

اسی لیے تو جب اسے پہلی بار پتہ چلا کہ وشمہ اس رشتے پہ تیار نہیں تھی اور اس کی جذباتی وابستگی کسی اور کے ساتھ تھی لیکن گھر والوں کے نہ ماننے پہ وہ وشمہ سے شادی کر رہا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا تھا کہ کوئی دل میں کسی اور کو بسا کے زندگی کسی اور کے ساتھ گزارنے کا فیصلہ کیسے کر سکتا ہے۔

وہ کورا دل لے کر اپنے جیون ساتھی کو پوری گرم جوشی کے ساتھ خوش آمدید کہنے کے لیے تیار تھا اور پھر ان گرم جوشی پہ کسی وسوسے نے ٹھنڈے چھینٹے مار دیے۔

وہ بے دلی سے اس کے برابر بیٹھا کوٹ کی جیب سے وہ مخملیں ڈبیہ نکالنے لگا' جو دو دن پہلے ہی رخشندہ کے ساتھ جا کے خرید لایا تھا۔

ڈبیہ سے کنگن نکالتے ہوئے اسے خیال آیا کہ رونمائی کا تحفہ دیکھنے سے پہلے اس کے تقاضے بھی پورے کرنے چاہئیں... سرد ہاتھوں سے گھونگھٹ اٹھاتے ہوئے اس نے بڑی ہی اچٹتی نظر اس کے چہرے پہ ڈالی۔

بظاہر کوئی کمی... کوئی خامی نہ تھی۔ لیکن جو کمی تھی' اس کا احساس خرم کو بڑی شدت سے ہو رہا تھا۔

چند منٹ کے تکلیف دہ انتظار کے بعد کچھ بے چین ہو کر فقیر بیگ نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھائیں۔ سامنے بیٹھے شخص کی آنکھوں میں اس کے لیے صرف اجنبیت تھی یہ سرد مہری تھی۔
اس کا دل اتھاہ گہرائیوں میں ڈوب گیا۔

☼ ☼ ☼

وصی نے بے یقینی سے سیل فون کی اسکرین پہ چمکتے حروف کو دیکھا۔ کل سے اس کا فون مسلسل آف تھا۔ ابھی دراز میں سے نکالتے ہوئے یونہی بے ارادہ ہی آن کر کے دیکھا تو کسی انجان نمبر سے تین پیغامات منتظر تھے۔
"سوہا کو ہاسپٹل لے کر جا رہا ہوں۔ جلدی رابطہ کرو۔" وہ بری طرح چونکا۔
اگلا پیغام جلدی سے نکالا۔
"اس کی حالت نازک ہے۔ اس وقت ڈاکٹرز ہاسپٹل کے ایمرجنسی میں ہوں۔ جلدی پہنچو۔"
وصی کے کان سائیں سائیں کرنے لگے۔ اس نے اگلا پیغام بھی نکال لیا تھا مگر ہر لفظ دھندلا دھندلا نظر آ رہا تھا۔ اس نے تیزی سے پلکیں جھپکیں۔ آنکھوں کے آگے چھائی دھند اوس بن کے ٹپک پڑی۔
"میں سوہا کا پاپا ہوں۔"
اب پیغام بھیجنے والے کو اپنا تعارف کروانا یاد آیا تھا۔
"وہ آئی سی یو میں ہے اور شاید تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ خدا کے لیے میری بیٹی کی موت آسان کر دو۔ اسے اس کشمکش سے نکال دینا۔"
وشمہ واش روم سے اپنا بھاری لباس تبدیل کر کے اور زیورات سے نجات حاصل کر کے نکلی تو وصی کو بجلی کی سی تیزی کے ساتھ کمرے سے نکلتے دیکھا۔
"وصی۔۔۔"
اس نے سارے حجاب اور جھجک بالائے طاق رکھ کے اسے پکارا مگر شاید اس نے سنا ہی نہیں۔
وشمہ ششدر کھڑی دیکھتی رہی۔ اس کی شیروانی صوفے پہ پڑی تھی۔ کلاہ میز پہ رکھا تھا۔ جس وقت وہ واش روم جا رہی تھی تب وہ اپنے جوتے اتار رہا تھا سو وشمہ نے کرسی کے ساتھ رکھے اس کے سلیپرز دیکھے۔
"پتا نہیں۔۔۔ وہ ننگے پیر ہی چلا گیا۔ یا پھر۔۔۔؟"
اس کے ساتھ ہی رات کے سناٹے میں کار کے اسٹارٹ ہونے کی آواز نے اسے پھر سے مخمصے میں ڈال دیا۔ گیٹ کے کھلنے اور پھر بند ہونے کی چرچراہٹ کے دوران ہی دروازے پہ بڑی بے تاب سی دستک بھی ہو چکی تھی۔
وشمہ نے اسی الجھن بھرے انداز میں دروازہ کھولا تو سامنے پروین سوالیہ نشان بنی کھڑی تھیں۔ وہ چونکی نہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ ان سے وصی کے یوں بنا بتائے اٹھ بھاگنے کی وجہ دریافت کرتی۔ وہ اس سے تفتیش کر رہی تھیں۔
"مجھے کیا پتا۔۔۔"
ظاہر ہے وہ اس کے سوا کیا کہتی مگر پروین مطمئن نہ ہوئیں۔
"تمہیں نہیں پتا ہو گا تو کسے پتا ہو گا۔ یہاں تمہارے علاوہ اور کون تھا اس کے پاس۔"
"میں واش روم میں تھی۔ مجھے نہیں پتا کیا ہوا۔ میں نے صرف جاتے دیکھا تھا۔ میں سمجھی کسی سے کوئی بات کرنے گئے ہوں گے یا کوئی اور کام ہو گا۔"
"کم از کم تم پوچھتیں تو سہی کہ وہ آدھی رات کو اور وہ بھی اس موقع پر کہاں جا رہا ہے؟"
ان کی مسلسل جرح سے وہ اکتا رہی تھی۔ کیونکہ یہ سارے سوال تو خود اس کے اندر کلبلا رہے تھے ان کے جواب کہاں سے دیتی۔
"مجھے اندازہ نہیں تھا کہ وہ گھر سے باہر جا رہے ہیں۔"

"کمال ہے۔ کہاں جا سکتا ہے وہ اور وہ بھی بغیر مجھے بتائے۔"
ان کی "مجھے بتائے بغیر" والی بات پہ وشمہ اور بھی کبیدہ خاطر ہوئی۔ گویا صرف ان کو بتانا ضروری تھا اور یہی بات قابل اعتراض ہے۔ بھلے بیوی کو بتائے یا نہ بتائے۔
"کوئی فون آیا تھا؟" ادھر پوچھ گچھ ختم ہی نہ ہو رہی تھی وشمہ کے ماتھے کی شکنوں کو دیکھنے کے باوجود۔
"پتا نہیں۔" اب وہ بھی واضح طور پر منہ بنا کے اکھڑے لہجے میں کہنے لگی۔
"میں نے تو کسی قسم کی رنگ ٹون یا کسی سے فون پہ بات کرنے کی آواز نہیں سنی۔"
"میں فون کر کے پوچھتی ہوں۔" وہ پلٹیں تو وشمہ جتائے بغیر نہ رہ سکی۔
"یہ کام تو آپ کو پہلے کرنا چاہیے تھا۔"
وہ رکیں۔ مڑ کے حیرت سے اسے دیکھا۔
یقین نہ آ رہا تھا کہ چند گھنٹے پہلے بیاہ کر لائی دلہن اور ان کے سامنے پل کے جوان ہونے والی سگی بھتیجی اس بے مروتی سے بات کر سکتی ہے۔

☼ ☼ ☼
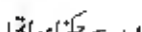
"سوہا۔۔۔ سوہا۔۔۔! پلیز۔۔۔ پلیز آنکھیں کھولو۔۔۔ سوہا!" وصی اس کا سرد ہاتھ اپنے چہرے سے لگائے آنسوؤں سے بھری سرگوشیاں کر رہا تھا۔
سوہا کا پورا وجود مختلف قسم کی نالیوں اور ٹیوبوں سے جکڑا ہوا تھا۔ آکسیجن ماسک سے چھپا اس کا زرد چہرہ وصی کے دل کو چیرے جا رہا تھا۔
"سوہا! میں وصی تمہارا وصی۔۔۔ دیکھو تو سہی۔ میں تمہارے پاس ہوں۔"
وصی نے سسکیوں سے چھلنی اس کا نازک ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔
"مجھے احساس ہو چکا تھا سوہا! کہ جسے میں ہمدردی اور اپنائیت کا رشتہ سمجھ رہا تھا وہ محبت تھی۔ جسے میں ہنسی کے بہانے میں چھپانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ جذبہ ہی کوئی اور تھا۔ میری بزدلی نے میری کم ہمتی نے مجھے یہ اعتراف کرنے نہیں دیا۔ لیکن سوہا! تم انتظار تو کرتیں۔ اتنا یقین تو رکھتیں کہ جلد یا بدیر محبت بالآخر اپنا آپ منوا لیتی ہے۔ تمہاری محبت نے بھی میرے بھرم کو ایڑیوں تلے مسل کے یہ قبول کروا لیا تھا کہ ہاں۔۔۔ ہاں میں ادھورا ہوں تمہارے بغیر۔۔۔"
رنگلاس ڈور سے جھکی آئی سی یو کے نیم تاریک ماحول میں جھانکتے ہوئے سوہا کی زندگی اور صحت کے لیے دعا کر رہی تھیں۔ وصی کے آنسو اسے یقین دلا رہے تھے کہ سوہا ضرور زندگی کی جانب پلٹ آئے گی۔ کیونکہ اسے پکارنے والا بہت محبت اور مان سے پکار رہا تھا۔

○ ○ ○

"کہاں ہو تم وصی؟"
اس کا سیل کئی گھنٹوں سے سائلنس پہ تھا۔ رنگ کے بہت زور دینے پہ وہ آئی سی یو سے نکلا تو سب سے پہلے فون دیکھا۔ گھر کے نمبر سے گیارہ مسڈ کالز تھیں۔ اسے اب احساس ہوا کہ شادی کی رات بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکلنے پر سب کیا کیا سوچ سکتے ہیں۔۔۔ اس نے متوقع سوالوں کے ممکنہ جوابات کی تیاری کیے بغیر گھر فون ملایا۔
"کہاں ہو تم وصی؟ یہ کیا حرکت ہے۔ ایک تو بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکل گئے وہ بھی شادی کی پہلی رات۔۔۔ گھر مہمانوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر۔ اوپر سے فون بھی نہیں اٹھا رہے۔"
"میں۔۔۔ میں دوستوں کی تھا امی۔"
"خیر تو ہے وصی۔۔۔ بیٹا بتاتے کیوں نہیں؟" اس کے لہجے میں کچھ ایسی شکستگی تھی کہ پروین کا سارا طیش سارا غصہ صرف تشویش میں ڈھل گیا۔
"ایک دوست کا ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا امی۔۔۔ جلدی میں گھر سے نکلنا پڑا۔۔۔ سوری کسی کو اطلاع نہیں دے سکا۔"

"دوست کا ایکسیڈنٹ...؟ کس دوست کا...؟"
"آپ نہیں جانتیں اسے۔ نیا دوست ہے۔ آفس میں ساتھ ہوتا ہے۔" ایک کے بعد ایک جھوٹ بولنا پڑ رہا تھا۔
"نیا دوست ہے تو تم گھنٹوں سے وہاں کیوں بیٹھے ہو۔ یہاں ہم مہمانوں کو کیا جواب دیں گے۔ ابھی تو سب سو رہے ہیں۔ اٹھیں گے تو تمہاری غیر موجودگی کا کوئی تو جواز دینا ہوگا۔ کیا بتائیں گے کہ دولہا نئی نویلی دلہن کو چھوڑ کے ایک نئے نویلے دوست کی ناز برداریاں کر رہا ہے۔" پروین کی جھنجلاہٹ پھر سے عود کر آئی۔
"امی... رشتہ نیا ہو یا پرانا۔ اس کے تقاضے تو ایک سے ہوتے ہیں ناں۔"
اس نے تھکے ہارے لہجے میں کہا تو وہ چپ سی ہو گئیں۔
"ویسے بھی وہ اس شہر میں اکیلا ہے۔ ایسے وقت میں میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"
"ہوں کرو... میں حسن یا حسان کو بھیجتی ہوں۔ وہ رک جاتے ہیں وہاں۔ تم گھر آ جاؤ۔"
ان کی پیشکش پہ وہ گھبرا اٹھا۔ حسن سے وہ اب ویسے ہی خائف رہتا تھا۔ حالانکہ ایک وقت میں عمر کے اچھے خاصے فرق کے باوجود اس سے ہی زیادہ قریب تھا۔ لیکن شادی کے بعد (حسن اور ہما کی شادی) دونوں میں ایک عجیب سا فاصلہ اور تکلف آ گیا تھا، جس کی وجہ جاننے سے کم از کم وصی تو قاصر تھا۔ جبکہ حسان کے بڑ بولے پن اور پیٹ کے ہلکا ہونے سے ڈرتا تھا...
"اس کی ضرورت نہیں امی! انہیں کیوں تکلیف دے رہی ہیں آپ۔"
"ضرورت ہے۔ ابھی تمہارے سسرال والے ناشتہ لے کر پہنچے ہوں گے۔ کیا جواب دوں گی میں انہیں۔"
"سسرال والے؟" وہ ایسے چونکا جیسے اپنی زندگی کی اس بڑی تبدیلی کو فراموش کر بیٹھا ہو۔
"ہاں... نوید بھائی اور حمزہ بھائی!"
"تو پھر... تب... آپ خرم بھائی کو بھیج دیجیے۔"
"پاگل ہو گئے ہو... اس کی بھی تو تمہارے ساتھ ہی شادی ہوئی ہے رات میں اور اس کے بھی سسرال والے آئے ہوں گے وہ بھی تو غیر لوگ... ان کو مطمئن کرنا اور بھی مشکل ہوگا۔"
"مجھے تو لگتا ہے آپ خود مطمئن نہیں ہیں۔" وہ جھنجلا گیا۔
"ایک معمولی سی بات کو لے کر آپ اتنی پریشان ہو رہی ہیں اور مجھے بھی کر رہی ہیں۔"
"یہ معمولی بات ہے؟"
"کیا لوگوں کے دوست نہیں ہوا کرتے؟ کیا دوستوں پہ مشکل وقت نہیں آیا کرتا؟ کیا ان کی مدد نہیں کی جا سکتی؟ یہ کون سی غیر معمولی بات ہے امی۔ آپ بچ بچا کر سنبھالیے گا نوید انکل کو اور اتنا ہی ہے تو یہ مت بتائیے گا کہ میں رات سے یہاں ہوں، کہہ دیجیے گا کہ ابھی نکلا ہوں۔"
"لیکن تم ہو کس ہسپتال میں؟"
اب تک وہ دل ہی دل میں پچھتاتے ہوئے جھوٹ پہ جھوٹ بولتا چلا جا رہا تھا لیکن اس معاملے میں نہ جھوٹ بولا جا سکتا تھا نہ سچ بتایا جا سکتا تھا۔
"ہیلو... ہیلو امی! شاید سگنلز نہیں آ رہے۔ میں تھوڑی دیر میں کرتا ہوں۔"
سامنے سے رینا کو آتے دیکھ کے اس نے سیل فون جیب میں ڈالا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو ڈسپوزیبل کپ تھے۔
"نہیں... شکریہ..."
"لے لو... رات بھر کے جاگے ہو... فریش ہو جاؤ گے۔"
"ضرورت محسوس نہیں ہو رہی۔"
"میں جو کہہ رہی ہوں... لے لو۔" یہ استحقاق رینا کے لہجے میں کبھی نہ آتا۔ اگر وہ وصی کے منہ سے سوہا کے

لیے اعتراف محبت نہ سن چکی ہوتی۔
"میری مانو... تو کچھ دیر گھر جا کے آرام کر لو۔"
"جب تک سوہا کو ہوش نہیں آتا۔ میں نہیں جاؤں گا۔"
"جب ہوش آئے گا تب کر جاؤ گے نا؟" اس نے بڑے عجیب انداز میں پوچھا۔
وہ چونک کر سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگا۔
رینا کے خشک ہونٹوں پہ ایک ملال میں ڈوبی مسکراہٹ تھی۔
"تمہیں اسے چھوڑ کے جانا ہی ہے وصی... اپنی اس زندگی میں لوٹنا ہی ہے جس کا آغاز تم نے کل رات کیا ہے۔ پھر کیا فرق پڑتا ہے کہ اس کے ہوش میں آنے کے بعد جاؤ یا اب۔"
وصی چند سیکنڈ غور سے رینا کے چہرے کو دیکھتا رہا جہاں اس دم اس کے رنگ بکھرے تھے۔
ایک ایسا جواب نہ سننے کی شدت سے تمنا تھی۔ جو اس کی خوش فہمیوں اور خوش گمانیوں کو مسمار کر دیتا۔
ایک ایسا اقرار سننے کی آس تھی جو اس کی بچی کو زندگی کی جانب کھینچ لاتا۔
"نئی زندگی کیا ہے... میں نہیں جانتا۔ زندگی کا نیا مطلب نیا مقصد کیا ہے... سو میں جانتا ہوں اور وہ ہے سوہا۔"

☆ ☆ ☆

"کیا کہہ رہی ہیں آپ؟" حسن بوکھلا گیا۔
"وہ رات سے گھر پہ نہیں ہے؟"
"ہاں... اور ابھی بھی آنے پہ تیار نہیں۔"
پروین جو کچھ دیر پہلے تک صرف پریشان تھیں، بار بار آنسو بہانے اور منتیں مانگنے لگتی تھیں کہ کسی طرح وصی کا پتہ چل جائے، اب صرف جھنجلاہٹ اور غصے کا شکار تھیں۔
"پتا نہیں بھلا ایسی بھی کیا دوستی یاری جس کے لیے بندہ گھر بار بھلا دے۔ معاملے کی نزاکت کو بھی نہ سمجھے۔ غضب ہے، ہم ایسی ہمدردی اور خدا ترسی سے جس کی وجہ سے زمانے کے آگے تماشا لگ جائے۔"
"ہے کہاں وہ؟"
"بتا ہی نہیں رہا۔ اوپر سے فون بھی بند کر دیا ہے۔"
"میں نے پہلے ہی کہا تھا مت کریں اس کی شادی زبردستی... جب اس کی مرضی نہیں تو..."
"یہ کوئی موقع ہے ایسی بات کرنے کا۔" وہ چڑ چڑ کے رو دیں۔
اور اس کی کسی بات سے ظاہر نہیں ہو رہا ہے کہ وہ دوست کی وجہ سے گھر سے غائب ہے۔ اللہ جانے کون دوست ہے جس کے سرہانے لگا بیٹھا ہے۔ میں نے کہا بھی کہ حسن کو بھیج رہی ہوں اس کے پاس... اگر بے چارہ اتنا ہی زخمی اور لاچار ہے تو... کم از کم تم گھر آ جاؤ... لیکن نہیں... الٹا کہہ رہا ہے بھیجنا ہے تو خرم کو بھیجو۔"
"خرم کو؟" حسن بری طرح چونکا۔
(یعنی خرم اصل معاملے سے واقف ہے۔)
"ابھی تمہارے ابو جاگ جائیں گے تو پھر سے سو سو سوالوں کا سامنا کرنے کو میں اکیلی... اللہ جانے کیوں نہیں یہ بچے چین لینے دیتے۔" وہ بڑبڑاتی ہوئی باہر نکلیں... ظل ہما چائے لے کر اندر داخل ہوئی۔
"چچی! کیوں اتنا پریشان ہو رہی ہیں... آپ انہیں سمجھائیے گا... کہ وصی اتنا غیر ذمہ دار نہیں ہے... ضرور کوئی وجہ ہوگی... ورنہ..."
"اس سے زیادہ غیر ذمہ داری اور کیا ہوگی... اور امی نے اب پریشان ہونا ہی ہے... وہ جو بے چاری رات بیاہ کے آئی ہے اس کا حال کیا ہوگا... اس کا سوچا تم نے؟"

حسن کو بار بار صرف وشمہ کی فکر ستائے جا رہی تھی۔ لہاں تو کل تک وہ وشمہ کے نام سے بلاوجہ خار کھا رہا تھا۔ اس کے اندر کی خجالت اسے جھنجلاہٹ میں مبتلا کر رہی تھی کہ جس لڑکی سے اس نے بڑی بے خوفی سے اظہار محبت کھل کے کر دیا تھا۔ اس کو چپ چاپ چھوٹے بھائی کی بیوی بنا کے لانا پڑ رہا ہے... اور اب اسی وشمہ سے ہمدردی ہو رہی تھی کہ کسی اور کے عشق میں گرفتار وصی گھر والوں کا بدلہ اس معصوم سے لے رہا ہے۔

"وشمہ کے گھر والے چاچی کے اپنے میکے والے ہیں۔ سمجھ جائیں گے اگر طریقے سے سمجھایا جائے تو ایسی کوئی..."

"تم چپ رہو۔ کیوں بلاوجہ دخل دے رہی ہو۔" حسن نے پلٹ کے کہا تو غزل ناراض ناراض سی کپ اس کے پاس رکھ کے پلٹ گئی۔

☆ ☆ ☆

"تمہاری اس دوست کا نمبر کیا ہے؟"

تقدیس اپنے کھلے لمبے بالوں میں برش کر رہی تھی جب اسے خرم کی سرد سنجیدہ آواز سنائی دی۔

"جی؟" اس نے پلٹ کے اسے دیکھا۔

"اسی دوست کا... جو مہندی کی رات اپنی نسل دکھا رہی تھی۔ اس کی بات کر رہا ہوں میں... اسی طوائف زادی کی۔"

اگرچہ تقدیس کے دل میں بھی سوہا کی اس حرکت کی وجہ سے اس کے لیے ست سا میل تھا۔ مگر اپنے شوہر کی زبان سے کسی عورت کے لیے ایسے تذلیل بھرے الفاظ سننا اسے اچھا نہیں لگا۔

اپنے سامنے کھڑا اعلا ہر خوش شکل، خوش گفتار، تعلیم یافتہ شخص اسے اجڈ اور گنوار سا لگا۔

"آپ کیوں پوچھ رہے ہیں؟" نہ چاہ کے بھی اس کی ناگواری لہجے سے چھلک گئی۔

"فکر مت کرو... اس سے تمہارے بارے میں کچھ نہیں جاننا مجھے۔" خرم کے طنزیہ کہنے پہ تقدیس کے اندر ایک خطرے کا الارم سا بجا۔

وہ اندر ہی اندر لرز کے رہ گئی۔ رات سے جس انہونی کا خدشہ اسے بار بار ہو رہا تھا... وہ سامنے آ کے رہی۔ اس کا شوہر... اس کی زندگی کا ساتھی... نگاہوں میں اجنبیت اور بے پناہ شکوک و شبہات لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

"مجھے اس سے کچھ جاننا ضرور ہے۔ مگر وصی کے بارے میں... جو رات سے گھر سے غائب ہے۔"

تقدیس بھی وصی کے بارے میں جان چکی تھی کہ سوہا کا وہ دوست جس کی وجہ سے اس نے اس مست ملنگ سی لڑکی میں ان گنت تبدیلیاں آتے دیکھی تھیں... اور جس کے حوالے سے وہ اسے چھیڑا کرتی تھی۔ وہ رشتے میں اس کا دیور لگتا ہے۔

"غائب ہے؟" اب وہ سمجھی کہ صبح سے گھر میں جو عجیب سی ٹینشن پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ کیا ہے۔

"اور مجھے پکا یقین ہے کہ اسی ڈرامے باز لڑکی نے کوئی چال چلی ہو گی ہم سب کو پریشان کرنے کے لیے۔"

"نہیں... یہ آپ کا وہم ہے۔" وہ کہے بغیر نہ رہ سکی۔

"کیوں؟... بہت اعتماد ہے اپنی سہیلی پہ؟... رگ رگ سے واقف ہو اس کی؟"

"نہیں... لیکن اس حقیقت سے ضرور واقف ہوں کہ دونوں میں ایسا کوئی تعلق نہیں۔"

"اتنی رازدار ہو؟" خرم نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"جبکہ تمہاری اسی کل وضاحتیں دے رہی تھیں کہ اس لڑکی سے تمہاری بس دور کی سلام دعا ہے۔" تقدیس کو مزید وضاحتیں دینا خود کو اور بھی جھوٹا ثابت کرنے کے مترادف لگا۔

وہ سر جھکا کے چپ رہ گئی اور اس کی یہ خاموشی خرم کو اور بھی سلگا گئی۔

"نمبر دو مجھے اس کا۔" تقدیس نے بیڈ سے سیل فون اٹھایا اور سوہا کا نمبر ملا کے خرم کو تھما دیا۔

"شکر ہے اللہ کا سوہا کو ہوش تو آیا۔" ربنا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"ہاں مگر ڈاکٹر ابھی اس سے ملنے نہیں دے رہے۔" وصی کے لہجے میں بے تابی ہوک رہی تھی۔

"اس کی بہت دل کی تسلی کے لیے کہ ڈاکٹروں کے مطابق خطرہ ٹل گیا ہے۔"

ربنا نے شفقت کے اظہار کے طور پر اس کا شانہ تھپتھپایا اور وصی کو اس لمس سے گویا کوئی سہارا ملا۔

ایک عجیب سا درد مشترک دونوں کو کل رات سے بجا کیے ہوئے تھا۔

ایک ڈور سے بندھے لگ رہے تھے دونوں... اور وہ ڈور تھی سوہا۔

"ورنہ پہلے تو یہی کہہ کر پریشان کر دیا تھا ڈاکٹر امتیاز نے کہ اگر ایک گھنٹے کے اندر اندر ہوش نہ آیا تو وہ کوما میں جا سکتی ہے... یا برین ہیمبرج کا خطرہ ہے۔ شکر ہے میرے مولا کا جس نے اسے زندگی لوٹا دی۔ میں تو ڈر کے مارے اصغر کو بھی فون نہیں کر رہی تھی کہ کیسے بتاؤں اسے سوہا کے بارے میں۔ کیا وجہ بیان کروں اس کے نروس بریک ڈاؤن کی... پنڈی میں وہ کتنا پریشان ہو گا یہ سوچ سوچ کر کے۔"

"آنٹی! آپ اب چاہیں تو انہیں فون کر دیں۔ بعد میں انہیں گلہ نہ ہو کہ آپ نے بروقت اطلاع نہیں دی۔ بلکہ آپ ایسا کریں کہ کچھ دیر کے لیے گھر چلی جائیں۔ آرام بھی کر لیں اور انہیں فون پہ مناسب الفاظ میں بتا بھی دیں۔"

"میرے خیال میں گھر جانے کی ضرورت تمہیں ہے۔ تمہارے گھر والے پریشان ہوں گے۔"

"میں نے انہیں بتا دیا ہے۔"

"کیا؟" ربنا کے فوراً پوچھنے پہ وہ نظریں چرا کے رہ گیا... پھر بات بدلی۔

"آپ ہو آئیے... میں تب تک سوہا کے پاس رکتا ہوں۔ آپ آ جائیں گی تو میں بھی گھر سے ہو آؤں گا۔"

"ٹھیک ہے... میں ایک دو گھنٹے تک آ جاتی ہوں... فون پہ رابطہ رکھوں گی تم سے۔"

"میرا فون آف ہے آنٹی... بیٹری ختم ہو گئی ہے۔"

"اچھا ایسا کرو... تم یہ سوہا کا فون رکھ لو۔ میں اسی پہ کر کے تم سے سوہا کے بارے میں پوچھتی رہوں گی۔"

اس نے فون ربنا کے ہاتھ سے لے لیا اور دوبارہ آئی سی یو کے گلاس ڈور کے سامنے کھڑا ہو گیا جہاں سوہا کے بیڈ کے گرد تین ڈاکٹرز اور دو نرسیں گھیرا ڈالے کھڑے تھے۔ وہ بے چینی سے پہلو بدل کے دیکھنے کی کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح سوہا کی ایک جھلک نظر آ جائے۔ مگر مایوس ہو کر اس نے ایک گہری سانس بھری اور ہاتھ میں پکڑے سوہا کے سیل فون کو تکنے لگا۔

"کبھی اس نے اسے بڑی بے قراری سے تھاما ہو گا۔ بے بسی آنکھوں کے ساتھ میرا نمبر ملایا ہو گا... بار بار ملایا ہو گا... چشم تصور سے مجھے کسی اور کے ساتھ ہنستا مسکراتا دیکھ کر کے فون زور سے نیچے پٹخا ہو گا۔"

اس نے یاسیت سے ڈائل نمبروں میں ایک قطار کے ساتھ اپنا نمبر دیکھا... یہ وہ وقت تھا جب وہ ولیمہ اپنے ہاتھوں اپنے دل کا خون کر رہا تھا اور فون اس نے آف کر رکھا تھا... شاید بے چینی، مایوسی اور بے بسی کی اس آخری حد نے اسے اس حال کو پہنچایا ہو گا۔

وہ یہ سوچتا ہوا محبت سے سیل فون کی اسکرین پہ مسکراتی سوہا کی تصویر پہ ہاتھ پھیر رہا تھا جب ہلکی سی بزر کے ساتھ اسکرین پہ چند ہندسے جگمگانے لگے جن پہ انگریزی حروف میں لفظ "سہیلی" لکھا تھا۔

"شاید سوہا کی کسی دوست کا فون ہے۔" اس نے کال ریسیو کر لی۔

دوسری جانب خرم تھا جو کسی لڑکی کی آواز کے بجائے وصی کو سن کر ٹھٹک گیا۔ اسے لگا اس کا وہم اسے بھٹکا رہا ہے... تصدیق کے لیے اس نے دہرایا۔

"وصی؟" اب چپ ہو جانے کی باری وصی کی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بات کیا ہے وشمہ؟ تم ہی سچ بتا دو... مجھے تو لگ رہا ہے سب کچھ چھپا رہے ہیں۔" منزہ نے اسے اکیلے میں لے جا کر پوچھا۔

"نہیں ماما! ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ خود وصی کے نہ ہونے سے دل برداشتہ تھی۔

"تو پھر وجہ ہے جو وصی آج کے دن گھر سے غائب ہے۔"

"کسی دوست کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تو بس... جلدی میں نکل گئے گھر سے... کسی کو بتایا تک نہیں۔"

"کیوں؟ کہاں تھے گھر کے سارے لوگ؟" وہ جل کے پوچھنے لگیں۔

"سو رہے تھے۔"

"کیا؟ سو رہے تھے؟ اس وقت تک؟" منزہ کو یہی بتایا گیا تھا کہ بس ان لوگوں کے آنے سے کچھ دیر پہلے وصی مجبوراً نکلا ہے۔ اسے یہی جان کر دل میں کھٹکا سا ہو گیا تھا اور وشمہ سچ بتانے جا رہی تھی۔

"جی... رات کے تین چار بجے تھے۔" وشمہ کے بتانے پہ منزہ گم صم بیٹھی اسے دیکھتی رہی۔

"اور تم نے جانے دیا؟"

"میں کیسے روکتی۔"

"اتنا جھوٹ بولا پروین نے مجھ سے۔"

"کیسا جھوٹ؟"

"اب تو مجھے شک نہیں بلکہ یقین ہے کہ یہ سب اسی کی چال ہے۔ پہلے وہ تم دونوں کو ایک نہیں دیکھنا چاہتی تھی، اب ایک ہونے نہیں دے گی۔"

"مگر... تو... وصی کا دوست..."

"سب بکواس ہے... سچ ہوتا تو پروین ہم سے یہ جھوٹ کیوں بولتی کہ وہ رات سے نہیں، صرف آدھے گھنٹے سے غائب ہے۔ ضرور اس کے دل کا چور اسے غلط بیانی پہ اکسا رہا ہے۔" وشمہ کے دل میں بھی غبار بھر گیا۔

"جھوٹ انہوں نے بولا... اور جا رہے جس وجہ سے بھی بولا... لیکن ماما... آگئے تو وصی ہیں... ابھی تو میں دل کو تسلی دے رہی تھی کہ چلو کوئی بات نہیں... دوست کو مصیبت میں دیکھ کے نہ رہ سکے ہوں گے۔ لیکن اب مجھے اپنے آپ سے نفرت سی محسوس ہو رہی ہے کہ میں اتنی... اتنی غیر اہم ہوں ان کے لیے... کہ وہ صرف پھوپھو کے ایک بار کہنے پہ مجھے یوں چھوڑ کے چلے گئے۔"

"نجانے کس دل سے کیا ہو گا وہ... تم اس کے لیے جی چھوٹا نہ کرو... مجبور کیا ہو گا پروین نے... دراصل یتیم بچہ ہے... پروین نے ہاتھوں پہ پال کر دکھا ہے... اس کے احسانوں تلے دبا بے چارہ اور کیا کرتا۔"

"اور اگر ان ہی احسانوں کے بدلے انہوں نے مجھے..."

"نہیں... ایسا نہیں ہونے دوں گی میں۔" منزہ نے اسے کسی قسم کی بدفالی نکالنے سے منع کیا۔

"پروین نے اسے اپنے احسانوں تلے زیر کر رکھا ہے تو تم محبت سے زیر کر لو... سب سے قوی جذبہ یہی ہے۔"

"پھوپھو کا مقابلہ بہت مشکل ہے ماما... انہوں نے تو آپ کے قدم تک اکھاڑنے کے لیے کیا کیا نہ کیا... آپ سے آپ کی چھت کو دور کر دیا۔"

"ہاں... اس کی کوشش یہی تھی کہ میں تمہارے پاپا کی زندگی سے دور ہو جاؤں... عجیب بہن تھی... بھائی کا گھر بسا نہیں دیکھ پائی... شاید اسے دوسروں کو ہمیشہ سے احسان تلے دبا کے رکھنے کا شوق ہے... رنڈوے بھائی اور یتیم بھانجی کی خبر گیری کے لیے ہفتے میں ایک آدھ بار اپنی گھر گرہستی سے نکل کر جو احسان عظیم کرتی تھی وہ... میرے آنے کے بعد تمہیں اور نوید کو یہ محتاجی نہ رہی... بس یہ برداشت نہ ہو رہا تھا اس سے... اپنے گھر کے ساتھ ساتھ وہ بھائی کے گھر پہ بھی اپنا حکم چلانا چاہتی تھی... میری وجہ سے یہ نہ ہو سکا تو میری بیٹی تک کو مجھ سے الگ کر دیا... کہ شاید گھبرا کے میں یہ گھر چھوڑ دوں... مگر میں ثابت قدمی سے جمی رہی... اب یہی ثابت قدمی تم نے دکھانی ہے۔"

☆ ☆ ☆
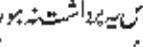
"آپ کیوں آئے ہیں خرم بھائی؟" وہ اسے دیکھ کے جز بز ہو رہا تھا۔

"یہ سوال مجھے تم سے کرنا چاہیے... تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"سوہا کی حالت اچھی نہیں۔"

"ان بازاری عورتوں کے پاس یہی ہتھکنڈے ہوتے ہیں... اب خودکشی کا ڈرامہ رچایا ہو گا۔"

"اس کا نروس بریک ڈاؤن ہوا... اور پلیز آپ بغیر سوچے سمجھے اس کے بارے میں غلط الفاظ استعمال نہ کریں۔" اس کے لہجے میں ناگواری کے ساتھ ساتھ ایک بے حد تکلیف دہ التجا بھی تھی۔

"تو اور کیا کہوں کسی طوائف زادی کو۔"

"وہ طوائف زادی نہیں ہے۔"

وصی نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ ربا، خرم کے آنے سے پہلے جا چکی تھی... ورنہ اس وقت خرم کے طیش کو دیکھ کر لگ رہا تھا وہ اس کی موجودگی کا بھی لحاظ نہ کرتا۔

"پاگل ہو چکے ہو تم وصی... وہ لڑکی کسی بھی طرح ہمارے گھر اور خاندان کے قابل نہیں ہے۔ کیا تم اتنے اندھے ہو چکے ہو... تمہیں احساس نہیں ہوا کہ قدرت نے تمہارے لیے کتنا بہترین فیصلہ کیا ہے... چاچی کا انتخاب لاجواب ہے۔ قدر کرو وشمہ کی... ایک پاکباز اور حیادار عورت نعمت ہوتی ہے... تم اس نعمت کی ناقدری کرتے ہوئے ایک ایسی لڑکی کے لیے خوار ہو رہے ہو جس کے اندر نجانے کون سا گندہ خون ہے جو اسے ملا باپ کی..."

"بس... پلیز خرم بھائی! بس کریں۔" وہ بلبلا اٹھا۔

"آپ کچھ نہیں جانتے... نہ سوہا کے بارے میں نہ وشمہ کے بارے میں... اس لیے پلیز چپ کر جائیں... وشمہ اچھی ہے، پاکباز اور حیادار بھی ہو گی میں مانتا ہوں... لیکن کیا آپ جانتے ہیں کہ اس یتیم ماں کی بچی میں یہ اوصاف پیدا کرنے والی... اس کی ایسی تربیت کرنے والی عورت کون ہے؟... وہ عورت سوہا کی سگی ماں ہے۔"

"کیا؟" خرم کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

"جب اس عورت کی ایک بیٹی ہمارے گھر اور خاندان کی عزت بن سکتی ہے تو دوسری کیوں نہیں؟... اس کی رگوں میں کوئی گندہ خون نہیں ہے۔ وہ بھی ایک اچھے خاندان سے تعلق رکھتی ہے، صرف اس کی قسمت اچھی نہیں ہے... نہ اسے باپ کا سایہ مل سکا نہ ماں کی گود... اور جس عورت نے اس کا واحد سہارا بننا چاہا... جس نے اس کی زندگی کی ساری محرومیاں دور کرنی چاہیں... ہاں وہ ضرور ایک طوائف زادی ہے... مگر طوائف وہ بھی نہیں خرم بھائی... وہ بھی شہر کے ایک معزز شخص کی بیوی ہے، آج سے نہیں پچھلے کئی سالوں سے... شاید اس کے ماضی کے بہت سے پہلو تاریک ہوں... مگر گھناؤنے ہرگز نہیں... یہ تاریکی بھی اس کے ماحول کی دین ہو گی... ورنہ کوئی بری عورت کسی غیر کی اولاد کو یوں کلیجے سے لگا کے نہیں پالتی... میں اس کی ممتا کا گواہ ہوں... رات بھر میں نے اس عورت کی جو حالت دیکھی ہے وہ عورت جو بقول آپ کے ایک طوائف ہے، وہ حالت اگر اس کی ماں کی جگہ موجود ہوتی... تو شاید اس کی بھی ہوتی... اور وہ لڑکی جو اندر ابھی ابھی موت کو شکست دے کر واپس آئی ہے... اس کا دل کتنا حساس اور نازک ہے، اس کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ صرف مجھے کھونے کی کسک نے اس کی سانسیں تک روک دی تھیں... پھر کیسے آپ اسے غلط قرار دے سکتے ہیں؟"

"تم صرف کتابی باتیں کر رہے ہو وصی! ایسے قصے صرف فلموں میں دیکھنے کی حد تک بھلے لگتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کل تم نے اپنے پورے ہوش و حواس میں ایک معصوم اور شریف لڑکی کو قرآن، رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بناتے ہوئے اپنی زندگی میں شامل کیا تھا... کیا اس سے انکار کر سکتے ہو؟" وصی لاجواب نظر آنے لگا۔

"اور تم اس پاک رشتے میں بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہو... تمہیں اس وقت جس کے پاس ہونا چاہیے تھا کے پاس نہیں ہو، اور جہاں نہیں ہونا چاہیے وہاں پائے جا رہے ہو، یہ محبت اور توجہ اس کا حق ہے، اس لڑکی کا..."

میں مجبور ہوں خرم بھائی...! محبت نے واری حق اور اصولی سے ماورا چیز ہے۔ دل ان حد بندیوں کو نہیں مانتا اور ایسا نہیں ہے کہ میں نے کوشش نہیں کی... یہ شادی اسی کوشش کا نتیجہ ہے... میں نے سوچا تھا بہت آسان ہے دل کو مار کے بڑوں کی خواہش پورا کرنا۔ محبت کو دفن کر کے صرف حقوق و فرائض کی جنگ لڑنا۔ لیکن یہ مجھ سے نہیں ہو پایا۔ اگر میں اس میں کامیاب ہو گیا ہوتا تو واقعی آج یہاں نہیں، وہاں اس کے پاس ہوتا۔ لیکن میں ایسا نہیں کر پایا۔ بلکہ اس لاحاصل کوشش کے نتیجے میں میں نے اس لڑکی کے لیے زندگی کو اور مشکل کر دیا جو پہلے ہی ہچکولے لے رہی تھی۔ پہلے میں اس کا دل توڑنے کا مجرم تھا۔ اب تو میں اس کی مجبوریوں کا قرض دار ہوں خرم بھائی! اسے میری ضرورت ہے۔ مجھے یہ قرض ادا کر لینے دیں۔ آپ کو خدا کا واسطہ ہے خرم بھائی! مجھے ساتھ چلنے پہ مجبور مت کریں، اس وقت میں اسے ایک لمحے کے لیے بھی اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔"
اس نے باقاعدہ ہاتھ جوڑ دیے خرم کے سامنے۔

☼ ☼ ☼
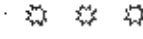
ہوش سے بے ہوشی میں جاتے ہوئے جو آخری خیال اس کے ذہن کو چھوا تھا، وہ یہ تھا کہ وہ اس زندگی سے اور اس کی تمام آزمائشوں سے آزاد ہو رہی ہے۔
آخری بار آنکھیں بند کرتے ہوئے اسے یقین سا تھا کہ اب یہ آنکھیں دوبارہ نہیں کھلیں گی... اور ان کوئی منظر کبھی نہیں دیکھ پائیں گی۔ لیکن ہوش کی سرحد پہ قدم رکھتے ہی۔
آنکھ کھولنے کے اگلے ہی لمحے...
وہ اپنی خوش بختی پہ نازاں ہو گئی... اس لیے نہیں کہ وہ ایک بار پھر سانس لے رہی تھی۔ اس لیے وہ اس کے سامنے سانس لے رہی تھی۔
اس لیے نہیں کہ اس کی آنکھیں کوئی اور منظر دیکھ رہی تھیں۔ بلکہ اس لیے کہ وہ اسے دیکھ رہی تھیں...
"وصی۔" اس کے لبوں نے نامحسوس سی سرگوشی کی۔
"ہاں... وصی... تمہارا وصی۔" وصی نے اس کے کپکپاتے ہاتھ گرم جوشی سے دبا کے اسے یقین دلانا چاہا۔
سوہا کی پلکیں سکون سے مل گئیں۔
اس کے زرد چہرے پہ ہلکورے لیتا اطمینان اور سفید پڑتے ہونٹوں کی مسکراہٹ وصی کے دل سے احساس جرم کو کم کرنے لگے۔

☼ ☼ ☼

"کہاں تھے آپ؟"
پورے دو دن کے بعد وہ گھر لوٹا تو پہلے پروین کی خفگی سہی... جسے خرم نے نجانے کیا کچھ کہہ کر ٹال رکھا تھا۔ اس کے بعد سراج دین کی ڈانٹ ڈپٹ سنی... شوکت جہاں نے زیادہ کرید تو نہیں... لیکن یہ ظاہر بھی کیا کہ انہیں خرم کے بتلائے بیان پہ کچھ خاص بھروسہ نہیں ہے۔ سب کا سامنا کرنے کے بعد وہ کمرے میں پہنچا تو وشمہ بگڑے تیور لیے، آنکھوں میں آنسو بھرے پوچھ رہی تھی۔
وہ ٹھٹکا۔ پھر گڑبڑا کے رہ گیا۔
اس صورت حال کے بارے میں تو سوچنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا۔ وہ وشمہ کے وجود کو یکسر فراموش کر بیٹھا تھا۔
"تمہیں کسی نے بتایا نہیں؟" کچھ سنبھل کے اس نے گول مول بات کی۔
"میں آپ سے جاننا چاہتی ہوں۔"
"اس گھر میں کوئی جھوٹ نہیں بولتا۔"
اسے حقیقتاً تکلیف ہوئی تھی کہ غلط بیانی بے شک ہوئی تھی۔ مگر اس کی جانب سے... پھر اس کی وجہ سے باقی لوگ کیوں ناحق قرار دیے جائیں۔

"ایسا کون سا دوست ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے کوئی دو دن گھر آنا بھول جائے۔"
"ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے بھی... ہوتی ہے کسی کسی کے جذبے میں اتنی طاقت کہ وہ دوسرے کو باندھ کے رکھ لے۔"
وشمہ کے کہنے پہ وہ اپنی تیوریاں درست کرتی اس کے پاس آئی۔
"کیا مجھ میں آپ کو وہ بات نظر نہیں آئی؟"
"مجھے تم ہی نظر نہیں آتیں۔" وہ خاموش رہا تھا مگر اس کا دل کہہ اٹھا تھا۔
"بتایئے نا۔" وہ مصر تھی۔ جواب جاننے کے لیے۔
"میں تھکا ہوا ہوں۔"
اسے آہستگی سے ایک جانب ہٹاتے ہوئے وہ واش روم کی جانب بڑھ گیا تھا۔
"تمہاری ساس تو ٹھیک ہے تمہارے ساتھ؟"
مدیحہ شادی کے بعد پہلی بار گھر آئی بیٹی سے بات کر رہی تھی۔ گویا اپنی تسلی کرنا چاہ رہی تھی۔
"جی... بہت اچھی ہیں... خیال رکھتی ہیں، محبت سے بات کرتی ہیں۔"
"اور نندیں؟... بڑی والی تو خیر وہ بیاہی ہے، بے بھی سیدھی سادی... دوسری تو اسی گھر میں رہتی ہے، دیکھنے میں بڑی سنجیدہ لگتی ہے۔ ایسے لوگ ہوتے تیز ہیں۔"
"نہیں ماما۔ ان کی عادت کی بہت اچھی ہے، کم گو... مگر نرم خو ہے... بہت زیادہ ہی حساس... بہت خیال کرنے والی...."
"اچھا... اور وہ چھوٹی... وہ کافی تیز لگتی ہے مجھے۔ ایک تو سب سے چھوٹی... اوپر سے کنواری... بیاہی نند کا ڈھب الگ... اور کنواری کا الگ سو پہ بھاری... ویسے بیاہی بھی گئی تو ملا کی دوڑ مسجد تک... یہیں چلی جائے گی.... بس اسی جانب سے کچھ کھٹکا ہے میرے دل میں۔"
"آپ بے کار وہم پال رہی ہیں ماما! تینوں بہت اچھی ہیں... روا کو تو اپنی پڑھائی کے علاوہ کسی کام میں دلچسپی ہی نہیں ہے۔"
"ہاں تو بڑی جاتے ہیں نا... اکلوتا بیٹا اور اکلوتا بھائی ہے خرم... اور اکلوتوں کے معاملے میں ماں، بہنوں کا دل تنگ ہوتا ہے۔ اس لیے میں پریشان تھی۔ اور باقی لوگ... تمہاری دادی ساس... چچی ساس... وغیرہ... اور ہاں وہ تمہاری دیورانی... نئی دلہن... اس کے ساتھ کیسے تعلقات ہیں تمہارے؟"
"سب لوگ بہت اچھے ہیں ماما! اور وشمہ کے ساتھ بھی تعلقات بس نارمل ہیں... نہ برے... نہ زیادہ دوستانہ، وہ اپنی عادت لیے دیے رہنے والی ہے۔"
"اچھا ہے... تم بھی زیادہ بہنا پا گانٹھنے نہ بیٹھ جانا۔ کون سا تمہاری سگی دیورانی ہے۔ سسرال میں بہت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، کبھی کبھی بظاہر بہت بے ضرر سا فعل بھی گلے میں کانٹا بن کے اٹک جاتا ہے۔"
وہ چپ چاپ سر جھکائے سنتی گئی۔
سب کے بارے میں پوچھا ماں نے۔ بس ایک اسی کے بارے میں نہ پوچھا جس کے ساتھ عمر بھر کا ساتھ باندھا تھا ان کی بیٹی نے۔
"خرم کب تک آئے گا؟" مدیحہ کے سوال پہ وہ چونکی۔ "جی... پتا نہیں۔"
"کیا مطلب؟... تم سے بات نہیں ہوئی اس سلسلے میں؟"
"آپ نے کل سب کو ڈنر پہ بلایا ہے۔ سب کے ساتھ ہی آئیں گے۔"
"ہاں وہ تو ظاہر ہے۔ شادی کے بعد تم پہلی بار رات رک رہی ہو میکے میں۔ اس لیے میں نے سوچا سب کی دعوت کر دوں۔ پھر ان کے ساتھ ہی چلی جانا۔ لیکن تمہیں خرم کو بھی کہنا چاہیے تھا رات یہاں رکنے کے لیے۔"

"وہ کیا کریں گے رُک کر؟" وہ گھبرا اٹھی۔

نئی نئی شادی کے نئے سنئے دن تھے۔ مگر اس کا ساتھ تقدیس کے دل کو اچھوتے جذبات سے مہکانے یا جیسے بوجھل کرنے کے بجائے ایک عجیب سی گھبراہٹ میں مبتلا کر تا تھا۔

"میں خود کہہ رہی ہوں۔" وہ انھیں۔

"رہنے دیں نا ماما۔ میں اکیلی آپ کو اچھی نہیں لگتی؟"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟.... لیکن شادی کے بعد بیٹیاں شوہر کے ساتھ کھڑی ہی اچھی لگتی ہیں۔"

"پلیز ماما! بات کو سمجھنے کی کوشش کریں۔"

وہ سمجھا نہیں پا رہی تھی کہ ان اولین دنوں میں باپ کے سامنے شوہر کے ساتھ رہنا اسے حجاب میں مبتلا کر رہا تھا۔ اور دوسری وجہ اس کے اور خرم کے درمیان سرد تعلقات اور خرم کا شکوک بھرا رویہ بھی تھا۔ جس کی بھنک بھی وہ اپنی ماں اور بہن کو نہیں دینا چاہتی تھی۔

"میں صرف ایک رات اور ایک دن یہاں اپنے لیے گزارنا چاہتی ہوں۔ انہی پرانے دنوں کی یاد میں۔ پلیز۔"

"ارے۔ خرم بیٹا۔ تم؟" مدیحہ نے سامنے دیکھ کے حیرت سے کہا تو تقدیس کرنٹ کھا کے اچھلی۔

وہ لاؤنج کے دروازے کے بیچوں بیچ کھڑا سنجیدہ نظر آ رہا تھا۔

"تم اپنا بیگ کار میں ہی بھول گئی تھیں۔ دینے آیا تھا۔"

"آ گئے ہو تو چائے پی کے جانا۔ میں تقدیس کے پاپا کو بلا کے لاتی ہوں۔" مدیحہ کے اسٹڈی کی طرف جانے پہ تقدیس نے اسی حالت میں کھڑے خرم کو مخاطب کیا۔

"آپ بیٹھیں نا پلیز۔"

"نہیں۔ چلتا ہوں میں۔ اور مجھے افسوس ہے کہ میں تمہارے پرانے دنوں کی یاد میں مخل ہوا۔ بے فکر رہو۔ جتنی دیر تم یہاں ہو، میں نہیں آؤں گا۔ تم جی بھر کے پرانی یادیں تازہ کرو۔" اس کے بظاہر سادہ الفاظ کے پیچھے جو پھنکار تھی اس نے تقدیس کی ریڑھ کی ہڈی سنسنا کے رکھ دی۔

* * *

وہ ابھی ابھی چار گھنٹے اس کے ساتھ گزار کے آیا تھا۔

نہ صرف آج بلکہ پچھلے چار روز سے وہ آفس سے سیدھا ہاسپٹل چلا جاتا تھا اور آج تو آفس سے بھی دو گھنٹے پہلے نکل آیا تھا۔ آج سوہا کو ڈسچارج جو ہونا تھا۔

اور آج ہی اس کی منزہ کے میکے والوں کے ہاں دعوت بھی تھی۔ یعنی سوہا کے سگے ماموں اور ممانی کے ہاں۔ سوہا کی زبانی اس کی مشکلات بھری زندگی کی ساری داستان سن چکا تھا اور اس کی طرح اب خود بھی یہ سمجھنے لگا تھا کہ اس کی اس حالت کے ذمے دار جہاں وشمہ کا باپ اور پروین ہیں، جنہوں نے سوہا کے معاملے میں اپنے دل و دماغ نہیں کیا، وہیں منزہ کے بھائی بھابی بھی تھے جنہوں نے بھانجی کی کفالت سے انکار کرتے ہوئے اسے بچپن کے پیچھے دکھا اور ان ہی لوگوں کی وجہ سے اس نے اپنی زندگی کے ابتدائی تیرہ سال کسی فٹ بال کی طرح ادھر سے ادھر گزارے تھے۔

اسے بھی ان سب سے اتنی ہی نفرت محسوس ہوتی تھی جتنی کہ سوہا کو۔

منزہ اس کی ساس تھی۔ تو نوید مراد سسر۔ لیکن وہ ان کا سامنا کرنے سے کتراتا تھا انہیں دیکھ کے سوہا کی حالت کے بارے میں سچ بتانے کے لیے اس کا دل مچلنے لگتا تھا۔

پروین جن کو وہ ماں جتنی عزت دیتا تھا۔ اب ان کے سامنے کم سے کم آتا۔ مبادا وہ اس کی نظروں کے بدلتے رنگ دیکھ لیں۔

وشمہ جو اس کی شریک حیات تھی اس کی محبت تو اول دن سے نہ پا سکی تھی۔ البتہ ہمدردی یا رعایت کی مستحق بھی نہ بن سکی کیونکہ وہی وہ ہستی تھی جس نے بالواسطہ یا بلاواسطہ سوہا کی حق تلفی کی تھی پھر کیسے وہ وشمہ کے ساتھ منزہ اور نوید کی ہمراہی میں اس گھر دعوت کھانے چلا جاتا جس گھر میں سوہا کو دو وقت روٹی نہ کھلائی جا سکی۔

اسی لیے آج جان بوجھ کے وہ تاخیر سے گھر آیا.... ورنہ سوہا کا ڈسچارج تو چھ بجے تک ہی ہو گیا تھا.... وہ گھنٹے وہ بے کے ساتھ اس کے گھر میں رکا رہا۔

"تم کو ساری میڈیسنز باقاعدگی سے لینی ہیں۔"

اس کا ہاتھ تھامے وہ تاکید کر رہا تھا اور سوہا شرارت بھری آنکھوں کے ساتھ دیکھتی مسکرائے جا رہی تھی۔

"یہ بہت چور ہے دوا کھانے کے معاملے میں۔"

وصی کے سامنے جوس رکھتے ہوئے ریحانہ نے لقمہ دیا۔

"نہیں اب یہ دوا بھی وقت پہ لے گی۔ آرام بھی بہت سا کرے گی۔ خوش رہنے کی کوشش بھی کرے گی اور...."

"اب میں چلوں؟"

"تم تنی جلدی؟"

"کافی دیر ہو گئی۔"

"ہاں.... مگر میرے پاس تو ابھی آئے ہو.... پہلے وہاں ہاسپٹل میں تو فارمیلٹیز میں بزی رہے۔ پھر.... یہاں آئے ہو تو بس بے تعلق چھوڑ رہے ہو، کچھ دیر تو بیٹھو۔"

اس کے ترسے ہوئے لہجے پہ وصی کمزور پڑنے لگا۔ دھیرج سے اس کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہا۔

"ابھی کے تین بار فون آ چکے ہیں۔ مجھے جانا تھا۔"

"کہیں جانا ہے نا.... تمہیں کیا۔" پروین کے ذکر پہ سوہا کے ماتھے پہ ناگوار بل آئے۔

"میرے ساتھ ہی جانا تھا۔ ایک دعوت میں۔" وہ چور سا بن گیا۔

"شادی کی دعوت؟" سوہا کے لبوں پہ زہریلی مسکراہٹ آئی۔ "تو پھر صرف تمہاری ماں ہی تو ساتھ نہیں ہوں گی تمہاری دلہن نے بھی جانا ہو گا۔ وہ تین فون اس کے بھی آئے ہوں گے۔"

"سوہا پلیز!" وہ بے چارگی سے بولا۔ "کیوں ذہن پہ بوجھ ڈالتی ہو۔"

"یہ بوجھ تو اب عمر بھر رہے گا.... ذہن۔ بھی اور دل پہ بھی۔"

"تو فی الحال یہ سب مت سوچو۔ میں ابھی تم سے کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔ ایسا کوئی بھی وعدہ جسے جلد بازی میں زندگیوں کو بھرپور کرنے کے لیے سوچنا پڑے وقت بہت سے فیصلوں کو خود ہی آسان کر دیتا ہے۔"

سوہا نے مطمئن ہوتے ہوئے سر ہلا دیا۔ وصی کی آنکھوں میں یقین کی چمک نے اسے مطمئن کیا تھا۔

"ویسے جانا کہاں ہے؟" وہ نارمل ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

"تمہارے ماموں کے گھر۔" وہ ہلکے پھلکے انداز میں بتانے لگا۔

"میرے ماموں؟" وہ چونکی۔ کتنے ناشناسا سے لگنے لگے تھے یہ لفظ یہ رشتے اور یاد آتے ہی جیسے پرانے زخموں کے منہ کھلنے لگے۔ خون پھر سے رسنے لگا وہ سب زہریلی یادیں جو ان رشتوں کے حوالے سے وابستہ تھیں۔ وہ سب تو اس نے وصی کے سامنے دہرا دیں وہ تو دل کا بوجھ ہلکا کر کے سبک ہو گئی۔ لیکن جب وصی وہاں سے نکلا تو اس کے جیسے پہ پھر رستے تھے۔

* * *

نئی نئی شادی کی۔

"وصی آئے نہیں اب تک؟"

ہلکے پیازی رنگ کے کامدار زری بوٹ کے جوڑے میں ملبوس بڑے سے بھاری کام والے آسمانی دوپٹے کو ڈھنگ سے ڈالے سفید اور ہلکے نیلے نگوں والے سونے کے گلوبند اور چوڑیوں سے آراستہ ایک کلائی کو سوت

کی ہم رنگ کانچ کی چوڑیوں سے اور دوسری کلائی کو سونے کی جڑاؤ چوڑیوں کے سیٹ سے بھرے وہ نفاست سے میک اپ میں پوری طرح تیار پروین سے کوئی چوتھی بار پوچھ رہی تھی۔

وہ خود وصی کے اب تک نہ آنے اور فون پہ تسلی بخش جواب نہ دینے پہ الجھی ہوئی تھیں' بار بار کے استفسار پہ چڑ گئیں۔

"مجھے کیا پتا' آتا ہوگا۔"

اور پھر ایک نظر اس کی بھرپور تیاری پہ ڈالی۔

شادی کو سولہ سترہ دن ہوئے تھے' ایسا سنگھار انہوں نے بھی ان دنوں میں خوب کیا تھا بلکہ شوکت جہاں نے زبردستی کرایا تھا۔ وہ وقت ہی اور تھے۔ کہیں جانا ہو یا نہ جانا ہو۔ دلہنوں کے لیے ہر وقت سونا لادے رکھنا اور بار سنگھار کیے رکھنا لازمی تھا۔ موسم ہو یا نہ ہو' سال بھر روز جہیز اور بری کے بھاری جوڑے پہننا بھی ضروری ہوا کرتا تھا۔ لیکن اب وقت بدل گیا تھا۔ انہیں بھی اچھا لگتا تھا کہ گھر کی بہوئیں بن سنور کے پہن اوڑھ کے رہیں لیکن وشمہ کی یہ عادت ذرا معمول سے ہٹ کے تھی۔

تقدیس بھی اس کے ساتھ بیاہ کے آئی تھی۔

سلیقے سے پہن اوڑھ کے رہتی۔ کلائی میں کانچ کی چوڑیاں بھی ہوتیں.... ساتھ سونے کے کنگن بھی۔ اس کا چھنکا سیٹ بھی پہن رکھا ہوتا یا لاکٹ اور ٹاپس تو ہر وقت پہنے ہوتے لیکن میک اپ کے نام پہ لپ اسٹک اور کاجل بس۔ جہیز میں بھی دو چار بھاری جوڑے تھے۔ باقی سب جدید تراش خراش کے کڑھائی والے یا پرنٹڈ سوٹ۔ بری بھی ظلِ ہما اور ندا نے بنائی تھی۔ ندا کی ابھی ابھی شادی ہوئی تھی اور اسے تجربہ تھا کہ پرانے جنوں کے حساب سے تیار کیے لہنگے اور بھاری کام والے جوڑے کیسے بےکار پڑے رہتے ہیں اور چند ماہ بعد ہی فیشن کے حساب سے پرانے ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اس نے ہما کے جہیز اور تقدیس کی بری کے لیے خاص یہ اہتمام کیا تھا۔ خود وہ حجاب کی وجہ سے شادی کے فوراً بعد ہی سے معمول کے رنگ ڈھنگ میں نظر آنے لگی تھی۔

ظلِ ہما بھی شوکت جہاں کے ٹوکنے کی وجہ سے شام کے اوقات میں مقدور بھر تیار ہو جایا کرتی تھی لیکن وشمہ کے تو رنگ ڈھنگ نرالے تھے۔ موڈ ناشتے کے لیے جب کمرے سے نکلتی تو فل میک اپ میں اور سونے کے ایک سیٹ پہنے ہوتی.... کہیں جاتے وقت تو حال ہی اور ہوتا جیسے کہ اس وقت تھا۔

"اور کون کون آ رہا ہے وہاں؟"

"بس ہم لوگ اور ماما' بابا۔"

"اچھا۔ میں سمجھی کوئی چھوٹی موٹی تقریب ہے شاید۔ تمہاری تیاری سے لگا تھا۔"

وشمہ جل کے رہ گئی۔ حالانکہ بہت سادہ انداز میں پروین نے احساس دلانے کی کوشش کی تھی کہ وہ ولیمہ کی دلہن کی مانند تیار ہے۔

"پہلی بار جا رہی ہوں ننھیال۔ شادی کے بعد بھی پہلی بار اور ویسے بھی پہلی بار۔ پہلے کسی نے کبھی جانے ہی نہیں دیا۔"

"تمہارے ننھیال نے خود ہی کبھی رابطہ نہیں رکھا.... نہ تمہیں پاس بلایا نہ ملنے کی خواہش ظاہر کی.... ورنہ ہم میں سے بھی کوئی نہ روکتا۔ رہے یہ لوگ تو یہ تمہارے ننھیال والے نہیں بھابی کے میکے والے ہیں۔"

پروین نے ہاتھ میں پکڑا دوپٹہ دوبارہ تہہ کرتے ہوئے ذرا تیز لہجے میں کہا۔

وشمہ بھانپ گئی کہ موڈ خراب ہونے کی وجہ سے پروین کا ساتھ جانے کا ارادہ ملتوی ہو گیا ہے۔ جو پہلے ہی ڈانواں ڈول سا تھا۔ منزہ کے ساتھ عرصے سے سرد خانے کا شکار تعلقات اب بالکل ہی تباہی کے دہانے پہ تھے کہ وہ اس کے میکے کی کسی دعوت میں شریک ہوتیں۔ لیکن اب معاملہ سدھر جانے کا تھا۔

منزہ کے بھائیوں اور بھابیوں نے صرف وصی اور وشمہ کو نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کو کھانے پہ بلایا تھا۔

اور ثنا گیارہ سال بعد وطن لوٹے تھے۔ اتفاق سے عین شادی کے دن پہنچے تھے۔ شادی کی اور بعد کی مصروفیت ہنے وہ منزہ سے کھل کے مل بھی نہ سکے تھے۔ کچھ منزہ بھی دل میں کھچاؤ لیے ہوئے تھی جسے ثنا نے محسوس کیا تھا اور اس کے خیال میں یہ بہترین موقع تھا' منزہ سے اپنے کشیدہ تعلقات سنوارنے کا جس کو بگاڑنے میں اور صرف حالات کارفرما رہے تھے۔

یہی سوچ کر انہوں نے وشمہ کے سارے سسرال کو انوائیٹ کیا تھا.... جو کہ ایک لحاظ سے منزہ کا بھی سسرال اس کی نند کا گھرانا.... لیکن یہ بات منزہ کو مسرور کرنے کے بجائے الٹا طیش دلا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا لوگوں سے وہ نفرت کرتی ہے' اس سے ہمدردی اور اپنائیت کا دعویٰ کرنے والے سب لوگ ان سے نفرت یں۔ لیکن بعد میں ٹھنڈے دماغ سے سوچا تو احساس ہوا یہی موقع ہے اپنے بھائیوں اور بھابیوں کی نظروں سے ترحم کے جذبے کو دھونے کا.... جو وہ کئی سالوں سے دیکھتی آ رہی تھی۔

کے فون آتے تو لہجہ شرمندہ شرمندہ سا ہوتا۔ جمشید بات کرتا تو شرمساری اور تاسف کے ملے جلے جذبات ساتھ.... جمیل بھائی اور کلثوم بھابی تو خیر سوہا والے معاملے کے بعد اس سے نظر بھی کم ملاتے تھے۔ بس عید برات پہ ملنا جلنا رہ گیا تھا.... منزہ کو ان سب کی ترس بھری نظریں زہر لگا کرتی تھیں۔ اسے لگا آج سالوں کی ت کے بعد موقع ملا ہے ان ترحم آمیز نظروں کو رشک بھری نظروں میں بدلنے کا۔

اس نے وشمہ کو خوب اچھی طرح تیار ہو کر آنے کا کہا۔ جس کا اسے ویسے بھی بہت شوق تھا۔ اور یہ تاکید بھی کہ اول تو پروین کسی بھی طرح آنے کا ارادہ موقوف کر دیں اور اگر آئیں بھی تو اس موڈ کے ساتھ کہ ان کا آنا یا نہ ایک برابر ہو۔

"میں نے ہر اس موقع پر اپنا دل کٹتے محسوس کیا ہے وشمہ! جس پہ مجھے خوش ہونا چاہیے تھا۔ اب میرا دل چاہتا کہ میں بھی سب کو ان کی روتی بسورتی سی شکل دکھاؤں.... عید پہ بھی میرے بھائی بھابی مجھ سے ملنے آتے تھے تو کوئی ایسی بات ضرور ہوتی تھی جس میں اپنا بھرم رکھنے کی خاطر بھی جھوٹ موٹ کی ہنسی کا لبادہ تمسخر اوڑھ تی۔ اب میں کھل کے خوش ہونا چاہتی ہوں۔ سب کو بتانا چاہتی ہوں کہ میں ایک ناکام عورت نہیں ہوں۔ ایک بیٹی مجھ سے الگ ہوئی ہے تو دوسری نے اس سے بڑھ کر میری ممتا کی تسکین کی ہے۔ میں سرخرو ہوئی ہ میں سب کو فخر سے بتانا چاہتی ہوں۔"

"ایسا ہی ہوگا ماما۔" وشمہ نے یقین دلایا تھا اور اب لال بھبوکا چہرہ لیے دوپٹہ واپس الماری میں رکھتی پروین کے دعوے کو غلط ثابت کرنے جا رہی تھیں۔

"کہاں جا رہی ہیں آپ؟" اس نے ٹھٹک کر پوچھا۔ پروین رات پہننے والی سوتی شلوار قمیص نکال کر واش روم جانب جا رہی تھیں۔

"کپڑے تبدیل کرنے.... وصی تو اب تک آیا نہیں اور ظاہر ہے تم اس کے بغیر تو جانے والی نہیں.... پتہ نہیں آئے.... میں اتنی رات گئے تک نہیں جاگ سکتی۔ نہ دیر سے کھایا کھانا ہضم ہوتا ہے مجھے۔"

"سب آپ وصی کو نہیں نا.... انہیں یاد نہیں کہ ہم نے جانا تھا۔"

"کتنے فون کروں میں.... بلاوجہ کیوں تنگ کر رہی ہو وشمہ!" اس بار پروین نے ذرا نرم لہجے میں کہا۔ "گھر سے کو سو کام ہوتے ہیں۔ تمہارے پھوپھا کی مثال تمہارے سامنے ہے۔ تم نے اپنے ہوش میں انہیں کتنی بار ساتھ اپنے سسرال آتے دیکھا ہے.... دھیرج رکھنا سیکھو۔ زیادہ سوال جواب سے مرد چڑ جاتے ہیں۔"

انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں سچ کی بات بتانی چاہی مگر وشمہ کے دل میں مزید غبار بھر گیا.... اس نے وصی کی حمایت بلاوجہ نہیں کی جا رہی بلکہ ضرور خود کسی نہ کسی کام سے گھر سے باہر ٹھہرا رکھا ہے' صرف اسے جلانے کے لیے۔

"کیا ضرورت نہیں کڑھ کڑھ کے اپنی صحت خراب کرنے کی۔ میری حالت دیکھو' اندر ہی اندر سب

برداشت کر کر کے کئی روگ لگا لیے۔۔۔ وہ لوگ اچھے رہتے ہیں جو یا تو دل میں آئی ہر بات ہر غبار سے ہر گز اور فوراً سے نکال باہر کرتے ہیں، سامنے والا بھلے جو بھی سوچے یا پھر وہ لوگ جو بے حسی کی چادر اوڑھے رہتے ہیں۔"
منزہ کا سکھایا سبق یاد آیا۔ اور وہ چہرے کے تاثرات کو ایک خوبصورت سی مسکراہٹ میں چھپاتے ہوئے بولی۔
"اوہ۔۔۔ گجرے منگوائے تھے حسان بھائی سے۔۔۔ پھول لائے کہ نہیں؟"
"گجرے؟" پروین کو وحشت ہونے لگی۔ انہیں ذرا اچھی نہیں لگتی تھیں بالوں میں بھاری گجرے لٹکانے والی عورتیں لیکن وشمہ کو کتنا ٹوکتیں اور کس کس بات پہ ٹوکتیں۔ ہاتھ میں پکڑے رات پہننے والے سوٹ کو دیکھ کے ملال اور بڑھ گیا۔ اب بار بھی تو وشمہ نے اصرار نہیں کیا تھا ساتھ چلنے کو۔
اور وہ خود تذبذب میں تھیں کہ غصے میں آ کے دعوت میں نہ جانے کا فیصلہ جلد بازی تو نہیں؟ اب دل ہی دل میں یہ بات پکی کر رہی تھیں کہ اب جو بھی ہے۔ انہیں کہیں نہیں جانا۔۔۔ کم از کم وشمہ کے ساتھ یا منزہ کے رشتے دار کے ہاں تو ہرگز نہیں۔
وشمہ حسان کے لائے گجرے پنوں کی مدد سے چوٹی پہ ٹانک رہی تھی جب آئینے میں اپنے عکس کے پیچھے اس نے وصی کو نمودار ہوتے دیکھا۔ اس کے چہرے پہ رونق سی آ گئی۔
"آ گئے آپ؟۔۔۔ اتنی دیر۔"
وصی کو اس کے لدے پھندے وجود سے الجھن سی محسوس ہوئی۔ اس کی وہ معصومیت۔۔۔۔ وہ سیدھا سادہ حسن اب نظر ہی نہیں آتا تھا۔ شاید چہرے کا حسن باطن کے شفاف ہونے سے مشروط ہوتا ہے۔ یہی وشمہ تھی۔۔۔ جسے جب کبھی دیکھتا تھا تو چینی کی مورت جیسی لگا کرتی۔۔۔ بھولی بھالی۔۔۔۔ اور اب جیسے کوئی حسین مگر بے جان، بے کشش مجسمہ۔ پتھر کا مجسمہ۔
اور وہی سوہا جو پہلی ملاقات میں اسے بے حد عام بلکہ سطحی سی لڑکی لگی اور جس کے قریب وہ محض جذبہ ہمدردی کے تحت ہوا تھا۔ ورنہ اس کی ظاہری شخصیت میں ایسا کچھ نہ تھا جو وصی جیسے لڑکے کو متاثر کرتا۔ لیکن اب وہی سوہا اسے ساری دنیا سے پیاری لگتی تھی۔
"آپ کو یاد نہیں تھا آج ہمیں۔۔۔"
"یاد تھا۔" مختصر جواب دے کر وصی نے وشمہ کی یہ خوش فہمی بھی توڑ دی جو اسے سہارا دیے ہوئے تھی کہ شاید اسے یہ بات ہی بھول گئی ہو۔
"پھر؟ کوئی کام پڑ گیا تھا ضروری؟"
"ظاہر ہے۔۔۔ بغیر کسی کام کے تو سڑکوں پہ نہیں پھر رہا تھا۔"
وہ تھکے ہارے انداز میں بیڈ پہ بیٹھ کے شوز اتارنے لگا۔ "بہت تھک گئے ہیں؟"
وصی نے جواب دینا ضروری نہ سمجھا اور وہیں آڑا ترچھا لیٹ گیا۔ اسے لیٹا دیکھ کے وشمہ کو گھبراہٹ ہونے لگی۔
"لیٹ کیوں گئے ہیں؟ تیار ہو جائیں نا۔ دیر ہو رہی ہے۔"
وصی کا دل چاہا خود کمرے سے نکل جائے یا اسے نکال دے۔ جتنا وہ سوالوں اور تکرار سے بچنا چاہ رہا تھا اتنا ہی وہ زچ کیے دے رہی تھی۔
"کرتے سوٹ نکال دیا ہے میں نے۔۔۔ ساتھ میں یہ والی شرٹ اور ٹائی جچے گی۔"
اب وہ الماری میں سے شرٹ نکال کر دکھا رہی تھی۔
وصی نے مٹھیوں میں بال جکڑ لیے۔
"کیا ہوا؟۔۔۔ سر میں درد ہو رہا ہے؟"
وصی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ کہ شاید اب ترس کھا کے ہی وہ اسے اس کے حال پہ چھوڑ دے لیکن۔
"اوہ۔۔۔ آپ شاور لے لیں۔۔۔ طبیعت فریش ہو جائے گی۔ تب تک میں چائے بنا لاتی ہوں اور ساتھ میں پین کلر بھی۔"

نجات کہیں نہیں تھی اس لیے ناچار اسے تولیہ لے کر واش روم میں جانا ہی پڑا۔
پروین خود تو نہ گئیں لیکن وصی کو کسی نہ کسی طرح انہوں نے نہ جانے کے ارادے سے باز رکھا جو آخری وقت تک بہانے بنا رہا۔ پروین نہ گئیں تو شوکت جہاں نے بھی جانا مناسب نہ سمجھا۔ سراج دین ویسے ہی نہ جا رہے تھے۔ ہما کی طبیعت ٹھیک نہ ہونے کی وجہ سے وہ اور حسن پہلے ہی معذرت کر چکے تھے۔
وصی کو بیس منٹ کی ڈرائیو اکیلے وشمہ کے ساتھ کرنے میں اور بھی کوفت کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔ اس کی ساری ادائیں۔۔۔ ساری باتیں، ساری ان تھک کوششیں ایک ایک کر کے ضائع ہوتی گئیں۔ وہ کسی بے جان چیز کی طرح بیٹھا سامنے دیکھتا کار چلاتا رہا۔ نتیجتاً جمیل کے گھر پہنچنے تک منزہ کی ساری ہدایتوں کو فراموش کر کے وشمہ اپنا موڈ بری طرح خراب کر چکی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

خرم صرف چار منٹ رکا تھا۔
لیکن ان چار منٹ میں وہ اسے بری طرح ہلا کے رکھ گیا تھا۔
شادی کی اولین رات سے جو خدشہ کسی بچھوے کی طرح تقدیس کے دل پہ سرسرا رہا تھا آج پھن پھیلائے ناگ کی طرح سامنے آ گیا۔
اس کا شریک حیات اس پہ اعتبار نہیں کرتا تھا۔
اسے اس کی ذات کے حوالے سے بہت سے ابہام تھے۔
اور تقدیس کو نہ تو اس کی وجہ سمجھ میں آ رہی تھی۔۔۔ نہ اس کے سدباب کا کوئی راستہ سجھائی دے رہا تھا۔
ایک بالکل انجان شخص۔۔۔ جس سے بے شک ایک گہرا رشتہ قائم ہو چکا تھا لیکن ابھی انہوں نے ایک دوسرے کو جاننے اور پہچاننے کے عمل سے گزرنا تھا اور وہ پہلے ہی اس کے بارے میں اپنی رائے مستحکم کر چکا تھا۔۔۔ ایک ایسی رائے جو سراسر غلط فہمی پہ مبنی تھی۔ پہلے دن ہی سے دونوں میں سے کسی نے نہ فاصلوں کو پاٹنے کی کوشش کی تھی نہ ان غلط فہمیوں اور غلط گمانیوں کی وضاحت کی اس لیے اسے بے حد دشوار لگ رہا تھا کہ کیسے وہ خرم سے اس موضوع پہ بات کرے۔
اگر وہ محض مہندی کے فنکشن میں سوہا کی جانب سے کیے تماشے کی وجہ سے یہ سب سوچ بیٹھا ہے تو کیا اسے اپنی پوزیشن واضح کرنی چاہیے یا اس کی جانب سے رائی کا پہاڑ بنا لینے پہ اپنی نسوانیت کا وقار اور انا کا پرچم بلند کرتے ہوئے خود بھی خفا ہو جانا چاہیے۔
اگر کسی اور نے اس کے خلاف خرم کے کان بھرے ہیں تو کیا وہ۔۔۔
"تقدیس!" مدیحہ کی آواز پہ وہ ادھیڑبن سے نکلی۔
"جی ماما!"
"کیا بات ہے۔۔۔۔ کل سے نوٹ کر رہی ہوں تم کچھ کھوئی کھوئی سی ہو۔"
"نہیں ماما! ایسی تو کوئی بات نہیں۔"
اسے مدیحہ کی کھوجتی نظروں سے الجھن ہوئی۔ وہ اپنی پریشانی کا اظہار کسی سے بھی نہیں کرنا چاہتی تھی۔۔۔ اپنی ماں سے بھی نہیں۔ اپنی ہی ذات کے ہلکا ہونے کا احساس ہوتا تھا۔
"مجھ سے بھی چھپاؤ گی؟"
"تحریم آپی کا کوئی فون آیا؟" اس نے ٹالنے کی کوشش کرتے ہوئے بات بدلی۔
"میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔۔۔ سچ سچ بتاؤ۔۔۔ تمہارے سسرال میں سب ٹھیک ہے نا؟"
"ایسا کچھ نہیں ہے ماما۔۔۔ پلیز یقین کریں۔۔۔ وہ تو۔۔" وہ روانی سے بتاتے بتاتے پھر رک گئی۔
"تو کیا خرم؟" وہ معاملے کی تہہ تک پہنچ ہی گئی تھیں تو اب مکرنے کا فائدہ۔۔۔ سو وہ خاموشی سے سر جھکا کے رہ گئی۔
وہ کسی کا بھی نام لے لیتی۔ ساس کا، نند کا، دیورانی کا شاید مدیحہ اسے اتنی سنجیدگی سے نہ لیتی۔ لیکن خرم کا نام

ایک پل کے لیے تو اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا لے آیا۔

"یا میرے خدا! تم ... تم بھی۔" وہ سر پکڑ کے بیٹھ گئیں۔

"میں ہمیشہ ڈرتی تھی کہ میری قسمت کی ہلکی سی پرچھائیں بھی میری کسی بیٹی پہ نہ پڑے... میں ہر وقت یہی دعا کرتی تھی... لیکن میں ایک دعا کرنا بھول گئی کہ یا اللہ میری بچیوں کو ان کے باپ کے اعمال کی سزا نہ ملے۔ لیکن...

"خود ساری عمر آوارگیوں میں گزار دی تمہارے باپ نے اور یہ نہ سوچا کہ اس کی اپنی بیٹیوں کے آگے آسکتا ہے یہ سب۔"

"لیکن ماما! ..." اس نے کہنا چاہا۔

"خرم شادی سے پہلے کسی کو چاہتا تھا یا پھر اس نے پہلے سے شادی کر رکھی ہے؟"

"بس ایسے ہی ذرا ... ہماری انڈر اسٹینڈنگ... دراصل ہمارے مزاج بہت الگ الگ ..."

"بس بس رہنے دو تقدیس! یہ مزاج اور انڈر اسٹینڈنگ کی باتیں تو فضول ہی ہوتی ہیں۔ اگر کسی کا دل صاف نہ ہو تو وہ کسی کے ساتھ بھی رشتے کو نبھا نہیں سکتا... میں خود بات کروں گی تمہاری ساس کے ساتھ۔"

"خدا کے لیے ماما! کیوں بات کو بڑھا رہی ہیں؟" وہ گھبرا اٹھی۔

"اب تو آمنے سامنے ہوگی یہ بات ذرا پوچھوں تو سہی ان سے کہ جب ان کے بیٹے کا کسی اور سے چکر تھا تو میری بچی کی زندگی برباد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ دیکھیں ماما... میں آپ کے آگے ہاتھ جوڑ رہی ہوں... خدا کے لیے اس بات کو یہیں چھوڑ دیجیے... میں نے بہت غلطی کی جو اپنی ایک ذرا سی پریشانی آپ سے شیئر کرنا چاہی... یہ سوچ کر کہ آپ ایک ماں بن کے ایک دوست کی طرح مجھے کوئی مشورہ دیں گی۔ لیکن آپ نے تو ہمیشہ جذبات میں آ کے بات بگاڑی ہی ہے۔ سنواری نہیں۔ جو حشر آپ نے اپنے اور پاپا کے رشتے کا کیا ہے اب آپ میری زندگی کا کرنا چاہتی ہیں۔"

مدیحہ سن بیٹھی اپنی ہی بیٹی کے منہ سے یہ فرد جرم سن رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

"میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اب مستقلاً پاکستان میں ہی رہوں گا۔"

خرم کے فیصلے نے رخشندہ اور معراج دین کو بے حد مسرور و مطمئن کیا تھا... وہیں ابھی ابھی میکے سے واپس آتی تقدیس کو ندرے حیرت ہوئی۔

ابھی اس دن تو وہ ندا آپی کے شوہر سے یہ ڈسکس کر رہا تھا کہ سرمائے کی کمی کی وجہ سے وہ پاکستان میں فی الحال کاروبار کی پوزیشن میں نہیں ہے اور باپ کے گارمنٹس کے بزنس میں شروع سے اس کی دلچسپی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دوسری جانب اس کی جو فیلڈ ہے اس میں یہاں اسکوپ نہ ہونے کے برابر ہے۔

شادی سے پہلے رخشندہ نے بھی تقدیس کے گھر والوں سے یہی کہا تھا کہ شادی کے فوراً بعد وہ واپس چلا بھی گیا تو جلد از جلد تقدیس کو پاس بلانے کی کوشش کرے گا۔

اس کے اس اعلان سے ظاہر ہے کہ اس کے ماں باپ اور بہنیں تو خوش ہونے ہی تھے ... اکلوتا بیٹا، بہنوں کا بھائی تھا ... اور کئی سال سے پردیس میں بھی تھا۔

ندا نے تو برملا اسے تقدیس کی محبت کا اعجاز کہا۔

"ہاں بھئی... چند دن کی دوری بھی برداشت نہیں ہو رہی ہوگی اب تو۔"

تقدیس اس شریر تبصرے پہ پھیکے پن سے مسکرا دی۔ بعد میں چونک کر رہ گئی جب اکیلے میں خرم نے اس کی تائید کی۔

"میں نے واقعی یہ فیصلہ تمہاری وجہ سے کیا ہے۔"

اس کا لہجہ عام سی گر انداز تھے سے بے گانہ سے تھے کہ وہ کوئی خوش فہمی بھی نہ بن سکی۔

"پتا نہیں تمہارے پیپرز بننے میں کتنا وقت لگے... میں تمہیں یہاں اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ میری بہنیں بہت سیدھی سادی ہیں۔ اور ایک سیدھی سادی زندگی گزاری ہے انہوں نے... میری امی کو تجربہ نہیں ہے تم جیسی لڑکیوں کو ہینڈل کرنے کا اور میں نہیں چاہتا کہ میری غیر موجودگی میں تمہاری وجہ سے میرے گھر والوں کو کوئی پریشانی ہو۔"

ہتک کا اتنا شدید اور تلخ احساس اسے زندگی میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا تھا۔

"اور ساتھ لے بھی گیا تو کہاں سنبھالتا پھروں گا تمہیں ... کام کروں گا یا تمہاری ٹینشن لوں گا۔"

"آ... آپ... آپ ایسا کیوں سوچتے ہیں؟"

وہ سفید پڑتا چہرہ اور کپکپاتا وجود لیے پوچھ رہی تھی۔

ایک لمحے کے لیے خرم کو اپنے اندر نرمی سی محسوس ہوئی لیکن پھر طبیعت کا شکی پن غالب آگیا۔

"یہ سوال تم اپنے آپ سے کرو... جتنا تم خود اپنے آپ کو جانتی ہو میں نہیں جانتا۔"

"آپ مجھے بالکل بھی نہیں جانتے اور نہ جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

اس نے آنسو صاف کیے اور مضبوط لہجے میں کہا۔

"میں نہیں جانتی... آپ کس بنیاد پہ میرے کردار کو نشانہ بنا رہے ہیں... یہ محض غلط فہمی ہے یا کسی کی بدنیتی کا شاخسانہ... لیکن آپ کو کوئی بھی رائے قائم کرنے سے پہلے دل کی گواہی تو لینی چاہیے۔"

"میری نظروں کی گواہی کافی ہے... اور آنکھوں دیکھے کو میں جھٹلا نہیں سکتا۔"

بے حد تنفر سے کہتا وہ نکل گیا اور وہ حیران کھڑی دیر تک سوچتی رہی کہ آخر اس کی زندگی کا وہ کون سا لمحہ تھا جو خرم کی نظروں کی پکڑ میں آگیا؟ کون سا ایسا لمحہ ایسا گمراہ کن لمحہ جس کے بارے میں اسے کچھ یاد نہیں۔

☆ ☆ ☆ ☆

"سوہا سے ملنے کو بہت دل چاہتا ہے۔"

ثنا کے کہنے پہ منزہ نے اسے جن نظروں سے دیکھا تھا تو ثنا تو جمشید بھی شرمندہ ہو کر رہ گیا۔

"تم ... تو... میرا مطلب ہے کبھی کبھی ملنا تو ہونا ہو گا؟" ثنا نے ہمت کر کے دوبارہ پوچھا۔

"اس کی گنجائش ہی کہاں چھوڑی تھی۔"

اس کے خشک لہجے میں دیے جواب پہ ثنا نے ایک بار پھر ہمت ہار دی۔ وہ دوستی وہ اپنائیت وہ بے تکلفی جیسے کسی پچھلے اسٹیشن پہ چھوٹ چکے تھے۔

"سنا ہے عمر کے چچا و پھپھو نے اسے بہت ناز و نعم سے پالا ہے۔" اس بار جمشید نے سکوت توڑنے میں پہل کی۔

"ہاں... کسی کے دل میں تو رحم ڈالنا تھا اللہ نے جسے وہ پیدا کرتا ہے اس کے لیے کوئی نہ کوئی وسیلہ بھی بناتا ہے۔"

"دیکھو منزہ! اس وقت جو حالات تھے ان میں شاید جمیل بھائی نے اپنے لحاظ سے ٹھیک ہی سوچا تھا۔"

"اپنے لحاظ سے... میری اولاد کے بارے میں فیصلہ وہ اپنے لحاظ سے کیسے کر سکتے تھے؟"

منزہ کا برسوں کا رکا شکوہ بڑی تیزی سے لبوں تک آیا۔

"تو تم کر لیتیں۔" سدا کی صاف گو ثنا کے آئینہ دکھانے پہ منزہ کی ساری تیزی ماند پڑ گئی۔

"تم بھی تو تب یہی فیصلہ کرتیں... اور اسے اپنی مجبوری کا نام دے دیتیں تو کیا مجبوریاں دوسروں کو نہیں ہو سکتیں؟"

"چند سال... اگر صرف چند سال کوئی میرا ساتھ دیتا... میری بیٹی کو قبول کر لیتا تو آج اس کی اور میری زندگی وہ نہ ہوتی جو ہے... صرف چند سال... وہ کوئی غیر نہیں تھی میری اولاد تھی اور جن سے مجھے تعاون کی امید تھی وہ بھی غیر نہ تھے۔ میرے اپنے بھائی تھے۔ لیکن کسی نے دل سے نہ کہا! اپنے بچے بھی تو پل رہے تھے اگر وہ بھی..."

وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

"میں تو یہاں تھا نہیں ورنہ۔۔۔" جمشید نے جواز پیش کرنا چاہا جسے وہ خاطر میں نہ لائی۔

"وہاں رہ کے آپ میری حمایت میں کچھ کہہ تو سکتے تھے جمیل بھائی سے۔ میری پوزیشن جو تھی وہ آپ جانتے ہیں۔ جس گھر میں میری بیٹی کے لیے جگہ نہ نکل رہی تھی شوہر سے بگاڑ کے میں دوبارہ کیسے وہاں آجاتی۔۔۔ مجھے ہر حال میں وہ چھت چاہیے تھی۔۔۔ جلد یا بدیر میں اتنی گنجائش پیدا کر لیتی کہ سوہا کو اپنے پاس بلا لیتی لیکن اگر جمیل بھائی کا دل تنگ پڑ رہا تھا تو آپ نے کون سا کشادگی کی کوئی راہ دکھلائی۔ اگر سارا مسئلہ اس بچی کے ذرا سے خرچ کا تھا تو وہ آپ وہاں بیٹھے بھی اپنے ذمے لے سکتے تھے لیکن۔۔۔ لیکن کسی نے اس چند روزہ کفالت کی بھی ہمت نہ کی کہ کہیں عمر بھر کا بوجھ سر پہ نہ آن پڑے۔ سوہا یہاں رہتی تو میں کبھی بھی اسے ساتھ لے جاتی۔۔۔ کم از کم اسے اس کی مجبوری اور محبت کا احساس تو رہتا مگر یہاں تو کچے کانوں یہ کارروائی ہوئی۔۔۔ مجھے اپنے ہاتھوں سے سوہا سے دست برداری لکھنی پڑی صرف اور صرف جمیل بھائی کی تنگ دلی کی وجہ سے۔ آج میری بچی کے دل میں میرے لیے سوائے نفرت اور بیزاری کے اور کچھ نہیں۔ مجھے یہ بھی قبول تھا۔ بھلے وہ مجھ سے نفرت کرتی رہتی مگر اس کی اپنی زندگی سنور گئی ہوتی۔۔۔ میرے لیے یہ بھی بہت تھا۔ لیکن کاش 'کاش' آپ اس درد کو محسوس کر سکیں جو مجھے سوہا کی بربادی دیکھ کے محسوس ہوتا ہے۔ صرف ناز و نعم سے پال لیا سب کچھ نہیں ہوتا بھائی! ایک چیز تربیت بھی ہوتی ہے جو صرف ماں اپنی اولاد کو دیتی ہے اور میری سوہا اس سے محروم رہ گئی۔ میں پرائی بیٹی کو تراش تراش کے ہیرا بناتی رہی اور میری اپنی بچی اس وقت راستے کا پتھر بنی ٹھوکریں کھا رہی ہے۔"

اسے وشمہ کی مہندی کے موقع پہ سکیورٹی گارڈز کا سوہا کو دھکے دے کر نکالنا یاد آ گیا۔۔۔ اور آنکھیں جل تھل ہو گئیں۔

ثنا اور جمشید ایک دوسرے کی جانب دیکھ کے رہ گئے۔

منہ سے نظریں ملانے کا حوصلہ تو تھا نہیں۔

* * * *

حسن پروین کے کہنے پہ ظل ہما کو ڈاکٹر کی طرف لے جا رہا تھا۔ اسے پچھلے مہینے ڈاکٹر نے خوش خبری سنائی تھی۔ حسن کے رویے میں بھی فطری طور پہ خوشگوار تبدیلی آئی تھی۔

"سنیے۔۔۔ ذرا روکیں۔"

ظل ہما نے بے ساختہ حسن کا بازو پکڑ کے متوجہ کیا مگر اس کے پوچھنے پہ اب جھجک رہی تھی۔

"بولو نا۔۔۔ کچھ بھول آئی ہو گھر پہ!"

"نہیں وہ۔۔۔"

حسن نے اس کی نظروں کے تعاقب میں فٹ پاتھ پہ دیکھا۔ چند ایک ٹھیلے والے کھڑے تھے۔ سب سے نمایاں ہو رہے تھے رنگ برنگے غبارے۔

"غبارہ چاہیے؟"

ہما بے ساختہ کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

حسن نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ کچھ دنوں سے اسے ہما کے ہر انداز پر اوا پہ حیرت ہوتی تھی کہ یہ وہی لڑکی تھی جسے زندگی کا ساتھی بنا لینے کے بعد۔۔۔ اور قربت کی انتہائی ساعتوں میں بھی اس نے کبھی درخور اعتنا نہ سمجھا تھا۔ اب تو جیسے وہ رفتہ رفتہ دل میں اترتی جاتی تھی۔

"ابھی سے کیا کرنے ہیں غبارے۔ ابھی تو بہت وقت ہے۔"

"آپ بھی ناں۔۔۔ میں غباروں کا کب کہہ رہی ہوں۔۔۔ وہ شکرقندی۔۔۔"

"اوہ۔۔۔ شکرقندی۔"

حسن نے ڈیش بورڈ سے والٹ اٹھایا اور نکلتے نکلتے پھر رکا۔ ذرا تشویش سے ٹھیلے والے کی شکرقندی پہ منڈلاتی مکھیوں کو دیکھا۔

"نہیں بھئی۔۔۔ یہ ذرا بھی ہائی جینک نہیں ہے۔ تم نے سنا نہیں تھا اس دن ڈاکٹر نے کیا کہا تھا۔۔۔ کہ اب تمہیں کھانے پینے میں بہت احتیاط کرنی ہے اور اپنی صحت کا خیال رکھنا ہے۔ غذائیت اور طاقت والی خوراک کھانی ہے۔ پھل، دودھ، انڈے، گوشت وغیرہ۔۔۔ یہ شکرقندی کون سی سوغات ہے؟"

"میرا دل کر رہا ہے۔ کچھ کھٹ میٹھا چٹ پٹا کھانے کو۔" ہما نے منہ لٹکا لیا۔

"کچی لے چلتے ہیں۔ ابال لینا اور جو اللہ بلا چاہیے اوپر چھڑک کر کھا لینا۔"

اس کی تجویز پہ ہما نے متفق ہو کر سر ہلا دیا اور ہلکا سا مسکرا دی۔ وہ ایسی ہی تھی راضی برضا رہنے والی۔

کار دوبارہ اسٹارٹ کرتے ہوئے حسن کی نظر سڑک کے دوسری جانب گئی۔ اوپن ایئر آئس کریم کارنر میں کونے والی ٹیبل پہ بیٹھا بلاشبہ وصی تھا مگر اس کے ساتھ ایک ہی کپ میں آئس کریم کھاتی وہ ہنستی ہوئی لڑکی وشمہ نہیں تھی۔

حسن کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ کے ظل ہما نے بھی گردن گھما کے اس کی توجہ کا مرکز تلاشنا چاہا۔ اور اگلے ہی پل وہ بھی ساکت تھی۔

* * * *

"ایسا کب تک چلے گا سوہا؟"

یہ سوال کرنے کا ارادہ وہ کافی دنوں سے کر رہی تھی لیکن ہر بار سوہا کے بگڑتے مزاج اور صحت کا سوچ کر ڈر جاتی تھی۔۔۔ لیکن آج اس کی معمول سے زیادہ چھلکتی تنگناہٹ اور پورے بدن سے پھوٹتی مسکراہٹیں دیکھ کے ربینا نے ہمت کر ہی لی۔

"کیا سب؟" وہ انجان بن گئی۔

"یونہی۔۔۔ روز روز کئی کئی گھنٹے تک گھومنا پھرنا۔۔۔ اور پھر۔۔۔ پھر تمہارا اپنے گھر اور اس کا اپنے گھر لوٹ جانا۔"

سوہا جیسے کسی خواب سے چونک کر جاگی۔

"پہلے کی بات اور تھی اب وہ شادی شدہ ہے سوہا!"

"ماما پلیز!" اسے ہمیشہ یہ سن کر تکلیف ہوتی تھی۔

"میرے نہ کہنے سے سچ بدل تو نہیں جائے گا۔"

"سب سے بڑا سچ میری اور اس کی محبت ہے۔"

"محبت کی بے بسی میں بھی سمجھتی ہوں۔۔۔ یہ ایسی حد بندیاں نہیں مانتی۔ مگر آج کل کی نسل صرف محبت پہ اکتفا کرتی بھی تو نہیں۔۔۔ کیا تمہارے اندر اس کے ساتھ کی خواہش نہیں ہے۔ کیا تمہیں یہ سوچ کر جلن محسوس نہیں ہوتی کہ وہ اس وقت کسی اور کے ساتھ ہے؟ کیا تم ان سب جذبوں سے ماورا ہو؟" سوہا آہستہ سے نفی میں سر ہلانے لگی۔

"تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تمہاری اور وصی کی یہ محبت ایک منطقی انجام چاہتی ہے اور اس کی بیوی کے ہوتے ہوئے۔"

"نہیں ہے وہ اس کی بیوی۔۔۔ کوئی رشتہ نہیں ہے اس کا وشمہ سے۔۔۔ وصی نے مجھے خود بتایا ہے۔ قسم کھا کے۔"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔۔۔ میں مردوں کو اچھی طرح جانتی ہوں۔ بیویوں سے فیض اٹھانے کے لیے محبت کا ہونا ضروری نہیں سمجھتے۔۔۔ انڈر اسٹینڈ؟ اور اگر ایسا ہو گیا۔ تو وہ دن دور نہیں جب وہ صرف اس کی بیوی نہیں بلکہ اس کے بچے کی ماں ہو گی۔"

سوہا لرز کے رہ گئی۔

"بیوی کو چھوڑنا اسے اتنا مشکل لگ رہا ہے تو کیا اپنے بچے کی ماں کو چھوڑنا آسان لگے گا؟"

"تو۔۔۔ تو میں۔۔۔ میں کیا کروں پھر ماما؟"

"دو ٹوک بات کرو اس سے۔۔۔ اگر اسے بیوی سے واقعی ذرا سا بھی لگاؤ نہیں تو پس و پیش سے کام کیوں لے رہا ہے؟ تم سے اتنی ہی محبت ہے تو اپنا کیوں نہیں لیتا؟ میری بھی فکر ختم ہو گی۔"

"میں بات کرتی ہوں اماں۔۔۔"

☼ ☼ ☼

حسن نے وصی کو اپنے کمرے میں بلایا تھا۔۔۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ معاملے کی بھنک کسی اور کو پڑے۔ خصوصاً وشمہ کو وہ ٹھیس نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔۔۔ یہ اور اک بھی اسے اب ہوا تھا کہ وہ کتنا بھی خود کو بہلانے کی کوشش کرے۔ اس کا دل اب بھی وشمہ کے لیے ایک خاص گوشہ رکھتا تھا۔ جب ہی تو وصی کو کسی لڑکی کے ساتھ دیکھ کر اسے غصہ اسی بات پہ آیا تھا کہ وہ وشمہ کو دکھ پہنچانے کا سبب پیدا کر رہا تھا۔

"آپ نے بلوایا حسن بھائی۔"

"ہاں بیٹھو۔ ایک ضروری بات کرنا ہے۔"

"میں چائے بنا کے لاتی ہوں۔"

ظل ہما شاید جانتی تھی یہاں کس موضوع پہ گفتگو ہونے والی ہے اس لیے اس نے کترا کے نکلنا چاہا۔

"تم کل کس لڑکی کے ساتھ تھے؟"

حسن کے اچانک سوال پہ وصی لمحہ بھر کے لیے گڑبڑایا۔ مگر پھر اس نے کوئی بہانہ یا عذر تراشنے کے بجائے سیدھا جواب دیا۔

"وہ کوئی اور نہیں سوہا ہے۔"

"سوہا۔۔۔ وہ ہے۔ میں تو سمجھا تھا وہ اب "تھی" ہو چکی ہے؟" حسن نے تیوریاں ڈال کے پوچھا۔

"وہ پہلے بھی میری زندگی میں خاص مقام رکھتی تھی اور اب بھی۔ اور ایسے رشتے آسانی سے بھلانے کے لیے نہیں ہوتے۔"

"تم ہوش میں تو ہو وصی؟" حسن کو اس سے اس درجہ بے باکی کی امید نہیں تھی۔

"اور وہ جو اب تمہاری زندگی میں شامل ہے۔ اس کا کیا قصور ہے؟ کسی نے زبردستی اسے تمہارے سر نہیں منڈھا تھا۔ تم پورے ہوش و حواس میں اس کے لیے راضی ہوئے تھے جبکہ میں نے تمہارا پورا پورا ساتھ دینے کا وعدہ کیا تھا۔۔۔ کوشش کی جاتی تو سب لوگ سوہا کے لیے راضی ہو جاتے۔۔۔ اور وشمہ کی زندگی بھی برباد نہ ہوتی۔ تب تم تھے جس نے قدم پیچھے موڑے تھے اور اب تمہیں خیال آیا ہے محبت ثابت کرنے کا؟"

وہ غصے میں گرج رہا تھا اس بات کا خیال کیے بغیر کہ اس کی آواز باہر تک جا رہی ہے۔

"بعض اوقات محبت اپنا آپ تسلیم کروانے میں کچھ وقت لگا دیتی ہے۔"

"ہوش کرو وصی۔۔۔ یہ وقت ایسی جذباتی اور احمقانہ باتوں کا نہیں ہے یہ ایک زندگی کا سوال ہے۔"

"نہیں۔۔۔ یہ دو زندگیوں کا سوال ہے۔۔۔ میری اور سوہا کی۔"

"اور وشمہ۔۔۔ کیا وہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی؟ اس کی زندگی کیا صرف بساط میں بچھے ایک مہرے کی سی ہے؟"

"مجھے اس سے ہمدردی ہے اور بس۔۔۔"

"وہ صرف ہمدردی کے قابل ہے؟"

حسن اور بھی بپھر گیا۔۔۔ دبا کے رکھی محبت ابھر کے سامنے آ رہی تھی۔

"بے وقوف انسان! وہ چاہے جانے کے قدر کیے جانے کے قابل ہے۔۔۔ خوش قسمت ہو تم جسے اتنی اچھی بیوی ملی ہے اور تم کنکر چھان رہے ہو۔"

"آپ کے لیے سوہا کنکر سہی۔۔۔ میرے لیے ہیرا ہے۔" وہ ایک جھٹکے سے مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

حسن اندر ہی اندر پیچ و تاب کھا کے رہ گیا۔

نہ کوئی بہانہ۔ نہ اس راز کو راز رکھنے کی التجا۔

نہ آئندہ ایسی غلطی نہ دہرانے کا عندیہ۔

ویسا کچھ بھی تو نہ ہوا تھا جیسا حسن نے سوچا تھا۔

"یعنی وہ اس حد تک آگے بڑھ چکا ہے کہ اب اس کو اس کی بھی پروا نہیں کہ میں یہ بات باقی سب کو بتا ہوں یا نہیں۔"

ہما چائے لے کر اندر آئی تو وصی جا چکا تھا۔ حسن لال بھبھوکا چہرہ لیے بیٹھا تھا۔

"چائے۔۔۔ وصی چلا گیا؟"

"کاش۔۔۔ کاش وشمہ کی اس سے شادی نہ ہوئی ہوتی۔" اس کی بڑبڑاہٹ پہ وہ چونکی۔

"کیا کہا وصی نے؟"

"اندھا ہو رہا ہے وہ اس کے عشق میں۔"

"کوئی کولیگ ہے؟"

"نہیں۔۔۔ وہی جونک۔۔۔ سوہا!"

"سوہا۔۔۔ لیکن وصی نے تو خود اپنی اس خواہش سے دست برداری اختیار کرتے ہوئے وشمہ سے شادی کی ہامی بھری تھی۔"

"آنکھوں میں دھول جھونکی تھی فریبی انسان نے۔۔۔ لیکن ان سب میں اس معصوم لڑکی کا کیا قصور ہے جو بے چاری۔۔۔" اسی وقت کسی دروازہ زور سے بند ہونے کی آواز آئی۔

"یہ کیا ہوا ہے؟" وہ چونکا۔

"کچھ نہیں شاید ہوا سے دروازہ زور سے بند ہو گیا۔"

ہما نے یہ نہ بتایا کہ یہ دھماکا اسی معصوم اور بے چاری لڑکی نے کیا ہے جسے وہ ابھی ابھی کچن میں اپنی ساس کے ساتھ الجھتا چھوڑ کے آئی ہے جو نہ صرف اس کی بھی ساس۔۔۔ بلکہ سگی پھوپھی بھی ہے۔

☼ ☼ ☼
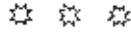
وہ بڑے خراب موڈ کے ساتھ کچن میں موجود تھی۔

پچھلے ہفتے ہی شوکت جہاں سے کہنے۔ اس کا ہاتھ کھیر میں ڈلوایا گیا تھا کیونکہ وہ کافی دنوں سے ظل ہما کو طبیعت کی خرابی کے باوجود مسلسل پروین کے ساتھ کچن میں مصروف دیکھ رہی تھیں۔

گھر میں کئی نوکر چاکر تھے لیکن کچن کا انتظام شروع سے گھر کی عورتوں کے پاس تھا۔ جب تک ان میں ہمت تھی پروین کا ہاتھ بٹایا کرتی تھیں کیونکہ رخشندہ تو بیٹیوں کی ماں تھیں۔ لیکن پروین اکیلی اور پچھلے دس بارہ سالوں سے شوکت جہاں بالکل ہی بستر کی ہو کے رہ گئی تھیں۔ کسی نہ کسی طرح پروین نے گزارے لائق گھر سنبھالا ہوا تھا۔

البتہ ہما نے آتے ہی سارا انتظام بغیر کسی کے کہے اپنے ہاتھ لے لیا۔ شادی کے آٹھویں دن بعد خود ہی میٹھا بنا کے سب کو کھلایا اور تب سے سب کی پسند اور صحت کے لحاظ سے کھانا پکا رہی تھی۔

ادھر کچھ دنوں سے یہ ہونے لگا کہ جہاں مسالہ بھونتے کھڑی ہوئی اور ابکائیاں شروع۔ ادھر دال کو بگھار لگایا ادھر متلی شروع۔ وہ ادھ موئی ہو گئی۔ تب شوکت جہاں نے دو مہینے اس کا داخلہ کچن میں بند کر دیا

وشمہ پہلے تو پرجوش سی ہوئی۔۔۔ لیکن ایک تو اس کے پکائے پہلے پہلے کھانے کو وصی نے دو نوالے لے کھا کے ہاتھ کھینچ لیا۔ اس سے دل برا ہوا سو ہوا۔۔۔ اوپر سے منجھو نے بھی اس کی کارگزاری سن کر لیکچر جھاڑ دیا۔

"میری طرح کچن کی ہو کے رہ جاؤ گی۔ پروین میں ساری عادتیں تمہاری دادی والی ہیں۔ اپنی ماں کی طرح وہ بھی کھٹنے والے کا سر زمین سے لگانا جانتی ہے۔ میری حالت سے سبق حاصل کرو۔ تم نے تو سب دیکھ رکھا ہے۔ تم جتنا راضی ہو کہ وصی تم سے اکھڑا اکھڑا رہتا ہے۔ کچن کی بو بو بن کے رہ گئیں تو وہ اور دور ہو جائے گا۔ کوئی ضرورت نہیں زیادہ گھر داری اور سگھڑ پن کے بگھارنے کی۔"

سب کا خیال تھا کہ بھیر میں ہاتھ ڈلوانے کے بعد وہ معمول کی طرح کچن میں آنا شروع ہو جائے گی۔ مگر ایک دن نہ دو دن۔ تین دن حتیٰ کہ پورا ہفتہ گزر گیا۔ وہ مہمانوں کی طرح عین وقت پہ کھانے اور ناشتے کے لیے نمودار ہو جاتی۔ شرما شرمی میں نہ شوکت جہاں سے کہا گیا نہ پروین سے۔ وہ تو ویسے بھی وشمہ سے الجھنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ اس کی نگاہوں کی بدلحاظی سے بڑا خوف آتا تھا اور وہ اپنی عزت اپنے ہاتھ والے مقولے پہ عمل پیرا تھیں۔

مگر ہما نہ بدلحاظ تھی نہ خود غرض۔ اسے اچھا نہ لگتا کہ وہ بستر پہ پڑی رہے اور پروین اکیلی کام کرتی رہیں۔ اس لیے کسی نہ کسی حال میں وہ ہاتھ بٹا ہی دیتی۔۔۔ لیکن آج جانے کیسے پروین سے رہا نہ گیا۔ چھٹی کا دن تھا سب گھر موجود۔۔۔ سب کا الگ الگ طرح کا ناشتہ بنانے میں ہلکان ہما کا رنگ زرد پڑ رہا تھا۔ آملیٹ کے لیے انڈا پھینٹتے ہوئے وہ بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھ کے واش روم کی طرف بھاگی تو پروین سے رہا نہ گیا اور انہوں نے آج ہی معاملہ صاف کرنے کا سوچا۔

"وشمہ! ناشتے کے بعد کچن میں آ جانا۔۔۔ دوپہر کھانے پہ اہتمام ہوگا۔ بریانی تم بنا لینا۔۔۔ ساتھ میں سلاد اور رائتہ مچھلی پہ مسالہ میں نے رات سے لگا رکھا ہے۔ وہ میں تل لوں گی۔ ذرا کُفل تو بعد میں ہما بھی بنا لے گی۔ اسے بس مسالوں کی بو سے شکایت ہے۔"

انہوں نے اپنے تجربے کی روشنی میں کام بانٹا۔ اولین دنوں میں جب شوکت جہاں نے ان پہ ذمے داریاں ڈالنا شروع کی تھیں تو ایسے ہی دونوں بہوؤں کو طریقے سے کام بتلائے تھے اور دونوں نے خوشی خوشی مل جل کے کیے بھی تھے لیکن وشمہ کے چہرے پہ ناگواری کی تحریر صاف پڑھی جا رہی تھی۔

بریانی کا مسالہ بھونتے ہوئے اس نے ہما کو اندر آتے دیکھا تو بڑے بھولے انداز میں طنز کیا۔

"آپ نے کیسے زحمت کی یہاں آنے کی؟۔۔۔ بریانی کا مسالہ بھن رہا ہے۔ کہیں آپ کو ناگوار نہ گزرے۔"

ہما پہ ٹیڑھی باتیں کم ہی اثر کرتی تھیں۔ وہ سادگی سے مسکرائی۔

"حسن اور وصی کے لیے چائے بنانا تھی۔"

اس نے رائتے میں ڈالنے کی غرض سے ابالنے کے لیے چڑھائے آلو کا برتن اتارا۔

"وصی کو چائے چاہیے تھی تو مجھ سے کہتے۔" وہ حسن کا ذکر گول کر گئی۔

"نہیں وہ تو دونوں بھائی مل کے بیٹھے ہیں تو میں۔۔"

"جب کھانا میں اکیلی بنا سکتی ہوں تو دو کپ چائے بنانے میں مجھے کیا مسئلہ ہو سکتا ہے۔"

وشمہ نے ایک جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے پتیلی لی تو وہ بھونچکا رہ گئی۔

"میں یہاں گرمی میں چولہے کے آگے تین گھنٹے کھڑی رہوں اور آپ چار منٹ میں دو کپ چائے بنا کے وصی کو یہ جتانا چاہتی ہیں کہ اسے اس گھر میں چائے بنا کے دینے والی صرف آپ ہیں۔"

"وشمہ!" پروین کی آواز پہ دونوں چونک کر مڑیں۔

ہما کے حواس باختہ چہرے پہ ایک رنگ آ رہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا جبکہ وشمہ پل بھر کے لیے گھبرائی پھر منہ کے بل نے جیسے جھٹکی سی دی اور وہ ڈھیٹ بن کے چائے کا پانی رکھنے لگی۔

ہما نے کترا کے نکلنا چاہا مگر پروین نے روک دیا۔

"تم چائے بناؤ ہما! اور وشمہ! تمہیں اتنی تمیز بھی نہیں کہ کسی سے کیسے بات کرتے ہیں۔۔۔ ہما تم سے عمر میں بھی بڑی ہے اور رشتے میں بھی۔"

"یہاں کون ہے جو عمر، رشتے اور حیثیت میں مجھ سے بڑا نہیں ہے۔" وہ بڑبڑانے لگی۔

ہما نے خاموشی سے چائے بنائی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ پیچھے کب دونوں کی بحث نے گرما گرمی اختیار کی، کب وشمہ احتجاجاً سارا کام چھوڑ کے دروازہ دھماکے سے بند کرتی نکلی۔ اسے خبر نہ ہوئی۔

☆ ☆ ☆

"ابھی یہ نہیں ہو سکتا سوہا! میں نے تم سے کہا تھا کہ ابھی مجھ سے کوئی وعدہ مت لو۔ فی الحال مجھے کسی آزمائش میں نہ ڈالو۔"

وصی نے اس کے مطالبے کے جواب میں منت کرتے ہوئے کہا۔

"لیکن وصی! ایسا کب تک چلے گا؟" اس نے ربنا کے الفاظ دہرائے۔ "اب تو مجھے ڈر لگنے لگا ہے۔ وہ چوبیس میں سے بارہ گھنٹے تمہارے ساتھ گزارتی ہے۔ تمہارے گھر والوں کی ہمدردیاں اس کے ساتھ ہیں۔ وہ تمہاری امی کی سگی بھانجی ہے جن کے تم پہ کئی احسانات ہیں۔ تم کبھی بھی کمزور پڑ سکتے ہو اور کچھ نہیں تو ان احسانات کے لیے ہی خود کو گروی رکھ سکتے ہو۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوگا سوہا! جو چیز اب میری رہی ہی نہیں وہ میں کسی اور کو دینے کا اختیار نہیں رکھتا۔ میں۔۔۔ میرا دل، میرا وجود، میرے جذبے سب اب تمہارے نام ہیں۔ یہ میں کسی اور کو کیسے دے سکتا ہوں۔"

"لیکن مجھ سے برداشت نہیں ہوتا کہ اس کے نام کے آگے تمہارا نام بھی لگے۔"

"سب ہو جائے گا۔۔۔ وہی جو تم چاہتی ہو۔۔۔ میری اپنی بھی یہی خواہش ہے لیکن پلیز کچھ دیر انتظار۔۔۔ ابھی وقت نہیں آیا۔"

□□□□

"اماں جان! آپ ہی کوئی مشورہ دیں۔ میری تو کچھ بھی سمجھ میں نہیں آ رہا۔"

تھک ہار کے پروین نے شوکت جہاں سے اپنا مسئلہ بیان کیا جو خود بھی کئی دن سے سارا تماشا دیکھ رہی تھیں۔

وصی کی وشمہ سے عدم دلچسپی سب پہ عیاں تھی۔ آفس سے سیدھا چھ ساڑھے چھ بجے گھر لوٹ آنے والا وصی اب رات گئے آتا۔۔۔ شاید ہی کسی نے اسے کبھی وشمہ سے ضرورتاً یا بلا ضرورت مخاطب ہوتے دیکھا تھا۔ اور ظاہر ہے کہ وشمہ کا ایسے میں تلخ ہونا سمجھ میں آتا تھا لیکن بالخصوص پروین کے ساتھ ہی کیوں؟ اس کا رویہ ایسا ہے؟ یہ کوئی نہ بھانپ پا رہا تھا۔

"میں تو کہتی ہوں غلطی سراسر وصی کی ہے۔۔۔ حسن بتا رہا ہے پھر سے اسی لڑکی۔۔"

"یہ ان دونوں کا ذاتی مسئلہ ہے خود نمٹائیں۔۔۔ میری مٹی کیوں پلید کر رہی ہے یہ لڑکی؟"

"ذاتی معاملہ کیسے ہوگا پروین۔۔۔ کوئی گھر سے بھاگ کر شادی نہیں کی انہوں نے۔ ہم نے کرائی ہے۔ اپنی ذمے داری پہ، اپنی خواہش پہ۔"

"مجھے یہ غلط فہمی تھی کہ وصی اسے پسند کرتا ہے۔"

"اور یہ غلط فہمی تو وصی نے پہلے ہی دور کر دی تھی کہ وہ وشمہ کو نہیں کسی اور کو پسند کرتا ہے۔"

وشمہ جو کسی کام سے کچن میں جا رہی تھی۔ لاؤنج میں بیٹھی شوکت جہاں کو پروین سے کہتے سن کر وہیں کی وہیں رک گئی۔

اسے شک تو پہلے سے تھا۔۔۔ ظاہر ہے وصی کے تیور بلاوجہ ہی تو ایسے نہ تھے۔ کوئی اپنی نوبیاہتا بیوی کو شجرِ ممنوعہ سمجھ کر اس پہ نظر تک نہ ڈالتا ہو، ظاہر ہے کہ اس کے دل و دماغ پہ کسی اور کا ہی راج ہوگا۔

"لیکن اماں جان! جو وہ چاہتا تھا وہ بھی تو نہیں ہو سکتا تھا۔"

وشمہ ٹوٹ سی گئی۔۔۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے جس کی وجہ سے وصی کو اس کا وجود نظر نہیں آتا۔

"میں تو سب بھلا کے اس کی خواہش پوری کرنے کا بھی سوچ رہی تھی۔ خود چل کے گئی تھی اس منزہ کی اولاد کا ہاتھ مانگنے۔ اس لڑکی کا ہاتھ جو شروع سے میرے لیے ایک مسئلہ بنی رہی۔"

"منزہ کی اولاد!" وشمہ چونکی۔

"دیکھ لیں اس چھٹنکی سوہا کے کرتوت۔ شریف زادی ہوتی تو وصی کی شادی کے بعد ٹھنڈی ہو کر بیٹھ جاتی لیکن یہ تو اس کا جادو اور بھی سر چڑھ کے بول رہا ہے۔"

"سوہا۔۔۔" وشمہ ہکا بکا رہ گئی۔

"ایک بات کہوں پروین! تم منزہ سے ذکر کرو۔"

"نہیں اماں جان! اسے تو ہوا بھی نہیں لگنا چاہیے۔ آپ کو نہیں پتا اسے تو موقع چاہیے میرے خلاف ایبا بھائی کو بھڑکانے کا... فوراً" وشمہ کی شادی کی ناکامی کا الزام میرے سر دھر دے گی۔ جینا حرام کر دے گی میرا جیسے میں نے جان بوجھ کر وصی..."

"نہیں... اس بار ایسا کچھ نہیں ہوگا۔"

شوکت جہاں کے لہجے میں یقین تھا۔

"یہ الزام وہ تمہارے سر نہیں ڈال سکتی۔ کیونکہ الزام کی زد میں اس کی اپنی بیٹی آرہی ہے۔ میری مانو تو اس سے بات کرو... وہ اپنی بیٹی کو سنبھالے گی اور سوہا بھی کسی اور کی بات مانے نہ مانے ماں کی تو سن ہی لے گی۔"

"لیکن منزہ بھابی... اور اگر انہوں نے اس معاملے میں ڈنڈی ماری؟ وشمہ کے مقابلے میں سوہا کا ساتھ دے دیا تو؟" وشمہ بھی ایک بار لرز کے رہ گئی۔

"نہیں پروین! تمہارے منزہ سے اختلاف اپنی جگہ... کچھ باتوں میں تم کچی تو ایک معاملے میں وہ بھی۔"

"وہ کیا؟"

"میں نے اس کی آنکھوں میں وشمہ کے لیے اصل محبت دیکھی ہے۔ دل کی بری نہیں ہے وہ... چلو محبت میں نہ سہی۔ شاید خود غرضی میں ہی سہی وہ معاملہ سنبھال لے... سوہا کی وجہ سے وشمہ کا گھر برباد ہوا تو اس کا اپنا گھر اس عمر میں، خراب ہوگا۔"

"شاید آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

پروین، متفق نظر آرہی تھیں۔ تب شاکی قدموں کے ساتھ پلٹ گئی۔

✲ ✲ ✲

"نہیں تایا! اس ویک اینڈ پہ تو مشکل ہے... اگر آپ پہلے بتا دیتیں تو شاید پروگرام بن جاتا۔"

تقدیس، تحریم سے فون پہ بات کر رہی تھی۔ جو اس سے ویک اینڈ میکے گزارنے پہ اصرار کر رہی تھی کیونکہ اس کا اپنا پروگرام تھا۔

"نہیں نا، تایا! بہت مشکل ہے... ابھی دو دن پہلے تو ہو کے آئی ہوں۔"

خرم کو اندر داخل ہوتے دیکھ کر غیر محسوس طریقے سے وہ کچھ محتاط ہو کر بات کرنے لگی۔

خرم یوں بن گیا جیسے اسے کوئی سروکار ہی نہ ہو کہ وہ کیا بات کر رہی ہے اور کس سے کر رہی ہے۔ وہ ٹی وی آن کر کے اس کے پاس ہی نیم دراز ہو گیا۔ لیکن اس کے باوجود تقدیس بے حد نروس ہو گئی۔

"جی... نہیں۔ ہاں ٹھیک ہے۔ میں بات کروں گی اچھا دیکھتی ہوں۔ نہیں وعدہ نہیں کر سکتی۔ اوکے۔"

مختصر جوابات دے کر اس نے بمشکل تحریم کو ٹالا اور فون بند ہوتے ہی سکون کا گہرا سانس لیتے ہوئے ٹی وی کی جانب دیکھا کہ ایسا کون سا پروگرام آرہا ہے جو خرم کی توجہ اپنی جانب کھینچے ہوئے ہے۔

"اپنا سیل فون مجھے دینا۔"

خرم کی بات پہ وہ حیران ہوئی۔ بظاہر ٹی وی میں مگن وہ اس سے ہی مخاطب تھا اور اپنا دایاں ہاتھ بھی اس کی جانب بڑھا چکا تھا... تقدیس نے چپ چاپ فون اس کی ہتھیلی پہ رکھ دیا۔ وہ اندازہ لگا رہی تھی کہ خرم کیا کرنے والا ہے۔ وہ شاید کال ریکارڈ میں چیک کرنے والا ہے کہ وہ کس سے بات کر رہی تھی۔ تحریم کا نمبر اس نے "تایا" کے نام سے save کر رکھا تھا۔ لیکن بدگمانی کی کوئی حد نہیں ہوتی۔ اس سے بعید نہیں تھا کہ وہ یہ سوچے کہ شاید کسی اور کے نمبر پہ "تایا" ... ہے... ہو سکتا ہے وہ اس نمبر پہ کال بیک کرے۔

بے اختیار ہی بیچی سے تقدیس کو اندر... کانپنا شروع کر دیا۔ لیکن خرم نے اس کے سارے اندازوں کے

عکس فون کا سوئچ آف کیا سم کارڈ نکالا... جیب میں ڈالا اور فون اپنی سائیڈ ٹیبل کے دراز میں ڈال کے چابی گھما دی۔

حیرت کی شدت میں وہ اس سے کوئی سوال تک نہ کر پائی۔

✲ ✲ ✲

"کیا بات ہے؟ طبیعت تو ٹھیک ہے تمہاری؟"

وہ جب سے میکے آئی تھی ایسے ہی گم صم تھی۔

"پروین نے کچھ کہا؟"

وہ تب بھی چپ رہی۔

"وصی سے کوئی جھگڑا؟"

اس نے نہ انکار میں سر ہلایا... نہ اقرار میں...

یہ بات منزہ سے شیئر کرنے والی وشمہ نے وصی کے اور اپنے کھوکھلے تعلق کو اب تک راز میں رکھا ہوا تھا۔ اپنی ہی بے عزتی کے خوف سے کتنا رو پیٹ کے اس نے وصی سے اپنی شادی کرائی تھی اور اب اسے یہ سوچ کے ہی شرم آرہی تھی کہ وہ جس وقت اس کے عشق میں مری جا رہی تھی وہ اس وقت سوہا کی محبت میں ڈوبا ہوا تھا اب تک غوطے کھا رہا ہے۔ وہ اپنی محبت کو تماشا نہیں بنانا چاہتی تھی۔ اس لیے خود کو یہ سوچ سوچ کر دھوکا دے رہی تھی کہ وصی بھی اس سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی وہ اس سے... لیکن پروین کی چال بازیوں کی وجہ سے اس کے ساتھ ایسا رویہ رکھنے پہ مجبور ہے۔

"کچھ تو ہے جو تم مجھے بتا نہیں رہیں۔"

"آپ بتائیں گی مجھے ایک بات؟"

"پوچھو بیٹا!"

"اب... آپ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہیں؟"

"یہ کیا سوال ہوا؟"

"پلیز بتائیں۔"

"تمہیں نہیں پتا؟ اور کوئی جانے نہ جانے تمہیں تو علم ہونا چاہیے کہ میں تم سے کتنا پیار کرتی ہوں۔ اتنا جتنا ماں اپنی بیٹی سے کر سکتی ہے۔"

"اور اگر کسی ماں کی دو بیٹیاں ہوں؟"

ایک لمحے کے لیے منزہ کی نظر جھلملا سی گئی۔

"تمام اولادوں میں سے بھی یہ فیصلہ کرنا بہت مشکل ہوتا ہے کہ سب سے پیارا کون ہے؟"

"لیکن اگر معاملہ دل کو پیارا لگنے سے بہت اوپر ہو؟"

"پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو وشمہ؟" وہ الجھ گئی۔

"ماما! اگر کبھی میں اور سوہا آپی آمنے سامنے ہوں تو آپ کس کا ساتھ دیں گی میرا یا ان کا۔ خاص طور پہ یہ جانتے ہوئے کہ میں حق پہ ہوں... اور وہ میرا حق چھین رہی ہیں۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟" اب کے منزہ بھی کچھ گھبراہٹ میں مبتلا ہو گئی۔

"آپ پلیز جواب دیں... کیا ہوگا آپ کا فیصلہ؟"

"جب ایسی کوئی بات ہی نہیں ہے تو تم احمقانہ سوال کر کے کیوں مجھے مشکل میں ڈال رہی ہو؟"

"ہے ایسی بات۔" وہ چلا اٹھی۔ "ایسی ہی بات ہے... وصی نے مجھے اب تک قبول نہیں کیا... میں غلط تھی۔

مجھے لگتا تھا جیسے میں اسے چاہتی ہوں۔ وہ بھی مجھے چاہتا ہو گا۔۔۔ مجھے لگتا تھا۔ محبت محبت کو کھینچتی ہے اور مجھے لگتا تھا اس سے شادی کے بعد مجھے سب کچھ مل جائے گا لیکن، لیکن وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا ماما! اس کے دل میں شادی سے پہلے بھی کوئی اور تھی۔ اب بھی کوئی اور ہے اور وہ کوئی اور نہیں سوہا آپی ہیں۔"

منزہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

● ● ●

"بھئی حد ہو گئی۔۔۔ جب ضروری فون کرنا ہو، یہ بند ہی ملتا ہے۔" شوکت جہاں نے کوفت سے ریسیور رکھا۔

"پہلے وقت کے وقت بل ادا ہو جاتا تھا۔۔۔ ابھی بھی اور سارے گھر کے بل جمع ہو جاتے ہیں۔۔۔ بجلی کے، گیس کے، پانی کے اور تو اور اس رابیات کیبل کے۔۔۔ بس نہیں ہوتا تو یہ ٹیلی فون کا بل نہیں جمع ہو پاتا اور ہو بھی کیوں۔۔۔ سب کے ہاتھوں میں دبا جو رہتا ہے تو چھوا چھا سا موبائل۔ کسی کو کیا ضرورت ہے جو اس فون کے بل بھرے۔ ایک مجھ بڑھیا کے سوا اور کون گھماتا ہے اس کے نمبر۔"

"کیا ہوا ہے اماں جان؟" رخشندہ نے اوپر سے جھانک کر پوچھا۔

"زبیدہ کی پوتی ہسپتال میں ہے۔۔۔ بیمار بھلا آج کے بچے ذرا ذرا سے ہوتے ہیں اور ہسپتالوں کا منہ دیکھتے پھرتے ہیں۔"

"ارے۔۔۔ کیا ہوا اسے۔۔۔ زبیدہ نانی کے ہاں تو یہ پہلی پوتی ہے نا۔۔۔ کئی سالوں کے انتظار اور منت مرادوں کے بعد پیدا ہوئی ہے۔"

"یہی تو پوچھنا تھا کہ کیا ہوا معصوم بچی کو۔۔۔ بھلا چند مہینے کی ننھی سی جان کو کون سے روگ لگ سکتے ہیں۔ مگر فون بند پڑا ہے۔۔۔ اس بار پھر کسی نے بل جمع نہیں کرایا۔"

"نہیں اماں جان۔۔۔ مجھے یاد ہے حسن جمع کروانے جا رہا تھا، تب ہی مجھ سے بھی بل لینے آیا تھا کہ اکٹھے جمع ہو جائیں۔۔۔ دو دن پہلے کی بات ہے۔"

"بھول بھال گیا ہو گا۔"

"لیکن ہمارا فون تو۔۔۔ شاید ویسے ہی کوئی خرابی ہو۔ آپ یہاں سے کر لیں۔"

"تو بتاؤ بھلا۔۔۔ اب میں کہاں سیڑھیاں پھلانگتی آؤں۔" ان کا موڈ بری طرح خراب ہو گیا تھا۔

"گھر پہ کوئی اور نہیں ہے؟۔۔۔ کسی کے موبائل سے فون کر لیجیے۔" رخشندہ جانتی تھیں اب جب تک وہ زبیدہ نانی کی پوتی کی خیریت معلوم نہ کر لیں گی۔۔۔ بات بے بات چڑتی رہیں گی۔

"کون ہو گا۔۔۔؟ پروین ہما کو لے کر روزی کے پاس گئی ہے، حسن، احسان سب اپنے اپنے دورے پہ نکلے ہیں۔ اے ہاں رخشندہ! اوپر پڑا ہے کسی کا موبائل تو بھجوانا ذرا۔۔۔ وہ تقدیس تو ہو گی نا۔۔۔ خرم کی دلہن۔"

"ہاں میں کہتی ہوں۔"

وہ اندر کی جانب مڑیں۔ تقدیس خرم کی قمیص استری کر رہی تھی۔

"تقدیس۔۔۔ بیٹا! ذرا اپنا موبائل تو دینا۔"

وہ ایسے اچھلی۔۔۔ جیسے کرنٹ لگ گیا ہو۔ اس کی حالت دیکھ کے رخشندہ بھی گھبرا گئیں۔

"کیا ہوا۔۔۔ شاید میرے پیچھے سے آ کر اچانک پکارنے کی وجہ سے ڈر گئیں۔"

"نہیں، نہیں امی جان! میں تو۔۔۔ وہ بس ویسے ہی ذرا کسی خیال میں تھی۔"

"نہیں نہیں۔ مجھے دستک دے کر آنا چاہیے تھا۔ بلاوجہ تمہیں گھبرا دیا۔"

"ایسی بات نہیں امی جان! آپ بیٹھیں ناں۔"

"دراصل نانی کی بھی یہی عادت ہے۔۔۔ ذرا سی نے اونچی آواز میں پکار لیا۔ یا پیچھے سے اچانک آ کے چونکا دیا تو یونہی سہم جایا کرتی تھی۔ تمہاری اور بھی بہت سی عادتیں اس سے ملتی ہیں۔"

تقدیس کے پاس ظاہر ہے کہ مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ تھا۔

"ارے ہاں۔۔۔ وہ موبائل لینے آئی تھی تمہارا۔"

تقدیس کی مسکراہٹ پھر غائب ہو گئی۔

"جی۔۔۔ موبائل۔"

"ہاں۔۔۔ اماں جان کو ایک ضروری فون کرنا ہے۔۔۔ نیچے کوئی اور ہے نہیں۔۔۔ بے چاری پریشان ہو رہی ہیں۔ جانو اس عمر میں عادتیں بچوں جیسی ہو جاتی ہیں۔"

"امی موبائل تو۔۔۔" وہ گھبرا گئی۔

جھوٹ بولنے کی نہ عادت تھی۔۔۔ نہ سلیقہ۔۔۔ ورنہ سو بہانے تھے، اور کچھ نہیں تو۔۔۔ بیلنس ختم ہونے کا ہی سکتی تھی۔ مگر کچھ سوجھ ہی نہ رہا تھا سوائے اس کے کہ وہ اپنا بھرم کھونے والی تھی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ تم پریشان کیوں ہو رہی ہو؟"

"موبائل تو خرم۔۔۔ ان کے۔۔۔ انہوں نے۔"

وہ اٹک اٹک کے بتا رہی تھی۔۔۔ انہوں نے خود ہی مطلب اخذ کر لیا۔

"خرم کے پاس ہے۔۔۔ حد ہو گئی، اپنا ہے تو سہی اس کے پاس۔۔۔ تمہارا کس لیے ساتھ لے گیا؟ اب اگر ابھی ضرورت پڑے تو۔۔۔ ان پی ٹی سی ایل نمبروں کا کیا بھروسا، کبھی بند تو کبھی خراب۔ نیچے کا بھی بغیر وجہ کے بند ہے۔"

وہ کمرے سے نکلنے لگیں تو تقدیس نے سکون کا سانس لیا کہ بغیر کسی لمبی تفتیش کے جان چھوٹ گئی۔

"جا کے اماں جان کا تو دھیان بناؤں۔۔۔ ورنہ فون کرنے تک ایسے ہی بول بول کے اپنا بلڈ پریشر بڑھاتی رہیں گی۔ بیٹا! تم ذرا پریشر ککر کا دھیان رکھنا۔۔۔ چھ آٹھ منٹ بعد بند کر دینا۔"

● ● ● ●

منزہ کا پورا وجود زلزلوں کی زد میں تھا۔

اسے اپنے سامنے بیٹھی رشمہ نظر آ رہی تھی۔ جو مسلسل بول رہی تھی۔ مگر منزہ کو صرف اس کے ہلتے ہونٹ بہتے آنسو دکھائی دے رہے تھے۔ وہ نہیں سنائی دے رہا تھا جو وہ کہہ رہی تھی۔ کانوں میں صرف ان لفظوں کی سنسناہٹ گونج رہی تھی، جو وہ پہلے مکمل کہہ چکی تھی۔

"اگر کبھی میں اور سوہا آپی آمنے سامنے ہوں تو آپ کس کا ساتھ دیں گی۔۔۔ میرا یا ان کا۔۔۔ خاص طور پہ یہ جانتے ہوئے کہ میں حق پہ ہوں اور وہ میرا حق چھین رہی ہیں۔"

"وہ مجھ سے محبت نہیں کرتا ماما! اس کے دل میں شادی سے پہلے بھی کوئی اور تھی۔ اب بھی کوئی اور ہے اور وہ کوئی اور نہیں سوہا آپی ہیں۔"

"بکواس بند کرو۔" منزہ پوری شدت سے چلائی۔

رشمہ سکتے کی کیفیت میں چپ ہو گیا۔

"تم جانتی ہو تم کیا کہہ رہی ہو؟" منزہ نے اسے کاندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑ ڈالا۔

"جی جانتی ہوں ماما! آپ بھی جان لیں کہ یہی حقیقت ہے۔"

"کسی نے کہا اور تم نے مان لیا۔ جو تمہیں بہکانے کی اور میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کر رہے ہیں رشمہ! ان کی کوششوں کو کامیاب بنا رہی ہو؟"

"ایسا نہیں ہے ماما۔۔۔ کسی نے بطور خاص مجھ سے کچھ نہیں کہا۔ میں نے اتفاقاً ان کی باتیں سنی ہیں۔۔۔ جو وہ بطور خاص کافی عرصے سے مجھ سے چھپا رہے تھے اور وہ نہ بھی بتائیں۔۔۔ رمضی کا رویہ، اس کی لاتعلقی سب خود بتا رہی ہے کہ اس کے دل میں کیا ہے۔۔۔ فریال! اس کے دل میں دور تک میں نہیں ہوں۔

سوہا بھی نہیں ہو سکتی۔"

منزہ کے پورے وثوق سے کہنے پر وشمہ نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"یہ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں؟"

"کیونکہ وہ میری بیٹی ہے۔"

اس نے ایک پل کی تاخیر کیے بغیر کہا۔

وشمہ نے گلہ آمیز نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے بولی۔

"اور میں! میں آپ کی بیٹی نہیں؟"

"میرا یہ مطلب ۔۔۔۔ ؟"

"ان کا اعتبار ہے آپ کو ۔۔۔ آپ کی بیٹی ایسا نہیں کر سکتی' میرا اعتبار نہیں کر رہیں آپ کہ میں سچ کہہ رہی ہوں۔" "تمہاری بات کو دوسرا رنگ دے رہی ہو۔"

"تو آپ کلیئر کر دیں نا! اس بات کو۔۔۔ جا کے پوچھیں سوہا آپی سے۔"

"میں ۔۔۔ میں پوچھوں؟ مگر کس حق سے وشمہ؟"

اس کے لہجے میں اتنی لاچاری اور بے بسی تھی کہ وشمہ کی ساری تندی بھی ماند پڑ گئی۔

"مجھے کیا حق ہے جو میں اس سے یہ ۔۔۔ یا کوئی بھی اور سوال کروں۔ میں اس کی لگتی کیا ہوں؟ یہ سوال اگر اس نے مجھ سے کر دیا تو کیا جواب ہوگا میرے پاس۔"

"ٹھیک ہے تو آپ میری ماں ہونے کے حق سے ان سے یہ سوال کر سکتی ہیں۔ کیا آپ کا فرض نہیں کہ آپ اپنی بیٹی کی شادی شدہ زندگی میں آنے والی ہر رکاوٹ کو دور کریں۔"

"وشمہ ۔۔۔ یہ سوال تم وصی سے بھی تو کر سکتی ہو؟" منزہ نے اس کا دھیان اپنی جانب سے ہٹایا۔ "کم از کم اور کچھ نہیں تو یہ تو پتا چل جائے گا کہ تمہارے اندر جو غلط فہمیاں جنم لے رہی ہیں وہ واقعی صرف غلط فہمیاں ہیں یا خدانخواستہ ان میں کچھ سچائی بھی ہے۔"

"ٹھیک ہے میں پوچھ لوں گی اور میں اتنا کہہ دوں ماما! کہ اگر انہوں نے میرے خدشات کی تصدیق کی تو میرا مقدمہ آپ کو لڑنا ہوگا ۔۔۔۔ صرف آپ کو۔"

وہ اسے کشمکش میں ڈال کے چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

"خدا تمہارا بھلا کرے ۔۔۔ ذرا ملانا تو زیدہ کا نمبر۔"

خرم نے گھر آتے ہی جیسے ہی سلام کے بعد پیار لینے کے لیے شوکت جہاں کے سامنے سر جھکایا وہ دعائیں دیتے ہوئے فوراً "اپنے مطلب پہ آگئیں۔"

"زیدہ ۔۔۔ کون زیدہ؟" وہ کچھ سمجھ نہ پایا۔

"تمہاری بڑی ادی ۔۔۔ زیدہ تائی ۔۔۔۔ اماں جان کی خالہ زاد بہن ۔۔۔ وہ جو سرگودھا میں ہوتی ہیں۔"

"اوہ اچھا ۔۔۔ کیا ہوا انہیں؟"

"اسے کچھ نہیں ہوا ۔۔۔ اس کی بیچاری کی پوتی بے چاری کو۔"

اس سے پہلے کہ وہ لمبی چوڑی تفصیل میں جاتیں ۔۔۔ رخشندہ نے گھبرا کر بات سمیٹی۔

"اماں جان کو ضروری بات کرنا ہے۔ گھر کا نمبر خراب ہے اور موبائل کسی کا ۔۔۔۔"

بات کرتے کرتے وہ چونکیں ۔۔۔ جیسے کچھ یاد آگیا ہو۔

"ارے ہاں تم تقدیس کا موبائل کیوں لے گئے تھے اس سے؟" بانی بیٹے خرم کے گلے میں پھندا سا پڑ گیا۔ گاڑی کی چابیاں ٹرے میں رکھتے ہوئے اس نے ایک ناگوار سی نظر تقدیس کے گھبرائے ہوئے چہرے پہ ڈالی۔

"ٹھیک ہے میں شام کو ہی آپ کے لیے نیا سیٹ اور کنکشن لا دوں گا۔"

"کمال ہے ۔۔۔ میں بات تقدیس کے فون کی ۔۔۔"

"بھئی مجھے کسی نے زیدہ کا نمبر لا کے دینا ہے یا نہیں؟"

شوکت جہاں کے اس موضوع سے رخشندہ کی توجہ ہٹانے پر خرم نے سکون کا سانس لیا۔

"نمبر بتا میں کی دادی جان ۔۔۔ تو تب ہی ملاؤں گا۔"

پر بانمبر" تمسو سانے ڈائری نکالی۔

● ● ● ●

"بی بی ۔۔۔ آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔"

ملازمہ کے بتانے پہ بیڈ پہ لیٹی کسل مندی سے ٹانگیں جھلاتی سوہا ایک دم الرٹ سی ہوئی۔

"وصی ۔۔۔!"

"جی نہیں کوئی صاحب اور ان کی بیگم ہیں۔"

"ماما سے ملنے آئے ہوں گے۔"

وہ دوبارہ سستی سے لیٹ گئی۔

"میڈم تو گھر پہ نہیں ہیں ۔۔۔ ویسے بھی انہوں نے آپ سے ملنے کے لیے کہا ہے۔" وہ چونک کر سیدھی ہوئی۔

"نام کیا بتا رہے تھے؟"

"سوہا۔"

"اسٹوپڈ ۔۔۔ میرا نہیں اپنا کیا نام بتا رہے تھے؟"

"میں نے پوچھا نہیں۔"

"بے وقوف عورت ہو تم ۔۔۔۔ کہاں ہیں وہ لوگ؟"

"ڈرائنگ روم میں بٹھایا ہے۔"

"اوہ گاڈ ۔۔۔ ماما کو پتا چلا کہ تم نے انجان لوگوں کو گھر میں گھسایا ہے تو خیر نہیں ۔۔۔۔ نہ تمہاری نہ تمہاری اس نئی نوکری کی۔"

"وہ ۔۔۔ بی بی ۔۔۔ وہ لوگ شریف لگ رہے تھے۔"

بے چاری سہم گئی ۔۔۔ چند دن ہوئے تھے یہاں کام کرنے۔

"اونہہ! شریف لگ رہے تھے۔"

وہ کوفت سے بڑبڑاتی ڈرائنگ روم کی طرف چلی گئی۔

"جی ۔۔۔ میں نے پہچانا نہیں آپ کو؟"

جس طرح وہ لوگ اسے دیکھتے ہی وارفتگی سے کھڑے ہو کر اس کی جانب بڑھے تھے اتنا یقین تو ہو گیا تھا کہ ان کا تعلق وصی کے گھرانے سے نہیں ورنہ وہ ایسا والہانہ پن کیوں جتاتے ۔۔۔ مگر وہ تھے بہرحال انجان اور نا آشنا۔

"ثنا ۔۔۔ میں جمشید ہوں تمہارا ماموں ۔۔۔ اور یہ تمہاری ممانی ثنا ۔۔۔ یاد نہیں تمہیں۔"

تو جانے ذہن کے کن بند دریچوں پہ کسی خوشگوار سی مہک نے دستک دی۔

بچپن میں جب وہ منزہ کے ساتھ "نانا گھر" رہنے جاتی تھی۔ جہاں نانا تھے نہ نانی ۔۔۔ ہاں ماموں تھے ممانی تھیں۔ ان کے بچے تھے وہ لوگ ۔۔۔ جب وہ ایک غیر معینہ مدت کے لیے ان کے ہاں رہنے آئی منزہ کے ہمراہ۔ پھر وقت بدلا۔ جب منزہ اسے چھوڑ کے دلہن بن کے کسی کے ساتھ رخصت ہوئی اس کے بعد کے بہت سے اور تکلیف دہ لمحے جمشید اور ثنا کے ساتھ گزارے کوئی لمحات اس کے حافظے میں محفوظ نہیں تھے۔ البتہ ان کا ذکر وہاں سے بچپن میں سنتی رہا کرتی تھی ۔۔۔ اور وہ بھی اچھے الفاظ میں۔

چند ساعتیں ایسی ہی بوجھل خاموشی کے ساتھ گزارنے کے بعد وہ درشتی سے بولی۔

"کس سے ملنے آئے ہیں آپ؟"

"ظاہر ہے..... تمہارے ماموں ممانی ہیں ہم ــــ تو تم سے ہی ملنے آئیں گے۔"
ثنا نے اس کے سوال کے روکھے پن کو نظرانداز کرتے ہوئے نرمی سے کہا۔
اس بار وہ چاہ کے بھی رکھائی سے پیش نہ آ سکی۔

☼ ☼ ☼

"تو تم نے اپنا یہ گن بھی ظاہر کر دیا!" خرم کڑے تیور لیے اس سے پوچھ رہا تھا۔
"جی..... کون سا کیا کیا ہے میں نے؟"
ایک مضبوط اور پر اعتماد شخصیت والی لڑکی بے اعتباری کی گرد سے، بندلا کے کمزور پڑ چکی تھی۔
"تم نے امی سے میری شکایت کی؟"
"میں نے نہیں کی۔"
"تو انہیں خواب آیا تھا کہ میں نے تمہارا فون لیا ہے۔"
"میں نے یہ نہیں کہا تھا آپ نے فون لیا ہے۔ صرف اتنا بتایا ہے کہ فون آپ کے پاس ہے۔"
"ایک ہی بات ہے۔" وہ جھنجھلا اٹھا۔
"ایک بات نہیں ہے..... بہت فرق ہے۔ فون لے لینے میں ــــ اور ویسے ہی کسی وجہ سے اپنے پاس رکھنے میں ــــ انہیں یہی لگا کہ آپ کو ضرورت تھی تو لے لیا آپ نے۔"
"مجھے لمبی چوڑی وضاحتیں سننے کی عادت نہیں ہے۔ تم کوئی اور بہانہ بھی بنا سکتی تھیں..... میرا نام لینے کی ضرورت کیا تھی؟"
"میں جھوٹ نہیں بولتی۔"
وہ آہستگی سے کہتی پلٹ گئی ــــ مگر جانے میں خرم کو اس نے تپا کے رکھ دیا۔
"ہونہہ ــــ جھوٹ' یہ دھوکے کسی اور کو دینا۔"
"میں نے کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا۔" وہ تڑپ کے مڑی۔
"پلیز ــــ آپ آج مجھے بتا ہی دیجئے کہ آپ کے اندر کون سی غلط فہمی پنپ رہی ہے؟ کون سی فرد جرم عائد کر رہے ہیں آپ مجھ پہ ــــ آخر میری کون سی حرکت ہے جو گرفت میں آ گئی ہے؟"
"آواز آہستہ رکھو ــــ مجھے چلانے والی عورتیں پسند نہیں ہیں۔" وہ غرایا۔
"دیکھیے' جہاں تک بات پسند ناپسند کی ہے' مجھے بھی شک کرنے والے یا عورت کی تذلیل کرنے والے مرد پسند نہیں ہیں' میں بھی تو برداشت....."
مگر اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی اس کے چہرے پہ خرم کا ہاتھ اپنا نشان چھوڑ گیا تھا۔
"میں جانتا ہوں تمہیں کس قسم کے مرد پسند ہیں لیکن اپنی پسند ناپسند تمہیں شادی سے پہلے اپنے باپ کے سامنے رکھنی چاہیے تھی ــــ تب شرم و حیا کا ڈھونگ رچانے کی کیا ضرورت تھی ــــ لیکن اب [illegible] تو کرو برداشت کیونکہ میں بھی یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ میرے نکاح میں آنے والی عورت میری بد [illegible] سے' سمجھیں تم۔"
وہ چنگھاڑتا ہوا باہر نکلا ــــ اور تقدیس اپنے دہکتے گال پہ ہاتھ رکھے سوچتی رہ گئی۔
"تو میں صرف آپ کے نکاح میں آئی عورت ہوں ــــ آپ کی زندگی میں نہیں آئی؟"

☼ ☼ ☼
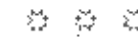
"ماما! آپ جانتی ہیں آج مجھ سے ملنے کون آیا تھا؟" سوہا کی بات پہ میک اپ صاف کرتی رہنا کا ہاتھ رکا۔
"منزہ؟" اس کے لبوں سے سرسراتا ہوا نام نکلا۔

"نہیں ــــ ان کے بھائی اور بھابی ــــ میرے ماموں ممانی۔"
"کون ــــ وہ جس نے قسم کھا کے کہا تھا کہ وہ نہ خود کبھی تم سے تعلق رکھے گا نہ تمہاری ماں کو رکھنے دے گا۔"
وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔
"کول ڈاؤن ماما! وہ نہیں..... دوسرے والے ماموں ــــ آپ نہیں جانتیں' انہیں نہ کبھی ملی ہیں وہ ملک سے باہر ہوتے ہیں دو فیملی..... ابھی لوٹے ہیں تو مجھ سے ملنے آ گئے۔"
"تم سے کیوں؟ اپنی بہن سے ملتے جاتے۔"
"ظاہر ہے ــــ ان سے بھی ملے ہوں گے۔"
"اور ان کے کہنے پہ تمہیں بہلانے پھسلانے آئے ہوں گے۔"
"پلیز..... ماما! آپ کی یہ باتیں مجھے ہی گریڈ کرتی ہیں۔" اس کے ناگواری سے کہنے پر رہنا ذرا سنبھلی۔
"میرا مطلب صرف یہ تھا۔"
"آپ کا مطلب جو بھی ہو..... لیکن مجھے برا لگتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے آپ مجھ پہ ــــ میری محبت پہ شک کر رہی ہوں۔"
"تم پہ شک تو میں مر کے بھی نہیں کر سکتی میری جان۔"
رہنا نے اس کا ماتھا چوما اور پھر اس کا موڈ خوشگوار کرنے کی غرض سے پوچھنے لگی۔
"اور کیا کیا باتیں ہوئیں ان سے ــــ کیا کہہ رہے تھے؟ کوئی تحفہ وغیرہ بھی لائے تمہارے لیے ــــ یا؟"
"دل سے پوچھ رہی ہیں؟" وہ ہنسنے لگی۔ "یہ نہ ہو میں بتانے لگوں اور آپ جیلس ہو جائیں۔"
"مت کیا کرو نا جیلس..... جب پتا ہے کہ تمہارے معاملے میں میں کمینگی کی حد تک خود غرض ہوں۔ میں دنیا کے کسی ایک شخص سے تمہیں بانٹ سکتی ہوں۔"
"اور وہ کون خوش نصیب ہے؟" وہ سب جانتے ہوئے بھی مسکرائی۔
"وصی اور کون۔"

❀❀❀❀

"وصی..... مجھے آپ سے ایک بات کرنا ہے۔"
وشمہ کے سنجیدگی سے کہنے پہ وہ جوتے اتارتے اتارتے رکا۔
"ہاں' پوچھنا ہے پوچھو۔"
"پوچھوں....." وصی کے اندر خطرے کی لائٹ جلنے بجھنے لگی۔
"کیا آپ شادی سے پہلے کسی اور کو پسند کرتے تھے؟" "کسی اور سے شادی کرنا چاہتے تھے آپ؟"
"یہ معلومات تمہیں کس نے دی ہیں؟"
"جس نے بھی دی ہیں۔ آپ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ ٹھیک ہیں یا غلط۔"
"غلط۔" وصی کے اس یک لفظی جواب سے وشمہ کا رکا ہوا سانس بحال کر دیا۔
"جس نے بھی تمہیں یہ معلومات دی ہیں..... سراسر غلط ہیں سچ میں تمہیں بتاتا ہوں..... میں شادی سے پہلے کسی اور کو پسند نہیں کرتا تھا بلکہ اب بھی..... یعنی شادی کے بعد بھی اسے پسند کرتا ہوں۔"
وشمہ کی سانسیں پھر سے رکنے لگیں۔
"اس سے شادی کرنا چاہتا تھا' میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور جن باوثوق ذرائع سے تمہیں یہ انفارمیشن ملی ہیں' بے شک ان کو بھی اپ ڈیٹ کر دینا کیونکہ قصور ان کا نہیں ان کی معلومات بھی بس یہیں تک محدود تھیں [illegible] حالات سے انہیں باخبر کرنا تمہارا فرض ہے۔ آخر تم ان کی اتنے ارمانوں سے لائی بہو ہو۔"
وشمہ سکتے کے عالم میں کھڑی اسے دیکھتی رہی اس کا سکتہ تب ٹوٹا جب وہ جھٹکے سے دروازہ بند کر کے باہر نکل

گیا۔

اس کے جاتے ہی اس نے زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیا۔

"دھوکے باز ہو تم...... نہ صرف تم...... بلکہ تمہارے سارے گھر والے سب نے مل کر میری زندگی برباد کی ہے...... سب جانتے تھے تمہارے کرتوتوں کے بارے میں۔۔۔ لیکن کسی نے میرے بارے میں نہ سوچا۔۔۔ کسی نے تمہیں نہیں روکا...... چپ چاپ میری زندگی کو تباہ ہوتا دیکھتے رہے۔۔۔ تم بھی اور یہ سارے لوگ۔"

وہ چیختی جا رہی تھی اور مختلف چیزیں اٹھا اٹھا کے دروازے پہ مار رہی تھی۔

اس کا یہ ہنگامہ گھر کے کونے کونے تک سیکنڈوں میں پہنچ گیا۔۔۔ برآمدے میں کبوتروں کو دانہ ڈالتی شوکت جہاں تک۔۔۔ کچن کے اسٹور سے چاولوں کی بوری ملازمہ سے صاف کروانے کی غرض سے نکلواتی پروین تک۔

ٹیرس سے اندر کی جانب مڑتی رخشندہ تک۔

اپنے روم میں ظل ہما کو ملٹی وٹامن کے کیپسول کھلانے پہ اصرار کرتے حسن تک۔۔۔

اور تیز تیز قدموں سے چلتے پورچ کی جانب جاتے وصی تک بھی جو سب ہڑبڑا کے اس کے کمرے کی طرف بھاگ رہے تھے اور وہ تھا۔۔۔ جو جلد از جلد یہاں سے دور جانا چاہ رہا تھا۔

"آواز نیچی رکھو وشمہ۔۔۔ کیا شور مچا رکھا ہے؟"

سب سے پہلے پروین وہاں پہنچیں۔۔۔ اور انہوں نے اس کے اس شور و غل کی وجہ تک دریافت کرنا ضروری نہیں سمجھا...... شاید اس لیے کہ وصی کے تیور انہیں باور کرا رہے تھے کہ جلد یا بدیر...... یہی ہونے والا ہے۔

"ہاں۔۔۔ میری آواز دبا دیں آپ۔۔۔ بلکہ صرف آواز ہی کیوں میرا گلا دبا دیں آپ۔۔۔ تاکہ نہ میں رہوں۔ نہ کوئی اس زیادتی کے خلاف آواز اٹھا سکے۔"

"کیا جاہلوں کی طرح چلا رہی ہو؟...... یہ بہو بیٹیوں کا شیوہ ہے کیا؟"

انہوں نے ظل ہما اور حسن کو اپنے کمرے سے نکلتا اور رخشندہ کو سامنے سے ہراساں انداز میں آتے دیکھا تو خفت سے دوچار ہوتے ہوئے آواز دبا کے ڈانٹنے لگیں۔

"خیریت ہے امی...... کیا ہوا ہے؟"

حسن پروین سے پوچھ رہا تھا مگر تشویش بھری نگاہیں وشمہ پہ ٹکی تھیں۔

"کچھ نہیں ایسے ہی بس۔"

"کیا کچھ نہیں...... یہ آپ کے لیے کچھ نہیں ہے...... میرا شوہر مجھے کہہ کے گیا ہے کہ وہ مجھ سے نہیں کسی اور سے شادی کرنا چاہتا تھا...... مجھے نہیں کسی اور کو پسند کرتا تھا اور کرتا ہے۔ وہ صاف صاف اعلان کر کے گیا ہے کہ آج نہیں تو کل وہ اس سے شادی کر کے رہے گا اور آپ مجھے کہہ رہی ہیں کہ میں چپ رہوں اپنی آواز نیچی رکھوں؟"

حسن اس سارے معاملے سے آگاہ تھا۔ اس لیے وصی کا یہ کھلم کھلا اعلان اس کے لیے انکشاف نہیں تھا البتہ رخشندہ ہکا بکا کھڑی تھیں۔

"یہ کیا ہو رہا ہے بھئی کوئی بتاتا کیوں نہیں؟"

شوکت جہاں نے آواز دی۔۔۔ مارے گھبراہٹ کے ان کے ہاتھ پیر پھولے جا رہے تھے...... اتنا تیز چل کے آ سکتی نہیں...... ہما فوراً منظر سے غائب ہوئی۔

"میں دادی جان کو دیکھوں ذرا پریشان ہو رہی ہیں۔"

"پروین۔۔۔ یہ سب۔" رخشندہ نے دریافت کرنا چاہا۔

"بتایئے۔۔۔ بتایئے انہیں چپ کیوں ہیں۔۔۔ بتائیں آپ نے کون سی دشمنی نکالی ہے میرے ساتھ۔ جب آپ کو سب پتہ تھا تو آپ تب چپ رہیں...... اب مجھے چپ کرانا چاہتی ہیں۔"

"کیوں شور مچا کے تماشا لگا کے کیا حاصل ہو گا۔۔۔ نکل لیں گے اس مسئلے کا حل۔۔۔ میں خود بات کروں گی

"ہم سب کریں گے...... ایسا کیسے کر سکتا ہے وصی...... ہم بھلا ہونے دیں گے۔۔۔ ہمارے خاندان میں ایسے رواج نہیں ہیں بیٹا۔ تم اطمینان رکھو۔" رخشندہ نے بھی تسلی دی۔

"تمہیں ذہن پہ کسی قسم کا بوجھ رکھنے کی ضرورت نہیں ہے وشمہ۔" حسن کیوں پیچھے رہتا...... وشمہ کے آنسو تو جیسے اسے پھر سے ماضی کی جانب دھکیل رہے تھے۔

"ہم سب مجرم ہیں تمہارے...... تم ٹھیک کہتی ہو۔۔۔ سب کچھ جانتے بوجھتے ہوئے بھی ہم نے وصی کو اس شادی کے لیے مجبور کیا۔"

حسن کے دل گرفتی سے کہنے پہ پروین نے اسے ناگواری سے گھورا۔

"اگرچہ میں نے اپنی سی کوشش کی تھی۔ اور وہ نہ وصی کی ضد پوری کرنے کے لیے تھی نہ اس لڑکی سے ہمدردی میں۔۔۔ مجھے صرف اس دن کا ڈر تھا۔ اس دن کا جب وہ تمہیں تمہیں پہنچاتا۔۔۔ لیکن کسی نے میری بات نہ مانی اور سب سے زیادہ قصوروار ٹھہراؤں گا میں وصی کو۔ اگر وہ اسے بھلا نہیں سکتا تھا۔ اس سے تعلق ختم نہیں کر سکتا تھا تو بے شک جنگ کرتا ہم سے اسٹینڈ لیتا...... نہ خود کو اس کشمکش میں ڈالتا...... نہ تمہاری زندگی برباد کرتا نہ ہم سب کو تمہارے سامنے شرمندہ کرتا...... بہت بڑی غلطی کی اس نے۔"

"بس کرو اب...... تمہیں کیا پتہ کس کی کتنی غلطی ہے۔"

پروین کو اس کا اتنا زیادہ بولنا ذرا اچھا نہیں لگا جبکہ وشمہ کو حسن کی باتیں اچھی لگ رہی تھیں۔ اس کی حمایت میں جو تھیں اور جو پروین نے اسے ٹوکا...... تو اسے یہی لگا کہ انہیں وشمہ کی حمایت میں کسی کے دو لفظ بھی برداشت نہیں ہوتے۔

"بہرحال اس حقیقت سے نظر تو نہیں چرائی جا سکتی امی۔۔۔! اگر آپ اپنی ذمے داری پہ اپنی بھانجی کو بیاہ کے لائی ہیں تو اب وصی کو مجبور بھی کیجیے اس رشتے کی ذمے داریاں نبھانے کو۔"

"ہاں پروین...... ٹھیک ہے رشتے ناتے طے کرتے ہوئے ماؤں کو اپنی مرضی اور پسند چلانے کا بڑا چاؤ ہوتا ہے' تو بھی ہے یہ ان کا۔۔۔ لیکن بات صرف اپنی پسند کی بہو لانے پہ ختم نہیں ہو جاتی۔۔۔ اس کے بعد بھی ماؤں کے بہت سے فرائض ہوتے ہیں۔" رخشندہ نے ان کے کاندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

اتنے بہت سارے حقائق بیان سننے کے بعد وشمہ کی ہچکیاں بندھی ہوئی تھیں...... جو پروین کو مجرم نہ ہوتے ہوئے بھی مجرمانہ احساس میں۔۔۔ ایک ندامت آمیز خفت میں مبتلا کر رہی تھی...... اس وجہ سے وہ یہ کچھ کہنے پہ مجبور ہو گئیں جو عام حالات میں شاید کبھی اپنے زبان تک نہ لاتیں۔

"بھائی۔۔۔ آپ کچھ نہیں جانتیں اور نہ ہی حسن جانتا ہے کہ میں نے اپنے فرائض کس حد تک نبھائے ہیں۔ میں نے وصی کی یہ شادی زبردستی نہیں کرائی مجھے خود زبردستی مجبور کیا گیا اور مجھ پہ یہ دباؤ اپنی اس نام نہاد منترہ کے ذریعے ڈلوانے والی خود وشمہ تھی۔"

وشمہ سن شدر رہ گئی۔ اسے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اسے اس طرح سب کے سامنے سبکی کا سامنا کرنا پڑے گا۔۔۔ وہ آنسو ذرا سے بھری ہراساں آنکھیں لیے سب کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگی۔

☼ ☼ ☼
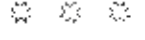
"اتنے پریشان کیوں ہو...... جب سے آئے ہو۔۔۔ دماغ بھی حاضر نہیں ہے تمہارا؟"

سوہا نے اس کے کھوئے کھوئے انداز کو دیکھتے ہوئے گلہ کیا۔

"نہیں۔۔۔ کچھ خاص نہیں۔" اس نے ٹالنا چاہا...... یوں بھی ذکر چاہے وشمہ کا ہو چاہے پروین کا' سوہا کے غصے ابھار دیتا تھا۔

"کچھ تو ہے۔۔۔ ہاں اگر تم بتانا نہ چاہو تو۔"

"پلیز۔۔۔ سوہا ٹرائی ٹو انڈر اسٹینڈ۔۔۔ میں اکیلا کافی نہیں کیا الجھنے کے لیے جو بات مجھے پریشان کر رہی ہے۔ کیا

ضروری ہے کہ تمہیں بتا کے میں تمہیں بھی پریشان کروں۔"

"وصی! تم مجھے خود سے الگ سمجھنا کیوں نہیں چھوڑ دیتے۔"

"میں تمہیں خود سے نہیں اپنے مسائل سے الگ رکھنا چاہتا ہوں۔"

"اور تمہارا سب سے بڑا مسئلہ میں ہی تو ہوں۔"

"کاش... تم اندازہ لگا سکتیں کہ تم میرے لیے کیا ہو۔ اور کاش میں تمہیں بتا سکتا تم میرے لیے کیا ہو۔"

وصی نے اس کا ہاتھ ہلکے سے سہلایا۔ سوہا کی جھنجلاہٹ ڈھلنے لگی۔

وہ ذرا سا مسکرائی۔

"اپنی بیوی سے چھپ چھپا کے آئے ہو؟"

وشمہ کا ذکر... وہ بھی سوہا کی زبانی اور سب سے حیرت انگیز بات یہ کہ اتنے ہلکے پھلکے انداز میں سو اس کا چونکنا بجا تھا۔

"ایسی بات نہیں۔"

"نہیں... کچھ کچھ تو میں بھی جانتی ہوں اسے۔ بچپن میں چاہے بہت سیدھی سادی اور بے وقوف جیسی تھی لیکن اتنا اندازہ ہے مجھے کہ میری ماں کی مصلحت آمیز محبت نے اس کا کیا حشر کیا ہوگا۔ میری ماں کو ان سے بالکل ویسی ہی محبت ہے... وصی جیسی محبت میری ماما... یعنی میری چاچی ریتا کو مجھ سے ہے۔ ایک ڈر ایک خوف میں لپٹی محبت ہر بات پہ لے کے سہ جانے والی محبت... ماں کی خالص محبت نہیں ہے یہ... محتاط خوف کو نہیں پہچانتی۔ اسے یہ ڈر نہیں ہوتا اس کی اولاد اس کی محبت پہ شک نہ کرے یا اس سے بدظن ہو کر کسی اور کی طرف نہ ہو جائے۔ وہ بلا خوف و خطر اسے روکتی ٹوکتی ہے۔ ڈانٹتی ہے مارتی ہے... سختی سے کام لے کر بھی اسے سیدھے راستے پہ لاتی ہے۔ اس کے نزدیک اولاد کی ناراضی سے زیادہ اہم اس کی تربیت ہوتی ہے۔ اسے پتہ ہوتا ہے وصی اگر تربیت میں چوک ہو گئی تو اولاد کا مستقبل اس کی زندگی خراب ہو جائے گی۔ رہا ناراضی کا سوال تو اپنی ماں سے اولاد کب تک ناراض رہتی ہے۔ آنا تو ماں کی گود میں ہی ہے۔ لیکن یہ جو دوسری قسم کی ممتا ہوتی ہے نا... وشمہ کی!! اور میری ماما والی... یہ بڑی خود غرض ہوتی ہے۔ اس میں اولاد سے محبت کے دعوے چاہے کتنے ہی بڑے بڑے کیوں نہ ہوں اصلیت یہ ہوتی ہے۔ جو تمہارے سامنے ہے سامانے مجھے ہر آسائش دی ہر سہولت فراہم کی... میری ہر ضد کے آگے گھٹنے ٹیکے مگر کبھی اپنی منوانے کی ہمت نہ کی۔ وجہ صرف وہ خوف تھا کہ کہیں میں انہیں چھوڑ کے وہاں نہ چلی جاؤں۔ تم بتاؤ یہ محبت ہے یا خود غرضی؟ ممتا ہے یا مصلحت؟"

"اس کے باوجود کہ تم اس ممتا اور مصلحت کا فرق جانتی ہو، پھر بھی اپنی سگی ماں سے زیادہ اعتماد تم ماما پہ کرتی ہو' کیوں؟"

"کیونکہ وہ محبت تھی یا خود غرضی... ممتا تھی یا مصلحت... مگر میرے لیے وہی ہے۔ جو ڈوبتے کے لیے تنکے کی حیثیت ہوتی ہے۔ مجھے بھی ان کی اتنی ہی ضرورت ہے جتنی انہیں میری اور میں جانتی ہوں میری ہر بات ماں کے ماما نے میرے اندر جتنی ضد اور جتنی سختی پیدا کی ہے اتنی ہی وشمہ میں بھی ہوتی ہوگی۔"

"ہاں... نہ صرف ضد اور سختی بلکہ بدلحاظی بھی... وہ ماں کے ساتھ ذرا بھی عزت سے پیش نہیں آتی۔"

"اور تمہیں یہ بات بری لگتی ہے؟" سوہا نے جھجکتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"ہاں... نہیں... میرا مطلب تھا۔"

"جب تمہارا اس سے کوئی تعلق ہی نہیں، تمہیں اس سے کوئی دلچسپی ہی نہیں۔ تو تمہارے اندر اس کے لیے غصے کیوں پیدا ہو رہے... نہیں؟"

"مگر ان سے نہیں ہے سوہا... بہرحال گھر کا ماحول تو خراب ہو رہا ہے... میں چاہے اس رشتے کو کسی نظر سے بھی دیکھوں، سب کے لیے تو اس صورت حال کا ذمہ دار میں ہوں۔ سب کا خیال ہے کہ میرے رویے کے ردعمل کے طور پہ وہ اس طرح کا بی ہیو کر رہی ہے۔"

"تو تم اپنا رویہ بدلنا چاہتے ہو؟"

"فار گاڈ سیک سوہا! مجھے مزید نہ الجھاؤ... میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔"

اور حقیقتاً وہ اس لمحے سوہا کو اتنا قابل رحم لگا کہ اسے اپنی جھنجھنی باتوں پہ شرمندگی سی ہونے لگی۔

"سوری وصی... میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتی... مگر کر دیتی ہوں کب؟ کیسے؟ پتہ ہی نہیں چلتا... سوری۔"

"اٹس او کے۔"

"اگر تمہارے اس کے ڈریا آؤٹنگ وغیرہ پہ جانے سے تمہاری فیملی تم سے خوش اور مطمئن ہو جاتی ہے... تو تم جاؤ... میری پروا مت کرو۔"

"نہیں سوہا! ایسی بات..."

"پلیومی وصی... میں برا نہیں مانوں گی... بس تمہاری یہ الجھن یہ شکستگی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔"

"تم غلط سمجھ رہی ہو... بات وہ نہیں ہے۔ اسے تمہارے اور میرے تعلق کے بارے میں پتہ چل گیا ہے اور اس نے گھر میں ہنگامہ کھڑا کر دیا ہے۔ مجھے لگا تھا۔ کبھی پتہ چلا بھی اسے تو زیادہ سے زیادہ رو دھو کے کی ناراض ہو کر اپنے باپ کے گھر چلی جائے گی لیکن اس نے تو اپنا اور میرا تماشا بنا کے رکھ دیا ہے۔"

"انٹرسٹنگ۔"

"تمہیں یہ انٹرسٹنگ لگ رہا ہے؟"

"جو ہوا اچھا ہوا وصی... میرے خیال میں تمہارے لیے سب سے مشکل مرحلہ یہی تو تھا... جو خود بخود حل ہو گیا ہے۔"

"حل نہیں ہوا سوہا... یہی تو پریشانی ہے مجھے۔ گھر جانے کو دل نہیں کر رہا کیسے سب کا سامنا کروں... ایک ایک کر کے سب لوگ یہ بات جانتے جا رہے ہیں۔"

"تم کیوں چھپانا چاہتے ہو اپنے اور میرے تعلق کو؟"

ابھی ابھی خود سے عہد کیا تھا... کہ وہ وصی کی پریشانی میں مزید اضافہ نہیں کرے گی لیکن چند ہی منٹ میں سب بھلائے چلا رہی تھی۔

"کیا یہ رشتہ' یہ تعلق اتنا شرمناک ہے؟"

"تم سمجھتی کیوں نہیں سوہا... وہ وقت کہ میں پورے اعتماد اور وقار کے ساتھ تمہیں اپنے گھر والوں سے متعارف کراتا... وہ وقت گزر چکا ہے... میری اپنی کمزوری کی وجہ سے۔ اب میں ایک شادی شدہ مرد ہو کر اپنی محبت کا اعتراف کس طرح اسی وقار اور اعتماد سے کر سکتا ہوں؟ شرمناک ہمارا تعلق نہیں ہے' شرمناک میری یہ شادی شدہ حیثیت ہے۔ تم نہیں... میں قصوروار ہوں اس سارے قصے میں۔" وہ پھر سے ٹوٹنے لگا تھا۔

سوہا تاسف بھری نظروں سے اسے دیکھے گئی۔

□□□□

"تو وصی نے یہ لحاظ بھی کرا دیا۔"

شوکت جہاں نے ساری روداد سن کر کہا۔

"لحاظ ختم کرنے کا ریکارڈ تو وشمہ نے بنایا ہے اماں جان... نہ حسن کی موجودگی کا لحاظ... نہ درخشندہ کا بھرم سب کے سامنے چلا رہی تھی۔"

"تم بھی کم غلط نہیں کیا پروین جو بھی ہے' ہے تو نادان بچی... اس گھر کی عزت... تمہاری بھانجی بھی... اور ہماری بہو بھی۔ ایسے سب کے سامنے تمہیں وہ راز بتانا نہیں چاہیے تھا جو کب سے چھپائے چلی آ رہی تھیں۔"

"تو کیا کرتی۔۔۔۔ حسن اور بھائی نے اس کی حمایت میں جو مجھے سنانا شروع کیا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ یہی تو تھی جس نے مہینوں میرے گلے پہ چھری رکھی تھی۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کیسے نکلوں اس مصیبت سے۔ کیس الٹا تو ہی بیٹ ننگا ہوتا ہے۔ منہ پھاڑ کے کہہ دیتی کہ یہ وشمہ کی مرضی اور پسند ہے تو سب مجھے ہی سناتے کہ اس کے بھائی کی لڑکی خود سے رشتہ بھجوا رہی ہے وہ بھی پھوپھی کو سیڑھی بنا کے۔۔۔۔ اور وصی تھا کہ قابو نہ آتا تھا۔۔۔۔ ادھر وصی کی بغاوت کا خدشہ۔۔۔ ادھر یہ ڈر۔۔۔۔ کہ یہ بے وقوف نہ کوئی الٹی سیدھی حرکت کر لے۔۔۔ تب کیسے تڑپ رہی تھی۔ اور اب منہ بھر بھر کے الزام ہم سب گھر والوں کو دے رہی ہے کہ ہم نے جانتے بوجھتے اس بندھن میں باندھا ہے۔۔۔ اتنی جلدی بھول گئی کہ یہ رشتہ میں نے اس کے دباؤ میں آکے اور اس کی بچکانہ ضد کے آگے مجبور ہو کے ڈالا تھا اور وہ بھی اس کی پھیلائی غلط فہمی کی وجہ سے کہ وہ اور وصی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔"

"اب کیا فائدہ ایک دوسرے کو الزام دینے کا۔۔۔ یہ اوپر نبھانے رشتے ہیں۔ تمہارا یا وشمہ کا کیا زور۔"

"اب سوچتی ہوں۔۔۔۔ یونہی کڑھ کڑھ کے جینا تھا تو وصی کی ہی مان لیتی۔ اس سوہا پہ ہی راضی ہو جاتی۔ ہم میں سے کوئی ایک تو خوش ہوتا۔۔۔۔ میں یا وشمہ نہ سہی۔۔۔ وصی ہی سہی۔"

"تم سب کچھ اللہ پہ کیوں نہیں چھوڑ دیتیں پروین۔"

"اماں جان۔۔۔ برا نہ مانیے گا۔۔۔۔ کیا آپ اپنی اولاد کی تکلیفوں پہ سارے معاملے اللہ پہ چھوڑ دیا کرتی تھیں۔۔۔۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہونا تو بہرحال وہی ہے جو اللہ کو منظور ہو گا لیکن مائیں کیسے خود کو باز رکھ سکتی ہیں پریشان ہونے سے۔ کیا میں وصی کی ماں نہیں ہوں؟ کیا میں نے اسے حسن اور حسان سے کم محبت دی ہے؟ کیا اس کی زندگی میں کانٹے ہی کانٹے۔۔۔۔ مشکلات ہی مشکلات دیکھ کے مجھے اطمینان ہو سکتا ہے؟"

"دعا کرو۔۔۔ یہ دل کو سکون دیتی ہے اور دعا ہمیشہ نیک نیتی سے کرو۔۔۔ کبھی اس چیز کی طلب نہ کرو۔۔۔۔ جو تمہیں اپنے لیے اچھی لگے۔۔۔ ہمیشہ اس چیز کی طلب کرو جو اللہ تمہارے لیے پسند کرے۔ دیکھنا اس دعا کے بعد دل کیسے ٹھہر جاتا ہے۔"

☆ ☆ ☆

"یقین نہیں آتا کہ چچی جان نے جو کچھ کہا ہے 'وہ واقعی سچ ہے؟'"

ہما نے حسن سے کہا جو خود بھی اب تک مسلسل کشمکش میں تھا۔

"ہاں۔ اگر وہ میری ماں نہ ہوتیں تو یقین کرنا میرے لیے بھی مشکل تھا۔۔۔۔ وشمہ تو میرا مطلب ہے اس وقت یعنی شادی سے پہلے تو بہت ہی کم گو 'بڑی' جھجکتی۔ ہولی سی ڈیو لڑکی تھی۔ وہ کیسے۔۔۔ کیسے اس نے یہ سب کیا ہو گا۔۔۔ کیسے اپنی سوتیلی ماں کے ذریعے امی کو پریشرائز کیا ہو گا۔۔۔۔ ایک خیال آرہا ہے۔"

"کیا۔۔۔؟"

"ہو سکتا ہے امی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہوں۔۔۔ میں ان کے بیان کی سچائی پہ شبہ نہیں کر رہا۔ لیکن یہ بھی تو ممکن ہے یہ ساری غلط فہمی منزہ ممانی کی پھیلائی ہو۔ وشمہ اس سارے قصے میں سرے سے ملوث ہی نہ ہو اور وہ اس معصوم کا نام لے لے کر امی کو بدظن کر رہی ہوں۔"

"لیکن اس سے منزہ آنٹی کو کیا فائدہ ہوتا؟"

"ایک تو سوتیلے پن کی تسکین ہو جاتی' وشمہ کے سسرال میں اس کے جانے سے پہلے ہی اس کے خلاف کدورت پھیلا کے۔۔۔۔ اور دوسرا یہ شادی نہ ہو پاتی تب بھی وشمہ کو بدنام کرنے کا تو اچھا خاصا انتظام ہو چکا تھا ان کی دانست میں۔" "آپ کا قیاس غلط نہیں ہو سکتا تھا اگر۔" اتنا کہہ کے وہ ذرا سا رکی۔

"اگر۔۔۔۔ اگر کیا؟"

"اگر وشمہ کا ان کی باتوں۔۔۔۔ بلکہ الزامات کے جواب میں ہم سب نے اس کا وہ ردعمل نہ دیکھا ہوتا۔۔۔ اس کے تاثرات ایسے ہی تھے جو کسی بھی۔۔۔۔ کسی شریف سچ کے سامنے آجانے پہ ہوتے ہیں۔ اگر یہ الزام غلط ہوتا

اس کی خاموشی میں ایک دکھ 'ایک احتجاج ہوتا لیکن اس کی چپ شرمندگی تلے دبی ہوئی تھی۔"

"ہاں۔۔۔ شاید تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔"

حسن نے دل پہ پتھر رکھ کے بالآخر وشمہ کا قصور تسلیم کر ہی لیا۔

☆ ☆ ☆

جو کچھ وشمہ کہہ کے گئی تھی۔ وہ منزہ کو ہلا ڈالنے کے لیے کافی تھا۔۔۔۔ اگرچہ اسے اب تک یقین نہیں آیا تھا کہ یہ ساری بات حقیقت پر مبنی ہے۔۔۔ لیکن اس کے باوجود اس کی سانسیں تک خشک ہوتے چلی جا رہی تھیں۔ یہ سوچ سوچ کر کہ جس گھر ہستی کو قائم رکھنے کے لیے اس نے اپنی بیٹی تک کی قربانی دی۔ آج وہی بیٹی اس گھر ہستی کے لیے پھر سے سب سے بڑا خطرہ بنی ہوئی ہے۔

"اگر اس بار سوہا کی وجہ سے مجھے کوئی الزام 'کوئی طعنہ سننے کو ملا تو میں برداشت نہیں کروں گی۔ 'اور یہ الزام۔۔۔ کہ سوہا کی وجہ سے وشمہ کا گھر ٹوٹا۔۔۔ اس کی شادی شدہ زندگی برباد ہوئی' یہ الزام تو میری زندگی کا سب سے بڑا الزام ہو گا۔"

فون کی گھنٹی پہ وہ اپنے خیالوں سے چونکی۔

"ضرور نوید کا ہو گا۔۔۔" وہ سستی سے اٹھی۔

اس کے بجھے بجھے رویے سے نوید کل سے ٹھٹکا ہوا تھا اور بات بات پہ اس کی وجہ دریافت کر رہا تھا۔

"ہیلو۔۔۔۔" اس نے ایک بار پھر گھسے پٹے بہانے دل میں دہراتے ہوئے کہا۔۔۔ مگر دوسری جانب اسے ثنا کی ہشاش بشاش آواز سنائی دی۔

"کیسی ہو منزہ؟"

"ٹھیک ہوں۔" اس نے بھی زبردستی اپنی آواز میں بشاشت پیدا کی۔

"تمہیں ایک خبر سنانا تھی۔"

"اچھی یا بری؟" اس نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

"اف کورس اچھی خبر ہے۔۔۔ بھول گئیں تم مجھے بری خبریں پھیلانے کا شوق کبھی بھی نہیں رہا۔"

"یہ شوق شاید کسی کو بھی نہیں ہوتا۔۔۔۔ قسمت جھولی میں ڈال جاتی ہے یہ ذمے داری کسی کسی کو کہ جاؤ ان بری خبروں کو جی بھر کے خود بھی سہو اور دوسروں کی جھولی میں بھی حسب توفیق ڈالتے جاؤ۔"

"نہیں بھئی۔۔۔۔ میں تو دل خوش کرنے والی خبر۔۔۔ بلکہ خبریں سنا رہی ہوں۔ ایک تو یہ کہ میں اور جمشید سوہا سے مل کے آئے ہیں۔"

"کیا؟" وہ بھرپور طریقے سے چونکی۔

"سوہا سے؟ مل کے آئے ہیں یا اتفاقاً ملی تھی؟"

"مل کے آئے ہیں بھئی۔۔۔ اس کے گھر۔"

"اس کے چچا چچی نے ملنے دیا؟"

"روک سکتے تو روکتے۔"

"اور سوہا۔۔۔۔ وہ ٹھیک طرح سے ملی؟"

منزہ نے ڈرتے ڈرتے پوچھا کہ نجانے وہ ان سے کس انداز میں پیش آئی اور اسے اب کیا سننے کو ملے۔

"بالکل۔۔۔ ہاں پہلے پہچان نہیں پائی۔۔۔ لیکن بعد میں کافی دیر تھوڑی گپ شپ رہی۔"

"اچھا۔۔۔۔" منزہ نے بے یقینی سے کہا۔ اسے سوہا کے بارے میں کسی قسم کی خوش فہمی نہیں تھی۔

"اور ہاں۔۔۔ پرسوں اس نے آنے کا وعدہ کیا ہے۔"

"کیا؟ لیکن وہ۔۔۔ وہ تو۔" اس بار منزہ بالکل بھی یقین کرنے کو تیار نہیں تھی۔ بھلا سوہا کیسے جمیل بھائی کے گھر

جا سکتی ہے۔ "وہ تو ان کا نام تک سننے پر تیار نہیں ہوتی۔ چلو آپ دونوں کو تو پھر بھی مانا جا سکتا ہے کہ اس یادداشت میں آپ کے حوالے سے کوئی خوشگوار واقعہ نہیں تو کوئی ناخوشگوار واقعہ بھی نہیں ہو گا شاید مروت میں وہ آپ کی حامی بھر بھی لے لیکن وہاں اس گھر میں ناممکن۔"

"بہت اچھی طرح جانتی ہو تم اپنی بیٹی کو..... واقعی وہ وہاں آنے پہ کسی قیمت پہ تیار نہیں تھی۔"

"تو پھر——"

"تو پھر یہ کہ یہ کوئی ہماری انا کا مسئلہ تو تھا نہیں—— نہ ہماری کوئی ضد تھی کہ اسے لانا" جمیل بھائی کے گھرانے پہ جھکانا ہے۔ بس ہم ملنا چاہتے ہیں اس سے 'کچھ اچھا وقت' کچھ اچھی باتیں' کچھ اپنی لاپروائی کا ازالہ—— کچھ اس کے دل کی کدورت کو کم کرنا..... صرف یہی مقصد ہے اس سے ملنے اور ملتے رہنے کا۔"

"ملنا تو میں بھی چاہتی ہوں اس سے' اور ملنے کا ایک مقصد میرے پاس بھی ہے مگر میں جانتی ہوں مجھ سے ملنے کے لیے وہ اتنی آسانی سے نہیں مانے گی۔"

"تمہیں اس سے کچھ کہنا ہے تو مجھے بتا دو..... میں کہہ دوں گی۔"

"وہ اتنی آسانی سے کہنے والی بات نہیں ہے۔"

"تم بھی آ جاؤ وہاں—— ہم نے ایک فارم ہاؤس میں ملاقات رکھی ہے۔ جمشید کے دوست کا ہے—— یہیں قریب ہی بس آدھے گھنٹے کی ڈرائیو پہ—— تم کہو تو تمہیں پک کرتے ہوئے چلے جائیں۔"

"نہیں—— نہیں۔" وہ گھبرا گئی۔

"میرا نام سن کے تو وہ فارم ہاؤس میں بھی ملنے پہ تیار نہیں ہو گی اور میں چاہتی ہوں کہ وہ مجھ سے نہ سہی' کم از کم آپ لوگوں سے ضرور ملے۔"

"کوئی بات تو ہے منزہ—— تمہارا لہجہ بتا رہا ہے۔"

"ہاں..... بات ہے..... مگر جب تک میں کسی نتیجے پہ پہنچ نہیں جاتی کیسے بتاؤں..... اور اگر بالفرض بتا بھی دوں تو اس کا فائدہ کیا ہو گا؟ کیا آپ اس سلسلے میں میری کوئی مدد کر سکیں گی؟"

"ضرور..... تم ایک بار کہہ کے تو دیکھو۔"

"ٹھیک ہے—— میں آج ہی وشمہ سے کہتی ہوں کہ——"

وہ روانی سے بتاتے بتاتے خود ہی رک گئی۔

"وشمہ—— وشمہ سے کیا کہنا ہے؟"

"نہیں—— کچھ نہیں میں کل فون کرتی ہوں آپ کو؟"

ثنا کا فون بند ہوتے ہی اس نے وشمہ کا نمبر ملایا۔

"تمہاری بات ہوئی وصی سے؟"

"کیا خاک بات ہو گی ماما—— دو دن ہو گئے میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔" وہ پھوٹ پھوٹ کے رو دی۔

"کیا—— وہ دو دن سے گھر نہیں آیا؟"

منزہ ایک دم بے چین ہو اٹھی' اسی وقت نوید مراد کو یہ خبر سنانے کے لیے کہ جس بہن کے سپرد اس نے اپنی اکلوتی بیٹی بڑے ارمانوں کے ساتھ کی تھی۔ اس بہن کے گھر وہ بیٹی اس درجہ ناقدری کا شکار ہے۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس سب کا پس منظر یاد آ گیا۔ وہ نئے وسوسے کا شکار ہو گئی۔ اگر سجاد والی بات میں ذرا سا بھی سچ نکلا تو پھر پروین نہیں وہ خود آئے گی۔

"گھر تو آتے ہیں—— مگر اپنے کمرے میں نہیں۔"

"تو کہاں ہوتا ہے؟"

"مجھے کیا پتا؟" وہ چڑ گئی۔ "میں تو دو دو دن کمرے سے نہیں نکلی۔"

"یہ وقت کمرہ بند کر کے بیٹھنے کا نہیں ہے وشمہ! تم خود کو اکیلا کر رہی ہو۔ اس وقت تمہیں زیادہ سے زیادہ حمایت کی ضرورت ہے اور حمایت ہمیشہ مظلوم کے ساتھ ہوتی ہے۔ تمہارے معاملے میں ظلم تمہارے ساتھ ہوا ہے یہ بات سب جانتے ہیں' صرف تمہیں منوانا ہے۔ سب سے الگ کٹ کر الگ ہو کر تم کیا کر لو گی؟ گھر سے بھاگ کر شادی نہیں کی تم نے' وہ لوگ بیاہ کر لے کر گئے ہیں—— کیسے چپ چاپ تماشا دیکھ سکتے ہیں وہ کہ تم دو دن سے کمرے میں اکیلی بند پڑی ہو اور وہ تمہارا شوہر اندر جھانک تک نہیں رہا۔"

"ماما—— پھوپھو نے سب کو بتا دیا ہے۔"

"کیا—— کیا بتا دیا ہے؟"

"یہی کہ—— یہ شادی..... یہ شادی میری پسند اور ضد کے نتیجے میں۔"

"کیا—— مجھے پروین سے اس ہلکے پن کی توقع نہیں تھی۔"

"اب کیا ہو گا ماما..... میں تو کسی کا سامنا تک کرنے کے قابل نہیں رہی۔"

"ایسا کچھ نہیں کیا تم نے وشمہ..... جو منہ چھپاتی پھرو—— پسند کی شادی کرنا کوئی جرم نہیں ہے۔ شادی ہوئی تو سب کی رضامندی سے ہے..... پورے زمانے کے سامنے..... ہر طرح کے رسم و رواج کے ساتھ۔"

"لیکن مجھے تو بے حد سبکی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔ اگر وصی کی پسندیدگی بھی اس رشتے میں شامل ہوتی تو میں سر اٹھا کے اس بات کا مقابلہ کرتی۔ لیکن اب تو سب یہ سمجھ رہے ہیں کہ میری یک طرفہ پسندیدگی کی وجہ سے وصی کو یہ زہر کا گھونٹ پینا پڑا اور میں ہی وجہ ہوں۔ اس کی اس حالت کی میں ہی ذمے دار ہوں۔"

"اور تم چپ چاپ سب برداشت کر رہی ہو؟ تم نے یا میں نے وصی کو گن پوائنٹ پر تو شادی کے لیے مجبور نہیں کیا تھا۔ نہ پروین کے گلے میں کوئی پھندا ڈالا تھا۔"

"میں چپ رہنے پہ مجبور ہوں ماما! کیونکہ میں کمزور ہوں۔ میری واحد طاقت آپ ہیں۔ لیکن اگر—— اگر سجاد والی بات سامنے آ گئی تو آپ کی طاقت بھی کھو دوں گی میں۔"

سجاد کے ذکر پہ منزہ کی ساری تندی تیزی ماند پڑ گئی۔

"سنو وشمہ! یہ بات جلد از جلد کلیئر ہونی چاہیے۔"

"اور کس طرح کلیئر کروں میں بس میں نے خود سنا ہے۔ آپ کیوں میرا یقین نہیں کر رہیں؟"

"یہ بات بطور خاص تمہیں گمراہ کرنے کے لیے بھی سنائی جا سکتی ہے۔ تم وصی سے معلوم کرو۔"

"وہ میرے سامنے ہی کب آتے ہیں؟"

"تو تم سامنے چلی جاؤ۔"

"میں کیوں..... نہیں مجھ سے نہیں ہو گا یہ..... غلطی یہ وہ ہیں میں نہیں جو جھکوں۔"

"میں تم سے جھکنے کے لیے نہیں کہہ رہی وشمہ—— تم اس کے پاس جاؤ گی—— معافی مانگنے یا منانے نہیں..... اپنے سوال کا جواب لینے اور یہ بہت ضروری ہے۔ جب تک مجھے تسلی نہیں ہو جاتی کہ یہ بات سراسر جھوٹ نہیں ہے تب تک میں تمہاری مدد نہیں کر سکتی۔ چاہتے ہوئے بھی نہیں۔"

"اور اگر یہ بات جھوٹ نہ نکلی تو کیا تب آپ میری مدد کریں گی؟" وشمہ کے سوال نے منزہ کو گنگ کر دیا۔

☆ ☆ ☆

"وصی! یہ کیا تماشا بنا رکھا ہے تم نے؟"

کتنے دنوں سے چپ چاپ سب برداشت کرتی پروین کا پیمانہ صبر بالآخر لبریز ہو گیا۔

آج پھر رات پونے گیارہ کے قریب گھر لوٹتے ہی وصی بغیر کچھ کھائے پیئے ڈرائنگ روم میں چلا گیا تھا—— وہ تین دن سے صوفے پہ ہی بسر کر رہا تھا۔

"یہ کون سا وقت ہے گھر آنے کا—— پہلے تو تم چھ سوا چھ تک آ جاتے تھے۔ حد سے حد تک سات بج جاتے

"میں آفس سے چھٹی کے بعد ہی نکلا ہوں۔"

"اس کے بعد اس کے پاس حاضری دینے جاتے ہو گے۔ وہ کیسے لوگ ہیں؟ اس سے ہی اندازہ لگالو تم ان کی شرافت اور خاندانی پن کا، کوئی کیسے ایک جوان غیر مرد کو اپنی بچی کے پاس آدھی آدھی رات تک بٹھائے رکھنا گوارا کرتا ہے؟"

"میں نسیم کے ہاں تھا۔ کل بھی اور آج بھی، آپ چاہیں تو پتہ کر لیں۔۔۔ اس کی والدہ سے تو آپ کی بات چیت رہتی ہی ہے۔"

"کیوں کر رہے ہو تم ایسا؟"

اس کے شکستہ لہجے پہ پروین بھی نرم پڑ گئیں۔

"آپ جانتی تو ہیں؟"

"یہ کوئی طریقہ نہیں ہے وصی..... تمہاری وجہ سے ہم سب لوگ اس لڑکی کے سامنے شرمندہ رہتے ہیں۔ تم سارا دن گھر پہ ہوتے نہیں۔ مصیبت ہم سب کے لیے ہے۔ نہ کمرے سے نکلتی ہے نہ کسی سے بات کرتی ہے۔ چوبیس گھنٹے رونا دھونا۔۔۔ سو منتیں کر کے تو اسے کھانا کھلانا پڑتا ہے۔ کبھی ہمارے لے کر جاتی ہے۔۔۔ کبھی دروازہ بلواتی ہوں۔ میرے سے تو جایا نہیں جاتا۔ ایسی الزام دیتی نظریں۔ کیا میں یہی سب دیکھنے کے لیے رہ گئی ہوں۔ اور سے اپنے ماموں کا مزاج تم جانتے ہو۔ انہیں کسی نہ کسی طرح بھنک نہیں پڑنے دی اب تک، لیکن چلو وہ ان تو آگئے۔ کب تک چھپائیں گے۔ کل بھی پوچھ رہے تھے کہ وہ کھانے کے لیے ٹیبل تک کیوں نہیں آئی۔۔۔ طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنایا۔۔۔ وہی آج چل گیا۔ کب تک اسے بیمار بتلاتی رہوں گی۔ دیکھنا کل تک یہ اعتراض سامنے آجائے گا کہ بہو ہو کر تین دن سے سلام تک کرنے کیوں نہ نکلی۔ تمہارے ماموں اور کن کن کا اعتراض نہ کریں اور وہ بھی میرے میکے سے وابستہ کسی فرد کے اوپر یہ بھلا ہو سکتا ہے۔"

"مجھے بتائیں۔۔۔ پھر میں کیا کروں؟" وہ زچ ہوا تھا۔

"جا کے ہاتھ جوڑوں اس کے آگے..... قسمیں وعدے کرنوا لے منہ میں ڈالوں؟ کیا کروں؟"

"اپنی یہ روش ترک کر دو خدا کے لیے..... یہ دن بھر غائب رہنا۔۔۔ آدھی رات کو آ کے بجائے اپنے کمرے کے یہاں گھس جانا۔ آخر وہ بیوی ہے تمہاری۔ یہ تمہارا گھر ہے۔ کیوں اجنبی مہمان بنے ہوئے ہو۔ وہ غلط کر رہی ہے میں جانتی ہوں لیکن یہ بھی مانتی ہوں کہ وہ جو کر رہی ہے۔ تمہارے اس عمل کے رد عمل کے طور پہ کر رہی ہے۔ تم سدھر جاؤ تو وہ بھی سدھر جائے گی۔"

"میں کیسے جاؤں اس کمرے میں..... مجھے اس کے سوال، اس کے آنسو تنگ کرتے ہیں ممانی جان۔"

"یہ سوال اس کے دل میں پیدا کرنے والے بھی تم ہو۔۔۔ یہ آنسو ان آنکھوں تک لانے والے بھی تم ہو۔ وہ میری بھانجی ہے اس لیے نہیں کہہ رہی۔۔۔ یقین کرو..... مکمل غیر جانب داری سے کہہ رہی ہوں کہ بہر حال اس ساری صورت حال کے ذمے دار تم ہو۔ اس کا رد عمل بچکانہ اور شدید ضرور ہے۔ مجھے سارے گھر کے سامنے خفت میں بھی مبتلا کر رہا ہے لیکن یہ سب تمہاری وجہ سے ہے۔ تم وہاں کیوں نہیں جاتے؟"

"صرف میرے ماننے سے کیا ہوتا ہے..... چلیں مان لیتا ہوں یہ سب میری غلطی ہے۔۔۔ اب اس سے کیا حاصل؟"

"غلطی مان لینے کے بعد اگلا مرحلہ اس کو سدھارنے کا ہوتا ہے۔"

"کوئی حل نہیں ہے اس مسئلے کا۔ کم از کم میرے پاس تو نہیں۔ اب اماں جان کو ہی بھیجنا پڑے گا تمہیں سمجھانے کے لیے۔"

وصی نے احتجاجاً سر اٹھا کے دیکھا۔ مگر وہ اپنی کہہ کے جا چکی تھیں۔ وہ گہری سانس بھر کے رہ گیا۔ جتنا کسی کا سامنا کرنے سے بچنا چاہ رہا تھا۔۔۔ اتنے سوال سر اٹھا اٹھا کے سامنا کرنے پہ مجبور کر رہے تھے اور شوکت جہاں کا سامنا کرنے کے تو فقط تصور سے ہی وہ گھبرا اٹھا۔

وہ تھکے تھکے انداز میں صوفے پہ لیٹ گیا۔ بازو موڑ کے آنکھوں پہ رکھ لیا۔ نیند تو آنی نہیں تھی..... مگر کوشش کرتے رہنے میں کیا حرج تھا۔

دروازہ کھلنے کی ہلکی سی آواز پہ اس کا دل مزید بوجھل ہو گیا۔ وہ دل ہی دل میں خود کو شوکت جہاں کے سوالوں کے لیے تیار کرنے لگا۔

قدموں کی آہٹ کے ساتھ ہی دوشمہ کی بست مدھم آواز سنائی دی۔

"کب آئے آپ؟"

اس نے فوراً آنکھیں کھولیں..... ایک بالکل بدلے ہوئے روپ میں وہ سامنے تھی۔۔۔ شادی سے پہلے کبھی ہزاروں بار جب بھی دیکھا تھا۔ بڑے سادہ روپ میں دیکھا تھا اور شادی کے بعد سے مسلسل بہت بنے سنورے روپ میں لیکن آج اس کے وجود اور سراپے سے نہ وہ کم عمری کی سادگی کا نکھار نظر آ رہا تھا نہ ہی دلہناپے کا سنگھار۔

"کھانا کھایا آپ نے؟"

"اور تم نے؟" بے ساختہ وہ پوچھ بیٹھا۔

جواب میں وہ سر جھکا کے انگلیاں مروڑنے لگی۔

"مامی نے بتایا ہے تم کھانا نہیں کھاتیں۔ کسی سے بات نہیں کرتیں۔ کمرے سے نکلتیں کیا ہے یہ سب؟"

وہ نرم لہجے میں پوچھ رہا تھا مگر دوشمہ کو یہ سب تیزے کی انی کی طرح چبھ رہا تھا۔ اسے پروین سے نئے سرے سے ہونے لگا جو اس کے آنے سے پہلے ہی اس کی شکایتیں وصی تک پہنچا چکی تھیں۔

"اور آپ جو کچھ کر رہے ہیں۔۔۔ وہ کیا ہے؟"

شوہر کے سمجھنے سمجھانے پہ وہ خود کو شانت کر کے آئی تھی مگر رہ نہ سکی۔

"تم سمجھو..... میرا دماغ خراب ہے۔"

"اور آپ سمجھیں کہ آپ نے میرا بھی دماغ خراب کر دیا ہے۔"

وصی حیرت سے اسے تکنے لگا۔

"کیا دکھ رہے ہیں؟"

"مجھے ہرگز اندازہ نہیں تھا کہ اتنی گم صم اور جھینپی رہنے والی لڑکی اتنے جواب بھی دے سکتی ہے اور وہ بھی ترکی بہ ترکی۔"

"پھر تو بڑا دھوکا ہوا آپ کے ساتھ۔۔۔ بے خبری میں مارے گئے آپ، آپ نے تو یہی سوچ کر شادی کی ہو گی میرے ساتھ کہ یہ تو بے زبان ہے۔۔۔ بے وقوف ہے، کچھ بھی کر لو چپ چاپ برداشت کرے گی۔ مگر ایسا ہوا نہیں اور ہو گا بھی نہیں کیونکہ میں چپ چاپ سب کچھ برداشت کرنے والوں کا حشر دیکھ چکی ہوں۔ میری ماما کی مثال سامنے ہے۔ مجھے ان کی طرح جبر و برداشت اور درگزر کے ریکارڈ نہیں بنانے..... قربانی کی مثالیں پیش کرنی ہیں۔ ہاں ان سب کے بدلے انہیں کوئی عزت و تکریم کے میڈل ملے ہوتے تو شاید میرے اندر بھی یہ لالچ پیدا ہو کہ میں بھی یہ سب حاصل کر لوں۔ مگر اتنا سب کرنے کے بعد بھی وہ خالی ہاتھ ہیں۔ ان کی قربانیوں اور صبر کا جذبہ تو در کنار۔۔۔ کوئی کھلے دل سے اعتراف تک نہیں کرتا پھر میں کس آس پہ ان کے نقش قدم پہ چلوں۔۔۔ مجھے وہی کرنا ہے جو ایک عام انسان کرتا ہے ایک عام انسان اپنا حق چھنے پہ کیا کرتا ہے؟ جانتے ہیں ناں آپ؟ چیختا ہے، چلاتا ہے واویلا کرتا ہے۔ دوسروں کو الزام دیتا ہے۔ خود کو سزا دیتا ہے یہ سب کروں گی میں اور دوچھ ملے نہ ملے کم از کم میرے اندر کی گھٹن تو ختم ہو گی۔ یہ احتجاج میرا حق ہے۔ مجھے احتجاج کرنے سے نہیں روک سکتے آپ۔"

"ہاں شاید ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ یہ حق ہے تمہارا۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں تسلیم کر رہا تھا۔

"مجھے بھی تم سے یہ توقع نہیں رکھنی چاہیے کہ تم بے حسی کی چادر اوڑھ کے سارا دن فقط مسکراتی ایک بارہ ٹکی نویلی دلہن کا رول پلے کرتی رہو۔۔۔ صرف میری کوتاہیوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے۔"

"تو آپ یہ تو مانتے ہیں کہ آپ سے کوتاہی سرزد ہو رہی ہے۔"

"ہاں۔۔۔ مانتا ہوں لیکن اس کا ازالہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں۔۔۔ یہ میرے بس سے باہر ہے۔"

"یہ تو آپ کے بس میں ہے ناں کہ مجھے اس کا نام ہی بتا دیجئے۔۔۔ جس کے سامنے آپ کو میں نظر نہیں آئی۔"

وصی چند سیکنڈ چپ رہا۔

"اس کا نام جاننے سے تمہیں کوئی دلچسپی نہیں ہونی چاہیے۔"

"ہونی چاہیے۔۔۔ آپ سے میرا تعلق ایسا ہے کہ میں سب کچھ جان سکوں۔"

"مجھ سے ہوگا۔۔۔ مگر اس سے نہیں۔"

وشمہ معنی خیز انداز میں مسکرائی پھر قدم آگے بڑھ کے اس کے مقابل آئی۔

"ہو سکتا ہے اس سے بھی کوئی گہرا تعلق نکل آئے۔"

وصی اچانک ہی بے تحاشا اور بے نام سی گھبراہٹ میں مبتلا ہو گیا۔

"ویسے اتنا بتا دوں۔۔۔ مجھے نام جاننے سے زیادہ اس نام کی تصدیق کرانے میں دلچسپی ہے۔ اتنا تو میں جان چکی ہوں کہ وہ کون ہے لیکن سنی سنائی بات پہ یقین کرنے کے بجائے صرف ایک بار آپ کی زبانی یہ اعتراف سننا چاہتی ہوں۔"

"میں تمہاری تسلیاں کرانے کا پابند نہیں ہوں۔" وہ درشتی سے بولا۔

"چاہے کسی دل سے بھی سہی۔ مگر بہرحال آپ نے مجھے بیوی تسلیم کیا ہے۔ اللہ رسول کو گواہ بنا کے۔ سینکڑوں لوگوں کی موجودگی میں اور آپ اس بات کے پابند ہیں کہ میرے اس سوال کا جواب دیں۔"

"مجھے تمہارے کسی بھی سوال کا جواب نہیں دینا۔" وہ غصے میں میز سے گاڑی کی چابیاں اٹھاتے ہوئے بولا۔

"صرف ہاں یا ناں۔"

وہ دروازے کی جانب بڑھتے وصی سے پوچھ رہی تھی۔

"کیا وہ لڑکی سوہا آپی ہیں؟"

وصی کے قدم دروازے کے پاس رک گئے۔

"کیا وہ لڑکی سوہا آپی ہیں؟"

وشمہ نے اپنا سوال دہرایا۔ اس بار اس کے لہجے میں جارحانہ پن نمایاں تھا۔

وصی نے سوچنے میں صرف ایک لمحہ لگایا۔

یہی وقت تھا اپنے اندر کے اس ندامت بھرے احساس کو دھونے کا کہ وہ سوہا کی محبت کو وہ مقام نہیں دے سکا جس کی وہ حق دار تھی۔ اگر آج اس محبت سے مکر جاتا تو شاید کبھی اس کا دل سوہا کے سامنے سرخرو نہ ہو پاتا۔

"ہاں۔۔۔ میں سوہا سے محبت کرتا ہوں۔"

اس کے انداز میں تفاخر تھا۔ اس کے اعتراف میں سکون تھا۔ ہلکا پھلکا سا ہو کر وہ باہر نکل گیا اور وشمہ ذہنی طور پر یہ جواب سننے کے لیے تیار ہونے کے باوجود سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

ثنا نے اس سے بچپن کی کسی تلخ یاد کا تذکرہ تک نہ کیا منزہ کے حوالے سے بھی کوئی بات نہ کی۔ نہ اسے ان سے ملنے پر اکسایا نہ منزہ کی جانب سے کسی قسم کی کوئی نصیحت یا صفائی پیش کی اور تو اور ربا کے بارے میں اس سے رتا برابر بدگمانی بھی نہ کی۔ بلکہ جب سوہا نے اس کا روعمل جاننے کی غرض سے جان بوجھ کر ربا سے اپنے نگاؤ اور قربت کا اظہار کیا اس کی تعریف کی تو ثنا نے نہ صرف دلچسپی ظاہر کی بلکہ بڑھ چڑھ کر ربا کی خوبیوں کی تائید بھی کی۔ غرض سوہا جو توقعات لے کر ثنا سے ملنے آئی تھی۔ وہ منہ کے بل جا گریں۔

"کتنی خوش اور رانگ نظر آ رہی ہے سوہا!" دور بیٹھے جمشید نے ثنا سے کہا۔

"ہاں۔ جب ہم اس سے ملنے گئے تھے تو وہ ویسی ہی تھی جیسی منزہ نے بتایا تھا۔ اکھڑی اکھڑی رہنے والی۔ چڑچڑی بدلحاظ لیکن وہ اس کا اوپری خول تھا۔ ویکھو تو اندر سے کتنی نرم اور محبت کرنے والی ہے۔ بلکہ منزہ کا ماضی۔ کیسی بالکل ویسی ہی معصوم کتنی گھل مل گئی ہے اپنے بہن بھائیوں سے۔"

"تمہیں منزہ کو بھی بلا لینا چاہیے تھا اس پکنک پہ۔ وہ سوہا کو ہنستے بولتے دیکھ کے خوش ہو جاتی۔"

"لیکن شاید سوہا اسے دیکھ کے خوش نہ ہو پاتی۔ میں سوہا کے اندر جمی برف کو پگھلانا چاہتی ہوں۔ اسے توڑنا ہی چاہتی۔ برف پگھلنے میں بہت کم وقت لگتا ہے لیکن اس سے پہلے اسے زبردستی منزہ کے گلے باندھنا اسے ماں سے اور متنفر کر دے گا۔"

"لیکن میں دل سے چاہتا ہوں ثنا! کہ اس کا دل ماں کی طرف سے صاف ہو جائے۔ منزہ کی آنکھوں میں اکلوتی اولاد کی نفرت اور بے رخی کا زرد سناٹا ان کے ٹھہر گیا ہے جو مجھ سے دیکھا نہیں جاتا۔"

"دھند چھٹے گی جمشید! ایک دن سب ٹھیک ہو جائے گا۔" ثنا نے تسلی دی۔

"میرے دل سے یہ بوجھ نہیں جاتا کہ کیریئر بنانے کے چکر میں روزگار کے بہتر مواقع کے لالچ میں اولاد کے مستقبل کی خاطر میں نے کتنی خود غرضی سے کام لیا اور بہن کو ان حالات میں اکیلا زمانے کے تھپیڑے سہنے کے لیے چھوڑ دیا جب اسے ہمارے سہارے کی سب سے زیادہ ضرورت تھی۔"

"غلطیاں انسانوں سے ہی ہوتی ہیں۔ ہم سے بھی ہوئی۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں۔ ہاں مگر غلطی کا احساس اتنی دیر سے ہو کہ ازالے کی مہلت بھی نہ ملے۔ وہ افسوسناک ہے۔ ہمارے پاس تو ازالے کی گنجائش بھی ہے اور تلافی کا راستہ بھی۔"

اس نے مسکراتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں فارم ہاؤس کے سبزہ زار پہ سوہا اس کے بچوں نشاط اور مہک کے ساتھ کرکٹ کھیل رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

"اب تو آپ کو کسی ثبوت کی ضرورت نہیں؟ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے اور وہ بھی کسی دوسرے کی زبانی نہیں۔ بلکہ خود وصی نے میرے سامنے یہ اعتراف کیا ہے۔ اب یہ مت کہیے گا کہ آپ کو ابھی بھی یقین نہیں آ رہا۔"

وشمہ نے تلخ لہجے میں کہا۔

منزہ کی حالت ایسی تھی جیسے سارے بدن سے کسی نے لہو نچوڑ لیا ہو۔

"پتا نہیں کس بات کا بدلہ لیا ہے سوہا آپی نے مجھ سے۔ میں نے تو کبھی ان کے ساتھ کچھ برا نہیں کیا۔ کبھی برا نہیں چاہا۔ پتا نہیں ماما! کیوں کیا انہوں نے ایسا؟"

منزہ کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔

وشمہ اس معاملے میں سچی تھی۔ اس نے کبھی سوہا کے بارے میں کچھ غلط نہیں کہا تھا۔ منزہ کس منہ سے بتاتی سوہا نے یہ دشمنی اس کے ساتھ نہیں اپنی ماں کے ساتھ نکالی ہے۔

"آپ ابھی ان سے بات کریں۔ ان سے پوچھیں۔"

وشمہ نے اسے جھنجھوڑا۔

"ہاں۔۔۔ میں۔۔۔" منزہ نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ "میں۔۔۔ ابھی کرتی ہوں بات۔"

مگر اس کے کھوکھلے لہجے سے اس کے ارادے کا بھربھرا پن ظاہر تھا۔

"میرے سامنے بات کریں۔ انہیں یہاں بلائیں۔"

وشمہ سخت مضطرب ہو رہی تھی۔ بس نہ چل رہا تھا کہ ابھی سوہا سامنے آجائے اور وہ اسے جھنجوڑ جھنجوڑ کے سارے حساب کتاب کر لے۔

"کیسی باتیں کر رہی ہو؟ اسے یہاں کیسے بلا سکتی ہوں میں؟ سب کو پتا چل جائے گا۔"

"سب کون..... گھر میں اور کون ہے میرے اور آپ کے علاوہ؟ پاپا تو ہیں نہیں۔ آپ صاف صاف بات کرنے کے لیے انھیں یہاں بلائیں۔"

"وہ نہیں آئے گی وشمہ! بالکل نہیں آئے گی۔"

"تو آئیں میرے ساتھ چلیں۔ ہم خود جاتے ہیں اس کے گھر۔ ذرا اس کی آوارہ چچی کو بھی چار باتیں سنا کے آئیں جس کی شہ پہ وہ یہ گل کھلا رہی ہے۔ اسی سے سیکھے ہیں اس نے دوسروں کے شوہر ہتھیانے کے گر۔"

وشمہ کے زہر میں بجھے الفاظ منزہ کو ان سب تکلیف دہ الفاظ سے کہیں زیادہ شدت سے دردناک محسوس ہوئے جو وہ اب تک سوہا کے بارے میں بہت سے اجنبی لوگوں سے سنتی آئی تھی۔

"وہ اس آوارہ عورت کے زیر تربیت صرف اس لیے رہی وشمہ! کہ تمہیں میری تربیت اور توجہ مل سکے۔"

منزہ نے اسے کچھ یاد دلانا چاہا مگر وہ ہتھے سے اکھڑ گئی۔ بدلحاظی اور زبان درازی کے یہ نئے اسباق بھی اسے خود منزہ نے ہی تو سکھائے تھے۔

"یعنی آپ کا بھی یہ ماننا ہے کہ وہ اس معاملے میں حق بجانب ہے۔ چونکہ میں نے اس کی ماں کی محبت پائی۔ اس لیے اسے پورا حق ہے کہ وہ میرے شوہر پہ قبضہ جمانے کی کوشش کرے۔ آپ اس کا ساتھ دیں گی؟"

"میں کسی کا ساتھ نہیں دے رہی میں تو صرف....."

"اوہ۔ اچھا ہوا! آپ نے فیصلہ سنا دیا کہ آپ کسی کا ساتھ نہیں دے رہیں۔"

وشمہ نے منزہ کی بات درمیان میں سے اچک لی۔

"نہ اس کا۔ نہ میرا لیکن آپ کو پتا ہے۔ میرا ساتھ نہ دینے کا مطلب یہی نکلتا ہے کہ آپ در پردہ اپنی بیٹی کا ساتھ دے رہی ہیں۔"

منزہ کو لگا آج سالوں بعد شمشاد بیگم اس کے سامنے کھڑی ہیں۔

"تمہاری بیٹی..... تمہاری بیٹی۔"

وہ بے یقینی سے اپنے مقابل تن کے کھڑی وشمہ کو دیکھنے لگی۔ یہ وہ وشمہ نہیں تھی جس کی آنکھوں سے پلکوں کی جھالر شاذ و نادر ہی اٹھا کرتی تھی۔

اب تو ان آنکھوں میں شرارے لپکے مارا کرتے تھے۔

وہ وشمہ..... جس کے لب میٹھے بولوں کے شہد ٹپکایا کرتے تھے، اسے منزہ نے ہی زہر میں بجھے تیر چلانے سکھائے تھے۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ یہ نشانہ اس پہ بھی تاک سکتی ہے۔

"میری بیٹی تو تم بھی ہو کیا تمہیں بھی یقین دلانا پڑے گا۔"

اس کے ٹوٹے بکھرتے لہجے پہ وشمہ کی تندی ذرا کی ذرا ماند پڑی۔

"ہاں..... ہوں میں آپ کی بیٹی..... ہاں سمجھتی ہوں آپ کو اور اسی حق سے کہہ رہی ہوں کہ ایک بیٹی کی ماں ہونے کا فرض نبھائیں۔ اس کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا حساب لیں۔ کیوں پیچھے ہٹ رہی ہیں آپ؟"

"ٹھیک ہے میں سوہا سے بات کروں گی۔"

وہ جانتی تھی کہ اس کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ مگر پھر بھی اس نے ہامی بھر لی۔

"بات کریں گی نہیں..... بات کریں..... میرے سامنے۔"

اس کے زور دینے پہ منزہ بھی تڑخ سی گئی۔

"تمہیں میرے کہے کا اعتبار نہیں ہے؟"

"آپ کا ہے..... مگر سوہا کا نہیں۔"

پہلی بار اس نے سوہا کا نام بغیر القاب کے ادا کیا۔

گویا اپنے اور اس کے رشتے اور تعلق کے درمیان ایک حد بندی قائم کر دی۔

"ذرا مجھے بھی تو پتا چلے ان کا موقف کیا ہے۔ آپ نمبر ملائیں اس کا۔"

اس نے فون منزہ کے آگے دھرا۔

منزہ بے چارگی سے ایک گہرا سانس بھر کے رہ گئی۔

❁❁❁❁

رینا کی گود میں سر رکھ کے لیٹے وہ مسلسل مسکرا رہی تھی۔ ایسی مسکراہٹ رینا اس کے لبوں پہ تب دیکھا کرتی تھی جب وصی اس کے پاس ہوتا۔ یا مل کے جاتا۔ مگر وہ دن ہوئے وصی بھی آفس کی مصروفیات اور چھ گھری ٹینشن کی وجہ سے آنہ سکا تھا۔ رینا کو تشویش تھی کہ اس وجہ سے سوہا پھر سے منفی سوچوں کا شکار نہ بن جائے۔ اس لیے اس نے دل پہ پتھر رکھ کے اسے ماموں ممانی کے ساتھ پورے دن کے لیے جانے کی اجازت دے دی۔ یہ خدشہ نظر رکھتے ہوئے بھی کہ وہاں ان کے ساتھ منزہ بھی ہو سکتی ہے۔ سوہا کی برین واشنگ کرنے کے لیے..... لیکن سوہا بحال بنانے کے لیے اور اسے ڈپریشن اور ٹینشن سے دور رکھنے کے لیے ایسا کرنا ضروری تھا۔

اور رینا کا اندازہ درست تھا۔ اس پورے دن کی پکنک کے اثرات اس کے مزاج پہ بڑے اچھے مرتب ہوئے ہے۔ لیکن اس کی حد سے بڑھی خوشی اور طمانیت رینا کے اندازوں سے بڑھ کے تھی۔

"بہت خوش نظر آرہی ہو..... ایسا بھی کیا دے دیا ہے تمہارے ماموں ممانی نے تمہیں؟"

رینا کے لہجے میں تجسس کے ساتھ حسد اور رشک بھی جھلک رہا تھا۔

"وہ..... جو اب تک کسی نے نہیں دیا۔"

"کیا؟" وہ چونکی۔

"اعتماد....." وہ رینا کو دیکھ کے مسکرائی۔ "آپ نے مجھے جی بھر کے محبت دی..... پھر آسائش دی، میرے منہ سے نکلے والی بات کو مکمل ہونے سے پہلے پورا کیا۔ لیکن ماما! آپ کی یہ بے پناہ محبت بھی مجھے..... میری ذات کو وہ اعتماد نہیں دے سکی، جو اس ایک دن کی قربت نے دیا ہے۔ وہ مجھے اس لیے پیار نہیں دے رہے تھے کہ انھیں میری..... مجھے ان کی ضرورت ہے۔ وہ مجھے اس لیے بھی توجہ نہیں دے رہے تھے کہ میرا ان سے کوئی خون کا رشتہ ہے۔ کوئی ایسا احساس نہیں دلایا جا رہا تھا، جس سے لگے کہ یہ محبت، یہ عنایت..... یہ اپنائیت کسی وجہ سے ہے..... سب بغیر وجہ کے تھا..... بالکل نارمل..... میں تو بھول ہی گئی تھی کہ میں ایک نارمل لڑکی ہوں..... ایک نارمل زندگی جی سکتی ہوں..... آپ ہوں..... وصی ہو..... یا تقدیس جیسی کوئی دوست..... سب کی محبت سب کی توجہ ایک ڈر، ایک خوف کے پردے میں چھپی ہوئی ہے..... مجھے آج پتا چلا ماما! کھل کے جینا کیا ہوتا ہے۔"

اپنی دھن میں وہ رینا کے بہتے آنسو بھی نہ دیکھ سکی۔

"اور میں اس گمان میں تھی کہ میں نے تمہیں سب کچھ دیا ہے۔ وہ سب جو ایک ماں اپنی اولاد کو دے سکتی ہے۔"

رینا کے آنسو دیکھ کے سوہا ندامت کے گہرے احساس سے شرابور ہو گئی۔ اس نے ایک ہاتھ سے اس کے بہتے آنسو صاف کیے..... دوسرے سے اس کا ہاتھ تھام کے لبوں تک لگاتے ہوئے کہا۔

"آپ ایسا کیوں سوچتی ہیں؟ آپ نے مجھے وہ سب دیا جو آپ کے بس میں تھا..... مگر جو آپ کے پاس خود نہیں تھا وہ آپ مجھے کیسے دے سکتی تھیں۔ یہ رشتے..... یہ اعتبار بھرا ماحول..... جو آپ کو نہیں ملا۔ آپ کہاں سے لا تیں بھلا..... پتا ہے جب میں ہائی اسکول میں تھی..... تب لڑکیوں کے پاس ماموؤں..... خالاؤں اور کزنز کے علاوہ

کوئی موضوع ہی نہیں ہوتا تھا بات کرنے کے لیے۔ اور میں ٹکر ٹکر سب کے منہ دیکھا کرتی تھی۔ کل اپنے کزنز کے ساتھ تمہاں کرنے کے بعد مجھے پتا چلا میں نے اپنی مَن اِیج میں اور اپنے بچپن میں کیا چیز مِس کی ہے۔ دل چاہ رہا ہے 'پرانے دن لوٹ آئیں اور میں ان میں وہ سارے رنگ بھردوں' بے خودی کے عالم میں اپنائیت کے احساس کے ان رنگوں کے بغیر میرے بچپن کی البم کتنی ادھوری 'کتنی پھیکی ہے۔"

"پرانے دنوں میں رنگ بھرنے کی فکر چھوڑو۔ اپنے آنے والے دنوں کی فکر کرو۔ وصی کو صبح سے ایک بھی فون کیا تم نے؟"

وصی کے ذکر پہ سوہا کی مسکراہٹ بجھ گئی۔

"نہیں۔ دل نہیں چاہ رہا۔"

"کوئی ناراضی؟ کوئی جھگڑا؟"

"نہیں۔ میں اس سے ناراض ہو ہی نہیں سکتی سا! اس کی زندگی میں پہلے کیا کم مشکلیں ہیں' جو میں اپنی ناراضی اس پہ تھوپ کر اسے مزید پریشان کروں۔ میں تو اسے خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس کی پریشانیاں کم کرنا چاہتی ہوں۔ لیکن ڈر جاتی ہوں کہ کہیں اس کی ساری پریشانیوں کی وجہ میں ہی تو نہیں۔"

"اس کی زندگی میں خوشیاں لانے کے لیے تمہارا اس کی زندگی میں شامل ہونا بہت ضروری ہے۔"

"اور میرے اس کی زندگی میں شامل ہونے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی زندگی میں مجھ سے پہلے موجود سب لوگ نکل جائیں۔ ورنہ وہ میرا وجود برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ حقیقت وصی بھی جانتا ہے کہ مجھے اپنانے کے لیے اسے بہت سے اپنوں کو غیر بنانا ہوگا۔ اور اس کا حوصلہ وہ کر نہیں پا رہا۔"

"اسے مجبور کرو۔"

"وہی بات میں نے کہا نا۔ میں اس کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کرنا چاہتی۔ نہیں ڈالنا چاہتی اس پہ کسی قسم کا کوئی دباؤ۔ میں اسے وقت دے رہی ہوں۔ مہلت دے رہی ہوں۔ یہی ہے میرے پاس دینے کے لیے۔ شاید وقت' یہ مہلت اسے بہتر فیصلہ کرنے میں مدد دے۔"

"مگر اس طرح اس سے کٹ کر؟"

"میں اس سے الگ نہیں ہوں ما! ہمارا رشتہ اب رابطے سے بہت آگے نکل گیا ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔"
اس نے مسکرا کے ربنا کا ہاتھ سہلاتے ہوئے تسلی دی۔

"کیسے بے فکر ہو جاؤں۔ ماں ہوں تمہاری 'فکر تو رہتی ہے' وصی لاکھ اچھا سہی' اس کی آنکھوں میں سچائی بھی دیکھی ہے میں نے اور تمہارے لیے بے لوث محبت بھی۔ لیکن وقت کا کیا پتا' کب وہ کمزور پڑ جائے' کب مجبور ہو جائے' اپنے رشتوں کے آگے۔"

"اسی بات سے میں بھی ڈرتی ہوں۔ لیکن اس کا کوئی حل میرے پاس نہیں ہے۔ جیسے کوئی کسی کے دل میں زبردستی اپنی محبت نہیں ڈال سکتا۔ ویسے ہی کسی کے دل سے کسی کی محبت زبردستی نکال بھی نہیں سکتا۔ اس کے دل میں اپنے خاندان کی محبت کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ کاش! وہ لوگ دل سے مجھے قبول کر لیں۔ کاش یہ معجزہ ہو جائے۔"

"آمین۔" ربنا نے صدقِ دل سے کہا۔

"اور معجزے بھی تو اسی دنیا میں ہوتے ہیں۔ دیکھنا ایک دن وہ بڑی چاہ سے تمہیں مانگنے آئیں گے اور وصی بڑی شان سے تمہیں بیاہ کر لے جائے گا۔"

سوہا نے مسکرا کے آنکھیں موند لیں۔
شاید وہ ربنا کے خواب کو خود دیکھنا چاہتی تھی۔

⁂ ⁂ ⁂ ⁂

منزہ نے کسی نہ کسی طرح وشمہ کو ٹال ہی دیا۔ وہ سوہا سے بات ضرور کرنا چاہتی تھی مگر اس کے سامنے نہیں۔
بہت سوچنے کے بعد اس نے ثنا سے مشورہ کرنے کا سوچا۔ ایک وقت تھا وہ اپنی زندگی کے ہر چھوٹے بڑے معاملے میں اس سے مشورہ لیا کرتی تھی۔ جب رشتوں پہ اعتماد نہ رہا تو اس نے کسی سے بھی مشورہ لینا ترک کر دیا۔ لیکن اب وقت نے ثابت کر دیا تھا کہ وہ درست ہے۔ کھرا انسان جو بھی فیصلہ کرتا ہے وہ اسے چھپ کر پہلا کے نصب کرتا ہے۔ اس نے سوہا کے بارے میں جو فیصلہ کیا۔ وہ اس کے بدترین نتائج بھی بھگت رہی تھی۔
اس نے وشمہ کے بارے میں جو قدم اٹھایا' اس کا انجام بھی بھگت لیا تھا۔
اب وہ خود پہ اعتماد کرنے کے قابل نہیں رہی تھی۔ سو ثنا کی طرف چلی آئی۔

"یہ دیکھو۔ پلنک کی تصویریں' کتنی پیاری لگ رہی ہے سوہا!"

ثنا نے اسے تصویریں دکھانا چاہیں۔ منزہ نے ایک اچٹتی سی نگاہ ڈالی۔ کھلتے ہوئے گلابی رنگ کے لباس میں کھلکھلاتی بے فکری سے ہنستی اس لڑکی نے ہمیشہ اولاد بن کے اس کے کلیجے میں ٹھنڈک ڈالنے کے بجائے مشکلات ہی پیدا کی تھیں۔

"کاش اس کا دل بھی اتنا پیارا ہوتا۔"
اس تبصرے پہ ثنا الجھ سی گئی۔

"تم سے ناراض ضرور ہے وصی۔ اور اس کے کچھ گلے جائز بھی ہیں' مگر اس کے دل میں کدورت نہیں ہے منزہ! دیکھو تو ہم سب سے کھل مل گئی تھی۔ وہ تو محبت اور اعتماد کو ترسی ہوئی بچی ہے۔"

"ہاں۔ اتنی ترسی ہوئی کہ اب دوسرے کی محبتیں چھیننے کے درپے ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"اس نے ہمیشہ پیدا ہونے کے بعد سے لے کر اب تک میری راہ میں کانٹے ہی بوئے ہیں۔ کوئی سکھ نہیں دیا۔ شروع سے لے کر اب تک میرا وجود اس کی مہربانی کے طفیل سولی پہ ٹنگا رہا ہے۔ اسے ماں کی عزت کرنے کی توفیق ہوئی نہ محبت کرنے کی۔ نہ ہی میری قربانیوں کا اعتراف کرنے کا حوصلہ یہ خود میں پیدا کر پائی۔ لیکن میرے چند نا کردہ گناہوں کی سزا دینے کا کوئی موقع اس نے ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔"

"ہوا کیا ہے منزہ! کھل کے بات کرو۔"

"کتنی کھل کے کروں؟ اپنی ہی بیٹی کے کرتوت کھولتے ہوئے شرم آتی ہے۔"

"کیا؟" ثنا ششدر رہ گئی۔
اتنی بڑی بات۔ ایسے الفاظ۔ یہ الزام کوئی ماں بے سبب تو اولاد پہ نہیں دھر سکتی۔
وہ سوچ میں پڑ گئی' یہ تو اس نے سوہا کے اندر ایک بے حد معصوم اور بے ضرر سی لڑکی کو پایا تھا۔ اس کا ذہن تسلیم نہیں کر رہا تھا کہ ایسی لڑکی جو پیار کے دو میٹھے بول سن کر پگھل سکتی ہے' وہ کسی کے لیے اتنے آزار کا سبب بھی بن سکتی ہے اور وہ بھی سگی ماں کے لیے۔
منزہ نے مناسب قطع برید کے ساتھ وشمہ کی ساری شکایت اسے بتا دی۔
ثنا سوچ میں پڑ گئی۔

"اب مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں؟ وشمہ کا کہنا ہے کہ میں سوہا سے بات کروں۔ وہ میری ہچکچاہٹ کو جانبداری ٹھہرا رہی ہے' جبکہ خدا گواہ ہے میری ہچکچاہٹ کے پیچھے یہ خوف ہے کہ وہ جو میری ذات کو ذرے سے زیادہ اہمیت نہیں دیتی۔ میری بات کو کیا اہمیت دے گی۔"

"تم اس سے بات کرنا بھی مت۔ میں خود کر لوں گی۔"

"نہیں۔ ورنہ وہ آپ لوگوں سے بھی متنفر ہو جائے گی۔"

"کیوں ہو گی؟ میں اس کے بھلے کی بات کروں گی۔ اسے آنے والے خطرے سے آگاہ کروں گی۔ وہ عاقل'

بالغ، باشعور لڑکی ہے۔ کیا اسے اتنی بھی سمجھ نہیں ہوگی کہ کیا بات اس کے لیے نقصان دہ ہے اور کیا فائدہ مند۔ کون اس کے ساتھ مخلص ہے اور کون نہیں۔"

"اسے اتنی عقل ہوتی تو اس کے دل میں میرے لیے نفرت نہ ہوتی۔"

"یہ نفرت نہیں ہے منزہ! یہ احتجاج ہے... ایک چند ماہ کے بچے کو بھی ماں گود سے اتار کے بستر پر لٹا دے تو وہ احتجاج کے طور پر چلاتا ضرور ہے... ہاتھ پیر پٹخ کے روتا بھی ہے۔ تب تک، جب تک ماں دوبارہ گلے سے نہ لگا لے۔ تم نے تو اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنی آغوش سے محروم کیا تھا۔ چاہے مجبوراً ہی سہی... چاہے دل پہ پتھر رکھ کے ہی سہی... اس احتجاج کو بھی تم ایسی ہی کوئی مجبوری سمجھ لو۔"

☼ ☼ ☼
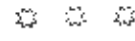
"وصی... بیٹا کیوں اپنی زندگی برباد کر رہے ہو؟"

بڑے دنوں بعد وہ وقت پہ گھر آیا تھا۔

پروین نے اسے پیار سے سمجھانا چاہا... وہ چپ رہا۔

"نئی نئی شادی ہوئی ہے تمہاری... ایسے دنوں میں چہرے پہ نکھار آتا ہے۔ تمہارے چہرے کی تو رونق روٹھ گئی ہے... ہنسنا بولنا بھول گئے ہو... دل کڑھتا ہے تمہیں دیکھ دیکھ کر۔"

"مامی! میں... میں بھی ہنسنا چاہتا ہوں... کھل کے سانس لینا چاہتا ہوں۔ خوش رہنا چاہتا ہوں مگر..."

"مگر... مگر کیا؟"

"مگر اس کے ہمراہ... جس کی ہمراہی کے میں نے خواب دیکھے ہیں۔"

"پھر وہی ضد..." وہ زچ ہوا ٹھیں۔

"تم اچھے بھلے سمجھدار ہو۔ پھر مان کیوں نہیں لیتے کہ یہ ناممکن ہے۔"

"کیا صرف اسی لیے کہ اس کی پرورش ایک شریف عورت نے نہیں کی... صرف اس لیے کہ اس کے دامن پہ چند ایسے چھینٹے ہیں جو اس کے کردار کی کجی کی وجہ سے یا کسی گمراہی کی وجہ سے نہیں، بلکہ صرف اس کی ماں کی لاپروائی اور اپنی ذات سے عدم دلچسپی کی وجہ سے ہو گئے... ورنہ وہ بہت اچھی ہے۔ کم از کم وشمہ سے تو بہت اچھی... جس نے ایک شریف عورت کی گود میں پرورش پائی... سات پردوں اور چار دیواری کے اندر پلی بڑھی... مجھے اس کی آنکھ میں وہ لحاظ اور وہ مروت نہیں ملتا جو سوہا کی آنکھوں میں ہے۔"

"بات صرف اتنی نہیں ہے۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلے سوہا کو مسترد کرنے کی وجہ یہ تھی... لیکن ایسا تو اکثر ہوتا ہے... عموماً ماں باپ کو اولاد کی پسند سے اختلاف ہوتا ہی ہے۔ اعتراض کی بھی کوئی نہ کوئی گنجائش نکل آتی ہے، مگر جوڑ جاتے ہیں وہ بالآخر منوا لیتے ہیں۔ تم نے بھی تو فوراً ہی پسپائی اختیار کر لی تھی... ہم سمجھے کہ تمہیں بھی کوئی خاص خواہش نہیں ہے۔ وشمہ کے معاملے میں مجھے غلط فہمی ضرور ہوئی... کہ تم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو... لیکن یہ بھی تو مانتے ہو کہ تم پہ اس سلسلے میں کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا۔ وہ میری بھانجی ہے، مگر میں نے زبردستی اسے تمہارے سر نہیں تھوپا... تم ایک بار انکار کرتے... کوئی اعتراض کرتے اور ہم لوگ پھر بھی تمہیں اس سے شادی پہ مجبور کرتے، تب تمہارا یہ رویہ جائز تھا، لیکن وصی! تم ہمیں اور وشمہ کو اس گناہ کی سزا دے رہے ہو جو ہم نے کیا ہی نہیں۔"

دروازے کے اس جانب کھڑی وشمہ اس نیت سے تو لیٹنے آئی تھی کہ اس کے خلاف وصی کے کان بھرتے ہوئے اپنی پھوپھو کو رنگے ہاتھوں پکڑے گی اور خوب خوب شرمندہ کرے گی مگر وہ تو اپنے ساتھ ساتھ اس کا مقدمہ بھی لڑ رہی تھیں۔

"میں مانتا ہوں میں غلط ہوں۔ مگر آپ بھی تو مانیں کہ میں مجبور ہوں۔"

"کوئی مجبوری اتنی بڑی نہیں ہوتی جو انسان کو کسی دوسرے انسان... خصوصاً خود سے وابستہ انسان کو دکھ دینے

پر اکسا سکے۔"

"مجھے وشمہ کے ساتھ ہونے والی زیادتی کا احساس ہے مگر اسے کس نے کہا تھا کہ ہماری محبت کی من گھڑت باتیں پھیلائے۔"

"اس نے کوئی باتیں نہیں پھیلائیں... کوئی لڑکی ایسا کر ہی کیسے سکتی ہے... ہو سکتا ہے کہ وہ تمہاری جانب سے کسی غلط فہمی کا شکار ہو... یا اس نے محض اپنی یک طرفہ پسندیدگی کا اظہار کیا ہو اپنی ماں سے... بیٹیاں ماؤں کو اپنی پسند بتلا یا ہی کرتی ہیں مگر منزہ نے بھی ہو کہ تم دونوں کے درمیان کچھ ہے۔ جو بھی ہوا... اغلاط فہمی کی بنا پہ... لیکن کسی نے کسی کو بندوق دکھا کے شادی پہ مجبور نہیں کیا... وہ اپنی خوشی سے تمہاری زندگی میں آئی... تم نے خوشی سے بیاہ کرایا تھا... اب یہ کیا ڈرامہ ہے... شادی کے بعد ہی تمہارا عشق کیوں زور پکڑ گیا؟"

"یہ بات میں آپ کو نہیں سمجھا سکتا۔"

وہ پروین کی جرح کے سامنے لاجواب تھا۔

"تمہیں اس وقت صرف اپنے دل کو سمجھانے کی ضرورت ہے وصی! وشمہ بن ماں کی بچی ہے... اس نے زندگی میں کوئی خوشی جھولی بھر کے نہیں پائی... اسے اپنی محبت سے محروم نہ کرو۔"

باہر کھڑی وشمہ کی پلکیں پروین کے لجاجت آمیز لہجے پہ بھیگ گئیں۔

"سوہا نے بھی بہت سی محرومیاں دیکھی ہیں ممانی! وہ بھی خوشیوں کے ہنڈولے پہ بیٹھی مزے نہیں لوٹ رہی... میں اسے کیسے ایک اور دکھ دے دوں۔"

"کیا وہ وشمہ سے سوتن بن کے آنا چاہتی ہے؟"

اس سوال نے وشمہ کو اندر سے چٹخ کے رکھ دیا۔

"نہیں... سوہا آپ کے اندازوں سے بہت مختلف لڑکی ہے... اگرچہ وشمہ نے دانستہ نادانستہ اس سے زندگی بھر کچھ نہ کچھ چھینا ہی ہے پھر بھی وہ اسے اس مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی۔"

"یعنی وہ تم دونوں کے درمیان سے نکلنے کو راضی ہے؟"

پروین نے امید سے پوچھا... مگر وصی کا جواب مایوس کن تھا۔

"نہیں... میں نے وشمہ کو اپنے اور سوہا کے درمیان سے نکالنے کا فیصلہ کیا ہے۔"

وشمہ تو کھڑے کھڑے جی جان سے لرز گئی۔ پروین بھی ایک ساعت کے لیے سکتے میں آ گئیں۔

"وصی... ! تم اس حد تک جا سکتے ہو؟"

"پتا نہیں... میں... میں کچھ طے نہیں کر پا رہا۔" اپنے بالوں کو دونوں مٹھیوں میں جکڑے وہ حد درجہ بے بس نظر آ رہا تھا۔

پروین کو یک بارگی اس پہ ترس سا آنے لگا، لیکن جانتی تھیں، اس موقع پر نرمی جتانے کا مطلب اسے دلیر کرنا ہے۔ ابھی اس نے صرف فیصلہ کیا ہے... اس فیصلے پہ عملدر آمد کرنے کا حوصلہ نہیں کر پا رہا، اور وہ اس کی حوصلہ افزائی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔

"جانتے ہو تم کتنی بڑی غلطی کرنے جا رہے ہو۔ یہ جو تمہاری حالت ہے نا وصی... صرف اس لیے ہے کہ تم نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا... اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور آج تم نادانستگی میں وشمہ کے اور ہم سب کے ساتھ یہی کر رہے ہو... ندامت کا یہ بوجھ تمہیں کھل کے جینے نہیں دے رہا... نہ تم راتوں کو سو پا رہے ہو، نہ ٹھیک سے کھا رہے ہو۔ فرض کرو اگر تم نے دل کے بے لگام ہونے پہ وشمہ کو طلاق دے بھی دی تو کیا تم خوش رہ پاؤ گے سوہا کے ساتھ؟ کبھی بھی نہیں... میں نے تمہیں پالا ہے وصی! مجھ سے زیادہ تمہیں کوئی نہیں جانتا... تم ایک معصوم بے قصور لڑکی کے ماتھے پہ داغ لگانے کے بعد مطمئن نہیں رہ سکو گے اور ذرا ٹھنڈے دل سے سوچو... سوہا کے اور تمہارے درمیان جو رشتہ ہے وہ کتنا بھی پر خلوص اور سچا کیوں نہ ہو، ہے تو نا پائیدار اور

شرعی و قانونی لحاظ سے کمزور اور بودا ہے۔ تم دونوں کے راستے الگ ہو بھی گئے تو چند ہی دنوں... مہینوں یا شاید سال بھر میں، تم بھی بیوی بچوں میں مگن ہو کر اس دور کو بھلا دو گے۔ اسے بھی کوئی نہ کوئی نیا زندگی کا ساتھی مل جائے گا۔ لیکن طلاق کے داغ کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کے لیے کتنے راستے کھلے ہیں، ان سے تم بھی واقف ہو۔ اس لیے وصی ایسا کچھ نہ کرنا، جس کے نتیجے میں تمہیں ساری عمر اپنا پیچھا کرتی بددعاؤں سے بچ کر بھاگتے رہنا پڑے گا۔"

وشمہ کے پیر شل ہو گئے، کاندھے ندامت کے بوجھ سے جھک گئے تو وہاں سے ہٹ گئی۔

❖ ❖ ❖ ❖

وہ کافی دنوں کے بعد میکے آئی تھی۔

خرم کے ردعمل سے ہر دم اتنی خائف رہتی تھی کہ پاس سے گزرتی ہوا سے بھی بچ کر سمٹ جانے کی کوشش کرتی کہ نجانے اس پہ بھی کوئی اعتراض نہ ہو جائے... مدیحہ خود اسے لینے آئیں اور رخشندہ نے بھی شفقت سے کہا کہ بہت دنوں سے وہ میکے نہیں گئی۔ ماں خود لینے آئی ہے تو انکار نہ کرے... وہ خرم کی جانب اجازت طلب انداز میں دیکھنے لگی۔

خرم اندر ہی اندر جز بز ہو رہا تھا مگر ماں اور ساس دونوں کی موجودگی کے لحاظ کی وجہ سے کچھ کہہ نہیں پا رہا تھا۔

"اسے کیا دیکھ رہی ہو... وہ تو یہی کہے گا کہ کیا ضرورت ہے جانے کی۔"

ماں کے اس درست اندازے پہ خرم نے گڑبڑا کے انہیں دیکھا۔ پھر خشمگیں نگاہوں سے تقدیس کو، کہ شاید وہ اس کی ساری باتیں جا کے بتاتی ہے۔

"یہ عادت ان سب بھائیوں کو ہے... کیا خرم، کیا حسن، کیا وصی... اپنے باپ، چچا پہ پڑے ہیں۔"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں ہنس کے بتانے لگیں۔

مدیحہ نے بھی ان کا ساتھ دیا۔

"سب ہی مرد ایک جیسے ہوتے ہیں... مجھے دیکھیں... دو بیٹیاں بیاہ چکی ہوں۔ ابھی بھی میکے جانے کے لیے ان کے پاپا سے اجازت نامہ حاصل کرنا پڑتا ہے۔ پتا نہیں یہ مرد اکیلے رہنے سے اتنا گھبراتے کیوں ہیں۔"

"اکیلے رہنے سے نہیں... بیویوں کو اکیلا چھوڑنے سے۔" خرم سوچ کے رہ گیا۔

"جاؤ تقدیس! جا کے تیار ہو جاؤ... بے شک ایک رات رہ لینا۔ کل خرم لے آئے گا۔"

"لیکن امی!" خرم نے احتجاج کرنا چاہا۔

"خرم..." انہوں نے نرم انداز میں تنبیہہ کی... بعد میں مدیحہ اور تقدیس کے جانے کے بعد رسان سے سمجھایا۔

"تم، تین بہنوں کے اکلوتے بھائی ہو... میرے بعد میکے کا مان تم ہی بھائی، بھاوج نے رکھنا ہے... بیوی کو میکے جانے سے روکو گے۔ جانے پہ جا بجا پابندیاں لگاؤ گے تو کل کو اپنی بہنوں کو کس منہ سے میکے آنے کا کہو گے؟ تقدیس کس دل سے انہیں قبول کرے گی... نہیں بیٹا! ایسا نہیں کرتے... وہ بھی کسی کی بیٹی ہے... کسی کی جان ہے۔ جیسے ہم نے بیٹیاں بیاہ کر بھی ان کا راستہ کھلا نہیں چھوڑا۔ ایسے ہی وہ بھی ترستے ہوں گے۔ اس کی صورت دیکھنے کے لیے۔"

"پتا نہیں اور کون کون ترستا ہو گا اس کے لیے، اور کتنا ترستی ہے وہ کسی کے لیے جو فون کر کے ماں کو مدد کے لیے بلاتی ہے۔" وہ کڑھ کے رہ گیا۔

اور تقدیس اس کے کہے بغیر یہ سب جانتی تھی کہ وہ کیا سوچ رہا ہو گا۔ کیا کیا اندازے اور مفروضے قائم کر رہا ہو گا اس کے بارے میں۔ لیکن اس کے اندر اتنی گھٹن ہو رہی تھی کہ کچھ دیر کے لیے سب کچھ بھلا کے اس نے جانے

کا فیصلہ کر لیا اور کچھ نہیں تو کم از کم چوبیس گھنٹے کے لیے ہی کھل کے سانس لینے کا موقع تو ملے لیکن اس کی رہی سہی سانسیں بھی اٹک کے رہ گئیں جب اس نے وہی جانا پہچانا سا ماحول وہی شناسا سی کشیدگی اپنے ماں اور باپ کے درمیان موجود پائی... جو وہ بچپن سے دیکھتی آ رہی تھی۔ مگر اب خود پہ پڑی افتاد کے باعث وقتی طور پہ فراموش کر بیٹھی تھی۔

"اسی لیے لائی ہوں میں تمہیں اور تحریم کو بھی بلایا ہے تاکہ بیاہی بیٹیوں کو سامنے دیکھ کے کچھ شرم کر لے بازا باپ، جسے بڑھاپے میں ایک بار پھر عشق کا بخار چڑھا ہے۔"

"کیا ہو گیا ہے امی آپ کو...؟"

تحریم نے تو باقاعدہ ناپسندیدگی جتائی۔

"تم نہیں جانتیں۔ میں کب سے اس شخص کے بدلتے رنگ ڈھنگ دیکھ رہی تھی۔ بیٹیاں بیاہ کے بجائے ذمہ دار ہونے کے یہ اور لاپروا ہو گیا۔ جیسے بھول ہی گیا کہ ابھی تطہیر گھر بیٹھی ہے... یہ بھی یاد نہ رہا کہ یہ رنگین مزاجیاں تم دونوں کی زندگی میں کیا زہر گھول سکتی ہیں۔ دامادوں کے سامنے کیا منہ لے کر جائے گا۔ کسی بات کا احساس نہیں رہا۔"

وہ رونا دھونا شروع کر چکی تھیں اور تقدیس بے حس و بے حرکت بیٹھی بے تاثر چہرے کے ساتھ سب دیکھ رہی تھی۔ سن رہی تھی۔ تحریم نے مدد طلب نظروں سے اسے دیکھا۔

"آپی سمجھاؤ ناں ماما کو۔"

تطہیر نے بھی اسے شانے سے ہلایا۔

ہمیشہ وہی تھی جو ایسے موقعوں پہ مدیحہ کی آگ کسی نہ کسی حد تک ٹھنڈی کر دیا کرتی تھی۔ مگر وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ کر چلی آئی۔

✲ ✲ ✲

"آپ اتنی خوش کیسے رہ لیتی ہیں ممانی؟"

سوہا نے بڑے رشک اور حیرت سے ثنا کے چمکتے مسکراتے چہرے کو دیکھا۔

"اس لیے کہ میں سب کو خوش رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔"

"سب کو خوش رکھنا تو بہت مشکل بلکہ ناممکن ہے... آپ کیسے کر لیتی ہیں یہ؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ میں سب کو خوش کر لیتی ہوں۔ میں نے صرف خوش کرنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے اور کوششیں کبھی کامیاب ہوتی ہیں، کبھی ناکام لیکن مجھے یہ اطمینان تو رہتا ہے کہ میں نے دانستہ کسی کو ناخوش نہیں کیا بلکہ اپنی جانب سے خوشی دینے کی کوشش ہی کی ہے۔"

"لیکن یہ کوشش کبھی کبھی آپ کو مہنگی بھی پڑتی ہو گی؟"

"خوشیاں تو ہوتی ہی مہنگی ہیں۔ چاہے اپنے لیے خریدو چاہے کسی دوسرے کے لیے۔"

سوہا کچھ سوچنے لگی۔

"کہاں گم ہو گئیں؟"

"میں بھی کسی کو خوشی دینا چاہتی ہوں۔ سوچ رہی ہوں کیسے دوں؟"

"وہ خوشی کوئی خاص ہے...؟ یا پھر کسی کو بھی دینا چاہتی ہو یہ خوشی؟"

ثنا نے دلچسپ مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

ثنا کے ساتھ ہر موضوع پہ بے تکلف بات کرنے والی سوہا نجانے کیوں جھینپ سی گئی۔

"نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔"

وہ کنی کترا گئی مگر ثنا یہ موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتی تھی۔

"تمہاری چچی۔ میرا مطلب ہے تمہاری ماما نے کہیں تمہارے رشتے کی بات وغیرہ چلائی؟"

"نہیں۔" وہ سر جھکا کے ناخن سے میز کریدنے لگی۔
"تمہاری اپنی کوئی انوالومنٹ؟"
ثنا نے محتاط الفاظ میں پوچھا۔
"آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟" اس نے الٹا سوال کیا۔
"مجھے ٹوہ لینے کی عادت نہیں ہے نہ کسی کو کریدنے کی نہ ہی کسی کے ذاتی معاملات میں دخل دینے کی۔ اس لیے میرے اس سوال کے پیچھے ایسا کوئی مقصد نہیں ہے۔ دراصل تمہاری شادی کی عمر تو ہو گئی ہے اور ایسے موقعوں پر صرف مائیں ہی نہیں 'ممانیاں' 'چچیاں' خالائیں سب متحرک ہو جاتی ہیں۔ میں نے سوچا اگر تم یک نہیں ہو تو میں بھی اردگرد نظر دوڑاؤں۔"
"نہیں پلیز... اس کی ضرورت نہیں۔" وہ بے تحاشا گھبرا گئی۔
"شاید میرا اندازہ درست ہے۔ کوئی ہے جو یہ جگہ لے چکا ہے۔"
وہ سر جھکا کے رہ گئی۔ اس صورتحال کا تو سوچا ہی نہیں تھا۔
"کوئی کلاس فیلو؟"
"نہیں... وہ..." سوہا ہاتھ مسلنے لگی۔ ثنا کی اپنائیت اور دوستانہ پن اسے کھلنے پہ مجبور بھی کر رہا تھا مگر یہ عجیب سی جھجک بھی گھیر رہی تھی جس کا سامنا اس نے آج سے پہلے کبھی نہیں کیا تھا۔
"نام کیا ہے اس کا؟"
ثنا نے ایک اور مشکل آسان کی اور اگلے مرحلے پہ آ گئی۔
"نام... وصی..."
"کیا کرتا ہے؟"
سوہا کچھ اور کھلی۔ مزید تفصیل بتائی۔
"ہوں... لگتا تو ٹھیک ٹھاک ہے۔ انتظار کس بات کا ہے۔ وہ بھی اپنے پیروں پہ کھڑا ہے۔ تم نے بھی فائنل ایر کے ایگزامز دے دیے ہیں۔ آگے پڑھنے میں انٹرسٹڈ نہیں ہو۔ میرا خیال ہے اسے اب رشتہ بھیج دینا چاہیے۔"
سوہا چپ رہی۔ ایک داستان اس کے نقش نقش سے بول رہی تھی مگر ثنا اس کی زبانی سننا چاہتی تھی۔
"کیا ہوا سوہا! بتاؤ؟"
"کچھ نہیں۔" اس گریز کے پیچھے ایک تکرار تھی کہ پوچھو... پوچھو مجھ سے۔ میں یہ درد یہ بوجھ اکیلے ڈھوتے ڈھوتے تھک گئی ہوں۔
ثنا نے ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پہ رکھ کے پیار بھرا دباؤ ڈالا۔ دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی چھو کر اٹھائی۔
"مجھے اپنی دوست سمجھو سوہا!"
اور اسی ایک رشتے کی آج کل سوہا کو سب سے زیادہ ضرورت تھی۔
دوست کی... ہمراز کی...

☆ ☆ ☆

"اس عورت نے میری زندگی عذاب بنا کے رکھ دی ہے۔"
جعفر محمود تنتناتے ہوئے یہاں سے وہاں چکر کاٹ رہے تھے۔ جو کچھ وہ محسوس کر رہے تھے وہ نیا نہیں تھا۔ سالوں سے وہ یہ سب کبھی برداشت کرتے تو کبھی بھڑاس نکال کر نمٹتے آ رہے تھے لیکن جو بے بسی آج محسوس ہو رہی تھی وہ پہلے کبھی نہیں ہوئی تھی۔
ان ہی بچیوں کے سامنے دونوں میاں بیوی ایک دوسرے پہ طعنہ زنی کرتے الزام تراشیاں کرتے رہتے تھے لیکن آج وہ بچیاں اپنے گھر کی تھیں۔ شادی شدہ تھیں۔ ان کے سامنے اپنا آپ ہلکا ہوتے دیکھنا انتہائی ناقابل برداشت تھا۔

"میں نے یا تم نے...؟ یہ تم ہو جس کی وجہ سے میں پچھلے تیس سالوں سے جہنم میں جل رہی ہوں۔"
"یہ جہنم تمہارا اپنا دہکایا ہوا ہے۔ تمہارے اپنے شک اور وسوسوں کی آگ ہے جو تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی بھسم کر رہی ہے۔"
"تم اور بھسم۔ لالیاں ٹپک رہی ہیں چہرے سے۔ عمر آگے کے بجائے پیچھے جا رہی ہے۔ نہ شوخیاں کم ہو رہی ہیں نہ چونچال پن اور ایک میں ہوں وقت سے پہلے بڑھاپا مسلط کر دیا تم نے مجھ پہ۔ تمہاری رکھوالی کرتے کرتے میرے سر کے سارے بال سفید ہو گئے۔ جھریوں سے بھر گیا میرا وجود۔"
"یہ تمہارے اندر کا زہر ہے جو تمہارے وجود سے ظاہر ہو رہا ہے۔"
"اور یہ تمہارے اندر کی رنگینی ہے جو تمہارے ان مہنگے سوٹوں، شوخ رنگ کی شرٹوں ٹائیوں اور تیز خوشبو والے پرفیوم سے ظاہر ہو رہی ہے اور آئے دن بدلتی تمہاری جوان اور فیشن ایبل سیکرٹریوں سے بھی۔"
"بکواس بند کرو۔ میری عمر کا نہیں تو گھر آئی بچیوں کا ہی لحاظ کر لو۔ بس کر دو اب میری کردار کشی کرنا۔"
"تمہارا کردار ہے کہاں؟"
"مدیحہ... میں اس سے زیادہ برداشت نہیں کروں گا۔"
اندر کمرے میں پریشان شکلیں لے کر بیٹھی تینوں بہنیں ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگیں۔
"برداشت تو ہم سے بھی نہیں ہو رہا۔"
تحریم نے بڑبڑا کے کہا۔
"پتا نہیں کیا ضرورت تھی ماما کو ہمیں بلانے کی۔ یہ تماشا دکھانے کے لیے اکٹھا کیا ہے ہمیں۔ شکر ہے میں اکیلی آئی۔ لیکن کل جب میرے اور تقدیس کے شوہر ہمیں لینے آئیں گے تو ان کے سامنے بھی کیا یہی سب ڈرامہ ہو گا۔"
"آپ دونوں انہیں سمجھائیں۔"
تطہیر نے دونوں کو اکسایا۔
"اب کہاں سمجھیں گے یہ۔ ساری عمر گزر گئی یہ سب کہتے ہوئے۔" تحریم نے بیزاری سے کہا اور اٹھی۔
"مجھ سے تو نہیں رہا جا رہا اس تناؤ میں۔ لوگ میکے آتے ہیں ہلکا پھلکا ہونے۔ آرام کرنے یہاں الٹا حساب ہے۔ دل ہی گھٹا ہو گیا ہے۔ میں تو جا رہی ہوں ڈرائیور کے ساتھ۔"
اس کی لاتعلقی پہ تطہیر نے حیرت سے اسے دیکھا پھر امید بھری نظروں سے تقدیس کو دیکھنے لگی جو صبح سے ایسے ہی ٹھس سی بیٹھی تھی۔
"پلیز تقدیس آپی! تم تو ماما کو سمجھا سکتی ہو۔"
"وہ سمجھیں... نہ سمجھیں... میں سمجھ گئی ہوں۔"
اس تمام عرصے میں یہ پہلا جملہ تھا جو اس نے کہا۔
"کیا؟" تحریم نے حیرت سے استفسار کیا۔
"یہی کہ یہ مکافات عمل ہے جسے میں بھگت رہی ہوں۔"
وہ دونوں اس کی بات کا مطلب ہی تلاش کرتی رہیں اور وہ اٹھ کر باہر چلی گئی۔
"سب جانتی ہوں میں۔ یہ جو گھر سے باہر دل پھرنے لگا ہے۔ یہ جو بال نئے سرے سے ڈائی ہونے لگے ہیں۔ یہ سب اس نئی سیکریٹری کے چکر میں ہے۔"
"بکواس بند کرو مدیحہ! اندر بیٹھی ان بچیوں کے بارے میں ہی سوچ لو۔ کیا عزت رہ گئی ہو گی ان کے دل میں باپ کی۔"
"ان کو ان کے باپ کے بارے میں بتانے کے لیے ہی تو بلایا ہے۔ انہیں بھی پتا چلے وہ کس گندے انسان کی

اولاد ہیں۔"

"تم ساری حدیں پار کر رہی ہو۔"

"اور تم کب کے حدیں توڑ کے نکل چکے ہو۔"

"مدیحہ!" وہ کر بچے مگر سامنے کھڑی تقدیس کو دیکھ کر رک سے گئے۔ پھر ایک گہرا سانس لے کر اسے مخاطب کیا۔

"تقدیس... ! سمجھالو اپنی ماں کو۔ اب میری وہ عمر نہیں رہی کہ میں اس سے زیادہ صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکوں۔"

"اور میں بھی اس عمر میں سوتنوں کے جلاپے برداشت نہیں کر سکتی۔" مدیحہ بھی چلائیں۔

"لیکن میں تو برداشت کر رہی ہوں۔" اس نے ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

دونوں سوالیہ انداز میں اسے دیکھنے لگے۔

"اور پتا نہیں کتنا عرصہ برداشت کرنا پڑے۔ لیکن کوئی نئی بات نہیں۔ ماں باپ کی غلطیوں کا خمیازہ اولاد ہمیشہ سے بھگتتی آئی ہے۔"

"کیا مطلب ہے تمہارا؟"

"میں بہت دنوں سے خدا سے یہ سوال کر رہی تھی کہ اگر یہ آزمائش ہے میرے اللہ تو مجھے قبول ہے۔ مجھے ہمت دے کہ میں اس میں ثابت قدم رہ کے سرخرو ہو سکوں اور اگر یہ سزا ہے تو کم از کم میرا گناہ میرے سامنے لے آ تاکہ مجھے پتا تو چلے کہ میری یہ سزا کن گناہوں کے بدلے ملی ہے۔ آج میرا وہ گناہ آپ دونوں کی صورت میں میرے سامنے ہے۔"

"یعنی... یعنی تم..." جعفر محمود تو حیرت کی شدت سے مغلوب ہو کر کچھ کہہ نہ پائے۔

"کیسی سزا میری جان؟ کیا ہو رہا ہے تمہارے ساتھ؟" مدیحہ نے بے چینی سے پوچھا۔

"وہی جو اس گھر میں ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتی۔ بچپن سے ہی یہ جاننے میں ناکام رہی ہوں کہ آپ میں سے کون صحیح ہے اور کون غلط۔ لیکن یہ تو طے ہے کہ ایک حق پر ہے اور دوسرا غلطی پر۔ پاپا اگر ماما کے یہ سارے شکوک صحیح ہیں تو آج میں آپ کی بے احتیاطیوں اور بے ایمانیوں کی سزا بھگت رہی ہوں اور ماما! اگر آپ صرف شک کی آنکھوں سے دیکھتے ہوئے بغیر سوچے سمجھے پاپا پر الزام لگا رہی ہیں تو یہ دیکھ لیجیے۔ آپ کا کیا آپ کے سامنے آ رہا ہے۔ آج آپ کی بیٹی وہ سب بھگت رہی ہے جو آپ کی وجہ سے کوئی بھگتتا رہا ہے۔ وہی شک۔ وہی بے اعتمادی۔ وہی بے اعتباری... وہی گھناؤنے الزام..."

کچھ پل کے لیے ایک سکتہ سا ماحول پہ طاری ہو گیا۔ پھر جعفر محمود کی بوجھل آواز نے اس سکتے کو توڑا۔

"تو خرم... تمہیں..."

مگر ان میں اتنی سکت نہ تھی کہ وہ فقرہ مکمل کر پاتے۔

پھر بھربھری مٹی کی طرح ڈھے کر گرتے گرتے انہوں نے صوفے کا سہارا لیا مگر ہاتھ پھسل گیا اور وہ نیچے آن گرے۔

"پاپا... !"

تقدیس چلاتے ہوئے ان کی جانب بڑھی۔ مدیحہ کے اندر بھی کچھ بری طرح کپکپا گیا۔

☆ ☆ ☆

"خرم کہاں رہ گئے تھے تم؟ فون بھی آف تھا؟"

وہ جیسے ہی گھر پہنچا۔ رخشندہ نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اب وہ کیا بتاتا کہ تقدیس کو جانے سے منع تو نہیں کر سکا تھا مگر یہ توقع ضرور کر رہا تھا کہ وہ اس کی ناراضی اور ناپسندیدگی کا خیال کرتے ہوئے شاید خود ہی جانے کا ارادہ

ترک کر دے۔ مگر وہ جس طرح اٹھ کے فوراً "ہی ماں کے ساتھ چلی گئی" اس پہ وہ سخت تپ گیا ہوا گیا۔ وہ دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا جب تقدیس کے میکے کے نمبر سے فون آیا۔ جل کے اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔ مگر متواتر تیسری بار فون آنے پہ اس نے سیل ہی آف کر دیا۔

"وہ... چار جنگ ختم ہو گئی تھی۔ خیریت...؟"

"خیریت کہاں؟ تقدیس کا فون آیا تھا۔ اس کے پاپا کو ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔"

"کیا... ؟ اچانک...؟"

اس کے ساتھ ہی اسے تقدیس کے بار بار فون کرنے کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ دل ہی دل میں وہ قدرے شرمندہ اور متاسف بھی ہوا۔

"کہاں ہیں وہ اب...؟ میرا مطلب ہے کس اسپتال میں...؟ اور کیسی طبیعت ہے اب؟"

"فی الحال تو خطرے سے باہر نہیں نکلے۔ آئی سی یو میں ہیں۔ حسن اور تمہارے ابا گئے ہیں اسپتال۔ میں اور پروین تمہارا انتظار کر رہے تھے۔ چلیں...؟"

"چلیے۔" وہ تھکن اور پژمردگی کے باوجود جانے پہ تیار ہو گیا۔ موقع کی نزاکت ہی ایسی تھی۔

☆ ☆ ☆

"وہ شادی شدہ ہے اور تم اتنی سیریس ہو اس کے لیے؟ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ..."

"میں سب جانتی ہوں ماما... ! لیکن میں اسے تب سے پسند کرتی ہوں جب وہ شادی شدہ نہیں تھا؟"

"تو کیا وہ تمہیں پسند نہیں کرتا تھا؟"

"ہم اچھے دوست تھے۔ میں دوستی سے کچھ بڑھ کے سوچنے لگی تھی۔ وصی کے دل میں بھی میرے لیے کچھ جذبات تھے مگر تب ان میں وہ شدت نہیں تھی جتنی شدت میرے دل میں شروع سے اس کے لیے رہی ہے۔ وہ مخلص تھا اور سچا بھی۔ اسی لیے اس نے اپنے گھر والوں کو میرے لیے رشتہ دے کر بھی بھیجا مگر کچھ خاندانی اختلافات اور کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے اس کے گھر والے راضی نہ ہوئے۔ چونکہ وصی ان کے احسانات تلے دبا ہوا تھا اور کچھ فطری طور پہ بھی شریف اور با مروت اس لیے اسٹینڈ نہیں لے سکا۔ اس نے مجھ سے تعلق منقطع کر لیا اور چپ چاپ اپنے گھر والوں کی پسند سے شادی کر لی۔"

"یہ کہانی یہیں ختم ہو جانی چاہیے تھی ثنا! تمہیں قسمت کے لکھے پہ صبر کر لینا چاہیے تھا۔"

"میں نے کیا ماما... ! کیا۔ مگر وصی نہ کر سکا۔ جو شدت میرے دل میں شروع سے تھی وہ اس کے دل میں تب پیدا ہوئی جب اسے مجھے کھونے کا احساس ہوا۔ وہ اب میرے بغیر نہیں رہ سکتا۔"

"مگر رہ رہا ہے۔"

ثنا کی بات پہ وہ چپ ہوئی۔

"ہاں... رہ رہا ہے۔ مگر مجبوراً" اور یہ مجبوری عرصے تک نہیں رہنے والی۔"

"کیا اب اس کے گھر والے مان جائیں گے؟ کیا اب تم انہیں قبول ہو گی... کیا وہ سارے اختلافات اور غلط فہمیاں اب ختم ہو جائیں گی؟"

"نہیں..." اس نے یاسیت سے گہرا سانس بھرا۔

"شاید اور بڑھ جائیں گی۔ غلط فہمیاں بھی اور مجھ سے شکایتیں بھی۔ نفرتیں بھی۔"

"اتنی ڈھیر ساری نفرتوں اور شکایتوں کا ازالہ کیا ایک شخص کی محبت کر سکتی ہے ثنا...؟"

ثنا نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا۔ وہ پہلوؤں کے رہ گئی۔ وصی سے محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ اس کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں سے چشم پوشی کر لیتی۔ اس کی بست سی دل موہ لینے والی عادتوں کے ساتھ ساتھ ایک یہ

خامی بھی تھی کہ وہ بے حد کمزور قوت ارادی کا مالک تھا۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے سوہا! کہ تم ایک محبت پہ اکتفا کرتے ہوئے باقی سب کی نفرتیں مول لینے کا بڑا قدم اٹھا بھی لو مگر وہ ایک محبت ہی قدم پیچھے ہٹالے۔"

ثنا اس کے دل میں کب سے چھپے اس خدشے کو زبان پہ لے آئی جس کے بارے میں اس نے کبھی کھل کے سوچا بھی نہیں تھا۔

"کبھی سوچا تم نے اس بارے میں؟"

وہ نفی میں سر ہلاتے ہلاتے رک کر اقرار میں سر ہلا گئی۔

"بہت مشکل ہے سوہا! نفرتیں سمیٹ کر جینا۔"

"جانتی ہوں۔ اسی مشکل سے تو اب تک گزرتی آئی ہوں۔"

"تھکی نہیں؟"

"بہت۔ بہت تھکی ہوں ممانی! تھک کے ٹوٹ گئی ہوں۔"

وہ اس کے گلے لگ کے بکھر کے رونے لگی۔

آج اس نے ثنا سے وہ سب کہا تھا جو وہ کبھی ربنا سے بھی نہیں کہہ پائی تھی۔ اپنے ان خدشات اس عدم تحفظ کا ذکر کرکے وہ ربنا کو احساس جرم میں مبتلا نہیں کرنا چاہتی تھی کیونکہ یہ سب اسی کی وجہ سے ملا تھا اسے۔

"کیسے ہیں اب انکل؟"

خرم نے نرمی سے پوچھا۔ اس کا زرد رنگ دیکھ کے وہ ساری ناراضی بھول گیا تھا۔

"ابھی تک تو..." اس کے پیڑی زدہ خشک ہونٹ پھڑپھڑا کے بس اتنا کہہ پائے۔

"لیکن اچانک یہ ہوا کیسے...؟ وہ تو بہت فٹ رہتے ہیں۔ میں نے کبھی سنا نہیں کہ انہیں ہارٹ پرابلم ہے۔"

"ہمیں بھی نہیں پتا کہ یہ سب کیسے ہوا؟"

وہ چپ رہا۔ ظہیر نے آگے بڑھ کے خرم کو جواب دیا۔

خرم نے ذرا فاصلے پہ بیٹھی مدیحہ کی جانب دیکھا اور ان کو تسلی دینے ان کی طرف بڑھا۔

"آنٹی! آپ فکر مت کریں۔ انکل ان شاء اللہ ٹھیک ہو جائیں گے۔"

اس کے رسمی کلمات کے جواب میں مدیحہ نے کچھ ایسی نظروں سے اسے دیکھا کہ وہ کچھ نہ سمجھنے کے باوجود شرمسار سا ہو گیا۔ وہ نظریں ہی ایسی طعنہ زن قسم کی تھیں۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہ ٹھہر سکا اور رخشندہ کے ٹوکنے کے باوجود وہاں سے چلا آیا۔ کیونکہ نہ صرف مدیحہ بلکہ اس کی بڑی سالی تحریم کا رویہ بھی کچھ اکھڑا سا اکھڑا سا تھا۔

رخشندہ اور پروین نے البتہ سمدھیانے کا لحاظ کرتے ہوئے آتی جلدی واپس جانا مناسب نہ سمجھا۔ مدیحہ کا رویہ ان سے بھی لیا دیا سا تھا لیکن چونکہ خرم کی طرف سے ان کے دل میں کوئی چور نہیں تھا اس لیے انہوں نے اسے صرف شوہر کی حالت اور پریشانی پہ محمول کرکے زیادہ سنجیدگی سے نہیں لیا۔

"تقدیس بیٹا! تم زیادہ ٹینشن نہ لینا۔ بیماری اللہ کی طرف سے آتی ہے اور اللہ ہی سے دعا کرنے سے صحت بھی ملتی ہے۔ دل میں امید بھر کے اللہ کے آگے دامن پھیلاؤ اور اپنی ماں کو بھی حوصلہ دو۔ ایسے ہاتھ پیر چھوڑ کے بیٹھنے سے کچھ نہیں ہوگا۔"

جاتے جاتے رخشندہ نے اس کا ماتھا چوم کر تسلی دی۔

"توبہ ارے ایسی میٹھی لو ر اندر سے کھٹی۔" تحریم نے ان دونوں کے جانے کے بعد تبصرہ کیا۔

"کیا یہ نہیں جانتی ہوں گی کہ ان کا بیٹا ہماری بہن کے ساتھ کیا کر رہا ہے؟ ایک ہی چھت کے نیچے رہنے والے تمام لوگوں میں سب حصے دار ہوتے ہیں۔"

تقدیس ایک لفظ نہ بولی۔

نہ ساس کی حمایت میں۔

نہ بہن کی تائید میں...

اس کارواں رواں اس وقت صرف اپنے بابا کی زندگی اور صحت کے لیے دعا گو تھا۔ جو اس کی جلد بازی کی وجہ سے اس حال تک پہنچے۔ وہ کتنی دیر تک تو اپنی تم آہی کو کوستی رہی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ ضبط کھو بیٹھی اور نجانے کیا کچھ کہہ ڈالا جو وہ دل پہ لے گئے۔

"میں نے یہ سب سوہا سے اس لیے نہیں کہا کہ میں تمہاری طرح کسی دوراہے پہ کھڑی ہوں۔"

ثنا نے اپنی اور سوہا کی گفتگو کی ساری تفصیل منزہ کے سامنے دہرانے کے بعد کہا۔

"نہ اس لیے کہا کہ میری ساری ہمدردیاں دوشمہ کے ساتھ ہیں اور اس کا گھر بچانے کی خاطر میں سوہا کو وصی سے دور رکھنا چاہتی ہوں۔ میرا رشتہ صرف سوہا سے ہے اور میں صاف گوئی سے کہوں گی کہ اگر مجھے انتخاب کا موقع ملا تو ظاہر ہے میں سوہا کا ساتھ دوں گی۔ تمہاری طرح میری ممتا ہی ہوئی نہیں ہے۔ میں تمہیں قصوروار نہیں کہہ رہی۔ ظاہر ہے پیدا کرنے والی اولاد کے ساتھ ساتھ پالنے والی اولاد بھی اتنی ہی پیاری ہو جاتی ہے اور منزہ میں نے سوہا کو اس لیے بھی نہیں سمجھایا کہ اس کی وجہ سے تمہاری زندگی اور ازدواجی رشتے پہ جو خطرات منڈلا رہے ہیں وہ ٹل جائیں۔ بلکہ صرف اس لیے کہ میں چاہتی ہوں اس کی تمام پچھلی محرومیوں اور تشنگیوں کا ازالہ ہو سکے۔ وصی بلاشبہ ایک اچھا انسان ہوگا۔ لیکن اگر دوشمہ درمیان میں نہ بھی ہوتی تب بھی میں سوہا کو یہی مشورہ دیتی کہ وصی اس کے لیے بہترین انتخاب نہیں ہے کیونکہ وصی سے اسے محبت مل سکتی ہے وہ اعتماد اور تحفظ نہیں جس کی اسے سب سے زیادہ ضرورت ہے۔ اس نے اتنے تھپیڑے کھائے ہیں کہ وہ اس سے زیادہ سہہ نہیں پائے گی۔"

"لیکن... وہ تو ضد پہ اڑی ہے۔"

"تمہیں کیا پتہ کہ وہ ضدی ہے یا نہیں۔ تم نے کبھی اس سے بات کرکے اسے سمجھنے کی کوشش کی؟"

ثنا کے سوال پہ وہ نظریں چرا گئی۔

"تم تو ہمیشہ اس سے خوف زدہ رہی ہو۔ اسی لیے وہ تم سے بھاگتی رہی۔ اسے ربنا جیسی ماں چاہیے تھی۔ جو خود عدم تحفظ کا شکار ہوتے ہوئے اور ایک کمزور حیثیت رکھتے ہوئے بھی اس کے سامنے ڈھال بن سکے۔ وصی کے روپ میں اسے تم ہی ملو گی منزہ! جیسے تم اس سے محبت کرتی ہو مگر اسے اپنانے سے ڈرتی ہو۔ یہی حال وصی کا ہے اور یہ بات میں نے سوہا کو سمجھا دی ہے۔ وہ وصی سے بہتر انسان ڈیزرو کرتی ہے۔"

"مگر وہ بہتر انسان اس کے نصیبوں میں کہاں؟" منزہ رونے لگی۔

"میں نے ربنا کی گود میں اسے ڈال کر اس کا مستقبل خراب کر دیا ہے۔ کون ایک طوائف زادی کی آغوش میں پلنے والی ایسی لڑکی کو اپنائے گا جس کے بارے میں سو سو باتیں مشہور ہیں۔ وصی ہے جو اسے چاہتا ہے مگر میری مجبوری کہ میں اسے یہ رشتہ بنانے کی اجازت بھی نہیں دے سکتی۔ اور کون ہے جو..."

"میں..." شیخ نے جواب دیا تھا۔

● ● ●

دونوں کے قدم جناح پارک کے سبزہ زار پہ ایک ساتھ اٹھ رہے تھے...

دونوں ہی کے قدم سست اور بے ترتیب تھے۔

دونوں کی ہی نظریں اپنے متحرک قدموں پہ جمی تھیں۔

دونوں بعد ملنے کے باوجود دونوں کے لبوں پہ ہی ایک دوسرے کو سنانے کے لیے کچھ نہ تھا۔

گم صم... چپ چاپ... اندر ہی اندر الجھتے وہ آدھے گھنٹے سے ایک ساتھ چل رہے تھے۔ تھکن کا احساس ہو رہا تھا نہ گرمی کا... اور نہ ہی اس ہیبت ناک سکوت کا... ویسے بھی یہ سکوت ان دونوں کے مابین قائم تھا... دونوں کے

اندر تو ایک کہرام بپا تھا۔ بازگشتیں تھیں، جو ان کو جھنجوڑے جا رہی تھیں۔

"تم نے کبھی کسی کو دکھ نہیں دیا! اور نہ کسی کے ساتھ زیادتی کی ہے اور آج تم ناانصافی وشمہ کے اور ہم سب کے ساتھ یہی تو کر رہے ہو، ندامت کا یہ بوجھ تمہیں کھل کے جینے نہیں دے رہا ہے۔ تم راتوں کو سو بھی رہے ہو نہ ڈھنگ سے کھا رہے ہو، فرض کرو اگر تم نے دل کے بے لگام ہونے پہ وشمہ کو طلاق دے بھی دی تو کیا تم خوش رہ پاؤ گے سوہا کے ساتھ، کبھی نہیں۔۔۔ تم ایک معصوم، بے قصور لڑکی کے ماتھے پہ داغ لگانے کے بعد مطمئن نہیں رہو گے اور سوہا کے اور تمہارے درمیان جو رشتہ ہے وہ کتنا ہی پرخلوص اور سچا کیوں نہ ہو، ہے تو ناپائیدار اور قانونی و شرعی لحاظ سے کمزور اور بودا۔۔۔ تم دونوں کے راستے الگ ہو بھی گئے تو چند ہی دنوں، مہینوں یا شاید سال بھر میں تم بھی بیوی، بچوں میں مگن ہو کر اس درد کو بھلا دو گے، اسے بھی کوئی نہ کوئی زندگی کا نیا ساتھی مل جائے گا، لیکن طلاق کے داغ کے بعد ہمارے معاشرے میں لڑکی کے لیے کتنے راستے کھلے ہیں ان سے تم بھی واقف ہو اس لیے وصی ایسا کچھ نہ کرنا جس کے نتیجے میں تمہیں ساری عمر اپنا پیچھا کرتی بددعاؤں سے بچ کر بھاگنا پڑے۔"

وصی کے قدم لحہ بھر کو تھمے۔۔۔ لیکن سر جھٹکا کے اس کے ساتھ چلتی سوہا نے اپنے دھیان میں غور ہی نہ کیا، وہ اپنے اندر کی آوازوں سے نپٹتی چلی جا رہی تھی۔

"کیا اب اس کے گھر والے مان جائیں گے؟"

"کیا اب تم انہیں قبول ہو گی؟ وہ سارے اختلافات اور غلط فہمیاں اب ختم ہو جائیں گی؟"

"اتنی ڈھیر ساری نفرتوں اور شکایتوں کا ازالہ کیا صرف ایک شخص کی محبت کر سکتی ہے؟"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تم اس ایک محبت پہ اکتفا کرتے ہوئے باقی سب کی نفرتیں مول لینے کا بڑا قدم اٹھا بھی لو مگر وہ ایک محبت ہی قدم پیچھے ہٹا لے۔"

"اس سے تمہیں محبت تو شاید مل جائے مگر وہ اعتماد اور تحفظ نہیں، جس کی تمہیں محبت سے زیادہ ضرورت ہے۔"

وصی حیرت سے خود سے قدم بہ قدم دور جاتی سوہا کو دیکھ رہا تھا، جسے نہ اس کے پیچھے رہ جانے کا احساس تھا نہ اپنے آگے نکل جانے کا۔

☆ ☆ ☆

"آپ؟" منزہ حیرت کی شدت سے ذرا سنبھل کے بولی۔

"ہاں۔۔۔ میں اپناؤں گی اسے۔۔۔ اور کوئی احسان نہیں کروں گی اس پہ یا تم پہ۔۔۔ کوئی کمی نہیں ہے سوہا میں۔ میرے خیال میں تو وہ میرے صبیح کے لیے ایک بہترین انتخاب ثابت ہو گی۔"

منزہ کتنی دیر کچھ بول ہی نہ سکی۔

آنسو شکر گزاری کے اظہار کے طور پہ اس کے گالوں پر بہنے لگے۔

"بس ایک بار صبیح سے بات کر لوں۔"

ثنا کی اگلی بات پہ اس کا خوشی سے پھیلتا دل سکڑ سا گیا۔

"اور اگر صبیح نہ مانا تو۔۔۔" دل کا خدشہ وہ زبان تک نہ لا سکی۔

"ویسے تو اس نے اس بارے میں سارے اختیارات مجھے سونپ رکھے ہیں میں جانتی ہوں، میرے انتخاب پہ اسے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ صرف یہ پوچھنا ہے اس سے کہ وہ ذاتی طور پہ ایک نئے رشتے اور نئی ذمہ داری میں بندھنے کے لیے تیار ہے یا نہیں، اگر ہاں تو یہ منگنی وغیرہ کے جھنجٹ رہنے دیتے ہیں اور ڈائریکٹ شادی کر دیتے ہیں، لیکن اگر ابھی وہ اپنا کیریئر اسٹیبلش کرنا چاہتا ہے تو ٹھیک ہے، سال ڈیڑھ سال کی مہلت دے دیتے ہیں

دونوں بچوں کو۔ تمہارا کیا خیال ہے؟"

"میرا خیال؟" وہ رونے لگی اور ثنا کے ہاتھ تھام کر ہونٹوں سے لگا لیے۔

"ارے، یہ کیا کر رہی ہو؟ ابھی یہ سب کرنے کا وقت نہیں آیا، شروع شروع میں لڑکے والوں کو منت کرنی پڑتی ہے، جوتیاں گھسانی پڑتی ہیں لڑکی والوں سے ہاں کہلوانے کے لیے، خاص طور پہ اتنی اچھی اور ہیرا لڑکی کے لیے، ہاں ایک بار شادی ہو لینے دو۔۔۔ پھر میں اصلی لڑکے والی بن کے دکھاؤں گی تمہیں۔۔۔ یہ بھابھی، دوست وغیرہ سب بھول جانا تم، سمجھیں؟ صرف یہ یاد رکھنا کہ تمہاری سمدھن ہوں میں تمہاری بیٹی کی ساس۔"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہہ رہی تھی مگر منزہ مسلسل روئے چلی جا رہی تھی۔

"آپ نے اتنے سالوں میں کبھی بھابھی بن کے نہ دکھایا تو اب میری سمدھن یا سوہا کی ساس کیا بن کے دکھائیں گی۔"

"تم نے مجھے پہلے کچھ بتایا کیوں نہیں خرم کے بارے میں؟"

مدیحہ نے یہ سوال تقدیس سے تب کیا، جب جعفر محمود کی حالت قدرے سنبھل جانے کے بعد اسے آئی۔ سی۔ یو سے پرائیویٹ روم میں شفٹ کر دیا گیا اور تطہیر نے خود رات وہاں رکتے ہوئے باقی سب کو گھر بھیج دیا۔

"کیا بتاتی میں خود تو کچھ سمجھ پاتی پہلے کہ مجھ سے غلطی کب اور کہاں ہوئی؟"

"مسئلہ کیا ہے آخر اس کے ساتھ؟"

"شاید میں ان کا سب سے بڑا مسئلہ ہوں۔"

"میں اس سے بات کرتی ہوں۔"

"نہیں۔۔۔ میں نہیں چاہتی کوئی میری جانب سے صفائیاں پیش کرے، جب میں نے کچھ کیا ہی نہیں تو میں گناہ گاروں کی طرح جواز کیوں پیش کروں؟ جب میرے دامن پہ کوئی چھینٹا ہی نہیں تو اپنے بے داغ آنچل کو کس لیے بار بار رگڑ کے دھوؤں، مجھے تب سکون ملے گا جب وہ خود میری بے گناہی کا، میری پاکبازی کا یقین کریں گے۔"

"وہ کوئی ذہنی مریض لگتا ہے تقدیس! ورنہ بغیر کسی وجہ کے، بغیر کچھ دیکھے کوئی کیسے کسی پہ شک کر سکتا ہے؟ کیسے کسی کے کردار پہ کیچڑ اچھال سکتا ہے؟"

مدیحہ کی بات پہ تقدیس نے بڑی جتاتی نظروں سے اسے دیکھا۔

مدیحہ اندر ہی اندر شرمندہ سی ہو گئی۔

"ایسے مت دیکھو تقدیس! تمہاری ماں نہ ذہنی مریضہ ہے نہ اسے تمہارے باپ سے کوئی پرانی دشمنی نکالنی ہے، یہ جس عورت کو تم نے اس دن چلاتے ہوئے دیکھا تھا تم کیا جانو اس عورت نے کتنے سال صبر کی سل اپنے سینے پہ رکھ کے گزارے ہیں، جس عورت کو آج تم سامنے سے بھی لڑتا اور دوڑتا دیکھ کے ذہنی مریضہ سمجھنے لگی ہو وہ عورت کبھی اپنے شوہر کے سائے تک کو بھی ترس کے رہ جاتی تھی اور شوہر، وہ سایہ تو کیا، اپنی محبت، اپنا ساتھ سب باہر لٹا کے اندر سے کھوکھلا ہو کے اس کے پاس آتا تھا، تم نہیں جان سکتیں وہ تکلیف، وہ درد جو ایک عورت تب محسوس کرتی ہے جب اسے یہ معلوم ہو کہ اس کے پہلو میں لیٹا مرد اس کے پاس ہو کے بھی اس کا نہیں ہے۔"

مدیحہ کے آنسو گرنے لگے، گزرے سالوں کے کئی اذیت ناک لمحے یاد آ گئے تھے۔

"تو یہ صبر اب کیوں کھو دیا آپ نے؟ اب، جبکہ اب آپ بھی جانتی ہیں کہ اس عمر میں پاپا بھلا کیا کر سکتے ہیں۔"

"ہاں، میں جانتی ہوں اس عمر میں بھلا وہ کیا کر سکتا ہے؟ اب کیا کسی کے عشق کے خمار میں ڈوبے گا، کیا کسی کو اپنے عشق میں پاگل کرے گا؟ کیا کسی سوتن کی تلوار میری گردن پہ لٹکائے گا، لیکن تقدیس! یہی تو ایک رنج ہے کہ آج اس کے کچھ نہ کرنے کی وجہ اس کا تائب ہونا نہیں ہے، اس کا پچھتاوا یا ندامت بھی نہیں ہے بلکہ۔۔۔ اس کا اپنا دل بھر گیا ہے ان رنگینیوں سے، وہ میرے لیے لوٹا بھی ہے تو شرمندہ ہو کر ان سب حرکتوں کو

چھوڑتا تو میں قدر کرتی اس کے لوٹنے کی' لیکن اب کیا قدر کروں میں؟ وہ اتنا نہیں ہے تقدیس! وہ صرف تھک کے رک گیا ہے' سستا رہا ہے' کیا میں اس کے بڑھاپے اور مردوں کو سمیٹنے کے لیے ہی رہ گئی ہوں؟ کیا میرا اس جوانی اور رعنائی پہ کوئی حق نہیں تھا؟ ہاں' ہاں میں نے صبر کھو دیا ہے' میرے اس پچھلے صبر کے پیچھے میرا ڈر چھپا ہوا تھا' طلاق کا ڈر' اپنی بچیوں کو کھو دینے کا ڈر' بابجران سے باپ کے سائے کے چھن جانے کا ڈر' اس کے بے رخے پن ساتھ اور تعلق سے محروم ہو جانے کا ڈر' یہ ڈر مجھے زبان بندی پہ مجبور کرتا تھا' لیکن اب وہ ڈر نہیں رہا' کہاں جائے گا وہ اس عمر میں یہ گھر اور بچے چھوڑ کے' اب میں پچھلے سارے !!!"

"خدا کے لیے ماما! پچھلی باتوں کو بھول جائیں نا۔" تقدیس نے ہاتھ جوڑے۔

"بھولنا ہی پڑے گا' جب اولاد سامنے زخم لیے کھڑی ہو تو سے بار رہنا ہے اپنی چوٹیں سہلاتا۔"

مدیحہ نے اس کے بندھے ہاتھ کھولے' چومے اور نم آنکھوں سے لگائے۔

"میری بیٹی انمول ہے' میری بیٹی پاک ہے' میری بیٹی میرا فخر' میرا غرور ہے۔ میں کسی کو اجازت نہیں دے سکتی کہ وہ میرے فخر اور میرے غرور پہ انگلی اٹھائے' میں خرم سے بات کر کے رہوں گی' بلکہ اس کے گھر جا کے اس کی والدہ سے۔"

"نہیں ماما!" اس نے گھبرا کے بات کاٹی۔

"آپ ایسا کچھ نہیں کریں گی' یہ میرا مقدمہ ہے' اسے مجھے خود لڑنے دیں۔"

✲ ✲ ✲

"تمہارے اور تقدیس کے درمیان کچھ گڑبڑ ہے کیا؟"

ندا دو دن میکے رہنے آئی تھی' بھابھی کے والد کی طبیعت کا سن کر اس کے ساتھ اسپتال انہیں دیکھنے بھی گئی' جو بات درخشندہ نے محسوس نہیں کی' وہ اس نے ذرا ہی دیر میں بھانپ لی اور گھر آ کے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا۔

"نہیں' ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔"

"تم اس سے اکھڑے اکھڑے کیوں تھے؟"

"تو اسپتال میں کیا اس سے چہلیں کرتا؟"

وہ جھنجلا اٹھا تو ندا کو ہنسی آ گئی۔

"بھئی۔ چہلیں کرنے کے دن ہیں تمہارے' کر لیتے۔ اپنی نئی نویلی بیوی سے ہی کرنا تھیں نا' اسپتال میں منع تو نہیں۔"

وہ اس شوخی کا جواب' مسکراہٹ سے دینے کے بجائے وہی سنگین سی سنجیدگی چہرے پہ سجائے کمرے کی جانب بڑھا تو ندا مزید ٹھٹک گئی اور پیچھے پیچھے چلی آئی۔

"ناراض ہو اس سے؟"

"نہیں۔"

"وہ ناراض ہے تم سے؟" وہ مسلسل کرید رہی تھی۔

"نہیں بھئی۔"

"تو پھر کسے کسی اور فرد سے شکایت ہے اسے؟"

"کیا ہو گیا ہے آپ کو؟" اب کے وہ باقاعدہ چڑ گیا۔

"یہی تو پوچھ رہی ہوں' ہو کیا گیا ہے تم دونوں کو۔ کوئی مسئلہ ہے' کوئی ناراضی ہے' کسی دوسرے سے نہیں کہنا چاہتے' کسی کو بتانا نہیں چاہتے' ٹھیک ہے' لیکن آپس میں تو سلجھاؤ' اسے بات کرو' مناؤ۔"

"میرا کیا دماغ خراب ہے جو غلطی بھی اس کی' مناؤں بھی میں اس کو۔"

غصے اور جھنجلاہٹ میں ایسی بات خرم کے منہ سے نکل گئی جسے ندا نے جھٹ سے پکڑ لیا۔

"کیسی غلطی؟"

"کچھ نہیں۔" نجانے کیوں' جس بات پہ اسے پختہ یقین تھا' اس کا اظہار سوائے تقدیس کے کسی اور کے سامنے کرنے سے وہ کترا آتا تھا۔

وہ جواب دیے بغیر نکل گیا۔ ندا کا مزید رکنے کا پروگرام ہوتا تو وہ ضرور کسی نہ کسی طرح اس سے اگلوا کے رہتی' بہر حال جاتے جاتے وہ ظلِ ہما کے کانوں میں یہ بات ضرور ڈال گئی۔

"محسوس تو مجھے بھی کئی بار ہوا' لیکن آپ کی بات اور ہے' آپ بڑی ہیں' پوچھ سکتی ہیں خرم بھائی سے' مجھ میں کیا کسی؟ آپ کو پتا تو ہے ان کے مزاج کا۔"

"تقدیس سے تو بات کر سکتی ہو تم۔ میں نے تو اسے کم گو ہونے کے باوجود بہت دوستانہ سا پایا ہے' تمہارا دن رات کا ساتھ ہے' تم بتاؤ کیا وہ برا مانے گی اس بات پہ؟"

"کچھ کہہ نہیں سکتی' مزاج کی تو وہ واقعی اچھی ہے' لیکن اتنی ذاتی بات پوچھنے پہ اس کا ردعمل کیا ہو' کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ ویسے بھی اگر خرم بھائی کے ساتھ واقعی اس کا کوئی پرابلم چل رہا ہے تو وہ ہمیں کیوں بتانے لگی' میرا مطلب ہے اپنی نند کو۔ خرم بھائی کی بہن کو۔"

"تو تم نند بن کے مت پوچھنا' ایک دوست بن کے پوچھ لینا' دراصل ہما! شادی سے پہلے میں زندگی کے ہر معاملے خصوصاً" دوسروں کی زندگیوں' دوسروں کے معاملات کو بڑا سرسری سا لیتی تھی' میرا خیال تھا کہ سب کی اپنی ذاتی زندگی ہے' اچھی یا بری' دوسرے کو بہرحال کوئی حق نہیں اس میں مداخلت کرنے کا' لیکن اب احساس ہوتا ہے کہ ہر کسی کو اندر سے یہ چاہ ہوتی ہے کہ کوئی ہمارا حال پوچھے' کوئی کہے' تمہیں کوئی مسئلہ تو نہیں' کوئی ضرورت تو نہیں' یہ چھوٹی چھوٹی باتیں بڑا حوصلہ دیتی ہیں' دلوں کو باندھتی ہیں۔"

"اچھا۔ بات کرتی ہوں کسی دن موقع دیکھ کے' ابھی تو وہ اپنے والد کی وجہ سے پریشان ہے۔"

"اور وصی کی سناؤ؟"

ندا کی بات پہ ہما کا دل خلافِ توقع اپنے حال میں مگن رہا' نہ سکڑا' نہ سمٹا' نہ دھڑکنیں منتشر ہوئیں۔ اسے خود اپنی کیفیت غنیمت لگی۔ دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ جس کی ذاتِ پاک نے اسے اپنے حال میں مست رہنے اور کسی وابستگی کو فراموش کرنے اور اپنے شوہر' گھر سے سو فیصد وفادار ہونے کا اہل بنایا۔

"میں کیا سناؤں؟ وصی سے دوستی آپ کی رہی ہے' آپ کو سب پتا ہونا چاہیے۔"

"اب تو تم اس کے گھر کا فرد ہو اور میں اس گھر سے ہی رخصت ہو چکی ہوں' وصی تو اب فون بھی کبھی کبھار کرتا ہے' ایمان سے دل بھی دکھتا ہے یہ سوچ کر کہ کیا شادی کے بعد رشتے اور تعلق اتنے بدل جاتے ہیں۔"

"وہ بدلا ہے' مگر اس شادی کی وجہ سے نہیں۔"

"ہاں میں جانتی ہوں' امی نے بتایا ہے کہ جو کچھ حماقتیں وہ کرتا پھر رہا ہے' مجھے وصی سے یہ امید نہیں تھی' وہ تو سمجھدار اور معاملہ فہم لڑکا تھا' کیا ہو گیا ہے اسے؟ شاید عشق اور وہ بھی اندھا عشق ایسے ہی حواس معطل کرتا ہے۔"

✲ ✲ ✲

"وصی سے پتا چلا ہے کہ تقدیس کے والد آج کل اسپتال میں ہیں۔"

سوہائے' وصی پر مسلسل تذکرے سے کہا تھا' مگر اس کا رواں رواں مشتاق ہو گیا۔

"کیوں؟ کیسے؟ کون سے اسپتال؟"

اس کی بے تابی اور اضطراب پہ سلائس پہ جیم لگاتی صبا نے قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔
"اتنی تفصیلات کا تو علم نہیں مجھے، وصی نے ایسے ہی باتوں باتوں میں بتایا تھا۔" "تمہیں پوچھنا تو چاہیے تھا۔" آخر تقدیس تمہاری سب سے قریبی دوست ہے۔"
"ہے نہیں... تھی۔"
اس نے سلائس واپس پلیٹ میں رکھ دیا۔ کھانے سے دل اچاٹ ہو گیا تھا۔
"بہرحال... یہ وقت ایسا ہے کہ تمہیں، میرا مطلب ہے پرانے تعلق کے لحاظ میں ہی سہی... مگر..."
ردا کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ جعفر کے پاس جانے کے لیے وہ کیا جواز پیدا کرے، خود بے شک نہ جا سکے مگر صبا کی زبانی ہی اس ستم گر کا حال جان سکے۔
"وہ بھول گئی... دراصل..." وہ چائے کا گھونٹ بھرتے بھرتے کچھ ہچکچا سی گئی۔ "دراصل بات صرف تقدیس کی نہیں ہے، ہمارے درمیان بے شک دوستی وہ نہیں رہی مگر ایسی دشمنی بھی بہرحال نہیں ہے کہ میں اس کا سامنا کرنے سے کتراؤں، لیکن ماما! آپ تو جانتی ہیں کہ وہ اب کس فیملی کا حصہ ہے، مجھے ان لوگوں کا سامنا کرنے سے خوف آتا ہے۔"
"خوف آتا ہے؟ صرف سامنا کرنے کے خیال سے بھی؟ تو تم ان کے ساتھ زندگی کیسے گزارو گی صبا؟"
ردا نے تعجب سے سوال کیا۔ وہ دہل کے رہ گئی۔
"زندگی؟"
"چاہے وصی تمہیں لے کر الگ ہو جائے، پھر بھی خاندان سے رابطے تو نہیں ٹوٹنے، عمر بھر تمہیں ان لوگوں کو فیس کرنا ہے، اپنا دل مضبوط کرو صبا! ایسے تو گزارا نہیں ہونے والا۔"
وہ لاپروائی سے ناشتہ کھانے لگی اور صبا خالی خالی نظروں سے اسے دیکھے گئی۔
اسے کتنی ہی ایسی یادیں گھیرنے لگیں، جب اصغر کے ساتھ ردا کو خاندان کی کسی نہ کسی خوشی غمی میں شریک ہونا پڑتا اور وہ وہاں ایسی ہی ڈھٹائی کے ساتھ سر اونچا کیے بیٹھی رہتی، سب کو یاد تھا کہ اصغر کی بیوی، "صبا کی ماں" عصمت کی بہو کو چھوڑ کے آئی ہے، کوئی اس کی شناخت بھولنے پہ تیار نہیں تھا۔
کوئی اسے اس کی اوقات یاد دلانے میں پیچھے رہ جانے پہ راضی نہیں ہوتا تھا۔
"شاید میں اپنا دل اتنا مضبوط نہ کر سکوں ماما!"
اس نے پسپائی اختیار کرتے ہوئے سوچا۔

☆ ☆ ☆

مدیحہ نے سوپ کا چمچ جعفر کی جانب بڑھایا۔
وہ بے گانے انداز میں منہ پھیر کے رہ گیا۔
مدیحہ کی انگلیاں کپکپا اٹھیں۔
"ضد مت کرو، کھا لو کچھ، ورنہ دوا کیسے لو گے؟"
"دل نہیں چاہ رہا۔" جعفر نے آنکھیں موند لیں۔
مدیحہ نے غور سے اسے دیکھا تو جیسے دل پہ گھونسا سا پڑا۔
"کتنا لباس ٹھیک رہتی ہیں تمہارے چہرے پہ یہ عیاشیاں، تمہیں بوڑھا ہونے کب دیں گی، تمہاری جوانی کے دن پتا نہیں کب ختم ہوں گے اور کب مجھے سکون کا سانس نصیب ہو گا۔"
حسد اور جلاپے میں ڈوبے اس کے اپنے الفاظ لبوں پہ آ گئے اور وہ دکھ سے کپکپاتے ہونٹوں کے ساتھ اس کا ڈھلتا ہوا چہرہ دیکھنے لگی۔

وہی دن میں آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے پڑ چکے تھے، ہونٹوں پہ پپڑیاں جمی تھیں، انگلیوں کی پوروں کی ہلکی ہلکی لرزش بتلا رہی تھی کہ اسے اب ان پہ قابو پانے میں بھی کتنی دقت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ باقاعدگی سے شیو کرنے والے کے چہرے پہ سفید غبار سا پھیلا ہوا تھا، جو اسے اصل عمر سے بھی دس سال آگے کا ظاہر کر رہا تھا۔
مدیحہ نے اس کے سینے پہ بندھے ہاتھوں پہ اپنا ہاتھ نرمی سے رکھا تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگا۔
اس بار نگاہوں میں دل کو چیرتی بے اعتنائی کے بجائے ہلکا سا شکوہ تھا۔
"پلیز... تھوڑا سا سوپ لے لو۔ تطہیر کو میں نے ابھی ابھی گھر بھیجا ہے، دو راتوں سے مسلسل یہاں تھی، آرام نہیں ملا اسے اور تحریم کی ساس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، اس کا گھر جانا بھی ضروری تھا، اور تقدیس تو آپ کو پتا ہے ایک ہی دن کے لیے آئی تھی اور رہنا پڑ گیا۔ ذرا سی دیر کے لیے گھر گئی ہے کپڑے وغیرہ لینے، پھر بھی آتے آتے گھنٹہ ڈیڑھ تو لگے گا، تب تک کیا بھوکے رہو گے؟ میں جانتی ہوں، ناراض ہو مجھ سے، میرے ہاتھ سے کچھ کیسے کھاؤ گے، جبکہ بات تک کرنا گوارا نہیں ہے مجھ سے، لیکن اگر بیٹیاں اس وقت موجود نہیں ہیں تو کچھ دیر کے لیے ناراضگی بھول جاؤ، میری غلطیاں بھی بھول جاؤ، بے شک مجھے معاف بھی مت کرنا مگر پلیز... پلیز... تھوڑا سا سوپ لے لو۔"
اس کے رقت آمیز لہجے میں نجانے کیا تھا کہ جعفر محمود نے منہ کھول دیا، مدیحہ نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ سوپ کا چمچ اس کی طرف لے جاتے ہوئے کہا۔
"شکر ہے... میری کوئی بات تو مانی۔"
"اس حالت میں بھی طعنے دینے سے نہیں چوکیں تم۔"
وہ ہنسنے کی کوشش میں کراہ کے رہ گیا۔
مدیحہ فوراً اس کی کمر سہلانے لگی۔
دل خود بخود اس شخص کے لیے اتنا ہی نرم اور گداز ہو رہا تھا، جیسے شادی کے اولین دنوں میں ہوا کرتا تھا، جب وہ آفس سے گھر لوٹتا تو اس کی ساری تھکن ہتھیلیوں میں سمیٹنے کو بے تاب رہتی تھی وہ۔ اس شخص کے لیے پچھلے کئی سالوں سے جس کے لیے نفرت اور بیزاری بھی کم پڑ رہی تھی۔
"میں جانتی ہوں، مجھ سے غلطی ہوئی، مجھے یہ سب باتیں بیاہی بیٹیوں کے سامنے نہیں کرنی چاہیے تھیں۔"
اس کے نیپکن کو درست کرتے ہوئے مدیحہ نے اپنی غلطی تسلیم کی۔
"نہیں... تمہیں یہ باتیں اب مجھ سے کرنی ہی نہیں چاہئیں۔" جعفر محمود نے تصحیح کی۔ "تم مان کیوں نہیں لیتیں کہ اب وقت وہ نہیں رہا۔"
جواب میں مدیحہ کے پاس کہنے کو بہت کچھ تھا، لیکن وہ اس کی طبیعت کی خرابی کے پیش نظر چپ سی رہی۔
"تم میرا اعتبار کیوں نہیں کر لیتیں کہ اب میری زندگی میں تمہارے اور بچیوں کے علاوہ اور کچھ نہیں رہا۔"
"تم نے کبھی یہ اعتبار دلانے کی کوشش بھی تو نہیں کی۔" وہ ہلکا سا گلہ کر بیٹھی۔ "مانا میں بدگمانیوں میں بہت آگے نکل گئی تھی۔ تم بھی تو مانو کہ کبھی میری انگلی تھام کے مجھے واپس لانے کی کوشش نہیں کی... مانا شک نے مجھے اندھا اور پاگل کر دیا تھا، مگر تم بھی تو مانو کہ اس شک کی دلدل سے نکالنے کے لیے تم نے کبھی کوئی کوشش نہیں کی... مانا... میری محبت بے اعتباری کی گرد تلے دب گئی تھی، مگر تم نے اپنی محبت سے اس دبی ہوئی محبت کو ابھارنا نہیں چاہا۔"
جواب میں کئی سیکنڈ جعفر محمود چپ رہا۔
پھر اس کے ہاتھ پہ اپنا سوئیوں اور ٹیوبوں سے جکڑا ہاتھ رکھ کے آہستہ سے کہا۔
"مانا..."

اسے الماری سے کپڑے نکالتے دیکھ کے وہ جز بز ہو رہا تھا۔ ہما اس کے ساتھ تھی' ورنہ بہت کچھ سنا ڈالتا۔

''یہ والا سوٹ رکھ لو آرام دہ رہے گا۔''

ہما نے کاٹن کا تیسرا سوٹ اس کے بیگ میں رکھا تو وہ کہے بغیر رہ نہ سکا۔

''بس بھی کرو ہما۔ وہ وہاں چھٹیاں گزارنے نہیں جا رہی۔''

''ہسپتال میں اپنی صفائی کا بھی خاص دھیان رکھنا پڑتا ہے بھائی جان۔! دن میں دو بار تو شاور لے کر نہیں کپڑے ضرور بدلتی ہوں گے تقدیس!''

تقدیس چونکہ اس سے بھی ڈیڑھ برس چھوٹی ہی تھی اس لیے بڑے بھائی کی بیوی ہونے کے باوجود ہما اس کے نام کے ساتھ بھابھی وغیرہ کی وضاحت کرنا عجیب سا محسوس کرتی تھی۔

''اور اپنے آرام کا بھی خیال کرنا۔''

''اتنی فکر ہے تو جانے کیوں دے رہی ہو؟''

''کیسی باتیں کر رہے ہیں؟ انکل بیمار ہیں' وہ جائیں بھی نا!''

ہما تقریباً ''برا مان کے بولی۔

''جانے کیا کرلے گی' ڈاکٹر تو ہے نہیں یہ مجبور کرنا ہے وہ وہاں ڈاکٹرز کر رہے ہوں گے' شام کو میں لے جایا کروں گا ملوا لے۔''

وہ اس کے نہ جانے کے جواز پیش کر رہا تھا۔

''مانا کہ وہ وہاں جا کے کچھ نہیں کر سکیں گی؟ لیکن یہ بھی تو سوچیں کہ یہاں رہ کے کیا کرلیں گی؟ دھیان تو اس کا اپنے ابو میں اٹکا رہے گا' پریشان رہے گی' طرح طرح کے وہم کرے گی' اس سے اچھا ہے وہیں رہے کم از کم اسے تسلی تو رہے گی اور آنٹی کو بھی بیٹیوں کے ساتھ اور پاس ہونے سے دلی تقویت رہے گی۔''

خرم چپ رہا اور خشمگیں نگاہوں سے پیکنگ میں مصروف تقدیس کو گھورنے لگا جو پہلے ہی چپ تھی۔ تھکان چہرے سے واضح تھی' اس کے باوجود خرم کو لگ رہا تھا کہ وہ میکے جانے' بلکہ اس سے اور اس گھر سے کچھ دن اور دور رہنے کے خیال سے ہونے والی خوشی اور ہیجان کو چھپانے کے لیے پریشان اور پژمردہ ہونے کا ناٹک کر رہی ہے۔

''پیکنگ تو ہو گئی' میری مانو تو اب آئی تو ہو ایک دو گھنٹے آرام کرنے کے بعد جانا۔ شکل دیکھو ذرا اپنی۔''

''نہیں' آرام کیا کرنا' میں چلتی ہوں اب۔''

''جانے دو ہما! وہاں اس کا بے چینی سے انتظار ہو رہا ہو گا۔''

اس کے چبھتے لہجے پہ تقدیس نے چونک کر دیکھا۔

''ویسے بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں رکنے سے اسے آرام کی بجائے تکلیف ہی ملے۔''

تقدیس چپ چاپ سینڈل اتار کے بیڈ پہ چڑھ گئی' ہما الجھن بھرے انداز میں دونوں کو دیکھنے لگی۔

''اچھا... میں چائے بھجواتی ہوں تمہارے لیے۔''

نہ تقدیس کی خاموشی سمجھ میں آ رہی تھی' نہ خرم کی کٹیلی باتوں کی تہہ میں اتر پا رہی تھی وہ... اس لیے باہر نکل گئی۔

''ایک بات تو بتاؤ؟''

خرم نے پھنکارتے لہجے میں کہا تو دروازہ بند کر کے اگلا قدم آگے بڑھاتی ہما نہ چاہتے ہوئے بھی رک گئی۔

''کہیں تمہارے کسی کرتوت کی بھنک تو نہیں پڑ گئی انکل کے کانوں میں اور وہ بے چارے تاب نہ لاتے ہوئے...''

تقدیس جو لیٹنے کے لیے تکیہ درست کر رہی تھی۔ تڑپ کے اٹھ بیٹھی۔

''غیرت کا ابال بھی دل کو کہیں کا نہیں چھوڑتا۔ جس بدنامی سے بچنے کے لیے انھوں نے تمہیں سر سے بوجھ کی طرح اتار کے پھینکا تھا' وہی بدنامی تم میکے سے سسرال اور پھر سسرال سے میکے سمیٹ لائی ہو گی۔''

ہما اپنی جگہ سن ہو گئی۔

اور تقدیس کا کئی مہینوں سے طاری اذیت بھرا بند سکتہ بالآخر ٹوٹ گیا۔

''بس کیجیے' خدا کے لیے چپ رہیں۔ میرے باپ کی بیماری کو تو تماشا نہ بنائیں' مجھے فخر ہے کہ ہم تینوں بہنوں نے اپنے کسی عمل سے انھیں کبھی شرمندہ نہیں ہونے دیا۔ کبھی ان کا سر نہیں جھکنے دیا اور اس کے لیے مجھے آپ کو گواہی پیش کرنے کی یا آپ سے گواہی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا دل جانتا ہے' میرا رب جانتا ہے اور میرے ماں' باپ جانتے ہیں' میں اپنے ضمیر کے آگے مطمئن ہوں اور وہ مجھ سے مطمئن ہیں۔ مجھے اب اپنے کردار کے بارے میں آپ کو کوئی صفائی نہیں دینا' لیکن آپ بھی کم از کم میرے والدین کے بارے میں ایسی بات کہنے سے پرہیز کیجیے' مجھ پہ آپ کا حق ہے' اگرچہ آپ اس حق کا ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں' پھر بھی میں اس حق کو تسلیم کرتی ہوں' لیکن میرے گھر والوں کے بارے میں کسی قسم کی رائے زنی کا حق آپ کو نہیں ہے۔''

❁ ❁ ❁

ہما نے من و عن ساری بات رخشندہ سے کہہ دی۔

وہ بھی بے یقینی سی تھیں کہ خرم ایسی ذہنیت کا مظاہرہ کر سکتا ہے۔

''خرم بھائی کچھ بھی کہیں' لیکن مجھے تقدیس ایسی نہیں لگتی' ویسے بھی جس کے دل میں چور ہو وہ نظر جھکا کے رہتا ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات نہیں کرتا۔''

''میں جانتی ہوں' یہ عمر ایسے ہی نہیں گزاری میں نے تقدیس کا انتخاب اپنی اکلوتی بہو کے طور پہ خوب سوچ سمجھ کے کیا تھا میں نے' حیرت ہے کہ خرم کو اس کی آنکھوں میں حیا اور پاکبازی کی وہ جھلک نظر نہیں آئی؟''

''وہ غلط کر رہے ہیں امی! اور انھیں روکنا ہو گا' احساس دلانا ہو گا۔''

''مجھے تو پہلے ہی تاسف ہو رہا ہے کہ اتنے دنوں سے میرے گھر میں یہ سب ہو رہا ہے اور مجھے خبر نہیں۔''

❁ ❁ ❁

ربنا اسے اپنے گھر میں دیکھ کے ششدر رہ گئی۔

ثنا کا موڈ البتہ نارمل تھا' ایسے جیسے ربنا کے گھر کسی سے ملنے آنے رہنا اس کا برسوں پرانا معمول ہو۔

''کیا ہوا! پہچانا نہیں۔'' ثنا مسکرائی۔ ''بڑی جلدی جلدی بھول جاتی ہیں آپ۔''

''نہیں... ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' ثنا کے دوستانہ لہجے اور انداز نے ربنا کو تذبذب سے روک دیا تھا۔

''سوہا گھر پہ نہیں۔''

''اچھا۔'' وہ اطمینان سے بیٹھتے ہوئے بولی جیسے سوہا کے ہونے نہ ہونے سے اسے خاص فرق نہ پڑتا ہو۔

''وہ بھی نکلی ہے' آنے میں وقت لگے گا۔''

اب ربنا کے صاف جتانے پہ وہ نرمی سے مسکرائی۔

''کوئی بات نہیں... اس سے پھر کبھی مل لوں گی۔ اس بار تو خاص آپ سے ملنے آئی ہوں۔''

''مجھ سے؟ منیزہ نے کوئی پیغام بھجوایا ہو گا؟'' ربنا نے نیچے چوتن کر کے پوچھا۔

جواب میں ثنا ہنس پڑی۔

"پیغام تو میں واقعی لائی ہوں، مگر مثنوی نے نہیں بھجوایا۔ وہ اس قسم کے پیغام بھجوانے کی پوزیشن میں نہیں۔ بیٹیوں کی ماں ہے نا! ایسے پیغام تو میں ہی لا سکتی ہوں، اور آپ کے پاس کیونکہ بہرحال سوہا آپ کی بیٹی ہے، آپ کو ہی مکمل اختیارات اس کے بارے میں کوئی فیصلہ کرنے کا۔"

باوجود اس کے کہ شنا کی ملائمت سے کی گئی باتیں ریٹا کو تقویت کا احساس دلا رہی تھیں۔

باوجود اس کے کہ سوہا کو اس کا فراخ دلی سے اس کی بیٹی قرار دینا اسے فخر میں مبتلا کر رہا تھا، پھر بھی کوئی بے نام، معنی سی الجھن اسے گھیرے جا رہی تھی۔

□□□

رخشندہ جواب طلب انداز میں اس کے سامنے کھڑی تھیں اور خرم کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہاں جائے۔

"جواب دو خرم۔ میں کچھ پوچھ رہی ہوں تم سے۔"

"اب میں کیا بتاؤں آپ کو۔" وہ دست پا گیا۔

"اگر کچھ ہے بتانے کو تو بتاؤ۔"

اس کے پاس جواب میں ایک شرمساری خاموشی تھی۔

"کچھ بھی نہیں ہے۔" رخشندہ نے تاسف سے سر ہلایا۔

"اور اس کچھ بھی نہ ہونے کی بنیاد پہ تم اپنا گھر اور اس بچی کی زندگی دونوں کو خراب کر رہے ہو۔"

"ایسا نہیں ہے امی۔ کہ کچھ بھی نہ ہو۔ بے بنیاد عمارت کبھی کھڑی نہیں ہوتی، بس یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آ رہا میں آپ سے اس موضوع پہ کیا بات کروں؟"

"جو بھی تمہارے دل میں ہے، کیا تقدیس کے بارے میں تم جو بھی رائے رکھتے ہو اس کی کوئی مضبوط ٹھوس وجہ ہے تمہارے پاس؟ کوئی ثبوت؟ اس کے ماضی کے حوالے سے؟"

"اس کو مشکوک ثابت کرنے کے لیے سب سے بڑا ثبوت اس کی صحبت ہے امی۔ انسان اپنی صحبت سے پہچانا جاتا ہے اور اس کے حلقہ احباب میں کچھ خاص اچھی شہرت کے حامل۔"

"میں نے تو اتنے مہینوں میں اس کی کسی بھلی یا بری دوست کو آتے جاتے نہیں دیکھا، اسے تو دوسری لڑکیوں کی طرح فون پہ گھنٹوں چپک کر سہیلیوں سے گپیں لگانے کی بھی عادت نہیں ہے۔"

"جس قسم کی اس کی سہیلیاں ہیں وہ کھلے عام ملنے کے قابل نہیں۔" وہ جل کے بولا۔

"تم مفروضوں کی بنیاد پہ بات کر رہے ہو، اس عمر اور اتنے تجربے کے بعد میں انسان کو پہچاننے میں اتنی بڑی غلطی نہیں کر سکتی۔ میں نے بھی تین تین بیٹیوں کی پرورش کی ہے اور اسی بنا پہ حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ تقدیس کسی بھی طرح کردار و اخلاق کے معیار میں ندا، ہما اور ردا سے کم نہیں۔"

"پلیز امی! بغیر سوچے سمجھے میری بہنوں کو کسی کے ساتھ نہ ملائیں، اور میں مفروضے نہیں گھڑ رہا۔ میں نے تقدیس کو شادی سے پہلے بھی اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تھا، وہ لڑکی جو ذرا سی بھی اچھی شہرت نہیں رکھتی، اور پھر عین شادی والے دن اس نے جو تماشہ کیا تھا، یاد ہے آپ کو۔"

"کون؟ سوہا؟"

"جی۔ وہی محترمہ۔ وہی جو وصی کے گھر کو آگ لگا رہی ہے۔ وہی جو ایک طوائف کی شہ اور اس کی تربیت حاصل کر کے چلی ہے۔ جو ہر لے ڈنکے کی چوٹ پہ ایک شادی شدہ سے عشق لڑا رہی ہے، یہی سوہا۔ آپ کی قابل فخر بہو تقدیس کی گہری دوست۔"

"او ہو تو یہ کھٹک ہے تمہارے دل میں۔"

انہوں نے ایک گہرا سانس بھرا۔

"پہلی بات تو یہ کہ وہ وہیں واضح ہو گیا تھا کہ تقدیس کی سوہا سے ایسی خاص دوستی نہیں ہے۔"

"اور یہ واضح کس نے کیا تھا؟" خرم نے مکمل بات سنے بغیر سوال اٹھایا۔

"خود تقدیس کے اپنے گھر والوں نے۔ وہ تو ظاہر ہے کہ بیٹی کے کارناموں پہ پردہ ڈالیں گے۔"

"کیسے کارنامے؟" وہ بھی ضبط کھو بیٹھیں۔

"بغیر کسی واضح اور ٹھوس ثبوت کے تم دھڑا دھڑ میرے سامنے منہ بھر بھر کے ایسے واہیات لفظ اس بچی کے لیے استعمال کیے جا رہے ہو جسے میں اپنی ذمے داری پہ بیاہ کر لائی تھی۔ اللہ سے یہ کہہ کر کہ یا اللہ جس طرح میں اس پرائی بیٹی کو اپنا بنا کے رکھوں گی، ویسے ہی میری بچیوں کو ان کے گھروں میں محبت اور سلامتی عطا فرمانا۔ تم نے میری پوری بات سنی کب ہے۔ ہو جاتی ہے کالج میں ہر طرح کی لڑکیوں سے علیک سلیک۔ بچیاں تو نادان ہوتی ہیں انہیں لوگوں کو جانچنے پرکھنے کی سمجھ آتے آتے آتی ہے۔"

"کیا ہما کالج نہیں گئی؟ کیا ردا نہیں جاتی۔ ان کی تو ایسی دوست پا تم دوستیاں نہیں ہوئیں۔ میں شروع سے دیکھتا آ رہا ہوں کیسے آپ ان کے اسکول کے زمانے سے ان کی سہیلیوں اور میل جول پہ نظر رکھا کرتی تھیں۔"

"ہر انسان کی سمجھ کا پیمانہ الگ ہوتا ہے۔ ایک ہی ماں کی گود میں پرورش پانے والی بچیاں الگ الگ سمجھ بوجھ اور فطرت لے کر پیدا ہوتی ہیں۔ ہما ماشاءاللہ شروع سے ایسی رہی ہے کہ مجھے اسے بس اشارہ، کچھ سمجھانا پڑتا تھا۔ وہ خود محتاط ہو جاتی تھی۔ البتہ ندا۔ عمر میں۔ سب سے بڑی ہونے کے باوجود اس کا تجربہ اس میدان میں صفر تھا اور صفر ہے۔ جانتے ہو کالج میں پڑھنے کے نہیں۔ بلکہ پڑھانے کے دوران وہ ایسا دھوکا کھا چکی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"چھ ماہ ہوتے ہیں۔ عملی میدان میں آ جانے یا لیکچرر بن جانے کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دنیا داری میں بھی ماہر ہو گئی۔ وین لگوا کے دی تھی تب میں نے اسے کالج سے آنے جانے کے لیے اور اسی وین میں اس کی دوستی ایک ایسی لڑکی سے ہو گئی جو کسی ماڈلنگ وغیرہ کی کمپنی میں کام کرتی تھی۔ اور اس کا تعلق بڑے ہی بدنام گھرانے سے تھا۔ ایک بہن تو جعلسازی کے الزام میں جیل کاٹ رہی تھی۔ ماں نے تیسرا شوہر کر رکھا تھا۔ چھوٹی بہن کے واہیات ڈانسوں کی سی ڈیز بازار میں کھلے عام مل رہی تھیں اور وہ بھی یہ نوکری محض اونچا ادا پارٹیوں سے تعلقات بڑھانے کے لیے کر رہی تھی۔"

"تو۔ پھر کیسے میرا مطلب؟" وہ بوکھلا کے رہ گیا۔

"کچھ بھی نہیں۔ دونوں کی علیک سلیک وین تک محدود تھی۔ اس سے پہلے کہ یہ دوستی گہری ہوتی۔ روابط مضبوط ہوتے میں نے اس لڑکی کے اطوار بھانپ لیے وہ وین سے اتر کر بس پانچ منٹ کے لیے گھر کے اندر پانی پینے آئی تھی۔ میں کھٹک گئی۔ میں نے کچھ سوال کیے ان سے میرے شک کو تقویت ہوئی اس کے بعد وصی کے ذریعے کھنگالا سب کچا چٹھا سامنے آ گیا۔ میرے سمجھانے پہ ندا نے اس سے قطع تعلق کر لیا۔ وین بھی بدل لی۔ مگر خود سوچو کسی نے اسے کبھی اس لڑکی کے ساتھ وین میں بیٹھ کر گپیں لگاتے نہ دیکھا ہو گا؟ کیا اس سے ندا کے بارے میں غلط رائے قائم کی جا سکتی ہے؟"

خرم سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔

"آج سوہا کی ممانی آئی تھی۔"

ریٹا نے اصغر سے ذکر کیا۔

"وہ جو باہر سے آئی ہے۔ وہ والی؟"

"ہاں ___ پہلی بھی آئی تھی مگر سوہا سے ملنے ___ خاصا ملنا جلنا رکھ لیا ہے اس نے سوہا سے اور حیرت کی بات تو یہ ہے کہ سوہا جو ماں اور اس کے حوالے سے کسی بھی رشتے سے خار کھاتی تھی۔ اس سے ایسے گھل مل گئی ہے جیسے ___"

رُبنا سے بات مکمل نہ ہو سکی تو وہ لب کاٹ کے رہ گئی۔ اصغر نے گہری نظروں سے اسے دیکھا۔

یہ سانولے رنگ کی تیکھے نقوش والی ___ متناسب جسم و قد کی مالک ___ عمر چور قسم کی عورت ___ جس سے کبھی وہ بے تحاشہ محبت کرتا تھا۔

پھر جس کی حاکمانہ اور مشتاقانہ فطرت سے گھبرا کے اس سے کترانے لگا تھا۔

اور پھر ایک وقت تھا جب وہ یہ جان گیا تھا کہ یہ عورت جو پچھلے پندرہ سالوں سے اس کے ساتھ ہے، نہ کبھی اس سے محبت کر پائی تھی نہ کرتی ہے تو وہ اس سے شدید نفرت بھی کرنے لگا تھا۔

لیکن اب کچھ عرصے سے یہی محبت سے بے زاری اور بے زاری سے نفرت میں ڈھلا جذبہ ہمدردی اور ترحم میں تبدیل ہوتا جا رہا تھا۔

"کیوں دل چھوٹا کرتی ہو؟ صرف یہ سوچ کر کہ تم اس کی سگی نہیں ہو ___ وہ سگے ہیں؟ جبھی وہ ہماری سگی بیٹی بھی ہوتی تو ہم اس کے سگے ہمیشہ تو نہیں رہنے والے تھے ___"

"کیا مطلب؟" وہ الجھی۔

"کبھی بیٹیاں بھی حق جتانے کے لیے ہوتی ہیں؟ یہ تو فرض نبھانے کے لیے ہوتی ہیں ___ میں جانتا ہوں سگا چچا ہونے کے باوجود شاید مجھے سوہا سے اتنی شدید محبت نہیں ہے۔ جتنی تجھے ہے مجھے یہ بھی پتہ ہے کہ تو شاید زندگی سوہا کے لیے ہے لیکن ربنا میری رانی! اب وقت آ گیا ہے کہ تو اپنے دل کو مار لے ___ سوہا کو کتنا عرصہ اور گود میں چھپا کے رکھے گی؟"

"میں اسے منزہ کے پاس نہیں جانے دوں گی۔ کبھی نہیں ___ نہیں ہے وہ سوہا کی ماں۔ وہ ایک خود غرض عورت ہے۔ اس نے سوہا کی تب پروا نہیں کی جب سوہا کو اس کی ضرورت تھی تو اب کیا کرے گی۔ میں نہیں جانے دوں گی اسے منزہ کے پاس۔"

"کون کہہ رہا ہے کہ اسے منزہ کے پاس جانے دے اور منزہ بھی اب اسے تجھ سے واپس لے کر کیا کرے گی! اب وہ وقت آ گیا ہے جب حق دار کو امانت سونپی جاتی ہے۔ اسے رخصت کرنے کا وقت۔ اب وہ تیرے میرے پاس رہے یا منزہ کے پاس ___ کرنا تو اسے رخصت ہی ہے۔"

ربنا گم صم سی اسے دیکھنے لگی۔

"اسی لیے سمجھا رہا ہوں ___ آہستہ آہستہ دل پکا کرنا شروع کر دے ورنہ بعد میں تکلیف ہو گی۔"

"میں ___ مجھے پتہ ہے سوہا نے چلے جانا ہے لیکن میں وہ نہیں ہونے دوں گی جو منزہ چاہتی ہے۔ اس کی سازش جان گئی ہوں میں ___ وہ سوہا کو ہمیشہ کے لیے اپنی مٹھی میں کرنا چاہتی ہے۔"

"بھرجائی کا خوف؟" وہ جھنجھلا اٹھا۔

"اب سوہا کی شادی میں بھرجائی کہاں سے آ گئی؟"

"تمہاری اسی چالاک سازشی بھرجائی نے اپنی بھرجائی کو یعنی سوہا کی ممانی کو یہاں کس لیے بھیجا تھا ___ جانتے ہو؟"

اصغر سوالیہ انداز میں اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

"سوہا کا رشتہ مانگنے ___"

"سوہا کا رشتہ؟"

"ہاں ___ اپنے بیٹے کے لیے۔"

۞ ۞ ۞

"کیا ہمارے درمیان اب صرف چپ کا رشتہ رہ گیا ہے؟" کئی تکلیف دہ پل خاموش گزارنے کے بعد سوہا نے دریا کے سوکھتے کیچڑ زدہ پانی میں ایک کنکر اچھالتے ہوئے وصی سے پوچھا۔

وہ چونکا اور خالی خالی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

یہ نظریں ___ یہ آنکھیں اتنی بے بس ___ اتنی لاچار تھیں کہ سوہا کو اس سے خوف محسوس ہونے کے ساتھ ساتھ اس پر ترس بھی آنے لگا۔

"تم کتنے بدل گئے وصی ___ اور شاید اس تبدیلی کی وجہ میں ہوں۔"

وصی نے تردید کی ___ نہ تصدیق۔

سوہا بجھ کے رہ گئی۔ شاید وہ وصی کی جانب سے تردید کی منتظر تھی ___ کہ وہ کہے۔

"نہیں سوہا ___ تم کیوں؟"

یا شاید وہ تصدیق کی منتظر تھی۔ کہ وہ کہے۔

"ہاں تم ہو میری زندگی میں تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ۔ تمہارے آنے سے میری زندگی میں رنگ ہی رنگ بھر گئے ہیں ___ خوشیاں ہی خوشیاں بکھر گئی ہیں۔"

لیکن وہ چپ تھا اور اس چپ سے سوہا کا دل کٹ رہا تھا۔

"چلوں میں ___" وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈال کے سست سے انداز میں کھڑا ہو گیا۔

"اتنی جلدی ___؟ ابھی تو کوئی بات بھی نہیں ہوئی۔"

"ممانی کو ہاسپٹل لے کر جانا تھا۔"

"خیریت؟"

"ہاں وہ بھائی کے والد کی طبیعت کا پتہ کرنے جانا تھا۔" اسے بتانے کے بعد وہ چونکا۔ جیسے کچھ یاد آیا ہو۔

"میرا خیال تھا تم بھی گئی ہو گی ___ آخر وہ تمہاری اچھی دوست رہی ہیں۔"

"ہاں ___ اچھی دوست ٹھیک کہا تم نے۔" وہ افسردگی سے مسکرائی۔

"اور یہ بھی ٹھیک کہا کہ رہی ہیں ___ وہ اور میں بڑے عجیب حالات میں دوست بنے اور ان سے بھی عجیب حالات میں الگ ہوئے۔ اب تو شاید کوئی وجہ بھی نہیں رہی اس سے ملنے کی۔"

"ہاں ___ یہی بہتر ہے کیونکہ اب وہ صرف تمہاری سابقہ دوست نہیں ہیں ___ میری بھابھی بھی لگتی ہیں میرے خاندان کا ایک حصہ۔"

وصی کی بے ساختگی سے کہی بات نے سوہا کو شدید دھچکا پہنچایا ___ وہ تو شاید کہنے کے بعد محسوس بھی نہ کر پایا کہ سوہا کی حساسیت پر اس کا کتنا اثر ہوا ہے لیکن وہ اسی وقت ہسپتال جانے کا ارادہ کر بیٹھی۔

۞ ۞ ۞

"کیا بات ہے؟ آپ ہاسپٹل نہیں گئے آج؟" وصی نے لاؤنج میں لیٹے خرم سے پوچھا۔

"سب آپ کا پوچھ رہے تھے۔"

"روزانہ حاضری لگوانا ضروری ہے کیا؟"

وہ جلا بیٹھا تھا۔ درخشندہ نے کلاس ہی ایسی لی تھی۔

"آخر آپ کے سسر ہیں…… جانا تو چاہیے۔"

"تمہارا سسر ہسپتال جائے گا تو دیکھ لیں گے تم کتنے پھیرے لگاتے ہو؟"

خرم نے وصی اور وشمہ کے رشتے کی کڑواہٹ پہ چوٹ کی…… وصی کچھ دیر تو بول ہی نہ سکا…… خرم سے اس ہلکے پن کی توقع نہ تھی۔ اس کا ردِعمل دیکھ کے خرم بھی شرمسار سا ہو گیا۔ اپنے رویے کی بدصورتی اور الفاظ کی کراہیت کا احساس ہوا تو معذرت کرنے لگا۔

"سوری یار…… دراصل پہلے ہی امی نے اس ٹاپک پہ لیکچر دے کے پریشان کیا ہوا تھا…… اوپر سے تم بھی۔"

"کوئی بات نہیں…… لیکن بولنے سے پہلے اتنا تو سوچ لیں کہ آپ کس کے بارے میں کیا بات کر رہے ہیں۔ مجھے واقعی اپنے سسر سے کوئی خاص جذباتی وابستگی نہیں ہوئی۔ مگر وشمہ کو اپنے والد…… اور ممانی کو اپنے بھائی سے تو ہو گی…… اگر وہ سن لیتیں تو کتنا برا لگتا انہیں۔"

پھر اس کے پاس بیٹھ کر دوستانہ انداز میں پوچھا۔ "مسئلہ کیا ہے؟"

خرم کچھ دیر اسے دیکھتا رہا جیسے اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا ہو کہ اس سے شیئر کرے یا نہیں۔

پھر آہستگی سے نفی میں سر ہلا دیا۔

"نہیں…… کوئی مسئلہ نہیں۔ تم سناؤ کچھ فیصلہ کیا یا نہیں؟"

"کس بارے میں؟"

"یہ جو دو کشتیوں پہ سوار ہو تم…… اس کا کوئی فیصلہ تو کرنا ہو گا…… یا لٹکائے رکھو گے دونوں کو۔"

"بعض فیصلے زندگی خود اپنے ہاتھ میں لے لیتی ہے۔ میں بھی نہیں جانتا…… میری زندگی کا یہ موڑ مجھے کہاں لے کر جانے والا ہے…… میں نے خود کو حالات اور تقدیر کے سپرد کر دیا ہے۔"

"یہ تو شکست کا اظہار ہے۔"

"ہاں…… میں بری طرح شکست کھا چکا ہوں۔ دل اور ضمیر دونوں کے ہاتھوں…… نہ دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو پا رہا ہوں کہ وہ سوہا سے دستبردار ہو جائے نہ ضمیر کو سلا پا رہا ہوں کہ وہ ممانی کی توقعات کو توڑنے کی ہمت کر لے۔"

"سوہا……" خرم کچھ کہتے کہتے رکا…… پھر اچانک بات مکمل کر ڈالی۔

"سوہا اور تقدیس تو گہری دوست ہیں نا؟…… تم کہو تو میں تقدیس سے بات کروں…… سوہا کو کچھ سمجھائے؟"

"اسے کیا سمجھانا ہے؟" وہ حیران ہوا۔

"وہ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر رہی…… نہ کسی قسم کا کوئی دباؤ ڈال رہی ہے۔ آپ سب اسے غلط سمجھ رہے ہیں…… اس نے تو مجھ سے کہیں پہلے شکست تسلیم کر لی تھی۔"

"پھر بھی…… میں تقدیس سے۔"

وہ گھما پھرا کے بات کو وہیں لا رہا تھا۔

"یہ ایک اور غلط فہمی ہے آپ کی…… بھابی کی کبھی بھی سوہا سے ایسی دوستی نہیں رہی کہ وہ اس کے فیصلوں، جذبات پہ اثر انداز ہوں۔ مجھ سے ملنے سے کچھ ہی دن پہلے دونوں کی کالج میں دوستی ہوئی تھی…… سوہا اور بھابی ایک دوسرے سے اتنی ہی مختلف ہیں جتنے میں اور سوہا۔ لیکن میرے معاملے میں محبت کا کرشمہ تھا جو انسان کو سامنے والے کی سب خامیاں تمام کمیاں بھلا دینے پہ مجبور کر دیتا ہے۔ وہاں صرف دوستی تھی محبت نہیں۔ متضاد فطرتوں کے لوگوں میں آسانی سے بن جاتی ہے لیکن دوستی صرف ہم مزاج لوگوں کی نبھ پاتی ہے۔ اس لیے یہ دوستی شناسائی کچھ ہی دنوں میں ختم ہو گئی تھی…… پھر بھابی کے گھر کا ماحول بھی کافی سخت تھا۔ سوہا اس بات سے ہرٹ بھی ہوئی لیکن……"

بات کرتے کرتے اس نے خرم کو دیکھا جہاں سوچ کی گہری پرچھائیاں چہرے پہ نظر آ رہی تھیں۔

"کیا ہوا؟"

"ہوں، کچھ نہیں۔" وہ چونکا پھر اٹھ کھڑا ہوا۔

"اس سے پہلے کہ امی ایک اور لیکچر دینے آ جائیں سوچ رہا ہوں کہ انہیں لے کر ہسپتال کا چکر لگا ہی لوں۔"

وصی مسکرایا۔

"نیک خیال ہے۔ ممانی ان کے انتظار میں وہیں رک گئی تھیں۔ ان کو بھی ساتھ لیتے آئیے گا۔"

❂ ❂ ❂

سوہا فروٹ باسکٹ اور بوکے لے کر روم میں داخل ہوئی تو جعفر محمود کو سوپ پلانے کے بعد نیپکن سے ان کا چہرہ صاف کرتی تقدیس نے ٹھٹک کر اسے دیکھا…… کچھ ایسا ہی دھچکا سوہا کو بھی لگا۔

کیونکہ تقدیس کے چہرے کی شادابی جیسے کسی نے نچوڑ کے رکھ دی تھی…… آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے، پژمردگی۔ سوہا کتنی ہی دیر اسے اور وہ سوہا کو تعجب سے دیکھے گئی۔ جعفر محمود کے مخاطب کرنے پہ دونوں چونکیں۔

"تقدیس…… یہ کون ہیں بیٹا؟"

"یہ…… یہ میری……"

سوہا کی نظریں اس نامکمل اور جھجکتے ہوئے تعارف پہ جھک گئیں۔

"یہ میری دوست ہیں…… سوہا۔"

اس کے ہمت کر کے کہہ دینے پہ سوہا کی نظریں ایک بار پھر اٹھیں اور اسے مشکور انداز میں تکنے لگیں۔

"اچھا…… اچھا۔"

یقیناً جعفر محمود کے حافظے سے اس دن غصے میں بپھری اور مہمانوں کے سامنے تماشا کرتی اس لڑکی کی شکل محو ہو چکی تھی۔

رخشندہ بڑے مطمئن انداز میں خرم کے ساتھ ہسپتال میں داخل ہوئیں…… انہیں لگ رہا تھا کہ شاید ان کے سمجھانے کا اثر ہوا ہے خرم پہ جب ہی وہ انہیں لے آیا ہے۔ اندر پروین کو بڑے سنجیدہ تاثرات لیے دیکھا تو ٹھٹک کر پوچھا۔

"خیریت پروین؟"

"فی الحال تو خیریت ہے…… شکر ہے یہ آفت وصی کے جانے کے بعد آئی ہے۔"

"کیسی آفت؟" وہ گھبرا گئیں۔

"وہی سوہا۔"

خرم بھی بھرپور طریقے سے چونکا۔

"وہی آئی ہوئی ہے اندر…… تقدیس کے ساتھ وزیٹر روم میں بیٹھی ہے۔" خرم کے اعصاب تن گئے۔

"سوہا…… اور اندر…… تقدیس کے ساتھ۔" اس نے زہریلے انداز میں سوچا اور ایک منافقانہ ہوئی نظر ہاں پہ ڈالی جو ابھی کچھ دیر قبل کی باتوں پہ اب خود نادم سی ہو کر نظر چرا رہی تھیں۔

وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھا۔

"خرم، رکو۔" انہوں نے گھبرا کے پکارا…… مگر وہ نہ رکا۔

آج وہ سارے بھرم چاک کرنا چاہتا تھا۔

٭ ٭ ٭

"ایک عرصے بعد تم نے مجھے دوست کہا' مجھے اچھا لگا۔" سوہا کے مسکرا کے کہنے پہ تقدیس نے زخمی نظروں سے اسے دیکھا۔
"تمہاری دوست ہونے کی بڑی بھاری قیمت چکائی ہے میں نے سوہا!"
"کیا مطلب؟"
"کچھ نہیں' تم بتاؤ' کیسے پتا چلا میرے پاپا کے بارے میں۔"
"ظاہر ہے وصی سے۔"
"سوہا! ایک بات کہوں۔"
"نہیں رہنے دو۔"
اس نے بغیر فوراً منع کر دیا تو تقدیس حیرت سے اس کا منہ تکنے لگی۔
"کیونکہ میں جانتی ہوں تمہیں کیا کہنا ہے۔" وہ کرب سے مسکرائی۔
"تم مجھے مخلصانہ مشورہ دینا چاہتی ہو کہ میں وصی کو بھول جاؤں' مجھے غیر جانبدارانہ انداز میں سمجھانا چاہتی ہو کہ میں اور وصی الگ دنیاؤں کے باسی ہیں' مجھے اس حقیقت سے روشناس کرانا چاہتی ہو کہ ہم کبھی ایک نہیں ہو سکتے' یا کبھی ہو بھی جائیں تو زندگی ویسی خوشگوار اور سبک نہیں ہو گی' جس کے خوش کن تصور ہم دونوں نے باندھ رکھے ہیں' مجھے خبردار بھی کرنا چاہتی ہو کہ یہ ساتھ۔ یہ تعلق مجھے سوائے رسوائی اور خواری کے کچھ نہیں دے گا' یہ کہنا ہے نا تمہیں تقدیس؟"
وہ چپ کی چپ رہ گئی۔
"پھر بہتر ہے کہ تم یہ سب مت کہو کیونکہ میں ان تمام تلخ حقیقتوں سے پہلے ہی واقف ہوں۔"
"واقف ہو تو سنبھل کیوں نہیں جاتیں؟"
"کبھی کوئی خود بھی سنبھلا ہے اس خاندان میں تقدیس؟ جب تک کہ کوئی سنبھالنے والا ہاتھ آگے نہ بڑھے۔ تمہاری چند روزہ دوستی نے مجھے کیسا سہارا دیا تھا اس دلدل سے نکلنے کا' جس میں میں ان فرینڈز کی وجہ سے دھنستی جا رہی تھی' جن کی تمام تر بے راہ روی کے باوجود کوئی ان پہ انگلی اٹھانے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ کیونکہ ان کا تعلق ایسی فیملی سے نہیں تھا جیسا میرا تھا۔ ان کے باپ جاگیردار' سرمایہ کار اور وہ بھی پشت در پشت سے چلے آ رہے تھے' میرے باپ کی طرح ترکا لگا کے نو دولتیے نہیں تھے۔ ان کی مائیں بھی میری ماما کی طرح سیاہ پس منظر نہیں رکھتی تھیں۔ ان کی تمام حرکتوں پہ پردہ ڈالنے کے لیے ان کے خاندان کا حوالہ کافی تھا' یہ تم تھیں' جس نے میرے اندر کی اس سوہا کو باہر نکالا' وہ سوہا' جسے اس کی ماں منزہ اور مرحوم باپ مظہر نے بڑے ارمانوں سے پالنے کے خواب دیکھے تھے۔ لیکن پھر تم نے بھی چند ہی دنوں بعد ہاتھ کھینچ لیا' ایک وصی تھا' جس نے میرے اندر لگن پیدا کی۔ میں کسی دوسرے کے لیے' کسی کی خوشی کی خاطر اپنی اصلاح کروں' خود کو سنواروں' اور میں نے کوشش بھی کی' لیکن اب وہ بھی گھبرانے لگا ہے' جھجکنے لگا ہے۔"
"وہ اس دنیا میں اکیلا ہوتا' یا تم اس کی اکیلی محبت ہوتی تو وہ نہ جھجکتا' نہ گھبراتا' مگر اس سے وابستہ دوسرے بہت سے رشتے ایسے ہیں جو اسے جھجکنے پہ مجبور کرتے ہیں۔"
"اور تم۔۔۔ تم تقدیس؟"

"میں تو اس سے بھی کمزور ہوں سوہا! میں ایک لڑکی ہوں۔ میں کتنا بھی تمہارے بارے میں دوسروں کو صفائیاں دے لوں' تمہاری دوستی اور تم سے تعلق مجھے کٹہرے میں کھڑا رکھے گا' اور جو غلطی تم نے میری شادی کے موقع پر کی تھی وہ تو۔۔۔"
"میں اس پہ واقعی شرمندہ ہوں' وہ میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی' سب سے بھیانک غلطی۔۔۔ اس وقت جذبات میں اندھی ہو کر میں نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس سے میں اپنے لیے تو گڑھا کھود ہی رہی ہوں تمہارے لیے بھی مشکلات پیدا کر دوں گی' اس واقعے کے بعد سب نے تم سے پوچھا تو ہو گا میرے بارے میں؟"
"سب کا تو پتا نہیں' ہاں مگر ایک شخص ہے' جس کے نہ سوال ختم ہوتے ہیں نہ اندیشے۔"
اس کے بے حد کرب سے کہنے پہ سوہا چونکی۔ "کیا مطلب؟ کون؟"
"کوئی نہیں' بس ایسے ہی۔" وہ مسکرا دی۔
"تم اب جاؤ سوہا! تم آئیں' پاپا کی خیریت دریافت کی' مجھے اچھا لگا' لیکن برا مت ماننا میں نہیں چاہوں گی کہ آئندہ کبھی ہماری ملاقات ہو۔"
"اور میں اگرچہ یہ چاہتی ہوں کہ ہمیشہ ہماری ملاقات رہے' اس کے باوجود تمہاری خواہش کا احترام کروں گی' اور پتا ہے میں ایسا کیوں چاہتی ہوں' کیونکہ آج احساس ہوتا ہے کہ وہ چند دن جو میں نے تمہاری دوستی کے ساتھ گزارے ان چند دنوں میں میں کتنی خالص اور بے ریا رہی' شاید محبت کا اثر تھا۔"
"ہاں محبت اچھے یا برے اثرات ڈالتی تو ہے جیسے تمہاری محبت نے مجھ پہ ڈالے۔"
تقدیس کی نظروں کے سامنے وہ تکلیف دہ دن گزر گئے' جب خرم نے اس محبت کے حوالے سے اس پہ تکلیف دہ الزامات لگائے تھے۔
"جانے دو یار! میری محبت نے کیا اثر ڈالنا ہے کسی پہ' تم پارس ہو' تم تو پتھر کو سونا بنا سکتی ہو مگر میں بھلا کبھی لوہے کے ٹکڑے سے سونے کو بھی زنگ لگتا ہے؟"
سوہا نے رشک بھرے لہجے میں کہا۔
"تم ان لڑکیوں میں سے ہو تقدیس' جن کو کوئی بھی اپنی زندگی کا ساتھی بنا کے فخر محسوس کرے' جن کا کردار' جن کا ماضی' میرے کردار اور ماضی کی طرح داغ دار نہیں ہے۔ جن کی شخصیت میں کوئی جھول نہیں ہے' جن کے دامن میں کوئی چھید نہیں ہے' کوئی ایک بھی ندامت بھرا لمحہ' پچھتاوے کی ایک ہلکی سی پرچھائیں' تم کتنی خوش قسمت ہو تقدیس! تمہارا ضمیر اپنے کسی فعل یا عمل کے لیے بوجھل نہیں ہے' خوش قسمت ہو تم تقدیس' خوش قسمت' اور وہ شخص خوش قسمت ترین' جس کی زندگی میں تم شامل ہو' اور میں' میں نہ خود اتنی خوش نصیب بن سکی' نہ میں وصی کو وہ خوش قسمت ترین شخص بنا سکتی ہوں۔"
یاسیت سے کہتی وہ جانے کے لیے پلٹی' اور اپنے پیچھے اندر آتے خرم کو دیکھ کے لمحے بھر کے لیے رکی' پھر آگے بڑھ گئی' لیکن تقدیس کی تو گویا اوپر کی سانس اوپر' اور نیچے کی نیچے رہ گئی۔

٭ ٭ ٭

"تجھے بات تو کرنی چاہیے سوہا سے۔" ام صغریٰ نے ربنا کو اکسایا۔
"نہیں' کوئی فائدہ نہیں' اس نے کون سا ماننا ہے۔"
"پھر بھی۔۔۔ بچیوں کے بیاہ آئیں تو ان تک پہنچانا' ان کی مرضی جاننا تو چاہیے۔"
"تمہیں بڑی سمجھداریاں سوجھ رہی ہیں۔" ربنا نے طنز بھارا۔

"بس میں نے کہہ دیا نا۔ مجھے اس سے کچھ نہیں جاننا۔ نہ کچھ بتانا ہے۔ یہ میرا اور میری بیٹی کا معاملہ ہے' تم الگ رہو اس سے۔"

"سوہا میری بھی کچھ لگتی ہے رینا!" اصغر نے کڑے تیور اختیار کیے۔ "بیٹی نہ سہی' بھتیجی تو ہے" اور وہ بھی منہ بولی نہیں' سگی' خون کا رشتہ ہے میرا اس سے۔"

کتنی دیر رینا کچھ کہہ نہ سکی۔ پھٹی پھٹی بے یقین نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

"تم۔ تم مجھے طعنہ دے رہے ہو؟ مجھے یہ جتلا رہے ہو کہ میرا اور سوہا کا رشتہ خون کا نہیں ہے' میں اس کی سگی نہیں ہوں' وہ میری منہ بولی بیٹی ہے۔"

"یہ میں طعنہ نہیں دے رہا' یہ تم ثابت کر رہی ہو' اگر ماں ہو۔ تو ماں کا فرض نبھاؤ' اس کے لیے ایک اچھے خاندان کے اچھے' شریف' برسرروزگار لڑکے کا رشتہ آیا ہے' اسے بتاؤ' اس کی مرضی معلوم کرو' اگر وہ انکار کرے تو اسے سمجھاؤ' اسے راضی کرنے کی کوشش کرو۔"

"واہ' ابھی صرف اس تک بات پہنچانے کا حکم سنا رہے تھے' اب راضی کرنے کی ذمے داری بھی سونپی جا رہی ہے' کل کو کہو گے' زبردستی اسے لال جوڑا پہنا کے رخصت بھی کر دو' اچھا فرض نبھا رہے ہو سگے چچا ہونے کا' تکلے نہ تم بھی بینڈو کے پینڈو' میں سوہا کے ساتھ یہ ظلم نہیں ہونے دوں گی۔"

"کیسا ظلم کوڑھ مغز عورت۔؟"

اصغر کے کوڑھ مغز کہنے پہ وہ تلملا کے رہ گئی۔

"اچھا۔ میں کوڑھ مغز ہوں' اور تم کیا ہو؟ وہی روایتی جاہل مرد' بیٹی کے رشتے کو انا کا مسئلہ بنا رہے ہو' بس نہیں چل رہا کہ اسے کسی راہ چلتے کے ہاتھ تھما دو' یہ ظلم نہیں ہے تو کیا ہے؟ میں اس کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہونے دوں گی' سنا تم نے!؟"

"میں اس کے ساتھ زبردستی کرنے کا نہیں کہہ رہا' لیکن وہ بچی ہے' ناداں ہے' اسے زندگی کا نہ تجربہ ہے' نہ لوگوں کی پرکھ' اگر ہم اس کے بڑے بن کے اسے کسی کے بارے میں بتائیں گے نہیں کہ کون اس کے لیے اچھا ہے اور کون برا تو اسے کیا پتا چلے گا' اور مجھے لگتا ہے یہ رشتہ اس کے لیے بہترین ہے۔"

"خاک بہترین ہے' وہ ملک سے باہر چلی جائے گی' مجھ سے دور ہو جائے گی۔"

"بیٹیاں چاہے اگلے محلے بیاہی جائیں' دور تو ہو ہی جاتی ہیں" اور اگر تمہیں اس سے واقعی ماں والی ہی محبت ہے تو اپنے بارے میں نہیں' اس کے بارے میں سوچو' یہ سوچ کر مت گھبراؤ کہ تمہارا کیا بنے گا' یہ سوچو کہ اس کے لیے کیا بہتر ہے' ملک سے دور جانا تو اس کے لیے اچھا ہے' یہاں کیا رکھا ہے اس کے لیے' تمہارا حوالہ' ماں کے لوٹے رشتے کی کڑواہٹ' دور رہے گی تو سب بھلا کے جلدی سیٹ ہو جائے گی' اور جڑیں تو اس کی بھی ادھر ہیں' اس لڑکے کی بھی ہو جائیں گے کچھ سالوں بعد ادھر شفٹ' جیسے اس لڑکے کے ماں باپ وطن لوٹ آئے ہیں۔"

رینا سوچ میں پڑ گئی۔

اصغر نے نرمی سے اس کے کاندھے کے گرد بازو پھیلا کے اسے اپنے نزدیک کیا۔

اور یہ قربت شاید عرصے بعد اس نے بخشی تھی۔

رینا نے بنا کسی مزاحمت کے اس کے کاندھے پہ سر ٹکا کے آنکھیں موند لیں۔

اور یہ سپردگی بھی اس نے عرصے بعد اصغر کو سونپی تھی۔

۞ ۞ ۞

پروین کچن میں کام کر رہی تھیں۔

ہما کا بی پی بے حد لو تھا۔ پروین نے اسے زبردستی کچن میں آنے سے روکا تھا۔ گرمی بھی تو بے حد تھی' اوپر سے لوڈشیڈنگ نے مت مار رکھی تھی۔ وہ اس کا پورا پورا خیال رکھتیں' پھر بھی ہما ڈنڈی مار لیتی اور گھر کے کسی نہ کسی کونے میں کچھ نہ کچھ کرتی پائی جاتی۔

"پھوپھو....." وشمہ کی بدھم آواز پہ وہ مڑیں۔

وہ شرمسار سا چہرہ لیے کچن کے دروازے پہ کھڑی انگلیاں مسل رہی تھی۔

"کوئی کام ہے تو بتا دیں۔"

پروین اس کے لیے لہجے' اور اس پیشکش پہ جی بھر کے حیران ہوئیں' مارے حیرت کے کتنی دیر کچھ کہہ بھی نہ سکیں۔

"کیا بنا رہی ہیں؟" وہ آگے بڑھی۔

"کریلے گوشت' ماش کی دال اور بینگن کا بھرتہ۔"

"ماش کی دال مجھ سے ذھیلی بنتی ہے' کریلے گوشت تو بنانے نہیں آتے' بھرتہ میں بنا دوں؟"

"ہاں۔ ٹھیک ہے بنا لو۔"

وہ مصالحانہ انداز میں بولیں' جب وشمہ خود سے پیش قدمی کر رہی تھی تو وہ کیوں اکڑی رہتیں۔

"سب سے پہلے کیا کرتے ہیں؟"

وشمہ کے پوچھنے پہ پروین کی ہنسی چھوٹ گئی۔

"میں بھی شاید یہ بتانا آتا ہے۔"

وشمہ خجل سے انداز میں مسکرا دی۔

"آؤ..... میں بتاتی ہوں' بلکہ ساتھ ساتھ کریلے اور دال بھی دیکھتی جاؤ' اچھی طرح سیکھ لو کیسے بناتے ہیں' میں روز روز کچن میں نہیں آنے والی' لوگ باتیں کریں گے کہ نئی نئی بہو میں ہوتے ہوئے پروین خود جتی رہتی ہے' میرا کیا ہے' میرے حقے تو ہر روز وہاں آئیں گی لوگوں کی باتیں تم لوگوں کو سننا ہوں گی۔"

وہ ہلکے پھلکے انداز میں کہتی پیاز کاٹنے لگیں۔

"چلو۔ ہما کی تو مجبوری ہے' اسے رعایت مل سکتی ہے' ویسے بھی گرمی میں اسے آنے بھی نہیں دیتی کچن میں' پسینہ آنے سے اس کا بی پی لو ہو جاتا ہے اور حالت خراب ہو جاتی ہے' لیکن پھر بھی وہ رات کو کچھ نہ کچھ ہاتھ بٹا دیتی ہے' اب تم سیکھ ہی لو تو اچھا ہے۔"

"آہستہ آہستہ سب سیکھ جاؤں گی' ویسے مجھے پیکٹ والے مسالوں سے سب بنانا آتا ہے' بریانی' قورمہ' اچار گوشت' کڑھائی گوشت' بنا کے کھلاؤں گی آپ کو' بالکل پرفیکٹ بنتا ہے' مگر کریلے گوشت اور بھرتے وغیرہ کے مسالوں والے پیکٹ ہی نہیں ملتے۔"

پروین نرم سی مسکراہٹ کے ساتھ اسے بھرتے کا وہی چھینٹے باتیں کرتے دیکھ رہی تھیں' عرصے بعد آج وہ دی معصوم سی الھڑ سی وشمہ لگ رہی تھی۔

"ویسے مجھے دوسرے کچھ اور کھانے بھی بنانے آتے ہیں' مسالے کے پیکٹ کے علاوہ' جیسے مونگ مسور کی دال' آلو کی بھجیا' مکس پکوڑے' دہی بڑے' فروٹ چاٹ' ڈرم اسٹکس' سبزی کا پلاؤ' اور بس۔ اور ہاں۔ فروٹ ٹرائفل اور شاہی ٹکڑے بھی۔"

"ارے واہ! تمہیں تو بہت کچھ آتا ہے۔"

پروین نے حوصلہ افزائی کی خاطر سراہا۔

"آٹا گوندھنا نہیں آتا مگر روٹی اچھی بنا لیتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے' آج بنا کے دکھاؤ' آٹا ہما صبح گوندھ لیتی ہے' پراٹھوں کا بھی اور چپاتیوں کا بھی۔"

"پھوپھو!" وہ جھجکی۔

"ہاں... بولو... اور کیا بنانا آتا ہے؟"

وہ مہارت سے کریلے بھونتے اور دوسرے چولہے پہ دال میں مسالا ڈالتے پوچھ رہی تھیں۔

"وہ... پھوپھو... سوری۔"

پروین نے ہاتھ روک کے اسے دیکھا' دھلے دھلے معصوم کم عمر چہرے پہ شرمساری کی لالی تھی۔

"کس بات کے لیے؟"

"سب باتوں کے لیے پھوپھو... ساری بدتمیزیوں' ساری بدگمانیوں' ساری غلط فہمیوں کے لیے۔" اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

سچے موتیوں جیسے شفاف آنسوؤں سے۔

پروین نے بے اختیار محبت سے اس کے گال تھپتھپائے۔

وہ پروین کے گلے لگ گئی۔

☆ ☆ ☆

"سنیے... آج ڈاکٹر سے اپائنٹ منٹ ہے' لے جائیں گے؟" ہما نے فون پہ حسن سے کہا۔

"نہیں۔" حسن نے چھوٹتے ہی کہا پھر ہنس پڑا۔

"عجیب باتیں کرتی ہو' کیوں نہیں لے کر جاؤں گا؟"

"نہیں... میرا مطلب تھا۔" وہ جھینپ گئی۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟"

صبح وہ گھر سے نکلا تو ہما کی بی پی لو ہونے کی وجہ سے کچھ مضمحل سی تھی۔

"جی... ٹھیک ہوں اب۔"

"کھانا پینا رہی ہو یا...؟"

"جی... بالکل... ایک آپ گھر سے چلے بھی جاتے ہیں تو کیا ہوا؟ یہاں بہت سے لوگ ہیں زبردستی کھلانے والے' امی ہیں... چچی ہیں... امی ہیں... اور پتا ہے آج مجھے ملک شیک کس نے لا کے اصرار کے ساتھ پلایا؟"

"احسان صاحب نے؟"

"نہیں۔"

"تو... تو پھر راستے نے؟"

"نہیں... ان سے بھی بڑا معجزہ۔"

"آسمان سے اترا تھا ملک شیک کا گلاس؟"

"نہیں جناب... دشمہ بنا کے لائی تھی اپنے ہاتھوں سے۔"

"ہاتھوں سے... اچھی بچی۔"

"میرا مطلب ہے بلینڈر میں۔" وہ کھلکھلا کے ہنسی۔

"یہ کیسے بھی؟"

دشمہ کے ذکر پہ اب حسن کو کسی خلش کا احساس نہیں ستاتا تھا' وقت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس کے لیے جو سب سے بہترین تھا' تقدیر نے وہی منتخب کیا تھا۔

"آج کل اس میں کافی مثبت تبدیلیاں دیکھی جا رہی ہیں' چچی کے ساتھ بھی اس کا رویہ بدلا ہے۔"

"اچھی بات ہے۔" حسن نے اسے سرسری سا لیا۔

"تم وقت پہ تیار رہنا... ڈاکٹر کا ٹائم سات بجے کا ہے' میں ٹھیک سوا چھ بجے تک پہنچ جاؤں گا۔ بس ہارن دوں گا' نکل آنا۔ ٹریفک بہت ہوتا ہے اس ٹائم ورنہ دیر ہو جائے۔"

"ٹھیک ہے' میں تیار رہوں گی۔"

"کس رنگ کے کپڑوں میں؟" وہ شوخ ہوا۔

"جو آپ کہیں۔"

"اوں... آسمانی... اور پلیز... ہمیشہ کی طرح وہ اپنی پسندیدہ کافی کلر کا لپ اسٹک مت لگا لینا... کتنی بار کہا ہے مجھے تمہارے ہونٹوں پہ گلابی لپ اسٹک اچھی لگتی ہے' اچھی بھلی کھلی کھلی رنگت کو تم کافی کلر لگا کے عجیب پراسرار سا بنا لیتی ہو۔"

اس کے عجیب و غریب اعتراض پہ وہ دیر تک ہنستی رہی۔ فون بند کرنے کے بعد بھی۔

الماری میں سے ہینگ کیا ہوا ہلکا آسمانی گلابی بارڈر والا سوتی لان کا سوٹ نکالتے ہوئے ایسے ہی اسے پل بھر کو خیال آیا۔ گزرے دنوں میں جب اسے بھنک پڑی تھی کہ وصی کو سیاہ رنگ بے حد بھاتا ہے تو وہ کتنے ہی سوٹ اس رنگ کے بنا بیٹھی تھی' حالانکہ رخشندہ چڑا کرتی تھیں' بن بیاہی بچیوں کے سیاہ رنگ میں ملبوس رہنے پہ' لیکن وہ مکمل لباس نہ سہی' ہر لباس میں اس رنگ کا تڑکا ضرور لگاتی' اور پھر بہانے بہانے سے وصی کے سامنے آتی مگر کبھی اس نے نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا تھا۔

ملال ہما کا دل بوجھل سا ہو گیا۔

وصی کی یاد سے نہیں' بلکہ اپنی اس رائیگاں ریاضت سے۔

"کتنی بے مقصد لٹائی میں نے وہ توجہ' وہ محبت' ایک ایسی ہستی پہ' جسے نہ میری پروا تھی' نہ اب اس کی ہے' جو ان توجہ اور محبت کی اصل حق دار ہے۔ کاش میں نے اپنے جذبے حیثیت کر رکھے ہوتے' لیکن اب بھی کچھ نہیں بگڑا' شکر ہے اس ذات پاک کا جس نے مجھے بے اختیار ہونے سے روکا اور آج میری نظر نہ وصی کے سامنے شرمسار ہے نہ اپنے شوہر کے سامنے گناہ گار۔ رہی یہ دل کی خلش تو اس کی تلافی میں حسن کو اپنی مکمل وفا اور محبت دے کر مٹا ڈالوں گی۔ اور ایک بار پھر اللہ پاک کا شکر کہ وصی کے معاملے میں' میں نے گستاخی کا ارتکاب کرتے ہوئے اپنے رب سے کوئی گلہ نہیں کیا' احتجاج نہیں کیا' کیونکہ شاید میرے رب کے اسی فیصلے میں میرے لیے بہتری تھی۔"

اس کے سامنے وصی کا وہ رویہ بھی تھا جو وہ دشمہ کے ساتھ روا رکھتا تھا' اور حسن کا التفات بھی جو اس کے نصیب میں آیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا ممانی نے ایسا کہا؟" سوہا ششدر رہ گئی۔

"ہاں... وہ اپنے بیٹے... کیا نام ہے اس کا...

فرقان۔"

"ہاں۔ صبیح... اس کے لیے تمہارا رشتہ مانگ رہی ہے۔"

یہ کہہ کر ربنا نے بغور اس کے تاثرات جانچنا چاہے۔ وہاں صرف حیرت تھی۔ نہ غصہ' نہ غم' نہ خوشی۔ خیر' خوشی کے تاثرات کی تو ربنا کو توقع بھی نہ تھی بوصی کے بارے میں وہ اس کے شدید جذبات سے آگاہ جو تھی' لیکن غصہ ضرور متوقع تھا' وہ تو سمجھ رہی تھی کہ سوہا سنتے ہی پھٹ پڑے گی۔

"ممانی کو یہ کیا سوجھی؟"

"ان کی ہمت کیسے ہوئی مجھ سے پوچھے بغیر یہ کام کرنے کی؟"

"میرے لیے کیا صبیح ہی رہ گیا ہے؟"

"وصی کے ہوتے ہوئے کوئی اور... ناممکن۔"

لیکن اس نے ایسا کچھ نہیں کیا۔

وہ حیرت جو فوری ردعمل کے طور پہ ربنا نے اس کے چہرے پہ دیکھی تھی' اب وہ حیرت بھی کہیں نہیں تھی۔ سپاٹ تاثرات کے ساتھ وہ اپنے ایر رنگز اتار رہی تھی' ربنا اس کے قریب آئی۔

"تم ملی ہو صبیح سے؟"

"ہوں... ملی تو ہوں۔"

"کیسا ہے؟" ربنا نے ٹٹولا۔

"بس... ٹھیک ہے... شاید ٹھیک سے زیادہ اچھا ہو... یا شاید ٹھیک بھی نہ ہو۔"

سوہا نے عجیب الجھا الجھا سا جواب دیا۔

"میں نے کون سا اسے جانچنے والی نظر سے دیکھا تھا۔ ویسے بھی مجھے پتا کہاں چلتا ہے کہ کون اچھا ہے' کون برا' اب تو خود پہ مجھے ذرا سا بھی اعتماد نہیں رہا ماما۔"

ربنا کو بے اختیار اصغر کے الفاظ یاد آ گئے۔

"وہ ناسمجھ ہے' کم عمر ہے اور ناتجربے کار بھی۔ اسے فیصلے کا مکمل اختیار دینے کی ضرورت بھی کیا ہے' اسے کیا پتا انسانوں کو کیسے پرکھتے ہیں۔"

ربنا اسے اب تک بالوں میں برش لگاتے دیکھ رہی تھی' چند منٹ تک اس کی جانب سے کسی بات کا انتظار کرتے رہنے کے بعد اس نے اکتا کے پوچھا۔

"تم خود انکار کرو گی یا میں؟"

"انکار؟ کس کو؟" وہ حیران ہوئی۔

"تمہاری ممانی کو..." ربنا نے جل کے کہا۔ "کمال ہے' اتنی دیر سے یہی تو بتا رہی ہوں میں۔"

"لیکن انکار میں کروں یا آپ... وجہ کیا بتائیں گی' کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔"

سوہا کے جواب نے ربنا کو گنگ کر دیا۔

چند لمحے بعد وہ سنبھل کے بولی۔

"وصی... میرا مطلب ہے وہ وجہ کافی نہیں؟"

"کس کس کو وہ وجہ بتائی جائے ماما؟" سوہا نے تلخی سے سوال کیا۔ "اور کس منہ سے بتائی جائے۔ وہ وجہ دروازے پہ میرے لیے بارات لے کر نہیں کھڑی۔"

ربنا نے اس کے لہجے کی تلخی کو بھی محسوس کیا' اور اس کی آنکھوں سے جھلکتی مایوسی کو بھی۔

اور فوراً اندازہ لگا لیا۔

"یعنی تمہیں اپنی ممانی کا پیش کردہ یہ رشتہ منظور ہے؟"

وہ چونکتے ہوئے لہجے میں پوچھ رہی تھیں۔

"نہیں... میں نے یہ نہیں کہا... اگر فوری انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے تو فوری اقرار کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اور پہلے مجھے ان سے وجہ دریافت کرنی ہے' اس رشتے کو بھیجنے کی۔"

○ ○ ○

ثناء اس کی بات سن کر دیر تک ہنستی رہی۔

"عجیب ہو تم... یہ کیا سوال ہوا بھلا؟ بھئی کسی لڑکے کی ماں جب کسی لڑکی کے لیے اپنے بیٹے کا رشتہ بھیجتی ہے تو اس کا ایک ہی مطلب ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اسے وہ لڑکی بطور اپنی بہو کے پسند ہے۔"

"لیکن مجھ میں پسند کرنے والی کیا بات ہے؟"

"ارے... اتنی قنوطیت؟ کیا کبھی غور سے آئینہ نہیں دیکھا؟"

"دیکھا ہے... اور جانتی ہوں... دیکھنے میں ٹھیک ٹھاک ہوں' لیکن یہ بھی جانتی ہوں کہ لوگ اپنی بہوئیں پسند کرتے ہوئے صرف شکلیں نہیں دیکھتے۔"

"یہ میں بھی جانتی ہوں بی بی! سمجھدار..." ثناء نے اس کے سر پہ پیار بھری ہلکی سی چپت لگا کے کہا۔

"اور میں نے بھی سب دیکھا ہے... کس بات کی کمی ہے تم میں... ہاں گھرداری میں تھوڑا پھوہڑ ہو' خیر چلتا ہے۔ سب میکے سے سیکھ کے نہیں آتیں' کچھ میری طرح ہوتی ہیں' سسرال آ کے ساس نندوں کے طعنے کھاتے ہوئے ان سے ہی سیکھ کر ان کی احسان مند ہوتی ہیں۔ تم مجھ پہ گئی ہو۔ میرا نام روشن کرو گی' سو ویسے بھی صبیح کھانے پینے کا ایسا خاص شوقین نہیں ہے' لاپروا بھی بہت ہے' اپنے پاپا جیسا نہیں ہے جو ذرا سی الماری بے ترتیب ہونے پہ گھر سر پہ اٹھا لیں' دونوں میں خوب بنے گی۔"

"آپ مجھے بہلا رہی ہیں ممانی۔" وہ گلوگیر لہجے میں بولی۔

"تم کیا دو تین سال کی بچی ہو جسے میں لالی پاپ دے کر بہلاؤں گی؟"

"یہ آپ مجھے لالی پاپ ہی تو دے رہی ہیں ممانی! میں نے آپ کو ممانی سمجھ کے نہیں دوست جان کے آپ سے اپنے راز شیئر کیے تھے' اس لیے نہیں کہ آپ مجھ پہ ترس کھا کے اس طرح......"

"کس نے کہا... میں تم پہ ترس کھا رہی ہوں... پاگل ہو تم... کیا کوئی محض ہمدردی میں اتنا بڑا فیصلہ کر سکتا ہے؟"

"تو پھر... پھر انہوں نے کہا ہوگا آپ سے۔"

"کس نے؟"

ثناء کے سوال پہ وہ نظر چرا گئی۔

"صنوبر کے بارے میں کہہ رہی ہو؟"

ثناء نے اس کے جھکے ہوئے سر سے خود اندازہ لگا لیا۔

"یہاں بھی تم غلط ہو... اتنا بڑا فیصلہ کوئی ماں محض کسی کی فرمائش پہ بھی نہیں کرتی۔ صبیح کے لیے میرے دل میں کچھ ارمان بھی ہیں' اور ایک ماں ہونے کے ناتے میری کچھ ذمے داریاں بھی ہیں' میں جذبات میں آ کے کیے فیصلے پہ صبیح کی زندگی کا فیصلہ کیوں کروں گی۔"

"تو پھر... آپ... آپ تو سب جانتی ہیں۔"

"کیا؟ کیا جانتی ہوں میں؟" ثنا نے الٹا سوال کیا۔
"یہ ایسی اہم بات نہیں' اور تمہیں بھی کوئی ضرورت نہیں اسے اہمیت دینے کی۔ اگر صبیح میں کوئی کمی ہے؟ اسے ناپسند کرنے کی کوئی وجہ ہے تمہارے پاس' تو میں تمہاری مرضی کا احترام کروں گی' اور اگر وہ لڑکا' اس کی وجہ سے تم انکار کر رہی ہو تو بہت غلطی کر رو گی' سوہا۔ بالفرض وہ اپنی بیوی کو طلاق دے کر گھر والوں کی مخالفت مول لے کر تم سے شادی کر بھی لیتا ہے تو تمہاری زندگی آسان نہیں ہوگی۔ پہلے سے بھی مشکل ہوگی۔ اور اپنے لیے آسانیاں چننا۔ مشکلوں اور کٹھنائیوں سے بچ کر چلنا خود غرضی نہیں ہے' تمہیں پورا حق ہے اپنے لیے ایسی راہ چننے کا جس میں تمہارے لیے خوشیاں ہوں محبت اگر خوشی کے ساتھ بندھی ہو تو سکھ دیتی ہے ورنہ نہیں۔"

❁ ❁ ❁

"گئی ہے وہ اپنی ممانی کے پاس۔" ربنا نے اصغر کو اطلاع دی۔
"اس کی ممانی ایک سمجھدار عورت ہے' وہ اسے منا لے گی۔"
"ہاں۔ ایک میرے علاوہ سب ہی عورتیں سمجھدار ہیں میں تو کوڑھ مغز ہوں۔" ربنا جل کے بڑبڑائی۔
اصغر نے مسکرا کے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔
"اب لگتا ہے تم میری بیوی ہو۔ اصغر بھٹی کی بیوی۔ یعنی بیگم اصغر بھٹی' جلتی کڑھتی' بڑبڑ کرتی' ورنہ پہلے تو تم صاحب بنی رہتی تھیں' اب میرے جوڑ کی لگ رہی ہو۔"
اس نے ربنا کے اس نئے حلیے پہ چوٹ کی۔
وہ ساری نزاکت' وہ ساری بناوٹ' جیسے دل اوب سا گیا تھا ہر چیز سے' کتنے ہی دن ہو گئے تھے وہ سادہ سی شلوار قمیص میں ہی گھر میں پھرتی رہتی' بلکہ تو سارا دن تو نائٹ ڈریس میں گزار دیتی۔
بالوں کی اسٹائلنگ اور کٹنگ کو بھی توجہ کی ضرورت تھی' لیکن وہ انہیں الٹا سیدھا لپیٹ کے جوڑے کی شکل دیے ہوئے تھی' کبھی اس کے ناخنوں سے نیل پالش نہیں اتری تھی' اور اب کتنے ہی دنوں سے ٹوٹے رنگے ٹوٹے پھوٹے ناخن لیے وہ گھوم رہی تھی۔
اصغر کو اس کا سادہ گھریلو روپ بے حد بھا رہا تھا۔
"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے' دل ہی نہیں چاہتا بننے سنورنے کو۔"
اس نے وجہ بیان کی۔
"سوہا والے معاملے کو دل پہ لے رہی ہو تم۔ کتنا سمجھا رہا ہوں کہ اللہ پہ چھوڑ دو' وہ سوہنا جو کرے گا' بہتر کرے گا' اولاد و قبضہ جمانے کے لیے نہیں ہوتی' اور خدا کے واسطے اپنے دل سے اب یہ خوف نکال دو کہ کوئی ہے تم سے چھین لے گا' جا کے دیکھو۔ ان سب جاننے والے' ملنے والوں کو جا کے دیکھو۔ جن کے چھ چھ' سات سات بچے ہیں۔ بڈھا' بڈھی اکیلے بیٹھے تصویریں دیکھ رہے ہوتے ہیں' البموں میں۔ بیٹیاں اپنے گھر اور بچوں میں گم۔ یہ شروع شروع میں لگتے ہیں میکے کے چکر' پھر بچوں کے بڑے ہونے پہ چھٹیوں میں آ گئیں تو آ گئیں۔ بیٹے بیٹیوں سے بھی زیادہ بے دید اور طوطا چشم ہوتے ہیں' بیویوں کے ہو کے رہ جاتے ہیں۔ بھلا اولاد بھی کوئی سینے سے لگا کے رکھنے والی چیز ہے' ہاں ہاں اس عمر میں کام آتا ہے تو صرف زندگی بھر کا ساتھی' اسے جینے سے لگا کے رکھو' بڑھاپے میں کام آئے گا۔"
وہ اس کا ہاتھ رکھ کے جھکتا شوخی سے کہہ رہا تھا' نہ چاہتے ہوئے بھی ربنا کو ہنسی آ گئی۔
"تم نے رکھی ہے نا کیا؟"

"اب کہاں؟ کب کی چھوڑ دی' پتا نہیں تم میرا اعتبار کیوں نہیں کرتیں۔" وہ اچانک شوخی سے یاسیت پہ اتر آیا۔
ربنا کے دل میں کسک سی جاگی' وہ کیا بتاتی' اس سے فطرت ہوئی' کسی پہ بھی اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔
نجانے اعتبار کر لینے کے بعد جو سکون ملتا ہے' وہ کیا ہوتا ہوگا۔
"اچھا۔ میری قسم کھاؤ' پھر اعتبار کر لوں گی۔"
"واقعی؟ تمہاری قسم۔ تمہارے سر کی قسم۔ میں نے پینا پلانا۔ سٹہ بازی' وومنیزر کا سیمنٹ بنانا سب چھوڑ دیا ہے' تمہاری قسم' اپنی مری ماں کی قسم اور اپنی اس بچی کی آئندہ زندگی کی خوشیوں کی۔"
"بس بس۔ میں نے یقین کر لیا۔" ربنا کی آنکھیں جھلملا اٹھیں۔
"اب ایک بات کا یقین اور کر لو کہ سوہا کی ماں نے اس کے لیے رشتہ نیک نیتی سے ہی بھیجا ہے' اس کے لیے بے کار کی بدگمانیاں اور وہم دل میں نہ لاؤ' اندر ہی اندر گھل گھل کے تم نے اپنی حالت کیا کر لی ہے۔"
"تمہیں تو بڑی پسند آ رہی ہے میری یہ حالت۔"
"مجھے تو سیدھی سادی۔ گھریلو گھریلو بیوی سی ضرور اچھی لگ رہی ہے' مگر یہ پیلی رنگت' آنکھوں سے نیچے حلقے' نہ بھئی یہ نہیں چلیں گے' مجھے بیگم ہنستی کھلتی چاہیے' رعب داب والی' کچھ کھایا پیا کرو' جان بنایا کرو۔"
"کچھ کھانے پینے کو جی نہیں کرتا' بھوک مر گئی ہو جیسے' کمزوری محسوس بھی ہوتی ہے' مگر کھانے کی جانب طبیعت راغب نہیں ہوتی۔"
"ڈائٹنگ کر کر کے تو نے بھوک کا ستیاناس کر لیا ہے۔"
"شاید ٹھیک کہتے ہو' ہاتھوں' پیروں میں سے جان نکلتی محسوس ہوتی ہے۔"
"مانتی نہیں ہے' مگر بڈھی ہو گئی ہے تو۔"
اصغر نے چھیڑا تو برا مان گئی۔
"تم سب کو چھوڑ سکتے ہو۔ مگر یہ حرکت نہیں۔"

"ارے۔ ناراض کیوں ہوتی ہے' مذاق کر رہا تھا میں' اچھا اب نہیں کرتا' بیٹھ تو سہی میں ڈاکٹر سے ٹائم لے دیتا ہوں' کل دکھا لینا۔"
"اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔"
"نہیں لاپروائی اچھی نہیں' وہ بھی اس عمر میں۔" وہ دوبارہ شوخی پہ اترا' پھر ربنا کے گھورنے پہ کان پکڑ کے ہنسنے لگا۔
"نہیں نہیں۔ میرا مطلب ہے۔ میری عمر اب نہیں رہی کہ میں تمہاری صحت کی فکریں اٹھاتا پھروں۔ کل میں خود لے کر جاؤں گا تمہیں ڈاکٹر کے پاس۔"
ربنا کچھ کہنے والی تھی کہ سامنے سے آتی سوہا کو دیکھ کے چپ ہو گئی اور کھوجتی نظروں سے اس کے چہرے کا جائزہ لینے لگی۔ جو ہمیشہ کی طرح بے تاثر تھا۔
"ہاں سے آ رہی ہے میری رانی بچی؟"
اصغر کے پوچھنے پہ وہ نارمل انداز میں بتانے لگی۔
"ممانی سے ملنے گئی تھی۔"
"خیریت تھی؟" اس نے محتاط انداز میں پوچھا۔
"جی۔ بالکل۔" اصغر کو جواب دینے کے بعد اس نے ربنا کو مخاطب کیا۔

"ماما۔ کل آپ مجھ سے پوچھ رہی تھیں نہ کہ انکار آپ کریں گی یا میں؟"
ربتا کا دل اچھل کے حلق میں آ گیا۔ وہ بمشکل سر ہلا پائی۔
"نہ آپ انکار کریں گی' نہ میں۔"
مختصر اور مبہم جواب میں بہت بڑا اشارہ چھپا تھا' اس سے پہلے کہ خوشی سے مسکراتا اصغر اس سے تفصیل سے کوئی بات کرتا' وہ اٹھ کے اندر چلی گئی۔
امر نے ربتا کی جانب دیکھا' اس کی توقع کے برعکس وہاں مکمل سکون کی کیفیت تھی۔
شاید ربتا کے دل میں اصغر کی باتیں اتر گئی تھیں۔

❂ ❂ ❂

سب کچھ غیر متوقع ہی ہوتا جا رہا تھا۔
ثنا کا صبیح کے لیے اس کا رشتہ دینا تو غیر متوقع تھا ہی' سوہا کا مان جانا اور بھی غیر متوقع تھا۔
لیکن سب سے حیران کن بات رہی' وصی کا ردِعمل۔
وہ نہ حیران ہوا' نہ غم زدہ' نہ اس نے سوہا سے کوئی شکوہ کیا' نہ وعدے یاد دلائے۔
"میں خوش ہوں سوہا! کہ تم نے اپنے لیے ایک بہترین فیصلہ کیا۔ میں یہ سوچ کر خوش ہوں کہ جو خوشیاں میں تمہیں دینا چاہتا تھا وہ تمہیں ملنے والی ہیں' میں خوش ہوں کہ جو مقام میں تمہیں دلانا چاہتا تھا' وہ مقام تمہیں ملنے جا رہا ہے۔ میں نہ سہی' کوئی اور سہی' محبت کا دامن اتنا تو وسیع ہوتا ہی ہے کہ وہ محبوب کی خوشی میں خوش ہو لے۔ محبت میں پا لینا ہی سب کچھ نہیں ہے سوہا! محبت میں دل کا سکون بھی بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں تمہیں پا لیتا مگر ساری عمر تم سے شرمندہ رہتا کہ تمہیں نہ عزت دلا سکا' نہ محبت دے سکا' تو کیا میرے دل کو سکون ملتا؟ اب تم کسی اور کی ہونے جا رہی ہو' لیکن مجھے یہ سکون رہے گا کہ تم جہاں ہو' جس کے بھی ساتھ ہو' خوش ہو۔"
"وصی! تمہیں مجھ سے کوئی گلہ نہیں؟ زندگی کی خوشیوں پہ تمہارا بھی تو حق تھا' اور میری وجہ سے تم کتنا عرصہ اس خوشی سے محروم رہے' میں نے محبت میں اپنا دامن اتنا وسیع کیوں نہیں کیا' جتنا تم کر رہے ہو' میری محبت اتنی فراخ دل کیوں نہ ہو سکی' جتنی تمہاری ہے۔ میں تو تمہیں وشمہ سے قریب تک بھی نہیں سکتی تھی۔ میری وجہ سے تم نے اپنی زندگی عذاب بنائے رکھی' کتنی تکلیف دی تمہیں' کتنی اذیت۔"
"بھول جاؤ سب کچھ' اور مجھے بھی۔"
"نہیں وصی! تکلیف دہ باتوں کو بھول جانا اچھا ہے' وہ میں بھول جاؤں گی' مگر تمہیں نہیں۔ تمہیں تو میں ہمیشہ یاد رکھوں گی' تمہاری یاد مجھے یاد دلاتی رہے گی کہ محبت کیسے کی جاتی ہے' کیسے نبھائی جاتی ہے' اور محبت میں وسعت اور فراخ دلی کیسے پیدا کی جاتی ہے۔ میں تمہیں کبھی نہیں بھول سکتی۔"
"میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا' مگر ہر وقت' ہر پل نہیں' صرف دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"
وصی نے مسکرا کے کہا۔

❂ ❂ ❂

منزہ' پروین کے پاس بیٹھی تھی۔
آج مزاج میں وہ طنطنہ ناپید تھا' پروین نے بھی یہ بات محسوس کر لی' پروین کا اپنا مزاج ایسا نہیں تھا کہ بلاوجہ

کدورت سنبھالے پھرتیں۔ منزہ کے ماؤ والے پن بھی بس ختم ہو جایا کرتیں' مگر جب مدِ مقابل ہی پسپائی پہ آمادہ ہو تو وہ کیا کرتیں' سو بڑے سبھاؤ اور اخلاق سے مہمان داری نبھائے جا رہی تھیں' کچھ یہ بھی تھا کہ وشمہ کے بدلتے رویے نے ان کے گلے دور کر دیے تھے۔
"وشمہ آئی نہیں ابھی تک؟"
اسے بیٹھے آدھا گھنٹہ ہو رہا تھا' وشمہ کو خبر تھی مگر وہ ملنے نہیں آئی تھی۔
"آئی ہو گی' دوپہر کو سونے کی عادی ہے' میں نے اسے جگایا تھا' ظاہر ہے نہانے چلی گئی ہو گی' تیار ہونے میں اتنا وقت تو لگتا ہے' لو آ گئی وشمہ۔"
وشمہ کچھ سنجیدہ' کچھ ناراض ناراض سی اندر آئی' منزہ اسے گلے لگانے آگے بڑھی' وشمہ کے انداز میں موجود واضح تکلف اور گریز کو پروین تک نے محسوس کر لیا اور بہانے سے وہاں سے چلی گئیں۔
"تم بیٹھو میں ذرا اسے شربت دیکھ لوں' ٹھنڈا ہونے رکھا تھا یا نہیں۔"
"ناراض ہو اپنی ماں سے؟" منزہ نے اس کے ہاتھ تھامے۔
"نہیں' ناراض نہیں ہوں۔"
"پھر فون پہ بھی بات نہیں کرتیں۔"
"کیا بات کروں؟ ایک بات کی تھی آپ سے' لیکن پھر احساس ہوا جو بات کسی کے بس میں نہ ہو' اسے منوانے کی کوشش کرنا فضول ہے۔"
"اور اگر کوئی اس ناممکن کو ممکن کر دکھائے تو؟"
"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔
"میں نے یہی خوش خبری تمہیں سنانے کے لیے فون کیا تھا' اگر تم آ خیر بخوش خبری آ کے سنائیں تو زیادہ بھلی لگتی ہے' خوش ہونے والے کے چہرے کی مسکراہٹ بھی تو دیکھنے کو ملتی ہے۔"
منزہ نے وشمہ کا چہرہ ہاتھوں میں بھرا۔
"سوہا کا رشتہ طے ہو گیا ہے' میرے بھائی کے بیٹے سے' اور سوہا نے اپنی خوشی اور مرضی سے ہاں کی ہے' وصی کی رضامندی اور مشورے کے ساتھ' دونوں یہ جان گئے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے لیے نہیں بنے۔ سوہا شادی کے بعد بیرون ملک جا رہی ہے۔"
"ماما!"
مارے خوشی اور تشکر کے وشمہ سے کچھ نہ کہا گیا' وہ منزہ سے لپٹ گئی۔

❂ ❂ ❂

آج سوہا کی شادی تھی۔
تقدیس میرون ساڑھی میں جانے کے لیے تیار تھی۔ خرم اس کے نیکلس کا ہک لگاتے ہوئے پیار سے کہہ رہا تھا۔
"تم نے اپنی دوست کے لیے تحفہ کیا لیا؟"
"قدرت نے اسے جو تحفہ دے دیا ہے اس کے بعد سارے تحفے ہیچ ہیں۔"
"پھر بھی تمہیں بھی اپنی طرف سے کچھ دینا چاہیے۔"

"آپ بور ہو رہے ہیں۔"

"کس؟"

"ہاں، مجھے وہاں لے کر جا رہے ہیں، اپنی خوشی سے، یہ اس کے لیے تحفہ ہی ہو گا۔"

"شرمندہ مت کرو یار! غلطی انسانوں سے ہی ہوتی ہے۔"

"ہاں ہوں... انسانوں سے نہیں، مردوں سے۔"

"کیا مطلب؟ مرد انسان نہیں ہوتے؟"

وہ کھلکھلا کے ہنس دی۔

"اس بحث میں مت پڑیں، ورنہ دیر ہو جائے گی۔"

خرم محبت سے اس کے مسکراتے چہرے کو دیکھنے لگا۔

جو وہ اس دن اس کی اور سہا کی گفتگو نہ سنتا تو بے اعتباری کی یہ دھند نہ چھٹتی۔

❁ ❁ ❁

وشمہ نے حیرت اور رشک کے ملے جلے تاثر کے ساتھ وصی کو دیکھا جو آئینے کے سامنے کھڑا پرفیوم اسپرے کر رہا تھا۔ وہ دونوں بھی شادی پہ انوائٹڈ تھے اور وشمہ کو سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وصی جو سہا کے لیے اتنا سنجیدہ تھا کس دل سے جانے کے لیے تیار ہو رہا ہے۔

"آپ کو کچھ ہو نہیں رہا؟" وہ پاس آ کے پوچھنے لگی۔

"ہاں، ہو رہا ہے۔"

"کیا؟"

"سر میں درد۔"

"پریشانی سے؟" وہ سمجھی سہا کی شادی کا غم وہ جتنا چھپانے کی کوشش کر رہا ہے، وہ سر میں درد کی صورت ظاہر ہو ہی گیا۔

"نہیں، تمہارے سوالوں سے، جتنی پوچھ گچھ تم کر رہی ہو، وہی وقت تیار ہونے میں لگاؤ، تو ہم وقت پہ پہنچ جائیں گے۔"

"پھر بھی... آپ کتنا بھی چھپائیں، ایسا ہو نہیں سکتا کہ آپ کو کوئی دکھ نہ ہو۔"

"دکھ... یار! تم مجھے اتنا کم ظرف سمجھتی ہو کہ میں کسی پرخلوص سے دوست کی زندگی کے نئے سفر پہ اداس یا دکھی ہوں گا؟ میں خوش ہوں، بہت خوش، اور تم کو بھی خوش نظر آنا چاہیے، نہ صرف خوش، بلکہ بہت خوبصورت بھی، چلو، جلدی، اسے لیپا پوتی کرواؤ اپنے چہرے کی۔"

اس نے وشمہ کی چھوٹی سی ناک دبائی۔

❁ ❁ ❁

دلہن بنی سہا نے اسٹیج پر بیٹھے بیٹھے نظر اٹھا کے دیکھا۔ ریٹا اور منزہ ایک ساتھ بیٹھی محبت لٹاتی نظروں سے اس کے دلہناپے سے سجے روپ کو دیکھ رہی تھیں۔ اصغر خوشی اور بڑے وارے دونوں سنبھالے مبارک بادیں وصول کر رہا تھا۔ ثناء اس پہ سے روپے نچھاور کر کے بانٹ رہی تھی۔ وصی اور وشمہ، پروین کے برابر بیٹھے کوئی اہم مسئلہ

ڈسکس کر رہے تھے شاید۔ تینوں کے چہرے کتنے مطمئن تھے۔ تقدیس، خرم کی کسی بات پہ مسکرا رہی تھی، پھر سہا نے گردن گھما کے اپنے برابر بیٹھے صبیح کو دیکھا۔

"یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، تم میری زندگی میں اس لیے آئے، سب مطمئن اور خوش ہیں، شکر ہے میں ان گلیوں کی بھول بھلیوں میں گم نہیں ہوئی، جن کے راستے نہ میری منزل تک جاتے ہیں نہ کسی اور کو خوشی دے سکتے ہیں۔"